ہندوستان، پاکستان

اور بیرونی ممالک کے بزرگانِ دین

اور

صوفیائے کرام

کے حالاتِ زندگی، ان کی کرامات

اور تعلیمات

روشنی کے مینار

جسے ضیاء تسنیم بلگرامی نے انتہائی تحقیق و جستجو کے بعد اتنے آسان اور دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ کہانیوں کا گمان ہوتا ہے۔ روشنی کے مینار کے صفحات میں حضرت ابو داؤد طائیؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ نصیر الدین روشن چراغ دہلیؒ، حضرت شیخ سلیم چشتیؒ اور دوسرے بہت سے بزرگانِ دین کے واقعات تفصیل سے دیئے گئے ہیں۔

اسلام کے خاموش مبلغوں کے پاکیزہ واقعات

روشنی کے مینار : حصہ اوّل : بیس روپے — حصہ دوم : بیس روپے (ڈاک خرچ علیحدہ)

آج ہی ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر گھر بیٹھے وی پی ڈاک سے منگوائیے، یا اپنے اخبار فروش سے طلب کیجیے!

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں۔

غیر ملکی روانگی اپنے اپنے ملک کے لئے قیمت اور محصول ڈاک معلوم کرنے کے لئے تحریر فرمائیں۔ پھر ڈرافٹ بھیجیں۔

آپ کو ہندوستان کے کسی گوشے میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں اُردو، انگریزی، ہندی، پنجابی کتابیں یا رسائل منگوانے ہوں تو شمع کے ادارے کو خدمت کا موقع دیجئے۔ غیر ممالک میں شہر، شہر نئے ایجنٹ بنائے جا رہے ہیں!

سعدیہ دہلوی

نانی اماں نے ہمارا نام بچپن میں ہی پیر زندہ رکھ دیا تھا۔ گھومنے پھرنے کا شوق شروع سے ہی تھا۔ کئی بار غیر ملکی سفر بھی کر چکے ہیں۔ دہلی میں ایک بار پھر جوتی پر جوتی چڑھی اور ہم ولایت کے سفر کے لئے روانہ ہو گئے۔

اس بار ہمارے چھوٹے چچا اور چچی بھی ہم سفر تھے۔ لندن ایرپورٹ پر اتر کر احساس ہی نہیں ہوا کہ ولایت پہنچ گئے۔ کیونکہ لندن کے ایرپورٹ پر کام کرنے والے ۹۰ فی صد ہندوستانی اور پاکستانی ہیں۔ کسی کو سلام کیا تو کسی کو نمستے لیکن جس وقت ایرپورٹ کے باہر آئے اور سر پر برف گری تو یقین ہو گیا کہ لندن کی سرزمین ہے۔

لندن کا سفر کافی خوش گوار رہا۔ کئی دل چسپ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ لندن میں ہمارا قیام قیصر تمکین کے ہاں رہا۔ قیصر صاحب اردو کے اچھے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ لندن کے مشہور اخبار 'لندن ٹائمز' کے مدیروں میں سے ہیں۔ ایک روز انھوں نے ہمیں اپنے دفتر کی سیر کرائی۔ وہاں کی زمین اتنی چمک رہی تھی کہ ہمیں اس میں اپنا عکس نظر آ گیا۔ آفس بھی صاف ستھرا اور شان دار تھا۔ ہمیں حیرت ہوئی اس کی وجہ دریافت کی۔ حیرت اس لئے ہوئی کہ صحافیوں کا دفتر چاہے دنیا کے کسی کونے میں بھی ہو جگہ جگہ کاغذات کا ڈھیر دفتر کی خوب صورتی میں شمار ہوتا ہے۔ ہماری امید کے مطابق قیصر صاحب صفائی کا نام سنتے ہی کچھ برا مان گئے۔ انھوں نے خود اپنی صفائی پیش کی: "ارے صاحب یہ ہمیشہ اتنا صاف نہیں رہتا ہے۔ دراصل ٹائمز اخبار کو ۲۰۰ سال ہو گئے۔ اور کچھ دنوں بعد ملکہ الیزبیتھ ہمارے دفتر میں صد سالہ فنکشن میں تشریف لا رہی ہیں۔ آپ ان کے جانے کے بعد آئیں پھر دیکھیے گا کیا خوب لگتا ہے!"

ٹائمز کے دفتر میں ایک اور بات دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ یہاں کاغذ کے انبار نظر آئے اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ قدرتی بات ہے۔ اخبار کے دفتر میں کاغذ نہیں تو کیا ہاتھی دکھائی دیں گے۔ ہم بھی یہی سوچتے تھے۔ لیکن تقریباً سات سال پہلے نیویارک ٹائمز کا دفتر دیکھا تھا۔ صاحب یقین مانئے ہم کاغذ کے دیدار کو ترس گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہر کام کمپیوٹر کرتا ہے۔ ہر رپورٹر کی میز پر ایک چھوٹا سا کمپیوٹر لگا ہوا ہے۔ کیسا کاغذ اور کیسا قلم۔ رپورٹر اپنی کہانی کمپیوٹر میں ٹائپ کر دیتا ہے اور وہ کہانی مدیر کے کمپیوٹر میں چلی جاتی ہے اور اس طرح کمپیوٹر کا صفحہ اخبار کا صفحہ بن جاتا ہے۔

ہم نے کہا "قیصر صاحب کاغذ پر تو ہم بھی لکھتے ہیں"۔ انھوں نے پھر صفائی پیش کی "دراصل ۶ سال سے یونین کی ہڑتال چل رہی ہے۔ یونین والے کمپیوٹر کو آنے نہیں دیتے بہت سے کارکن اس وجہ سے بے روزگار ہو جائیں گے"۔ چلو کہیں تو کمپیوٹر کی ہار ہوئی۔ یہ انسانی قدر دیکھ کر مسرت ہوئی۔

لندن میں ہم نے ادب اور موسیقی کا خوب لطف اٹھایا۔ ۲ مشہور پینٹرز کی نمائش چل رہی تھی۔ ایک رینوا کی دوسری شاگال کی۔ رینوا پچھلی صدی کا مشہور فرانسیسی آرٹسٹ تھا۔ دنیا بھر سے اس کی پینٹنگ جمع کر کے لندن کے ایک میوزیم میں اکٹھی کی گئی تھیں۔ اس کی پینٹنگ میں فرانس کی زندگی کے ہر پہلو کے نقوش ملتے ہیں۔

شاگال بھی عجیب انسان ہیں۔ وہ اس وقت ۹۰ سال کے ہیں اور شاید دنیا کے مشہور ترین آرٹسٹوں میں سب سے زیادہ عمر کے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تصویروں میں اس صدی کے مختلف نقشے ملتے ہیں۔ یہ

• مضامین اور افسانوں کا انمول خزانہ

• انعامی مقابلے

•••• اور بہت کچھ

شمع کی
کھانسی، نزلہ،
زکام، گلے اور سینے کی
بیماریوں کے لئے
دو روپے
شمع لیباریٹریز
(یونانی اینڈ آیورویدک)
لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶
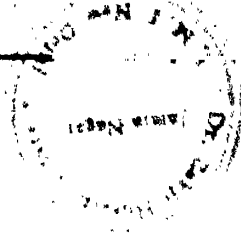
افتتاحیہ

دُنیا میں اہلِ علم کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا طبقہ وہ ہے جو دنیاوی علوم کا ماہر ہے۔ وہ آنے والی نسلوں کے لئے سائنس کی تحقیقات علوم و فنون کی کتابیں اور شعر و ادب کی تخلیقات چھوڑ جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو باطنی علوم میں ماہر ہوتا ہے۔ یہ اولیاء اللہ ہیں جو آتشِ عشق میں فنا ہو کر اپنے نقشِ قدم چھوڑ جاتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی زندگی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک بار آپ حوض کے قریب بیٹھے وضو فرما رہے تھے۔ ناگہاں انہیں ایک بچھو پانی میں تڑپتا نظر آیا۔ آپ کو خیال آیا کہ یہ خشکی کا جانور ہے۔ پانی میں مر جائے گا۔ آپ نے اُسے پانی سے نجات دلانے کے لئے حوض میں ہاتھ ڈالا۔ جُوں ہی آپ کا ہاتھ اُس سے مَس ہوا، اُس نے آپ کے ہاتھ پر ڈنک مارا۔ آپ نے اُسے چھوڑ دیا۔ دوسری بار بھی یہی ہوا اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخرکار حضرت نے اُسے اُٹھا ہی لیا اور زمین پر ڈال دیا۔ ایک شخص یہ واقعہ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آپ سے پوچھا "حضرت! آپ نے اِس بچھو کو کیوں بچایا۔ وہ آپ کو لگاتار ڈنک مار رہا تھا" حضرت نے جواب دیا "بچھو اگر ڈنک نہ مارے تو بچھو نہیں، اور میں اس کو اذیت سے نہ بچاؤں تو خدا کی راہ میں مٹنے والا نظام الدین نہیں"

اگر ہمیں حق کی تلاش ہے اور ہم سچائی کی راہ پر چلنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے حریفوں کو پہچاننا ہی ضروری نہیں بلکہ اپنے نفس پر قابو پانا بھی ضروری ہے۔ ہمیں ہمیشہ حسنِ سلوک کا راستہ اختیار کرنا چاہئے — جب ہمیں اپنے حریف کی چال پر غصہ آتا ہے تو دراصل یہ غصہ اس کی چال کا ردِ عمل نہیں ہوتا بلکہ یہ جذبہ اپنے دل کے تاریک گوشوں میں چھپا ہوتا ہے۔ اگر ہم ان تاریک گوشوں پر روشنی ڈالیں تو یہ انکشاف ہوگا کہ جذبات کا یہ طوفان اپنے ہی نفس کی خاک سے پیدا ہوتا ہے۔

اولیاء اللہ نے جو مثالیں ہمارے لئے چھوڑی ہیں ان سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں اپنے نفس کو مار کر انسانیت اور خلوص کا راستہ اپنانا ہے۔

سعدیہ دہلوی

بانو

نگراں : یوسف دہلوی
مدیرہ اعزازی : زینت کوثر دہلوی
مدیرہ : سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر : شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اڑتیسواں (۳۸) سال، ۴۵۸واں شمارہ

سالانہ قیمت : اڑتالیس روپے

مقامِ اشاعت و صدر دفاتر : آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ : شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس : 3161601 SHMA IN
ٹیلی فون : 272066, 272067, 272068
دیگر دفاتر : بمبئی، کلکتہ اور مدراس
مالکان : شمع میگزین
طابع و ناشر : یونس دہلوی

ٹائٹل : بمبئی آفسیٹ پریس، دہلی
مطبوعہ : روبی پرنٹنگ پریس، دہلی

ترتیب

ان کے علاوہ : ● کشیدہ کاری کے نمونے ● کہی اَن سنی ● بزم بانو
انعامی تصویریں ● پسندیدہ شعر
● کڑھائی کے نمونے ● ہیلتھ کلب
● ذہنی ورزش ● اقوالِ زریں
اور بہت سی دوسری کئی دلچسپیاں

سعدیہ دہلوی

نانی اماں نے ہمارا نام بچپن میں ہی پرندہ رکھ دیا تھا۔ گھومنے پھرنے کا شوق شروع سے ہی تھا۔ کئی بار غیر ملکی سفر بھی کر چکے ہیں۔ دسمبر میں ایک بار پھر جوتی پر جوتی چڑھی اور ہم ولایت کے سفر کے لئے روانہ ہو گئے۔

اس بار ہمارے چھوٹے چچا اور چچی بھی ہم سفر تھے۔ لندن ایرپورٹ پر اتر کر یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ولایت پہنچ گئے۔ کیونکہ لندن کے ایرپورٹ پر کام کرنے والے ۹۰ فی صد ہندوستانی اور پاکستانی ہیں۔ کسی کو سلام کیا تو کسی کو نمستے لیکن جس وقت ایرپورٹ کے باہر آئے اور سر پر برف گری تو یقین ہو گیا کہ لندن کی سرزمین ہے۔ لندن کا سفر کافی خوش گوار رہا۔ کئی دل چسپ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ لندن میں ہمارا قیام قیصر تمکین کے ہاں رہا۔ قیصر صاحب اردو کے اچھے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ لندن کے مشہور اخبار 'لندن ٹائمز' کے مدیروں میں سے ہیں۔ ایک روز انھوں نے ہمیں اپنے دفتر کی سیر کرائی۔ وہاں کی زمین اتنی چمک رہی تھی کہ ہمیں اس میں اپنا عکس نظر آ گیا۔ آفس بھی صاف ستھرا اور شان دار تھا۔ ہمیں حیرت ہوئی اس کی وجہ دریافت کی۔ حیرت اس لئے ہوئی کہ صحافیوں کا دفتر چاہے دنیا کے کسی کونے میں بھی ہو جگہ جگہ کاغذات کا ڈھیر دفتر کی خوب صورتی میں شمار ہوتا ہے۔ ہماری امید کے مطابق قیصر صاحب صفائی کا نام سنتے ہی کچھ برا مان گئے۔ انہوں نے خود اپنی صفائی پیش کی: "ارے صاحب یہ ہمیشہ اتنا صاف نہیں رہتا ہے۔ دراصل ٹائمز اخبار کو ۲۰۰ سال ہو گئے۔ اور کچھ دنوں بعد ملکہ الیزبیتھ ہمارے دفتر میں صد سالہ فنکشن میں تشریف لا رہی ہیں۔ آپ ان کے جانے کے بعد آئیں پھر دیکھیے گا کیا خوب لگتا ہے!"

ٹائمز کے دفتر میں ایک اور بات دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ یہاں کاغذ کے انبار نظر آئے اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ قدرتی بات ہے۔ اخبار کے دفتر میں کاغذ نہیں تو کیا ہاتھی دکھائی دیں گے ہم بھی یہی سوچتے تھے۔ لیکن تقریباً سات سال پہلے نیویارک ٹائمز کا

دفتر دکھا تھا۔ صاحب یقین مانئے ہم کاغذ
کے دیدار کو ترس گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہر کا
کمپیوٹر کرتا ہے۔ ہر رپورٹر کی میز پر ایک چھو
کمپیوٹر لگا ہوا ہے۔ کیسا کاغذ اور کیسا قلم
رپورٹر اپنی کہانی کمپیوٹر میں ٹائپ کر دیتا ہے
اور وہ کہانی مدیر کے کمپیوٹر میں چلی جاتی ہے
اور اس طرح کمپیوٹر کا صفحہ اخبار کا صفحہ بن جا
ہے۔

ہم نے کہا "قیصر صاحب کاغذ پر ت
ہم بھی لکھتے ہیں"۔ انہوں نے پھر صفائی پیش ک
"دراصل ۷ سال سے یونین کی ہڑتال چل ر
ہے۔ یونین والے کمپیوٹر کو آنے نہیں دے
بہت سے کارکن اس وجہ سے بے روزگار
ہو جائیں گے۔" چلو کہیں تو کمپیوٹر کی ہار ہوئی
یہ انسانی قدر دیکھ کر مسرت ہوئی۔

لندن میں ہم نے ادب اور موسیقی کا خو
لطف اٹھایا۔ ۲ مشہور پینٹرز کی نمائش
چل رہی تھی۔ ایک رینوا کی دوسری شاگال
رینوا پچھلی صدی کا مشہور فرانسیسی آرٹ
تھا۔ دنیا بھر سے اس کی پینٹنگ جمع کر
لندن کے ایک میوزیم میں اکٹھی کی گئی تھی
اس کی پینٹنگ میں فرانس کی زندگی کے ہر پہ
کے نقوش ملتے ہیں۔

شاگال بھی عجیب انسان ہیں۔ و
وقت ۹۰ سال کے ہیں اور شاید دنیا کے
مشہور ترین آرٹسٹوں میں سب سے زیا
عمر کے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تصویروں
اس صدی کے مختلف نقشے ملتے ہیں۔

اینوا کی نمائش کی دو دلکش تصویریں

دنیا کے پہلے ماڈرن آرٹسٹ بھی مانے جاتے ہیں۔ ان نمائشوں میں ایک نئی بات دیکھی۔ گائیڈ کی جگہ یہاں بھی مشین نے لے لی ہم کو ایک کیسٹ ریکارڈر اور ہیڈ فون دے دیا گیا۔ ہم نے اسے اپنے کانوں میں فٹ کر لیا۔ اس طرح ہر تصویر کی معلومات ملتی رہی۔

ایک شام انگریزی کلاسیکل موسیقی سننے گئے۔ اس موسیقی کو سننے میں ہمیں بہت سرور ملا۔ لیکن ہمیں یہاں بھی کسی کمپیوٹر کا دخل لگا۔

رائل فیسٹیول ہال میں ہم لندن فل ہارمونک آرکسٹرا سن رہے تھے۔ بینڈ میں کوئی ڈیڑھ سو موسیقار تھے۔ چند لمحوں کے لئے وہ سب خاموش اور ٹھہرے ہوئے نظر آئے لیکن کانوں میں سُریلی آواز گونجتی رہی۔ پہلے سوچا کانوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ پھر ذرا غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ واقعی ایک ہاتھ بھی نہیں ہل رہا ہے۔ مگر آواز برابر آ رہی ہے ہم نے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا یہ میوزک کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ انہوں نے ہمیں نادان سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ یہ کمپیوٹرائزڈ بیٹ ہے ہم یہ پوچھنے ہی والے تھے کہ صاحب کلاسیکل موسیقی میں کمپیوٹر کا کیسا دخل۔ لیکن اپنی زبان کو لگام دینے ہی میں بہتری لگی۔ کہیں کالا رنگ اور بڑی بات نہ ہو جائے۔

ایک دن دھوپ نکلی موسم تو بدلا ہی ساتھ ساتھ لوگوں کا رویہ بھی بدل گیا صبح سے فون آنے شروع ہو گئے۔ لوگ دھوپ کی مبارک باد اللہ میاں کے بجائے ہمیں دینے لگے۔ بھلا بتائیے! ایک دھوپ کیا نکلی۔ سب دوستوں کو دوستی کا فرض اور قرضے یاد آ گئے۔ سارے کے سارے باہر گھومنے جانے کو تیار۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں ـــ ہم نے جلدی سے دو نفل شکرانے کے پڑھے اور ساتھ ہو لئے۔ اوپر والے کا شکر کیا کہ ایک دن تو دھوپ ملی۔ اور انڈر گراؤنڈ ٹرینوں سے چھٹکارا ملا ہم سچ بات بتا رہے ہیں۔ ہمیں زمین کے نیچے چلنا ذرا اچھا نہیں لگتا۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ ایک گھبراہٹ کی کیفیت رہتی ہے۔ دراصل ابو جان کی دی ہوئی نصیحت یاد آ گئی ـــ "بیٹی اپنے پاؤں ہمیشہ زمین پر رکھنا۔" اس پر تو مجبوراً عمل نہ کر سکے۔ مگر ان کی دوسری نصیحت پر کچھ ضرورت سے زیادہ عمل کیا۔ کبھی پاؤں چادر سے باہر نہ پھیلایا۔ حالانکہ چادریں ہم اپنے اوپر آٹھ دس ڈال کر سوتے تھے۔ لیکن اللہ گواہ ہے ایک چادر سے بھی ایک چھنگلی تک نہ نکالی۔ مستقل گٹھڑی بنے سکڑتے رہے۔

ابّا تو یاد آئے ہی مگر اس سفر میں نانی بھی یاد آ گئیں۔ دروازے خود بخود کھلتے بند ہوتے رہے۔ ٹکٹ مشین سے خریدا کافی اور سینڈوچ بھی حد تو یہ ہے کہ ایک دن گھر کا راستہ بھول گئے۔ تو مجبوراً مشین سے ہی دریافت کیا۔

جیسے جیسے نانی کی پیش گوئیاں صحیح نکلیں آنے والے وقت سے ڈر لگتا گیا۔ اللہ بخشے میری نانی کو ان کا ایک جملہ ستاتا رہا "یہ قربِ قیامت ہے۔ در و دیوار سے گانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کا پہناوا پہن رہے ہیں۔"

تم ٹھیک کہتی تھیں اماں واقعی عجب زمانہ ہے۔ آج کا انسان مشینوں کے بارے میں زیادہ جانتا ہے۔ انسانی احساس کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ اماں اب تو اصلی

نپولین کے مجسمے کے ساتھ چچا جان (الیاس دہلوی)

مرحومہ مسز اندرا گاندھی کے مجسمے کے ساتھ [illegible]

زیں بالکل منظر ہو گئیں — کیا بتاؤں ان میں اب نقل بننے لگے۔ اس دھوپ [illegible] دن ہم میڈم ٹوساڈ گئے وہاں اندرا گاندھی کے ساتھ فوٹو کھنچوائے۔ [illegible] ہال میں ایک سفید لٹ لگائے [illegible] کا مجسمہ ہال کی زینت بنا ہوا ہے۔ ہم نے [illegible] اندرا گاندھی کے ساتھ اپنا فوٹو بھی [illegible] کھنچوا لیا۔ اور ان کے ساتھ اپنے قریبی مراسم کی قسمیں کھانے لگے۔

میڈم ٹوساڈ ایک مشہور ویکس میوزیم ہے۔ دنیا کی نامی گرامی ہستیاں یہاں موم میں ڈھل چکی ہیں۔ ان مورتیوں کو صرف بولنے کی دیر ہے۔ بعض مورتیاں مشین کے ذریعہ سانس لے کر سینہ بھی پھلاتی ہیں۔ اس میوزیم میں ہمارے [illegible] بھی ساتھ تھے۔ عمرہ کر کے آئے تھے۔ ان کے سر کے کئی بار استرا بھی پھر چکے تھے۔ اوپر سے ایک بالوں والا کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہم اپنے چچا کو نہ صرف بے حد پیار کرتے

ہیں بلکہ ان کی عزت بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ وہ اس وقت کیا لگ رہے ہوں گے۔ انہیں یہاں ولیم شیکسپیئر کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ ہم نے ان کو سمجھایا کہ وہ بھی شیکسپیئر یا نپولین سے کم نہیں۔ ہم ان کی تصویر کھینچ ہی رہے تھے کہ کچھ عورتوں نے بھی ان کی تصویر [illegible] [illegible] سے پہلے تو وہ عورتیں حیرت زدہ رہ گئیں۔

وہاں سے نکلے تو ہمارے دوستوں نے کہا۔ کراؤن جیولز دیکھنے چلتے ہیں لیکن ہم نے انگریزوں کے یہ شاہی زیورات دیکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ ہم کئی بار لندن جا چکے ہیں ہم نے سب کچھ دیکھا لیکن آج تک یہ زیورات دیکھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ ہندوستان سے لوٹے ہوئے زیورات دیکھ کر ہم یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں گے۔

لندن میں ہماری ملاقات پاکستانی ادیب مشتاق احمد یوسفی سے بھی ہوئی۔

گزشتہ سال [illegible]
[illegible]
انکی رائے پوچھی تو ہم نے [illegible] کا غلط اور بے تحاشا استعمال [illegible] ہوتا ہے۔ خاص طور سے اشتہارات میں یہاں تک کہ ایک اشتہار دیکھا کہ ایک عورت کے منہ پر شیونگ کریم اور ہاتھ میں ریزر ہے یہ کسی شیونگ کریم کا اشتہار تھا۔ ہماری نظر میں مغربی عورت کو آزادی دے کر مرد اس کا غلط استعمال کر رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب عورت چاہے وہ کہیں کی بھی ہو اشتہارات کے لئے استعمال کی جائے گی وہ صحیح معنی میں آزاد نہیں ہے۔ ایک آزاد خیال اور ترقی

اینوا کی نمائش کی دو دل کش تصویریں

دنیا کے پہلے ماڈرن آرٹسٹ بھی مانے جاتے ہیں۔ ان نمائشوں میں ایک نئی بات دیکھی۔ گائیڈ کی جگہ یہاں بھی مشین نے لے لی ہم کو ایک کیسٹ ریکارڈر اور ہیڈ فون دے دیا گیا۔ ہم نے اسے اپنے کانوں میں فٹ کرلیا۔ اس طرح ہر تصویر کی معلومات ملتی رہی۔

ایک شام انگریزی کلاسیکل موسیقی سُننے گئے۔ اس موسیقی کو سُننے میں ہمیں بہت سرُور ملا۔ لیکن ہمیں یہاں بھی کسی کمپیوٹر کا دخل لگا۔

رائل فیسٹیول ہال میں ہم لندن فیل ہارمونک آرکسٹرا سُن رہے تھے۔ بینڈ میں کوئی ڈیڑھ سو موسیقار تھے۔ چند لمحوں کے لئے وہ سب خاموش اور ٹھہرے ہوئے نظر آئے لیکن کانوں میں سُریلی آواز گونجتی رہی پہلے سوچا کانوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ پھر ذرا غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ واقعی ایک ہاتھ بھی نہیں ہل رہا ہے — مگر آواز برابر آرہی ہے ہم نے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پُوچھا یہ میوزک کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟ انہوں نے ہمیں نادان سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ یہ کمپیوٹرز بیٹ ہے ہم یہ پوچھنے ہی والے تھے کہ صاحب کلاسیکل موسیقی میں کمپیوٹر کا کیا دخل۔ لیکن اپنی زبان کو لگام دینے ہی میں بہتری لگی۔ کہیں کالا رنگ اور بڑی بات نہ ہو جائے۔

ایک دن دُھوپ نکلی موسم تو بدلا ہی ساتھ ساتھ لوگوں کا رویہ بھی بدل گیا۔ صبح سے فون آنے شروع ہو گئے۔ لوگ دُھوپ کی مبارک باد اللہ میاں کے بجائے ہمیں دینے لگے۔ بھلا بتائیے! ایک دُھوپ کیا نکلی۔ سب دوستوں کو دوستی کا فرض اور قرضے یاد آگئے سارے کے سارے باہر گھومنے جانے کو تیار۔ اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں — ہم نے

جلدی سے دو نفل شکرانے کے پڑھے اور ساتھ ہو لئے۔ اُوپر والے کا شکر کیا کہ ایک [illegible] ملی۔ انڈر گراؤنڈ ٹرینوں سے چھٹکارا ملا ہم سچ بات بتا رہے ہیں۔ ہمیں زمین کے نیچے چلنا ذرا اچھا نہیں لگتا۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ ایک گھبراہٹ کی کیفیت رہتی ہے۔ دراصل ابّو جان کی دی ہوئی نصیحت یاد آگئی — "بیٹی اپنے پاؤں ہمیشہ زمین پر رکھنا۔" اس پر تو مجبوراً عمل نہ کر سکے۔ مگر ان کی دوسری نصیحت پر کچھ ضرورت سے زیادہ عمل کیا۔ کبھی پاؤں چادر سے باہر نہ پھیلایا۔ حالانکہ چادریں ہم اپنے اوپر آٹھ دس ڈال کر سوتے تھے۔ لیکن اللہ گواہ ہے ایک چادر سے بھی ایک چھنگلی تک نہ نکالی۔ مستقل گٹھری بنے سکڑتے رہے۔

ابا تو یاد آئے ہی مگر اس سفر میں نانی بھی یاد آگئیں۔ دروازے خود بخود کھلتے بند ہوتے رہے۔ ٹکٹ مشینوں سے خریدا کافی اور سینڈوچ بھی حد تو یہ ہے کہ ایک دن گھر کا راستہ بھول گئے۔ تو مجبوراً مشین سے ہی دریافت کیا۔

جیسے جیسے نانی کی پیش گوئیاں صحیح نکلیں آنے والے وقت سے ڈر لگتا گیا۔ اللہ بخشے میری نانی کو ان کا ایک جملہ ستاتا رہا "یہ قُربِ قیامت ہے۔ در و دیوار سے گانے کی آوازیں آرہی ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کا پہناوا پہن رہے ہیں۔"

تم ٹھیک کہتی تھیں اماں واقعی عجب زمانہ ہے۔ آج کا انسان مشینوں کے بارے میں زیادہ جانتا ہے۔ انسانی احساس کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ اماں اب تو اصلی

نپولین کے مجسمے کے ساتھ چچاجان (الیاس دہلوی)

مرحوم مسز اندرا گاندھی کے مجسمے کے ساتھ سعدیہ دہلوی

زیں بالکل منقا ہوگئیں — کیا بتاؤں
سان بھی اب نقلی بننے لگے۔ اس دھوپ
لے دن ہم میڈم ٹوساڈ گئے وہاں گاندھی جی
ر اندرا گاندھی کے ساتھ فوٹو کھنچوائے۔
پنے کالے بالوں میں ایک سفید لٹ لگائے
ن کا مجسمہ ہال کی زینت بنا ہوا ہے ہم نے
ندرا گاندھی کے ساتھ اپنا فوٹو بیڈ روم میں
گالیا۔ اور ان کے ساتھ اپنے قریبی مراسم
ل قسمیں کھانے لگے۔

میڈم ٹوساڈ ایک مشہور ویکس میوزیم ہے۔
نیا کی نامی گرامی ہستیاں یہاں موم میں ڈھل چکی
یں۔ ان مورتیوں کو صرف بولنے کی دیر ہے۔
بعض مورتیاں مشین کے ذریعہ سانس لے کر
سینہ بھی پھلاتی ہیں۔ اس میوزیم میں ہمارے
چا بھی ساتھ تھے۔ عمرہ کرکے آئے تھے۔
گنجے سر پر کئی بار استرا بھی پھروا چکے تھے۔
اوپر سے ایک بالوں والا کوٹ پہنے ہوئے
تھے۔ ہم اپنے چچا کو نہ صرف بے حد پیار کرتے
ہیں بلکہ ان کی عزت بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ
خود ہی سمجھ لیجئے کہ وہ اس وقت کیا لگ رہے
ہوں گے۔ انہیں یہاں ولیم شیکسپیئر کے ساتھ
کھڑا کر دیا۔ ہم نے ان کو کہا کہ وہ کسی شیکسپیئر
یا نپولین سے کم نہیں۔ ہم ان کی تصویر کھینچ ہی
رہے تھے کہ کچھ عورتوں نے بھی ان کی تصویریں
اتارنا شروع کر دیں۔ جب چچا جان اپنی جگہ
سے ہلے تو وہ عورتیں حیرت زدہ رہ گئیں۔

وہاں سے نکلے تو ہمارے دوستوں
نے کہا۔ کراؤن جیولز دیکھنے چلتے ہیں لیکن
ہم نے انگریزوں کے یہ شاہی زیورات دیکھنے
سے صاف انکار کر دیا۔ ہم کئی بار لندن جا چکے
ہیں ہم نے سب کچھ دیکھا لیکن آج تک یہ
زیورات دیکھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ ہندوستان
سے لوٹے ہوئے زیورات دیکھ کر ہم یہ صدمہ
برداشت نہ کر سکیں گے۔

لندن میں ہماری ملاقات پاکستانی
ادیب مشتاق احمد یوسفی سے بھی ہوئی۔
گزشتہ سال ہم ان کی تینوں کتابیں پڑھ چکے
تھے۔ مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ ہم نے 'بانو'
میں لکھنے کے لئے ان سے وعدہ لے لیا۔ 'بانو'
پڑھنے والی بہنوں اور ان کے مسائل کا ذکر بھی
بی بی سی کے ریڈیو اور ٹی وی پر بھی آیا۔ دونوں
جگہ بانو کی مدیرہ کی حیثیت سے ہمارا انٹرویو
لیا گیا۔ ہم سے مغربی عورت کے بارے میں
اپنی رائے پوچھی گئی ہم نے کہا۔ کہ مغربی عورت
کا غلط اور بے تحاشا استعمال دیکھ کر افسوس
ہوتا ہے۔ خاص طور سے اشتہارات میں۔
یہاں تک کہ ایک اشتہار دیکھا کہ ایک عورت
کے منہ پر شیونگ کریم اور ہاتھ میں ریزر ہے
یہ کسی شیونگ کریم کا اشتہار تھا۔ ہماری
نظر میں مغربی عورت کو آزادی دے کر مرد اس
کا غلط استعمال کر رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک
عورت چاہے وہ کہیں کی بھی ہو اشتہارات
کے لئے استعمال کی جائے گی وہ صحیح معنی
میں آزاد نہیں ہے۔ ایک آزاد خیال اور ترقی

پیرس کا مشہور برج ایفل

پسند عورت وہ ہے جو اچھے بُرے کی سمجھ رکھتی ہو۔ جو اپنی زندگی کے فیصلے سوچ سمجھ کر کرے اور ان پر عمل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

لندن سے ہم پیرس گئے۔ چند سال پہلے بھی ہم وہاں گئے تھے اور پھر وہاں نہ جانے کی قسم کھالی تھی لیکن زندگی میں بہت سی قسموں کی طرح یہ قسم بھی خوش فہمی میں توڑ دی۔ ایک بار پھر یہ قسم کھانی پڑی۔ افسوس اس لئے کہ پیرس ایک تاریخی اور خوب صورت شہر ہے۔ قسم اس لئے کھانی پڑی کہ وہاں کے لوگ بے حد متعصب ہیں۔ اور کسی غیر ملکی کو زیادہ دن تک ٹِکنے نہیں دیتے۔ ویسے تو لندن میں بھی بہت تعصب ہے۔ ہر مہینہ کسی ہندوستانی کا گھر جلا دیتے ہیں۔ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو سڑکوں پر اور ٹرینوں میں بھی گھونٹ لیتے ہیں۔ لیکن ہمیں کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا۔ اور جہاں تک گالیوں کا تعلق ہے۔ انگریز لکھنؤ والوں کی طرح گالیاں مخمل میں لپیٹ کر دیتے ہیں۔

لیکن وہ ہماری موٹی کھال پر اتنی نہ چبھیں — ہم فرانس میں قدم قدم پر دھکے کھاتے اور سوچتے: کاش نانی اماں کا کہنا مان کر دودھ پیتے رہتے

لور میوزیم میں ایک مصری مجسمہ

تو آج رنگ کچھ گورا ہوتا۔ چائے کالی پی پی کر تو بچا کھچا رنگ بھی رخصت ہو گیا۔ اور پھر ہمیں فرانسیسی زبان بھی نہیں آتی جس انگریزی زبان کو پڑھ کر ہم نے ایورسٹ کی چوٹی پر جھنڈا گاڑا تھا۔ وہ ذرا کام نہ آئی۔ نانی اماں اور فرانسیسیوں کے خیالات کتنے ملتے ہیں۔ دونوں کی ایک ہی رٹ "انگریز کی چھی دہن" انگریزی جانتے ہوئے بھی کوئی فرانسیسی انگریزی نہیں بولے گا۔ ان کا یہ لسانی غرور دیکھ کر کچھ رشک سا آیا۔ ہم لوگ تو اب شکریہ بھی تھینک یو کی شکل میں قبول کر لیتے ہیں۔ اور اماں تو مرتے دم تک ہر مرعوب صورت شخص کو کہتی تھیں "یہ بالکل انگریز لگ رہا ہے۔" خیر چھوڑیئے اماں کی باتیں۔

ادھر ہم فرانس والوں کی کچھ خوبیاں بیان کر رہے تھے۔ ہوٹل میں صبح کی چائے پی کر جو نکلے تو رات ہو جاتی کھانے کی تلاش میں۔ ہم سُور کا گوشت نہیں کھاتے اب ہم یہ بات دُکان دار کو کیسے سمجھائیں۔ ہم ویجی ٹیبل کہتے اور وہ "پاپے پاپے"۔ یہ فقرہ سُنتے سنتے رات ہو جاتی۔ "پاپے" کا مطلب ہم نے ڈکشنری میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ آگے چلے جاؤ۔ اب خالی پیٹ میں مونالیزا بھی اچھی نہیں لگتی۔ آخر ہار کر ایک فرنچ بریڈ اور پنیر کی ٹکیاں خرید کر مونالیزا کی مسکراہٹ دیکھنے چلے۔ ان خاتون کا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگا۔ ادھر ہم نے دل میں کہا تو آپ ہیں مونالیزا — تصویر کی کشش میں ہم وقتی طور پر سب کچھ بھول گئے۔ مونالیزا کا کمال یہ ہے کہ آپ چاہے انہیں کسی بھی زاویہ سے دیکھیں وہ آپ سے آنکھ ملاتی رہیں گی۔ ان کی مسکراہٹ میں کچھ طنز ہے۔ کچھ نخرے جیسی

شیطانی، کچھ لیونارڈو دا ونچی نے
پہلی بار ایک تصویر میں رنگوں سے حرکت پیدا
کی۔ تصویر کی مقبولیت کا راز مونالیزا کی آنکھیں
اور مسکراہٹ ہے۔ پھر آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا
کہ لیڈی مونالیزا دراصل کون خاتون تھیں۔

مونالیزا کے علاوہ پیرس کے لوور میوزیم میں
پینٹنگز اور تاریخی مورتیوں کا خزانہ ہے کہ کوئی اطمینان
سے دیکھنا چاہے تو ہفتوں لگ جائیں۔ یہاں
جتنا لطف ہم لینا چاہتے تھے۔ وہ نہ لے سکے۔
ایک لفظ بھی انگریزی میں نہیں لکھا ہوا تھا۔
فرانس ایک ایسا ملک ہے جہاں ٹورسٹ
کے لئے بھی معلومات صرف فرانسیسی میں ہی
لکھی ہوتی ہیں۔ انٹرنیشنل ریلوے اسٹیشن
پر اپنا پلیٹ فارم پوچھا۔ تو اطلاعات کی کھڑکی
پر بیٹھی خاتون نے منہ پھیلا لیا۔ صرف ہمارے
چہرے پر تھوکنے کی دیر تھی۔ نا بابا۔ اپنی عزت
سب کو پیاری ہوتی ہے۔ چاہے ہمارا رنگ
کالا ہی کیوں نہ ہو۔ اور پھر کم بختوں نے چین سے
بیٹھ کر کافی بھی پینے نہ دی۔ فرانس پورٹ کے
مطابق ہم نے اپنا بجٹ بنا کر کافی آرڈر کی۔
کھڑے ہو کر تو ہم پانی بھی نہیں پیتے — جب تک
اماں کی بتائی ہوئی بات اور شریعت کے مطابق
بیٹھ کر بسم اللہ نہ پڑھ لیں۔ مجال ہے ایک
گھونٹ جو حلق سے اتر جائے۔ تو ہم نے یہی
کیا۔ ویٹر بل لایا تو ہم اچھل پڑے۔ فرانس
پورٹ سے زیادہ تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ بیٹھنے کا
ٹیکس تھا۔ ہم دیر تک یہ سوچتے رہے کہ آخر
ہم اکیلے کیوں بیٹھے ہیں۔ اور باقی لوگ کھڑے
کیوں ہیں۔ بات سمجھ میں فوراً آ گئی اور سوچا۔
اگلی بار ہم بھی کھڑے ہو کر کافی پئیں گے۔ بسم اللہ
سمجھنے پر تو ہمیں کوئی نہیں روک سکتا تھا

قرطبہ میں خلیفہ کے محل کا ایک حصہ۔ سامنے حوض کے ٹوٹے ہوئے پتھروں پر منقش آیات قرآنی ہیں

لیکن ٹھنڈ کے مارے ہم اس دن دوبارہ کافی
پینے گئے تو کچھ ٹھنڈک بھی پہنچے۔ قسم سے
کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ سوچا دو چار روپے
بچا کر کون سی عمارتیں کھڑی کر دیں گے —
اب کی بار جو بل آیا تو ہم اتنا اچھلے کہ گزشتہ
اولمپک میں میڈل جیت سکتے تھے — بل
پہلے سے بھی بڑھ کر تھا۔ معلوم ہوا کہ ہم سب
فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے۔ لہٰذا اس منظر کا
ٹیکس تھا — ہم جان گئے کہ سڑک پر
بارش ہوتی ضرور دیکھی تھی لیکن ہمیں اپنے
نظارہ دیکھنے پر لئے ٹیکس کے بارے میں
بیشتر معلومات ہوتی تو اندر کرسی پر لپک لیتے۔
ہمیں بتایا گیا کہ ہم زیادہ پیسے والے حصے کی
باؤنڈری لائن پر بیٹھے ہیں — پھر یہ افسوس
ہوتا رہا کہ کم از کم اتنی مہنگی بارش کو ذرا غور سے
دیکھ لیتے یا چند قطرے جمع کر کے بطور تبرک
ہندوستان لے آتے۔ اس کے بعد اگر ہمیں
چھینک بھی آتی تو اسے دبا کر رخصت کر دیتے
کہ کہیں اس پر بھی ٹیکس نہ لگ جائے۔

پیرس چھوڑا تو فرانسیسی سے پیچھا چھڑایا۔ ہم
قرطبہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلے تو میڈرڈ اسپین
کی راجدھانی گئے یہاں کے اسٹیشن پر ایک
ہوٹل کا مالک کھڑا تھا جو اپنی موٹر میں ہوٹل لے گیا
ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہم سے کہا "اگر ہوٹل
پسند نہ آیا تو کوئی بات نہیں"۔ زبان نہ جاننے کی
پریشانی سے نجات کہ ان انگریزی لفظوں کی
چھاؤں میں ہم اس کے ساتھ ہو لئے۔ ہوٹل تو
پسند آیا ہی۔ اسپین کے سب ہی لوگ پسند
آئے۔ یہاں گھومتے پھرتے ہوئے کبھی اپنے آپ
کو اجنبی نہ محسوس کیا۔ یقین آ گیا کہ انسانیت کی
زبان ابھی موجود ہے۔ سینڈوچ کے لئے
اشارہ کیا تو سینڈوچ کھول کر دکھا دئے کہ
اس میں کیا تھا۔ راستہ پوچھیں تو وہ اشاروں
سے سمجھا دیں۔

میڈرڈ ایک پرانا اور نئے شہر کا سنگم
ہے۔ پرانی عمارتوں کے ساتھ ساتھ کھڑی
ماڈرن عمارتیں موجود ہیں۔ چوراہوں پر پرانے
سنگ مرمر کے فوارے چلتے ہیں، کھانا پینا
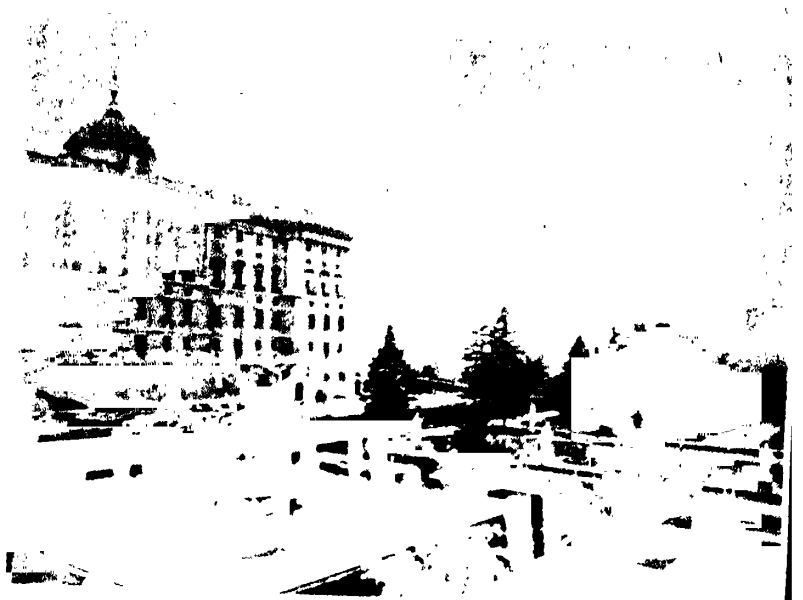
میڈرڈ کا شاہی محل جو اب تک آباد ہے

اور رہنا باقی یورپ کے مقابلے میں سستا ہے۔ عرب قوم یہاں ورثے میں کافی کچھ چھوڑ گئی ہے۔ اس میں خوب صورتی اور سستی دونوں ہی شامل ہیں۔ جس طرح عرب میں قیلولہ ہوتا ہے اسی طرح اسپین کے لوگ سیانتا کے عادی ہیں۔ لڑکیاں یہاں بے حد خوب صورت ہیں۔ لمبی کالی زلفیں اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اُن کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔

میڈرڈ سے قرطبہ گئے اور سالہا سال کا ارمان آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ مسجد قرطبہ جو ایک وقت مسلمانوں کی شان تھی دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور غم بھی۔ سونے کے حروف سے قرآن مجید کی آیتیں دیواروں پر لکھی ہوئی تھیں۔ موجودہ شکستہ حالی دیکھ کر رنج ہوا۔ مسجد قرطبہ ایک کونے میں ہی رہ گئی ہے۔ چاروں طرف گرجے ہیں جو استعمال بھی ہوتے ہیں لیکن نمازی نہ رہے۔

قرطبہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا شہر ہے۔ کوئی اونچی عمارت نظر آئی۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں اور ہر طرف نارنگیوں کے پیڑ ہیں۔ ہمیں سارے یورپ میں سب سے زیادہ یہی شہر پسند آیا۔ یہاں اسلامی تاریخ کی وجہ سے اور بھی دلچسپیاں ہیں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہاں کا ہر کھنڈر ہم سے کچھ باتیں کر رہا ہو۔ کبھی یہ سوچتے کہ یہ وہ شہر ہے جس نے دنیا کو اتنا علم دیا اور دنیا کے سب ہی دانش ور دل کے خیالات بدلے۔ کہیں علامہ اقبال کا شعر یاد آیا ؎

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نُور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طُور

مدینہ الزہرا بھی گئے جو قرطبہ کے چاروں طرف سبز پہاڑیوں کے بیچ ہے۔ یہ سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ کبھی یہ اسلامی خلفاء کی رہائش گاہ تھی۔ اس زمانے میں وہاں زمین کے نیچے سے ایک سُرنگ بھی شہر تک نکلتی تھی۔ رہائش گاہ سے نظارہ تو بس سبحان اللہ۔ دیکھ کر طبیعت تر و تازہ ہو گئی اور وہاں پھر جانے کا ارادہ کیا۔ یہ رہائش گاہ بھی بہت شکستہ حال تھی۔ ہر طرف ٹوٹی ہوئی سنگِ مرمر کی آئینیں نظر آ رہی تھیں۔ قرطبہ کے لوگ اپنے عربی آباؤ اجداد کی طرح بے حد مہمان نواز ہوتے ہیں۔ اسٹیشن پر ہم کافی ہاؤس میں چائے پی رہے تھے وہاں کے مالک نے ہم سے گفتگو شروع کی اور ضد کی کہ وہ ہمیں قرطبہ کی سیر کرائے گا۔ ہم نے پہلے تو اس کو کچھ شک کی نظر سے دیکھا۔ آج کے زمانے میں کوئی اگر زیادہ اچھائی سے پیش آئے تو ہمیں یقین نہیں آتا۔ جس طرح آج کل آپ کسی شخص سے کہیں کہ وہ سیدھا اور اچھی طبیعت کا ہے تو وہ خفا ہو جاتا ہے اور اپنی مکاری اور چالاکی کے ثبوت پیش کرنے لگتا ہے۔ صرف ہمیں ہی نہیں چچا جان کو بھی اتنی شرافت پر شک ہوا۔ انہوں نے ہم سے سرگوشی کی کہیں یہ پیسے تو نہیں لے گا۔ ہم نے ان کو سمجھایا کہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا ہوا کم از کم موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک گائیڈ بولا تو مل ہی جائے گا۔ تو صاحب وہ رات بھر کا جاگا ہوا شخص ہمیں اپنی موٹر میں بٹھا کر قرطبہ کی سیر کرانے لے گیا۔ خلفاء کی رہائش گاہ بھی ان ہی صاحب نے دکھائی۔ اور ہمیں رخصت کرنے سے پہلے دوسری پہاڑی پر ایک ریسٹورنٹ میں چائے بھی پلائی وہ بھی اپنے ہی خرچہ پر۔ یہ مہمان نوازی دیکھ کر تعجب کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ قرطبہ سے ہم ریل میں اسپین کے دوسرے شہر بارسلونا کی طرف روانہ ہوئے۔ قرطبہ میں چلتے چلتے تھک گئے تھے کہ بڑی ہی مزے دار نیند آئی لیکن صبح جو اُٹھے تو ایسا ہوش آیا کہ پھر بے ہوش ہونے کو جی چاہا۔ پرس غائب اور کوٹ کی جیب میں سے پاسپورٹ بھی۔ یہ سوچ کر چلے تھے کہ بارسلونا سے رات ہی کو سوئیٹزرلینڈ کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن اب تو نہ پاسپورٹ نہ پیسہ۔ یہ دیکھ کر جان نکل گئی
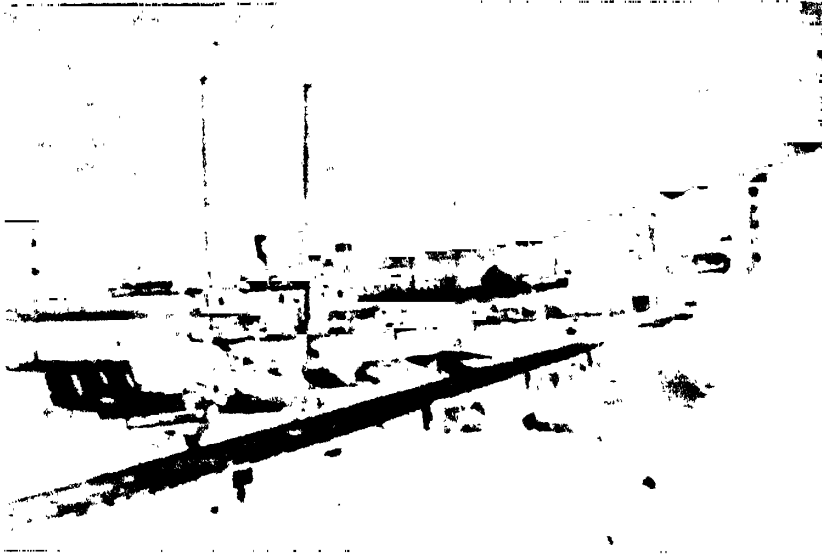
سوئٹزرلینڈ میں جنیوا کا ایک منظر

ن اٹکی ہوئی جان اور ہوائی جہاز کی واپسی
ٹکٹ کے لئے اللہ کا شکر ادا کیا۔ سوچا
ہی میں بہتری ہوگی۔ بقول نانی اماں کے
یں مل گئیں لیکن سوال یہ تھا کہ اب کریں کیا۔
سے زبان کا مسئلہ۔ ساری ٹرین چھان ماری
ں انگریزی میں بات کرنے والا نہ ملا۔ بہرحال
سے بات ہوئی ہی تو یہ سمجھ میں آیا کہ بارسلونا
پولیس رپورٹ کرنی ہوگی۔ زندگی میں پہلی بار
سپورٹ کی اہمیت کا احساس ہوا کیونکہ
ی ہوٹل والا اس کے بغیر رکھنے کو تیار نہیں تھا۔
گی میں پہلی بار بس کرنے کی مجبوریاں اپنا کر
یں۔ اللہ کو یاد کر کے اپنی قسمت آزمانے
ٹیشن کے باہر سڑک پہ نکلے۔ اوپر والے
یاد ہی کیا تھا کہ اس نے مدد فرمائی۔ ایک
دستانی کی دکان کھلی نظر آئی تو اس سے
ستہ سمجھنے کے لئے اندر گئے۔ اپنی ملی ہوئی
ں کا ذکر بھی کیا۔ وہ فوراً اپنے گھر لے گیا اور ہمیں
ک کے دھکوں سے بچا لیا۔ وہاں سے پھر
سرے دن ہم میڈرڈ واپس گئے نئے پاسپورٹ
نے۔ رات بھر ریل میں گزاری لٹانے کے لئے
باقی نہ رہا۔ تو اطمینان سے سو گئے۔ وہاں اپنے
ارت خانے نے بڑی مدد کی اور فوراً ہی نئے
سپورٹ دے دئے۔ سنا تھا کہ چور اٹلی
ں ہوتے ہیں لیکن صاحب ہم تو اسپین میں
گئے۔ دراصل ہم لوگ چہرے سے ہی غیر ملکی
تے ہیں۔ اور پھر شیطان تو ہر جگہ موجود ہے۔
ں کم بخت کو کہیں کے ویزا کی ضرورت نہیں
ی۔

اسپین سے ہم جنیوا کے لئے

انہ ہوگئے۔ اس سفر میں اتنا خوب صورت
ں کا راستہ پہلی بار دیکھا۔ برفیلے پہاڑوں

کے بیچ میلوں چلتے رہے۔ فرانس اور سوئٹزر
لینڈ کا جو حصہ تقریباً ملا ہوا ہے حسین ترین ہے۔
سے شہر میں پہاڑ، سبزہ، برف سب ہی ایک
ساتھ نظر آتے ہیں۔ جنیوا کی خوب صورتی کے
بارے میں جو کچھ سنا تھا سچ ہی نکلا لیکن
ہم ابھی بھی کشمیر کے بارے میں کہیں گے
اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است
روم پہنچے تو وہاں کے کھنڈر دیکھے۔ یہاں کھانے
پینے اور زبان کی اتنی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کی
وجہ ہماری میزبان مسز شاہد مہدی تھیں۔ ان کے
شوہر یو۔ این۔ او کے فوڈ آرگنائزیشن میں ہندوستانی
نمائندوں میں سے ہیں۔ روم کا تاریخی حصہ شہر کے
بیچ میں ہے۔ یہاں یا تو آپ پیدل چل سکتے ہیں
یا بس لے سکتے ہیں۔ موٹروں کی یہاں اجازت
نہیں۔ یہاں ہزاروں سال پہلے کی عمارتیں دیکھیں
اور اسکول میں پڑھی تاریخ یاد آگئی۔ ہماری
چاچی کا یہاں دل نہ لگا۔ ایک تو ان کو تاریخ میں
دلچسپی نہ تھی۔ اور عمارتوں کی کالک سے ان کا

دل بھی کچھ اداس ہو گیا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں
نہیں آ رہی تھی کہ دنیا کی مشہور ترین فیشن
کی دکانیں باہر سے اتنی سیاہ کیسے ہیں حالانکہ
ہم نے ان کو بہت سمجھایا کہ روم کی یہی قدیمی عمارتیں
دیکھنے دنیا چلی آ رہی ہے۔ دوسرے کرنسی
کا ہزاروں میں حساب کرتے کرتے دماغ خراب
ہو گیا۔ ۲۰۰ لیرے کی چائے اور ڈیڑھ ہزار
لیرے کا سینڈوچ۔ جوتی خریدی تو ۲۵ ہزار
لیرے کی۔ ہمیں تو کچھ اچھا لگا کہ ہمارے
ہندوستانی روپے جو ہر جگہ ڈالر اور پاؤنڈ میں
گھٹ جاتے تھے۔ روم میں ہزاروں میں بدل
گئے۔ سیکڑوں ہزاروں خرچ کر ڈالے کم از کم
کچھ عرصہ تک تو اپنے آپ کو ہم نے رئیس محسوس
کیا۔ یہاں کا مشہور کھانا پیتزا بھی کھایا۔
اللہ کو مانے آدھا کھا کر باقی چڑیوں کو ڈال دیا۔
اتنا بد مزہ کھانا تو شاید ہم نے ہندوستان
میں کبھی نہیں کھایا۔ سارے کچے میدے پر
ٹماٹر کی لیپ لگی ہوئی تھی۔ بس اللہ دیتا رہے
تو صاحب ہمیں اٹلی میں نہ کسی نے لوٹا اور نہ

ہمارے گوڈوں پر کسی نے چٹکیاں بھریں۔ جیسے وہاں کی روایت سنتے آئے ہیں۔

یہ تو تھا ہمارے یورپ کا سفر — ہمیں ہمارا یورپ نہ صرف کچھ ایک۔ جیسا لگنے لگا بلکہ بے حد مہنگا بھی لگا۔ مغربی تہذیب سے دل پہلے ہی اُچاٹ ہو چکا ہے۔ مشرقی اور اسلامی تہذیب کے ہم قائل ہوتے جا رہے ہیں۔

پہلی بار جدہ جانے کا اتفاق ہوا شہر بے حد پسند آیا۔ موڈرن ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں اسلامی تہذیب بھی ملتی ہے۔ یہاں کی سرکار اپنے عوام کے لئے کیا کچھ کرتی ہے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ مثلاً کھانا پینا بے حد سستا ہے۔ ایک ریال میں کوئی پانچ روٹیاں مل جاتی ہیں سرکار کی طرف سے آٹا مفت ملتا ہے۔ بیکری والے اس کو پکانے کے کچھ پیسے لیتے ہیں۔ ایک بات اور جو بے حد اچھی لگی وہ یہ ہے کہ عورت ہونے کے ناطے سڑک پار کرتے ہوئے دائیں بائیں نہیں دیکھنا پڑتا۔ بس گاڑیاں اپنے آپ ہی رُک جاتی ہیں۔ گاڑیوں پر ایک اور بات یاد آئی سعودی عرب میں کوئی ٹریفک لائٹ کا قانون نہیں توڑتا۔ ہمیں بتایا گیا کہ سارے شہر کا ٹریفک کیمروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور کسی ایک غلطی پر ایک ہفتہ جیل ہو سکتی ہے۔ ساتھ میں چالیس ریال روز بھی دینے پڑتے ہیں۔ سعودیہ کے کوئی بھی اصول توڑے نہیں جا سکتے۔ عجیب ہی ملک ہے۔ نہ رشوت چلتی ہے نہ تعلقات۔ سب سے زیادہ خوشی یہاں اسلامی تہذیب دیکھ کر ہوئی۔ عرب اپنے گھر بھی اپنی روایت کے مطابق سجاتے ہیں۔ سُنت کے مطابق نیچے بیٹھنے کا انتظام ہر گھر میں ملتا ہے۔ غیر ملکوں میں چاہے عرب کسی طرح سے بھی پھریں۔ اپنے ملک میں اپنا ہی لباس پہنتے ہیں تمام عورتیں پردہ نشین ہوتی ہیں۔ زیادہ تر بُرقع کالے اور سفید ہوتے ہیں۔ اس بات کی خوشی ہوئی کہ سعودیہ کی تہذیب کے مطابق انگریز عورتیں بھی بُرقع پہنتی ہیں۔ یہاں تو انگریزوں کی حرص میں عمر گزر گئی بس ایک بوٹے کا فرق باقی ہے۔

جدہ میں ہمارے میزبان نامی گرامی شاعر صلاح الدین پرویز تھے۔ شبنم مناروی اور ساشہ فضلی پاکستان کے دو شاعروں سے بھی ملاقات رہی — ہم نے ان سے بھی بانو میں پابندی سے لکھنے کے وعدے لئے۔

یہ تو رہی دنیاداری کی باتیں جو کچھ عرصہ بعد شاید خود بھی یاد نہ رہیں۔ لیکن مدینہ منورہ کا سفر اور خانہ کعبہ کی زیارت کے تصور میں ساری عمر ہی غرق رہیں گے۔ وہاں کے تاثرات کوئی کیا بیان کر سکتا ہے۔ احرام باندھے ہم سیدھے سیدھے جدہ ایرپورٹ سے حرم شریف گئے۔ پہلی بار خانہ کعبہ کی زیارت نصیب ہوئی تو دیکھتے ہی آنکھوں سے پانی ٹپکنے لگا اور ہاتھ کانپ اٹھے۔ زندگی میں پہلی بار عمرہ نصیب ہوا۔ اللہ سے دعا کی کہ ہر مسلمان کو یہ زیارت نصیب ہو — حرم شریف میں برستے ہوئے نور کو لفظوں میں ڈھالنے کا زور ہمارے قلم میں نہیں۔ حجرِ اسود کا کئی بار بوسہ لیا اس کی کشش مقناطیس کی طرح ہے۔ طواف تہجد کے وقت بھی کئے اور دوپہر میں بھی کئے۔ مگر کوئی لمحہ ایسا نہ ملا کہ حجرِ اسود کا بوسہ آسانی سے لے سکیں۔ ایک دن ہم صفائی کے وقت حرم شریف پہنچے تو طواف ذرا دُور سے کیا۔ اس وقت بھی دیکھا کہ حجرِ اسود کا بوسہ صفائی کرنے والے لے رہے تھے۔

مدینہ منورہ کی زیارت تو ہر عاشقِ رسولؐ کا ارمان ہے مکہ میں جلالی کیفیت ملتی ہے اور مدینہ منورہ پہنچتے ہی دل میں سکون اور ہلکا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ بھی زیادہ حلیم و خلیق نظر آئے۔ روضۂ مبارک کی جالیاں چھوڑ کر گھر لوٹنے کو دل نہ چاہا۔ دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ مدینہ ہی میں جان نکلے تا کہ رسول اللہؐ کی قربت حاصل رہے۔ لوٹتے وقت مولانا نیازی کا ایک شعر لبوں پہ آ رہا ہے

ملک الموت میں حاضر ہوں لیکن اتنا کرم
ایک بار اور مدینہ کا سفر ہو جائے ■

"تجھ سے کتنی بار کہا کچھ گھرداری بھی سیکھ ۔ انڈا بھی ڈھنگ سے تلنا نہیں آتا۔ سسرال جائے گی تو ساس نند کو کیسے بھگتے گی؟ تجھ جیسی لڑکیوں کو ہی ساس نندیں جلا کر دھری دے آتی ہیں۔ یہ جو تو فوٹوگرافی سیکھ رہی ہے، یہ کس کام آئے گی؟"

"ارے تما، آپ کو نہیں معلوم، میں نے راکیش سے فوٹوگرافی سیکھ لی ہے۔ اب میں اپنا الگ اسٹوڈیو بجا رہی ہوں۔ تم سمجھتی ہو میں اپنی پاکٹ منی ادھر ادھر اڑا رہی ہوں۔ میں نے راکیش کے پاس والی بلڈنگ میں دو کمروں کا فلیٹ ہائر پرچیز پہ لے لیا ہے، مجھے بنک سے لون جو ملا تھا۔ میں نے سوچا تھا بات جم جائے گی تب بتاؤں گی۔ ایک کمرے میں خود رہوں گی، دوسرے میں اسٹوڈیو بنا رہی ہوں۔"

"تو تم نے کہا بھی نہیں اور فلیٹ لے لیا! اور تو اکیلی وہاں رہے گی اور اسٹوڈیو چلائے گی؟"

> کتنا کہا تم سے چھوٹی عمر میں کر دینا چاہئے لڑکی کا بیاہ، اس کی باتیں سن کر تو میرا جی ہول رہا ہے۔ ساس نندیں کیسے بھگتے گی؟ یہ موُنہہ زوری سسرال میں نہیں چلے گی۔

"اکیلی نہیں، نیلما شیئر کر رہی ہے، پتہ ہے ابھی تو ہم نے کاٹھ کے خالی کھوکھے جوڑ کر بیڈ بنائے ہیں۔ اور چٹائی پر کھادی بھنڈار سے لے کر سوتی قالین کے ٹکڑے سجا دئے ہیں تم دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی۔"

"سن رہے ہو صاحبزادی کی باتیں؟ تم نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔"

"تو بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں؟ لڑکی بالغ ہے۔ ہم اس پر دھونس تھوڑی جما سکتے ہیں۔"

"کون کہتا ہے بالغ ہے؟ سارٹی فکٹ میں تو......"

"ممّا، وہ تو جھوٹا سارٹی فکٹ ہے آپ نے میری عمر کم لکھوا دی تھی۔ میں نے میونسپلٹی سے سچّا سارٹی فکٹ لیا، تب ہی تو فلیٹ ملا، ورنہ کیسے ملتا؟ یہ آپ لوگ ہماری زندگی جھوٹ پر کیوں کھڑی کرتے ہیں؟"

"لڑکے کم عمر لڑکی چاہتے ہیں۔"

"تاکہ دھونس جما سکیں، میں تو اپنے سے چھوٹے لڑکے سے شادی کروں گی۔ بعد میں اسے ٹریننگ کر کے اچھی سی نوکری پر لگاؤں گی۔ نہیں جی، میں اُسے اپنا اسسٹنٹ بناؤں گی۔ بڑا ہینڈسم ہے نرگی، یہ لمبا چھ فٹ کا قد ہوتی۔ ول، فلم میں چلا دوں گی۔ دیوانہ ہے امیتابھ کا۔ مگر میں نے کہہ دیا ہے، کل کلی امیتابھ جیسے چھوکرے جھک مارتے پھرتے ہیں، اگر نقل ہی کرنا ہے تو مارلن برینڈو بنانے جاؤ گے۔

ورنہ ایک دم چھٹی۔"

"کیا وہ لنگوڑا اناتھ ہے؟ کوئی مرا جیتا نہیں ہے؟"

"ہے کیوں نہیں؟ بڑے امیر خاندان کا لڑکا ہے۔ دہلی سے فلم کے چکر میں بھاگ آیا ہے۔ اُس کا چھوٹا بھائی تو اُس سے بھی ایک ایچ لمبا ہی ہوگا۔ وہ بھی بھاگ آیا تھا۔ میں نے کہا، بچو دو سال بعد بی اے کر کے آؤ۔ تب دیکھا جائے گا۔ چھٹیوں میں آتے رہو۔ اس کے امّاں، ابّا روتے پیٹتے آئے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا اس کی مخالفت نہ کرو، ورنہ سائینس سے سمجھاؤ۔ اس کی بہن بھی ساتھ تھی۔ وہ بھی شبانہ اعظمی بنی پھرتی ہے۔ پڑھنے میں پھسڈی دھڑیوں میک اپ۔ میں نے کہہ دیا نا بابا اتنی سی لڑکی۔ ہم کہاں اس کی آیا گیری کریں گے۔ اُتو کی پٹھی کسی رنڈی خانے میں بٹھا دی جائے گی۔"

"تو کون سی بوڑھی ڈھڈو ہے؟"

"ارے میں تایا جی پر گئی ہوں۔ پچھتے ہوئے مارتے خال تھے۔ اسم طرح تک ان سے کانپتے تھے۔"

"تبھی تو ان کا مرتے۔ ان کا انجام بھی تو برا ہوا۔"

"یوں تو تمہارے ماموں بھی ٹی بی میں گھل گھل کر مرے۔ تایا جی ایک بے حد مزدور تھی! عورت۔ اور وہ تو انہیں لے ڈوبی زندگی نہ جانے کتنوں کی روزی روٹی کا سہارا ہوتی ہے۔ ممّی بابی کو گھر میں ڈال کر اس کے چاہنے والوں کی چھٹی کر دی اور وہ جو اُسے لایا تھا چُپ مار سہہ لیتا۔ اچھا ہی ہوا کہ رو رو کر مرنے سے بچ گئے۔"

"اچھا بند کرو یہ بکواس۔ ہم تیری شادی کر رہے ہیں۔ اور اگر چوں چرا کی تو......"

"کاہے کی چوں چرا؟ میں نے اپنی شادی آپ پر چھوڑ دی، کوئی لڑکا ملا؟"

"مل جائے گا۔"

"تو کسی بہانے سے دکھا دیجئے گا۔ کتنا جہیز دے گا؟"

"لڑکا جہیز دیتا ہے کہ لڑکی والے دیوانی ہوئی ہے!"

"ارے واہ! میرا بزنس روز بروز چمک رہا ہے۔ میں کماؤ سپتری ہوں۔ چاہو تو اُسے بھی کہیں اچھی پوسٹ دلا دوں گی۔ بہت جلد پہنچ ہے۔ اگر اچھا جہیز نہ لایا تو اپنے میں ہی لگاؤں گی۔"

"آگ لگے تیرے مونہہ کو۔ اچھا نند کو کیسے بھگتے گی؟"

"ارے میں نہیں، اگر انہوں نے کی تو بس سب کا پتہ کٹ جائے گا۔ نہیں میں تو اپنے سسرال والوں کے بہت کروں گی۔"

"تو کیا ہوم سائنس کے کورس کرو گی؟"

"ہوم سائنس سراسر بکواس!"

"ہاں، تو تو جادو کی چھڑی اور جادو سے تھال سج کر آ جائیں۔"

"اور کیا؟ ٹیلی فون کا نمبر اور گرما گرم پلاؤ، قورمہ، سج گیا

پھر ایک دن سجیلا جوان چند مختلف عمر کے مردوں کے ساتھ آیا۔ اسے اور نیند آنے لگی۔ نیلما نے اسے خوب سجایا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر گہری لال رنگ کی لپ اسٹک لگائی تھی جو اس کی چوڑیوں اور بھاری بھرکم طاؤسی ساڑی سے خوب میل کھا رہی تھی۔

کمینی کا چیک ہمیں نہیں چاہئے، پھاڑ کر پھینک دو۔" شریمتی جی غرائیں۔

"پاگل ہوئی ہو؟ یہ مہینہ تو چل جائے، پھر میں کچھ انتظام کر دوں گا۔ لاؤ، میں واپسی میں کیش کرا لوں گا۔ کہیں کمینی کینسل نہ کردے، یہ تو کل کا پوسٹ کیا ہوا ہے۔ آج تم نے اُسے بے کار ڈانٹا۔"

"تو کیا ارادے ہیں؟ یوں ہی نتھا مبیل چھوڑ دو گے؟"

"اُفوہ! بس تم تو ذرا سی دیر میں جوالامکھی کی طرح پھٹ پڑتی ہو، آخر ہم اس کے ماتا پتا ہیں، وہ ہمیں جرکہ دے سکتی ہے؟ ٹیڑھی انگلی گھی نہیں نکلتا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، یاد ہے وہ بچپن میں بات بات پر ہٹ کرتی تھی، مار سے بھی قابو میں نہیں آتی تھی، پھر بہلا پھسلا کر ہی بات بنتی تھی۔"

"تو کیا اس کے سامنے ہاتھ جوڑیں، ناک رگڑیں؟ اس کے چلن ٹھیک نہیں، میرا تو کلیجہ بیٹھا جاتا ہے۔"

"ٹھنڈے دل سے سوچو۔ آخر ہم اس کے ماتا پتا ہیں۔ وہ ہمیں دشمن سمجھتی ہے، سوچ تو، ڈیڑھ دو ہزار کا بھتّا بیٹھ جائے گا۔ ہم جو جمع جوڑ کر رہے ہیں وہ اسی کے جہیز کے لئے رہے گا۔ ایک ہی بیٹا ہے، سب پورا ہو جائے گا۔ لڑکا انجینئر ہے۔ بڑا مونہہ پھاڑتے ہیں۔ یہ اجگر ایک دفعہ شادی ہو جائے گی اپنے سر سے بلا ٹلے گی۔ سارے کس بل نکل جائیں گے۔ دودھوا منہ ناگن کی طرح بیٹھی ہے سسرال سنبھالنے کو۔ ذرا نرمی سے کام لینا پڑے گا۔"

"تو کیا اس کے پیر پڑنا ہی پڑیں گے؟ میں تو نہیں جاؤں گی، تم ہی بھگتو۔"

"خوب! بفس میں چنگاری ڈال بنا بو الگ کھڑی۔ تم نے لگائی ہے، تم ہی بجھاؤ گی۔"

شریمتی ہاتھوں سے سر کو تھام کر پھوٹ پڑیں۔ اتنے میں گھنٹی بجی۔ موتی کھاٹن چکی پر آٹا پسوانے گئی تھی۔

"کون حرام زادہ آدھمکا؟" جھلا کر شریمتی جی نے دروازہ کھولا اور پھر لوٹی بھینی کی طرح چرنوں میں ماتھا ٹیک دیا۔

سوامی جی نارد منی کے سمان جوگیا وستر میں ہاتھ میں چاندی کی موٹھ کی چھڑی سنبھالے کھڑے تھے۔ دونوں بانہیں پکڑ کر انہیں اٹھایا شاید سر چھاتی سے لگا لیتے مگر شریمان کو شردھا میں ڈوبے اپنی طرح لپکتے دیکھ کر آشیرواد پر ہی اکتفا کی۔

"کیا پھر مہا بھارت ہوئی ہے؟"

"نہیں مہاراج آپ ہی کو پکار رہے تھے۔"

سوا بالشت اونچا دودھ کا گلاس جس میں پستے، بادام اور پیسی ہوئی کیسر گھلی ہوئی تھی سوامی جی چسکیاں لے کر پیتے رہے۔ گلاس کی تہہ میں گھونٹ بھر بچا ہوا دودھ شریمتی جی نے ہتھیلی پر ٹپکایا اور بڑی شردھا سے پی کر ہتھیلی مانگ میں پھیرلی۔

سوامی جی بڑی عقیدت سے آنکھیں میچ ہاتھوں کا پنجہ کسے بیٹھے رہے۔ پھر رامائن کے اس حصّے کا پاٹھ کرنے لگے جہاں سیتا جی اپنے جڑواں بیٹوں کو باپ کی چھایا کے بغیر پالتی ہیں، انہیں بوند بوند ساری کتھا سناتی ہیں کہ انکی پرکشا لے کر بن باس تک۔

دس بج چکے تھے۔ شری مان بار بار گھڑی دیکھ کر پسینے چھوڑ رہے تھے۔ آج اُن کی بہت اہم میٹنگ تھی۔ ٹریفک سے گزر کر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔

آپ نے بھی اپنی اردھنگی کو سمجھاؤ نہیں دیا؟ بیٹی کو گھر سے نکال دیا تو چپکے بیٹھے رہے؟ خیر، بات ایسی نہیں بگڑی ہے کہ ماتا پتا سنبھال نہ سکیں۔ اپنی ہی بچّی ہے "منالاؤ"، "نہ" تھوڑا ہی کر سکے گی۔ پھر ہم دیکھ لیں گے، کبھی وہ روٹھ گئی۔ تم تو نہیں روٹھی ہو۔ ساتھ آنے میں آنا کانی کرے تو وہیں رہ پڑو۔ کیا دھکّے مار کر نکال دے گی؟" سوامی جی نیم دراز ہو کر صوفے پر کہنی کے بل لیٹ گئے اور تھالی میں سے تیسری تر گلاب جامن بڑے تکلّف سے اٹھا کر مونہہ میں بھرلی۔ شریمتی ہولے ہولے اُن کے پاؤں سہلانے لگی۔

بیل بجائی تو نیلما نے دروازہ کھولا، اور سٹپٹا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"اندر آنے کی اجازت ہے؟"

"آیئے آیئے۔" نیلما کی سٹّی گم تھی۔ "نہا رہی ہے شوما۔"

"ممّا!" شوما نے باتھ روم سے نکل کر سہمی ہوئی آواز نکالی۔

"تم روٹھ جاؤ تو روٹھ جاؤ، ماں باپ

کیسی بھرتے ہو روٹھیں گے؟ چلو، تم جیتیں ہم ہارے
کبھی ماں بنو گی تو پتہ چلے گا۔ ہم اب تمہارے بیچ
میں ایک شبد بھی نہیں بولیں گے، جہاں چاہو
جو چاہو، فیصلہ کرو۔ تیرے پرانوں میں کھٹ پٹ
ہو ہی جاتی ہے، سو بھی معاف کر دو۔"

"ہائے مم!" شوما دوڑ کر ان سے لپٹ گئی
"سوری ممّا۔ بیٹھیے۔"

"یہ کیا چڑھایا ہے گیس پر؟ ٹھہرو میں
چائے بناتی ہوں۔"

"نہیں آنٹی، آپ بیٹھئے پلیز۔ میں بناتی
ہوں۔"

"کل یہ حلوا بنایا تھا۔ حلق سے ہی نہ اترا۔
تھوڑا سا تم لوگوں کے لئے لائی ہوں، اور دیکھو
کوئی چٹائی وٹائی ہے؟ کشن تو بہت ہیں۔ بس میں
یہیں ادھر سو جایا کروں گی۔"

"کیا بات ہے ممّا؟" شوما سہم گئی۔

"بات کیا ہوتی؟ وہی پرانی چخ چخ، تمہارے
پتا جی کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ بات بات پر کاٹ
کھانے کو دوڑتے ہیں۔ ہر وقت یہی رٹ کہ بیٹی
ساتھ نہیں رہتی تھی گھر آتی تو رہتی تھی، تم جانو بیٹی
ماں سے زیادہ باپ کو پیاری ہوتی ہے، بٹیا ہم
سے بھول ہوئی ہو تو معاف کر دو۔"

"ہائے ممی، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" شوما
کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"تو پھر گھر چلو۔"

"ابھی تو میرا اپائنٹ منٹ ہے، بہت کام
ہے۔ بس شام کو سیدھی ادھر سے گھر ہی آؤں گی"
"تب تک میں بھی یہیں بیٹھوں گی، ساتھ
ہی چلیں گے۔ نیلما بھی تو چلے گی نا؟ تیرے چاچا جی
کو تیرے ہاتھ کی آلو کی پروٹھیاں بہت پسند ہیں۔
کیا کیا ڈالتی ہے بھرتے ہیں؟ میں تجھ سے ترکیب
لوں گی۔"

"ہائے ممّا کتنی بدل گئیں! ابھی کل
ہی تو گھر سے نکال دیا تھا اور آج ---" کپڑے
بدلتی ہوئی شوما نے نیلما سے کہا۔

"آخر ماں ہیں تیری۔"

"مگر نہ جانے کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"چل دیوانی! اپنی ماں سے بھی کوئی
ڈرتا ہوگا؟"

"جب دیکھو ڈانٹتی ہی رہتی تھیں۔ اب
ایک دم کیسی میٹھی ہو گئیں۔"

"ماں بچوں کی بھلائی سمجھ کر ہی ڈانٹا
کرتی ہے۔ پھر وہ پرانے زمانے کی ہیں۔ لیکن
ہیں تو تیری ماں۔"

"ایسی پرانے زمانے کی بھی نہیں، کلب
میں برج کھیلتی ہیں۔ ڈانس کرتی ہیں دوستوں
کے سنگ۔"

"پر پوجا پاٹ بھی تو بہت کرتی ہیں۔
دھرم کرم کی پکی ہیں۔ ہم ہر رنگ میں رنگ
جاتے ہیں وقت کے ساتھ، یہی تو اپنے دیس
اور دھرم کی بڑائی ہے۔ میری ماں بھی بہت
دھارمک تھی۔ ہر تیوہار پر او دھم مچتی تھی۔"

بات گئی گزری ہو گئی۔ شوما گھر جانے
لگی۔ اس کا کمرہ ممّا نے ٹھیک کر دیا تھا۔ ماں اور
ڈیڈی اس کا بہت خیال رکھنے لگے۔ ایک ساتھ
کئی فلمیں دیکھیں۔ نیلما بھی شوما کے گھر میں ہی
سوتی۔ گھر کا ماحول بڑا کھلا کھلا ہو گیا۔ شوما کے
ساتھ نیلما سے بھی بہت لاڈ ہونے لگے۔

شوما صبح سویرے اٹھنے کی بجائے دیر
تک پڑی سوتی، اونگھتی رہتی، ہر دم سستی
چھائی رہتی، جسم بھی کچھ بھر گیا، گالوں پر سرخی

پرنانس تھامس

نانسی ایک نیویارک شہر کی ایک گھریلو عورت نے اپنی
جیب یال اچھالنے کے ذریعہ ۔۔ برس کی گڑیاں بچی
ہیں۔
ان ضرورت مند بچوں کے لئے جو کو غس یورو
سوسائٹی فار پروٹیکشن آف کرمی نو چلڈرن وکٹمس
مرم تشدد (ضلاعت) کے زیر نگرانی رہتے ہیں۔

آ گئی۔

پھر کچھ دن کے لئے نیلما دلی چلی گئی۔
اکیلے فلیٹ میں شوما کو بہت دقت ہوتی۔ تھوڑے
دن کے لئے اس نے کام لینا بھی بند کر دیا کہ نیلما
آئے گی تب دیکھا جائے گا۔ ممّا نے وی۔ سی۔ آر
بھی لے لیا تھا۔ خوب نئی نئی فلمیں دیکھی جاتیں
پھر ممّا طرح طرح کے کھانے پکاتیں۔ شوما بھی
ان کی مدد کرنے لگی۔ مگر اسے نیند اس غضب
کی آنے لگی تھی کہ دن میں ایک دو بار ممّا کی آنکھ
بچا کر دو جھپکیاں ضرور لے لیتی۔

کبھی شوما مجھے کتنی پیاری تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا خیال کیسے دماغ
...کالوں، ایک دن وہ بھی تھا جب وہ ایک مثالی لڑکی تھی کالجوں کے جلسوں میں، بڑے
...ادے میں اس کا ذکر کیا کرتی تھی، میرے ذہن میں مرتب ہوتی ہوئی کہانی بے طرح
...ع تھی۔

ایک دن نمانے اُسے ایک بھاری
...سی ساڑی نکال کر دی۔ مور پنکھی کا سنہرا
...۔ پونے گز کا بھاری پلّو۔ دبی زبان سے کہا
...وئی اُسے دیکھنے آرہا ہے۔"

"کیوں؟"

" اس لئے کہ یہ چاند سا مکھڑا دیکھنے لائق
...ہے۔"

" میں ۔۔ سمجھی نہیں" اُسے زور کی نیند
...ہی تھی۔ اس نے غور سے وہ زیورات بھی
...یں دیکھے جو سنار لے کر آیا تھا اور جب نما
... اُسے گڑیا کی طرح سجایا اور ہیئر ڈریسر بلا لائے
...ی کے جیسے بال بنائے تو وہ بالکل ہیما مالنی
...لنے لگی، یہ اور بات تھی کہ اُسے ہیما مالنی کبھی اچھی نہ لگی
...ی، چنانچہ وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی
...ی تو وہ خود کو بھی بڑی احمق لگی۔ مگر محلّے کی
...رتیں تو اس کی تعریف میں زمین آسمان
...ے قلابے ملانے لگیں۔ اس نے سوچا کہ یہ سب
...ھی ہیں، مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ کچھ دن سے
...سے کچھ کہنے کو نہیں مل رہا تھا۔ اس کا جی ہر وقت
...لایا متلایا سا رہتا تھا۔ دنیا اتنی بور ہو گئی تھی
...ٹوں سو کر بھی نیند پوری نہ ہوتی۔

پھر ایک دن سجیلا جوان چند مختلف عمر
...، مردوں کے ساتھ آیا۔ اُسے اور نیند آنے
...ی۔ نیلما نے اُسے خوب سجایا تھا۔ اس کے ہونٹوں
...گہری لال لپ اسٹک لگائی تھی جو اس کی
...ڑیوں اور بھاری بھرکم طاؤسی ساڑی سے
خوب میل کھا رہی تھی۔

پہلے تو مٹری کا وہ نوجوان اُسے کچھ بھوندو سا لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اُسے بتائے کہ اس کی دائیں مونچھ ذرا زیادہ لمبی ہے۔ بس کوئی قینچی دے تو آدھے چاول کے برابر کتر دے۔ بہت تل ہو رہا تھا۔ رنگ برنگے بلب جل بجھ رہے تھے۔ اس کی ہتھیلیوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں، اُسے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ اس کا بیاہ ہو رہا ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیوں ہو رہا ہے، نیلما بڑی گھبرائی سی کیوں ہے؟ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ سب کچھ بڑے سکون سے تو ہو رہا ہے۔ اگر اس کی جگہ نیلما ماڈل بنی ہوتی تو وہ سب کچھ بڑی آسانی سے سنبھال لیتی۔ بیگی بار بار آنسو پوچھ رہی ہے۔ اس کے دماغ میں بھری ہوئی رُوئی ہولے ہولے پھول رہی تھی۔ ابھی ابھی نیند کا ایسا زبردست جھونکا آیا تھا کہ اگر پیچھے بیٹھی ہوئی چاچی یا مامی نے اُسے سنبھال نہ لیا ہوتا تو اس کا مُونہہ ہَون کے دہکتے انگاروں سے جھلس جاتا۔

یہ نری کیوں مُونہہ بسور رہا ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے پاس بلانا چاہا، مگر ایک ہاتھ تو وہ گاؤدی دبائے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ اس نے اٹھایا ہی تھا کہ ممّا نے اُسے دبوچ لیا۔ اوہ، وہ بالکل بھول گئی تھی کہ کیمرہ چل رہا ہے۔ طرح طرح کی خوشبوؤں کے ریلے سے اس کی سانس اُتھل چل رہی تھی۔ سوچنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ وہ بلن جس سے وہ کبھی خوب سوچا کرتی تھی، جام ہو گیا تھا۔ اس نے خود کو نرم نکلے دھارے پر بے تحاشہ چھوڑ دیا اور بہتی رہی۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔
ماں باپ نے اتنا جہیز دیا کہ سمیٹے نہیں سمٹتا تھا تھالیوں میں اشرفیاں بھی ہوئی تھیں۔ دُولہا دُلہن ہنی مون منانے کشمیر گئے تھے۔ چار پانچ سال گزر گئے۔ اس درمیان کبھی کبھی دعوت میں شوبھا مجھے مل جاتیں۔ شوما کے پتی نے نوکری چھوڑ کر دہلی کے قریب اسٹیل کے برتنوں کی فیکٹری شروع کر دی تھی۔ دو بیٹیوں کے بعد سوامی جی کی کرپا سے ایک بیٹا بھی ہوا۔ اور یہ خبر کسی دُشمن نے اڑا دی کہ کچھ گھپلا ہوا تھا، اس لئے نوکری چھوڑنا پڑی اور یہ بھی سراسر بہتان ہے کہ داماد نے کوئی چھوکری ڈال رکھی ہے۔ ویسے بھی پینے پلانے کا تو آج کل فیشن ہے۔ پارٹی میں اس کے بغیر رنگ ہی نہیں جمتا۔

اس روز بھی بڑا رنگ جما ہوا تھا، انوپ جلوٹا نے غزلوں کا انتخاب بڑی لگن سے کیا ہوگا۔ حالانکہ کوئی سمجھنے والا نہ تھا، گلاس کھنک رہے تھے۔ کھسر پھسر بھی چل رہی تھی کہ ایک دم میرے اوپر ٹھوس گوشت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"سوری" میں نے گھبرا کر الٹی معافی مانگی۔

"ہائے آنٹی مجھے نہیں پہچانا؟"

وہاں سب ہی بھاری بھرکم ریشم اور جواہرات سے لدی پھندی لیڈیز براجمان تھیں مگر میں نے نہایت خندہ پیشانی سے کہنا شروع کیا۔

"میں شوما ہوں آنٹی۔" اس کی آنکھیں اب بھی ویسے ہی معصوم اور روشن تھیں۔

"اُوہ شوما! کیا شہد کی مکھیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی؟"

"دلّی کا پانی ہی چربیلا ہے۔" اس نے پلیٹ سے مٹھی بھر کاجو سمیٹے۔ "شیری نے پرامز کیا تو ہے کہ پندرہ دن میں مٹاپا اتار دے گی۔"

"ممّا کے پاس ٹھہری ہو؟" میں نے یوں ہی پوچھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کم بخت سے کیا بات کروں۔

"نہیں وہ مونچھ پھلا کر بولی۔ "ممّا تو سیاپا کھاتی ہے۔ کٹّی پورا حرامی ہے مگر حق اسی کی سائڈ لیتی ہے۔"

"یعنی تمہارے پتی دیو۔"

"ٹھینگا سے پتی دیو۔ میں کیوں اسے جھیلوں۔ شیراٹن میں ہمارا سوئٹ ہے۔" اس نے خالی گلاس پاس سے گزرتے ہوئے بیرے کی طرف بڑھایا۔ بیرے نے لپک کر دوسرا سامنے کر دی۔ شوما نے ایک گلاس میں دو گلاسوں کی وہسکی انڈیلی اور گرم سموسوں کی پلیٹ قریب سرکالی۔

نہ جانے کیا کیا بک رہی تھی۔ انگریزی اور ہندوستانی کی خاصی بھاری بھرکم گالیاں سُرعت سے اس کے لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے ہونٹوں سے اُچھل رہی تھیں۔ پھیلے ہوئے گلے کے مختصر ترین بلاؤز سے گندھا ہوا میدا اُبل رہا تھا۔

"بچے کیسے ہیں؟ ساتھ لائی ہو؟" میں نے پٹڑی بدلنا چاہی۔

"ممّا کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ دو

ڈین وے پاکی میری اووِنس نے ایک گھریلو جنگ میں۔ ۱۸۸۱ء تک اپنے شوہر کے ہمراہ ایک وطن پرست فوجی کی وردی پہن کر جنگ کی تھی۔ اس نے تین جنگوں میں حصہ لیا۔ دو بار زخمی ہوئی اور اپنی بغل میں اپنے شوہر کو قتل ہوتے دیکھا۔

سال سے ان ہی کے پاس رہتے ہیں۔ ہمارا بنگلہ ہے نا مسوری میں۔ ڈیڈی تو دلّی سے چپکے ہوئے ہیں۔ بالکل سٹھیا گئے ہیں۔ پہلے مرغی خانہ کھولا۔ فیض آباد کے پاس وہ ٹھپ ہو گیا تو اب ہوٹل چلانے والے ہیں۔ اس حرام زادی نے ڈبو دیا۔"

"معلوم ہوا۔ ساری عمر بیوی کی تابعداری بھگتنے کے بعد ایک دم ایک انیس بیس برس کی لڑکی کے چکر میں پھنس گئے۔"

"آپ آیئے نا، چھٹے فلور پر ہے کمرہ یا ایسا کریں، چھوڑیئے یہ ریں ریں۔ ابھی چلیے۔"

وہ اتنے زور سے بولنے لگی کہ سب متوجہ ہو گئے۔ اس کے مونہہ سے گالیوں کے لچھے چھما چھم برس رہے تھے۔ نہایت بھاری بھرکم ہندی اور انگریزی کی گالیاں۔ کسی نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ کشتی لڑنے لگی، لیکن جلد ہی اس کی مدافعت ختم ہو گئی اور وہ ان کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

اس کے بعد قوالی بالکل نہیں جمی اور محفل درہم برہم ہو گئی۔

دو تین دن بعد اس کا فون آیا کہ وہ بہت بیمار ہے۔ اور اسے شیراٹن، سکستھ فلور پر فوراً پہنچوں۔ میں نے فون بند کر دیا۔ پھر فون آیا کہ وہ بڑی مصیبت میں ہے، لوگ اُسے بہت پریشان کر رہے ہیں۔ میں فوراً پندرہ ہزار روپے لے کر پہنچوں۔

پندرہ ہزار۔ اگر پندرہ روپے کا ذکر ہوتا تو شاید مجھے تکلّف نہ ہوتا۔ میں نے فون کا رسیور اُتار کر رکھ دیا۔

کبھی شوما مجھے کتنی پیاری تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا خیال کیسے دماغ سے نکالوں! ایک دن وہ بھی تھا جب وہ ایک مثالی لڑکی تھی۔ کالجوں کے جلسوں میں بڑے اعتبار سے میں اس کا ذکر کیا کرتی تھی۔ میرے ذہن میں مرتب ہوتی ہوئی کہانی بے طرح الجھ گئی تھی۔

شام کا اخبار بیچنے والا چیخ کر پکار رہا تھا۔

"لکھ پتی کی اکلوتی بیٹی، کروڑپتی کی بہو نے ہوٹل کے چھٹے مالے سے کود کر خودکشی کر لی"

میں آج بھی فیصلہ نہیں کر پائی کہ یہ خودکشی تھی یا قتل!

■■

محبت کا کیمیائی تجزیہ

انور حسین

محبت کیا ہے؟ اس سوال کا ایک سادہ جواب یہ ہے کہ ایک انسان کی دوسرے انسان کے لئے چاہت اور اس کے قرب کی خواہش کو محبت کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ جواب انسان کو پوری طرح مطمئن نہیں کرتا۔ ایک انسان دور سے اپنے محبوب کی پرستش کرتا ہے۔ دوسرا اس کو حاصل کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دیتا ہے محبت کی داستانیں ایسے واقعات سے بھری ہوتی ہیں۔ محبت میں دیوانگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے شیکسپیئر کا قول ہے کہ ایک سر پھرے شاعر، عاشق اور دیوانے میں کوئی فرق نہیں ہوتا سوال یہ ہے کہ محبت کے جذبے میں ایسی کون سی طاقت ہے کہ انسان

اپنے ماں باپ، سماج، مذہب بلکہ اپنی عزت اور دولت کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔
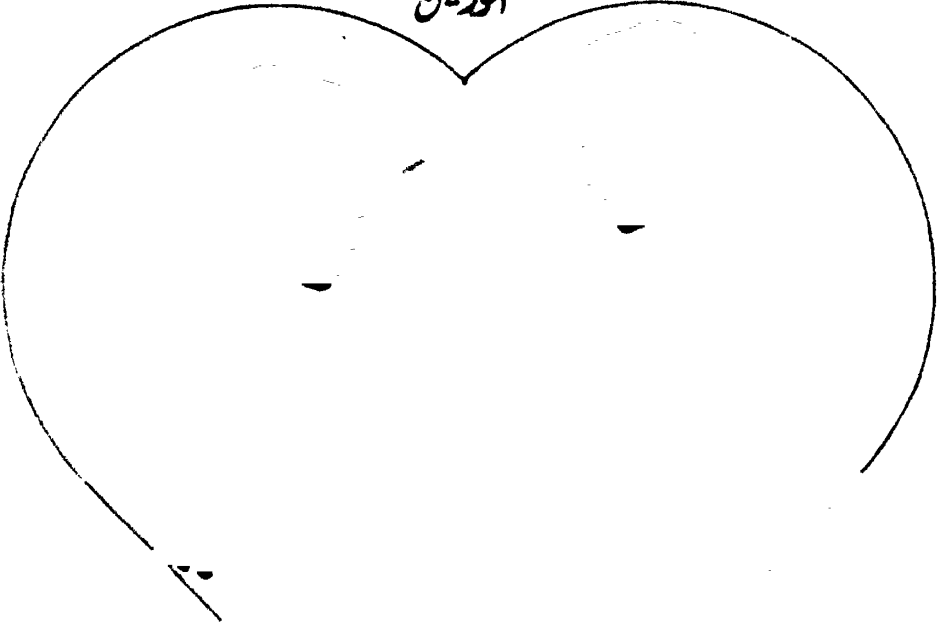
نفسیات کے ماہرین نے محبت کا تجزیہ کیا ہے۔ اگر انسان کو بچپن میں محبت نہ ملی ہو تو وہ جوانی میں اس کی تلاش کرتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ ماہرین کا قول ہے کہ جن انسانوں کو محبت نہیں ملی وہ محبت نہیں کر سکتے۔ محبوب کے انتخاب میں بھی ماں باپ کی شکل و صورت اور شخصیت کا سایہ ہوتا ہے۔ پھر محبت کی کئی قسمیں ہیں۔ ماں باپ کی اپنی اولاد سے محبت، اپنے ملک سے محبت، بھائیوں کی محبت وغیرہ لیکن عام زبان میں محبت کے معنی عورت اور مرد کی محبت ہی ہے۔ مغرب کے ممالک میں کچھ سائنس دان ایک دوسرے رُخ سے محبت پر ریسرچ کر رہے ہیں اور یہ ہے محبت کا کیمیائی تجزیہ۔

محبت کا پہلا اسٹیج خاصا خطرناک ہوتا ہے۔ اس میں راتوں کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ بھوک پیاس غائب ہو جاتی ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ محبوب کی شکل دیکھتے ہی دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کی ایک نگاہِ غلط انداز دل کو حدت سے بھر دیتی ہے۔ اگر دونوں طرف آگ برابر لگی ہو تو کیا کہنا۔ اس وقت انسان کا جوش اور جذبہ اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت عام انسان سے مختلف ہوتی ہے۔ اگر محبوب مہربان ہو تو اُداسی انسان کے پاس نہیں پھٹکتی۔ اس کا اعتماد دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کا قول ہے کہ انسان کی یہ کیفیت محبت کے جذبے کی محتاج نہیں ہے۔ یہ دوا سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

آج کل نوجوانوں میں منشیات کا استعمال عام ہے۔ ڈرگ کے عادی نوجوان اکثر جوش پیدا کرنے والے ڈرگ یا دوا لیتے ہیں۔ انہیں "اسپیڈ" یا "ڈرفتار" کہتے ہیں۔ بے روزگاری، غریبی اور والدین کی ڈانٹ پھٹکار سے تعلیم یافتہ نوجوان اکثر اداسی یا ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انہیں مایوسی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اس ڈپریشن کو دور کرنے کے لئے ایک دوا ملتی ہے، جسے ایمفیٹامین یا اسپیڈ کہتے ہیں۔ اس دوا کی فروخت پر قانونی پابندی ہے۔ لیکن

> محبت میں جدائی ناقابلِ برداشت بن جاتی ہے محبوب ایک دن بھی نظروں سے دور ہو جائے تو جینا دوبھر ہو جاتا ہے

لوگ اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ اس دوا کے استعمال سے انسان میں جوش اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اداسی دور ہو جاتی ہے۔ دنیا ایک بار پھر رنگین دکھائی دیتی ہے۔ محبت کے پہلے حملے میں بھی یہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور یہ مشابہت اتفاقی نہیں ہوتی۔

اسپیڈ یا جوش پیدا کرنے والی دوا کا اثر عارضی ہوتا ہے۔ دوا کا اثر زائل ہوا اور سارا جوش ختم، تقریباً یہی کیفیت دیوانہ وار محبت کرنے والوں کی ہوتی ہے۔ اگر دوا کا اثر چند گھنٹے رہتا ہے تو محبت کا اثر چند ہفتے یا چند مہینے رہتا ہے اور اس کے بعد زائل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک بات بتا دینا ضروری ہے۔ محبت میں قرب حاصل نہ ہو تو یہ کیفیت بہت عرصے تک باقی رہ سکتی ہے لیکن قرب حاصل ہو جانے پر محبت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ دیوانہ وار کیفیت ختم ہو جاتی ہے اس کی مثال اس موٹر کار کی ہے جس کی رفتار ۲۰۰ کیلومیٹر ہو اور اچانک اس کے ایکسیلریٹر سے پیر ہٹا لیا جائے [illegible] کم نہ ہوگی لیکن اس [illegible] کی طاقت شامل نہ ہوگی۔ کچھ دور چلنے کے بعد یہ خود بخود رک جائے گی۔ دیوانہ وار محبت میں بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے لئے بڑے جوش اور جذبے سے قدم اٹھاتا ہے، لیکن چوٹی پر پہنچنے کے بعد اس جذبے کی ضرورت نہیں رہتی۔ چوٹی سے نیچے پہنچنا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن اس مرحلے کو سر کرنے کے لئے جوش سے زیادہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے نیچے اترتے وقت اسے اپنی جان کی پروا زیادہ ہوتی ہے۔ محبت میں بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے ابتدائی چند ہفتوں یا چند مہینوں کے بعد دیوانہ پن ختم ہو جاتا ہے۔ محبت باقی رہتی ہے لیکن اس میں ایک ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ اسٹیج نمبر ۲ میں انسان اپنے محبوب کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس کی حالت ایک افیمچی کی ہو جاتی ہے جس طرح ایک افیمچی روز افیون کی گولی کھا کر اتنا غفیل ہو جاتا ہے، اسی طرح اسٹیج نمبر ۲ والا انسان بھی اپنے محبوب سے کچھ دیر مل کر یا ا

ہے۔ اسی طرح چھُپ چھُپ کر ملنے میں
ت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ محبوب کو خط
تے ہوئے پکڑے جانے کا ڈر ہوتا ہے۔
ے یا کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بھی یہی
در پیش رہتا ہے۔ چند ثانیوں کی ملاقات
لئے انسان بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے
رہتا ہے خطرے کا عنصر ختم ہو جائے تو
کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔

خوف کا جذبہ ایک غدود کی پیداوار
۔ اسے ایڈر ےنالن کہتے ہیں۔ گھر میں اچانک
ھُس آئے یا جنگل میں کسی درندے سے
بھیڑ ہو جائے تو انسان کے پاس دو ہی راستے
تے ہیں۔ فرار یا مقابلہ۔ یہ دونوں ہی ایڈرینالن
پیداوار ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ
بقت بیان کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم کُتّے سے

ڈرتے ہیں تو رات کے وقت اس سے مڈبھیڑ
ہو جانے پر ہم تیز تیز قدم بڑھاتے ہیں۔ کُتّا
ہمیں دیکھ کر بھونکتا ہے۔ ہم بھاگنا شروع
کر دیتے ہیں۔ کُتّا بھی ہمارے پیچھے لگ جاتا
ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کُتا ہمارے
پیچھے ہی کیوں بھاگ رہا ہے۔ دراصل کُتّے کا
خوف ہمارے جسم میں ایڈرے نالن کی مقدار
تیزی سے پیدا کر رہا ہے۔ کُتّے کی سونگھنے کی طاقت
بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ ہمارے جسم میں تیزی
سے بنتی ہوئی ایڈرے نالن کو سونگھ لیتا ہے۔
اسے اس مرکب سے الرجی ہے۔ ہم جتنا اس سے
خوف کھاتے ہیں، وہ اتنی ہی تیزی سے ہماری
طرف دوڑتا ہے۔ ہمارا خوف اور اس کا تعاقب
مساوی مقدار سے بڑھتے ہیں۔ کتّے سے ڈرنے
والی عورتیں اس نکتے کو یاد رکھیں۔

محبت کے اس کیمیائی تجزیے سے ایک
بات واضح ہو جاتی ہے۔ محبت کا پہلا دور
دیوانگی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس دور میں انسان
محبت کی بلندی پر پہنچنے کے لئے دیوانہ وار قدم
اُٹھاتا ہے۔ لیکن ہر بلندی کی ایک حد ہوتی
ہے۔ جب انسان اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے
تو اس کے پاس نیچے گرنے کے سوا کوئی چارہ
نہیں ہوتا۔ یہ انسان محبت کے دوسرے
اسٹیج میں داخل نہیں ہونے پاتا۔ اس کی محبت
میں کبھی ٹھہراؤ نہیں آتا۔ اس ٹھہراؤ سے پہلے ہی
وہ ٹریجڈی کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھر سے بھاگ جانے
اور خودکشی کی کوشش کے پیچھے یہی دیوانگی
کارفرما ہوتا ہے۔ محبت کی رفتار جتنی تیز
ہوتی ہے، اس کی چوٹ بھی اتنی ہی کاری
ہوتی ہے۔ ●●

اقوالِ زرّیں

- حضورؐ نے فرمایا تم (عورتیں) مردوں کے پیچھے چلو اور کنارے پر چلو۔
- زندگی انسان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔
- زندگی ہمارے لئے غم اور خوشی ایک ساتھ لے کر آتی ہے۔
- جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، وہ کسی سے بدلہ نہیں لیتا۔
- ہر گناہ کی توبہ ہے لیکن بداخلاقی کی توبہ نہیں۔
- ہر محنت میں فائدہ ہے، لیکن زبانی جمع ترچ سے مُفلسی آتی ہے۔
- ہمیشہ پاک صاف رہنے سے رزق میں برکت ہوتی ہے
- اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھ لینا جہالت ہے۔
- سب سے زیادہ خوش قسمت وہ شخص ہے جسے خدا تعالیٰ قناعت اور نیک بیوی عطا فرمائے۔
- سب سے بلند تقویٰ تواضع ہے۔

لوگوں کے پاس جاکر عاجزی کرنے سے ان سے نااُمید رہنا اچھا ہے۔
- کم عقل سے دوستی کرنا اپنی کم عقلی جتانا ہے۔
- جب عقل کامل ہو جائے تو کلام گھٹ جاتا ہے۔
- معافی نہایت اچھا انتقام ہے۔
- عقل مند سوچ کر بولتا ہے، بے وقوف بول کر سوچتا ہے
- تین چیزیں آخر کار ذلیل کرتی ہیں: ظاہر داری، دورُخی اور فضول خرچی۔
- ذہن کی خوبی اخلاق کی خوبی ہے۔
- دوسروں کے حال پر غور کرنے سے نصیحت حاصل ہوتی ہے۔
- ایمان دار کو غصّہ جلد آتا ہے، مگر وہ راضی بھی جلد ہو جاتا ہے۔
- اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کرنا قدرت کا اٹل قانون ہے۔

میری ماں

قیصر تمکین

لچھمی نرائن کے خیراتی چکتسالیہ کی دھرم شالہ میں ٹھنڈی زمین پر جو زندہ لاش پڑی تھی، وہ میری ماں تھی۔

ویسے وہاں میلے، گندے کپڑوں میں لپٹے لپٹائے اور بھی بہت سے انسانی پنجر اسی طرح پڑے ہوئے تھے جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مگر پھر بھی یہ سب اِس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ دھرم شالہ کے ہال میں ان کو جگہ مل گئی تھی۔ بیسیوں مریض تو ایسے بھی تھے جو باہر میدان میں درختوں کے نیچے یا سڑک کے کنارے اپنے کنبے والوں کے ساتھ درد سے بلبلاتے اور کراہتے ہوئے زندگی کے گنے چنے دن گزار رہے تھے۔

میرے سامنے جو ڈھانچا گندی، میلی، چیتھڑے جیسی ساڑی میں لپٹا پڑا تھا، اس کے بال جھبرے جھبرے اور راکھ کے رنگ کے تھے۔ اس کا چہرہ بھونق تھا۔ اُس کے بدن کی جلد کچھ اس طرح گرد آلود اور جھریوں سے بھری تھی کہ اس چمڑے کا خیال آتا تھا جو یورپ کے بعض پرانے قلعوں میں لوہے کی زنجیروں پر غلاف کی طرح چڑھا دیا جاتا ہے۔ اُس پنجر نے اپنی بے نور آنکھوں سے مجھ سے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن میں جو اُس کا لاڈلا اکلوتا بیٹا تھا اور سات سمندر پار کر کے آخر وقت میں اُس سے ملنے کے لیے پہنچا تھا، اُس کی کوئی بات سمجھ نہیں سکا۔

الجیریا کے آوریس پہاڑی علاقہ کی خواتین کو کبھی کاٹن سینا نہیں پڑتا۔ وہاں کپڑا ایسی ناپ اور شکل میں بنا جاتا ہے کہ پہننے کے قابل تیار ہو کر آتا ہے۔

جمعہ کی شام تھی جب میں پارک لین کے شان دار اسٹوڈیو نما دفتر سے نکلا۔ میں نے اپنی چھپتی بینٹلے از خود کھلنے اور بند ہونے والے گیراج میں مقفل کی۔ پھر اپنے ہاتھ کی گھڑی میں لگے ہوئے خفیہ نمبروں کو دبا کر زیر زمین دوز موٹر خانے کا دروازہ کھولا اور اپنی نئی نویلی بی ایم ڈبلو نکالی۔

میرا گھر جنوبی ویلز کی وادیوں میں ہے اور ہفتے کے آخر میں جب میں اپنے "کنٹری ہوم" جاتا ہوں تو بینٹلے کی بجائے بی اے ڈبلو استعمال کرتا ہوں۔ اس موقع پر گاڑی میں خود ہی چلاتا ہوں، کیوں کہ شہر سے دور خاموش وادی میں سکون کے دو تین دن گزارنے کی اُمید پر جو شگفتگی میری طبیعت میں سما جاتی ہے، اُس کو میں کسی شوفر کی موجودگی سے آلودہ کرنا پسند نہیں کرتا۔

لندن سے باہر نکلنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔

موٹر وے چار (ایم فور) پر پہنچتے ہی میں نے ذرا پاؤں دبایا تو میری نئی نویلی بی ایم ڈبلو اسّی سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُڑنے لگی۔ جن گاڑیوں یا ڈرائیوروں نے میری تیز رفتاری پر ہارن بجائے، ان کو میں نے دو انگلیاں دکھائیں اور خود پر مزید بے فکری کا عالم طاری کرنے کے لئے ریڈیو کھول دیا۔ مگر شروع کے دو ہی تین الفاظ نے مجھ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

ریڈیو پر میرے ہی بارے میں اعلان ہو رہا تھا "جلیسر روڈ کے مندوجی، جو لندن میں کہیں کام کرتے ہیں، جلد سے جلد ہندوستانی ہائی کمیشن سے رابطہ قائم کریں۔ اُن کی والدہ خطرناک طور پر علیل ہیں۔"

جب میں گھر پہنچا تو ہر کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میرے سارے جاننے والے مجھ کو یہ بتانے پر مصر تھے کہ میری ماں بہت بیمار ہے۔ ابھی ابھی ریڈیو پر "ایس او ایس" نشر ہوا ہے۔

میں مندا کنی پرشاد خوش دل، جو انگریزی میں ملٹی ملینیر اور اُردو میں کروڑ پتی کہلاتا ہوں، ماں کی اس بے تکی حرکت پر جھنجھلا گیا۔ میں اُس سے کہہ کر آیا تھا کہ اب زندگی بھر اس کا اور اس کے دیس کا مونہہ بھی نہ دیکھوں گا پھر آخر اس کو یہ فضول اعلان کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ جھنجھلاہٹ کچھ کم ہوئی تو بھی میں نے اپنی معتمد ترین سکریٹری فرانسین کو فون کیا جو اپنی بے پناہ خوب صورتی اور بے حساب ذہانت کی وجہ سے ہر ناممکن کو ممکن بنا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میں اس کو ایسے ہی ہنگامی مواقع پر زحمت دیتا ہوں۔ میرا بھروسا جائز ثابت ہوا۔ ایک ہی گھنٹے کے وقفے میں میرے سفر کے تمام انتظامات اِس طرح مکمل ہو گئے کہ میں چوبیس گھنٹے کے اندر لچھمی نرائن کے خیراتی چکتسالیہ (واقع جلیسر روڈ) پہنچ گیا۔

اور اب میں ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس اور بھی بہت سی عورتیں اس سے کہیں خراب حالت میں پڑی تھیں۔ شاید اُن کے بھی کروڑ پتی بیٹے اُن کو گودام کے بلوں میں سسکتی ہوئی بیماری کی چوہیاں سمجھ کر اُن سے کنی کاٹ چکے تھے۔

ماں نے کچھ سنبھالا لیا تھا، مگر واقعہ یہ تھا کہ وہ مرنے کے بہت قریب تھی۔ ہاں، اپنی ضد اور ہٹ پر وہ آج بھی اُسی طرح قائم تھی جیسے آج سے ۲۵ سال قبل، جب میری منتوں سماجتوں کے باوجود اس نے اپنا گاؤں اور شہر چھوڑنے اور دیس کے باہر جانے سے انکار کیا تھا۔ آج [illegible] کے باوجود اُس نے چکتسالیہ کی دھرم شالہ کی گھٹیا زمین چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ کسی اچھے شہر کے کسی بہترین نرسنگ ہوم میں جانے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ اس نے تو وہیں دم توڑنے کا فیصلہ کیا تھا، کیوں کہ وہاں اس کے چاروں طرف وہی لوگ تھے جو اس کے دُکھ درد کے ساتھی تھے اور میں کروڑ پتی ایم۔ پی۔ کا شڈیل، لندن شہر میں ذاتی جہاز رانی کمپنیوں کا مالک، آج سے ۲۵ سال قبل یہ کہہ کر اُس کو چھوڑ آیا تھا کہ جب تم تڑپ تڑپ کر اس دھرتی پر جان دے رہی ہو گی تو میں تمہارا مونہہ دیکھنے بھی نہیں آؤں گا۔ اُس دن ماں بیٹے میں ایسا جھگڑا ہوا تھا جیسے دونوں سدا سے ایک دوسرے کے جانی دشمن رہے ہوں۔

وہ تو چوتھائی صدی پہلے کی بات تھی، لیکن اب مجھے ایسا لگا جیسے ماں بہت لالچی ہو گئی تھی۔ وہ مجھ کو دیکھ کر اشاروں سے پھل، مٹھائیاں، دوائیں اور معلوم نہیں کیا الا بلا منگواتی۔ عجیب عجیب فرمائشیں کرتی۔ اس نے مجھ سے ریڈیو [illegible] کی فرمائش کی اور پھر وہ سب سامان اُس کے پاس

کے لوگوں کو بانٹ دیا۔ اُس کی اس فیاضی سے
پوری دھرم شالہ میں نئی زندگی دوڑ گئی۔ نرسیں
اس کے آس پاس مکھیوں کی طرح چپکی رہتیں اور
دوسری لاچار اور بے سہارا عورتیں ماں سے کہہ کر
اپنے اور اپنے عزیزوں کے لئے ڈھیر سا سامان
منگواتیں۔ مگر میرے اوپر کیا اثر پڑتا؟ میں نے سوچا؟
ماں اس آخری وقت میں کتنی ہی حریص اور لالچی کیوں
نہ ہو جائے کتنا ہی پیسہ کیوں نہ ضائع کرے، اپنے
حساب ہزاروں بھی اُڑا دے تو بھی میرے لئے کیا
فرق پڑے گا۔ یہ ساری رقم اس خرچے کے برابر بھی
نہیں جو میں اپنی چہیتی ایرانی بلی مرجینا کے سنگاپور
ہر ہفتے ویٹ (VET) کے پاس "چیک اپ"
کے لئے جانے میں اڑاتا ہوں۔ میرے کتوں اور
بلیوں کی غذا پر بھی اتنی رقم اٹھ جاتی ہے کہ اس سے
کئی خیراتی چکتسالیہ کھل سکتے ہیں۔ مگر میں بہت ہی
سخت دل ہوں۔ میں اس دیس سے الگ ہوں،
یہاں کے دفتری لوگوں اور ڈاکٹروں سے بددل
ہوں۔ انہوں نے مجھے دیا ہی کیا۔ بھوک، افلاس،
بیماریاں اور لگاتار ذلتیں۔ مجھے تو یاد آ رہے تھے
وہ دن جب میں بیماری کی حالت میں دلی کے ایک
میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے سامنے بنچ پر پڑا رہا تھا۔
میں سب سے پہلے آ گیا تھا مگر پھر بھی میرا نمبر ایک
بجے تک نہیں آیا اور ڈاکٹر لوگ لنچ کے لئے چلے
گئے۔ جب میں کچھ کہتا تو چپراسی مجھ کو ڈانٹتا اور کہتا
باری سے ہی نمبر آئے گا؟ حالانکہ میرے سامنے
بہت سے لوگ آئے اور بغیر کسی انتظار کے سیدھے
ڈاکٹروں کے پاس گئے، اور پھر واپس بھی چلے
گئے۔ کچھ لوگوں نے چپراسی سے الگ بات چیت کی
اور ان کا بھی نمبر جلد ہی آ گیا۔ میرا نمبر نہ آنا تھا نہ آیا۔
میں ان سب کو کوستا ہوا اور اس پورے دیس کو برا کہتا ہوا
وہاں سے چل پڑا۔ مجھے اس دیس میں خیراتی شفاخانے
تعمیر کرانے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ ہاں یہ دوسری
بات ہے کہ ایڈنبرا سالزبرگ اور گلینڈبورن کے
تہذیبی میلوں کے لئے میں ہر سال ہزاروں پونڈ
چندہ دیتا ہوں اور ایسا کرتے ہوئے مجھ کو میڈیکل
انسٹی ٹیوٹ کا وہ چپراسی ضرور یاد آتا ہے جس نے
مجھ کو رذیل ترین مخلوق سمجھ کر بری طرح ڈانٹا پھٹکارا
تھا۔

میرے آنے کے دو تین دن کے اندر
لچھمی نرائن کے چکتسالیہ میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو گئیں
صفائی کا انتظام کچھ اچھا ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے
سے زیادہ نرمی سے باتیں کرنے لگے، کیوں کہ سب کو
معلوم ہو گیا تھا کہ نبو کا بیٹا پیسے والا ہے، ولایت
سے آیا ہے اور کہیں دور کے بڑے اچھے ہوٹل میں
ٹھہرا ہے۔ (یہ ہوٹل شہر کا بہترین ہوٹل تھا
اور جہاں میں ایک فرضی نام سے چھپ کر رہ رہا
تھا، اپنے معیار کے اعتبار سے میرے شوفر
ایک کے کوارٹر سے بھی گیا گزرا تھا)۔

ماں کے پاس پڑی ہوئی ایک اور عورت
حلق کے کینسر میں مبتلا تھی۔ وہ کچھ بول نہیں سکتی
تھی ساس کی بیماری اپنی آخری منزل پر تھی۔ مگر
پھر بھی اُس کی املی کی چیاں جیسی آنکھیں بڑی خوفناک
حد تک چمکدار تھیں۔ وہ ان چمکتی آنکھوں سے
مجھ کو دیکھا کرتی۔ مجھے اس کی نگاہوں سے وحشت
ہوتی تھی، کیوں کہ مجھے ایسا لگتا گویا وہ مجھے ملامت
کر رہی ہوں۔ میں جتنا وقت ماں کے پاس
گزارتا اور اس کے اشاروں پر نوٹوں کی گڈیاں
نکال کر ردی کے ٹکڑوں کی طرح چکتسالیہ کے ملازموں
کو فضول فضول سامان لانے کے لئے دیتا، وہ
عورت مجھ کو دیکھا کرتی۔ ہر چند کہ اس کے جسم کی
کسی رگ یا ریشے میں بھی اب زندگی کی رمق باقی
نہیں تھی مگر اس کی نگاہیں اب بھی کسی طرح کی بجلی

پوری تاریخ میں سب سے بدقسمت دلہن

تورینو (اٹلی) میں شہزادی ماریہ کاسوریا جس کی شادی ۳۰ مئی ۱۸۶۷ کو اٹلی کے بادشاہ کے بیٹے ڈیوک آف آوسٹا کے ساتھ ہوئی تھی کہ سیاہ کن دن واقعات سے بھر اٹھا۔ دلہن کے ملبوسات کی محافظ نے پھانسی لگالی، شاہی محل کے گیٹ کیپر نے اپنا گلا کاٹ لیا، بارات کے آگے آگے چلنے والا کرنل لُو لگ جانے کے سبب مر گیا، اسٹیشن ماسٹر بھی مولن ٹرین کے پہیوں کے نیچے کچل گیا۔ بادشاہ کا ذاتی مددگار گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ سب سے معزز آدمی نے گولی مار کر خودکشی کر لی۔

جیسی چمکا کرتی تھیں۔ ایک بار تو ان دو چنگاریوں
کی جوت دیکھ کر میں سہم گیا اور اس رات مجھ کو
مشکل سے نیند آئی۔

یہ عورت تھی بھی عجیب۔ کچھ سنکی سی لگتی تھی
جب سب لوگ نئے کپڑے اور پھل، مٹھائیاں
پا کر خوش ہوتے تھے تو وہ زندہ لاش کی طرح پڑی
رہتی تھی۔ مرنے والوں کے اعزا، مرنے والوں کا
غم کرنے کی بجائے میرے گن گا رہے تھے سب
لوگ میری تعریف اور خوشامد کرتے اور جتنی دیر
میں وہاں رہتا سب مکھیوں کی طرح مجھ سے چمٹے

...نے۔ مگر وہ عورت اپنی چمکتی آنکھوں سے نہ جانے
...یں مجھ پر ملامت کیا کرتی۔
پانچویں یا چھٹے دن اسپتال کا سب سے
...اکٹر، جو تقریباً غلاموں کی طرح میرا مطیع اور
...دار ہو چکا تھا، گھبرایا گھبرایا میرے ہوٹل پہنچا اور
...لگا کہ میری ماں پر پھر دورہ پڑا ہے اور اُس کے
...ال میں یہ آخری دورہ تھا۔ (اس اطلاع پر میں
...نے اپنے تحت الشعور میں ایک اطمینان کا احساس
...یا، کیوں کہ اب میں جلد سے جلد اِس نرک سے
...ھاگ نکلنا چاہتا تھا)۔
اور ہوا بھی یہی۔ ماں کا کریا کرم ہوتے
...ہی میں نے رختِ سفر باندھا اور چل کھڑا ہوا۔

اُسی شام کو علی گڑھ کے اسٹیشن پر ڈاکٹر
کئی نرسوں کے ساتھ مجھ سے ملنے آیا۔ جلیسر روڈ
سے علی گڑھ تک وہ کیسے اور کس گاڑی سے
پہنچ گیا، میری سمجھ میں نہ آسکا۔ پھر بھی اُس نے
ہاتھ جوڑ جوڑ کر اور گڑگڑا کر معافی مانگتے ہوئے
بتایا کہ جس عورت کا کریا کرم ہوا، وہ میری ماں
نہیں تھی۔ مطلب یہ کہ جس عورت کی خاطر میں اُس
نرک میں ہفتے بھر سے بھُن رہا تھا، وہ میری
نہیں، کسی اور کی ماں تھی۔
میں غصّے سے کانپنے لگا اور پتہ نہیں کیا کیا
اَول فول بکنے لگا۔ غصّے کے مارے میرے مونھ
سے پورے الفاظ بھی نہیں نکل رہے تھے۔ ڈاکٹر
نے بالکل زر خرید غلاموں کی طرح میری ڈانٹ
پھٹکار خندہ پیشانی سے سُنی اور بڑی مؤدبانہ عاجزی
سے کہا کہ معلوم نہیں کہاں، کس سے اور کس طرح یہ
غلطی ہو گئی کہ ایک انجانی عورت نے میری ماں کا
رُوپ دھار لیا۔ میری اصل ماں تو دوسری عورت
تھی۔
کون تھی وہ؟ میں نے گرج کر پوچھا۔
"وہی کینسر کی مریضہ، جو آج صبح مری ہے۔
یہ دیکھیے اُس کا سرٹیفکٹ، جو اُس کے گلے کے
لاکٹ سے نکلا۔ یہ الٰہ آباد میونسپلٹی نے ۱۹۴۰ میں
جاری کیا تھا...."
میں نے سوچا، یہ تو کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا
ہے، کیوں کہ میری ماں کی شادی ۱۹۴۰ میں اپنے
عزیزوں کی مرضی کے خلاف الٰہ آباد میں میرے باپ
سے ہوئی تھی، جو ذات باہر تھا۔ میں نے ذرا نرمی
کے ساتھ وہ تعویذ نما کاغذ لے کر دیکھا۔ سرٹیفکٹ
انگریزی میں تھا، اور ترجمہ یہ تھا: "کرونا کیسری
باجپئی۔ عمر ۲۶ سال۔ زوجہ امبیکا پرشاد بیدل۔
ساکن محلہ ساؤتھ ملاکا۔ الٰہ آباد۔ ۷ جولائی ۱۹۴۰"

□□

خیال اپنا اپنا

نتیجہ بانو: جون ۱۹۸۵ میں شائع ہوگا

یہ انعامی مقابلہ آپ کو موجودہ دور کے مختلف مسئلوں اور سوالوں کے بارے میں اظہارِ رائے کا موقع اور دعوت دیتا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات اور فکری نتائج دوسروں تک پہنچائیے اور انعام حاصل کیجیے۔

پہلا انعام: سو روپے
دوسرا انعام: پچاس روپے
تیسرا انعام: تیس روپے

اس ماہ کا سوال ہے: **کیا اعلیٰ تعلیم عورتوں کا مستقبل سنوار سکتی ہے؟**

اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ لفظوں میں اپنے خیالات ہمیں لکھ بھیجیے۔ آپ کی تحریر ۱۰ مئی ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جانی چاہیے:

"خیال اپنا اپنا" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

رشتہ پیار کا
شتہ پیار کا ہم دونوں میں ہے تب سے
رہا ہے سورج دنیا میں جب سے
رتی پر جب پہلا پنچھی چہکا تھا
غوں میں جب کوئی غنچہ مہکا تھا
لا تھا جب کوئی گیت کسی لب سے
شتہ پیار کا ہم دونوں میں ہے تب سے
تنی دیر سے وقت ہے اور زمانہ ہے
ں سے بھی کچھ اپنا پیار پرانا ہے
دور تھی چاہت کی منزل جب اِن سب سے
شتہ پیار کا ہم دونوں میں ہے تب سے
نٹ رہا تھا میرا خدا جب تقدیریں
امنے رکھ دیں رنگ برنگی تصویریں
انگ لیا تھا میں نے تجھے اپنے رب سے
رشتہ پیار کا ہم دونوں میں ہے تب سے
چھنکی تھی جب پہلی بار کوئی جھانجھن
رکھا گیا تھا عورت کا جب نام دُلہن
سامنے حُسن جب آیا ایک نئی چھب سے
رشتہ پیار کا ہم دونوں میں ہے تب سے
قتیل شفائی

تین نئی کشیدہ کاریاں
سارہ
کشیدہ کاری
فرح کشیدہ کاری
(اُردو ہندی میں) قیمت : ۱۸ روپے
(علاوہ محصول)
راسیہ کشیدہ کاری
(اُردو ہندی میں) قیمت : ۱۲ روپے (علاوہ محصول)
سارہ کشیدہ کاری
(اُردو ہندی میں) قیمت : ۱۰ روپے (علاوہ محصول)
اگر آپ کپڑے کو کشیدہ کاری کے اچھے ڈیزائن سے مزین کرلیں تو اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور محفل میں آپ کے کپڑوں کو غور سے دیکھا جاتا ہے۔
کشیدہ کاری کے نمونے دیدہ زیب، خوب صورت اور نظر فریب ہونے چاہئیں۔ علاوہ ازیں جدید دور کی تبدیلیوں کا بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہو تو پھر آپ سوسائٹی میں منفرد حیثیت کی حامل ہوجائیں گی۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کے پاس جدید وضع کے ڈیزائن ہوں۔
اِن تینوں کشیدہ کاریوں میں موڈرن ڈیزائن، ہر قسم کی بیلیں، کُرتوں کے گلے، ساڑیوں کے بوڈر، کٹ ورک غرض یہ کہ آپ کی ہر ضرورت کے ڈیزائن ان میں موجود ہیں۔
اِن کے علاوہ مختلف ڈیزائن کی کشیدہ کاریاں
شمع کشیدہ کاری ۱۰ روپے
زینت کشیدہ کاری ۱۴ روپے
فردوس کشیدہ کاری ۱۲ روپے
بانو کشیدہ کاری ۱۵ روپے
شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سمیم انور

راج محل میں ماں بیٹے کا جھگڑا

ہندوستان کی سیاست میں آج کل
ہراج ماتا وجے راج سندھیا اور ان کے لڑکے
راؤ سندھیا کا جھگڑا دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔
بھارتیہ جنتا پارٹی کی نائب صدر ہیں جبکہ
راؤ کانگریس آئی کے ممبر ہیں۔ ماں بیٹے کا
سیاست تک محدود نہیں ہے، بلکہ اِس
ے نے گھر کی فضا کو بھی ناخوش گوار بنا دیا
زشتہ دنوں راج ماتا کے محل کی تلاشی
لی گئی، حکومت کا خیال تھا کہ وہاں سونے
یورات کا خزانہ دبا ہوا ہے۔ ایمرجنسی کے
ز میں راج ماتا کو جیل بھی جانا پڑا تھا۔ اس
ہ کی ابتدا اس وقت ہوئی جب راج ماتا
یس چھوڑ کر جن سنگھ میں شامل ہو گئی تھیں۔

دِلی اور جھانسی کے درمیان گوالیار
ے بڑی ریاست تھی۔ آج سے دو سو سال قبل
شاہ ابدالی نے پانی پت کے مقام پر مرہٹوں
کست دی تو زخمی ہونے والے سرداروں میں
اجی سندھیا بھی تھے۔ جنگ میں اُن کی ٹانگ
ٹ گئی تھی۔ وہ میدانِ جنگ سے کسی طرح بھاگ
لنے میں کام یاب ہو گئے اور گوالیار پہنچ گئے
اداجی ایک قابل سیاست داں تھے۔ انھوں
ر دِلی کے شاہ عالم بادشاہ اور بعد میں انگریزوں
ے گٹھ جوڑ کرکے گوالیار کو ایک بڑی قوت بنا دیا
سابق مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا اسی خاندان
کے چشم و چراغ تھے۔

ہندوستان کے راجہ مہاراجہ عموماً
آپس میں شادیاں کرتے تھے۔ انہیں شاہی اور
نیلے خون میں عام لوگوں کے لال خون کی آمیزش
پسند نہ تھی۔ وجے راج بھی نیپال کے رانا خاندان
سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن کی ماں ایک رانا کی بیٹی
تھیں۔ باپ مدھیہ پردیش کے شہر ساگر میں ڈپٹی کلکٹر

ازدواجی تعلقات کی دنیا میں سب سے عجیب کچہری

پناما (امریکہ) کی کوئی نسل میں آدمی اپنی بیوی کی محبت کے امتحان میں ایک حریف کی طرف پشت کرکے کھڑا ہو جاتا ہے اور اُسے ایک بھاری ڈنڈا اپنی ٹانگوں پر ۳ بار مارنے دیتا ہے مقابل کی اگر ٹانگ ٹوٹ جائے تو وہ اپنی بیوی حریف کو ہار بیٹھتا ہے اور وہ اس بھاری ڈنڈے سے تبھی بچ پاتا ہے جبکہ اس کی بیوی عین موقع پر چلا کر اسے خبردار کر دے۔

تھے۔ وجے راج کی پیدائش ساگر میں ہوئی۔

وجے راج کو اس بات کا فخر ہے کہ وہ پہلی نیپالی لڑکی ہیں جنہوں نے میٹرک پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے پر نیپال کے مہاراجہ نے انہیں ایک ہزار روپیہ انعام دیا تھا۔

وجے راج کی ماں انگریزی داں نہیں تھیں، لیکن وہ سنسکرت اور ہندی جانتی تھیں۔ انہیں جیوتش میں بھی کمال حاصل تھا۔ انہوں نے خود اپنا زائچہ تیار کیا۔ زائچہ دیکھ کر انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ایک بچی کو جنم دیں گی اور اُسے جنم دیتے ہی گزر جائیں گی۔ ان کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔ وجے راج کی پیدائش کو ابھی دس روز بھی نہ گزرے تھے کہ وہ چل بسیں۔ وجے راج کی پرورش ننہال میں ہوئی۔

وجے راج بچپن میں بہت شرارتی تھیں۔ وہ گھر پر نیپالیوں کا مخصوص لبادہ پہنتی تھیں، وہ لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتی تھیں، درختوں پر چڑھتی تھیں۔ اپنے ماموں کے ساتھ شکار پر جاتی تھیں۔ وہ اپنی آزاد پسند طبیعت کو نیپال کی دین بتاتی ہیں۔ نیپال ایک غریب اور پسماندہ ملک تھا۔ لیکن وہ آزاد تھا جب کہ ہندوستان انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔

وجے راج کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ ان کا گھر گڑیوں سے بھرا رہتا تھا۔ ان کی سہیلیاں گڑیوں سے کھیلنے کے لئے ہر وقت اُن کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ وجے راج نیپالی ضرور تھیں لیکن اب ہندوستان ان کا وطن بن چکا تھا۔ جب جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام ہوا تو وجے راج پر اس کا بہت اثر ہوا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس ملک کی بہتری کے لئے کام کریں گی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ پہلی بار اپنے والد کے گھر گئیں، جنہوں نے وجے راج کی ماں کے انتقال کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ باپ کے گھر پہنچ کر وجے راج نے فیصلہ کیا کہ وہ کالج میں داخلہ لیں گی۔ ان کی نانی نے جب یہ بات سنی تو وہ بھڑک اٹھیں۔ ایک شہزادی اور عام لڑکیوں کے ساتھ کالج میں پڑھے یہ بات انہیں ہرگز گوارا نہیں تھی۔ لیکن وجے راج اپنے فیصلہ پر اٹل رہیں۔ ان کے باپ نے اُن کی حوصلہ افزائی کی اور وجے راج نے تھیوسوفیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج کا ماحول اسکول اور گھر کے ماحول سے بہت مختلف تھا۔ وہاں لڑکیاں سادہ لباس پہنتی ہیں۔ وجے راج کے پاس قیمتی اور شاندار کپڑوں کا انبار تھا۔ انہیں خود فیشن ایبل لباس پہننے کا شوق تھا لیکن کالج کا ماحول دیکھ کر ان کا دل ڈوب گیا۔ یہاں وہ قیمتی لباس نہیں پہن سکتی تھیں۔ اس طرح لڑکیوں سے اپنائیت پیدا نہ ہوتی۔ وجے راج نے دل کڑا کرکے سارے قیمتی کپڑے گھر بھیج دئے اور خود سادہ لباس پہننا شروع کر دیا۔

۱۹۴۵ میں وجے راج نے تھیوسوفیکل کالج چھوڑ کر آئی۔ ٹی۔ کالج، لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ لکھنؤ کا ماحول مختلف تھا۔ یہاں وہ قیمتی لباس پہن سکتی تھیں۔ جب وجے راج تھرڈ ایر میں پہنچیں تو چھٹیوں میں اپنے وطن ساگر گئیں۔ وہاں پہنچتے ہی ان کی نانی نے ان کو شادی کرنے پر راضی کر لیا۔ وجے راج نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور لکھنؤ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ ابتدا میں ان کی منگنی ایک فوجی افسر سے ہوئی لیکن وہ لمبے عرصے کے لئے ولایت چلا گیا اور منگنی ٹوٹ گئی۔ پھر مہاراجہ تری پورہ کا نام زیر بحث آیا، لیکن چند وجہوں سے یہ رشتہ بھی منظور نہ ہوا۔ اس اثنا میں معلوم ہوا کہ گوالیار کے مہاراجہ جیاجی راؤ بھی رشتہ کی تلاش میں ہیں۔ وجے راج کے ایک رشتے دار مہاراجہ کے لئے لڑکی کی تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے مہاراجہ کو وجے راج کا فوٹو دکھایا تو وہ لڑکی سے ملنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کا بر دکھاوا بمبئی میں ہوا وجے راج اپنی نانی کے ساتھ بمبئی گئیں اور تاج محل ہوٹل میں قیام کیا۔ مہاراجہ کی اپنی کوٹھی سمندر محل ورلی کے پاس تھی۔ بر دکھاوے کے وقت مہاراجہ نے وجے راج کو قریب سے دیکھا، لیکن ان سے کوئی بات نہیں کی، نانی سے بات چیت کرتے رہے

ی دیر بعد انہوں نے سب کو بمبئی کے
کورس میں ریس دیکھنے کی پیش کش کی۔
اجہ ریس کے شوقین تھے۔ اُن کے اپنے گھوڑے
ریس میں دوڑتے تھے۔ غالباً وہ یہ بات آزمانا چاہتے تھے
راج اُن کے لئے خوش نصیبی کی علامت ہیں یا نہیں۔
یس میں ان کا گھوڑا جیت گیا تو یہ شادی کے
یک شگون ثابت ہوگا۔ وجے راج کی قسمت
تھی۔ ریس میں مہاراجہ کے ایک چھوڑ دو
جیتے، چنانچہ مہاراجہ نے وجے راج سے
ی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

شادی کے بعد وجے راج گوالیار پہنچیں
وں نے وہاں کی عورتوں کی فلاح و بہبود
لئے کام شروع کیا۔ انہوں نے عورتوں کے
ایک کالج کھولا، جہاں بی اے تک تعلیم مفت تھی۔

وجے راج مہارانی گوالیار بن گیئں۔
لیار ان کی زندگی کا محور بن گیا۔ ان کی زندگی
ام سے گزر رہی تھی۔ ان کو سیاست سے دُور
بھی واسطہ نہیں تھا لیکن آج سیاست ان
اوڑھنا بچھونا ہے۔ سیاست میں ان کے
۱۹۵۰
خلے کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ یہ فروری
بات ہے۔ وجے راج گوالیار میں تھیں، مہاراجہ
ئی میں تھے۔ گوالیار کے گونا انتخابی حلقے میں
یک آدمی پارلیمنٹ کے حلقے کے لئے کھڑا ہوا تو
س نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ مہاراجہ کا
ندو مہاسبھا کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے۔ مہاراجہ
و سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وجے راج
نے جب یہ الزام سُنا تو انہوں نے مہاراجہ کو بمبئی
رنک کال کی، لیکن مہاراجہ نے انہیں ٹال دیا۔
جے راج سیدھی دلی آئیں اور پنڈت نہرو سے
ملیں اور اپنی شکایت اُن کے سامنے پیش کی۔
پنڈت نہرو نے اُن کی بات صبر سے سُنی۔ انہوں

سب سے انوکھی تواریخی شادیاں (۱۸۵۵)

تلبھد (ہندوستان) کے راجہ شیواجی پاس لئے رنجیدہ رہتے تھے کہ ان کے کوئی وارث بیٹا نہیں تھا۔ بیٹے کی حصول کے لئے انہوں نے ایک ہی دن میں ۱۷ بیویاں بنائیں۔ ایک بار میں ۹ لڑکیوں سے اور باقی شام دیگر لڑکیوں سے شادی کی مگر پھر بھی بیٹا پانے نہ وہ سورگ سدھارے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کا راج پاٹ بھی چھین لیا۔

نے اس کا یہ حل نکالا کر خود مہارانی کو اس سیٹ کی پیش کش کر دی۔ مہارانی ان کی یہ پیش کش سُن کر حیران رہ گیئں۔ فارم بھرنے کی تاریخ سر پر تھی۔ انہوں نے پنڈت جی کی پیش کش قبول کر لی اور پھر وہ الیکشن جیت گیئں۔

۱۹۶۱ میں مہاراجہ کا اچانک انتقال ہو گیا، انتقال کے وقت ان کی عمر ۴۵ سال تھی۔ وجے راج پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ انہوں نے گھر سے نکلنا بند کر دیا اور اس دَوران الیکشن کا دوسرا دَور بھی آ گیا۔ پنڈت جی نے انہیں پھر اس علاقے سے کھڑا ہونے کی پیش کش کی لیکن وجے راج اس وقت الیکشن لڑنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ انہوں نے ٹال مٹول کی لیکن پنڈت جی کا اصرار بڑھ گیا۔ ناچار وہ راضی ہو گیئں لیکن وہ الیکشن کے لئے گھر سے باہر نہیں نکلیں۔ اس کے باوجود وہ انتخاب جیت گیئں۔

وجے راج کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہوئیں، لیکن آہستہ آہستہ ان کا دل کانگریس سے بیزار ہو گیا۔ اُن کے ایک قریبی معتمد سردار آنگرے اس وقت جن سنگھ سے وابستہ تھے۔ انہوں نے وجے راج کو جن سنگھ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا۔ وہ جن سنگھ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑیں اور جیت گیئں۔ یہیں سے اُن کے بیٹے سے اختلافات اُن سے الگ ہونے شروع ہو گئے۔ انہوں نے ماں کی اتحادی جماعت میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد دونوں میں فاصلہ بڑھتا گیا۔ سادھو راؤ اندرا گاندھی کے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے علی الاعلان ماں کی مخالفت کی تو وجے راج کا دل ٹوٹ گیا۔ سادھو راؤ ان کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ انہوں نے بیٹے کو بڑے لاڈ پیار سے پالا، انہیں آکسفورڈ بھیجا۔ یورپ میں تعلیم دلائی۔ لیکن ایمرجنسی کے دَوران میں جب وجے راج جیل گیئں تو سادھو راؤ اپنی بیوی کو لے کر یورپ چلے گئے۔

وجے راج ایک بار اپنے بیٹے سے ملنے اسپتال گیئں جہاں وہ زیر علاج تھے۔ تو اسپتال کے کمرے میں خاموشی طاری رہی، اُن کے بیٹے اور بہو نے اُن سے کوئی بات نہ کی۔ گوالیار میں اُن کی غیر حاضری کے دَوران اُن کے گھر کی خانہ تلاشی بھی ہوئی۔ اب ماں بیٹے کے بیچ میں ایک خلیج حائل ہے، جس کا پاٹنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ■■

تبسم

ویت نام کی جنگ جاری تھی۔ رات کے وقت ایک امریکی سپاہی غلطی سے اپنی ہی طرف کے ممنوعہ علاقے کی طرف جا نکلا۔ دوسری طرف سے مسلح پہرے دار کی آواز آئی "رک جاؤ!"

امریکی سپاہی نے آواز پہچان لی اور کہا "میں بھی امریکی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، اپنے قومی ترانے کا پانچواں بند سناؤ۔" پہرے دار نے مطمئن ہونے کی غرض سے مطالبہ کیا۔

"مجھے، نہیں آتا۔" سپاہی بولا۔

"ٹھیک ہے آجاؤ۔ تم اپنے ہی آدمی ہو۔" پہرے دار نے کہا۔

●

نجومی: آپ کی قسمت کا ستارہ بلند ہے۔ جلد ہی آپ کے گھر میں بے سان گمان ایک بڑی دولت آنے والی ہے۔ کیا آپ نے لاٹری کا ٹکٹ خریدا ہے یا سٹّا لگایا ہے؟ ذرا سوچیئے۔

گاہک: لاٹری یا سٹّے سے تو میں دور ہی رہتا ہوں۔ البتہ ابھی دو دن ہوئے میں نے اپنی زندگی کا بیمہ ضرور کرایا ہے۔

●

پولیس انسپکٹر نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے کسی شخص کی آواز آئی "انسپکٹر صاحب، میری کار کا اسٹیرنگ وھیل، بریک، ایکسی لریٹر اور ڈیش بورڈ وغیرہ غائب ہوگیا ہے جلد آئیے!"

پتہ پوچھنے کے بعد پولیس انسپکٹر روانہ ہونے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسی شخص کی آواز تھی۔ "معاف کیجیے گا انسپکٹر صاحب میں غلطی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔"

●

استاد: بتاؤ، مچھر دانی کیوں لگاتے ہیں؟

حامد: تاکہ مچھر اس میں رہیں۔

●

ٹیچر: رحیم، تمہیں یہ سوچ کر تعجب نہیں ہوتا کہ انڈے سے بچے کیسے پیدا ہوتے ہیں؟

رحیم: ہوتا ہے سر۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ وہ اس کے اندر کیسے پہنچ جاتے ہیں۔

●

جج: (چور سے) جانتے ہو، تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟

چور: جی ہاں، جانتا ہوں۔

جج: تو بتاؤ۔

چور: آپ سے تعارف کرانے کے لئے۔

●

استاد: الٹے بانس بریلی سے تم کیا سمجھتے ہو؟

بچہ: صرف اتنا کہ بریلی میں بانس الٹے کرکے رکھے جاتے ہیں۔

●

دو شرابی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ پہلے نے کہا میں کچھ دن میں بھارت کا پردھان منتری بنوں گا۔

دوسرا شرابی بولا "اے مسٹر، تم ابھی پردھان منتری نہیں بن سکتے۔"

پہلے شرابی نے کہا "کیوں نہیں بن سکتا؟ تم دیکھتے ہی رہنا، میں پردھان منتری ضرور بنوں گا۔"

دوسرے شرابی نے دلیل دی "جب تک میں استعفیٰ نہ دوں گا، تم پردھان منتری کیسے بن سکوگے؟"

●

ایک لنگڑے بھکاری کو دیکھ کر ایک بوڑھے شخص نے کہا "سچ مچ لنگڑا ہونا بڑا تکلیف دہ ہے۔ لیکن غنیمت ہے تم اندھے نہیں ہو، ورنہ تمہیں اور بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔"

بھکاری بولا "آپ سچ کہتے ہیں، حضور! جب میں اندھا تھا تو لوگ مجھے کھوٹے سکے دے جاتے تھے۔"

●

خود بھی ہنسیے، دوسروں کو بھی ہنسائیے۔ نئے نئے، مزہ دار چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجیے۔ پرانے گھسے پٹے، بار بار سنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجیے، کیوں کہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

حسب نسب

مسرور جہاں

میں نے رات کی آخری دعا ختم کی۔ اور بائبل کو آنکھوں سے لگا کر اس کی مخصوص جگہ پر رکھ دیا۔ پھر یسوع مسیح کے مجسمے کے سامنے آنکھیں بند کر کے چند منٹ گزارا۔ اپنے ہاتھوں سے سینے پر صلیب کا نشان بنا کر۔ آنکھیں بند کر کے کھڑے ہونے سے مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ اس وقت میں دل ہی دل میں اپنی پورے دن کی مصروفیت کا جائزہ لیتے ہوئے سوچتا ہوں کہ مجھ سے کوئی غلط کام تو سرزد نہیں ہو گیا۔ کسی کی دل شکنی، کسی کی حق تلفی، جھوٹ یا بے ایمانی یا کسی کے ساتھ زیادتی تو میں نے نہیں کی۔

اپنا محاسبہ کرتے ہوئے میں اپنے ساتھ بھی رعایت نہیں کرتا۔ اس وقت میرے سامنے چرچ کا ایک معزز پادری نہیں، ایک عام انسان ہوتا ہے جو خامی ہے، گناہ گار ہے، غلط کار ہے اور جسے ایک عام انسان کی طرح اپنے گناہوں کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور یسوع مسیح کے حضور میں صدق دل سے اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگنی پڑتی ہے۔ توبہ بھی کرنا ہوتی ہے اور اپنے آپ سے وعدہ بھی کرنا ہوتا ہے کہ کل جب نیا سورج طلوع ہوگا تو میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس کے سبب مجھے اس پاک مسیح کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ تو ایسے وقت جب میں اپنا محاسبہ کر رہا تھا۔ مجھے اپنے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں اس چاپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ ڈیوڈ ہے۔ ڈیوڈ میتھیو، میرا بیٹا لیکن یہ وقت تو اس کے آنے کا نہیں ہے۔ اس وقت تو اس کو کلب میں ہونا چاہیے تھا۔ اپنی دوست جیکولین کے ساتھ۔ ان دونوں کی دوستی کچھ ایسی زیادہ پرانی تو نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے بڑی جلدی دوستی، پیار اور محبت کی کئی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اور اب انھوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔

جیکولین: خوب صورت، باحیا اور سلیقہ مند

اس عمر میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے عشق کا بخار بہت تیزی سے بڑھتا ہے اور ۱۰۰ ڈگری پر پہنچ جاتا ہے وارفتگی ایک نشہ بن کر چھا جاتی ہے لیکن ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجش پیدا ہونا بھی ضروری ہے۔

لڑکی ہے اور عام عیسائی لڑکیوں کی طرح بہت زیادہ آزاد خیال اور بگڑی ہوئی نہیں ہے۔ ورنہ شاید ڈیوڈ بھی اس کو شادی کے لئے پسند نہیں کرتا۔ کیوں کہ وہ بے حد قدامت پسند رجحانات رکھتا ہے یہ شاید اس کے ماحول کا اثر ہے۔ جہاں ہر وقت گناہ و ثواب، نیکی و بدی اور خیر و شر کا ذکر ہوتا ہے ایسے ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کی ذہنی تربیت خود بخود اسی نہج پر ہوتی ہے اور یہ ایک بالکل فطری بات ہے۔ اس کے لئے کسی شعوری کاوش کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ڈیوڈ کئی ہفتے سے عموماً آدھی رات کے بعد ہی کلب سے لوٹتا ہے اور ایک نظر میرے اوپر ڈال کر سونے کے لئے چلا جاتا ہے۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول ہے جس میں بس کبھی تبدیلی ہوتی ہے۔ وہ بھی کسی خاص بات کے نتیجے میں۔ اس وقت بھی اس کا آنا بالکل خلاف معمول اور خلافِ امید تھا اور اس کے پیروں کی ہلکی ہلکی لیکن مضطربانہ چاپ سے میں نے اندازہ لگایا کہ بات کچھ زیادہ خوش گوار نہیں ہے۔ میں نے خود کو ذہنی طور سے اس نئی اور خراب بات کے لئے تیار کر لیا اور آنکھیں کھولنے سے پہلے میں نے اس کے سکون اور سلامتی کے لئے دعا مانگی اور دل ہی دل میں آمین کہہ کر آنکھیں کھول دیں۔

ڈیوڈ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا مجھ کو ہی دیکھ رہا تھا اور شاید دعا ختم کرنے کا منتظر تھا مجھے دعا سے فارغ پا کر وہ اضطراب میں ایک قدم میری طرف بڑھا اور رک گیا۔ کچھ کہنے کے لئے اس کے لب ہلے۔ لیکن آواز نہ نکلی۔ شاید وہ اچانک مجھے ٹوکنا بے ادبی خیال کر رہا تھا۔ یہ محسوس کر کے میں نے بات شروع کی۔

"کیا بات ہے ڈیوڈ؟ آج تم کلب سے بہت جلد واپس آگئے۔؟"

"جی پاپا۔" وہ آہستہ سے بولا۔ اور ایک نیچی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس کو کھڑا ہونا دوبھر لگ رہا تھا میں نے سگار سلگا لیا اور اس کی بے وقت آمد اور اضطرابی کیفیت کے متعلق سوچتا ہوا اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

ذرا دیر خاموشی رہی۔ سگار کا ایک طویل کش لے کر میں نے سکوت توڑا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے۔ ڈیوڈ؟ تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔"

"پاپا! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"کس بات کے لئے شرمندہ ہو مائی ڈیر۔ کچھ بتاؤ بھی تو۔"

"جیکولین کے معاملے میں۔" اس نے ہولے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"میں نے تو کبھی تمہاری دوستی پر اعتراض نہیں کیا۔ پھر شرمندگی کیسی۔"

"کاش! آپ نے ایسا کیا ہوتا پاپا۔"

"لیکن کیوں۔؟ جیکولین ایک اچھی لڑکی ہے۔ مجھے بھی پسند ہے اس سے تمہاری لڑائی تو نہیں ہوگئی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ میں جس کو کوئی بہت اہم بات سمجھ رہا تھا وہ بہت معمولی نکلی۔ اور یہ اچھا ہی تھا۔

"میں نے ہمیشہ کے لئے اس سے تعلق توڑ لیا ہے پاپا۔" ڈیوڈ نے کہا

"اس عمر میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے عشق کا بخار بہت تیزی سے بڑھتا ہے اور ۱۰۰ ڈگری پر پہنچ جاتا ہے۔ وارفتگی ایک نشہ بن کر چھا جاتی ہے لیکن ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجش پیدا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بھی عشق کا ایک نہایت ضروری حصہ ہے اس کے بغیر تو یا محبت کی تکمیل ہی نہیں ہوتی۔ پھر یہ جھگڑے یا چند روز کے بعد مطلع بالکل صاف ہو جاتا ہے [illegible] ہے کہ کبھی ان کے گلستانِ الفت پر رنجش [illegible] کدورت کے بادل چھائے ہی نہیں تھے بلکہ ہمیشہ [illegible] وفا کا سورج چمکتا رہا تھا۔ ان دونوں نے بھی یہ مان لیا کچھ ہوا ہوگا اور یہ جذباتی [illegible] بے وقوف لڑکا [illegible] پیاری سی لڑکی سے تعلق توڑنے کا اعلان کر کے چلا آیا۔ اور اس وقت وہ بے چاری تکیے میں مونہہ چھپائے بن موسم کی برسات کر رہی ہوگی۔

"کوئی بات بھی تو ہو۔ [illegible] ذرا سی بات پر اتنا گہرا تعلق توڑنا۔ نادانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ بات دراصل کچھ بھی نہ ہوگی سوائے اس کے کہ آج جیکولین نے تمہاری پسند کا لباس نہ پہنا ہوگا۔ یا پھر اس نے [illegible] دوست لڑکے سے بات چیت کی ہوگی۔ جس کو تم خوامخواہ ہی سخت ناپسند کرتے ہو۔ کیوں؟ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔؟" میں نے پورے وثوق سے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہولے سے سگار کے کش لینے لگا۔

"پاپا! بات کچھ زیادہ ہی سیریس ہے!"

"کیا واقعی۔" میں نے اس سیریس بات کا وزن ہلکا کرنے کے لئے ذرا مذاقیہ لہجہ اختیار کیا۔

> میں تو اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ سوسائٹی میں مجھے گری ہوئی نظر سے دیکھا جائے اور میرا مذاق اڑایا جائے کہ میری بیوی کو ورثے میں اپنے باپ کا نام تک نہیں ملا اور اس کی ولدیت کا خانہ خالی ہے

تم کا مذاق میں اکثر ڈیوڈ سے کرتا ہوں۔ لیکن یہ کیا۔ ڈیوڈ تو سچ مچ سنجیدہ تھا۔ نہ مسکرایا۔ نہ اثبات میں سر ہلایا بلکہ کچھ اداس ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بات کچھ نہ کچھ سیریس ضرور تھی۔

"مجھے پوری بات بتاؤ۔ مائی ڈیئر۔ تب سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔"

"پاپا، جیکولین، بہت جھوٹی، فریبی، اور دھوکے باز نکلی۔ میں اسے ایسا گرا ہوا نہیں سمجھتا تھا۔"

"کیا تم سے پہلے بھی اس کا کسی اور سے افیئر رہ چکا ہے؟"

"خیر یہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ تم بھی چند ماہ قبل فلورا میں دلچسپی لیتے تھے۔ بلکہ میں تو یہاں تک سمجھ رہا تھا کہ تم فلورا کے معاملے میں سنجیدہ ہو لیکن جب وہ پچھلے دنوں اس آدمی مین سے شادی کر کے چلی گئی تو میں نے بھی وہ باب بند کر دیا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ شاید اس طرح وہ قائل ہو جائے۔

"میں اتنا نیرو مائنڈڈ نہیں ہوں پاپا کہ ایسی معمولی باتوں پر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر بیٹھوں۔ بات دراصل کچھ اور ہے۔"

"وہ بھی کہہ ڈالو۔" ڈیوڈ کا تذبذب دیکھ کر مجھے سخت الجھن ہو رہی تھی۔

"جیکولین ـــ جیکی، ایک ناجائز اولاد ہے۔ اس کے باپ نے ـــ وہ جو کوئی بھی تھا ـــ اسے قبول نہیں کیا ـــ اور اس نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی اور کہا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ اتنی بڑی بات میں کیسے برداشت کرتا؟"

ڈیوڈ کے لہجے سے غصہ، دکھ، شرمندگی اور پچھتاوا جھلک رہا تھا۔ یقیناً اسے اچانک یہ بات سن کر شاک لگا ہوگا۔ کیوں کہ اتنی چھوٹی سی معصوم سی لڑکی کے لئے وہ ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب جو معلوم ہوا تو وہ اپنے آپ میں نہیں رہا۔ لیکن بات کو ہلکا اور غیر اہم بنانے کے لئے میں نے سکون سے کہا "خیر یہ بات تو سچ ہو سکتی ہے کہ اس کا وہ بزدل باپ جس نے اس کو قبول کرنے کی ہمت نہیں کی، مر چکا ہو۔ بلکہ مرے ہوئے کہنا تو کوئی جرم نہیں ہے۔ کچھ بھی کہو، میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ بات تم کو کیسے معلوم ہوئی؟"

"بالکل غیب سے۔ وہ کافی عرصہ پہلے بنگلو میں اس کے پڑوسی تھے اور اس کے بارے میں سچی صورت حال جانتے ہیں۔"

"تم نے جیکولین سے اس کی تصدیق کی؟"

"جی ـــ اور اس نے اعتراف کر لیا ہے کہ یہ بات سچ ہے۔"

"یعنی اس نے تم سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔"

"اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا پاپا۔ اسے تو یہ بات بہت پہلے ہی مجھے بتا دینی چاہئے تھی۔ یعنی جب بات دوستی سے آگے بڑھی تھی۔ اس وقت شاید میں اس کے بارے میں ہمدردی سے سوچتا۔ لیکن اب ـــ اب تو اسے سراسر دھوکا اور فریب ہی کہا جا سکتا ہے اور ان حالات میں مجھے اس سے ہمدردی ہونا تو دور رہا۔ الٹے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔"

"تمہاری شکایت اور غصہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن ایسا تو ہماری اس سوسائٹی میں اکثر ہوتا ہے ـــ اگر سب لوگ تمہاری طرح فیصلے کرنے لگیں تو آدمی سے زیادہ لڑکیاں ساری زندگی کنواری رہ جائیں۔ ان کو بھی شادی کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ ماں کی غلطی کا کفارہ لڑکی ادا کرے یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

"میں تو اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ سوسائٹی میں مجھے گری ہوئی نظر سے دیکھا جائے اور میرا مذاق اس لئے اڑایا جائے کہ میری بیوی کو ورثے میں اپنے باپ کا نام تک نہیں ملا اور اس کی ولدیت کا خانہ خالی ہے۔"

"مائی ڈیئر، کوئی لڑکی اپنے منہ سے یہ بات نہیں کہے گی کہ وہ ایک ناجائز اولاد ہے۔ اور جب بات جائز، ناجائز کی ہو تو صرف لڑکی ہی کیوں، لڑکے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔"

"یہ ٹھیک پاپا، میں کب کہہ رہا ہوں کہ لڑکے اس سے الگ ہیں یا ان کو چھوٹ ملنا چاہئے؟ شرافت کے اصول تو سب کے لئے یکساں ہیں اس سوسائٹی میں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی، ایک پل کچھ سوچا پھر آہستہ سے کہا۔

"ڈیوڈ، ہماری سوسائٹی میں آزادی اور بے راہ روی کے بڑھتے ہوئے رجحان نے ہمیں بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اس کا تدارک کیسے کیا جائے۔ کیا ایسی تمام اولادوں کو، خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، راندۂ درگاہ کر کے چھوڑ دیا جائے یا انہیں باعزت بننے کا موقع فراہم کیا جائے؟ میرے خیال میں دوسری بات زیادہ مناسب ہے۔ تمہارا خیال ہے میرے بچے؟"

آپ کو ہولی فادر نے اصلاح کے لئے

مراقش کے نیلے لوگ

ذرا گھاٹی کی بربر نسل اپنے کپڑوں کو
ایک ایسے نیلے انڈیگو رنگ میں رنگ لیتی
ہے جو دھیرے دھیرے ان کے پورے
جسم کو مستقل طور پر نیلا کر دیتے ہیں۔

اس دنیا میں بھیجا ہے۔ اس لئے آپ کا یہ سوچنا درست ہے لیکن میں نے سوسائٹی کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اس لئے میں تو پوری کوشش کروں گا کہ میرے بے داغ حسب نسب میں میری کسی لغزش یا نادانی کے سبب کوئی کھوٹ پیدا نہ ہو ورنہ میرا ضمیر ہمیشہ مجھے ملامت کرتا رہے گا۔" ڈیوڈ نے ذرا غرور سے کہا۔

"تو کیا تم نے جیکولین کو صاف جواب دے دیا۔" میں نے دوسرا سگار سلگا لیا۔ اور آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔ گفتگو طویل ہوتی جا رہی تھی اور ڈیوڈ کے اٹھنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے میں بھی نہ جانے کیوں بات ختم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ دراصل ڈیوڈ کے اس جذباتی دورے کو ختم کرنے کے لئے میں خود اس سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔

ڈیوڈ نے میری بات کا جواب پورے جوش و خروش سے دیا۔

"جی ہاں پاپا" میں نے اس سے دو ٹوک بات کر لی اور اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔

اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تمہارا فیصلہ قطعی غلط ہے۔ اس لئے جاؤ اور اسی وقت جا کر جیکولین سے معافی مانگو تو برخودار دلوں کے فیصلے ان سطحی باتوں سے اوپر اٹھ کر کرنے چاہئیں۔ تمہاری پست ذہنیت پر مجھے افسوس ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ تمہاری پرورش اور تربیت کے دوران کہیں مجھ سے ہی تو کوئی غلطی نہیں ہو گئی۔ تمہاری سوچ کا یہ انداز میری کوتاہی کا نتیجہ تو نہیں ہے؟"

"پاپا، آپ — آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" ڈیوڈ کا مونہہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ شاید اسے مجھ سے ایسی باتوں کی امید نہیں تھی۔ الٹے وہ مجھ سے اپنے اس اقدام کے لئے تعریف کا خواہاں تھا۔

"پاپا، کیا آپ کا اونچا خاندان، اعلیٰ پوزیشن قابل قدر حسب نسب اس بات کو برداشت کرے گا۔ کہ آپ کی بہو ایک بے نام و نشان لڑکی ہو اور آئندہ ہمارا خاندان ایک ناجائز لڑکی کے رحم و کرم پر پھولے پھلے۔"

"ہاں — کیوں نہیں؟ آخر اس میں کون سی قباحت ہے ڈیر۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔"

"آ جائیں گی — ذرا تحمل سے میری باتیں سنو۔ میں تم کو ایک کہانی سناتا ہوں۔ تب شاید میری بات تمہاری سمجھ میں زیادہ اچھی طرح آ جائے۔"

میں چند منٹ خاموش رہا اور بات شروع کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب کرتا رہا۔ "کئی برس پہلے غالباً پچیس سال قبل کی بات ہے، ان دنوں میں گوا کے ایک چھوٹے سے قصبے میں چرچ کا پادری تھا" میں نے بات شروع کی۔ "گوا کی لڑکیاں اور لڑکے آزاد خیال ناچ گانے اور سیر و تفریح کے رسیا رہے ہیں۔ وہاں باقاعدہ ایسے میلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں لڑکے اور لڑکیوں کو ملنے جلنے کی پوری آزادی میسر ہوتی ہے اور یہ رنگا رنگ تقریبیں گوا کے کلچر کا حصہ ہیں۔ — ایلا بھی اس تہذیب کی پیداوار تھی، بے حد خوب صورت، معصوم، لیکن شوخ و شنگ — وہ اکثر اپنی ماں کے ساتھ چرچ آتی تھی اس کا باپ بچپن ہی میں مر گیا تھا۔ اس لئے میں ایلا کی ماں کو اکثر اس کے خرچ کے لئے روپے پیسے دے دیتا تھا۔ ایلا کی ماں کی صحت خراب رہتی تھی۔ اور وہ اس کی شادی جلد سے جلد کر دینا چاہتی تھی ان ہی دنوں جہاز پر کام کرنے والے ایک کیپٹن نے ایلا کو پسند کیا اور ان دونوں کی منگنی ہو گئی، شادی چند مہینے کے بعد۔ ایک بڑے تیوہار کے موقع پر ہونا طے پائی تھی — ایلا کی ماں اس رشتے سے بہت خوش تھی۔ ایک روز ایلا کی ماں گھبرائی گھبرائی میرے پاس آئی اور اس نے ایک ایسی بات بتائی جسے سن کر میں بھی ایک بار شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے بتایا کہ ایلا ماں بننے والی ہے۔ کنواری ماں۔ اور اگر یہ بات کیپٹن کو معلوم ہو گئی تو وہ اس سے شادی نہیں کرے گا۔ اور ان کی سخت بے عزتی اور بدنامی ہو گی، بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اسے رائے دی کہ وہ ایلا کو لے کر کسی دور افتادہ مقام پر چلی جائے اور بچے کی ولادت کے بعد واپس آ جائے اس طرح بات کھلے گی نہیں خوش قسمتی سے ان ہی دنوں کیپٹن اپنے جہاز کے ساتھ ملک سے باہر چلا گیا اور ایلا کو

ہوسے کر بمبئی چلی گئی۔ جہاں اس کی بہن
۔ جو ایک اسپتال میں نرس تھی یوں بچے کی
کا مسئلہ آسانی سے طے ہوگیا۔ جب ایلا واپس
تو وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت اور معصوم
تھی۔ اور اسے دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا
نے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔ کچھ دن کے بعد
آگیا اور ان کی شادی ہوگئی۔ مجھے یقین ہے
ں نے ایک خوش و خرم زندگی گذاری ہوگی
شادی کے کچھ دن کے بعد ہی میں نے گوا
تھا۔ پھر ہماری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔

"اس بچے کا کیا ہوا پاپا؟" ڈیوڈ نے بے تابی
چھا۔ وہ اضطراب میں اپنے دونوں ہاتھ مل

"شاید میں تم کو یہ بات بتانا بھول گیا کہ
ل سے میں نے اس بچے کی پرورش کا وعدہ
کیا تھا اور میں نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا۔ اس بچے
کی میں نے ہی پرورش کی۔ اپنا بیٹا بنا کر۔"

"پاپا! کیا۔ میں۔ میں۔ ایلا" ڈیوڈ چیخ اٹھا۔

"ہاں بیٹا۔ تم ایلا کے بیٹے تھے لیکن اب میرے بیٹے ہو۔ ایک معزز پادری ریورنڈ ٹیسل کے بیٹے جسے اپنے اعلیٰ حسب نسب پر ناز ہے بیٹے یہ سب کہنے سے میرا مطلب یہ تھا کہ غلطی تو ہر انسان سے ہوسکتی ہے اور اس کو اپنے کئے کی کچھ نہ کچھ سزا بھی ضرور ملنا چاہیے لیکن سزا دینے کا حق تو پیدا کرنے والے نے اپنے پاس رکھا ہے۔ اور پھر بڑا پن اسی میں ہے کہ ہم کسی بے قصور کو سزا دینے کے بجائے معاف کردیں۔ تم بھی جیسکی کو معاف کردو کیوں کہ وہ بے قصور ہے۔ اور تم سے محبت کرتی ہے۔"

ڈیوڈ اضطراب کے عالم میں کھڑا ہوگیا

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے ڈارلنگ؟"

"میں جیکی کے پاس جا رہا ہوں پاپا۔ اس سے معافی مانگنے۔" وہ سچ مچ بہت شرمندہ نظر آرہا تھا۔

"شاباش، ضرور جاؤ۔ لیکن ایلا کے نہیں، میرے بیٹے بن کر کیوں کہ میں اپنی تمام تر عزت اور پوزیشن کے باوجود جیسکی کو اپنی بہو بنانے کے لئے تیار ہوں۔"

ڈیوڈ نے میرے گال کا بوسہ لیا۔ اور تقریباً بھاگتا ہوا میرے کمرے سے نکل گیا میں نے پیار سے اس کو جاتے ہوئے دیکھا اور پھر میری نظریں اس تصویر پر مرکوز ہوگئیں جس میں ماں میری ننھے جیزس کرائسٹ کو گود میں لئے مسکرا رہی تھیں میرا سر فرط عقیدت اور محبت سے جھکتا چلا گیا اور میں صلیب کا نشان سینے پر بناتا ہوا اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔

انگوٹھی جو ایک مچھلی کے ذریعہ واپس لائی گئی:

پیرس (فرانس) کی مادام ایڈی گیوربریٹ کی انگوٹھی باورچی خانہ میں کام کرتے وقت کھوگئی جو انہیں کچھ دن بعد اس مچھلی سے واپس مل گئی جسے وہ بازار سے خرید کر لائی تھیں۔
انگوٹھی باورچی خانہ کی نالی میں گری ہوئی تھی جہاں سے وہ ندی تک پہنچ گئی اور وہاں ایک مچھلی کے ذریعہ نگل لی گئی جسے خود مادام نے خریدا اور اس طرح موجودہ زمانہ میں یہ اتفاق کی سب سے زیادہ تعجب خیز مثال بن گئی (۱۹۰۳)

ہر ماں اور باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کا لاڈلا دنیا کی آنکھ کا تارا بنے ۔ صرف اُن کا ہی نہیں، قوم کا مُلک کا بھی نام روشن کرے، دُنیا کی ذمّہ داریوں کا بوجھ اُٹھائے ۔ یہ خواہش اپنی جگہ ٹھیک ہے، مگر آپ نے اِس سلسلے میں کیا کچھ کیا ہے ۔ اس کی ابتدا پنگوڑے میں ہی کرنی چاہیئے ۔ اپنے لاڈلے کو **"ممتا"** دیجئے، یہ ننھے بچّوں کا خاص ٹانک ہے، جو ایک ماں کی طرح ان کی حفاظت کرتا ہے ۔ جسم میں کیلشیم کی کمی کو دُور کر کے ہڈیوں کے ٹیڑھے پن کو روکتا ہے ۔ ننھے بے زبان بچّوں کو قبض سے نجات دلاتا ہے ۔ نزلہ اور زکام میں بھی مفید ہے ۔ بچّوں کو ہنستا اور خوش و خرّم رکھنا ہی **"ممتا"** کا کام ہے ۔ اپنے بچّے سے پیار ہے تو اُسے **"ممتا"** ہی دیجئے اور دیکھئے وہ کتنی جلدی جلدی پروان چڑھتا ہے ۔

قیمت فی شیشی : آٹھ روپے

شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) **لیبارٹیریز**، لال کنواں، دہلی ۶

کافی کی کہانی

سلطان کریم

شمالی ہندوستان میں چلنے کا رواج
. لیکن جنوبی ہندوستان میں کافی کا رواج
ں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہوگا جہاں کافی
ہو۔ کافی کی اہمیت کا اندازہ اس بات
جاسکتا ہے کہ جب لڑکے والے لڑکی کو
تے ہیں تو اُن کی سب سے پہلی فرمائش یہی
کہ لڑکی اُنہیں کافی بنا کر پلائے۔ اگر لڑکی
ار کافی بنا کر مہمانوں کو پیش کر دی تو گویا
میدان مار لیا۔

کافی پینے والوں کی آبادی جنوبی ہندوستان
محدود نہیں۔ یہ ساری دُنیا کا پسندیدہ مشروب
ی اسے بغیر دودھ کے پیتا ہے تو کوئی
کریم اور شکر ڈال کر۔ عرب کافی کے
دیتے ہیں۔ وہ صرف اس کا چھلکا
پیتے ہیں۔ وہاں یہ قہوہ کہلاتا ہے اور
بغیر دودھ کے پیا جاتا ہے۔ عربوں کا خیال ہے کہ کافی
کے بیج طبیعت میں ہیجان پیدا کرتے ہیں، اس لئے
وہ اس کے چھلکے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

کافی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ کچھ
مورخین اس کی عمر ڈھائی ہزار سال بتاتے ہیں۔
یمن کی بندرگاہ موخا سے کافی ساری دُنیا میں
برآمد ہوتی تھی۔ افریقہ میں لوگ کافی کے بیج
پکا کر کھاتے تھے۔ وہاں کافی مشروب کی بجائے
غذا کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کے
متعلق ایک کہانی بھی مشہور ہے۔ حبش کے ایک
گوالے نے کافی کے بیج چارے میں ملا کر اپنی بکریوں
کو کھلائے تو وہ میدان میں چھلانگیں مارنے لگیں
ان کی چستی اور پھرتی دیکھ کر گوالا حیران رہ گیا۔ اس
نے کافی کے کچھ بیج ایک خانقاہ کے پادری کو پیش
کئے۔ پادری نے انہیں نشہ آور چیز سمجھ کر آتش دان
میں پھینک دیا۔ کافی کے بیج آگ میں جلنے لگے تو
ایک عجیب خوشبو پیدا ہوئی۔ پادری نے جلے ہوئے
بیج آتش دان سے نکالے اور انہیں پیس کر اور
پانی میں اُبال کر خانقاہ کے طالب علموں کو پلائے
یہ مشروب پینے کے بعد لوگوں نے تازگی اور چستی
محسوس کی۔ اس کے بعد پادری نے کافی کا باقاعدہ
استعمال شروع کر دیا۔ خیر یہ تو ایک کہانی ہے لیکن
یہ ایک حقیقت ہے کہ کافی مشروب کی شکل میں پہلی
بار عرب میں استعمال ہوئی۔ غالباً پہلا قہوہ خانہ
مکہ میں قائم ہوا۔ رفتہ رفتہ قہوہ خانہ عرب کی سماجی
زندگی کا جزو بن گیا۔ لوگ یہاں مذہب، سیاست
اور ادب پر بحث کرتے تھے۔ بعض ملکوں میں
قہوہ خانے انقلابیوں کا اڈہ بن گئے۔

سترہویں صدی میں کافی پہلی بار یورپ

کافی بورڈ کے کارکن کافی کے مختلف نمونوں کو چکھ کر اُن کی خوبی اور خامی پرکھ رہے ہیں۔

پہنچی تو اس کا داخلہ اِٹلی سے شروع ہوا۔ اٹلی کا جنوبی حصہ سسلی عربوں کے زیرِ نگیں رہا ہے جب پہلی بار کافی یورپ پہنچی تو وہاں کے لوگوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ کافی مسلمان لے کر آئے تھے، اِس لئے یورپ کے عیسائی اِسے شیطانی مشروب کہتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اٹلی میں کئی قہوہ خانے کھُل گئے۔ جب کافی فرانس پہنچی تو وہاں کے شراب بنانے والوں کا ماتھا ٹھنکا۔ ان کا خیال تھا کہ کافی شراب کی جگہ لے لے گی اور اُن کا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔ انہوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے یہ افواہ پھیلا دی، کہ کافی پینے سے دماغ میں پانی بھر جاتا ہے، لیکن یہ پروپیگنڈا بے سود ثابت ہوا اور قہوہ خانے قائم ہوتے رہے۔ آج قہوہ خانے فرانس کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہیں، جہاں، شاعر، ادیب اور سائنس دان بیٹھ کر دُنیا جہاں کی باتیں کرتے ہیں۔

فرانس سے کافی انگلستان پہنچی تو پہلا کافی ہاؤس آکسفورڈ میں قائم ہوا وہاں ایک کپ کی قیمت ایک پنس تھی۔ یونی ورسٹی کے پروفیسر اور طالب علم قہوہ خانے میں جمع ہونے لگے تو ان کا نام "پینی یونی ورسٹی" پڑ گیا۔ طالب علموں کا خیال تھا کہ وہ اُن قہوہ خانوں میں ایک پینی خرچ کر کے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ کچھ طالب علم امتحان کی تیاری کے دوران نیند کو بھگانے کے لئے کافی کا استعمال کرنے لگے۔ کافی ہاؤس میں ہر قسم کے لوگ جمع ہو جاتے تھے، وہ سیاست اور انقلاب کی باتیں کرتے تھے۔ کافی ہاؤس نے جب یہ شکل اختیار کر لی تو حکومت کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ انگلستان کا ایک بادشاہ کافی ہاؤس سے اتنا خوف زدہ ہو گیا کہ اُس نے ان پر پابندی عائد کر دی۔

امریکہ میں کافی کا داخلہ جنگِ آزادی کی دین ہے۔ امریکن انگلستان سے چائے برآمد کرتے تھے، لیکن انگلستان نے چائے پر ڈیوٹی لگا دی جس کے نتیجے میں لوگوں نے چائے پینی چھوڑ دی، چائے کی جگہ کافی نے لے لی۔ انگلستان سے جنگ شروع ہوئی تو کافی پینا حب الوطنی کی علامت بن گیا۔

سترہویں صدی کے آخر میں کافی ہندوستان میں داخل ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق ایک فقیر بابا بُودن کافی کے سات بیج لے کر ہندوستان آئے۔ انہوں نے کرناٹک کے چک منگلور کے علاقے میں کافی کے پودے لگائے۔ بابا بُودن کا مزاج بھی مرنج ملانج ہے۔ اُن کے عقیدت مندوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، بابا بودن کی کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ آج بھی ہندوستان کی ۶۰ فی صد کافی کرناٹک میں پیدا ہوتی ہے، باقی کافی کیرالا، آندھرا اور تامل ناڈو پیدا ہوتی ہے، ہندوستان میں کافی کی سالانہ پیداوار ایک لاکھ ٹن ہے۔ اس کے باوجود کافی پیدا کرنے والے ملکوں میں یہ آٹھویں نمبر پر ہے، دُنیا کی تمام کافی کا دو تہائی حصہ برازیل میں پیدا ہوتا ہے۔

عرب میں آج بھی قہوہ شوق سے پیا جاتا ہے خادم مہمانوں کے لئے ایک لمبے ہینڈل والے برتن میں قہوہ لاتا ہے۔ اسے قہوہ سکہ کہتے ہیں یعنی شکر ملا ہوا قہوہ۔ قہوہ پینے کے لئے ہر مہمان کو چینی کے بغیر ہینڈل کے کپ پیش کئے جاتے ہیں۔ پیالی میں قہوہ ختم ہو جائے تو خادم اُسے دوبارہ بھر دیتا ہے مہمان کو تین کپ ضرور پینے پڑتے ہیں۔ تین کپ پینے کے بعد مہمان کپ کو دائیں بائیں جنبش دیتا ہے، خادم سمجھ جاتا ہے کہ مہمان کو مزید کپ کی ضرورت نہیں ہے۔ عرب کا قہوہ خوب گاڑھا ہوتا ہے۔ برتن میں قہوہ کے نیچے کافی کا پاؤڈر جمع رہتا ہے۔ ترکی میں قہوہ عرب سے زیادہ گاڑھا اور سیاہ ہوتا ہے۔ ان کا کافی بنانے کا طریقہ دُنیا سے جُدا ہے۔

شمالی ہندوستان میں کافی کا شوق بتدریج بڑھ رہا ہے۔ آج سے پچیس تیس سال پہلے عام لوگ کافی کے نام سے بھی واقف نہیں تھے، لیکن اب کئی تجارتی ادارے ایسی کافی تیار کرتے ہیں جو فوراً تیار کی جا سکتی ہے، تاہم جنوبی ہند کے لوگ آج بھی پُرانے طریقے سے کافی تیار کرتے ہیں۔ اس کے لئے دو برتن استعمال ہوتے ہیں۔ ایک مکان میں کافی تیار ہو رہی ہو تو پڑوس کے دو مکان اس کی خوشبو سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ کافی کی مقبولیت دیکھ کر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ شمالی ہندوستان میں بھی جنوبی ہندوستان کی طرح گھر گھر تیار ہونے لگے گی۔ ●

نسیم بنتِ سراج

بہت دن سے کچھ لکھا نہیں تھا۔ آج
ڈا ہے تو کچھ اول جلول سا لگ رہا ہے۔
ہ کی وجہ؟ بس کام کی زیادتی۔ اور کوئی
ویسی زیادتی؟ یوں سمجھ لیں کہ مرنے تک
رصت نہیں تھی۔ خیر، ایسی فرصت ہم کو
ہ بھی نہیں۔ کارِ جہاں دراز ہے......
ت تو آج بھی کچھ ایسی نہ تھی، مگر موضوع ہی
یا آ پھنسا ہے جیسے سانپ کے منہ میں
وندر۔ اُگلتے بنے نہ نگلتے

ایک مشکل تو یہ ہے کہ اگر کسی دن جلدی
اخبار کی سرخیوں (آج کل تو تباہیوں کہا جائے
یادہ مناسب ہوگا) پر نظر نہ ڈالی تو سمجھئے مصیبت
ئی جیسے ایک دن پھر پڑا اگر گھر سے نکلنے کو
۔ لیکن اللہ بھلا کرے ہمارے ایک
م فرما کا کہ ان کی پسلی پھڑک اٹھی۔ ان کا
ن فون آیا۔

"آپ نے وہ خبر پڑھی؟"
ہم نے خفت مٹانے کے لئے نہایت
بھولے بن کر پوچھا "کون سی خبر؟" (اس روز
بھی ہم نے سرے سے اخبار کو ہاتھ نہیں لگایا
تھا)

"آج کا کالم پڑھا آپ نے؟"
"کون سا؟" ہم نے اسی انداز سے
پوچھا۔

"وہی مقتدرہ والا۔"
مصنف کا نام سن کر تو ہم سکتے میں آگئے
مقتدرہ کے 'ق' پر ہم اگر اعتراض کریں تو
کوئی بات بھی ہوتی کہ ہمارے نام میں نارنس
کی شیرینی صبح کی تازگی، پھولوں کی نکہت
چراغوں کی روشنی اور بیٹی کی محبت ہے۔
ویسے 'اردو لینگویج اتھارٹی' کے
ترجمے سے ہم بھی کچھ خوش نہیں۔ اگر واقعی پاکستان

میں اردو کو فروغ دینا ہے تو انگلش کا ترجمہ انگریزی کی بجائے اردو کر دینا چاہتیے — اس اجازت کے ساتھ کہ قدیم اردو اگر کوئی بولے تو اس طرح کہ "تم کو کیا کرنا مانگتا ہے؟" پھر دیکھیے کیا فروغ ہوتا ہے۔ آپ جس کو دیکھیے انگریزی بولتا نظر آئے گا۔

افسر تو یہ بھی مان لے گا کہ "ابھی دیر ہو گئی تو بیگم ناراض ہو جائیں گی" مگر بابو جب بھی چھٹی لے گا یا نور آنٹ کی بیماری کی وجہ سے یا کہے گا کہ ٹیلیگرام آیا ہے، نا دران لا کی ڈیتھ ہو گئی ہے رات کی فلائٹ سے جانا ہے۔ ایک ویک کی لیو سینکشن کر دیجئے۔ ایپلیکیشن میں نے تھرو پراپر چینل دے دی ہے۔

ہاں، ہم جیسوں کی مصیبت ہے کہ بے چارے دو زبان بولتے ہیں جو پاکستان میں تو کوئی سمجھتا نہیں۔ تصور اس میں ہمارا نہیں اماں کا ہے۔ اتنی مشکل سے تو انگریزی کے لفظ منہ پر چڑھے تھے۔ اسکول میں تو خیر خوب بول لیتے تھے "مس جی، ہوم ورک کی بک آنٹی کے گھر رہ گئی ہے۔ جی، پلیز جی۔" لیکن گھر میں اگر انگریزی کا کوئی لفظ جملے میں آ گیا تو اماں چاہے کتنے ہی کام میں لگی ہوں ضرور سن لیتی تھیں اور وہی ایک جملہ "اے بی آپے میں رہو۔ انگریز کی بیٹی بننے کی ضرورت نہیں۔" ہم کو تو اس لفظ بیٹی پر ہی شرم آتی تھی کہ اماں کیسی زبان بولتی ہیں۔ اس زمانے میں تو بیٹی کو چڑیا کا بانفہ روم کہا جاتا تھا (کسی سے معذرت کے ساتھ) ایک تو سہیلیوں کے سامنے ویسے ہی شرمندہ ہونا پڑتا تھا کہ ہماری نہ کوئی لینن آنٹی تھیں نہ للی آپا، نہ گھر میں کوئی بلی کہلاتی تھی نہ گڈی۔ ابا کو ڈیڈی اور اماں کو ممی کہنے کا تو سوال کیا پیدا ہوتا۔ اوپر سے "ش، ق" کا درست ہونا بھی لازمی۔ اچھا بھلا رشتہ آیا تھا بھائی میاں کے لئے۔ اماں نے صاف جواب دے دیا کہ "بوا لڑکی کا ش، ق درست نہیں ہے۔" بہتیرا کہا کہ اماں شکل تو دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے، چاند کا ٹکڑا ہے۔ مگر صاحب ق تو ق وہاں تو ش کا شوشہ بھی تھا۔

لیکن اس زمانے میں گلا پکڑ کر ڈاکٹر کی تلاش میں کوئی نہیں نکلتا تھا کہ ہائے ق، اٹک گیا ہے اب چمٹی سے نکلوائیں گے۔ سنا ہے حال ہی میں ایک صاحب شرف آباد سے گزرے تو مقتدرہ کا ق ان کے گلے میں اٹک گیا۔ وہ ڈاکٹر

> اب جو آنکھ کھلتی ہے تو
> ہاتھ میں قلم ہے اور قلم کے سر پر ق ہے
> کبھی قلم کو دیکھتے ہیں اور کبھی ق کو
> اور یہ قلم تو ہم کو بہت پیارا ہے اور
> جب تک قلم ہے —

کی تلاش میں تھے۔ ہم سے رائے لی جاتی تو آسان سا نسخہ تجویز کر دیتے کہ میاں حلق میں دو انگلیاں ڈال کر قے کر دو۔ ایک مقتدرہ کے ق پر ہی کیا منحصر ہے، اگلے پچھلے تمام ق نکل جائیں گے۔ دیکھا، ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آیا۔ اسی طرح ایک صاحب نے دقیقہ کہنا چاہا تو پہلا ق تو کہہ گئے مگر معلوم ہوا کہ دوسرے ق پر چل بسے۔ اب تو دیر ہو گئی، ہاں اگر ممکن ہوا تو قیامت کے دن ضرور ان سے سوال کریں گے کہ حقیقت میں کیا گزری کہ وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ویسے ایک مشورہ دیجئے۔ اس ق کو کہاں کہاں سے نکالا جائے گا؟ یہ قرآن میں ہے، فرقان میں ہے، خدا میں نہیں، اس کی قدرت میں ہے۔ ہم میں نہیں، ہمارے مقدر میں ہے۔ ہاتھ کی لکیروں میں نہیں، قسمت کے لکھے میں ہے۔ قوس و قزح کے رنگوں میں ہے۔ محبوب کے قرب میں ہے، شبِ فراق میں ہے۔

اور اگر آپ سب کا مطالبہ ہے کہ اتھارٹی کو اتھارٹی رہنے دیا جائے یا کوئی ایسا لفظ ڈھونڈا جائے جس میں ق نہ ہو تو ڈھونڈنے میں بہت وقت لگے گا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈھونڈنے نکلے تھے ہندوستان اور ڈھونڈ لی نئی دنیا وغیرہ۔ تو ہم ہمت کر کے مقتدرہ کے صدر کے پاس کیوں نہ جائیں اور ان سے پوچھیں:

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

ویسے بھی ڈاکٹر صاحب عالم، فاضل، نہایت دانا اور انتہائی فہم و فراست کے حامل ہیں اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کس برجستگی سے جواب دیتے ہیں۔ اچھا چلیے، پاکستانی فلموں کی طرح اگر ہم اس سین کو خواب کی شکل دے دیں تو کچھ یوں ہوگا کہ ہم ڈرتے ڈرتے کانپتے ہوئے پہنچتے ہیں اور نہایت خوشامدانہ لہجے میں کہتے ہیں: "مسٹر پلیز۔ اتنے بہت سے لوگ آبجیکٹ کر رہے ہیں آپ ہی مان جائیے اور مقتدرہ کے ق کو یک قلم علیحدہ کر دیجئے۔" ڈاکٹر صاحب مسکرا کر کہتے ہیں "مگر پہلے آپ قلم سے تو ق کو الگ کر دیجئے۔"

اب جو آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھ میں قلم ہے اور قلم کے سر پر ق ہے۔ کبھی قلم کو دیکھتے ہیں اور کبھی ق کو۔ اور یہ قلم تو ہم کو بہت پیارا ہے اور جب تک قلم ہے .....

کل نئی کہانی

ع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے
نے مجھے ایک تتلی کا تحفہ دیا ہے
اُس کے پَروں کو سُنہرے ستاروں سے کیوں باندھ کر
، آنکھوں پہ پھیلا دیا ہے
کتنی خواہش ہے
کو اُڑتا ہوا دیکھنے کی
. ایک چھوٹی سی لڑکی بنانے کی
کی آنکھوں میں کاجل بھگونے کی
لو باہوں میں بھر کر
کے ہونٹوں پہ اِک خوب صورت سا بچپن پرونے کی
کتنی خواہش ہے،
. ہ گھر میں آئے
گھر اُس کے رونے سے ہنسنے لگے

زہ اِک بدن،
ہنے تخلیق کی ہے یہ تتلی
ئ دن سے اُس کے لئے اپنی آنکھوں میں دریا سجاتی رہی ہے
نہ بالوں کو جُوہی کی کلیوں سے بھر لے
ہنسے کہ شب اپنے آنے کا سارا سے بھول جائے
دن اپنے سورج میں مہتاب کو بھی چھُپا لے
، کتنی خواہش ہے

، کتنی خواہش ہے
، اک کویتا لکھوں
ت سے زیادہ میں اُس کی زلفیں لکھوں
وپ سے زیادہ میں اُس کا چہرہ لکھوں
نٹ سے زیادہ میں اُس کا بوسہ لکھوں
. کویتا سے زیادہ میں اُس کا سراپا لکھوں

، کتنی خواہش ہے
، اک کویتا لکھوں

ت سال پہلے مجھے میری ماں نے بتایا تھا
ب شب،
ب بہت تیز طوفان کی زد میں
ب راستے کھو گئے تھے

سب اپنے تھے
لیکن
اندھیرا گھنیری،
شور و شر سے بندھی،
بارشوں میں لدی
اُس لڑائی میں، اُس رات میں
ایک جگنو تھا جو اُڑ رہا تھا
اِک دیا تھا کہ جو جل رہا تھا
ایک آہٹ تھی جو چل رہی تھی
ایک شاعر تھا،
جو اِک کویتا کی تخلیق میں گا رہا تھا
ایک عورت تھی جو جگ رہی تھی
کہ شاید وہی اُس کویتا کی ماں تھی
ختم کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

صلاح الدین پرویز

میں اردو کو فروغ دینا ہے تو انگلش کا ترجمہ انگریزی کی بجائے اردو کر دینا چاہیے — اس اجازت کے ساتھ کہ قدیم اردو اگر کوئی بولے تو اس طرح کہ "تم کو کیا کرنا مانگتا ہے؟" پھر دیکھئے کیا فروغ ہوتا ہے۔ آپ جس کو دیکھئے انگریزی بولتا نظر آئے گا۔

افسر تو یہ بھی مان لے گا کہ "بھئی دیر ہو گئی تو بیگم ناراض ہو جائیں گی" مگر بابو جب بھی چھٹی لے گا یا تو وائف کی بیماری کی وجہ سے یا کہے گا کہ ٹیلیگرام آیا ہے، فادر ان لا کی ڈیتھ ہو گئی ہے رات کی فلائٹ سے جانا ہے۔ ایک ویک کی لیو سینکشن کر دیجئے۔ اپلیکیشن میں نے تھرو پراپر چینل دے دی ہے۔

ہاں، ہم جیسوں کی مصیبت ہے کہ بے چارے وہ زبان بولتے ہیں جو پاکستان میں تو کوئی سمجھتا نہیں۔ تصور اس میں ہمارا نہیں اماں کا ہے۔ اتنی مشکل سے تو انگریزی کے لفظ منہ پر چڑھے تھے۔ اسکول میں تو خیر خوب بول لیتے تھے "یس جی، ہوم ورک کی کاپی گھر رہ گئی ہے۔ جی، پلیز جی۔" لیکن گھر میں اگر انگریزی کا کوئی لفظ جملے میں آ گیا تو اماں چاہے کتنے ہی کام میں لگی ہوں ضرور سن لیتی تھیں اور وہی ایک جملہ "اے بی آپے میں رہو۔ انگریز کی بیٹی بننے کی ضرورت نہیں۔" ہم کو تو اس لفظ بیٹی پر ہی شرم آتی تھی کہ اماں کیسی زبان بولتی ہیں۔ اس زمانے میں تو بیٹی کو چڑیا کا باتھ روم کہا جاتا تھا (کسی سے معذرت کے ساتھ) ایک تو سہیلیوں کے سامنے ویسے ہی شرمندہ ہونا پڑتا تھا کہ ہماری نہ کوئی لینن آنٹی تھیں نہ للی آپا، نہ گھر میں کوئی بلی کہلاتی تھی نہ گڈی۔ ابا کو ڈیڈی اور اماں کو ممی کہنے کا تو سوال کیا پیدا ہوتا۔ اوپر سے "ش، ق" کا درست ہونا بھی لازمی۔ اچھا بھلا رشتہ آیا تھا بھائی میاں کے لئے۔ اماں نے صاف جواب دے دیا کہ "بوا لڑکی کا ش، ق درست نہیں ہے۔" بہتیرا کہا کہ اماں شکل تو دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے، چاند کا ٹکڑا ہے۔ مگر صاحب ق تو ق وہاں تو ش کا شوشہ بھی کھا۔

لیکن اس زمانے میں گلا پکڑ کر ڈاکٹر کی تلاش میں کوئی نہیں نکلتا تھا کہ ہائے ق، اٹک گیا ہے اب چمٹی سے نکلوائیں گے۔ سنا ہے حال ہی میں ایک صاحب شرف آباد سے گزرے تو مقتدرہ کا ق ان کے گلے میں اٹک گیا۔ وہ ڈاکٹر

اب جو آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھ میں قلم ہے اور قلم کے سر پر ق ہے

کبھی قلم کو دیکھتے ہیں اور کبھی ق کو

اور یہ قلم تو ہم کو بہت پیارا ہے اور جب تک قلم ہے

کی تلاش میں تھے۔ ہم سے رائے لی جاتی تو آسان سا نسخہ تجویز کر دیتے کہ میاں حلق میں دو انگلیاں ڈال کر قے کر دو۔ ایک مقتدرہ کے ق پر ہی کیا منحصر ہے، اگلے پچھلے تمام ق نکل جائیں گے۔ دیکھا، ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آیا۔ اسی طرح ایک صاحب نے دقیقہ کہنا چاہا تو پہلا ق تو کہہ گئے مگر معلوم ہوا کہ دوسرے ق پر چل بسے۔ اب تو دیر ہو گئی، ہاں اگر ممکن ہوا تو قیامت کے دن ضرور ان سے سوال کریں گے کہ حقیقت میں کیا گزری کہ وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ویسے ایک مشورہ دیجئے۔ اس ق کو کہاں کہاں سے نکالا جائے گا؟ یہ قرآن میں ہے، فرقان میں ہے، خدا میں نہیں، اس کی قدرت میں ہے۔ ہم میں نہیں، ہمارے مقدر میں ہے۔ ہاتھ کی لکیروں میں نہیں، قسمت کے لکھے میں ہے۔ قوسِ قزح کے رنگوں میں ہے۔ محبوب کے قرب میں ہے، شبِ فراق میں ہے۔

اور اگر آپ سب کا مطالبہ ہے کہ اتھارٹی کو اتھارٹی رہنے دیا جائے یا کوئی ایسا لفظ ڈھونڈا جائے جس میں ق نہ ہو تو ڈھونڈنے میں بہت وقت لگے گا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈھونڈنے نکلے تھے ہندوستان اور ڈھونڈ لی نئی دنیا وغیرہ۔ تو ہم ہمت کر کے مقتدرہ کے صدر کے پاس کیوں نہ جائیں اور ان سے پوچھیں:

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

ویسے بھی ڈاکٹر صاحب عالم فاضل، نہایت دانا اور انتہائی فہم و فراست کے حامل ہیں اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کس برجستگی سے جواب دیتے ہیں۔ اچھا چلئے، پاکستانی فلموں کی طرح اگر ہم اس سین کو خواب کی شکل دے دیں تو کچھ یوں ہو گا کہ ہم ڈرتے ڈرتے کانپتے ہوئے پہنچتے ہیں اور نہایت خوشامدانہ لہجے میں کہتے ہیں: "مسٹر پلیز۔ اتنے بہت سے لوگ آبجیکٹ کر رہے ہیں آپ ہی مان جائیے اور مقتدرہ کے ق کو یک قلم علیحدہ کر دیجئے۔" ڈاکٹر صاحب مسکرا کر کہتے ہیں "مگر پہلے آپ قلم سے تو ق کو الگ کر دیجئے۔"

اب جو آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھ میں قلم ہے اور قلم کے سر پر ق ہے۔ کبھی قلم کو دیکھتے ہیں اور کبھی ق کو۔ اور یہ قلم تو ہم کو بہت پیارا ہے اور جب تک قلم ہے .....

ل نئی کہانی

رتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے
مجھے ایک تتلی کا تحفہ دیا ہے
ں کے پَروں کو سُنہرے ستاروں سے کیوں باندھ کر
نکھوں پہ پھیلا دیا ہے
ی خواہش ہے
ڑتا ہوا دیکھنے کی
یک چھوٹی سی لڑکی بنانے کی
آنکھوں میں کاجل بھگونے کی
باہوں میں بھر کر
ہونٹوں پہ اِک خوب صورت سا چُمبن پرونے کی
ی خواہش ہے،
گھر میں آئے
ر اُس کے رونے سے ہنسنے لگے

اِک بدن،
نے تخلیق کی ہے یہ تتلی
دن سے اُس کے لئے اپنی آنکھوں میں دریا سجاتی رہی ہے
بالوں کو جُوہی کی کلیوں سے بھر لے
سے کہ شب اپنے آنے کا سارا سمے بھول جائے
ں اپنے سورج میں مہتاب کو بھی چھُپا لے
تی خواہش ہے

تی خواہش ہے
ک کویتا لکھوں
سے زیادہ میں اُس کی زلفیں لکھوں
پ سے زیادہ میں اُس کا چہرہ لکھوں
ے سے زیادہ میں اُس کا بوسہ لکھوں
رتیلے سے زیادہ میں اُس کا سراپا لکھوں

کتنی خواہش ہے
اِک کویتا لکھوں

ن سال پہلے مجھے میری ماں نے بتایا تھا
شب،
بہت تیز طوفان کی زد میں
ے راستے کھو گئے تھے

سب ہار بیٹھے تھے
لیکن
اندھیرا گھَنیری،
شور و شر سے بندھی،
بارشوں میں لدی
اُس لڑائی میں، اُس رات میں
ایک جگنو تھا جو اُڑ رہا تھا
اِک دیا تھا کہ جو جل رہا تھا
ایک آہٹ تھی جو چل رہی تھی
ایک شاعر تھا،
جو اک کویتا کی تخلیق میں گا رہا تھا
ایک عورت تھی جو جگ رہی تھی
کہ شاید وہی اُس کویتا کی ماں تھی
ختم کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

صلاح الدین پرویز

میں اردو کو فروغ دینا ہے تو انگلش کا ترجمہ انگریزی کی بجائے اُردو کر دینا چاہتے — اس اجازت کے ساتھ کہ قدیم اُردو اگر کوئی بولے تو اس طرح کہ "تم کو کیا کرنا مانگتا ہے؟" پھر دیکھئے کیا فروغ ہوتا ہے۔ آپ جس کو دیکھئے انگریزی بولتا نظر آئے گا۔

افسر تو یہ بھی مان لے گا کہ "بھئی دیر ہو گئی تو بیگم ناراض ہو جائیں گی" مگر بابو جب بھاگ چھٹی لے گا یا نو وائف کی بیماری کی وجہ سے یا کہے گا کہ ٹیلیگرام آیا ہے، فادر اِن لا کی ڈیتھ ہو گئی ہے رات کی فلائٹ سے جانا ہے۔ ایک ویک کی لیو سینکشن کر دیجئے۔ ایپلیکیشن میں نے تھرو پراپر چینل دے دی ہے۔

ہاں، ہم جیسوں کی مصیبت ہے کہ بے چارے وہ زبان بولتے ہیں جو پاکستان میں تو کوئی سمجھتا نہیں۔ تصور اس میں ہمارا نہیں اماں کا ہے۔ اتنی مشکل سے تو انگریزی کے لفظ مُنہ پر چڑھے تھے۔ اسکول میں تو خیر خوب بول لیتے تھے "یس جی، ہوم ورک کی کاپی آنٹی کے گھر رہ گئی ہے۔ جی، پلیز جی۔" لیکن گھر میں اگر انگریزی کا کوئی لفظ جملے میں آ گیا تو اماں چاہے کتنے ہی کام میں لگی ہوں ضرور سُن لیتی تھیں اور وہی ایک جملہ "اے بی آپے میں رہو۔ انگریز کی بیٹی بننے کی ضرورت نہیں۔" ہم کو تو اس لفظ بیٹی پر ہی شرم آتی تھی کہ اماں کیسی زبان بولتی ہیں۔ اس زمانے میں تو بیٹی کو چڑیا کا بانقد روم کہا جاتا تھا (کسی سے معذرت کے ساتھ) ایک تو سہیلیوں کے سامنے ویسے ہی شرمندہ ہونا پڑتا تھا کہ ہماری نہ کوئی لینن آنٹی تھیں، نہ للی آپا، نہ گھر میں کوئی ببلی کہلاتی تھی، نہ گڈی۔ ابا کو ڈیڈی اور اماں کو ممی کہنے کا تو سوال کیا پیدا ہوتا۔ اور یہ

سے "ش، ق" کا درست ہونا بھی لازمی۔ اچھا بھلا رشتہ آیا تھا بھائی میاں کے لئے۔ اماں نے صاف جواب دے دیا کہ "بوا لڑکی کا ش، ق درست نہیں ہے۔" بہتیرا کہا کہ اماں شکل تو دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے، چاند کا ٹکڑا ہے۔ مگر صاحب ق تو ق وہاں تو ش کا شوشہ بھی کھا۔ لیکن اس زمانے میں گلا پکڑ کر ڈاکٹر کی تلاش میں کوئی نہیں نکلتا تھا کہ ہائے ق، اٹک گیا ہے اب چمٹی سے نکلوائیں گے۔ سُنا ہے حال ہی میں ایک صاحب شرف آباد سے گزرے تو مقتدرہ کا ق ان کے گلے میں اٹک گیا۔ وہ ڈاکٹر

اب جو آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھ میں قلم ہے اور قلم کے سر پہ ق ہے
کبھی قلم کو دیکھتے ہیں اور کبھی ق کو
اور یہ قلم تو ہم کو بہت پیارا ہے اور
جب تک قلم ہے—

کی تلاش میں تھے۔ ہم سے رائے لی جاتی تو آسان سا نسخہ تجویز کر دیتے کہ میاں حلق میں دو اُنگلیاں ڈال کر قے کر دو۔ ایک مقتدرہ کے ق پر ہی کیا منحصر ہے، اگلے پچھلے تمام ق نکل جائیں گے۔ دیکھا، ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آیا۔ اسی طرح ایک صاحب نے دقیقہ کہنا چاہا تو پہلا ق تو کہہ گئے مگر معلوم ہوا کہ دوسرے ق پہ چل بسے۔ اب تو دیر ہو گئی، ہاں اگر ممکن ہوا تو قیامت کے دن ضرور ان سے سوال کریں گے کہ حقیقت میں کیا گزری کہ وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ویسے ایک مشورہ دیجئے۔ اس ق کو کہاں کہاں سے نکالا جائے گا؟ یہ قرآن میں ہے، فرقان میں ہے، خدا میں نہیں، اس کی قدرت میں ہے۔ ہم میں نہیں، ہمارے مقدر میں ہے۔ ہاتھ کی لکیروں میں نہیں، قسمت کے لکھے میں ہے۔ قوس و قزح کے رنگوں میں ہے۔ محبوب کے قُرب میں ہے، شبِ فراق میں ہے۔

اور اگر آپ سب کا مطالبہ ہے کہ اتھارٹی کو اتھارٹی رہنے دیا جائے یا کوئی ایسا لفظ ڈھونڈا جائے جس میں ق نہ ہو تو ڈھونڈنے میں نہیت دقت لگے گی اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈھونڈنے نکلے تھے ہندوستان اور ڈھونڈ لی نئی دنیا وغیرہ۔ تو ہم ہمت کر کے مقتدرہ کے صدر کے پاس کیوں نہ جائیں اور ان سے پوچھیں:

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

ویسے بھی ڈاکٹر صاحب عالم، فاضل، نہایت دانا اور انتہائی فہم و فراست کے حامل ہیں اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کس برجستگی سے جواب دیتے ہیں۔ اچھا چلئے، پاکستانی فلموں کی طرح اگر ہم اس سین کو خواب کی شکل دے دیں تو کچھ یوں ہوگا کہ ہم ڈرتے ڈرتے کانپتے ہوئے پہنچتے ہیں اور نہایت خوشامدانہ لہجے میں کہتے ہیں: "مسٹر پلیز۔ اتنے بہت سے لوگ آبجیکٹ کر رہے ہیں آپ ہی مان جائیے اور مقتدرہ کے ق کو یک قلم علیحدہ کر دیجئے!" ڈاکٹر صاحب مسکرا کر کہتے ہیں "مگر پہلے آپ قلم سے تو ق کو الگ کر دیجئے!"

اب جو آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھ میں قلم ہے اور قلم کے سر پہ ق ہے۔ کبھی قلم کو دیکھتے ہیں اور کبھی ق کو۔ اور یہ قلم تو ہم کو بہت پیارا ہے اور جب تک قلم ہے ....

نئی کہانی

ں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے
ایک تتلی کا تحفہ دیا ہے
پروں کو سنہرے ستاروں سے کیوں باندھ کر
ں پہ پھیلا دیا ہے

اہش ہے
ہوا دیکھنے کی
چھوٹی سی لڑکی بنانے کی
ں میں کاجل بھگونے کی
ں میں بھر کر
نٹوں پہ اِک خوب صورت سا جُھبن پرونے کی
اہش ہے،
ں آئے
کے رونے سے ہنسنے لگے

بدن،
لیق کی ہے یہ تتلی
سے اُس کے لئے اپنی آنکھوں میں دریا سجاتی رہی ہے
ں کو جُوہی کی کلیوں سے بھر لے
شب اپنے آنے کا سارا سمے بھول جائے
پنے سورج میں مہتاب کو بھی چھُپا لے
اہش ہے

خواہش ہے
کویتا لکھوں
سے زیادہ میں اُس کی زلفیں لکھوں
سے زیادہ میں اُس کا چہرہ لکھوں
سے زیادہ میں اُس کا بوسہ لکھوں
سے زیادہ میں اُس کا سراپا لکھوں

خواہش ہے
کویتا لکھوں

ال پہلے مجھے میری ماں نے بتایا تھا

ب،
ہت تیز طوفان کی زد میں
استے کھو گئے تھے

سب اب بیٹھے تھے
لیکن
اندھیرا گھپ،
شور و شر سے بندھی،
بارشوں میں لدی
اُس لڑائی میں، اُس رات میں
ایک جگنو تھا جو اُڑ رہا تھا
اِک دیا تھا کہ جو جل رہا تھا
ایک آہٹ تھی جو چل رہی تھی
ایک شاعر تھا،
جو اک کویتا کی تخلیق میں گا رہا تھا
ایک عورت تھی جو جگ رہی تھی
کہ شاید وہی اُس کویتا کی ماں تھی
ختم کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

صلاح الدین پرویز

میں اردو کو فروغ دینا ہے تو انگلش کا ترجمہ انگریزی کی بجائے اُردو کر دینا چاہتے ——— اس اجازت کے ساتھ کہ قدیم اُردو اگر کوئی بولے تو اس طرح کہ "تم کو کیا کرنا مانگتا ہے؟" پھر دیکھئے کیا فروغ ہوتا ہے۔ آپ جس کو دیکھئے انگریزی بولتا نظر آئے گا۔

افسر تو یہ بھی مان لے گا کہ "کبھی دیر ہو گئی تو بیگم ناراض ہو جائیں گی۔" مگر بابو جب بھی چھٹی لے گا یا تو وائف کی بیماری کی وجہ سے یا کہے گا کہ ٹیلیگرام آیا ہے، فادر ان لا کی ڈیتھ ہو گئی ہے رات کی فلائٹ سے جانا ہے۔ ایک ویک کی لیو سینکشن کر دیجئے۔ ایپلیکیشن میں نے تھرو پراپر چینل دے دی ہے۔

ہاں، ہم جیسوں کی مصیبت ہے کہ بے چارے وہ زبان بولتے ہیں جو پاکستان میں تو کوئی سمجھتا نہیں۔ تصور اس میں ہمارا نہیں اَمّاں کا ہے۔ اتنی مشکل سے تو انگریزی کے لفظ مُنہ پر چڑھے تھے۔ اسکول میں تو خیر خوب بول لیتے تھے "یس مس جی، ہوم ورک کی بُک آنٹی کے گھر رہ گئی ہے۔ جی، پلیز جی۔" لیکن گھر میں اگر انگریزی کا کوئی لفظ جملے میں آ گیا تو اَمّاں چاہے کتنے ہی کام میں لگی ہوں ضرور سُن لیتی تھیں اور وہی ایک جملہ "اے بی آپے میں رہو۔ انگریز کی بیٹی بننے کی ضرورت نہیں۔" ہم کو تو اس لفظ بیٹی پر ہی شرم آتی تھی کہ اَمّاں کیسی زبان بولتی ہیں۔ اس زمانے میں تو بیٹی کو چڑیا کا باتھ روم کہا جاتا تھا (کسی سے معذرت کے ساتھ) ایک تو سہیلیوں کے سامنے ویسے ہی شرمندہ ہونا پڑتا تھا کہ ہماری نہ کوئی لینن آنٹی تھیں، نہ للی آپا، نہ گھر میں کوئی بلی کہلاتی تھی نہ گڈی۔ ابا کو ڈیڈی اور اَمّاں کو ممی کہنے کا تو سوال کیا پیدا ہوتا۔ اور یہ سے "ش، ق" کا درست ہونا بھی لازمی۔ اچھا بھلا رشتہ آیا تھا بھائی میاں کے لئے۔ اَمّاں نے صاف جواب دے دیا کہ "بُوا لڑکی کا ش، ق درست نہیں ہے۔" بہتیرا کہا کہ اَمّاں شکل تو دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے، چاند کا ٹکڑا ہے۔ مگر صاحب ق تو ق وہاں تو ش کا شوشہ بھی کھٹا۔ لیکن اس زمانے میں گلا پکڑ پکڑ کر ڈاکٹر کی تلاش میں کوئی نہیں نکلتا تھا کہ ہائے ق، اٹک گیا ہے اب چمٹی سے نکلوائیں گے۔ سُنا ہے حال ہی میں ایک صاحب شرف آباد سے گزرے تو مقتدرہ کا ق ان کے گلے میں اٹک گیا۔ وہ ڈاکٹر

اب جو آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھ میں قلم ہے اور قلم کے سر پر ق ہے
کبھی قلم کو دیکھتے ہیں اور کبھی ق کو
اور یہ قلم تو ہم کو بہت پیارا ہے اور
جب تک قلم ہے ———

کی تلاش میں تھے۔ ہم سے رائے لی جاتی تو آسان سا نسخہ تجویز کر دیتے کہ میاں حلق میں دو انگلیاں ڈال کر قے کر دو۔ ایک مقتدرہ کے ق پر ہی کیا منحصر ہے، اگلے پچھلے تمام ق نکل جائیں گے۔ دیکھا، ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آیا۔ اسی طرح ایک صاحب نے دقیقہ کہنا چاہا تو پہلا ق تو کہہ گئے مگر معلوم ہوا کہ دوسرے ق پر چل بسے۔ اب تو دیر ہو گئی، ہاں اگر ممکن ہوا تو قیامت کے دن ضرور ان سے سوال کریں گے کہ حقیقت میں کیا گزری کہ وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ویسے ایک مشورہ دیجئے۔ اس ق کو کہاں کہاں سے نکالا جائے گا؟ یہ قرآن میں ہے، فرقان میں ہے، خدا میں نہیں، اس کی قدرت میں ہے۔ ہم میں نہیں، ہمارے مقدر میں ہے۔ ہاتھ کی لکیروں میں نہیں، قسمت کے لکھے میں ہے۔ قوس و قزح کے رنگوں میں ہے۔ محبوب کے قُرب میں ہے، شبِ فراق میں ہے۔

اور اگر آپ سب کا مطالبہ ہے کہ اتھارٹی کو اتھارٹی رہنے دیا جائے یا کوئی ایسا لفظ ڈھونڈا جائے جس میں ق نہ ہو تو ڈھونڈنے میں بہت وقت لگے گا اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈھونڈنے نکلے تھے ہندوستان اور ڈھونڈ لی نئی دنیا وغیرہ۔ تو ہم ہمت کر کے مقتدرہ کے صدر کے پاس کیوں نہ جائیں اور ان سے پوچھیں:

کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

ویسے بھی ڈاکٹر صاحب عالم فاضل نہایت دانا و بینا اور انتہائی فہم و فراست کے حامل ہیں اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کس برجستگی سے جواب دیتے ہیں۔ اچھا چلئے، پاکستانی فلموں کی طرح اگر ہم اس سین کو خواب کی شکل دے دیں تو کچھ یوں ہو گا کہ ہم ڈرتے ڈرتے کانپتے ہوئے پہنچتے ہیں اور نہایت خوشامدانہ لہجے میں کہتے ہیں: "مسٹر پلیز۔ اتنے بہت سے لوگ آبجیکٹ کر رہے ہیں آپ ہی مان جائیے اور مقتدرہ کے ق کو یک قلم علیحدہ کر دیجئے۔" ڈاکٹر صاحب مسکرا کر کہتے ہیں "مگر پہلے آپ قلم سے تو ق کو الگ کر دیجئے۔"

اب جو آنکھ کھلتی ہے تو ہاتھ میں قلم ہے اور قلم کے سر پر ق ہے۔ کبھی قلم کو دیکھتے ہیں اور کبھی ق کو۔ اور یہ قلم تو ہم کو بہت پیارا ہے اور جب تک قلم ہے .....

ِالکل نئی کہانی

ردع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے
ں نے مجھے ایک تتلی کا تحفہ دیا ہے
بن اُس کے پَروں کو سُنہرے ستاروں سے کیوں باندھ کر
ہری آنکھوں پہ پھیلا دیا ہے
مجھے کتنی خواہش ہے
س کو اُڑتا ہوا دیکھنے کی
سے ایک چھوٹی سی لڑکی بنانے کی
س کی آنکھوں میں کاجل بھگونے کی
س کو باہوں میں بھر کر
س کے ہونٹوں پہ اِک خوب صورت سا چُمبن پرونے کی
مجھے کتنی خواہش ہے،
ہ وہ گھر میں آئے
میرا گھر اُس کے رونے سے ہنسنے لگے
ور وہ اِک بار ن۰
جس نے تخلیق کی ہے یہ تتلی
جو کئی دن سے اُس کے لئے اپنی آنکھوں میں دریا سجاتی رہی ہے
پنے بالوں کو جوہی کی کلیوں سے بھر لے
تنا ہنسے کہ شب اپنے آنے کا سارا سمے بھول جائے
کہ دن اپنے سورج میں مہتاب کو بھی چھُپا لے
مجھے کتنی خواہش ہے

مجھے کتنی خواہش ہے
میں اک کویتا لکھوں
رات سے زیادہ میں اُس کی زلفیں لکھوں
دھوپ سے زیادہ میں اُس کا چہرہ لکھوں
ہونٹ سے زیادہ میں اُس کا بوسہ لکھوں
اور کویتا سے زیادہ میں اُس کا سراپا لکھوں

مجھے کتنی خواہش ہے
میں اِک کویتا لکھوں

بہت سال پہلے مجھے میری ماں نے بتایا تھا
ایک شب،
جب بہت تیز طوفان کی زد میں
سب راستے کھو گئے تھے
سب ڈرے بیٹھے تھے
لیکن
اندھیرا گھیری؛
شور و شر سے بندھی،
بارشوں میں لدی
اُس لڑائی میں، اُس رات میں
ایک جگنو تھا جو اُڑ رہا تھا
اِک دِیا تھا کہ جو جل رہا تھا
ایک آہٹ تھی جو چل رہی تھی
ایک شاعر تھا،
جو اک کویتا کی تخلیق میں گا رہا تھا
ایک عورت تھی جو جگ رہی تھی
کہ شاید وہی اُس کویتا کی ماں تھی
ختم کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے

صلاح الدین پرویز

روحانی شادی

کوثر چاند پوری

جس ماحول میں آنسہ رابعہ جمیل نے پرورش پائی تھی وہ نہ امیرانہ تھا، نہ غریبانہ، بس متوسط درجہ کا تھا۔ کھانے کو موٹا جھوٹا ملتا ہی رہتا تھا۔ ناشتے میں گوچنی کی باسی روٹی چھاچھ کے ساتھ کھالیا کرتی تھی۔ دوپہر اور رات کو بھی روکھی سوکھی مل جاتی تھی۔ چھاچھ گھر میں نہ ہوتی تھی تو جمیلہ نانی کے یہاں سے لے آیا کرتی تھی، جس کے یہاں ایک بھینس تھی، اس لئے دودھ، دہی اور مکھن کی افراط تھی محلے والوں کا حصہ صرف چھاچھ ہی میں تھا۔ چار چھ لڑکیاں مٹی کی ہانڈیاں لے کر آجاتیں اور صحن میں بیٹھی دودھ بلوئے جانے کا انتظار کرتی رہتیں۔ جمیلہ نانی رئی میں لگا ہوا مکھن انگلیوں سے خوب پونچھ لیتی اور چھاچھ میں تیرتی ہوئی پھٹکیاں بھی چار انگلیاں جوڑ کر نکال لیتی۔ آنگن میں بیٹھی ہوئی کنواریوں کے نصیب میں کھٹی میٹھی چھاچھ ہی آتی۔

کچھ گھرانوں میں دو دن کی چھاچھ اکٹھی کرکے کڑھی پکالی جاتی۔ عام طور پر گوچنی کی روٹی سے ہی ناشتہ کیا جاتا۔ لقمہ منہ میں رکھ کر چھاچھ کا گھونٹ بھر لیا جاتا۔ رابعہ جمیل کبھی نانی کے یہاں سائل بن کر نہیں آئی۔ وہ غریب ہو کر بھی ایک آن رکھتی تھی۔ نانی کو اس کا بھولپن پسند تھا۔ ناک نقشے کی بھی تعریف کرتی تھی۔ اکثر سوچتی کہ میرے نواسوں یا پوتوں میں کوئی لڑکا ہوتا تو میں رابعہ کو بہو بنا لیتی۔ مگر اللہ میاں نے ایک نواسے اور دو پوتوں کو اٹھالیا۔

اب صبر و شکر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ نہ جانے رابعہ کس خوش قسمت کے یہاں جائے گی؟ اس بدنصیبی کا گلہ کس سے کیا جائے؟ یہ تو ازل ہی سے اس کے نام لکھ دی گئی تھی۔

...ڑکی جو اپنے وزن کے سونے
...ونے میں خریدی گئی۔

آنسز ابیلا (۱۳۷۲ - ۱۳۴۸)
فرانس کے بادشاہ جین دی گڈ کی
بیٹی اپنے باپ کو انگریزوں سے چھڑانے
کے لئے جمع کی جانے والی رقم میں اضافہ
کرنے کے لئے بادشاہ نے ۱۲ برس
کی عمر میں اپنی بیٹی کو ملان کے حکمراں
ڈیوک گیلی ازو ندم کے ہاتھوں
۲۰۰۰ر۵۰۴ راڈالر میں بیچ دیا۔ لڑکی جو بعد
میں ڈیوک کے جوان بیٹے کی دُلہن بنی
۸۰ پونڈ وزن کی تھی اور اس کی قیمت
...۸ پونڈ سونے کے سکوں میں ادا
کی گئی تھی۔

...کثر رابعہ کا انتظار کر کے وہ آپ ہی ایلی ہوئیم
...کی دیگچی بھر کر چپا چپہ اس کے یہاں بھیج دیا
...کرتی تھی اور اس میں ذرا سا مکھن بھی ڈال دیتی
...تھی۔

رابعہ پڑھنے لکھنے کی شوقین تھی۔
...اسمٰعیل میرٹھی کی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ چند
...نظمیں زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ یہ نظم بہت شوق
سے گا کر پڑھا کرتی تھی:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

اصل میں یہ اس کی دعا تھی جس میں گائے خریدنے کی نہ جانے کتنی آرزوئیں شامل تھیں۔ وہ دن کا بڑا حصہ پڑھنے میں گزارتی اور پڑھی ہوئی نظمیں کاپی پر لکھ لیا کرتی تھی۔ اس کا خط بہت پاکیزہ ہو گیا تھا۔

وہ سنِ شعور کو پہنچی تو اس نے باپ کا نام بھی اپنے نام میں شامل کر لیا اور وہ رابعہ جمیل خود کو لکھنے لگی۔ استاد کے کہنے سے آنسہ کا لفظ بھی نام میں ملا لیا، جس کے معنی کنواری (یعنی دوشیزہ) کے ہیں۔ رابعہ کی سہیلیاں اس سے محبت بھی کرتی تھیں اور اس کی عزت بھی ان کے دلوں میں تھی۔ وہ اسکول جانے لگی تھی۔ استانیوں کو اس کی ادائیں بہت بھاتی تھیں۔ اسے اور بھی کئی نظمیں حفظ تھیں جن کو وہ بڑی سریلی آواز میں گا کر سنایا کرتی تھی استانی اکثر اسے حکم دیا کرتی تھی کہ رابعہ جمیل کوئی اچھی سی نظم سناؤ اور وہ اسٹیج پر کھڑی ہو کر بہت مترنم لہجے میں گانے لگتی۔ ہال میں سماں بندھ جاتا۔ گہری خاموشی چھا جاتی نظم ختم ہوتے ہی ہال تالیوں سے گونجنے لگتا۔ اس طرح رابعہ کا دل بلّیوں اچھلنے لگتا اور حوصلہ بھی بڑھ جاتا۔ وہ کسی کلاس میں فیل نہیں ہوتی۔ بس ایک مرتبہ اسے سپلی منٹری امتحان دینا پڑا تھا، ورنہ ہمیشہ اوّل یا دوم آتی۔ ایسا بہت ہی کم ہوا کہ تھرڈ آئی ہو۔

وقت کے ساتھ رابعہ اسکول سے اپنی دو سہیلیوں سمیت کالج میں پہنچ گئی۔ ان سہیلیوں میں سے ایک کا نام عارفہ اور دوسری کا فوزیہ تھا۔ سینئر لڑکیوں نے اسے بنانا چاہا۔ اس نے سہیلیوں کے ساتھ گا کر غزلیں پڑھیں۔ سب کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ رابعہ سے نظمیں اور غزلیں ہی سنتی رہیں۔

کالج میں داخل ہونے تک تعلیم کے مصارف والدین برداشت کرتے رہے۔ لیکن ان پر دو لڑکوں کی تعلیم کا بوجھ تھا۔ ماں نے ایک روز بیٹی سے کہا "رابعہ، میں تمہارے بھائیوں کو بھی پڑھا رہی ہوں۔ اب تمہیں کچھ نہیں دے سکتی!" رابعہ نے بڑے عزم اور حوصلے سے کہا "مت دیجئے میں اپنے پڑھنے کا خرچ آپ برداشت کروں گی"! اور اس نے دو امیر گھرانوں کی لڑکیوں کو ٹیوشن کرنے شروع کر دئے۔ جو بہت دن سے اصرار کر رہی تھیں۔ اس نے ان سے درخواست نہیں کی بلکہ ان ہی کی بہت پرانی درخواست منظور کر لی۔ وہ خوش ہو گئیں۔ شکریہ بھی ادا کیا۔ اس طرح رابعہ اپنے مصارف سے زیادہ کمانے لگی۔ جو پیسے بچ جاتے، وہ بھائیوں کو دے دیا کرتی۔

رابعہ کی عمر اکیس برس کی ہو چکی تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں اس کی ماں سے کہتیں "بہن بٹیا کا بیاہ کر دو جوان لڑکی کا گھر بٹھانا اچھا نہیں" ماں بھی اسی قسم کی باتیں سوچا کرتی تھی لیکن رابعہ کا بڑا بھائی محسن امریکہ میں تھا۔ اس کی واپسی کے انتظار میں رابعہ کی شادی رکی ہوئی تھی۔

رابعہ خود بھی نہیں چاہتی تھی کہ پیر ڈل میں ازدواج کی بیڑیاں پہن لے۔ اس نے ماں سے کہہ دیا تھا "پہلے میں ڈاکٹر کی ڈگری لوں گی اس کے بعد ان باتوں پر توجہ دوں گی"

"اچھا، تو ڈاکٹر بنے گی!؟" بوڑھی

۔ سے کہتی۔

ہاں ضرور بنوں گی۔"

اور ڈاکٹر سے ہی بیاہ کرے گی؟"

ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

لیکن میں یہی سمجھتی ہوں۔ تم کو کان کھول کر

بیٹی! میں ڈاکٹر کو داماد بنانے کا تصور

کر سکتی۔ بھلا اتنا پیسہ کہاں سے لاؤں گی؟"

دہی لے آئے گا۔ تم بالکل نہ ڈرو۔

ہیں ایسا نہیں ہوتا کہ اس طرح لڑکی

ر کے ہاتھ بیچ ڈالیں۔"

موجودہ دور میں شرافت کا معیار

ہے۔"

ہمارے یہاں نہیں بدلا۔"

بدل جائے گا۔ سماج بدلتا ہے تو

یزیں بدل جاتی ہیں۔"

رابعہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ایک دن رابعہ کی ماں کے پاس شمشاد کا پیغام آیا

"میں آپ کی صاحب زادی کو اپنانا چاہتا ہوں۔ میں نے سارے حالات معلوم کر لئے ہیں۔ آپ مصارف کا خیال نہ کریں وہ رابعہ جمیل کے پاس ہیں۔"

"کہاں سے آگئے اس کے پاس؟"

ماں نے حیرت کے ساتھ سوچنا شروع کر دیا اور ایک رات کو رابعہ سے سوال کیا:

"بیٹی، تیرے پاس شادی کا خرچ کہاں سے آگیا؟"

"میں نے کہا تھا نا کہ دہی لے آئے گا۔"

"کیا سچ مچ لے آیا؟"

"اور کیا جھوٹ موٹ؟"

اصل میں ڈاکٹر شمشاد اور رابعہ کے درمیان یہ سب بہت پہلے طے ہو چکا تھا اور اس نے ایک اچھی خاصی رقم رابعہ کو بھیج دی تھی۔ اس تقریب کی بنیاد بہت پرانے رُومان پر تھی۔ رابعہ نے آپ ہی محسن کو تار دے دیا۔ وہ پندرہویں دن ہوائی جہاز سے آگیا۔ رابعہ نے شمشاد کی دی ہوئی رقم شکریہ کے ساتھ واپس کر دی اور جلد ہی نہایت سادگی سے رابعہ اور ڈاکٹر شمشاد میاں بیوی بن گئے۔ لین دین کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ نہ جہیز نہ چڑھاوا۔ رابعہ گلے میں صرف نیکلس ڈالے ڈاکٹر شمشاد کی نئی موٹر میں بیٹھ کر اس کے گھر چلی گئی اور ان کی یہ شادی جس کی بنیاد رومان پر تھی ہمیشہ پھلتی پھولتی رہی۔

غریب وسادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیل
(علامہ اقبال) محمد شارق رضا، آکوٹ

خوب ہے منظر گرداب کنارے سے مگر
آؤ گرداب کی آنکھوں سے کنارا دیکھیں
(تابش عظیم آبادی) سروری بیگم، کلکتہ ۱۴

مدت ہوئی کہ چشم تحیر کو ہے سکوت
اب جنبش نظر میں کوئی داستاں نہیں
(اصغر گونڈوی) ملکہ صبا، پڈکھہ

اور ہیں وہ جنہیں عشرت کی تمنا ہوگی
زندگی! ہم تو ترا قرض چکانے آئے
(کشور عثمانی مرادآبادی) قمر جہاں، رامپور

مقتل میں نظر آؤ گے سچ بول کے دیکھو
بے موت ہی مرجاؤ گے سچ بول کے دیکھو
(فضل الرحمٰن فضل) بیگم محمد صالح، حیدرآباد

فاصلے بڑھتے گئے آنکھوں سے سب منظر گئے
تم خوش رہو بس مہرباں جو بھی ہوا اچھا ہوا
(زین رامش) یاسمین صبا، پٹنہ

حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جدا ہونے کا
ورنہ یہ کاجل تیری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا
(نامعلوم) نوری انیس فاطمہ، بمبئی ۲

سو ظلم کئے تم نے ایک آہ نہ کی ہم نے
وہ ظرف تمہارا تھا یہ ظرف ہمارا ہے
(نامعلوم) سلطانہ بیگم، علی گڑھ

اہل محفل کو خبر تک نہ ہوئی
کہہ گیا بات اشاروں میں کوئی

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
مس سکینہ خانم موتن، بلگام

نکل جاتے ہیں آنسو جب یاد تمہاری آتی ہے
زمانہ روٹھ جاتا ہے محبت روٹھ جاتی ہے

یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے
محبت کر کے بھی دیکھا محبت میں بھی دھوکہ ہے
شاہ بندری نسیم الغنی، بھٹکل، مدراس

زخم پتہ پتہ ہے درد ڈالی ڈالی ہے
اے میرے چمن آخر کون تیرا مالی ہے
(راز الہ آبادی) محمد ارشد، اعظم گڑھ

یوں نام محبت دیوانے بدنام نہ کر اے پروانے
ایک شمع پہ کیوں جل مرتا ہے مرنے کے بہانے اور بھی ہیں
(نامعلوم) امتہ الحفیظ، جڑچرلہ

نور حق شمع الٰہی کو بجھا سکتا ہے کون
جس کا حامی ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون
کشور سلطانہ، بہار شریف

یوں تو ہر لمحہ تیری یاد میں بوجھل گزرا
دل کو محسوس ہوئی تیری کمی شام کے بعد
زینت خانم، کلکتہ

خدا جانے کشش کیسی ہے احسان تیری باتوں میں
کہ اکثر ڈھونڈتا ہوں میں تجھے تاریک راتوں میں
(احسان بستی پوری) آفتاب عالم، نوراللہ پور

اس وقت آپ کو کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے ایسا شعر جسے آپ بار بار سننا یا گنگنانا چاہتی ہیں؟ اس شعر کے حسن، اثر اور کیفیت میں دوسروں کو بھی شریک کیجئے۔ جس کارڈ یا کاغذ پر آپ اپنا پسندیدہ شعر لکھ کر بھیجیں، اس پر اپنا نام، پتہ ضرور درج کریں۔ اگر معلوم ہو تو شاعر کا نام بھی تحریر کریں۔

"میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ان سے ملئے

ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ

ہندوستان کی جنگ آزادی
کے دوران عورتیں سیاست کے میدان میں داخل
ہونے سے گھبراتی تھیں۔ انگریزوں کے خلاف
تقریریں کرنا، جلوس نکالنا، ہڑتال کرنا عورتوں کے
بس کا روگ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ جلوس پر
لاٹھی چارج ہوتا تھا لوگ گرفتار ہوتے تھے۔
انہیں قید و بند کی مصیبتیں سہنی پڑتی تھیں جیل
میں چکی پیسنی پڑتی تھی۔ سیاست کے اکھاڑے
میں اترنا دل گردے کا کام تھا۔ عورتوں میں اس
کام کا حوصلہ نہیں تھا لیکن جب انگریزوں کے
خلاف جنگ تیز ہوئی تو نظریہ بدل گیا۔ اس کا
سہرا گاندھی جی کے سر ہے۔ انہوں نے نہ صرف
سیاسی تحریک کو ایک عوامی تحریک بنایا، بلکہ
عورتوں کو بھی اس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔
عورتوں نے اس دعوت پر لبیک کہی۔ عورتوں
کے لئے یہ ایک انقلابی دور تھا۔ انہوں نے
یہ بات ثابت کر دی کہ وہ لاٹھیاں کھانے اور
جیل جانے میں کسی سے کم نہیں۔ سروجنی نائیڈو،
وجے لکشمی پنڈت، اینی بیسنٹ اور نہ جانے کتنی
عورتوں نے سیاست میں حصہ لیا۔ اس طرح
سیاست میں ہندوستانی عورتوں کا عمل
دخل شروع ہو گیا۔ ہندوستان غالباً دنیا کا
سب سے پہلا بڑا ملک تھا جہاں ایک عورت
وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھی۔ نجمہ ہبت اللہ بھی سیاست
کے میدان میں نام پیدا کرنے والی عورتوں کے
اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

نجمہ ہبت اللہ کا نام ٹیلی فون ڈائرکٹری میں
ہیپت اللہ کے نام سے درج ہے۔ لوگ
اس نام کی ماہیت اور معنی سمجھنے سے قاصر تھے۔
بمبئی اور دہلی میں بھی ہیپت اللہ خاندان کے
لوگ آباد ہیں۔ وہ سب اپنا نام اسی طرح لکھتے
ہیں۔ عربی میں پ نہیں ہوتا۔ اس کی جگہ ب
استعمال ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اسے ہیبت اللہ
کی بگڑی ہوئی شکل سمجھتے تھے۔ سعادت حسن منٹو
نے بھی اپنے ایک مضمون میں اس خیال کا اظہار
کیا ہے۔ خود نجمہ کے خاوند کو بھی اس نام کی
ماہیت کا پتہ نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ انگریزوں
نے تلفظ کی مشکل حل کرنے کے لئے ہبت اللہ
کو ہیپت اللہ بنا دیا۔ اس نام کی اصلی ماہیت
دریافت کرنے کا سہرا نجمہ کے سر ہے مگر ہیپت اللہ
اب اتنا عام ہو گیا ہے کہ انہوں نے اس نام
کو یونہی چلنے دیا۔ ہبہ کے معنی انعام کے ہیں۔
ہبتہ اللہ کے معنی خدا کا انعام ہیں۔

نجمہ ہندوستان کی پارلیمنٹ کی ممبر ہیں
وہ مہاراشٹر کے علاقے سے راجیہ سبھا کی ممبر
چنی گئیں۔ اب وہ اسی راجیہ سبھا کی ڈپٹی
چیئرمین ہیں۔ سیاست ان کو ورثے میں ملی
ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد رشتہ میں ان کے
نانا تھے۔ مولانا آزاد کے ایک بھائی تھے جن
کا نام ابوالنصر تھا۔ ان کا انتقال عراق کی سیاحت
کے دوران نوجوانی میں ہی ہو گیا تھا۔
بہنیں تھیں۔ ایک بڑی بہن پہلے ہ
دو بہنیں فاطمہ اور آبرو بھوپال میں آبا
سابق والیٔ ریاست سلطان جہ
بہنوں کو بھوپال لے آئی تھیں۔
نے ایک بہن کو ڈاکٹر آف ا
تھا۔ ان کے شوہروں کو بھی ریاست
گیا تھا۔ آبرو بیگم نجمہ کی نانی تھی
نانا بھوپال میں مدارالمہام تھے۔ یہ
وزیر اعظم کا عربی ترجمہ ہے۔ یہ ا
سے آکر بھوپال میں آباد ہو گئے تھے۔
کی پیدائش مکہ میں ہوئی تھی ان کے را
مکہ میں بس گئے تھے۔ مولانا کی دوسری
کی شادی بھی بھوپال میں ہوئی تھی
اور پروفیسر ناصر حسین ان کے
نجمہ بھوپال میں پیدا ہوئیں

سکول سے انہوں نے میٹرک پاس
موتی لال سائنس کالج سے بی ایس سی
سی کیا۔ ایم ایس سی میں ان کا موضوع
ا۔ ۱۹۵۹ میں جب پنڈت نہرو بھوپال
نجمہ ان سے ملیں۔ پنڈت جی وکرم یونیورسٹی
نیشن میں صدارت کرنے آئے تھے۔
ہ نوں ایم ایس سی کے آخری سال میں زیرِ تعلیم
انہوں نے پنڈت جی سے درخواست
وہ اگلے سال بھی جلسہ تقسیم اسناد میں آئیں
نہیں اپنے ہاتھ سے گولڈ میڈل دیں۔
ت جی نے پوچھا "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم
میڈل ضرور حاصل کرو گی؟" نجمہ نے اثبات
جواب دیا۔ پنڈت جی نے وعدہ کیا کہ اگر نجمہ
ی گولڈ میڈل حاصل کر لیں تو وہ اگلے سال
وکرم یونیورسٹی کے کانووکیشن میں شرکت
یں گے۔ نجمہ نے اپنا قول نبھایا اور ۱۹۶۰ میں
ولڈ میڈل حاصل کر لیا تو پنڈت جی نے بھی اپنا
عدہ نبھایا اور کانووکیشن میں شرکت کرنے
کے لئے بھوپال پہنچ گئے۔

ایم ایس سی کرنے کے بعد نجمہ کو یونیورسٹی
رانٹس کمیشن کا وظیفہ ملا۔ انہوں نے زوولوجی
پی ایچ ڈی کیا۔ سی ایس آئی آر سے بھی انہیں
یفہ ملا۔ پی ایچ ڈی کے لئے ان کا مقالہ
لب کی ماہیت پر تھا۔ ان کا مقالہ نیویارک میں
ڑھا گیا۔ نجمہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھیں۔
وہ باقاعدہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں اس سلسلے
میں انہوں نے ۱۹۵۷ میں مولانا آزاد سے مشورہ
طلب کیا تھا۔ مولانا اس وقت کشمیر میں چھٹیاں
منا رہے تھے۔ سری نگر میں ان کا قیام چشمہ شاہی
میں تھا۔ انہوں نے نجمہ کو خط لکھا کہ وہ اپنے
باپ سے کہیں کہ ان کو خط لکھیں۔ جب یہ خط
پہنچ گیا تو مولانا نے اس کے جواب میں لکھا:

"اگر تم ڈاکٹر بننا چاہتی ہو تو اس بات کا فیصلہ
کرو کہ شادی کے بعد بھی اپنا کام جاری رکھو گی۔
اگر تم شادی کے بعد بال بچوں میں گھر جاؤ گی تو
ایک ایسے انسان کی حق تلفی کرو گی جو اپنا کام
زندگی بھر جاری رکھنا چاہتا ہے۔ میڈیکل کالج
میں ایک سیٹ کا ملنا دشوار ہے۔ یہ سیٹ
تمہیں مل گئی تو اس ذمہ داری کو زندگی بھر نبھانا
پڑے گا۔ تم کوئی ہنر حاصل کرو تو اس میں کمال
بھی حاصل کرو۔ یہ نہ ہو کہ کام کو درمیان میں ہی چھوڑ دو۔
انسان کے لئے یہ بات باعثِ عزت ہے کہ
وہ اپنے علم و ہنر کی وجہ سے پہچانا جائے۔ اونچے
خاندان سے تعلق باعثِ فخر نہیں ہے۔" یہ خط
نجمہ کے پاس آج بھی محفوظ ہے۔

نجمہ کچھ عرصہ بھوپال میں ٹیچر رہیں۔ پھر ان
کی شادی ہو گئی۔ ان کے خاوند ہبتہ اللہ داؤدی
بوہرے ہیں۔ سیدنا برہان الدین اس جماعت
کے صدر ہیں۔ نجمہ نے ایک بوہرہ تاجر سے شادی
کی، لیکن سیدنا سے ان کا میثاق نہیں ہوا۔
مذہب کے معاملہ میں دونوں اپنے اپنے مسلک
پر قائم ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی پر اس کا کوئی
اثر نہیں پڑا۔ نجمہ کی تین لڑکیاں ہیں۔ پہلی لڑکی
کی عمر ۱۷ سال ہے۔ وہ کالج میں زیرِ تعلیم ہے
دوسری لڑکی کی عمر ۱۵ سال ہے اور تیسری
کی ۱۱ سال۔

نجمہ ۱۹۸۰ سے راجیہ سبھا کی ممبر ہیں۔ اس
سے پہلے وہ بمبئی کانگریس کمیٹی کی نائب صدر
تھیں۔ وہ جب پارلیمنٹ کی ممبر بنیں تو وہاں
انہوں نے مسلم پرسنل لا کے بارے میں تقریر
کی۔ اس زمانے میں حکومت کی کوشش تھی کہ
تمام ملک کا پرسنل لا ایک قانون کے تحت ہو۔
مسلمان رائے عامہ اس بات کے خلاف تھی۔ نجمہ
بھی پرسنل لا میں تبدیلی کے خلاف ہیں۔ ان
کا کہنا ہے کہ اسلام نے عورت کو وہ حقوق دیئے
ہیں جو دنیا کے کسی مذہب نے نہیں دیئے۔
اسے شادی میں اپنے خاوند کو چننے کا حق حاصل
ہے۔ خاوند سے نہ بنے تو خلع کا حق ہے۔
عورت معاشی طور پر بھی آزاد ہے۔ اسے باپ کی
جائداد میں اپنے بھائی سے نصف حصہ ملتا ہے۔
خاوند کی جائداد سے ۲ فی صد حصہ ملتا ہے۔ یہ مہر کی
رقم کے علاوہ ہے۔ بیٹا اس کی زندگی میں فوت
ہو جائے تو اس کی جائداد سے بھی حصہ ملتا ہے۔
وہ اپنی جائداد اور روپیہ کی دیکھ بھال خود کر سکتی ہے
جب اسے باپ اور خاوند کی جائداد میں حصہ دیا گیا
تو اسے اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی
کے متعلق خود فیصلہ کرے۔ خاوند اگر لاپتہ ہو جائے
تو اسے علیحدگی کا حق حاصل ہے۔ حنفی فقہ میں ایک
بیوی کو اپنے لاپتہ خاوند کے انتظار میں برسوں گزارنے
پڑتے ہیں لیکن نجمہ نے اس معاملے میں بھوپال کی
مثال دی۔ وہاں اگر کسی عورت کا خاوند اسے چھوڑ کر
بھاگ جائے یا لاپتہ ہو جائے تو وہ قاضی سے
رجوع کرتی ہے۔ قاضی تین مہینے کا نوٹس اخبار میں
شائع کراتا ہے۔ اگر خاوند اس نوٹس کا کوئی جواب
نہ دے تو بیوی کو خلع مل جاتا ہے۔ حنفی فقہ میں
ایک نشست میں تین بار طلاق کہہ دینے سے
طلاق ہو جاتی ہے لیکن تین مہینے کی مدت میں
خاوند بیوی سے رجوع کر سکتا ہے۔ اس طرح
قانون کے بنیادی اصول کو برقرار رکھا گیا ہے
غالباً ان تبدیلیوں کا سبب نواب صدیق حسن خان
کا اثر ہے۔ جو نواب سلطان جہاں بیگم کے دوسرے
خاوند تھے۔ نواب صدیق حسن اہلِ حدیث کے
ممتاز علماء میں سے تھے۔

اسلام میں وراثت کے قانون پر بھی بحث
لے دے ہو رہی ہے۔ اگر کوئی لاولد انسان
ایک بچے کو گود لیتا ہے اور اسے پال پوس کر
بڑا کرتا ہے۔ تو وہ اس کا بیٹا تصور کیا جاتا ہے
لیکن اسلامی قانون لے پالک کا حق تسلیم نہیں کرتا۔
پارلیمنٹ میں لے پالک کو اس کا حق دلانے
کے لئے کوشش ہو رہی ہے۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ
ان لوگوں میں پیش پیش ہیں جو وراثت کے
قانون میں کوئی تبدیلی چاہتے ہیں۔ نجمہ کو وراثت
کے قانون میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ ان کا کہنا
ہے کہ انسان زندگی میں اپنا سرمایہ جسے چاہے
دے سکتا ہے۔ وہ یہ سرمایہ لے پالک کے
نام بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے
کہ اس کے مرنے میں ایک سال باقی ہو۔ یہ سال
مرض الموت کی مدت کہلاتا ہے اور اس عرصہ میں
دیا ہوا ترکہ قانون کی نظروں میں قابلِ اعتنا نہیں ہے۔

محبت کی شادی اور ماں باپ کی پسند
کی شادی کے معاملے میں نجمہ میانہ روی کی قائل ہیں۔
اسلام میں مرد کے ساتھ عورت کو بھی اجازت ہے
کہ وہ جہاں چاہے شادی کر سکتی ہے۔ اس لئے
ماں باپ کی پسند کی شادی کو اسلامی شادی
قرار دینا غلط ہے۔ مگر یہ بات صحیح ہے کہ
ماں باپ جب لڑکی کا رشتہ تجویز کرتے ہیں
تو زمانے کی اونچ نیچ بھی دیکھتے ہیں۔ وہ صرف
لڑکے کی شکل و صورت پر نہیں جاتے، جب کہ
نوجوان لڑکے لڑکیاں ان چیزوں کو نہیں دیکھتے
ماں باپ کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں، جب کہ محبت
اندھی ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ لڑکے لڑکی
کی پسند کے ساتھ ماں باپ کی رائے بھی شامل
ہو۔ خود نجمہ کی شادی بھی اسی طرح ہوئی۔ وہ
شادی سے پہلے اپنے خاوند کو جانتی تھیں۔ ان کی
شادی میں ماں باپ کی رضامندی بھی شامل تھی۔

یہ بات دنیا بھر میں مشہور ہے کہ مرد
نے عورت کو دبا کر رکھا ہے۔ اس پر ظلم کیا ہے
اسے دنیا میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع
نہیں دیا ہے۔ مغربی ممالک میں عورتیں مردوں کے
خلاف تحریک چلا رہی ہیں۔ نجمہ مرد اور عورت کی برابری
کی قائل نہیں ہیں۔ عورت ہر کام نہیں کر سکتی۔ اس کے
علاوہ اس کی زندگی میں کئی پابندیاں ہیں جو مردوں
پر لاگو نہیں ہوتیں۔ وہ حاملہ ہوتی ہے۔ اسے بچوں
کو دودھ پلانا پڑتا ہے۔ صدیوں سے یہی ہوتا
چلا آیا ہے۔ کام کی اس تقسیم نے مرد کو زیادہ
طاقت ور بنا دیا ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے
جب انسان غاروں میں رہتا تھا، کام کی یہی تقسیم
رائج تھی۔ مرد شکار کے لئے نکلتا تھا۔ عورت گھر
میں رہتی تھی، بچے پالتی تھی، کھانا پکاتی تھی۔ اس
تقسیم نے عورت کے دل کو نرم بنا دیا۔ عورت کی
قوتِ برداشت مرد سے زیادہ ہے۔ بچوں کو
پالنا ایک صبر آزما کام ہے۔ لیکن نجمہ مرد اور عورت
کے معاملے میں تعصب کی قائل نہیں۔ خود ان
کے گھر میں یہ تعصب نام کو بھی نہیں تھا۔ ان
کی نانی تعلیم یافتہ تھیں، ماں بھی تعلیم یافتہ تھیں
مگر یہ تعلیم مشرقی علوم تک محدود تھی۔

مغرب کے لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ
ایشیا میں مرد عورت کا احترام نہیں کرتے، عورت
مرد کے جوتے اتارتی ہے۔ اس کے پاؤں دباتی
ہے، جب کہ یورپ میں مرد عورت کے استقبال
کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے، اس کا سامنا ہو جائے
تو اپنا ہیٹ اتار لیتا ہے۔ لیکن کیا عورت کا مقام
وہاں مرد سے بلند ہے؟ دونوں جگہ ہی مرد کا
رتبہ عورت سے بلند ہے۔ پھر اس ڈھونگ
سے کیا فائدہ۔ دراصل ہم حقیقت پسندی سے
کام نہیں لیتے۔ اگر کوئی عورت بھری ہوئی بس میں
داخل ہو جائے تو مرد اخلاقاً اپنی سیٹ چھوڑ دیتے
ہے۔ نجمہ کے خیال میں ایک جوان اور صحت مند
عورت کے لئے بس کی سیٹ چھوڑ دینا صحیح
جوان عورت کے مقابلے میں ایک بوڑھے
کے لئے سیٹ چھوڑنا زیادہ بہتر ہے۔

نجمہ نے تقریباً ساری دنیا کی سیا
کی ہے۔ وہ جب مسز گاندھی کے ساتھ
کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے گئیں
ان کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا
کے ملکوں سے آئے ہوئے نمائندوں کو
فارم دیا جاتا ہے جس میں ایک سوال یہ بھی
ہے کہ آپ کی بیوی کا نام کیا ہے۔ نجمہ نے
سوال کو دیکھا اور حیران رہ گئیں۔ بھلا ان کی بیوی
ہو سکتی ہے؟ مغرب کے آزاد خیال کا
نہیں اس بات کی امید نہیں تھی کہ ایک عو
ڈیلی گیٹ بھی اقوام متحدہ میں داخل ہو سکتی
نجمہ نے عراق، مصر، لیبیا، تیونس، سیریا اور
کی سیاحت بھی کی ہے۔ گزشتہ سال وہ
کانفرنس میں شرکت کرنے پاکستان کی
اسلام آباد بھی گئی تھیں۔

نجمہ بمبئی میں رہتی ہیں۔ ان کا مکان
کرنل کے علاقہ میں ہے۔ بمبئی میں رہتے ہوئے
برسوں گزر گئے ہیں۔ وہ گجراتی بول سکتی ہیں۔ ا
نے بمبئی کی سیاسی اور سماجی زندگی میں
حصہ لیا ہے۔ لیکن انہوں نے مہاراشٹر
میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ا
سے پارلیمنٹ کی ممبری کا شوق تھا۔ اس
ارمان پورا ہو گیا اور وہاں ان کی سیاسی زند
مرکز بن گیا۔

شکایت فرصت نہ ملنے کی

شیریں فرحت قمر

لیجیے لمحہ لمحہ کرکے ایک سال اور گزر گیا۔ ایک ایک لمحہ سے مل کر ایک منٹ، ایک منٹ سے مل کر گھنٹے، دن، ہفتے، مہینے اور پھر ہفتے ہیں اور گزرتے چلے جاتے ہیں اور ہمارے بہت سے کام ادھورے رہ جاتے ہیں۔

ایک طالب علم کو شکایت رہتی ہے کہ اُسے مضامین پڑھنے کے لئے وقت نہیں ملتا۔

ایک گرہستن کو گلہ رہتا ہے کہ گھر کے کاموں میں اُلجھے رہنے کی وجہ سے کسی سے ملنے جُلنے کہیں آنے جانے کا وقت ہی میسر نہیں آتا۔

ایک عام آدمی فریاد کرتا رہتا ہے کہ اُسے فرصت ہی نہیں ملتی۔

دوسری طرف ہمارے ہی معاشرے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے لمبے چوڑے کاروبار کو بھی سنبھالتے ہیں، اپنی زندگی کی گوناگوں ذمّہ داریوں کو بھی نبھاتے ہیں اور ہنستے کھیلتے، ورزش کرنے، سیر کرنے، سفر کرنے، لوگوں سے ملنے جُلنے کا وقت بھی وقت بھی نکال لیتے ہیں۔ ایک وزیر، ایک بزنس مین یا ایک افسر اعلیٰ صبح سے رات تک نہ جانے کتنے مسائل کو سُلجھاتا ہے، کتنے ٹیلیفون کرتا ہے، کتنے کاغذات دیکھتا ہے۔ میٹنگیں، دعوتیں، جلسے تقریریں، انکم ٹیکس، مقدمے، سفر، وقت کی پابندی وغیرہ سے یہ لوگ اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے یہ سب کام بہت آسان ہو۔

کیا اس قسم کے لوگوں کا دن چوبیس گھنٹے کی بجائے چالیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔

کیا یہ لوگ رات کو سوتے نہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسا بھی نہیں ہے۔ دن ایک ہی جیسا عرصہ سب کے لئے لے کر آتا ہے اور رات کو یہ سب ہی لوگ سوتے ہیں۔

مغربی ممالک یا مشرق میں جاپان جیسے ملک کے عام لوگ بھی اپنے دن کے ان ہی چوبیس گھنٹوں میں بہت کچھ کر لیتے ہیں۔ اپنی روزمرّہ کی زندگی کی ذمّہ داریاں پوری کرنے کے علاوہ وہ کچھ تفریحی کام بھی کرتے ہیں اور تخلیقی بھی، کسی کے کام بھی آتے ہیں اور کلب میں وقت بھی گزارتے ہیں۔ ہفتہ واری چھٹی کو جی بھر کر مناتے ہیں اور سالانہ چھٹیوں میں لمبے لمبے تفریحی سفر بھی کر لیتے ہیں۔ ہر فرد کا کوئی نہ کوئی مشغلہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لئے بھی وہ وقت نکال لیتا ہے۔

وقت سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کا راز ہے: لمحات کی قدر!

چند لمحوں سے مل کر ایک منٹ بنتا ہے اور ایک منٹ کو عام طور سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی (ایک منٹ کیا ایک گھنٹہ کی بربادی کا افسوس نہیں کیا جاتا۔) ایک منٹ دیکھنے میں معمولی سی عرصہ لگتا ہے، لیکن اسی ایک منٹ میں۔

آپ ایک مختصر سا پوسٹ کارڈ لکھ سکتی ہیں، جس کا انتظار آپ کی کوئی دُور افتادہ سہیلی یا رشتہ دار بس کرتی ہی رہتی ہیں۔

آپ پڑوس میں جا کر کسی بزرگ کو آداب سلام کر سکتی ہیں یا کسی بیمار کا حال چال پوچھ سکتی ہیں (اب اس کا کیا کیا جائے کہ ان معمولی کاموں کے لئے بھی ہم کو گھنٹہ آدھا گھنٹہ چاہیے اور اتنا وقت نہ ہونے کی صورت میں ہم اس قسم کے کام ٹال دیتے ہیں۔)

ہم کسی سے مانگی ہوئی چیزوں کو لوٹا سکتے ہیں (یہ کام مگر کرنا ہی ہو تو ایک منٹ میں ہو سکتا ہے اور اگر نہ کرنا ہو تو مہینوں تک نہیں ہوتا اور پڑوسی کی وہ چیز یا تو گم ہو جاتی ہے یا اِدھر اُدھر پڑی رہ کر خراب ہو جاتی ہے۔)

بجلی کے ڈھیلے سوئچ، پریس کے ڈھیلے تار، ہیٹر یا کوکر کے ڈھیلے ہینڈل کو کسا جا سکتا ہے

الماری کے ایک خانے یا گھر کے ایک گوشہ کی بے ترتیب چیزوں کو قرینے سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک جگہ رکھے ہوئے خطوط، بجلی پانی کے بل، رسیدیں وغیرہ فائلوں میں ڈالی جا سکتی ہیں۔

پانچ چھ گلاس یا چائے کے پیالے دھو کر اپنی اپنی جگہ رکھے جا سکتے ہیں۔

اسکول گئے ہوئے بچّوں کی چھوڑی ہوئی چیزوں کو اپنی اپنی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔

میلے کپڑے اپنی جگہ پہنچائے جا سکتے ہیں

ڈرائنگ رُوم کی کرسیوں، میزوں وغیرہ پر جھاڑن پھیرا جا سکتا ہے۔

ایک کمرے سے مکڑی کے جالے صاف کئے جا سکتے ہیں۔

ایک جوڑ جوتوں پر پالش کیا جا سکتا ہے۔

ایک جوڑ موزے یا دو رومال دھوئے جا سکتے ہیں۔

اخبار کے پہلے صفحہ کی سُرخیاں پڑھی جا سکتی ہیں۔

اور بھی نہ جانے ایسے کتنے چھوٹے موٹے
م کئے جا سکتے ہیں جن کو کرنے کے لئے آپ کو
رصت نہ ملنے کی شکایت رہتی ہے اور جن کے بروقت
نہ ہونے سے کبھی کبھی جسمانی، دماغی یا مالی پریشانی
کے علاوہ کئی کئی گھنٹے برباد ہوتے رہتے ہیں۔

ایک طرف وقت نہ ملنے کی شکایت اور
دوسری طرف وقت کی بے قدری کا یہ عالم کہ آپ
کو اس قسم کی باتیں ہندوستانی معاشرے میں عموماً سننے
کو ملیں گی۔

ارے اب کھانے میں صرف آدھا گھنٹہ
باقی رہ گیا ہے۔ اتنی دیر میں کیا کام ہوگا۔

بس دفتر جانے میں پندرہ منٹ رہ گئے
ہیں اتنی دیر میں کیا ہو سکتا ہے۔

سر پیریڈ ختم ہونے میں بس پانچ منٹ
رہ گئے ہیں۔ اب بس کریں۔

یعنی دس پانچ منٹ یا آدھا گھنٹہ کوئی معنی
ہی نہیں رکھتا۔ بعض لوگ تو کسی سفر، تبادلے وغیرہ
سے پہلے کے پورے ایک دو دن کو ہی اپنی عملی
زندگی میں شمار نہیں کرتے۔ اس طرح ہر روز کس قدر
وقت برباد ہوتا ہے۔ فرض کریجئے ایک گھنٹہ روز
سال بھر میں ۳۶۵ گھنٹے یعنی پورے پندرہ دن؛
آنکھ کھل جانے کے بعد بستر سے باہر آنے
میں ہم لوگ گرمی کے موسم میں دس پندرہ منٹ
اور جاڑوں میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضائع کر دیتے
ہیں۔ جب کہ مستعد آدمی الارم کی آواز سنتے ہی
بستر سے باہر نکل آتے ہیں۔ بستر میں جاگتے ہوئے
پڑے رہنے کا اوسط ایک عام ہندوستانی کے
لئے آدھا گھنٹہ روز بھی ہو تو سال بھر میں پورا
ایک ہفتہ اس غلط عادت کی نذر ہو جائے گا۔

میں نے ایسے افراد بھی دیکھے ہیں، جو
بارہ گھنٹے روز سونے کا ارادہ رکھتے ہیں اور جب
بھی موقع ملتا ہے اتنا سوتے ہیں۔ آپ کے آس
پاس بھی کوئی نہ کوئی شخص ایسا ہوگا جو چھٹی کے
دن کا بہترین مصرف سونا سمجھتا ہے۔ اس طرح
ضرورت سے زیادہ سونے میں سال کا نصف عرصہ
یعنی پورے چھ مہینے ختم ہو جاتے۔ ایک عام
صحت مند انسان کے لئے سات آٹھ گھنٹے کی نیند
کافی ہوتی ہے۔ اگر ہم فالتو نیند میں تین گھنٹے روز بھی
ضائع کرتے ہیں تو سال بھر میں ڈیڑھ مہینہ ضائع
کر دیتے ہیں۔ اپنی جان پہچان کے کامیاب اشخاص
کی زندگی پر نظر ڈالئے وہ آپ کو بہت کم سوتے
ملیں گے۔ ضرورت سے زیادہ سونے سے شاید
قسمت بھی کچھ اونگھنے لگتی ہے۔

نیند سے زیادہ وقت کو قتل کرنے والی
عادت ہمارے معاشرہ میں ایک اور بھی ہے اور
وہ ہے فضول کی باتیں۔ عورتیں اس سلسلہ میں کچھ زیادہ
ہی بدنام ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم لوگ
صبح سے شام تک بے کار کی باتیں ہی کرتے
رہتے ہیں۔ یہ باتیں اکثر ایسی ہوتی ہیں جن کو نہ بولا
جائے تو زندگی میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا۔ گپ شپ،
دوسروں کی برائیاں، بے کار کی نکتہ چینی، خواہ مخواہ
کا بحث و مباحثہ، غیبت، چغلی وغیرہ، محض بے کار
کی باتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امریکن بہت زیادہ بولتے
ہیں، میرا خیال ہے ہم ہندوستانی امریکنوں سے
بھی زیادہ بولتے ہیں۔ پھر امریکنوں کو تو کھانے کو
بھی خوب ملتا ہے۔ ہم لوگ تو ویسے ہی ناقص اور
کم خوراک کھاتے ہیں اور دوسری طرف فضول باتوں
میں اتنی توانائی ضائع کرتے رہتے۔ انگریز، جاپانی
اور جرمن لوگ بہت کم بولتے ہیں اور اگر ہم تاریخ
پر نظر ڈالیں تو انگریزوں اور جرمنوں نے بہت کچھ کیا
ہے اور آج جاپانی بہت کچھ کر رہے ہیں۔

ہندوستانی معاشرے میں گپ شپ ایک

مشغلہ کے طور پر کی جاتی ہے، دفتر ہو یا سڑک ریل
ہو یا بس، گھر ہو یا دوکان ہر طرف باتیں۔ باتیں۔ بہت سے
لوگ کام کرتے جاتے ہیں۔ اور بولتے جاتے ہیں۔
اس طرح نہ کام صحیح ہو پاتا ہے، نہ گفتگو کا لطف آتا
ایک تجربہ کیجئے، ایک کام کو بغیر کسی سے بات چیت
کئے توجہ لگا کر کیجئے۔ دوسری بار اسی کام کو باتوں
کے ساتھ کیجئے۔ آپ کو دونوں بار کام کے دوقفہ میں
اور کام کی اچھائی میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔ اگر
ہم اپنی فضول باتوں کا اوسط دو گھنٹے روز فرض کرلیں
تو سال میں ایک مہینہ اس طرح بے کار ہو جاتا ہے
ان باتوں کے علاوہ کام کو ٹالنے، چیزوں
کو سلیقے اور ترتیب سے نہ رکھ کر ان کو ڈھونڈھنے
اور پھر غصّہ اور لڑائی کرنے، خواہ مخواہ کڑھنے
، کام کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے کام نہ کرنے کی

وجہ سے سال بھر میں ایک ماہ کے بے کار ہونے
کا اور امکان ہے۔

اب ذرا شمار کیجئے:

فطری نیند یعنی آٹھ گھنٹے روز سونے
کی وجہ سے گزر جاتے ہیں۔ سال میں ۱۲۰ دن۔
فالتو نیند کی وجہ سے بے کار جاتے ہیں
سال بھر میں ۴۵ دن۔
بیدار ہو کر بستر سے نہ نکلنے کی وجہ سے
ضائع ہوتے ہیں سال بھر میں: ۷ دن
دس پندرہ منٹ کو اہم نہ سمجھ کر بے کار ضائع
کرنے کی وجہ سے: ۱۵ دن
فضول باتوں میں فضول چلے جاتے ہیں:
۳۰ دن۔
بے ترتیبی، بدسلیقگی، غصّہ اور کڑھن کی

تبدیل کرنے میں [illegible]
کھانے ناشتے [illegible]
تفریح وغیرہ میں: ۲۰ دن
یعنی سال بھر میں ۳۳۵ دن ہوگئے
باقی بچے تیس دن۔ اس کا مطلب یہ ہوا
کہ پورے سال کے عرصہ میں ہم واقعی کام صرف ایک
ماہ کے عرصہ کے برابر کرتے ہیں۔ یہ بات آپ
کو عجیب سی لگے گی۔ مگر ایک تلخ حقیقت ہے ہمارے
معاشرے کے افراد کی۔ اب ہم اپنی ناکامی اور غریبی
کا الزام اپنی قسمت پر لگائیں تو یہ دوسری بات ہے
دوسرے اشخاص یا باہر کے حالات پر الزام لگانے
سے اپنی عزت محفوظ سی ہو جاتی ہے نا! لیکن یہ
ہماری غلط فہمی ہے۔ ہم اپنا الزام کسی پر ٹال نہیں سکتے
کام یابی، ترقی، خوش حالی اور مسرت
کے لئے بھرپور کام کرنا ضروری ہے اور کام کرنے
کے لئے ضرورت ہے وقت کی۔ تو اپنا وقت بچائیے
لمحہ لمحہ کی قدر کیجئے۔ منٹ منٹ کو کام میں لگایئے
اس طرح اگر آپ سال بھر صرف ایک ہزار گھنٹے
بھی بچا سکیں تو آپ ایک سال میں۔
...۵۰۰ صفحات پڑھ سکیں گی۔
...۴۰۰ صفحات لکھ سکیں گی۔
...۱۰۰ سماجی ملاقاتیں کر سکیں گی۔
سیر تفریح اور ورزش کے لئے تین گھنٹے
روز صرف کر سکیں گی۔
...۶۰۰۰ ہزار خطوط لکھ سکیں گی۔
سیکڑوں ادھورے کام پورے کر سکیں گی
ذرا سوچئے ـــــ اور سوچنے میں بھی زیادہ
وقت نہ لگایئے۔ بس اپنے لمحات کو استعمال کرنا
شروع کر دیجئے۔ ■■

ڈستی تنہائیاں

عطیہ پروین

ایک ادھیڑ عمر کی خوبصورت عورت
کے پیچھے ...

پہلا سین

شام کا وقت ہے۔ سنہری دھوپ پارک میں بکھری ہوئی ہے۔ کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ پھاٹک کی طرف سے ایک بوڑھا آدمی خوبصورت سی چھڑی کو کبھی زمین پر ٹیکتا ہوا اور کبھی اسی چھڑی سے پودوں اور پیڑوں کو چھیڑتا ہوا آہستہ آہستہ آتا ہے۔ بچوں کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ بچے ایک ساتھ چلاتے ہیں۔

بچے : دادا آگئے! دادا آگئے!

بوڑھا : (ہنستا ہے) ہاں بچو، میں آگیا کون سا کھیل ہو رہا تھا؟

ایک چھوٹی بچی : ہم آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ دادا، آپ بھی کھیلیں گے؟

بوڑھا ایک لمبی سانس لے کر بینچ پر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے۔

بوڑھا : نہیں بیٹی، اب کیا کھیلیں گے — آنکھ مچولی۔ اب تو زندگی ہم سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔

بچی : کیا کہا دادا؟ زندگی کیسے آنکھ مچولی کھیلتی ہے؟

بوڑھا : (پیار سے بچی کا سر تھپتھپاتا ہے) تم ابھی نہیں سمجھو گی، بیٹی۔ جاؤ کھیلو۔

بچے جو آگ پر ننگے پاؤں ناچتے ہیں

جزیرہ بالی میں بچے اپنے ذریعہ پیش کردہ ایک مذہبی مجلس سنگ ہیانگ میں دہکتے شعلوں پر بغیر جوتہ پہنے ناچتے ہیں۔ وہ سمادھی کی ایسی حالت میں پہنچا دیے جاتے ہیں جس میں انہیں نہ کسی طرح کی تکلیف ہوتی ہے اور نہ ہی وہ زخمی ہوتے ہیں۔

(ایک بچہ دوڑتا آتا ہے اور بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے)

بچہ : دادا، میری آنکھیں بند کیجیے۔ میں چور بنا ہوں۔

بوڑھا : (ہنستا ہے) اچھا تم چور ہوا بھئی واہ! (جیب سے رومال نکالتا ہے اور بچے کی آنکھوں پر رومال باندھتا ہے۔)

بچہ : (دھیرے سے) دادا! دادا! ذرا ڈھیلی پٹی باندھنا میں چپکے سے دیکھ لوں گا کہ پنکی کہاں جاتی ہے۔

بوڑھا : (ہنستا ہے) اچھا بے ایمان بتادوں سب کو؟

بچہ : (خوشامد سے) نہیں دادا نہیں۔

بوڑھا : اچھا، یہ تو بتاؤ، صرف پنکی کو کیوں دیکھو گے؟

بچہ : بس دیکھوں گا۔ وہ میری فرینڈ ہے نا۔

بوڑھا : آہا! تو یہ بات ہے، برخوردار! جمعہ جمعہ آٹھ روز ہوئے آپ کی پیدائش کو اور ماشاءاللہ گرل فرینڈ بنانے لگے!

بچہ : (آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی پر ہاتھ پھیر کر) دادا، میں آٹھ روز کا نہیں ہوں آٹھ سال کا ہوں۔ (اکڑ کر) پورے آٹھ سال کا۔

(یہ کہتے ہوئے وہ بچوں کے پیچھے اِدھر اُدھر بھاگنے لگتا ہے۔ بوڑھا ان سب کے ہنستے، چہچہاتے بھاگتے، دوڑتے دیکھ کر بڑے پیار سے مسکراتا ہے۔ پھر ایک لمبی سانس لیتا ہے)

بوڑھا : (اپنے آپ سے) کبھی ہم بھی بچہ تھے ہنستی پھُدکتی چہچہاتی چڑیاں۔ ہم بھی آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ چور زیادہ تر ہم کو بنایا جاتا تھا۔ "آجاؤں آجاؤں" ہم کہتے اور کورس میں ساتھی چلاّتے: "ابھی ناہیں۔ ابھی ناہیں!" اور ان سب میں ایک مہین سی اونچی سُریلی آواز نمایاں ہوتی: "آجاؤ" ہم دوڑتے۔ کونا کونا ڈھونڈتے اور پھر ایک پیاری سی نرم نرم سی لچکیلی سی، گوری سی ہرنی جیسی آنکھوں والی بچی کو پکڑ لیتے سب شور مچاتے: "نجمہ چور! نجمہ چور!" ہم دیکھتے نجمہ کا پھول سا مونہہ اور پھول گیا ہے۔ انگلی اٹھا کر کہتی: "بے ایمان! تم دیکھ رہے تھے"، ہم لاکھ قسمیں کھاتے۔ وہ ایک نہ سنتی۔ تب ہم کہتے: "اچھا لو ہم تمہاری باری پر چور بن جائیں گے"، اُف! کیا دن تھے وہ بھی!

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

(آنکھوں میں آئے ہوئے پانی کو ہاتھ سے پونچھتا ہے۔ بچے اِدھر اُدھر سے آکر اسے گھیر لیتے ہیں۔ وہی بچہ جس کے پٹی باندھی گئی تھی کہتا ہے)

بچہ : دادا، دیکھیے، میں پنکی کی باری پر چور بنا ہوں تو یہ لوگ کہتے ہیں ہم بدلہ نہیں کرنے دیں گے۔ پنکی خود چور بنے۔ بتلائیے دادا، میں کیا بُرائی کر رہا ہوں۔

بوڑھا : (اس پیاری سی بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) نہیں بچو، گُڈو کو پنکی کی باری پر چور بن جانے دو۔ یہ ننھی سی پیاری سی چڑیا تھک جاتی ہے نا۔

(بچے پھر شور مچاتے اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔)

دوسرا سین

(سڑک پر ایک ادھیڑ عمر کی خوب ص
عورت آہستہ آہستہ چلی آرہی ہے سف
ساڑی، سفید بلاؤز — کانوں میں ٹاپس یا
خالی۔ آنکھوں پر چشمہ۔ اِدھر اُدھر دیکھتی ہو
اپنے آپ سے کہتی ہے

عورت : میرے خیال میں تو آج بھی
شخص میری مخصوص بنچ پہ بیٹھا ہوگ
بڑا ضدی ہے۔ کہتا ہے: "میڈ
یہ پبلک کا مال ہے اس پر کسی کا نا
نہیں لکھا ہے۔ آپ بھی اسے استعما
کر سکتی ہیں"، میں بھی، سچ، بڑا ضد
(پارک کے دروازے پر رک

بچوں کا شور بڑھتی ہے اور مسکراتی ہے)

..: ہائے! بچپن — چہچہاتی چہکتی ہوئی چڑیاں. کبھی ہم بھی اسی طرح اُڑتے، چہکتے پھرتے تھے. آہ وہ خوب صورت دن! دل کے تہ خانے میں ابھی تک ان دنوں کی یادیں دفن پڑی ہیں. (گہری سانس بھر کر)

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

پارک میں داخل ہوتی ہے چاروں طرف دیکھتی آگے بڑھتی ہے. بچوں کا شور)

: آنٹی آگئیں! آنٹی آگئیں!

(سب بچے عورت کو گھیر لیتے ہیں. وہ ایک ایک کا سر تھپکتی ہے. بال سہلاتی ہے اور پوچھتی ہے)

ت: آج ہمارا بنچ خالی ہے نا؟

ل: نہیں آنٹی، آج بھی اس پر دادا بیٹھے ہیں.

ہ: آنٹی، دادا سے لڑائی نہ کیجیے گا. وہ تو بڑے اچھے ہیں. روز آپ کا راستہ دیکھتے ہیں.

ت: (تعجب سے) میرا راستہ؟

ہ: جی.

ت: (اپنے آپ سے) کبھی وہ بھی میرا اسی طرح راستہ دیکھا کرتا تھا. اس کی خوب صورت نیلی آنکھیں میرے راستے پر بچھی رہتی تھیں.

ہ: کس کی آنکھیں، آنٹی؟

رت: (چونک کر) کسی کی نہیں. جاؤ بچو، تم لوگ کھیلو.

(آہستہ آہستہ بڑھتی ہے.

بنچ کے قریب پہنچتی ہے بوڑھا چونک کر دیکھتا ہے. اس کی آنکھیں عورت کے چہرے پر جمی ہیں اور ہونٹ ہل رہے ہیں)

بوڑھا: آہ! بالکل وہی چال! دھیرے دھیرے ہولے ہولے. جیسے پانی پر تیرتی ہوئی مرغابی. کسی شہزادی کی طرح بادقار اور اونچی اٹھی ہوئی گردن. لبوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ اور آنکھوں میں کوندتی ہوئی بجلیاں. (آہ) جب وہ میں آ کر رستانے کے لیے کہتا:

رہ گئے لاکھوں کلیجہ تھام کر
آنکھ جس جانب تمہاری اٹھ گئی

وہ خفا ہو کر کہتی: یہ نہ کہا کرو.

رہ گئے لاکھوں کلیجہ تھام کر

صرف اپنے کلیجے کے بارے میں کہا کرو.

بوڑھا: (زور سے) السلام علیکم محترمہ.

بہت دیر کی مہرباں آتے آتے.

عورت: (خفگی سے) معاف کیجیے گا، ہم اتنے بے تکلف نہیں ہیں. وعلیکم السلام.

بوڑھا: (مسکراتے ہوئے) نہ سہی بے تکلف. اس ادا اس بوڑھی شام کے ساتھی خوب ہیں.

عورت: بھلا آپ میرا راستہ کیوں دیکھتے ہیں؟

بوڑھا: کیا کروں میڈم. راستہ دیکھنے کی عادت سی پڑی ہے. بچہ تھے تو بھی کسی کا راستہ دیکھتے تھے. جوان ہوئے تو جوانی راستہ دیکھتے دیکھتے گزر گئی اور اب بڑھاپا آیا ہے تو بھی کم بخت انتظار کا روگ ختم نہیں ہوا. معاف کیجیے گا آپ کو دیکھ کر مجھے کوئی یاد آجاتا ہے.

ایسا قبیلہ جس میں کوئی عورت غیر شادی شدہ نہیں

کاٹھمانڈو (نیپال) کی [illegible] ایک لڑکی کی [illegible] برس میں ایک [illegible] درخت کے ساتھ شادی کر دی جاتی ہے تاکہ وہ غیر شادی شدہ نہ رہنے [illegible] بڑی ہو جائے [illegible] زندگی میں [illegible] جب وہ [illegible] درخت [illegible] جاتے ہیں.

(عورت ہاتھ میں پکڑا ہوا پرس بنچ پر اس طرح رکھتی ہے کہ دونوں کے درمیان حائل بن جاتی ہے. پھر وہ بنچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھ جاتی ہے. بوڑھا ناک سکوڑ کر ہوا میں کچھ سونگھتا ہے اور کہتا ہے)

بوڑھا: اُف! بالکل وہی مہک. وہ جس عطر کی خوشبو میں لاکھ کہتا، دوسرے سینٹ استعمال کیا کرو. وہ کہتی: نہیں یہ میرا پسندیدہ عطر ہے. مروں گی تو وصیت کر جاؤں گی کہ کافور کی جگہ عطر حنا لگانا. (ہنستا ہے) عجیب تھی وہ بھی! کتنی پیاری! کتنی دلچسپ! کس قدر خوب صورت.

عورت: (بوڑھے کو غور سے دیکھتی ہے) آپ کچھ کہہ رہے ہیں؟

ڈیکیی سیرینا۔ لہاسہ (تبت) کی یہ خاتون تین زندہ بودھوں کی ماں ہے اس کا ایک بیٹا تبت کا دلائی لامہ ہے اور دیگر دو وسیع ریاستوں کے سربراہ ہیں۔ ان کے ان تینوں بیٹوں کو تبت میں بھگوان بودھ کا اوتار تسلیم کیا جاتا ہے۔

بوڑھا: (چونک کر) اوہ! نہیں تو۔ کچھ نہیں، بس بڑبڑانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ بوڑھا ہو گیا ہوں نا۔ گھر پر بیٹا اور بہو ایک دوسرے میں مگن رہتے ہیں۔ پوتے پوتی اسکول چلے جاتے ہیں میں اکیلا رہ جاتا ہوں۔ اداس اداس تنہا تنہا۔ میری تنہائیاں ہی میری ساتھی ہیں اور ماضی کی یادیں میری دوست۔ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔

عورت: (اپنے آپ سے) بالکل یہی عالم میرا بھی ہے، مگر میں اس اجنبی شخص کو کیوں بتاؤں کہ میری تنہائیاں بھی مجھے ڈستی ہیں اور میں بھی ماضی کے دھندلکوں میں ڈوب کر حال کی تلخیاں بھولنے کی کوشش کرتی ہوں میں اسے کیوں بتاؤں کہ اس کو دیکھ کر مجھے کوئی یاد آجاتا ہے۔ وہ خوب صورت، دلکش سراپا۔ چوڑا چکلا سینہ مضبوط بازو۔ جگمگاتی مسکراتی آنکھیں، چوڑا الباق سا چہرہ۔ اونچی پیشانی۔ باوقار چال — یقیناً اس شخص کی نوجوانی اسی خوب صورت اور وجاہت کا عکس ہوگی۔

بوڑھا: (اس کی طرف جھک کر) جی آپ نے کچھ فرمایا؟

عورت: (چونک کر) جی نہیں تو (مسکرا کر) دراصل مجھے اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔

بوڑھا: ماضی بھی کیسی دلچسپ چیز ہوا کرتا ہے۔

عورت: دلچسپ بھی اور دل کو خون کر دینے والا بھی۔

بوڑھا: (اپنے آپ سے) آہ! نہیں بھولتے وہ دن جب ہم بچپن کی حدوں سے نکل کر جوانی کی دہلیز پر کھڑے ہوئے تھے۔ میں جب شام کو اس کے گھر آتا تو وہ مجھے سراپا انتظار نظر آتی مگر وہ ظاہر یہی کرتی کہ اس کا سنگھار میرے لئے نہیں، اس کا انتظار میرے لئے نہیں، اس کی مسکراہٹ میرے لئے نہیں۔ لیکن، وہ میرا پسندیدہ گلابی رنگ کا لباس پہنے ہوتی۔ گلاب کا پھول بالوں میں لگائے ہوتی۔ اپنی گہری گہری جھیل جیسی آنکھوں میں شرم لگائے ہوتی اور اس کے تبسم سے چھلکتی شعر اچھا کہتا ہے مجھے چوم چوم کر کہتی میں تمہاری ہوں میں تمہاری ہوں۔

عورت: آپ نے کچھ کہا؟

بوڑھا: جی، کچھ نہیں۔ (آہ بھرتا ہے)

عورت: (اپنے آپ سے) آہ! یہ داستان تو اپنی معلوم ہوتی ہے۔

فضا خاموش ہے ساکت ہیں لب چپ ہے زباں میری
مگر پھر بھی سُنے جاتا ہے کوئی داستاں میری

بوڑھا: یہ شعر بہت دل نشیں ہے۔

عورت: شکریہ۔

بوڑھا: (اپنے آپ سے) ہم دونوں کتنی کتنی دیر تک ایک دوسرے سے شاعرانہ بات چیت کیا کرتے تھے۔ اسے تو اشعار یاد تھے حسین اشعار سے بھری ہوئی اس کی نوٹ بک آج بھی کسی قیمتی شے کی طرح میرے سینے سے لگی رہتی (عورت بے چینی سے پہلو بدلتی ہے۔ اب اس کا چہرہ گلاب کے پھولوں کی طرف ہے) وہ انگلی سے پھولوں کو چھوتی جاتی ہے اور کہتی جاتی ہے:)

عورت: اس کا وہ خوب صورت قلم آ... میرے سینے سے کسی قیمتی ... طرح لگا ہوا ہے اور اس کا وہ ... کا چشمہ بھی جس کو وہ ایک بار ... میز پر بھول گیا تھا۔ آہ! میں ... پیئے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے ... ڈبے میں جمع کر لیتی تھی۔ آج ... ڈبہ میرے پاس محفوظ ہے۔

بوڑھا: (اپنے آپ سے) میرے ... پینے پر وہ کس قدر خفا ہوا کرتی ... تھی: "تم انسان نہیں، کسی مل کی ... گا" "دھواں ... دھواں اگلا کرتا ..." مگر میں جانتا تھا کہ وہ میرے ... کے بعد پیئے ہوئے ... کے ٹکڑوں کو بڑے پیار ... اور ایک ڈبے میں رکھ لیتی ... چھوٹی بہن نے مجھے وہ ڈبہ ... آہ! ہماری یہ بے زبان ا...

عورت: (ٹھنڈی سانس ک...) ہماری محبت بے زبان تھی...

ا بول نہ سکے۔ ہماری محبت خاموش تھی،
ں لئے کوئی ہمیں سمجھ نہ سکا اور ہم ایک
دسرے سے جُدا کر دئے گئے۔
ٹھنڈی سانس) میری امّی نے میرے
ئے ایک دولت مند نوجوان کا انتخاب
یا۔ میں خاموشی سے دیکھا کی میرا دل
وتا رہا، مگر میرے لب چُپ رہے۔
یری قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ اور میں نے
س کو قبول کر لیا۔"
: (گھبرائی ہوئی آواز میں) وہ مجبور ہو گئی
ور میں اس کی خاطر کچھ بول نہ سکا۔ بغاوت
نہ کر سکا۔ اپنے پیار کا اعلان نہ کر سکا۔ میں
دیکھتا رہا۔ کُڑھتا رہا اندر ہی اندر جلتا
رہا اور میری کائنات مجھ سے چھن گئی۔ آہ!
محبت بھی کتنی مجبور ہوا کرتی ہے!
ے : اس کو نہیں معلوم کہ اتنے لمبے عرصے
میں ایک لمحے کے لئے بھی میں اس کو
بھول نہ سکی۔
ھا : بیوی بچّوں میں گھِر کر، زندگی کے
جنجال میں اُلجھ کر بھی میں اس کو بھلا نہ سکا۔
ت : اگر میرے بیٹے کا تبادلہ لکھنؤ نہ ہوا
ہوتا تو شاید ـــ شاید ـــ (چونک کر
وہ بُوڑھے کو دیکھتی ہے اور آنکھوں سے
چشمہ اُتار کر آنکھیں پونچھتی ہے۔)
ھا : آپ رو رہی ہیں!
ت : نہیں تو ـــ آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔
ھا : (اپنے آپ سے) آہ! بالکل وہی
بہانہ! میری جُدائی پر وہ اسی طرح
آنسو چھپا لیتی تھی۔ بالکل وہی گہری گہری
جھیل سی آنکھیں ہیں جن میں ڈوب جانے
کو دل چاہا کرتا تھا۔

عورت : (اپنے آپ سے) میرے اللہ
یہ تو بالکل اسی انداز سے دیکھتا ہے۔
اسی دل فریب انداز سے۔
بُوڑھا : کہیں یہ وہی تو نہیں ہے؟ اپنے
ماضی کی پرچھائیں؟
(عورت گلاب کا ایک پھول توڑتی ہے
ہاتھ بالوں تک لے جاتی ہے، پھر
رُک جاتی ہے۔)
عورت : توبہ! اب کیا رکھا ہے ان بالوں
میں!
بُوڑھا : کبھی ساون کی گھنگھور گھٹائیں ہوا
کرتے تھے۔
عورت : (چونک کر) جی؟ (انگلی اُٹھاتی
ہے) آپ نے کیا کہا؟
بُوڑھا : (جلدی سے) کچھ نہیں ہوا سرد
ہو رہی ہے۔ مجھے کھانسی کی شکایت
رہتی ہے۔ چلوں ـــ اپنے اداس
تنہا کمرے میں، پُرانے لحاف اور
ٹھنڈی توشک میں گھس کر ماضی کی
یادوں میں گم ہو جاؤں،
عورت : کبھی دسمبر کی یخ بستہ راتوں میں
خالی قمیص پہنے پہنے میرے لئے وہ
ہوٹل سے چائے لاتا تھا۔

بُوڑھا : آہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا! کیا میں آپ
کو کچھ دُور تک پہنچا دوں؟
عورت : جی نہیں، شکریہ۔ ہم ایک دوسرے
کے لئے اجنبی ہیں۔
(بوڑھا اور عورت ایک دوسرے
کو غور سے دیکھتے ہیں پھر آہستہ
آہستہ اُٹھتے ہیں اور ایک
ساتھ لیکن الگ الگ لمبی
سڑک پر چلتے ہیں۔ ایک
دوسرے سے انجان بنے
ہوئے، ایک دوسرے
کو دیکھے بغیر۔ بچوں کا شور ختم
ہو چکا ہے۔ رات کا اندھیرا
اُتر رہا ہے۔ گہرا سناٹا ہے
بس ان دونوں کی قدموں کی
چاپ ہے جو دُور ہوتی جا رہی
ہے۔ دُور کہیں سے ایک
دردناک گیت کی آواز سُنائی
دے رہی ہے۔

جینے کے سفر میں راہی ملتے ہیں بچھڑ جانے کو
اور دے جاتے ہیں یادیں تنہائی میں تڑپانے کو

●●

رشتے ناطے

عبدالغنی شیخ

شادی کا یہ پیام دیتے وقت مجھے بڑی
ی۔ لڑکا وجیہہ تھا، شریف تھا اور متمول
سے تعلق رکھتا تھا۔ لڑکی شریف اور خوبصورت
لرچہ غریب تھی۔

جب میں نے ریشماں کی امی سے کہا کہ
ٹکیل کے لیے ریشماں کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں
وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگیں۔

"شکیل کون ہے بیٹا؟" ان کے لہجے اور
ز میں حیرت بھی تھی اور غیر معمولی دلچسپی بھی۔

"شکیل؟ جمیل صاحب کا لڑکا، چچی، جن کا
ہریں بڑا ہوٹل ہے۔"

شاید ان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا
ا۔ پوچھنے لگیں۔ "شکیل نے کس کا ہاتھ مانگا
ہے؟"

"اپنی ریشماں کا، چچی۔"

وہ تھوڑی دیر گم صم رہیں، پھر بولیں
"افضل بیٹا، ان کا اور ہمارا کوئی جوڑ نہیں
ہے۔ پھر وہ ریشماں کا رشتہ کیوں مانگ رہے
ہیں؟"

بات دراصل یہ ہے چچی، جس روز طفیل
میاں کی شادی تھی، ان کے یہاں شکیل نے ریشماں
کو دیکھا تھا۔ ریشماں اسے پسند آئی تھی اور اس
نے اپنے والدین سے مشورہ کیا تھا اب میں ان
ہی کی طرف سے یہ رشتہ مانگنے آیا ہوں۔"

ریشماں کی امی کی آنکھوں میں اب بھی حیرت
تھی۔

میں نے کہا ریشماں میں کس چیز کی کمی ہے،
چچی؟ حسن میں، خوش خلقی میں، سلیقہ شعاری میں
وہ تو ہزاروں میں ایک ہے۔"

اسی درمیان میں ریشماں کے ابو آگئے۔
ان کے ساتھ ریشماں کی چھوٹی بہن صبیحہ بھی تھی

میں چھلکے ہوئے چہرے پر عمر، غریبی اور محنت نے ہی لکیریں کھینچ دی تھیں۔

میں نے ابّو کے سامنے رشتے کا ذکر چھیڑا۔ نے اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا "افضل ا، تم جانتے ہو، ہم بہت غریب ہیں۔ امارت و غربت کا یہ رشتہ پنپ نہیں پائے گا۔ تمہیں ملوم ہے ہم کوئی جہیز نہیں دے سکتے۔"

"میں شکیل کو اچھی طرح جانتا ہوں، چچا" میں نے وضاحت کی۔ "وہ میرا دوست ہے۔ ان کو دولت کا کوئی لالچ نہیں۔ پھر دولت ہی سب کچھ نہیں، چچا۔ دنیا میں شرافت تو سب سے بڑا گن ہے اور خاص طور سے لڑکی کی سیرت بھی تو معنی رکھتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن ہم ان لوگوں کو زیادہ نہیں جانتے۔ بس اتنا سُنا ہے کہ خاندانی ہیں، دھن دولت والے ہیں۔" کچھ توقف کے بعد وہ بولے۔ "دولت والے جہیز پر زیادہ نظر رکھتے ہیں، افضل۔"

ایک لمحہ کے لئے میں نے بھی سوچا کہ بات شاید درست ہے۔ ممکن ہے شکیل کے والدین کو ریشماں کے والد کی مالی حالت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ ہو۔ میں نے دل ہی دل میں اس معاملے پر شکیل سے تبادلۂ خیال کرنے کا ارادہ کیا۔ تاہم اپنی دلی کیفیت کو ان کے سامنے ظاہر ہونے نہیں دیا اور ان سے کہا "خاندانی اور دولت والی بات بھول جائیے، چچا میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر ان کو جہیز ہی لینا تھا تو کسی امیر گھر کی لڑکی ڈھونڈ لیتے۔ پھر بھی آپ کے اطمینان کے لئے دوبارہ ان سے مل لیتا ہوں۔"

انہوں نے کچھ جواب نہیں دیا تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا "بہر حال یہ رشتہ اپنی جگہ قائم ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو یہ رشتہ قبول ہوگا۔"

جب میں دالان میں پہنچا تو ریشماں ٹب میں کچھ کپڑے ڈبوئے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ شفق گوں ہو گیا۔ اور جلدی سے کچن میں چلی گئی۔ وہ پہلے کبھی مجھ سے اس طرح نہیں شرمائی تھی۔ میں نے سوچا، صبیحہ نے اسے یہ بات بتلا دی ہو گی کیوں کہ وہ بیچ میں ہی کچھ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

دروازے سے باہر آکر میں نے غیر شعوری طور پر مڑ کر مکان کی طرف ایک نظر ڈالی۔ تقریباً ایک سال پہلے میں اس مکان میں اس وقت داخل ہوا تھا جب ریشماں کا بڑا بھائی سڑک کے ایک حادثے میں چل بسا تھا۔ اس وقت میرے دل کی اور کیفیت تھی۔ میں حادثے کے جائے وقوع کے نزدیک تھا اور میں نے ہی سب سے پہلے محلّے کے چند بزرگوں کو یہ بُری خبر دی تھی، لیکن ریشماں کے والدین کو یہ الم ناک خبر سُنانے کی مجھے ہمّت نہیں ہوئی تھی۔ وہ بوڑھے ماں باپ کا واحد سہارا تھا۔ کئی گھنٹے بعد جب میں تعزیت کے لئے گیا بھی تو اظہارِ ماتم کئے بغیر بھیڑ میں کھڑا رہا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اس معاملے پر شکیل سے تبادلہ خیال کرنے کا ارادہ کیا تاہم اپنی دلی کیفیت کو ان کے سامنے ظاہر ہونے نہیں دیا۔

اب ایک سال بعد آج میرے دل کی کیفیت بالکل مختلف تھی۔ میں سیدھا شکیل کے پاس گیا اور ساری بات اس کو سُنائی۔ وہ مسکرا کر بولا "بھئی، ہم تو جہیز کے بالکل خلاف ہیں۔ پھر بھی تم میرے والد سے مل لو اور ان کے خیالات معلوم کر لو۔"

شکیل کے والدین نے کہا "ہمیں کچھ نہیں چاہیئے، چاہے لڑکی ان ہی کپڑوں میں ہمارے گھر آجائے جو اس وقت اس کے تن پر ہیں۔"

ریشماں کی جب شادی ہوئی تو وہ اس لباس میں تو نہیں تھی جو وہ عام طور پر پہنتی تھی۔ اس کے جسم پر بھی سُرخ عروسی جوڑا تھا۔ ساتھ میں ایک ٹرنک میں کچھ کپڑے اور زیورات بھی تھے۔ لیکن ٹیلی ویژن اور ریفریجریٹر جیسی چیزیں بہر حال نہیں تھیں۔

میں نے ریشماں کے ابّو اور امّی سے کہا "ریشماں کو اتنے کپڑے اور زیورات کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی آپ کو صبیحہ کے ہاتھ بھی پیلے کرنے ہیں۔"

"وہ بولے افضل بیٹے، بیٹی کی عزت کا خیال بھی تو رکھنا پڑتا ہے۔"

شادی سادہ طریقے سے ہوئی۔ ضیافت میں بھی شکیل کے گھر والوں نے یہ خیال رکھا کہ ریشماں کے والدین پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

شادی کے بعد بھی ابّو اور امّی میں ریشماں کے مستقبل سے متعلق ایک اضطرابی کیفیت پائی جاتی تھی۔

چند روز بعد جب شکیل اور ریشماں رواج کے مطابق سلام کے لئے آئے تو ریشماں بڑی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

ریشماں کی امّی نے دولہا کو ہاتھ باندھنے کی ایک گھڑی پیش کی۔ مگر شکیل نے گھڑی لینے سے انکار کیا۔ ابّو نے کہا۔ "بیٹا، یہ ہمارا معمولی سا نذرانہ ہے۔ اسے تو قبول کرنا ہی ہوگا۔"

شکیل نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر گھڑی لے لی۔

اقبال جعفری

بے وفا

شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کے درمیان محبت اور رازونیاز
، باتوں کو "کورٹ شپ" کہا جاتا ہے، جس کے بغیر مغربی ممالک میں شادی
ئیا ناممکن ہے۔ اب ہندوستان میں بھی (مغربی ممالک کی حد تک
ہی) ازدواجی بندھن میں گرفتار ہونے سے قبل، فریقین کے ایک دوسرے
جاننے، سمجھنے اور عادات واطوار سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے
ق ہوجانے کو معیوب نہیں کہا جا رہا ہے۔ اس دن کالج میں منعقد تقریری
ابلے کا موضوع "کورٹ شپ" ہی تھا، جس کی مخالفت میں انور کی دھواں
ار تقریر کے فوراً بعد اناؤنسر نے زیبا کو موضوع کی موافقت میں تقریر
ںنے کے لئے پکارا تھا۔ چھوئی موئی سی، لجاتی شرماتی، نازک اندام زیبا
، اسٹیج پر آتے ہی وہ سماں باندھا کہ اچھے اچھے جیالے ہوٹنگ کرنے والے
ے بھی سناٹے میں آگئے اور ہال میں ایسا سکوت طاری ہوا کہ پن گرنے
ی آواز بھی صاف سنی جاسکتی تھی۔ زیبا، شادی سے قبل، لڑکے اور لڑکی کی
ی کی موافقت پر بے تکان تقریر کر رہی تھی۔

زیبا کی تقریر ختم ہوگئی۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ کا شور چند منٹ بعد
مدم ہوگیا۔ اناؤنسر نے تقریر کے لئے کوئی اور نام پکارا۔ لیکن انور اس
ت بھی بے خود سا تالیوں سے دادِ تحسین دے رہا تھا اور ہال میں موجود
نص کی نگاہ انور کی دیوانگی کی طرف تھی۔ زیبا بھی اسے عجیب نظروں
ے دیکھ رہی تھی۔

مقابلے کے بعد انور کالج کے دروازے پر زیبا کا منتظر تھا۔
"ناگوارِ خاطر نہ ہو تو عرض کروں کہ آپ کی تقریر بالکل آپ کی طرح
ں"۔ انور نے جھجکتے ہوئے کہا، "بڑی خوب صورت، بہت حسین!"
"شکریہ"۔ زیبا نے شرماتے ہوئے نگاہیں جھکا کر کہا۔ تعریفی
مات نے اس کے رخسار دہکا دئے تھے۔
وہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔

چند دن بعد وہ لائبریری میں ملے۔
زیبا، فانی بدایونی کی شاعری میں غرق تھی۔ انور کی آواز سن کر
چونک گئی اور گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ انور اس کے روبرو تھا۔ زیبا کی بڑی بڑی
سیاہ آنکھوں کے گوشے نم تھے۔
"کیسی ہیں آپ؟ کالج میں تو کہیں نظر ہی نہیں آتی ہیں"۔
"جی، اچھی ہوں"۔ زیبا نے مختصر سا جواب دیا۔

کینٹ کے کاؤنٹ کی بیوی ایلزابیتھ
کو ١٣٠٧ میں اپنے شوہر کی موت کے بعد یہ قسم توڑنے کے جرم میں کہ وہ دوبارہ کبھی شادی نہیں کرے گی، ہر سال میں ایک بار ۴۰ میل پیدل چلنے، روزانہ ۲۲ بھجن پڑھنے اور ہر ہفتہ میں ایک دن صرف روٹی اور شوربہ کھانے کی سزا دی گئی تھی۔

"کیا پڑھ رہی تھیں؟" انور نے کتاب کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہ — یاسیات کے امام کا مطالعہ کر رہی تھیں! اتنا زیادہ اثر لیتی ہیں آپ! آپ کو شاید احساس بھی نہیں کہ آپ کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔"

"جی — اوہ — ! جی ہاں —" زیبا نے رومال سے آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا "خالی پیریڈ تھا — سوچا، لائبریری میں گزار دوں۔"

"نہ جانے کیا بات ہے، تقریری مقابلے کے بعد سے بارہا دل چاہا کہ آپ سے ملوں، باتیں کروں — مجھے غلط نہ سمجھئے، بس خواہش ہی تو ہے ایک دیوانے دل کی — اگر آپ نامناسب خیال نہ فرمائیں تو کیا میں آپ سے آئندہ بھی مل سکتا ہوں؟"

"انور صاحب!" زیبا نے نگاہیں جھکا کر کہا "اخلاقی ضابطوں اور قدروں کی حدود میں رہ کر ملنے اور بات کرنے کو میں نامناسب خیال نہیں کرتی —"

"شکریہ زیبا — مجھے یقین تھا کہ آپ میری دل شکنی نہیں کریں گی۔"

ایک شام کو بوٹ کلب میں زیبا اپنی چند سہیلیوں کے ہمراہ بوٹنگ کی غرض سے آئی ہوئی تھی۔ انور کو وہاں موجود پا کر زیبا کو بہن کی طرح چاہنے والی راز دار سہیلی تمنا نے شرارتاً دونوں کو ایک ہی بوٹ کلب میں تالاب کی سیر کا موقع فراہم کر دیا۔ کشتی بیچ تالاب میں تھی اور دیگر کشتیوں سے کافی فاصلے پر۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور زیبا کے سیاہ دراز بال لہرا لہرا کر اس کے چہرے کا احاطہ کر رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے، لیکن ان کی نگاہیں ان کے دل کی گفتگو کر رہی تھیں۔ زیبا کے چہرے پر حجاب کی سرخی چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ اس نے انور کا خاموش اظہارِ محبت سن لیا ہے۔ اچانک زیبا کے گلے میں لہراتا ہوا دوپٹہ ہوا کے زور سے نکل گیا۔ نہایت پھرتی سے زیبا دوپٹہ تھامنے کے لئے ایک جانب جھکی اور کشتی کا توازن بگڑ گیا۔ اگر انور بروقت زیبا کا بازو تھام کر اسے سہارا نہ دیتا تو وہ یقینی طور پر تالاب میں گر جاتی اور کشتی بھی الٹ چکی ہوتی۔ گھبراہٹ، متوقع حادثے کے خوف اور انور کے جوان اور مضبوط ہاتھوں کے لمس سے زیبا کا تنفس تیز ہو گیا۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا تھا؟" انور نے پوچھا۔

"میرا دوپٹہ —" زیبا بمشکل کہہ سکی۔ انور نے مخالف سمت میں کشتی موڑ دی اور کچھ فاصلے پر تالاب میں پڑا ہوا زیبا کا دوپٹہ اٹھا لیا۔

"زیبا —" انور نے کچھ عجیب لہجے میں کہا۔ زیبا کو اس کی آواز میلوں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

زیبا کے عارض گلال ہو گئے۔ انور نے پہلی بار اسے "تم" کہہ کر مخاطب کیا تھا جیسے بوجھل لمبی پلکوں نے آنکھوں پر گھونگھٹ کھینچ لیا۔ یہ سوچ کر کہ جس اظہارِ تمنا کو دل نے آنکھوں کی سفارت سے جان لیا تھا، اب انور کی زبان سے ادا ہونے کو ہے۔ جس اقرارِ محبت کو زیبا ایک بیش بہا خزانے کی مانند اپنے دل میں چھپائے رکھتی تھی، اب انور کے سامنے افشا ہونے والا تھا۔

"زیبا، تمہارے بغیر میری زندگی نامکمل ہے۔ مجھے تمہارا دائمی قرب، زندگی بھر کی رفاقت درکار ہے۔" انور انتہائی جذباتی ہو گیا تھا۔ "زیبا، تم نہ ملیں تو میں زندگی کے اس طویل و عریض ویرانے میں کہیں کھو جاؤں گا۔"

زیبا شرم سے دوہری ہو گئی۔ اپنے دل کی تمام تر گہرائیوں سے چاہتے ہوئے بھی وہ انور سے محبت کا اقرار نہ کر سکی۔ مگر یہ ضروری تو نہیں کہ دل کے جذبات کی ترجمان ہمیشہ زبان ہی بنے۔ حیا کی تپش سے دہکتے ہوئے رخسار!

رخی میں، فسر مگیں آنکھوں کی گہرائی میں تیرتے ہوئے سنہرے مستقبل کے
ں میں، انہوں نے اپنا جواب پالیا تھا۔

کالج کے خالی کمروں باغات کے تنہا کنجوں اور تالاب کی لہروں سے
کران کی داستانِ محبت نے پھیلنا شروع کیا تو ان کے افلاس زدہ
دل تک بھی پہنچ گئی اور زیبا کے چچا نے جو اس کا سرپرست بھی تھا، اس کی
ہ کا سلسلہ منقطع کرا دیا۔ محبت میں تمام زندگی ایک دوسرے کا ساتھ دینے
ے وعدوں کا، چاند تاروں کو گواہ بنا کر کھائی ہوئی قسموں کا سنہرا سلسلہ ختم ہو گیا
فرقت کے سنسان اور اجاڑ دنوں کا، جُدائی کی کسک سے بھرپور طویل
وں کا تڑپا دینے والا سفر شروع ہو گیا۔ انور کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی۔ وہ
ن میں کئی کئی بار زیبا کے گھر کے سامنے سے گزرتا کہ شاید اپنے محبوب کی ایک
ملک ہی نصیب ہو جائے، لیکن ہر بار بند دروازہ منہ چڑا کر محبت میں اس
دیوانگی کا مذاق اُڑا دیتا۔ زیبا نے کھانا پینا ترک کر دیا تھا اور دن رات
رے میں بند، انور کی ایک چھوٹی سی تصویر کو سینے سے لگائے سسکتی رہتی تھی
جرم محبت کی سزا کی ابتدا تھی۔ اور انتہا؟ زیبا کے چچا نے اس کی شادی
ے کر دی۔ شہر کے ایک سرمایہ دار تاجر خان صاحب کے ساتھ جو عمر میں
زیبا سے تیس برس بڑے تھے اور ان کی یہ تیسری شادی تھی۔ انور پر قیامت
ٹ گئی۔ زیبا سے ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی اور وقت آہستہ آہستہ
گزرتا جا رہا تھا۔

زیبا کی بچپن کی ساتھی تمنا، اس آگ سے بخوبی واقف تھی
جس میں دو جوان دل جُھلس رہے تھے۔ اس موقع پر اگر وہ خاموش تماشائی
بنی رہتی تو دو زندگیوں کے برباد ہو جانے کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی۔ اس
نے انور اور زیبا کی محبت کے راز میں اپنے خاندان کے چند افراد کو شریک کیا
اور اپنے بھائی اور بھابی کو تیار کیا کہ وہ زیبا کے سرپرستوں کو، زیبا کو بربادی
کے بھیانک غار میں دھکا دینے سے باز رکھیں۔ زیبا کے بزرگ، تمنا سے
اس کی دوستی اور محبت سے واقف تھے۔ وہ دونوں پرائمری اسکول سے
ایک ساتھ تھیں۔ مگر غربت اور افلاس سے تنگ خاندان کی اپنی کچھ مجبوریاں
تھیں۔ زیبا کے بزرگوں نے تمنا کے بھائی اور بھابی کی ہر دلیل رد کر دی۔ تمنا
نے ہار نہیں مانی۔ اس نے ایک بھیانک فیصلہ کیا۔ اس نے زیبا کے چچا اور
چچی کو اس بات کے لئے تیار کر لیا کہ وہ بند کمرے میں پڑی گھٹتی اور سسکتی زیبا

تیراک جو وہیل کے ذریعہ ڈوبنے سے بچالئے گئے

نیوزی لینڈ کی ایک خلیج لک میں ایک کشتی کے ڈوب جانے پر زندہ بچی صرف دو ادھیڑ عمر خواتین کو اس وقت زندگی مل گئی جب انہیں پانی میں تیرتی ہوئی ایک وہیل کی لاش مل گئی۔ ایک مچھلی مارنے والا بھالا وہیل کے جسم میں گھوا کر دونوں خواتین اس بھالے سے بندھی ہوئی رسی کے سہارے لاش پر چڑھ گئیں اور ۸۰ میل تک بہتی ہوئی محفوظ مقام تک پہنچ گئیں (رائٹر)

کو ایک دو دن کے لئے اپنے گھر لے جائے۔

زیبا نے انور کی حالت دیکھی نہ گئی۔ اُلجھے ہوئے خشک بال
انگاروں کی طرح دہکتی سرخ آنکھیں جو اس بات کی غماز تھیں کہ انہیں دنوں
کیا ہفتوں سے نیند نصیب نہیں ہوئی ہے۔ بڑھی ہوئی ڈاڑھی، بے ترتیب
میلے کپڑے۔ وہ انور سے لپٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے آبشار رواں ہو گئے۔
انور کے لاکھ سمجھانے پر بھی اس کی ہچکیاں اور سسکیاں بند نہ ہو سکیں۔ بہت
دیر تک رونے کے بعد وہ انور کی گود میں سر رکھ کے بے ہوش ہو گئی۔ تمنا اور انور
بمشکل تمام اسے ہوش میں لا سکے۔ وہ بالکل خاموش، کھوئی کھوئی آنکھوں سے
انور کو دیکھتی رہی۔

"زیبا ـــــ" انور کی آواز میں بلا کا پیار تھا۔ "یہ آزمائش کا وقت
ہے، فیصلہ کن آزمائش کا ـــــ میں تمہاری زندگی برباد نہ ہونے دوں گا ـــــ
دل کی نگری بہت مشکل سے بسائی جاتی ہے، زیبا۔ میں اسے اُجاڑنے کے
لئے بڑھنے والے ہاتھوں کو توڑ دوں گا ـــــ میں اس بوڑھے سرمایہ دار کے
کریہہ پنجوں سے تمہیں چھین لوں گا۔ لیکن زیبا، یہ سب کچھ تمہاری مدد کے
بغیر ممکن نہ ہو گا ـــــ تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا زیبا ـــــ"

"انور ـــــ" زیبا سسکیوں کے درمیان بولی "میرا جینا، میرا

اوبرسٹ ڈوف
جرمنی کی خواتین

موسم گرما کے سب سے زیادہ گرم دن کو بھی۔ اپار ٹنڈ زان کا فرکا ٹوپ پہنے رہتی ہیں۔
موسم گرما کے دوران وہ اس فر کے اوپر ایک دوسرا سفت اسٹرا ہیٹ اور پہن لیتی ہیں۔

مرنا۔ اب آپ کے ساتھ ہے — میں آپ کے ساتھ ہوں — زندگی بھر ساتھ رہنا چاہتی ہوں — آپ کی گود میں سر رکھ کر مرنا چاہتی ہوں۔"

"سنو زیبا —" تمنا بولی "انور بھائی تمہیں یہاں سے کہیں دور لے جانا چاہتے ہیں — فیض آباد میں میرے ماموں رہتے ہیں میں نے امی سے انہیں خط لکھوا دیا ہے تم دونوں ان کے پاس چلے جاؤ — وہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ماموں جان تمہیں زندگی بھر کے بندھن میں باندھ دیں گے۔ جب دل چاہے واپس چلے آنا — بولو زیبا، تم تیار ہو نا؟"

"تمنا، میں انور کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں۔" زیبا نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"بس تو نیک کام میں تاخیر کیوں" تمنا خوش ہو کر بولی "میں ابھی بھائی جان سے کہہ کر سفر کے انتظامات کرائے دیتی ہوں کل رات کی گاڑی سے روانہ ہو جاؤ۔"

رات تاریک تھی۔ موسم سرما کی سرد تاریک رات۔ چاروں طرف سناٹے کی حکمرانی تھی۔ زیبا کے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک رکشا کھڑا تھا جس میں بیٹھا ہوا انور بے تابی سے زیبا کی آمد کا منتظر تھا۔ گھنٹہ گھر سے دو بجنے کا اعلان ہوا اور زیبا نے نیند میں بے سدھ پڑے بیمار اور بوڑھے ماں باپ پر الوداعی نظر ڈالی۔ وہیں اس کی معصوم چھوٹی بہن فریدہ سو رہی تھی، جسے شام کو اس نے اپنے ہاتھوں سے بخار کی دوا دی تھی۔ وہ بخار کی شدت سے تپ رہی تھی اور نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ زیبا کے بستر پر اس کا ننھا بھائی شاکر سردی کی شدت سے گھٹنوں کو سینے سے ملائے گٹھری بنا پڑا تھا۔ زیبا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے دونوں معصوم جسموں کو اچھی طرح لحاف میں لپیٹ دیا۔

ایک خط انور کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔

میرے انور:

میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ وعدے کے مطابق نہ آسکی۔ میں مجبور ہوں انور۔ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میرے گرد دیواریں ہی دیواریں ہیں۔ میں ان دیواروں کو پھلانگ سکتی ہوں، گرا سکتی ہوں، کیونکہ یہ بہت نیچی ہیں، بڑی نرم ہیں۔ لیکن ان دیواروں کے ساتھ میری محبت بہت پائیدار ہے، دائمی ہے۔

یہ دیواریں ہیں: عارضۂ قلب میں مبتلا میری بوڑھی ماں اور میرے مفلوج والد جنہوں نے اپنی چہیتی بیٹی کے لئے یقیناً کسی شہزادے کے خواب دیکھے ہوں گے۔ مگر آج وہ دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ کیا یہ دیواریں اتنا زبردست صدمہ برداشت کر سکیں گی کہ میں انہیں پھلانگ گئی؟

میری معصوم بہن فریدہ اور ننھا بھائی شاکر میری راہ میں حائل بہت نازک سی دیواریں ہیں۔ میں انہیں اس حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤں جب انہیں میری ضرورت ہے تو دنیا سے بیٹیوں اور بہنوں کی محبت کا اعتبار ختم ہو جائے گا۔ مجھے غلط نہ سمجھئے۔ میں مجبور ہوں۔ چچا جان نے مجھے بتایا ہے کہ میرے ہونے والے شوہر میرے والدین کا بہترین علاج کرائیں گے اور فریدہ اور شاکر کو کسی پبلک اسکول میں اچھی تعلیم و تربیت کے لئے داخل کرا دیں گے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی۔

انور، میں سماج کے جس طبقے سے تعلق رکھتی ہوں اس طبقے کی لڑکیاں سنہرے خواب دیکھنے کا حق تو رکھتی ہیں لیکن ان خوابوں کی سیاہ تعبیروں کو چپ چاپ سر جھکا کر قبول کر لینا ان کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔

میں جانتی ہوں، شکست دل کا درد ناقابل فراموش ہوتا ہے — بہرحال، مجھے بے وفا سمجھ کر بھلا دینا!

زیبا۔

اوبرسٹ ڈوف
جرمنی کی خواتین

موسم گرما کے سب سے زیادہ
گرم دن کو بھی ۔ اپار نٹدزن
کا فرکا ٹوپ پہنے رہتی ہیں۔
موسم گرما کے دوران وہ اس فر کے اوپر ایک
دوسرا سخت اسٹرا ہیٹ اور پہن لیتی ہیں۔

مرنا۔ اب آپ کے ساتھ ہے — میں آپ کے ساتھ ہوں — زندگی بھر ساتھ رہنا چاہتی ہوں — آپ کی گود میں سر رکھ کر مرنا چاہتی ہوں ۔"

"سنو زیبا —" تمنّا بولی "انور بھائی تمہیں یہاں سے کہیں دور لے جانا چاہتے ہیں — فیض آباد میں میرے ماموں رہتے ہیں۔ میں نے ابھی سے انہیں خط لکھ دیا ہے تم دونوں ان کے پاس چلے جاؤ — وہاں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ماموں جان تمہیں زندگی بھر کے بندھن میں باندھ دیں گے۔ جب دل چاہے واپس چلے آنا — بولو زیبا، تم تیار ہو نا؟"

"تمنّا، میں انور کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں ۔" زیبا نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"بس تو نیک کام میں تاخیر کیوں ۔" تمنّا خوش ہو کر بولی "میں ابھی بھائی جان سے کہہ کر سفر کے انتظامات کرائے دیتی ہوں کل رات کی گاڑی سے روانہ ہو جاؤ۔"

رات تاریک تھی۔ موسم سرما کی سرد تاریک رات۔ چاروں طرف سنّاٹے کی حکمرانی تھی۔ زیبا کے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک رکشا کھڑا تھا، جس میں بیٹھا ہوا انور بے تابی سے زیبا کی آمد کا منتظر تھا۔ گھنٹہ گھر سے دو بجنے کا اعلان ہوا اور زیبا نے نیند میں بے سُدھ پڑے بیمار اور بوڑھے ماں باپ پر الوداعی نظر ڈالی۔ وہیں اس کی معصوم چھوٹی بہن فریدہ سو رہی تھی، جسے شام کو اس نے اپنے ہاتھوں سے بخار کی دوا دی تھی۔ وہ بخار کی شدت سے تپ رہی تھی اور نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ زیبا کے بستر پر اس کا ننھا بھائی شاکر سردی کی شدت سے گھٹنوں کو سینے سے ملائے گٹھری بنا پڑا تھا۔ زیبا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے دونوں معصوم جسموں کو اچھی طرح لحاف میں لپیٹ دیا۔

ایک خط انور کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔

میرے انور :

میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ وعدے کے مطا[بق]
نہ آسکی۔ میں مجبور ہوں انور۔ میں آپ کا ساتھ نہیں د[ے سکتی]
میرے گرد دیواریں ہی دیواریں ہیں۔ میں ان دیوار[وں]
کو پھلانگ سکتی ہوں، گرا سکتی ہوں، کیونکہ یہ [دیواریں]
نیچی ہیں، بڑی نرم ہیں۔ لیکن ان دیواروں کے س[امنے]
میری محبت بہت پائیدار ہے، دائمی ہے۔
یہ دیواریں ہیں : عارضہ قلب میں مبتلا میری بوڑھی [ماں]
اور میرے مفلوج والد جنہوں نے اپنی چہیتی بیٹی کے
یقیناً کسی شہزادے کے خواب دیکھے ہوں گے
آج وہ دو وقت کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ کیا یہ دیوا[ریں]
اتنا زبردست صدمہ برداشت کر سکیں گی کہ میں انہ[یں]
پھلانگ گئی؟
میری معصوم بہن فریدہ اور ننھا بھائی شاکر میری راہ میں
حائل بہت نازک سی دیواریں ہیں۔ میں انہیں اس حالت
میں چھوڑ کر چلی جاؤں جب انہیں میری ضرورت ہے تو
دنیا سے بیٹیوں اور بہنوں کی محبت کا اعتبار ختم ہو جائے گا
انور! مجھے غلط نہ سمجھئے۔ میں مجبور ہوں۔ چچا جان نے
مجھے بتایا ہے کہ میرے ہونے والے شوہر میرے والدین
کا بہترین علاج کرائیں گے اور فریدہ اور شاکر کو کسی پبلک
اسکول میں اچھی تعلیم و تربیت کے لئے داخل کرا دیں گے
میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی
انور! میں سماج کے جس طبقے سے تعلق رکھتی ہوں اس
طبقے کی لڑکیاں سنہرے خواب دیکھنے کا حق رکھتی ہیں
لیکن ان خوابوں کی بے معنی تعبیروں کو چپ چاپ سر جھکا کر
قبول کر لینا ان کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔
میں جانتی ہوں شکستہ دل کا درد ناقابلِ فراموش
ہوتا ہے — بہر حال، مجھے بے وفا سمجھ کر بھلا دینا!
زیبا۔

سلاد کی پلیٹ سجانے سے پہلے ہری سبزیوں اور ٹماٹروں کو دھوکر لگ بھگ آدھے گھنٹے کے لئے فریج میں رکھیں۔ پھر سلاد کی پلیٹ سجائیں۔ ایسا کرنے سے سبزیاں تر و تازہ ہوجاتی ہیں اور نرم نہیں پڑتیں۔

●

فریج میں گوندھا ہوا آٹا رکھنے سے پہلے برتن میں گھی یا تیل لگا دیجئے۔ اس سے آٹا سوکھے گا نہیں۔

●

پریشر کوکر میں دال بناتے وقت تھوڑا سا گھی ڈال دیں۔ پھر ابال باہر نہیں آئے گا۔

●

سبزیوں کا ابلا ہوا پانی پھینکنا نہیں چاہئے، بلکہ اس کو سوپ کی طرح استعمال کریں۔

●

چٹخے ہوئے انڈے کو ابالنے کے لئے ایک چمچہ سرکہ ابلتے ہوئے پانی میں ڈال کر اس میں انڈا ڈال دیں۔ انڈے کی سفیدی اور زردی باہر نہیں نکلے گی۔

●

روزانہ تھوڑی مقدار میں جامن کھانے سے معدہ اور جگر کو تقویت ملتی ہے۔

●

دماغ کو قوی بنانے کے لئے کھانے سے دس منٹ پہلے روزانہ ایک یا دو سیب بالکل تازہ، بغیر چھیلے کھالیں۔ بہت فائدہ ہوگا۔

●

کان میں درد ہو تو آم کے پتوں (جو بالکل تازہ ہوں) کا عرق نچوڑ لیں اور اس کو نیم گرم کر کے چند قطرے کان میں ٹپکائیں دو تین بار کے استعمال سے فائدہ ہو جائے گا۔

●

دانتوں کو صاف اور چمکیلا بنانے کے لئے لیموں کا رس برش یا مسواک میں لگا کر دانت صاف کریں۔ چند دن میں دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگیں گے۔

●

کچھ لوگوں کے مونہہ سے بو آتی ہے، جو بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ عرق لیموں جو تازہ نکالیں اس میں عرق گلاب ملالیں ـــ دونوں کو ملا کر اس سے صبح، شام کلیاں کریں۔ اس سے نہ صرف مونہہ کی بدبو دور ہو کر خوشبو آنے لگتی ہے، بلکہ مسوڑھوں کی سوجن اور زخم وغیرہ بھی دور ہو جاتے ہیں۔

●

ایک چمچہ اجوائن کو بھون کر باریک پیس لیں۔ اس سے دانت مانجھنے سے چند دن میں دانت مضبوط اور چمکدار ہو جائیں گے۔

●

ہائیڈروجن 10-VOLUME کالیں۔ روئی کو پانی میں بھگو کر اس کو نچوڑ لیں۔ گیلی روئی ہائیڈروجن میں بھگو کر اس سے دانت صاف کریں۔ دانتوں کا پیلا پن اور دانتوں کی بیماریاں جاتی رہیں گی مگر یہ خیال رکھیں کہ ہائیڈروجن حلق میں نہ جانے پائے۔

●

چاندی کے برتن یا زیورات صاف کرنے کے لئے پانی میں ایک کپ کچا دودھ ڈال کر اس سے برتن صاف کریں۔

●

لکڑی کے کواڑ یا لکڑی کا فرنیچر صاف کرنے کے لئے سرسوں کے تیل میں پانی ملا کر اسے خوب ملالیں اور پھر ایک چھوٹے کپڑے پر لگا کر اس کو فرنیچر یا کواڑوں پر لگا کر صاف کریں اس کے بعد ایک صاف بڑے کپڑے سے خوب چمکا دیں۔ یہ وارنش کا کام دے گا۔

●●

آگ کے سات دریا

رفیعہ منظور الامین
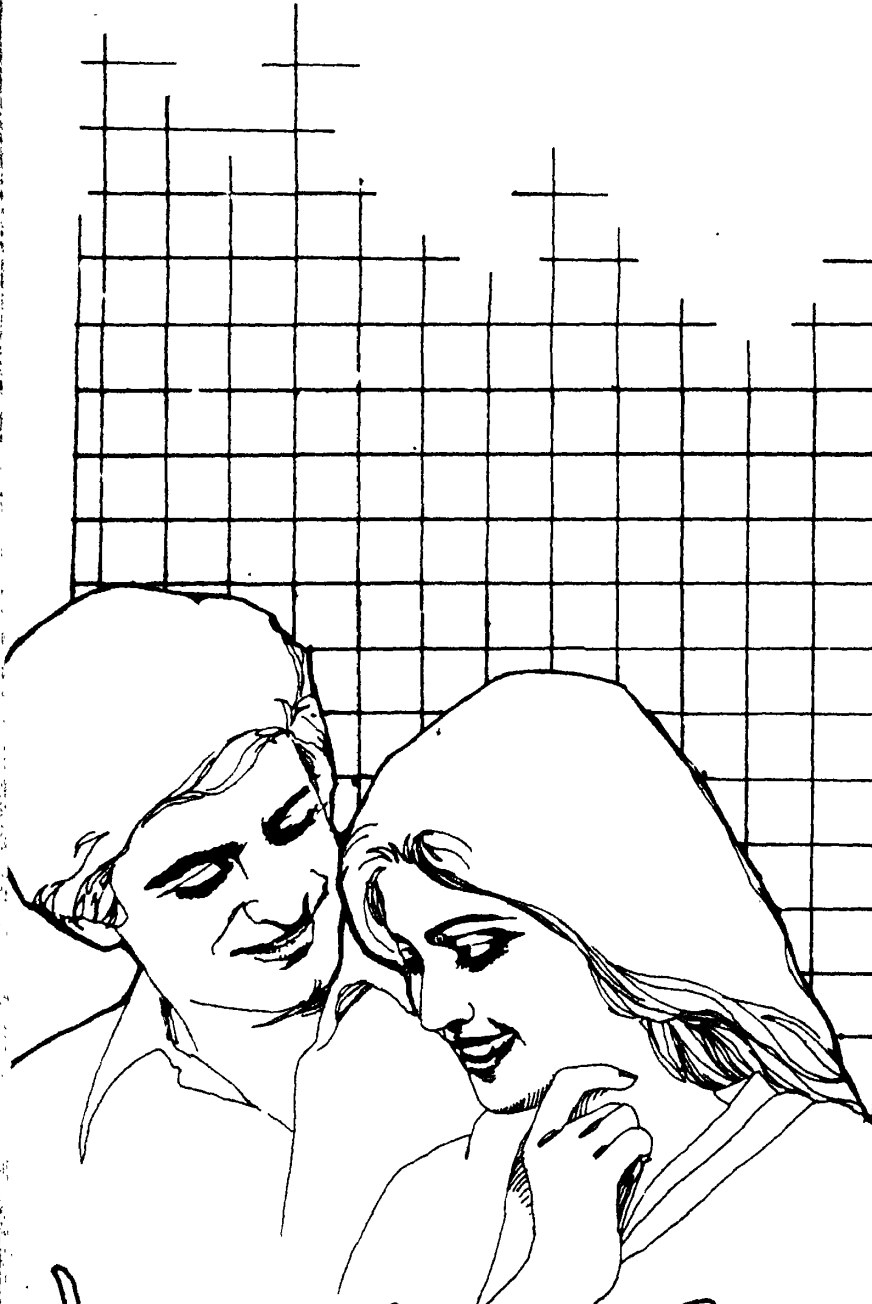
یک روز کفیل میاں کی عاشقی
رہی۔ فہمیدہ بی بی کی ٹوٹی دیوار کے
تے جاتے آنکھیں چار ہو گئی تھیں۔
چلتا تو زندہ گھوں کھاتے۔ لیکن
رے ٹین کے ٹوٹے صندوقوں کی
کرتے کرتے ٹھنا ٹھن شور میں نظروں
و بار کو کہاں محسوس کر پاتے۔ غدر تو
پڑتا جب پتہ چلتا کہ لڑکی اور لڑکے
کو نظر انداز کر کے خود ہی اپنی بات
۔ ابا سماج کی جس سیڑھی پر بیٹھے
یہی ہوتا تھا۔ شادی کے لئے لڑکی
پسندیدگی کو خودسری بلکہ آوارگی سمجھا
لہٰذا اس سے پہلے کہ کفیل میاں
بی بی سے عشق کے قصے لیلیٰ اور مجنوں
تے، ابا کے پاس رشتے کا پیغام پہنچا
لے ابا نے بخوشی منظور بھی کر لیا ——
نجھا ضرور تھا کہ لڑکے والوں کی طرف
کا کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا تھا ——
ل میاں کی سوتیلی ماں اڑ گئی تھیں کہ
ساڑی ضرور لیں گی۔ یہ گویا کفیل میاں
سے نکل جانے کا ہرجانہ تھا۔ ورنہ وہ
ساتھ ہی کفیل میاں کے اوصاف
بائیکاٹ کر رہے تھے۔ ساتھ ہی اماں
ہتی تھیں کہ سوتیلا بیٹا گھر سے نکل جائے
ہوتے۔ کفیل میاں یہ اس لئے جھیل گئے
فی والے مولانا کے پاس بزرگوں کے
ستہ جانا ضروری تھا، ورنہ قبلہ بیٹی دینے
انکار کر دیتے —— فہمیدہ بی بی کو
نے کے لئے وہ آگ کے سات دریا
و بھی تیار تھے۔
کفیل میاں ردی کا بیوپار کرتے تھے

آگ میں سکی ہوئی دُلہنیں

دکوکوچا (پیرو) آدی باسیوں میں لڑکی کو ۱۲ برس کی عمر میں بیاہ سے قبل اس کی ہونے والی سُسرال کی جھونپڑی میں ایک ٹوکری میں لٹکا دیا جاتا ہے جہاں نیچے سے جلتی ہوئی آگ کے اوپر رات دن لٹکے رہ کر اسے تین ماہ گزارنے ہوتے ہیں۔

سائیکل پر سوار گھر گھر سے ردّی جمع کرتے تھے لیکن تول میں لاکھ بے ایمانی کرنے پر بھی اتنی آمدنی نہ ہوتی کہ دو پیٹ پل سکیں۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ صبح سویرے ہی وہ اپنی سائیکل لئے گھر سے نکل جاتے تو پھیری لگاتے لگاتے شام ہو جاتی اور وہ فہمیدہ بی بی کے مکھڑے کو ترس جاتے۔ فہمیدہ بی بی تھیں بھی تو بارش کی پہلی بوند کی طرح نکھری ہوئی۔ ان کی زندگی میں صرف پندرہ زاویئے اُبھرے تھے اور ہر زاویہ ایک فلڈ لائٹ تھا۔ پندرہ کا سن تیکھا ناک نقشہ گھنی بل کھاتی چوٹی، جسے موباف نہ باندھو تو کھل کھل جاتی تھی۔ کہاں یہ لوازم سے بھرپور دسترخوان اور کہاں ردّی کا قبرستان، جہاں کفیل میاں اپنا ردّی کا بوجھ جھونک آتے۔ اس قبرستان میں کیسے کیسے سیاسی لیڈر اپنی دروغ گوئیوں کے ساتھ روز دفن ہو جاتے۔ افسروں کی رشوت ستانیاں جن سے جان بوجھ کر حکومت آنکھ چُراتی۔ اغوا، ریپ، نقب، ڈاکے، جن میں خود پولیس کا ہاتھ ہوتا۔ دلہنوں پر ڈھلائے گئے ستم۔ بڑی طاقتوں کی شاطرانہ حرکتیں۔ سب کچھ دفن ہو جاتا۔ اپنا بوجھ ہلکا کر کے کفیل میاں چند پُرانے، میلے نوٹ مٹھی میں دبائے گھر پہنچتے تو سوتیلی ماں دال کے ہر چمچے کے ساتھ سو سو صلواتیں سُناتیں اور جب کفیل میاں اپنی دُلہن کی طرف دیکھتے تو ان کا کلیجہ مُونہہ کو آنے لگتا، کیوں کہ وہ بھی دن بھر کولہو کے بیل کی طرح گھر میں جُتی رہتی۔ سوتیلے دیوروں اور نندوں کی خدمت الگ۔ بیت الخلا سے ایک آواز دے کر چُپ نہ ہوتا کہ دوسرے کا نعرہ لگ جاتا اور وہ بھاگتی ہوئی لوٹا لئے۔ اور معاہدے کے مطابق بھی کفیل میاں کو شادی کے دو مہینے بعد ہی گھر چھوڑ دینا تھا جو وہ ابھی تک نہیں کر پائے تھے۔ اوپر سے غضب یہ ہوا کہ فہمیدہ بی بی کے اُبکائیاں شروع ہو گئیں لیکن آنے والے کا قدم مبارک ثابت ہوا اور کفیل میاں کو ایک فیکٹری میں نوکری مل گئی۔ اس روز ان کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا، کیوں کہ اب وہ یاقوت پورہ کے اس چھوٹے سے کمرے کا کرایہ دے سکتے تھے جس کے وہ کئی چکر کاٹ چکے تھے اور مالکِ مکان کرایہ کم کرنے کے لئے ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

کفیل میاں کے خیال میں محلہ بہت اچھا تھا۔ مکان چوں کہ ایک تنگ گلی کے سرے پر بنا تھا، اس لئے محفوظ تھا۔ ایک طرف کوڑے کا ڈھیر ضرور لگ جاتا تھا لیکن سوروں کا ایک دل باقاعدگی سے آکر اسے چٹ کر جاتا تھا۔ اور جو کچھ بچتا وہ ہوا سے اِدھر اُدھر ہو جاتا۔ گھر میں بجلی تھی۔ بجلی کا خرچ مالکِ مکان کرائے کے ساتھ ہی وصول کر لیتا لیکن شرط یہ تھی کہ پانچ بتی کا گولا ہی لگایا جائے گا۔ بیت الخلا کی سہولت مالکِ مکان نے اپنے ہی گھر میں دے رکھی تھی، جس کا ایک روپیہ الگ دینا پڑتا۔ مالکِ مکان کی دو بڑی بڑی کوٹھیاں شہر کے مختلف حصّوں میں بنی تھیں، جن کا اچھا خاصا کرایہ آتا تھا۔ لیکن وہ اتنا منکسر المزاج اور سادگی پسند تھا کہ اس نے اپنی پُرانی روش نہیں چھوڑی۔ یاقوت پورہ کے اس آبائی گھر سے اسے عشق تھا۔ خدا ترسی اور بھلمنساہٹ اس کے خمیر میں تھی۔ اس نے ضرورت مندوں کی خدمت کو اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ بیسیوں لڑکیوں کی شادیاں اس نے کرا دی تھیں اور نکاح کی مبارک رسم اس کے ہی گھر میں ادا کی جاتی تھی — اس مقدّس فرض کی تکمیل کے لئے اس نے اپنے گھر میں ایک پکّا کمرہ الگ رکھ چھوڑا تھا۔ جہاں اُجلی چاندنیوں کا فرش تھا۔ قالین بھی تھے اور گاؤ تکیے بھی۔ اس کے علاوہ حیدرآبادی شان و شوکت کی وہ مخصوص مخملی زرّیں مسند بھی بیچوں بیچ لگی رہتی جو خود اس نے اس مقصد کے لئے بنوائی تھی۔ سیکڑوں جوڑے اب تک اس مسند پر بیٹھ کر نکاح کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔ بڑے بڑے مال دار لوگ اس کے گھر آئے دن آتے

ے اور آئے دن شادیاں بھی ہوتی رہتی
لیکن کوئی دھوم دھڑکا یا ہنگامہ بپا نہ
خالص اسلامی طرز کی شادیاں ہوتیں اور دولہا
وں کو لے کر سدھار جاتے اور لڑکی والے
مکان کو دعائیں دیتے رخصت ہوجاتے۔
دولہا بہت خلیجی ممالک سے آئے ہوئے
تے اور دلہن والے وہ مجبور اور مفلس
پ ہوتے، جن کی لڑکی ان کی چھاتی پر
لی کا وہ اٹل پہاڑ بنی ہوتی جہاں لاکھ منتوں
وں کے باوجود کوئی دولہا اسے بیاہنے کے
نہ آتا — لیکن بھلا ہو شیخوں کا کہ حالات
کچھ بہتر ہو چلے تھے۔ اب لڑکی والے لڑکی
ا ہونے پر واویلا نہیں مچاتے تھے، کیونکہ
یہ ہی لڑکی دس گیارہ سال کی ہوتی، وہ کسی کریہہ
رت بوڑھے شیخ کی نذر کردی جاتی۔ اور جن
مردوں میں توے پر گرتی روٹی کی تھاپ مشکل
سنائی دیتی، وہاں روپوں کی کھنک گونجنے
تی — اس گلی سے کئی دلہنیں رخصت
ئی تھیں۔ کچھ گم صم سی واپس بھی آئی تھیں اور
پہ کا تو پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ آخر ہوئیں کیا۔ مگر
ن سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یہاں کون ان کے
ے ساون کے جھولے ڈالے بیٹھا تھا!

"اب اپن اپنی زندگی بنائیں گے یاں۔"
کفیل میاں نے فہمیدہ بی بی کے گلے میں باہیں
ڈال کر کہا اور فہمیدہ بی بی نے ایک زوردار ابکائی
لی۔ ان ابکائیوں کا سلسلہ چلتا ہی رہا اور پھر
ایک دن ایک ننھی سی جان نے اس اندھیرے
کمرے میں جنم لیا۔ لیکن ماں باپ کو ایسا لگا جیسے
پانچ بتی والا بلب اچانک دس بتی والا بن گیا ہو
یہی سلسلہ چلتا رہا۔ بلب کی روشنی کم سے کم تر ہوتی
رہی اور سادہ لوح سمجھتے رہے کہ نور نظر بڑھ رہا ہے۔

جب تین لڑکیوں کے بعد بھی لڑکا نہیں تولد ہوا
تو دونوں چونکے اور انہیں احساس ہوا کہ اندھیرے
کا دیو اس کمزور ناتواں پانچ بتی والے بلب
سے دھینگا مشتی کر رہا ہے۔

لڑکیاں باپ پر گئی تھیں۔ دبلی پتلی
نازک۔ ماں سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا —
روکھی سوکھی دال روٹی اور تین بار ماں بننے پر بھی
فہمیدہ بی بی کا نکھار وہی تھا — البتہ کفیل میاں
کے بال انہیں دغا دے رہے تھے۔ چندیا
چٹ ہو رہی تھی، جو بچے کھچے بال تھے ان میں
بھی چٹیائی ہونے لگی تھی۔ اور پھر سیمنٹ فیکٹری
میں کام کرتے کرتے پھیپھڑوں نے منوں سیمنٹ
پھانک لی تھی اور اب اپنا رنگ بدل رہے تھے۔
ادھر سب سے بڑی لڑکی صفیہ چودہ سال کی ہونے
کو آئی تھی اور دوسری دونوں سال پیچھے ایک
دوسرے سے چھوٹی تھیں۔ مالک مکان ان
کے سروں پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے
تھے۔ اس روز وہ کفیل میاں کا حال چال
بھی ضرور پوچھتے۔ جب باقاعدگی سے ہر مہینے
کرایہ وصول کرنے جاتے۔ کفیل میاں بے چارے
مارے بندھے کام پر ضرور جاتے۔ نہ جاتے تو
پانچ حلق کیسے بھرتے؟ لیکن اب ان کی
غیر حاضریاں لگنے لگی تھیں۔ وہ تو فیکٹری کا مالک
شریف تھا جو ان کے حالات جاننے پر رعایت
کر جاتا تھا۔

ایسے میں ایک طوفان اور کھڑا ہوا۔
بڑی لڑکی صفیہ جب باہر کے نل پر پانی
بھرنے گئی تو محلے کے غنڈے پاشا نے
اس کے دوپٹے کا کونا چٹکی میں پکڑ لیا۔ وہیں
کھڑے محسن نے پاشا کے منہ پر ایک مکا
رسید کر دیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور صفیہ
ہانپتی کانپتی گھر بھاگ آئی۔ وہ اور محسن ایک
دوسرے کے کچھ نہیں لگتے تھے۔ ان کا آپس
کا بس ایک نظر کا رشتہ تھا لیکن بس یہی ایک
کم بخت رشتہ تو غضب ڈھاتا ہے —
محسن غریب ماں باپ کا بیٹا ضرور تھا لیکن
پڑھ لکھ کر کچھ بننے کے خواب بُن رہا تھا —
خواب اس کے ماں باپ بھی دیکھ رہے تھے۔
کیوں کہ ان کا بیٹا انجینیئرنگ کے آخری سال
میں پہنچ گیا تھا — ایک بار انجینیئر ہو جائے
تو پھر انہیں کیا کمی تھی۔ اور کچھ نہیں تو رشوت

شمالی تھائی لینڈ کی آکھا نسل کی خواتین

اپنی شادی کے وقت ایک اونچی سی ٹوپی (یا تاج) پہنتی ہیں اور پہننے میں صرف ان لمحوں کو چھوڑ کر، جب وہ بال سنوارتی ہیں، اس ٹوپی کو دن یا رات میں کبھی نہیں اتارتیں مرنے کے بعد بھی انہیں اس کے ساتھ ہی دفنا دیا جاتا ہے۔

توکھا ہی سخت تھا — لیکن فی الحال انہوں نے رشوت کی حد جانے بغیر ہی اس کی قیمت چار لاکھ مقرر کردی تھی۔ حیدرآباد میں انجینیئر کے یہی دام ہیں۔ گھوڑے جوڑے کی رقم شایانِ شان تو ہونی ہی چاہیے۔

صفیہ کے ساتھ پیش آتے ہوئے اس حادثے نے اس کے ماں باپ کو ہلا دیا۔ دوسری دونوں لڑکیاں بھی جوانی کی دہلیز پر کھڑی تھیں اور کفیل میاں کی صحت زیادتی پر اتر آئی تھی۔ انہوں نے اور نہیدہ بی بی نے مل کر طے کیا کہ جلد سے جلد صفیہ کی شادی کر دینی چاہیے۔ اور جب محسن نے اپنا عندیہ ظاہر کیا تو ان کی خوشی کی حد نہیں رہی — لیکن ان کی یہ خوشی دیرپا نہیں تھی۔ کیوں کہ محسن نے تو اپنا معاملہ ماں باپ کے ہاتھوں سونپ کر چھٹیاں ختم ہونے پر ورنگل اپنے کالج چلا گیا اور یہاں ہیڈکوارٹر نے صاف کہہ دیا کہ وہ گھوڑے جوڑے کی رقم چار لاکھ دینے کو تیار ہوں تو انہیں صفیہ کو بہو بنانے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ ان کا خاصا مسخرا پن تھا۔ جہاں سکّے سے سکّہ تک ٹکرائے بھی نہیں تھا۔ وہاں چار لاکھ کہاں سے جڑتے۔ وہ بیٹے کی ضد سے بھی واقف تھے — اسے توبھرم دے دیا کہ بات چیت چل رہی ہے اور ادھر کفیل میاں سے کہا کہ جلد سے جلد لڑکی کا نکاح کہیں اور کر دو تو ہم تمہیں دو ہزار روپے دیتے ہیں — کفیل میاں نے یہ دو ہزار ان کے مونہہ پر دے مارے۔ لیکن ان کا یہ زعم بے جا تھا۔ لاکھ کوشش پر بھی کوئی صفیہ کو بیاہنے نہیں آیا۔ جو آتا ہزاروں کی مانگ لے کر آتا۔ سب سے کم مانگ دس ہزار کی تھی۔ اور اس درمیان پانچ چار بار چٹکی میں صفیہ کا دوپٹہ پکڑ چکا تھا — مالکِ مکان یہ سارے تماشے چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا — انہوں نے ایک ایسی ترکیب سجھائی کہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ یہ ترکیب ہمیشہ ان کی گودڑی میں زہر مہرے کی طرح رکھی رہتی تھی۔ مجبور انسان بہت جلد مدد کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ کفیل میاں کہاں تک گردن اکڑائے رکھتے۔ مجبوریوں کے گرداب میں پھنسے تھے۔ انہوں نے آخر اس تنکے کا سہارا لے ہی لیا۔

طے یہ پایا کہ اگر شیخ صفیہ کو پسند کر لیتا

> شیخ کی عقابی نظریں
> نسوانی چہروں پر پھسلتی رہیں
> تین دل، تین معصوم دل
> خوف سے دھڑکتے رہے

ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کی نظر اگر دوسری دونوں بہنوں میں سے کسی ایک پر ٹکتی ہے تو اس سے دس ہزار لے لئے جائیں اور صفیہ کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اب رہا مالکِ مکان کا کمیشن، تو وہ خدا ترس انسان تھے — وہ کفیل میاں سے ایک پائی بھی لینا حرام سمجھتے تھے — جو بھی ہوگا وہ شیخ سے وصول کرلیں گے، ورنہ اصولاً تو وہ لڑکی والوں سے بھی فی صد کمیشن لیا کرتے تھے۔ دراصل انہیں یقین تھا کہ وہ تینوں ہی معصوم جوانیاں آخر کار ان کے مقتل میں لازماً آئیں گی۔ انہوں نے ایک شیخ سے ان کی کلیجی کا سودا بھی کر رکھا تھا۔ اس بیچ وہ شیخ محض انتظار کی گھڑیاں کاٹنے کے لئے ایک نکاح کر چکا تھا۔ اس دلہن کو وہ پچھلی بار ایک حبشی کے ہاتھ بیچ آیا تھا۔

آخر وہ نیک ساعت آئی جب مقتل، کھولا گیا اور اس سیاہ فام کریہہ صورت شیخ کے لئے بازار سجایا گیا۔ عورت کا بازار سے بہت پرانا رشتہ ہے۔ کاش وہ چلن جاری رہتا جب یوسف بازار میں بکنے آتے اور زلیخائیں ان کے دام لگاتیں۔

ایک طرف قالین پر نہیدہ بی بی سر جھکائے اپنی نک سک سے درست تینوں بیٹیوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ کچھ دور کفیل میاں تھے۔ زنجیریں کہیں نہیں تھیں مگر وہ خود کو ہر طرف سے جکڑا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ اتنا کہ سرکشی کرتے کرتے اب وہ شل ہو گئے تھے۔

مالکِ مکان شیخ کے پہلو میں بیٹھا کھسر پھسر عربی میں بات کر رہا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی قرآن شریف مکمل نہیں پڑھا تھا، لیکن جی لگا کر عربی ضرور سیکھ گیا تھا۔ جو اس کے لئے جادوئی زبان تھی۔

شیخ کی عقابی نظریں نسوانی چہروں پر پھسلتی رہیں۔ مالکِ مکان اسے ہر لڑکی کے مثبت پہلو کی طرف متوجہ کرتا رہا — تین دل، تین معصوم دل خوف سے دھڑکتے رہے کہ قرعہ کہیں اسی کے نام نہ پڑ جائے۔ کہیں بھاگنا ناممکن تھا — اور زبان پر معاشرہ کا پہرہ بیٹھا تھا۔

مالکِ مکان، ہُدہُد کی طرح اچھل کر کفیل میاں کے پاس جا بیٹھا — خوشی سے اس کے مونہہ سے الفاظ نہیں نکل رہے

ھے — اتنا بڑا کمیشن تو اسے پہلے صرف
ب بار ملا تھا جب اس نے نو سالہ عائشہ کا
دہ کرایا تھا۔

"سن رہے ہو کفیل میاں؟ بڑے
بیبوں والے ہو!"

کفیل میاں کی گردن جھکی رہی۔

"شیخ صاحب پچاس ہزار دینے کا
ں رہے ہیں۔"

کفیل میاں کی نظریں اُٹھیں "کون سی
پسند ہے اس دوزخی کو؟" انہوں نے زیرِ لب
چھا۔

"ابھی پوچھتا ہوں۔" بُدبُدا چھل کر نقرئی
ی پر جا بیٹھا۔

کچھ باتیں ہوئیں۔

"شیخ صاحب بول رہیں، اُنو جن کا بی
ھ پکڑ لئے۔" مالک مکان نے کفیل میاں کو
ایا۔

شیخ اپنا چغہ سنبھالے اُٹھا۔
فید قیمتی چغے کو اس کی پُرشہوت شخصیت
غ دار کر رہی تھی۔

"نہیں شیخ!" — مالک مکان نے
ں کا دامن پکڑ لیا — وہ بھی گھاگ تھا۔
ہاتھ لگانے سے پہلے پیسہ رکھو۔ یہ شریف
لمان بچیاں ہیں شیخ۔" مالکِ مکان نے عربی
ں کہا۔ شیخ رُک گیا — پل بھر کو اس نے
الکِ مکان کو حقارت سے دیکھا، پھر چغہ میں
تھ ڈال کر نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اس کے
گے پھینک دیں اور آگے بڑھا۔

لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو خشک
تھے، کیوں کہ وہاں دہشت کی سخت گرمی تھی۔
لیکن نہمیدہ بی بی کی آنکھیں رواں تھیں —
وہاں صرف یاس اور بےچارگی تھی۔ وہ آج
اپنے جگر کے ایک ٹکڑے کو بیچ رہی تھیں،
تاکہ دوسرے جگر پاروں کے نصیب نہ اُجڑیں۔
لڑکیاں قبول صورت تھیں۔ رشتے آ رہے تھے
لیکن پیسوں پر بات اٹک جاتی تھی۔ ایک کی
قربانی سے دوسری دو در بدر ہونے سے بچ سکتی
تھیں — وہ شیخ کے پھاوڑے جیسے پاؤں
کو تکتی رہی، جو سامنے آ کر رُک گئے تھے۔

سب دم بخود شیخ کے فیصلے کے منتظر تھے۔

شیخ نے اچانک جھک کر نہمیدہ بی بی
کا ہاتھ دبوچ لیا۔ اس نے تینوں لڑکیوں کو
نظر انداز کر دیا تھا۔

وقت تھم گیا تھا — صرف شیخ کی گرفت
میں ایک نبض پھڑک رہی تھی، جسے اس نے
خرید لیا تھا — وہ نبض صرف ایک عورت
کی نہیں تھی، وہ نبض ایک ماں کی بھی تھی۔ فہمیدہ
چاہتی تو جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا سکتی تھی۔ بلکہ
اس کا فوری ردِ عمل یہی تھا۔ لیکن اسی لمحہ اسے
خیال آیا کہ اگر وہ شیخ اس کی تین معصوم لڑکیوں
میں سے کسی کا ہاتھ تھامتا تو کیا اسے تسکین
ہوتی؟ اسی وقت اس کی نظر نوٹوں کی ان گڈیوں
پر گئی اور پھر تین جوڑ تکتی ہوئی ان آنکھوں پر
جن میں حیرت تھی، خوف تھا۔ ساتھ ہی ایک
طمانیت تھی۔ بال و پر میں وہ لرزش تھی جو ایک
پرندہ اچانک خود کو آزاد پا کر محسوس کرتا ہے۔

کفیل میاں آگ بگولا ہو کر کھڑے
ہو گئے۔ فہمیدہ بی بی کو ان کی چاہت پر رتی برابر
شبہ نہیں تھا۔ اور امتحان تو دونوں ہی کا تھا۔
وہ چپ چاپ ان کے آگے جا کھڑی ہوئی اور
ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ ان کی آنکھیں
ملیں۔ مجبور آنکھیں جب مجبور آنکھوں سے ملتی
ہیں تو لوگ چند لمحوں میں ہی برسوں کا سفر طے کر لیتے
ہیں۔

"میں تمہارے کو تین طلاق دیا، فہمیدہ
بی بی۔" کفیل میاں نے تین بار دہرایا —
آواز جیسے کسی جنازے سے آ رہی تھی۔
فہمیدہ بی بی نے ان کے ہاتھ چھوڑ دئے۔

غلام عورت

جو ملکہ بنی۔ ایک انگریز لڑکی جسے سمندری
ڈاکوؤں نے نیوسٹریا، فرانس کے کنگ
کلووس دوم کو غلام کی شکل میں بیچ دیا تھا
بادشاہ کا پیار جیت لیا۔ اس کی ملکہ بن گئی اور
اس کی موت کے بعد قائم مقام حکمراں کی شکل
میں حکومت کی۔ وہ تین بادشاہوں کی ماں
ہوئی اور قائم مقام حکمراں کی شکل میں اس نے
اپنی سلطنت میں غلامی کی رسم ہمیشہ کے لئے
غیر قانونی قرار دے دی۔

المہر
عورت سے محبّت کرنا
نوازش ہے۔ مگر عورت کو نہ سمجھنا
زیادتی ہے۔
عورت کا سب سے بڑا
دُکھ یہی ہے کہ اسے سمجھا نہیں جاتا
عورت کے دل میں بے شمار
آرزوئیں ہوتی ہیں، جو ہلکی سی ٹھیس سے
بھی بے آواز ٹوٹ جاتی ہیں۔ پھر یہ
بھی عجیب بات ہے کہ ان شیشوں
کے ٹوٹ جانے پر بھی وہ پتھر کی
طرح سخت رہتی ہے اور سنگین
حالات کے سامنے جمی رہتی ہے۔
اس کی فطرت میں بے شمار گہرائیاں
ہیں۔ اس کے چھپے ہوئے جذبوں کی پکار
سُنے بغیر اس سے محبت کرنا
ایسا ہی ہے جیسا کسی خوب صورت
ٹائیٹل کی کتاب کو بغیر پڑھے بُک
شیلف میں سجا دینا۔
عورت حُسنِ فطرت کا سب
سے دل کش عطیہ اور خالقِ جمال کا
سب سے بڑا جادو ہے۔
عورت مرد کی نسبت جنّت
کے زیادہ قریب ہے بلکہ جنّت تو
اس کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے۔
اس وقت جب وہ ماں ہو۔
عورت
سالنامہ

ہجوم اور تنہائی

ستارہ جعفری

میرے بچپن کا زمانہ بھی کیسا حسین
تھا۔ دادی اماں، امی، چاچی سب مل کر
ہی گھر میں رہتی تھیں۔ ہم سب بھائی بہنوں
سے گھر میں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ دادی
سردیوں کے موسم میں شام کو سورج غروب
کے بعد اپنے نرم و گرم بستر میں بیٹھ جاتی
۔ پلنگ کے قریب سُرخ سُرخ انگاروں
دہکتی ہوئی انگیٹھی رکھی رہتی تھی۔ اس کی وجہ
مرہ خوب گرم رہتا تھا۔ پلنگ کے قریب ہی
پڑھنے کے لئے ایک لکڑی کی چوکی بچھی ہوئی
۔ اس کے پاس صاف ستھرا لوٹا اور سلفچی رکھی
۔ امی یا چاچی عشا کی نماز پڑھنے کے بعد دادی
کو اسی چوکی پر گرم گرم کھانا پروس دیتیں۔ پھر
ی اماں بڑا سا پیتل کا پان دان کھول کر اس
سے پان بنا کر کھاتیں اور ہم بچوں کو چھوٹی
ی تقسیم کرتیں۔ اسی طرح گرمیوں میں دادی
ں کا پلنگ آنگن میں چھڑکاؤ کر کے بچھا دیا
تا تھا۔ ان کے سرہانے موگرے اور بیلے
ے پھول ایک مٹی کے کورے پیالے میں
ہم ڈال کر بھگو دیے جاتے تھے تاکہ ان کی
شبو سے دادی اماں کو رات میں آرام کی نیند
سکے۔

گرمی ہو یا سردی، محلے کی عورتیں اپنے
اپنے گھروں کا کام ختم کر کے دادی اماں کے
س جمع ہو جاتی تھیں۔ کسی کو بیٹے، بیٹی کی شادی
کے سلسلے میں مشورہ کرنا ہوتا تھا تو کسی کو
دعوتِ ولیمہ کا انداز پوچھنا ہوتا۔ کوئی خاتون جہیز
کی فہرست دکھا کر رائے طلب کرتیں۔ دادی
اماں سب کو معقول مشورہ دیتیں اور سب
خواتین دادی اماں کے اخلاق کی تعریف کرتی
ہوئی شام کو رخصت ہو جاتی تھیں۔ امی اور چاچی

اپنے گھر کے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔
رات کو ہم سب بھائی بہن اپنا اپنا سبق
یاد کر کے دادی اماں کے بستر پر بیٹھ جاتے۔
وہ اپنا بڑا سا لحاف ہمارے اوپر ڈال دیتیں۔
ہم کہتے "دادی اماں، کہانی سنائیے۔"
"پہلے یہ بتاؤ، تم نے اپنا سبق یاد کر لیا؟"
"جی ہاں۔ کر لیا۔" سب یک زبان
ہو کر جواب دیتے۔
"اچھا پہلے بارہ امام اور پنجتن پاک کے
نام سناؤ؟"
ہم وہ بھی سنا دیتے۔ پھر وہ باری
باری سب سے قُل، الحمد اور کلمہ سنتی تھیں۔ اس

کے بعد پوچھتی تھیں "کون سی کہانی سنیں گے؟"
"علی بابا چالیس چور کی۔" میرے
چچازاد بھائی جواب دیتے۔
"نہیں، ہم تو وہ کہانی سنیں گے جس میں
ایک راجہ کی سات بیٹیاں تھیں۔ راجہ نے
پوچھا تھا: تم کس کی قسمت کا کھاتی ہو۔ چھ نے
جواب دیا: آپ کی قسمت سے۔ ساتویں
نے جواب دیا، اپنی قسمت کا۔ تو راجہ نے خفا
ہو کر اس لڑکی کو جنگل میں چھوڑ دیا تھا۔"
"ارے، تمہیں کوئی جنگل میں نہیں
چھوڑے گا۔ ڈرو نہیں۔" میرا بھائی کہتا۔
"ساتویں ہے نا۔ بے چاری اس لئے

نجومی جس کی پیش گوئیاں اتنی حقیقی تھیں کہ وہ خوف زدہ ہو گیا۔

کھاؤ (اردن) شیخ عبدالرزغ نے ایک بار پیش گوئی کی تھی کہ اردن کے شاہ عبداللہ کا قتل ہوگا۔ ۱۹۵۱ میں بہت افسوس ناک انداز میں انجام پذیر ہو گئی۔ اس پر انہوں نے چپ رہنے کا عہد کیا اور ۱۳ برس تک بالکل نہ بولے۔

ڈرتی ہے۔" بھائی احمر بولتے "ہاں۔ دادی اماں، علی بابا چالیس چور سنایئے۔"

"نہیں، ہم تو سفید جیسے برف والی کہانی سنیں گے۔" فرخندہ چلاتی۔

"تم خاموش رہو۔" بھائی جان اپنے بڑے پن کا رعب جماتے۔

دادی اماں سب کی رائے سنتیں۔ پھر پان دان کھول کر ایک پان کی گلوری بنا کر مونہہ میں رکھتیں اور کہتیں "دیکھو بچو پہلے میں رخشندہ کی فرمائش پوری کروں گی۔ اس کو بادشاہ والی کہانی سناؤں گی۔ پھر فرخندہ بیٹی کی۔ اس کے بعد علی بابا چالیس چور کی سننا۔"

چونکہ میں دادی اماں کو سب سے زیادہ لاڈلی تھی، اس لئے وہ میری بات نہیں ٹالتی تھیں۔

"ہاہا! ہماری کہانی پہلے شروع ہو گی۔" میں اور فرخندہ تالیاں بجاتے۔

"دادی اماں، ان دونوں کو روک لیجیے، ورنہ کل ہم ان کی ساری گڑیاں کنوئیں میں پھینک دیں گے۔" بھائی جان اور دوسرے بھائی جھنجھلا کر کہتے۔

"چپ رہو لڑکو!" وہ آہستہ سے ڈانٹ کر مسکرا دیتیں۔

ہم لوگوں کا شور سن کر چاچی اور امی آجاتیں اور کہتیں "ان بچوں کو آپ اپنے کمرے سے نکال دیجیے۔ یہ آپ کو بہت تنگ کرتے ہیں۔"

"دلہن، یہ تو میرے کھلونے ہیں!" دادی ہم سب کے سروں پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتیں۔

کہانیاں سنتے سنتے ہم کب سو جاتے، یہ خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ رات میں کسی وقت آنکھ کھلتی تو میں امی جان کے بستر میں ہوتی۔ یہ میں امی کے جسم کی خوشبو سے پہچانتی تھی۔

ایک دن صبح ہی صبح ہمارے گھر کے ملازم نواب نے آکر جگایا "چھوٹی بی بی، جلدی اٹھئے۔ سب بچے آنند باغ جا رہے ہیں۔"

آنند باغ ہمارے یہاں ایسا ہی تھا جیسے بمبئی میں رانی باغ ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ مونہہ ہاتھ دھویا اور نواب ناشتہ کرائے بغیر ہم سب بچوں کو آنند باغ لے گیا۔ وہیں پر صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا کھایا۔

شام کو گھوم پھر کر واپس آئے تو دیکھا کہ گھر میں سب لوگ خاموش بیٹھے ہیں۔ امی، چاچی، ابا جان، اور چاچا کی رونے کی وجہ سے آنکھیں سوج گئیں تھیں۔ ہم سب دادی اماں کے کمرے کی طرف دوڑے۔ آنند باغ سے ہم سب بھائی بہن دادی اماں کو تحفے میں دینے کے لئے پھول لائے تھے، لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کمرے میں ایک شمع روشن تھی اور ہماری دادی اماں کا پلنگ تک نہیں تھا۔ ہم لوگ گھبرا کر دادی اماں کو پکار رہے تھے۔ اسی وقت پھوپی جان نے آکر ہمیں کمرے سے نکالنے کی کوشش کی اور کہا "یہاں تم سب کا کام نہیں ہے۔ اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"ہماری دادی اماں کہاں ہیں؟ ہم ان کو پھول دیں گے۔ ہم ان کو پھول دیں گے ہم نہیں جائیں گے یہاں سے۔" سب بچے مچل گئے۔

ابا جان نے آکر بڑے پیار سے پھوپی جان کو گلے لگایا، پھر سب بچوں سے مخاطب ہو کر کہا "بیٹا، تم سب کی دادی اماں کربلا گئی ہیں۔ آج نہیں ملیں گی۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔

"کب گئیں؟ ہمیں ساتھ کیوں نہیں لے گئیں!" میں رونے لگی۔

"تھوڑے دن کے لئے گئی ہیں۔ آجائیں گی۔" ابا جان ہمیں پیار سے سمجھانے لگے۔

"ہم تو ابھی دادی اماں کے پاس جائیں گے۔ رات کو ہمیں کون کہانی سنائے گا؟" سب بچوں نے چلا چلا کر رونا شروع کر دیا تب امی اٹھیں، سب کو خاموش کیا اور کہا "دیکھو اس طرح رونے چلانے سے تمہاری دادی اماں کو بہت تکلیف ہو گی۔ اب وہ کربلا میں رہیں گی۔ وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔"

ہم دادی اماں کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے بڑے ہو گئے جب میں نے میٹرک پاس کر لیا تب معلوم ہوا کہ جس روز صبح کو تمام بچے

پھر کے لئے آنند بلاغ بھیج دیئے گئے تھے
ن دادی امّاں کا انتقال ہوا تھا۔
آج میں بھی عمر کی اسی منزل پر پہنچ چکی ہوں
۔ میرے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹے
شادی کے بعد وارڈن روڈ پر الگ فلیٹ لے لیا
ہے۔ حالانکہ میرا فلیٹ بہت بڑا ہے تین بیڈروم
ں میں ہیں۔ بڑی آسانی اور آرام کے ساتھ
ن خاندان اس میں رہ سکتے ہیں۔ بے حد خوبصورت
ہ مالابار ہل پر ہے۔ بیٹی نے بھی اپنے بھائی کے
یب فلیٹ لے لیا ہے۔ میرے شوہر دن
ر آفس میں رہتے ہیں۔ شام کی چائے پی کر کلب
لے جاتے ہیں۔ وہاں سے بارہ ایک بجے رات کو
پس آکر اپنے بیڈ روم میں سو جاتے ہیں ہم دونوں
کے الگ الگ بیڈروم ہیں۔ اکثر اتوار کی شام
و میرے بیٹے بہو اور بیٹی داماد آجاتے ہیں تو
بچوں کی وجہ سے گھر میں چہل پہل ہو جاتی ہے پھر رات کا
کھانا کھا کر سب واپس چلے جاتے ہیں۔

کسی اتوار کی رات کو جب سارے بڑے
ویڈیو پکچر ٹی۔ وی پر دیکھتے ہوتے ہیں تو میں
بچوں سے کہتی ہوں "آؤ، تمہیں کہانی سُناؤں۔"
"ممی، گرینڈ مدر اسٹوری سُنانے کو بولتا
ہے۔ ہم کومک پڑھ رہے ہیں اور ٹی۔ وی دیکھ
رہے ہیں۔ پلیز ان سے بولو، بور نہ کریں۔"
بچوں کے والدین کہتے ہیں۔ "ممی، آپ ان
کو ڈسٹرب نہ کیجیے۔"
میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ زمانے کی قدریں
بدل چکی ہیں۔

بیٹا تو دو تین ہفتے بعد آتا ہے، لیکن،
بیٹی دوسرے تیسرے دن آتی ہے۔
نیچے گاڑی میں سے آواز دیتی ہے "عبداللہ!
ممی، پاپا کیسے ہیں؟"
"اچھے ہیں۔" عبداللہ جو میرا پرانا ملازم
ہے، جواب دیتا ہے۔
"ممی، پاپا کو بائی بائی بولو۔"
"بائی! آپ اوپر آئیے۔ ممی سے مل لیجیے۔
وہ اکیلی ہیں۔"
"نہیں میں اس وقت اوپر نہیں آسکتی
ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ پھر ہیئر ڈریسر کے
پاس جا کر بال سیٹ کرنے ہیں۔ اس کے بعد
گھر آکر لنچ کے لئے تیار ہونا ہے۔ لنچ پر جانا بہت
ضروری ہے۔ بائی بائی ممی! بائی بائی، عبداللہ!
اور اس کی گاڑی فرّاٹے بھرتی گزر جاتی ہے
میں صرف آواز سنتی ہوں۔

مجھے ہائی بلڈ پریشر ہے پیروں میں
درد بھی رہتا ہے۔ اس وجہ سے زیادہ چل پھر
نہیں سکتی۔ نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر کا
خیال ہے، پانی اُتر رہا ہے۔ اس لئے پڑھنے
لکھنے میں بھی وقت نہیں گزار سکتی بس روز صبح کو
گاڑی سے ہینگنگ گارڈن چلی جاتی ہوں۔
وہاں دوپہر تک بیٹھتی ہوں۔ پھر گھر واپس آکر
کھانا کھاتی ہوں اور آرام کرتی ہوں۔ شام کی
چائے کے بعد پھر ہینگنگ گارڈن چلی جاتی
ہوں اور رات تک بیٹھتی ہوں۔ لیکن وہاں کے
ہجوم میں بھی اپنے کو تنہا محسوس کرتی ہوں۔
بوڑھے پارسی مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو
سہارا دیئے چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں۔ بچے
اپنی آیاؤں کے ساتھ جھولا جھولنے اور مختلف
کھیلوں میں مشغول رہتے ہیں۔ بمبئی کی تہذیب
میں بغیر جان پہچان کے کوئی کسی سے بات نہیں
کرتا۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی
مخاطب نہیں ہوتے۔ میں خاموشی سے بھری پُری
دنیا کا تماشا دیکھتی رہتی ہوں اور وقت گزر جاتا

تریپولی کے سلطان ابنِ ابی عمران

(۱۳۶۹ - ۱۳۴۹) نے ایک انکسار پسند
حکمران کی شکل میں اپنی رعایا کا دل
جیتنے کے لئے ۲۰ برس تک اپنے دارالخلافہ
میں چل سبزیاں فروخت کی تھیں

ہے۔ اللہ! عمر کے یہ سال کتنے طویل ہو گئے ہیں!

ایک اتوار کی صبح کو میں اکیلی بینچ پر
بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک آیا دو بچوں کی انگلی پکڑے
میرے قریب سے گزری۔ دونوں بچے آیا کا
ہاتھ چھڑا کر بے تحاشا "بھوت! بھوت!"
چلاتے ہوئے بھاگے۔
"بائی لوگ کے لئے ایسا بات نہیں بولتے۔"
آیا نے ڈانٹا۔
بچے دور کھڑے ہوئے میرا منہ چڑاتے
رہے۔ پھر انگریزی میں اپنی آیا سے کہا "ہم نے
کومک میں پڑھا ہے، بھوت کا سر بڑا اور سفید
ہوتا ہے۔"
یہ سُن کر مجھے اپنی دادی کے بال یاد آگئے
جو چاندی کی طرح چمکتے تھے اور ان میں ہلکے ہلکے
گھونگھر تھے۔ ہم سب بھائی بہن اس بات پر

نجومی جس کی پیش گوئیاں اتنی حقیقی تھیں کہ وہ خوف زدہ ہو گیا۔

محمد (بیدل) شیخ عبدالرزاق نے ایک بار پیش گوئی کی تھی کہ اردن کے شاہ عبداللہ کا قتل ہوگا۔ ۱۹۵۱ء میں بہت افسوس ناک انداز میں انجام پذیر ہو گئی۔ اس پر انہوں نے چپ رہنے کا عہد کیا اور ۱۳ برس تک بالکل نہ بولے۔

ڈرتی ہے۔" بھائی احمد بولتے "ہاں۔ دادی اماں، علی بابا چالیس چور سنایئے۔"

"نہیں، ہم تو سفید جیسے برف والی کہانی سنیں گے۔" فرخندہ چلاتی۔

"تم خاموش رہو" بھائی جان اپنے بڑے پن کا رعب جماتے۔

دادی اماں سب کی رائے سنتیں۔ پھر پان دان کھول کر ایک پان کی گلوری بنا کر مونہہ میں رکھتیں اور کہتیں "دیکھو بچو پہلے میں رخشندہ کی فرمائش پوری کروں گی۔ اس کو بادشاہ والی کہانی سناؤں گی۔ پھر فرخندہ بیٹی کی۔ اس کے بعد علی بابا چالیس چور کی سننا"

چونکہ میں دادی اماں کو سب سے زیادہ لاڈلی تھی، اس لئے وہ میری بات نہیں ٹالتی تھیں۔

"ہاہا! ہماری کہانی پہلے شروع ہو گی۔" میں اور فرخندہ تالیاں بجاتے۔

"دادی اماں، ان دونوں کو روک لیجیے، ورنہ کل ہم ان کی ساری گڑیاں کنوئیں میں پھینک دیں گے"! بھائی جان اور دوسرے بھائی جھنجھلا کر کہتے۔

"چپ رہو لڑکیو!" وہ آہستہ سے ڈانٹ کر مسکرا دیتیں۔

ہم لوگوں کا شور سن کر چاچی اور امی آ جاتیں اور کہتیں "ان بچوں کو آپ اپنے کمرے سے نکال دیجیے۔ یہ آپ کو بہت تنگ کرتے ہیں"

"دلہن، یہ تو میرے کھلونے ہیں"! دادی ہم سب کے سروں پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتیں۔

کہانیاں سنتے سنتے ہم کب سو جاتے، یہ خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ رات میں کسی وقت آنکھ کھلتی تو میں امی جان کے بستر میں ہوتی۔ یہ میں امی کے جسم کی خوشبو سے پہچانتی تھی۔

ایک دن صبح ہی صبح ہمارے گھر کے ملازم نواب نے آکر جگایا: "چھوٹی بی بی، جلدی اٹھیے۔ سب بچے آنند باغ جا رہے ہیں۔"

آنند باغ ہمارے یہاں ایسا ہی تھا جیسے بمبئی میں رانی باغ ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، مونہہ ہاتھ دھویا اور نواب ناشتہ کرائے بغیر ہم سب بچوں کو آنند باغ لے گیا۔ وہیں پر صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا کھایا۔

شام کو گھوم پھر کر واپس آئے تو دیکھا کہ گھر میں سب لوگ خاموش بیٹھے ہیں۔ امی، چاچی، ابا جان، اور چاچا کی رونے کی وجہ سے آنکھیں سوج گئیں تھیں۔ ہم سب دادی اماں کے کمرے کی طرف دوڑے۔ آنند باغ سے ہم سب بھائی بہن دادی اماں کو تحفہ میں دینے کے لئے پھول لائے تھے، لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کمرے میں ایک شمع روشن تھی اور ہماری دادی اماں کا پلنگ تک نہیں تھا۔ ہم لوگ گھبرا کر دادی اماں کو پکار رہے تھے۔ اسی وقت پھوپی جان نے آکر ہمیں کمرے سے نکالنے کی کوشش کی اور کہا "یہاں تم سب کا کام نہیں ہے۔ اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"ہماری دادی اماں کہاں ہیں؟ ہم ان کو پھول دیں گے۔ ہم ان کو پھول دیں گے۔ ہم نہیں جائیں گے یہاں سے"۔ سب بچے مچل گئے۔

ابا جان نے آکر بڑے پیار سے پھوپی جان کو گلے لگایا، پھر سب بچوں سے مخاطب ہو کر کہا "بیٹا، تم سب کی دادی اماں کربلا گئی ہیں۔ آج نہیں ملیں گی"۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔

"کب گئیں؟ ہمیں ساتھ کیوں نہیں لے گئیں!" میں رونے لگی۔

"تھوڑے دن کے لئے گئی ہیں۔ آ جائیں گی"۔ ابا جان ہمیں پیار سے سمجھانے لگے۔

"ہم تو ابھی دادی اماں کے پاس جائیں گے۔ رات کو ہمیں کون کہانی سنائے گا؟" سب بچوں نے چلا چلا کر رونا شروع کر دیا تب امی اٹھیں، سب کو خاموش کیا اور کہا "دیکھو اس طرح رونے چلانے سے تمہاری دادی اماں کو بہت تکلیف ہو گی۔ اب وہ کربلا میں رہیں گی۔ وہاں کوئی نہیں جا سکتا"۔

ہم دادی اماں کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے بڑے ہو گئے جب میں نے میٹرک پاس کر لیا تب معلوم ہوا کہ جس روز صبح کو تمام بچے

...ہر کے لئے آنند باغ بھیج دئے گئے تھے
...ین دادی اماں کا انتقال ہوا تھا۔
آج میں بھی عمر کی اسی منزل پر پہنچ چکی ہوں
...میرے ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹے
...شادی کے بعد وارڈن روڈ پر الگ فلیٹ لے لیا
...ہے۔ حالانکہ میرا فلیٹ بہت بڑا ہے تین بیڈروم
...ں میں ہیں۔ بڑی آسانی اور آرام کے ساتھ
...ن خاندان اس میں رہ سکتے ہیں۔ بے حد خوبصورت
...مالابار ہل پر ہے۔ بیٹی نے بھی اپنے بھائی کے
...یب فلیٹ لے لیا ہے۔ میرے شوہر دن
...بھر آفس میں رہتے ہیں۔ شام کی چائے پی کر کلب
...لے جاتے ہیں۔ وہاں سے بارہ ایک بجے رات کو
...اپس آکر اپنے بیڈروم میں سو جاتے ہیں ہم دونوں
...کے الگ الگ بیڈروم ہیں۔ اکثر اتوار کی شام
...کو میرے بیٹے بہو اور بیٹی داماد آجاتے ہیں تو
بچوں کی وجہ سے گھر میں چہل پہل ہو جاتی ہے۔ پھر رات کا
کھانا کھا کر سب واپس چلے جاتے ہیں۔

کسی اتوار کی رات کو جب سارے بڑے
ویڈیو پکچر ٹی۔وی پر دیکھتے ہوتے ہیں تو میں
بچوں سے کہتی ہوں "آؤ، تمہیں کہانی سناؤں"۔
"ممی، گرینڈ مدر اسٹوری سنانے کو بولتا
ہے۔ ہم کومک پڑھ رہے ہیں اور ٹی۔وی دیکھ
رہے ہیں۔ پلیز ان سے بولو، بور نہ کریں۔"
بچوں کے والدین کہتے ہیں۔ "ممی، آپ ان
کو ڈسٹرب نہ کیجیے۔"
میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ زمانے کی قدریں
بدل چکی ہیں۔

بیٹا تو دو تین ہفتے بعد آتا ہے، لیکن
بیٹی دوسرے تیسرے دن آتی ہے۔
نیچے گاڑی میں سے آواز دیتی ہے "عبدل!
ممی، پاپا کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔" عبدل جو میرا پرانا ملازم
ہے، جواب دیتا ہے۔
"ممی، پاپا کو بائی بائی بولو"
"بائی! آپ اوپر آئیے۔ ممی سے مل لیجیے۔
وہ اکیلی ہیں۔"
"نہیں میں اس وقت اوپر نہیں آسکتی
ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ پھر ہیر ڈریسر کے
پاس جا کر بال سیٹ کرنے ہیں۔ اس کے بعد
گھر آکر لنچ کے لئے تیار ہونا ہے۔ لنچ پر جانا بہت
ضروری ہے۔ بائی بائی ممی! بائی بائی عبدل!"
اور اس کی گاڑی فراٹے بھرتی گزر جاتی ہے
میں صرف آواز سنتی ہوں۔

مجھے ہائی بلڈ پریشر ہے پیروں میں
درد بھی رہتا ہے۔ اس وجہ سے زیادہ چل پھر
نہیں سکتی۔ نظر بھی کم زور ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر کا
خیال ہے، پانی اتر رہا ہے۔ اس لئے پڑھنے
لکھنے میں بھی وقت نہیں گزار سکتی۔ بس روز صبح کو
گاڑی سے ہینگنگ گارڈن چلی جاتی ہوں۔
وہاں دوپہر تک بیٹھتی ہوں۔ پھر گھر واپس آکر
کھانا کھاتی ہوں اور آرام کرتی ہوں شام کی
چائے کے بعد پھر ہینگنگ گارڈن چلی جاتی
ہوں اور رات تک بیٹھتی ہوں۔ لیکن وہاں کے
ہجوم میں بھی اپنے کو تنہا محسوس کرتی ہوں۔
بوڑھے پارسی مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو
تھامے چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں۔ بچے
اپنی آیاؤں کے ساتھ جھولا جھولنے اور مختلف
کھیلوں میں مشغول رہتے ہیں۔ بمبئی کی تہذیب
میں بغیر جان پہچان کے کوئی کسی سے بات نہیں
کرتا۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے لوگ بھی
مخاطب نہیں ہوتے ہیں خاموشی اس بھری پری
دنیا کا تماشا دیکھتی رہتی ہوں اور وقت گزر جاتا

ترپولی کے سلطان ابن ابی عمران
(۱۳۶۹ - ۱۳۴۹) نے ایک انکسار پسند
حکمران کی شکل میں اپنی رعایا کا دل
جیتنے کے لئے ۲۰ برس تک اپنے دارالخلافہ
میں پھل سبزیاں فروخت کی تھیں۔

ہے۔ اللہ! عمر کے یہ سال کتنے طویل ہو گئے ہیں!

ایک اتوار کی صبح کو میں اکیلی بینچ پر
بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک آیا دو بچوں کی انگلی پکڑے
میرے قریب سے گزری۔ دونوں بچے آیا کا
ہاتھ چھڑا کر بے تحاشا "بھوت! بھوت!"
چلاتے ہوئے بھاگے۔
"بائی لوگ کے لئے ایسا بات نہیں بولتے۔"
آیا نے ڈانٹا۔
بچے دور کھڑے ہوئے میرا منہ چڑاتے
رہے۔ پھر انگریزی میں اپنی آیا سے کہا "ہم نے
کومک میں پڑھا ہے، بھوت کا سر بڑا اور سفید
ہوتا ہے۔"
یہ سن کر مجھے اپنی دادی کے بال یاد آگئے
جو چاندی کی طرح چمکتے تھے اور ان میں ہلکے ہلکے
گھونگھر تھے۔ ہم سب بھائی بہن اس بات پر

رہتے تھے اور ہر ایک یہی کہتا تھا کہ دادی کے سر کی چاندی سب سے زیادہ میرے حصے میں آئے گی۔ آج کی دنیا میں ہر قابلِ قدر چیز بھوت ہونے کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔

اسی وقت ایک نوجوان جوڑا ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے میرے قریب سے گزرا۔ لڑکی رُک کر میری جانب دیکھنے لگی، پھر اپنے دوست سے مخاطب ہوئی۔ "دیکھو! یہ بے چاری بڑھیا روز اکیلے ٹائم پاس کرتی ہے۔"

"اولڈ ایج والوں کو ہم کیسے کمپنی دے سکتے ہیں، ڈارلنگ؟"

"یس۔" دونوں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میری دنیا ہینگنگ گارڈن تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر کی وحشت ناک تنہائی سے یہاں چند گھنٹوں کے لئے نجات مل جاتی تھی۔ یہاں کی تازہ ہوا اُچھلتے ہوئے فوارے اور ہنستے کھیلتے ترو تازہ رکھتی تھی۔

ایک شام میں حسبِ معمول آکر وہاں بیٹھی ہوئی محوِ تماشا تھی کہ دو نئی آیاؤں کی آواز سے چونک پڑی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اشارے سے پوچھا۔

"ہم یہ بولتا ہے میم صاحب، آپ کو دوسرے گارڈن میں اپنا ٹائم پاس کرنا مانگتا ہے۔"

"یہ گارڈن بابا لوگ کا ہے۔ وہ ہر دن آپ کو یہاں بیٹھا دیکھ کر بہوت گھبراتا ہے۔ اولڈ ایج والا لوگ باجو کے گارڈن میں جاتا ہے۔" دوسری آیا نے کہا۔

"کل بابا اور بے بی کو فیور ہو گیا۔ اس کے ڈیڈی ممی نے ہم کو بوم مارا۔ ممی نے بولا ہے، آپ دوسیرا جگہ دیکھیں۔ ہم بہت دُکھی ہو گیا ہے آپ سے۔"

ایک بڑی عمر کی آیا نے نرمی سے کہا۔ "معاف کرنا۔ آں۔ ہم لوگ کا کیا قصور ہے؟ صاب لوگ ذرا سی بات پر اپن لوگ کی چھٹی کر دیتا ہے۔"

میں نے ان کی باتیں سُن کر کوئی جواب نہیں دیا۔ نیچے چوپاٹی اور نیلے پیالہ نما سمندر کو دیکھنے لگی، جہاں سروں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں سوچنے لگی کل سے یہ منظر بھی میرا ساتھ چھوڑ دے گا اور میری تنہائی کی ساتھی صرف ماضی کی خوشگوار یادیں ہوں گی۔

■■

ذہنی ورزش

انعام:
ایک سوان
پریشر کوکر

نتیجہ نمبر۲

صحیح جواب یہ ہیں:

۱۔ مدر ٹریسا
۲۔ لکشمی بائی
۳۔ کرن بیدی
۴۔ الیگزینڈر گراہم بیل
۵۔ اے، آر، خاتون
۶۔ منجندری پال
۷۔ راجا رام موہن رائے
۸۔ اکبر
۹۔ اچھوت کنیا
۱۰۔ ہندوستان

■ رافیہ رشید (رام پور، یو، پی)

ان مقابلوں میں حصہ لینے والوں کی گنتی تو بہت زیادہ رہی۔ مگر نتیجہ نمبر۲ میں جواب جیتنے والوں نے بھی ایک غلطی کی ہے۔ نتیجہ نمبر۳ میں صحیح جوابات کی تعداد صرف تین رہی ان میں سے قرعہ اندازی کر کے انعام میں دونوں کو ایک ایک سوان پریشر کوکر بھیجا جا رہا ہے۔ جیتنے والوں کے نام شائع کئے جا رہے ہیں۔

نتیجہ نمبر۳

صحیح جواب یہ ہیں:

۱۔ نابالغ لڑکی کی شادی
۲۔ بتن سنگھ
۳۔ سینیر کیمبرج
۴۔ اٹلی
۵۔ عصمت چغتائی
۶۔ عراق
۷۔ سروجنی نائیڈو
۸۔ ولی دکنی
۹۔ کہیں بھی نہیں
۱۰۔ کشمیر

■ بی، علوی (لاجپت نگر، نئی دہلی)

ایک بیماری ہے

ثناء اللہ

شک اور اعتماد دو متضاد چیزیں ہیں لیکن کبھی کبھی یہ دونوں ساتھ ساتھ بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک ماں اپنے بیٹے اور بیٹی پر شک نہیں کرتی لیکن بہو پر شک کرتی ہے۔ وہ انسان جس پر شک کیا جائے اگر آہستہ آہستہ اپنی کارکردگی سے اعتماد کی فضا قائم کردے تو شک دور بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر کوئی دوسرا انسان شک کا مرکز بن جاتا ہے۔

شک کی بیماری ورثے میں بھی ملتی ہے۔ یہ ذیابیطس، گٹھیا اور بلڈ پریشر کی طرح جبلی ورثہ نہیں ہوتا، بلکہ ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ ماں باپ شکی مزاج ہوں تو بہت ممکن ہے کہ بچے بھی ان سے متاثر ہو جائیں۔ ایک شکی مزاج ماں اپنے برتاؤ سے بیٹی میں یہ بیماری منتقل کر دیتی ہے۔ بیٹی

ور تے کو سنبھال کر رکھتی ہے اور اپنی بیٹی کو منتقل
دیتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ یہ بیماری
ری دنیا میں پائی جاتی ہے۔ ساس بہو پر شک کرتی
ہے۔ مالکن نوکروں پر شک کرتی ہے۔ خاوند بیوی
کے شک کا شکار ہوتا ہے اور بیوی خاوند کے۔

شک کی بیماری کا سب سے بڑا نقصان ازدواجی
زندگی میں ہوتا ہے۔ بیوی خاوند پر شک کرے یا
خاوند بیوی پر، دونوں صورتوں میں گھر جہنّم کا نمونہ
بن جاتا ہے۔ اگر خاوند دیر سے گھر آتا ہے تو ضرور
وہ دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہوگا۔ کام کا تو محض
بہانہ ہے۔ بعض شکی مزاج عورتیں دل ہی دل میں
سوکن کا تصور کرتی ہیں۔ وہ خاوند کی جیب ٹٹولتی
ہیں کہ شاید کوئی کاغذ کا پرزہ یا کسی عورت کے سر
کا بال مل جائے۔ بعض عورتیں خاوند کا لباس سونگھتی
ہیں کہ شاید انہیں اس میں عطر کی خوشبو مل جائے اور
وہ خاوند کی چوری پکڑ لیں۔ اس کے برعکس خاوند
بھی اپنی بیوی پر شک کرتے ہیں۔ اسے کسی رشتہ دار
یا دوست کے سامنے نہیں آنے دیتے مبادا بیوی
کی توجہ اس طرف مرکوز ہو جائے۔ بعض اوقات
شک ایک مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر
بیوی کسی فلم ہشار کو پسند کرتی ہے تو میاں جل بھن
جاتے ہیں اور اس میں عیب نکالنا شروع کر دیتے
ہیں۔

شک کا ایک سبب خود اعتمادی کی کمی
ہے۔ اگر میاں کی شکل وصورت واجبی ہے تو وہ
کم تری کے احساس کا شکار ہو جاتا ہے۔ بیوی
خوب صورت ہو تو یہ احساس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔
س کو گمان ہوتا ہے کہ بیوی مجھ سے محبت نہیں کرتی۔
کوئی مجھ سے بہتر شکل وصورت کا انسان نظر آئے گا
تو وہ اس کو پسند کرنے لگے گی۔ وہ یہ بھول جاتا ہے
کہ عورت کے لیے شکل وصورت ایک ضمنی حیثیت
رکھتی ہے۔ مرد اگر ذہین ہے، عقل مند ہے، اپنے کام
میں ہوشیار ہے، بیوی اور بچوں کا خیال رکھتا ہے
تو بیوی کی ضرورتیں بڑی حد تک پوری ہو جاتی ہیں۔
شادی کے متعلق ایک فلاسفر کا قول ہے کہ مرد اپنی
ازدواجی ضرورت کے لیے شادی کرتا ہے۔ عورت
کا حُسن اور جسمانی تناسب اس کے انتخاب میں مرکزی
کردار ادا کرتے ہیں کبھی وہ عورت کے سنہری بالوں
پر فدا ہو جاتا ہے تو کبھی اس کی بھوری آنکھوں پر۔
کوئی سرو قامت پر مرمٹتا ہے تو کوئی بُوٹے سے
قد پر۔ کوئی اس کی چال دیکھ کر مر جاتا ہے تو کوئی اس
کے گالوں کے گڑھوں میں گر پڑتا ہے۔ اس کے
برعکس مرد کی شکل وصورت عورت کے لیے مرکزی
حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ اپنا گھر بسانے کے لیے شادی
کرتی ہے۔ اس کی آرزو ہوتی ہے کہ اس کا اپنا
گھر ہو، بچّے ہوں، اپنے گھر میں وہ آزاد انسان کی
طرح زندگی بسر کرے۔ خاوند حسین ہو تو اچھا ہے،
نہیں ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

مرد اس نکتہ کو نہیں سمجھتے۔ وہ بیوی کی حُسن
سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور خود کو اس سے کم تر
تصور کرتے ہیں۔ اس کم تری کے احساس سے شک
پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ بیماری اتنی بڑھ جاتی
ہے کہ انہیں خواب میں بھی بیوی کی بے وفائی دکھائی
دینے لگتی ہے۔ سوتے جاگتے انہیں ایک ہی فکر کھائے
جاتی ہے۔ ان کی بیوی نے ایک بہتر مرد تلاش کر لیا
ہے۔ وہ اس سے چُھپ کر ملتی ہے۔ وہ گھر میں بے وقت
نکلتے ہیں کہ شاید وہ چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیں۔ گھر
کی تلاشی لیتے ہیں کہ شاید مچان یا کوٹھری میں ان کا
رقیب چُھپا بیٹھا ہو۔

شک کا ایک سبب اور ہے اور وہ ہے
عمر کا زیادہ فرق۔ اگر مرد ادھیڑ عمر میں جوان عورت
سے شادی کرے تو وہ بھی عموماً شک کا شکار ہو جاتا
ہے۔ یہ شک قدرتی ہے اسے دُور کیا جا سکتا ہے۔
لیکن یہاں بھی مرد اپنی نادانی سے اس نکتہ کو بھول
جاتا ہے کہ وہ بیوی کی ناز برداری کرتا ہے، اس کا
ہر طرح خیال رکھتا ہے۔ بیوی کو کیا ضرورت ہے کہ
وہ اپنے بھرے بھرے گھر کو آگ لگا کر چلی جائے؟
یہاں ہمیں بیویوں کو ایک مشورہ دینا ہے۔ انہیں
اپنے مرد کے سامنے دوسرے مرد کی تعریف نہیں
کرنی چاہیے۔ شکّی مزاج مرد کے سامنے تو یہ بات
بھُس میں آگ لگانے کے برابر ہے۔ معقول آدمی
تو دوسرے کی تعریف سُن کر مسکرا دیتا ہے، لیکن
اس کے دل پر ہلکی سی چوٹ ضرور لگتی ہے۔ لیکن شکّی
مزاج آدمی غصّہ میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس
کے شک کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ آج اس کی بیوی
دوسرے مرد کی تعریف کر رہی ہے، کل اس کی طرف
محبت کا ہاتھ بھی بڑھا سکتی ہے۔

شک کا ایک سبب انا بھی ہے۔ بعض مرد
بڑے خود پرست اور مغرور ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سامنے
کسی کو نہیں گردانتے اگر وہ خوب صورت ہیں تو دوسروں
کو بدصورت سمجھتے ہیں۔ اگر دولت مند ہیں تو متوسط طبقے
کے لوگوں سے حقارت سے پیش آتے ہیں۔ اگر تعلیم یافتہ
ہیں تو دوسروں کو جاہل سمجھتے ہیں۔ انہیں قابلیت کا
ہیضہ ہو جاتا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں میں خود پرستی
اور تعلّی کا مرض عام پایا جاتا ہے۔ ایسے انسان کی
بیوی اگر دوسرے مرد کی تعریف کرے تو شک کی
بنیاد پڑ جاتی ہے۔

شک کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ خاوند بیوی
بچّے نوکر رشتہ دار اور دوست سب اس کی زد میں
آ جاتے ہیں۔ ایک بی بی کو بھول جانے کی عادت تھی۔
ایک بار انہوں نے زیورات کا ڈبّا تجوری سے نکال کر
الماری میں رکھا۔ انہیں دوسرے دن کسی تقریب

میں جاتا تھا۔ دوسرے دن جب وہ شادی کی محفل میں جانے کی تیاری کرنے لگیں تو زیورات کا خیال آیا۔ وہ یہ بھول گئیں کہ انہوں نے ڈبا، تجوری سے نکال کر الماری میں رکھا تھا۔ وہ تجوری کی طرف بڑھیں اور اسے کھولا۔ تجوری خالی تھی۔ یہ دیکھ کر ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ گھر میں ملازم کے سوا کوئی باہر کا آدمی نہیں تھا۔ قدرتی طور پر ان کا شک ملازم پر گیا۔ لیکن ان کا ملازم بیس سال سے گھر میں رہتا تھا۔ اس نے کبھی ایک پیسے کی بے ایمانی نہیں کی تھی۔ ایک لمحے کے لئے انہیں اس کی وفاداری اور نیک چلنی کا خیال آیا، لیکن انہوں نے یہ سوچ کر اس خیال کو دل سے نکال دیا کہ پیسہ اچھے اچھوں کی نیت خراب کر دیتا ہے۔ انہوں نے پولیس کو چوری کی خبر پہنچا دی۔ پولیس آئی۔ انہوں نے مالکن سے پوچھا کہ انہیں کس پر شک ہے۔ مالکن نے نوکر کا نام لیا۔ پولیس نوکر کو پکڑ کر لے گئی اور گھونسوں اور لاتوں سے اس کی تواضع کی۔ دن بھر وہ تھانے میں پولیس کی مار کھاتا رہا لیکن اس نے چوری کا جرم قبول نہیں کیا۔ کرتا بھی کیسے؟ اس نے تجوری کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اتفاقاً گھر میں مالکن کی بیٹی نے الماری کھولی تو وہاں کپڑوں کے تہہ کے نیچے زیورات کا ڈبا نظر آیا۔ مالکن بہت شرمندہ ہوئیں انہوں نے پولیس کے چنگل سے اپنے ملازم کو چھڑایا اور اس سے معافی مانگی۔ اس کی تنخواہ میں ۲ روپے کا اضافہ بھی کر دیا۔

یہ سب تو ہوا لیکن ان کی شک کی عادت نہیں گئی۔ بھولنے کی عادت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ وہ روپیہ الماری سے نکال کر طاق میں رکھ دیتیں، بھول جاتیں۔ کبھی بچوں سے پوچھتیں، انہیں ڈراتیں دھمکاتیں، خوشامد کرتیں، لالچ دلاتیں، لیکن بچوں نے روپیہ چرایا ہو تو وہ جرم کا اقبال کریں۔ ناچار وہ تھک ہار کر بیٹھ جاتیں۔ شام تک گھر میں کسی نہ کسی کو وہ روپیہ مل جاتا تو وہ ماں شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتیں۔ بچے ان کی بھولنے کی عادت سے زچ ہو گئے تھے۔ اس پر شک کی بیماری ان کی جھنجھلاہٹ میں اضافہ کرتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ ماں کی دونوں باتوں کے عادی ہو گئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ماں اپنی عادت کو جان کر بھی اس سے چھٹکارا نہیں پا سکیں۔ ہر بار انہیں یقین ہوتا کہ ان کا شک صحیح نکلے گا، لیکن ہر بار ان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا۔ مگر ان کی شک کی عادت نے زندگی بھر ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

شک کی عادت سے پیچھا چھڑانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنا محاسبہ کرے ــــ کیا وہ

> ●● اگر آپ اعتبار کرنے کی عادت ڈالیں تو شک کی عادت ختم ہو جائے گی۔ اس بات کا انتظار نہ کریں کہ دوسرا انسان خود کو اعتبار کے قابل بنائے۔ ●●

احساسِ کمتری کا شکار ہے؟ کیا اس کے ماں باپ شکی مزاج تھے؟ کیا اس نے لاشعوری طور پر ان کا اثر قبول کر لیا؟ کیا وہ خود کو نااہل اور کمتر سمجھتا ہے؟ اگر یہ عادت گھر کے ماحول سے ملی ہے تو اسے سمجھنے کے بعد آہستہ آہستہ اس عادت سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ ماں باپ نے ایک دوسرے پر شک کیا، بچوں اور نوکروں پر، دوستوں اور رشتہ داروں پر شک کیا۔ نتیجے میں وہ زندگی بھر ذہنی پریشانی سے دوچار رہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم بھی اس تجربے کو دہرائیں؟ ماں باپ سے شکل و صورت اور جسمانی بیماریاں ورثے میں ملی ہیں۔ کیا بس اتنا ہی کافی نہیں ہے؟

اگر آپ خود کو کمتر سمجھتی ہیں تو یہ سمجھ لیجئے کہ دنیا میں کوئی انسان مکمل نہیں ہے۔ اگر اس میں خوبی ہے تو اس کے مقابلے میں کوئی کمزوری رہتی ہے۔ کوئی عورت بہت مالدار ہے لیکن اس کے کنجوس بھی ہے۔ کوئی خوبصورت ہے تو اس دماغ کا خانہ خالی ہے۔ کوئی جامہ زیب ہے تو دن سنگھار کرتی ہے۔ غرض کوئی انسان ایسا جس میں ساری خوبیاں جمع ہوں۔ اس لئے دوسری عورت سے مرعوب ہونے کا سوال پیدا ہوتا۔ اگر آپ کی شکل و صورت واجبی ہے لیکن سگھڑ اور سلیقہ شعار ہیں تو آپ کو خاوند پر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ لذیذ کھانا میں ماہر ہیں تو یہ ہنر آپ کے سارے عیب اگر آپ ہنرمند ہیں تو آپ کو خاوند پر شک کی ضرورت نہیں۔

اگر آپ اعتبار کرنے کی عادت ڈالیں کی عادت خود بخود کم ہو جائے گی۔ اس بات نہ کریں کہ دوسرا انسان خود کو اعتبار کے قابل آپ خود پہل کریں۔ اعتبار کرنے میں نقصان ضرور ہے، لیکن یہ خطرہ مول لے بغیر شک سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ ایک سکون پسند سے کسی نے پوچھا کہ تمہاری طمانیت کا راز کیا اس نے جواب دیا "میرا اصول ہے کہ اعتبار کر دھوکا کھاؤ۔ یہ بات اس سے بہتر ہے کہ شک پریشانی مول لو۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے اتنا دھوکا نہیں ہوا۔ اعتبار سے اعتبار پیدا ہوتا چور پر شک کرنے کے بجائے اگر اسے اپنی چابی دے دیں اور کہیں تو میری غیر حاضری میں خیال رکھنا تو گویا آپ نے اس کی انسانیت کو بہت ممکن ہے کہ اس کی سوئی ہوئی انسانیت جاگ جائے اور وہ آپ کے اعتبار کو ٹھیس نہ پہنچ

...حبہ :

...ہادیہ میں آپ کو دیکھا تھا۔ آپ جتنی
...یں، اتنی ہی حسین ہیں اور اتنا ہی حسین
...ہیں۔ بانو مارچ کا افتتاحیہ اور اس میں
...وں کی مثالیں بہت پسند آئیں،
...تکمیلِ آرزو" دل میں اتر گیا۔ یہ افسانہ
...سے بہت قریب ہے۔ اس کے علاوہ
...دن۔ اسے" اور" اندھیرے کے خلاف"
...کی عورتوں کے لئے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔
...ملیے" کے تحت ٹی۔وی آرٹسٹ
...ایر سے ملاقات دل پر نقش چھوڑ گئی
...ابلے" تصویر کا عنوان" اور" ذہنی ورزش"
...ت دل چسپ اضافے ہیں۔

مس حبیب قریشی، حیدرآباد

...یریہ صاحبہ :

...نئے کالمیں کا اضافہ خوش گوار ہے خصوصاً
...' جیسے کالم کی میری نظر میں بڑی اہمیت
...رے ایک دوست مغنی عباس صاحب
...پرانا معمول ہے کہ وہ نیا اور اچھا لطیفہ
والے کو پچاس پیسے کا سکہ نذر کرتے ہیں۔
...وئی معاف، اگرچہ آپ نے مزہ دار چٹکلے
...پر زور دیا ہے، لیکن بانو فروری' میں
...لم سارے لطیفے سطحی، بے کیف
...ساختگی سے مبرّا ہیں۔ آپ بہتر سمجھ سکتی
...یفوں کے انتخاب سے لے کر اندازِ بیان
...کالم خاص محنت چاہتا ہے۔ تاہم اس
...پ ضرور جاری رکھیں۔ کسی بھی حیلے سے
...زخوشی تقسیم کرنا بہت بڑی انسانی خدمت
...رکی کا کہنا ہے کہ سب سے بڑی بات ہے
...مہذب بنانا۔ اور بانو نے تقریباً ۵۰ہ
...کے ذریعہ ہندوستانی خواتین میں جو عاجی

شعور، خود اعتمادی اور خود شناسی پیدا کی ہے
وہ یقیناً اپنی مثال آپ ہے۔ امید ہے کہ آپ
پرچے کو بہتر سے بہترین بنانے کی کوشش جاری
رکھیں گی اور منظومات اور افسانوں کے انتخاب
میں زیادہ سختی سے کام لیں گی!

خان ارمان بمبئی

سعدیہ بہن :

بانو میں" افتتاحیہ" ہمیشہ دیرپا تاثرات
چھوڑتا ہے۔ فروری کے بانو میں آپ نے
آں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر
سے قارئین کے دل و دماغ کو منور اور معطر کرنے
کی سعادت حاصل کی ہے۔ یہ دل سوز اور سحر انگیز
تحریر لوحِ دل پر ضرور نقش ہو گی، مگر عمل کی ضرورت
ہے۔ قرآن اور تاریخ و تہذیبِ اسلام کی روشنی
میں آج کا انسان نئی روشنی اور نئی تعلیم و تفہیم حاصل
کر سکتا ہے۔

آج ہم مادہ پرستی اور مغرب پرستی کے شکار
ہو رہے ہیں۔ اس لئے اب ضرورت اس
بات کی ہے کہ نئی نسل کو اسلامی پیام سے
روشناس کرایا جائے تاکہ وہ دنیا میں بھی سربلند
رہے، آخرت میں بھی۔

آر شہناز بیگم، کرنول

پیاری بہن :

بانو : فروری نظر نواز ہوا۔ سرِورق
دل کش اور خوب صورت ہے۔ افتتاحیہ کا تو
کوئی جواب ہی نہیں۔ افسر بانو کا "حالیہ تاریخ کا
سب سے خوف ناک حادثہ" پڑھ کر اور تصویریں
دیکھ کر آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ کہانیاں بہت
دل چسپ ہیں۔ خاص طور سے "چارہ گر" "تکمیلِ
آرزو" "یادِ دل کے زخم" "ذرا سی بھول" اور
"اندھیرے کے خلاف" قابلِ ستائش ہیں۔
"میرے پسندیدہ اشعار" کا کالم مجھے بہت پسند
آیا۔ سال نامہ کا بے چینی سے انتظار ہے۔
نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

مس صدیقہ آفریں، تھکرالوان موگر

سوئیٹ بہن :

فروری کا بانو اپنی تمام تر رعنائیوں کے
ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ سرِورق تو زیادہ پسند
نہ آیا مگر افتتاحیہ میں ہمیشہ بڑے شوق سے
پڑھتا ہوں۔ اس ماہ کا افتتاحیہ بھی خوب ہے

ل بھی سب کی سب قابلِ تعریف ہیں۔
اثر شاہجہاں پوری اور فردوس گیاوی کی
می پسند آئیں۔ "نیا سال" نظم بھی تعریف
اج ہیں۔ انور شمیم کے مضمون "آیئے
وں کی طرح ہوا میں اُڑیں" نے معلومات
ضافہ کیا۔

افروز عالم دل کش شکر آزاد نگر

...صاحبہ:

فروری کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے
رونما ہوا۔ افتتاحیہ میں جو بات کہی گئی ہے
ت پر مبنی ہے۔ یقیناً اسلام مکمل نظامِ حیات
دنیا میں جتنے بھی نظریات ہیں، انسان
انی تخلیق ہیں، جن کے ذریعہ مسائل سلجھنے
بائے مزید پیچیدہ ہو رہے ہیں۔
ہی واحد مکمل نظام ہے جس کے وسیلے سے
نیت کی صحیح تعمیر ہو سکتی ہے۔

بانو ہمارے گھر کا پسندیدہ رسالہ ہے
پ کی ادارت میں بانو شگفتہ گل کی طرح نکھرا
۔ تاہم مزید شبنم کی ضرورت بھی ہے۔
ر نیازی کی "نعتِ پاک" روح پرور ہے
وبال کا حادثہ قیامت سے کم نہ تھا۔ تمام
مامین معلوماتی ہونے کے ساتھ مؤثر بھی
ہے۔

عبد الرحمٰن قریشی، نیمچ (ایم پی)

ر بہن:

فروری کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ افسانے
یا زوں کے زخم"، "ٹونٹی" اور "ذرا سی بھول" بہترین
ے۔ آپ نے بانو کو حسن، دل کشی اور دلچسپی کا
سنگم بنا دیا ہے۔ نئے فن کاروں کی بھی تو خوب
نت افزائی ہوتی ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے

محمد شارق رضا، آکوٹ

عزیز بہن:

۵۷ ویں شمارہ جلوہ افروز ہوا۔ افتتاحیہ
دل کی گہرائیوں کو چھو گیا۔ آپ نے اپنے افتتاحیہ
میں محسنِ انسانیت کی مثال دے کر ہماری
تاریک راہوں میں روشنی بکھیر دی ہے۔ اللہ سے
دعا ہے آپ کے افتتاحیہ پر اسی طرح سے نکھار
آتا جائے اور آپ کا قلم ہمیں ایسے ہی حقائق سے
روشناس کراتا رہے۔ زیرِ نظر شمارے میں
سب ہی تخلیقات معیاری ہیں لیکن خاص طور
پر صفیہ سلطانہ کا "چارہ گر"، اور نزہت کی "ذرا سی
بھول" قابلِ مطالعہ ہیں۔ شعری حصہ بھی خوب
ہے۔ بزمِ بانو میں عصمت چغتائی کے جوابات
بھی پسند آئے۔ "ایک ستون اور گرا" کے عنوان
سے شہناز کا فیض احمد فیض کو خراجِ عقیدت
بھی خوب ہے۔

نسیم انور، کاماریڈی۔

سعدیہ صاحبہ:

آپ نے بانو کی ادارت سنبھالی اس کی
مبارک باد قبول کریں اس اہم تبدیلی کا ہم سب
نے پُر جوش خیر مقدم کیا ہے۔ ہمیں قوی امید ہے
کہ آپ کے زیرِ ادارت یہ رسالہ نئی نسل اور نئے
دور کے تقاضوں کو پورا کرے گا۔

سلیم خورشید، بمبئی ۸

محترمہ:

"بانو" کا شمارہ نمبر ۵۴ اپنی تمام تر
انفرادی خصوصیات اور خوبیوں کے ساتھ نظر نواز
ہوا۔ "بانو" کے پُر شکوہ اور باوقار ادبی شیش محل
کو آپ نے جس طرح سنوارا اور سجایا ہے، اس
سے آپ کی ادب نواز شخصیت کا اندازہ ہوتا
ہے۔ خدا اس جھلملاتے شیش محل کو سنگ ہائے
نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔

زیرِ نظر شمارے میں احمد رضا کا مضمون
"افغانستان میں پردے کی کہانی" اپنی تاریخی
اہمیت کے ساتھ نہایت دلچسپ ہے۔
صفیہ یوسفی کا افسانہ "سلگتا سا حاصل" ہوا اور بچے
کے فرق کو دور کرنے کی اچھی کوشش ہے۔
"ان سے ملئے" کے تحت ذرہ عثمانی سے
ملاقات خوب مگر کچھ تشنہ ہے۔ ڈاکٹر
مرزا اثر بیگ کی کہانی "تلاشِ مسلسل" عصرِ حاضر
کے پُر غرور، خود پسند اور لالچی چہرے پر ایک
طمانچہ ہے۔ عبد الرب نے "موس" میں عورت
کی ایک خوب صورت اور پُر فریب نفسیاتی
تصویر اچھے ڈھنگ سے پیش کی ہے، جو حقیقی تو
ہی نہیں عبرت انگیز بھی ہے۔ ممتاز رفیق کا مضمون
"ام انگلی کے بالے کا فوٹو کھینچا جا سکتا ہے"
حیران کن اور معلوماتی ہے۔ اور آپ کا افتتاحیہ
تو ایک ایسا خوب صورت پھول ہے جس
میں اصلاح کا رنگ بھی ہے اور ادب کی خوشبو
بھی۔

(ڈاکٹر معظم علی خاں، علی گڑھ)

سویٹ سعدیہ:

بانو مارچ کا افتتاحیہ لاجواب تھا میرے
ہاتھ جس وقت بانو آتا ہے میں پہلے افتتاحیہ
پڑھتی ہوں۔ کہانیوں میں سب سے زیادہ "ردِ
لاشیں" اور "نافرمان" پسند آئیں یہ حقیقت ہے
کہ آج کل جہیز کے بغیر لڑکی کی شادی نہیں
ہو سکتی۔ "تبسم"، "میرا پسندیدہ شعر" اور
عصمت صاحبہ کے جوابات، "ذہنی ورزش"
"خیال اپنا اپنا" سارے کالم اچھے ہیں۔
میری طرف سے آپ کو مبارک باد کہ آپ نے
بانو کو نئی دل کشی بخشی ہے۔

امت الحفیظ، جڑچولہ

کراسٹچ کے خوشنما بوٹے اور دل فریب گلا
کشیدہ کاری

ذرا سی بات

عزیز مراد آبادی

میری پیاری دیدی میں خودداری کا مادہ اس حد تک بھرا ہوا تھا کہ وہ فولاد کی طرح سخت ہو گئی تھیں۔ شاید اسی خودداری کے باعث انہوں نے اپنے شوہر سے شادی کے چند دن بعد ہی علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

طلاق کی اصل وجہ ان کو معلوم تھی یا ان کے شوہر کو معلوم ہوگی جو طلاق کے فوراً بعد امریکہ چلے گئے تھے۔ تب سے ان کا آج تک کچھ پتہ نہیں کہ امریکہ میں ہی ہیں، یا کہیں اور، یا اس دنیا میں اب ہیں بھی یا نہیں۔

شوہر سے طلاق لینے کے بعد ہی دیدی ایک کالج میں لیکچرار ہو گئی تھیں اور بظاہر مطمئن اور خوش نظر آتی تھیں۔ طلاق جیسے ناخوشگوار واقعے کو آج تقریباً چھ سات سال ہو چکے ہیں لیکن میرے ذہن میں یہ واقعہ ابھی تک تازہ ہے۔

اس واقعہ کے چند دن بعد ایک سانحہ ہمارے مشفق باپ کی موت کی صورت میں رونما ہوا تھا۔ خدا جانے ان پر دل کا دورہ پڑا تھا یا اپنی بیٹی کے گھر اجڑنے کے شدید صدمے نے ان کی جان لی تھی۔ باپ کے منہ موڑ لینے کے دو سال بعد ہماری ماں جو عرصے سے بیمار تھیں چل بسیں۔ وہ میرے ہاتھ پیلے کرنے کی تمنا دل میں لے کر دنیا سے سدھاری تھیں۔

باپ کی موت کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری دیدی پر آ پڑی تھی، جسے انہوں نے بحسن و خوبی نبھایا بھی۔ میں اپنے شعور و فہم کے مطابق سوچتی کہ اگر دیدی دوبارہ کہیں بیاہی جاتیں تو ہمارا گھر کیسے چلتا؟ دوسرے لفظوں میں ان کے اس عمل سے میں خوش ہی تھی۔ پھر ماں کے گزرنے کے بعد میری پرورش، تربیت اور نگہداشت کا بھاری بوجھ بھی ان کے کاندھوں پر آ گیا تھا۔ گویا اب میرے لئے وہی ماں تھیں، وہی باپ۔ غالباً میری ہی وجہ سے انہوں نے دوسری شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ کئی اچھے پیام بھی آئے تھے، لیکن ہر پیش کش کو انہوں نے اس طرح ٹھکرا دیا تھا جیسے کسی بااختیار وزیر کو گداگر کی پیش کش کردی جائے۔

میں ڈیڈی کی نگرانی میں پرورش پانے
ہے ساری کی ساری ان ہی کے رنگ
ں گئی تھی۔ وہی خودداری، وہی انا پرستی،
یکھ رکھاؤ، وہی وضع داری اور وہی خوبو،
ے خمیر میں گندھ گئے تھے۔ جن سے ان کی
یت عبارت تھی۔ ڈیڈی کی طرح میں بھی محتاط اور
دور اندیش ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے انہوں
اعلیٰ تعلیم دلا کر ایک امریکن مانٹیسری اسکول
ملازمت دلانے میں بڑی مدد کی تھی۔ ان کا
ن تھا کہ موجودہ دور میں ہر باشعور لڑکی کو اپنے
دل پر کھڑے ہونے کے لائق ہونا چاہیے۔ وہ
ف روٹی روزی کے لئے شادی کے خواب نہ
یکھے جن کی تعبیریں غیر متوقع ہوتی ہیں۔

اپنے والدین کی اولاد ہم دو بہنیں ہی ہیں۔
ہی وجہ تھی کہ ڈیڈی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکی تھیں۔
ور طلاق کے بعد انہیں کسی کا دست نگر نہیں
بننا پڑا تھا۔ بلکہ میری کفالت بھی انہوں نے ہی
کی تھی۔ میں چونکہ ڈیڈی سے زیادہ خوب صورت
اور پرکشش ہوں، اس لئے میری حفاظت
کی فکر انہیں ہمیشہ بے چین کئے رکھتی تھی۔
کئی بار انہوں نے باتوں باتوں میں کہا بھی تھا کہ
زمانے کی بری نظر سے مجھے بچائے رکھنے کی
بھاری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ان کے لئے
مشکل ترین کام ہوتا جا رہا ہے، جب کہ میرے
لئے یہ کام قطعی مشکل نہ تھا، یا پھر مجھے اس کا
احساس ہی نہیں تھا۔

ایک دن ڈیڈی نے مجھے بتایا کہ میرے
لئے انہوں نے ایک وجیہہ صحت مند اور
بانکا نوجوان ڈھونڈھ لیا ہے۔ ان ہی کے
کالج کا ایک لیکچرار تھا۔ اس کا نام شکیل
تھا۔ شکیل سے میری کئی بار ڈیڈی کی موجودگی
میں ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ وہ تنک مزاج ہونے
کے باوجود بڑا شاندار نوجوان تھا۔ اسے شوہر
بنانے کے خیال سے میرے من میں پھلجھڑیاں سی
چھوٹنے لگی تھیں۔

"ڈیڈی، آپ مجھے اپنی محبت سے
محروم کر دینا چاہتی ہیں؟" میں نے رسماً یا اخلاقاً
کہا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے، بلکہ میں شکیل کو
بھی اپنی محبت کا حصہ دار بنانے کی خواہشمند
ہوں۔" انہوں نے اپنے ہونٹوں پر دل نواز
مسکراہٹ سجا کر بتایا تھا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔" میں نے

"ٹھیک ہے مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دو۔ اگر وہ ضدی مرد معافی نہیں مانگتا تو پھر تمہارے فیصلے پر غور کیا جائے گا۔"

حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"مطلب بالکل واضح ہے۔ شکیل
اور تم یہیں اسی گھر میں میرے پاس رہو گے۔
تمہارے سوا میرا اس دنیا میں اور ہے کون؟"
ان کے لہجے میں اپنائیت اور محبت کی مٹھاس
تھی۔

"تو پھر آپ کی جیسی مرضی!" میں نے
شرم سے نگاہیں جھکا کر رضامندی کا اظہار
کر دیا تھا۔

میری شادی کے بعد واقعی ڈیڈی
نے ثابت کر دیا کہ وہ جتنا مجھے چاہتی ہیں اتنا
ہی پیار شکیل پر بھی نچھاور کرتی ہیں۔ ایک طرف
وہ میری شفیق، ہمدرد ڈیڈی ہیں تو دوسری طرف
شکیل کی پُروقار ساس بھی۔

شکیل کے ساتھ میری زندگی میں
بہارِ بے خزاں کا موسم آگیا تھا۔ میں اپنے ماں
باپ کے غم اور جدائی کے کرب کو یکسر
بھلا بیٹھی تھی۔ ڈیڈی کی زندگی میں آئے ہوئے
طوفان کی یادیں بھی میرے ذہن سے محو سی ہو گئی
تھیں۔ میرے اندر تبدیلیاں لانے کی
ذمہ دار ڈیڈی خود بھی تھیں، کیوں کہ انہوں نے
مجھے شکیل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت
تنہائی میں گزارنے کے مواقع فراہم کئے تھے۔

وہ بہت کم ہمارے کمرے میں آتی تھیں۔ صرف
انہیں ہماری ضروریات اور دکھ سکھ کا خیال رہتا
تھا۔ اس طرح ہم تینوں کی ہی زندگی بے انتہا
خوش گوار گزر رہی تھی۔ مگر شادی کے چند ماہ بعد
ہی حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ ایک معمولی
بات، بالکل معمولی سی بات خودداری اور انا کے
تصادم سے غیر معمولی ہوتی چلی گئی۔ "وہ اپنی خو نہ
چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں!" کے
مصداق شکیل اور میں دونوں ہی اپنی اپنی ضد
پر اڑ گئے تھے۔ بات بڑھی۔ شکیل کو یہ زعم تھا
کہ وہ مجھ سے زیادہ کماتا ہے اور مجھے یہ طنطنہ تھا
کہ میں اس کے بل بوتے پر زندگی نہیں گزار رہی
ہوں، اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔ اس زعم اور
طنطنہ نے ہماری تعلقات میں رنجش چنگاریوں
کے لئے تیل کا کام کیا۔ چنگاریاں شعلوں
کی طرح بھڑک اٹھیں۔ تعلقات نے آتش فشاں
کا روپ دھار کر ہماری ازدواجی زندگی کو اپنی
لپیٹ میں لے لیا۔ بہت دن تک ہمارے تعلقات

کا علم دیدی کو نہیں ہوا کیوں کہ اس
۔ کرنے کے لئے دونوں میں سے
تھا۔ دیدی کی بے لوث قربانی محبت
جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا الزام
ی اپنے سر لینے پر آمادہ نہیں تھا۔
دن ہمارے تعلقات میں تلخیاں
رچا تا۔ ہر رات کمرے میں دو نفوس
کے باوجود شبِ تنہائی کی طرح گزرتی۔
کا سارا روپ دھارتا اور یوں ہم اور
ب دوسرے سے بے گانہ لاتعلق
ہوتے چلے گئے۔ پھر زندگی میں وہ
جب شکیل کے گھر آنے سے
لنے لگے۔ اس نے مجھ میں میری
دلچسپی لینی تقریباً ختم کر دی۔ میں دیدی
ایک خودکار مشین بن کر رہ گئی۔
تے تو کھانا میز پر لگا دیتی۔ وہ چپ
کھاتے اور ایک لفظ بھی زبان سے
اپنے بستر پر منہ ڈھانپ کر
نے۔ صبح کو نہا دھو کر روبوٹ کی طرح
تے اور دیدی کے ساتھ کالج چلے جاتے۔
بھی دیدی کے جذبات کا احترام کرنے
خارجی زندگی میں تعلقات کی کشیدگی
نے دیا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک
ایسا موقع آتا بھی کہ ہم دونوں کا ایک
سے بات کرنا ضروری ہوتا تو شکیل
بہانے سے باہر چلے جاتے اور اس
تے جب موقع نکل جاتا ہم دونوں
دی کے سامنے کبھی کبھار ہی آتے
تے تھے تو کبھی انہیں یہ احساس نہ ہونے
ہماری زندگی میں زبردست انقلاب
۔

میں ایک نوجوان لڑکی اس عذاب کو
یوں چپ چاپ کب تک برداشت کرتی؟
آخر ایک دن جب شکیل کہیں باہر گئے ہوئے
تھے، اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور
دیدی کے زانو پر سر رکھ کر شیر خوار بچی کی طرح
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "دیدی، مجھے
میری زندگی کے جہنم سے بچا لیجئے۔ میں شکیل
کے ساتھ رہنے کا ناٹک اب اور نہیں رچا سکتی
انہوں نے میری توہین کی ہے، میری انا کو ٹھیس
پہنچائی ہے، میرے جذبات و احساسات
کا خون کیا ہے، مجھے ایک کمزور انسان سمجھ کر
اپنی برتری مسلط کرنے کی کوشش کی ہے، مجھے

شکیل کے ساتھ جلدی زندگی میں بہارِ بے خزاں کا موسم آگیا تھا۔ میں اپنے ماں باپ کے غم اور جدائی کے کرب کو یکسر بھلا بیٹھی تھی۔ دیدی کی زندگی میں آئے ہوئے طوفان کی یادیں بھی میرے ذہن سے محو ہو گئی تھیں۔

حقیر سمجھا ہے ۔۔۔"
میری داستانِ غم سن کر دیدی نے
مجھے دلاسا دیا اور اس تغیر کا اصل سبب
معلوم کیا تو میں انہیں کوئی معقول وجہ بتانے
سے قاصر رہی۔ آخر انہوں نے ماں کا کردار ادا کرتے
ہوئے کہا "میری پیاری ثمینہ، شوہر بیوی کے
تعلقات ایسی ڈور نہیں جسے ایک اشارے
میں توڑا جا سکے۔ تم سچ سچ بتاؤ کہ واقعی شکیل
کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہو یا ۔۔۔؟"
"چاہتی تو ہوں، مگر اس شرط پر کہ وہ
اپنے قصور کی مجھ سے معافی مانگیں۔" میں نے
سچی بات بتا دی۔
"اگر اس نے معافی نہ مانگی؟"
دیدی نے پوچھا۔
"تو میں اس کے ساتھ رہنا پسند نہ
کروں گی۔" میرا دوٹوک جواب تھا۔
"تمہارا یہ قطعی فیصلہ ہے؟" یہ دیدی
کا چبھتا ہوا سوال تھا۔
"جی ہاں۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ
بھی تو نہیں ہے۔" میں نے بے بسی کا اظہار کیا
"ٹھیک ہے۔ مجھے سوچنے کے لئے
کچھ وقت دو۔ اگر وہ ضد پر مُصر رہا، معافی نہیں
مانگتا تو پھر تمہارے فیصلے پر غور کیا جائے گا۔
جب باہمی تعلقات میں کشیدگی کا زہر گھل جائے
تو ازدواجی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ مجھے
اس تلخ حقیقت کا بخوبی اندازہ ہے۔ میں
تمہاری غیر موجودگی میں شکیل سے اپنے طور پر
بات کروں گی کہ آخر اس نے میری بھولی بہن
پر ظلم کیوں ڈھایا ہے۔ تم فکر نہ کرو، ثمینہ۔ جلد
ہی ہم کسی قطعی اور اٹل فیصلے پر پہنچیں گے تب
اس مردک کی عقل ٹھیک ہو گی۔ جیسے میں
پہلے بھی ایک اکڑ فوں کی عقل ٹھیک کر چکی ہوں۔
میں بھی آخر تجربہ کار عورت ہوں۔ ان مردوں کی
نفسیات کو خوب پہچانتی ہوں" کہتے کہتے دیدی
کا پارہ چڑھنے لگا۔ خلافِ توقع وہ میرے
اوپر برسنے کے بجائے شکیل کو ہی اپنے غصے
اور نفرت کا نشانہ بنانے لگی تھیں۔ ان کے اس
رویّے سے میری انا کو بڑی تسکین اور تقویت ملی
تھی۔ لیکن ایک دبی ہوئی چنگاری، ایک خلش
نے تیزی سے کروٹ لی۔ ایک دبے ہوئے۔
انا کے بوجھ تلے، دبے ہوئے احساس میں
حرارت پیدا ہوئی ۔۔۔ کہ شکیل سے جدائی

برلن (جرمنی) کی ایک نرس
مِنّا براؤن
کو نیند کی گولیاں زیادہ کھالینے
کے سبب مُردہ قرار دے دیا گیا اور
خودکشی کے معاملوں میں مشہور رسم
کے مطابق اسے ایک کھلی قبر میں دفنا دیا گیا
دوسرے دن لاش کی پہچان کے لیے جب
تابوت کے کیل لگے ڈھکن کو کھولا گیا تو وہ
اس میں زندہ پائی گئی۔

کے بعد طویل زندگی کا راستہ تنہا کیسے طے کروں گی؟ کر بھی سکوں گی یا نہیں؟ کیا مجھ میں بھی ڈیڈی جیسی قوتِ برداشت ہے؟ کیا میں ان کی طرح قربانی پیش کرنے کی سکت رکھتی ہوں؟ کیا میں ایک ذرا سی بات کے لئے زندگی کا سُکھ چین تج سکتی ہوں؟ کیا میں اپنے حُسن اپنے شباب کی حفاظت شکیل کے بغیر بے فکری سے کر سکتی ہوں؟ کیا میرا حُسن شکیل کے والہانہ عشق کے بغیر بامعنی رہ سکتا ہے؟ شوہر کے پیار کا چسکا کیا زندگی بھر میرا اچھا نہیں کرے گا؟ کیا ماں بننے کی تمنا کا خون کرنا ممکن ہے؟ کیا لمبی لمبائی دنیا کو اجاڑ کر سکھ چین کا میسر آنا ممکن ہو سکے گا؟ ان ہی خیالات میں غلطاں کئی دن اُداسیوں، اُمیدوں، محرومیوں کے ہجوم میں قیامت کی طرح گزر گئے، لیکن نہ شکیل جھکے اور نہ میں نے معافی کے لئے پہل کی۔ معافی کے لئے پہل کرنے کا مطلب ہوتا ہمیشہ کے لئے شوہر کی نظر میں غیر اہم ہستی بن کر رہ جانا، جو میری خودداری اور انا کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

ڈیڈی کی اطلاع کے مطابق شکیل بھی اپنی انا کے غلام تھے۔ میری معافی ان کی ساری شکایات اور گلوں کا سدِباب کرنے کے لئے کافی تھی۔ وہ مردِ آہن ہونے کے دعوے دار ہونے کی وجہ سے ٹوٹنے کو، جھکنے کو تیار نہ تھے۔ معاملہ معافی اور علیحدگی کے درمیان اٹکا ہوا تھا اور اسی طرح کئی دن تک اٹکا رہا۔

رمضان کا مہینہ الوداعی دَور سے گزر رہا تھا۔ عید کا مبارک دن لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جا رہا تھا۔ میری پریشانی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اضطراب اور فکرمندی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈیڈی نے اپنی بے لبی صاف الفاظ میں واضح کر دی تھی کہ "ثمینہ، میں تم سے اور شکیل سے یکساں محبت کرتی ہوں۔ تم میرا جتنا احترام کرتی ہو، اتنا ہی احترام شکیل بھی میرا ساتھی لیکچرار ہونے کے باوجود کرتا ہے اور یہ اس کی شرافت کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ بھی اپنی ہٹ سے ہٹنے کو تیار نہیں۔ وہ کسی بھی حالت میں معافی مانگ کر بیوی کی نظر میں خود کو ہمیشہ کے لئے ذلیل نہیں کرنا چاہتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ تم ایک بار اور ٹھنڈے دل سے غور کر لو، پھر جیسا کہو گی اقدام کر لیں گے۔"

گویا ڈیڈی نے مجھے خلا میں لٹکا کر تنہا چھوڑ دیا تھا۔

آنے والا کل عید الفطر کا دن تھا
لیکن میرے لئے زندگی کا تباہ کن فیصلہ کرنے
کا لمحہ۔

"میڈم، آپ کا لیٹر" چپراسی نے ایک
خوب صورت خط میری جانب بڑھایا تو میں
خیالوں سے چونک کر چپراسی کو ہونق کی طرح
گھورنے لگی۔ وہ غالباً میری حالت کو بھانپ
مُسکراتا ہوا چلا گیا۔ میں نے مشکوک و شبہات
کے ہجوم میں گھِر کر لفافہ چاک کیا تو اس کے
اندر سے 'عید مبارک' کا کارڈ نمودار ہوا۔ کارڈ
انتہائی خوش خط الفاظ میں یہ عبارت درج

صرف میری ثمینہ — عید مبارک۔

عید کا دن آپہنچا ہے — ٹو
رشتے ناطے جوڑنے کا دن۔
خدا کے لئے سارے گلے شکوے
بھُول کر آؤ، پھر زندگی کی راہ میں پھُول بکھیر
عید کے پُرمسرت موقع پر اپنے پیاروں سے
معذرت طلب کرنا بھی فخر و انبساط کی بات
لہٰذا مجھے معاف کر کے میری رُوح میں سما جا

عید کا دن ہے گلے آج تو مِل لے ظالم
رسمِ دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے

برقتِ ملاقات اس خط کا ذکر کرنے کا مطلب
ہوگا میرے ظرف کا مذاق۔

صرف تمہاری زندگی کا ہم سفر
شکیل

خط پڑھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میں
کسی بڑے جُرم کا ارتکاب کیا ہو۔ میں سو
لگی کاش! میں ہی پہل کر لیتی تو میری ا
کی بجائے میری عزّت و عظمت میں اضافہ
ہوتا، جس طرح شکیل مجھے دنیا کی عظم

دلہن:
گیلکنک (یوگوسلاویہ)
میں ایک منگیتر
بن جانے کے بعد شادی
کے دن تک اپنے شوہر کو نہیں
دیکھ سکتی البتہ اس کی پہلی جھلک وہ
اپنی شادی کی انگوٹھی میں سے دیکھتی
ہے

ـف میں نظر آرہا ہے خیر، مگر
ـکے قدموں پر سر رکھ کر اپنی
ـ دھرمی کے لئے معافی مانگوں گی
ـری ہی تھی کہ میں نے ذرا سی بات کا
ـ معاملے کو خطرناک حد تک الجھا دیا
ـ خاموشی سے اپنی غلطی تسلیم کر لیتی
ـون سی گھٹ جاتی؟ میں ہی اتنی
ـ قصوروار ہوں، اپنے شوہر کی
ـ"

ـھے معاف کر دو، شکیل" میں نے
ـ پہنچتے ہی معذرت چاہی تو شکیل
ـسے تکتا رہ گیا۔
ـکا ہے کی معافی؟"
ـس اب خدارا مجھ سے سوال نہ
ـی غلطی کو معاف کر دیجئے۔ میں
ـرمندہ ہوں کہ آپ کو اتنے دنوں تک
ـب مبتلا رکھا۔ آپ کی زندگی اجیرن
ـ کر دی تھی میں نے۔" میری آنکھوں
ـت کے آنسو امڈ آئے۔
ـتنی ذرا سی بات کے لئے معافی کی
ـت ہے؟ میں خود شرمندہ ہوں
ـرانب کے چکر میں تمہیں جلاتا جھلساتا
ـ شکیل کے الفاظ مجھے عجیب سے

ـ"تم بہت عظیم ہو شکیل بس ایک بار
ـہاں میں نے تمہیں معاف کیا۔" میں ان
ـنے سے لگنے کے لئے بے قرار تھی۔
ـ"چلو معاف کر دیا لیکن ایک شرط
ـندہ ذرا ذرا سی باتوں کو بتنگڑ بنا کر
ـے سمندر میں اوندھے منہ نہیں گراؤ گی۔"

ان کے الفاظ میرے کانوں میں شہد کی طرح
ٹپکے۔
"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے، میرے
شکیل۔"
یہ جواب سنتے ہی شکیل نے بے اختیار
ہو کر مجھے اپنی مضبوط باہوں میں بھر کر اپنے
سینے سے لگا لیا۔ میری بے قرار آنکھوں سے
آنسوؤں کا ایسا سیلاب بہا کہ ساری کدورت
دھل دھل کر آنکھوں کی راہ بہہ گئی۔ دل پھول
کی طرح ہلکا ہو گیا اور مجھے ایسا لگا کہ عید
کل نہیں آج ہے۔ اس درمیان دیدی نے مجھے
اپنے کمرے سے پکارا جن سے ملے بغیر میں
سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔
"تمنیہ! کیا بات ہے؟ آج خوش
بھی بہت نظر آرہی ہو؟ مگر آنکھیں آنسو
بہانے کی چغلی بھی کھا رہی ہیں؟" دیدی نے
مسکرا کر میرے دل کا چور پکڑ لیا۔
"وہ ــــ وہ ــــ" میں ہکلا گئی
تو میرے دل کی بات انہوں نے اچک لی۔
بولیں "یہی ناکہ آج تمہاری اور شکیل کی صلح
ہو گئی ہے۔"
"آپ کو کیسے پتہ چلا؟" میں حیرت
سے ان کا منہ تکنے لگی۔
"شکیل کا کوئی خط ملا تھا تمہیں
آج یا کل؟"
میں اور بھی حیرت زدہ ہو گئی۔ "آج
ہی ملا ہے۔ لیکن کیا یہ سب آپ کے علم
میں ہے؟" میں نے بدستور حیرانی سے
پوچھا۔
"ہاں، لیکن یہ بتاؤ پہلے، کہ سارے
گلے شکوے بھی دور ہو چکے ہیں؟"
"جی ہاں دیدی۔ اب ہمیں کسی سے
کوئی گلہ نہیں ہے۔ ان کا دل تو پہلے ہی صاف
تھا۔" میں نے خوش ہو کر بتایا۔
"تو سنو میری بنو۔ کیا خط میں شکیل
کے قلم کا بھی کچھ لکھا ہوا تھا؟" انہوں نے
عجیب سا سوال کیا۔
"نہیں تو۔ وہ تو کسی ماہر خطاطی کی تحریر
لگتی ہے۔" میں نے بتایا۔
"تو میری بھولی بھالی بہن، تم نے کیسے
یقین کر لیا کہ وہ خط شکیل کا لکھا ہے؟"
واقعی غور طلب بات تھی۔
"ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن میں جذبات
کی رو میں یہ سب سوچنے سمجھنے کے قابل ہی

کب تھی۔ تو کیا وہ خط شکیل نے نہیں بھیجا تھا، میری حیرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

"ہاں، وہ خط شکیل نے نہیں، میں نے ایک خطاط سے لکھوا کر بھیجا تھا۔ تاکہ تم تباہی کے اس دہانے سے ہٹ کر اپنی خوشگوار زندگی کی طرف آجاؤ۔ جس پر میں کھڑی اپنے مستقبل سے خوف زدہ ہوں۔ میری پیاری بہن، میں پہلی بار سچائی اگلنے پر مجبور ہوں کہ میں نے اپنے شوہر سے خودداری اور انا کے فریب میں آ کر علیحدگی اختیار کر لی تھی، لیکن اس کی قیمت میں آج تک ادا کر رہی ہوں۔ اگر تم دونوں میرے پاس نہ ہوتے تو میں اب تک گھل گھل کر مر بھی چکی ہوتی۔ طلاق والے دن سے ہی میرے دل کو ایک پل کے لئے بھی سکون میسر نہیں آیا ہے۔ میں ہر لمحہ خود کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہوں۔ میری ہر رات انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزرتی ہے۔ جوانی بیت جانے کے بعد بڑھاپے کا کوئی بھی سہارا مجھے نظر نہیں آتا۔ تم اور شکیل مجھ سے واقعی بہت محبت کرتے ہو، لیکن حالات کا اونٹ کروٹ بھی تو بدل سکتا ہے۔ خدانخواستہ تم دونوں کا سہارا مجھے نہ مل سکا تو ذرا سوچو میں کہاں جاؤں گی؟ میں دوسری شادی بھی کر سکتی تھی، لیکن ماں کا اور تمہارا خیال کون رکھتا؟ تمہاری خوشیوں، سکھ چین اور کامیابی کی خاطر شادی نہ کرنے کا فیصلہ ہی میرے لئے بہتر تھا۔"

پھر انہوں نے اپنی نم آنکھیں خشک کر کے کہا۔ "اب تم بھی اسی راستے پر چلنے کی غلطی کر رہی تھیں۔ میں بھلا ایسا کیوں کر ہونے دیتی۔ شکیل بہت اچھا انسان ہے۔ میں نے اسے قریب سے دیکھا پرکھا ہے۔ مرد کی خودداری اور انا کا لالچ عورت، یعنی اس کی بیوی کے لئے مضر نہیں، بلکہ مفید ہی ہوتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں برسر روزگار لڑکیوں کے سوچنے کا انداز بڑا بھیانک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ دو پیسے کما کر اپنے شوہروں کو حقیر سمجھنے لگتی ہیں۔ ثمینہ، تم یہ غلطی بھولے سے بھی نہ کرنا۔ میری مثال سامنے رکھ کر زندگی گزارو۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔"

یہ کہتے کہتے دیدی کا دل بھر آیا اور وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ میں بھی دل پر قابو نہ رکھ سکی اور ان کے ساتھ ساتھ رونے لگی، جب کہ میں کہنا چاہتی تھی کہ دیدی آئندہ کبھی نادانی کا ثبوت نہیں دوں گی اور ہم دونوں تاحیات آپ کا سہارا بن کر جئیں گے۔ (

خاتونِ اوّل

جس کا ایک بن مانس کے ذریعہ اغوا کیا گیا، فرانس کے صدر کی شریک حیات اوام ریمانڈ پائن کیئر ۱۹۱۴ میں جب پیرس کے ایلیسی پیلیس کے باغیچہ میں بیٹھی ہوئی تھیں تو ایک بن مانس (اورنگوٹان) جو قریب ہی کے ایک پنجرے سے بھاگ نکلا تھا کے ذریعہ ان کا اغوا کر لیا گیا اور وہ انہیں ایک اونچے پیڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر لے گیا اور وہاں کئی گھنٹے تک اپنے قبضہ میں رکھا۔ اس بن مانس کے جا وا میں رہنے والے ایک اسسٹنٹ کے ذریعہ انہیں بغیر کسی نقصان کے چھڑوایا گیا۔ لیکن اس واقعہ کو ۴۰ برس سے زائد عرصہ تک چھپائے رکھا گیا۔

پیاس

کیفی اعظمی

تُو ہمہ رنگ ہمہ نُور ہمہ سوز و گداز
بزمِ مہتاب سے آنے کی ضرورت کیا تھی
تُو جہاں تھی اُسی جنت میں نکھرتا تیرا رُوپ
اِس جہنم کو بسانے کی ضرورت کیا تھی
یہ خد و خال یہ خوابوں سے تراشا ہوا جسم
اور دل جس پہ خد و خال کی نرمی بھی نثار
خار ہی خار، شرارے ہی شرارے ہیں یہاں
اور تھم تھم کے اٹھا پاؤں بہاروں کی بہار
تشنگی زہر بھی پی جاتی ہے امرت کی طرح
جانے کس جام پہ اُٹھ جائے نگاہِ معصوم
ڈوبتے دیکھا ہے جن آنکھوں میں مے خانہ بھی
پیاس اُن آنکھوں کی بجھے یا نہ بجھے کیا معلوم
تُو فقط جسم نہیں شبد بھی ہے گیت بھی ہے
کون اشکوں کی گھنی چھاؤں میں گائے گا تجھے
تجھ سے ایک درد کا رشتہ بھی ہے بس پیار نہیں
اپنے آنچل پہ مجھے اشک بہا لینے دے

تُو جہاں جاتی ہے جا، روکنے والا میں کون
رستے رستے میں مگر شمع جلا لینے دے

دو آنکھیں

جب بھی چوم لیتا ہوں اُن حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیروں میں جھلملانے لگتے ہیں
پھول کیا شگوفے کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سب رہِ عقیدت میں سر جھکانے لگتے ہیں
پھول کھِلنے لگتے ہیں اُجڑے اُجڑے گلشن میں
پیاسی پیاسی دھرتی پر ابر چھانے لگتا ہے
لمحہ بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحہ بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

کشیدہ کاری
شیشے کا کام

محمد جمیل
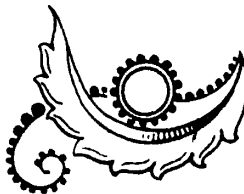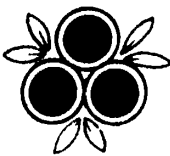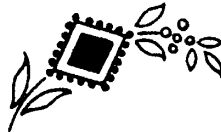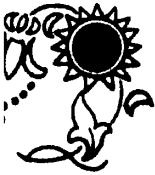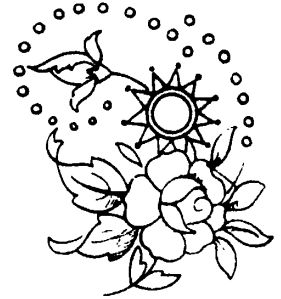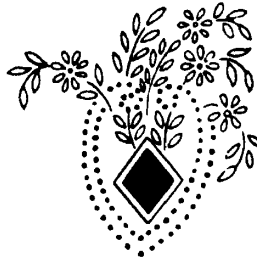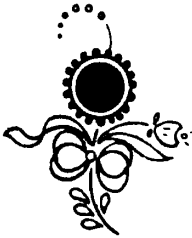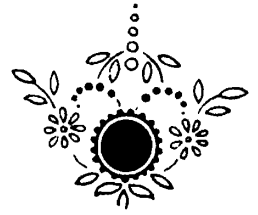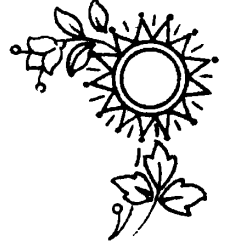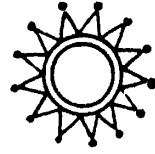
ہندوستانی سائنس داں عورتیں

پچھلے سال ہندوستان کی تیسری قطب جنوبی مہم میں دو سائنس داں
ں ڈاکٹر سدیتیا سین گپتا اور کماری ادیتی پنت بھی شامل تھیں۔
ہندوستان کی خاتون سائنس داں کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی کامیابی
۔ دونوں سائنس داں عورتیں گزشتہ سال قطب جنوبی کی مہم کی ذمہ داریوں کو
ابی کے ساتھ پورا کرکے واپس آئی ہیں۔

ڈاکٹر سدیتیا کی پیدائش کلکتہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ارضی سائنس میں
ایس کرنے کے فوراً بعد جیالوجیکل سروے (تنظیم برائے ارضیاتی جائزہ) میں
یقی کام شروع کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری جادوپور یونی ورسٹی سے حاصل
۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر سدیتیا کو رائل کمیشن لندن کی طرف سے وہ اہمیت آمیز وظیفہ
یق کے لئے دیا جاتا ہے ملا۔ اس سے قبل یہ وظیفہ ملک کے مشہور سائنس داں
ر بھابھا کو جنھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے، ملا تھا۔ اس طرح ڈاکٹر
یتیا کو تین برس تک لندن کے امپیریل کالج میں تحقیق کرنے کا موقعہ حاصل ہوا
کے بعد دو سال تک انھوں نے سویڈن میں بھی سائنسی تحقیق کی۔ وطن
ں آنے پر آپ جادوپور یونی ورسٹی میں لکچرار ہو گئیں۔

قطب جنوبی سے واپسی پر انٹرویو اور دوسرے بیانات کے دوران
ٹر سدیتیا نے جن باتوں کا اظہار کیا ہے۔ ان کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ
گا۔ جس چیز نے وہاں پہنچنے پر ان سب سے زیادہ اپنی جانب متوجہ کیا، وہ
اں کے خوب صورت مناظر تھے اوپر نیلا آسمان تھا، اور نیچے زمین کی سطح
اف شفاف برف سے گھری ہوئی تھی، دور تک پتیوں کی آواز تک سنائی
یں دیتی تھی۔ اس وقت ایسا احساس ہوتا تھا جیسے ہم اس سرزمین پر نہ ہوں
کسی اور دنیا میں پہنچ گئے ہوں، وہاں ڈاکٹر سدیتیا کا خاص کام ۲۵ مربع
لومیٹر پہاڑی علاقے کا ارضیاتی تحقیقی جائزہ لینا تھا۔ جہاں بسیہ جستہ
ور تانبے کے معدنیاتی ذخائر بکھرے پڑے ہیں۔ یہ بہار کے علاقے سے ملتا جلتا
ہے۔ وہاں کی چٹانیں بھی بناوٹ میں بہار کی چٹانوں سے ملتی جلتی ہیں اس طرح
ونڈوانہ لینڈ کا نظریہ ثابت ہو جاتا ہے۔ جو یہ بتاتا ہے کہ انٹارکٹیکا اور ہندوستان
بھی آپس میں جڑے ہوئے تھے۔

اس پہاڑی علاقے کے تحقیقی جائزے کے دوران ڈاکٹر سدیتیا نے
مختلف چٹانوں کے ٹکڑوں کو جمع کیا ہے جن پر بعد میں تحقیق کی جائے گی۔ وہاں
تحقیق کے لئے ان کے پاس کلائینومیٹر کمپاس (جس سے چٹانوں کی حالت کا اندازہ
کیا جاتا ہے۔ اور ہتھوڑا تھا جس کے ذریعہ مختلف قسم کی چٹانوں کو توڑ کر چھوٹے
ٹکڑے حاصل کئے جاتے ہیں) ڈاکٹر صاحبہ صبح کو ۹ بجے تک تحقیقی کام کے لئے نکل
پڑتی تھیں اور کبھی کبھی کام سے واپسی بارہ بجے رات تک ہوتی تھی۔ شاید آپ یہ
کہیں کہ رات تو وہاں ہوتی ہی نہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن وہاں گھڑیوں سے یہ
اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ رات کے دس بجے ہیں۔ دن کے نہیں۔ غرض اس طرح
ڈاکٹر سدیتیا کو روزانہ ۱۲ سے ۱۴ گھنٹے تک تحقیقی کاموں میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔
یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر سدیتیا قطب جنوبی کے "دکشن گنگوتری" کے علاقے میں لگائے
ہوئے کیمپ میں تقریباً ۲۵ دن تک تنہا رہیں، یہیں ۵ دن تک ان کے ساتھ
ایک اور خاتون سائنس داں ادتی پنت بھی رہی تھیں۔

اس مہم کے دوران ڈاکٹر سدیتیا خود بھی اپنے لئے کھانا پکاتی
تھیں لیکن زیادہ تر وہ پکاپکایا کھانا کھاتی تھیں، جو بند ڈبوں میں ان کے ساتھ
رہتا تھا۔ عام طور پر وہ صبح کو ۷ بجے اٹھ جاتی تھیں۔ انھیں اس بات کی
خوشی ہے کہ اس مہم کے دوران انھوں نے پورے تحقیقی علاقے کا ارضیاتی نقشہ
تیار کر لیا ہے۔ اسی طرح مختلف سائنسی شعبوں کے سائنسدانوں نے دوسرے
تجربات کئے اور اپنے کام انجام دئے ہیں۔ اس سے قبل سائنس دانوں نے
وہاں اپنی تجربہ گاہ بھی تیار کی تھی۔

اس مہم کے دوران ڈاکٹر سدیتیا کو ایک بھیانک اور خطرناک طوفان

نیزرے پرتگال

کی غیر شادی شدہ لڑکیاں ۱۳ سال کی عمر سے ہی پیٹی کوٹ پہنتی ہیں

کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ان کا کہنا ہے: پچھلے سال ۲۵ فروری کو یہ برفیلا طوفان شروع ہوا تھا اچانک ہوا کی رفتار میں اضافہ ہونے لگا اور ہوا کے ساتھ خشک برف کے ٹکڑے اُڑنے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ سارے لوگ عمارت میں تھے۔ طوفان اس قدر تیز تھا کہ باہر کھڑے رہنا ناممکن تھا۔

قطب جنوبی میں عام طور پر ہوا کی رفتار ۳۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے، جب کہ طوفان کے دوران یہ رفتار ۱۵۰ کلومیٹر فی گھنٹہ ہوگئی تھی لیکن اس طوفان کا یہ فائدہ ہوا کہ ہندوستانی ٹیم میں جو موسمیاتی ماہرین تھے انھوں نے موسم سے متعلق اعداد و شمار جمع کئے۔

پنگوئین نام کے پرندے کے علاوہ قطب جنوبی میں سیل اور اسکوا بھی ڈاکٹر سدیتا کو دکھائی دئے، اسکوا صفائی کرنے والا پرندہ ہے۔ اور بطخ جیسا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سدیتا نے جب ایک پنگوئین کو چھونا چاہا تو وہ اور اس کے ساتھ کا سارا جھنڈ بھاگنے لگا۔ ان پرندوں کی حرکت انسانی حرکت سے مشابہ ہے مثلاً یہ برف پر انسانوں کی طرح چلتے ہیں اور پھسل جاتے ہیں۔ اکثر یہ ایک قطار بنا کر چلتے ہیں، کوئی بھی پنگوئین قطار توڑنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کبھی جھنڈ سے آگے نکل جانے پر پنگوئین اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر بات کرنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی یہ پرندے جوڑوں میں دکھائی دیتے ہیں، پنجوں سے ایک دوسرے کو تھامتے ہوئے یہ انسانوں کی طرح چومتے ہیں۔

ڈاکٹر سدیتا نے جس علاقے کا نقشہ بنایا وہ تقریباً ۲ کلومیٹر لمبا تھا اور ان کا اسٹیشن بیچ میں تھا۔ اس طرح انھیں روزانہ تقریباً دس کلومیٹر چلنا پڑتا تھا۔ روزانہ تحقیقی جائزے کے دوران انھیں آڑی ترچھی اور اونچی نیچی زمین کو ناپنا پڑتا تھا اس طرح سفر میں کلومیٹر سے کہیں زیادہ کا ہوجاتا تھا۔ اور کام کرنے کا وقفہ ۱۲ سے ۱۴ گھنٹے تک ہوتا تھا۔ پوری ٹیم کے لئے بنگلور سینٹرل فوڈ ٹریننگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ڈیفینس فوڈ ریسرچ لیبارٹری نے لذیذ کھانے بند ڈبوں میں پیک کرکے دئے تھے۔ جن میں چپاتیاں پراٹھے چاول، دالیں، دوسا، نوڈلز اور حلوا وغیرہ شامل تھا۔ کھانے کو بس ہلکا گرم کی ضرورت ہوتی تھی۔

عام طور پر ہم کے سارے اراکین مل کر کام کرتے تھے، مثلاً پانی لانا، برف توڑنا۔ ڈاکٹر سدیتا مشکلات سامنے آنے پر دوسروں کو مناسب مشورے بھی دیتی تھیں، انھیں تحقیقی جائزے کے دوران طرح طرح کی مشکلات کو حل کرنے کا تجربہ پہلے ہوچکا تھا۔ ان کی جسمانی صحت بھی بہتر تھی، ۲۵ کلو وزن کا پتھر وہ بھی آسانی سے اٹھا لیتی تھیں۔

ہفتے میں ایک یا دو بار ڈاکٹر سدیتا اپنے خاندان کے قریبی لوگوں سے بات کرتی تھیں۔ ان کی ماں چونکہ بہت باہمت خاتون ہیں۔ اس لئے انھیں قطب جنوبی میں اپنی بیٹی کے جانے پر زیادہ تشویش نہ تھی لیکن ان کے باپ ضرور کچھ فکرمند رہتے تھے۔ ڈاکٹر سدیتا کی دو بہنیں ہیں جن میں سے ایک انجینئر ہے اور دوسری کو موسیقی سے لگاؤ ہے ان کی ماں ایک گھریلو خاتون ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے ان کی سب سے زیادہ ہمت افزائی کی جب کہ وہ جانتی تھیں کہ قطب جنوبی کی اس ہم میں کافی خطرے بھی ہیں۔

ڈاکٹر سدیتا کا خیال ہے کہ ملک میں درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر کچھ کرنا ہوگا۔ لیکن کام کہاں سے شروع کرنا چاہئے ابھی تک اس کا تعین وہ نہیں کرسکی۔ تاہم وہ محسوس کرتی ہیں کہ ایک خاتون سائنس داں کی حیثیت سے وہ بہترین خدمات انجام دے کر ہی وہ ملک کے لئے اپنی ذمہ داری پوری کرسکتی ہیں۔ انھوں نے اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کیا ہے۔ کہ اگر انھیں قطب جنوبی جانے کا دوبارہ موقع ملے گا۔ تو وہ ضرور وہاں جانا چاہیں گی۔

قطب جنوبی کی مہم میں ہندوستانی سائنس داں عورتوں کی پیش رفت نے ثابت کردیا ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں کے علاوہ سائنسی تحقیق میں بھی عورتیں گراں قدر خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ اب ہندوستان کی چوتھی ٹیم بھی وہاں کامیابی کے ساتھ پہنچ گئی ہے۔ اس طرح کامیابی کے مزید امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ ■■

اپنی ذہانت کو آزمایئے، اپنی معلومات کا امتحان لیجئے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوان پریشر کوکر حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوئے تو انعام پانے والے کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا
اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔

۱۰-اپریل ۱۹۸۵ تک ہمیں ملنے والے جوابات اس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر ۲۸" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۔ ملکہ ممتاز محل کا اصلی نام کیا تھا؟

۲۔ ۱۸ ویں صدی میں اندور پر مہارانی کا راج تھا۔ اس مہارانی کا نام کیا تھا؟

۳۔ شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا کا مزار کہاں ہے؟

۴۔ عظیم آباد کس شہر کا دوسرا نام ہے؟

۵۔ خلیفہ ہارون رشید کی ملکہ کا نام بتایئے جس نے مکّہ کے قریب ایک نہر بنوائی تھی؟

۶۔ شعری مجموعہ "نقشِ فریادی" کی مصنّف کون ہیں؟

۷۔ مشہور رومانی داستان "شیریں فرہاد" کا تعلق کس ملک سے ہے؟

۸۔ مشہور عالم "کوہِ نور ہیرا" کس ملک میں ہے؟
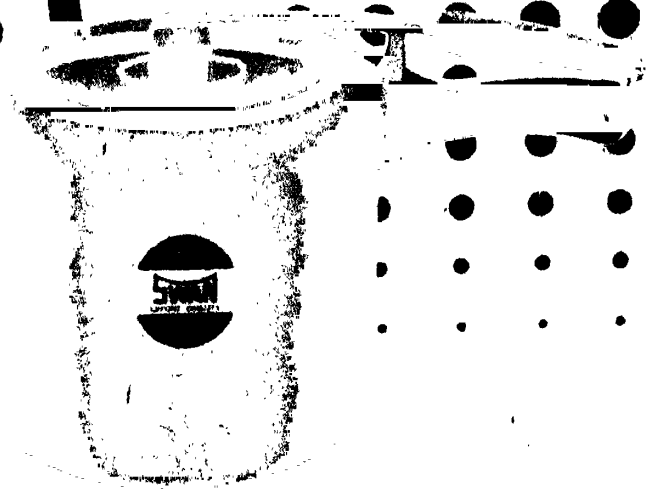
۹۔ پہلا ایٹم بم کس شہر میں گرایا گیا تھا؟

۱۰۔ ہندوستان کا ایک علاقہ "عطر کا شہر" کہلاتا ہے۔ اس کا نام بتایئے؟

ذہنی ورزش نمبر

(۱) ....
(۲) ....
(۳) ....
(۴) ....
(۵) ....
(۶) ....
(۷) ....
(۸) ....
(۹) ....
(۱۰) ....
نام : ....
پتہ : ....

رام پال

یہ ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔
میں اجمیر شریف میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ کے عرس مبارک کے موقع پر عالمی صوفی کانفرنس کے سلسلے میں مدعو تھا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر مذہب وملت کے بزرگوں اور برگزیدہ اصحاب کے دربلا تفریق مذہب وملت، بلا امتیاز نسل و رنگ ہر ایک کے لئے کھلے ہیں۔
میں برہمن ہوں، لیکن مجھے اپنے پیر و مرشد

اور
مہمان خدا
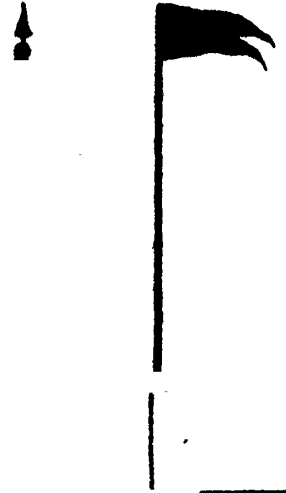
تاریخ کا سب سے فرماں بردار بیٹا۔ مصر اور شام کے حکمران سلطان صلاح الدّین۔

(۱۱۳۸-۱۱۹۳) نے اپنی تمام سلطنت اپنے والد ایوب کو دے دی تھی۔ مگر والد نے اسے قبول نہیں کیا۔

پھر بھی صلاح الدین اپنے والد کو ان کی زندگی کے آخری دن تک روزانہ تخت پر بٹھا کر ان کے سامنے ادب سے جھکتا رہا۔

حضرت بابا شیخ مسعود الدّین فرید شکر گنج رح سے بے پناہ عقیدت ہے۔ وہاں میں نے حضرت خواجہ غریب نواز رح کے در پہ جھولی پھیلائی کہ مجھے اپنے مُرشد حضرت بابا فرید رح کے مزار پر سلام کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ اگر بات دل سے نکلی ہو اور اس میں کسی کا نقصان نہ ہو تو دُعا یقیناً قبول ہوتی ہے۔ اور جب عرش سے عرضی منظور ہوئی تو فرش والوں کی کیا مجال کہ اس میں رد و بدل کریں۔ چنانچہ مجھے اسپیشل ویزا عنایت ہوا۔

مجھ سے کسی نے باتوں باتوں میں یہ سوال کیا کہ "رام پال تم پاکستان کیوں جا رہے ہو؟ تمہارا تو آبائی گاؤں تو ضلع سیالکوٹ میں ہے اور تم ملتان، پاک پتن اور لاہور جانا چاہتے ہو۔ یہ کیوں؟ میں نے ہنس کر کہا کہ "میرے گاؤں میں کوئی درگاہ نہیں جس کی زیارت کر سکوں اور وہ ماضی جسے وقت بھلا چکا ہے، اسے کریدنے سے کیا فائدہ؟ البتہ ملتان میں حضرت بہاؤ الدین ذکریا رح، حضرت رکن الدین الفتح رح، حضرت شمس تبریز رح اور دیگر اولیا کی درگاہیں ہیں۔ پاک پٹن شریف میں میرے مُرشد کا مزار ہے، جہاں میں زندگی میں ایک دفعہ سربسجدہ ہونا چاہتا ہوں۔ لاہور میں حضرت داتا گنج بخش رح اور حضرت میاں میر رح کے مزاروں پر حاضری دینے کی آرزو ہے۔ میرا مقصد زیارت ہے، سیاحت نہیں۔" وہ حیران ہو کر بولا "تو کبھی ہندوستان میں اجمیر شریف ہے، نظام الدین رح کا مزار ہے، مہرولی ہے کلیر شریف ہے اور پھر تم پنڈت ہو۔ کاشی، ایودھیا، ہردوار، رشی کیش، متھرا، بندرابن، تروپتی، جگن ناتھ جی، دوارکا جی اور بہت سے تیرتھ استھان ہیں جہاں تمہیں جانا چاہئے۔" نہ معلوم میرے مونہہ سے کیسے بے ساختہ یہ کلمہ نکلا "میں تو پاکستان فقط یہ دیکھنے کے لئے جا رہا ہوں کہ بھارت کے بھگوان اور پاکستان کے خدا میں کیا فرق ہے۔ اگر واگہ کے اس پار اللہ رکھی کی بہو اتنی ہی تیز طرار ہے جتنی اٹاری کے ادھر رام رکھی کی کل وہو، زبان دراز، یا وہاں بھی فقیر محمد مصیبت پڑنے پر مسجد میں اسی طرح سر جھکاتا ہے جیسے فقیر چند ان حالات میں مندر میں تب تو میرے خیال میں کوئی فرق نہیں۔ باقی حالات مجھے زندگی کے اسباق پڑھا دیں گے۔"

کچھ دن بعد میں لاہور ریلوے اسٹیشن پر تھا۔ ملتان کا ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ گاڑی کا ہر ڈبا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، بالکل اسی طرح جیسے امرتسر یا دہلی میں ہوتا ہے۔ ایک تو میں ویسے ہی عمر رسیدہ۔ دوسرے بھاگم بھاگ میں تھکا ہوا۔ تیسرے لاہور اسٹیشن پر تقریباً ۴۳ برس کے بعد قدم رکھا تھا۔ لہٰذا اپنائیت کے باوجود قدرے اجنبیت تھی۔ میں نے ایک بھرے پُرے ڈبے کے سامنے کھڑے ہو کر فقط اتنا کہا کہ بھائیو، میں ہندوستان سے آیا ہوں اور ہندو برہمن ہوں۔ مگر ملتان فقط درگاہوں پر سلام کرنے جا رہا ہوں۔ میرے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جس میں حضرت بابا فرید رح اور حضرت داتا گنج رح کے لئے چادریں تھیں۔ اور یقین مانیئے، یہ میرے الفاظ نہ تھے گویا "کھل جا سم سم" تھا۔ اور وہ ٹوکری نہ تھی گویا وہ طلسمی انگوٹھی" تھی۔ سب لوگ اُٹھ بیٹھے۔ میرے لئے جگہ بن گئی۔ ایک نوجوان لڑکی (وہ شاید سسرال سے واپس ماں باپ کے پاس جا رہی تھی) نے بڑے ادب سے ایک چادر میرے لئے بچھا دی۔ اپنی صُراحی میں سے پانی نکالا اور پیش کیا۔ یہ پہلا سبق تھا کہ بھگوان اور خدا میں کوئی فرق نہیں۔ اگر کہیں ہے تو خود ہمارا بنایا ہوا۔

تقسیم سے پہلے میرے والد منٹگمری میں سول ہسپتال کے انچارج تھے اور میرا آبائی ضلع گوجرانوالہ سے ملحق تھا۔ میں اس لڑکی کے خدوخال میں اپنی بیٹی کے نقوش دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک رسالہ نکالا میں نے اچٹتی نظر سے رسالے کا نام دیکھا۔ بچی کی آنکھوں میں حیرت کے آثار پیدا ہوئے۔ بولی "تو کیا آپ اردو جانتے ہیں؟" میں نے ہنس کر کہا "فقط جانتا ہی نہیں، اس زبان میں لکھتا بھی ہوں۔"

"اوہ!" اس نے آہستہ سے کہا اور رسا

ے ہاتھ میں تھما دیا۔
میں نے پوچھا "بیٹی تم ساہیوال میں
کہاں ہو؟" بولی "دسہرہ گراؤنڈ کالونی
" اتفاق کی بات، وہ دسہرے کے
ن تھے۔ میں نے سوال کیا "بیٹا، کیا تمہیں
ہے کہ دسہرہ کیا ہوتا ہے" اس نے نفی
سر ہلایا۔ اور تب مجھے نہ معلوم کیسے
العین کے مشہور ناول "آگ کا دریا"
دیباچہ کا یہ فقرہ یاد آیا: "میری بھانجی نے
ہا کہ آنٹی، یہ نسبت کیا ہوتی ہے؟" اور
سوال سے اس آٹھ صد صفحات کے ناول
بنیاد پڑی۔ اب وقت نہ تھا کہ میں اس
کو دسہرہ کے تہوار اور اس کی اہمیت
آگاہ کرتا، کیوں کہ ساہیوال اسٹیشن آچکا
۔ وہ اتری اور مجھے بڑے ادب سے
م کیا۔ میں نے نہایت پیار سے اُسے
شیرباد دیا، اسی طرح جیسے میں جالندھر
وقتِ رخصتی اپنی بچی کو دیتا۔ تب مجھے
اس ہوا کہ بھگوان اور خدا ہر جگہ ایک ہی
۔ یہ بھی تو آخر میری ہی بچی تھی۔ ملک تقسیم
ہوا ہوگا، لیکن بھگوان اور خدا میں تو تفریق
نہ ہو سکی۔

ایک توپ گولہ انسان جو مارا نہیں جا سکا۔

اردن نامی ایک ہندوستانی سادھو جس نے ایک نئی وسیع و عریض توپ کو آشیرواد دینے سے انکار کر کے میسور کے سلطان کو ناراض کر دیا۔ وہ بغیر کسی نقصان کے صاف بچ گیا۔ پہلی بار وہ ۔۔۔ فٹ کی اونچائی تک اُچھال دیا گیا اور ایک ہاتھی پر سے ۔۔۔ مدرسے کے اوپر جا گرا اور دوسری بار بغیر ایک بھی قطرہ ۔۔۔ وہ ایک جھونپڑی کے چھپر پر آ گرا۔

جیسا میں نے عرض کیا، وہ دسہرے
لی کے دن تھے۔ ملتان میں میرے میزبان
صحافی اور اہلِ قلم تھے۔ میں ان کی مہمان نوازی
ے چار برس کے بعد بھی نہیں بھول سکا۔ میں
کے گھر پہنچتے ہی وہاں کا ایک جانا پہچانا فرد
۔ میں بھارت سے پہنچا تھا، اس لئے
منے بچوں کے لئے اعجوبہ تھا۔ لیکن
انہوں نے اپنے ابا، تایا، خالو اور مجھ

میں کوئی فرق نہ پایا تو وہ سرحد کی لکیر کو بھول گئے۔ ان کو میرے میزبان نے شاید میری انا کو تھپکنے کی خاطر بتلایا تھا کہ میں کہانی کار ہوں۔ اس لئے وہ لگے ضد کرنے: "انکل، کہانی سنائیے۔"
اب ادیب کے لئے سب سے مشکل کام بچوں کے لئے کہانی لکھنا ہے، کیوں کہ اسے اس سطح پر سوچنا پڑتا ہے جسے ان کا ننھا ساذہن سمجھ سکے۔ مجھے اور تو کوئی کہانی نہ سوجھی۔ چونکہ رام لیلا کے دن تھے، اس لئے میں نے انہیں سیتا، رام کی کہانی سنانی شروع کر دی۔ وہ شاید آٹھ دس بچے تھے۔ ایک دو نوجوان بھی تھے۔ جو انہیں شرارتوں سے باز رکھنے کے لئے میری حفاظت کے لئے بیٹھے تھے
کہانی کے دوران انہوں نے جب راون کا ذکر آیا تو ننھے منے تالے اور جب رام کا نام لیا تو تالیاں بجائیں۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ بچہ ہر جگہ "رب کا روپ" ہوتا ہے۔ اور رب کا مطلب ہندوستان میں بھگوان اور پاکستان میں خدا ہے۔ اور میری اس بات کی تصدیق میرے میزبان کے نوجوان لڑکے (جو شاید ملتان میں ذکریا یونی ورسٹی کا طالب علم تھا) نے اس طرح کی: "انکل، اگر بھارت اور یہاں کے نصاب میں دونوں مذاہب کے بزرگوں کی سیرت اور تعلیم کو داخل کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سارے سنت مہاتما اور غوث قطب ایک ہی بات کرتے تھے"۔ دوسرے نے جو ذرا بڑا تھا، یہ اضافہ کیا: "رامائن اور مہا بھارت کو پاکستان میں اور قصص الانبیا کو ہندوستان میں ایک لازمی مضمون بنا کر پڑھایا جائے تاکہ ہم کو ایک دوسرے سے واقفیت حاصل ہو۔"
اور پھر میں سوچنے لگا کہ جہاں اونچی سطح پر ایک دوسرے سے "نا جنگ معاہدہ" اور "دوستانہ تعلقات" کی بات چیت جاری ہے وہاں ان معصوموں کی بات بھی سنی جائے تو کتنا اچھا ہو۔ نزدیکی کا مطلب صرف یہ

کہ تجارت میں اضافہ ہو، یا سیاحت میں
سہولت ملے۔ جب تک رُوح تک پیغام
نہیں پہنچے گا، باقی سب کوششیں بے کار
ہوں گی۔ اس تہذیبی فاصلے کا تجربہ مجھے حال ہی
ہی ہوا۔ جب ایک نوجوان قلم کار سے، جو ایک
سرکاری ادارے سے منسلک ہے، محرّم کی
پر ایک فیچر لکھنے کو کہا گیا۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات
وہ لفظ محرّم سے تو واقف تھا، مگر اس سے
آگے اس کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔
اس نے مجھ سے رجوع کیا تو میں نے اسے تفصیلاً
واقعۂ کربلا، شہادت، پانی کی قلّت، یزید کے
سیاہ کارنامے، اور پھر لکھنؤ کے امام باڑے،
انیس اور دبیر کے معرکہ خیز مرثیے، سب کے
بارے میں بتایا۔ آخر میں کہا کہ ایک روایت کے
بموجب رسولِ کریمؐ کے نواسوں کے مٹھی بھر مجاہدوں
میں برہمن بھی تھے، جو بھگوان کے بھگت تھے
اور خداوندِ کریم کے نام لیواؤں کی طرف سے
لڑے اور شہید ہوئے۔ آج بھی انہیں حسینی
برہمنوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سُن کر
اس کی نظروں سے بھگوان اور خدا کا فرق
مٹ گیا، کیونکہ نام میں کیا رکھا ہے؟
طاقت تو وہی ہے، شکتی وہی ہے۔ ہر روح
میں اس کا پرتو ہے۔

تقریباً اسی قسم کا دوسرا واقعہ مجھے
اپنے پاکستانی سفر میں پیش آیا جس روز
مجھے واپس آنا تھا، اس روز ۷ نومبر
۱۹۸۰ کو جمعہ تھا اور دیوالی کا دن تھا۔ لیکن
لاہور شہر میں اس تیوہار کا کسی کو علم نہ تھا۔
میں سامان باندھ رہا تھا اور واپسی کی تیاری
میں مشغول تھا۔ ہوٹل کے بیرے نے تانگے
والے سے میرے بارے میں کہا کہ ان کو بھارت
جانا ہے اور یہ برہمن ہیں۔ تانگے والے کی
عمر شاید ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ نہ معلوم
میرے مُونہہ سے گرد و پیش کو دیکھ کر کیوں
یہ الفاظ نکل گئے کہ آج دیوالی ہے ـــ اور
آج سے ۳۳ برس پہلے آج کے روز لاہور میں
کتنی رونق ہوا کرتی تھی۔ اس میرے ہم عمر
تانگے والے نے میری طرف غور سے
دیکھا۔ تانگہ کھڑا کیا۔ کہیں سے تھوڑی سی مٹھائی
خریدی۔ مجھے پیش کی اور ساتھ ہی دیوالی مبارک
کہا۔ پھر وہ پُرانی یادوں میں کھو گیا۔ بھاٹی
گیٹ سے لاہور جنکشن تک آتے آتے وہ
اُن تیوہاروں کا ہی ذکر کرتا گیا جو تقسیمِ وطن سے
پہلے اس نے اسی لاہور میں اپنے دوستوں

> ۷ نومبر ۱۹۸۰ کو جمعہ کا دن تھا اور دیوالی کا دن تھا۔ لیکن لاہور شہر میں اس تیوہار کا کسی کو علم نہ تھا۔

(جن میں ہندو اور سکھ، سب ہی شامل تھے)
کے ساتھ مل کر منائے تھے۔ ان میں دیوالی،
دسہرہ، جنم اشٹمی، گورو پُرب بھی تھے۔ عید،
شب برات، محرّم اور بڑے صاحب لوگوں والا
بڑا دن یعنی کرسمس بھی تھے۔ پھر اسٹیشن پر اس
نے قلی کو آواز دینے کی بجائے میرا سامان
اُٹھا کر خود پلیٹ فارم پر رکھا۔ اور جب میں
کرایہ دینے لگا تو مُسکرا کر مجھ سے عین پنجابی ڈھنگ
سے بغل گیر ہو کر کہنے لگا "پنڈت جی آپ
ملے، کرایہ مل گیا"۔

میں ملتان سے پہلے پاک پتن گیا۔
وہاں میرے پیر و مُرشد حضرت بابا شیخ فرید
شکر گنج رح کا مزار شریف ہے۔ اور آپ
یقین کریں کہ مجھے پہلے سے اس بات کا قطعی
علم نہ تھا کہ جس دن میں وہاں حاضر ہوا، اس روز
ان کے عرس شریف کا پہلا روز ہوگا۔ گویا میرے
رہبر نے خود ہی اس موقع پر مجھے بلایا تھا۔
ایک شخص نے مجھ سے کہا، "رام پال صاحب،
ویزا اتنی آسانی سے تو نہیں ملا کرتے اور آپ تو
ایک سینیئر پولیس افسر رہ چکے ہیں۔ اُردو
کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ ہندو ہیں اور
پھر براہمن ہیں"۔ میں نے ان کی طرف دیکھا،
مُسکرایا اور مزار کی چوکھٹ پر سر رکھ کے
گنگنایا:

اب یقیناً مری تقدیر بدل جائے گی
ان کو منظور نہ ہوتا تو نہ آنے دیتے

پاک پتن سے میں لاہور گیا اور حضرت
داتا گنج بخش رح کے مزار شریف کے بالکل
نزدیک ایک ہوٹل میں گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی کمرہ
خالی نہیں۔ میں نے ڈیسک کلرک سے کہا۔
"میاں، میں آپ کا مہمان نہیں ہوں میرے
جو میزبان ہیں، ذرا اُن سے پُوچھ آؤں کہ میرا کیا
بندوبست کیا ہے۔ آپ فقط میرے اس
مادی سامان کا دھیان رکھیں"۔ پھر حضرت
داتا گنج بخش کے مزار پر چادر چڑھا کر جب وا
آیا تو وہ ڈیسک کلرک میری طرف حیرت سے
دیکھ کر مُسکرایا اور بولا "صاحب عجیب با
ہے۔ آپ کے جانے کے فوراً بعد ۱۲ نمبر وا
کمرے میں ٹھہرے ہوئے صاحب کا کرا
سے فون آیا کہ فوراً چلے آؤ۔ ابھی ابھی وہ چلے
ہیں۔ آپ کا سامان میں نے بھجوا دیا ہے"۔

در رہا۔ جگہ جانی پہچانی تھی مگر اب وقت
ساتھ بہت کچھ بدل چکا تھا لیکن پھر بھی
اجنبیت میں اپنائیت تھی۔ وہی مقامات،
لیاں، وہی کوچے، وہی سڑکیں، وہی عمارتیں
را بہت بدل تو پل پل میں ہر شخص
ہوتا رہتا ہے۔ برسوں میں تھوڑا بہت
جانا قابلِ قبول تھا۔ لیکن نہ خلوص بدلا
، نہ پیار، نہ اخوت، نہ محبت۔ سب ہی
ان تھے۔ سب کے اندر وہی بھگوان
خدا تھا۔ واگہ کے اُدھر بھی اور اِدھر کے
بھی لوگ ابھی تک اپنے سینوں میں
ول کی گٹھڑی اُٹھائے ہیں پھر
دل نہیں اس طرح ملتے ہیں کہ یقین کرنا پڑتا
کہ بھگوان اور خدا دونوں ایک ہی شے ہیں
ب ہی نور۔ انا الحق، اہم برہم۔

لاہور میں حضرت میاں میرؒ کی درگاہ پر
سلام کیا۔ حضرت میاں میرؒ وہ بزرگ پیر ہیں
ہنوں نے اپنے دستِ مبارک سے امرتسر
ں ہرمندر (دربار) صاحب کا سنگِ بنیاد
کھا۔ میں ان کے مزار کے سامنے بیٹھا تھا۔
یرے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اُٹھے ہوئے
تھے۔ ایک دم میں نے محسوس کیا کہ میری
گود میں کوئی جان دار چیز ٹھمک رہی ہے۔
میں نے آنکھیں کھولیں تو کوئی ایک برس کا
ننھا منا سا بچہ میری ٹھوڑی سے کھیل رہا
تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس کے مسکرانے سے
میں بھی مسکرایا اور ہمارے ساتھ کائنات
بھی۔ اس کی ماں جو میری بیٹی کی ہم عمر تھی، مجھ سے
چند فٹ کے فاصلے پر بڑے خلوص سے
دعا مانگ رہی تھی جب اس نے دعا کے
بعد آنکھیں کھولیں تو نظروں نے بچے کو تلاش
کیا۔ میری گود میں بچے کو دیکھ کر وہ جھجکی۔ بیٹی
رکی اور بولی "چچا ابا، معاف کریں یہ ننھا
اپنے نانا سے بہت مانوس ہے۔ اس نے سمجھا
کہ ...." اور میں نے اس کی بات کاٹ کر
کہا "بیٹی، اس نے ٹھیک ہی سمجھا۔" اور پھر
میں نے مسکرا کر کہا "ایک بات کہوں، بیٹی؟"
وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے مسکرا کر
کہا "میری بچی بھی تمہاری ہم عمر ہے۔ اور اس
کا بھی ایک لڑکا بالکل اس کا ہم عمر ہے۔"
پھر میں نے اس بچی سے نہایت پیار سے
کہا "تم پاکستانی ہو۔" اس نے کہا "جی ہاں۔"
میں نے مزید کہا "اور میں ہندوستانی ہوں۔"

میں ان کے مزار کے سامنے
بیٹھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ دعا کے
لئے اُٹھے ہوئے تھے۔ ایک دم میں نے
محسوس کیا کہ میری گود میں کوئی جان دار چیز
ٹھمک رہی ہے۔

اس نے جواب دیا "میں آپ کے بیٹھنے کے
انداز سے ہی سمجھ گئی تھی۔" میں نے بات آگے
بڑھائی "لیکن ایک کرشمہ سناؤں۔" وہ حیرت
سے تکنے لگی۔ میں نے ہنس کر کہا "بیٹی، میرے
نواسے اور تمہارے بچے دونوں کی شکل ایک
جیسی ہے۔" وہ مسکرائی۔ ماں کی وہ شفقت آمیز
قوس جس کے سامنے مونا لیزا کی مسکراہٹ
مات ہو۔ پھر وہ بولی "چچا ابا، اس ننھے کے
ابا ایران میں ہیں۔ اور وہاں عراق سے جنگ
چھڑ گئی ہے۔ میں دعا مانگنے آئی تھی کہ وہ بخیریت
واپس آئیں۔" میں نے حیران ہو کر کہا "بیٹی،
میرا لڑکا انجینیر ہے اور وہ عراق سے تیل لینے
گیا ہے بحری جہاز سے۔ میں بھی حضرت
یہی مراد مانگ رہا تھا کہ وہ بخیریت واپس
آ جائے۔" تب وہ بڑے تحمل سے بولی "چچا ابا،
یوں کریں، اب پھر آپ اپنے ان دیکھے داماد
کے لئے اور میں اپنے انجانے بھائی کی
سلامتی کے لئے دعا مانگیں۔ انشاء اللہ
قبول ہوگی۔" اور ہم دونوں کا سر خود بخود حضرت
میاں میرؒ کے در پہ جھک گیا۔

میں ہندوستان واپس آ گیا۔ اور
میرا لڑکا پندرہ دن کے اندر بخیر واپس آ گیا۔
اور مجھے یقین کامل ہے کہ ننھا بھی اپنے ابا
کی گود میں بیٹھا ہوگا۔

اس بچی نے بہت کہا کہ "چچا ابا، آج
آپ دوپہر کا کھانا ہمارے ہاں کھائیں۔"
مگر میں نے اسے آشیرواد دے کر کہا "بیٹی
میں تمہاری دعوت ضرور قبول کرتا، مگر میرے
ویزا کی میعاد ختم ہو رہی ہے اور آج مجھے دوپہر
کی گاڑی سے امرتسر پہنچنا ہے۔ کل کو مجھے
جالندھر جانا ہے، جہاں میں آج کل رہتا ہوں"
میں نے بچے کے شہابی گالوں کو چوما، دعائیں
دیں اور باہر کی طرف چلا۔

عین دروازے پر ایک معمر برقعہ
پوش خاتون کھڑی تھیں۔ انہوں نے آہستہ
سے کہا "بھائی جان سنئے۔" میں رُک گیا
اور حیرت بھرے لہجے سے پوچھا "بہن، آپ
نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟" انہوں نے ایک لفافہ
میری طرف سرکاتے ہوئے کہا "جی ہاں، اس
میں حضرت میاں میرؒ کے دربار کا تبرک ہے۔"
پھر چند لمحے رُک کر بولیں "میں ضلع جالندھر
کی رہنے والی تھی۔ اور میری شادی ضلع امرتسر
میں ہوئی تھی۔ اب شاید میں جیتے جی وہاں

ایک نرم و نازک دل والا ظالم بادشاہ
وِدن کا حکمراں ترکش پاشا حافظ علی

(۱۸۱۸ - ۱۷۳۲) اس بات پر فخر کرتا تھا کہ اپنی زندگی کے بیس سالہ دورِ سلطنت میں ہر صبح اپنی سلطنت کے ایک دشمن کو مروا تا آیا ہے یعنی... سے بھی زیادہ لوگوں کو مروا دیا تھا۔ تو پھر بھی ایک پالتو جانور کی موت کے دکھ سے اس کا دل اتنا ٹوٹ گیا کہ وہ اسی غم میں مر گیا۔

تو نہ جا سکوں، آپ دونوں جگہ میری طرف سے یہ تبرک بانٹ دیں۔ میں جسمانی طور پر نہ سہی، حضرت کی دعاؤں سے روحانی طور پر تو اپنے آبائی میکے اور سسرال کے گاؤں میں ایک دفعہ گھوم آؤں گی۔" اور ان کا گلا رقت سے بھر آیا۔ میری بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ میں لاہور میں پہنچ کر بھی اپنے آبائی گاؤں پسرور (ضلع سیالکوٹ) میں نہیں جا سکتا تھا۔ مجبوریاں۔ انسان حالات کے ہاتھوں بے بس ہے۔

میں بھاری قدموں سے باہر آیا جیسے میں اپنی بیٹی، لواسے اور بہن سے رخصت ہو کر کہیں بہت دور جا رہا ہوں اور شاید اس زندگی میں ان سے کبھی نہ مل سکوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ بھگوان اور خدا اتنے نزدیک ہو کر بھی ایک دوسرے سے اتنے دور کیوں ہو گئے ہیں لیکن شاید یہ ہماری ظاہری نظر کا دھوکا ہو، باطن میں تو دونوں ایک ہی ہیں۔

لاہور اسٹیشن پر بھی وہی افراتفری تھی جو امرتسر اسٹیشن پر ہوا کرتی ہے۔ قلی وہی من مانی مزدوری مانگ رہے تھے۔ وہی ہجوم دھکا، وہی ریل پیل۔ وہی ہنگامہ۔ وہی شور و غل۔ اور شیطان ہر جگہ بہکانے میں مصروف تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھگوان اور خدا (یا یوں کہئے، بھگوان یا خدا) ہر جگہ اپنے بندوں کو شیطان کے چنگل سے بچانے میں مشغول تھے۔

گاڑی چلی۔ حسبِ معمول اٹاری اسٹیشن پر ضابطہ اور کارروائی ہوئی۔ میری سیٹ کے نزدیک ایک کنبہ بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی نوجوان لڑکی کی شادی میرٹھ میں کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ بچی کی عمر مشکل سے اٹھارہ انیس برس کی ہوگی۔ ٹھیٹھ دیہاتی لوگ تھے۔ بچی بھی لاجونتی، چھوئی موئی تھی۔ انہوں نے دسترخوان کھولا (متوسط طبقہ کے زمیں دار لگتے تھے) اور مجھے شرکت کی دعوت دی۔ ماں نے گوشت کی تمام اشیا الگ کر کے فقط سبزی، پراٹھے اور آچار مجھے دیا۔ اسے گئے وقتوں کی تہذیب سے شناسائی تھی۔

جب امرتسر اسٹیشن آیا تو میں نے جیب سے چند روپے نکال کر اس بچی کو دیتے ہوئے کہا، 'بیٹی' اب تو میرے دیس کی بہو ہے۔ بھگوان سدا تجھے خوش رکھے۔ بوڑھ سہاگن کرے'۔ اور خوشی کے آنسوؤں میں ہم جدا ہوئے۔

امرتسر اسٹیشن کا قلی بھی اتنا ہی ہٹیلا اور ضدی تھا جیسا لاہور کا لیکن وہ دل کا تھا۔ اور میں بحث میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو مانگا میں نے دیا۔ جہاں جانا اور رات کو رہنا تھا، پہنچا۔ سامان رکھا اور فوراً ہی دربار صاحب کو طرف روانہ ہو گیا جو جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ جیسے ہی میں گورو گرنتھ صاحب کے سامنے سیس نوایا، کانوں میں میرے مرشد حضرت بابا شیخ فرید کا یہ شعر پڑا جو راگی جتھا گا رہا تھا:

فریدا۔ جو تینیں مارن مکیاں، تو سانہ ماریں گھُم
آن پڑے گھر جائیکے، پیر تناں دے چم

(بابا فریدؒ فرماتے ہیں: جو تمہیں مکے ماریں، تم ان پر جواباً گھونسا نہ تانو، بلکہ ان کے گھر خود جا کر ان کے پاؤں پر سر رکھ کر معافی مانگ

اس کے ساتھ ہی مجھے پاکپتن شریف میں حضرت کے دربار میں قوال کا گایا ہوا شعر یاد آ گیا جس کا مطلب بھی عین یہی ہے:

فریدا۔ برے دا بھلا کر۔ غصہ من نہ ہنڈھا
دیہی روگ نہ لگئی۔ سبھ کجھ پلے پا۔

(بابا فریدؒ نصیحت کرتے ہیں کہ اے بندے، برے سے بھی نیکی کا سلوک کر، غصے کو تھوک۔ یہ بیماری کہیں تیرے ذہن کو نہ چاٹ جائے۔ عقل سے کام لے)

میرا جسم سرحد کے آر پار ہو آیا تھا اور جس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں گیا تھا اس کا جواب میرے بھگوان، میرے خدا نے نہایت تفصیل سے، مثالیں دے دے کر مجھے سمجھا دیا تھا کہ راستے الگ الگ ہو سکتے ہیں، مگر 'وہ' ایک ہی ہے، ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا۔

○○

نزلہ زکام سے کس طرح چھٹکارا پائیں

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جسے نزلہ اور زکام کبھی نہ ہوا ہو۔ یہ شکایت اتنی عام ہے کہ لوگ اس روگ کو بیماری کی فہرست میں ہی شامل نہیں کرتے اور اس بیماری کے دوران بھی کام میں مشغول رہتے ہیں۔ اس غفلت کی وجہ سے زکام اور بڑھ جاتا ہے۔ زکام کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا جائے تو اسے دور ہونے میں ۱۵ دن لگ جاتے ہیں اور اگر علاج نہ کیا جائے تو دو ہفتے لگتے ہیں۔ خیر یہ تو مذاق ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس بیماری میں جم کر آرام کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹ

ڈاکٹر اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ زکام چھوت سے لگتا ہے لیکن اکثر لوگوں کو زکام کے مریضوں سے الرجی ہوتی ہے اگر آپ کا شمار بھی ان انسانوں میں ہوتا ہے تو آپ زکام کے مریض کے پاس نہ بیٹھیں نفسیات کے ماہرین زکام کا سلسلہ نفسیاتی صدمے سے جوڑتے ہیں ان کی رائے میں زکام کے مریض کی حالت اور رونے والے انسان کی کیفیت میں جو مشابہت پائی جاتی ہے وہ اتفاق نہیں ہے۔ گفتگو کے دوران کسی نے آپ کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔ کسی دوست نے احسان فراموشی کا ثبوت دیا، ساس نندوں نے بے جا الزام لگایا۔ یا والدین یا بڑے بہن بھائیوں نے ناانصافی کی تو انسان کا دل رونے کو چاہتا ہے لیکن وہ رو نہیں سکتا۔ آنسو کے سیلاب میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو وہ

ہی زکام کا علاج ہے۔ لیموں وٹامن سی کا خزانہ ہے زکام کا حملہ ہوتے ہی گرم چائے میں ایک لیمو کا رس نچوڑ لیں۔ دودھ نہ ملائیں۔ اگر کھٹی چائے حلق سے نہ اترے تو ایک چمچہ چینی ملا لیں اور کمبل اوڑھ کر لیٹ جائیں۔ اس نسخے سے زکام سے بہت حد تک نجات مل سکتی ہے۔

زکام میں ناک بند ہو جاتی ہے۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ اُبلتے ہوئے پانی کی بھاپ لیں ایک برتن میں پانی بھر کر چولہے پر رکھ دیں جب پانی اُبلنے لگے تو برتن کو چولہے سے اتار لیں۔ اب سر اور برتن کو ایک تولئے سے ڈھک لیں۔ گرم پانی کی بھاپ ناک کی نالیوں کو فوراً کھول دے گی۔ اس پانی میں تھوڑا سا وکس ملا لیں تو زیادہ مفید ہے اس سے بھاپ میں تیز خوشبو پیدا ہو گی۔ وکس کو ناک اور سینے پر ملنا بھی مفید ہے لیکن اصل علاج گرم پانی کی بھاپ ہے۔ بھاپ لینے کے بعد ٹھنڈی ہوا میں باہر نہ جائیں۔

ناک کے راستے بہہ نکلتا ہے۔ اس لئے جب آپ کو پہلی بار ناک میں ریزش معلوم ہو تو آپ فوراً گزشتہ ۲۴ گھنٹوں پر نظر ڈالیں۔ ممکن ہے کہ اس میں آپ کو اپنے زکام کا سبب مل جائے اگر آپ کو وہ واقعہ مل جائے جس سے آپ کو ذہنی تکلیف پہنچی ہے تو آپ کا زکام ختم ہو جائے گا۔

روس میں تو ڈاکٹر برسوں سے زکام پر تحقیقات کر رہے ہیں۔ تازہ اطلاعات کے مطابق انھوں نے زکام کا قطعی علاج دریافت کر لیا ہے۔ یہ سرکہ اور ستر ہے کے عرق کی آمیزش سے تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کی مناسبت کیا ہو یہ بات ابھی تک راز میں ہے۔ ان ڈاکٹروں کا دعویٰ ہے کہ اس علاج نے زکام کو چند گھنٹوں میں آرام آجاتا ہے۔ جس دن روسی ڈاکٹر اس نسخہ کو ظاہر کر دیں گے۔ اس روز دنیا سے زکام ختم ہو جائے گا۔ خدا جانے وہ کیا مصلحت ہے جو ان ڈاکٹروں کو نسخہ کے اظہار سے روک رہی ہے۔

دنیا میں زکام کی بے شمار دوائیں ہیں۔ ایبرن سے تیار کی ہوئی بہت سی دوائیں بازار میں ملتی ہیں یا اینٹی بایوٹیکس ٹیٹرا سائیکلین ہے۔ یونانی طب میں جوشاندہ یا عرق گاؤزبان 'لعوق سپستاں' اور لعوق آب تربوز والا بھی مفید ہیں، ہومیوپیتھک ڈاکٹر بھی اس روگ کے کارگر علاج کا دعوےٰ کرتے ہیں ان میں جو علاج آپ کو موافق آئے اسے بے کھٹکے اختیار کریں۔ لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ زکام معمولی شکایت نہیں اس کا علاج سنجیدگی سے کرنا چاہئے۔ کچھ لوگ پیٹ کی خرابی کا سلسلہ بھی زکام سے جوڑتے ہیں تھکان میں زکام کا حملہ شدید ہو جاتا ہے۔ ناک میں ریزش پیدا ہو تو حملہ شروع ہو گیا ہے۔ اگر بستر پر لیٹنا برا لگتا ہے تو زکام کی رفتار کم کر دیں۔ آرام سے زکام کا حملہ ناکام بنایا جا سکتا ہے

■■

صحت سے متعلق اپنے علم کو پر...

صحت سے متعلق کچھ سوالات پیش کئے ...
سوال کا جواب صحیح یا غلط میں دینا ہے صحت سے متعلق ...
جوابات صفحہ نمبر ۱۲۹ پر درج ہیں۔

● س: (۱) بچے کے پولیو کا ٹیکہ ... کی عمر میں لگوانا چاہیے۔

● س: (۲) شیرخوار بچہ اگر اپنے ... یا رگڑے تو کوئی خطرے کی بات نہیں ہے ...

● س: (۳) بچے کو بھاری کمبل ... سلانے سے بخار اتر جاتا ہے۔

س: (۴) بچے کو غصہ دکھانے ... دانے کو کھجانے سے روکنا چاہیے۔

● س: (۵) شیرخوار بچے کے دانت ... نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ... کے دانت ... ہی ہیں

یہ ممتا

صالحہ عابد حسین

چیختے چیختے اُبکارتے پکارتے
اب تک نہ تھکی تھی۔ ایک بےقراری
ں کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ گھر گھر میں
ش کر ڈھونڈ رہی تھی۔ باغ کے کونوں میں
ش کر رہی تھی۔ پڑوسیوں کے ہاں جا جا کر
پوچھ کر رہی تھی۔ اور ہر طرف سے دھتکاری
رہی تھی!

"ارے ایک ہی وہ ماتا — دونوں
۔ دونوں ایک ساتھ بچھڑ گئے — جانے
ن ظالم چُرا لے گیا!"

کتنی نادان کتنی الہڑ تھی وہ۔ مگر
لی کے لئے اس نے پہلے سے انتظام کر لیا
تھا۔ ایک محفوظ، پُرسکون جگہ، سب کی
نظروں سے دُور، جہاں وہ اپنی پہلی تخلیق کو
دے سکے۔ آہ یہ دنیا والے — یہ بے درد
بے حس، ظالم دل والے، یہ تضحیک کرنے
والے، دھتکارنے والے، دوش دینے والے۔
جبکہ اسے چھٹکارا مل رہی تھی۔
کاش اس وقت اس کم بخت نے
کے باپ نے ہی اس کا ساتھ دیا ہوتا۔
ہوس، عیاش، بوالہوس۔ اس کی چیخ و پکار
فریاد اس وقت کسی نے نہ سنی جب رات
کے اندھیرے میں اس نے اسے ریپ کیا
تھا۔ جیسے سب بہرے ہو گئے تھے۔ اس
بےقراری اور کرب کی طرف سے بےحسی۔
پھر — پھر جب قانونِ قدرت نے اپنا
دکھایا اور وہ حاملہ ہو گئی تو اس کم بخت نے
آنکھیں پھیر لیں۔ جیسے اسے کوئی واسطہ، کوئی
مطلب ہی نہ ہو۔ اس کا بس چلتا تو وہ انہیں
دنیا میں آنے ہی نہ دیتا۔ باپ بن کر بچے کا ایسا

ناک کے راستے بہہ نکلتا ہے۔ اس لئے جب آپ کو پہلی بار ناک میں ریزش معلوم ہو تو آپ فوراً گذشتہ ۲۴ گھنٹوں پر نظر ڈالیں۔ ممکن ہے کہ اس میں آپ کو اپنے زکام کا سبب مل جائے اگر آپ کو وہ واقعہ مل جائے جس سے آپ کو ذہنی تکلیف پہنچی ہے تو آپ کا زکام ختم ہو جائے گا

روس میں تو ڈاکٹر برسوں سے زکام پر تحقیقات کر رہے ہیں۔ تازہ اطلاعات کے مطابق انھوں نے زکام کا قطعی علاج دریافت کر لیا ہے۔ یہ سرکہ اور سنترے کے عرق کی آمیزش سے تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کی مناسبت کیا ہو یہ بات ابھی تک راز میں ہے۔ ان ڈاکٹروں کا دعویٰ ہے کہ اس علاج سے زکام کو چند گھنٹے میں آرام آجاتا ہے۔ جس دن روسی ڈاکٹر اس نسخہ کو ظاہر کر دیں گے۔ اس روز دنیا سے زکام ختم ہو جائے گا۔ خدا جانے وہ کیا مصلحت ہے جو ان ڈاکٹروں کو نسخہ کے اظہار سے روک رہی ہے۔

دنیا میں زکام کی بے شمار دوائیں ہیں۔ اسپرن سے تیار کی ہوئی بہت سی دوائیں بازار میں ملتی ہیں یا اینٹی بایوٹیکس ٹیٹرا سائیکلین ہے۔ یونانی طب میں جوشاندہ یا عرق گاؤزبان، لعوق سپستاں، اور لعوق آب تربوز والا بھی مفید ہیں۔ ہومیوپیتھک ڈاکٹر بھی اس روگ کے کارگر علاج کا دعوے کرتے ہیں ان میں جو علاج آپ کو موافق آئے اسے بے کھٹکے اختیار کریں۔ لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ زکام معمولی شکایت نہیں اس کا علاج سنجیدگی سے کرنا چاہئے۔ کچھ لوگ پیٹ کی خرابی کا سلسلہ بھی زکام سے جوڑتے ہیں لیکن ان میں زکام کا حملہ شدید ہو جاتا ہے۔ ناک میں ریزش پیدا ہو تو حملہ شروع ہو گیا ہے۔ اگر بستر پر لیٹنا برا لگتا ہے تو کام کی رفتار کم کر دیں۔ آرام سے زکام کا حملہ ناکام بنایا جا سکتا ہے

■■

صحت سے متعلق اپنے علم کو پرکھئے

صحت سے متعلق کچھ سوالات ... سوال کا جواب صحیح یا غلط میں دیجئے ... جوابات صفحہ نمبر ۱۲۹ پر درج ہیں۔

- س: (۱) بچے کے پولیو کا ٹیکہ ۳ سال کی عمر میں لگوانا چاہیے۔
- س: (۲) شیر خوار بچہ اگر پیٹ کے بل کروٹ لے یا رینگے تو کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔
- س: (۳) بچے کو بھاری کمبل میں لپیٹ کر سلانے سے بخار اتر جاتا ہے۔
- س: (۴) بچے کو خسرہ، چیچک کے دانے کو کھجانے سے روکنا چاہئے۔
- س: (۵) شیر خوار بچے کے دانتوں کی دیکھ بھال نہیں کرنی چاہئے اس کے دودھ کے دانت تو ٹوٹنے ہی ہیں

چیختے چیختے اب تھک سے
اب تک دہشت تھی ایک بے قراری
ے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ مگر گھر میں
س کر بھر تڑپ رہی تھی۔ باغ کے کونوں میں
س کر رہی تھی۔ پڑوسیوں کے ہاں جا جا
پوچھ کر رہی تھی۔ اور ہر طرف سے دھتکاری
ہی تھی!

"ارے ایک ہی ممتا — دونوں
۔ دونوں ایک ساتھ بچھڑ گئے — جانے
ن ظالم چرا لے گیا!"

کتنی نادان کتنی انجان تھی وہ۔ مگر
ں کے لئے اس نے پہلے سے انتظام کر لیا
ا۔ ایک محفوظ، پرسکون جگہ، سب کی
روں سے دور، جہاں وہ اپنی پہلی تخلیق کر
رہے سکے۔ آہ یہ دنیا والے — یہ بے درد
س، ظالم دل والے، یہ تضحیک کرنے
لے، دھتکارنے والے، دولتی دینے والے۔
جگہ اسے چھپا کر رکھ دی تھی۔
کاش اس وقت اس کم بخت کے
ے کے باپ نے ہی اس کا ساتھ دیا ہوتا۔
وس، عیاش، بوالہوس۔ اس کی چیخ پکار
ر یاد اس وقت کسی نے نہ سُنی جب رات
ے اندھیرے میں اس نے اسے ریپ کیا
ا۔ جیسے سب بہرے ہو گئے تھے۔ اس
بے قراری اور کرب کی طرف سے بے حس۔
پھر — پھر جب قانونِ قدرت نے اپنا
دکھایا اور وہ حاملہ ہو گئی تو اس کم بخت نے
ھیں پھیر لیں۔ جیسے اسے کوئی واسطہ کوئی
مطلب ہی نہ ہو۔ اس کا بس چلتا تو وہ انہیں
یا میں آنے ہی نہ دیتا۔ باپ ہو کر بچے کا ایسا

تاریخ گواہ ہے کہ مختلف تہذیبوں اور مختلف زمانوں میں دنیا کے مختلف حصوں میں دہی کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں بھی دہی رومیوں اور فلسطینیوں کی ایک مرغوب غذا تھی اور یونانی تہذیب میں بھی اس کا بول بالا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں بھی لوگ دہی استعمال کرتے تھے اور یہ نعمت بنی اسرائیل کی خوراک کا بھی حصہ تھی۔ مارکوپولو نے اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے کہ اہل چین دہی خوب استعمال کرتے تھے۔ چنگیز خاں کے سپاہیوں کو بھی کھانے کے ساتھ دہی دیا جاتا تھا۔ تبت میں دہی یاک کے دودھ سے بنایا جاتا رہا ہے تو قدیم عرب میں یہ اونٹنی کے دودھ سے بنایا جاتا تھا۔ دودھ چاہے بکری کا ہو یا گھوڑی کا، گائے کا ہو یا بھینس کا، دہی کی شکل اختیار کرنے کے معاملے میں ایک ہی اصول کے پابند رہتا ہے، یعنی گرمی پاکر دودھ میں پائے جانے والے بیکٹیریا جراثیم تیزی سے پرورش پانے لگتے ہیں اور دودھ میں موجود قدرتی شکر LACTOSE کو لیکٹک ایسڈ LACTIC ACID میں بدل ڈالتے ہیں۔ لیکٹک ایسڈ کی موجودگی ہی دودھ کے ہلکے میٹھے ذائقہ کو دہی کے تیکھے، ترش مگر پسندیدہ ذائقہ میں بدل دیتی ہے۔

قدیم زمانے سے ہی طبیب دہی اور چھاچھ سے معدے کے مختلف امراض، پیچش اور سنگرہنی وغیرہ کا علاج کرتے رہے ہیں۔ جدید طبی سائنس نے بھی دہی کی بھی اہمیت کو مانا ہے۔ اور دہی کو آنتوں کی تیزابیت GASTRO [illegible] دور کرنے کا کارگر نسخہ تسلیم کیا ہے۔ روس اور امریکہ کسی بات پر [illegible] دلی سے شاید ہی متفق ہوتے ہوں، مگر دہی کے معاملے میں دونوں ممالک [illegible] اختلافِ رائے نہیں ہے۔ دونوں ہی ملکوں میں دہی کو ایک صحت بخش [illegible] طور پر خوب صورتی میں اضافہ کرنے والی شے سمجھا جاتا ہے۔ دہی کو آج

صرف سکھ اور پنجابی ہی سر دھونے کے لیے استعمال نہیں کرتے، بلکہ [illegible] بڑے شہروں کے بیوٹی سیلونوں میں بھی دہی کو بال دھونے کے لیے کام میں [illegible] دنیا کے مختلف ممالک میں دہی مختلف اشیاء آمیز کرکے خوراک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ دہی کی یہ عالمگیر مقبولیت بے وجہ بھی نہیں ہے کیونکہ اس میں پروٹین (لحمیات) کیلشیم اور کئی وٹامنوں کی وافر تعداد پائی جاتی ہے۔ [illegible] افادیت کے باوجود دہی ایک زود ہضم شے ہے، جس کو مرد، عورت، بچے بوڑھے سب ہی آسانی سے ہضم کر سکتے ہیں۔ پروٹین کی وافر مقدار کے باوجود [illegible] پیدا نہیں کرتا اور آنتوں میں سڑن اور تیزابیت پیدا کرنے کی بجائے آنتوں کو صاف کرکے ان کو تقویت پہنچاتا ہے۔

موسم گرما میں دہی کی لسی یا چھاچھ کا ایک گلاس بہترین مشروب [illegible] ہے کیونکہ یہ معدہ اور آنتوں کی خشکی کو دور کرکے ہاضمہ میں مدد دیتا ہے۔ دوسری طرف یہ دماغی نظام کو بھی سکون اور فرحت بخشتا ہے۔ چھاچھ میں چکنائی برائے نام ہی رہ جاتی ہے، لیکن بعض معاملوں میں چھاچھ، چکنائی والے دودھ سے تیار کیے ہوئے دہی سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے دیہی علاقوں میں گڑ یا نمک کے ساتھ چھاچھ کا استعمال اب سے [illegible] سال پہلے تک ایک عام بات تھی۔ ان دنوں چھاچھ کو مہمان کی تواضع کے طور پر بھی پیش کیا جاتا تھا۔ اب صورت حال میں اتنی تبدیلی آچکی ہے کہ قصبات اور دیہات میں بھی چھاچھ مشکل سے میسر آتی ہے۔ دہی اور چھاچھ اعصاب کو بھی سکون اور تقویت دیتے ہیں۔

ایک حسن افزا شے کی حیثیت سے

دہی سے سر یا چہرے کی مالش

تناؤ نا نفسیاتی الجھنوں سے جڑے ہیں۔ ان
کی رائے میں ذہنی تناؤ اور جذباتی الجھن چہاسے
کا باعث بنتی ہے۔ مثلاً کنواری لڑکیاں اکثر چہاسوں
کا شکار ہو جاتی ہیں اور شادی کے بعد چہاسے
غائب ہو جاتے ہیں، کیوں کہ شادی کے بعد
زندگی میں ایک ٹھیراؤ آجاتا ہے۔ لڑکی کو اس کی
منزل مل جاتی ہے۔ اس کی الجھن ختم ہو جاتی ہے

اور ساتھ ہی چہاسے بھی۔

کچھ ڈاکٹر برتھ کنٹرول کی گولیوں سے
بھی چہاسوں کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ غرض جتنے
منہ اتنی باتیں۔ ایک بات صاف ہے کہ
چہاسے کیلیں اور دانے ہارمون کی وجہ سے
پیدا ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر یہ بات معلوم کرنے
سے قاصر ہیں کہ آخر وہ کون سے ہارمون ہیں جو چہاسے
پیدا کرتے ہیں۔

چہاسوں کے دوسرے سبب پُر خشک
اور کھُردری جلد ہے۔ یہ چہاسوں سے پاک رہتی
ہے۔ لیکن یہاں دوسرے مسئلے کھڑے
ہو جاتے ہیں۔ خشک جلد رطوبت سے محروم رہتی
ہے۔ یہ کمی پانی سے دُور کی جا سکتی ہے لیکن
تعجب کی بات یہ ہے کہ چہرے پر جتنا پانی

چھڑکا جائے، خشکی اتنی ہی تیزی سے بڑھتی ہے دھوپ اور ہوا سے پانی خشک ہو جاتا ہے تو جلد پہلے سے بھی زیادہ خشک ہو جاتی ہے۔ اس طرح جلد کو بار بار پانی سے دھونا فائدہ کی بجائے اُلٹا نقصان پہنچاتا ہے۔ جاڑوں میں کھال پھٹنے کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ کھال پانی کو جذب نہیں کرتی۔ جس طرح پانی چکنے گھڑے سے پھسل جاتا ہے، اسی طرح خشک جلد پانی کو روک نہیں سکتی۔ اس لئے ہونٹ پھٹ جاتے ہیں۔ ہاتھوں کی جلد میں سفید لکیریں نمودار ہو جاتی ہیں۔ آخر جلد پانی کو کیوں نہیں روک سکتی؟ یہ ایک معمہ ہے، جسے ڈاکٹر آج تک حل نہیں کر سکے۔ آپ کی جلد خشک ہے۔ وہ پانی کی ضرورت محسوس کرتی ہے آپ نل سے پانی لے کر چہرے کو بھگوتی ہیں لیکن پانچ منٹ بھی نہیں گزرنے پاتے کہ پانی اُڑ جاتا ہے اور خشکی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔

اس پریشانی کو دور کرنے کی ایک ترکیب ہے۔ آپ پانی چہرے پر ڈالیں اور اس کے بعد گیلے چہرے پر کوئی ایسی کریم یا تیل استعمال کریں جو پانی کو جلد کی سطح پر قید کر لے۔ بازار میں جتنے موائسچرائزر فروخت ہوتے ہیں ان کی بنیاد اسی اصول پر رکھی گئی ہے۔ موائسچرائزر نمی کو چہرے سے ختم نہیں ہونے دیتے اور ایک لمبے عرصے تک قید رکھتے ہیں۔ اگر آپ موائسچرائزر خریدنے کی سکت نہیں رکھتیں تو گھر پر ہی یہ ترکیب استعمال کر سکتی ہیں۔ اس طرح آپ کی جلد میں نمی برقرار رہے گی۔

سفید اور سانولی جلد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ سفید جلد دھوپ سے تپنے کے بعد بھی اپنی تمام سفیدی نہیں کھوتی اگر تھوڑی بہت سفیدی کم بھی ہو جائے تو وہ سُرخی میں بدل جاتی ہے۔ دیکھنے والے کو یہ بات نظر نہیں آتی۔ لیکن سانولی جلد تپنے کے بعد کالی پڑ جاتی ہے۔ لوگ اس فرق کو فوراً بھانپ لیتے ہیں۔ سانولی عورتوں کو یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ ○○

خوابوں کی بستی

ہاجرہ شکور

اچھا تو آپ ہی سائیکاٹرک کلینک دیکھنے آئے ہیں۔ اس جہاں کے قابلِ دید مقامات میں سے ایک مقام! مجھ سے ملئے۔ میں یہاں کی انچارج ہوں۔ سریتا مُرلی منوہر۔ آج آپ صرف او پی ڈی ہی دیکھ لیں۔ او پی ڈی۔ یہ مریضوں کا ہجوم ہے زندگی کی دوڑ میں ہار کر ہتھیار ڈالنے والوں کا میلا لگتا ہے۔ خود فریبی کی خود ساختہ جنت میں آرام کرنے والے لوگ اپنے رشتہ داروں کے لئے مسئلہ بن جاتے ہیں اور ڈاکٹروں کے لئے کیس۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنی جنت سے واپس حقائق کے جہنم زار تک آ جائیں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ کبھی ڈاکٹروں کو ان سے حسد تو نہیں ہوتا؟ یہ ایک عجیب سی رسہ کشی ہے۔ کبھی بازی ہمارے ہاتھ رہتی ہے کبھی ان کے ہاتھ۔

یہ دیکھئے، یہ پندرہ سالہ لڑکی اپنے آپ کو بھگوان کرشن کا اوتار سمجھتی ہے۔ آپ اسے سکزوفرینیا کی مریض سمجھ لیں۔ لیکن وہ بھگوان بن کر بہت خوش ہے۔ بس آزادی، دل لگی، ہنسی ٹھٹھول اور چھیڑ چھاڑ کی اسے تمنا تھی، وہ سخت گیر ماں باپ کے زیرِ سایہ کہاں مل سکتی تھی؟ اب اس کے سامنے خیالی پیکر ناچتے ہیں اور وہ خود کو بھی ان میں شامل کر لیتی ہے۔ یہ ہیلوسینیشن اور ڈلیوژن اس کی ناآسودہ خواہشوں کا عکس ہیں۔

یہ دیکھئے، سروپ سیٹھی بھی آ گیا۔ یہ اس کی پانچویں وزٹ ہے۔ یہ خیالی دنیا میں خیالی پیکروں کے ساتھ رہتا ہے۔ دس سال پہلے اس کی محبوبہ کاویری نے خودکشی کر لی تھی۔ سروپ کو گہرا صدمہ ہوا، لیکن یہ لذت آمیز غم اس نے اپنے اندر سمو لیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک چنچل حسینہ سے اس نے شادی کر لی۔ خوب صورت اور سلیقہ مند شردھا تنگ مزاج تھی۔ شادی کے پھیرے

کانگو میں مروندی نسل کی لڑکیاں

اپنی ٹانگوں پر سیکڑوں گز لمبی رسّی لپیٹ لیتی ہیں۔ کیوں کہ موٹی ٹانگیں وہاں حسن کی علامت تصور کی جاتی ہیں۔ ان کی یہ ٹانگیں عام ٹانگوں سے ۵ گنا موٹی دکھائی دیتی ہیں۔

اس نے ملکیت کی مہر سمجھ لئے اور مزہ دار کھانوں سے اس نے شوہر کے معدے سے دل تک پُل بنا لینا چاہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کاویری کا نام لے کر اسے چھیڑتی بھی رہتی تھی۔ یہ زہر بلا اُبال حرام زندگی میں تلچھٹ کی طرح بیٹھتا رہا۔ یہ ایک سانپ کی طرح کنڈلی مارے خاموش بیٹھا رہا۔ اس درمیان سروپ ایک بچی کا باپ بن گیا۔ یہ بچی بادِ بہار کا جھونکا تھی یاد رکھا ایک ذریعہ۔ دھیرے دھیرے یہی اس کی زندگی کا محور بنتی چلی گئی۔ سات سال کی عمر میں ٹیٹنس سے اس کی موت ہو گئی۔ سات سال کی خوب صورت اور چنچل لڑکی راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ یہیں خاموش بیٹھے ہوئے انعی نے پھنکار کر سروپ کو ڈس لیا۔

سروپ اب ایک مُبھم، ملائم خیالی دنیا کا باسی ہے۔ وہ کاویری اور نیلم کے ساتھ رہتا ہے۔ کاویری اسے بیڈ ٹی پیش کرتی ہے اور نیلم اس سے ہوم ورک کے سوالات حل کراتی ہے۔ سدھا نیمے کے کٹلیٹ اور آلو کے پراٹھے کے ذریعہ اس کے قریب آنا چاہتی ہے۔ لیکن بجلی کے جھٹکے بھی اس کی مدد نہیں کر سکتے۔

لیجئے، لاج ونتی بھی آ گئی ہے اس کا پریشاں حال شوہر بتلائے گا کہ آج بھی وہ اس طرح یاسیت کا شکار ہے۔ پانچویں لڑکی کی پیدائش کے بعد ہندوستانی ماں کے دل کے اندر ایک ڈائن پیدا ہو گئی۔ وہ نوزائیدہ لڑکی کو ختم کر دینا چاہتی تھی، کیوں کہ ساس کی بدکلامی اور اپنے احساسِ جُرم کو ختم کر دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ یہ خواہش ابھی جڑ پکڑ ہی رہی تھی کہ ڈائریا سے دو ماہ کی بچی مر گئی۔ اس کی موت کا سبب وہ اپنی دیوانی خواہش کو سمجھتی ہے۔ اس کے مجرم ضمیر نے اسے مزید یاسیت کی طرف دھکیل دیا۔ اب نہ اسے کوئی نظر آتا ہے، نہ وہ کسی کی سُنتی ہے۔ وہ خلا میں ایک غیر مرئی مرکز پر اپنی نگاہیں جمائے رہتی ہے۔ کاش ہم بھی وہ سب کچھ دیکھ سکتے جو اسے نظر آتا ہے۔

یہ منجو گوئل ہے۔ اس سترہ سالہ ذہنی مریضہ کے متوسط طبقے کی روایتوں کے امین ماں باپ کیس کو سمجھنے میں ہماری ذرا بھی مدد نہیں کر رہے ہیں۔ منجو کو ہم میں سے کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ اور نہ وہ کسی سے بات کرتی ہے۔ اسے فرصت ہی کہاں ؟ وہ برابر انیل اور چنٹو سے گفتگو کرتی رہتی ہے۔ انیل اس کا عاشق کوئی سڑک چھاپ مجنوں ہوگا اور چنٹو اس بچے کا نام ہے جسے پیدائش سے پانچ ماہ قبل ہی مار ڈالا گیا۔ کون جانے پیدائش کے بعد کنواری ماں ہی شاید اس کا گلا گھونٹ دیتی، لیکن ضائع شدہ حمل اس کے جسم سے نکل کر اس کی رُوح میں سرایت کر گیا ہے۔ اس کا چنٹو کو تھپکنا، دُودھ پلانا، اس سے توتلی باتیں کرنا، اسے پالنے میں سُلانا۔ غیر مرئی بچہ ہمارے لئے ایک پُراسرار شے ہے، لیکن منجو کی دنیا اسی سے آباد ہے۔ روایتوں کے بوجھ سے نڈھال اور پڑوسیوں کے طعنوں سے شرمسار والدین اپنی پیاری بیٹی کا دُکھ ذرا بھی نہیں بانٹ سکتے۔

یہ ہیں دل افروز بیگم۔ پینتالیس سال کی گھٹے والی عورت، اس حسین و جمیل طوائف زادی سے سیف اللہ بیگ نے نہایت کم عمری میں نکاح کر لیا تھا۔ لیکن جان کی بازی لگا کر حاصل کی ہوئی محبوبہ بیوی بن کر پاؤں کی جُوتی بن گئی۔ اس کے ہر شوق اور ہر خواہش کو کچلا گیا کہ کہیں وہ طوائفیت کی طرف نہ لوٹ جائے۔ اس کو پنج وقتہ نمازی بنا کر ایک مکان تک محدود کر دیا گیا۔ شوہر نے جاسوسی اور نگرانی کی خدمات اپنے سر لے لیں۔ لیکن دل افروز کے ہاتھ میں ایک ترپ کا پتّہ تھا۔ عبّاس — اس کی ساری محبت کا واحد مرکز، اس کا بیٹا۔ ساری جوانی اس کی پرورش میں کاٹ دی۔ احساسِ محرومی کو بیٹے نے ایک سائبان بن کر روک لیا تھا۔ لیکن وہی احساسِ محرومی ان کا تعاقب کرتا رہا اور بیٹے کی شادی کی رات ان پر پوری طرح ٹوٹ پڑا۔ اب ان کی دنیا ان کے نخرے اُٹھانے والے خیالی شوہر تک محدود ہے، جس کی عادتیں عبّاس سے ملتی جلتی ہیں۔ اپنے شوہر کو وہ قطعی نہیں

پاتی ہیں۔

یہ اور اسی طرح کے سیکڑوں کیس جن کی فائلیں بنا کر ہم انہیں نمبروں میں تبدیل کر دیتے ہیں، شیلفوں میں قید کر دیتے ہیں، الماریوں میں رکھ کر تالا لگا دیتے ہیں، سال کے آخر میں انہیں اعداد و شمار میں بدل کر چارٹوں اور گرافوں میں سجا دیتے ہیں، ورک لوڈ ظاہر کرنے والی سالانہ رپورٹ کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں۔

ان کے علاوہ اس کلینک میں کچھ اور بھی کیس ہیں جن کے اعداد و شمار کبھی نہیں بنے۔ اپنے مریضوں کو پاگل قرار دینے کے لئے ہمارے پاس کچھ سنگِ میل ہیں جن کو ہم زندگی کے سفر میں خاص وقفوں سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ مثلاً ٹھیک وقت پر پڑھائی، مناسب وقت پر نوکری، اس کے بعد شادی، بچے، ریٹائرمنٹ، پنشن اور موت۔ ان سے جو انحراف کرے، رفتار دھیمی یا تیز کر دے، یا سنگِ میل ہی اکھاڑ کر پھینک دے، تو ہم اسے ایب نارمل سمجھ لیتے ہیں۔ ویسے ایب نارمل کون نہیں؟ اوپر سے پُرسکون اور اندر سے پُرغضب دریا کی طرح انسان کا دل بھی متلاطم رہتا ہے۔ مثال کے طور پر لیجیے ڈاکٹر رستوگی کو۔ نیورو سرجری کے ماہر اور دماغی امراض کے مشہور زمانہ معالج۔ کون جانتا ہے کہ وہ کس قدر دماغی تناؤ کا شکار ہیں۔ یہ بدخوابی کے پرانے مریض ہیں جب آخری بار کینیڈا گئے تھے تو سیتاپور قصبہ کا ولد رستوگی یہ بالکل بھول گیا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب ہمارے لئے ایک چمکیلی دھند سے زیادہ نہیں۔ اپنی تیرہ سالہ لڑکی کو انہوں نے مغربی آزادی تو دے دی، لیکن مغربی والدین

برائٹس ڈی المیڈا

پرتگال کی جان آف آرک جو پیشے کے اعتبار سے نان بائی تھی نے الجزبٹا کی جنگ میں اسپین میں واقع ٹاف شائل میں، فوجیوں کو مار ڈالا حالانکہ ہتھیار کے نام پر اس کے پاس صرف نان بائیوں والا بیلچہ ہی تھا۔

(۱۴ اکتوبر ۱۳۸۵)

کے انداز سے لاتعلق نہ ہو سکے وہ ڈیکنز گیسٹس پر مقالے پڑھتے رہے اور لڑکی ان کی عادی ہوتی گئی۔ دو سال بعد اپنی پندرہ سالہ لڑکی کو نیویارک کی انڈر ورلڈ میں کھو کر وہ بے نیل مرام واپس آ گئے۔ ہر رات انہیں اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ سلوک کا خیال پاگل کر دیتا ہے اور وہ نیند کی گولیاں وہسکی میں گھول کر پی جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کا رعشہ اور دماغ کا تناؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ان کی آنکھیں ان پاگل بیوی کی خاموش نگاہیں برمے کی طرح ان کے دل کے پار ہو جاتی ہیں۔ دوسری بیٹی سے کبھی وہ دیوانہ وار پیار کرتے ہیں، کبھی بیکراں نفرت۔ وہ دماغی مریضوں سے بھی زیادہ بے بس ہیں، کیوں کہ ہر صبح کو وہ ہوش مندی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔

یہ ہیں دوسرا کیس یعنی دوسرے ڈاکٹر بدری ناتھ ملہوترا۔ اپنی نوجوانی اور وجاہت کے نشے میں خود ہی سرشار ایک انتہائی معمولی گھرانے سے تعلق رکھنے والے نیم خواندہ ماں باپ کی اولاد۔ اپنے خاندان کے واحد پڑھے لکھے انسان۔ ان کی زندگی کا مقصد ہے اپنی اصلیت سے فرار۔ کہیں کوئی بھانپ نہ لے کہ یہ ضلع باندہ کے ایک دقیانوسی گھر کی پیداوار ہیں۔ ماں باپ سے یہ چھوت کے روگ کی طرح بھاگتے ہیں۔ بھائی بہن انہیں جانی دشمن نظر آتے ہیں۔ یہ اپنی شاطرانہ چالوں کی بدولت ڈاکٹر تلوتما سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن بیگم کے سامنے خواہ مخواہ نروس نظر آتے ہیں۔ تلوتما کے نارن رٹیر رشتہ داروں سے یہ تعلق کر لیتے ہیں لیکن تلوتما کو اپنے رشتہ داروں سے یہ کبھی نہیں ملا سکے۔ ان کی بوڑھی ماں کبھی کبھی اصلی گھی کے کنستر اور گڑ بھیجتی ہے تو ڈاکٹر ملہوترا کی توہین ہو جاتی ہے۔ بیوی باندہ جانے کو اور سب سے ملنے کو تیار ہے، لیکن انہیں اس گھر کے خیال سے لرزہ چڑھتا ہے جہاں جانور اور انسان ایک ہی چھت کے نیچے سوتے ہیں۔ ماں اور بہنیں صبح کو اٹھ کر اپلے تھاپتی ہیں۔ جھوٹ بولتے بولتے اور دوہری زندگی جیتے جیتے ملہوترا صاحب کتنی گھٹن اور بے چارگی کا شکار ہیں، کون جانے! اپنی بنائی ہوئی جھوٹ کی دنیا تنگ قبر بن کر ان کی ہستی کو بھینچ رہی ہے۔ جھوٹ کا زہر ان کی رگوں

آپ کو ایک بات اور بتاؤں میرا بڑا بیٹا سجل کمل سے خوفناک طور پر مشابہ ہے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کمل کا ڈالا ہوا بیج میری کوشش کے باوجود ضائع نہیں ہوا بلکہ میری کوکھ میں محفوظ تھا۔

سرایت کر گیا ہے۔ ان کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔ یہ دماغی تناؤ کم کرنے والی گولیاں برابر کھاتے رہتے ہیں۔

یہ ہیں تیسرے ڈاکٹر سدھا نشو رائے۔ کم زبان، اپنس مکھا اور شاہ خرچ۔ ان کی بیماری ایک عام بیماری ہے۔ ان کی موٹی اور بدشکل بیوی ان کے ماں باپ کے لئے لکشمی کا روپ ہے ڈاکٹر رائے؛ فرمانبردار بیٹے اور بہنوں کے لائق فائق بھائی ہیں مسز رائے کی لائی ہوئی دولت کے انبار سے سب کی مشکلیں حل ہو گئی ہیں۔ سدھا نشو رائے نے اپنی مرضی سے شوہر کے بدلے خادم، بلکہ غلام کا درجہ قبول کر لیا ہے۔ لیکن شوہر یا عاشق بننے کی خواہش جوں کی توں برقرار رہی ہے۔ دولوں کے بدلے وہ صرف عیاش بن سکتے ہیں۔ وہ بھی ذہنی حد تک۔ مریضوں کی کیس ہسٹری سننے سے انہیں بہت دلچسپی ہے۔ مریضوں کی ازدواجی زندگی اور خاص طور سے غیر قدرتی طریقے کی لذت کے بارے میں وہ بڑی تفصیل سے کرید کرید کر پوچھتے ہیں اور مصنوعی ذمہ داری کے احساس سے سرہلاتے رہتے ہیں۔ ہر کیس ہسٹری میں انہیں بلو فلم کا سا مزہ آتا ہے خود کو وہ ہیرو محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان کی ہیروئن اسّی کلو وزن والی مسز رائے کبھی نہیں ہوتیں ان کی کھوجی نگاہیں اور بے چین انداز ان کی اصلیت ظاہر کر دیتا ہے لیکن عام طور پر وہ مثالی شوہر، بیٹے اور بھائی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سیکس پرورژن کی بدترین مثال ہے۔

چلتے چلتے آپ میری داستان بھی سنتے جائیے۔ میں، یعنی ڈاکٹر واسو بتا مُرلی منوہر میں اور مُرلی منوہر خوب کماتے ہیں، سلیقے سے خرچ کرتے ہیں، آرام دہ ذاتی مکان ہے، دو لڑکے ہیں۔ پینتالیس کے آس پاس ہونے کے باوجود میں جوان اور تر و تازہ نظر آتی ہوں۔ مختصر یہ کہ میں ایک کامیاب عورت ہوں۔ مگر مجھے بھی ایک بیماری ہے۔ مجھے خیالی پیکر نظر نہیں آتے، بلکہ زندہ انسان ہی ہیولے اور سائے جیسے محسوس ہوتے ہیں۔ جی ہاں، مُرلی منوہر کا میری زندگی میں یہی مقام ہے۔ شاید میں خوابوں کے دور سے گزر رہی ہوں۔ مُرلی بھی ایک خواب ہے۔ جب میں ہوش میں آؤں گی تو ان بھوتوں اور سایوں سے میرا پیچھا چھوٹ جائے گا۔ مجھے ہر رشتہ وہم اور تصور نظر آتا ہے۔ بائیس برس پہلے کی شادی بھی ایک خواب ہے۔ نہ وہ محبت کی شادی تھی، نہ ماں باپ کی پسند کی۔ یہ شادی ایک پردہ تھی جو میرے ماضی پر ڈال دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب چالیس سالہ جانے مانے ڈاکٹر تھے، جنہیں پچھلی بیوی کی موت کے بعد ایک ڈاکٹر بیوی کی ضرورت تھی۔ قبول صورت اور جوان ڈاکٹر لڑکی کو دیکھتے ہی انہیں اس کے ماضی میں جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے بھی سوچا اور "ہاں" میں فیصلہ کر دیا۔ کمل ہمیشہ کے لئے امریکہ جا چکا تھا

لیکن احتیاط کے باوجود اس کا دیا ہوا زہر میرے جسم میں پاؤں پھیلا رہا تھا۔ پھر بھی مجھے نجات کا راستہ معلوم تھا۔ نجات ملتے ہی چہرے کی زردی کو پاؤڈر اور روژ میں چھپائے میں مُرلی منوہر کے خلوت کدے میں آ گئی۔ جب میں نے ان جھریوں والے ہاتھوں کو تھاما تو میں مطمئن تھی، لیکن سوچ رہی تھی کہ شاید یہ سب خواب ہی ہے۔ جب آنکھ کھلے گی تو میں بدستور کمل کی بانہوں میں جھولا جھول رہی ہوں گی۔ اب بھی جب خوابوں میں کمل کے ہونٹ میرے ہونٹوں کو چھوتے ہیں تو میں گھبرا کر چونک پڑتی ہوں، تاکہ اسے کس کر پکڑ لوں اور کہیں جانے نہ دوں۔ لیکن اس وقت وہسکی کی مہک میں ڈوبے ہوئے خراٹے یہ طلسم توڑ دیتے ہیں۔ میں پھر خواب اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش کرتی ہوں میں خوابوں کی دنیا میں رہتی ہوں۔ اندر کی دنیا مکمل ہے، لیکن باہر کی دنیا میں شاید میرا اسرار رہنا ہے۔

آپ کو ایک بات اور بتاؤں میرا بڑا بیٹا سجل کمل سے خوفناک طور پر مشابہ ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کمل کا ڈالا ہوا بیج میری کوشش کے باوجود ضائع نہیں ہوا بلکہ میری کوکھ میں محفوظ رہ گیا تھا اور وہ مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی لئے شادی کے دو سال بعد پیدا ہونے والا بچہ بھی منوہر کی نہیں، بلکہ کمل کی شکل لایا ہے، کیونکہ یہ بچہ میرے خواب کا پرتو ہے ـــ خواب جو میرے لئے بنیادی حقیقت ہے۔

اچھا، اب آپ کی وزٹ کا وقت ختم ہو گیا۔ اب پھر کبھی آئیے گا اور یہاں زیر علاج اور لاعلاج مریضوں کو دیکھئے گا۔ ○

اختر الاسلام

فربی مفکر بنٹلے نے کہا ہے کہ انسان
ﻞ کتاب ہے جس میں اس کی زندگی کا پورا
ہتا ہے اس پر یا اس کے آس پاس کے
ی بہت کم اثر کرتی ہے ہتھیلی سے انسان
ت، قابلیت، رجحان، فطری استعداد پسند
ا پتہ چل جاتا ہے۔ دست شناس لوگ ہتھیلی
پر بنے ہوئے خطوط سے بہت کچھ معلوم
۔ اطبا راسی لئے نبض دیکھ کر بیماری کی
تے ہیں۔ آج کل کیلی فورنیا یونی ورسٹی میں
ریسرچ ہو رہی ہے۔ اس ریسرچ کے نتیجے
ن کن باتیں سامنے آئی ہیں ہتھیلی دیکھ کر بت
ھ باتیں تو بہت ہی آسانی سے بتا سکتا ہے
توں کی تفصیل یہاں پیش یہاں جا رہی ہے
انیمیا کے مریضوں کی ہتھیلیاں اکثر سفید ہوتی
ے لوگ عموماً سست سنجیدہ اور بے حس نظر

سخت، گٹھی ہوئی اور مڑی تڑی انگلیاں
طبیعت کی بے زاری، نامرادی اور کم حوصلگی
ں ہیں۔ اس سے انسان کی گوشہ نشینی تنہائی پسندی
کا مسلم ہوتا ہے۔

نازک اور نرم انگلیوں سے انسان کی شائستگی
کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگر ہتھیلی کی لمبائی درمیانی انگلی سے زیادہ
تو وہ انسان جسمانی اور ذہنی اعتبار سے صحت مند
درست ہوتا ہے۔ اگر ہتھیلی اوسط سے چھوٹی ہے
شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ منظم طریقہ
اپنی زندگی گذارنے کا عادی ہے ایسا انسان
کا بہت پابند رہتا ہے اور روپیہ پیسہ کے معاملے
تو صد درجہ چوکس اور ہوشیار ہوتا ہے۔ ایسے
کے لیے تھوڑا سا بھی ذہنی جھٹکا ناقابل برداشت
جاتا ہے۔

آدرش انسان کی ہتھیلی بیچ کی انگلی کی لمبائی
کے برابر ہوتی ہے۔ ایسا آدمی بہت چاپلوس ہوتا ہے
اور عموماً میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ لیکن وہ بہت متوازن
بھی ہوتا ہے اور عموماً ہر دلچسپی میں برابر شریک
رہتا ہے۔

اوسط سے زیادہ لمبے ہاتھوں والے انسان
اکثر امراض کا شکار رہتے ہیں۔ عموماً ٹائیفائیڈ کے
مریضوں کی ہتھیلیوں پر زردی اور دھبے نظر آتے ہیں۔
ہتھیلی سے انسان کی عمر کا بھی اندازہ لگایا
جا سکتا ہے۔

دست شناسی کے علم مطابق لمبی انگلیاں
کاہلی، سستی، طبیعت کی درشتی، بے حوصلگی کی غماز
ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ انگلیاں فن کارانہ وصف
بھی رکھتی ہیں۔ ایسے لوگ ادب اور علم و فن کے میدان
میں شہرت حاصل کرتے ہیں۔

دست شناس نہ صرف ہاتھ دیکھ کر، بلکہ ہاتھ
ملا کر بھی پوری شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ گویا ہاتھ
اسٹیتھسکوپ کی جگہ حاصل کر گیا ہے جس سے اندرونی
کیفیات کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔ ■■

اقوالِ زرّیں

- تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جس کا برتاؤ اپنی بیوی کے ساتھ بہترین ہو۔
- خاموشی غصّے کا بہترین علاج ہے۔
- زندگی ایک پھول اور علم اس کا شہد ہے۔
- اگر تم کو زندگی سے محبت ہے تو وقت سے محبت کرو۔
- تم سنجیدہ بنو لیکن تلخ نہ بنو۔
- جو شخص راز پوشیدہ رکھتا ہے، گویا اپنی سلامتی کو قبضے میں رکھتا ہے۔
- زبان نہ صرف خیال کا پہیہ ہے، بلکہ سوچنے کے عمل میں ایک عظیم اور زبردست عنصر ہے۔
- زبان انسانی ذہن کا زرہ بکتر ہے۔ اس میں ماضی کے تحفے بھی شامل ہیں اور مستقبل میں جیتنے کے ہتھیار بھی
- الفاظ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنے خیالات کو چھپا سکتے ہیں۔
- زبان خیال کا لباس ہے۔
- ایسی بات مونہہ سے نہ نکالو جو کر نہ سکو۔
- بے وقوف کا دل اس کی زبان میں ہوتا ہے، لیکن عقل مند کی زبان اس کے دل میں ہوتی ہے۔
- زندگی ایک حسین اور خوب صورت دھوکا ہے۔
- زندگی ایک خوب صورت المیہ ہے۔

دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی اس
کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ اس نے چہرے
سر اٹھا کر دیکھا۔ انور اندر آرہا تھا۔ گھبرا کر اس
نے پھر سر جھکا لیا اور شرم سے کچھ اور زیادہ سمٹ گئی۔

انور نے اندر آکر سگریٹ جلائی اور اس
کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے
وہ اس وقت کسی پریشانی میں مبتلا ہو۔ جیسے
اس کا سر نہیں اٹھ رہا تھا، مگر دھڑکتے دل کے
ساتھ پرلطف دل سے وہ انور کو دیکھے جا رہی تھی۔

وہ اس تصور ہی سے جھوم اٹھی کہ انور ابھی
اس کے پاس آئے گا اور دھیرے سے اس کا
گھونگھٹ کھول کر اس سے میٹھی میٹھی پیار
بھری باتیں کرے گا۔ اسے اپنی تقدیر پر ناز
ہو رہا تھا کہ اسے انور جیسا شوہر ملا۔

"دیکھو!" انور پلنگ پر بیٹھتے ہوئے
بیزاری سے بولا۔ "میں تم سے صاف کہہ دینا
چاہتا ہوں کہ یہ شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی
ہے۔"

یہ سنتے ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا۔

"مجھے گھر والوں نے تم سے شادی کرنے کے لئے اپنی اس بہن کی زندگی کا واسطہ دے کر مجبور کیا تھا جس کا شوہر تمہارا چچازاد بھائی ہے۔ تمہارے گھر والے میرے لئے تمہارا پیغام لائے تو میرے گھر والے چاہتے ہوئے بھی اس لئے انکار نہ کر سکے کہ کہیں اس انکار کی وجہ سے ان کی بیٹی کی خوشیوں بھری زندگی میں گھن نہ لگ جائے۔ بجبوراً انہیں ہاں کہنا پڑا۔ اور یہ شادی ہو گئی، ورنہ میں تو رشتہ داری میں شادی کے خلاف تھا۔"

جیسے جیسے انور کہتا جا رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اس کا دل بھر آیا اور آنکھوں سے اشک نکلنے کے لئے بے تاب ہو گئے۔

اس کے خوابوں کے سارے محل ایک ہی پل میں ٹوٹ کر بکھر گئے تھے ــــ انور پلنگ پر لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ اور وہ سر جھکائے بیٹھی سوچتی رہی کہ یہ کیا ہو گیا؟

اگر اسے پتہ ہوتا کہ اس کی شادی کسی دباؤ کے تحت ہو رہی ہے تو وہ کبھی شادی کے لئے تیار نہ ہوتی۔ لیکن اس کے گھر والوں نے تو کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا؟ انور اور اس کے گھر والوں نے بیٹی کی رشتہ داری کو خود ہی دباؤ سمجھا اور شادی کے لئے تیار ہو گئے۔

کمرے میں ایک کرب ناک خاموشی چھائی رہی۔

رات دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔

دوسرا دن اس کے لئے کئی الجھنوں میں گزرا۔

اسے پتہ تھا کہ رات جیسا برتاؤ انور نے کیا گھر والے بھی ایسا ہی برتاؤ کریں گے۔ ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ بڑی ضدی تھی۔ کوئی اس سے ذرا بھی طنز بھری بات کہہ دیتا تو اسے غصہ آ جاتا تھا اور وہ اس سے الجھ جاتی تھی۔ اب اگر کسی نے اس سے اس طرح برتاؤ کیا تو اس کے لئے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اس

> **انور کا انتظار کرتے کرتے وہ تھک گئی تھی۔ اسے جھنجھلاہٹ بھی ہو رہی تھی غصہ بھی آ رہا تھا شادی کے دوسرے دن ہی یہ حال ہے تو زندگی کیسے گزرے گی۔**

کی ذرا سی بھی غلطی اسے گھر والوں اور انور کی نظروں سے گرا سکتی ہے، اسے اپنائیت سے محروم کر سکتی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے طے کیا کہ وہ نئے گھر میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھے گی۔

نئی دلہن ہوتے ہوئے بھی اس نے گھر کے سارے کام اپنے ذمے لے لئے۔ اسے کسی نے روکا بھی نہیں۔

شام تک اس نے بہت سے کام کر ڈالے اور بجلی کی سی تیزی سے کام کرتے ہوئے گھر کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔

اس کی ان صلاحیتوں کو دیکھ کر گھر والے دنگ رہ گئے۔ اور اسی وقت سے انہوں نے اس کے ساتھ اپنائیت کا برتاؤ شروع کر دیا۔

"انور کی اماں! ہم تو سمجھتے تھے، بہو بس یوں ہی ہوگی لیکن وہ تو بجلی کی طرح کام کرتی ہے۔" ابا بولے۔

"ہری تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔" اماں نے جواب دیا۔

اس رات انور ایک بجے گھر آیا۔

انور کا انتظار کرتے کرتے وہ تھک گئی تھی۔ اسے جھنجھلاہٹ بھی ہو رہی تھی، غصہ بھی آ رہا تھا۔ شادی کے دوسرے دن ہی یہ حال ہے تو زندگی کیسے گزرے گی؟ وہ بھری بیٹھی تھی۔ لیکن انور کے آتے ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔

"آپ نے آنے میں بڑی دیر لگا دی!" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں اس سے کیا لینا ہے؟" انور خشک لہجے میں بولا۔ "میں کسی وقت بھی گھر آؤں، کسی وقت بھی گھر سے جاؤں ــــ تم پوچھنے والی کون ہوتی ہو؟"

انور کا اکھڑا اکھڑا سا جواب سن کر اسے غصہ آ گیا۔ دل چاہا کہ وہ بھی دو چار باتیں سنا دے۔ لیکن وہ یہ سوچ کر چپ رہی کہ اگر جھگڑا ہوا تو دونوں کے ذہن میں جو تناؤ پیدا ہو جائے گا اس تناؤ کی وجہ سے وہ رات بھر نہیں سو سکیں گے۔ آفس میں بھی انور کے ذہن پر یہی تناؤ طاری رہے گا اور وہ ٹھیک طرح کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ شام کو وہ غصے میں بھرا گھر آئے گا اور اس طرح معاملہ الجھتا ہی جائے گا۔

دن اسی انداز سے گزر رہے تھے۔ انور کے برتاؤ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اس کی ذرا سی غلطی پر بات کا بتنگڑ بنانے کی

ں کرتا تھا۔ لیکن بعد میں امّی ابّا اس کی
ری کرنے لگتے تھے۔ وہ انور کو ہی
تھے۔
"کیوں خواہ مخواہ اس بے چاری سے
رتا رہتا ہے۔ تنگ کرنے کی کوئی وجہ
ہو"
اس درمیان اس نے گھر والوں پر کھل لیا
یا تھا کہ وہ اس کے غلام بن کر رہ گئے تھے۔
کے بغیر گھر کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ سب اس
رد جمع رہتے تھے۔
امّی سارے محلّے میں اس کی تعریف
پھرتی تھیں۔ "میری بہو لاکھوں میں ایک ہے۔"
، وہ انور کے دل میں اپنا کوئی مقام بنانے
ناکام رہی تھی۔ انور کے رنگ ڈھنگ وہی
۔۔ رات کو دیر سے آنا۔ ذرا ذرا سی بات پر
سے اُلجھ پڑنا، اسے کوئی اہمیت نہ دینا۔
رح کا بُرا سلوک اس سے کرنا۔
وہ تو کچھ نہیں کہتی تھی۔ لیکن گھر والے
ں کی طرف سے انور کو سمجھاتے رہتے تھے:
یکھو بیٹے! ہم نے مانا کہ یہ شادی ہماری اور
ہاری مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ لیکن یہ
ناؤ سلمٰی میں ایسی کون سی کمی ہے جو ہم اسے
مولی سی بات پر ٹھکرا دیں —— تم ہی بتاؤ"
نر سلمٰی میں کون سی وہ خوبی نہیں جو تم اپنی بیوی
یں دیکھنا چاہتے تھے؟"
گھر والوں کی بات سن کر انور لاجواب
ہو جاتا تھا۔
دھیرے دھیرے انور کا سلوک
بھی بدلنے لگا۔ اس نے اس سے بات بات
پر جھگڑنا چھوڑ دیا۔ چُپ چاپ گھر آتا اور اپنے
کاموں میں لگ جاتا۔ اس سے بات بہت

کم کرتا۔ لیکن وہ اس سے کچھ کہتی تو اس کی
بات کا جواب دے دیتا۔ پہلے تو یہ حالت تھی
کہ وہ اس سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ اس سے
کچھ پوچھتی یا بات کرتی بھی تو اس کی بات کا
کوئی معقول جواب نہیں دیتا تھا۔
اس کی خاموشی نے شاید انور کو پگھلا
دیا تھا۔ ایک دن وہ اس سے بولا: "سنو؟"
"جی!"
"شادی کے بعد سے میں نے آج تک
تم سے کبھی سیدھی طرح بات نہیں کی۔
لیکن تم نے کبھی میرے اس سلوک کے
خلاف بغاوت نہیں کی میرے سارے کام

امّی سارے محلّے میں اس کی تعریف کرتی پھرتی تھیں میری بہو لاکھوں میں ایک ہے لیکن وہ انور کے دل میں اپنا کوئی مقام بنانے میں ناکام رہی ہے۔

کرتی ہو۔"
"آپ کی بیوی ہوں نا —— اس لئے۔"
"لیکن بیوی کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔
تم نے کبھی وہ حق بھی نہیں جتائے۔"
"فائدہ کیا! آپ مجھے بیوی ہی کب سمجھتے
ہیں۔ میں آپ کو پسند نہیں ہوں۔ پھر بیوی کے
حق جتا کر کیا فائدہ؟ آپ انہیں پورا کرنے سے
تو رہے۔"
اس کی بات سن کر انور کسی گہری سوچ میں
ڈوب گیا۔ پھر بولا: "میں نے سنا تھا، تم بڑی
ضدی ہو۔"
"کبھی تھی۔"

"لیکن تم نے تو کبھی کسی بات کے لئے
ضد نہیں کی۔ کبھی مجھ سے جھگڑا نہیں کیا۔"
"جھگڑا کر کے تناؤ بڑھا کر کیا حاصل؟
جھگڑے سے ہمارے درمیان جو فاصلے
ہیں وہ کم تو نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کا انجام کیا
ہو سکتا ہے، مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں
نہیں چاہتی کہ میرے ساتھ بھی وہی ہو۔" اس
کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آنسو پونچھنے لگی۔
لیکن آنسوؤں کی لڑی ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔
"کیا بات ہے، تم کیوں رو رہی ہو؟"
پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر انور تڑپ
اُٹھا۔
"کچھ نہیں۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی
"کچھ باتیں یاد آ گئیں۔"
"کیسی باتیں؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔"
"آپ ان باتوں کو سن کر کیا کریں گے؟"
"ہو سکتا ہے میں کچھ تمہاری مدد کر سکوں
تمہارے دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔"
"وہ بات یہ ہے۔" وہ سر جھکا کر بولی۔
"ان میاں بیوی کے جھگڑوں اور گھریلو تناؤ کی
وجہ سے ہی میرے بھائی کی موت ہو گئی تھی۔"
"کیا!" یہ سنتے ہی انور کے ذہن کو
ایک جھٹکا لگا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
اسے دیکھنے لگا۔
اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے
بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے تھے۔
"مجھے معاف کر دو سلمٰی۔ میں نے آج
تمہارے دل کو ٹھیس پہنچائی۔" انور نے اپنے
ہاتھوں سے اس کے گالوں پر گرتے ہوئے
آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

ڈروسلا جو کہ روم کے شہنشاہ کلی گولا کی بہن تھی کی سنہ ۳۸ قبل مسیح میں جب موت واقع ہوئی تو اس کے اعزاز میں ایک ماہ کا سوگ منایا گیا جس کے دوران غسل کرنا ایک جرم تسلیم کیا گیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی پھر سلمیٰ دھیمے سے بولی "میرے بھیا کی شادی بھی ہماری طرح ہی بے جوڑ ہوئی تھی۔ میرے بھیا بھی آپ کی طرح ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ وہ آزاد خیالوں کے ضرور تھے لیکن انہیں حد سے زیادہ آزادی پسند نہیں تھی۔ انہیں جو بیوی ملی وہ حد سے زیادہ آزاد خیالوں کی تھی۔"

سلمیٰ ایک لمحے کے لئے رکی، پھر کہنے لگی "اس بے جوڑ شادی کا انجام یہ ہوا کہ شادی کے تیسرے دن بعد ہی ٹکراؤ ہو گیا۔ بھابی کو گھر میں رہ کر گھر کے کام کرنا گھر کی دیکھ بھال کرنا، شوہر کا خیال رکھنا غلامی جیسا محسوس ہوا اور گھر والوں کو بھابی کا سہیلیوں کے گھر جانا پارٹیوں میں جانا، پارٹیاں دینا آزادی اور بے حیائی نظر آئی۔ بھیا جب بھی آفس سے آتے، بھابی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ وہ یا تو کسی پارٹی میں گئی ہوتیں یا کسی سہیلی کے گھر۔ اگر آتیں تو دو منٹ بھی ٹھیک طرح بات نہیں کرتیں۔ بھیا نے جب اس بات کی بھابی سے شکایت کی تو بھابی بھڑک اٹھیں "آپ مجھے گھر کی چار دیواری میں قید کر اپنی نوکرانی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں"۔ بھیا نے انہیں سمجھایا "دیکھو زیبا، میں تم پر اس طرح کی کوئی پابندی لگانا نہیں چاہتا کہ تم کہیں نہ آؤ جاؤ۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم گھر پر بھی دھیان دو جب میں آفس سے آؤں تو تم گھر پر رہا کرو" لیکن بھابی کو یہ بھی پسند نہیں تھا۔ پہلے تو بھیا نے پیار سے سمجھایا، لیکن پھر بھی بھابی نہیں مانیں تو کچھ سخت الفاظ کا استعمال کیا جنہیں بھابی برداشت نہیں کر سکیں اور صاف کہہ دیا: "یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھے اپنی بیوی نہیں، غلام سمجھتے ہیں۔ گھر کے کاموں کے لئے کوئی نوکرانی رکھ لیجئے۔ میں آپ کے لئے اپنی سہیلیوں اور سوشل سرگرمیوں کو نہیں چھوڑ سکتی"۔ جب معاملہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو بھابی میکے چلی گئیں۔ اس طرح گھر والوں کو اور بھیا کو ایک ذہنی اذیت سے نجات مل گئی۔ لیکن بھیا کے دل پر ایک چوٹ بھی لگی کہ ان کی بیوی تین مہینے میں انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

"بات اور بھی آگے بڑھ سکتی تھی لیکن بھابی کے ماں باپ سمجھ دار تھے۔ انہوں نے بھابی کو سمجھایا اور واپس گھر چھوڑ گئے۔ بھابی کے باہر جانے اور سہیلیوں سے ملنے پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن بھابی نے اس کا غلط مطلب نکالا۔ انہیں ایسا لگا جیسے ان کی مجبوری کا گھر والے اور سسرال والے دونوں فائدہ اٹھا رہے ہیں، انہیں قیدی بنا رہے ہیں۔ انہوں نے باہر آنا جانا تو چھوڑ دیا، لیکن بعد میں انہوں نے اپنی آزادی کے چلے جانے کا بدلہ گھر والوں اور بھیا سے لیا۔ وہ رات دن گھر میں ہی رہنے لگیں۔ کبھی بھیا باہر چلنے کے لئے بھی کہتے تو ان کے ساتھ نہ جاتیں۔ گھر والے تو کسی طرح ان کی ان باتوں کو برداشت کر جاتے تھے۔ لیکن وہی سلوک جب وہ بھیا کے ساتھ بھی کرتیں تو انہیں بہت دکھ ہوتا۔ صبح کو جب بھیا آفس جانے لگتے تو کسی بات کا بہانہ بنا کر بھابی جھگڑا کھڑا کر بیٹھیں جب بھیا آفس سے آتے تو ان سے بات نہ کرتیں۔

"روز روز کے ان جھگڑوں سے بھیا عاجز آگئے۔ اس تناؤ کی وجہ سے ان کا آفس کے کاموں میں دل نہیں لگتا تھا۔ آفس میں ان سے بار بار پوچھ گچھ ہونے لگی گھر میں بھی وہی تناؤ تھا۔ اس لئے وہ دیر سے گھر آنے لگے۔ دیر سے گھر آتے تو دیر سے آنے پر دونوں میں پھر جھگڑا ہوتا۔ اس تناؤ سے نجات پانے کے لئے بھیا نے شراب کا سہارا لیا۔ وہ شام ہوتے ہی شراب پینے لگتے اور نشے میں گھر آکر مدہوشی میں سب کچھ بھول جاتے۔

"جیسے جیسے دن بیتتے گئے بھیا کی شراب پینے کی مقدار بڑھنے لگی۔ ان کی صحت گرنے لگی۔ نشے میں ان سے ٹھیک طرح کام بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس پر بھی بھابی یا بھیا دونوں میں سے کسی کو ہوش نہیں آیا۔ آئے دن کے جھگڑوں نے دونوں کے درمیان کے فاصلے اور بھی زیادہ بڑھا دئے تھے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے نفرت بڑھتی گئی۔ وہ ایک دوسرے کو برباد ہوتا دیکھ خوش ہوتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی بات ماننے کو کسی طرح تیار نہیں تھے۔ بھیا عادی شرابیوں کی سی زندگی گزارنے لگے۔ رات کو بوتل بغل میں دبائے لڑکھڑاتے قدموں سے گھر آتے تھے انہیں

زت یا صحت کسی کا بھی خیال نہیں تھا۔

آخر ایک دن وہی ہوا جس کے تصور سے ہمارا دل لرزتا تھا۔ بھیا کو نوکری پر سے کال دیا گیا۔ اس چوٹ نے بھیا کو اور زیادہ بڑ ڈالا۔ ان کا دل دنیا سے بھر گیا اور وہ اور یادہ پینے لگے۔ ایک روز کسی بات پر بھیا اور بھابی کا خوب جھگڑا ہوا۔ بھیا غصے میں بھرے ھر سے نکل گئے — اور پھر ریلوے کی پٹڑی ران کی کئی حصوں میں بٹی ہوئی لاش ملی۔"

آخری الفاظ سن کر انور کے دل کو جیسے وئی تیر چیرتا چلا گیا۔ سلمیٰ اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے سسک رہی تھی۔ انور کچھ دیر سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"چپ ہو جاؤ سلمیٰ۔" دیر تک وہ انور کے سینے سے لگی سسکتی رہی، پھر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "اس بات کو سوچ سوچ کر میرا دل کانپ اٹھتا تھا۔ میں بھی بھابی کی طرح ہی ضدی تھی اور سہاگ رات کو ہی جب آپ نے کہہ دیا تھا کہ یہ شادی آپ کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے تو مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے پھر تاریخ اسی کہانی کو دہرا رہی ہے۔ اگر میں نے ضبط سے کام نہ لیا ہوتا، اگر میں آپ سے بھابی جیسا سلوک کرتی تو شاید پھر کسی کی بلی لیتا۔"

"تم بڑی ہو سلمیٰ۔" کہتے ہوئے انور نے پھر اسے لپٹا لیا۔ "میں نے تمہیں بہت غلط سمجھا۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں بہت بڑی بھول کی۔ تمہارے ساتھ ہر طرح کی بدسلوکی کی۔ تمہیں ہر طرح تنگ کرتا رہا۔ لیکن تم نے چپ چاپ برداشت کر لیا صرف میری بھلائی کے لئے۔ تم نے سچ کہا اگر تم بھی ٹکرا جاتیں تو ہماری دوری اور نفرت بڑھتی ہی جاتی۔ اور وہ تنازعہ کا ماحول پھر ایک بار اس کہانی کو دہراتا جو تمہارے گھر ہو چکی ہے۔"

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

"مجھے معاف کر دو میری دلہن۔ میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں۔ اب میں کبھی تمہیں کوئی دکھ نہیں دوں گا۔"

"اس میں معافی کی کیا بات ہے؟"

"نہیں تم پہلے مجھے معاف کر دو۔"

"دیکھیے، اب اگر آپ نے اپنے منہ سے معافی کا لفظ نکالا تو جھگڑا ہو جائے گا۔"

"مگر پیار بھرا جھگڑا۔" انور بولا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

○○

جوابات ہیلتھ کلب

● ج: (۱) غلط: نوزائیدہ بچے کو دو مہینے کی عمر میں پولیو کا شربت دینا چاہئے۔ دوسری خوراک مہینے کے بعد اور تیسری ۶ مہینے کے بعد دینا ہے۔ ا سال بعد ایک مزید خوراک اور آخری بار ایک ل اسکول میں داخلہ کے موقع پر دینا چاہئے۔

● ج: (۲) غلط: بچہ بار بار کان کھجلائے تو ممکن ہے کہ اس کے کان کے اندرونی حصے میں برباد ہو گیا ہو۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

● ج: (۳) غلط: بچے کو بھاری کمبل میں لپیٹنے سے بخار بڑھ جائے گا۔ بچے کو ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنائیں اور چادر میں لپیٹ کر لٹا دیں، سردی میں معمولی کمبل کافی ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ہر بخار میں اسپرو دینا غلط ہے۔ معمولی بخار صحت کے لئے نقصان ہونے کی بجائے مفید ثابت ہوتا ہے اس سے جسم کی مدافعت کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔

● ج: (۴) صحیح: خسرا کے دانے خود بخود سوکھ جائیں تو ان کا نشان باقی نہیں رہتا۔ انھیں کھجانے سے انفکشن کا خطرہ رہتا ہے اور داغ باقی رہ جاتا ہے۔ بچے کے ناخن کاٹ دیں۔ مزید احتیاط کے لئے اس کی انگلیوں پر پٹی باندھ دیں۔ کیلومین لوشن داغ پر لگانے سے ٹھنڈک پہنچتی ہے، اور خارش نہیں ہوتی۔ بچے کو بستر پر لٹائے رکھیں اور اسے خوب پانی پلائیں دو ہفتے میں سارے دانے سوکھ جاتے ہیں اور انفکشن کا خطرہ نہیں رہتا۔ بیماری کے دوران بچہ کو اسپرو دینا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

● ج: (۵) غلط: بچے کے دودھ کے دانتوں کی اتنی ہی احتیاط کرنی چاہئے جتنی بعد میں نکلنے والے دانتوں کی۔ اگر بچے کے ابتدائی ۲۰ دانتوں کی حفاظت نہیں کی گئی تو اس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ آگے چل کر ۳۲ دانتوں کا سیٹ بھی بے قاعدہ ہو جائے گا۔ بعض گیارہ بارہ سال کی عمر تک نہیں گرتے۔ اس دوران بچے کو چبانے کے لئے مضبوط دانتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے

(فیض)

شبستاں کا تاریخی رنگین

فیض نمبر

شائع ہو چکا ہے۔

یہ ایک مکمل اور جامع
ادبی دستاویز ہے۔
جسے صدیوں محفوظ رکھا
جائے گا۔

سوانحی مضامین، تنقیدی جائزے،
نادر و نایاب رنگین تصویریں

شائع ہو گیا شائع ہو گیا شائع ہو گیا۔۔

فیض کے صد رنگ اور سدا بہار کلام
کا عطر آپ کے ادبی ذوق کی آسودگی کا مکمل سامان۔

ہندوستان، پاکستان اور انگلستان کے نامور ادیبوں کے تعاون سے پیش کیا گیا ہے۔

آپ اس نمبر کو ہمیشہ محفوظ رکھنا پسند کریں گے
اس نمبر کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے

قیمت: پندرہ روپے

اپنے قریبی کتب فروش سے آج ہی رابطہ قائم کریں یا براہ راست ہمیں لکھیں:

شبستاں اردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

دل کے آنگن جھڑی لگی تھی
اُمنڈی تھی برسات
جانے کیا تھی بات
لندن کی اُس بھیگی رات
میں تھی بہت اُداس
دروازے سے جھانکا اُس نے
میرے کمرے میں وہ آیا
میری جانب قدم بڑھایا
آکے بیٹھا میرے پاس
جانے کیا تھی بات
میں تھی بہت اُداس
ہاتھ مرا ہاتھوں میں لے کر
بِن بولے آنکھوں میں جھانکا
میرا ماتھا چوما اُس نے
مجھ کو اپنے گلے لگایا
پیار بھرا اک گیت سُنایا
میرے گلے میں ڈالیں باہیں
جگ مگ کر دیں میری راہیں
خوشبو، خوشبو آنچل آنچل
مہکا گجرا، پھیلا کاجل
تھم گیا طوفاں چھٹ گئے بادل
دھیرے دھیرے آئی لبوں تک
اک بھولی بھٹکی مُسکان
سارے دُکھڑے بھول گئی میں
مارے خوشی کے پھول گئی میں
سارے دکھوں کو دے گئے مات
"ننھے منے سے دو ہاتھ"
جانے کیا تھی بات
لندن کی اُس بھیگی رات

محسنہ جیلانی

دوہا

بزمِ بانو

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی آپ کے
سوالات کے دل چسپ جوابات
دیتی ہیں۔
ایک پوسٹ کارڈ پر صرف
دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے
نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری
ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔
سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ
نہ لکھیں، صرف نام لکھنا کافی ہے۔
مدیرہ

بزمِ بانو
ماہ نامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

[...]بنا فرزانہ رشیدی کامٹی، ناگپور

[...]:۔ انسان سے لحاظ کا دامن کب [...]چھوٹ جاتا ہے؟

[...]جب اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی [...]ہے یا جب برا وقت پڑتا ہے جینے کے [...]لئے بے شرمی کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ [...]تب قسمت کو الزام دیتی ہے۔ اسی وجہ [...]سے ناقص العقل کہلاتی ہے۔ دنیا بدل رہی [...]ہے۔ رشتے ناطے ٹوٹ رہے ہیں لڑکیاں [...]اُلجھ رہی ہیں۔ باپ بھائی کہیں سے [...]پالن ہار ڈھونڈ کر لائیں تو نصیب کھلے۔

[...]:۔ کیا کامیابی بغیر جدوجہد کے بھی مل سکتی ہے؟

[...]تھوڑی سی چوری کی تکلیف تو گوارا کرنا ہی پڑے گی۔ کچھ بے ایمانی چار سو بیسی بھی جھیلنی پڑے گی۔ آج کل یہی حربے کامیابی بخش رہے ہیں۔ دیکھنا ہے یہ کب تک چل سکے گا، پر اکثریت کی سمجھ میں آتا جا رہا ہے کہ انسان کو اپنے اُوپر بھروسا کرنا پڑے گا۔ خاص طور پر لڑکیوں کو بس کماؤ شوہر پر بھروسا کر کے زندگی گزارنے کی عادت بدلنا ہوگی۔ مرد کی کمائی پر شوق پورے کرنے کا وقت گیا۔ والدین کو لڑکی کیا دیتی ہے جو وہ اس سے بیٹے جیسی محبت کریں۔ لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ لڑکیاں شوقین مزاج پڑھنے سے جی چُراتی ہیں۔ صورت شکل پر بھروسا کرتی ہیں۔ گھنے بالوں اور گوری رنگت کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ والدین پھر شوہر پر پھر بیٹوں کے رحم و کرم پر جیتی مرتی ہیں۔ بغیر جدوجہد کے عیش کے نسخے تلاش کرتی ہیں۔

محمد ابراہیم راہی، بالنواڑہ

س:۔ محبوبہ اگر جنت کا خواب ہے تو بیوی؟

ج خواب اور وہ بھی جنت کا انخواب ہی رہے تو اچھا ہے۔ بیوی نہایت ٹھوس حقیقت ہوتی ہے۔ ایسا کیجیے کہ یا تو محبوبہ کو بیوی بنا لیجیے یا بیوی کو محبوبہ۔ پتہ چل جائے گا۔

س:۔ دوستی دو قدم تو محبت ...... ؟

ج جنم جنم۔

سرور عالم انصاری، چھپرہ، (بہار)

س:۔ محبت ایک طوفان کی طرح دل میں کب آتی ہے؟

ج جب سینے میں دل کی جگہ ایک سوکھا پتھر ہو۔

مسز رقیہ صمد، حیدرآباد

س:۔ اردو زبان کے رسم الخط کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج اُردو نہایت شیریں اور آسان زبان ہے۔ وہ جس رسم الخط میں بھی لکھی جائے عام انسان کے کام آئے گی۔ نہ جانے دنیا کی زبانیں ایک ہی رسم الخط میں کیوں نہ رہیں۔

س:۔ عورت کو ماضی، حال اور مستقبل میں سے کس کی زیادہ فکر رہتی ہے؟

ج ماضی، حال اور مستقبل کی اہمیت ہر جان دار کے لئے اہمیت رکھتی ہے جنس کا ٹھپّہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ویسے فکر کرنے کا بوجھ مرد نے زبردستی اکیلے اُٹھا رکھا ہے۔

شیخ عثمان آزاد، نصیر آباد، (جلگاؤں)

س:۔ کیا غربت میں انسان کی عقل بھی کام نہیں کرتی؟

ج بالکل درست! دنیا میں غریبوں کی اکثریت اس بات کا ثبوت ہے۔ بہت مختصر سی امیر انسانوں کی ٹولی ان کے خون سے

ہولی منا رہی ہے۔ اور وہ اپنے سے بھی زیادہ غریب اور کم زور کو لوٹ رہے ہیں قتل کر رہے ہیں۔ ان کی پہنچ اُوپر والوں تک تب ہے نہیں۔ اپنے سے بھی کم زور کو مار لیتے ہیں۔

س :۔ شادی کرنے کا طریقہ بتلایئے ؟

ج گھر کی خواتین کو ایک عدد دُلہن کی تلاش میں بھیجیے۔ لڑکیاں بھی شادی کی اُمید لگائے سوکھ رہی ہیں۔ آسانی سے دُلہن مل جائے گی۔ بینڈ باجے اور جوڑے گھوڑے کے چکر کو بھول کر بس خاموشی سے نکاح کر ڈالئے۔ اس میں ایسی مشکل کیا ہے؟ رہی وہ بینڈ باجے والی شادی تو وہ حماقت ہے۔

...الدین خاں، راوڑکیلا (اُڑیسہ)

س :۔ جس کلی کو سورج کی جھلک نصیب نہ ہو کیا اس کو پھونک مار کر شگفتہ کیا جا سکتا ہے؟

ج سورج کا کرایہ تو نہیں دینا پڑتا۔ اگر آپ پھونک مار کے بجلی کا بلب بجھا سکتے ہیں تو ضرور کلیاں بھی کھلا دیں گے۔ کوشش کر کے دیکھ لیجیے۔

س :۔ کیا اچھی اور دل نشیں باتوں کے لئے آراستگی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ج یہ لفظ آراستگی ڈکشنری میں تو نہیں ہے۔ کیا سجاوٹ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ بات کام کی ہو تو کئی پھندنے لگانے کے بجائے سیدھے سادے طریقے سے کہہ دینا بہتر ہے۔

س :۔ فقیری اور بادشاہی میں کتنا فرق ہے؟

ج بس اتنا فرق ہے جتنا سیاہی اور سفیدی میں۔ فقیر دل کا بادشاہ ہو سکتا ہے اور بادشاہ کم ظرف اور ظالم ہو سکتا ہے۔

بے نذیرا عظمی، مغل سرائے

س :۔ کوئی لڑکی کسی داغ دار لڑکے سے شادی کرنے پر کب آمادہ ہوتی ہے؟

ج لڑکا تو گھی کا لڈّو ہوتا ہے۔ ٹیڑھا بھی ہو تو میٹھا اور مزے دار ہوتا ہے اگر داغ دار سے مطلب کسی بھیانک مرض کا داغ ہے تب تو ان جانے میں شادی پر راضی ہو جاتی ہوگی۔

س :۔ دولت سے عزّت یا عزّت سے دولت؟

ج آج تو دولت سے سب کچھ ملتا ہے عزّت نہ بھی ملے تو ٹھاٹ تو ہو ہی جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں اسمگلروں کو بہت نیچا سمجھا جاتا تھا۔ اب ان کی دولت کی مدد سے بڑی اونچی کرسیاں حاصل کی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں دولت سے حاصل کی ہوئی عزّت کچھ زیادہ پائیدار نہیں ہوتی۔ اونچی گدّی تو مل جاتی ہے مگر ہر دم یہی خوف طاری رہتا ہے اور زیادہ پیسے والا ٹانگ گھسیٹ کر کرسی سے اُتار بھی سکتا ہے۔ وہ محبّت اور عزّت زیادہ پائیدار اور سکون بخش ہوتی ہے جو فن کار کو ملتی ہے۔ جس میں روپیہ کا لین دین نہیں ہوتا۔

سید ارشد اقبال تھپرہ، (بہار)

س :۔ اس دور میں انسان اگر ضمیر کی سنتا رہے تو؟

ج زندگی کی راہیں ہموار ہو جائیں گی۔ مگر ضمیر سے جھوٹ نہیں بولنا چاہئے ورنہ بھٹک جائے گا فریب۔

س :۔ دنیا میں کون سا امتحان اہمیت رکھتا ہے؟

ج سب ہی امتحان پوری توجہ کے حق دار ہیں۔ بنیادی امتحان حق اور باطل میں تمیز کرنے کا ہے۔ اگر اس میں اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے تو پھر تو بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

رباب سیدہ نقوی، علی گڑھ

س :۔ جس کی ہر سحر میں شب کا سا اندھیرا ہو تو اس انسان کی زندگی؟

ج دل اور دماغ میں خود اعتمادی کا سورج اُتارے وہ انسان تو زندگی کی شامیں روشن ہو جائیں گی۔ زندگی جینے کی آرزو سے جگمگا اُٹھے گی۔

س :۔ زندگی کی راہیں ناہموار ہوں اور راہی کم زور تو؟

ج بہت سے کم زور دل میٹھی راہوں کو ہموار بنانے کے طریقے سوچیں ایک تار کم زور ہوتا ہے۔ بہت سے کچے سوت کے تاروں سے مضبوط رسّی بن سکتی ہے۔

ایم۔ عبد الحق جو لاساہی، کٹک

س :۔ کوئی کہتا ہے کہ عورت ایک پھول ہے کوئی کہتا ہے کہ عورت ایک شعلہ ہے حقیقت میں عورت کیا ہے؟

ج ہر جاندار شعلہ اور شبنم کا مرکب ہے بعض لوگوں میں توازن بگڑ جاتا ہے یا تو بات بات پر بھڑکتے ہیں یا سر جھکا کر زبردست کی دھونس سہ لیتے ہیں۔

دیوی کا تیوہار

ہمالیہ والا

نیپال دُنیا کے اُن گنے چُنے ممالک میں سے ایک ہے جہاں ابھی تک بادشاہت چلتی ہے۔ انگلستان کی طرح، نیپال کے لوگ بھی پُرانی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اُن کی پابندی بڑے اہتمام سے کرتے ہیں۔ آج ان کی ایک ایسی ہی روایات کے بارے میں سنئے۔

'کماری رسیت' کی رسم نیپال میں کئی صدیوں سے منائی جاتی رہی ہے۔ مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ رسم دسویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی تھی۔ جدید نیپال کے بانی پرتھوی نارائن شاہ نے کھٹمنڈو پر ۱۷۶۸ میں چڑھائی کی تھی۔ اس وقت کماری میلہ شہر میں منعقد ہو رہا تھا۔ کھٹمنڈو کے اصلی راجہ نے جب اپنے آپ کو گورکھا سپاہیوں سے گھرا ہوا پایا تو اس نے خاموشی سے ہتھیار ڈال دئے۔ اس
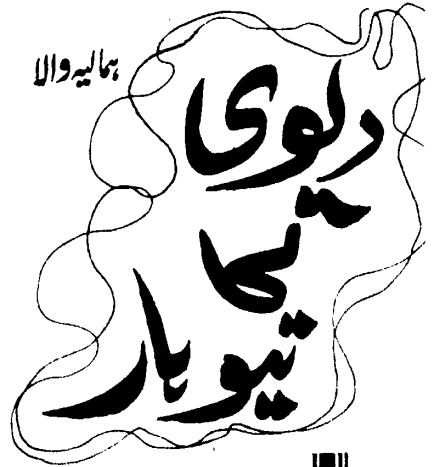
طرح نیپال کسی خون خرابے کے بغیر پرتھوی نارائن شاہ
کے ہاتھ آگیا اور انہوں نے کماری رسیت پہلے
کو جاری رہنے دیا۔

ہر سال ستمبر کے مہینے میں قمری بارہ
تاریخ کو "کماری" اپنے محل سے نکلتی ہے اور
صدیوں پرانے گھوڑا کی طرح بنی ہوئی "گاڑی" میں
بیٹھ کر کھٹمنڈو شہر کے بازار اور گلیوں سے گزرتی
ہے۔ کماری کون ہے؟ وہ ایک نابالغ لڑکی ہوتی
ہے۔ اُسے ہر طرح کی سہولت ملتی ہے۔ اپنے محل
میں وہ شہزادیوں کی سی زندگی گزارتی ہے ایک
چھوٹے سے تخت پر بیٹھ کر دربار کرتی ہے۔ نیپالی
لوگوں کے دلوں پر اس کا راج ہے۔ یہ راج بالغ
ہونے سے پہلے ختم ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ روایت
کے مطابق دیوی خون نہیں دیکھ سکتی۔ اس کے بعد
اس کی جگہ دوسری لڑکی کماری بنائی جاتی ہے۔

کماری اپنے محل سے سال میں ایک
عزرہ دن نکلتی ہے۔ اس روز پورے شہر میں
تیوہار کا سا سماں بندھتا ہے۔ ہجوم در ہجوم
لوگ کماری کے درشن کرنے کے لئے امڈ سے
پڑتے ہیں۔ اس کی سواری کا شاہ خود آغاز کرتے
ہیں۔ کماری شاہ کے ماتھے پر لال ٹیکا لگاتی ہے
اور چاول اُس کے سر پر ڈالتی ہے۔ نیپالیوں کا
عقیدہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کماری جسے لوگ
جیتی جاگتی دیوی مانتے ہیں شاہ کے ماتھے پر ٹیکا
لگانے میں ناکام رہے تو شاہ اپنا راج کھو سکتے
ہیں یا اپنی جان گنوا سکتے ہیں۔

شہر میں کماری کی سواری جیسے جیسے
آگے بڑھتی ہے لوگ اس پر پھولوں اور سکوں
کی بارش کرتے رہتے ہیں۔ وہ رتھ جس میں دیوی
بیٹھتی ہے خوب آراستہ ہوتا ہے اور اُسے
سینکڑوں سجھگت کھینچتے ہیں۔ یہ جلوس ہنومان
ڈھوکا کے پاس رکتا ہے۔ وہاں بھیروں دیوتا
کا مندر ہے۔ بھیروں کے بت کے منہ سے
ایک لمبا پائپ لگا ہوتا ہے، جس میں سے چاول
سے بنی شراب بہتی ہے۔ کماری اس شراب
کے کچھ گھونٹ لیتی ہے اور پھر جلوس آگے بڑھتا
ہے۔ جلوس کے آگے آگے دو سو سال پرانی
سالار جنگ پلٹن کے جوان مارچ کرتے ہوتے
ہیں۔ بچی ہوئی شراب کا ایک گھونٹ پینے کے
لئے لوگ مندر میں ٹوٹے پڑتے ہیں۔ کماری
واپس اپنے محل میں چلی جاتی ہے۔

کماری یا دیوی کے انتخاب کا بھی
عجیب طریقہ ہے۔ نیپال کے پرانے باشندے
نیوار کہلاتے ہیں۔ نیواری بہت اچھے کسان
اور باہنر لوگ تھے۔ دراصل کماری تیوہار نیواری
تیوہار ہی ہے، جو ملا راجاؤں کے دور میں شروع
ہوا تھا۔ اس زمانے میں، ملا راجاؤں کی دیوی
تالیجو بھوانی تھی اور اسی کے اوتار کے روپ
میں کم سن لڑکیوں کو دیوی بنانے کی رسم شروع
ہوئی۔

کماری کے انتخاب کے طریقے کی تفصیلات
خفیہ رکھی جاتی ہیں۔ انتخاب کرتے پجاری کرتے ہیں
پانچ یا چھ سال کی کچھ لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔ عموماً
یہ شاکیہ قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان لڑکیوں کی
جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ انہیں کئی طرح کے
مشکل امتحانوں اور کٹھن مرحلوں سے گزرنا
پڑتا ہے۔ ان میں ایک امتحان یہ بھی ہوتا ہے
کہ لڑکیوں کو اندھیرے کمرے میں بند کر دیا جاتا
ہے اور کمرے میں جانوروں کی کھوپڑیاں بکھیری
جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہونے والی دیوی
ایسے بھیانک مناظر سے نہ گھبرائے اور مضبوط
دل اور ثابت قدم رہے۔ ان لڑکیوں کو دکھائی
دینے والے خوابوں کی بھی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ
یہ بھی مانا جاتا ہے کہ تالیجو بھوانی سپنے میں کوئی
اشارہ دے گی۔

منتخب ہونے والی لڑکی 'دیوی' اور
'کماری' بن جاتی ہے۔ وہ اپنے کنبے اور دوستوں
کے ساتھ عیش و آرام سے اس محل میں رہتی
ہے جو اس کے لئے مخصوص کیا جاتا ہے۔ اس کا
راج بالغ ہونے تک رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ
عام شہری بن جاتی ہے۔ لطف کی بات یہ کہ جو
لڑکی کماری رہ چکی ہو۔ اُسے ور نہیں ملتا، کیوں کہ
نیواری لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جو بھی کماری سے
بیاہ کرے گا، ایک ہی سال میں مر جائے گا۔
دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے مرد جنہوں نے
سابق کماری سے شادی کی لمبی عمر تک پہنچے، اس
کے باوجود، لوگ ہچکچاتے ہیں۔ ■■

(انگریزی سے ماخوذ)

پوری تاریخ میں سب سے منحوس فیشن ڈیزائن

۱۱۹۶ سے ۱۲۰۲ تک یمن پر حکومت کرنے والے
ملک العزیز نے ۹ فٹ سے پیچھے والا ایک
شاہی چوغہ تیار کرایا تھا۔ اس کی پوشاکوں کی
فضول خرچی نے اس کی رعایا کو اتنا ناراض کر دیا
تھا کہ اُس نے بغاوت کر دی اور اسے مار ڈالا۔

نتیجہ: خیال اپنا اپنا

کیا عورت تنہا زندگی گزار سکتی ہے؟

اس مقابلے میں حصہ لینے والی زیادہ تر بہنیں اور بھائی عورت کے تنہا زندگی گزارنے کے مخالف نظر آئے مسز دلشاد فیاض قاضی (پونے) کی تحریر پہلے انعام (سو روپے) کی حق دار ٹھہرائی گئی۔ شمیم ثریا (گلبرگہ) کو دوسرا انعام (پچاس روپے) اور متین صدیقی (حیدرآباد ۔۲) کو تیسرا انعام (تیس روپے) دیا جا رہا ہے۔ انعام حاصل کرنے والی تحریریں یہاں شائع کی جا رہی ہیں۔

پہلا انعام:

عورت اور مرد کے درمیان محبت کا جذبہ فطری اور پیدائشی طور پر ہوتا ہے، ورنہ خدا نے آدم کے وجود کے ساتھ حوا کو پیدا کرنا ضروری نہ سمجھا ہوتا۔ مرد اور عورت دونوں کا وجود بجائے خود اس بات کی قدرتی دلیل ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر زندگی کا حسین سفر طے کرنا ناممکن ہے۔ عورت جتن کر کے مرد کی سرپرستی کے بغیر زندگی کی گاڑی کو ایک زندہ لاش بن کر ضرور کھینچ سکتی ہے لیکن وہ زندگی کی اُمنگ، خوشی اور دلی سکون نہیں پا سکتی۔

عورت اگر تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتی بھی ہے تو نہایت مجبوری میں۔ قدیم زمانے سے لے کر آج تک عورت کو ایک کھلونا ایک حقیر چیز سمجھا جاتا رہا۔ ہر دور میں کبھی اس کے جذبات سے کھیلا گیا تو کبھی اس کی آرزوؤں کو پامال کیا گیا، کبھی اسے ستی کے روپ میں جلایا گیا، تو کبھی پیدا ہوتے ہی اسے منحوس قرار دیا گیا۔ آج بھی جہیز کو لے کر اس پر ظلم ہوتا ہے۔ جب ہم کسی سے نفرت کریں، اس کی توہین کریں تو اس کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے اس میں دشواریوں کو جھیلنے اور کچھ کر دکھانے کی خواہش یا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ آج کی ہر وہ لڑکی جو اپنی زندگی سے مایوس ہوتی ہے مردوں کے دوش بدوش چل کر ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ بھی ناموافق حالات سے ڈٹ کر مقابلہ کر سکتی ہے۔ لیکن عورت کا یہ ردِ عمل فطری نہیں ہے۔ اس راہ پر چل کر اسے سکھ نہیں ملتا۔

ضبطِ نفس انسان کا بڑا ہتھیار ہے جو مردوں سے زیادہ عورت میں ہوتا ہے۔ ایک تنہا عورت مرد کے بغیر عزت، دولت، شہرت، سب کچھ پا سکتی ہے، لیکن پھر بھی اس کی زندگی میں ایک خلا سا رہے گا۔ دل و دماغ کی کشمکش کا اثر اس کے اندرونی سکون کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ تب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پیار بھرا لمس یا ایک پیار بھری نظر ہی اس کی ساری خوشیاں لوٹا سکتی ہے۔ کبھی کبھی اس کا اظہار وہ اپنی خودداری کی وجہ سے نہیں کرتی، لیکن اندر ہی اندر سلگتے رہنے کو زندگی گزارنا نہیں کہا جا سکتا۔

مسز دلشاد فیاض قاضی، پونے

دوسرا انعام:

عورت کا تنہا زندگی گزارنے کا تصور ہی محال ہے۔ وہ ابتدا سے ہی کسی نہ کسی کے ساتھ رہنے کی عادی ہوتی ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، شوہر اور بچے اس کی زندگی کے مختلف ادوار میں اُس کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ہاں اگر اس سوال سے مراد یہ ہے کہ کیا عورت جیون ساتھی کے بغیر زندگی گزار سکتی ہے، تو بھی میرا جواب نفی میں ہوگا۔ عورت فطرتاً ملنسار ہوتی ہے۔ اُسے میل جول رکھنا، اپنی ذات کا اظہار دوسروں پر کرنا پسند ہوتا ہے۔ خاندانی زندگی اسے عمر کے ہر دور میں اچھی لگتی ہے چاہنے اور چاہے جانے کا جذبہ بھی اس میں شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنی محبت کو بانٹنا بھی چاہتی ہے ایک بیٹی، ایک بیوی، ایک ماں یا پھر ایک سہیلی کی حیثیت سے وہ محبت دینے اور محبت پانے کی آرزومند رہتی ہے۔

خلوت پسند عورت کے چہرے پر وہ آسودگی اور ممتا کی نرمی دکھائی نہیں دیتی جو جلوت پسند عورت کے چہرے پر ہوتی ہے، کیوں کہ تنہائی پسند عورت اپنی فطری جبلت کو کچلنے کی کوشش میں نارمل نہیں رہتی۔ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ تنہا رہنے والی عورت ضرورت سے زیادہ کم گو اور محتاط یا پھر چڑچڑی اور بدمزاج ہوتی ہے۔ عورت کی فطری تکمیل کے لئے اُس کا اجتماعی زندگی سے تعلق ضروری ہے۔

شمیم ثریا، گلبرگہ

تیسرا انعام:

عورت، جسے صنفِ نازک کہا جاتا ہے، ہر موڑ پر کسی نہ کسی سہارے کی محتاج رہتی ہے۔ اس کے بچپن میں باپ اور شادی کے بعد شوہر نگہباں کے روپ میں موجود ہے، جو ہر قدم پر اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ ایسے رشتوں کو چھوڑ کر ایک عورت کا تنہا زندگی گزارنا ایک ایسا رویّہ ہے جس سے بے شمار مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ تنہا عورت کو دیکھ کر مطلب پرست لوگ اس پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں لوگوں کی نکتہ چینیاں بڑھ جاتی ہیں۔ سماج میں عورت کی تنہا زندگی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک عورت تن تنہا یعنی صرف اپنے لئے جئے، جب کہ دوسروں کو پروان چڑھانا اس کا اوّلین فرض ہے؟

شوہر کی خدمت اور بچوں کی پرورش سے عورت کو جو خوشی حاصل ہو سکتی ہے وہ تنہا زندگی میں میسر نہیں آتی۔ آنگن میں ہنستے کھیلتے بچے اور شوہر کی مسکراہٹ عورت کی زندگی کو پرسکون بناتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر گود سونی ہو یا پھر تند مزاج شوہر سے سابقہ پڑ جائے تو عورت بعض اوقات تنہا ماحول کو ہی بہتر سمجھنے لگتی ہے۔ ساس نندوں کے چبھتے ہوئے تیر بھی اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ کاش وہ گھر گرہستی کے جھنجھٹ میں پڑی نہ ہوتی۔ اس سے تو بہتر تنہائی تھی۔ لیکن اگر وہ سب بندھن توڑ کر سہاگ کھڑی ہو تو تنہائی ہی اسے کاٹنے کو دوڑتی ہے اور وہ اپنے فیصلے پر پشیمان ہو جاتی ہے۔

حضرت آدم اور بی بی حوا کی ایک غلطی سے ناراض ہو کر خالقِ کائنات نے انہیں زمین پر الگ الگ مقام پر اُتارا تو وہ پریشان رہے اور خدا نے انہیں معاف کر کے جب ایک دوسرے سے ملا دیا تو مسرت بھری زندگی گزارنے لگے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تنہا زندگی مشکل سے کٹتی ہے۔ اور پھر ایک عورت کا تنہا زندگی گزارنا مشکلات کے بھنور میں پھنس جانے کے مترادف ہے۔ مختصر یہ کہ عورت تنہا زندگی نہیں گزار سکتی، کیوں کہ ہر قدم پر اسے تحفظ کی ضرورت ہے۔

متین صدیقی، حیدرآباد ■

تصویر کا عنوان نمبر ۱

اس تصویر کا موزوں اور برمحل عنوان ہمیں لکھ بھیجئے۔ سب سے اچھا عنوان تجویز کرنے والے کو "حنیفہ" کے دو پیکٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ صرف وہی عنوانات مقابلے میں شریک ہو سکیں گے جو ۱۰۔اپریل ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جائیں۔ اپنا جواب ساتھ لگے کوپن پر ہی بھیجنا ہوگا۔

تصویر کا عنوان نمبر ۱، ماہ نامہ بانو آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

عنوان ------------------------------------

نام ------------------------------------

پتہ ------------------------------------

تصویر کا عنوان نمبر ۲

اس تصویر کا موزوں اور برمحل عنوان ہمیں لکھ بھیجئے۔ سب سے اچھا عنوان تجویز کرنے والے کو "زنبی پاؤڈر" کے دو پیکٹ انعام میں دئے جائیں گے۔ صرف وہی عنوانات مقابلے میں شریک ہو سکیں گے جو ۱۰۔اپریل ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جائیں۔ اپنا جواب ساتھ لگے کوپن پر ہی بھیجنا ہوگا۔

تصویر کا عنوان نمبر ۲، ماہ نامہ بانو آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

عنوان ------------------------------------

نام ------------------------------------

پتہ ------------------------------------

ے جادوگر الیاس سیتاپوری کا تازہ ترین شاہ کار

رم سرا کا محبوب

حرم سرا کا محبوب — تازہ ترین

الیاس سیتاپوری کی تحریروں میں گوند اور شہد کا ملا جلا مزا ۔ایک بار شروع کر دینے کے بعد اُن کی کسی بھی کہانی کو بیچ میں چھوڑ دینا نہیں ۔تاریخ کے باب ننگے کرداروں کے رُوپ میں سامنے آجاتے ۔اُن میں فاتح لٹیرے بھی ہیں اور شکست کھا جانے والے بادشاہ بھی۔ یہ، بیوی، لونڈی اور داشتہ کے رُوپ میں حسینائیں بھی ہیں اور ان کو ٹھکرا کر ت کو گلے لگا لینے والے سُورما بھی۔ قیمت: پندرہ روپے (ڈاک خرچ الگ)

کشمیر کی کلی

قیمت: سو کر روپے (ڈاک خرچ الگ)

داستانِ حُور

قیمت: پندرہ روپے (ڈاک خرچ الگ)

دیوی کے پرستار

قیمت: بیس روپے (ڈاک خرچ الگ)

الیاس سیتاپوری کے دیگر شاہ کار جو شمع بُک ڈپو نے عمدہ کاغذ پر آفسیٹ سے شائع کئے ہیں:

زادی کا نیلام — پندرہ روپے (ڈاک خرچ الگ)

بالاخانے کی دُلہن — قیمت: پندرہ روپے (ڈاک خرچ الگ)

حرم سرا — قیمت: پندرہ روپے (ڈاک خرچ الگ)

چاند کا خدا — قیمت: پندرہ روپے (ڈاک خرچ الگ)

عجائب خانۂ عشق — قیمت: پندرہ روپے (ڈاک خرچ الگ)

اندر کا آدمی — قیمت: دس روپے (ڈاک خرچ الگ)

راگ کا بدن — قیمت دس روپے (ڈاک خرچ الگ)

ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر گھر بیٹھے وی پی ڈاک سے منگائیے، یا اپنے اخبار فروش سے طلب کیجئے!

شمع بُک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

انتباہ:

الیاس سیتاپوری اور ضیا تسنیم بلگرامی کی تمام کہانیوں اور کتابوں کے ہندوستان میں اشاعت کے حقوق شمع بُک ڈپو کے نام محفوظ ہیں۔ بلا اجازت شائع کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

●● آپ کو ہندوستان کے کسی گوشے میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں اردو، انگریزی، ہندی، پنجابی کتابیں یا رسائل منگوانے ہوں تو شمع کے ادارے کو خدمت کا موقع دیجئے۔ ہر ملک میں شہر شہر ہمارے ایجنٹ بنائے جا رہے ہیں!!

حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں۔

...ملنے کے لئے قیمت اور محصول ...رم کرنے کے لئے تحریر فرمائیں، یا منی آرڈر بھیجیں۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں عورتوں کا حصہ

رفعت پروین

ہندوستان ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا
ا۔ ملک کا جھنڈا قانون ساز اسمبلی میں
یا۔ یہ اسمبلی ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت
یان قائم کی گئی تھی۔ بعد میں مسلم لیگ نے
س حکومت میں شریک ہونے کا فیصلہ
۱۵ اگست کو ہندوستان آزاد ہوا تو
لسم پنڈت نہرو نے ترنگا جھنڈا
ں بلند کیا۔ یہ جھنڈا انہیں بنسابتہ نے
کیا تھا۔ بنسابتہ اس وقت آل انڈیا ویمنز
س کی صدر تھیں۔

بنسابتہ کے لئے ترنگا جھنڈا بنانا اور
۱۹۴۷ء میں پارلیمنٹ میں پیش کرنا آسان تھا
آزادی سے ستر اسی سال قبل یہ جھنڈا
ت کی نشانی تھا۔ اسے لہرانا خطرے کو دعوت
تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان پر انگریز
راج تھا۔ اس وقت ملک کی آزادی
متعلق سوچنا بھی دیوانے کا خواب معلوم ہوتا
۔ گاندھی جی ابھی جنوبی افریقہ میں تھے۔
۔ بڑائی ایک جیل میں سزا کاٹ رہے تھے۔
وقت ایک عورت نے ہندوستان کا
ترنگا بلند کیا۔ یہ عورت بھیکا ئی جی کاما تھی۔
یاب پارسی عورت تھی۔

وہ ۱۹۱۳ء کا زمانہ تھا۔ ابھی پہلی جنگِ عظیم
ث نہیں ہوئی تھی۔ انگریزوں کا ڈنکا سارے
یا میں بج رہا تھا۔ اس زمانے میں اتنی بڑی
نت سے ٹکر لینا حیرت انگیز تھا۔ بھیکا ئی جی کا
قلابی ہونا اس لئے اور بھی تعجب انگیز ہے
وہ ایک پارسی عورت تھیں۔ پارسی ہندوستان
ں رہتے ضرور تھے لیکن ان کا رہن سہن لباس
زبان انگریزوں سے ملتے جلتے تھے۔ وہ انگریزوں
دلپسند کرتے تھے اور انہیں ملک سے

ایک حکمراں

جس کے پاس کپڑوں کا سب سے بڑا اسٹاک تھا حیدرآباد کے چھٹے نظام اور ہندوستان کے سب سے امیر شاہزادہ میر محبوب علی خاں ۔ (۱۹۱۱-۱۸۵۶) نے اپنے دورِ حیات میں ایک کپڑا کبھی دوبار زیب تن نہیں کیا۔ بیش قیمت، نفیس مہین ململ سے بنے کپڑے ایک بار استعمال کرنے کے بعد محل کے نوکروں کو دے دئے جاتے تھے۔

نکالنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بھیکائی جی بھی ایک ایسی ہی شعلہ صفت عورت تھیں۔ جب انہوں نے ہندوستان کا پہلا ترنگا بلند کیا تو انگریزوں نے انہیں فوراً گرفتار کرلیا۔ بعد میں بھیکائی جی یورپ چلی گئیں۔ یورپ میں کچھ انقلابی جلا وطنی کی زندگی کاٹ رہے تھے۔ بھیکائی جی ان کی سرپرست بن گئیں۔ ان کا گھر انقلابیوں کا اڈّہ بن گیا۔ انگلستان میں رہ کر انگریزی راج کی جڑیں کاٹنا مشکل ہوگیا تو بھیکائی جی پیرس آگئیں۔ یہاں سے انہوں نے ایک اخبار نکالا۔ وہ چند سال برلن میں بھی رہیں۔ بھیکائی جی جب تک زندہ رہیں ہندوستان کی آزادی کے لئے تن من دھن سے کوشش کرتی رہیں۔

رام پور کے علی برادران محمّد علی اور شوکت علی بھی جنگِ آزادی کے سپاہی تھے۔ محمد علی آئی سی ایس کرنے کے لئے لندن گئے۔ یہ ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ گھوڑ سواری میں امتحان میں فیل ہو گئے۔ اس طرح وہ ہندوستان کی سب سے اُونچی ملازمت میں داخل ہونے سے بچ گئے۔ شوکت علی نے ہندوستان ہی میں تعلیم پائی۔ ان کی ماں آبادی بیگم کچھ زیادہ پڑھی لکھی عورت نہیں تھیں، لیکن انہوں نے اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ محمّد علی نے کچھ روز بڑودہ کے افیون کے محکمے میں ملازمت کی، لیکن وہ جلد ہی ملازمت چھوڑ کر ہندوستان کی جنگِ آزادی میں کود پڑے۔ آبادی بیگم نے اپنے بیٹوں کا حوصلہ بڑھایا۔ اس زمانے انگریز ترکی کو ہضم کرنے کی چال چل رہے تھے۔ ترکی کو جنگِ عظیم میں شکست ہوئی تو یورپ کے بڑے اور فاتح ملکوں نے اسے 'مردِ بیمار' کا خطاب دیا۔ ترکی کا خلیفہ دنیا کے مسلمانوں کا سربراہ سمجھا جاتا تھا۔ انگریزوں کی چال سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ناراضگی پھیل گئی۔ ترکی کے خلیفہ کو انگریزوں کے ظلم سے بچانے کے لئے ہندوستان میں خلافت کی تحریک شروع ہوئی۔ آبادی بیگم پردہ نشین عورت تھیں۔ وہ جلسوں میں تقریریں نہیں کرسکتی تھیں لیکن وہ اپنے دونوں بیٹوں کی پشت پناہ تھیں۔ انہوں نے محمّد علی شوکت علی کو خلافت تحریک کا سرگرم کارکن بنا دیا۔ یہ ۱۹۲۳ کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں گلی گلی اس گانے کا چرچا تھا: بولیں امّاں محمّد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو، بعد میں اتاترک نے خود ہی خلیفہ کو جلاوطن کرکے ترکی میں جمہوری حکومت قائم کی تو خلافت کی تحریک ٹھنڈی پڑ گئی۔

محمّد علی کے انتقال کے بعد ان کی بیگم میدانِ سیاست میں آئیں۔ رام پور میں برقعے کا رواج سخت تھا۔ بیگم محمّد علی برقعے میں ہی سیاسی کانفرنسوں میں شرکت کرتیں۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی رکن تھیں۔ اس زمانے کی میٹنگ کے فوٹو دیکھیے تو ان میں ایک برقعے پوش عورت بھی نظر آئے گی، جو مسٹر جناح اور لیاقت علی خاں کے ساتھ کرسی پر بیٹھی ہے۔ یہ بیگم محمد علی تھیں، جنہوں نے پردے کے باوجود ہندوستان کی سیاسی جنگ میں حصہ لیا۔

پنجاب میں یونینسٹ وزارت قائم ہوئی تو سر محمّد شفیع پنجاب کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ ان کی لڑکی بیگم شاہ نواز بھی باپ کے شانہ بشانہ سیاست میں داخل ہوگئیں۔ پنجاب میں بھی برقعے کا رواج تھا۔ امیر گھرانوں کی عورتوں میں یہ رواج کچھ زیادہ ہی سخت تھا۔ بیگم شاہ نواز پنجاب میں پہلی عورت تھیں جنہوں نے برقعے کو خیرباد کہا۔ وہ جب پہلی بار بے پردہ اسٹیج پر آئیں تو لوگوں نے ان پر خوب لعن طعن کی اور آوازے کسے۔ کچھ لوگ جلسہ گاہ سے اٹھ کر چلے آئے۔ لیکن بیگم شاہ نواز نے ہمّت نہ ہاری۔ وہ سیاست کے میدان میں ڈٹی رہیں۔

۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی سے ۱۰ سال پہلے انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کرلیا تھا۔ انہوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے دلیپ سنگھ کو لندن بھیج دیا۔ دلیپ سنگھ بعد میں عیسائی ہوگئے۔ اس خاندان کی ایک شاخ کپورتھلہ کی ریاست سے متعلق تھی۔ راج کماری امرت کور

اس نسل سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس وقت نواب، راجے مہاراجے انگریزوں کے پٹھو تھے۔ انگریز انہیں بڑے بڑے خطاب دیتے تھے اور ہر طرح ان کی دلجوئی کرتے تھے۔ راج کماری امرت کور شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں شامل ہوگئیں۔ گاندھی جی نے انگریزوں سے عدم تعاون اور غیر ملکی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شروع کی تو راج کماری کو ایک سخت امتحان سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے پاس سلک اور شیفون کی سینکڑوں بیش قیمت ساڑیاں تھیں۔ گاندھی جی کا حکم تھا کہ غیر ملکی مال کو جلا دیا جائے۔ عورتوں کو اپنے قیمتی کپڑے بہت پیارے ہوتے ہیں، لیکن راج کماری نے بغیر کسی تامل کے اپنی ساری بیش قیمت ساڑیاں جلا دیں۔ اور ہاتھ کا بُنا کھدر پہننا شروع کر دیا۔ راج کماری کو سیاسی تحریک کے سلسلے میں کئی بار جیل جانا پڑا۔ محلوں میں رہنے والی راج کماری اس سزا سے مطلق نہ گھبرائی اور خوشی خوشی جیل روانہ ہوگئی۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب دو پارٹیاں ایک دوسرے کے مدِمقابل ہوگئیں۔ ایک پارٹی کے سربراہ گوکھلے اور گاندھی جی تھے جو عدم تشدد اور اہنسا کے راستے پر چلنا چاہتے تھے۔ دوسرا گروہ نوجوانوں کا تھا۔ ان کا گرم خون اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ خاموشی سے انگریزوں کی لاٹھیاں کھائیں اور چپ چاپ جیل چلے جائیں۔ یہ دہشت پسندوں کا گروہ تھا۔ یہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتے تھے۔ ۱۹۱۱ میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کا جلوس دلی کے چاندنی چوک سے نکلا تو ایک انقلابی نے وائسرائے پر بم پھینکا۔ لارڈ ہارڈنگ زخمی ہوگئے، لیکن ان کا محافظ مارا گیا۔ بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور راج گورو اس تحریک کے لیڈر تھے لیکن ان سے بہت پہلے اس تحریک کی روحِ رواں ایک عورت تھی۔ یہ سرلا دیوی گھوشال تھیں۔ یہ ایک بنگالی عورت تھیں جنہوں نے کلکتہ میں سوشل سروس اور جسمانی ورزش کے کلب سے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ بعد میں سرلا دیوی نے ایک پنجابی رام بھج دت سے شادی کر لی۔ اس کے بعد وہ سرلا دیوی چودھرانی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ کلکتہ سے ان کی تحریک کا مرکز پنجاب میں منتقل ہوگیا۔ یہ ۱۹۰۵ کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کے پنجے ہندوستان میں مضبوطی سے گڑے ہوئے تھے لیکن دہشت پسندی کی اردھارٹ نے انگریزوں کو بدحواس کر دیا۔ سرلا دیوی کے پیچھے رات دن سی آئی ڈی سائے کی طرح لگی رہتی۔ انگریزوں کی بلیک لسٹ میں سرلا دیوی چودھرانی کا نام سرِفہرست تھا۔

ہندوستانیوں کے علاوہ کچھ

سفید فام عورتیں بھی ہندوستان کی جنگِ آزادی میں شامل ہوگئیں۔ ان میں اینی بیسنٹ اور سسٹر نیویدیتا کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اینی بیسنٹ ایک شعلہ بیان مقرر تھیں۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ انگریز عورتیں ہی انگریزی حکومت کے خلاف ہوگئی تھیں۔ اینی بیسنٹ کانگریس کی صدر بھی منتخب ہوگئیں اور کئی بار جیل گئیں۔ سسٹر نیویدیتا کی سرگرمی کا مرکز کلکتہ تھا۔ ان کے علاوہ انگلستان کے بحری بیڑے کے ایک افسر ایڈمرل سلیڈ کی بیٹی بھی ہندوستان پہنچ گئیں اور احمد آباد کے سابرمتی آشرم میں رہنے لگیں۔ گاندھی جی نے ان کا نام میرا بہن رکھا۔ میرا بہن گاندھی جی کے ساتھ لندن کی گول میز

گیدڑ جو راجہ بنا

ہندوستان میں پرتاپ گڑھ کے راجہ نے ایک محکوم مہاراجہ کو بے عزت کرنے کے لئے ایک گیدڑ کو تاجِ شاہی پہنا کر دربار کا حکمران بنا دیا اور اس جانور نے ۱۲ برس تک خدمت کی۔

کانفرنس میں ان کے مترجم کی حیثیت سے بھی گئیں۔ انگریز انہیں سنکی اور پاگل سمجھتے تھے۔ بھلا انگلستان کی اعلیٰ سوسائٹی کی ایک عورت کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ ہندوستان جا کر دال بھات کھائے، برت رکھے اور کھدر پہنے۔

ہندوستان کے دہشت پسندوں کو گھر میں پناہ دینا جرم تھا لیکن یہاں بھی ایک انگریز عورت نے حکومت سے ٹکر لی۔ ان کا نام مارگریٹ جعفر علی تھا۔ وہ الٰہ آباد میں نواب تصیر جعفر علی اتر پردیش کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے جب مارگریٹ کے رنگ ڈھنگ دیکھے تو وہ گھبرا گئے اور ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مارگریٹ کو دہشت پسندوں

کو گھر میں پناہ دینے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ انہیں جیل بھی جانا پڑا، لیکن وہ جنگِ آزادی کی جدوجہد سے دست بردار نہ ہوئیں۔

"۱۹۴۲ کی 'ہندوستان چھوڑو' تحریک" کے نتیجے میں انگریزوں نے ملک کے تمام سیاسی لیڈروں کو جیل میں بند کردیا۔ پنڈت نہرو اور ان کے ساتھی احمد نگر کے قلعہ میں نظر بند ہو گئے۔ گاندھی جی کو پونا کے آغا خاں کے محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ صرف دو لیڈر تھے جو انگریزوں کی دست برد سے محفوظ رہے۔ ایک بہار کے جے پرکاش نارائن اور دوسری ارونا آصف علی۔ یہ دونوں 'زیرزمین' چلے گئے۔ انگریزوں نے ان کی تلاش میں لاکھ سر مارا لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کی گرفتاری کے لئے انعام کا اعلان بھی کیا گیا۔ گاندھی جی نے مسز آصف علی کو پیغام بھیجا کہ وہ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کردیں خود ہی اپنی گرفتاری کا انعام وصول کرلیں اور یہ روپیہ کانگریس کے اس فنڈ میں دے دیں جو ہریجن سدھار کے کام آتا ہے۔ مگر بیگم آصف علی نے گاندھی جی کا مشورہ قبول نہیں کیا۔ وہ ۱۹۴۲ سے ۱۹۴۵ تک چھپی رہیں۔

۱۹۳۰ میں اندرا گاندھی کی ماں کملا نہرو اور ہنسا مہتہ دلّی آئیں تو دلّی اسٹیشن کا پلیٹ فارم "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ انگریزوں نے ان کے استقبال کو ناکام بنانے کے لئے ایک چال چلی۔ انہوں نے چار انجن برابر کی لائن پر دوڑا دئے۔ وہ چاہتے تھے کہ انجنوں کی گڑگڑاہٹ اور سیٹی سے نعروں کی گونج دب جائے۔ لیکن ان کی یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ چار انجنوں کی گڑگڑاہٹ بھی نعروں کی گونج کو دبا نہ سکی۔

۱۹۴۲ میں اندرا گاندھی جیل میں تھیں۔ ان کی شادی کو کچھ عرصہ ہی گزرا تھا۔ ان کی ایک دوست مسز گنستھر نے نیویارک سے انہیں شادی کے تحفے میں چاندی کا ایک چمچ بھیجا۔ مسز گاندھی نے اس تحفے کا جواب تار سے دیا۔ انہوں نے لکھا: "میرے باپ اور ان کے ہمراہی جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔ ہندوستان غلامی اور بھوک کی چکّی میں پس رہا ہے۔ میری سمجھ نہیں آتا کہ میں اس خوب صورت تحفے کو کیسے قبول کروں۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ دن کب آئے گا جب ہم ایسی خوب صورت اور بیش قیمت چیزیں استعمال کرسکیں گے؟" یہ تار مسز گنستھر کو نہیں ملا۔ بمبئی کی سی آئی ڈی نے اس تار کو ضبط کرلیا تھا۔

دروازے پر لگاتار دستک ہوئی تو اُسے اٹھنا ہی پڑا۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ ایک کابلی والا کھڑا تھا۔

کابلی والا! وہ کابلی والا ہی تو تھا جس کی وجہ سے زندگی کی دھارا بنگال کی کھاڑی میں گرنے کے بجائے بحرِ عرب میں گر کر اپنا وجود کھو چکی تھی۔

نرمل غصے سے تملا اٹھا۔ "کیوں آئے ہو؟

اب....؟

وہ ابھی جملہ بھی پورا نہیں کر سکا تھا کہ کابلی والا بیچ میں بول پڑا "ہم اپنے دیس سے آتا ہے۔ تمہارا واسطے چٹھی ہے۔"

"ہمیں نہیں چاہئے۔" نرمل نے کہا۔

"ہم کو کیا تم جانو۔" اتنا کہہ کر کابلی والا ٹیبل پر خط رکھ کر چلا گیا۔

نرمل نے خط کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھا — یہی جذبہ اگر کارفرما رہتا اور خط کو ہاتھ نہ لگایا ہوتا تو کہانی یہیں ختم ہو جاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا لفافے پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے دیکھا، جس پتے کی اُسے جستجو تھی، وہ لفافے پر درج تھا۔ اسی پتے کے نہ ملنے کی باعث وہ اپنا خط ڈاک کے حوالے نہ کر سکا تھا۔ آج وہ خط ضرور پوسٹ ہو جائے گا۔ یہ خط کئی راتوں کی کاوش کا نتیجہ تھا۔ ویسے خط تو کچھ طویل نہیں تھا، لیکن بات بڑی تھی۔ چاہتے ہوئے بھی ایک رات میں وہ اسے ختم نہیں کر سکا تھا۔ لفافے کو بند کرنے سے پہلے ایک بار خط پڑھ لینے کی خواہش ہوئی۔ جس رات کو اس نے خط لکھنا شروع کیا تھا، کیسی عجیب و غریب حالت تھی اس کی۔ جسے وہ خط لکھ رہا تھا اُسے کیسے مخاطب کرے، یہ بھی طے نہیں کر سکا تھا۔ مجبوراً بغیر القاب و آداب کے اس نے خط لکھ ڈالا تھا۔

"سوچتا ہوں، خط لکھ کر کیا ہوگا؟ لیکن نہ لکھ کر بھی کیا ہوگا؟ بلکہ نہ لکھ کر زیادہ نقصان ہوگا۔ شاید پاگل ہو جاؤں۔ لکھ کر دل کا بوجھ تو کاغذ پر اتار سکوں گا۔ اسی لئے خط لکھ رہا ہوں۔ شام کو جو دوستوں کی چوکڑی بیٹھتی تھی، کب کی ختم ہو چکی ہے۔ ویسے سارے دوست زندہ ہیں۔ وقتاً فوقتاً دکھائی بھی دے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی آنکھوں میں یا تو نفرت ہے یا پھر رحم۔ اور نفرت یا رحم، دونوں میں ایک بھی مجھے قبول نہیں۔ احباب دل کے بوجھ کو ہلکا کیا کریں گے؟ اپنے سلوک سے وہ تو بوجھ مزید بڑھا دیتے ہیں۔ نہیں آتے تو اچھا ہی ہے۔ کون چائے بنائے ان کے لئے۔ میں تو ناشتہ اور کھانا پاس ریستوراں میں کھا لیتا ہوں اور باقی سب بدستور چل رہا ہے۔ آج بھی دفتر جانے سے پہلے جوتے پر پالش کرتا ہوں۔ بالوں کو ہفتے میں ایک مرتبہ ڈائی کرتا ہوں۔ کپڑے کریز کے بغیر کل بھی نہیں پہنتا تھا، آج بھی نہیں پہنتا ہوں۔ یہ سب کیسے کر لیتا ہوں، خود میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید معمول ہی اب فطرت بن چکی ہے۔

یاد آتا ہے، میری اسی انداز کو پچیس سال پہلے تم نے دیکھا تھا۔ اُس وقت تم نے کہا تھا۔ "تمہاری شادی جس سے ہوگی وہ بڑی تقدیر والی ہوگی۔"

"کیسے؟" میں نے پوچھا تھا۔

"جب خود اتنے سج دھج کر رہتے ہو تو بیوی کو

پھول کی طرح رکھو گے۔"

تمہارے اس چھوٹے سے جملے پر خیال آیا تھا "مجھے شادی کر لینی چاہیئے۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا اور تم نے شرم سے اپنی نظریں جھکا لیں۔ تمہارے اسی اندازِ محبوبیت پر میں نے بے تکلف ہو کر دل کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا: "کیا یہ مقدّر تمہیں سونپ دوں؟"

گزرتے وقت کے ساتھ محبت کا ننھا سا پودا تناور درخت کی شکل اختیار کرتا چلا گیا، جو بعد میں ہماری رسوائی کا سبب بن گیا۔ پرنسپل صاحب نے بلا کر ہم دونوں سے کہا تھا: "آپ لوگ موضوعِ گفتگو بنتے جا رہے ہیں، جو اس ادارے کے مفاد میں قطعی نہیں ہے" ــــ اس کا جواب نہ میں نے دیا تھا اور نہ تم نے۔ لگی لگائی نوکری چھوڑ کر ہم لوگ رائے پور سے بہار کے ایک شہر میں آ کر بسے اور ہم دونوں نے میاں بیوی کی طرح رہنا شروع کر دیا رہنے کا انداز اتنا فطری تھا کہ کسی کو شبہ تک نہیں ہوا۔ ہمیں ایک دوسرے پر پورا اعتماد تھا۔ کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ کورٹ میرج کر لیں۔ ہم زن و شوہر ہیں، اس میں کسی کو کیا اعتراض ہوتا؟ میرے خاندان میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تمہارے ساتھ تمہارے بھیا اور بھابھی کی شفقت اور محبت تھی۔ تم نے خط کے ذریعہ بھیا اور بھابھی کو آگاہ کر دیا تھا کہ تم میرے ساتھ ہو اور خوش ہو۔ راکھی کے دن آنے کے لئے بھیا اور بھابھی سے اصرار بھی کیا تھا۔ راکھی سے دو دن پہلے بھابھی اور بھیا ڈھیر سارے کپڑے اور مٹھائیاں لے کر آ گئے تھے۔ ہم سب بس کے ذریعہ ایک دوسرے شہر گئے اور بھیا کے حکم پر مندر میں بھگوان کے سامنے باضابطہ شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ تمہارے بھیا نے تو اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا، ہاں بھابھی نے ازراہِ مذاق ضرور کہا تھا: "پگلی! مجھ سے کہہ دیا ہوتا۔ وہیں بڑی شان سے شادی کر دیتے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم لوگوں نے بھی محبت کی شادی کی تھی۔" تم نے صرف اتنا کہا تھا: "بھابھی معاف کر دو" اور بھابھی نے تمہاری پیشانی پر بوسہ دے کر تمہیں اپنی باہوں میں بھر لیا تھا۔

ان باتوں کو یاد کرنے سے فائدہ ہی کیا؟

لیکن بھول بھی کیسے جاؤں؟ آنکھیں کھلی رکھوں تو دماغ میں اور آنکھیں بند رکھوں تو آنکھوں کے سامنے ایک ایک بات متحرک نظر آتی ہے۔ اتفاق سے مجھے ایک اچھی سی نوکری مل گئی تھی۔ دن بڑے مزے میں کٹ رہے تھے۔ ہم دونوں کی مشترکہ محبت نے دو اور وجود تخلیق کر ڈالے تھے۔ ہمارا رہن سہن بڑے شاہانہ انداز کا تھا۔ دونوں بچیاں للی اور جولی کی پرورش بھی عیش کی فضا میں ہوئی۔ دونوں کا داخلہ بھی انگلش میڈیم اسکول میں کر دیا گیا تھا۔ دونوں بچیاں مغربی وضع کا لباس پہنتی تھیں انگریزی بولتی تھیں۔ گھر میں ہمارے درمیان باتیں بھی انگریزی میں ہوا کرتی تھیں۔ ہم پر انگلش مینشن کا رعب غالب تھا۔

کرسمس کے موقع پر للی اور جولی کو اس کے دوستوں نے مدعو کیا تھا۔ لڑکیاں دس بارہ سال کی ہو گئی تھیں۔ بالکل انگریزوں جیسے کپڑوں کے لئے ضد کر بیٹھیں۔ جب میں نے اپنی جیب خالی ہونے کی اطلاع دی تو جولی نے کہا: "پاپا، یو ڈونٹ نو اَس۔"

جولی کا اس میں کیا قصور تھا؟ یہ پیڑ تو ہمارا ہی لگایا ہوا تھا۔

ہماری مشکلات کے دَور کی شروعات ہوئی۔ پٹھان اپنے قرض کی وصولی کے لئے آیا۔ اس نے سود در سود جوڑ کر حساب بتایا لیکن میں اکیلا نہیں تھا۔ ہمارے علاقے کے بیشتر اینگلو انڈین بھی اس کے شکنجے میں تھے۔ پہلی تاریخ کو ادھر تنخواہ ملی اور اُدھر پٹھان حاضر۔ تنخواہ کا بیشتر حصہ خان کے اور قرض کی مد میں چلا جاتا۔ کچھ روپے وہ چھوڑ جاتا۔ دو دن بعد آتا اور نیا قرض دے جاتا۔ اس طرح زندگی اور موت کی طرح قرض چلتا رہا۔ اسی طور پر قرض چلتا رہتا تو غالباً کوئی خاص بات نہ تھی۔ ہوا یہ کہ قرض کی رو رُک گئی، صرف پیدائش ہوتی رہی۔ مسلسل پیدائش کے اس سلسلے نے ہماری خوب صورت سی ازدواجی زندگی کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔

درخت کا وجود اپنی جگہ پر ہی قائم رہتا ہے۔

لیکن قرض کا درخت انسان کے سائے کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ میں اسی درخت کی چھاؤں میں اپنی زندگی کے شب و روز جوں توں کر کے کاٹ رہا تھا۔ میری خوشیاں، میرے غم اسی قرض کے مرہونِ منت تھے۔ میں ہمیشہ خوف زدہ رہتا تھا اور میری یہ کوشش رہتی تھی کہ پٹھان سے سامنا نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اکیلے میں مروّت کے لہجے میں تقاضا کرنے والا پٹھان اب جہاں کہیں بھی ملتا بے آبرو کرنے پر تُل جاتا۔

ایک دن باس کے کام سے بازار جانا پڑا۔ سوچا، کیوں نہ گھر ہوتا چلوں۔ گھر آیا۔ لیکن دروازے پر ہی ٹھٹھک جانا پڑا۔ پٹھان اندر موجود تھا۔ اس کی آواز سُن کر ہی کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ جو کچھ سنا اُسے کوئی بے غیرت ہی سُن کر برداشت کر سکتا تھا اور میں بے غیرت نہیں تھا۔ میں پاس پڑے ہوئے پتھر کو اٹھا لایا اور پٹھان کا حساب برابر کرنے ہی والا تھا کہ زمین پر مجھے اپنے سائے کی بجائے اُس درخت کا سایہ نظر آیا جو قرض کا تھا۔ میں دفعتاً ڈر گیا۔ سہمے ہوئے قدموں سے میں نے دفتر کا رُخ کیا۔ سوچا تھا شام کو لوٹ کر تم سے کیفیت طلب

ں گا، لیکن لوٹنے پر تم نے ہی سوال وجواب کا
ہ شروع کر دیا۔
"پٹھان آیا تھا؟"
میں خاموش رہا۔
"زبردستی چائے پی کر گیا۔ اُلٹا سیدھا بک
یا۔ میں سب پی گئی۔"
میں پھر بھی خاموش رہا۔
تم نے لمبی سانس لی۔ "لیکن اب وہ روز
تقاضے کے لیے نہیں آئے گا۔ پورے دو ماہ
لیے مان گیا۔"
کیسے مان گیا؟ کیوں مان گیا؟ ان باتوں
چھنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہو سکی۔ آخر اس میں
ا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ تم تو پٹھان کے سامنے
لک نہیں تھیں۔ ایک بار میں نے ہی اُسے بہلانے
لیے تم سے چائے دینے کو کہا تھا۔ تمہاری چائے
ہ اُسے اتنی بڑھے گی، یہ میرے خواب وخیال
ھی نہیں تھا۔
ایک دوست سے ملنے کا بہانہ بنا کر میں گھر سے
لا۔ رات کو لڑکھڑاتے قدموں سے گھر پہنچا۔
پر دھڑام سے گر پڑا۔ تم نے کچھ کہا تھا میں ہوش
تھا ہی نہیں کہ سُن پاتا۔ ہاں تم رو رہی تھیں،
ں ضرور سمجھ گیا تھا۔
وہ رات بیت گئی۔ بعد کے دن بھی گزر گئے
طرح کتنی راتیں اور کتنے دن گزر گئے۔ للی نے
میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس کے بہت سارے
ت تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں۔ مجھے اپنی ترقی
ی اب خود کھلنے لگی تھی۔ یہ گھٹن بھرا ماحول ہمارا
دردہ تھا۔ اینگلو انڈین لڑکیاں اپنے مرد دوستوں
بے باکی سے ملتی تھیں۔ جب بھی للی کا کوئی
ئے فرینڈ آتا، ہم بھی انہیں کے انداز میں زبان
ں کر کے کہتے۔ "بیب، یور بوائے فرینڈ!"

> شادی کر دو۔ یہ کہنا کتنا آسان ہے۔ کتنی دوڑ دھوپ کی، لیکن دس ہزار سے نیچے کوئی بات کرنے کو تیار تک نہیں تھا۔ ایک دن دفتر سے لوٹتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ جولی رو رہی ہے

اور للی چہکتی ہوئی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ نکل جاتی۔
ایک دن ایسا بھی آیا کہ للی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گھومنے نکلی تو سات دنوں کے بعد لوٹی۔ اتنے دنوں کے بعد لوٹنے پر اس کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ کر ہم حیران بھی تھے، دُکھی بھی تھے۔ کچھ ترقی پسند رجحانات کے حامل افراد نے مبارک باد بھی دی۔ مزید یہ بھی کہا کہ ایسی شادیاں قومی یکجہتی پیدا کرتی ہیں۔
تقریباً اسی طرح کی باتیں للی کی تصویر کے ساتھ اخباروں میں چھپی تھیں۔ ہم لوگوں کی اس ترقی پسندانہ روش کی خوب تعریف کی گئی تھی۔
ہماری انگریزیت اب خود ہمارا مذاق اُڑا رہی تھی۔ ذہن میں بار بار یہ خدشہ اُبھرتا کہ کہیں جولی بھی
"نہیں، جولی ایسا نہیں کرے گی۔" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا تھا۔
"صرف کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جلد اس کی شادی کر دو۔" یہ تمہارا جواب تھا۔
شادی کر دو ——— یہ کہنا کتنا آسان ہے۔ کتنی دوڑ دھوپ کی، لیکن دس ہزار سے نیچے کوئی بات کرنے کو تیار تک نہیں تھا۔
ایک دن دفتر سے لوٹتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ جولی رو رہی ہے۔
"سوریٹی، وہاٹ میکس یو کرائی؟"
پاپا... ممی... وہ اور بھی سسک سسک کر رونے لگی۔

"کیا ہو گیا جولی کی ممی کو؟" میں کمرے میں داخل ہوا۔ تم کمرے میں نہیں تھیں۔ جولی نے تمہارا خط دیا۔ شاید تمہیں تعجب ہو، لیکن یہ حقیقت ہے۔ میں زندگی میں پہلی بار رو دیا، خوب دل کھول کر رویا۔ آخر کسی طرح جولی نے چپ کرایا۔
اب مزید لکھنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ ہم دو تھے، چار ہوئے۔ اب پھر چار سے دو ہو گئے۔ کم ہو گئے۔ بات بھی کم ہونی چاہیے۔
کبھی کبھی سوچتا ہوں، تم اس لیے گئی ہو کہ مجھے قرض سے نجات ملے۔ اسی قرض سے چھٹکارے کا خیال جولی کو بھی آیا ہوگا ——— اور اب میں تنہا ہوں۔ ایک مشینی آدمی کی طرح۔ کب تک چلتا ہوگا۔ کچھ بھی تو نہیں جانتا ——— بس..."

اپنے خط کو پڑھ لینے کے بعد نرمل نے ایک لمبی سانس لی۔ لفافے پر پتہ لکھنے کی غرض سے اس نے کابلی والے کا لایا ہوا خط اٹھایا ——— جب خط اٹھایا ہی تھا تو پڑھنے میں کیا نقصان ہے؟
نرمل نے لفافہ کھولا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پندرہ ہزار روپے کا بینک ڈرافٹ تھا اور ڈرافٹ کے ساتھ منسلک تھا ایک پرزہ۔ لکھا تھا:
"مجھے معاف کرنا۔ قرض ادا ہو گیا ہے۔ پندرہ ہزار روپے جولی کی شادی کے لیے روانہ کر رہی ہوں ——— ابھی تک صرف تمہاری سیما۔"

آپ نے سسپنس بھرے بہت سے ناول پڑھے ہوں گے، لیکن **گلزار چودھری** کا انداز سب سے نرالا ہے، ان کا نیا ناول پڑھیے:

پھیلتے سائے

سلیمہ نے فرخ کے ساتھ گھر سے بھاگنے سے انکار کر دیا، لیکن گھر واپس جانے کی بجائے وہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف کانگریس کی مہم میں شامل ہو گئی..... اس کی رومانی زندگی اور مُلک کی جنگِ آزادی کے امتزاج کا دلچسپ ناول ۔ آج ہی منگائیے!

قیمت: تیرہ روپے (ڈاک خرچ علیحدہ)

گُلزار چودھری کے گزشتہ ناول بھی ساتھ ہی منگائیے:

ٹُوٹے ناتے

قیمت: تیرہ روپے (ڈاک خرچ علیحدہ)

اُٹھتی لہریں

قیمت: تیرہ روپے (ڈاک خرچ علیحدہ)

سیما سُوری کا چوتھا ہنگامہ خیز ناول

دیکھتے دیکھتے

کیا ایک ٹی وی اداکارہ کو محبت کا حق نہیں؟

قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے (ڈاک خرچ علیحدہ)

سیما سُوری کے گزشتہ ناول بھی ساتھ ہی منگائیے:

تیسری انگلی

بے پناہ دولت، بے پناہ حُسن اور بے پناہ غم دلوں کی داستان۔ قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے (ڈاک خرچ علیحدہ)

اُونچی دُکان

ایک بااُصول لڑکی کی داستان، جو محبت اور انا کو الگ الگ رکھنا چاہتی تھی۔
قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے (ڈاک خرچ علیحدہ)

ٹیڑھی لکیریں

ایک نوجوان لڑکی کی ایسی رومان پرور داستان ہے، جسے آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔
قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے (ڈاک خرچ علیحدہ)

آج ہی ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر گھر بیٹھے وی پی ڈاک سے منگالیجیے یا گھر بیٹھے اپنے اخبار فروش سے طلب کیجیے!

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں

غیر ملکی پڑھنے والے اپنے ملک کے لئے قیمت اور محصول ڈاک معلوم کرنے کے لئے تحریر فرمائیں پھر ڈرافٹ بھیجیں۔

•• آپ کو ہندوستان کے کسی گوشے میں یا دنیا کے کسی بھی مُلک میں اُردو، انگریزی، ہندی، پنجابی کتابیں یا رسائل منگوانے ہوں تو شمع کے ادارے کو خدمت کا موقع دیجیے۔ غیر ملک میں شہر شہر نئے ایجنٹ بنائے جا رہے ہیں!!

پاکستان کی عورت

جیلانی بانو

پاکستان میں عورت کے لئے چادر لازمی قرار دی گئی ہے۔

پاکستانی عورت کسی آؤٹ ڈور کھیل میں حصّہ نہیں لے سکتی۔

پاکستان کی عورت سر ڈھانپے بغیر ٹی، وی پر نہیں آسکتی۔

پاکستان میں بدکار عورت کو سنگسار کیا جاتا ہے۔

پاکستان سے دُور بیٹھ کر دیکھئے تو پاکستان کی عورت کا یہی کلوز اپ اُبھرتا ہے
اس بار جب پاکستان جانے کا پروگرام بنا تو میں سوچ رہی تھی کہ شاید میں برقع کے بغیر پاکستان میں باہر نہ نکل سکوں گی۔ اب تک وہاں کی سب لکھنے والی خواتین برقع پوش ہوچکی ہوں گی۔ پاکستان کی بغاوت پسند خود سر شاعرہ کشور ناہید پر برقع کیسا لگے گا؟

کراچی ایرپورٹ پر اترے تو پی آئی اے کی وی، آئی، پی کوچ انڈین ائر لائن کے پلین سے لگی کھڑی تھی۔

"خوش آمدید جیلانی بانو۔ ہم آپ کے لئے وی، آئی، پی کوچ لے آئے ہیں۔" یہ دل کش مسکراہٹ والی خوش شکل، خوش مزاج بیگم منور حسین تھیں اور ان کے ساتھ تھے منور حسین صاحب، پی آئی اے کے ایک اہم عہدہ دار۔ وہ پاکستانی ادیبوں کی طرف سے پلین کی سیڑھیوں کے قریب ہمارا استقبال کر رہے تھے۔

میں منور حسین صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھول گئی۔ صرف مسز منور حسین کو دیکھے جا رہی تھی۔ گلابی شلوار قمیص پہنے۔ سلیقے سے میک اپ کئے خوب صورتی سے کٹے ہوئے بال۔

شمیم کاظمی ایک رائیٹرز انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر ہیں۔ محنت کش خواتین کی انجمن کی سکریٹری ہیں۔ 'اپوا' کی سکریٹری بھی رہ چکی ہیں۔ بڑی ادب نواز، باذوق خاتون ہیں۔

دوسرے دن انہوں نے مجھے کراچی کے سب سے شان دار فائیو اسٹار ہوٹل 'ہالی ڈے اِن' میں آنے کی دعوت دی۔

محنت کش خواتین کی میٹنگ اور فائیو اسٹار ہوٹل میں!

مخملیں سیڑھیوں پر پاؤں رکھتی، رنگین فواروں کی پھوار سے بھیگتی، میں اوپر جارہی تھی تو سوچ رہی تھی: پاکستان کی محنت کش عورت کہاں پہنچ گئی ہے!

اوپر روشنیوں سے جگمگاتے ہال میں رنگ و بو کا سیلاب سا آیا ہوا ہے ——— ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی فیشن پریڈ میں آ گئی ہوں۔ زیوروں اور کپڑوں کے نئے نئے انداز۔ کراچی کے بیوٹی پارلر والوں نے آج جانے کتنی کمائی کی ہوگی، تب یہ جاکر رنگ روپ نکھرا، جسے دیکھ کر فیض نے یہ غزل کہی تھی:

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ

میری کاٹن کی سفید ساڑی ان جھلملانے والے کپڑوں سے الگ سی ہو گئی تھی۔ اکیلی حیران پریشان۔

مگر شمیم کاظمی نے جب ڈائس پر آکر اس محفل میں میری موجودگی کا اعلان کیا تو بہت سی خواتین آگے بڑھیں۔

" آپ جیلانی بانو ہیں انڈیا سے آئی ہیں؟"

فوٹو گرافر ہمارے آس پاس ٹہل رہے

ان کے سر کی چادر کہاں ہے؟ میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ ہر طرف شلوار قمیص پہنے، دوپٹوں کو گلے میں لپیٹے، دل کش میک اپ سے چہرے سنوارے، انتہائی تیز رفتار خواتین گھوم رہی تھیں۔

ان چار برسوں میں کراچی زیادہ خوب صورت ہو گیا تھا۔ سڑکوں پر کاروں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ عورتوں نے میک اپ کے نئے طور طریقے سیکھ لئے تھے۔ دُکانیں غیر ملکی سامان سے بھری ہوتی تھیں۔ لوگوں کے ڈرائنگ روم غیر ملکوں کی چیزوں سے سجے ہوئے تھے۔

مگر پاکستان کی نئی نسل اپنی زمین سے اپنے رشتے استوار کررہی ہے۔ ان کے لباس، کھانے، طور طریقوں میں ان کا اپنا انداز ہے۔ خاص طور سے پورے پاکستان میں اردو بولنے والوں کا ایک نیا لب و لہجہ نمایاں نظر آتا ہے، جس پر سندھی، پنجابی، اور دہلی کے ساتھ دکنی بولی کا مِلا جُلا اثر پڑتا ہے۔ اب وہ ایک الگ اسٹائیل میں ڈھل گئی ہے، جو پاکستان کی اپنی بولی ہے

پاکستان کی سڑکوں پر ڈرائیور کار کا ہارن نہیں بجا سکتے۔ جب آواز نکالنا ہی جرم ہو تو شور کاہے کا ہوگا؟

اتنی گُم صُم فضا کو دیکھ کر میں نے شمیم کاظمی سے کہا: "میں پاکستان کی محنت کش عورت سے ملنا چاہتی ہوں"

تھے۔ ہر خوب صورت خاتون نے میرے
ساتھ اپنا فوٹو کھنچوایا۔
"نمستے جی۔ کیا آپ بھارت سے
آئی ہیں، میں نے آپ کی دھوں دام کی ساڑی
سے پہچان لیا۔"
میں نے مڑکر دیکھا۔ ایک ہنس مکھ،
سیدھی سادی بنگالی خاتون تھیں۔ سُرخ
ساڑی، سُرخ بٹوا۔
"میں الکا بنرجی ہوں، انڈیا کے کونسل
مسٹر جے۔ پی۔ مکرجی کی وائف۔"
"ہیلو الکا۔" اور بہت جلد الکا میرے
ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں۔ ان
اجنبی خواتین کی محفل میں الکا کے ساتھ نے میری
بڑی ڈھارس بندھائی (ڈھارس تو مکرجی تھا)
اور پارتھا سارتھی نے بھی بہت دی۔
انڈین کونسلیٹ کے تمام لوگوں نے وہاں
ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔
ایک بار مکرجی صاحب نے اور دوسری بار
پارتھا سارتھی صاحب نے اپنے گھر اپنے
دوستوں سے ملانے کے لئے ڈنر پر بلایا۔
ہمارے سفر کی تمام دشواریوں کو حل کرنے میں
مدد دی۔
تھوڑی دیر بعد شمیم کاظمی نے کہا،
"چلئے بانو، اب چلیں۔"
ہائے یہ تو
پارٹی تھی۔
"مگر شمیم، مجھے تو پاکستان کی محنت کش
عورت سے ملنا تھا۔"
"اچھا۔" شمیم ہنسنے لگیں۔ "میں آپ
کو اگلے ہفتے جم خانہ کلب لے چلوں گی۔
وہاں کچھ خواتین سوشل ورکرس سے آپ کی
ملاقات کراؤں گی۔

جم خانہ کلب میں پاکستان کی
بڑی اہم ورکرس خواتین سے ملاقات ہوئی۔
مسز شیریں رحمت اللہ۔ یہ سندھ کی
سوشل ویلفیئر سوسائٹی کی صدر ہیں۔ لڑکیوں
کے کئی خانگی کالجوں کی سرپرست ہیں۔
کلچرل آفیئرز کمیٹی کی ممبر ہیں۔ پاکستان کی
طالب علم لڑکیوں کو غیر ممالک میں پڑھنے کے
لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کے اسکالرشپ
ان ہی کی نگرانی میں دئے جاتے ہیں۔
شاہ بیگم ایک ٹریول کمپنی کی ایجنٹ
ہیں اور بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا ادارہ
چلاتی ہیں۔
پروین خاتون نیشنل میوزیم کی ڈا
ہیں۔
عتیقہ خاتون ایک مشہور اور کامیا
آرکیٹکٹ ہیں۔
ساجدہ رضوی ایک کامیاب
ایڈوکیٹ ہیں۔
مسز فاطمہ سفوری پاکستان ریڈ
کی ڈپٹی کنٹرولر ہیں۔
ان خواتین سے ملنے کے بعد
پہلی بار معلوم ہوا کہ پاکستان میں خواتین
اتنے اہم عہدے دئے جاتے ہیں۔
"دئے نہیں جاتے، چھینے جاتے

مسز منصوری نے کہا۔

(مسز فاطمہ منصوری کے شوہر منصوری صاحب "ڈان" گروپ سے نکلنے والے اخبار "اسٹار" کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کے دیور گجراتی 'ڈان' کے ایڈیٹر ہیں۔ بڑی لڑکی کامیاب آرٹسٹ ہے۔ امریکہ میں ٹریننگ لے رہی ہے۔ چھوٹی لڑکی کیمسٹری میں ریسرچ کررہی ہے۔ فاطمہ بہت مصروف رہتی ہیں اپنے ملک کے مسائل سے پوری طرح واقف ہیں۔)

"یہ تو ہر ملک کی عورت کا مسئلہ ہے، فاطمہ بہن" میں نے کہا۔

"پورے ایشیا میں عورت کو اپنے حقوق کے لئے لڑنا پڑرہا ہے۔"

"ہاں، مگر بانو، پاکستان میں ہمیں ایک طرف سماج سے لڑنا ہے، دوسری طرف ان کٹر انتہا پسندوں سے، جو تمام اسلامی قوانین کی پابندی صرف عورت سے کرانا چاہتے ہیں۔"

"لیکن آپ سب ڈاکٹر، آرکیٹیکٹ بیرسٹر، سائنسٹسٹ خواتین ہیں۔ کیا آپ کو اپنا کام کرنے کی پوری آزادی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مگر اس آزادی کے لئے ہمیں بڑی قربانیاں دینا پڑی ہیں، کیوں کہ ہمارا معاشرہ ایسی جدوجہد کرنے والی عورتوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا اور مذہب ہمیں بے دین، بدکردار اور خود سر عورتوں میں شمار کرتا ہے۔" عتیقہ کہہ رہی تھیں۔

"پاکستان کی عورت کو گھر سے نکل کر کمانے کی آزادی نہیں ہے۔ مگر مرد کو جہیز مانگنے اور بغیر کسی قصور کے طلاق دینے اور کئی کئی شادیاں کرنے کی پوری آزادی ہے۔"

میں نے یہ سن کر سر جھکالیا، کیوں کہ میں بھی ایک جمہوری ملک کی افسانہ نگار ہوں جہاں عورت ووٹ دے کر پارلیمان میں جاتی ہے، پرائم منسٹر بن سکتی ہے، مگر جہیز کے بغیر شوہر کی دہلیز پر قدم نہیں رکھ سکتی۔ میرے کانوں میں ان ہزاروں لڑکیوں کی چیخیں گونج رہی تھیں جو جہیز نہ لانے پر زندہ جلائی جارہی تھیں، گلے میں پھانسی کا پھندا لے کر خودکشی کرنے پر مجبور کی جارہی تھیں۔

جم خانہ کلب کی سب سے اوپر والی منزل پر کچھ چینی لوگ کھڑے تھے۔ وہ سب ایک کلچرل گروپ کے لڑکے لڑکیاں تھے، جو پاکستان کی سیر کرنے آئے تھے۔

لان پر بیٹھی سات آٹھ خواتین کے ہالے اس گروپ کو انہوں نے اپنے کیمروں میں فوکس کیا۔ یہ فوٹو ضرور اچھا ہوگا پاکستان کی کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ ہندوستان کی ایک افسانہ نگار۔ ہمارے رنگ کتنے ملے جلے تھے۔ محنت سے تھکے ہوئے چہرے اپنے حقوق کے لئے کرنے والی جدوجہد کی چمک، سادہ لباس، آسمان کی طرف اٹھی ہوئی گردنیں۔ مگر بانہوں میں پڑی ہوئی زنجیریں۔ برصغیر کی عورت چاہے یو، این، او کی کرسی پر جا بیٹھی ہو، مگر اپنے جہیز کی فکر اسے مارے ڈالتی ہے۔

"پاکستان کی محنت کش عورت کو آپ دیکھنا چاہتی ہیں تو سندھ اور پنجاب کے اندرونی علاقوں میں جائیے۔ کراچی کے سمندر کے کنارے بنی ہوئی جھگیوں میں جھانکئے۔ وہاں آپ کو وہ عورت ملے گی جو پاکستان کی معمار ہے۔" زاہدہ حنا کہہ رہی تھیں۔

مگر ایک صبح وہ عورت مجھے اپنے ہی گھر کے ڈرائنگ روم میں مل گئی۔ ہاتھوں میں مہندی لگائے۔ نئی دلہنوں کی جگمگاہٹ چہرے پر سجائے، جھلملاتے کپڑے پہنے۔

"میں ایک اردو ڈائجسٹ سے آئی ہوں آپ کا انٹرویو لینے۔ معاف کیجئے۔ میں نے گزشتہ ہفتے آپ سے انٹرویو کے لئے وقت لیا تھا۔ مگر اتوار کو میری شادی ہوگئی" وہ دونوں ہاتھوں میں مونہہ چھپا کر شرما گئی۔

اب میں نے اس پاکستانی دلہن کو غور سے دیکھا، جو اپنے چہرے سے گھونگھٹ ہٹاتے ہی اپنے دولہا کے اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر میرا انٹرویو لینے میں مصروف ہوگئی تھی۔

پاکستان کے انگریزی اور اردو اخباروں میں زیادہ تر عورتیں ہی کام کرتی ہیں۔ نیوز ایڈیٹر سے لے کر جرنلسٹ تک۔

پاکستان میں خالص علمی اور ادبی رسالوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے، اس لئے ہلکا پھلکا ادب پیش کرنے والے ڈائجسٹ زیادہ تعداد میں چھپنے لگے ہیں۔ ان رسالوں میں لکھنے والی عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ یہ ڈائجسٹ کو چلانے والی کوئی عورت ہی ہے، چاہے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کا نام رسالے پر موجود نہ ہو۔ یہ خواتین بے حد محنت اور سوجھ بوجھ کے ساتھ ان پرچوں کو چلاتی ہیں، کیوں کہ بازار میں ان رسالوں کا زبردست مقابلہ ہے۔

پاکستان کے ایک ایسے ہی بہت مشہور رسالے "دوشیزہ" کو چلانے والی دو خواتین ہیں۔ رخسانہ سہام مرزا اور رعنا فاروقی۔ رخسانہ اپنے ان گنت مہمانوں، چھوٹے بچوں، ضعیف والدہ کی خدمت کرکے نو بجے صبح آفس پہنچ جاتی ہیں "دوشیزہ"، میں تین عورتیں تین کہانیاں لکھنے والی رعنا فاروقی دن بھر ایک بینک میں کام کرتی ہیں اور شام کو جب کراچی کی فیشن ایبل خواتین "ہالی ڈے ان" میں "میٹ ٹوگیدر" پارٹیاں انجوائے کرتی ہیں تو رعنا رات کے بارہ بجے تک اپنے رسالے کو بازار میں آگے لے جانے کی اسکیم بناتی رہتی ہیں۔

کشور ناہید پاکستان کی مشہور شاعرہ ہے، بے حد نازک مزاج، حساس، دوست نواز ادب اور موسیقی کی یہ محفل کی روح رواں مگر دن بھر یہ خوب صورت شعر لکھنے والی شاعرہ، پاکستان نیشنل سینٹر کی ڈائریکٹر بنی، نہایت سنجیدگی سے اپنا کام کرتی ہیں۔

ایسی ہی ایک خاتون کا نام زاہدہ حنا ہے۔ وقت کی آہٹوں کو گننے والی جدید افسانہ نگار۔ انتہائی تیزی سے پر پیچ راہوں پر کار ڈرائیو کرنے والی، وہ بڑے نازک مسائل اور نفسیاتی موضوعات پر کہانیاں لکھتی ہے۔ تین چھوٹے بچوں کی ماں ہے۔ دن بھر ایک آفس میں کام کرتی ہے۔ شام کو ایک چھوٹے ڈائجسٹ کے آفس میں جاکر ایڈیٹر کا فرض ادا کرتی ہے۔ اس کے بعد کراچی کی یہ ادبی محفل میں جاکر زوردار مباحثوں میں حصہ لیتی ہے۔

پاکستان میں ہر دور میں افسانہ نگار اور شاعر خواتین کی خاصی تعداد رہی ہے یہ سب خواتین لکھنے کے علاوہ اپنے گھروں اور خاندانوں کی ذمہ داریاں بھی پوری کرتی ہیں۔ پاکستان کی عورتوں میں سماجی شعور بیدار کرنے والی ایک ایسی ہی باشعور خاتون کا نام ہے بیگم ممتاز ملک نورانی۔ انہوں نے جمہوریت پسند خواتین کی ایک انجمن بنائی ہے۔ یہاں وہ خواتین میں ترقی پسند نقطۂ نظر سے بیداری کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ ان کے یہاں ہر مہینے میٹنگ ہوتی ہے۔ اس میں خواتین کے مسائل پر مباحثے ہوتے ہیں۔ ان کی انجمن میں گھریلو خواتین محنت مزدوری کرنے والی عورتیں جرنلسٹ آرٹسٹ، شاعر، ادیب، کلرک، ہر طرح کی خواتین اکٹھی ہوتی ہیں۔ میں ان کی ایک محفل میں شریک ہوئی جس میں ہاجرہ مسرور رضیہ فصیح احمد، زاہدہ حنا، ندرت الطاف اور سعیدہ گزدر وغیرہ بھی آئی تھیں۔

ان جلسوں میں شریک ہونے پر

مجھے احساس ہوا کہ عورت کے مسائل ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ بیگم ممتاز نورانی کی بائی پاس سرجری ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود وہ کام کرنے میں نوجوان لڑکیوں کی طرح نظر آتی ہیں انہوں نے کہا "پاکستان میں بدکاری کی سزا، اس عورت کو دی جاتی ہے جو حاملہ ہو جائے۔ مرد کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لئے وہ مجرم قرار نہیں پاتا۔

مرد کبھی مجرم ثابت نہیں ہوتا، کیوں کہ دنیا میں ہر جگہ انصاف کی ترازو اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ابھی تک دنیا کے کسی ملک میں ایسی عدالت نہیں بنائی گئی ہے، جہاں عورت سے انصاف کیا جائے۔

مگر مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اپنے حق کے لئے لڑنے والی عورتوں میں پاکستانی عورت بھی شامل ہے۔

یقین نہ آئے تو میں کے کلر گروپ کا وہ فوٹو اٹھا کر دیکھئے جس میں ایک ہندوستانی افسانہ نگار کے ساتھ دو پاکستانی عورتیں سر جوڑے بیٹھی ہیں۔ ●●

احساسِ کم تری

وقار مانوی

کچھ اقربا مرے کم تر ہیں مجھ سے
کچھ برتر
مجھے بجھے بجھے سے نظر آتے ہیں جو کم تر ہیں
ملول رکھتا ہے احساسِ کم تری اُن کو
مجھے پسند نہیں
کم تری کا یہ جذبہ
میں اُن سے جب بھی ملوں، پُرتپاک ملتا ہوں
میں چاہتا ہوں انہیں ہم سَری کا درجہ دوں
مرا تپاک سے مِلنا اُبھارتا ہے انہیں
حوصلہ بڑھاتا ہے
اور اِس عمل سے مجھے کچھ خوشی سی ہوتی ہے

مرے عزیز!
مگر وہ جو مجھ سے برتر ہیں
جنہیں زمانہ سمجھتا ہے مال و زر والے
نظر کے پست ہیں
وہ اونچے اونچے گھر والے
کچھ اُن کے طور طریقے ہیں مختلف سب سے
وہ مجھ سے مل کے نہ مِلنے کا شکوہ کرتے ہیں
کچھ اِس طرح بھی رفاقت کا رنگ بھرتے ہیں
وہ جب ملیں
تو یہ معمول اُن کا دیکھا ہے
نہ پوچھنے پہ بھی گویا یہ اُن کی خو ٹھہری
وہ ذکر کرتے ہیں، اِملاک کا
اثاثے کا
بڑے گھرانوں میں کچھ خاص رشتے ناطوں کا
نمایاں ہو سکے جس سے کہ حیثیت اُن کی
ہر ایک شعبے میں اپنی ترقیوں کا بیاں
اور اِک طویل سی رُوداد
جس کا سر ہو نہ پاؤں

کوئی سُنے نہ سُنے وہ سنائے جاتے ہیں
کشاں کشاں
مرا رہنا انہیں پسند نہیں
وہ مجھ سے شاکی ہیں
وہ چاہتے ہیں مجھے کچھ قریب تر لانا
وہ چاہتے ہیں کہ میں اُن کا احترام کروں
میں اُن سے ربط بڑھاؤں نیاز مندانہ
جہاں کہیں ہوں، ادب سے انہیں سلام کروں

سلام کا ہے جہاں تک سوال، تو ہر شخص
اِسے اِک اچھا عمل ہی قرار دیتا ہے
عزیزوں ہی کو نہیں، بلکہ عام لوگوں کو
سلام کرتے ہیں
ہو پہل اگر تو اچھا ہے
مگر
انہیں نہیں، جو منتظر سلام کے ہوں

وہ احترام کے لائق نہ ہوں، یہ بات نہیں
خود اِس کی آرزو رکھنا مگر نہیں اچھا
سمجھنے کو، میں انہیں محترم سمجھتا ہوں
مرے عمل سے مگر مطمئن وہ کیسے ہوں
بری تو خیر نہیں ہوتی
سربلندی بھی
مگر بھلی نہیں یہ خوئے خود پسندی بھی
مرے لئے جو تصور ہے، کم تری کا انہیں
وہ خود انہیں کو پریشاں، اُداس رکھتا ہے
خیالِ کم تری، مجھ میں جو وہ نہیں پاتے
تو ہونے لگتی ہے مجروح برتری اُن کی
کرے بھی کیسے
مجھے اُن کی برتری مرعوب
مری نظر میں ہے احساسِ کم تری معیوب

اس کے ہسپتال سے آنے کے بعد اس گلی کے رہنے والوں میں سب سے پہلے جو اس کی مزاج پرسی کے لیے آیا' وہ موتی تھا۔ اس کے پڑوسیوں کا کتا! موتی خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے دُم ہلانے لگا۔ اور جب وہ اس کی چارپائی کے قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ موتی کا پیٹ پھولا ہوا ہے — اس کے اپنے پیٹ کی طرح۔ وہ حیران رہ گئی اور اپنی بیماری کو بھول کر موتی کے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھنے لگی۔

"یہ کیا ہوا تجھے موتی؟" اس نے ہاتھ بڑھا کر موتی کو سہلایا۔ اس ایک پل میں وہ اپنا درد بھول گئی۔ آج پورے ایک ماہ بعد اس نے موتی کو دیکھا تھا۔ ہسپتال میں اپنی بیماری، دواؤں، ڈاکٹروں، نرسوں اور عیادت کے لیے آنے والے عزیزوں، رشتہ داروں کے درمیان وہ موتی کے بارے میں بالکل نہیں سوچ سکی تھی۔ جب موتی کے مالک آئے تھے تو اس نے ان سے موتی کے بارے میں پوچھا بھی تھا، لیکن اس وقت انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ موتی بیمار ہے۔

تو کیا یہ ان ہی دنوں بیمار پڑ گیا؟

اسے کینسر تھا۔ جو اب تیسری منزل میں تھا۔ گھر والوں نے اسے اس کی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، لیکن اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے کوئی مہلک بیماری ہے۔ شاید کینسر ہے۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی بیماری اب آخری منزل میں ہے۔

اب کی بار وہ پورے ایک مہینے ہسپتال میں رہی تھی اور اب ڈاکٹروں نے اس کے شوہر کو بتا دیا تھا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے — گھر لے جائیے — زندگی کے آخری چند روز وہ گھر میں گزار لے — اور جب وہ گھر آئی تو حیران تھی کہ لوگ تو صحت یاب ہو جانے کے بعد ہسپتال سے چھٹی پاتے ہیں اور وہ بغیر صحت یاب ہوئے گھر آ گئی تھی!

"گھر میں آرام رہے گا — ہے نا؟" گھر پہنچنے کے بعد اُسے سہارا دے کر، اس کی چارپائی تک لاتے ہوئے اس کے شوہر نے اس سے کہا۔

"ہوں" — اس نے بیچارگی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پلنگ پر بیٹھ گئی — اُف! وہ کتنا تھک گئی تھی!

اس نے دیکھا تھا کہ اس کا شوہر اس سے نظریں چُراتا ہے، شاید اس لیے کہ کہیں اس کی نگاہیں چغلی نہ کھا جائیں۔

وہ شوہر سے پوچھنا چاہتی تھی، آپ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟ آپ میں اتنی ہمت کیوں نہیں ہے؟ آپ یہی سمجھتے ہیں نا کہ میں مرنے سے پہلے نہ مر جاؤں؟ نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ موت کو خوشی خوشی گلے لگا لوں۔ جتنی زندگی ہمارے قسمت میں لکھی ہے، وہی تو جینے کو ملے گی۔ جتنی مدت کے لیے ہم دونوں کا ساتھ لکھا ہے اتنا ہی تو ساتھ

ڈاکٹر بشیشر پردیپ

داڑھی بنانے کے دنیا میں سب سے انوکھے بلیڈ

نیوگائنا کے باشندے دھاگے جیسی اور حیرت انگیز طور پر تیز گھاس کی پتی سے داڑھی بناتے ہیں

رہے گا۔ زندگی نے جو کچھ بھی ہمیں دیا ہے، ہم اس کے لئے زندگی کے شکر گزار ہیں۔" لیکن جب وہ اپنے شوہر کے اداس چہرے کی طرف دیکھتی تو خود بھی اداس ہو جاتی۔

اس کا علاج اب زیادہ تر اُن دواؤں تک محدود تھا جو اس کے درد کو کم کرنے کے لئے دی جاتی تھیں۔ جیسے ہی دوا کا اثر کم ہوتا، وہ کراہ اٹھتی۔ اور اس وقت اس کا شوہر اسے پھر دوا دے دیتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اسے ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہوتا اور ایسے میں موتی آجاتا۔ اور وہ اپنا درد بھول کر موتی کے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھنے لگتی۔

موتی کے مالک کے لڑکے راجو نے اُسے بتایا تھا "آنٹی، موتی کو ایسائیٹس (ASYTES) ہو گیا ہے۔ اس کے پیٹ میں پانی پڑ گیا ہے۔ چار پانچ بار پانی نکلوا چکے ہیں پہلے ہر ہفتہ نکلواتے رہے ہیں۔ اب ہر دوسرے تیسرے دن نکلوانا پڑتا ہے۔"

پھر ایک دن جب راجو آیا تو موتی بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔ گرتا پڑتا۔ جھولتا ہوا سا۔ پھولے ہوئے پیٹ کی وجہ سے اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہی تھیں۔ راجو اس کی چارپائی کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور موتی پاس کھڑا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ سر کو ایک طرف جھکا کر، عجیب سوالیہ انداز میں۔

راجو بولا "آنٹی، ڈاکٹر کہتا ہے، موتی کا علاج کرانا بالکل بے کار ہے۔ یہ بچے گا نہیں۔ اسے مروا دینا ٹھیک رہے گا۔" اور وہ روہانسا ہو گیا۔

یہ سن کر وہ بھی اداس ہو گئی۔ اس کی اپنی بیماری کے بارے میں بھی تو ڈاکٹر سب کچھ جانتے ہیں۔ انہوں نے اس کے شوہر کو بھی بتا دیا ہے۔ شوہر نے اگرچہ اُسے نہیں بتایا، لیکن وہ بھی جان گئی ہے شوہر کو معلوم ہے وہ بچے گی نہیں۔ پھر بھی وہ اس کا علاج کرا رہا ہے۔ اور وہ بھی برابر دوا لے رہی ہے۔ جب تک سانس تب تک آس۔

لیکن موتی؟ موتی تو جانور ہے۔ اس نے موتی کی طرف دیکھا۔ موتی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کہہ رہا ہو: "ہاں، اب میں دو ہی چار دن کا مہمان ہوں۔"

موتی آنکھوں سے باتیں کرتا تھا اپنی مہلک بیماری کے بارے میں بہت کچھ بتا رہا تھا۔ اپنی بیماری، اپنا دکھ، اپنی بے بسی۔

اس نے دیکھا کہ موتی کا پیٹ آج کچھ زیادہ پھولا ہوا ہے۔ لاشعوری طور پر اس کے ہاتھ اس کے اپنے پیٹ کی طرف چلے گئے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اس کا اپنا پیٹ بھی کافی اوپر تک پھول آیا ہے۔ وہ لیٹے لیٹے اپنے پیٹ کو نہیں دیکھ سکتی تھی، لیکن ہاتھوں سے پیٹ کی سوجن محسوس کر لیا کرتی تھی۔ اس کے پیٹ کی سوجن بڑھتی جا رہی تھی ڈاکٹر تو باقاعدہ فیتے سے اس کے پیٹ کی سوجن ناپا کرتا۔

اس کے ہاتھ اپنے پیٹ پر تھے اور نگاہیں موتی کے پیٹ کی طرف۔ کبھی کبھی تو اسے یہ محسوس ہوتا کہ موتی کی بیماری اور اس کی اپنی بیماری ایک سی ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے وہ اور بھی موتی کے نزدیک آ گئی تھی۔ موتی آتا تو وہ کہتی "ارے موتی، اب تو نہ آیا کر۔ دیکھ، مجھ سے تو اب چلا بھی نہیں جاتا۔ تیری تو اب ٹانگیں بھی ٹیڑھی ہو گئی ہیں۔ نہ آیا کر اب۔"

لیکن موتی کی آنکھیں جواب دیتیں "جب تک چل سکوں گا، آؤں گا ضرور۔ جب ٹانگوں پر کھڑا ہی نہ ہو سکوں گا تو بات دوسری ہے۔"

وہ خود بھی تو اب مشکل سے بیڈ پر سے اٹھ پاتی تھی۔ ابھی چار ماہ پہلے وہ کتنی چست و تندرست تھی۔ اچانک ایک دن اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ اسے بخار تھا۔ اور پھر یہ بخار اس کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔ اسے ہر وقت بخار رہنے لگا۔ پیٹ میں ہلکا ہلکا درد اور بخار۔ پیٹ میں درد تو اسے پچھلے سال بھی ہوا تھا اور ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا تھا۔ یہ سن کر وہ دونوں فکر مند ہو گئے تھے۔

ان کا کوئی بچہ نہ تھا۔ آپریشن کے بعد تو بچے کی امید ہی جاتی رہے گی۔ پھر وہ ایسے ڈاکٹروں سے علاج کرانے لگے جو آپریشن کے بغیر شفا کا دعوے کرتے تھے۔ اُن ڈاکٹروں کی دواؤں سے مرض گیا نہیں، صرف دب گیا اور جب دوبارہ ابھرا تو پوری طاقت سے ابھرا۔

اسے علاج کے لئے بمبئی بھی جانا پڑا۔ ایک بار نہیں، تین بار۔ ہر مہینے میں ایک بار۔ اور وہ سمجھ گئی کہ اسے کوئی مہلک بیماری ہے، جو اس سے چھپائی جا رہی ہے۔ گھر کے کسی فرد نے اسے نہیں بتایا۔ نہ شوہر نے، نہ اس کے ماں باپ نے۔ لیکن ان کے چہروں پر لکھی تحریر سے اس نے اپنی بیماری کے بارے میں سب جان لیا۔ جس طرح شوہر اسے جھوٹی تسلی دیتا، اسی طرح وہ بھی اسے کھوکھلا دلاسا دیتی۔

"ارے! آپ اداس ہو گئے؟ میں ٹھیک
جاؤں گی۔۔۔ بالکل ٹھیک۔۔۔"
"ہاں، یقیناً تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔۔۔ بالکل
ٹھیک ہو جاؤ گی۔۔۔" ایک پھیکی سی مسکراہٹ
کے شوہر کے ہونٹوں پر رینگ جاتی۔۔۔ اور
دکھ ہوتا کہ وہ آپس میں اس کی بیماری کے بارے
کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟
جب اُسے اچانک احساس ہوا تھا کہ اس
مرض لاعلاج ہے تو وہ اکیلے میں کتنا روئی تھی۔۔۔
میں نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھگوان ایسا
کر سکتے۔۔۔ لیکن بھگوان کو شاید یہی منظور تھا۔
اب۔۔۔ اب تو اس نے اپنے آپ کو اس آخری
گھڑی کے لئے تیار کر لیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس
شوہر بھی ہمت سے کام لے۔ لیکن اس کا شوہر
سے اس کی بیماری کا نام بھی نہیں بتا رہا تھا۔۔۔

موتی اب تقریباً روز ہی آ جاتا۔ کبھی پھولے
ہوئے پیٹ کے ساتھ، جب اس کے پیٹ میں
پانی بھر جاتا۔ اور کبھی پچکے ہوئے پیٹ کے ساتھ،
جب اس کے پیٹ میں سے پانی نکال دیا جاتا۔
ایک دن راجو آیا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی
تھیں۔۔۔ اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ
روتا رہا ہے۔۔۔
"کیوں راجو؟ کیا بات ہے؟"
"پاپا موتی کو لے گئے۔۔۔ مروانے کے
لئے۔۔۔ ساتھ میں ہمارا نوکر شنکر بھی گیا ہے ایک
بوری لے کر۔۔۔ موتی کے انجکشن لگے گا۔۔۔ اور جب
وہ مر جائے گا تو بوری میں بند کر کے اسے دریا میں
ڈال آئیں گے۔۔۔" اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں پھر
آنسو آ گئے۔۔۔
دیکھو بیٹا، تمہیں صبر کرنا ہی پڑے گا۔ تم
تو جانتے ہو، موتی بہت تکلیف میں تھا۔۔۔
"ہوں۔۔۔" راجو نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔۔۔
اور پھر اچانک بولا۔
"آنٹی، تم بھی تو بہت تکلیف میں ہو۔۔۔"
اور وہ سن کر رہ گئی۔۔۔ راجو نے کتنی سچ
بات کہی تھی! لیکن۔۔۔ لیکن موتی تو ایک جانور ہے۔
وہ اپنی موت پر اپنے سے تعلق رکھنے والوں کی
حالتِ زار کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔۔۔ وہ
یہ سب باتیں راجو کو کیسے سمجھائے؟
تھوڑی دیر کے بعد راجو چلا گیا۔۔۔
اس کا شوہر اسے دوا دینے لگا تو اس نے
شوہر کو بتایا کہ پڑوسیوں کے کتے کو موت کا انجکشن
دے دیا گیا ہے۔ اس کا شوہر بھی یہ سن کر اداس ہو گیا
اسی وقت وہ بولی۔۔۔
"یہ مرسی کلنگ (MERCY KILLING)
ہوا نا؟ یعنی جس کے بچنے کی کوئی امید نہ ہو، جو بہت
تکلیف میں ہو، اسے ڈاکٹر کی رائے سے، اس کی
اپنی رضامندی حاصل ہو جانے کے بعد، ابدی نیند
کا انجکشن دے دینا۔۔۔ یہ مرسی کلنگ کا اصول تو
جانور اور انسان دونوں پر چسپاں ہو سکتا ہے۔۔۔
ہے نا؟"
اور وہ شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے
لگی۔۔۔ اس کا شوہر کچھ لمحے تک خاموش اس کی طرف
دیکھتا رہا اور پھر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔۔۔ اور
اسی وقت اس نے شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے
لیا۔
"دیکھئے، میں سب جان گئی ہوں۔ اب آپ
جھوٹ نہ بولئے گا۔۔۔ مجھے کینسر ہے نا؟"
جواب میں اس کے شوہر نے اپنی نگاہیں
پھر اس کی طرف پھیر دیں۔۔۔ کرب، بے چینی،
درد، سب ایک ساتھ ان نگاہوں میں سمٹ آیا۔

عصمت بے (۱۹۰۰-۱۸۴۲) جو ٹھیک اسی
دن پیدا ہوا تھا جس دن ترکی کا سلطان عبد الحمید پیدا
ہوا تھا۔ اس کی شکل اس سلطان سے اتنی ملتی تھی کہ وہ عام طور
سلطان کی جگہ درشن دیتا تھا اور بہت دن تک یہ پتہ نہیں
چلا کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ عرصہ تک زندہ رہا۔

اور پھر ان آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔
اس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔۔۔
درد کی ایک لہر اس ہاتھ سے اس ہاتھ تک اور پھر
اس ہاتھ سے اس ہاتھ تک سرایت کر گئی۔۔۔
"لیکن بھگوان پر تو بھروسہ رکھنا ہی پڑے گا
آگے جو بھی قسمت میں لکھا ہے۔"
"یہی تو میں بھی کہنا چاہ رہی تھی۔۔۔ دو ہی
تو باتیں ممکن ہو سکتی ہیں: مرسی کلنگ یا پھر صبر
اور تحمل سے اس بیماری کو جھیلنا۔۔۔ جتنے دن بھی
زندگی کے باقی ہیں، ہمارا ساتھ باقی ہے، ہنسی خوشی
گزار دینا۔۔۔"
"ہوں۔۔۔"
اور جب دوسرے دن ڈاکٹر آیا تو وہ یہ دیکھ کر
حیران رہ گیا کہ اس کے پیٹ کی سوجن اگرچہ کچھ اور
بڑھ گئی تھی، مگر وہ ہشاش بشاش اور پُرسکون تھی۔
اور جب اس نے اپنے شوہر کو پکارا۔۔۔ "دیکھئے ڈاکٹر
صاحب آئے ہیں۔" تو جواب میں اس کے شوہر
کی آواز "آ رہا ہوں۔۔۔" میں بھی صبر اور شکر نمایاں
تھا۔۔۔

●●

شمع ٹانک
ہر موسم کے لئے نباتاتی یونانی ٹانک
بڑھتے ہوئے بچوں سے لے کر دودھ پلانی ماؤں اور
بڑے بوڑھوں تک خاندان کا ہر فرد پورے سال،
ہر موسم میں شمع ٹانک استعمال کر سکتا ہے۔ اس کا
ہر مزے دار چمچہ صحت اور قوّت کا خزانہ ہے۔ شمع ٹانک
صحت کو بحال کرتا ہے، تھکے ہوئے اعصاب کو تسکین
دیتا ہے، فرحت بخش نیند کا ضامن ہے، بھوک بڑھاتا
اور نظامِ ہضم کو بہتر بناتا ہے۔ توانائی عطا کرتا ہے
بیماریوں کے خلاف قوّتِ مزاحمت پیدا کرتا ہے۔
بیماریوں سے بچنے کے لئے یا بیماری کے بعد زور اور
قوّت بحال کرنے کے لئے شمع ٹانک استعمال کیجئے۔
اس میں الکحل بالکل نہیں ہے۔
فی بوتل: پچیس روپے (مقامی ٹیکس علاوہ)
شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی۶

ل — شخصیت کا آئینہ

شہناز رفیع چودھری

ہندوستانی شاعری میں حسین
ی کی تعریف میں لب و رخسار اور چشم و گیسو
اتھ تل کو بھی بہت اہمیت دی گئی ہے۔
ماد ولتِ حسن کے دربان کی حیثیت
تل کا بہت ہی اہم درجہ ہے۔ تِل اور خال
ش نصیبی کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔
یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تِل اور خال
ذریعہ انسانی کردار کے مختلف پہلو ظاہر
تے ہیں۔ تل کے رنگ اس کی بناوٹ اور
ئے وقوع کے ذریعہ انسانی کردار کو پڑھا
کتا ہے۔ انگریزی میں اس علم کو "مولوسوفی"
جاتا ہے۔

مولوسوفی کی رو سے ہلکے رنگ والے
ل سب سے بہتر اور خوش نصیبی کی
مت ہوتے ہیں کالے تل عمدہ نتائج سے
ن آنے والی دشواریوں کے غماز ہوتے ہیں۔
ل تِل انسان کی اچھائیوں کو نمایاں کرتے ہیں۔
ونے تِل درمیانے درجے کی خصوصیات
ے حامل ہوتے ہیں، جب کہ ترچھے اور نوکیلے
ں اچھائی اور برائی دونوں کی اطلاع دیتے ہیں۔

تِل کے جائے وقوع کی مناسبت
سے بھی انسانی کردار کا جائزہ لیا جاتا ہے۔
ل اگر جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر ہوں تو
نہیں دیکھ کر آسانی سے شخصیت کی خوبیاں
ور خامیاں معلوم کی جا سکتی ہیں۔

ٹھوڑی پر تِل کسی بھی جانب کیوں نہ ہو،
اچھی علامت ہے۔ اس جگہ تِل کے حامل لوگ
قابلِ رشک شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔
یہ لوگ ہمدرد، پُر محبت اور فیاض ہوتے ہیں
انہیں گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہوتا ہے
دوسرے لوگوں کی خوبیوں کو اپنانے کا فن انہیں
خوب آتا ہے۔ ہر قسم کی ذمہ داری ان لوگوں
کو بلا خوف و خطر سونپی جا سکتی ہے۔

گال پر (کسی بھی گال پر) تِل ہو تو نہایت
گہری، مستقل مزاج شخصیت کی علامت
ہے۔ ایسا آدمی ہر معاملے میں میانہ روی کا قائل
ہوتا ہے۔ اسے روپے پیسے کی زیادہ ہوس
نہیں ہوتی اور وہ ہر حال میں خوش اور مطمئن رہتا ہے

آنکھ پر تِل کے حامل لوگ ایماندار
اور قابلِ اعتماد ہوتے ہیں مگر یہ لوگ عموماً اپنی
صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے اور ہاتھ
پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایسے بچوں
کو جن کی آنکھ پر تِل ہوتا ہے، خصوصی شفقت
کا رویہ درکار ہوتا ہے۔

سینے پر تل ہونا غصہ ور شخصیت کی
پہچان ہے۔ اس جگہ تل کے حامل لوگوں
کے مزاج میں کاہلی اور تلون بہت ہوتا ہے یہ
نہایت جامد قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ تِل
گردن پر اگر سامنے کی جانب ہو تو ایسے شخص
کا رویہ نامناسب ہوتا ہے۔

کان پر تِل بہت ہی کم ملتا ہے لیکن
اگر مل جائے تو کیا کہنا یہ غیر متوقع دولت
کی نشانی ہے۔

پیٹ پر تِل کے حامل اشخاص اپنے آپ
پر بہت توجہ دیتے ملتے ہیں، خوب کھاتے

محبت کا پنجرہ

لیوروکا (چیکوسلواکیہ) میں ایک بدنامِ زمانہ لڑکی جس نے افسران کو اپنے منگیتر کا نام بتا دیا تھا کو لیوروکا کے بازار میں لوہے کے ایک پنجرے کے اندر قید کر دیا گیا اور اس نوجوان کو پنجرے کے باہر زنجیر سے باندھ دیا گیا۔ دونوں کو اسی قید میں تب تک رکھا گیا جب تک کہ وہ آدمی شادی کے لئے راضی نہیں ہو گیا۔

پیتے ہیں اور روپیہ اڑانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ان میں ٹھنڈے مزاج والے لوگ بھی ملتے ہیں، جنہیں اپنے اوپر کافی اختیار ہوتا ہے۔

ناف پر تل اگر مرد کے ہو تو بے حد خوش نصیب ہے۔ اگر عورت کے ہو تو اسے بہت سے بچوں کی خواہش ہوگی۔

ہونٹوں پر تل کے حامل لوگ فیاض شخصیت کے مالک ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو ہمیشہ بہتر سے بہتر ماحول کی جستجو پریشان رکھتی ہے۔

تل بیچوں بیچ ماتھے پر ہو تو اعزاز، دولت، منصب اور خوشیاں ملتی ہیں۔ ایسے لوگ ہر جگہ آسانی سے اپنا مقام بنا لیتے ہیں۔

اگر ہاتھ پر تل ہو تو بے حد باصلاحیت شخص کی پہچان ہے۔ ایسے شخص کو دولت عزت اور شہرت، سب ہی کچھ میسر آتا ہے۔ لیکن اگر تل کسی بھی انگلی پر ہو تو یہ بے ایمانی کی علامت ہے۔ ایسا شخص کام چور ہوتا ہے اور دشواریوں سے آنکھیں چراتا ہے۔

ناک پر تل کے حامل لوگ مخلص دوست ہوتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کے مزاج میں تلون بہت ہوتا ہے۔ ایسے آدمی ہر وقت روپیہ بنانے کے چکر میں رہتے ہیں خواہ منصوبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔

بازوؤں پر تل کا حامل اگر مرد ہے تو یہ علامت ہے اس کے خوش اخلاق ہونے کی۔ ایسا شخص محنتی، خوش مزاج اور اچھے تعلقات رکھنے والا ہوتا ہے۔ اگر تل کہنیوں کے نزدیک ہو تو ایسے شخص کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے خاصی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔

کلائی پر تل کے حامل لوگ کفایت شعار، طباع، خوش تدبیر اور ایجاد کے ماہر ہوتے ہیں عورت کی کلائی پر تل ہو تو اس کی صرف ایک شادی ہوگی اور اگر مرد کی کلائی پر تل ہو تو اس کی دو شادیاں بھی ہو سکتی ہیں۔

جن لوگوں کی کہنی پر تل ہو، ان کو سفر کی بے پناہ خواہش ہوتی ہے۔ مگر یہ بے حد غیر مستقل مزاج اور متذبذب ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے انہیں بے پناہ رغبت ہوتی ہے۔ یہ لوگ چاہیں تو بہت کما سکتے ہیں، مگر مشکل سے ہی ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں۔

تل دائیں گھٹنے پر ہو تو یہ باش شخص کی پہچان ہے۔ اسے گھر اور خاندان سے بے حد لگاؤ ہوتا ہے یہ منہ بولتا اور کنشانی بھی ہے

کندھے پر تل کے حامل لوگ بلند حوصلہ نہیں ہوتے۔ انہیں جو کچھ مل جائے اسی پہ قانع ہو جاتے ہیں۔

دائیں جانگھ پر تل خراب صحت کی نشا ہے۔ خواہ آدمی خوش حال ہی کیوں نہ ہو۔ بائیں جانگھ پر تل خراب صحت کے ساتھ مفلسی کی علامت ہے۔

پیروں پر تل رکھنے والے کو سخت محن کے ذریعہ بچپن کے دشواریوں پر عبور حاصل ہو ہے۔ ایسے شخص میں کاہلی بھی پائی جاتی ہے۔ تل اگر پاؤں کے اوپر (تلوے کی طرف نہیں) تو ایسا شخص جھگڑالو قسم کا ہوتا ہے۔

ایڑی پر تل کے حامل لوگ دماغی ا جسمانی طور پر تیز اور طرار ہوتے ہیں یہ چاہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ انہیں دولت بھی مل سک ہے۔ مگر یہ عموماً معمولی معمولی چیزوں پر لڑ اور الجھتے رہتے ہیں۔

جن لوگوں کے تلوؤں پر تل ہوتا ہے غم زدہ رہنے والے آدمی ہوتے ہیں، اپنی صح سے غافل رہتے ہیں اور تنہائی کو محفل پر تر دیتے ہیں۔ ٹخنوں پر تل کا حامل اگر مرد ہے یہ علامت ہے بزدلی کی۔ اگر حامل عور ہے تو یہ ہمت، خوش مزاجی اور تعاد کی علامت ہے۔

فیلوسوفی کی رو سے اگر کسی مقام دو تل ہوں، (مثلاً ٹھوڑی پر دونوں جانب ایسے تلوں کو "جڑواں تل" کہتے ہیں۔ ایسے اشخ دوہری شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اگر ک مقام پر پاس پاس دو تل ہوں تو اس کا مطلب دو محبتیں۔

تل اگر ہتھیلیوں پر ہو تو انہیں برا اچھا نہیں سمجھا جاتا، کیوں کہ انہیں کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔

زخموں کا سوداگر

ہرچرن چاولہ

وہ لڑکی جب بھی مجھے یاد آتی ہے،
آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ ہاتھوں پر
طاری ہوجاتا ہے، زبان میں لکنت آجاتی۔
رہاتھ کے تمام کام غلط سلط ہونے لگتے ہیں۔
ی اتنی خوب صورت ہے کہ اُسے فرشتے بھی
کرنے کے لئے جنّت کا عیش و آرام چھوڑنے
ر ہوجائیں۔ پہلے میں بھی اُسے دیکھ کر اپنے
کھو بیٹھتا تھا۔ مگر تب بات اور تھی۔ اب
ے میں دیکھ لوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے وجو
ی شیطان پناہ گزیں ہوگیا ہے جو مجھے قتل
لیب دے رہا ہے۔ تم کہتے ہو الہ آباد میں
بائی گھر ہے۔ پھر میں نے وہاں سے جان بوجھ
ں سے تبدیلی کیوں کروائی۔ مگر تمہارے اس سوال
جھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میرے زخموں کو
نے پر تُلا ہوا ہو، جس سے میرے اندر پھر ایک
ن جاگ اُٹھا ہو، جو کہتا ہو:

"چلو الہ آباد اور بنا دو اسے گولی کا نشانہ۔
پہلے خود پھانسی پر ہی جھول جاؤ۔ مگر ایک بار
کا وجود ضرور اس دنیا سے مٹا دو، جس کے

ایک امریکن لڑکی جو فرانس کی ملکہ بن سکتی تھی

بنک آف دی یو ایس کے ایک چیئرمین تھامس وِلنگ کی بیٹی الوی گیل وِلنگ نے آرلیئنس کے ڈیوک (شہزادہ) لوئس فلپ کی شادی کی تجویز کو ٹھکرا دیا تھا جب کہ وہ فرانسیسی بغاوت کے سبب ایک شرنارتھی کے طور پر فلاڈلفیا کے ایک گرل اسکول میں پڑھاتا تھا۔ لڑکی کے باپ نے لوئس فلپ سے کہا: "اگر تمہارے لئے فرانس کی گدی پانے کا کوئی موقع نہیں ہے تو تم میری بیٹی کے لئے مناسب نہیں اور اگر تم فرانس کے بادشاہ بن جاتے ہو تو میری بیٹی تمہارے لئے مناسب نہیں ہوگی۔"

لوئس فلپ فرانس کا بادشاہ بنا اور اُس نے ۱۸ برس حکومت کی۔

بوجھ سے دھرتی کی چھاتی بھی گھُٹ کر سانس نہیں لے سکتی۔"

تم حیران آنکھوں سے میری جانب کیوں دیکھ رہے ہو؟ اس لئے نا کہ ایک خوب صورت لڑکی کی یاد کے ساتھ غصے سے خون کا کھَول جانا کیا معنی رکھ سکتا ہے؟ خوب صورتی کے ساتھ تو عشق کا جذبہ اُبھرنا چاہئے۔ تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ میں نے بھی اس لڑکی سے پیار کیا تھا، دل کی ساری دنیا سے اُسے چاہا تھا، خدا سے دن رات دُعائیں مانگیں تھیں کہ خدایا اگر تو وہ لڑکی مجھے بخش دے تو باقی تمام عمر تجھ سے اور کچھ نہیں مانگوں گا۔

مگر خدا کے یہاں رشتے شاید پہلے سے ہی طے ہوتے ہیں۔ مذہب کی، چھوٹے بڑے کی اُونچے نیچے کی دیواریں رہی سہی کسر بھی پُوری کر ڈالتی ہیں۔ وہ پکّا پھل کسی اور نامعقول، بدطینت اور شیطان صفت انسان کی جھولی میں گر نا تھا۔ بس یہ سب غصہ مجھے اسی شیطان پر آتا ہے، جب دیکھتا ہوں کہ کیسے اس نے ایک ہری بھری پھلواری میں آگ کے شعلے بھڑکا کر کسی کی دنیا ہی ملیامیٹ کر کے رکھ دی۔

اِس لڑکی کو میں نے پہلی بار بازار میں سبزی اور پھل خریدتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اُس نے بھی مجھے دیکھا تھا یا نہیں، مگر میں کسی انجانی طاقت سے کشاں کشاں دُور اندر محلّے تک اس کے پیچھے کھنچا چلا گیا۔ محلّہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں کئی دفعہ ان گلیوں سے گزرا تھا۔ وہ جب ایک تنگ گلی میں مُڑی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ـــ وہ کہیں ـــ ہاں، وہ اسی گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جس میں، میں کئی دفعہ آ چکا تھا۔ وہ روشن کا گھر تھا۔ وہ پنجابڑا میرا بہت ہی بے تکلف، ہم نوالہ، ہم پیالہ قسم کا دوست تھا۔ اُردو کو بھی پنجابی کے لہجے میں بولتا تو مزہ آ جاتا۔ اس کی باتیں ہی اتنی پُرلطف اور وزن دار ہوتیں کہ رگوں میں دَورانِ خون تیز ہو جاتا۔ ہم محکمۂ معدنیات کے ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ دفتر جُدا تھے۔ ایک ہی جیپ پر ہم دَورے پر جاتے تھے۔ جب کئی کئی دن باہر رہنا پڑ جاتا تو ایک ساتھ کھانا پینا ہوتا۔ یہی نزدیکی ہمارے دلوں کو قریب لے آئی تھی۔ وہ شاید اکتوبر کا مہینہ تھا۔ سردی بگڑے زکام کی طرح موٹے موٹے دھرتی کی چھاتی میں اُتر رہی تھی اور ہر گھر میں کوئی نہ کوئی نزلہ، فلو یا بخار سے چارپائی پر پڑا تھا۔ روشن بھی سخت بیمار ہوا۔ میں نے اُس کے علاج معالجہ میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ جب وہ قدرے ٹھیک ہوا تو میری ماں نے ایک غریب بُوڑھی عورت کو اس کے گھر میں نوکرانی رکھوا دیا۔ کیوں کہ اُسے پرہیزی اور مناسب غذا کی ضرورت تھی، جو بازار سے دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ بڑھیا نے اُسے ماں جیسا پیار دیا اور شاید روشن نے بھی بیٹے جیسا۔ میں جب وہاں جاتا۔ دونوں مجھے اچھّے سے اچھا کھلائے پلائے بغیر جانے نہ دیتے۔ یہ سلسلہ کئی دن چلتا رہا۔ وہ بُوڑھی عورت جیسے اُس گھر کا ایک فرد ہی بن کر رہ گئی۔ مگر ایک دن میں نے اُس گھر میں ایک اور فرد کو دیکھا وہ روشن کے لئے چائے کا پیالہ لا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ پیالہ پل بھر کے لئے اُس کے ہاتھوں میں کانپا۔ پھر لجاتی، شرماتی، پیالہ روشن کے سامنے میز پر رکھ کر وہ اندر چلی گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے بے موسم کی بجلی دُور کہیں آسمان کی وسعتوں میں کوندی ہو اور بجھ گئی ہو۔

"روشن؟" میں نے آنکھوں سے پُوچھا۔

"ماں کی بیٹی ہے۔" وہ جھینپ کر بولا۔

میں کھُل کر ہنسا۔ "سب ماں کی ہی بیٹیاں ہوتی ہیں۔"

میری ہنسی ایک دم بند ہو گئی، جیسے میرے جبڑوں میں کسی نے کیل ٹھونک دی ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی چائے کا دوسرا پیالہ لئے پھر اندر آ رہی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد چائے سُڑکتے ہوئے پھر میری آنکھوں نے پُوچھا۔ "روشن؟"

"بتایا تو ہے کہ وہ ماں جی کی بیٹی ہے" اُس نے اپنے مخصوص، کرخت، پنجابی لہجے میں کہا۔

میں تھیر ایوپی کا بزدل بھیّا۔ دو س

میری آنکھوں نے کہی۔
"آگ اور پٹرول ایک ساتھ؟ ایک ہی گھر
"
اُس پنجابی موٹے بھٹ نے مجھے گالی دی۔
ت کمینہ ہے۔"
اُس کی گالی جیسے ایک تالہ تھی، جو کھٹاک
رے ہونٹوں پر آلگا۔ لیکن خیالات ایک
ے کی طرح میرے اندر ہی اندر کھولتے رہے۔
ر جب ڈھکنا رکھ دیا جائے تو پانی اور زیادہ
سے اُبلنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ سب
ے وغیرہ اُتار کر خود ہی پھینک دیتا ہے۔ میرے
دنی اُبال نے بھی اس وقت سب بندشیں اب
ے، سب ڈھکنے وغیرہ اُتار کر ایک طرف رکھ
۔ جب چھ مہینے بعد میں نے اس لڑکی کو بھاری
ں کے ساتھ گلی میں سے گزرتے دیکھا۔ میں نے
سرے لوگوں کی نظروں میں بھی شک کی پرچھائیاں
یں اور مجھے میں اندر اندر ایک غصّے کی لہر بھی
ڑتی محسوس کی۔ میری آنکھوں نے پھر روشن سے
چھا: "اب؟"

وہ خاموش رہا اور اس کی خاموشی نے میرے
نٹوں پر لگے تالے کو توڑ دیا۔ میں نے اُس جیسی
بری سے اُسے گالی دی۔ "کمینے تُو نے یہ کیا کیا؟"

"دوست، تم مجھے گالیاں دو، جُوتے مارو
مگر میری مشکلیں بھی تو آسان کرو۔ یہاں میرا
در کون ہے؟" اُس نے میرے ہاتھوں کو اپنے
ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، تمہارے گناہوں کا میں بھی
حصہ دار بنوں؟" میں نے اُس کے ہاتھوں کو جھٹکتے
ہوئے کہا: "میں یہاں کا رہنے والا ہوں۔ سب
ڈاکٹروں کو جانتا ہوں نا —— اس لئے؟"
"بکواس بند کرو۔" وہ پھر ایک دم بھڑک

اُٹھا: "مجھے تمہاری کسی مدد کی ضرورت نہیں اور
نہ میں تمہارے ڈاکٹروں کی طبی امداد کا خواہش مند
ہوں۔ میں حیران ہوں کہ تم ایک عرصہ سے
میری دوستی کا دم بھرتے رہے۔ مگر مجھے ابھی
تک پہچان نہیں سکے۔ وہ میری بیوی ہے۔ نصف
بہتر —— ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم لوگ اگر
سات پھیرے لینے کو گناہ خیال کرتے ہو تو میں تم
لوگوں کا مونہہ بند کرنے کو یہ رسم بھی پوری کر دوں
گا۔ باقی اونچے نیچے چھوٹا بڑا، امیری غریبی، ذات
پات، یہ تو خود ہماری ہی اُٹھائی ہوئی دیواریں ہیں۔
جنہیں سماج کے گورے ٹھیکے داروں نے مضبوط بنایا
ہے تو کیا ہم اپنے جوان ہاتھوں سے اُنہیں گرا نہیں
سکتے ہیں؟"

جیسے تالا پھر اُس نے واپس میرے لبوں پر
لگا دیا۔ مگر اب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے تمام
جذبات ایک قیمتی خزانے کا رُوپ بھر کر میرے اندر
اُس تالے میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ میں اور میری ماں
پھر سینہ سپر ہو کر محلے والوں کے طوفان کے آگے ڈٹ
گئے۔ بڑی منتوں، سماجتوں اور حیلوں سے لڑکی
کی ماں کو منانے کے بعد ہم نے سات پھیروں کی
رسم بھی ایک سنسان مندر میں پوری کرا دی اور
روشن چھ مہینے بعد ایک بچی کا باپ بن گیا۔
شہر کے ایک روزنامچے نے اونچے اور نیچے
کے بیچ گرتی ہوئی اس دیوار کے بارے میں تعریفی
سُرخی کے ساتھ یہ خبر چھاپی۔

روشن کی گھریلو زندگی اب چین سے
گزر رہی تھی۔ ایک خوب صورت پیار کرنے والی
بیوی، ایک گلو نامی بچی اور ایک ہر وقت
خدمت کے لئے تیار ساس سے گھر بھرا پُرا لگتا تھا۔
جہاں ہنسی کے فوارے چھوٹتے تھے، خوشیوں کے

آسٹریا کے آرک ڈیوک میکسی میلین کی بیوی
میری ڈی باور گینے
(۱۴۵۰ ۔ ۱۴۹۲) جو ایک شکار کے دوران
گھوڑے پر سے گر پڑی تھیں۔ ۲۵ برس
کی عمر میں ہی ناسور سے مریں۔ کیونکہ وہ
اتنی شرمیلی تھیں کہ کسی معالج کو اپنے زخموں
کو علاج کرنے کی اجازت نہیں دے سکیں۔

پھول کھلکھلاتے تھے اور زندگی اپنی تمام رنگینیوں
کے ساتھ جلوہ فگن تھی۔ میری آشنا میں بھی وہیں
گزرتی تھیں۔ میری چائے اب جا سادہ چائے نہیں
ہوتی تھی۔ اکثر اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ لوازم بھی
ہوتے تھے۔ محلے والے اب بھی روشن سے ناراض
تھے مگر میں، میری ماں اور اس کی ساس ایک
ڈھال کی طرح ہمہ تن اُس کی حفاظت پر مامور ہو گئے
تھے جس کی وجہ سے کسی کو اس سے کچھ کہنے کی جرأت
نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ایک دن ——

میں کالی دن دورے پر باہر رہا۔ پھر دمیاں سے

بی ایلور تھومی کی شرمیتی کلارا کارٹر

برسوں تک ۶ دن ہر ہفتہ ۵ بجے صبح ۵۔ افراد والے خاندان کا کھانا بنائیں۔ ایک ڈاک گھوڑا گاڑی کو ۴ میل لمبے راستے پر ہانکیں۔ موسم میں ۱۰ کوارٹ نیلی بیریاں ہر روز توڑ کر لائیں، ہوشیاری سے پکایا ہوا رات کا کھانا پروسیں اور پھر برتن وغیرہ صاف کریں۔

چار مہینے کی چھٹی پر گاؤں چلا گیا۔ اس بیچ روشن بھی کئی مرتبہ اپنے ماں باپ کے پاس پانی پت گیا تھا۔ شاید وہ بہو کے لئے ان کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھٹی سے آنے کے بعد اپنی ذاتی اور دفتری مصروفیات کے باعث میں کئی مہینے تک روشن کے گھر نہ جا سکا اور پھر ایک دن وہ خوب صورت لڑکی مجھے اُس کے گھر لے گئی۔ ہاں وہ روشن ہی کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ میں سیدھی ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا — روشن گھر پر ہی موجود تھا۔ اس کے چہرے پر اُداسیوں کا لیپ تھا۔ میں نے بے تکلف دوستانہ انداز میں پوچھا۔

"روتے کیوں ہو؟"

اُس نے کوشش کر کے مسکراتے ہوئے میری طرف مظلوم نظروں سے دیکھا۔ اندر سے چوں چوں جیسے دو چڑیوں کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر وہ آوازیں نزدیک ہوتی ہوئی نسوانی بنتی گئیں۔ کوئی کوئی لفظ میرے پلے پڑا۔

"شادی ..... میں بھی ..... پھر کیا ہے ..... میرا گھر ..."

میں نے روشن سے پوچھا۔

"کیوں کوئی آیا ہوا ہے؟"

"ہوں — ہاں نہیں" وہ ہکلایا۔ کچھ دیر بعد وہی لڑکی پیالہ ہاتھوں میں لئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی۔ مجھے دیکھ کر پیالہ بُری طرح اُس کے ہاتھوں میں کانپا، مگر وہ سنبھلی۔ پیالہ روشن کے آگے میز پر رکھ کر وہ واپس اندر بھاگ گئی۔ شاید اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ انجان بنتے ہوئے میری آنکھوں نے پوچھا

"کون؟"

"پنجاب سے آئی ہے" روشن بولا۔

"کون ہے؟" اب میری زبان نے سوال کیا۔

"تمہاری بھابھی"

"بھابھی" جیسے زن سے کوئی چیز میرے سر سے ٹکرائی۔ اور مجھے ایسے لگا جیسے مجھے چکر کھلانے والے جھولے میں بٹھا کر کسی نے اُسے زور سے گھما دیا ہے۔ مجھے آس پاس کی ہر چیز گھومتی محسوس ہوئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو کچھ دیر پہلے اندر بولی ہوئی وہی نسوانی آوازیں زوں زوں کر کے پھر میرے کانوں میں بجنے لگیں۔

"شادی ..... میں بھی ..... پھر کیا ... میرا گھر ....."

"روشن! یہ تُو نے کیا کیا؟" میں بس یہی کچھ کہہ سکا۔

"اور کیا کرتا؟ ماموں جان بہت زور ڈال رہے تھے"

"تم نے ماں باپ کو پہلی شادی سے آگاہ نہیں کیا تھا؟" میں نے سیدھے سیدھے پوچھا۔

"نہیں، میں زمین تیار کر رہا تھا کہ ماموں جان مجبور کرنے لگے۔ میرے ماں باپ مان گئے اور میں نے ان کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا"

"مگر تم سچ بول کر جان چھڑا سکتے تھے۔ صاف کہہ دیتے کہ میں پہلے ہی شادی کر چکا ہوں"

"نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح ماموں جان کا دل ٹوٹ جاتا۔ کیوں کہ ان کی لڑکی کی عزت اور زندگی کا سوال تھا"

"تو کیا بھابھی تمہارے سگے ماموں کی لڑکی ہے؟"

"ہاں"

"مگر ہندوؤں میں تو ایسے رشتے نہیں ہوتے"

"کبھی کبھی ہو بھی جاتے ہیں"

"نہیں تم نے جان بوجھ کر ....." میں نے اپنی زبان کو روکا اور صرف اتنا کہا۔ "تم نے بہت بڑا ظلم کیا ہے، روشن۔ بہت بڑا اندھیر۔ خدا تمہیں معاف نہیں کرے گا۔" میں اس کے روکنے کے باوجود اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔

میں دو دن تک دفتر نہیں جا سکا۔ پچھلے واقعات کی گاڑی اپنے کھردرے پہیوں سے میرے ذہن کی صاف شفاف مال روڈ پر دندنانے لگی — اوشا اور رانیل مجھے بار بار یاد آنے لگے۔ اوشا، یہی لڑکی، کبھی دہلی کالج میں میری ہم جماعت رہی تھی۔ میں نے اُسے دل کی ساری دنیا سے چاہا تھا۔ خدا سے زندگی بھر کے لئے صرف ایک خواہش کی تھی، اوشا کے پیار کی۔ مگر نہیں، وہ مجھے نہیں، میرے ہی دوست انیل کو چاہتی تھی۔ وہ ریڈیو ٹیکنیشین تھا۔ بہت

وہ خواتین جو اپنی عمر کبھی نہیں چھپاتیں

جنوبی ہندوستان میں بوندو نسل کی لڑکیاں ہرماہ ایک نیا گلوبند (ار) پہن کر اپنی عمر ظاہر کرتی ہیں۔
۱۵ برس کی نوجوان لڑکی ۱۸۰ ہار پہنتی ہے اور تب تک ہر ماہ ایک نیا ہار پہنتی جاتی ہے، جب تک کہ اُس کی شادی نہ ہوجائے۔

ماشاعر بھی تھا۔ میں نے جب اُسے اُوشا سے
تے جُلتے دیکھا تو اپنے سینے پہ پتھر کی سل رکھ کر اُس کا
بال ہی ترک کر دیا۔ اُوشا کا خیال چھوڑتے ہوئے
ے بہت بڑی ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا۔ بیمار بھی ہوگیا۔
کر دل پہ جبر کرکے میں نے قسم کھائی کہ تازندگی شادی
ں نہیں کروں گا۔ اس طرح اپنی محبت کی زندگی میں
دہی اپنے ہاتھوں آگ لگا کر میں الٰہ آباد آگیا۔
ہاں آہستہ آہستہ میں حالات کے سانچے میں ڈھلتا
یا۔ روشن کی دوستی نے میرے دل سے اُداسیوں کی
ٹائیں چھانٹنی شروع کردیں۔ میں اس کے بہت قریب
ا گیا۔ اتنا کہ لوگوں کے یہ کہنے کے باوجود کہ روشن
ل جلن کا کچا ہے۔ میں اپنی ضد پر اڑا رہا، بلکہ اُلٹا
ن سے لڑنے مرنے کو تیار ہوجاتا۔ میری نظر میں وہ
ب فرشتہ تھا، جن پر لوگ صرف 'باہر کا' ہونے
ں وجہ سے الزامات لگا رہے تھے۔ میرے دل پر
ں وقت اس کی عظمت کی چھاپ سی جم کر رہ گئی، جب
ں نے غریب دروپدی سے پیار اور پھر شادی کرلی۔
روشن کے ہاں میرا آنا جانا تقریباً بند ہوگیا۔
ہ بہت ہی خود غرض اور نیچ انسان ثابت ہوا۔ اتنا
چ کہ جان بوجھ کر اُس نے اپنے سگے ماموں کی لڑکی سے
نادی کی تاکہ رشتہ داری کے دباؤ سے وہ اوشا
ر اس کے باپ یعنی اپنے ماموں جان کو اپنے پہلے گناہ
ے ظاہر ہوجانے پر کچھ کہنے یا کرنے کا موقع ہی نہ دے۔
یونکہ وہ اگر کہیں باہر شادی کرتا تو دو شادیاں کرنے
پر سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے نوکری سے برخاست
ہوسکتا تھا۔ اپنے سگے ماموں سے اُسے ایسی کسی
شکایت کا بہت کم اندیشہ ہوسکتا تھا۔ مگر پھر بھی
انسان کو کمینہ اور گرا ہوا نہیں ہونا چاہئے کہ معمولی
سے عیش یا آرام کی خاطر بیک وقت کئی کئی بے گناہ
انسانوں کی زندگیوں سے کھیلے۔ اگر اُسے اوشا سے
ہی عشق تھا تو پھر اسے اس غریب دروپدی، اُس

کی ماں، اُس کی ڈیڑھ سالہ بچی، اُس کے ہونے والے
بچے، اوشا اور اس کے باپ کی زندگی سے کھیلنے کا
کیا حق تھا؟

میرا دل کئی دن تک بے چین رہا۔ ایک سانپ
سا کُنڈلی مارے ہر وقت ذہن پر سوار رہتا۔ اوشا
کی مظلومیت دل آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتا۔ دل چاہتا کہ
کسی طرح اُس مظلوم کو راون کے چنگل سے آزاد کرا دوں۔
جانے وہ غریب کب تک اس دوزخ میں زندہ رہ سکے۔
شاید روشن کو میرے دل کے جوار بھاٹے کا علم ہوگیا
تھا۔ دوست وہ اچھا جو پاس رہتا ہو اور دشمن وہ بُرا
جو پاس رہتا ہو۔ میں کل تک اُس کا اچھا دوست تھا۔
تو اب بُرا دشمن بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ بُرے انسانوں
کو بُرائی نبھانے کے لئے بُرے ہی راستے سوجھتے ہیں۔
اُس نے مجھ سے ایک نئی دوستی کا آغاز کیا۔ وہ گِر چکا
تھا۔ اُس نے مجھے بھی گرا ہوا سمجھ لیا۔ ایک دن
دفتر میں مجھ سے بولا: "میں دَورے پر جا رہا ہوں۔ تم
اوشا کو سنگم اشنان کرا لانا۔"

"کیا اوشا کو سنگم کل ہی لے جانا ضروری
ہے؟" میں نے دل میں سوچا۔

"تم اُسے سنگم اب تک کیوں نہیں لے گئے؟
یا واپس آکر کیوں نہیں لے جا سکتے؟ آخر کل کوئی تہوار
بھی تو نہیں؟"

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اُس نے مزید کہا۔

"شام کو اُسے شاپنگ بھی ضرور کرا دینا۔
اسے کچھ کپڑے خریدنے ہیں۔"

"کپڑے تو عورتیں اپنے خاوند کے ساتھ ان
کی پسند سے ہی خریدنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔" میرے دل
نے سوچا، مگر زبان سے بس اتنا کہا۔

"تم خود بھی تو ....."

"اور بعد میں نائٹ شو دکھانا نہ بھولنا۔
وہ فلم دیکھنے کی بہت خواہش مند ہے۔"

میرا دل چاہا کہ اس کے ایک زناٹے دار طمانچہ
رسید کروں اور کہوں "اُلّو کے پٹھے! تو نے مجھے بھی اپنی
ہی طرح نیچ اور کمینہ سمجھا ہے؟ رشوت سے میرا منہ
بند کرنا چاہتا ہے۔ یاد رکھ میں تجھ سے اس توہین کا
بدلہ ضرور لوں گا۔"

میں کم زور انسان ہوں۔ ایک بے ضرر ادیب
میرا کام تخلیق ہے، تخریب نہیں۔ میں کسی کا گھر بسا تو
سکتا ہوں، اُجاڑ نہیں سکتا۔ مگر دروپدی اور اوشا
کی مظلومیت بھی نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ انہیں
اس گورکھ دھندے سے رہا کرنے کے ہزاروں طریقے
سوجھتے، مگر ادیب ذہن انہیں رد کردیتا۔

خدا بڑا کارساز ہے۔ وہ سب کی مشکلیں
آسان کرتا ہے۔ اُس نے میری بھی راہیں ہموار کردیں۔
دوسرے دن میں نے روشن کی ہدایت کے مطابق اوشا
کو گھمایا پھرایا تو نہیں، مگر اُس کے دماغ میں بھیسر

منزور شوال دیا کہ وہ کسی طرح اس کسائی کی چھری تلے سے نکل بھاگے۔

کچھ دن بعد میری ڈیوٹی روشن کے ساتھ ایک ہی علاقے میں لگی۔ جیپ پر ہم کو سبا ہیڑی جاتا تھا۔ صبح کو جیپ پر جب میں اور ڈرائیور روشن کے گھر کے پاس پہنچے تو دور ہی سے ہم نے اس کے دروازے پر ایک بہت بڑا ہجوم دیکھا۔ قریب جانے پر ہم نے دیکھا کہ ایک لمبا دھڑنگا چھ فٹ کا جوان ہولڈال، اٹیچی کیس، ٹرنک اور دوسرا سامان اُس کے گھر سے باہر نکال نکال کر سڑک پر ڈھیر کر رہا تھا اور اونچی آواز میں اُوشا سے کہہ رہا تھا۔

"تم مجھے راکھی کس لئے باندھتی ہو؟ میں مر گیا تھا کہ تم چپ چاپ اس شیطان کے چنگل میں پڑی رہیں"

روشن بھیگی بلی بنا، آنکھیں نیچی کئے باہر نکلتے ہوئے سامان اور گلی میں بہتی عزت کو حسرت و یاس سے تک رہا تھا۔

مالک مکان کی بیوی پڑوسن سے کہہ رہی تھی:

"ہائے میں مر گئی۔ مُوا کہتا تھا: دہلی سے میری بہن آئی ہوئی ہے۔ من میں کالک تھی نا۔ اسی لئے دونوں کو باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔"

"اور بہن آوازیں تو ان کے گھر سے ایسے آتی تھیں جیسے لام لگی ہوئی ہو" پڑوسن کہہ رہی تھی۔

"لام ہی تو لگے گی بہن"! تیسری نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا تھا۔

"جب کسی کا گھر جلتا ہے تو وہ کیا کچھ نہیں کر گزرتا"

"مگر اس بے شرم نے کیا کیا! پہلے دروپدی سے شادی کر کے پہلے سھدر پرش کا ڈھونگ رچایا مگر ابھی بے چاری کے ہاتھوں کی مہندی ہی نہیں اُتری تھی کہ اس پر سوکن لا بٹھائی" ایک اور نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اس غریب نے ابھی زندگی کا دیکھا ہی کیا تھا"۔ ایک اور نے راگنی الاپی۔

"ایسے کو تو گولی مار دینی چاہیئے"! ایک بزرگ بولا۔

نوجوانوں میں سے ایک نے شہ پا کر کہا

"دیکھتے کیا ہو ذرا کر دو ہڈیاں سیدھی"!

جوان طبقے میں طوفان آنے سے پہلے جیسی حالت پیدا ہوئی۔

جھنڈا سنگھ نے جو علاقے کا بدمعاش تھا 'بڑبڑ بڑبڑ' جیسی کوئی عجیب آواز نکالی، جس نے جوان خون میں جوش کی ایک لہر پیدا کر دی۔ شیر کی پہلی ہی گرج سے گیدڑ جھاڑیوں میں چھپا۔ روشن اپنے مکان کے قلعے میں پناہ گزین ہو گیا۔

ڈرائیور اور میں کچھ دیر جیپ روکے اوشا اور اس کے بھائی کو سامان رکشا پر لادتے دیکھتے رہے۔

اچانک اوشا اور سامان کو چھوڑ کر وہ نوجوان میرے قریب آیا اور بولا۔

"آپ روشن کے افسر ہیں نا؟ میں اس کی رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ میں اُوشا کو چھوڑ کر آپ کے دفتر آؤں گا"

ڈرائیور کہیں چغلی نہ لگا دے اس لئے میں نے انگریزی میں اُسے جواب دیا۔

"رپورٹ سے کچھ نہ ہوگا۔ آپ لڑکی کی آئندہ زندگی کے لئے کچھ کیجئے"

"آپ نے بہت اچھا کیا کہ لڑکی کو قبر پر خانے سے نکال لیا"

وہ واپس رکشا کی طرف مڑ گیا۔ میرے اشارے پر ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ خود میرے اندر بھی ایک جوالا مکھی پھوٹ پڑا — اُف خدایا! سات انسانوں کے قاتل کی تیرے پاس کیا سزا ہے؟ تیرے انصاف کا مندر آج سنسان کیوں ہے؟ اچانک انیل ایک روشنی کی کرن کی طرح میرے ذہن کے پردوں پہ نمودار ہوا۔ دفتر پہنچتے ہی تمام حالات سے اُسے آگاہ کرنے کے لئے کاغذ اور قلم اٹھایا ہی تھا کہ چپڑاسی اندر آیا۔

"صاحب، آپ کا خط"

خط دیکھ کر میں تمام جان سے کانپ گیا۔ اس کا ایک کونا پھٹا ہوا تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے خط کھولا۔

اُف! انیل اب اس دنیا میں نہیں تھا۔

"روشن تمہارے مقتولین میں ایک اور کا اضافہ ہوا" میں نے دکھی دل سے سوچا اور اسی کاغذ پر لمبی چھٹی کے بعد تبدیلی کی درخواست دے دی۔

■■

فارم نمبر ۴

رجسٹریشن آف نیوز پیپرز رولز ۱۹۵۶

۱۔ مقامِ اشاعت: دفاتر شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۲۔ وقفہ اشاعت: ماہانہ ۳، ۴۔ طابع و ناشر ایم یونس دہلوی۔ قومیت: ہندوستانی

۵۔ مدیرہ: سعدیہ دہلوی قومیت: ہندوستانی

۶۔ ملکیت: شمع میگزینز۔ یونس دہلوی، ادریس دہلوی، الیاس دہلوی۔ دفاتر شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں یونس دہلوی اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات جہاں تک میرے علم و یقین کا تعلق ہے، حق و سچائی پر مبنی ہیں۔

نئی دہلی۔ یکم مارچ ۱۹۸۵   محمد یونس دہلوی ناشر

اپنی پریشانی بچّوں میں نہ بانٹئے

احمد کریم

بچوں کے لئے ماں باپ ایک نعمت ہیں۔ وہ ان کے دکھ سکھ کا خیال کرتے ہیں، انہیں تعلیم دلاتے ہیں، ان کی تربیت کرتے ہیں لیکن ان تمام عنایتوں کے ساتھ ایک قباحت بھی ہے وہ انجانے میں اپنی ذہنی پریشانی بھی بچوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ بچپن کا زمانہ عجیب ہوتا ہے۔ اس میں بچے ماں باپ سے زیادہ سیکھتے ہیں اور اسکول سے کم۔ بچپن میں جو عکس بیٹھ جائے وہ آئندہ مشکل ہی سے ختم ہوتا ہے۔ ماں باپ پر اس بارے میں بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

انسان کے دل میں غصہ، نفرت اور حسد کے جذبات ابھرتے ہیں تو وہ برملا ان کا اظہار کر دیتا ہے۔ بچوں کے لئے یہ جذبات نئے ہوتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کی رائے ہے کہ بچے کا غصہ سے تعارف ایک بچے سے ہی ہونا چاہئے۔ اپنے ہم عمر اور ہم قد بچے سے وہ اتنا خوف زدہ نہیں ہوتا جتنا بڑے سے۔ جب یہ تعارف ایک طویل القامت آدمی کے ذریعہ ہو تو بچہ ضرورت سے زیادہ ڈر جاتا ہے خواہ وہ لمبا آدمی اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ ماں باپ کو چاہئے کہ اپنا غصہ اتارنے کے لئے اپنے ہم قد انسان کا انتخاب کریں۔ بچوں کا

بیلے لیونارڈ، نامی جیکسن نے (I...)
میں ایلی نائز نیمیل کالج کی ایک ٹرینڈ ٹیچر اتنی مذہبی تھی
کہ وہ اپنے کسی خط کو تب تک ڈاک میں
نہیں ڈالتی تھی جب تک اسے یہ پورا بھروسا
نہیں ہوتا کہ اس کا وہ خط اتوار کے دن
راستے میں نہیں ہوگا۔

تخاب بے جا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ باپ کو دفتر
بی ڈانٹ پڑی یا اس کے دوسرے ساتھی
کو ترقی مل گئی اور وہ اس سے محروم رہ گیا۔ وہ
غصے میں جلا بھنا اپنے گھر پہنچا۔ گھر پہنچتے ہی اس
کا سامنا بیوی بچوں سے ہوا۔ بچہ اس کی ٹانگ
سے لپٹ گیا اور اس سے اُلٹی سیدھی فرمائش
کرنے لگا "میرے لئے کھلونے نہیں لائے؟
مٹھائی نہیں لائے؟ اسکول کی کاپی یا پنسل نہیں
لائے؟" باپ جو عام طور پر ان سوالوں کا جواب
نرمی سے دیتا تھا اب یک دم بدل گیا۔ اس نے
بچے کو سختی سے ڈانٹ دیا۔ بچہ سہم کر چپ ہو گیا۔
دفتر کی بلا طویلے کے سر ہوتی ہے۔ باپ اپنا غصہ
کہاں نکالے؟ بچے کی مصیبت یہ ہے کہ باپ
اس پر چلا سکتا ہے، لیکن بچہ اتنی ہی تیز آواز سے

جواب نہیں دے سکتا۔ وہ باپ کی ناانصافی
اور غصے کو پی جاتا ہے۔ اس وقت بچہ ماں کی شفقت
کا سہارا لیتا ہے۔ ماں اس کو دلاسا دیتی ہے اور
بچہ اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

باپ کی نسبت ماں بچے سے زیادہ قریب
ہوتی ہے۔ بچہ ماں کے سہارے باپ کی گھڑکیاں
سہ لیتا ہے لیکن بعض اوقات ماں بھی پریشانی
اور غصے کا شکار ہو جاتی ہے۔ ساس نندوں سے
جھگڑا ہوا یا نوکر کی بدتمیزی پر غصہ آیا تو وہ بھی اسے
بچے پر نکالتی ہے۔ بچہ حیران ہو جاتا ہے کہ اس کی
شفیق ماں کو یکایک کیا ہو گیا۔ وہ اصل راز نہیں
جانتا۔ اگر اسے یہ راز معلوم ہو جائے تو بھی اس
کی سادہ طبیعت اس کی باریکیاں نہیں سمجھ سکتی۔
بعض اوقات ایک ماں اپنے ازدواجی تعلقات
کی ناآسودگی کا غصہ بھی بچہ پر نکالتی ہے۔ بچہ
ان باتوں کو کیا سمجھے؟ وہ حیران اور پریشان ہو جاتا ہے
کہ ان صورتوں میں وہ کیا کرے۔ اس کو اس سوال
کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ نتیجے میں وہ خود ہی ذہنی تناؤ
کا شکار ہو جاتا ہے۔

آج کا دور تیز رفتاری کا دور ہے۔
انسان دھیرے دھیرے مشینی زندگی کا عادی
ہوتا جا رہا ہے۔ دیہات کی نسبت شہروں میں تیز رفتاری
زیادہ ہے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے نہ باپ کے
پاس وقت ہے اور نہ ماں کے پاس۔ اس لئے بچہ
تنہائی کے احساس کا شکار ہو جاتا ہے۔
ماں باپ اس کے ہوم ورک میں اس کا ہاتھ نہیں
بٹاتے۔ باپ تھکا ہارا کام سے واپس آیا ہے۔
اس کے پاس وقت نہیں۔ ماں کو گھر کے کام کاج
سے فرصت نہیں۔ وہ بچے سے یہی اُمید رکھتے ہیں کہ
وہ اپنا سارا کام خود ہی نمٹائے۔ ان کا خیال ہوتا ہے

کہ اس طرح بچے میں خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ وہ یہ
بھول جاتے ہیں کہ اس سلوک سے بچے میں
خود اعتمادی کی بجائے عدم اعتمادی پیدا ہوتی
ہے۔ اگر ماں بچے کا ہوم ورک نہیں سمجھتی تو اس کے
پاس بیٹھ جانے سے ہی بچے میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔
آج کل ماں باپ کی کوشش ہوتی ہے کہ
ان کا بچہ جلد بڑا ہو جائے، اپنا کام خود کرنا سیکھے۔
زندگی میں اپنا مقام خود بنائے۔ بچے سے یہ
اُمید رکھنا غلط نہیں، غلطی جلد بازی میں ہے۔
قدرت کی رفتار سست ہے۔ آم کے درخت
میں پھل سات آٹھ سال بعد آتا ہے۔ اس میں
جلد بازی سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ بچے کی
پیدائش میں نو ماہ کی مدت درکار ہے۔ اس میں
بھی جلد بازی ممکن نہیں۔ اسی طرح ایک بچے کو
بالغ ہونے میں کافی عرصہ لگتا ہے۔ اس سے
جلد بڑا ہونے کی اُمید رکھنا فضول ہے۔
اکثر والدین اپنے بچوں کے سامنے
دوسرے بچوں کا حوالہ دیتے ہیں: دیکھو تمہارا
فلاں دوست اسکول میں کتنے اچھے نمبر لایا۔ وہ
کتنا محنتی ہے۔ ایک تم ہو کہ سالانہ امتحان
میں فیل ہو گئے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بچہ
اسکول کے امتحان میں فیل ہوا ہے، زندگی کے
امتحان میں نہیں۔ تاریخ ایسے مشاہیر کے قصوں
سے بھری ہوئی ہے جو اسکول کے امتحان میں فیل
ہو جاتے تھے، لیکن بعد میں ان کی صلاحیتیں اُبھریں
اور انہوں نے تاریخ میں اپنا مقام بنایا۔ سالانہ
امتحان میں پاس ہونے کی بے جا اہمیت اور
اس کے نتیجے میں ایک قصہ قابلِ ذکر ہے۔
نئی دلی کے ایک مشہور آدمی کا بچہ ایک انگریزی
اسکول میں پڑھتا تھا۔ باپ ایک ذہین اور
محنتی افسر تھا۔ وہ بچے سے یہی اُمید رکھتا تھا

کہ وہ ہر امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرے گا۔ بچہ باپ کی طرح ذہین اور محنتی نہیں تھا لیکن وہ امتحان میں کامیاب ہونے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا۔ جب سینیئر کیمبرج کے امتحان کا وقت آیا تو باپ کو بیٹے سے۔۔ اُمید تھی کہ وہ اس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرے گا۔ بدقسمتی سے نمایاں کامیابی حاصل کرنا تو درکنار لڑکا سرے سے کامیاب ہی نہیں ہوا۔ جب اس لڑکے کو اپنے فیل ہونے کی خبر ملی تو اس پر بجلی سی گری۔ اب وہ اپنے ماں باپ کو کیا منہ دکھائے؟ اس پر ان کے ردِ عمل کا اتنا خوف طاری ہوا کہ اس نے موت کو زندگی پر ترجیح دی۔ وہ ایک ٹرین کے آگے لیٹ گیا۔ ماں باپ کو جب اس کی موت کی خبر ملی تو انہوں نے سر پیٹ لیا۔ لیکن اب پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا۔ اس قربانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فائنل میں امتحان دینے والے بچوں کے ماں باپ سہم گئے۔ انہوں نے بچوں کو ڈھارس دی۔ فیل ہونے والوں کے ماں باپ نے بھی انہیں تسلی دی کہ بیٹا کوئی بات نہیں۔ اگلے سال پھر کوشش کرنا۔ اس بچے کی موت نے دوسرے بچوں کی زندگی آسان بنا دی۔

افسردگی اور پریشانی ایک چھوت کی بیماری ہے

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔ جس طرح تپ دق کے جراثیم بیمار کے سانس سے اس کے ساتھ رہنے والے کے جسم میں منتقل ہوتے ہیں اسی طرح افسردگی اور ذہنی تناؤ کی فضا بھی ساتھ رہنے والے کے دل میں بسیرا کر لیتی ہے۔ ماں باپ میں عدم تحفظ کا احساس ہے وہ روپیہ کی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ باپ کنجوس ہے۔ پیسہ ہوتے ہوئے بھی گھر میں تنگی ترشی رہتی ہے۔ ایسی صورت میں لازما اس کا اثر بچے کے ذہن پر پڑے گا۔ ماں خاوند کی بدسلوکی سے پریشان رہتی ہے۔ اس میں تمام کی کمی ہے۔ وہ جن عورت سے ڈرتی ہے یہ ساری عادتیں بھی غیر شعوری طور پر بچے میں بھی منتقل ہو جاتی ہیں۔

والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچے کے لئے وقت نکالیں۔ پرانے زمانے میں بچے رات کو نانی اماں سے کہانی سنتے تھے اور کہانی سنتے سنتے سو جاتے تھے۔ اب ماں باپ کے پاس کہانی سنانے کا وقت نہیں۔ غالباً انہیں خود کہانیاں یاد نہیں۔ اگر آپ مصروف ہیں تو بچے کو آرام سے سمجھا دیں۔ اسے یہ احساس نہ ہونے دیں کہ آپ کو اس کی پروا نہیں ہے۔ ایک دفعہ بچے کو آپ کی محبت کا یقین ہو جائے تو وہ آپ کے کام میں رخنہ نہیں ڈالے گا۔

اگر آپ کام کاج سے تھک گئی ہیں یا آپ کی کسی سے ان بن ہو گئی ہے اور آپ کا مزاج خراب ہے تو بچے پر غصہ نکالنے کی بجائے ساری بات سمجھا دیں۔ اسے اس بات کا یقین دلائیں کہ وہ اس بدمزاجی اور افسردگی کا ذمہ دار نہیں ہے۔

باپ جب کام سے لوٹے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ دن بھر کی داستان گھر پر سنائے۔ کاروباری اور دفتری زندگی بور ہوتی ہے۔ گھر کے لوگوں اور خصوصاً بچوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ بہتر یہ ہے کہ گھر اور باہر کے کام کو جدا جدا رکھا جائے۔ مکان دار جب دکان میں تالا لگائے تو ضروری ہے کہ ذہن میں بھی قفل لگا لے۔ یہ قفل دوسرے دن صبح ہی کھلنا چاہئے۔ گھر کی دنیا ایک الگ دنیا ہے۔ باہر کی دنیا

فرانس میں لیوٹرڈی اور جنے کی خواتین

بیٹے کے سر پر اوڑھنے والے دوپٹے کے اوپر ایک نیت باندھ لیتی ہیں۔ اپنے گاؤں کی ان خواتین کے ۱۰۰۱ء میں جنہوں نے ۱۲۰۰ برس قبل عربی فوجیوں کے ایک جتھے کو صرف پتھروں سے مار ڈالا تھا اور پھر ان حملہ آوروں کی پیٹیاں کو سر پر پہنا تھا

سے اسے ملوث نہ کریں۔

بچے کی امتحان کی رپورٹ دیکھتے رہیں اس میں دلچسپی کا اظہار کریں۔ اس کی کامیابی پر اسے شاباشی دیں۔ ناکامی پر ڈھارس بندھائیں۔ بچوں کے لئے کھیل بھی ضروری ہے۔ اس سے کھیل کی اسپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسے اپنے ہم عمروں سے ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے۔ اس سے آئندہ کی سوشل لائف پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ بچوں کو کھیلنے سے مت روکیں۔ انہیں ہر وقت گھر میں بند نہ رکھیں۔ کھیل بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا اسکول کا کام۔

آخر میں یہ بات کا خیال رکھیں کہ بچے بچے ہی ہوتے ہیں۔ وہ اسکول کے کام سے زیادہ کھیل میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کھلاڑی آئندہ زندگی میں بہتر انسان ثابت ہوتے ہیں۔

عائشہ المامس کا پہلا خط پاکر

ہرنیٹی کے نام

ٹے ہوئے الفاظ لکھے ہیں تو نے
شیدہ ہے مضمون گہرا بار ترا!
بے ربط سی تحریر کا ہے جزوِ حسیں
بتا کے لئے جذبۂ ایثار ترا!

عمر میں یہ شوقِ حصولِ تعلیم
ستقبلِ زریں کا پتہ دیتا ہے
چھی سی لکیروں میں ہے رقصِ تخیل
کاوشِ رنگیں کا پتہ دیتا ہے

راہ پہ چلنا ہے بہت دُور تجھے
یسی کہ جہاں سایۂ اشجار نہیں
منزلِ مقصود ہے فردوسِ حسیں
ہے جس کے کسی فرد کو انکار نہیں

سان کو اخلاص عطا کرتا ہے
سان کو محبت کی نظر دیتا ہے
کے سامنے جلتا نہیں سورج کا چراغ
ظلمتِ شب کو بھی سحر دیتا ہے

یہی سمجھا ہے کہ دولت ہیں زر و سیم و گہر
جن سے آسائش و آرام بہت ملتا ہے
علم تو فقر ہے، افلاس ہے، ناداری ہے
علم سے چاک گریباں بھی کہیں سِلتا ہے

خیر یہ سچ ہے مگر فقر بڑی چیز بھی ہے
علم کے شہرؐ نے اِک روز یہی مانگا تھا
اور ٹھکرا کے ہر اِک عیش کو پتھر کی طرح
اپنے اللہ سے یہ دُرِ خفی مانگا تھا

جسم کی پیاس بجھاتی ہے متاعِ دنیا
روح کو علم ہی سیراب مگر کرتا ہے
ماہ و انجم بھی بہت پست نظر آتے ہیں
علم جب راہ ترقی پہ سفر کرتا ہے

وقت کی آندھی اِسے لاکھ بجھانا چاہے
علم کی شمع شب و روز جلائے رکھنا
نورِ تقدیس بھی ہاں علم کے ہمراہ رہے
روح کے طاق میں یہ شمع بھی سجائے رکھنا

ڈاکٹر معظّم علی خاں

یہ دھرتی

نظیرؔ و اکبرؔ و اقبالؔ کی جنت ہے یہ دھرتی
اجنتا اور الورا، تاج کے فن کاروں کی بستی

یہیں پر نانک و چشتی یہیں خسرو ہوئے پیدا
یہی تلسی کی رامائن یہی غالبؔ کی محبوب

یہی ہے رامؔ کی دھرتی یہی ہے کرشن کی نگری
یہی گوتم کا مسکن ہے یہی عظمت ہے پورس کی

اسی دھرتی میں سیتا ہے اسی میں دروپدی کھوئی
یہ دھرتی آن ہے چتوڑ کی، جھانسی کے ویروں کی

رشی منیوں کی یہ دھرتی یہ ویروں کی نشانی ہے
محبت اور وفاؤں کی یہاں اِس میں کہانی ہے

یہاں گنگا یہاں جمنا یہاں پربت ہمالہ ہے
یہاں کشمیر کی وادی یہاں پر سورگ بستا ہے

اُمنڈتے ساگروں کا شور اور گاتی ہوئی ندیاں
مہکتے گلشنوں میں پھول اور ہنستی ہوئی کلیاں

یہاں رنگیں صبحیں ہیں یہاں رنگین شامیں ہیں
یہاں چاندی کے چتون ہیں یہاں سونے کی آنکھیں ہیں

کنہیا بن کے ہم جب امن کی مُرلی بجاتے ہیں
تو اُس کی تان پر بچھڑے ہوئے دل گیت گاتے ہیں

ہمیں اِس دیش کی مٹی کو ماتھے پر سجانا ہے
یہیں جینا یہیں مرنا یہیں پھر جنم لینا ہے

چلو ہم ایک ہو کر پھر خوشی کے پھول بکھرائیں
ترنگا کا پھریا آسماں کی چھت پہ لہرا دیں

شرافت علی شرافت

گناہ کی تلاش

ایس۔ ایس۔ چاولہ

گھبرائے ہوئے سے سنہا صاحب اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے اندر آنے کی اجازت بھی طلب نہیں کی۔ لکشمی اور سندھیا اس وقت چائے پی رہی تھیں۔ سنہا نے آتے ہی کہا۔ "بیٹی، تم نے مجھے برباد کر دیا۔ میری ایسی مٹی پلید کر دی ہے کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں، اُن کی شادی کی راہ میں تم نے اتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اب ان کے لئے اچھے رشتے ملنے تقریباً ناممکن ہو جائیں گے۔ سماج کی انگلیاں مجھ پر اٹھیں گی، میں اتنا بڑا آدمی، اتنا نام، اتنی جائیداد، اور تم نے کچھ بھی نہ سوچا اور مجھے بدنام کر دیا۔ گھر گھر میں میرا چرچا ہوگا — لوگ مجھ پر تھو تھو کریں گے، اگر کوئی اور ہوتا تو میں اُسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا۔"

لکشمی نے کچھ کہنا چاہا، مگر سندھیا نے روک دیا۔ وہ بولی "سنہا صاحب، مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ مگر کیا آپ اس بات سے انکار کر سکیں گے کہ جس بات کو آپ بدنامی کہتے ہیں،

وہ ایک حقیقت ہے؟"

سنہا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

سنجے سنہا کے پتا جی بہار کے بڑے زمیں داروں میں سے تھے۔ اُن کی ایک شکر کی مِل تھی۔ دو کوئلے کی کانیں۔ اس کے علاوہ وہ کئی فرموں کے ڈائریکٹر تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے اور تین بیٹیاں۔ بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بڑا بیٹا اپنے بزنس میں والد کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ چھوٹا سنجے کالج میں پڑھ رہا تھا۔ پٹنہ کی نئی آبادی میں ان کی ایک کوٹھی تھی۔ وہیں پر سنجے اپنے ایک نوکر کے ساتھ رہ رہا تھا۔ سنجے کے دماغ میں بچپن میں یہ بیٹھ چکا تھا کہ وہ امیر ہے اور ہر غریب انسان اس کی ہر خوشی، ہر ضد پوری کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اسی لئے اُس نے جو چاہا پا لیا، نرمی سے، گرمی سے، سختی سے اور کہیں مار پٹائی سے بھی، کالج میں وہ دادا گیری کرتا تھا۔ پیسے والا تھا اس لئے اس کے گرد خوشامدیوں، مفت خوروں اور چمچوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی، لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا، ان کو تنگ کرنا، موقع مِل جانے پر حُسن کو لُوٹ لینا بھی اس کے مشاغل میں شامل تھے۔

ایک دن زور کی بارش ہو رہی تھی۔ سنجے کار میں گنگناتا اپنے دھیان میں مست چلا جا رہا تھا کہ بس اسٹاپ کے پاس ایک ننھا سا ہاتھ آگے بڑھا، جو زور زور سے ہل رہا تھا۔ اُس نے کار روکی، ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی نے تقریباً بھیگتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ مجھے میرے اسکول تک چھوڑ دیں گے؟ میرے فائنل امتحان ہیں۔"

سنجے نے لڑکی کا جائزہ لیا۔ گندمی رنگ، میانہ قد، بڑی بڑی آنکھیں، لمبے گھنے کمر تک پھیلے بال۔ وہ جنوبی ہند کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی۔ سنجے نے کار کا دروازہ کھولا اور لڑکی خاموشی سے کار میں بیٹھ گئی۔

سنجے نے لڑکی کا نام پوچھا۔ لڑکی نے کہا "لکشمی۔"

"کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟"

"اسکول کا فائنل ایئر ہے۔"

سنجے نے لڑکی کو اُس کے اسکول کے سامنے اُتار دیا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور چلی گئی۔ اس کے بعد سنجے نے لکشمی کو تقریباً بھلا ہی دیا۔ شکل، صورت جسم، اُس کی کسی بات میں ایسی کشش نہ تھی کہ سنجے اس کی طرف کھنچا چلا جاتا۔

> اسے ایک ایسا سبق سکھایا جائے جسے یہ ساری عمر نہ بھول سکے ۔ سنجے سنہا سے ٹکراؤ کا مطلب ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا جائے

اگلے سال لکشمی اس کے کالج میں تھی اور اس کی آمد نے کالج میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ پڑھنے میں وہ سب سے آگے تھی۔ بحث و مباحثے میں اُس کی ٹکر کا کوئی نہ تھا۔ کھیل کود کے سوا کالج کی ساری سرگرمیوں میں لکشمی سب سے آگے تھی، مگر ویسے وہ ہمیشہ خاموش رہتی تھی اور نظریں جھکائے چلتی تھی لکشمی کے پتا جی سرکاری ملازم تھے اور مدراس سے آئے ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ پٹنہ میں رہتے ہوئے انہیں تین سال ہو گئے تھے۔

سنجے کو شاید معلوم نہیں تھا کہ چلتی زبان کی ایک زبان ہوتی ہے، مگر خاموشی کی سو زبانیں ہوتی ہیں۔ سنجے کو ہر وقت بولنے والی لڑکیوں کے مقابلے میں یہ خاموش لڑکی زیادہ پسند آئی۔ دونوں ایک ہی کالونی میں رہتے تھے۔ سنجے نے آتے جاتے لکشمی کو لفٹ دینی شروع کر دی۔ اُس نے یہ بات نوٹ کی کہ وہ کوئی سوال خود نہیں کرتی تھی، بلکہ صرف اُس کی بات کا جواب دیتی تھی یا اس کے ایک سوال پر اپنا ایک سوال پوچھ لیتی۔ جب کبھی سنجے رومانٹک موڈ میں آ کر بات کرتا تو فوراً ہوا دیتی۔ "ایسا کھلا پیار ہمارے سماج کا حصہ نہیں ہے۔" سنجے کہتا۔ "زندگی کے یہ دن جوانی کے دِن کہلاتے ہیں۔ ان دنوں میں جو عیش کر لئے جائیں وہ جائز بھی ہیں اور صحیح بھی۔" لکشمی کا جواب (سوال) ہوتا۔ کیا آپ کی تینوں بہنوں نے بھی ایسے عیش کئے تھے؟" یہ سُن کر سنجے کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ یہ لڑکی آخر اپنے کو سمجھتی کیا ہے؟ پڑھائی لکھائی میں تیز ہے تو کیا ہوا؟ اس کو اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ اتنی کھلی، ایسی گندی بات میری بہنوں کے متعلق کہہ سکے؟ اس لڑکی کا ایک ہی علاج ہے۔ اسے ایک ایسا سبق سکھایا جائے جسے یہ ساری عمر نہ بھول سکے۔ سنجے سنہا سے ٹکراؤ کا مطلب ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا جائے۔ یہ صرف سسک کر جئے۔ یہ کلی پھول بن رہی ہے۔ پھول بننے سے پہلے ہی اسے کچل دیا جائے۔

سنجے نے ایک منصوبہ بنایا۔ اپنے جنم دن پر اس نے کچھ ہی دوستوں اور کالج کی لڑکیوں کو مدعو کیا۔ اِس پارٹی میں لکشمی کو بھی بلایا گیا۔ پارٹی کے شور شرابے میں دیپتی جو سنجے کی رازدار تھی لکشمی کو باہر لے آئی۔ باتیں کرتی ہوئی وہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ منصوبے کے مطابق دیپتی تو باہر نکل گئی اور سنجے نے کمرے کے دروازے کی کنڈی لگا دی، پھر وہ لکشمی کے ساتھ دست درازی پر اتر آیا۔ لکشمی نے بہت منت سماجت کی، بھگوان

کا واسطہ دیا مگر اُس کی عصمت نہ بچ سکی، باہر کے
شور میں اندر کی چیخ و پکار دب کر رہ گئی۔ سنجے نے
من مانی کرلی اور فاتح کی طرح اُٹھ کر کنڈی کھول
دی، لکشمی کچھ نہ بول سکی، وہ بس روتی رہی۔
دو ماہ کے بعد سنجے کو معلوم ہوا کہ اس کے پتاجی
کا تبادلہ ہو گیا ہے اور سارا خاندان پٹنہ چھوڑ کر
چلا گیا ہے۔

سنجے رنگ رلیاں مناتا ہوا کالج میں پڑھتا
رہا، کبھی فیل ہوتا رہا اور کبھی پاس ہوتا رہا۔
اُس نے کلکتہ جا کر اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ تھوڑے
عرصے میں وہ ایک بڑا بیوپاری بن گیا۔ اس کے
بعد وہ ایکس پورٹ امپورٹ کے کاروبار میں
لگ گیا اور اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر دہلی کو بنا لیا۔ اُس
کی شادی ایک بہت اچھے خاندان میں ہو گئی۔ اب
اس کے چار بچے تھے۔ دو لڑکیاں، دو لڑکے، دونوں
لڑکیاں شادی کے قابل تھیں۔ ان کی شادی کی
بات چیت اچھے گھرانوں میں چل رہی تھی۔

اچانک جیسے زلزلہ آجاتا ہے اسی طرح
سنجے کے تمام دفاتر پر انکم ٹیکس والوں کا ایک ساتھ
چھاپا پڑا۔ ہر بزنس مین ٹیکس میں ہیرا پھیری تو کرتا
ہی ہے مگر سنجے تو جیسے اُستاد تھا اور جب وہ پھنس
گیا تو اس کو راہ فرار نظر نہ آئی۔ اس کو معلوم ہوا کہ
اس کے کیس کا تعلق انکم ٹیکس کمشنر کے ساتھ ہے۔
اور وہ کوئی عورت ہے۔ اس نے سوچا، کیوں نہ
اس سے براہ راست ہی مل لیا جائے، شاید کوئی
راستہ نکل آئے۔ شاید رشوت یا خوشامد یا منت سماجت
سے کام چل جائے۔

سنجے انکم ٹیکس کمشنر کے گھر کے ڈرائنگ روم
میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اندر آئیں تو سنجے حیران رہ
گیا۔ اُس کے سامنے لکشمی چلی آرہی تھی، وہ پسینے
میں نہا گیا۔ اُسے کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ وہ
زندگی میں لکشمی سے دوبارہ مل سکے گا، اور یہ تو
اس کے تصور سے بھی باہر تھا کہ لکشمی اتنے بڑے
عہدے پر فائز ہوگی۔

لکشمی نے سنجے کو ضرور پہچان لیا ہوگا مگر
اس نے یہ ظاہر نہیں کیا۔ اس نے صرف اتنا کہا
"فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟"
سنجے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
اس کے لب کھلتے اور بند ہوجاتے۔ اتنے میں لکشمی
نے آواز دی "سندھیا!"

لگ بھگ ایک خوب صورت، نازک اندام
لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے پوچھا "ممی
کیا بات ہے؟"

"میں ان تمام برسوں میں سسک سسک کر جی رہی ہوں۔ میں سوچ رہی تھی کہ نہ میری منگنی ہوئی نہ برات چڑھی نہ پھیرے ہوئے نہ شادی ہوئی مگر ماں بن گئی۔"

لکشمی نے کہا "بیٹی! ان سے ملو۔ یہ
سنجے سنہا ہیں۔ تم نے تو اپنے کیس کا سنا ہوگا
مگر یہاں آکر اور مجھے دیکھ کر نہ معلوم کیوں خاموش
ہو گئے ہیں۔ مدت ہوئی، ہم دونوں پٹنہ کے کالج
میں پڑھتے تھے، معلوم نہیں انہیں میری کون سی
ادا بھا گئی تھی کہ یہ میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ کہتے تھے
کہ زندگی کے یہ دن جوانی کے دن ہیں اور ان دنوں
میں جو عیش کرلے جائیں وہ جائز بھی ہیں اور صحیح بھی۔
میں نے ان سے پوچھ لیا تھا کہ کیا آپ کی تین بہنوں
نے بھی ایسے ہی جوانی کے عیش کئے تھے؟ یہ ٹھہرے
امیر، بارسوخ اور طاقت ور، اور پھر مرد۔ اس لئے
انہوں نے میری سچائی یا زبان درازی کا بدلہ لیا۔
انہوں نے دھوکے سے میری عصمت لوٹ لی اور
مجھے کنواری ماں بنا دیا۔ آج مجھے یہ کہنے میں جھجک
نہیں ہے کہ تم میری حقیقی بیٹی ہو اور یہ تمہارے پتا
ہیں جنہوں نے تمہیں سراپا تحفے کے طور پر مجھے بخش
دیا تھا۔ ان میں عصمت دری کرنے کی ہمت تو تھی
مگر آگے نتیجہ بھگتنے کی اور ذمہ داری اٹھانے کی قوت
نہیں تھی۔ میں ان تمام برسوں میں سسک سسک
کر جی رہی ہوں۔ میں سوچتی رہی تھی کہ نہ میری منگنی
ہوئی، نہ برات چڑھی، نہ پھیرے ہوئے، نہ شادی
ہوئی۔ مگر میں ماں بن گئی۔ کیا یہ اتنا کڑوا اور اتنا
بھیانک ہوتا ہے؟ میرے سامنے ساری زندگی
پڑی تھی۔ تمہارا مستقبل میرے سامنے تھا۔ میں نے
بدنامی سے بچنے کے لئے پٹنہ چھوڑ دیا۔ تمہارے متعلق
یہ مشہور کر دیا کہ تم میری بہن کی بیٹی ہو جو مر گئی ہے
اور جس کے شوہر نے دوسری شادی کرلی ہے۔ میں
آگے پڑھتی گئی۔ کئی بند مقابلے کا امتحان دے کر
میں کامیاب ہو گئی اور انکم ٹیکس کے محکمے میں لگ گئی۔
بچپن میں سندھیا! تم نے بار بار مجھ سے پوچھا کہ تمہاری
ماں کہاں ہے؟ تمہارا باپ کہاں ہے؟ اور میں
کہتی رہی کہ تمہاری ماں بھگوان کے پاس چلی گئی اور
تمہارا باپ دور گیا ہوا ہے۔ وہ ڈھیر سارے پیسے
تمہارے لئے کما کر لائے گا۔ یہ سب جھوٹ تھا۔ اس
حادثے کے بعد میں نے کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر
بھی نہیں دیکھا تھا۔ ٹوٹے ہوئے خوابوں اور لوٹے
ہوئے دل کے ساتھ میں اور کس کے ساتھ زندگی
کی شرکت کا سودا طے کرتی؟ اور پھر تم بھی تو تھیں۔ سندھیا
آج یہ تمہارے سامنے ہیں۔ تم اب اپنے باپ کو
اچھی طرح دیکھ لو، کیوں آج کے بعد تم پھر شاید انہیں
کبھی نہ دیکھ سکو گی۔ یہ بڑے لوگ ڈھلتے سائے ہیں"
سندھیا اٹھی، وہ اندر گئی، واپس آئی تو
اس کے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔ اس نے کیمرے ہی تو

سنجے سنہا کے کھینچ لے گا اور پھر ذرا تیکھی آواز میں
بولی ' اتنی مدت کے بعد باپ کو دیکھ کر مجھے خوشی ہونی
چاہیے'' میرے اندر غصّے کا لاوا اُبل رہا ہے۔ میں
سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا باپ سماج کا کلنک
ہو گا۔ تم گندگی کے کیڑے ہو۔ معلوم نہیں دُنیا اولاد
لوگوں حرامی کہتی ہے۔ میں تو کہوں گی تم میرے حرامی
باپ ہو میں اخباروں کے لئے آرٹیکل لکھتی ہوں'
یعنی فری لانسر ہوں، اب دو تین بعد تم اپنی کرتوتوں
کا بھانڈہ بیچ چوراہے پر پھوٹتا ہوا دیکھ لوگے۔"

سندھیا نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس نے
سنجے سنہا، لکشمی اور اپنے فوٹو شائع کر دئے اور
جو کچھ لکشمی کے ساتھ بیتا تھا بے کم و کاست بیان کر دیا۔
آخر میں اُس نے ایک سوال کیا تھا۔ کیا اس دُنیا
میں کوئی ایسی عدالت ہے جو ایسے رنج اور کمینے
گناہ گار کو اس کے ان گھناؤنے گناہوں کی سزا
دے سکے؟

سنہا صاحب روتے رہے مگر لکشمی اور سندھیا
نے ان کی طرف توجّہ نہ دی۔ سنہا صاحب رو دھو کر
ذرا صبر سے بیٹھے تو انہوں نے سندھیا سے کہا بیٹی!
تمہیں اتنی بے صبری نہیں دکھانی چاہئے تھی۔ اِس
معاملے کو اخباروں میں اُچھالنے کے علاوہ اور کئی
راستے بھی تو ہو سکتے تھے۔

سندھیا نے پھر پلٹ وار کیا۔ " آپ کے لئے
ماں کے ساتھ عیش کرنے کے کئی اور راستے ہو سکتے
تھے، آپ ان کے ساتھ شادی کر سکتے تھے، ان کو
سماج میں صحیح مقام دلا سکتے تھے۔ آپ نے کچھ بھی
نہ سوچا اور من مانی کرلی۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ جو کچھ میں
نے کیا ہے وہ اپنے باپ کی طرح سوچے سمجھے بغیر کیا
ہے کیوں کہ مجھ میں بھی آپ کا خون ہے تو کیا یہ درست
نہ ہوگا، یہ حقیقت ہے کہ نتیجہ سوچنے کی پروا نہ سنجے سنہا
کو تھی اور نہ سندھیا سنہا کو ہے!"

بات اتنی سچی اور کھری تھی کہ سنجے سنہا سے
کوئی جواب نہ بن پڑا۔ انہوں نے جلتے ہوئے سندھیا
کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ " بیٹی، دنیا کی تمام خوشیاں
تمہیں میسّر ہوں!" لکشمی کی طرف انہوں نے بھرپور
نظر ڈالی اور بوجھل قدموں سے سر جھکائے باہر چلے
گئے۔

پندرہ دن کے بعد اخباروں میں یہ خبر چھپی
تھی کہ مشہور صنعت کار اور بزنس مین سنجے سنہا
نے خودکشی کرلی، وہ کافی دن سے پریشان تھے۔
اُن کے تمام دفاتر پر انکم ٹیکس والوں کا چھاپا پڑا تھا۔
ان کے متعلق ایک فری لانسر جرنلسٹ سندھیا نے

آپ کے لئے ماں کے ساتھ عیش کرنے کے کئی اور راستے ہو سکتے تھے، آپ نے کچھ بھی نہ سوچا اور من مانی کرلی۔

یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ اُن کی ناجائز
اولاد ہے۔ وہ رات کو پریشانی کی وجہ سے سونے کی
گولیاں کھاتے رہتے تھے۔ کل شاید نیند لانے کے
تعداد سے زیادہ گولیاں کھا گئے تھے، اس لئے صبح
کو مردہ پائے گئے۔

لکشمی اور سندھیا پر اس خبر کا کوئی خاص
اثر نہ ہوا تھا۔ جب انہیں ان سے کوئی لگاؤ ہی نہ
تھا بلکہ بھرپور نفرت تھی تو پھر انہیں افسوس کیا
ہوتا؟

سنجے سنہا کے مرنے کے ایک ماہ بعد ان کا
وکیل ایک اتوار کو لکشمی اور سندھیا سے ملنے آیا'
اس نے بتایا کہ سنجے سنہا صاحب نے اپنی زندگی میں
ایک ٹرسٹ بنایا تھا۔ جس میں ایک کروڑ روپے
سے اوپر جمع تھا۔ انہوں نے اِس ٹرسٹ کا سربراہ
لکشمی کو بنایا تھا۔ اپنی بیوی اور چار بچوں کے لئے
جائیداد کا حصّہ انہوں نے الگ کر دیا تھا۔ اپنے
تمام کاروبار کا سربراہ انہوں نے سندھیا کو
بنایا تھا۔ وصیت میں انہوں لکھوایا تھا، لکشمی
اور سندھیا دونوں کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، اُس
کو سوچتے ہوئے میرا دل پھٹ اٹھتا ہے۔ میں
گناہ گار ہوں، گناہوں کی سزا خود ہی بھگتوں گا۔
گناہ کی تلافی تو ممکن نہیں ہے مگر کوشش ضرور کروں گا
کہ دل کا بوجھ دنیا میں جانے سے پہلے کچھ ہلکا ضرور
کر جاؤں۔"

پھر انہوں نے لکھوایا تھا۔ " سندھیا
میری سب سے بڑی اولاد ہے اور اس میں سنہا
خاندان کا وہ گرم خون ہے جو آگ سے کھیل کر بھی
نہیں پچھتاتا، ایسا خون کبھی تباہی لا سکتا ہے تو
کبھی بزنس کی ایک سلطنت بھی قائم کر سکتا ہے
میری سندھیا ہر طرح اس قابل ہے کہ وہ اِس
کاروبار کو سنبھال سکے۔ سندھیا سے میری ایک
عرض ہے کہ وہ اپنی دونوں ماؤں اور بہنوں،
بھائیوں کا اسی طرح خیال رکھے جیسے گھر کے بڑے
بزرگ یا 'کرتا' رکھتے ہیں۔ یہ اب اُس کی ذمہ داری
ہے۔ میری ایک تمنا تھی کہ میں سندھیا کو اپنے
بازوؤں میں لے کر پیار کر سکتا۔ کاش میں اپنی
بیٹی کو اپنے گلے سے لگا سکتا!"

وکیل کی زبان سنہا صاحب کی وصیت
سن کر لکشمی کی آنکھوں سے دو آنسو گرے مگر وہ
اپنے آپ کو سنبھال گئی۔ لیکن سندھیا اس انہونی
پر چکرا اٹھی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور وہ رو
پڑی۔ "پاپا! پاپا!

■■

انگلستان کے شاہی خاندان کی تنخواہیں

شبیر حسن

آج سے ۲۵ سال پیشتر انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ کی سالانہ تنخواہ ۵۰ لاکھ روپیہ تھی۔ اس تنخواہ میں ان کا گزر مشکل سے ہوتا تھا۔ ان کے محل بکنگھم پیلیس میں کئی سو کمرے ہیں۔ ان کو گرم رکھنے کا خرچ ہی لاکھوں روپیہ سالانہ تھا۔ ملکہ اپنے رہائش کے کمرے میں ہی آگ جلتی رکھتی تھیں، باقی کمرے ٹھنڈے پڑے رہتے تھے۔ جب اس کفایت شعاری سے بھی کام نہیں چلا تو ملکہ نے وزیر اعظم سے درخواست کی کہ ان کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔ ملکہ ایک سرکاری ملازم ہیں۔ ان کی تنخواہ کا مسئلہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اس میں معقول اضافہ کر دیا گیا۔ لیکن مہنگائی بڑھتی رہی۔ اس کے ساتھ ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ آج ان کی تنخواہ تقریباً ۵ کروڑ روپے سالانہ ہے۔ اس تنخواہ پر کوئی انکم ٹیکس نہیں ہے۔ سرکاری تنخواہ کے علاوہ ملکہ کی آمدنی کے دوسرے ذرائع بھی ہیں۔ ان کی جاگیر ہے، ریس کے گھوڑے ہیں، کمپنیوں کے شیئر ہیں۔ ان سب ذرائع سے مزید ایک کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔

ملکہ کے خاوند ڈیوک آف ایڈنبرا کو ۵۰ ہزار روپیہ ہفتہ تنخواہ ملتی ہے، یعنی تقریباً ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ شاہزادہ چارلس اور ان کی بیوی ڈائنا جو انگلستان کے ہونے والے بادشاہ اور ملکہ ہیں، ایک پائی بھی تنخواہ نہیں ملتی۔ سرکاری قول کا بیان ہے کہ پرنس چارلس پہلے ہی امیر آدمی ہیں۔ ان کو مزید روپیہ کی ضرورت نہیں۔ انگلستان کے جنوب مغرب میں ان کی کارنیوال کی جاگیر ہے۔ اس جاگیر سے پرنس چارلس کو (ڈیوک آف کارنیوال بھی کہلاتے ہیں) ۱½ کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ ڈائنا ان کی بیوی ہیں۔ پرنس چارلس ان کا خرچ خود اٹھاتے ہیں۔ گو کبھی کبھی وہ بیوی کی فضول خرچی سے تنگ آ جاتے ہیں۔ ڈائنا جب کسی دکان یا اسٹور میں جاتی ہیں تو ہر چیز درجنوں کے حساب سے خریدتی ہیں۔ وہ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس خاندان کی جائداد سے ان کا حصہ مقرر ہے۔ یہ آمدنی ½ ۱ لاکھ روپیہ سالانہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ریس گھوڑوں اور شیئرز سے دونوں میاں بیوی ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ کی مزید آمدنی پیدا کر لیتے ہیں۔ اس طرح دونوں کی مشترکہ آمدنی ½ ۲ لاکھ روپیہ ہفتہ یا ¾ ۱ کروڑ روپیہ سالانہ تک پہنچ جاتی ہے۔

شہزادی مارگریٹ ملکہ کی چھوٹی بہن ہیں۔ ان کی تنخواہ بھی سرکار سے مقرر ہے۔ یہ ۳ ہزار روپیہ ہفتہ یا ۱۵ لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔ زمین کا کرایہ، ریس کے گھوڑے اور حصہ جات مزید ۱۵ لاکھ روپیہ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ مارگریٹ خاصی دل پھینک عورت ہیں۔ لڑکپن اور جوانی میں ان کے کئی رومانس مشہور ہوئے۔ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ ان کو ملکہ کے خاوند ڈیوک آف ایڈنبرا سے محبت تھی، مگر انہوں نے بہن کی خاطر اپنی محبت قربان کر دی۔ اس کے بعد رومانس کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ ان کی بہن نے ان کے پیچھے خفیہ پولیس کے آدمی لگا رکھے تھے کہ کہیں ان کی بہن جو انگلستان کے تخت کی تیسری وارث تھی، محبت کے جوش میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے۔ ایک بار وہ ایک دعوت سے نکلیں تو ان کا ایک دوست ان کے ہمراہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ کار میں بیٹھیں۔ دوست نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا۔ جب کار کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں تو مارگریٹ نے دیکھا کہ خفیہ پولیس کا آدمی کار کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ مجبوراً کار سے اتر آئیں اور واپس چلی گئیں۔

مارگریٹ کو بعد میں ہوائی فوج کے ایک افسر سے عشق ہو گیا۔ یہ افسر طلاق یافتہ تھا

انگلستان میں شاہی خاندان میں طلاق ممنوع تھی۔ وہ شادی نہ کر سکیں اس کے بعد ان کی شادی ایک نوجوان ٹونی آرمسٹرانگ جونس سے ہوگئی لیکن چند سال کے بعد دونوں میں ناچاقی پیدا ہوگئی۔ اس بار وہ طلاق حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ آج کل وہ اکیلی ہیں اور ادھیڑ عمر کے باوجود نوجوان امیرزادوں کے ساتھ خوب گلچھرے اڑاتی ہیں۔

شہزادی این ملکہ کی اکلوتی بیٹی ہیں ان کی تنخواہ بھی حکومت سے مقرر ہے۔ انہیں ۳۱ ہزار روپیہ ہفتہ یا ۱۶ لاکھ روپیہ سالانہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ایک بڑی جاگیر بھی ہے۔ ان کی زمین کی کاشت سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ ۱۵ لاکھ روپیہ سالانہ تک پہنچتی ہے۔ اس طرح ان کی مجموعی آمدنی ۳۱ لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔ ان کے شوہر مارک کو سرکار سے کچھ نہیں ملتا۔ شہزادی این کو ریس کے گھوڑے پالنے کا شوق ہے۔ وہ خود بھی ایک ماہر گھوڑسوار ہیں۔ اور اس فن کے مقابلوں میں کئی کپ جیت چکی ہیں۔

ملکہ کے دو اور لڑکے پرنس اینڈریو اور پرنس ایڈورڈ ہیں۔ ان کا پہلا لڑکا چارلس سرکاری تنخواہ سے محروم ہے لیکن ان دونوں شہزادوں کی تنخواہ مقرر ہے۔ ہر لڑکے کو ۳۰۰ر۵ روپیہ ہفتہ یا ۳ لاکھ روپیہ سالانہ تنخواہ ملتی ہے۔

ملکہ کے دوسرے لڑکے پرنس اینڈریو بحری فوج میں افسر ہیں۔ اس ملازمت سے ان کو ایک لاکھ تیس ہزار روپیہ سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔

پرنس اینڈریو اپنے بڑے بھائی چارلس کے برعکس ایک خوب صورت نوجوان ہیں۔ وہ اپنی خالہ مارگریٹ کی طرح محبت کے رسیا ہیں۔

انگلستان میں ان کے کئی رومانس مشہور ہو چکے ہیں۔ ان کے ایک رومانس نے تو دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ وہ ایک فلم ایکٹریس کواسٹارک کے عشق میں مبتلا ہوگئے۔ فلم اسٹار سے محبت کرنا کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ ایکٹریس بلیو فلموں میں کام کرتی تھی۔ لوگوں نے اس کی برہنہ اور نیم برہنہ تصویریں دیکھی تھیں۔

کواسٹارک سے شہزادے کے تعلق نے ملکہ کو بے چین کر دیا۔ شہزادہ انگلستان کے تخت کا تیسرا وارث ہے۔ اسے زندگی میں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ لیکن باوجود احتیاط کے یہ راز کھل گیا۔ اخبارات نے ان خبروں کو خوب خوب اچھالا۔ ملکہ نے اپنی ناراضگی کا اعلان نہیں کیا۔ انہوں نے جی کڑا کر کے کواسٹارک کو اپنے اسکاٹ لینڈ کے محل میں ڈنر پر بلایا۔ اس بات سے ملکہ کی رواداری دنیا پر ثابت ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد یہ عشق خود بخود ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور کواسٹارک نے کسی دوسرے نوجوان سے شادی کرلی۔ پرنس اینڈریو بھی اسے بھول گئے اور یہ داستان افسانہ بن کر رہ گئی۔

شاہی خاندان کی سرکاری تنخواہوں پر کوئی انکم ٹیکس نہیں ہے، لیکن دوسری آمدنی پر ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ صرف ملکہ اور ولی عہد پرنس چارلس پر یہ قانون لاگو نہیں ہوتا۔ ان کی آمدنی خواہ سرکاری ہو یا ذاتی، اس پر کوئی انکم ٹیکس نہیں ہے۔

لاڑا

گربچن سنگھ

گرمی کا موسم ہونے کے باوجود رات کو سنگ مرمر کا فرش ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ ماں کے کہنے پر بھی سوانی نے سونے کے لئے جائے طواف کے فرش پر چادر نہیں بچھائی اور یوں ہی لیٹی رہی۔ بغل میں اس کا چھوٹا بھائی گرو بند لیٹا ہوا تھا۔ 'پریکرما' میں اگرچہ طواف کرنے والے لوگ آجا رہے تھے اور بھیڑ سی ہو رہی تھی، پھر بھی متبرک تالاب کی طرف سے آنے والے جھونکوں میں خنکی تھی، جو جسم میں ایک سرد سا پیدا کر دیتے تھے۔ سنہری گردوارے کے کلس اور اس کے اندر جلتی ہوئی روشنیوں کا عکس تالاب کے پانی میں کروٹیں لیتا ہوا ایسا لگ رہا تھا، جیسے سونا پگھل رہا ہو۔ سوانی کو پہلے کبھی اس گردوارے کے احاطے میں رات گزارنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ماں کبھی کبھی سنکرانتی یا اماوس کے دن سویرے یا دوپہر کے وقت اس مقدس تالاب میں اشنان کے لئے لے آیا کرتی تھی۔ وہ بھی برس میں ایک آدھ بار۔ پھر دن ڈھلے تک وہ اس کو واپس گاؤں لے جاتی۔ ماں اسے یہاں لاتی تھی۔ من میں منتوں کی گٹھری باندھے۔ اور اس گٹھری کو یہاں کھول کر دعا کر کے، اُمیدوں سے بھرا دل لئے واپس لوٹ جاتی۔

تالاب میں نہانے کے بعد دربار صاحب میں پرساد چڑھاتے ہوئے ماں دعا کرتی: "اے گرو مہاراج، میری بیٹی پر کرم کر، وہ اس کے ہاتھوں میں مہندی رچے۔ بانہوں میں لال رنگ کی چوڑیاں چڑھیں۔ اس کا گھر بس جائے میں تیرے لنگر خانے میں ہفتوں

بدقسمت عورت جس کے لیے محبت ہمیشہ موت کی پیامی ہوئی۔

روم کے شہنشاہ کلاوڈیس کی بیٹی اینٹونیا (۶۵-۳۵) نے اپنے دو شوہروں کو پھانسی لگتے دیکھا اور جب اس نے شہنشاہ نیرو کی پُرجوش شادی کی تجویز کو ٹھکرا دیا تو بے آبرو حکمران نے خود اسے پھانسی دے دی۔

چھوٹے برتن مانجھنے کی خدمت انجام دوں گی۔ اے گرو، خدا کے حضور میں بھی میری دعا قبول ہو۔'

ماں ہر مرتبہ میں ایک ہی دعا کیا کرتی تھی۔

سوانی کو کبھی یہ اچھا لگتا، کبھی اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگتی۔ وہ سوچتی، ماں گرو کے دربار میں بس یہی کیوں مانگتی ہے، اور کچھ کیوں نہیں مانگتی؟ ہم غریب ہیں، ہمیں روپیہ پیسہ بھی تو چاہیئے۔ ماں اس سے کہتی "بیٹی دعا کرو: گرو جی، ہم پر مہر کرو، کرم کرو۔ خدا کے حضور میں ہماری دعا پہنچا دو۔"

"باباجی مہر کرو، کرم کرو — میں ہاتھ جوڑ کر دعا کرتی ہوں، میری ماں کی پریشانی دُور کرو۔"

سوانی پھسپھسا کر دعا مانگ لیتی۔

دربار صاحب سے باہر نکل کر ماں اپنے ہاتھ سے اس کے مونہہ میں شیرینی ڈالتی۔ اس وقت ماں کے چہرے پر ایک جلالی کیفیت ہوتی اور آنکھوں میں صبر و یقین کی چمک۔

ماں ہی کو اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟

سوانی کبھی دل میں سوچتی — اس کے باپ کو اس کی فکر کیوں نہیں ہے؟ وہ کبھی اپنے ساتھ اسے دربار صاحب میں کیوں نہیں لاتا؟ وہ ماں کی طرح اس کے حق میں خدا سے دعا کیوں نہیں کرتا؟ کیا وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیٹی سوانی کے ہاتھوں میں مہندی رچ جائے؟

اُسے اپنے باپو بڑے عجیب لگتے تھے۔ وہ اکثر گھر سے باہر رہتے۔ آج اس سنت مہاتما کے درشنوں کو گئے ہیں تو کل فلاں سادھو سنیاسی سے ملنے۔ اگر گھر میں ہیں تو گرنتھ یا کسی کتاب پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ کھانا ملا تو کھا لیا، نہیں تو مونہہ کھول کر کھانے کو نہیں مانگا۔ گھر کے کاموں سے نام کو بھی دلچسپی نہیں۔ کھیتوں میں سے بٹائی کا جو حصہ چاچا، تایا کے لڑکے دے گئے، اس پر مطمئن ہو گئے۔ سب کہتے ہیں: بنتا سنگھ سادھو آدمی ہے۔ کوئی کوئی تو کہتا ہے: وہ سادھو ہو گیا ہے۔

باپو نے گیروے رنگ کے کپڑے پہننے شروع کر دیئے تھے۔ دنیاداری میں رہ کر دنیا سے دور۔ ماں بک جھک کر ہار گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو باپو کے خیالات اور جذبات کے حصار میں مقید کر لیا تھا کوئی شکایت نہیں، کوئی اعتراض نہیں، باپو کی خدمت اس کا ایمان ہے۔ اُن جیسے لوگ جو اُن سے ملنے کے لیے آتے ہیں، ان کی خدمت بھی اس کا فرض ہے۔ گھر کی ساری ذمہ داریوں کی جواب دہی اب اسی پر ہے باپو "سادھو ہو گئے ہیں نا۔

ماں کو بڑا ارمان تھا کہ سوانی کو کوئی کماؤ بر ملے۔ منتیں مانتے مانتے، تلاش کرتے کرتے، چار جگہ چرچا چلاتے چلاتے، ایک لاڑا مل ہی گیا۔ اس سے رشتہ بھی طے پا گیا۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ سوانی کو سب علم ہے۔ اس نے اپنے لاڑے کا وہ فوٹو، جو ماں نے اپنی صندوقچی میں رکھا ہوا ہے، چوری چوری نکال کر دیکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اس کا لاڑا، فوج کا سپاہی ہے۔ اونچا قد، گول بھرا ہوا چہرہ، ڈاڑھی مونچھوں نے جسے اور رعب دار بنا دیا ہے۔

سوانی یہ سب جانتی تھی کہ پیار کیا ہوتا ہے سکھی سہیلیوں کے مونہہ سے کبھی کبھی کسی کے پیار کے قصے سُن سُن کر دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا تھا، لیکن سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ اپنے لاڑے کا فوٹو دیکھنے کے بعد اب وہ اپنے دل و دماغ کو ایک کشش میں قید محسوس کرتی ہے۔ سوتے جاگتے، کھاتے پیتے اور خاص طور سے تنہائی میں لاڑے کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔

اس دن پر کرما میں کچھ نوجوان چہرے دیکھ کر سوانی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا لاڑا بھی ان ہی

میں ہے، جو چودہ آنکھوں سے کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا ہے۔ سوانی بھی ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر پھر اپنی نظریں نیچے جھکا لیتی۔ یہ ردِ عمل اس وقت تک ہوتا رہا تھا، جب تک کہ شام ڈھل نہیں گئی تھی۔ دربار صاحب میں پاٹھ شروع ہو چکا تھا، سارے ماحول پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ اور گرو ندر ادب سے بیٹھ گئے رہتے۔ پاٹھ اور دعا کے بعد ماں ایک مرتبہ پھر سب کو لے کر اندر گردوارے میں متھا ٹکانے لے گئی تھی۔ پھر لنگر میں جا کر کھانا کھایا۔ ماں کا خیال تھا کہ وہ سویرے ہی گاؤں لوٹ جائیں گے۔ رات پریکرما ہی میں گزرے گی۔ سوانی نہیں چاہتی تھی کہ اتنی جلد گھر لوٹا جائے۔ کیوں نہ دو چار دن یہاں اور رہا جائے۔ بڑا سکون ملتا ہے یہاں۔ ساری پریشانیاں، سب دکھ دور ہو جاتے ہیں۔

لنگر خانہ سے لوٹ کر انہوں نے پریکرما میں ایک ایک جگہ سونے کا ٹھکانا بنا لیا، ماں نے سمجھایا تھا کہ سوتے وقت سر دربار صاحب کی طرف رکھنا چاہیے۔ اس طرف پاؤں کرنے سے گناہ سرزد ہوتا ہے۔ نیند میں خوف ناک خواب دکھائی دیتے ہیں۔

سر دربار صاحب کی طرف کیے لیٹے لیٹے سوانی آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ دور آسمان پر تارے جگمگاتے ہوئے ایسے لگ رہے تھے جیسے وہ سب نیچے کی طرف، دربار صاحب کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ گاؤں کی سکھی سہیلیوں اور بڑی بوڑھیوں کے مونہہ سے بھی تو اس نے سنا ہے یہ جو تارے ہیں، وہ پاک روحیں ہیں، جو دھرتی کو چھوڑ کر اوپر چلی گئی ہیں۔ ان میں فرشتے بھی ہیں۔ سوانی محسوس کر رہی تھی کہ برستی ہوئی روشنی کی پھوار سارے ماحول کو جگمگا رہی ہے اور ایک نورانی روشنی دربار صاحب سے نکل کر چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ متبرک تالاب کا پانی پگھلے ہوئے سونے کی طرح لہروں میں بدل رہا ہے۔ چہار سو متبرک نغموں کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہے، اور خوشبوؤں سے مہک رہی ہے۔ اس دوران اُسے اپنے لاڈلے کا تصور بھی بہت حسین لگا۔ دن بھر کی تھکی ماندی تھی۔ اطمینان سے اس نے اپنی آنکھیں موندلیں۔

بھولی بھالی، سوانی نے شاید یہ سنا ہو گا کہ جس دھرتی پر بے پایاں سمندر ہیں، جس پر بڑی بڑی جھیلیں ہیں، جس پر کئی اطراف برف جمی رہتی ہے، گہرے دریا ہیں اسی دھرتی کے بطن میں لاوے کا کھولتا ہوا سمندر بھی ہے، خوف ناک آگ بھی ہے اس نے کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا کہ جس آسمان سے پانی برستا ہے، اولے گرتے ہیں، جس میں جلا کر بھسم کر دینے والی بجلی بھی پوشیدہ ہے، وہاں سے قہر کی بارش بھی ہوتی ہے، اور پانی میں بھی آگ لگ جاتی ہے۔

سوانی نیند میں خواب دیکھ رہی تھی: آسمان سے آگ برس رہی ہے نیچے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ متبرک تالاب کا پانی لاوے کی طرح کھول رہا ہے۔ چہار سو چیخ پکار اور رونے کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ کیا عورت کیا مرد، کیا بوڑھا، کیا بچہ، سب آگ میں جھلسے، خون میں نہائے، تڑپ رہے ہیں — خوف ناک دھماکوں سے دھرتی کانپ رہی ہے۔ اس کا لاڈلا، جسے آگ نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، اس کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھتا ہوا اپنی باہیں آگے پھیلاتا ہے۔ اور سوانی ایک چیخ کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی دیکھا چاروں طرف اندھیرا ہے اور ہُو کا عالم۔ اُس

ملکہ جو آگ پر چلی تھی

فرانس کی ملکہ ریچرڈا اپنے شوہر کنگ لوئس دی اشا ڈ (۸۷۱ ۔ ۹۳۹) کے ذریعہ کردار پر شک کیے جانے کے سبب اپنے کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے موم میں تر ایک گاؤن پہن کر دہکتی ہوئی آگ کے اوپر چلنے کو مجبور کی گئی۔
ملکہ اس جان لیوا آزمائش میں کامیاب ہو گئی مگر اس نے اپنے شوہر کو چھوڑ کر ایک خواتین سنترم میں داخلہ لے لیا۔

اندھیرے میں روشنی کی چمک جاگتی ہے تو خوف ناک آوازوں کے ساتھ، لرزہ خیز دھماکوں کے ساتھ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے ہیں، سنسناتی ہوئی گولیاں آتی ہیں، ان کے لگتی ہیں اور وہ ہائے کرتے ہوئے ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ ان میں بچے ہیں، بوڑھے بھی ہیں، عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔

ماں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "چل سوانی چل، جلدی چل۔ یہاں گولیاں چل رہی ہیں۔ دربار صاحب میں فوج گھس آئی ہے۔ تو گرو ندر کا ہاتھ پکڑ لے"

"وہ تینوں بے شمار لوگوں کے ساتھ پریکرما کے برآمدے میں سر چھپانے کے لیے ایک طرف بڑھے رائفلوں اور مشین گنوں کی گولیاں سوں سوں کرتی ہوئی

سوئٹزرلینڈ کی مشہور آرٹسٹ

ایمی لیپن بغیر بانہوں کے ہی پیدا ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے ۵ برس کی عمر سے ہی پینٹنگ بنائی کی ۔ اپنی تحریر دیدہ زیب بنائی اور ایک ممتاز آرٹسٹ بنی ــــ صرف اپنے پیروں کا استعمال کر کے۔

س طرح نکلی جا رہی تھیں جیسے ان کا پیچھا کر رہی ہوں ب ایک جگہ سوانی کا پاؤں الجھا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ نیچے کوئی اوندھے مونہہ گرا پڑا تھا۔ ماں نے اسے سنبھال دیا اور کھینچتی ہوئی آگے کی طرف لے گئی۔ وہ حقیقت میں کس طرف جا رہے ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اچانک گرونندر زور سے چیخا اور تڑپ کر نیچے گر پڑا۔ سوانی اُسے سنبھال نہ سکی وہ چیخی "ماں، دیکھو گرونندر کو کیا ہو گیا ہے؟" "ماں ہائے" کہتی ہوئی کس کٹے ہوئے درخت کی طرح گر کر لڑکے کے پاس ہی ڈھیر ہو گئی۔

ماں ۔۔۔۔! پھر ایک چیخ سوانی کے مونہہ سے پھوٹ پڑی اور وہ ماں کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

ماں نے لمبی سانس لی اور لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کچھ بولی، جسے سوانی ٹھیک طرح سمجھ نہیں سکی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ برستی ہوئی آگ کے نیچے کھولتے ہوئے پانی میں بیٹھی ہوئی ہے۔ فرش پر وہ خون ہے جو پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ وہ گولی کے شکار ان بے قصور لوگوں کا خون ہے جن کا نام، پتہ، ٹھکانا کوئی نہیں جانتا۔ وہ سب کا ملا جلا خون ہے، جو اس کے پیروں کو رنگ رہا ہے۔ ہر طرف لاشیں بچھتی جا رہی ہیں۔ دھماکوں کے ساتھ نعرے لگانے والوں کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی ہے۔

اچانک چاروں طرف دھواں دھواں سا پھیلنے لگا۔ زہریلی گیس سے آنکھیں جلنے لگیں اور دم گھٹنے لگا۔ سوانی کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ ڈوبنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہاں سب کچھ تاریکی میں سماتا چلا جا رہا ہے۔

سوانی نے جب آنکھیں کھولیں تو بھی اندھیرا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند پایا۔ اس کے جسم پر ایک کپڑے کے سوا اور کوئی لباس نہیں تھا۔ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور اعضا میں جلن ہو رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے آس پاس بھوت پریت چکر کاٹ رہے ہیں۔ خون خوار بھیڑیئے، سنگین تانے رائفلیں اٹھائے خوفناک چہروں والے لوگ گھوم رہے ہیں۔ کمرے کے دروازے کے پاس ایک فوجی دیوار سے سہارا لیے سر جھکائے بیٹھا سا لگ رہا تھا۔ اس کی گردن لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ کی رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹی پڑی تھی۔ وہ اس کا لاڑا نہیں تھا۔ وہ اس کے لاڑے کا خونی ہو سکتا تھا۔ اس کی ماں اور بھائی کا قاتل، خونی جس نے دربار صاحب کی پرکرما کو خون سے بھر دیا تھا۔ وہ اس کے دیس کا سپاہی نہیں تھا، دشمن تھا۔ جھجکتی ہوئی سہمتی ہوئی وہ آگے بڑھی اور دھیرے سے اس نے رائفل اٹھا لی۔ رائفل کافی وزنی تھی۔ وہ اس کا کیا کرے؟ اس میں سے کیسے گولی نکلتی ہے؟ گولی کیسے داغی جاتی ہے؟ کدھر مونہہ کر کے گولی داغے؟ کس کو مارے؟ سب ہی دشمن ہیں ــــ اس کی تمناؤں کے، اس کی آبرو کے، اس کے یقین اور ایمان کے۔

رائفل اس نے سامنے کی طرف تان دی۔

بجلی جیسی لپلپاتی ہوتی ایک چمک جاگی۔ پھر تڑ تڑ اور چڑ چڑ کی آواز اور دھماکے۔ سوانی نے محسوس کیا کہ ڈھیر سارے، انگاروں جیسی گولیاں اس کے جسم کو چھید کر پار ہو گئیں ہیں۔

"پانی!" اس کے مونہہ سے نکلا۔

متبرک تالاب کا پانی تو کھول رہا تھا۔ نلوں کا پانی بند تھا۔ نہ جانے اس جیسے کتنے مرنے والوں نے ایک ایک بوند پانی کو ترستے ہوئے دم توڑا ہو گا۔ وہاں نہ پانی تھا، نہ کھانا تھا۔ نہ زخموں کے لیے مرہم اور نہ مُردوں کے لیے کفن۔ وہاں خدا کے سوا اپنا کوئی نہیں تھا۔ سوانی کا لاڑا بھی!

●●

وہ لمحہ کتنا عجیب تھا جیسے آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹ کر فضاؤں میں بکھر گیا ہو۔

اُس شام منیر منزل بالکل خاموش تھی چپ چپ دم سادھے جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو سارے ہنگامے، چہلیں، شور، ولولے اور نقرئی قہقہوں کا ہجوم منتشر ہو گیا تھا۔ بس وہاں ایک سناٹا تھا موت کا گہرا سناٹا۔ ہر چہرہ دُھواں دُھواں، ہر دل بجھا بجھا اور ہر آنکھ شبنمی تھی۔ مسز عثمانی کے غم میں، راشدہ باجی کے دُکھ میں، رشیا بھابھی کے خیال میں اور رشو منیا کے ملال سے۔

لان کے ایک گوشے میں مسٹر عثمانی بیٹھے تھے، اپنی لُٹی لُٹی سی ویران دنیا لئے۔ انھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ان کے دماغ کی نس نس کو چھلنی سے چھیل رہا ہو۔ آہستہ آہستہ، ہولے ہولے۔ انھوں نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ان کی محبوب رفیقِ حیات کی زندگی کا چراغ یک بیک بجھ جائے گا۔ اور وہ عمر کی اس منزل میں تنہا رہ جائیں گے۔ جہاں انھیں راشدہ کا ہاتھ میں ہاتھ لے کر قدم بہ قدم چلنا تھا

نے بڑھنا تھا۔ نئے حوصلوں کے ساتھ نئی امیدوں
ساتھ اور اس یقین کے ساتھ جس میں ایمان کی
شنی ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ انسان دکھوں سے
ا دامن چھڑانے اور اپنے دل کی دیواروں سے
زریں نقوش کھرچ دے۔ جنھوں نے اسے حوصلے
تے ہیں وہ حوصلے جو پہاڑوں کی بلندیاں' اور سمندر
گہرائیاں سر کرادیں جو چاند کی انگنائی چھولیں
ر ستاروں کی چمک کو رگ رگ میں انڈیل دیں کیا
ئی انسان اپنے ایسے محبوب کو بھلا سکتا ہے.؟
شاید کبھی نہیں۔

مسٹر عثمانی فرخ آباد میں سیشن جج تھے خوش
ل، خوش نظر، خوش فکر اور خوش لباس' اُن کے
ہرے سے وجاہت' آنکھوں سے ذہانت اور
ونٹوں سے پھول جھڑتے تھے۔ وہ سادہ زندگی
در بلند خیالات کے پیکر تھے۔ اور مسز عثمانی کو دیکھ کر
یہ کہنا پڑتا تھا کہ بے شک اللہ تعالیٰ جوڑے آسمان
سے اُتار رہا ہے۔ راشدہ اودھ کے اس تعلقہ داری نظام
کی یادگار تھیں جنھوں نے حضرت گنج اور امین آباد کو
خوب صورت شامیں دی تھیں تو ہنومان پل کو وہ صبح
بخشی تھی جہاں بھگت مہابلی کے گن گاتے تھے لیکن
وہ شاید حضرت گنج کی شاموں اور ہنومان پل کی صبحوں
نے یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ بہت جلد ان سے وہ چراغ
چھین لیا جائے گا جس کے لہو سے کتنے ہی گھروں
میں آگ روشن تھی۔

لان کے دوسرے گوشے میں ساجدہ بیٹھی
مٹیالی دھوپ کی ردا اوڑھے' اپنی باجی کے غم میں
ایسی نڈھال جیسے اس کی نس نس کا لہو نچوڑ گیا ہو اس
کی آنکھوں کا دریا بہتے بہتے سوکھ گیا تھا اُس کی
حالت اس طوفان جیسی تھی جو مطلوبہ ہوا نہ ملنے کی
وجہ سے اپنے محدود دائروں ہی میں گھٹ کر رہ
جائے۔ راشدہ باجی کے انتقال کے بعد اُس نے

پہلی بار سنجیدگی سے سوچا تھا کہ وہ اکیلی رہ گئی تھی
بالکل تنہا ایک برگِ خزاں رسیدہ کے مانند۔ راشدہ
باجی کے ہوتے ہوئے اس نے کبھی کسی بات کی پروا
نہیں کی تھی۔ جو دل میں آتا کرتی، جہاں جی چاہتا
جاتی۔ جو سوچ لیتی کر کے دم لیتی۔ جب اس کا شعور
بیدار ہوا تھا تو اس نے اپنے آس پاس صرف
راشدہ باجی کو ہی دیکھا تھا جو اُسے روک ٹوک سکتی
تھیں، ورنہ گھر میں اب کوئی بزرگ ایسا نہ تھا جو
جوان لڑکی سے یہ کہہ سکتا۔ " اے بٹیا شام کا
وقت ہے نہا دھو کے بیٹھی ہے۔ اٹاری پر نہ چڑھ
راشدہ باجی چلی گئیں۔ تو گویا ساری پابندیاں چلی گئیں۔
وہ پابندیاں جو آزادی کے احساس کو زندہ رکھے

وہ بڑے گھر کی بیٹی تھی، منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئی تھی آرائش و آسائش کی وہ کون سی شے تھی۔ جو اُسے حاصل نہ تھی۔

ہوئے تھیں۔ اب تو وہ آزاد ہو کر بھی خود کو ایسا
غلام محسوس کر رہی تھی جس کا نہ کوئی آقا تھا نہ مالک
وہ بڑے گھر بیٹی تھی۔ موہنہ میں چاندی کا چمچہ لے کر
پیدا ہوئی تھی۔ آرائش و آسائش کی وہ کون سی
شے تھی جو اسے حاصل نہ تھی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے
انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا اور آباؤ اجداد
کی شاندار لائبریری کے خوش انتظامی کے شوق
نے اُسے بی لب بھی کرا دیا تھا۔ اسے جہاں
میر و غالب' ٹیگور اور تلسی پسند تھے' وہاں وہ
ٹینی سن، براؤننگ اور اسکاٹ کے کلام کو بھی
بصد شوق پڑھتی تھی اور پڑھتے پڑھتے ایسی دنیا میں
میں کھو جاتی جو سات رنگوں کی البیلی دنیا ہوتی ہے
پھولوں کی دنیا، خوشبو کی دنیا، اس نے اپنی باجی

کی شادی کے بعد ایک ایسی ہی رُوپہلی دنیا اپنے
ذہن کے جزیروں میں سجائی تھی جس پر اس کا اپنا
حق ہوگا دبدبہ ہوگا' وقار ہوگا۔ اس کے نقش و نگار
میں جاذبیت تھی۔ آنکھوں میں خوب سے خوب تر
کی جستجو اور جوان جسم میں وہ قوت جو منزل سے ہم کنار
ہوئے بغیر ایک پل کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دے۔

منیر منزل پیلی کوٹھی بھی کہلاتی تھی اور
کوٹھی کے گراؤنڈ فلور پر ان لوگوں نے قبضہ کر لیا
تھا جو کسی زمانے میں اُس گھر کی رعیت کہلاتے تھے
بالائی حصے میں کرایہ دار رہتے تھے، ساجدہ نے
کوٹھی کے بیشتر حصے کرایہ پر محض اس خیال سے
اٹھا دئے تھے کہ وہاں چراغ جلتا رہے، ورنہ
قلعہ نما بھاری کوٹھی دن دہاڑے پھاڑ کھانے
کو دوڑتی تھی۔ جب ایک ایک کر کے سب رخصت
ہو گئے تو دور کے عزیز اپنی قرابت داری کے ڈانڈے
ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لانے لگے تو یہی رشتہ دار مطمئن تھے کہ
جب دونوں بہنوں میں کوٹھی تقسیم ہوگی یا فروخت
کی جائے گی تو انھیں بھی کچھ نہ کچھ حصہ بزرگوں کی
یادگار کے طور پر تبرکاً حاصل ہوگا۔ نعیم، باسط اور کلیم
کے گھر والے چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے سے ساجدہ
کی شادی ہو جائے۔ راشدہ کے کتنے ہی پیام آئے
لیکن وہ چاہتی تھیں کہ ساجدہ کی مرضی کے بغیر کسی کو
جواب دے دیں۔ جب کبھی کوئی پیام آتا تو وہ دوڑ
کر لکھنؤ جاتیں اور ساجدہ سے مشورہ کرتیں لیکن ساجدہ
نے ایک دن صاف صاف کہہ دیا "باجی آپ نے خود
تو اپنے لئے جج تلاش کر لیا اور مجھے وکیلوں اور بیرسٹروں
کے سر تھوپنا چاہتی ہیں۔

ساجدہ کا یہ جواب سن کر راشدہ بہت ملول
ہوئیں، لیکن نہایت نرم لہجے میں بولیں ساجدہ میری شادی
والدین نے کی تھی اور میں بڑی بہن ہونے کے ناطے
ماں کا درجہ رکھتی ہوں۔ لیکن ساجدہ نے بات کو یہ کہہ کر

ٹال دیا "باجی! ابھی مجھے شادی وادی نہیں کرنا پہلے
میں ریسرچ مکمل کرلوں" اس کے بعد سوچوں گی۔ ساجدہ
کا جواب سن کر راشدہ کے ہونٹوں پر ہنسی اور دل میں
اُداسی کی کئی ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچتی چلی گئیں۔ لیکن وہ
بہت متین، سنجیدہ اور معاملہ فہم خاتون تھیں۔

دراصل ساجدہ بدلتے ہوئے حقائق سے
بالکل ناآشنا تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باعث
سمجھتی تھی کہ اس کی شادی بھی کسی متعلقہ دار گھرانے
میں ہوگی، کسی اعلیٰ افسر یا جج سے ہوگی۔ تاکہ خاندان
کی وہ روایات زندہ رہیں۔ جو صدیوں کا انمول سرمایہ
ہیں۔ یہ سب کچھ ممکن بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن خاندان
کے بیشتر لڑکے پاکستان ہجرت کرچکے تھے اور جو ہندوستان
میں رہ گئے تھے، انھوں نے ڈاکٹر، انجینئر اور پروفیسر
بن کر خلیجی ممالک کا رُخ کرلیا۔ بچے کچھے لڑکے اس
کے معیار کے مطابق نہ تھے، اس لئے جو پیام آتا وہ
انکار کردیتی لیکن وہ سورج کی ہر نئی نویلی کرن کے
ساتھ یہ توقع لے کر بستر سے اُٹھتی کہ آج اس کے
خوابوں کا کوئی بانکا شہزادہ اس کے آنگن میں ضرور
اترے گا اور وہ بھی اپنے پیا کے ساتھ پردیس چلی
جائے گی۔ لیکن دوپہر کی زرد زرد دھوپ لڑکھڑاتے
قدموں کے ساتھ شام کی سرمئی باہنوں سے ہم کنار
ہوجاتی اور اس کے خوابوں کا کوئی شہزادہ اُس کے
صحن میں نہ اترتا اور وہ رات کے ملگجی سایوں کے سنگ
اپنی ذات کے حصار میں قید ہوجاتی۔ لیکن وہ ایک
حوصلہ مند لڑکی تھی۔ کسی بھی حال میں اپنے ماضی سے
ملے ہوئے مستقبل کے دامن کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی
اسے یقین تھا کہ ایک دن آئے گا جب حویلی میں رت
جگا ہوگا وہ بھی باجی کی طرح دُلہن بنے گی۔ بیاہ کا
سُرخ اطلسی جوڑا زیب تن کرے گی۔ ہاتھوں میں حنا،
مانگ میں افشاں اور جسم پر اُبٹن مہکے گا اور دولہا بھائی
کی طرح اس کا بھی دولہا خوب بڑا سا سہرا گلے میں ڈالے
شارک اسکن کی شیروانی پہنے اور گھوڑے پر سوار ہوکر
شہنائیوں کی دُھن میں آئے گا۔ دیوان خانے میں
بارات ٹھہرے گی، براتیوں سے کوٹھی اور کمروں سے
زنان خانہ بھر جائے گا۔ مراثنیں گیت گائیں گی۔
ڈھولک کھنکے گی۔ دارا بجے گا۔ آتش بازی چھوٹے
گی۔ چاروں طرف شادیانے ہوں گے اور اس کے
خوب صورت خوابوں کی مہکتی ہنستی تعبیریں۔

سورج کی ہر سنہری کرن جہاں اس کے
دل میں امیدوں کی نئی جوت جگاتی، وہاں معاوضے
کے طور پر اس کے بالوں کی سیاہی لے کر سفیدی
کی سوغات بخش دیتی تھی اس نے چڑھتے سورج کے
ساتھ جب بڑھتی عمر کی سوغات کو آئینے میں دیکھا تو

> **اُسے یقین تھا کہ ایک دن آئے گا جب حویلی میں رت جگا ہوگا، وہ بھی باجی کی طرح دُلہن بنے گی بیاہ کا سُرخ جوڑا زیب تن کرے گی۔**

بل کرکھا کر رہ گئی۔ غم و غصہ بے طرح اس کی نس نس
میں سرایت کرگیا۔ اس نے چاہا کہ وہ قدآدم آئینہ
توڑ دے یا پھر اپنے سر پر اُگے ہوئے چاندی کے
وہ مہین مہین تار نوچ کر کھڑکی کے باہر پھینک
دے جو اس کے گلابی خوابوں کا مونہہ چڑانے کے
لئے سر میں پیچھے سے جھانکا کرتے تھے۔ یہ سوچتے
ہوئے اس کے چہرے پر روکھی سی ہنسی کا گدلا پن
چھا جاتا کہ شاید وہ دیوانی ہوگئی ہے۔ پھر وہ خود
کو سمجھاتی۔ "ساجدہ مت بھولو کہ ہر رات کی سحر
ہوتی ہے۔ مایوسی کفر ہے۔ تم اللہ پر یقین رکھو
کہ تمہیں بھی دولہا بھائی جیسا دولہا ملے گا۔"
راشدہ جب لکھنؤ آتیں تو عزیز و اقارب
سے ملاقات کا اہم مقصد ساجدہ کے لئے لڑکے
کی تلاش ہوتا لیکن آج کے دور میں اچھا لڑکا ملنا اتنا ہی
دشوار ہے۔ جتنا آصف الدولہ کے تاریخی امام باڑے
کی بھول بھلیوں میں راستہ۔

ایک شام دونوں بہنیں سہ دری میں پڑے
ہوئے قدیم چھپر کھٹ پر بیٹھی تھیں۔

"باجی! کیا انسان اپنے ماضی سے خود کو الگ
کرکے جی سکتا ہے؟" ساجدہ بیٹھے بیٹھے اس طرح بول
اٹھی جیسے کوئی بچہ چلتے چلتے پوچھنے لگے "پیڑوں کے
پتے ہرے کیوں ہوتے ہیں؟"

راشدہ دیر تک ساجدہ کے کتابی چہرے
کو تکتی رہیں۔ جہاں خوابوں کے فیروزی جزیروں پر
شکستہ ارمانوں کے مرثیے تحریر تھے۔ اور آنکھوں
میں ڈوبتے ستاروں کی وہ چمک تھی جو سورج کی
کرنوں سے خوف زدہ رہتی ہے۔

"باجی! کیا یہی وہ زندگی ہے جس کو پانے
کے لئے میں نے برسوں جدوجہد کی تھی پڑھتے
پڑھتے میں نے آنکھیں خراب کرلیں اور آپ
دیکھتی ہیں، میرے سر پر اُگے ہوئے چاندی کے
یہ تار؟"

ساجدہ کی مجروح آواز بتارہی تھی کہ اس
کے سینے میں کوئی الاؤ تھا۔ جو آہستہ آہستہ
سلگ رہا تھا۔ اور وہ اپنے کندن سے بدن کی
گہرائیوں میں کہیں بہت دور ٹوٹ کر ریزہ ریزہ
ہوگئی، اس کی بات سُن کر راشدہ کے سینے کے
اندر ایک نشتر سا چبھتا چلا گیا اور انھوں نے والہانہ
طور پر ساجدہ کو اس طرح گلے لگا لیا کہ شاید بدلے
ہوئے حالات پر زمین کا دل اور آسمان کا کلیجہ
دہل ہوگیا ہوگا۔ اس شام اس گھرانے کی دو لڑکیاں
گلے مل کر رو رہی تھیں۔ جس گھرانے کی ڈیوڑھی نے
میسر جان گی کے لوگوں کی سوغات بخشی تھی رنگ

ر کا امتیاز کے بغیر سب کو انعام واکرام سے نوازا
، پنچایتی کاموں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا
ا۔ لیکن آج اس گھرانے میں کوئی ایسا بزرگ
یا نہ تھا جو ان لڑکیوں کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ
کر یہ کہہ سکتا ' بچیو ' دونوں وقت مل رہے ہیں
ے میں رویا نہیں کرتے۔

وقت بدلا ' رت بدلی ' حالات اور چڑھتی
ڑی عمر کے ساتھ ساجدہ کا دل و ذہن بدل گیا مسلسل
ایسوں کے باعث اس کے مزاج میں چڑچڑا پن
یا وہ سیدھے منہ کسی سے بات نہ کرتی ' بات بے بات
راضگی ' غصہ ' طنز و طعن اور ہر چیز کی توڑ پھوڑ اس
ی عادت بن گئی۔ ایک دن راشدہ کو یہ دیکھ کر بہت
کھ ہوا۔ کہ جب ریڈیو پر یہ گیت آرہا تھا ' چھوڑ
بل کا گھر ... " تو ساجدہ نے ریڈیو اٹھا کر پھینک
یا۔ اور وہ دن بھی راشدہ کو اچھی طرح یاد تھا جب
وہ ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے جارہی
تھیں اور انھوں نے اپنا چوتھی کا بنارسی جوڑا نکال
کر مسہری پر رکھا تھا اور باتھ رُوم چلی گئی تھیں اور
جب لوٹی تھیں تو انھیں یہ دیکھ کر بہت رنج ہوا تھا
اور غصہ بھی آیا تھا کہ ساجدہ نے اس خوب صورت
بنارسی جوڑے پر روشنائی کی دوات الٹ دی تھی۔
راشدہ کو یہ بھی یاد تھا کہ ایک دن مسٹر عثمانی اپنے
کچھ دوستوں کے ہمراہ منیر منزل آئے تھے اور
ساجدہ نے اپنے دولہا بھائی سے کہا تھا " یہ
میری کوٹھی ہے ' کوئی ہوٹل نہیں ہے کہ جب
جی چاہا آپ اپنے دوستوں کے ساتھ آدھمکے یہی
نہیں ' ساجدہ نے راشدہ اور مسٹر عثمانی کے مشورہ
کے بغیر کوٹھی کے نچلے کئی کمرے فروخت کر دئے
تھے جب کہ قانونی طور پر مشترکہ جائیداد میں کوئی حصہ
بیچنے کا اسے کوئی حق نہ تھا لیکن راشدہ نے یہ کہہ کر
بات کو رفع دفع کر دیا تھا " ساجدہ بچی ہے اس کی

کسی بات یا کام کا بُرا نہ ماننا چاہئے۔"

" بیگم ! اگر چھتیس سال کی لڑکی بچی ہے تو پھر
آپ ؟" عثمانی صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

" ہاں ' وہ مجھ سے چار سال چھوٹی ہے " مسز
عثمانی کا لہجہ بھی خوش گوار تھا۔

راشدہ اپنی چھوٹی بہن کی خوشیوں اور خوشنودی
کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار رہتی تھی اس لئے
اس کی ہر بات گوارا تھی لیکن دولہا بھائی کو یہ ہرگز
گوارا نہ تھا کہ وہ اپنی کوٹھی پر کبھی مشاعروں کا اہتمام
کراتی کبھی طلبار کے بیت بازی اور تقریروں کے
مقابلے اور کبھی سیاسی پارٹی کی میٹنگ ان کی سسرال
کی کوٹھی میں ہو۔ جہاں تک مشاعروں اور تقریری مقابلو

ساجدہ ان شاعروں کی منڈلی کو زیادہ لفٹ نہ دیا کرو یہ لوگ تو خود اس بات کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی اُن سے چائے پی لے اور ان کی غزل سُن لے

کا سوال تھا وہ بھی اس حد تک نظر انداز کئے جاسکتے
تھے کہ اُن سے ادب کی خدمت ہوتی تھی لیکن
لیکن بعض ناکارہ شعرار کا وقت بے وقت کوٹھی پر آنا
اور ساجدہ کی شعر نوازی انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی
تھی۔

" ساجدہ ان شاعروں کی منڈلی کو زیادہ لفٹ
نہ دیا کرو۔ یہ لوگ تو خود اس بات کی تلاش میں
رہتے ہیں کہ کوئی ان سے چائے پی لے اور ان کی
غزل سُن لے۔"

" دولہا بھائی آپ ٹھہرے نرے جج : آپ
کو کیا خبر کہ شعر و ادب ہے کس چڑیا کا نام۔ شاعرانہ
دل و دماغ پایا ہوتا تو صرف ایک سو سات ' ایک

سو سترہ اور تین سو دو ڈ ہی جانتے ہیں۔ ساجدہ دولہا
بھائی کو ایسا کرارا جواب دے دیتی کہ وہ عافیت
کی خاطر چپ ہو جاتے

ساجدہ کے اس بدلے ہوئے مزاج کی
وجہ سے وہ اس سے ہفتوں بات چیت نہیں
کرتے تھے۔ اور انھوں نے اپنی دانست میں اس کو
پاگل لڑکی قرار دے دیا تھا وہ جب کبھی لکھنؤ سے
فرخ آباد آتی تو جج صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ
شکار کے لئے چلے جاتے اور جب کئی کئی دن بعد
بعد واپس آتے تو ساجدہ یہ کہتے ہوئے ان کا
خیر مقدم کرتی " لیجئے دولہا بھائی ہم تو آپ سے
نیاز حاصل کرنے کی خاطر حاضر خدمت ہوئے تھے
اور آں جناب ہیں کہ محرّم کا چاند بنے پھرتے ہیں۔"

اری پگلی ! محرّم کا نہیں ' عید کا چاند کہا
کرتے ہیں " راشدہ اس کی اصلاح کرتیں۔

" باجی میں تو ان کا چہرۂ انور دیکھ کر کہہ رہی
ہوں جس پر ساڑھے تین بج رہے ہیں جیسے جنگل
سے نہیں کسی امام باڑے سے آرہے ہوں "
ساجدہ کے سو نہہ میں جو آتا کہتی چلی جاتی
لیکن عثمانی صاحب صرف ہلکے سے مسکرا دیتے اور
نہا دھو کر ڈرائنگ رُوم میں بیٹھ جاتے تاہم دل ہی
دل میں یہ دعا بھی کرتے رہتے کہ خدا کرے ساجدہ
کی موجودگی میں اُن سے ملنے کوئی نہ آئے۔

جج صاحب کے دو بچے تھے ؛ فوزیہ اور
نفیس ' فوزیہ پانچویں میں پڑھتی تھی اور نفیس
تھرڈ اسٹینڈرڈ میں تھا۔ دونوں اپنی آنٹی کو
بہت چاہتے تھے۔ اور ساجدہ بھی انھیں ڈھیر
سا پیار دیتی تھی۔ لیکن جب اس کی کوئی رگ پھڑکتی
تو وہ بچوں کے کئی کئی طمانچے بات بے بات رسید
کر دیتی۔ بچے بلک بلک کر روتے اپنی ممی سے فریاد
کرتے ' پاپا سے شکایت کرتے۔ لیکن ان کی ساری

زیادیں اور شکایتیں بے اثر رہتیں۔ ساجدہ خود ہی اگلے دن انھیں اپنے ساتھ کبھی سینما لے جاتی کبھی پارک میں اور کبھی کلب۔ مٹھائیاں اور کھلونے طمانچوں کی اذیت کو شگفتہ پنکھڑیوں کی نرمی میں بدل دیتے۔ دراصل بچے خود بھی ساجدہ سے بہت مانوس تھے اور اس نے بچوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ اسے کبھی آنٹی نہ کہیں چھوٹی ممی کہیں۔

لیکن ہم ایک شرط پر آپ کو چھوٹی ممی کہیں گے پہلے آپ وعدہ کیجئے کہ اس اتوار کو ہمیں فلم دکھائیں گی: فوزیہ اور فضیل موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھانے میں خاصے ماہر تھے

"ضرور، ضرور:" ساجدہ بچوں سے وعدہ کرتے ہوئے ارشاد بوا کا ہاتھ بٹانے کے لئے کچن میں چلی جاتی اور اس طرح ہاتھ بٹاتی کہ کبھی قورمے میں مرچ تیز کبھی بریانی میں نمک غائب۔ کبھی گوبھی گل جاتی اور کبھی چپاتیاں جل جاتیں لیکن وہ جلی ہوئی چپاتیاں اور تیز مرچوں کا قورمہ دولہا بھائی کو کھلاتے ہوئے خوب ہنسی اور کہتی "کیا ارشاد بوا میرے مقابلے میں قورمہ بنائیں گی، ساتوں مسالے ڈال کر میں نے قورمہ بنایا ہے۔ آخر ہوں نا ایک تعلقہ دار کی بیٹی :

غالباً جج صاحب کی طرف سے اسے ساتوں مسالے تو کیا' سات خون بھی معاف تھے۔ اس لئے وہ صرف زیر لب مسکرا کر رہ جاتے اور بہر صورت کھانا کھا کر اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلے جاتے۔ اگر کبھی بہت غصہ آتا تو وہ صرف اتنا کہتے "بیگم، ارشاد سے کہو کہ اس پاگل کو کچن میں نہ آنے دیا کریں۔"

دراصل ساجدہ کو تخریب کاری میں بہت لطف آتا تھا اور دلیل یہ دیتی تھی کہ تخریب کے پیچھے تعمیر پوشیدہ ہوتی ہے وہ [illegible] کے مرنے پر ملول نہ ہوتی اور کہہ دیتی "مرحوم [illegible] از جہ ادبی۔ لیکن اپنی باجی کے مرنے پر وہ [illegible] روئی تھی۔ اس نے اپنے بال نوچ لئے تھے [illegible] پھاڑ لئے تھے۔ اور دیوانہ وار باجی کے جنا[زے] کے پیچھے قبرستان جانے کے لئے بھاگی تھی [illegible] نے بڑی مشکل سے اسے روکا تھا۔

جب راشدہ باجی کے چہلم کے بعد کچھ [illegible] جج صاحب کی دوسری شادی کے لئے چند موز[وں] پیام لے کر آئیں تو ساجدہ نے نہایت تر[شی] اور غصے بھرے لہجے میں یہ کہتے ہوئے کوٹھی کا دروازہ بند کر دیا۔ "خبردار' جو آئندہ کوئی پیام لایا۔"

■■
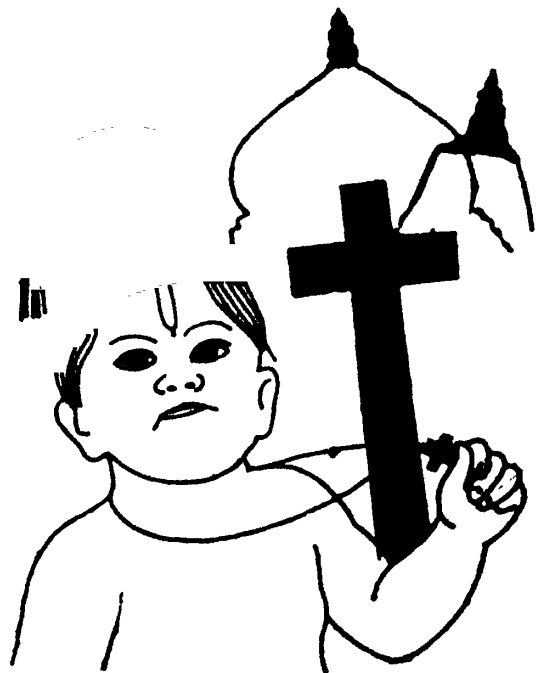
ضرورت ہے ایک خوشامدی کی

افسر بانو

میں کافی کی پیالی لئے ریستوران میں
ل ہونے ہی والی تھی کہ سامنے سے کالج کے
نے کا میرا ایک خوب رُو ہم جماعت اشرف
کھائی دیا۔ اشرف کو دیکھے ہوئے کم و بیش
رہ برس گزر چکے تھے۔ میں نے اُسے فوراً پہچا
لیکن وہ میرے قریب سے گزرا تو بالکل بیگانوں
رح۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے لپک کر اس
کہا۔ "اشرف، مجھے پہچانا نہیں؟ میں کشور
ں"

اشرف نے ایک لمحے کے لئے مجھے
نکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ پھر یک لخت اُس
ے ہونٹوں پر وہی دیرینہ مُسکراہٹ نمودار ہوئی.
ور پھر اپنی غلطی کی اس نے خوب صورتی سے
لافی کی کہ دل جیت کرلے گیا۔ کہنے لگا: "ارے
شور ــــ تم! واللہ! کتنی خوب صورت لگ
ہی ہو! کتنی کم عمر! بھلا میں تمہیں کیسے پہچان
سکتا تھا؟"

اس کے بعد اشرف نے دو چار باتیں کیں اور
رُخصت ہو گیا۔ لیکن مجھے ترستا چھوڑ گیا۔ جو کچھ
اس نے میری صورت اور عمر کے متعلق کہا تھا
بالکل سچ نہ سہی، ذرا سا جھوٹ ہی سہی، لیکن
ہائے کتنا پیارا جھُوٹ تھا! میرا جی چاہا کہ اِس
دِل رُبا جھوٹے کا دنیا کے آخری سرے تک پیچھا
کرتی رہوں۔ کافی کی میز پر بھی مجھے ایسا محسوس
ہوا جیسے میں ۳۵ سال کی نہیں، فقط پندرہ
سال کی کانونٹ کی طالبہ ہوں۔ خوشامد جھُوٹی
سہی، مگر کتنی دِل کش ہوتی ہے۔

شاید مجھے جھوٹی تعریف کی اِس لئے
بھی ضرورت ہے کہ میں نے چھوٹی عمر میں سچائی
کے ہاتھوں بڑے دردناک چرکے سہے تھے، ایک

انوکھا سماج

اڑیسہ اور آندھرا کی سرحد پر پہاڑوں کا سلسلہ ہے ۔ اسے ملکان گیری کہتے ہیں ۔ ان ـں میں ایک قبیلہ رہتا ہے ۔ یہ بوندا کہلاتے ہیں آبادی چار ہزار ہے ۔ بوندا کی شادی کی رسمیں ـندوستان سے بالکل الگ ہیں ، وہاں دلہن ـ دلہا سے زیادہ ہوتی ہے ۔ لڑکا ۱۲ یا ۱۴ برس ـجائے تو سمجھئے اس کی شادی ہو گئی ، اسے جلد ـی لڑکی ڈھونڈ لینی چاہئے ۔ اگر عمر زیادہ ہو گئی ـ شادی کی عمر نکل گئی ۔ لڑکا ۱۴ برس کا ہو تو اسے ـں کی لڑکی مل سکتی ہے ۔ اگر لڑکا سولہ سترہ برس ـلیا تو اسے کوئی ادھیڑ بیوہ ہی مل سکتی ہے جتنی ـاتی ہندوستان میں لڑکی کے باپ کو ہوتی ہے ، ـی فکر بوندا لڑکے کے ماں باپ کو ہوتی ہے ۔ پھر ـ کو جہیز بھی دینا پڑتا ہے ۔ لڑکی مفت نہیں ملتی ـاں دندناتی پھرتی ہیں اور لڑکے اُن کو حاصل ـنے کی فکر میں گھلے جاتے ہیں ۔

شادی کے بعد اگر دونوں میں سے کوئی ـوڑ دے تو اُسے تاوان دینا پڑتا ہے ۔ لڑکی علیحدہ ـے تو اُسے خاوند کو وہ روپیہ واپس کرنا پڑتا ہے ـے شادی کے وقت ملا تھا ۔ لڑکے کو مزید رقم دینی ـا ہے ۔ ایک لڑکے کا دل دوسرے کی بیوی پر ـئے تو وہ کچھ روپیہ دے کر اُسے حاصل کر سکتا

بوندا لڑکے لڑکیاں ۹ برس کی عمر میں ماں باپ ـر چھوڑ دیتے ہیں ۔ وہ ایک ہوسٹل جیسے مکان ـرہتے ہیں ۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے الگ ـ ہوسٹل ہیں ۔ اس سے لڑکے و لڑکیوں کو اپنی ـی گزارنے کا سلیقہ آجاتا ہے ۔ ان میں ـ اعتمادی پیدا ہوتی ہے ۔ ماں باپ کو بھی اولاد ـکر سے نجات مل جاتی ہے ۔ شادی کے بعد عورت

کے نام کے ساتھ مرد کے نام کا دم چھلا نہیں لگتا ۔ اس کا اپنا نام باقی رہتا ہے ۔ دراصل بوندا لڑکی ہی گھر کی مالک سمجھی جاتی ہے ۔ میاں چولہا چکی کرتے ہیں ۔ برسوں کی مشق سے وہ بہت اچھے باورچی بن گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ وہ بچے کی آیا کا کام بھی کرتے ہیں ۔ لڑکیاں جب زراعتی پیداوار فروخت کرنے کے لئے منڈی میں جاتی ہیں تو بچوں کی دیکھ بھال میاں کے ذمہ ہوتی ہے ۔

بوندا تاڑی کے شوقین ہوتے ہیں ۔ وہ دن بھر تاڑی کے نشے میں مست رہتے ہیں ۔ اگر گھر میں تاڑی ختم ہو جائے تو دوسرے کے درخت سے چرا لیتے ہیں ۔ بوندا میں جرائم کا سبب شراب خوری ہے ، تاڑی کے نشے میں آئے دن قتل ہوتے رہتے ہیں لیکن بیوہ کو اس بات کی فکر نہیں رہتی کہ اب کون اس سے شادی کرے گا ۔ وہ کسی ادھیڑ عمر سال دار آدمی سے شادی کر لیتی ہے ، جو عموماً گاؤں کا ساہوکار ہوتا ہے ۔ بوندا قبیلے کا سماج عورت کی محنت اور سماجی ذمہ داری کے سہارے قائم ہے ۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

مصر کی راجدھانی قاہرہ کی ایک عدالت میں ایک عورت نے اپنے خاوند کے خلاف طلاق کا مقدمہ دائر کر دیا ۔ اس نے خاوند پر الزام لگایا ہے کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے ۔ مصر میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنا قانوناً جرم ہے ۔ عدالت نے خاوند سے پوچھ گچھ کی تو دوسری بیوی کا ثبوت نہیں ملا ۔ بیوی نے بیان کیا کہ اُس کے خاوند نے کسی انسان سے شادی نہیں کی ، بلکہ ایک جنات عورت سے شادی کی ہے ۔ یہ جن (یا پری) اس کے خاوند پر عاشق ہو گئی ہے ۔ وہ روز اُس کے پاس آتی ہے ، دونوں کی شادی ہو گئی ہے ۔ عدالت حیران تھی کہ وہ کس طرح اس مقدمے کا فیصلہ کرے شادی کا کوئی ثبوت نہیں ۔ عدالت نے علما سے رائے طلب کی تو انہوں نے بتایا کہ قرآن میں انسان اور جن دونوں کا ذکر موجود ہے ، دونوں خدا کی مخلوق ہیں ۔ جن کا وجود ہے تو اس سے شادی بھی ہو سکتی ہے ۔ عدالت نے یہ توجیہ مان لی اور عورت کو طلاق مل گئی ۔

ممتا کی کرامت

ایلا بین پٹیل گجرات کے ایک گاؤں میں رہتی ہے ۔ اس کا خاوند نینا کمار پاس کے گاؤں میں مقیم ہے ۔ ایک روز ایلا بین گھر میں روٹی پکا رہی تھی کہ اُسے اپنے بچے کی دھڑکتی چیخیں سنائی دیں " ماں مجھے بچاؤ " ایلا توے پر روٹی چھوڑ کر باہر بھاگی ۔ باہر پہنچ کر اس نے جو نظارہ دیکھا اس سے اس کا خون منجمد ہو گیا ۔ ایک تیندوا اس کے تین سالہ بچے کو اٹھا کر لے جا رہا تھا ۔ ایلا خوف سے تھر تھر کانپنے لگی ۔ وہ ایک کمزور دل عورت ہے ، تیندوا

توڈور کی بات ہے، دو پڑوس کے کتوں سے بچی تھی
ہے، لیکن معصوم بچے کی چیخوں نے اُسے بہادر
بنادیا۔ وہ فوراً تیندوے کی طرف لپکی اور اُسے
دونوں ہاتھوں سے مارنے لگی۔ تیندوے نے بچے
کو ایک پنجے کے نیچے دبا رکھا تھا۔ دوسرے پیر کے
پنجے سے وہ اس کے بدن پر خراشیں ڈال رہا تھا
ایلا نے ایک ہاتھ سے اپنے بچے کی ٹانگیں پکڑلیں
اور دوسرے ہاتھ سے تیندوے کو مارنا شروع
کردیا۔ اُس کے مکوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی
طاقت آگئی کہ تیندوا پیچھے ہٹ گیا۔ اس دوران
ایلا پوری طاقت سے چلا رہی تھی۔ "بدمعاش!
چھوڑ مجھے بچے کو" وہ گھر میں اکیلی تھی، اس کا
خاوند گھر سے باہر تھا۔ تیندوے نے بچے کا ہاتھ
پکڑلیا اور ایلا نے بچے کی ٹانگ۔ اب بچہ دونوں
کے درمیان معلق تھا۔ جانور اور انسان میں رسہ کشی
شروع ہوگئی۔ خدا جانے یہ ایلا کی دعاؤں کا اثر
تھا یا اس کی چیخوں کا نتیجہ کہ تیندوے نے بچے کو چھوڑ
دیا۔ بچے کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ ایلا نے
بچے سے کہا کہ وہ فوراً بھاگ جائے۔ بچے نے اس
کے حکم کی تعمیل کی۔ اب ایلا کی باری تھی۔ اس نے
تیندوے کا شکار چھینا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ

شدید درد ہے۔ عورت اِس درد کو اکیلی ہی جھیلتی
ہے۔ پیدائش کے بعد بچے کو صاف ستھرے کپڑے
پہنا دیئے جاتے ہیں تو مرد اُسے گود میں اٹھاتا ہے
اور اُسے پیار کرتا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ بچے کو
پیدا کرنے میں عورت پر کیا گزرتی ہے۔ اب یہاں اُتر
کی بلیتھ منسٹر للیتا راؤ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ مرد
کو زچگی کے دوران بیوی کے پاس رہنا چاہیے تاکہ
وہ عورت کی تکلیف اور درد کا مشاہدہ کرے۔ مرد
کے لئے یہ ایک انوکھا تجربہ ہوگا۔ ممکن ہے اِس کا
نتیجہ بڑھتی ہوئی آبادی کے کنٹرول کی شکل میں
ظاہر ہو۔ مرد اپنی بیوی کو درد سے کراہتے ہوئے
دیکھے تو شاید اُسے بار بار اِس تکلیف میں مبتلا
نہ کرے۔

جب حاملہ عورتوں سے اس بارے میں
رائے لی گئی تو اُن کا ردِ عمل یکساں نہیں تھا۔ کچھ
عورتوں نے اِس بات پر رضامندی ظاہر کی، ان کا
خیال ہے کہ خاوند کی موجودگی اطمینان کا باعث
ہوگی۔ لیکن کچھ عورتوں نے اس کی شدید مخالفت
کی۔ یہ بات ان کے لئے شرمندگی کا باعث ہوگی کہ
میاں ان کو اس حالت میں دیکھیں۔ ایک عورت
نے اس مسئلہ سے بے پروائی ظاہر کی۔ اس نے کہا

ایک لڑکی۔ فرانس کی
اوساگو وادی میں سُرخ کپڑے
بھی پہن سکتی ہے، جب کہ
وہ وارث ہو۔ وہ لڑکیاں
جن کے بھائی یا بڑی
بہنیں ہوتی ہیں کالے
کپڑے پہنتی ہیں۔

"اِس تجربے سے بڑھتی ہوئی آبادی میں کمی نہ
ہوگی، ممکن ہے کہ مرد وقتی طور پر عورت کی تک
سے متاثر ہوجائے، لیکن وہ یہ بات جلد ہی
جائے گا اور آبادی میں اضافے کا تناسب
رہے گا۔"

پولیس مشاطہ کے رول میں

بنگلور کے قریب ایک گاؤں
کا پنڈال تیار ہوا۔ برات گاؤں میں پہنچی
والوں نے اس کا استقبال کیا۔ ابھی برا
ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دونو
میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ یہ جھگڑا اتنا
وہ لوگ والے برات واپس لے جانے

شاید یہ
بھی ضرورت ہے کہ میں

...سونا — ہر بیٹی ہے
...گھر جاتے تو ڈھول
...ایسا کیوں ہوتا ہے ؟
...ماں ہوتی ہے
...بیٹی کی ماں
...پاؤں نیچے جنت رکھ دی اوپر والے نے
...ماں ہے لیکن اُس کی دولت پُوت
...رشتے میں حدِ فاصل اتنی گہری
...کا نقصان — عزرو
...ڈھول تو ہو نہیں سکتا
...کیمیا گر کی بھول اس کی
...دین
...نہ دے یا دے کر لے لے — اُس کی مرضی
...شان
...مجال جو لے لے اس سے من چاہی اک باس
...دکھ بھی ترسے جس کو ماں بننے کی آس
...بھی تو بیٹی تھی نا!
...جگ میں ایک —
...کوکھ کہے مریم سے — تم پر ہی موقوف تھا بس ؟
...کا پُوت
...جنم دینے کی نہیں ہے
...تو پیدا ہی ماں ہوتی ہے
...حقیقت — اک سچائی — سورج جیسا رُوپ
...کیوں نہ — اُن جانا — اَن دیکھا سایہ مُندر

سمجھوتہ

اِس سے پہلے کہ محبت مجھے اندھا کر دے
میں نے دیکھا تو ہے
اِک خواب سُنہرا لیکن
میں نے سوچا کہ
بہن بھائی ہیں چھوٹے میرے
خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا
مِری قسمت مِری تقدیر نہیں ہو سکتا
اور ماں باپ بھی!
بوڑھے ہیں بہت ہی بوڑھے
کون ہے؟
اُن کا زمانے میں سوائے میرے
اِس سے پہلے کہ
زمانہ مجھے پاگل سمجھے
اور پھر
میں نے خیالات پہ قابو رکھا
کبھی دل پر کبھی جذبات پہ قابو رکھا
فیصلہ!
سوچ سمجھ کر یہ کیا ہے میں نے
کیوں نہ!
سمجھوتہ میں حالات سے اپنے کر لوں
اور پھر اُن کی دعاؤں سے میں جھولی بھر لوں

قاضی انصار

۵۰۰۰۰ روپے

بیس ہزار
روپے کے انعامات

پہلا انعام: بارہ ہزار روپے نقد

یا ایک ۵۱ سینٹی میٹر کا رنگین ٹی وی

اور تین ہزار روپے نقد

دوسرا انعام: آٹھ ہزار روپے

پہلا انعام بالکل درست حل پر : بارہ ہزار روپے، دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر : آٹھ ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر، شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعہ ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ اور ہر حل پر علیحدہ انعام حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں، ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرطیں شمع مِنی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ہفتہ ۱۱ ۔ مئی ۱۹۸۵ء آٹھ بجے رات تک
۱۳ ۔ مئی ۱۹۸۵ء کو دو بجے دوپہر تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کرلئے جائیں گے۔

شمع مِنی معمہ نمبر ۱۱۳

■	■	۵	۴	۳	۲	۱
■	■	ے	ے	ا	م	ڑ
	۶ تھ	■	ل	ن	ک	
ے	ٹ	۷	■	ا	ت	ا
ی	ا		۸	■	ے	ے
ـ	ن	ک		۹	■	ن
ں	و		ا		۱۰ غ	■

اشارے

اُوپر سے نیچے :

۱۔ ضرورت ہے کہ دنیا کے ممالک جنگ بازی کی بجائے امن بازی میں مصروف ہوں، دشمنی کی آگ کی بجائے دوستی ——

۲۔ آجکل تو نقلی ہیرے اصلی ہیروں سے زیادہ —— ہیں۔ یہی حال سیاست میں بھی

۳۔ بڑا بدقسمت ہے جو دن رات محنت ہی کرتا ہے اور پھل —— اس کے نصیب میں نہ ہو

۴۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میرے ساتھ اسی —— میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آچکا ہے

۵۔ تھ ——، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد

دائیں سے بائیں :

۶۔ —— لکھا، بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

۷۔ سُکھ کے دن میری قسمت میں نہیں ہیں۔ جب تک یہ اندھیرا —— گا میری آنکھیں بند ہو چکی ہوں گی

۸۔ ہر طرف غریبوں کی جھونپڑیاں —— جا رہی ہیں تاکہ امیروں کے محل وہاں تعمیر کئے جا سکیں

۹۔ موٹر کاروں کی دوڑ میں ڈرائیور کی نظریں عقاب کی اور اعصاب فولاد کے ہونے چاہئیں۔ ذرا بھی —— کا نتیجہ موت بھی ہو سکتا ہے

۱۰۔ جیب خالی ہے تو کیا ہوا! ہمارے —— میں تو زر و جواہر کی کمی نہیں

کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔

★ فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ۔

★ صرف دس اشارے

★ انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

★ صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوائیے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھیے۔

★ شمع مِنی معمہ نمبر ۱۱۳ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور جون ۱۹۸۵ء کے ماہ نامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

شمع ادبی معمے (شمع مِنی معمہ نمبر ۱۱۳) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی

شمع مِنی معمہ نمبر ۱۱۳ کا صحیح حل: بدھ ۱۵ ۔ مئی ۱۹۸۵ء کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہ نامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات: شمع جون ۱۹۸۵ء میں بھی شائع کی جائیں گی

ہر طرز کے بالوں کے لئے زلفی

بال آپ چاہے جس طرح سنواریں مگر ان میں ڈالئے زلفی ہیرٹانک ہی کیوں کہ یہ دوسرے تیلوں سے دس گنا بہتر ہے، یہ بالوں کی جڑوں کے نیچے تک پہنچ جاتا ہے اور بالوں کی تمام بیماریوں کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیتا ہے۔ زلفی تیل ہی نہیں بالوں کی غذا بھی ہے۔ سر دھونے کے لئے "زلفی بالوں کا کالا صابن" یا زلفی پاؤڈر استعمال کیجئے۔ جو بالوں کو صاف کرتا، ملائم بناتا اور ان کو تیزی سے بڑھاتا ہے۔ قیمت زلفی ہیرٹانک: پندرہ روپے

قیمت زلفی بالوں کا کالا صابن: آٹھ روپے

قیمت زلفی پاؤڈر: آٹھ روپے

شرع (یونانی، انٹی آیورویدک) لیباریٹریز لال کنواں، دہلی

افتتاحیہ

"بانو" کا یہ شمارہ آپ کو نئے سال کے پہلے مہینے میں ملے گا۔ یہ گزرے ہوئے بارہ ماہ کے دوران اپنی کارگزاری کا جائزہ لینے کا وقت ہوتا ہے اور اگلے برس میں اپنی خامیوں کو دُور کرنے کا عہد کرنے کا موقع ہوتا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ وہ بہتر سے بہترین بن سکے۔ کامیابیاں اس کے قدم چومیں اور اس کا نام دنیا بھر میں تعریف کے ساتھ مشہور ہو۔ یہ سب حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا اور اپنے سامنے کسی ایسی شخصیت کی مثال رکھنا ہوگی جس کی جھلک ہم اپنے آپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

تاریخ میں ایسی مکمل اور مبارک شخصیت ایک ہی ہے، جن کے نقشِ قدم پر چل کر ہم دین اور دنیا دونوں سنوار سکتے ہیں، اور وہ ہیں سرکارِ دو عالم، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام صفات سے متصف فرمانے کے بعد رحمت اللعالمین، یعنی تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔

گاندھی جی نے اپنی آپ بیتی میں لکھا تھا کہ میں ہمیشہ کالا کمبل اوڑھتا ہوں تاکہ رسول اللہؐ کو خراجِ عقیدت پیش کرتا رہوں، جن کا اوڑھنا کالی کملی تھا۔ نپولین نے بھی اپنی سوانح حیات میں حضورؐ کی تعریف و توصیف کے بعد اپنی اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ میں چاہتا ہوں ایک دن تمام دنیا میں ایسی حکومت قائم کروں جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر کاربند ہے (دنیا کے بیشتر ممالک کے موجودہ آئین آج برادری، برابری اور انصاف کے جن اصولوں پر قائم ہیں وہ اصول چودہ سو سال پہلے قرآن نے ہمیں سکھائے تھے۔ یہی اصول اسپین میں مسلمانوں کی قائم کردہ یونی ورسٹیوں اور علم گاہوں کے ذریعے یورپ کے دانش مندوں تک پہنچے اور دنیا بھر میں پھیل گئے)

حضورؐ کا وسیع اخلاق اور نیک کردار تمام دنیا کے لئے روشن مثال ہے تو حق تعالیٰ نے آپؐ کی سیرتِ مبارکہ پر عمل پیرا ہونے والوں کو جنت کی بشارت دی ہے۔ آپؐ نے کبھی بدلہ نہیں لیا، بلکہ تکلیف پہنچانے والوں کے لئے دُعا فرمائی۔ آپؐ نے جو چیز اپنے لئے پسند کی وہی دوسروں کے لئے پسند فرمائی۔ آپؐ نے کسی کا دل دُکھانے کو بدترین گناہ قرار دیا، اور وسیع الاخلاق ہونے کو دنیا کی سب سے بڑی عبادت قرار دیا۔

آنے والے دنوں، مہینوں اور برسوں میں ہم اپنے دل خلقِ خدا کے لئے محبت ہی محبت سے بھرلیں۔ بغض، حسد اور کینہ کو دل سے نکال پھینکیں اور محبوبِ خدا کی سیرت کو اپنے عمل کے لئے مثال بنالیں تو ماضی کی تاریکیوں کو پیچھے چھوڑ کر مستقبل کی راہوں کو نورِ خداوندی سے جگمگا سکتے ہیں۔
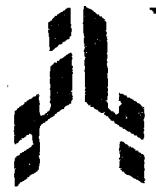
سعدیہ دہلوی

بانو
فروری ۱۹۸۵

نگراں: یوسف دہلوی
مدیرۂ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا ازتیسواں سال، ۲۵۶واں شمارہ
اس شمارے کی قیمت: تین روپے
سالانہ قیمت: چھتیس روپے

مقامِ اشاعت و دفتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس: 3161601 SHMA IN
ٹیلی فون: 272066, 272067, 272068
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس
مالکان: شمع میگزین
طابع و ناشر: یونس دہلوی

مہتمم: بمبئی آفسیٹ پریس، دہلی
مطبوعہ: دہلی پرنٹنگ پریس، دہلی

نعت

اُن کے کوچے سے مِرا روز گزر ہو جائے
عمر تھوڑی ہو سلیقے سے بسر ہو جائے

مِری فریاد میں اتنا تو اثر ہو جائے
آنکھ سے اشک جو ٹپکے تو گہُر ہو جائے

اُن کی رحمت ہو تو طوفان بھی ہو ساحل بکنار
وہ مخالف ہوں تو ہر موج بھنور ہو جائے

ملک الموت! میں حاضر ہوں مگر اتنا کرم
اور اِک بار مدینے کا سفر ہو جائے

جالیوں کا رُخِ روشن سے جو اُٹھ جائے نقاب
شبِ ظلمات بھی تابندہ سحر ہو جائے

تیری عظمت کی جھلک دیکھ کے معراج کی رات
کب سے جبریل کی خواہش ہے بشر ہو جائے

میں غلامِ شہ والا ہوں مجھے کیا غم ہے
دشمنوں کو مِرے بس اتنی خبر ہو جائے

درِ عالی پہ کئی دن سے پڑا ہے کوثر
اب تو آقا کوئی رحمت کی نظر ہو جائے

دربارِ رسالت میں رخصت کے وقت
بے ساختہ یہ اشعار زبان پہ جاری ہو گئے

در پیش ہے پھر گنبدِ خضرا سے جدائی
اے سرورِ عالم! تری رحمت کی دہائی

صد شکر ہوں جاروب کشِ روضۂ اقدس
شاہی سے سوا ہے مجھے اِس در کی گدائی

مجھ سا کوئی مجرم تری اُمت میں نہیں ہے
تو رحمتِ کونین ہے شاہد ہے خدائی

میں شکل نہ دیکھوں گا کبھی بادِ صبا کی
پیغام جو ہر سال یہ طیبہ سے نہ لائی

دربار میں رخصت کو گنہگار کھڑا ہے
لِلّٰہ نظر اے کہ کریمانہ ادائی

کوثر نیازی

narim

سردیوں کی رات تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ رات ایسی قیامت نازل کرنے والی ہے۔ بھوپال میں لوگ بے فکری کی نیند سو رہے تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ مطمئن تھا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ کچھ ہی دیر میں اس شہر میں کیا ہونے والا ہے۔ اسٹیشن پر لوگ صبح کی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ یکایک یونین کاربائیڈ کی فیکٹری کے ٹینک سے جہاں بڑی مقدار میں گیس موجود تھی، گیس تیز دباؤ کے ساتھ نکلنی شروع ہو گئی۔ یہ اخراج اتنا اچانک ہوا کہ فیکٹری میں کام کرنے والے بھی کچھ نہ کر سکے۔

افسر بانو

وہ بھاگے ہوئے فیکٹری کے انچارج کے پاس گئے۔ جب تک فیکٹری کے سپروائزر کو اس حادثہ کا پتہ چلا، اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی، گیس کافی مقدار میں نکل چکی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ سفید زہریلی گیس تیزی سے ٹینک سے نکلتی رہی اور لوگوں کی زندگیوں کا فیصلہ کرتی رہی۔

ایک صاحب ستری سا یا کا کہنا ہے
کہ اچانک سوتے سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ
سٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے
تھے۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کا دم گھٹ رہا
ہے سینے میں جلن اور گھٹن ہو رہی ہے۔
سانس لینے میں دشواری پیش آرہی ہے۔
پورے جسم میں آگ سی لگ رہی ہے۔ اپنے چاروں
طرف چادر لپیٹ کر ناک اور منہ کو تولیے سے
ڈھانک کر وہ اسٹیشن کی طرف لپکے۔ وہاں انہوں
نے کافی لوگوں کو مرا ہوا پایا۔ بہت سے لوگ
موت اور زندگی کی کشمکش میں تڑپ رہے تھے۔
پہلے تو شاید وہ یہ سمجھے کہ کسی ٹرین کا حادثہ ہو گیا
ہے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک خاص قسم کا
سفید سفید دھواں پوری فضا میں پھیلا ہوا ہے
اور ایک شدید قسم کی بدبو رچی ہوئی ہے۔ لوگ
گھبرائے ہوئے اُبکائیاں لے رہے تھے
اور قے کر رہے تھے۔ جب وہ واپس ہوٹل
آئے تو وہاں بھی کچھ لوگ اندھے ہو چکے تھے۔
بڑی تعداد میں لوگ اسپتال جا رہے تھے۔
اب ان کو ساری تفصیل کا علم ہوا اور وہ گھبرا کر
اپنی بیوی کو آخری خط لکھنے بیٹھ گئے۔ انجام کار
سا یا زندہ رہا اور ہزاروں لوگ اس موت کے
شہر میں ختم ہو گئے اور ہر وہ شخص جو زندہ تھا،
اس کے سامنے موت ناچ رہی تھی۔

ایک ہی خوف ناک رات میں کیسی
ت گزر گئی۔ لوگ رات کو چین سے سوئے
.. وہ نہیں جانتے تھے کہ صبح کے سنہری
دں کو آنکھوں میں بسائے ہوئے وہ ہمیشہ
یئے دنیا سے چلے جائیں گے۔ صبح تک بھوپال
موت کے سناٹے کا شہر نظر آرہا تھا۔
رف سڑکوں، میدانوں جنگلوں میں جانوروں
انسانوں کی لاشیں ہی لاشیں نظر آرہی تھیں۔

پورے ہندوستان کے اخباری نمائندوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی، اخباروں کی سرخیاں روزانہ مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کر رہی تھیں۔ اسپتالوں میں جگہ نہیں رہی تھی نئے کیمپ بنوائے گئے تھے۔ مگر بے سود۔ ہزاروں کی تعداد میں بچے یتیم ہو گئے، عورتیں بیوہ ہو گئیں، لوگ اندھے ہو گئے، معذور ہو گئے

غرض ہر طرف موت اور دہشت کا بھیانک سایہ سب کی طرف دوڑ رہا تھا اور تیزی سے لوگوں کو دبوچ رہا تھا۔

کچھ خدا ترس لوگوں نے اپنے گھروں کے باہر درزی بٹھا دئے تھے، تاکہ وہ لاشوں کے کفن تیار کر سکیں۔ اور مرنے والوں کی آخری رسوم ادا کی جا سکیں۔ لیکن لاشیں اتنی زیادہ تھیں کہ سب کی آخری رسوم کا مناسب ڈھنگ سے

ادا کرنا ممکن نہ رہا۔ سیکڑوں لاشوں کے ڈھیر پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگائی جا رہی تھی۔ دنیا کی تاریخ میں انسان کا نازل کیا ہوا یہ سب سے خوفناک حادثہ تھا جس نے پچھلے تمام حادثوں کو بھلا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ سرکار لوگوں کو نقصان کا معاوضہ دے رہی ہے، اس فیکٹری کو وہاں سے ہٹا رہی ہے، اس کے لیے بڑے بڑے سائنس داں باہر سے بلا رہی ہے۔ لیکن کیا اس معاوضہ سے لوگوں کو کوئی فائدہ، کوئی تسلی ہو سکتی ہے؟ کیا ان کی زندگی اب سنبھل سکتی ہے؟ کیا ان کی آنکھیں واپس آ سکتی ہیں؟ جو بچے یتیم ہو گئے ان کا کیا ہوگا؟ کیا ان کے ماں باپ انھیں مل سکتے ہیں؟ وہ عورتیں جو بیوہ ہو گئیں، وہ خاندان جن کے سارے افراد اندھے ہو گئے، وہ سب اب کیا کریں گے؟ اس وقت اس تھوڑی سی مدد سے ان کو کیا سہارا مل سکتا ہے؟ ان کا تو خدا ہی حافظ ہے۔

بہت جتن کر کے ہندوستانی سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے بچی ہوئی زہریلی گیس کو بے اثر کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب ایسا ہلاکت خیز حادثہ نہ ہوگا لیکن جو المیہ ہو چکا ہے اس کی تلافی کیسے ہوگی؟

نتیجہ ذہنی ورزش نمبر ا

بانو جنوری ۱۹۸۵ کے شمارے میں "ذہنی ورزش نمبر" کے عنوان سے ایک انعامی مقابلہ شائع ہوا تھا جس میں دس سوالات کے جوابات پوچھے گئے تھے۔ اس انعامی مقابلے میں شرکت تو بہت سی بانو بہنوں اور بھائیوں نے کی، لیکن سب سوالوں کے صحیح جواب ہم کو صرف مس پروین، نئی دہلی نے بھیجے ہیں ان کو انعام میں ایک سوان پریشر کوکر بھیجا جا رہا ہے۔

صحیح جواب یہ ہیں:

۱۔ ۲۴۔ جنوری ۱۹۶۶
۲۔ وجے لکشمی پنڈت
۳۔ ۶۲۲
۴۔ محمد حسین جاہ
۵۔ علامہ راشد الخیری
۶۔ عالم آرا
۷۔ امیر خسروؔ
۸۔ میڈم کیوری
۹۔ رضیہ سلطان
۱۰۔ ۱۹۵۲

ہاشم
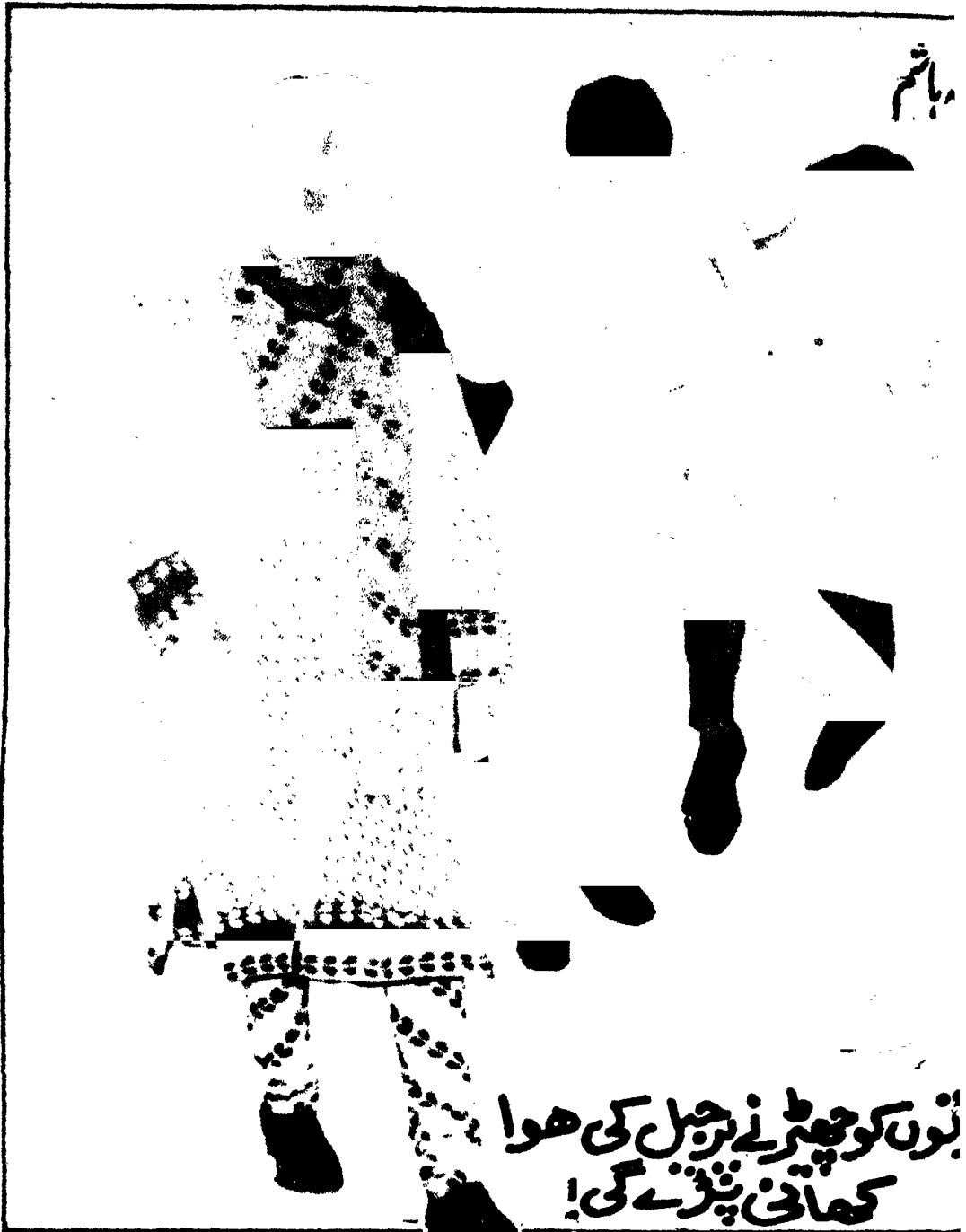
...نوں کو چھیڑنے پر جیل کی ہوا کھانی پڑے گی!

ج سے پچاس سال پہلے عورت
بھار ہی نکلتی تھی۔ اگر کبھی شادی
ے تو ڈولی، پالکی اور فینس موجود
بقے میں عورت کا گھر سے باہر نکلنا
معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ہاں، وہ گھر کے آنگن سے
آسمان کا نظارہ کرسکتی تھی۔

وہ بھی کیا دن تھے۔ عورت کتنی محفوظ اور
مطمئن تھی۔ نہ کھانے کمانے کی فکر، نہ تعلیم کا
جنجال، نہ ملازمت کا بکھیڑا۔ عورت کی دنیا
شوہر اور بچوں کے گرد گھومتی تھی۔ اس کا سنیما

جانا بھی بُرا سمجھا جاتا تھا۔ ان ۵۰ برسوں میں بہت کچھ بدل گیا۔ پردے کا رواج ختم ہو گیا۔ اسکول، کالجوں میں لڑکیوں کا تانتا بندھ گیا۔ ڈولی اور پالکی عجائب خانہ میں رکھنے کی شے ہو گئی عورت نے تعلیم حاصل کی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ قابلیت اور ذہانت میں مرد سے کسی طرح کم نہیں۔ مرد نے اس کے لئے ٹیچر، نرس اور لیڈی ڈاکٹر کے پیشے مخصوص کر دیئے تھے، لیکن عورت نے اس حصار کو بھی توڑ دیا۔ وہ وکالت، صحافت اور سیاست میں بھی پَر تولنے لگی۔ نیا زمانہ کیا آیا عورت کو پر لگ گئے۔ وہ ہر میدان میں مرد کی برابری کا دعویٰ کرنے لگی۔ لیکن ایک دوڑ میں وہ ابھی مرد سے پیچھے ہے۔ اور وہ ہے غنڈہ گردی اور بازار میں چلتی ہوئی عورت کو چھیڑنے کی وبا۔

یہ بیماری تقریباً ہر ترقی یافتہ ملک میں موجود ہے۔ لندن اور نیویارک کی زمین دوز ریلوں میں بھیڑ بھاڑ کے وقت عورت کو یہ مصیبت جھیلنی پڑتی ہے۔ بھیڑ بھاڑ میں لوگوں کو ہاتھ اور کہنیاں چلانے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اگر کوئی عورت احتجاج کرے تو اس بے چاری کی کوئی نہیں سُنتا، بلکہ سب لوگ مُسکرانے لگتے ہیں۔ ایشیائی ملکوں میں عورت اب بھی ایک اچوبہ سمجھی جاتی ہے۔ لوگ اس طرح اسے گھُور کر دیکھتے ہیں جیسے انہوں نے عورت کو کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ عورت اکیلی ہو تو اس پر آوازیں کسنا، اس کا پیچھا کرنا ایک عام بات ہے۔ اب عورت ان باتوں سے ڈر کر گھر میں تو بیٹھنے سے رہی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ گھر سے اکیلی نکلتے ہوئے ڈرتی ہے۔ شام کے بعد اکیلے نکلنا اس کے لئے اور بھی دُشوار ہو جاتا ہے

سب سے زیادہ مصیبت بسوں میں سفر کرنے والی لڑکیوں کو پیش آتی ہے۔ وہ بھیڑ بھاڑ میں مَردوں کی دست درازیوں کا شکار ہو جاتی ہیں لیکن وہ کیا کریں؟ انہیں اسکول، کالج یا دفتر پہنچنا ہی ہے۔ اس لئے وہ خاموشی سے سب کچھ سہہ لیتی ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک علاج تو یہ ہے کہ عورتیں بھی اس میدان میں کود جائیں اور مَردوں کو چھیڑنا شروع کر دیں۔ آج سے ۵۰ سال پہلے سہراب مودی نے ایک فلم بنائی تھی، جس کا نام تھا "الٹی گنگا"۔ اس میں یہی کچھ دکھایا گیا تھا۔ مگر جیسا کہ اس فلم کے نام سے ظاہر ہے یہ اُلٹی گنگا بہنے والی نہیں تھی۔ اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے ہولی کے دنوں میں عورتوں کو چھیڑنے کا سلسلہ کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے۔ لڑکے بسوں میں گھُس جاتے ہیں اور پانی کے بھرے ہوئے غبارے لڑکیوں کے لباس پر پھینکتے ہیں۔ کچھ من چلے تو لڑکیوں کے چہروں پر گلال ملنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ہولی کا عذر اچھا ہے۔ چلو، اسی بہانے رُخِ یار کو چھونے کا موقع مل جاتا ہے۔

یوں تو یہ وبا ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں موجود ہے، لیکن دہلی نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہاں ٹریفک کا انتظام بمبئی اور مدراس کے مقابلے میں ناقص ہے۔

آج سے تین سال پہلے دلّی یونیورسٹی کے لڑکے ہولی کے موقع پر سینٹ اسٹیفنز کالج اور ہندو کالج کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے لڑکیوں کو چھیڑنا شروع کیا۔ کالج کے کچھ شریف لڑکوں نے ان کی مزاحمت کی تو انہوں نے مارپیٹ شروع کر دی۔ کالج کے اساتذہ اور نگراں مُونہہ دیکھتے رہ گئے۔ لڑکیاں خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں اور کالج کے ذمّہ دار افسر بے بس سے ان کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس ہنگامے کے بعد بھی کالج کے اربابِ اختیار یا پولیس نے ان غنڈوں کا سُراغ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجے میں غنڈوں کی جیت ہوئی۔ لڑکیاں اب ہولی کے تیوہار سے اس قدر خوف زدہ رہتی ہیں کہ وہ ہولی کے دنوں میں کالج کے پاس بھی نہیں پھٹکتیں۔ پولیس نے آنسو پونچھنے کے لئے اسپیشل فورسس تعینات کی ہے، لیکن لڑکیاں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتیں۔ ہولی کے دنوں میں عورتوں کے کالج پر قبرستان کا گمان ہوتا ہے

دلّی کی عورتیں اس صورتِ حال سے ہار ماننے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے حکومت سے مانگ کی کہ ان کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ غنڈوں سے نمٹنے کے لئے قانون بنایا جائے۔ اس کے لئے جلوس نکالے گئے، حتّٰی کہ دلّی کے چیف کونسلر جگ پرویش چندر کا گھیراؤ کیا گیا۔ بالآخر یہ کوشش رنگ لائی۔ کئی مہینوں کی محنت کے بعد قانون کا مسودہ تیار ہو گیا۔ اس قانون کا نام ہے: "دلّی میں لڑکیوں کو چھیڑنے کی ممانعت کا ایکٹ"۔ یہ بل دلّی کونسل سے پاس ہو گیا ہے۔ عنقریب یہ پارلیمنٹ سے بھی پاس ہو جائے گا۔ اسی اثنا میں ایک ایسا ہی بل بمبئی کی اسمبلی میں بھی پیش ہو چکا ہے۔

اس بل کے تحت لڑکیوں کو چھیڑنے والے مجرم تصوّر کئے جائیں گے۔ ان کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ ایک مجسٹریٹ سرسری سماعت

اہیں سزا دے سکتا ہے۔ لڑکیوں
رنے کی فرد جرم کیسے لگے گی؟ جب ایک
ما الفاظ اور اشاروں سے کوئی نازیبا
ہے گا۔ کوئی ایسا دلیا خط لکھے گا۔ کوئی
اگیت گائے گا۔ بازار میں ایسی کوئی حرکت
ے گا جس سے لڑکی کی عزت پر حرف آئے۔
صورت میں پولیس اسے گرفتار کر سکتی
جرم ثابت ہونے پر اسے کم از کم ۲ دن کی
سکتی ہے۔ اگر دوسری بار جرم سرزد ہو تو
ن کی قید ہو سکتی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے
ں قانون سے لڑکیوں کے چھیڑ خانی کا
لسلہ ختم ہو جائے گا۔

اب تک جو قانون اس ضمن میں بنائے
گئے، وہ سب بے کار ثابت ہوئے۔
قانون دفعہ ۳۵۴ کے تحت نافذ ہے اس
لڑکیوں کے وقار کو نقصان پہنچانے والے
راست میں لیا جا سکتا ہے۔ دفعہ ۵۰۹
تحت لڑکی کے ساتھ زبردستی کرنے والے
ایک سال قید کی سزا ہو سکتی ہے۔ دلی
پولیس نے اب تک جن غنڈوں کو گرفتار
یا ہے، ان پر بازار میں دنگا فساد کرنے اور
ن کو خطرہ میں ڈالنے کا جرم ہی عائد کیا گیا ہے۔
، باتوں کو عدالت میں ثابت کرنے کے لئے
ے مقدمے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں عدالت میں
اتے ہوئے گھبراتی ہیں۔ اس سے مزید بدنامی
ا خطرہ ہوتا ہے۔ وکیلوں کی جرح کے سامنے
نہیں ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں۔ پولیس کو لڑکی
کی گواہی نہ ملے تو مقدمہ کیسے چلے؟ اس لئے
پولیس چھیڑ خانی کے الزام کی بجائے فتنہ فساد
کھڑا کرنے کا الزام لگاتی ہے، جس سے ملزم
کو قرار واقعی سزا نہیں ملتی۔ اصل جرم ثابت
ہونے پر ایک غنڈے کو سال بھر کی سزا
ہو سکتی ہے، لیکن دنگا فساد کی فرد جرم میں
اس پر معمولی جرمانہ ہی ہوتا ہے۔ جرمانہ کی رقم دس
روپے سے ۵۰ روپے تک ہوتی ہے۔ ملزم
یہ معمولی جرمانہ ادا کر دیتا ہے اور اپنے گھر کی راہ لیتا
ہے۔

ان مقدموں میں ناکامی کی وجہ یہ بھی
ہے کہ لڑکیاں چھیڑ خانی کی تفصیل بتلاتے ہوئے
ہچکچاتی ہیں۔ صفائی کا وکیل جان بوجھ کر ان سے
ملزم کی حرکتوں کی تفصیل پوچھتا ہے۔ لڑکیاں
جتنی گھبراتی ہیں، سوالات کی بوچھار اتنی ہی تیز
ہوتی ہے۔ عدالت کے کمرے میں لوگ مزہ
لینے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ وکیل کے
سوالات کا جواب دینا لڑکی کے لئے توہین آمیز
ہے، لیکن مقدمے کی کامیابی کے لئے یہ بات
ضروری ہے۔ نتیجے میں ملزم جیت جاتا ہے۔
اور لڑکی اپنا سا منہ لے کر گھر واپس آجاتی ہے۔

نئے قانون میں لمبے مقدمے کی گنجائش
نہیں۔ لڑکی کا بیان کافی ہے۔ اسے بار بار عدالت
میں حاضر ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔
حکام کا خیال ہے کہ اس قانون سے لڑکیوں
کو چھیڑنے کے واقعات میں کمی ہو جائے گی
لیکن عورتوں کے ادارے اس قانون سے
مطمئن نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قانون بنانے
سے کچھ نہیں ہوتا۔ جہیز کے خلاف قانون پاس
ہوا، لیکن اس سے کیا فائدہ ہوا۔ ضرورت اس
بات کی ہے کہ مردوں کی ذہنیت بدل جائے
ایک لڑکا بچپن سے ہی اپنی ماں کو باپ کی
گالیاں کھاتے سنتا ہے اور اسے پٹتے ہوئے
دیکھتا ہے تو اسے اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے
اگر اسے ۲ دن کی قید ہو بھی گئی تو وہ آٹھویں دن
جیل سے رہا ہو کر پھر اپنی من مانی کرے گا۔ اس
بار اس میں سزا کے خلاف غصہ بھی شامل
ہوگا۔ اگر قانون میں دم ہوتا تو گزشتہ قانون ہی
کافی تھے جس میں ایک سال قید کی سزا
ہو سکتی ہے لیکن اس قانون پر عمل نہیں کیا گیا
جب پچھلے قانون کامیاب نہیں ہوئے تو آئندہ
بننے والے قانون کون سا تیر مار لیں گے؟

اس قانون پر ایک اور اعتراض بھی کیا
جاتا ہے۔ پولیس کو اس کے تحت کھلی چھٹی
ہو گی کہ وہ جس کو چاہے اور جب چاہے لڑکیوں
کو چھیڑنے کے الزام میں پکڑ لے۔ اس بات
کی کیا گارنٹی ہے کہ پولیس بے گناہ لوگوں
کو اس جرم میں نہیں پکڑے گی؟ ذاتی دشمنی
کی بنا پر کوئی شخص بھی کسی پر الزام لگا سکتا
ہے کہ اس نے میری بیٹی یا بہن کو چھیڑا ہے

ان سب باتوں کے باوجود کچھ عورتوں
کا خیال ہے کہ اس قانون سے عورتوں کو فائدہ
ہوگا۔ غنیمت ہے کہ پارلیمنٹ نے راہ چلتی
عورتوں کے لئے علیحدہ قانون بنایا ہے حکام
نے اس معاملے میں ذمہ داری کا ثبوت دیا۔
گو، ۲ دن کی قید کم ہے، لیکن اس کی وجہ سے
غنڈے لڑکیوں کو چھیڑنے سے پہلے سوچنے
پر مجبور ہو جائیں گے۔ سرسری سماعت کا یہ
فائدہ ہوگا کہ جس لڑکی کو راہ چلتے چھیڑا جائے
وہ سیدھی پولیس اسٹیشن جا سکتی ہے
صرف اس کے بیان پر پولیس حرکت میں
آجائے گی مجسٹریٹ ملزم کے انکار کو
اہمیت نہیں دے گا اور اسے ۲ دن کے لئے
جیل بھیج دے گا۔ □

...ہار آپ کے آنگن میں !

بانو بہنوں کے اصرار پر کئی سال بعد بانو کا سال نامہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ
...کا اپریل ۱۹۸۵ کا شمارہ ہوگا، جو مارچ ۱۹۸۵ میں شائع ہوگا۔
...پسپی اور افادیت کے اس انمول خزانے کو جمع کرنے میں ادب اور صحافت کے
...گنت جگمگاتے ستاروں کی محنت اور لگن شریک رہی ہے۔ خواجہ احمد عباس،
...مت چغتائی، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، کیفی اعظمی، قتیل شفائی، رام لال، کوثر چاند پوری،
...رو رجہاں، مسعودہ حیات اور شعر و ادب کے آسمان کے دوسرے چاند سورج اس محفل
...جلوہ گر ہیں۔ نشاطِ مطالعہ فراہم کرنے کے علاوہ سائنس، سیاست، واقعات حاضرہ
...دوسرے شعبوں سے متعلق چیدہ چیدہ مضامین کے ذریعہ سال نامہ آپ کو زیادہ
...ر، زیادہ باشعور بنائے گا۔
...سال نامہ بانو ہر صورت میں حاصل کیجئے۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرا لیجئے۔

خوب صورتی اور افادیت کا یہ ضخیم مرقع، جس کی قیمت دس روپے ہوگی، سالانہ
...یداروں کو مفت پیش کیا جائے گا۔ سال نامہ رجسٹری سے منگوانے کے لئے
...انہ خریدار خریداری نمبر کے حوالے کے ساتھ ۳ روپے منی آرڈر کے ذریعہ جلد بھیج
... نئے خریدار بھی یہ شان دار تحفہ مفت حاصل کرنے کے لئے اڑتالیس روپے
...انہ قیمت ارسال فرمائیں۔ ان کے لئے رجسٹری کا خرچ ہم برداشت کریں گے۔

ماہ نامہ بانو،
آصف علی روڈ،
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ایک [illegible]

(فیض احمد فیض کی موت پر)

اے اُردو تیرا وہ مسکن
بخشی میر و غالب نے جس کو جِلا
نہیں دوسرا جس کا ثانی ملا
در و دیوار بھی روشن ہوئے
ظفر و مومن نے جب رنگ بھرے
فیض و اقبال نے کیا مستحکم
اور تو صدیوں تک رہی

خود پہ نازاں
پُرغرور
پُروقار
اور پُرنور
ساحر و فراق اور کیسے کیسے
لوگ آتے رہے
رونقیں بڑھتی رہیں
حُسن بے مثال بنا

اور پھر
لہر قضا کی جو اُٹھی
تیرے ہم نفس
میرے ہم سفر
ساتھ تیرا چھوڑ گئے
بارہا تو نے ہاری تھی ہمت
مگر کچھ ہاتھوں نے تجھ کو سہارا دیا
طور جینے کا نیا تجھ کو بتایا
اور تو بھی اُٹھی تھی
آج پھر ٹھیس لگی ہے شکستہ دل کو
آج پھر ہوتی ہیں اشکبار آنکھیں
مگر تجھے ڈگمگانا نہیں ہے
کر لے یکجا تمام حوصلوں کو
کہ آج تیرا ستون ایک اور گرا

شہناز ملک

فیض
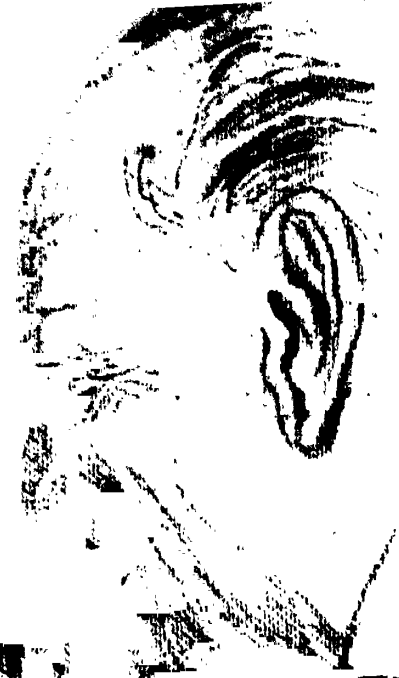
لومبر ۱۹۸۴ کو اُردو ایک اور فسوں انگیز آواز سے محروم ہو گئی۔
باد کی سب سے معتبر، سب سے انقلابی آواز تھی۔ اُردو کے اس
نے سے اُردو شعر و ادب کی دنیا دہل گئی ــــ فیض احمد فیض
سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ان کا زمانۂ تعلیم لاہور میں
بتدا سے ہی ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن رہے۔ برِصغیر کی
بعد فیض شعر و ادب کے میدان میں سرگرم عمل رہنے کے علاوہ پاکستان
ت اور صحافت سے بھی وابستہ رہے۔

ادی کے بعد فیض پاکستان کے اخبارات، پاکستان ٹائمز، امروز،
ار کے چیف ایڈیٹر کی خدمات انجام دینے لگے۔ یہ زمانہ ساری دنیا
ر بنیادی سیاسی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ فیض نے اپنے اخباروں میں بڑی
ے ان گھناؤنی ریشہ دوانیوں کے پردے کو بڑی بے باکی سے چاک کیا
بڑی طاقتوں نے ساری دنیا میں پھیلا رکھا تھا۔ فیض نے کمیونسٹ
ظیم میں بھی کام کیا۔

گزشتہ بیس سال کے عرصہ میں فیض کی شاعری نے بین الاقوامی شہرت
لی تھی۔ اُردو کے علاوہ دنیا کی بہت سی دوسری اہم زبانوں میں ان کی
کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ گزشتہ جولائی میں لندن یونیورسٹی اور فیض
اڈمی نے مل کر ان کی شاعری پر ایک بین الاقوامی مذاکرہ کا اہتمام کیا۔
ٹ دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ لینن انعام' انھیں پہلے ہی مل چکا تھا۔
فیض آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی شہرت، ان کی محبوبیت
ہے۔ ان کا نام اور ان کا کلام سرحدوں، قوموں اور عقیدوں کی ساری
بیار کر کے ہمہ گیر مقبولیت کی زندہ علامت بن چکا ہے۔

شائع ہو گئی ہے
شمع
پاکٹ جنتری
۱۹۸۴ کی
شمع پاکٹ جنتری میں
نومبر ۸۴ کے لئے جو پیش گوئی کی گئی تھی، بدقسمتی
سے وہ ساڑھے نو گھنٹے پہلے ہی سچ ہو گئی!
ستمبر
اکتوبر
نومبر
دسمبر
۹۷
مفید و کارآمد مضامین، چنیدہ اشعار، آپ کے محبوب فلمی ستاروں کے نام، پتے اور تاریخ پیدائش۔
آسانی سے تاریخیں پڑھی جاسکیں اس کے لئے ایک صفحہ پر صرف پندرہ دن دئے گئے ہیں. کون سے دن سعد ہیں اور کون سے نحس، راشیوں کے نیک و بد اثرات، اسلامی عملیات اور بہت سے دیگر معلوماتی مضامین کے علاوہ وہ تمام دلچسپیاں جن کے باعث شمع پاکٹ جنتری کی حیثیت منفرد ہے۔
ایک جنتری منگانے کے لئے تین روپے کا منی آرڈر بھیجئے اور منی آرڈر رسید اپنے خط کے ہمراہ ہمیں بھیج دیں۔
(ایجنٹ حضرات کیلئے: ایک سو یا اس سے زائد منگانے پر / 195 روپے سیکڑہ۔ پانچ سو یا اس سے زائد منگانے پر -/ 185 روپے سیکڑہ۔ ریلوے پارسل کی صورت میں منگانے پر ریل کا کرایہ ہمارے ذمہ۔ ڈاک سے منگانے پر ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔ ریل پارسل کے ذریعہ کم از کم سو عدد جنتری بھیجی جائیں گی۔
قیمت: تین روپے
شمع بک ڈپو
آصف علی روڈ، نئی دہلی
آپ کو ہندوستان کے کسی گوشے میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں اردو، انگریزی، ہندی، پنجابی کتابیں یا رسائل منگوانے ہوں تو شمع کے ادارے کو خدمت کا موقع دیجئے۔
ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں۔

گھر میں تینوں بھائی آرام سے
ں ابھی تک کنوارے تھے
ی بہن تھی۔ جو شادی شدہ تھی۔
پنے بچوں کے ساتھ آجاتی تو گھر
آجاتی۔ کام کرنے کے لئے
خادمہ تھی۔ بڑا بھائی دلبر ایک
یس سروس کرتا تھا۔ منجھلے بھائی
ڑ کر کے ایک میٹاڈور خرید لی
پاس کے دیہات میں مسافروں
چھے خاصے پیسے بنا لیتا تھا۔ یہ
ں زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن

ان دونوں نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی
نواد کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی اور اسے ڈاکٹر بنانے
میں کامیاب ہو گئے تھے۔ نواد اب باقاعدہ
پریکٹس کرنے لگا تھا۔

یہ تینوں بھائی نیک نام تھے اور شہر
کے بہت سے لوگ انہیں اپنا داماد بنانے کے
جتن کرتے رہتے تھے۔ لیکن بڑے بھائیوں کا
کہنا تھا اگر وہ شادی کر کے بیٹھ گئے تو ان کے
اخراجات ایک دم دگنے ہو جائیں گے۔ اور چھوٹے
بھائی کی تعلیم نامکمل رہ جائے گی۔ چھوٹے
بھائی کی شادی کا تو ابھی کوئی سوال ہی پیدا نہیں
ہوتا تھا۔ لیکن اب تمام مسائل نبٹ چکے تھے
اس لئے ان کی بڑی بہن ناہید بڑے بھائی
دلبر کی شادی بہت جلد کرنا چاہتی تھی۔ اس
نے اپنے بھائی کے لئے ایک خوب صورت
لڑکی تہمینہ تلاش کر لی تھی۔ ابھی باقاعدہ رشتہ
نہیں ہوا تھا۔ لیکن ناہید کا خیال تھا کہ رشتہ
طے ہونے کے فوراً بعد شادی ہو جائے گی۔
کیوں کہ اس گھر میں عورت کی سخت ضرورت
تھی۔

ان ہی دنوں دلبر کو پریس کے کسی کام
سے بمبئی جانا پڑا۔ اسے وہاں پندرہ دن کی بجائے

دو مہینے لگ گئے۔ اس دوران ناہید نے لڑکی والوں سے اقرار کرنے پر مہندی، چوڑیاں اور انگوٹھی بھیج کر دلبر کا رشتہ طے کر لیا۔

جب دلبر بمبئی سے واپس آیا تو رشتہ کی بات سن کر اس نے ناگواری کا اظہار کیا اور بہن بھائیوں سے کہا کہ رشتہ طے ہونے سے کیا ہوتا ہے وہ شادی نہیں کرے گا۔ اس لئے لڑکی والوں سے انکار کر دیا جائے۔

دلبر کی بات سنتے ہی ناہید کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ سٹپٹا کر بولی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے شریف آدمی اپنی زبان کے پابند ہوتے ہیں ہم نے ان کی بیٹی کو اپنی بہو مان لیا ہے۔ وہ لڑکی اس گھر میں بہو بن کر ہی آئے گی۔"

دلبر نے جواب دیا "کم از کم مجھ سے معلوم تو کر لیا ہوتا تم لوگوں نے سخت غلطی کی جو میری غیر موجودگی میں بات بڑھا دی میرے واپس آنے کا تو انتظار کرنا چاہیے تھا۔"

ناہید نے کہا "لیکن تم نے بمبئی جانے سے پہلے اس رشتہ کی کوئی مخالفت بھی تو نہیں کی تھی۔۔۔۔"

منجھلا بھائی جواد بولا "میں سمجھ گیا بھائی جان بمبئی میں کہیں دل لگا آئے ہیں۔ اس لئے شادی سے انکار کر رہے ہیں۔"

فواد نے ہنس کر پوچھا "کیا خیال ہے بھائی جان؟ کیا بھیا کی بات درست ہے؟"

دلبر نے کچھ برہمی کے ساتھ کہا "بے کار باتیں نہ کرو۔ کان کھول کر سن لو مجھے یہ شادی نہیں کرنی ہے۔"

کسی پر بھی دلبر کی ناراضگی کا اثر نہیں ہوا۔ دونوں چھوٹے بھائی یک زبان ہو کر بولے "بھائی جان، ہم آپ کا گھر بسا کر رہیں گے آپ چاہے کچھ بھی کہتے رہیں۔ ٹھیک ہے نا باجی؟"

ناہید نے کہا "بالکل ٹھیک ہے۔ آخر کب تک تم لوگ آزاد گھومتے رہو گے؟ بڑے بھائی کی شادی ہو جائے تو چھوٹے بھائیوں کا نمبر آئے۔ تہمینہ کی ماں نہیں ہے اور اس کے والد بیمار رہتے ہیں۔ وہ بہت جلد لڑکی کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

اس طرح دلبر تو شادی سے انکار کرتا رہا مگر گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

ناہید ایک مہینے کے لئے مستقل طور سے یہاں آ گئی۔ وہ روزانہ بازار کے چکر لگا کر دلہن کے لئے زیور اور کپڑے خرید کر بری کا بندوبست کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ اکثر کوئی چھوٹا بھائی ہوتا تھا۔

فواد نے کہا "بھائی جان کی شادی پر مہمانوں کی دعوت کا سارا بندوبست میں کروں گا اور سارا خرچ میں اُٹھاؤں گا۔"

منجھلے بھائی جواد نے گھر کی مرمت اور رنگ و روغن کرانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ دلبر ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا سب لوگ یہ سمجھے کہ وہ راہِ راست پر آ گیا ہے اور اب وہ شادی کی مخالفت نہیں کرے گا۔

شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ جواد نے گھر کی مرمت اور رنگ و روغن کرا کے اسے نیا کر دیا۔ یہ طے پایا کہ دلہن اوپر والے کمرے میں رہے گی۔ اس لئے اس کمرے کی سجاوٹ پر زیادہ زور دیا گیا۔ شادی سے دو روز پہلے جواد نے بھائی بھابی کے لئے حجلۂ عروسی تیار کر کے مقفل کر دیا۔

فواد نے شادی کارڈ چھپوا کر تقسیم کرا دئے۔ اس نے عمدہ قسم کی دعوتِ ولیمہ کا سارا انتظام کر لیا تھا۔

اچانک حالات نے ایک نیا موڑ لے لیا۔ شادی سے ایک دن پہلے دلبر گھر سے فرار ہو گیا۔ گھر والے اس نئی اُفتاد سے بہت زیادہ گھبرا گئے۔ کسی کو بھی یہ اُمید نہ تھی کہ دلبر اتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت دے گا۔ دونوں چھوٹے بھائی دلبر کو تلاش کر کے ہار گئے۔ ناہید سخت پریشان تھی۔ اس نے اپنی ذمہ داری پر یہ رشتہ طے کیا تھا۔ تہمینہ بہت خوبصورت اور شریف لڑکی تھی۔ اس کے والد ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ناہید سوچ رہی تھی کہ اگر برات وقت پر نہ پہنچی تو اس صدمہ کو وہ برداشت کر سکیں گے یا نہیں۔ ادھر بھی دلبر کی شادی کے کارڈ تقسیم ہو چکے ہیں۔ کل ہی اتنے سارے مہمانوں سے کس طرح معذرت کی جائے گی۔

تینوں بہن بھائی بہت دیر تک پریشان بیٹھے رہے۔ آخر ناہید نے یہ تجویز رکھی کہ تہمینہ کے ساتھ دلبر کی بجائے جواد کی شادی کر دی جائے۔ دلبر کی شادی کے معاملہ میں ہم آئندہ کبھی دخل نہیں دیں گے۔ اس کا جب اور جہاں دل چاہے گا شادی کر لے گا۔ اس وقت تو اس نے اپنے بہن بھائیوں کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

جواد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "باجی آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ جو لڑکی میری بھابی بن کر آنے والی تھی، اسے میرا ذہن ایک بیوی کی شکل میں کبھی قبول نہیں کرے گا۔"

ناہید نے ہنس کر کہا۔ "بس تو پھر تمہارا جو دل چاہے کرو، میں کل صبح کی ٹرین سے اپنے گھر جا رہی ہوں۔"

پہلے تو جواد بحث کرتا رہا، لیکن بھائی بہن نے سمجھا بجھا کر اسے ہموار کر لیا اور لڑکی والوں کو اس تبدیلی کی اطلاع کر دی۔

دوسرے دن دھوم دھام سے جواد کی برات چڑھی، سب لوگ خوش تھے لیکن دولہا سہرے کی آڑ میں اپنے آنسو پونچھتا جا رہا تھا۔ لڑکی کے رشتے کے ایک بھائی نے دولہا کا استقبال کرتے ہوئے اس کے گلے میں پھولوں کا بڑا سا ہار ڈال دیا لیکن ہار گلے میں پڑتے ہی خود بخود ٹوٹ گیا۔ لڑکا دھاگے میں گرہ لگانے لگا۔ جواد نے ڈوبتے ہوئے لہجہ میں اس سے کہا۔ "یہ ہار تو ٹوٹنا ہی تھا۔ اگر جوڑ بھی دو گے تو گرہ پھر بھی باقی رہ جائے گی ــــ" لڑکا کچھ نہیں سمجھا وہ ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔

شام کو برات دلہن کو لے کر واپس آ گئی۔ رات ہوئی تو دلہن کو اسی کمرے میں پہنچا دیا جسے جواد نے بڑی جانفشانی کے ساتھ اپنی بھابی کے لئے سجایا تھا۔ ساری رات تہمینہ اپنے دولہا کا انتظار کرتی رہی لیکن دولہا کمرے سے باہر چھت پر پڑی ہوئی نماز پڑھنے کی چوکی پر لیٹ کر سو گیا۔

دوسرے دن دعوتِ ولیمہ تھی جس میں بے شمار مہمان شریک ہوئے۔ دو تین دن بعد ناہید اپنے گھر واپس چلی گئی۔ دن گزرنے لگے، لیکن جواد نے دلہن کی شکل نہیں دیکھی۔ خادمہ کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے تہمینہ نے بہت جلد گھر کا سارا کام خود سنبھال لیا۔

جواد کا موڈ ہر وقت خراب رہتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی ڈرائیوروں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینی شروع کر دی تھی۔ وہ تہمینہ کے ہر کام میں نقص نکالتا تھا۔ دھیرے دھیرے جواد نے تہمینہ کا کھانا پینا اُٹھنا بیٹھنا مشکل کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ مار پیٹ پر اتر آیا۔ اچھے تماصے بنے ہوئے کھانے کو بدمزہ بتا کر وہ تہمینہ کے ایک آدھ تھپڑ لگا کر خوشی حاصل کرتا تھا لے دے کر گھر میں ایک نواد تھا جو تہمینہ کے ساتھ مروت سے پیش آتا تھا لیکن جب کبھی نواد بڑے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کرتا وہ اس سے بھی لڑنے لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ جواد نے معمول بنا لیا کہ وہ رات گئے نشے میں چور واپس آتا۔ بیوی کو گالیاں دیتا۔ مارتا پیٹتا اور سو جاتا۔ تہمینہ بہت صبر کے ساتھ اتنے ظلم سہ رہی تھی۔ نواد کو اس پر بہت ترس آتا تھا۔ ایک شریف بے بس لڑکی پر اتنا ستم نواد سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس نے اپنی ڈسپنسری کے اوپر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور وہیں رہنے لگا۔

ایک روز دوپہر کے وقت نواد اچانک گھر پہنچ گیا اس نے دیکھا دالان کے فرش پر تہمینہ تیز بخار کی حالت میں بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے جسم پر آڑی ترچھی نیلی دھاریاں تھیں۔

نواد نے تہمینہ کو فرش پر سے اُٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ قریبی دوا فروش سے لا کر دوا کھلائی۔ اور اس کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد تہمینہ کے بخار کی تیزی کم ہوئی تو اس نے آنکھیں کھول کر نواد کو دیکھا اور رونے لگی۔ نواد نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بھابی آپ گھبرائیے نہیں۔ میں نے دوا دے دی ہے آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔"

تہمینہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھے مار ڈالے گا نواد ...... وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں کیا کروں؟ میں کہاں جاؤں؟"

نواد پریشان نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اسی وقت جواد نشے میں جھومتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ نواد نے کھڑے ہو کر کہا۔ "بھیا۔ آپ نے بھابی کی کیا حالت بنا دی ہے! کیا آپ انہیں واقعی جان سے مارنا چاہتے ہیں؟"

جواد نے گالی دے کر کہا۔ "تجھے تہمینہ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ حرام خور! میں نے تجھے پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا اور تو ہی میری بیوی پر ڈاکہ ڈالنے آ گیا۔"

نواد نے جواد کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، جواد کا غصہ بھڑک گیا، غصہ میں آ کر جواد نے تہمینہ کو طلاق دے دی۔

تہمینہ ایک دم پلنگ سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر لڑکھڑا کر وہیں گر پڑی۔ نواد سناٹے میں کھڑا رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد نواد رکشا لے کر آیا اور تہمینہ کو اپنے بازوؤں میں اُٹھاتے ہوئے بولا۔ "چلو تہمینہ، تم میرے ساتھ چلو تمہاری لہولہان زندگی کو ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ اور وہ ضرورت میں پوری کروں گا"

ے محبوب نیا سال مُبارک ہو تجھے!

، جہاں میں ہے نئے سال کے تحفے کا چلن
ے محبوب بتا میں تجھے کیا پیش کروں
ے فن کار کے دامن میں کہاں لعل و گہر
جو منظور کرے اپنی دُعا پیش کروں
میرے محبوب نیا سال مُبارک ہو تجھے!
ے نزدیک نہ آئے کبھی یاس و حسرت
تح و نصرت کی بہاریں ہوں ترے دامن میں
ور تک جن سے ترے پیار کی خوشبو جائے
پھول مہکیں وہ شب و روز ترے گلشن میں
میرے محبوب نیا سال مُبارک ہو تجھے!
یری راہوں میں کبھی ہو نہ اندھیروں کا گزر
تنا اُونچا ہو مقدر کا ستارا تیرا
تو سدا چمکے ہر اک بزم میں سورج بن کے
روک پائے نہ کبھی وقت اُجالا تیرا
میرے محبوب نیا سال مُبارک ہو تجھے!
ساری دنیا کی مسرت ترے قدموں پہ نثار
تو جہاں بھی رہے آباد رہے شاد رہے
کیسے بھولوں گا میں اے دوست محبت تیری
اش تجھ کو ترا ایوب اثرؔ یاد رہے
میرے محبوب نیا سال مُبارک ہو تجھے!

وب اثرؔ شاہجہانپوری
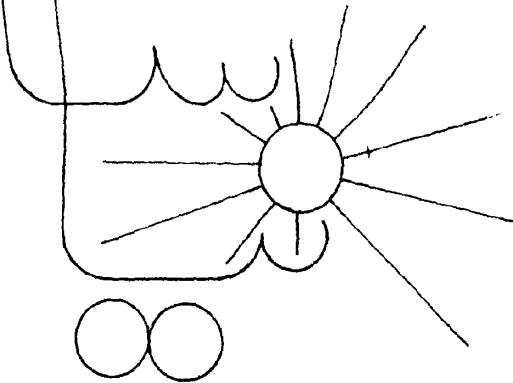
فردوس گیاوی

جشنِ نو سال مناؤں تو مناؤں کیوں کر
اور نغماتِ خوشی گاؤں تو گاؤں کیوں کر
کیا نہیں دے گا یہ غم سالِ گزشتہ کی طرح
پھر اسے اپنے گلے سے میں لگاؤں کیوں کر

یہ نیا سال تمہیں کیا دے گا بتاتا ہوں تمہیں
اِس کے منصوبوں کا افسانہ سناتا ہوں تمہیں
اِس نے بخشے ہے جو تحفے کی طرح پچھلے برس
دیکھنا چاہو تو وہ زخم دکھاتا ہوں تمہیں

کچھ خوشی دے گا نہ خوشیوں کی گواہی دے گا
یہ نیا سال بھی دُنیا کو تباہی دے گا
روشنی کی کوئی اُمید نہ رکھنا اِس سے
ظلمتِ شب کو یہ کچھ اور سیاہی دے گا

سادگی گاؤں کی مٹی میں مِلا ڈالے گا
رونقِ شہر، نیا سال مٹا ڈالے گا
دیکھ لینا یہ نیا سال بھی پہلے کی طرح
کتنے مظلوموں کی دُنیا کو جلا ڈالے گا

تم بھی کیا سالِ گزشتہ کے ستم بھول گئے
کس قدر اُس نے دیئے تھے تمہیں غم بھول گئے
کیا کوئی سال کسی کا بھی وفادار رہا؟
اِس قدر جلد وہ سب کرب و الم بھول گئے

عائشہ گھوڑوں کو ریس میں سرپٹ دوڑانے والی پہلی ہندوستانی لڑکی

سرفراز احمد

عائشہ کی کام یابی کسی اتفاق کی دین نہیں ہے، اس میں ان کی بے پناہ لگن اور برسوں کی محنت شامل ہے۔ وہ پونا میں رہتی ہیں۔ اُن کے باپ سولی کیپٹن کو بھی گھوڑسواری کا شوق ہے جب عائشہ نے دسویں کا امتحان پاس کیا تو وہ ایک مہینے کی چھٹی گزارنے بنگلور گئیں۔ بنگلور میں گھوڑے پالنے کا ایک فارم ہے جس کا نام 'لومینی' ہے۔ عائشہ کے لئے ایک مہینے کی یہ چھٹی تاریخ ساز ثابت ہوئی یہاں

گھوڑسواری مردوں کے لئے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ پہاڑوں اور دوسرے تفریحی مقامات پر عورتیں اکثر اپنا فوٹو کھنچوانے کے لئے ہی گھوڑوں پر بیٹھتی ہیں۔ بہت ہوا تو مال روڈ کے ایک دو چکر لگا لئے۔ اس دوران میں گھوڑے والا بھی ساتھ ساتھ بھاگتا ہے۔ گھوڑے کی سواری کے لئے مخصوص لباس ہوتا ہے۔ عورتیں ساڑی پہن کر گھوڑے پر نہیں بیٹھ سکتیں۔ اس کے لئے چست لباس (مثلاً جینز یا پتلون) پہننا پڑتا ہے۔ گھوڑا سرکش ہو تو سوار کی جان کو خطرہ رہتا ہے۔ یہ گھوڑا اپنے سوار کا مزاج پہچانتا ہے۔ اگر اُسے محسوس ہو جائے کہ سوار کے دل پر خوف طاری ہے تو وہ اُسے گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی تیز بھاگتا ہے، کبھی الف کھڑا ہو جاتا ہے، کبھی پینترے بدلتا ہے، سوار کا خوف جتنا بڑھتا ہے گھوڑے کی سرکشی اتنی ہی بڑھتی ہے، اس طرح وہ سوار کو گرا کر ہی دم لیتا ہے، لیکن اگر سوار کا دل مضبوط ہے۔ اس کے پاؤں رکاب میں مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں تو پھر گھوڑا رام ہو جاتا ہے۔

ریس کے گھوڑے دوڑانا معمولی گھوڑے دوڑانے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اس کے لئے برسوں ریاضت کی ضرورت ہے۔ ریس کے گھوڑے دوڑانے والوں کو انگریزی میں 'جوکی' کہتے ہیں۔ جوکی کے لئے ضروری ہے کہ وہ دُبلا پتلا ہو اور اس کا قد بھی چھوٹا ہو۔ اس کا وزن ۱۱۰ پونڈ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ عورتیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ان کا وزن اور قد مردوں سے کم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شہ سواری کا میدان اُن کے لئے نہیں ہے۔ ہندوستان کے بڑے شہروں میں ریس کورس موجود ہیں لیکن ان میں ایک بھی گھوڑسوار عورت نہیں ہے مگر ۲۱ سالہ عائشہ کیپٹن نے اس روایت کو توڑ دیا ہے، عائشہ ہندوستان کی پہلی جوکی لڑکی ہیں جنہیں باقاعدہ ریس میں گھوڑے دوڑانے کا لائسنس مل گیا ہے۔

کرنے کا موقع ملا اور ان میں گھوڑ سواری کا شوق
پیدا ہوا۔ انہیں اس بات کا خوبجہ نہیں تھا کہ ایک
دن یہی شوق ان کو اس میدان میں پہنچادے گا۔
جب عائشہ بنگلور میں ایک مہینے کی چھٹی
گزارنے کے بعد پونا واپس پہنچیں تو گھوڑے
سواری کا جنون ان کے سر پر سوار تھا۔ بنگلور کا
فارم مسز ریڈی کی ملکیت تھا۔ ریڈی نے
کے شوق کو ہوا دی اور انہیں گھوڑ سواری
سکھلایا۔ گھوڑا جب آہستہ آہستہ بھاگتا
اس کی چال ڈلکی کہلاتی ہے۔ تیز بھاگتا
اُس کی چال سرپٹ کہلاتی ہے۔ ڈلکی سے
تک پہنچنے میں ایک سوار کو خاصا وقت
ہے، لیکن عائشہ نے یہ ساری منزلیں ایک
کے مختصر عرصے میں طے کرلیں۔
پونا پہنچنے کے بعد عائشہ کے ذہن پر
ے سوار ہوگئے۔ انہوں نے اپنے باپ سے
مت کی کہ وہ اُنہیں گھوڑ سواری کی اجازت
یں۔ ان کے باپ کو بھی گھوڑ سواری کا شوق
پونا کے ریس کورس سے بھی ان کی وابستگی
انہوں نے بیٹی کا شوق دیکھا تو وہ ریس کورس
اتفاق سے ریس کورس کے جوکی چھٹی پر گئے
تھے۔ گھوڑے خالی تھے۔ سولی کیپٹن نے
قع کو غنیمت جانا اور عائشہ کو ان گھوڑوں
ی کرنے کی مہلت مل گئی۔ لیکن یہ مہلت عارضی
یس کورس کے جوکی واپس آئے تو عائشہ کی
ے بھی ختم ہوگئی۔
ہر انسان کی زندگی میں ایک موقع ایسا آتا
زندگی کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ عائشہ کے ساتھ
ی ہوا۔ ایک دن انہوں نے ایک گھوڑا دیکھا
رنگ کا ایک شاندار جانور تھا۔ جس کی پیشانی
سفید نشان ستارے کی طرح چمک رہا تھا

ہوگئیں۔ انہوں نے گھوڑوں کی ٹریننگ دینے
والے آدمی سے درخواست کی کہ وہ انہیں اس
گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت دے دے۔
یہ عائشہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ شخص راضی ہوگیا
عائشہ نے اس گھوڑے کی ٹریننگ اپنے ہاتھ میں
لے لی۔ گھوڑا بھی پیار کرنے والے کو پہچانتا ہے۔
عائشہ کی محنت اور ریاضت سے یہ گھوڑا اس قابل
ہوگیا کہ اس نے نئے سواروں کی ایک ریس میں
پہلا انعام حاصل کیا۔
شاید عائشہ کی قسمت میں سفید مشکی
والے گھوڑے لکھے ہوئے ہیں۔ اس گھوڑے
کا کام ختم ہوا تو عائشہ کو اسی رنگ کا دوسرا گھوڑا
مل گیا۔ اس کی پیشانی پر بھی سفید ستارہ چمک
رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں گھوڑے
بھائی بھائی تھے۔ اس گھوڑے کو ٹریننگ دینے
کے لیے ریس کورس کے ایک بوڑھے اور تجربہ کار
اُستاد نے عائشہ کا ہاتھ بٹایا۔ ان کا نام عزیز محمود ہے
عزیز محمود کی عمر ۷۶ سال ہے۔ ان کی تمام عمر
ریس کورس کے گھوڑوں کو تربیت دینے میں بسر
ہوئی ہے۔ عزیز محمود نے جب ایک نوجوان لڑکی
کا شوق دیکھا تو انہوں نے عائشہ کو اس گھوڑے
پر سوار ہونے کی اجازت دے دی اور یوں پہلی
بار عائشہ نے ایک ریس کے گھوڑے پر سواری
کی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ عزیز محمود نے
عائشہ کے باپ کو بھی گھوڑ سواری سکھائی تھی۔
عزیز محمود کی بوڑھی اور تجربہ کار آنکھوں نے
عائشہ کی صلاحیت کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے
عائشہ کو ریس کورس میں آنے کی اجازت دلادی
جب ریس کے دوسرے جوکی صبح کا کام ختم کرکے
اپنے گھر جاتے تو میدان خالی ہوتا۔ عائشہ کبھی ایک
گھوڑے پر اور کبھی دوسرے گھوڑے پر بیٹھتیں۔

عائشہ ایک دن میں ۱۵ گھوڑوں کی سواری کرتی
ان میں کئی گھوڑے ایک انجان سوار کو دیکھ کر
بدک جاتے۔ وہ طرح طرح سے عائشہ کو گرانے
کی کوشش کرتے۔ ان گھوڑوں کی سرکشی نے
عائشہ کو کئی بار زمین پر گرایا۔ ایک بار وہ اتنی زور
سے گریں کہ ان کے سر میں چوٹ آئی۔
انہیں کئی روز ہسپتال میں رہنا پڑا۔ اسی
ٹریننگ کے دوران ان کی ایک انگلی بھی زخمی
ہوگئی لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔
عزیز محمود نے عائشہ کو ریس کے سارے
سارے رموز سکھادئے۔ وہ کبھی عائشہ سے
گھوڑے کو سیدھا دوڑانے کے لئے کہتے، کبھی
چکر لگواتے، یہ چکر کبھی دائیں سے بائیں ہوتا اور
کبھی بائیں سے دائیں، کبھی عائشہ اپنی کارکردگی
سے مایوس ہو جاتی تو عزیز محمود اُن کی ہمت بڑھاتے
"کوئی بات نہیں بیٹا۔ تم گر گئیں تو کیا ہوا
تمہاری بیٹھک تو اچھی تھی۔"
عائشہ کا شوق تو پورا ہوگیا لیکن ان کی وجہ
سے ان کی تعلیم میں رخنہ پڑگیا۔ اُن کے باپ کو
یہ بات منظور نہیں تھی کہ عائشہ اپنے شوق کی خاطر
اپنی تعلیم کو نظرانداز کردیں۔ عائشہ کو اپنے باپ
کی رائے کا لحاظ تھا۔ وہ صبح کو ۸½ بجے سے ۱۰½
بجے تک گھوڑ سواری کرتیں اس کے بعد بھاگی بھاگی
کالج جاتیں وہ سینٹ میری ٹیچرز ٹریننگ کالج کی
طالب علم تھیں۔ اس طرح گھوڑ سواری اور تعلیم
دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔
عائشہ اب گھوڑے سواری کے فن میں ماہر
ہوگئی تھیں۔ لیکن ایسی مہارت کس کام کی جس کا
کوئی فائدہ نہ ہو۔ وہ کالج میں اسکول ٹیچر بننے
کی ٹریننگ لے رہی تھیں لیکن انہیں بچوں کو پڑھانے
سے زیادہ گھوڑا دوڑانے کا شوق تھا۔ ہر انسان

، دورا یا ایسا آتا ہے جب اس
ق میں سے ایک کو چھٹنا پڑتا ہے
ہی وہ وقت آگیا جب انہیں
ق سنجیدگی سے سوچنا پڑا نہیں
پ نہیں لگی، انہوں نے پکا ارادہ
س کے گھوڑے دوڑانے کی
بل کریں گی۔

ر امریکہ میں ریس کورس میں جانے
سے زیادہ ہیں۔ وہاں گھوڑوں
ہ کروڑوں روپے تک پہنچتی ہے
، لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہے
ی خاندان کے افراد کی طرح
ڑا کوئی بڑی ریس (مثلاً ڈربی)
ں کی قیمت یک لخت دس گنا
ے اس سے بچے پیدا کرانے کے
پے ادا کرتے ہیں۔ وہاں گھوڑوں
ڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لوگ
د اکا نام جانیں، نہ جانیں گھوڑوں
کو خوب جانتے ہیں۔ ۱۹۵۲ میں
ب ۳ سالہ گھوڑا ٹل یار ڈربی کی
اس کی قیمت لاکھوں پاؤنڈ تک
چھ مقابلے جیتنے کے بعد صرف
کے لئے محفوظ کر لیا گیا۔ یہ گھوڑا ایک
کھ پونڈ میں خریدا۔ ۱۹۸۱ میں موجودہ
ں کریم کا گھوڑا "شیرگار" ڈربی کی ریس
ں کی قیمت بھی آسمان کو چھونے
، نے اس گھوڑے کو فارم پر بھیج دیا
ت کے لئے مسلح گارڈ تعینات تھی
، یہ تدبیر کام نہیں آئی "شیرگار" کو
لے گئے۔ اس کے بعد خبر نہیں کہ شیرگار
، گئی یا آسمان کھا گیا۔ پولیس بھی آئی

ڈی اور انٹرپول کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اس گھوڑے کا سراغ نہیں مل سکا۔

آئرلینڈ میں ایک ایسا ہی فارم ہے۔ یہاں گھوڑوں کو پالنے کے علاوہ جوکی کو بھی تربیت دی جاتی ہے۔ عائشہ اس اسکول میں جانا چاہتی تھی۔ انہوں نے آئرلینڈ خط لکھا تو ان کی ماں پہلی ان کے خلاف ہوگئیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی نوجوان بیٹی سات سمندر پار جائے اور ایک اجنبی ملک میں زندگی گزارے۔ آئرلینڈ سے بھی جواب آگیا کہ وہاں عورتوں کے لئے سہولتیں میسر نہیں ہیں، ہاں اگر عائشہ اپنے رہنے اور کھانے کا بندوبست کریں تو انہیں اس اسکول میں داخلہ مل سکتا ہے۔ عائشہ اس بات کے لئے تیار تھیں، وہ کسی بھی قیمت آئرلینڈ جانا چاہتی تھیں لیکن ماں اپنی ضد پر اڑی رہیں۔ سال بھر عائشہ کے گھر میں تناؤ قائم رہا۔ باپ عائشہ کے ساتھ تھے لیکن وہ ماں کو بھی ناراض کرنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ پریشان تھے کہ کس کا ساتھ دیا اور کس کی مخالفت کریں۔

اس الجھن کا فیصلہ اس طرح ہوا کہ عائشہ کو بنگلور میں ہی ایک انگریز استاد مل گیا۔ بنگلور میں ٹریننگ کا دور بہت صبر آزما تھا۔ عائشہ صبح ۱/۲ ۵ بجے سے گھوڑے دوڑانا شروع کر دیتیں ۱/۲ ۱۰ بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہتا اس وقفے میں وہ ۵ گھوڑوں کی سواری کر لیتیں۔ اس کے بعد وہ کپڑے بدلتیں اور اصطبل کا دورہ کرتیں، اصطبل میں گھوڑوں کی دیکھ بھال ایک جوکی کی ذمہ داری میں شامل نہیں ہے۔ لیکن عائشہ نے یہ کام اس لئے سنبھالا کہ وہ گھوڑوں کو قریب سے دیکھنا اور جاننا چاہتی تھیں، گھوڑوں کو چارہ دینا، ان کی مالش کرنا، انہیں کھریرا اور ورزش کرانا۔ یہ سب باتیں عائشہ کے معمول میں داخل ہوگئیں، ۱/۲ ۱۲ بجے کھانے کا وقفہ ہوتا اور ساڑھے تین بجے تک وہ آرام کرتیں۔ اس کے بعد ٹریننگ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا۔ اس بار انہیں گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھنا پڑتا۔ یہ ٹریننگ دو گھنٹے تک چلتی۔ شام کو گھوڑے کو چارہ دینے کے بعد وہ اپنی بائیسکل پر بیٹھ کر گھر پہنچ جاتیں۔ وہ اس قدر تھک جاتی تھیں کہ کھانا کھا کر فوراً ہی بستر سنبھال لیتیں۔ ان دس مہینوں میں ان کی سوشل لائف صفر کے برابر ہوگئی۔ اصطبل میں وہ اکیلی لڑکی تھیں۔ وہ اپنے دل کی بات کس سے کریں، دن بھر کام اور زیادہ کام، تفریح کا وقت نایاب تھا۔ اس زمانے میں کبھی کبھی عائشہ بہت اداس ہو جاتیں لیکن جوکی بننے کا خیال ان کی ہمت کو پھر تازہ کر دیتا۔

بنگلور میں ٹریننگ ختم ہونے کے بعد عائشہ کو جوکی کا لائسنس ملنا تھا۔ ان کے باپ نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بنگلور کا لائسنس قبول نہ کریں اس طرح وہ ایک اصطبل اور ایک استاد سے بندھ جائیں گی۔ انہیں ۳ برس تک ایک ہی استاد کی نگرانی میں کام کرنا پڑے گا۔ اس لئے عائشہ کو پونا میں آل انڈیا لائسنس لینا چاہئے تاکہ وہ کسی کی پابند نہ ہوں اور فری لانس کام کریں۔ عائشہ واپس پونا پہنچ گئیں اور ستمبر ۱۹۸۲ میں انہیں آل انڈیا لائسنس مل گیا۔ اس طرح وہ ہندوستان کی پہلی جوکی عورت بن گئیں۔

عائشہ اب تک سو سے زیادہ ریسوں میں حصہ لے چکی ہیں اور ان میں کئی ریسیں جیت چکی ہیں۔ پہلی بار جب وہ ایک بڑی ریس میں حصہ لے رہی تھیں تو اتنی نروس تھیں کہ وہ جوکی کے کمرے سے ۱۲ بار باتھ روم گئیں۔ انہیں دست لگ گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ریس انہوں نے جیت لی۔

انہیں گھوڑوں کے ساتھ رہنے اور ان پر سواری کرنے کا موقع ملا اور ان میں گھوڑ سواری کا شوق پیدا ہوا۔ انہیں اس بات کا خوف نہیں تھا کہ ایک دن یہی شوق ان کو اس میدان میں پہنچا دے گا۔

جب عائشہ بنگلور میں ایک مہینے کی چھٹی گزارنے کے بعد پونا واپس پہنچیں تو گھوڑے سواری کا جنون اُن کے سر پر سوار تھا۔ بنگلور کا لومبنی فارم مسٹر ریڈی کی ملکیت تھا۔ ریڈی نے ان کے شوق کو ہوا دی اور انہیں گھوڑسواری کا فن سکھلایا۔ گھوڑا جب آہستہ آہستہ بھاگتا ہے تو اس کی چال ڈُلکی کہلاتی ہے۔ تیز بھاگتا ہے تو اُس کی چال سرپٹ کہلاتی ہے۔ ڈُلکی سے سرپٹ تک پہنچنے میں ایک سوار کو خاصا وقت لگتا ہے، لیکن عائشہ نے یہ ساری منزلیں ایک مہینے کے مختصر عرصے میں طے کرلیں۔

پونا پہنچنے کے بعد عائشہ کے ذہن پر گھوڑے سوار ہوگئے۔ انہوں نے اپنے باپ سے درخواست کی کہ وہ اُنہیں گھوڑسواری کی اجازت دے دیں۔ ان کے باپ کو بھی گھوڑسواری کا شوق ہے۔ پونا کے ریس کورس سے بھی ان کی وابستگی ہے، انہوں نے بیٹی کا شوق دیکھا تو وہ ریس کورس گئے۔ اتفاق سے ریس کورس کے جوکی چھٹی پر گئے ہوئے تھے۔ گھوڑے خالی تھے۔ سولی کیپٹن نے اس موقع کو غنیمت جانا اور عائشہ کو ان گھوڑوں پر سواری کرنے کی مہلت مل گئی۔ لیکن یہ مہلت عارضی تھی، ریس کورس کے جوکی واپس آئے تو عائشہ کی ٹریننگ بھی ختم ہوگئی۔

ہر انسان کی زندگی میں ایک موقع ایسا آتا ہے جو زندگی کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ عائشہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک دن انہوں نے ایک گھوڑا دیکھا، یہ مشکی رنگ کا ایک شاندار جانور تھا جس کی پیشانی پر ایک سفید نشان ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ عائشہ پہلی نظر میں اس جانور پر جی جان سے فدا ہوگئیں۔ انہوں نے گھوڑوں کی ٹریننگ دینے والے آدمی سے درخواست کی کہ وہ انہیں اس گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت دے دے۔ یہ عائشہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ شخص راضی ہوگیا۔ عائشہ نے اس گھوڑے کی ٹریننگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ گھوڑا بھی پیار کرنے والے کو پہچانتا ہے۔ عائشہ کی محنت اور ریاضت سے یہ گھوڑا اس قابل ہوگیا کہ اس نے نئے سواروں کی ایک ریس میں پہلا انعام حاصل کیا۔

شاید عائشہ کی قسمت میں سفید مشکی والے گھوڑے لکھے ہوئے ہیں۔ اس گھوڑے کا کام ختم ہوا تو عائشہ کو اسی رنگ کا دوسرا گھوڑا مل گیا۔ اس کی پیشانی پر بھی سفید ستارہ چمک رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں گھوڑے بھائی بھائی تھے۔ اس گھوڑے کو ٹریننگ دینے کے لیے ریس کورس کے ایک بوڑھے اور تجربہ کار اُستاد نے عائشہ کا ہاتھ بٹایا۔ ان کا نام عزیز محمود ہے عزیز محمود کی عمر ۶۷ سال ہے۔ ان کی تمام عمر ریس کورس کے گھوڑوں کو تربیت دینے میں بسر ہوئی ہے۔ عزیز محمود نے جب ایک نوجوان لڑکی کا شوق دیکھا تو انہوں نے عائشہ کو اس گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت دے دی اور یوں پہلی بار عائشہ نے ایک ریس کے گھوڑے پر سواری کی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ عزیز محمود نے عائشہ کے باپ کو بھی گھوڑسواری سکھائی تھی۔

عزیز محمود کی بوڑھی اور تجربہ کار آنکھوں نے عائشہ کی صلاحیت کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے عائشہ کو ریس کورس میں آنے کی اجازت دلادی جب ریس کے دوسرے جوکی صبح کا کام ختم کرکے اپنے گھر جاتے تو میدان خالی ہوتا۔ عائشہ کبھی ایک گھوڑے پر اور کبھی دوسرے گھوڑے پر بیٹھتیں۔ عزیز محمود ان کی رہنمائی کرتے۔ بعض اوقات عائشہ ایک دن میں ۵ اگھوڑوں کی سواری کرتیں ان میں کئی گھوڑے ایک انجان سوار کو دیکھ کر بدک جاتے۔ وہ طرح طرح سے عائشہ کو گرانے کی کوشش کرتے، ان گھوڑوں کی سرکشی نے عائشہ کو کئی بار زمین پر گرایا۔ ایک بار وہ اتنی زور سے گریں کہ ان کے سر میں سخت چوٹ آئی اور انہیں کئی روز ہسپتال میں رہنا پڑا، اِس ٹریننگ کے دوران ان کی ایک انگلی بھی زخمی ہوگئی لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔

عزیز محمود نے عائشہ کو ریس کے سارے سارے رموز سکھادئے۔ وہ کبھی عائشہ سے گھوڑے کو سیدھا دوڑانے کے لیے کہتے، کبھی چکر لگواتے، یہ چکر کبھی دائیں سے بائیں ہوتا اور کبھی بائیں سے دائیں، کبھی عائشہ اپنی ناکامی سے مایوس ہو جاتی تو عزیز محمود اُن کی ہمت بڑھاتے "کوئی بات نہیں بیٹا۔ تم گر گئیں تو کیا ہوا تمہاری بیٹھک تو اچھی تھی۔"

عائشہ کا شوق تو پورا ہوگیا لیکن ان کی وجہ سے ان کی تعلیم میں رخنہ پڑگیا۔ اُن کے باپ کو یہ بات منظور نہیں تھی کہ عائشہ اپنے شوق کی خاطر اپنی تعلیم کو نظرانداز کردیں۔ عائشہ کو اپنے باپ کی رائے کا لحاظ تھا۔ وہ صبح کو ۶½ بجے سے ۷½ بجے تک گھوڑ سواری کرتیں اس کے بعد بھاگی بھاگی کالج جاتیں وہ سینٹ میری ٹیچرز ٹریننگ کالج کی طالب علم تھیں۔ اس طرح گھوڑ سواری اور تعلیم دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

عائشہ اب گھوڑے سواری کے فن میں ماہر ہوگئی تھیں۔ لیکن ایسی مہارت کس کام کی جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ وہ کالج میں اسکول ٹیچر بننے کی ٹریننگ لے رہی تھیں لیکن انہیں بچوں کو پڑھانے سے زیادہ گھوڑا دوڑانے کا شوق تھا۔ ہر انسان

زندگی میں ایک دور ایسا آتا ہے جب اس
پنے کام اور شوق میں سے ایک کو چننا پڑتا ہے
ئشہ کی زندگی میں بھی وہ وقت آگیا جب انہیں
پنی زندگی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا پڑا انہیں
فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی، انھوں نے پکا ارادہ
لیا کہ وہ ریس کورس کے گھوڑے دوڑانے کی
قاعدہ تربیت حاصل کریں گی۔

یورپ اور امریکہ میں ریس کورس ہندوستان سے زیادہ ہیں۔ وہاں گھوڑوں کی قیمت لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے تک پہنچتی ہے ان کی ٹریننگ میں لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہے ان کی حفاظت شاہی خاندان کے افراد کی طرح ہوتی ہے۔ اگر گھوڑا کوئی بڑی ریس (مثلاً ڈربی) جیت جائے تو اس کی قیمت یک لخت دس گنا ہو جاتی ہے۔ لوگ اس سے بچے پیدا کرانے کے لاکھوں روپے ادا کرتے ہیں۔ وہاں گھوڑوں کے شجرہ نسب بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لوگ جیسے دادا، پردادا کا نام جانیں نہ جانیں گھوڑوں کے آباؤ اجداد کو خوب جانتے ہیں۔ ۱۹۵۲ میں سر آغا خاں کا ایک ۳ سالہ گھوڑا ٹل یار ڈربی کی ریس جیت گیا تو اس کی قیمت لاکھوں پاؤنڈ تک پہنچ گئی۔ اُسے کچھ مقابلے جیتنے کے بعد صرف افزائش نسل کے لئے محفوظ کر لیا گیا۔ یہ گھوڑا ایک فارم نے کئی لاکھ پونڈ میں خریدا۔ ۱۹۸۱ میں موجودہ آغا خاں پرنس کریم کا گھوڑا "شیر گار" ڈربی کی ریس جیت گیا تو اس کی قیمت بھی آسمان کو چھونے لگی۔ آغا خان نے اس گھوڑے کو فارم پر بھیج دیا۔ اس کی حفاظت کے لئے مسلح گارڈ تعینات تھی لیکن افسوس یہ تدبیر کام نہیں آئی۔ "شیر گار" کو چور اٹھا کر لے گئے۔ اس کے بعد خبر نہیں کہ شیر گار کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ پولیس بھی آئی اور افسروں کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اس گھوڑے کا سراغ نہیں مل سکا۔

آئرلینڈ میں ایک ایسا ہی فارم ہے۔ یہاں گھوڑوں کو پالنے کے علاوہ جوکی کو بھی تربیت دی جاتی ہے۔ عائشہ اس اسکول میں جانا چاہتی تھی۔ انھوں نے آئرلینڈ خط لکھا تو ان کی ماں لیلیٰ ان کے خلاف ہو گئیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی نوجوان بیٹی سات سمندر پار جائے اور ایک اجنبی ملک میں زندگی گزارے۔ آئرلینڈ سے بھی جواب آگیا کہ وہاں عورتوں کے لئے سہولتیں میسر نہیں ہیں، ہاں اگر عائشہ اپنے رہنے اور کھانے کا بندوبست کریں تو انہیں اس اسکول میں داخلہ مل سکتا ہے۔ عائشہ اس بات کے لئے تیار تھیں، وہ کسی بھی قیمت آئرلینڈ جانا چاہتی تھیں لیکن ماں اپنی ضد پر اڑی رہیں۔ سال بھر عائشہ کے گھر میں تناؤ قائم رہا۔ باپ عائشہ کے ساتھ تھے لیکن وہ ماں کو بھی ناراض کرنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ پریشان تھے کہ کس کا ساتھ دیں اور کس کی مخالفت کریں۔

اس اُلجھن کا فیصلہ اس طرح ہوا کہ عائشہ کو بنگلور میں ہی ایک انگریز استاد مل گیا۔ بنگلور میں ٹریننگ کا دور بہت صبر آزما تھا۔ عائشہ صبح ۵½ بجے سے گھوڑے دوڑانا شروع کر دیتیں ½۹ بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہتا اس وقفے میں وہ ۵ گھوڑوں کی سواری کر لیتیں۔ اس کے بعد وہ کپڑے بدلتیں اور اصطبل کا دورہ کرتیں۔ اصطبل میں گھوڑوں کی دیکھ بھال ایک جوکی کی ذمہ داریوں میں شامل نہیں ہے۔ لیکن عائشہ نے یہ کام اسی لئے سنبھالا کہ وہ گھوڑوں کو قریب سے دیکھنا اور جاننا چاہتی تھیں، گھوڑوں کو چارہ دینا، ان کی مالش کرنا، انہیں کھریرا اور ورزش کرانا۔ یہ سب باتیں عائشہ کے معمول میں داخل ہو گئیں، ½۱۲ بجے کھانے کا وقفہ ہوتا اور ساڑھے تین بجے تک وہ آرام کرتیں۔ اس کے بعد ٹریننگ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا۔ اس بار انہیں گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھنا پڑتا۔ یہ ٹریننگ دو گھنٹے تک چلتی۔ شام کو گھوڑے کو چارہ دینے کے بعد وہ اپنی بائیسکل پر بیٹھ کر گھر پہنچ جاتیں۔ وہ اس قدر تھک جاتی تھیں کہ کھانا کھا کر فوراً ہی بستر سنبھال لیتیں۔ ان دس مہینوں میں ان کی سوشل لائف صفر کے برابر ہو گئی۔ اصطبل میں وہ اکیلی لڑکی تھیں۔ وہ اپنے دل کی بات کس سے کریں۔ دن بھر کا کام اور زیادہ کام، تفریح کا وقت نایاب تھا۔ اس زمانے میں کبھی کبھی عائشہ بہت اداس ہو جاتیں لیکن جوکی بننے کا خیال ان کی ہمت کو پھر تازہ کر دیتا۔

بنگلور میں ٹریننگ ختم ہونے کے بعد عائشہ کو جوکی کا لائسنس ملنا تھا۔ ان کے باپ نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بنگلور کا لائسنس قبول نہ کریں اس طرح وہ ایک اصطبل اور ایک اُستاد سے بندھ جائیں گی۔ انہیں ۳ برس تک ایک ہی استاد کی نگرانی میں کام کرنا پڑے گا۔ اس لئے عائشہ کو پونا میں آل انڈیا لائسنس لینا چاہئے تاکہ وہ کسی کی پابند نہ ہوں اور فری لانس کام کریں عائشہ واپس پونا پہنچ گئیں اور ستمبر ۱۹۸۰ میں انہیں آل انڈیا لائسنس مل گیا۔ اس طرح وہ ہندوستان کی پہلی جوکی عورت بن گئیں۔

عائشہ اب تک سو سے زیادہ ریسوں میں حصہ لے چکی ہیں اور ان میں کئی ریسیں جیت چکی ہیں۔ پہلی بار جب وہ ایک بڑی ریس میں حصہ لے رہی تھیں تو اتنی نروس تھیں کہ وہ جوکی کے کمرے سے ۱۲ بار باتھ روم گئیں۔ انہیں دست لگ گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ریس انہوں نے جیت لی۔

بانوئی دہلی فروری ۱۹۸۵

انہیں گھوڑوں کے ساتھ رہنے اور ان پر سواری
کرنے کا موقع ملا اور ان میں گھوڑ سواری کا شوق
پیدا ہوا۔ انہیں اس بات کا خدشہ نہیں تھا کہ ایک
دن یہی شوق ان کو اس میدان میں پہنچا دے گا۔

جب عائشہ بنگلور میں ایک مہینے کی چھٹی
گزارنے کے بعد پونا واپس پہنچیں تو گھوڑے
سواری کا جنون اُن کے سر پر سوار تھا۔ بنگلور کا
نومبنی فارم مسٹر ریڈی کی ملکیت تھا۔ ریڈی نے
ان کے شوق کو ہوا دی اور انہیں گھوڑ سواری
کا فن سکھلایا۔ گھوڑا جب آہستہ آہستہ بھاگتا
ہے تو اس کی چال ڈلکی کہلاتی ہے۔ تیز بھاگتا
ہے تو اُس کی چال سرپٹ کہلاتی ہے۔ ڈلکی سے
سرپٹ تک پہنچنے میں ایک سوار کو خاصا وقت
لگتا ہے، لیکن عائشہ نے یہ ساری منزلیں ایک
مہینے کے مختصر عرصے میں طے کرلیں۔

پونا پہنچنے کے بعد عائشہ کے ذہن پر
گھوڑے سوار ہوگئے۔ انہوں نے اپنے باپ سے
درخواست کی کہ وہ اُنہیں گھوڑ سواری کی اجازت
دے دیں۔ ان کے باپ کو بھی گھوڑ سواری کا شوق
ہے۔ پونا کے ریس کورس سے بھی ان کی وابستگی
ہے، انہوں نے بیٹی کا شوق دیکھا تو وہ ریس کورس
گئے۔ اتفاق سے ریس کورس کے جوکی چھٹی پر گئے
ہوئے تھے۔ گھوڑے خالی تھے۔ سولی کیپٹن نے
اس موقع کو غنیمت جانا اور عائشہ کو ان گھوڑوں
پر سواری کرنے کی مہلت مل گئی۔ لیکن یہ مہلت عارضی
تھی، ریس کورس کے جوکی واپس آئے تو عائشہ کی
ٹریننگ بھی ختم ہوگئی۔

ہر انسان کی زندگی میں ایک موقع ایسا آتا
ہے جو زندگی کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ عائشہ کے ساتھ
بھی یہی ہوا۔ ایک دن انہوں نے ایک گھوڑا دیکھا،
یہ مشکی رنگ کا ایک شاندار جانور تھا۔ جس کی پیشانی
پر ایک سفید نشان ستارے کی طرح چمک رہا تھا
عائشہ پہلی نظر میں اس جانور پر جی جان سے فدا
ہوگئیں۔ انہوں نے گھوڑوں کی ٹریننگ دینے
والے آدمی سے درخواست کی کہ وہ انہیں اس
گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت دے دے۔

یہ عائشہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ شخص راضی ہوگیا
عائشہ نے اس گھوڑے کی ٹریننگ اپنے ہاتھ میں
لے لی۔ گھوڑا بھی پیار کرنے والے کو پہچانتا ہے۔
عائشہ کی محنت اور ریاضت سے یہ گھوڑا اس قابل
ہوگیا کہ اس نے نئے سواروں کی ایک ریس میں
پہلا انعام حاصل کیا۔

شاید عائشہ کی قسمت میں سفید مشکی
والے گھوڑے لکھے ہوئے ہیں۔ اس گھوڑے
کا کام ختم ہوا تو عائشہ کو اسی رنگ کا دوسرا گھوڑا
مل گیا۔ اس کی پیشانی پر بھی سفید ستارہ چمک
رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں گھوڑے
بھائی بھائی تھے۔ اس گھوڑے کو ٹریننگ دینے
کے لیے ریس کورس کے ایک بوڑھے اور تجربہ کار
اُستاد نے عائشہ کا ہاتھ بٹایا۔ ان کا نام عزیز محمود ہے
عزیز محمود کی عمر ۶۷ سال ہے۔ ان کی تمام عمر
ریس کورس کے گھوڑوں کو تربیت دینے میں بسر
ہوئی ہے۔ عزیز محمود نے جب ایک نوجوان لڑکی
کا شوق دیکھا تو انہوں نے عائشہ کو اس گھوڑے
پر سوار ہونے کی اجازت دے دی اور یوں پہلی
بار عائشہ نے ایک ریس کے گھوڑے پر سواری
کی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ عزیز محمود نے
عائشہ کے باپ کو بھی گھوڑ سواری سکھائی تھی۔

عزیز محمود کی بوڑھی اور تجربہ کار آنکھوں نے
عائشہ کی صلاحیت کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے
عائشہ کو ریس کورس میں آنے کی اجازت دلادی
جب ریس کے دوسرے جوکی صبح کا کام ختم کرکے
اپنے گھر جاتے تو میدان خالی ہوتا۔ عائشہ کبھی ایک
گھوڑے پر اور کبھی دوسرے گھوڑے پر بیٹھتیں۔
عزیز محمود ان کی رہنمائی کرتے۔ بعض اوقات
عائشہ ایک دن میں ۱۵ گھوڑوں کی سواری کرلیتی
ان میں کئی گھوڑے ایک انجان سوار کو دیکھ کر
بدک جاتے۔ وہ طرح طرح سے عائشہ کو گرانے
کی کوشش کرتے، ان گھوڑوں کی سرکشی نے
عائشہ کو کئی بار زمین پر گرایا۔ ایک بار وہ اتنی زور
سے گریں کہ ان کے سر میں سخت چوٹ آئی اور
انہیں کئی روز ہسپتال میں رہنا پڑا، اس
ٹریننگ کے دوران ان کی ایک انگلی بھی زخمی
ہوگئی لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔

عزیز محمود نے عائشہ کو ریس کے سارے
سارے رموز سکھا دئے۔ وہ کبھی عائشہ سے
گھوڑے کو سیدھا دوڑانے کے لئے کہتے، کبھی
چکر لگواتے، یہ چکر کبھی دائیں سے بائیں ہوتا اور
کبھی بائیں سے دائیں، کبھی عائشہ اپنی کارکردگی
سے مایوس ہو جاتی تو عزیز محمود اُن کی ہمت بڑھاتے
"کوئی بات نہیں بیٹا۔ تم گر گئیں تو کیا ہوا
تمہاری بیٹھک تو اچھی تھی"۔

عائشہ کا شوق تو پورا ہو گیا لیکن ان کی وجہ
سے ان کی تعلیم میں رخنہ پڑ گیا۔ اُن کے باپ کو
یہ بات منظور نہیں تھی کہ عائشہ اپنے شوق کی خاطر
اپنی تعلیم کو نظر انداز کردیں۔ عائشہ کو اپنے باپ
کی رائے کا لحاظ تھا۔ وہ صبح کو ½۸ بجے سے ½۱۰
بجے تک گھوڑ سواری کرتیں اس کے بعد بھاگی بھاگی
کالج جاتیں۔ وہ سینٹ میری ٹیچرز ٹریننگ کالج کی
طالب علم تھیں۔ اس طرح گھوڑ سواری اور تعلیم
دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

عائشہ اب گھوڑے سواری کے فن میں ماہر
ہوگئی تھیں۔ لیکن ایسی مہارت کس کام کی جس کا
کوئی فائدہ نہ ہو۔ وہ کالج میں اسکول ٹیچر بننے
کی ٹریننگ لے رہی تھیں لیکن انہیں بچوں کو پڑھانے
سے زیادہ گھوڑا دوڑانے کا شوق تھا۔ ہر انسان

زندگی میں ایک دور ایسا آتا ہے جب اس
اپنے کام اور شوق میں سے ایک کو چننا پڑتا ہے
ائشہ کی زندگی میں بھی وہ وقت آگیا جب انہیں
پنی زندگی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا پڑا انہیں
فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی، انھوں نے پکا ارادہ
کر لیا کہ وہ ریس کورس کے گھوڑے دوڑانے کی
باقاعدہ تربیت حاصل کریں گی۔

یورپ اور امریکہ میں ریس کورس ہیں جانے
والے ہندوستان سے زیادہ ہیں۔ وہاں گھوڑوں
کی قیمت لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے تک پہنچتی ہے
ان کی ٹریننگ میں لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہے
ان کی حفاظت شاہی خاندان کے افراد کی طرح
ہوتی ہے۔ اگر گھوڑا کوئی بڑی ریس (مثلاً ڈربی)
جیت جائے تو اس کی قیمت یک لخت دس گنا
ہوجاتی ہے۔ لوگ اس سے بچے پیدا کرانے کے
لئے لاکھوں روپے ادا کرتے ہیں۔ وہاں گھوڑوں
کے شجرۂ نسب بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لوگ
اپنے دادا، پردادا کا نام جانیں یا نہ جانیں گھوڑوں
کے آباؤ اجداد کو خوب جانتے ہیں۔ ۱۹۵۲ میں
سر آغا خاں کا ایک ۳ سالہ گھوڑا ٹل یار ڈربی کی
ریس جیت گیا تو اس کی قیمت لاکھوں پاؤنڈ تک
پہنچ گئی۔ اُسے کچھ مقابلے جیتنے کے بعد صرف
افزائش نسل کے لئے محفوظ کر لیا گیا۔ یہ گھوڑا ایک
فارم نے کئی لاکھ پونڈ میں خریدا۔ ۱۹۸۱ میں موجودہ
آغا خاں پرنس کریم کا گھوڑا "شیرگار" ڈربی کی ریس
جیت گیا تو اس کی قیمت بھی آسمان کو چھونے
لگی۔ آغا خان نے اس گھوڑے کو فارم پر بھیج دیا
اس کی حفاظت کے لئے مسلح گارڈ تعینات تھی
لیکن افسوس یہ تدبیر کام نہیں آئی "شیرگار" کو
چور اٹھا کر لے گئے۔ اس کے بعد خبر نہیں کہ شیرگار
کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ پولیس، سی آئی

ڈی اور انٹرپول کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اس
گھوڑے کا سراغ نہیں مل سکا۔

آئرلینڈ میں ایک ایسا ہی فارم ہے۔
یہاں گھوڑوں کو پالنے کے علاوہ جوکی کو بھی تربیت
دی جاتی ہے۔ عائشہ اس اسکول میں جانا چاہتی
تھی۔ انھوں نے آئرلینڈ خط لکھا تو ان کی ماں
لیلیٰ ان کے خلاف ہوگئیں وہ نہیں چاہتی تھیں
کہ ان کی نوجوان بیٹی سات سمندر پار جائے اور
ایک اجنبی ملک میں زندگی گزارے۔ آئرلینڈ
سے بھی جواب آگیا کہ وہاں عورتوں کے لئے سہولتیں
میسر نہیں ہیں، ہاں اگر عائشہ اپنے رہنے اور
کھانے کا بندوبست کریں تو انہیں اس اسکول
میں داخلہ مل سکتا ہے۔ عائشہ اس بات کے
لئے تیار تھیں، وہ کسی بھی قیمت آئرلینڈ جانا چاہتی
تھیں لیکن ماں اپنی ضد پر اڑی رہیں۔ سال بھر
عائشہ کے گھر میں تناؤ قائم رہا۔ باپ عائشہ کے
ساتھ تھے لیکن وہ ماں کو بھی ناراض کرنا نہیں کرنا
چاہتے تھے۔ وہ پریشان تھے کہ کس کا ساتھ دیں
اور کس کی مخالفت کریں۔

اس اُلجھن کا فیصلہ اس طرح ہوا کہ عائشہ
کو بنگلور میں ہی ایک انگریز استاد مل گیا۔ بنگلور
میں ٹریننگ کا دور بہت صبر آزما تھا۔ عائشہ
صبح ½۵ بجے سے گھوڑے دوڑانا شروع کر دیتیں
½۹ بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہتا اس وقفے میں
وہ ۵ گھوڑوں کی سواری کر لیتیں۔ اس کے بعد
وہ کپڑے بدلتیں اور اصطبل کا دورہ کرتیں، اصطبل
میں گھوڑوں کی دیکھ بھال ایک جوکی کی ذمہ داری
میں شامل نہیں ہے۔ لیکن عائشہ نے یہ کام اس لیے
سنبھالا کہ وہ گھوڑوں کو قریب سے دیکھنا اور جاننا
چاہتی تھیں، گھوڑوں کو چارہ دینا، ان کی مالش
کرنا، انہیں کھریرا اور ورزش کرانا۔ یہ سب
باتیں عائشہ کے معمول میں داخل ہوگئیں، ½۱۲ بجے

کھانے کا وقفہ ہوتا اور ساڑھے تین بجے تک وہ
آرام کرتیں۔ اس کے بعد ٹریننگ کا سلسلہ دوبارہ
شروع ہوجاتا۔ اس بار انہیں گھوڑے کی ننگی
پیٹھ پر بیٹھنا پڑتا، یہ ٹریننگ دو گھنٹے تک چلتی۔
شام کو گھوڑے کو چارہ دینے کے بعد وہ اپنی
بائیسکل پر بیٹھ کر گھر پہنچ جاتیں۔ وہ اس قدر
تھک جاتی تھیں کہ کھانا کھا کر فوراً ہی بستر سنبھال
لیتیں۔ ان دس مہینوں میں ان کی سوشل لائف
صفر کے برابر ہو گئی۔ اصطبل میں وہ اکیلی لڑکی
تھیں۔ وہ اپنے دل کی بات کس سے کریں۔ دن
بھر کا کام اور زیادہ کام۔ تفریح کا وقت نایاب
تھا۔ اس زمانے میں کبھی کبھی عائشہ بہت اداس
ہوجاتیں لیکن جوکی بننے کا خیال ان کی ہمت پھر
تازہ کر دیتا۔

بنگلور میں ٹریننگ ختم ہونے کے بعد
عائشہ کو جوکی کا لائسنس ملنا تھا۔ ان کے باپ
نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بنگلور کا لائسنس قبول
نہ کریں اس طرح وہ ایک اصطبل اور ایک
اُستاد سے بندھ جائیں گی۔ انہیں ۳ برس تک
ایک ہی استاد کی نگرانی میں کام کرنا پڑے گا۔ اس
لئے عائشہ کو پونا میں آل انڈیا لائسنس لینا چاہیے
تاکہ وہ کسی کی پابند نہ ہوں اور فری لانس کام کریں۔
عائشہ واپس پونا پہنچ گئیں اور ستمبر ۱۹۸۲ میں انہیں
آل انڈیا لائسنس مل گیا۔ اس طرح وہ ہندوستان کی
پہلی جوکی عورت بن گئیں۔

عائشہ اب تک سو سے زیادہ ریسوں میں
حصہ لے چکی ہیں اور ان میں کئی ریسیں جیت
چکی ہیں۔ پہلی بار جب وہ ایک بڑی ریس میں
حصہ لے رہی تھیں تو اتنی نروس تھیں کہ وہ جوکی
کے کمرے سے ۱۲ بار باتھ روم گئیں۔ انہیں
دست لگ گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ
ریس انہوں نے جیت لی۔ ■■

جدید تکنیک کے مطابق بالوں کا حسن جڑی بوٹیوں کے استعمال میں ہے۔
ٹریٹ آملہ شکا کائی ہیر آئل اور ٹریٹ ہربل ہیر سوپ، آملہ، شکا کائی، مہندی اور
دیگر جڑی بوٹیوں سے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ جڑی بوٹیاں لمبے، گھنے، چمکیلے اور
کالے بالوں کو بڑھانے کے لئے صدیوں سے مشہور رہیں۔
جی ڈی انٹرنیشنل پوسٹ بکس ۷۱۸۶، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

آیئے پرندوں کی طرح ہوا میں اڑیں

انور شمیم

انسان صدیوں سے ہوا میں اُڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ زمین پر دوڑتا ہے سمندروں میں تیرتا ہے، لیکن ہوا میں اُڑ نہیں سکتا۔ ہوا میں اُڑنے کے لئے پروں کی ضرورت ہوتی ہے اور انسان پروں سے محروم ہے۔ اگر انسان نقلی پر لگا کر اُڑنا چاہے تو بھی نہیں اُڑ سکتا ایک سرپھرے سائنس داں نے ایک بار اپنے بازوؤں پر نقلی پر لگائے اور گھر کی چھت سے کود پڑے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ حضرت ہڈی پسلی تڑوا بیٹھے۔ ویسے انسان نے ہوائی جہاز، راکٹ، بیلون اور گلائیڈر ایجاد کئے، جن میں بیٹھ کر وہ پرندوں سے تیز اور اونچا اُڑ سکتا ہے۔ بیلون یا گرم ہوا کے غبارے بغیر پروں کے ہوتے ہیں، جب کہ ہوائی جہاز اور گلائیڈر کی شکل پرندے سے ملتی ہے۔ گلائیڈر بغیر انجن اور پٹرول کے چلتا ہے۔ اس میں آواز نہیں ہوتی۔ یہ لکڑی کا بنا ہوتا ہے۔ اسے ایک ہوائی جہاز میں باندھ کر اوپر لے جاتے ہیں۔ اور بلندی پر پہنچ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ عام طور پر ایک جیپ بھی ہوائی جہاز کا کام انجام دیتی ہے۔ گلائیڈر کو زنجیر سے باندھ کر تیز دوڑاتے ہیں پھر رسّی الگ ہو جاتی ہے اور گلائیڈر زمین سے اوپر اٹھ جاتا ہے اب جگہ جگہ گلائیڈر کلب کھل گئے ہیں جہاں جیپ یا ہوائی جہاز کی جگہ ایک چرخی ہوتی ہے

اس میں لوہے کی زنجیر بنی رہتی ہے۔ اس زنجیر کا دوسرا سرا گلائیڈر سے بندھا ہوتا ہے۔ یہ چرخی بجلی سے چلتی ہے اور گلائیڈر کو تیزی سے کھینچتی ہے۔ اس کے بعد یہ زنجیر خود بخود الگ ہو جاتی ہے۔ اور گلائیڈر ہوا میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ آج کل سیکڑوں عورتیں گلائیڈر چلانے کی تربیت حاصل کر رہی ہیں۔ ہوا میں اُڑنے کا یہ سب سے سستا نسخہ ہے۔ ہوا کے سمندر میں گھنٹوں تیرتے رہیے۔ نہ پٹرول کی کمی کا ڈر، نہ انجن خراب ہونے کا خطرہ۔

گلائیڈر کی وجہ سے انسان بغیر کسی مشین کے ہوا میں اُڑنے کے قابل تو ہو گیا لیکن اس کا ہوا میں اُڑنے کا ارمان جوں کا توں رہا۔ گلائیڈر میں بیٹھنے کے لئے دو آدمیوں کی جگہ ہوتی ہے نیز ہوائی صورت میں دروازے بند ہو سکتے ہیں۔ انسان محفوظ اور مامون گلائیڈر میں مزے سے بیٹھا رہتا ہے۔ لیکن اب انسان ایک پرندے کی طرح کھلی فضا میں اُڑنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اس نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے، جس میں تین ڈنڈوں اور دو پروں کے سوا کچھ نہیں۔ دور سے دیکھیں تو اس پر واقعی ایک پرندے کا گمان ہوتا ہے۔ اس کو ہاتھ گلائیڈر کہتے ہیں۔ اس میں ہوا سے بچاؤ کے لئے کوئی سامان نہیں ہے۔ بارش اور طوفان سے محفوظ رہنے کے لئے کوئی طریقہ نہیں ہے جو ہوا میں اُڑتے ہوئے ایک پرندے پر بیتتی ہے وہی ہاتھ گلائیڈر کے ذریعہ اُڑنے والے پر بیتتی ہے۔ انسان اس گلائیڈر میں دونوں ہاتھوں سے ایک ڈنڈے کو پکڑ لیتا ہے۔ پاؤں پیچھے ایک ڈنڈے پر ٹکا لیتا ہے۔ اس کے لئے ہوائی اڈے کی ضرورت نہیں ہے، جیب اور چرخی درکار نہیں۔ انسان کسی بھی اونچے پہاڑ کی منڈیر یا کسی بلند و بالا عمارت کی چھت سے اُڑ سکتا ہے۔

ہاتھ گلائیڈر سب سے پہلے ۱۹۷۰ کے قریب امریکہ میں ایجاد ہوئے۔ وہاں کے لوگوں نے اس ایجاد کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہاتھ گلائیڈر کے بیسیوں بلکہ سیکڑوں کلب کھل گئے۔ لوگ گھنٹوں ہوا میں تیرتے پھرتے، نیچے زمین، پہاڑ اور سمندر کا نظارا کرتے۔ جب دل بھر جاتا تو نیچے اُتر آتے۔

ابتدا میں یہ شوق مردوں تک محدود تھا۔ لیکن پھر اس میں عورتوں نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ آج کل مغربی ممالک میں سیکڑوں عورتیں اسی طرح ہوا میں اُڑتی پھرتی ہیں۔ یہی نہیں، وہ ہاتھ گلائیڈر کے بین الاقوامی مقابلوں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ یہ کھیل سخت محنت طلب اور خطرناک ہے۔ ہزاروں فٹ اونچے پہاڑ کی منڈیر پر کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے سے ہی جھرجھری آ جاتی ہے۔ گلائیڈر چلانے والے گلائیڈر کو ہاتھوں میں پکڑے کچھ فاصلے سے دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور منڈیر سے چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ آگے ان کا حوصلہ ہی ان کا ساتھی ہوتا ہے۔ بین الاقوامی مقابلوں میں کٹھن سے کٹھن جگہ تلاش کی جاتی ہے، تاکہ انسان کی حاضر دماغی اور حوصلے کا امتحان لیا جا سکے۔

اس وقت دنیا میں آدھی درجن عورتیں ان مقابلوں میں حصہ لیتی ہیں۔ وہ مہارت اور حوصلہ میں کسی طرح مردوں سے کم نہیں۔

اب یہ کھیل ہندوستان بھی پہنچ گیا ہے۔ گزشتہ دنوں ایک بین الاقوامی مقابلہ ہمارے ملک میں بھی منعقد ہوا۔ اس کا نام 'ہمالیہ چیمپین شپ' تھا۔ اس مقابلے کے لئے ہماچل پردیش کی کانگڑہ وادی منتخب کی گئی۔

ہندوستان کے اس بین الاقوامی مقابلے میں تین عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ کم آسٹریلیا کی رہنے والی ہے۔ جوڈی انگلستان سے آئی تھی۔ اور لیری امریکہ سے۔ ان تینوں میں جوڈی نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ اس مقابلے میں حصہ لینے والوں کی کل تعداد ۴۴ تھی یعنی ۴۱ مردوں کے مقابلے میں ۳ عورتیں تھیں۔ جوڈی ماہروں کی فہرست میں کافی نیچے تھی لیکن اس نے مقابلے میں تیسرا انعام جیت کر سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عورت نے بین الاقوامی مقابلے میں اتنا اونچا مقام حاصل کیا ہو۔ جوڈی کو مردوں کو شکست دینے میں بڑا لطف آتا ہے۔ وہ ان مقابلوں میں حصہ لینا پسند نہیں کرتی جن میں صرف عورتیں شریک ہوں۔ وہ مردوں سے لوہا لینا چاہتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ کچھ مرد تو میرے ہاتھوں شکست کھا کر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ برا مان جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی مرد نے اس سے تین دن تک بات نہیں کی تھی۔ کھیل میں بھی مردوں کی چلتی ہے۔ عورتوں کے داخلے پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے لیکن جوڈی کو اس بات کی پروا نہیں ہے۔

جوڈی نے ۴ سال پہلے ہاتھ گلائیڈر چلانا سیکھا تھا۔ وہ اب تک ۵۰ گھنٹے ہوا میں پرواز کر چکی ہے۔ اسے اس کھیل میں حصہ لینے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ ایک بار اس نے ایک رسالے میں اس کھیل پر ایک مضمون

پڑھا۔ اس کے پڑھتے ہی اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوئی اور اس نے اس کھیل کو سیکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن جب اس کے گھر والوں کو اس فیصلے کا علم ہوا تو انہوں نے اس کی پرزور مخالفت کی۔ اس کا خاندان جوہری ہے۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ جوڈی اپنی جان کو بلاوجہ جوکھم میں ڈالے۔ انہوں نے جوڈی کو لاکھ سمجھایا لیکن اس نے ان کی ایک نہ مانی اور ہاتھ گلائیڈر کلب میں شامل ہو گئی۔ جوڈی نے انگلستان میں ابتدائی تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تربیت کے لئے آسٹریا چلی گئی۔ اسے اپنی محنت اور لگن کا صلہ جلد ہی مل گیا۔ تین سال کی قلیل مدت میں وہ چیمپین بن گئی۔

۱۹۸۴ میں امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا میں ہاتھ گلائیڈر کا بین الاقوامی مقابلہ منعقد ہوا تو اس میں چار عورتیں بھی شامل تھیں۔ جوڈی بھی ان میں سے ایک تھی۔ جوڈی نے اس مقابلے میں ۲½ سو کیلومیٹر کا فاصلہ ۷½ گھنٹے میں طے کیا۔ جوڈی کو آج بھی اس دن کی یاد آتی ہے تو اس کے بدن میں کپکپی دوڑ جاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ اس دن کی کہانی سناتی ہے۔ جب اس کا گلائیڈر ۸۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا تو سردی کی شدت سے اس کے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ وہ فضا میں ۲½ میل کی اونچائی پر اڑ رہی تھی۔ اتنی اونچائی پر قیامت کی سردی ہوتی ہے۔ ہوا لطیف ہوتی ہے اور سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ ہاتھ گلائیڈر چلانے والے کو اوندھے منہ لیٹنا پڑتا ہے۔ جوڈی ۷ گھنٹے تک اوندھے منہ گلائیڈر میں لٹکی رہی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا لیکن اسے ۲½ سو کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اس کی طاقت جواب دے رہی تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور کسی نہ کسی طرح یہ فاصلہ طے کرلیا۔ جب وہ منزلِ مقصود پر پہنچی تو وہ تقریباً ادھ مری ہو چکی تھی۔ جب وہ زمین پر اتری تو لوگوں نے اس کی کامیابی پر تالیاں بجائیں۔ لیکن جوڈی میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ لوگوں کی تعریف کے جواب میں شکریہ کے دو لفظ بھی کہہ سکتی۔ اس نے اس دن کے لئے تین سال تک محنت کی تھی۔ لیکن جب کامیابی اس کے قدم چوم رہی تھی اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ ہاتھ ہلا کر لوگوں کی تالیوں کا جواب دے سکے۔

جوڈی کا کہنا ہے کہ ہاتھ گلائیڈر کی سواری نازک مزاج لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ گلائیڈر کا وزن ۴۵ کیلو کے قریب ہوتا ہے۔ اتنے بھاری گلائیڈر کو لے کر اڑنا خاصا دشوار ہے۔ خود جوڈی کا وزن ۵۶ کیلو ہے یعنی اس کے گلائیڈر سے دو تہائی لیکن ایک دفعہ آپ ہوا میں تیرنے لگیں تو گلائیڈر کا وزن معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ہاتھ گلائیڈر چلانے والے کو ہر وقت موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تیز اور طوفانی ہوا اس کو راستے سے بھٹکا سکتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہوا بند ہو جائے تو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جوڈی نے اپنی اڑان کے دوران جسم پر روئی کا جیکٹ اور سر پر ہیلمٹ پہنا ہوا تھا۔ ایکسیڈنٹ کی صورت میں ہیلمٹ سر کو چوٹ سے بچا سکتا ہے۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود عورتیں اس کھیل میں حصہ لیتی ہیں۔

جوڈی کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آئے ہیں جب وہ موت کے منہ سے نکل کر نکل آئی۔ ایک بار وہ اٹلی میں ایک مقابلے میں حصہ لے رہی تھی۔ یہ اڑان دو گھنٹے کی تھی۔ جوڈی کو یہ اڑان بہت کٹھن معلوم ہوئی۔ ہوا کا رخ اس کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ ہوا میں طوفان کی تیزی تھی۔ ہاتھ گلائیڈر چلانے کے لئے بڑی مہارت کی ضرورت ہے۔ تیز ہوا میں اس کو موڑنا خاصا دشوار ہے۔ گلائیڈر میں ایسے اوزار لگے ہوتے ہیں جن کی مدد سے اسے نیچے اتارا جا سکتا ہے۔ جوڈی کے ہاتھ اتنے یخ بستہ ہو گئے تھے کہ اسے ان اوزاروں کے استعمال میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنا گلائیڈر کس طرح نیچے اتارے۔ اڑان جاری رکھنا موت کو دعوت دینا تھا۔ جوڈی کو کسی نہ کسی طرح زمین پر اترنا تھا، لیکن اس کے ہاتھ صحیح کام نہیں کر رہے تھے۔ آخر اس نے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔ اس کا گلائیڈر ایک درخت سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔ خوش قسمتی سے جوڈی کو زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ صرف اس کے گھٹنے کی ہڈی اتر گئی۔

جوڈی کی عمر ۳۴ سال ہے۔ وہ ہر ہفتہ تین گھنٹے پریکٹس کرتی ہے۔ وہ برطانیہ کی ہاتھ گلائیڈر کی چیمپین ہے۔ اس نے ہوائی مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے ساری دنیا کا چکر لگایا ہے لیکن جو لطف اسے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں پر اڑنے میں آیا، وہ اور کہیں نہ ملا۔ جوڈی ایک دن عالمی چیمپین بننا چاہتی ہے۔ عالمی چیمپین بننا آسان نہیں، لیکن جوڈی کی لگن دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن اس کا خواب ضرور پورا ہوگا۔

ابرار محسن

حامد میاں بڑی منتوں اور مرادوں سے چار بہنوں کے بعد پیدا ہوئے تھے اس لیے جتنا بھی دُلار ہوتا کم تھا۔ بایاں کان چھید کر بُندہ بھی ڈالا گیا۔ ماں فخر سے گردن اکڑائے انہیں اس طرح گود میں لیے پھرتیں جیسے وہ کسی عالمی مقابلے میں جیتی ہوئی ٹرافی ہوں۔ لاکھ کا پھر بھی لڑکا ہوتا ہے۔ جائداد کا وارث، خاندان کا چراغ۔ بھلا لڑکی کا ہونا بھی کوئی ہونا ہے؟ بیاہ سے پہلے فکر ہی فکر اور بیاہ کے بعد غم ہی غم۔ لڑکی کی پیدائش کو تو محض برداشت کر لیا جاتا ہے کسی حادثے یا کسی مرض کی طرح۔ بڑی بوڑھیاں بھی ٹھنڈی سانس بھر کر ہی مبارک باد دیا کرتی ہیں۔ "چلو خیر، لونڈیا ہی سہی نصیب اچھا ہو۔ ہائے!" حامد میاں کی ولادت سے ایک اور فائدہ یہ بھی ہوا کہ ماں کے دل سے یہ خدشہ بھی دور ہو گیا کہ کہیں ان پر سوکن لا کر نہ بٹھا دی جائے۔ اب کوئی ڈر نہ تھا ہر رسم دھوم دھڑاکے سے پوری کی گئی۔ اور حامد میاں کھیلتے کودتے سیانے ہو گئے گھر کی زمین کافی تھی اور زمیندار لوگوں کے لیے تعلیم یا کسی تجارت وغیرہ کی طرف توجہ دینا ویسے بھی معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔ پھر بھی رسماً انہیں بھی مقامی اسکول میں داخل کرا دیا گیا جس پر ماں نے کافی واویلا مچایا تھا پڑھنے کا سوال ہی کیا تھا ہر سال ماسٹر کو پیسے دے دیے جاتے اور انہیں اگلی جماعت میں چڑھا دیا جاتا۔ مگر آٹھویں کے بعد ان کا جی کچھ ایسا اچاٹ ہوا کہ مدرسے کو خیرباد کہہ دیا جلد ہی وہ عمر کے اس حصے میں جا پہنچے جب زمیندار کا لڑکا بڑوں سے چھپ کر بیڑی پینا شروع کر دیتا ہے اور غزل کے اشعار بھی سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہتیرے مشاغل تھے ــــ پتنگ بازی، کبوتر بازی، اور کرکٹوں پر لٹریں دوڑانا۔ گویا غزلوں سے باعمل طریقے سے لطف اندوز ہونا۔

حامد میاں کبوتر باز بھی بن گئے اور شاعر بھی مگر جب انہوں نے بڑی شدت سے عشق کے

کوچے میں قدم رکھا اور سہرے بازی کی ابتدا ہوئی جب وہ رنگِ پیراہن اور خوشبوئے زُلف کی بات کرنے لگے تو ماں نے ان کے والد سے کہہ ہی دیا کہ "لونڈا سیانا ہوگیا ہے میں تو اس کے سر پر سہرا باندھوں گی"

گاڑی بھر لڑکیاں دیکھی گئیں کسی کی شکل میں عیب نکالا گیا تو کسی کی عمر زیادہ بتا کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا۔ کوئی غریب ہونے کی وجہ سے قابلِ توجہ نہ سمجھی گئی آخر کار ماں اور بہنوں کے متفقہ فیصلے سے ایک لڑکی چُنی گئی جو خوب صورت بھی تھی اور جس کا باپ اُونچی شادی کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

جب ماں نے حامد میاں سے ان کی شادی کا ذکر کیا تو وہ پہلے تو بُرا مانے، لڑکی کو صلواتیں سُنائیں، پھر شرمائے۔ آخر ماں سے کہہ دیا۔ "تو جیسا چاہو بوا"

برخورداری کی سند فوراً ہی مل گئی یہی لچھن ہوا کرتے ہیں شریف گھرانوں کے لڑکوں کے۔ جہاں والدین نے چاہا انتہائی سعادت مندی سے مان گئے۔ رہا عشق۔ اس پر کیا اثر پڑتا ہے؟ اس کا چکر بھی چلتا رہے گا۔ عشق اور شادی دو جداگانہ مشغلے ہیں۔ ان میں سے ایک اپنی مرضی سے ہوتا ہے دوسرے میں والدین کی مرضی کا دخل ہوتا ہے۔ اور اگر لڑکی پسند نہ بھی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ اس وقت ماں باپ کی لاج کو رکھ لو، پسند نہ آئے مت گھاس ڈالنا، دوسری لے آنا۔ ایسا ہوتا آیا ہے۔ سماج اجازت دیتا ہے مگر عشق و عاشقی کا فعل غیر پاک محض شاعرانہ تک ہی محدود رکھو۔ اسے اپنی زندگی میں نہ لاؤ۔ عملی عشق بے ہودگی ہے بس زبانی عیاشی کرتے رہو، زبان سے دودھ کی نہریں کھودتے رہو یا جنگلوں کی خاک چھانو۔ شادی وہیں ہوگی جہاں بزرگ چاہیں گے۔ اشعار میں محبوب کے لئے آسمان کے تارے توڑو مگر جب بیاہ کی نوبت آئے تو ٹانگوں میں دُم دبا کر ماں باپ کی لائی ہوئی جہیز سے لدی پھندی لونڈی کو گھر میں ڈال ہی لو۔

بیاہ کی تاریخ رکھی گئی، حامد میاں کے اُبٹن لگایا گیا، زنانے میں ڈھولک پر گیت گائے گئے۔ وہ دولہا بنے، گھوڑے پر بیٹھے اور باجوں اور گولوں کی چھاؤں میں حاجی پیر کے مزار پر سلام کرنے گئے۔ اس کے بعد بارات نے دُلہن کے گھر کی سمت کوچ کیا۔ رسمیں، عورتوں کا ہجوم، کپڑوں کی سرسراہٹ، بچوں کا شور، نکاح، سلامی، قورمہ اور بریانی۔ جب وہ دھوم دھام سے واپس لوٹے تو کئی گاڑیوں میں جہیز تھا۔ اور ایک دُلہن۔ محض ایک نسوانی جسم جسے اس کے والدین نے کنیز بنا کر زیور اور کپڑوں میں لاد کر گھر سے دھکیل دیا تھا۔ اس جسم کے اپنے بھی کوئی جذبات تھے، پسند ناپسند تھی، اس کا تصوّر بھی گناہ تھا۔

دلہن گھر آئی، ساس نندیں واری صدقے ہوئیں، پھر رسموں کا دور چلا ـــ نہ جانے کب چوروں کی طرح، دبے پاؤں حامد میاں نے جا کر ایک قطعاً اجنبی چہرے پر سے گھونگھٹ ہٹا دیا۔

چند دنوں تک بیاہ کا خمار طاری رہا۔ اس کے بعد حامد میاں تو اپنے مشاغل سے لگ گئے ـــ اور کنیز اپنی اوقات پر لے آئی گئی۔ اب حامد میاں کی ماں محض ساس اور ان کی بہنیں نندیں تھیں ـــ اور ان کے درمیان ایک کنیز ـــ تنہا اور بے بیاہ و مددگار۔ شادی سے حامد میاں کے معمولات میں ذرّہ بھر فرق بھی نہ پیدا ہوا ـــ ہاں نازوں سے پالی ایک بیٹی لونڈی بن چکی تھی جس کا فرض تھا کہ خاندان بھر کی دل جوئی کرے، نخرے سہے، لال پیلی آنکھیں دیکھے اور چار لونڈی کا کام تنہا نبٹائے ـــ بیس ہزار میں خرید کر لائے تھے آخر۔ اور وہ رقم بھی نقد نہیں اُدھار تھی، قاضی صاحب کے سامنے سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں رقم ادا کرنے کا محض ایک رسمی اقرار جس کی اہمیت مذہبی کتابوں میں ہے یا دفتروں میں۔

حامد میاں جہیز میں ملی ہوئی گھڑی کلائی پر باندھے چُرمر چُرمر کرتے جوتے پہنے بستی میں رنگِ پیراہن اور خوشبو کے زُلف کا لطف اُٹھاتے رہے۔ کبوتروں سے بڑی دلچسپی تھی۔ پوری اٹاری میں کابکیں ہی کابکیں جن میں کبوتر ہی کبوتر ـــ ہر قسم کا، ہر نسل کا۔ صبح شام کئی کئی گھنٹے وہ انہیں دانا پانی دیتے اور اُڑان کی مشق کراتے۔ بھُوری دُم والا شیرازی تو جان تھا ان کی۔ اور کیوں نہ ہو، پورے پانچ سو گن کر دئیے تھے اس کے وہ بھی نقد۔ جب وہ کبوتروں کے ساتھ آسمان میں ایک باوقار انداز سے پرواز کرتا حامد میاں کا سینہ فخر سے پھول جاتا۔

حامد میاں عموماً مردانے ہی میں سوتے تھے۔ بزرگوں کے زمانے کی یہی روایات تھیں۔ شوہر اور بیوی ایک علیحدہ کمرے میں سوئیں اس سے زیادہ شرمناک بات کوئی ہو ہی نہ سکتی تھی۔ بھئی باہر باپ کے پاس سوؤ اور اگر حویلی میں سونا ہے تو بیوی سے کوسوں دُور کا نا

رکھو۔ شریف گھرانوں میں ایسی بے حیائیاں نہیں چلتیں کہ میاں بیوی سے بچوں سے پہلے پیار کریں۔ ماں نے بڑے ارمانوں سے بیٹا بیاہا تھا، بڑے چاؤ سے بہو لائی تھیں بس شروع شروع میں چند دنوں تک ہوتا رہا چونچلا۔ اتنا کافی ہے۔ آخر کب تک لاڈلی بنا کر رکھتیں۔ اور پھر پیر کی جوتی پیر میں ہی سجتی ہے — اور جوتی بھی کیسی۔ بلا قیمت کی۔ صبح سب سے پہلے اس کا اٹھنا لازمی تھا۔ سورج کا دیر سے نکلنا قابلِ معافی تھا مگر بہو دیر سے سو کر اٹھے، یہ تو غضب تھا۔ جاڑا ہو یا گرمی، منہ اندھیرے اس کا بستر چھوڑ دینا اس کا فرضِ اولین تھا۔ اور اس کے بعد جھاڑو، برتن، کھانا، گھر بھر کے کپڑے دھونا، خالی وقت اگر کبھی ملا بھی تو چرخہ کاتنا — سارا دن کی مشقت کے بعد آدھی رات گزر جانے کے بعد کہیں کمر لگانے کی نوبت آجاتی ہوگی حامد میاں کی شادی شدہ بہنیں جو اپنے اپنے گھروں میں بہوئیں بن کر اسی طرح کی زندگی گزار رہی تھیں وہ بھی میکے آکر بدیت کے مزے لوٹتیں اور ماں بیٹیاں مل کر اس کے سینے پر مونگ دلتی رہتیں۔ بیوی کے لئے کوئی چیز لانا شوہر کے لئے ویسے بھی معیوب بات ہے اور خصوصاً جب لڑکا سعادت مند ہو تب تو اس کا اور بھی سوال نہیں اٹھتا۔ اگر حامد میاں کبھی بھولے بھٹکے کبھی کچھ لے بھی آتے تو ماں کی تیوری چڑھ جاتی "یہ چونچلے نا چلنے کے ہیں اس گھر میں۔ جو چیز بھی آئے پہلے بہنوں کو ملے"۔ اس زمانے کا چلن ہی کچھ ایسا ہی تھا کہ ہر چیز جو گھر کی بیٹیوں کے لئے جائز ہوتی بہو پر حرام کر دی جاتی۔ اگر اپنی بیٹی کچھ کرتی ہے تو سبحان اللہ اور وہی بہو کرنا چاہے تو ساس اور نندیں اپنی زبانوں سے اس کی کھال کھینچ لیتی تھیں۔ ماں اور بہنوں کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ یہی ہوتا تھا کہ ماں بیٹے کے اور بہنیں بھائی کے کان بیوی کے خلاف اتنے بھر دیں کہ بیوی کی محبت کا بیج بھی دل میں باقی نہ رہے۔ ماں کسی قیمت پر یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ بیٹا ان کے علاوہ اور بھی کسی کا ہو کر رہے۔ بیوی — ایک مونث۔ بھیڑ، بکری، گائے بھینس کی طرح گھر میں بندھی ہوئی — ایک کھونٹے سے۔ مگر ان مویشیوں کی رسی کچھ تو دراز ہوتی ہی ہے۔ بیوی کے گلے کی رسی ذرا سی قدر لمبی ہوتی تھی کہ بس وہ سانس لے سکے۔ اور یہ کچھ کم تھا کہ کم از کم سانس لینے کی گنجائش تو چھوڑ دی جاتی تھی؟ اور اس پر مزید کرم یہ کہ جلد سے جلد اس کی گود بھری ہو ورنہ شوہر پر لٹکا ہی دیا جاتا تھا۔ یہ کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ گود بھری ہونے میں تاخیر شوہر کی نا اہلی کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔

حامد میاں کبوتر اڑاتے رہے۔ ایک برس گزر گیا۔ اب وہ مردانے ہی میں رہا کرتے تھے کیوں کہ بیوی امید سے تھیں۔ ایسی کیفیت میں رنگِ پیراہن اور خوشبوئے زلف کا متوالا گھر میں آخر کیا جھک مارتا!

یہ بھی بالکل اتفاق ہی تھا کہ جس دن حامد میاں صاحبِ اولاد ہوئے اسی دن ان کی ماں بھی ایک اور بیٹی کو دنیا میں لے آئیں ایک بے حساب بچے ہو چکے تھے۔ جتنے بچے پیدا ہو سکتے تھے ہوتے تھے، جب بڑھاپا آتا تو دوائیوں کی بیساکھیاں لگا کر بچے پیدا کرتے۔ اور یہ قطعاً شرم کی بات نہ تھی کہ اپنے بھی اولاد ہو اور اولاد کی بھی اولاد ہو۔ جوان بیٹے کا جوان بیوی سے دل لگانا البتہ بے غیرتی تھی — اور جوان اولاد کے ہوتے ہوئے ضعیفی میں بچے پیدا کرنا درست تھا۔

حامد میاں کے پاس اولاد کے لئے بھی اتنا ہی وقت تھا جتنا بیوی کے لئے گھر میں ان کے لئے ایک نسوانی جسم لا کر رکھ دیا گیا تھا تو بچہ بھی ہونا ہی تھا۔ ہر سال ہوتا رہے تب بھی ان کی صحت پر کیا اثر تھا؟ ان کے کون سے کبوتر کم ہو گئے تھے!

بچے کی پیدائش کے تیسرے دن نہ جانے کیا ہوا کہ بیوی کی طبیعت خراب ہو گئی اور حالت بگڑنے لگی۔ ابا حکیم صاحب کو بلا لائے جنہوں نے پردے کے پیچھے سے نبض دیکھ کر دوا تجویز کر دی۔

حامد میاں کبوتر بازی کے سالانہ مقابلے میں الجھے ہوئے تھے۔ زبردست اڑانیں ہو رہی تھیں۔ عزت کا سوال تھا۔ شیرازی کو دیکھ دیکھ کر حریفوں کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ کبوتر فضا میں تیر رہے تھے۔

"حامد میاں دلہن کی سانس اکھڑ رہی ہے" کسی نے کہا۔

حامد میاں کی نگاہیں ان کا پورا کبوتروں کی پرواز کا تعاقب کر رہا تھا اچانک ایک باز شیرازی پر جھپٹا۔

"حامد میاں دلہن چل بسیں" کسی نے پھر اطلاع دی۔ کوئی بات نہیں۔ دوسری لونڈی آجائے گی۔

حامد میاں کی آنکھوں میں آنسو آگئے شیرازی کی موت — بے وقت موت دوسرا شیرازی کہاں ملے گا؟

تبسم

باپ : بیٹے، آج تم نے تاریخ کا پرچہ کیسا کیا؟

بیٹا : پاپا، بالکل اچھا نہیں ہوا لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ پرچے میں سب سوال ایسے واقعات کے بارے میں تھے جو میری پیدائش سے پہلے کے تھے۔

●

ایک دیہاتی اور اس کی بیوی پہلی بار ٹرین میں بیٹھے۔ راستے میں ایک اسٹیشن پر انہوں نے کچھ کیلے خریدے۔ ٹرین چل دی تو دیہاتی نے کیلا چھیل کر جیسے ہی منہ میں رکھا، ٹرین ایک لمبی سرنگ میں داخل ہوئی۔ اس نے فوراً چلا کر اپنی بیوی سے کہا "ارے رکو۔ تم نے کیلا تو نہیں کھایا؟"

بیوی نے جواب دیا "نہیں۔ کیوں کیا بات ہے؟"

دیہاتی نے بیوی کو سمجھایا "کیلا ہر گز .کھانا، میں نے جیسے ہی کیلا منہ میں رکھا، میں اندھا ہوگیا۔ مجھ کو کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔"

●

ایک صاحب مچھلی کے شکار کے شوقین تھے۔ ایک روز وہ شکار کے لیے گئے مگر سارے دن ایک بھی مچھلی ان کے ہاتھ نہیں لگی۔ اپنی بیوی کی لعن طعن کے ڈر سے وہ خالی ہاتھ گھر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ وہ ایک دکان پر گئے جہاں مچھلیاں بکتی تھیں اور دکان دار سے کہا "تم وہیں کھڑے کھڑے چار مچھلیاں باری باری میری طرف پھینکو۔"

دکان دار نے حیران ہو کر پوچھا "مچھلیاں کیوں پھینکوں؟ میں سمجھا نہیں۔"

ان صاحب نے کہا "آج میں ایک مچھلی بھی نہیں پکڑ سکا۔ تمہاری پھینکی ہوئی مچھلیاں اپنی بیوی کو دکھا کر کہہ سکوں گا کہ یہ میں نے پکڑی ہیں۔ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"

●

باپ : کیا تم جانتی ہو کہ ہمارے بیٹے نے میرا دماغ پایا ہے؟

ماں : تم صحیح کہتے ہو، کیوں کہ میری عقل تو میرے پاس ہے۔

●

ڈاکٹر : دل کے آپریشن کے بعد اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔

مریض : آپریشن کے بعد تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میرے سینے میں ایک کی بجائے دو دل دھڑک رہے ہیں۔

ڈاکٹر : اوہو! اب پتہ چلا! میں پریشان ہو رہا تھا کہ اپنی رسٹ واچ کہاں رکھ کر بھول گیا تھا۔

●

ایک بادشاہ حمام کر گیا۔ ایک سر پھرا بھی وہاں آگیا۔ بادشاہ نے مذاق کے طور پر اس سر پھرے سے پوچھا "ذرا میری قیمت تو بتاؤ۔"

سر پھرے نے کہا "پچاس روپے"

بادشاہ نے ہنس کر کہا "خوب : پچاس روپے کی تو صرف میری لنگی ہے۔"

سر پھرا بھی ہنس کر بولا "میں نے بھی تو پچاس روپے لنگی کی ہی وجہ سے کہا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ لنگی کو الگ کر کے بھی تمہاری کوئی قیمت ہے؟"

●

ایک بار مرزا غالب نے اپنے ایک شاگرد سے کہا "جب میں مر جاؤں تو کہیں سے پرانا کفن لانا اور اس میں مجھے لپیٹ کر دفن کر دینا۔"

شاگرد نے حیران ہو کر پوچھا "اس سے کیا فائدہ ہوگا حضور؟"

مرزا غالب نے مسکرا کر جواب دیا "بہت فائدہ ہوگا، برخوردار جب منکر نکیر آئیں گے تو پرانا کفن دیکھ کر سمجھیں گے کہ مردہ پرانا ہے۔ اس سے سوال جواب ہو چکے ہیں۔"

خود بھی ہنسیے، دوسروں کو بھی ہنسائیے۔ نئے نئے، مزہ دار چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجیے۔ پرانے گھسے پٹے، بار بار سنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجیے، کیوں کہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

تکمیلِ آرزو

سعید فریدی

وہ تینوں بچپن کے ساتھی تھے۔
ساتھ دھول ــــ دھپا اور آنکھ مچولی کا
بل کھیلا، ایک ساتھ مدرسے سے لے کر
ج تک تعلیم حاصل کی اور ایک ساتھ نمایاں
یں سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔

ڈگری لینے کے بعد جلد ہی پرویز کو
سرکاری اسپتال میں ملازمت مل گئی،
نے اپنی رہائش گاہ کے ایک حصّے کو
سپنسری بنا لیا اور راشد کو شہر میں ایک
سی دکان مل گئی۔ اس طرح تینوں کام دھندے
ے لگ گئے ــــ پھر تھوڑے تھوڑے
فے کے ساتھ تینوں کی شادی ہو گئی۔

تینوں کی زندگی خوشیوں کے چمن میں
رام نظر آنے لگی، لیکن تینوں دوستوں کی
ندیریں الگ الگ تھیں، سوچنے اور عمل کرنے
انداز الگ الگ تھا۔ نظریات الگ الگ تھے،
اج الگ الگ تھا اور زندگی کو زندگی کا حسن
ینے کے منصوبے الگ الگ تھے۔ راستے
ں کسی فقیر کے "چند پیسے دے دو بابا" کے
سوال پر پرویز اس فقیر کو جھڑک دینے کا عادی
تھا، اطہر سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ جاتا تھا،
لیکن راشد اس فقیر کو چند پیسے دینا صرف
ضروری بلکہ فرض سمجھتا تھا۔ اس کے اندر رحم،
ہمدردی، تعاون اور خدمت کا جذبہ شروع
سے ہی موجود تھا۔ لیکن پرویز اور اطہر کو قدرت
نے یہ جذبے عطا نہیں کئے تھے۔ پھر بھی پرویز
نے بہت جلد ترقی کر لی ــــ وہ میڈیکل آفیسر
ہو گیا۔ اطہر کی ڈسپنسری میں مریضوں کی بھیڑ
لگی رہتی۔ لیکن راشد حوصلے، لگن اور ذہانت
کے باوجود زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ بات نہ
تھی کہ اس کے یہاں مریض آتے ہی نہ تھے

یا قدرت نے اس کے ہاتھوں میں شفا نہ
دی تھی۔ سب ہی کچھ تھا، لیکن قسمت کی
دیوی کچھ روٹھی سی تھی۔ ابھی اس کی ڈسپنسری
میں بھی مریض آتے تھے، لیکن ان سے وہ ناجائز
پیسے نہیں لیتا تھا۔ دس پیسے کی گولی کو سفوف
بنا کر پانچ روپے وصول کرنے کی کوشش
اس نے کبھی نہ کی تھی۔ محلے، پڑوس کے گھر والوں
سے وہ فیس نہ لیتا تھا۔ یہی نہیں ہر رودرد
نادار اور غریب مریضوں کو مفت دوائیں بھی دیتا
تھا۔ یہ سب کچھ کر کے اسے روحانی سکون
ملتا تھا۔ قدرت کی کرشمہ سازی بھی عجیب

ہوتی ہے۔ [illegible] اپنی محبت کا تحفہ [illegible]
[illegible] ایک [illegible] کی [illegible]
ہوتا ہے۔

راشد کی بیوی ایک متوسط گھرانے
کی بیٹی تھی۔ لیکن اس کی ذہنی پرواز بہت اونچی
تھی۔ اس کے خواب آسمانوں کی طرح بلند
تھے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ایک ایم بی بی ایس
ڈاکٹر سے اس کی شادی ہو رہی ہے تو اس کی
خوشی کا ٹھکانا نہ رہا ــــ اس کی آنکھوں کے
خواب مسکرانے لگے ــــ اس کی نگاہوں کے
سامنے جدید طرز کا ایک بنگلہ، صدر گیٹ پر
جالی جھروں میں لگی ہوئی خوبصورت کار، بنگلے
کے اندر آرائش کا تمام سامان رقص کرنے
لگے۔ شادی کے بعد وہ ایسی ہی زندگی کی متمنی
تھی جس میں صرف آرام ہی آرام ہو، عیش ہی
عیش ہو۔ اس طرح کے خواب ہر لڑکی بنتی
ہے۔ ایسی آرزوئیں تو ہر لڑکی سجاتی ہے، لیکن
عذرا کے اندر ان آرزوؤں کی کچھ زیادہ ہی
شدت تھی ــــ ایسی شدت کہ اس کی نگاہوں
میں شوہر کی عزت و عظمت بھی برقرار نہ رہ سکی۔
شادی کے بعد راشد کے معمولی سے
مکان میں قدم رکھ کر عذرا کے سارے خواب
بکھر گئے۔ یہاں تو کچھ بھی نہ تھا ــــ ایک نہ جہیز
تکمیلِ آرزو، راشد اور اس کی ڈگری کے سوا۔
عذرا نے شوہر کی رفعت کو نہیں دیکھا۔ اس کی
آنکھوں نے سب سے پہلے اپنے خوابوں کی
تعبیر تلاش کی۔ اور جب تعبیر نہ ملی تو وہ بجھ گئی۔
تنک مزاج بن گئی۔ جب عذرا پرویز اور اطہر
کی بیویوں سے ملتی تو اسے اپنی کمتری کا شدید
احساس ہوتا۔ ان دونوں کی بیویاں ہمیشہ عمدہ

ملبوسات زیبِ تن کئے رہتیں۔ ان کے ڈرائنگ روم بہت خوب صورت تھے۔ گھر میں ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر، فریج اور آرام و آسائش کا تمام سامان آچکا تھا۔ جب پرویز اور اطہر اسکوٹر پر اپنی بیویوں کو لے کر راشد کے یہاں آتے تو راشد تو بہت خوش ہوتے لیکن عذرا کو اپنے اندر کچھ ٹوٹتا سا محسوس ہوتا۔ وہ سوچنے لگتی؛ کاش راشد کے پاس بھی اسکوٹر ہوتا، عمدہ مکان اور آسائشِ زندگی کا سارا سامان موجود ہوتا، پھر وہ بھی عیش کرتی۔

بے اطمینانی کا احساس روز بروز گہرا ہی ہوتا گیا — اتنا گہرا کہ وہ اس کے بوجھ تلے ہر لمحہ دبی رہنے لگی — پہلے تو اس نے راشد سے کچھ نہ کہا..... لیکن کچھ کہے بغیر اس سے رہا بھی نہ گیا۔ اس لئے اس نے ایک دن راشد سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے، اب ہمارے حالات اچھے نہ ہو سکیں گے۔ دیکھئے پرویز اور اطہر نے کس قدر ترقی کر لی۔ آپ فاران کیوں نہیں چلے جاتے؟ آج کل وہاں اچھے ڈاکٹروں کی بہت ضرورت ہے۔ کچھ دن بعد ہی ہم لوگ بھی پرویز اور اطہر کی طرح اچھی زندگی گزارنے لگیں گے۔"

راشد کو عذرا کی یہ بات اچھی نہ لگی لیکن وہ بہت سلجھے ہوئے ذہن کا انسان تھا۔ اس نے بہت خاموشی کے ساتھ عذرا کو سمجھایا "قدرت کے گھر دیر ہے، اندھیر نہیں' عذرا — اس طرح تمہیں اپنا دل چھوٹا نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارے حالات ضرور بہتر ہوں گے — میں ضرور ترقی کروں گا اور تمہارے خواب ضرور پورے ہوں گے۔ کسی کے خوش گوار حالات یا اچھی زندگی دیکھ کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا دانش مندی نہیں۔ ہمیشہ اللہ پر بھروسا رکھنا چاہئے۔"

راشد کی ان باتوں سے عذرا کو وقتی سکون کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا — جلد سے جلد بہتر زندگی پا لینے کی آرزو ہر دن بڑھتی گئی — اور اس ہر دن بڑھتی ہوئی آرزو نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں سے چمکتی دمکتی زندگی کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ راشد سے بات بات پر اُلجھنے لگی۔ اسے اعتراض تھا کہ راشد محلے پڑوس کے گھروں میں جاکر مریض کو دیکھنے کی فیس کیوں نہیں لیتا، دواؤں کی قیمت کم کیوں لیتا ہے اور نادار مریضوں کو مفت دوائیں کیوں دیتا ہے۔ وہ کہتی تھی "پہلے گھر میں چراغ جلاؤ، پھر مسجد میں۔ یہ کیا کہ گھر میں اندھیرا ہے اور مسجد میں چراغ جلایا جارہا ہے۔ آج کے دور میں ایمان دار کون ہے اور ایمان داری کی زندگی اپنا کر کس کا پیٹ بھر رہا ہے؟ انسان کو وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملاکر چلنا چاہئے۔"

عذرا کے سوچنے کا انداز اور تھا، راشد کے سوچنے کا ڈھنگ اور، بہت تضاد تھا دونوں میں۔ عذرا چاہتی تھی کہ راشد فاران چلا جائے — فاران جائے بغیر حالات بہتر نہیں ہو سکتے'۔

راشد نے مجبوراً فاران جانے کی کوشش شروع کر دی۔ اسے جلد ہی ایران جانے کا ویزا مل گیا۔ اب عذرا بہت خوش تھی۔ لیکن راشد مغموم تھا — اسے اپنا وطن، وطن کا ذرّہ ذرّہ اور یہاں کا دُکھ سُکھ ہی عزیز تھا۔ اسے اپنے وطن کا کانٹا بھی پھولوں کی طرح شگفتہ لگتا تھا — لیکن عذرا کی آرزوؤں کی تکمیل بھی ضروری تھی — عذرا اس کی بیوی جو تھی، جسے وہ بے حد چاہتا تھا۔

راشد ایران چلا گیا۔
عذرا کی زندگی جگمگا اٹھی۔

کچھ دن بعد ہی پرانا مکان جدید طرز کی خوب صورت عمارت میں تبدیل ہو گیا — گھر میں ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر، فریج اور آرام و آسائش کا سارا سامان آگیا۔ خوب صورت اور سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں قیمتی وارڈروب میں رنگ برنگی ساڑیاں جھلملانے لگیں۔ وہ اپنی اسکوٹر پر بیٹھ کر پرویز اور اطہر کی بیویوں سے ملنے جاتی تھی، اور جب بھی ان لوگوں کے یہاں جاتی قیمتی کپڑے زیبِ تن کئے ہوتی۔ اب اس کا سر فخر سے بلند رہنے لگا تھا — وہ جیت گئی تھی۔ اس کی آرزوئیں پوری ہو چکی تھیں، خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔

راشد کو ایران گئے ہوئے پانچ سال سے زائد ہو گئے تھے۔ اس درمیان وہ ایک بار بھی اپنے وطن نہیں آیا تھا — شاید جان بوجھ کر۔ تب عذرا نے راشد کو لکھا: "اب تم آجاؤ راشد۔ تمہارے سوا اب مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں — آؤ اور دیکھو، تمہارے اور اپنے گھر کو میں نے کتنا خوب صورت سجایا ہے۔ تم جلد آجاؤ۔"

راشد کو عذرا کی شاید اسی تحریر کا انتظار تھا — اس نے عذرا کو لکھا: "یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ تمہاری ساری آرزوئیں پوری ہو گئیں اور تمہیں جن جن چیزوں کی ضرورت تھی تم نے انہیں فراہم کر لیا۔ پانچ سال بعد اب مجھے بلانے کی یاد آئی ہے، اس کے لئے میں تمہارا شکر گزار

ں۔

"عذرا، تم نے مجھے بلایا ہے مگر میں
کر تمہیں کیا دے سکوں گا؟ تمہیں تو عمدہ مکان
ی دی، فریج اور اسکوٹر درکار تھا۔ اللہ پاک
ے تمہیں وہ سب کچھ دے دیا ـــ اگر تمہیں
ھ اور ضرورت ہوتی تو میں اسے بھی پوری کرنے
ی کوشش کرتا۔ لیکن تم نے لکھا ہے 'اب مجھے
ھ نہیں چاہئے'۔ اس لئے میں مطمئن ہو گیا ہوں۔
"عذرا، میں بہت جلد آؤں گا ـــ لیکن
مہارے لئے نہیں، اپنے والدین کے لئے، جو
ھے اپنے سے جدا کرتے ہوئے مرغِ بسمل
نے ہوئے تھے ـــ اپنے دوستوں کے
لئے جنہیں مجھ سے بچھڑنے کا غم تھا ـــ اپنے
وطن کے لئے جس کے ذرے ذرے سے
ھے پیار ہے، جہاں کی سوندھی سوندھی مٹی
میں میری آرزوئیں شامل ہیں۔ اُن نادار اور
غریب مریضوں کے لئے جنہیں میری ضرورت
ہے، جن کے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں،
جو اپنی کم مائیگی کی وجہ سے موت و حیات کی
کشمکش میں مبتلا ہیں ـــ ماضی کے اجالے
سے میں اپنی زندگی روشن نہیں کر سکتا۔ میں
اپنے وطن میں رہ کر وطن والوں کی خدمت کروں گا
اور انشاء اللہ ترقی حاصل کروں گا۔ اب تک
میں نے جو کچھ کیا، تمہارے لئے، اب اپنی
آرزوؤں کی تکمیل کے لئے جیوں گا۔
"عذرا مجھے یہ لکھتے ہوئے بہت دکھ
ہے کہ میں تمہیں اپنے سے الگ کر رہا ہوں اب
تم آزاد ہو جس گھر میں تم ہو، وہ تمہارا ہے۔ وہاں
کی ایک ایک چیز تمہاری ہے اور تمہاری رہے گی
مجھے ایسی لڑکی نہیں چاہئے جسے مجھ سے محبت
نہ ہو، جو میرے ساتھ معمولی مکان میں رہ کر
سوکھا کھا کر اللہ کا شکر ادا کر سکے۔
"یہ نہ سوچنا کہ میں یہاں کسی ایرانی لڑکی
سے محبت کرنے لگا ہوں یا اس سے شادی
کرنے والا ہوں۔ نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں۔ اب
مجھے شادی نہیں کرنی ہے ـــ کبھی نہیں ـــ یہ
میرا فیصلہ ہے۔"
عذرا کے ہاتھوں سے خط چھوٹ کر
زمین پر گر پڑا اور وہ چیخ پڑی:
"نہیں راشد ـــ نہیں۔ ایسا نہیں
ہو سکتا ـــ کبھی نہیں ہو سکتا۔"
لیکن جو ہونا تھا، ہو چکا تھا ـــ اور
اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔
وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

میرا پسندیدہ شعر

اپنے ہاتھوں قتل کر دیں میں نے اپنی خواہشیں
میرا ضبطِ نفس ارمانوں پہ سبقت لے گیا
(شاہد احسن) جویریہ صدیقہ، گیوراٸی، بیڑ

•

باقی ابھی ہے ترک تمنا کی آرزو
کیوں کر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے
سکینہ خانم مومن، بلگام

•

دل کے آئینے میں اترے ترا چہرہ ترا عکس
شب کے سناٹے میں مجھ سے ترا پیکر بولے
ثمینہ پروین، ناگپور

•

آکے پتھر تو میرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے
(شکیب جلالی) حامد مرزا، بیڑ

•

آندھی تو گھس ہی جاتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے
اندر آنا منع ہے لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا
(پرویز شاہدی) قرۃ العین، ندیال

•

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
(علامہ اقبال) سیدہ فرح دیبا عابدی، امراؤتی

•

نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا
بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا
امۃ الحفیظ، محبوب نگر، اے۔ پی

•

عمر بھر ساتھ نبھانا کوئی آساں تو نہیں
ایک دن تو بھی بدل جائے گا دنیا کی طرح
(فیض احمد فیض) شاہین، ناگپور

اس وقت آپ کو کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے ـــ

ایسا شعر جسے آپ بار بار سننا یا گنگنانا چاہتی ہیں؟ اس شعر کے حسن، اثر اور کیفیت میں دوسروں کو بھی شریک کیجئے۔ جس کارڈ یا کاغذ پر آپ اپنا پسندیدہ شعر لکھ کر بھیجیں، اس پر اپنا نام، پتہ ضرور درج کریں۔ اگر معلوم ہو تو شاعر کا نام بھی تحریر کریں۔ "میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بے ڈھنگا لباس اور رنگین بال پنک کی نشانی ہیں

احمد کریم

[illegible]

تصور کئے جاتے ہیں۔ وہاں بے روزگاری کا تناسب مشرقی ممالک سے کم ہے۔ ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔ بے روزگاروں کو معقول مشاہرہ ملتا ہے جب تک انہیں کام نہیں مل جاتا۔ وہ ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتے۔ انگلستان ایک فلاحی ملک ہے۔ وہاں کوئی بھوکا ننگا نہیں کوئی فٹ پاتھ پر نہیں سوتا۔ انگلستان اپنی روایت پرستی کے لئے مشہور ہے۔ یہ روایت پرستی قدامت پسندی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ پہلے کسی کے جوتے پر پالش نہ ہو، سر پر ہیٹ نہ ہو، یا شیو نہ بنا ہو تو ایسے انسان کو دفتر میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بغیر تعارف کے کسی اجنبی سے بات کرنا مشکل تھا

یہ روایت پرستی بعض اوقات مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اس روایت پرستی کے متعلق سینکڑوں لطیفے وجود میں آئے۔ مثلاً ایک جہاز سمندر میں تباہ ہو گیا۔ صرف دو آدمی زندہ بچے۔ یہ دونوں لکڑی کے تختے پر تیرتے ہوئے ایک جزیرے تک پہنچ گئے۔ ان میں ایک انگریز تھا اور دوسرا اٹلی کا رہنے والا۔ ان دونوں کو اس جزیرے میں رہتے ہوئے ایک سال گزر گیا۔ وہ جنگل کے پھلوں پر گزر اوقات کرتے اور روز کسی آنے والے جہاز کی راہ دیکھتے۔ خوش قسمتی سے ایک جہاز وہاں لنگر انداز ہوا۔ جہاز کے کارکن جب جزیرے میں پہنچے تو انہیں دو انسان دکھائی دیئے۔ ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ ملاحوں نے ایک انسان سے جہاز کی تباہی کی داستان سنی تو اس سے کہا "شکر کیجئے کہ آپ اکیلے نہیں۔ آپ کے ساتھ دوسرا آدمی بھی ہے آپ دونوں کی خوب چھنتی ہو گی۔ اس نے جواب دیا مگر ہمارا تو اب تک تعارف بھی نہیں ہوا۔ میں ان سے کیسے بات کر سکتا ہوں۔ یہ شخص انگریز تھا۔

انگریزوں کی روایت پرستی ایک داستان پارینہ بن چکی ہے۔ اس کا ثبوت وہاں کے نوجوانوں کی بے راہ روی اور بغاوت ہے۔ یہ نوجوان پنک کہلاتے ہیں۔ "پنک" کا لفظ کس زبان کا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں، یہ کوئی نہیں جانتا۔ غالباً یہ انگریزی کے لفظ ٹنک کی بگڑی ہوئی شکل ہے ٹنک کے معنی ہیں "بیکار اور فضول چیز" — ۱۹۷۶ میں لندن کے کنگز روڈ سے یہ تحریک شروع ہوئی کنگز روڈ کے ایک چورا ہے کا نام "لینڈ اینڈ" یعنی "زمین کا آخری سرا" ہے۔

"پنک" تحریک میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنا لباس تبدیل کیا۔ مردوں نے سوٹ پہننا چھوڑ دیا۔ عورتوں

اس کی جگہ عجیب قسم کا بے ڈھنگا لباس اختیار کیا کسی نے عماری دار پاجامہ پہنا تو کسی نے تنگ موری کی پتلون۔ ان کا زیادہ تر لباس چمڑے کا ہوتا ہے۔ اگر چمڑا میسر نہ ہو تو نقلی چمڑا یا کمیں کا لباس پہن لیا جاتا ہے اس لباس میں بیلٹ کی جگہ زنجیریں ہوتی ہیں یا ازار بند استعمال ہوتا ہے، لباس میں مین کے ڈبنے لگے ہوتے ہیں۔ زنجیروں اور پٹکوں سے یہ مراد ہے کہ انسان سماج کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ کوٹ پر پتیل کے بٹنوں کی قطار ہوتی ہے

لباس کے بعد سب سے زیادہ توجہ چہرے کے میک اپ پر دی جاتی ہے۔ یہ لوگ غذا کے معاملے میں بے پروائی سے کام لیتے ہیں۔ کچھ لوگ چرس اور افیون کے عادی ہوتے ہیں۔ نتیجے میں ان کے گال پچک جاتے ہیں صحت مند چہرہ فارغ البالی کی علامت ہے۔ باغیوں کے گال پچکے ہوتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ یہ لوگ گالوں میں سوئی گھسا لیتے ہیں۔ کان کی لو اور ہونٹوں کے ساتھ بھی سلوک ہوتا ہے۔ غالباً پنک مرد اور عورتوں ہندوستان کے لوگوں سے یہ ہنر سیکھا ہے۔ عورتیں بہت اونچا اسکرٹ پہنتی ہیں۔ یہ منی اسکرٹ ہے۔ ٹانگیں ڈھکنے کے لئے عام عورتیں اسٹاکنگ بجائے رنگین جالی دار اسٹاکنگ استعمال کرتی ہیں

پنک کی سب سے بڑی خصوصیت سر ہیں۔ بالوں کے اسٹائل سے یہ لوگ فوراً پہچان جاتے ہیں۔ عورتیں اپنے بالوں کو رنگین بنا لیتی یہ رنگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کبھی زرد، کبھی نا اودا، کبھی فالسئی، کبھی سبز۔ غرض کوئی رنگ نہیں جو ان کی دست برد سے بچا ہو۔ بالوں کو کے علاوہ ان پر ایسا اسپرے کیا جاتا ہے۔ جو بال اکڑ جاتے ہیں۔ جیسے انسان کے بدن پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح سر پر دو تین

بال سیدھے کھڑے رہتے ہیں۔ کوئی عورت بالوں سے پیشانی ڈھک لیتی ہے۔ کوئی ادھ پکے بالوں کا جوڑا باندھ لیتی ہے۔ کوئی آدھے سر پر شیمپو پھیر دیتی ہے کوئی سر پر افریقہ کی عورتوں کی طرح چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں گوندھتی ہے، ادھر مرد سر کو استرے سے منڈوا کر اس پر عجیب نقش و نگار گدوا لیتے ہیں۔

پنک تحریک ۱۹۷۶ میں شروع ہوئی۔ ۱۹۷۷ اس کے عروج کا زمانہ تھا۔ یہ لوگ موسیقی کے رسیا تھے۔ ان کی موسیقی کی منڈلی کے نام بھی عجیب تھے۔ مثلاً جنسی پستول، گلا گھونٹنے والے، ٹکراؤ برج لندن کا ریڈیو، ہیرو کا خاتمہ، وغیرہ۔

موسیقی کی ان منڈلیوں نے انگلستان میں دھوم مچا دی۔ نوجوانوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ ہنرمند تھے ان کے جلسوں میں لڑکیاں گانا گاتیں، لڑکے بجلی کا گٹار بجاتے کوئی بانسری بجاتا تو کوئی نقارہ پر چوٹ لگاتا وہ موسیقی میں سر تال کے قائل نہیں تھے ان کی موسیقی بے ترتیب تھی۔ ان کے جلسوں پر ہنگامے کا گمان ہوتا تھا۔ انگلستان میں ایک بار لوگوں نے ان کے پوسٹر پر ملکہ کی تصویر دیکھی۔ اس میں ایک لوہے کی تیلی ملکہ کے گالوں کے آرپار دکھائی گئی تھی۔ انھوں نے ملکہ ایلزبتھ کا بھی مذاق اڑانا شروع کیا تو انگلستان کے شاہ پسند لوگ ان کے خلاف ہو گئے۔ ان کے خلاف لے دے شروع ہو گئی جس کے نتیجے میں ان کے جلسے کینسل ہو گئے۔ لوگوں نے ان جلسوں کے لئے ٹکٹ نہیں خریدے۔ جن لوگوں نے ٹکٹ خریدے تھے وہ پھاڑ کر پھینک آئے۔ اس اقدام سے پنک تحریک کو دھکا پہنچا۔

پنک تحریک میں نوجوانوں کے لئے ایک پیغام تھا۔ زندگی میں کاروبار اور ملازمت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ عام لوگوں کی زندگی بور ہے۔ صبح کو دفتر جانا دکان جانا، شام کو گھر آنا، دفتر میں فائلوں سے سر کھپا کر گھر میں بیوی کی شکایتیں سننا اور بچوں کا رونا دھونا برداشت کرنا ــــ انسان دن رات اسی محور کے گرد کولھو کے بیل کی طرح چکر لگاتا رہتا ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے اور اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔ زندگی میں یکسانیت اس کی صلاحیتوں کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے انسان کو چاہئے کہ وہ اس چکر سے آزاد ہو جائے لیکن اس بات سے یہ اندازہ غلط ہو گا کہ پنک ہپی بن گئے تھے۔ ہپی زندگی میں کام کرنے اور روپیہ کمانے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ دنیا میں بغیر روپیہ پیسے لئے سفر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی مجہول اور فقیرانہ ہے اس کے برعکس پنک سفر اور آوارہ گردی کے قائل نہیں۔ یہ لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور کام کاج سے گریز نہیں کرتے۔ یہ روپیہ ضرور کماتے ہیں لیکن فرصت کے اوقات میں زندگی میں رنگینیاں بھرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ عام ڈگر سے ہٹ کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ پنک تحریک کے دو اخبار ہیں، ان کے نام ہیں "پھٹا پرانا" اور "گوند کے سونگھنے والے" ان رسالوں میں ایڈیٹر جان بوجھ کر ہجے کی غلطیاں کرتے ہیں۔ گرامر بھی الٹی سیدھی ہے۔ ان کے طرح طرح کے نعرے ہیں، مثلاً "مستقبل کی فکر نہ کرو۔ آج کو خوشی سے گذارو کل کی کل دیکھی جائے گی"۔

انگلستان سے پنک تحریک امریکہ پہنچی تو وہاں کے نوجوانوں نے اس کی آؤ بھگت کی۔ موسیقی کی منڈلی جب امریکہ پہنچی تو وہاں کے لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جنسی پستول کی منڈلی وہاں بہت کامیاب رہی۔ انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ لیکن پنک اس کامیابی سے بھی بور ہو گئے۔ مختلف شہروں میں پروگرام ترتیب دینا۔ ان کی تاریخیں مقرر کرنا، ٹکٹ چھپوانا، ہال کرائے پر لینا، پھر لوگوں کی تحسین و آفریں سہنا ــــ یہ تو زندگی کا گھسا پٹا ڈھرا ہو گیا جس سے جان چھڑا کر پنک امریکہ پہنچے تھے۔ انھوں نے منڈلی ختم کر دی اور امریکہ سے واپس پہنچ گئے۔ لیکن وہ امریکہ میں پنک تحریک کا بیج بو آئے تھے۔ آہستہ آہستہ امریکہ میں بھی پنک پیدا ہو گئے لیکن ان کا ڈھرا انگریزوں سے الگ تھا یہ آوارہ اور بے کار لوگوں کا ہجوم تھا جو زندگی میں مختلف النوع رنگ بھرنے کے بجائے اسے تباہ کرنے پر تلا تھا۔ امریکہ میں ایسے کئی موسیقار پیدا ہوئے جنہوں نے بہت کامیابی حاصل کی۔ لیکن ان میں سے اکثر نشہ کے عادی تھے۔ ان میں سے کئی لوگ نشہ کی گولیوں کے زیادہ استعمال سے موت کا شکار ہو گئے۔ ایک پنک نے اپنی محبوبہ کو قتل کر دیا۔

پنک انسانی برادری کی آزادی کے قائل ہیں۔ وہ گورے اور کالے میں امتیاز نہیں کرتے۔ انگلستان میں کچھ سفید فام لوگوں کے ایک گروہ نے سیاہ اور سانولے لوگوں کے خلاف ایک تحریک چلائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سانولے لوگ ہندوستان اور پاکستان سے ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں انگلستان میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہم وطنوں کی طرح بہت بچے پیدا کرتے ہیں اگر ان کی آبادکاری کو بڑھاوا دیا گیا تو عین ممکن ہے کہ ایک صدی میں انگلستان میں کالے لوگوں کی اکثریت ہو جائے۔ اس تحریک کا نام "نیشنل فرنٹ" ہے۔ یہ لوگ کالے لوگوں کو مارتے پیٹتے رہتے ہیں پاکستانی لوگوں سے ان کی خاص دشمنی ہے۔ جہاں کوئی پاکستانی نظر آجائے یہ اس سے برا سلوک کرتے ہیں۔ ہندوستانی بھی ہم شکل ہونے کے ناطے اس دشمنی کی زد میں آجاتے ہیں پنک نیشنل فرنٹ کے خلاف ہیں۔ ان کے جلسوں میں نیشنل فرنٹ کے خلاف گانے گائے جاتے ہیں۔

"پنک تحریک" ۱۹۷۹ تک عروج پر تھی پھر اس پر زوال آگیا۔ اب انگلستان میں خال خال ہی زرد اور لال بالوں والی لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ ویسے بھی یہ تحریک دیہات میں نہیں پھیل سکی تھی۔ لندن اور اس کے مضافات ہی اس سے متاثر ہوئے تھے۔

■■

ان سے ملئے
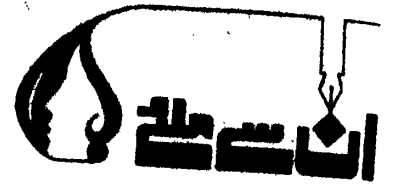
رات کو ٹیلی ویژن کے پردے پر ایک چہرہ اکثر نمودار ہوتا ہے۔ یہ گیتانجلی ایئر ہیں جو ہر تیسرے چوتھے روز ۹ بج کر ۵۰ منٹ پر انگریزی کی خبریں پڑھتی ہیں۔ ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی عمر اور گیتانجلی کی ملازمت تقریباً برابر ہے۔ وہ ۱۹۶۶ء سے انگریزی کی خبریں پڑھ رہی ہیں۔ اس زمانے میں تمام ہندوستان کے لئے نیشنل پروگرام کا وجود نہیں تھا۔ ٹیلی ویژن صرف ہندوستان کے تین چار بڑے شہروں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ پچھلے چند برسوں میں الیکٹرانک کے میدان

گیتانجلی ایّر

میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ خلا میں ایک سیارہ چھوڑا گیا جس کا نام 'انسات بی' ہے۔ یہ سیارہ خلا میں اپنے مدار پر گردش کرتا ہے۔ اس میں الیکٹرانک کیمرہ اور آواز کو پکڑنے والی مشین نصب ہے۔ کیمرہ زمین کی تصویر لیتا ہے جسے ہم اسٹوڈیو میں حاصل کر لیتے ہیں اس سے بادل کی رفتار اور طوفان کی آمد کا پتہ لگ جاتا ہے موسم کی یہ آگاہی ہمیں روز حاصل ہو جاتی ہے نیشنل پروگرام رات کو ۹ بجے شروع ہوتا ہے۔ اور ۲ گھنٹے جاری رہتا ہے۔ سٹیلائٹ کی مدد سے یہ پروگرام سارے ہندوستان بلکہ انڈمان نکوبار اور پاکستان میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

گیتانجلی نے ۱۲ سال تک ٹیلی ویژن میں باقاعدہ ملازمت کی۔ اس کے بعد انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا لیکن ان کا ۱۲ سالہ تجربہ ضائع نہیں گیا۔ ٹیلی ویژن والوں نے انہیں فری لانس نیوز ریڈر بنا دیا۔ اب وہ مہینے میں ۸ بار خبریں پڑھتی ہیں۔

ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ خبریں پڑھنے والا اپنے سامنے اسکرین پر لکھی ہوئی خبریں پڑھتا ہے۔ انداز ایسا ہوتا ہے۔ جیسے وہ آپ سے مخاطب ہو۔ یہ طریقہ انگلستان اور امریکہ میں رائج ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خبروں کا کارڈ میز پر رکھا ہوتا ہے پڑھنے والا نظریں جھکا کر خبریں پڑھتا ہے۔ سامنے دیکھنے کی مہلت اسے چند لمحوں کے لئے ہی ملتی ہے۔ یہ طریقہ ہندوستان میں رائج ہے ظاہر ہے کہ پہلا طریقہ بہتر ہے۔ یہ طریقہ ہندوستانی ٹیلی ویژن نے اب تک نہیں اپنایا۔ جب کہ دوسرے دن کا پروگرام بتانے والے اسی [illegible] کو استعمال کرتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھنے والے [illegible] کڑے امتحان سے گزرتے ہیں۔ خبروں کے درمیان کھنکھارنا منع ہے۔ اگر آواز حلق میں [illegible] تو پانی پی کر اسے صاف کرنا بھی ممکن نہیں۔ جب گیتانجلی نئی نئی ٹیلی ویژن پر آئی تھیں تو [illegible] وقت خبریں پڑھنے کے لئے ایک ہی انسا[illegible] ہوتا تھا۔ آج خبروں کی میز پر دو انسان بیٹھے [illegible] اگر ایک انسان خبریں پڑھتے پڑھتے تھک جا[illegible] یا اس کی آواز حلق میں پھنس جائے تو دوس[illegible] اس کی مدد کرتا ہے۔ خبریں پڑھنے والے کے [illegible] ضروری ہے کہ اس کا تلفظ صاف ہو۔ انگریزی خبریں پڑھنے والے کے لئے ضرور[illegible] کہ اس کے لہجے پر کسی ریاست کی چھاپ

بنگالی اور مدراسی ایک خاص لہجے میں انگریزی بولتے ہیں اور فوراً شناخت کر لئے جاتے ہیں۔ دراصل ہم جب انگریزی بولتے ہیں تو الفاظ انگریزی کے ہوتے ہیں اور لہجہ ہماری اپنی زبان کا ہوتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ ان لوگوں کا انتخاب کیا جائے جنہوں نے کونونٹ یا انگریزی اسکولوں میں تعلیم پائی ہے۔ ان لوگوں کا لہجہ غنیمت ہوتا ہے۔ اس پر کسی صوبے کی چھاپ نہیں ہوتی۔ دیسی اسکولوں کے پڑھے ہوئے لوگوں میں لہجے کا عیب باقی رہتا ہے۔ پنجابی اسکول کو سکول کہتے ہیں۔ اتر پردیش کے رہنے والے اسکول کہتے ہیں۔

گیتانجلی کا لہجہ اس عیب سے پاک ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بمبئی کے کیتھیڈرل اسکول میں ہوئی۔ جب ان کے والد تبادلہ کلکتہ ہو گیا تو انہوں نے وہاں کے لورڈ کونونٹ میں تعلیم پائی لوریٹو سے ہی انہوں نے بی اے کیا۔ ان کے والد امبے گاؤں کر مالیات کے محکمے سے متعلق تھے وہ ۱۹۲۱ء میں آئی سی ایس میں چن لئے گئے تھے۔ بعد میں وہ ریزرو بینک کے ڈپٹی گورنر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ایک روپیہ کے نوٹ پر ان کے دستخط ہوتے تھے۔ امبے گاؤں کر کی عمر اس وقت ۸۴ سال ہے۔ گیتا ان ہی کے ساتھ رہتی ہیں۔ گیتا کی ماں کا تعلق اتر پردیش سے تھا۔ وہ لکھنؤ کے ڈاکٹر تیتا لال کی بیٹی تھیں۔ گیتانجلی نے ایک ساؤتھ انڈین برہمن سوامی ناتھن ایئر سے شادی کی۔ سوامی ناتھن ایک مشہور صحافی ہیں۔ اس طرح گیتانجلی کا تعلق ہندوستان کی کئی ریاستوں سے ہو گیا۔ سوامی ناتھن سے شادی کے بعد گیتانجلی نے ٹیلی ویژن میں ملازمت کر لی اور وہ دلی میں بس گئیں۔ شادی کے بعد ان کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکا جو آج کل دہرہ دون کے دون اسکول میں زیر تعلیم ہے۔ دوسری لڑکی جو دلی میں تعلیم پا رہی ہے۔

خبریں پڑھنے والوں کو پروگرام نشر ہونے سے دو گھنٹے پہلے اسٹوڈیو پہنچنا پڑتا ہے، جہاں وہ خبروں پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ خبروں میں ناموں کی ادائی مشکل ہو جاتی ہے۔ افریقی لوگوں کے نام خاصے دشوار ہوتے ہیں۔ عربی نام بھی کچھ کم مشکل نہیں ہوتے۔ مثلاً مصر میں 'ج'، 'گ' کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ نجیب کو 'نگیب' اور جمال کو 'گمال' کہتے ہیں۔ لیکن یہ تصرف صرف بول چال تک ہی محدود ہے لکھنے میں 'ج' ہی استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی اخبار جو سنتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ وہ جمال کو 'گمال' ہی لکھتے ہیں۔ اب خبریں پڑھنے والے کیا کریں؟ جمال کہیں یا گمال؟ انہیں اس طرح کی مشکلات اکثر پیش آتی ہیں۔ وہ حامد کو حمید اور راشد کو رشید پڑھ جاتے ہیں۔

خبریں پڑھنے والوں کو اپنے لباس کی طرف بھی توجہ دینی پڑتی ہے۔ اور میک اپ پر بھی۔ میک اپ تو اسٹوڈیو میں ہو جاتا ہے، لیکن لباس گھر سے ہی پہن کر آنا پڑتا ہے۔ لباس ہر بار نیا ہونا چاہئے۔ یہ بوجھ بھی خبریں پڑھنے والے پر ہی پڑتا ہے۔ گیتانجلی کو بھی بے شمار ساڑیاں خریدنی پڑتی ہیں۔ ایک ساڑی کا نمبر مہینوں کے بعد آتا ہے، تاکہ اس وقفے میں لوگ اس کے رنگ اور ڈیزائن بھول جائیں۔

گیتانجلی ٹیلی ویژن میں ملازمت کے دوران لندن بھی گئیں۔ انہوں نے بی بی سی کا اسٹوڈیو دیکھا۔ وہاں کام کرنے والے روایت پسند نہیں ہیں۔ اسٹوڈیو میں بے تکلفی کا ماحول ہے۔ بڑے بڑے افسر کو بھی 'سر' نہیں پکارا جاتا۔ گیتانجلی اپنے خاوند کے ساتھ فلپائن کی راجدھانی منیلا بھی گئیں۔ فلپائن میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کچھ زیادہ ہی ہے سو وہاں عورتیں ہر شعبے میں کام کرتی ہیں۔

شادی کے ۱۴ سال بعد گیتانجلی اور سوامی ناتھن میں علیحدگی ہو گئی۔ گیتا طلاق کے بعد اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہیں۔ طلاق کے بعد بچوں کا سارا بوجھ ان پر پڑ گیا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ دون اسکول میں بچے کی تعلیم کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ ادھر بچی کی تعلیم اور گھر کے اخراجات بھی کم نہیں ہیں۔ گیتا نے ان حالات سے نبٹنے کے لئے ایک ہوٹل میں ملازمت کر لی۔

بمبئی کا تاج محل ہوٹل ٹاٹا خاندان کی ملکیت ہے۔ دنیا میں سیاحی کا زور بڑھا اور جا بجا ہوٹل کھلنے لگے تو ٹاٹا نے بھی تاج ہوٹل کھولنے شروع کر دئے۔ نئی دلی میں تاج ہوٹل بنا۔ اس کے بعد ایک دوسرا ہوٹل تاج پیلس کے نام سے بنایا گیا۔ گیتانجلی اسی تاج پیلس میں سیلز ایگزیکٹو ہیں۔ سیاحی کا کاروبار پھیلا تو ہوٹلوں کی تعداد بھی بڑھی لیکن اس کے ساتھ ہوٹلوں میں مقابلہ بھی شروع ہوا۔ ہوٹل کا کاروبار ایک بڑا بزنس کہلاتا ہے۔ ایک ہوٹل میں کئی سو کمرے ہوتے ہیں۔ خود تاج پیلس میں ۵۰۰ سے زیادہ کمرے ہیں۔ کسی بھی کمرے کا کرایہ ۵۰۰ روپے روزانہ سے کم نہیں۔ اس میں ناشتہ اور کھانا شامل نہیں۔ اگر سارے کمرے

بھرے ہوں تو ہوٹل کی یومیہ آمدنی دو ڈھائی لاکھ روپے سے کم نہیں ہوتی۔ اگر آدھا ہوٹل خالی ہو تو یہی آمدنی آدھی رہ جاتی ہے، لیکن اخراجات جوں کے توں رہتے ہیں۔ اس لئے ہوٹل کے منتظمین زیادہ سے زیادہ گاہک حاصل کرنے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہندوستان میں سیاحی کا سیزن جاڑے میں شروع ہو جاتا ہے۔ اور گرمیوں کی ابتدا تک برقرار رہتا ہے۔ مغربی ممالک کے لوگ جھلستی ہوئی دھوپ میں ہندوستان کا رخ نہیں کرتے نتیجے میں گرمی کا موسم ہلکا سیزن کہلاتا ہے۔ اس موسم میں ہوٹل کو پُر کرنا مشکل ہے۔

سیاحوں کے علاوہ بیرونی حکومت کے نمائندے، بین الاقوامی کمپنیوں کے ایجنٹ اور ملکوں کے سربراہ بھی ہندوستان آتے ہیں۔ ان کی آمد کی اطلاع ہمیشہ پہلے ہو جاتی ہے۔ بڑے ہوٹلوں کے ایجنٹ انہیں اپنے ہوٹلوں میں ٹھہرانے کی جستجو کرتے ہیں بعض اوقات ہوٹلوں کے ایجنٹ ان ملکوں میں موجود رہتے ہیں۔ اور وہیں سے ان کو بک کر لیا جاتا ہے۔ تاج پیلس کا ایک دفتر آسٹریلیا میں بھی کام کرتا ہے۔ جب یہ لوگ ہوٹل میں پہنچ جائیں تو کام کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ ان مہمانوں کی دیکھ بھال اور خدمت بھی ضروری ہے گیتا انجلی کو یہ سب کام دیکھنا پڑتا ہے۔ ہوٹل کا کھانا مہمان کے حسبِ منشا ہونا چاہئے۔ انگریز کون سا کھانا پسند کرتے ہیں؟ عرب کیا کھاتے ہیں؟ افریقہ کے لوگوں کی مرغوب غذا کون سی ہے؟ ان سب باتوں پر ریسرچ کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ان کی لانڈری کی بھی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ ہوٹل میں کپڑے دھونے اور ڈرائی کلیننگ کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ ہوٹل کی اپنی بیکری ہوتی ہے ہوٹل کا اصول یہ ہے کہ اگر آپ ہماری کارگزاری سے خوش ہیں تو دوسروں کو بتائیے خوش نہیں ہیں تو ہمیں بتائیے۔ گیتا انجلی کی زندگی بہت مصروف ہے۔ وہ دن بھر ہوٹل میں کام کرتی ہیں۔ کبھی میٹنگ ہو تو رات گئے گھر پہنچتی ہیں۔ اس کے علاوہ مہینے میں ۸ بار ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھتی ہیں۔ وہ یہ سارا کام حسن و خوبی سے انجام دیتی ہیں۔ خاوند سے علیحدگی کے بعد ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا تو انہوں نے ثابت کر دیا کہ عورت اگر ہمت سے کام لے تو اسے مرد کی سرپرستی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

آدھے سر کا درد ہو تو تھوڑا سا روغن بادام ناک میں ٹپکائیں۔ انشاء اللہ کچھ دیر بعد درد دور ہو جائے گا۔

●

سر دھونے سے پہلے لیموں کے چند قطرے پانی میں ملالیں۔ بال چمکدار ہو جائیں گے۔

شہد اور لیموں کا رس چاٹنے سے کھانسی دور ہوتی ہے۔

●

سیاہ بوٹ پالش میں تھوڑا سا سرکہ ملانے سے جوتوں میں مزید چمک آتی ہے۔

●

اگر جوتے اتارنے کے بعد پاؤں سے بدبو آتی ہو تو نیم کے پتے لے کر انہیں پانی میں ابال لیں اور پھر اس پانی میں پاؤں ڈال کر انہیں خوب ملیں۔ بدبو جاتی رہے گی۔

اگر آملے سے سر دھویا جائے اور آملے کا تیل بھی استعمال کیا جائے تو بال جلد بڑھتے ہیں۔

●

بتھوے کے ساگ کو پانی میں ابال کر سر دھونے کے بعد بتھوے کا نیم گرم پانی اچھی طرح سر پر ڈالیں اس سے بال جھڑنے بند ہو جاتے ہیں۔

بیوٹی کارنر

شہناز حسین

سر کے تاج کی حفاظت

آج کل عورتوں کی زبان پر یہ شکایت عام ہے کہ وہ جب کنگھی کرتی ہیں تو ان کے بالوں کا گچھا کنگھی میں اُلجھ جاتا ہے۔ اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے کوئی آملہ کا تیل استعمال کرتی ہے تو کوئی ناریل کا۔ بازار میں شیمپو اور ہیئر ٹانک بھی اس سلسلے میں بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔ سائنس نے بالوں کی ماہیت اور بالوں کے گرنے پر تحقیقات کی ہے، اس کی مدد سے آپ اپنے بالوں کی بخوبی حفاظت کر سکتی ہیں۔

بھُورے اور کالے بالوں کی تعداد میں فرق ہوتا ہے۔ ایک انسان کے سر کے بال گِننا آسمان کے تارے گننے کے برابر ہے لیکن سائنس دانوں نے اس کام کو بھی سرانجام دے دیا ہے۔ بھُورے بالوں کی تعداد سیاہ بالوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک بھورے بال والے انسان کے سر پر بالوں کی تعداد ایک لاکھ ۴۰ ہزار ہوتی ہے، جب کہ سیاہ بال ایک

لاکھ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ اس طرح ہر عورت
بالوں کے معاملے میں مختلف ہوتی ہے۔ عام
طور پر بال ۲۵ انچ سے زیادہ نہیں بڑھتے لیکن
بنگال اور جنوبی ہند میں عورتوں کے بال ۲۵
انچ سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ وہاں کی عورتیں
ناریل کا تیل زیادہ استعمال کرتی ہیں۔

انسانی آبادی کی طرح بالوں کی آبادی
بھی گھٹتی بڑھتی ہے۔ جس طرح ایک انسان
بڑھا ہو کر مر جاتا ہے، اسی طرح بال بھی بوڑھے
ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ نئے بال
اُگ آتے ہیں۔ انسانوں کی طرح بالوں کی عمر بھی
یکساں نہیں ہوتی۔ کوئی جوانی میں ہی ختم ہو جاتا
ہے، کوئی بڑھاپے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس
بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بالوں کا گرنا
قدرتی ہے۔ جتنے بال بوڑھے ہو کر گر جاتے ہیں،
اتنے ہی نئے بال پیدا ہو کر ان کی جگہ سنبھال لیتے
ہیں۔ اس دریافت کے بعد ان عورتوں کو اطمینان
ہو جانا چاہیے جو اپنی کنگھی میں بالوں کا گچھا
دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہیں۔ وہ بالوں کا گرنا تو
دیکھ سکتی ہیں، لیکن نئے بالوں کی پیدائش کا مشاہدہ
نہیں کر سکتیں۔ بیماری اور حمل کے دوران بال
تیزی سے گرتے ہیں۔ اس بات سے بھی پریشان
ہونا بیکار ہے۔ صحت یابی کے بعد نئے بال تیزی
سے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔

عورتیں خشکی سے بھی پریشان ہو جاتی ہیں۔
خشکی ایک قدرتی چیز ہے۔ جس طرح سانپ
نئی کینچلی بدلتا ہے، اسی طرح بالوں کے نیچے
کی کھال بھی اپنی سطح بدلتی ہے۔ پرانی سطح مُردہ ہو کر
خشکی بن جاتی ہے۔ ایک صحت مند کھوپڑی کے
لئے خشکی کا ہونا ضروری ہے۔ خشکی اس بات کی
ضمانت ہے کہ نئی سطح اُبھر رہی ہے۔ خشکی کا زیادہ
ہونا یا اس کا بالکل نہ ہونا، دونوں ہی تشویش
کی بات ہے۔ خشکی حد سے زیادہ بڑھ جائے تو
اس کا علاج ضروری ہے۔ اس کے لئے پرہیز زیادہ
بہتر ہے۔ مٹھاس اور نشاستے کا استعمال
کم کریں۔ پراٹھے، پکوڑے، حلوا، کچوری کم کھائیں۔
برفی، لڈو اور گلاب جامن سے پرہیز کریں۔
اس قربانی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔ وٹامن بی
کی گولیاں استعمال کریں۔ بیرونی علاج کے
لئے کوئی ایسی دوا استعمال کر سکتی ہیں جس
میں گندھک ملی ہو۔ ہفتے میں دو بار شیمپو بھی
استعمال کر سکتی ہیں۔

سر میں خشکی زیادہ ہو تو اس کا نقصان
یہ ہے کہ یہ اس روغن کو جذب کر لیتی ہے جو
کھوپڑی کی سطح سے نکل کر بالوں کی غذا بنتا
ہے۔ اس طرح نئے بالوں کی پیدائش میں رخنہ
پڑ جاتا ہے۔ آپ غذا میں احتیاط برتیں، بیرونی
علاج جاری رکھیں اور بالوں کو شیمپو کرتی
رہیں تو خشکی نارمل حالت پر واپس آ جائے گی۔
اگر بال پسینے اور گرد و غبار سے اَٹے ہوں
تو ان کا دھونا ضروری ہے لیکن اگر آپ کے
بال خشک ہوں تو بالوں کو بار بار نہ دھوئیں۔
بالوں کو ہر روز گیلا کرنا درست نہیں، بلکہ
نقصان دہ ہے۔ اس طرح وہ قدرتی روغن
بھی دھل جاتا ہے جو بالوں کی افزائش کے
لئے ضروری ہے۔ گرمیوں میں روز نہانے کی
عادت ہو تو بالوں کو بچا کر غسل کریں۔ بال بہت
زیادہ خشک ہوں یا بہت زیادہ روغنی، دونوں
صورتوں میں خاص صابن استعمال کریں۔ خشک
بالوں کے لئے ایسا صابن استعمال کریں جس میں
تیل کی آمیزش زیادہ ہو۔
گاہے گاہے بالوں کو برش کرنا مفید ہے۔
اس طرح بالوں کی جڑوں کا تیل تمام سر میں یکساں
طور پر پھیل جاتا ہے۔ کچھ عورتیں سر میں تیل کی مالش
کرواتی ہیں۔ اس میں کوئی نقصان نہیں لیکن
مالش زوردار نہ ہونی چاہئے۔ سخت مالش سے
بالوں کی جڑیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ مالش کا زوردار
ہاتھ تیل کو بالوں کی جڑوں تک پہنچانے کے
بجائے ان کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔ سخت
اور تیز نوک والی کنگھی استعمال کرنا بھی
نقصان دہ ہے۔

بالوں کے اچانک گرنے کی وجہ

جذباتی صدمہ بھی ہو سکتا ہے۔ کسی عزیز کی
جدائی یا موت بھی بال پیدا کرنے والے غدود
پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ سر میں بھاری چوٹ
لگنے سے بھی یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے۔
ٹائیفائیڈ کے حملے کے بعد بھی بال تیزی سے
گرتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں ٹائیفائیڈ کے حملے
کے بعد اکثر والدین اپنے بچوں کے سر پر استرا
پھروا دیتے تھے۔ وٹامن کی کمی بھی بالوں کے
گرنے کی وجہ بن سکتی ہے۔ بچوں کے سر میں پھنسیاں
نکل آئیں تو اس سے بھی بال گرنے شروع ہو جاتے
ہیں۔ پھنسیاں جتنی تیزی سے سر میں پھیلتی ہیں
اتنی ہی تیزی سے بال بھی گرتے ہیں۔ پھنسیوں کا
علاج کرنا بہت ضروری ہے۔ بالوں کے گرنے
کے بارے میں ایک اور بات جاننا ضروری
ہے کہ غصہ، نفرت، مایوسی اور انتقام کی جلن
بھی بالوں کے گرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔
اس صورت میں بال یکساں طور پر نہیں گرتے، بلکہ
جگہ جگہ سے گرتے ہیں۔ کسی جگہ کم ہو جاتے ہیں، کسی
جگہ برقرار رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں خوش گوار
اور سکون پرور ماحول ہونا ضروری ہے۔ غصے کو

حالت میں بالوں کے گرنے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور حالات نارمل ہوجاتے ہیں تو بالوں کی افزائش بھی نارمل ہوجاتی ہے۔

خشک بال والی عورتوں کو صابن یا شیمپو لگانے سے پہلے بالوں میں تیل لگانا چاہئیے۔ غسل کے بعد بھی بالوں کو سنوارنے کے لئے تھوڑا سا تیل لگانا چاہئے۔ انسان کی طرح بال بھی بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ بڑھاپے میں جھریوں کے ساتھ ساتھ بال بھی اپنی چمک کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے۔

یہ قدرت کا نظام ہے کہ انسان جسم کے جس عضو کو استعمال نہیں کرتا، وہ بے کار اور مفلوج ہوجاتا ہے۔ ارتقا کے اصول کے مطابق انسان پہلے بندر تھا لیکن ارتقا کے دوران وہ دونوں ٹانگوں پر چلنے لگا۔ اس کی دُم بے کار ہوگئی اور رفتہ رفتہ غائب ہوگئی ہمارا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے زیادہ کام کرتا ہے اس لئے وہ عموماً بائیں ہاتھ سے زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ یہی حال بالوں کا ہے۔ اگر انہیں بے حرکت چھوڑ دیا جائے تو وہ بے کار ہو کر گرنے لگتے ہیں۔ لیکن بالوں کی ورزش انہیں باعمل اور زندہ رکھتی ہے۔ ورزش کے لئے مالش اور برش عام طور پر مشہور ہیں۔ ایک بات یاد رکھیں جب بال جڑ سے باہر آجائے تو اس کا گرنا لازمی ہے۔ آپ کتنی ہی مالش کرلیں اس کا گرنا نہیں روک سکتیں جو پودا سوکھ کر مرجھا جائے، اس کی کتنی ہی آبیاری کی جائے، وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتا لیکن مالش سے ایک ضمنی فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس سے دوران خون تیز ہوجاتا ہے جس سے بالوں کی افزائش کو فائدہ پہنچتا ہے۔

انسان اس معاملے میں کاہل ثابت ہوا ہے بالوں کی دوائیں اور لوشن بیچنے والے اس نکتے سے واقف ہوتے ہیں۔ ہر لوشن کی شیشی پر لکھا ہوتا ہے کہ اس دوا کو سر میں لگا کر انگلیوں کی مدد سے بالوں کی جڑوں تک پہنچائیں۔ اس طرح دوا کا فائدہ خواہ کچھ نہ ہو، مالش کا فائدہ بالوں کو ضرور پہنچے گا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ڈاکٹر مریض سے دُودھ پینے کے لئے کہے اور مریض ٹال جائے لیکن اگر وہ یہ کہے کہ اس دوا کو دُودھ کے ساتھ پینا ہے تو مریض کو اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہم بغیر لوشن استعمال کئے انگلیوں کی مدد سے صرف مالش ہی کرلیں تو فائدے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ عام صحت کا بھی بالوں پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ متوازن اور مقوی غذا جتنا جسم کو فائدہ پہنچاتی ہے، اتنا ہی بالوں کو۔ صحت اور بالوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ٹائیفائیڈ کے دوران سر کے بال گرنے لگتے ہیں لیکن نارمل صحت واپس آتے ہی بال پھر اُگنے شروع ہوجاتے ہیں۔

سر کے بالوں میں ہر روز دو تین بار ضرور برش کریں۔ برش کرتے وقت ۱۰۰ بار گنتی کریں۔ برش کی حرکت عموماً اوپر سے نیچے کو ہوتی ہے۔ بالوں کو پیچھے سے اوپر اُٹھا کر اُلٹا برش بھی کریں۔ سر سے کنپٹی کی طرف اور کنپٹی سے سر کی طرف بھی برش کریں۔ اس طرح مردہ بال اپنی جڑوں سے باہر آجائیں گے جو بال اس طرح گریں انہیں زندہ نہ سمجھیں۔ دراصل یہ بال اپنی زندگی کی مدت پوری کرچکے ہیں۔ یہ بال نہ صرف خود نہیں بڑھتے، بلکہ نئے بالوں کی پیدائش بھی روکتے ہیں اور خواہ مخواہ ان کی جگہ گھیرے رہتے ہیں۔ ان کا گرنا ہی بہتر ہے۔

مرد عورتوں کے مقابلے میں زیادہ گنجے ہوتے ہیں بعض لوگ گنجے پن کو عقل مندی کی نشانی سمجھتے ہیں اور بعض دولت کی پیداوار ہے۔ سائنس دانوں اور دانش وروں میں جتنی تعداد گنجوں کی ہے اتنی ہی گھنے بال والوں کی۔ یہی حال دولت مندوں کا ہے۔

دراصل بال عورت کے حسن کی زینت ہیں۔ وہ ان کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس کے برعکس بال مرد کی خوب صورتی کا حصہ نہیں ہیں۔ اسے ان کی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اگر بال سر پر ہیں تو ٹھیک ہے نہیں ہیں تو بھی ٹھیک ہے۔ عورت ایسا نہیں کرسکتی۔ وہ گھنٹوں اپنی کنگھی چوٹی میں گزارتی ہے، بالوں میں باقاعدہ تیل لگاتی ہے لمبے بال ہوں تو سارے بالوں تک تیل پہنچانے کے لئے اُسے زور زور سے مالش کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح بالوں کی ورزش ہوجاتی ہے۔ اور عورت گنجے پن سے محفوظ رہتی ہے۔

بالوں کی ورزش کا ایک اور طریقہ ہے جو قدرے بھونڈا ہے لیکن مالش اور برش سے کہیں زیادہ مؤثر ہے۔ یہ ہے بالوں کا کھینچنا بچے (اور بعض اوقات بڑے بھی) جب ایک دوسرے سے لڑتے ہیں تو مخالف کے بال پکڑ کر اسے بے بس کردیتے ہیں۔ دراصل اس عمل سے وہ ان جانے میں اپنے مخالف کی ایسی خدمت کررہے ہیں جس کا خود اسے پتہ نہیں وہ اظہار تشکر کی جگہ آپ کو گالیاں دیتا ہے۔ اگر ہم آپ کو اپنے (یا دوسروں کے) بال کھینچنے کا مشورہ دیں تو آپ کہیں گی کیسا ایک وحشیانہ فعل ہے لوگ سمجھیں گے کہ ہم ایک دوسرے سے لڑرہے ہیں لیکن مہذب لوگ اگر اپنے بالوں کو سر پر

جانتے ہیں تو انہیں یہ وحشیانہ فعل
پڑے گا۔ دراصل بالوں کا گچھا
ان کے لئے نہیں ہے۔ قدرت نے
جانوروں کو بال اس لئے عطا کئے ہیں
کی حفاظت کریں۔ برفانی علاقوں میں
کے جسم پر زیادہ بال ہوتے ہیں۔ وہ
جسم کی حفاظت کرتے ہیں۔ صحرا کی
پ سے کھوپڑی بچ جاتی ہے اس لئے
کے بدو آج بھی بالوں کا گچھا سر پر رکھتے
یں جوں انسان مہذب ہوتا گیا، بالوں کی
ت کم ہوتی گئی۔ سردی سے بچنے کے لئے
اور ہیٹ کا استعمال ہونے لگا دھوپ
رش سے بچنے کے لئے چھتری ایجاد
۔ غرض ایک وقت ایسا آیا جب بال
ضرورت کھو بیٹھے اور صرف سنگھار کا حصہ
رہ گئے۔ انسانی تہذیب کی ترقی بالوں کی
ت بن گئی۔ آج بھی گنجاپن صرف مہذب
سائٹی میں پایا جاتا ہے۔ افریقہ کے وحشی
ائل، امریکہ کے ایر انڈین، ہندوستان
ے آدی باسی تہذیب کے اس انعام سے
روم ہیں۔ تہذیب اور ترقی کا یہی حال رہا تو
وہ دن دور نہیں جب انسان پیدائش کے
وقت بھی گنجا ہوگا۔ اس کے بالوں کا وہی حال
ہوگا جو اس کی دُم کا ہوا تھا۔

ہاں تو بات بالوں کی ورزش کی ہو رہی
تھی۔ بالوں کو لگاتار کھینچنا بالوں کی
بہترین ورزش ہے۔ اگر آپ ایک دوسرے
کے لئے یہ ورزش انجام دینا چاہتی ہیں تو اس
کے لئے لڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ عمل دوستانہ
ماحول میں بھی دہرایا جا سکتا ہے۔ اگر خود ہی
اس عمل کو دہرائیں تو اس سے دوسروں کو
غلط فہمی پیدا ہوگی اور آپ کے بالوں کی
ورزش بھی ہو جائے گی۔

گردن بالوں کی پڑوسن ہے گھر میں
آگ لگے تو پڑوسی کا گھر بھی متاثر ہوتا ہے۔ پڑوس
کی دیوار مضبوط ہو تو آپ کا گھر بھی مضبوط رہتا
ہے۔ اسی طرح گردن کی ورزش بھی بالوں کو فائدہ
پہنچاتی ہے۔ اچھا پڑوسی خدا کی نعمت ہے
اس سے بدسلوکی کرنا یا اسے نظر انداز کرنا تہذیب
کے خلاف ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ دفتر میں
میز پر بیٹھنے والے اکثر گنجے ہوتے ہیں۔ اس کا
سبب یہ ہے کہ ان کی نشست کا انداز گردن
کو ایک ہی زاویہ پر رکھتا ہے۔ اس کے برعکس
نوجی افسر اور سپاہی گنج سے محفوظ رہتے ہیں انہیں
ورزش کے دوران بار بار گردن کو گھمانا پڑتا ہے
گردن کی ورزش بہت آسان ہے۔ کبھی کبھی
گردن کو دائیں بائیں اور دائرے کی شکل میں
گھماتی رہیے، گردن کی ورزش ہو گئی۔
عورتیں فلم دیکھتی ہیں تو سر ایک ہی زاویہ پر ٹکا رہتا
ہے۔ کپڑے سیتی ہیں تو بھی نگاہ مشین پر ٹکی رہتی
ہے۔ سینے پرونے کے کام میں بھی گردن اکڑی
رہتی ہے۔ کام کے دوران ایک دو منٹ کے
لئے کام چھوڑ کر گردن کو ادھر ادھر گھمائیں اور
اس کے بعد کام جاری رکھیں۔

بالوں کو گرد و غبار سے صاف رکھیں
یہ جسم کی صفائی سے زیادہ ضروری ہے۔ میلے
اور خاک دھول میں اٹے بال جراثیم کا گھر
بن جاتے ہیں۔ جوئیں ایسے ہی بالوں میں بسیرا
کرتی ہیں۔ اگر آپ کے سر میں جوئیں ہوں تو ان
کا تدارک لازمی ہے۔ جوؤں کے خاتمے کے
بعد بالوں کو صاف ستھرا رکھیں ورنہ جوئیں پھر
وہاں ڈیرا ڈال لیں گی۔

بالوں کو ہوا دینا بھی ضروری ہے جس
طرح انسان ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی
طرح بال بھی ہوا کے بغیر مرجھا جاتے ہیں۔ مردعموماً
جاڑے میں ٹوپی پہنتے ہیں انہیں خطرہ ہوتا ہے
کہ شدت کی سردی انہیں زکام میں مبتلا کردے گی
یہ وہم ہے۔ زکام کا امکان اسی صورت میں
زیادہ ہوتا ہے جب ہم اپنے سر کو ٹوپی اور مفلر سے
ڈھکے رہتے ہیں۔ اس سے مصنوعی حرارت پہنچتی
ہے اور بال اسی حرارت کے عادی ہو جاتے ہیں۔
جب یہ حرارت نہ پہنچے تو زکام کا حملہ آسان ہو جاتا
ہے۔ بال ہمیشہ کھلے رہیں تو انہیں مصنوعی حرارت
کی عادت نہیں ہوتی اور ان کی قوتِ مدافعت
بڑھ جاتی ہے۔

غسل کرتے وقت اس بات کا دھیان
رکھیں کہ تیز گرم پانی بالوں میں نہ ڈالیں۔ یہ بالوں
کو نقصان پہنچاتا ہے۔ گرمیوں میں ٹھنڈا پانی
ہی استعمال ہوتا ہے۔ جاڑوں میں بھی گنگنے
پانی کا استعمال کریں۔ بالوں کو بھی غسل کی اتنی
ہی ضرورت ہے جتنی جسم کو۔ ٹھنڈے پانی سے
بالوں کو طاقت پہنچتی ہے۔

ہوا اور پانی کے ساتھ دھوپ بھی بالوں
کے لئے ضروری ہے، مگر تیز دھوپ بالوں کے
لئے مفید نہیں ہے۔ سیاہ رنگ حرارت کو جلد
جذب کرتا ہے، اس لئے دھوپ میں چلنے سے
بالوں کو قدرتی حرارت ملتی ہے۔ اس سے
دورانِ خون تیز ہوتا ہے، جس سے بالوں کو توانائی
حاصل ہوتی ہے۔

بالوں کی صفائی، ورزش اور دیکھ بھال
غذائی احتیاط کے ساتھ مل کر بالوں کو ہمیشہ
صحت مند، چمکیلا اور گھنا رکھتی ہے ■

اپنی ذہانت کو آزمائیے، اپنی معلومات کا امتحان لیجئے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوان پریشر کوکر حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوئے تو انعام پانے والے کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا۔ اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔

۲۵ جنوری ۱۹۸۵ تک ہمیں ملنے والے جوابات اس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر۲" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۔ ہندوستان میں کس عورت کو نوبل پرائز ملا ہے؟

۲۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والی جھانسی کی رانی کا پورا نام کیا تھا؟

۳۔ ایک ہندوستانی خاتون پولیس افسر کو 'کرن' کا نام دیا گیا تھا۔ اس کا پورا نام کیا ہے؟

۴۔ ٹیلی فون کس کی ایجاد ہے؟

۵۔ اُردو کی مشہور ناول "افشاں" کی مصنفہ کون تھی؟

۶۔ ایورسٹ کو سر کرنے والی پہلی ہندوستانی عورت کون ہے؟

۷۔ ستی کی رسم ختم کرنے کے لئے کس ہندو لیڈر نے پہلے آواز اٹھائی تھی؟

۸۔ بھگت کبیر کس مغل بادشاہ کے دور میں تھے؟

۹۔ ہندوستان میں بنی ہوئی پہلی رنگین فلم کا کیا نام تھا؟

۱۰۔ دنیا کا کون سا ملک مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے تیسرے درجے پر ہے؟

ذہنی ورزش نمبر

(۱) ....
(۲) ....
(۳) ....
(۴) ....
(۵) ....
(۶) ....
(۷) ....
(۸) ....
(۹) ....
(۱۰) ....
نام : ....
پتہ : ....
....

عفت!

آج میرے گرد یادوں کا حصار ہے اور میں اپنے وجود کو ان یادوں کے شکنجے سے آزاد کرنے میں ناکام ہوں کیوں کہ یادیں میرے ذہن سے اس طرح جڑی ہوئی ہیں جیسے جسم سے روح — ان بکھری یادوں کو میں اپنی ڈائری میں سمیٹ لینا چاہتا ہوں مگر میرا قلم ضبطِ تحریر کرنے سے قاصر ہے۔ اور زبان پر یہ شعر ہے —

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

لیکن ڈائری لکھنا تو میرا روز کا معمول ہے اور آج میں نے سوچا ہے کہ بیتے ہوئے دنوں کے سارے واقعات جو تم سے وابستہ ہیں یکجا کر لوں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی مرتبہ بھابی سے ملنے ان کے میکے گیا تھا تو انہوں نے تم سے ملاتے ہوئے کہا تھا "اس سے ملو میری چھوٹی بہن عفت ہے" اور میں نے ملاحت کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اچھا — تو یہی ہے وہ جس کا انتخاب میرے لئے کیا ہے"۔ اور تم شرم سے ہرن کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے بھاگ گئی تھیں۔ تم اس وقت نوشگفتہ کلی تھیں۔ شباب تمہارے جسم کو دلکشیں دے رہا تھا تم ایک مشرقی ماحول کی پروردہ تھیں اس لئے شرم و حجاب تمہارے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی بھابی جب میکے میں ہوتیں تو میں اکثر ان سے ملنے جاتا میری نگاہیں تم کو تلاش کرتیں۔ تم بمشکل سامنے آتیں لیکن رفتہ رفتہ حجاب کی دیوار ہٹتی گئی اور ہم دونوں کے درمیان بے تکلفی بڑھتی گئی۔ تم سے اکثر دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں۔ کبھی کبھی ہلکا پھلکا مذاق بھی ہو جاتا۔ لیکن کیا معلوم کہ ماضی کے وہ حسین لمحات میری زندگی کو طوفان کے تھپیڑوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیں گے۔ میری زندگی کی کشتی ایسے بھنور میں پھنس جائے گی جس سے نکلنا میرے لئے محال ہو گا۔

محبت زبان کے اظہار کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ تو وہ قلبی جذبہ ہے جو چہرے کے تاثرات سے نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ خصوصیت تمہارے اندر بدرجۂ اتم موجود تھی۔ تمہاری قدامت پسندی اور مشرقی مزاج یہ کیسے گوارا کرتا کہ تم اس کا اظہار کھلے لفظوں زبان سے کرتیں۔ لیکن میں اپنے دل کے مندر میں تمہاری محبت کی پوجا کرتا رہا میری نہ کوئی دلآویز شخصیت تھی اور نہ کسی اونچے عہدے پر فائز مگر چاہت کا جذبہ تو اپنے محبوب کے اندر وہ خوبیاں تلاش کرتا ہے جو اس کے ذہن کی کسوٹی پر پوری اتر سکے شاید تم نے بھی میرے اندر کوئی ایسی خوبی تلاش کر لی تھی تب ہی تو تم نے بھی اپنے دل میں محبت کے چراغ روشن کر لئے تھے۔ میں نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ "عفت! میرے لئے تمہارے حصول کی خواہش ایسی ہی ہے جیسے کوئی بچہ چاند کی خواہش کرے" اور تم نے جواب دیا تھا۔ "آج انسان کے قدم چاند پر بھی پہنچ چکے ہیں"۔ بظاہر یہ مختصر سا جواب تھا مگر گہری معنویت رکھتا تھا میرے دل کے اندر محبت کے ٹمٹماتے چراغ کو تم نے حیات بخش دی۔ منزل کی جانب

بانو کی قیمت میں اضافہ

کاغذ، چھپائی اور دوسرے اخراجات میں بے پناہ اضافہ کے باعث ہم "بانو" کی قیمت میں اضافہ پر مجبور ہو گئے ہیں۔

مارچ ۱۹۸۵ کے شمارے سے "بانو" کی قیمت چار روپے فی کاپی ہوگی۔ سالانہ خریداروں سے قیمت اڑتالیس روپے لی جائے گی جس میں دس روپے کی قیمت کا سالنامہ بھی (رجسٹرڈ ڈاک سے) پیش کیا جائے گا۔

میرے قدم تیزی سے بڑھنے لگے لیکن — جب منزلِ مقصود قریب آنے لگی تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ تو سراب ہے، میرے پاؤں تھم گئے اور ایک اطلاع میرے دل و دماغ پر بجلی بن کر گری۔

تمہارے لئے ایک اچھا رشتہ مل گیا تھا جو یقیناً مجھ سے بدرجہا بہتر تھا۔ لڑکا انجینیرنگ کر رہا تھا۔ ایک روشن مستقبل تمہارے سامنے تھا لیکن میرے آگے تو بس امید کی ایک موہوم سی کرن تھی جس کی روشنی میں تم نے میرا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا اور خلوص و محبت کا وہ اتھاہ سمندر جو میرے دل کے اندر موجزن تھا کسی کی تمام ظاہری خوبیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانے کے لئے کافی تھا۔ لیکن — تم احتجاج بھی نہ کر سکیں کیوں کہ قدامت پسندی نے تمہاری زبان پر مہرِ سکوت ثبت کر دی تھی۔ خوابوں کا وہ حسین محل جسے ہم دونوں نے مل کر تعمیر کیا تھا مسمار ہوتا نظر آ رہا تھا۔

میں نے تمہارے یہاں جانا اور ملنا جلنا اس لئے ترک نہیں کیا کہ مبادا لوگوں کے دل میں شکوک و شبہات جنم لے لیں۔ تم سامنے آتیں مگر سر ندامت کے بوجھ سے جھکا ہوتا۔ آنکھیں نم ہوتیں۔ میں تم سے رسمی باتیں کیا کرتا۔ ہاں جب صرف اتنا کہا تھا۔ "تم سلامت رہو"۔ تو پھر تمہاری آنکھوں کے سارے بندھ ٹوٹ گئے اور آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا۔ میں گھبرا گیا تھا۔

اور اس دن میری کیفیت اور حالت کا بیان کرنا مشکل ہے۔ جب میں نے سنا کہ اگلے ہفتہ تمہارا نکاح ہے۔ میں اس تقریب میں شرکت کرنا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ میں اپنی بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا کیسے گوارا کرتا مگر بھابی نے مجھے اس موقع پر خاص طور سے مدعو کر رکھا تھا اور میں نے سپر ڈال دی تھی۔ اس دن تمہارا گھر برقی قمقموں سے جگ مگ کر رہا تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ قمقمے نہیں بلکہ وہ چنگاریاں ہیں جو میرے وجود کو جھلسا کر رکھ دیں گی۔ روشنیوں سے لپٹی فضا میرے دل کے نہاں خانے میں تاریکی بن کر مجھے بھٹکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ رات گئے تقریب ختم ہوئی اور میں بغیر کچھ کھائے پئے اپنے گھر لوٹ آیا۔

وقت اپنے محور پر گھومتا رہا اور پھر مجھے ایک دن معلوم ہوا کہ تمہاری صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے اور تم نے بستر پکڑ لیا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں دلی گیا ہوا تھا۔ لیکن مجھے بھابی کے خطوط سے تمہارے بارے میں خبر ملتی رہی۔ ڈاکٹر اور حکیم تمہارے علاج سے تنگ آ چکے تھے۔ جس مرض کی تشخیص ڈاکٹر اور حکیم کر ہی نہیں سکتے تھے اس کا صحیح علاج کیسے کرتے۔ ہاں عفت! میں جانتا تھا کہ تمہارا مسیحا دراصل میں ہوں لیکن جرأتِ اظہار میرے لئے ناممکن تھی کیوں کہ تم ایک امانت تھیں۔ تمہیں بہر حال اپنا فیصلہ بدلنا تھا مگر تم نے حالات سے سمجھوتہ کرنا گوارا نہیں کیا اور ماضی کے زہر کو نوش کرتی رہیں۔

آج دلی سے لوٹا تو سب سے پہلے تم سے ملنا چاہا اور جب تمہارے گھر کے قریب پہنچا تو دور ہی سے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ ٹھیک اسی طرح جس دن تمہارا عقد تھا فرق یہ تھا کہ اس دن قہقہے فضا میں گونج رہے تھے اور آج نالہ و فغاں سے سارا ماحول سہما سہما سا ہے۔ ایک کہانی جو میری زندگی میں طوفان بن کر داخل ہوئی ختم ہو چکی ہے۔ اب میرے سامنے دشتِ تنہائی ہے جہاں میں اپنی ناکام حسرتوں کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے پہلے بھی بھٹکتا رہا اور اب بھی بھٹکتا رہوں گا۔

●

نزہت فاروقی

ذرا سی بھول

اماں کے چہرے پر سکون تھا۔ ایسا سکون جو باجی کی شادی کے بعد انہیں آج تک نصیب نہ ہوا تھا۔ دکھوں سے چُور میری اماں زندگی کے سفر میں تھک گئیں۔ لیکن مجھے کب تک زندگی کا بوجھ لئے گھسٹنا ہے، کون جانے ۔۔۔ آج اماں بھی چپکے سے آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لئے مجھے چھوڑ گئیں۔ یہ بھی نہ سوچا اماں نے کہ ان کے پیچھے ان کی گڈو کیسے اور کس کے سہارے جئے گی۔

آنسوؤں کا بندھ ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔

موت کے ظالم ہاتھوں نے آخری سہارا بھی مجھ سے چھین لیا اور میں تنہا رہ گئی۔ سچ تو ہے میں نے اماں کو غموں کے سوا دیا ہی کیا تھا پھر بھی اماں کبھی نہیں روئیں، ہونٹوں پر درد بھری مسکان سینے میں غموں کا طوفان لئے جیتی رہیں۔ اماں کو صدا آنسوؤں سے نفرت رہی، پھر یہ آنسو؟ میں نے دوپٹے کے کونے سے آنسو صاف کئے۔ شیبا باجی مجھے آواز دے رہی تھیں۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے ان کے پاس پہنچی۔

وہ کہہ رہی تھیں، "گڈو، تمہاری باجی آگئی ہیں"

میں لرز گئی۔ درد کی ایک تیز لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ باجی اندر آرہی تھیں، میری طرف دیکھے بغیر وہ اماں کے سرہانے جا کر پھوٹ پڑیں۔ باجی کے لئے بھی تو اماں واحد سہارا تھیں۔ شیبا باجی مجھے سہارا دے کر اماں کے پلنگ کے پاس لے آئیں، باجی نے ایک بار نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ جانے ان کی نظروں میں کیا کچھ سمویا ہوا تھا۔ ایک درد، ایک کرب، ایک شکوہ اور وہی مخصوص نفرت۔ میں ان کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور نظریں نیچی کر لیں۔ باجی کی نظروں میں میرے لئے ہمیشہ نفرت ہی رہی۔ یہ نظریں اب میری روح میں اتر چکی ہیں۔ کاش باجی مجھے معاف کر سکتیں، کاش ان کی نظروں میں ممتا ہوتی، ہمدردی ہوتی تو شاید میں اماں کا غم بھول جاتی۔

اماں کی میت جا چکی تھی۔ گھر میں اب ایک ہولناک سناٹا تھا۔ اس گھر میں باجی کی رخصتی کے بعد سدا ایسا ہی سناٹا رہا۔ لیکن اماں کی ہستی میں پھر بھی ایک رونق تھی جیسے اندھیری راتوں میں ایک ٹمٹماتا چراغ۔ مگر آج تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میں نے پلنگ سے ٹیک لگائی، نہیں جانتی ہوں، یا اندھیرے اب میرا مقدر بن چکے ہیں کل باجی بھی واپس چلی جائیں گی۔ ہمیشہ یوں ہی آتی ہیں، گم صم، اداس، اداس۔ ان کے آنے پر گھر کی اداسیوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ گھنٹوں اماں کے پاس بیٹھ کر آنسو بہایا کرتیں۔ اماں خاموش رہتیں، بالکل ساکت۔ ایک پتھر کی طرح۔ پھر دوسرے دن باجی ویسے ہی لوٹ جاتیں۔ اماں ان کو روکتی بھی نہ تھیں، بس حسرت سے تکتی رہتیں اور میں؟ میں ان دنوں اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ جاتی۔ جب کبھی ان کی نظریں مجھ سے ملتیں، ان میں نفرت ہوتی۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اب تو باجی کے سیاہ بالوں میں سفیدی بھی جھلکنے لگی ہے۔ ان کی آنکھوں کی ویرانیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ میں نے باجی کا وہ روپ بھی دیکھا ہے جب وہ دلہن بنی تھیں، کتنی پیاری لگ رہی تھیں وہ۔ بالکل روئی کے پھول جیسی۔ گھر میں ہر طرف خوشیاں بکھری پڑی تھیں۔ کتنے خوش تھے باجی اور شہاب بھائی ایک دوسرے کو پا کر۔ اماں کے ہونٹوں پر بھی ایک دل نشین مسکراہٹ نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔ ابا کی موت کے بعد اماں نے ہم دونوں بہنوں کو ماں اور باپ کا یکساں پیار دیا تھا۔ مصائب اٹھائے تھے، لیکن زباں پر آہ نہ لائی تھیں۔ باجی کی شادی پر جیسے وہ دل کھول کر خوش ہوئی تھیں، شاید پہلی اور آخری بار۔

شہاب بھائی کشمیر میں لیکچرار تھے، یوں ان کے ماں باپ یہیں شکوہ آباد میں مقیم تھے، لیکن چونکہ شہاب بھائی کی چھٹی بہت کم دن کی تھی اس لئے انہیں جلد واپس جانا تھا اور وہ باجی کو اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے تھے۔ باجی اور میں کبھی اماں سے الگ اور دور نہیں رہے تھے، اس لئے کیلے اتنی دور جانے کے خیال سے باجی بہت گھبرا رہی تھیں۔ اس دن بھی باجی بہت گھبرائی ہوئی تھیں اور کھانے کے درمیان یہی باتیں زیرِ بحث تھیں۔ اماں باجی کو سمجھا رہی تھیں کہ اچانک باجی نے رونا شروع کر دیا۔ آخر شہاب بھائی نے یہ تجویز پیش کی، کیوں نہ گڈو کو ساتھ لے لیں؟ تمہارا دل بھی لگے گا، اور یہ بھی گھوم پھر لے گی۔" اماں انکار نہیں کر سکی تھیں اور پھر میں باجی اور شہاب بھائی کے ساتھ کشمیر پہنچ گئی۔ اماں کی یاد ضرور آتی تھی لیکن شہاب بھائی بڑے دل چسپ اور مزاحیہ طبیعت کے انسان تھے۔ گھر میں ہوتے تو خوب ہنسایا کرتے یا پھر سیر و تفریح رہتی۔ ہر شام کہیں نہ کہیں کا پروگرام بنتا رہتا۔

اس دن بھی یونی ورسٹی سے واپس آکر انہوں نے مجھے آواز دی۔ "گڈو، آج کا کھانا نہیں بنے گا۔"

میں ان کے لئے کچن میں چائے کا پانی رکھ رہی تھی۔ حیران سی باہر آئی اور پوچھا۔

"کیوں خیر تو ہے؟"

"نہیں، بالکل خیر نہیں ہے۔ وہ رعب دار لہجے میں بولے۔

"اوہ! آخر بات کیا ہے؟ باجی اگر ابھی آپ کا یہ لہجہ سنیں گی تو باتھ روم میں ہی رونا دھونا شروع کر دیں گی۔"

"ارے بھئی، جھٹ پٹ تیار ہو جاؤ۔ آج ہم لوگ پکچر بھی دیکھیں گے اور باہر ہی ڈنر لیں گے۔"

"ارے واہ! مزہ آگیا، آج میں بہاری والے کباب کھاؤں گی۔"

میں لپک کر باتھ روم تک پہنچی اور دروازہ بجا بجا کر ہنستے ہوئے باجی کو پروگرام سنایا۔ پھر ہم لوگ سینما پہنچ گئے۔ فلم شاندار تھی۔ فلم دیکھنے کے بعد مجھ میں اور شہاب بھائی میں ہمیشہ ہی بحث ہوتی، باجی صرف مسکرایا کرتیں لیکن آج کی بحث میں باجی بھی سرگرمی سے حصہ لے رہی تھیں۔ ہم دونوں ان سے اس بات کو منوانے کے لئے بضد تھے کہ مرد عورت سے زیادہ شکی ہوتے ہیں۔ شہاب بھائی زور دار تردید کر رہے تھے۔ بحث طویل ہوتی جا رہی تھی۔ رات بھی خاصی ہو گئی تھی، اس لئے میں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ "ٹھیک ہے۔ آپ کا بھی امتحان ہو جائے گا۔" شہاب بھائی نے بھی حامی بھر لی۔

بات رفع دفع ہو گئی لیکن میں برابر موقع کی تلاش میں تھی۔

ان ہی دنوں باجی کے پڑوس میں ایک نیا خاندان آکر بسا۔ ہم لوگوں کا ان کے یہاں ہر وقت کا آنا جانا ہو گیا۔ ریٹائرڈ میجر رحمان صاحب کے تین بیٹے تھے۔ عمران اور فیضان شادی شدہ تھے اور بیرونی ممالک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ چھوٹا بیٹا ریحان کشمیر میں ہی رہ کر ڈاکٹری کا کورس مکمل کر رہا تھا۔ رحمان صاحب کے کوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ اور ان کی بیوی مجھے اپنی بیٹی کی طرح مانتے اور ریحان بھیا اپنی چھوٹی بہن۔ مجھے بھی ان سے بے حد انسیت تھی۔ ادھر اماں کے کئی خط مجھ کو بلانے کے لئے آچکے تھے، اس لئے ایک روز میں نے ریحان بھیا سے ان کی ایک تصویر مانگ لی اور ان سے ہمارے خط لکھنے کا بھی وعدہ کر لیا۔

جانے کے دن قریب آگئے لیکن ابھی تک شہاب بھائی کا وہ شرط والا امتحان ہونے والا تھا۔ ایک دن ریحان بھیا کی امی نے باجی کو کسی کام سے اپنے گھر بلا لیا۔ چونکہ شہاب بھائی کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس لئے میں گھر پر ہی تھی۔ ہاتھ میں پیالی لئے باہر آئی اور انہیں بتایا کہ باجی رحمان انکل کے گھر کسی کام سے گئی ہیں۔ شہاب بھائی نے کافی کی پیالی ٹیبل پر رکھ دی۔ اور خود صوفے پر بیٹھ کر جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے بولے۔ "یار گڈو، خالی کافی میں مزہ نہیں آئے گا تمہاری باجی نے وہ اخروٹ وغیرہ کہاں چھپا رکھے ہیں جو اس دن ریحان دے گیا تھا۔ ذرا ڈھونڈ کر لاؤ۔"

میرے دماغ میں یک لخت پلاننگ گھوم گئی۔ جلدی سے اندر کمرے میں آئی۔ رائٹنگ ٹیبل پر سے پیڈ اور قلم لے کر چار لائن کا ایک خط لکھ کر ریحان بھیا کی تصویر میں لپیٹا اور باجی کی اٹیچی میں کپڑوں کی تہہ کے نیچے رکھ دیا پھر شہاب بھائی کو آواز دی۔ "شہاب بھائی ساری جگہیں تو دیکھ ڈالیں اب تو صرف باجی کی اٹیچی باقی ہے، لیکن اگر میں ان کے کپڑوں کو ہاتھ لگاؤں گی تو ناراض ہوں گی کہ تہہ بگاڑ دی اس لئے آپ ہی آئیے۔"

شہاب بھائی آئے۔ اٹیچی کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ وہ خط اور تصویر ان کے ہاتھ لگ ہی گئی۔ انہوں نے حیرت سے خط کھولا، پھر اسے پڑھنے لگے۔ میں انجان سی بنی پیٹھ موڑ کر ایک رسالے کی ورق گردانی کرتی رہی۔ میں کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ ان کا چہرہ غصے

ے سننے ہوتا ہاتھ [illegible]
تیں۔ میں بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اب
ہیں بچے، [illegible]
پتے میں [illegible]
ی اور میں لپک کر باہر آگئی۔ انہوں نے پوچھا
"وہ کہہ گئے کیا؟" لیکن جو کچھ پڑی شہاب
ھائی کو اور ان کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ
ر وہ ٹھٹھک گئیں۔
شہاب بھائی غصّے سے پھنکارے:
"کہاں گئی تھیں؟"
"کیوں؟ کیا بات ہوئی؟ رحمان انکل
ے گھر گئی تھی۔ انہوں نے....."
"خاموش رہ ذلیل!" شہاب بھائی
نے مٹھی میں مسلی ہوئی وہ تصویر اور خط باجی
کے مونہہ پر پھینک دیے۔ "تم اتنا گر جاؤ گی،

رخصت [illegible] تھی۔ اس طرح سب
سے چھپ کر آدھی رات کو تمہیں دکھاوے کے ساتھ
بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں خود تم کو آزاد کرتا
ہوں۔ تم کو طلاق دیتا ہوں۔"
حیران سی باجی جیسے منجمد ہو کر رہ گئی تھیں
کچھ بھی تو کہہ سکی تھیں اپنی صفائی میں، صرف
چیخ اٹھیں۔ میں نے شہاب بھائی کو جھنجھوڑ ڈالا۔
"یہ کیا کر ڈالا شہاب بھائی آپ نے؟
نہیں شہاب بھائی، خدا کے لئے اپنا فیصلہ واپس
لے لیجئے۔ باجی بے قصور ہیں — بالکل بے قصور"
میں ان کے گریبان میں جھول کر بے ہوش
ہو چکی تھی۔ پھر بے ہوشی ٹوٹی تو اماں کو اپنے سامنے
پایا تھا۔ بڑی خاموشی سے وہ ہم دونوں کو اپنے
ساتھ واپس لے آئی تھیں۔ سب کے سب
خاموش تھے۔ کچھ کہنے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔

اس دن سے ہمارے گھر میں سناٹا سا
ہے، کسی کے قہقہے نہیں کھلتے، کسی کی ہنسی نہیں
گونجی۔ باجی نے اس شہر سے دور ایک گاؤں میں
ٹیچر کی ملازمت کر لی تھی۔ اماں بس خاموش رہیں۔
باجی اور شہاب بھائی دونوں ہی ادھوری زندگی
کا زہر پی کر جی رہے ہیں۔ اماں نے کئی بار میری طرف
بڑی امید نظروں سے دیکھا تھا۔ لیکن میری نظروں
نے انہیں مایوس کر دیا تھا۔ کیونکہ دو زندگیاں
برباد کرکے مجھے کیا حق تھا کہ میں اپنا گھر بساؤں
باجی کی زندگی تباہ کرکے میں خوشیاں مناؤں۔
میرا ضمیر بھی اس کی اجازت نہ دے گا۔ کیا جانتی
تھی کہ میرا ایک چھوٹا سا مذاق ایک بھرے پُرے
گھر کو کھنڈر بنا دے گا۔ ویرانیاں بڑھتی جائیں گی
اور ایک دن اماں بھی آنکھیں موند لیں گی اور
میں تنہا رہ جاؤں گی۔ ■■

نتیجہ بانو، اپریل ۱۹۸۵ میں شائع ہو گا۔

خیال اپنا اپنا

یہ انعامی مقابلہ آپ کو موجودہ دور کے مختلف مسئلوں اور سوالوں کے بارے میں اظہارِ رائے کا موقع
اور دعوت دیتا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات اور فکری نتائج دوسروں تک پہنچائیے اور انعام حاصل کیجئے

پہلا انعام : سو روپے
دوسرا انعام : پچاس روپے
تیسرا انعام : تیس روپے

اس ماہ کا سوال ہے : **کیا عورت تنہا زندگی گزار سکتی ہے؟**

اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ لفظوں میں اپنے خیالات ہمیں لکھ بھیجئے۔ آپ کی تحریر
۱۵۔فروری ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جانی چاہئے:

"خیال اپنا اپنا" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

"ارے بھابی جی — آپ! اتنے دنوں بعد؟ کہاں چلی گئی تھیں؟ ہم سب کتنا یاد کرتے تھے آپ لوگوں کو۔ کوئی خط پتر نہیں، کوئی اتہ پتہ نہیں...!"

وہ کہے جا رہی تھیں۔ اس درمیان انھوں نے مجھے گلے سے لگایا اور میرے بچوں کو باری باری گود میں سمیٹا۔ ہم لوگ پانچ سال بعد مل رہے تھے اس لئے دونوں کے بچے ہکا بکا سے کھڑے تھے۔

دونوں نے ایک دُوسرے کے بچوں کو جی بھر کے پیار کیا اور پھر تو ہم گذرے ہوئے زمانے کی باتوں میں اس طرح کھوئے کہ وقت کے گذرنے کا احساس تک ختم ہو گیا۔

بچے کچھ ہی دیر میں آپس میں گھل مِل گئے اور کھلونوں کے ڈھیر میں اُن کی خوشیاں رقص کرنے لگیں۔

وہ کی زبان باتیں کئے جا رہی تھی۔ مگر اُن کے ہاتھ ہماری خاطر داری میں مصروف تھے کبھی وہ سیب کاٹ کاٹ کر میرے بچوں کو اپنے ہاتھ سے کھلاتیں۔ اور کبھی چاکلیٹ سب بچوں میں تقسیم کرنے لگتیں۔

باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہم نے پانچ سالوں میں گذرے ہوئے تمام اہم واقعات ایک دوسرے کو کہہ سنائے۔ میں نے بتایا کہ دہلی میں اپنا مکان ہونا بہت ضروری ہے۔ ہمیں اپنے لئے نہیں تو نہ سہی اپنے بچوں کے لئے ضرور بہتر رہائش چاہیے۔ مکان کے مسئلہ کے بعد میں نے اپنی پڑھائی ختم ہونے اور بچی کے اسکول کا دور شروع ہونے کے بارے میں بتایا۔ شوہر کے کیریر میں کیا کیا پیش رفت ہوئی۔ اس کی بھی خبر دی — مختصر یہ کہ جب وہ بولیں تو میں چپ چاپ ہاں میں ہاں ملاتی رہتی اور جب میں آپ بیتی سناتی تو وہ بڑے غور سے تمام باتیں سنتی جاتیں۔

جب بھی باتوں سے ذرا مہلت ملی تو میں نے پانچ سال پہلے کے تمام پڑوسیوں کے بارے میں پوچھنا شروع کیا — وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے زینے پر قدم رکھتے ہوئے بولیں "چلئے چھت سے سب کے گھر نظر آتے ہیں اوپر چل کر سب کے بارے میں بتاؤں گی:"

اوپر پہنچ کر وہ کہنے لگیں وہ ۲۹-۱۷ ہے جس میں دو جڑواں بچے رہتے تھے، ارون اور پونیت وہ سب اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ ارون اور پونیت کے ماں باپ ایک بچی چاہتے تھے۔ مگر پھر لڑکا ہوا ہے ابھی چھ مہینہ کا ہے۔ دن میں اُسے کریچ میں چھوڑ دیتے ہیں۔ جڑواں لڑکے اسکول چلے جاتے ہیں ساڑھے آٹھ بجے ماں چلی جاتی ہیں اور ساڑھے نو بجے تک ان کے پاپا چلے جاتے ہیں۔ بچے جب اسکول سے واپس آتے ہیں تو پڑوسی انھیں کھانا کھلاتے ہیں اور پھر بچے باہر کے بچوں کے ساتھ کھیلتے رہتے ہیں۔ ماں باپ دونوں دیر سے آتے ہیں ماں ایک ٹیوشن پڑھانے جاتی ہے اور باپ اوور ٹائم کی وجہ سے ہمیشہ دیر سے آتے ہیں۔

اور یہ ۳۰-۱۷ ہے یہ لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ہاں، ان کی ایک پیاری سی لڑکی تھی جو تھی آپ کے گھر بہت جاتی تھی۔ وہ اچانک ختم ہو گئی — ماں اس کے غم میں ابھی تک روتی ہے۔

اور یہ سامنے ۳۱-۱۷ رہا۔ جس میں آپ رہتی ہیں۔ اس میں ڈیڑھ سال پہلے ایک نیا جوڑا آیا تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے اُن کے یہاں بھی لڑکا پیدا ہوا ہے — بچے کی دیکھ بھال کے لئے دس سال کا ایک ملازم لڑکا رکھ چھوڑا ہے۔ میاں بیوی دونوں نوکری کرتے ہیں۔ اکثر بچے کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ یہ لوگ باہر سے تالا بند کر کے چلے جاتے ہیں اور گھر کا نوکر کھڑکی میں سے گھبرایا، سہما اور روہانسا سا جھانکا کرتا ہے۔

اس کے آگے ۳۲-۱۷ ہے۔ اس میں دو سال پہلے میاں بیوی اور ایک بچہ آئے تھے وہ لوگ زیادہ ملنے جلنے والے نہ تھے۔ نہ کسی کے گھر جاتے اور نہ کسی کو اپنے گھر بلاتے اب صرف تنہا وہ اپنے بچے کے ساتھ رہتا ہے۔ عورت نہیں ہے۔ پہلے سننے میں آیا کہ وہ ایک مہینہ کی چھٹی لے کر گھر گئی ہے اور اسکول کی وجہ سے بچے کو ساتھ نہیں لے جا سکی ہے مگر بعد میں بات یوں کھلی کہ اس نے شوہر سے علیحدگی لے لی ہے۔ کیونکہ بیوی کا نوکری کرنا شوہر کو پسند نہ تھا۔

"ادھر دوسری لائن کے اس مکان میں ایک کرسچین عورت ہے۔ اس کا شوہر دوسرے شہر میں نوکری کرتا ہے۔ عورت اپنے لڑکے کے ساتھ رہتی ہے۔ کسی پرائیویٹ فرم میں نوکری کرتی ہے لڑکا گھر پر تنہا رہتا ہے سات سال کا ہو گیا ہے مگر ابھی تک اسکول نہیں جاتا۔ گھر پر ہی ٹیوشن پڑھتا ہے یہ بھی دن بھر تالے میں بند رہتا ہے۔ بہت دنوں تک ہم لوگ اُسے گونگا ہی سمجھتے رہے بے چارہ گم صُم کھڑکی سے جھانکتا رہتا۔ اتوار کو ماں کے ساتھ چرچ جاتا تو ہم لوگ اُسے مخاطب کرتے۔ مگر جواب ہمیشہ ماں دیا کرتی۔ لیکن ایک دن بہت جلدی میں تھی وہ باہر کا تالا بند کرنا بھول گئی تو لڑکے نے زور سے پکار کر تالا نہ بند کرنے کی خبر دی۔

اس کے آگے والے مکان میں دن بھر دو سال کا بچہ نوکر کے ساتھ رہتا ہے —— باپ لیکچرر ہیں اور ماں اسکول ٹیچر۔ بچہ سو کر اُٹھ نہیں پاتا کہ ماں جا چکی ہوتی ہیں —— اور جب وہ اٹھ کر آنکھیں مل رہا ہوتا ہے تو باپ کی ٹاٹا کی آوازیں آ تی ہوتی ہیں۔ نوکر بہت چڑچڑا ہے بات بات پر بچے کو مارتا رہتا ہے —— بچے کے ماں باپ سے جتنی ڈانٹ پھٹکار اسے ملتی ہے، وہ ایک ایک بات کا گن گن کر بدلہ لیتا ہے۔ بچہ سارے دن سہا سہا رہتا ہے۔ نوکر اُسے مداری کا بندر بنائے رکھتا ہے۔ کبھی اسے زور زور سے ہنسنے کا آرڈر دیتا ہے اور کبھی اس سے اٹھا بیٹھی کراتا ہے۔

وہ ہرے بھرے درختوں سے گھرا ہوا گھر ماما جی کا ہے۔ ابھی تک بہو کی تلاش میں ہیں۔ بیٹا چاہتا ہے، بیوی نوکری کرتی ہوئی ملے۔ ماں کو بھی کماؤ بہو پسند ہے۔ کئی لڑکیاں اچھے گھروں کی پڑھی لکھی خوب صورت ملیں، مگر ابھی تک بارو زگار لڑکی نہیں مل سکی ہے...."

وجے بولے جا رہی تھیں اور میرا ذہن اس وقت ایک ٹیپ ریکارڈر کی طرح کام کر رہا تھا جس میں تمام چھوٹے چھوٹے بچوں کی مجبوریاں قید ہو چکی تھیں۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن لیکچرر کے بچے پر مرکوز ہو گیا تھا۔ میں جو ابھی تک صرف سن رہی تھی اور ایک ایک بچہ کی دکھ درد کا جائزہ لے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میری زبان سے نکل گیا: "ہاں وجے، تم نے ابھی بتایا تھا نا کہ اس بچے کے باپ لیکچرر ہیں کیا لکھتے ہیں وہ؟ تم نے ان کا لکھا ہوا کبھی کچھ پڑھا۔

وجے معمولی پڑھی اور گھریلو قسم کی عورت تھی۔ جواب میں کہنے لگی، نہیں، پڑھا تو کچھ بھی نہیں مگر سنا ہے کہ بچوں کی زندگی پر کہانیاں لکھتے ہیں:

مجھے ایسا لگا جیسے میں کچھ اور برداشت نہیں کر سکتی میں نے بہت اداس لہجہ میں کہا "بس وجے تم نے تو اتنی دیر میں ساری کالونی کی سیر کرا دی۔

وجے میرے لئے کافی بنانے کچن میں چلی گئیں اور میرے سامنے میرے اپنے بچوں کا امکانی اکیلا پن گھومنے لگا۔

ڈاکٹریٹ کئے ہوئے مجھے کافی وقت گذر چکا تھا۔ میں اپنی زندگی اب رکی رکی سی محسوس کر رہی تھی۔ میں بہت کچھ کرنا چاہتی تھی اور ہر وقت اس تلاش میں رہتی تھی کہ کچھ کرنے کا موقع ملے مجھے اس بات کا شدید احساس تھا کہ اگر کچھ دن اور اس طرح گھریلو کام کاج میں مصروف رہی تو پھر آگے مایوسی ہی ہے۔ میں نے کئی جگہ درخواستیں بھیجی تھیں ایک دو انٹرویو بھی دے تھے مگر اب اتنے بچوں کی بے بسی مظلومی اور اکیلے پن کی داستانیں سن کر میرے تو خیالات ہی بدل گئے تھے۔ میں اندر سے بہت افسردہ ہو گئی اور میں نے ارادہ کر لیا کہ اب میں نوکری ہرگز نہ کروں گی۔ بچوں کی یہی عمر تو بہت اہم ہے۔ اگر اس وقت وہ کسی نفسیاتی اُلجھن کے شکار ہو گئے تو ان کی شخصیت پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ خدا نہ کرے میرے بچے کبھی مجبوروں کی طرح گھروں میں تنہا قید ہوں۔ خدا نہ کرے وہ وقت کہ دیکھنے والے ان پر ترس کھائیں۔ انھیں مارنا تو بہت دور کی بات ہے کوئی ان سے سخت لہجے میں بولے میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اپنے بچوں کی نفسیات کا پورا خیال رکھوں گی۔ میری زندگی میں ان کی خوشیاں ہی مقدم ہیں مجھے دو تنخواہیں نہیں چاہئیں۔ آمدنی نہ بڑھے نہ سہی: میں اپنی ضروریات محدود کر لوں گی۔ مگر بچوں کو تنہائی کے غار میں کبھی نہ جانے دوں گی۔

میں نے اپنے دونوں کھیلتے ہوئے بچوں کو پاس بلایا اور انھیں پیار کرنے لگی۔

وجے گئی تو کافی کے لئے تھیں مگر لوازم ساری میز بھری تھی۔

شام ہو چکی تھی۔ شوہر کی دفتر سے واپسی اور گھر بند ہونے کا خیال آیا۔ تو میں نے وجے سے اجازت چاہی۔ اور آئندہ اتوار ان لوگوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

سارے راستہ میں بچوں سے خوب بولتی انھیں کے مزاج اور پسند کی باتیں کرتی رہی، یہ باتیں اس خوف کا نتیجہ تھیں کہ کہیں میرے اس طرح تنہا نہ ہو جائیں۔ میں نے ایک بار پھر نوکری نہ کرنے کے بارے میں سوچا اور اپنے معصوم بچوں کو اپنے سے اور قریب کر لیا۔

گھر پہنچ کر میں نے دروازہ کھولا تو ایک لفافہ پڑا دیکھا خاکی رنگ کے اس لفافے کو میں چاک کیا تو پتہ چلا کہ میرا تقرر دہلی کے ایک میں لکچرر کی حیثیت سے ہو گیا ہے۔

اگلے روز میں نے اس ملازمت کو قبول کا خط بھیج دیا۔ ■

اندھیرے کے خلاف

تنویر اختر رومانی

میں صرف وسودھا نہیں ہوں' ایک عورت بھی ہوں' کسی عام عورت کی طرح ایک عورت. وسودھا نام ہو جانے سے لوگ مجھ سے یہ امید کیوں کرتے ہیں کہ میں دھرتی کی طرح سب کچھ برداشت کرتی رہوں گی! چپ چاپ' آخری دم تک! وسودھا تو صرف میرا نام ہے' محض پہچان کا ایک تخاطب لیکن میرے دکھ درد میں جب کوئی مجھے سمجھانے بجھانے آتا ہے تو یہ ضرور کہتا ہے: "تمہارا تو نام ہی وسودھا ہے. وسودھا یعنی دھرتی، ہر ظلم کو خاموشی سے برداشت کرنے والی دھرتی" مجھے اس نام سے چڑ ہو گئی ہے. وسودھا — جیسے کوئی نام نہ ہوا، ایک ایسی کال کوٹھری ہو گیا جس کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے قیدی کی ناانصافی کو سہنا مجبوری نہیں، اصول بن گیا ہو. نہیں نہیں، حد ہوتی ہے ہر بات کی. صرف وسودھا نام ہونے پر میں کب تک برداشت کرتی رہوں گی؟ اس گھر میں تو مصیبتوں کی کوئی حد ہی نظر نہیں آتی. سب کے سب مجھے ذلیل کرتے ہیں، مجھ سے نوکروں جیسا سلوک کرتے ہیں. ذرا بھی تو اپنائیت نہیں ہے میرے لئے کسی کے دل میں.

میری بڑی نند سشما کو ہی دیکھو — اپنی سسرال میں تو تھوڑی سی بھی عزت نہیں لیکن یہاں آ کر ہر دم رعب جماتی رہے گی. پچھلی دفعہ جب آئی تھی تو کہہ گئی تھی کہ اسے پکا کھانا کھانے کی عادت نہیں ہے، پوری کچوری سے اسے بدہضمی ہوتی ہے، اس لئے اس بار اس کے آنے پر میں نے اس کے کہنے کے مطابق اسے کچا کھانا پروس دیا تھا.

کھانا کھانے کے بعد جب سشما ماں کے پاس بیٹھی تو لگی شکایت کرنے: "دیکھ لو اماں، بہو سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ششمن کی بچی کی دو پوریاں ہی تھالی میں رکھ دیتی. میں کون سا روز روز آتی ہوں جو سوکھی روٹی سرکا دی."

انجام وہی ہوا. شام کو آتے ہی ماں اور نندی نے ان کے کان بھر دئے اور وہ بغیر سوچے ہی مجھ پر برس پڑے: "بہو کے گھر سے آئی ہے حرام زادی. گھر کے طور طریقے تک کا پتہ نہیں."

میں سب کچھ چپ چاپ سنتی رہی. جانتی تھی میری بات پر کوئی کان نہ دھرے گا.

اس قید سے کچھ دن تک رہائی کی خاطر میں نے جب اس دن میکے جانے کے لئے کہا تو ماں جی تیکھے لہجے میں چیخیں: "باپ کے گھر میں چھبیس برس تک رہ کر بھی پیٹ بھرا نہیں جو روز روز میکے جانے کی لگی رہتی ہے. میکے سے اتنا ہی لگاؤ تھا تو رہ جاتی وہیں پر — کیوں شادی کی؟"

"لیکن ماں جی —— دو سال...."

"اگر جانا ہی ہے تو اگلے مہینے کے بعد جانا. تیری جیٹھانی آنے والی ہے. اس بار بچے بھی آئیں گے اس کے ساتھ. گھر میں کتنا کام بڑھ جائے گا. کون کرے گا سب؟"

اگلا مہینہ بھی آ گیا. جیٹھانی بھی آ گئیں. وہ سب ایک مہینہ رہ کر واپس بھی چلے گئے لیکن میرا میکے جانا نہ ہو سکا. جب دو مہینے گزر گئے اور ماں جی کا کوئی موڈ بنتا نہیں دکھائی دیا تو مجبور ہو کر میں نے ہی گھر پر چٹھی ڈال دی. چٹھی کے جواب میں دیپے مجھے لینے آ گیا.

"اپنی بہن کو سدھار. کوئی لچھن نہیں اس کے بہو جیسے. کیا سکھایا ہے تم نے اسے پچیس برسوں میں؟ نہ کھانا بنانا آتا ہے نہ کپڑے دھونا. اور نیند تو اس کی پلکوں پر بیٹھی رہتی ہے. جب دیکھو سوتی ہی ملے گی." دیپے کے آتے ہی ماں جی میری تعریف کرنے لگیں.

"ایسا تو نہیں ہونا چاہئے، ماں جی." دیپے

میری طرف دیکھ کر بے یقینی سے بولا۔
"ایسا نہیں ہونا چاہیے سے مطلب؟"
ماں جی کی پیشانی وجے کے جواب سے تن گئی۔
وہ رعب سے بولیں "تو پھر میں کیا جھوٹی ہوں؟"
اتنا کہہ کر ماں جی نے ان کو آواز دیتے ہوئے کہا "سنتا ہے، تیرا سالا کہتا ہے، میں جھوٹی ہوں..... ہائے رام!! اس بڑھاپے میں یہ مجھ کو مجبور جھوٹ بولنے کا کلنک لگ رہا ہے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا، ماں جی۔"
وجے الجھن میں پڑ کر بولا "میں تو ... میں تو۔"
اتنے میں وہ آگئے اور آتے ہی وجے پر برس پڑے "وجے، کیا تمہیں اتنا بھی شعور نہیں کہ بڑے بوڑھوں سے کیسے باتیں کی جاتی ہیں۔"
"لیکن میں نے تو کوئی بھی بری بات نہیں کہی، جیجاجی۔" وجے عجیب حالت میں پھنس کر روہانسا ہو گیا۔
بیٹے کو اپنی طرف بولتے دیکھ ماں جی تڑاتڑ بولنے لگیں "تم لوگوں نے ہی اسے بگاڑ رکھا ہے۔ جب بھی میکے سے لوٹ کر آتی ہے تو تیور ہی نئے ہوتے ہیں اس کے۔ جانے کیا کیا پٹی پڑھاتے ہو۔"
"پٹی سے آپ کا مطلب؟" غصے میں وجے کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "آپ سمجھتی ہیں کہ ہم لوگ اپنی بہن کو خوش نہیں دیکھنا چاہتے؟ آپ ... آپ ایسا سوچ بھی کیسے لیتی ہیں؟"
حالات کو بگڑتے دیکھ کر میرا من چلا اٹھا۔ غصے میں فیصلہ نہیں کر سکی کہ کس سے کیا کہوں۔ میں وجے پر ہی چیخ پڑی "وجے، تم ماں جی سے بات چیت کرتے وقت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔"

میرے غصے سے وہ بھونچکا سا رہ گیا۔
لمحہ بھر بعد ہی میں اپنی بھول کو سمجھ سکی۔ دوڑ کر کمرے میں آگئی۔ پیچھے پیچھے وجے بھی آگیا۔ میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولا "دیدی! میں جانتا ہوں، مجھے ڈانٹ کر تمہیں بہت دکھ ہو رہا ہے لیکن جانے کیوں مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔" یہ کہہ کر وجے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور میں روتی رہی۔ بہت دیر تک روتی رہی۔ اور اس جھمیلے میں میرا میکے جانا ملتوی ہو گیا۔
جی بہلانے کے لئے ایک بار پڑوس والی دیدی کے یہاں سوئیٹر کی بنائی سیکھنے کے لئے چلی گئی تھی۔ شام کو آتے ہی ماں جی نے ان کو بتا دیا۔ یہ جھلاتے ہوئے چیخ پڑے۔
"سوئیٹر بغیر جان نکل رہی تھی کیا؟ کیوں گئی تھی اس کے گھر؟ یہ سب جانتے ہوئے کہ وہاں ہر دم شرابی کبابی، آوارہ لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی پتہ تھا کہ تو ایک جگہ ٹکنے والی عورت نہیں ہے۔"
اس واقعہ کے بعد پڑوس تک میں بھی جانا آنا چھوڑ دیا۔ گھر کی چار دیواری ہی میری دنیا بن گئی تھی۔ تنگ آ کر ایک دن مجبوراً گھر چلی گئی۔ گھر آئے ہوئے بھی سال بیت گیا۔ نہ کوئی چٹھی نہ بلاوا، نہ کوئی اشارہ۔ جیسے سسرال والوں کے لئے میری اہمیت ہی نہ رہی تھی۔ دو سال ہو گئے لیکن کوئی لینے نہیں آیا۔ مجبور ہو کر جس طرح اکیلی میکے گئی تھی، اسی طرح اکیلی سسرال واپس لوٹ آئی۔
گھر میں دو سال رہ کر میں نے بی ایڈ کر لیا تھا۔ کالج میں رہ کر بہت سکھ ملا تھا۔ جو آزادی، جو خوشیاں شادی کے بعد مجھ سے چھن گئیں تھیں، ایک بار پھر حاصل ہوئی تو مسرت کا ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ لیکن پھر ایک بار سسرال لوٹ کر مجھ پر جیسے ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ واپس اپنا کا بکس میں ... جہاں کچھ ... درمیان کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ... بندھی ٹکی سی زندگی۔
"تم گھر میں بیٹھی میری قمیض میں بٹن نہیں لگا سکتیں؟" ایک صبح قمیض پہنتے ہوئے بولے۔
میں نے گھبرا کر کہا "دکھائی نہیں دیا۔ لائیے ابھی لگائے دیتی ہوں۔"
"اب تو لگ ہی جائے گا، لیکن تمہاری ذمہ داری؟" جانے کیا کیا بڑبڑاتے رہے دیر تک....
میں سب کچھ چپ چاپ سنتی رہی۔ آخر یہ بٹن کی جگہ آلپن لگا کر وہی قمیض پہن کر آفس چلے گئے۔

بہت دن سے سوچ رہی تھی کہ پھٹے ہوئے کپڑوں کے بارے میں ان سے کہوں۔ موقع کی تلاش میں عرصہ نکل گیا۔ تب ایک دن کہا "سنو، میرے پاس کوئی ساڑی نہیں رہی۔ اس تنخواہ پر....."
"ساڑی! پچھلے سال ہی تو دو ساڑیاں لا کر دی تھیں ... دونوں ہی پھاڑ ڈالیں کیا؟"
"میں نے جان بوجھ کر تو پھاڑی نہیں۔"
"پھر بھی کپڑے پہننے کا ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔"
"تو اب میں بے ڈھنگی ہو گئی؟"
"میرا سر مت کھاؤ۔ ان ہی ساڑیوں سے کام چلاؤ۔"
سچ، اب تو گھر سے جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ دل چاہتا ہے کسی جنگل میں بھاگتی چلی جاؤں،

بھاگتی چلی جاؤں ــــ سمجھتی ہوگی۔"

ہاں، اب نوکری کرنا ہی پڑے گی۔ ہر طرح کی غلامی کے خلاف بغاوت کرنا ہی چاہئے۔ ایڈ نوکری چلی تھی، اس لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دئے۔ اخباروں کے تراشوں، فارموں اور لفافوں سے سنگاردان کی دراز بھرنے لگی۔

ایک شام ماں جی نے انہیں بتایا: "بہو نوکری کی تلاش میں ہے۔ یہ تو سراسر بُری بات ہے کہ گھر کی بہو باہر قدم رکھے۔ گھر کی تو عزت ختم ہو جائے گی۔ تیرے بچوں کی زندگی بھی چوپٹ ہو جائے گی۔ تُو روک نا اسے۔"

"جانتا ہوں ماں، مگر اب وہ لڑائی پر اتر آئی ہے۔ میری کہاں سُنے گی؟"

ان کے من میں آئی ہوئی ناامیدی مجھے اندر تک چھید گئی۔ جی چاہا کہ ان سے کہہ دوں۔ "میں تو آپ کی سب ہی باتیں سُننے کو تیار ہوں، کبھی میری بات بھی تو سُنئے، مجھے بھی تو میرا حق دیجئے۔" لیکن اسی لمحہ ایک انجان اندھیرا میری آنکھوں میں چھا گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا اور میں دوڑ کر کھڑکی کے پاس چلی گئی۔

اب میں ہمیشہ نوکری کے سپنے دیکھتی ہوں۔ سوچتی ہوں، دن میں چاہے سات آٹھ گھنٹے کو ہی سہی، اس جہنم سے چھٹکارا تو ملے گا۔ نئی سہیلیاں ہوں گی۔ جی بہل جائے گا۔ میں نے تو پہلی تنخواہ پر ان کے لئے ٹائی اور ماں جی کے لئے نئی دھوتی بھی لا نا طے کر لیا ہے۔ مجھے اُمید ہے، میری معاشی خود کفالت میری حالت کو گھر میں گھر کے لوگوں میں سُدھار دے گی۔

ایک دن ڈاکیہ تقرر کا خط لے آیا۔ دن بھر میں خوش رہی، ایک ایسے دیس کی جنتا کی طرح جس کو برسوں کی غلامی کے بعد ہمیشہ کے لئے آزادی مل گئی ہو۔

شام کو یہ گھر آئے اور کھانا کھا کر سونے کے لئے چلے گئے۔ میرے بتانے سے پہلے ہی ماں جی نے انہیں بتا دیا تھا۔ میرا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر بھی میں نے بات شروع کی۔ "سُنو ــــ کیا آپ کو پتہ چل گیا ہے مجھے..." یہ بیچ میں ہی بات کاٹتے ہوئے بولے: "نوکری لگ گئی ہے تمہاری۔"

"تو جوائن کر لوں؟" ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا۔

یہ جھلا اُٹھے۔ "مجھے پتہ نہیں۔" اور اسی کے ساتھ بتی بجھا کر بستر میں دھنس گئے۔

سارے کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ میں اپائنٹمنٹ لیٹر کو اپنے تکئے کے نیچے رکھ کر بہت کچھ سوچتی رہی۔ عجیب کشمکش تھی۔ کوئی فیصلہ نہیں لے پا رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اچانک میری آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

کمرے میں چھایا اندھیرا اچانک خوفناک لگنے لگا، جیسے کوئی راکشش اپنے لال ہونٹوں، بڑے بڑے دانتوں اور نوکیلے پنجوں سمیت میری طرف بڑھ رہا ہو۔ میری گردن پر ایک عجیب سا دباؤ محسوس ہونے لگا۔ میں نے زور سے چیخنا چاہا، لیکن آواز نہیں نکلی۔ میں گھبرا کر تیزی سے چارپائی سے اُٹھی اور دوڑ کر کمرے کی بتی جلا دی۔ پورا کمرہ روشنی سے جگمگا اُٹھا۔ کمرے کی کھڑکی بھی کھول دی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"کیوں ــــ کیا ہوا؟" انہوں نے مجھ سے پُوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"تو پھر یہ بتی کیوں جلا رکھی ہے؟"

"یوں ہی،" میں نے کہا۔ "میں کل سے نوکری پر جاؤں گی۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری نوکری ــــ میری نیند کیوں خراب کرتی ہو؟ بتی بجھا دو۔"

"نہیں بجھاؤں گی۔" نہ جانے اتنا سخت ہو جانے کی قوت مجھ میں کہاں سے آ گئی تھی۔ "مجھے اندھیرے میں نیند نہیں آتی، میں اسے بُجھانا نہیں چاہتی ہوں ــــ سمجھتے ہیں۔"

"اور مجھے اُجالے میں نیند نہیں آتی۔ سمجھیں؟"

"تب کوئی راستہ تو نکالنا ہی پڑے گا جس سے ہم اپنی اپنی طرح جی سکیں۔"

"ٹھیک ہے کل سے اپنی چارپائی الگ بچھا لینا۔"

"نہیں، دوسرے کمرے میں نہیں جاؤں گی۔ اسی کمرے میں کل ایک مدھم لائٹ کا بلب لگا دینا۔"

"تم اپنی نوکری کے گھمنڈ میں تو نہیں ہو؟"

"نہیں ــــ ویسے تم جیسا ٹھیک چاہو سمجھو۔ میں تو اس گھر میں رہنا چاہتی ہوں ــــ ایک فرد کی طرح، کسی باندی یا نوکرانی کی طرح نہیں۔"

میرا جواب سُن کر یہ چپ ہو کر سو گئے لیکن میں دیر تک اندیشوں کے بھنور میں گھری رہی۔

اور دوسری رات، میرے تمام اندیشوں کے اندھیرے کو جھُٹلاتا ہوا نیلے رنگ کا زیرو واٹ کا بلب میرے راستے کو روشن کرنے کے لئے کمرے میں جل رہا تھا۔

(ستیہ پال سکینہ کی ہندی کہانی کا ترجمہ)

○○

زنانہ سوئیٹر کے لئے خوب صورت ڈیزائن

پہلی سلائی : نمونے کے لئے ۱۶ خانے ڈالیں۔

اسیدھا (۲ سیدھے ۲ خانوں کو اکٹھا لے کر اسیدھا بنائیں اون آگے، ۳ سیدھے) ۲ مرتبہ اسیدھا

دوسری سلائی : ا الٹا۔ (ا الٹا، ۲ خانوں کو پیچھے سے اکٹھا لے کر الٹا بنائیں، اُون کو سلائی پر بل دے کر الٹا اون کو سلائی پر بل دے کر ۲ خانوں کو اکٹھا لے کر (سیدھا بنالیں) ۲ مرتبہ الٹا۔

تیسری سلائی : اسیدھا (۲ خانوں کو اکٹھا لے کر اسیدھا بنالیں، اُون آگے ۳ سیدھے، اون آگے، ۲ خانوں کو پیچھے سے اکٹھا لے کر اسیدھا بنالیں) ۲ مرتبہ اسیدھا۔

چوتھی سلائی : تمام اُلٹی۔

پانچویں سلائی : اسیدھا (اُون آگے ۲ خانوں کو پیچھے سے اکٹھا لے کر اسیدھا بنالیں، ۵ سیدھے) ۲ مرتبہ اسیدھا۔

چھٹی سلائی : ا الٹا (اُون کو سلائی پر بل دیں ۲ خانوں کو اکٹھا لے کر الٹا بنالیں، ۲ اُلٹے، ۲ خانوں کو پیچھے سے اکٹھا لے کر اُلٹا) ۲ مرتبہ اُلٹا

ساتویں سلائی : اسیدھا (۲ سیدھے، اُون آگے، ۲ خانوں کو پیچھے سے اکٹھا لے کر اسیدھا بنالیں) دو مرتبہ اسیدھا۔

آٹھویں سلائی : تمام اُلٹی

دو رنگوں میں بچوں کے لئے ڈیزائن

دو رنگ کا دو سلائیوں پر خوب صورت نمونہ : ۔ یہ نمونہ ایک رنگ کا بھی بنایا جا سکتا ہے۔ نمونہ بنانے کے لئے اپنی مرضی سے خانے ڈالیں۔ باڈر کے بعد ڈیزائن اس طرح شروع کریں۔

سلائی نمبر ۱۔ سیدھی سلائی۔

پہلے دو یا تین خانے سادہ سیدھے بُن لیں۔ دھاگا پیچھے ہی رہنے دیں۔ اب دو خانوں کے درمیان میں سے جو اس سے پہلے سلائی کا دھاگا نظر آتا ہے اس میں سے سلائی گزار کر پچھلی طرف نکال لیں اور بل دے کر سیدھا خانہ بُن لیں۔ یہ خانہ زائد بنے گا۔ اب دو خانے سیدھے بُن لیں۔ ان دو خانوں کے سیدھا بُننے کے بعد پھر درمیان میں سے سلائی ڈال کر اور ایک بل دے کر سیدھا خانہ بُن لیں پھر دو خانے سیدھے بُنیں۔ ساری سلائی اسی طرح ہوگی۔ یعنی ہر دو خانوں کے بعد درمیان میں سے ایک خانہ بُن کر اضافہ ہوتا جائے گا اور ساری سلائی سیدھی ہوگی۔

سلائی نمبر ۲۔ اُلٹی سلائی

اس طرف کنارے پر جو سادہ خانے سیدھے بُنے ہیں انہیں اُلٹا بُن لیں۔ اب وہ خانہ آئے گا جو زائد بڑھانا ہوگا اسے بھی اُلٹا بن لیں اور اس کے ساتھ کا بھی ایک اور اُلٹا بُن لیں۔ ان تینوں خانوں میں سے آخری خانہ پہلے دو پر سے گزاریں۔ اس طرح زائد بڑھا ہوا ختم ہو جائے گا اور ڈیزائن بھی بن جائے گا۔ اب اگلا خانہ اُلٹا بن لیں ساتھ والا بھی اُلٹا بُن لیں۔ یہ وہ خانہ ہوگا جو بڑھایا ہوگا ایک اور خانہ بُن لیں۔ اب ان تین میں سے بھی آخری خانہ پہلے دو پر سے گزار کر گرا دیں ساری سلائی اسی طرح بنائیں۔ ڈیزائن مکمل ہے۔ اس میں دو سلائیاں ایک رنگ سے اور دو دوسرے سے بنتی ہیں۔

اب سلائی نمبر ۳ سے ڈیزائن دوبارہ بنائیں اور دوسرے رنگ کا دھاگا استعمال کریں۔ اب اس میں احتیاط یہ ہے کہ زائد خانہ جو بڑھایا ہے وہ ان دو خانوں کے درمیان سے ہوگا جو تین خانوں کے بنائے تھے (اُلٹی سلائی ڈال کر جب آپ سلائی کو دیکھیں گی تو دو دو خانوں کا جوڑا الگ الگ نظر آئے گا۔ تیسرا زائد خانہ جو بڑھاتا ہے وہ ان دو جوڑوں میں سے اٹھا کر بُن لیں) ڈیزائن مکمل ہے۔

مدیرہ محترمہ :

آپ کی ادارت میں بانو کا پہلا شمارہ (جنوری ۱۹۸۵) دیکھا۔ آپ کا پُر مغز افتتاحیہ پڑھ کر آپ کی قابلیت، عبارت کی دل کشی، الفاظ کی شوکت اور نفیس مضمون کی جامعیت دیکھ کر جی تو خوش ہوا ہی، کچھ مرعوب ہونے کو بھی جی چاہا، دل سے کچھ ایسی صدا آئی :

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

کبھی آپ تو بہت ہنر مند نکلیں! دعا ہے کہ خداداد صلاحیتوں سے بھرپور یہ پیاری سی شخصیت دنیا میں کچھ نمایاں کام کر جائے کہ دنیا تسلیم کرے۔ خدا کرے آپ کے حوصلے ہمیشہ اور ہر دم تازہ رہیں۔ یہی لگن اور ذوق باقی رہا تو شہرت اور بامقصد کامیابیاں قدم چومتی رہیں گی۔

ڈاکٹر شاہ قیوم، ڈائرکٹر
عرب کلچرل سنٹر، نئی دہلی

اقبال آثر شاد جہاں پوری کا ادارہ آگاہی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا انداز پسند آیا۔

محمد نسیم، الہ آباد

محترمہ زینت بھابی :

تازہ شمارہ نظروں کے سامنے ہے۔ مطالعہ کرنے کے بعد طبیعت خوش ہو گئی۔ مضمون "بالوں پر ستاروں کا اثر" بے حد پسند آیا۔ افسانوں میں "ایک خط" "یادوں کے سہارے" اور "ذلت کی صلیب" پسند آئے۔ آپ نے جو نئے کالم شروع کئے ہیں، قابلِ تحسین ہیں۔ "میرا پسندیدہ شعر" اور "لفظی مقابلہ" جس کا عنوان ہے : کیا شادی کے لئے اشتہار دینا مناسب ہے؟ دلچسپ اضافے ہیں۔ "خیال اپنا اپنا" کا کالم مستقل کر دیں۔ تاکہ لڑکیوں کو مختلف موضوعات پر اظہارِ رائے کا موقع ملتا ہے۔

فریدہ بیگم، جمشید پور

ڈیر آپی :

جنوری کا شمارہ ملا۔ اس بار بانو بہت بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ ہم کو بہت پسند آیا۔ ایک مدت کے بعد سالنامہ کی خوش خبری ملی۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ افتتاحیہ بہت خوب ہے۔ "خیال اپنا اپنا" اور دوسرے کالموں کا اضافہ دیکھ کر خوشی ہوئی، مگر "بزمِ بانو" جیسے دلچسپ کالم کے صفحات کم کیوں کر دیئے؟ سالنامہ جلد دیکھنے اور پڑھنے کی خواہش ہے۔

پیاری سلطانہ، گنٹور

ڈیر آپی :

نئے سال کا پہلا شمارہ جلوہ افروز ہوا۔ سرِورق دل کش اور پُرکشش ہے۔ بانو ہر ماہ ہمارے گھر کے سب لوگ بڑی پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اس شمارے کے سب افسانے یعنی محمد طارق کا "آئینہ" اختری جبیں کا "یادوں کے سہارے" خورشید ملک کا "ایک خط" اور مرزا عمیر بیگ کا "سفید الو" بہت پسند آئے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بانو کا سالنامہ بہت جلد پڑھنے کو ملے گا۔ بانو میں نئے کالموں کا اضافہ "ذہنی ورزش" "میرا پسندیدہ شعر" "خیال اپنا اپنا" "تبسم" "اپنے متعلق آپ کی رائے" وغیرہ) قارئین کے لئے دلچسپیوں کا سامان مہیا کریں گے۔

ایس کے برہان الدین، ورنگل

سویٹ بھابی :

بانو جنوری نظر نواز ہوا۔ سرِورق کی تصویر بہت پسند آئی۔ "افتتاحیہ" کا تو جواب ہی نہیں۔ سرورق کی اگلی اور پچھلی تصویر اور اشعار پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ افسانہ "آئینہ" اور "یادوں کے سہارے" قابلِ تعریف ہیں۔

محترمہ زینت صاحبہ :

برسوں سے بانو کا سالنامہ شائع نہیں ہوا تھا۔ بانو جنوری میں یہ خوش آئند اعلان پڑھنے کو ملا کہ سالنامہ شائع ہونے والا ہے۔ اُمید ہے سالنامہ شاندار ہو گا۔

بانو میں نفسیاتی مضامین کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ آپ اگر توجہ کریں تو شخصیت کو سنوارنے کے لئے عمدہ سے عمدہ مضامین شائع ہو سکتے ہیں، خواہ ترجمہ شدہ ہی کیوں نہ ہو۔

عائشہ احمد، کریم نگر

محترمہ زینت کوثر صاحبہ :

۴۵۴ واں شمارہ میرے سامنے آیا تو ایک ہی نشست میں اسے پڑھ گئی۔ کئی کہانیاں پسند آئیں۔ لیکن کہانی "سوتیلی ماں" میں نے ہائی اسکول میں پڑھی تھی اور آج تک

ذہن اور شعور میں محفوظ ہے۔ نجم السحر صدیقی کی یہ کہانی میں نے بڑے غور سے پڑھی اور اس میں ان کی جرأت کی داد دینے کے لئے کوئی نئی بات تلاش کی لیکن ہر سطر کے ساتھ میری حیرت بڑھ گئی اور آخر میں مجھے یقین ہو گیا کہ اس کہانی کے ساتھ مصنفہ اصل مصنف کا نام لکھنا بھول گئی ہیں۔ اس کہانی کا مصنف اردو ادب کا لافانی شخص پریم چند ہے، جس کی تخلیق کوئی آسانی سے چُرا کر نام پیدا نہیں کر سکتا۔
نجم السحر صدیقی نے صرف کرداروں کے نام بدل دئے ہیں۔

بیگم شمع نظامی، لکھنؤ

محترمہ:

بانو کے شمارہ نمبر ۴۵۲ میں" لداخ میں غریب بچے بھیک نہیں مانگتے" کے عنوان سے مضمون نظر سے گزرا۔ یہ مسرت کی بات ہے کہ آپ کا جریدہ لداخ سے متعلق مضامین شائع کرتا رہا ہے۔ لیکن مذکورہ مضمون میں کئی غلطیاں ہیں ایک لداخی ہونے کے ناطے میں ان کی نشان دہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مصنف نے لداخ کی آبادی دس ہزار بتائی ہے۔ لداخ کی آبادی ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق ایک لاکھ بتیس ہزار ہے، جس میں پینسٹھ ہزار مسلمان ہیں۔ اس تناسب سے نصف آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

اکسائی چین ایک درہ نہیں بلکہ ایک بڑا قطعۂ زمین ہے، جس کا رقبہ تیرہ ہزار مربع میل ہے چین نے لداخ کے اس علاقے پر ۱۹۶۲ سے پہلے ناجائز قبضہ کیا تھا۔

مضمون میں یہ لکھا گیا ہے کہ لداخ میں اکثر گھر لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت سے بالکل بعید ہے۔ یہاں اکثر گھر پتھر کے بنے ہیں۔ عمارتی لکڑی بہت ہی کم ہے اور کھڑکیاں، دروازے وغیرہ بنانے کے لئے وادی کشمیر سے لکڑی درآمد کی جاتی ہے۔

لداخ میں یاک کی آبادی کئی ہزار سے زیادہ تر گائیں پائی جاتی ہیں۔ ذرمو اور ذو (ذومو کا نر) نسبتاً کم پائے جاتے ہیں۔

لداخ کا صرف شمالی علاقہ نہیں، بلکہ کبھی پورا خطۂ تبت کا حصہ تھا۔

سری نگر سے ختن (سنکیانگ کا ایک شہر) پندرہ روز کی نہیں گھوڑے پر تقریباً دو ماہ کی مسافت ہے۔

یہ بیان بھی غلط ہے کہ ہر لداخی گھر میں ایک کرگھا ہوتا ہے۔ لداخی اپنے کپڑے جولاہے سے بنواتے ہیں، جو اپنا کرگھا لے کر گھروں میں آتا جاتا رہتا ہے۔

مضمون میں جو تصویر دی گئی ہے، وہ لداخی بچوں کی نہیں ہے۔

یہ بات بھی غلط ہے کہ لداخ میں سبزیاں نایاب ہیں۔ لوگ نہ صرف اس معاملے میں خود کفیل ہیں، بلکہ آج کل چالیس پچاس لاکھ روپے کی سبزیاں لداخ میں تعینات فوج کو سپلائی کرتے ہیں۔

مصنف نے لداخ کی کئی رسموں کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں سے کچھ رسمیں تو ماضی کی یادگار ہیں، لیکن چند رسموں سے متعلق عزیزہ لوگوں کو بھی علم نہیں ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے لداخ آنے والے چند سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں اس خطّے سے متعلق کچھ انوکھی باتیں رکھی ہیں، جو ان کے سطحی مشاہدہ یا سُنی سُنائی باتوں پر مبنی ہیں۔ اور آج بھی تصدیق کئے بغیر یا علاقے کو دیکھے بغیر لکھی جاتی ہیں۔ یہ حقائق سے میل نہیں کھاتیں۔ کم سے کم لداخی قارئین کو یہ باتیں دُور از قیاس لگتی ہیں۔

عبدالغنی شیخ، لیہہ، لداخ

محترمہ:

شمارہ نمبر ۴۵۴ اچھی اچھی کہانیوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ افسانہ 'ہوس' حقیقت پر مبنی ہے چند سال ہوئے بھارت کے ایک مشہور اداکار کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔

حسینہ بانو سُبحان خان، ناسک

ڈیئر آنٹی:

شمارہ نمبر ۴۵۳ نظر نواز ہوا۔ افتتاحیہ نہایت مؤثر رہا۔ افسانوں میں" پیاسی رُوح" خاص طور سے دل پر نقش ہو گیا۔ شوہر اور بیوی میں ایسی ہم آہنگی ہو تو گھریلو زندگی رشکِ جنّت بن جاتی ہے۔

شیخ الطاف احمد، سری نگر۔

پیاری آنٹی:

'بانو' کا شمارہ نمبر ۴۵۳ نظر نواز ہوا۔ سرورق بہت خوب صورت ہے۔ افتتاحیہ بھی کارآمد ہے۔ "ایران کے بارے میں" "خوشبوؤں کا شہر" "خواب کی تعبیر" "بچوں کو اندھے ہونے سے بچائیں" "آگ لگانے والی عورت" "پیپر میشی" "بیوٹی کالج" "دیس پردیس کی خبریں" یہ سب فیچر بانو کی جان ہیں۔ کہانیاں "مداوا" "پیاسی رُوح" "کڑوے پھل" "نتیجہ" "صبح کا بھولا" ایک تمام یادگار کہانیاں ہیں۔

مس فریدہ گوہر، نرمل۔ ■

بزم آپا بانو

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دلچسپ جوابات دیتی ہیں۔
ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔ سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں صرف نام لکھنا کافی ہے۔

مدیرہ

بزم بانو
ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

سلطان احمد اسٹنگ، کریم نگر

س:۔ عصمت آنٹی۔ آدمی اور انسان میں کیا فرق ہے؟

ج: بچہ پیدا ہوتا ہے تو آدم زاد کہلاتا جب عقل اور علم کی جلا ہوتی ہے تو انسان بن جاتا ہے۔

س:۔ زندگی کی راہ میں اگر غم ہی غم ملنے لگیں تو ـــــ؟

ج: تو رچہ معلوم کیجیے، سر جھکا کر غم سہنا بزدلی اور حماقت ہے۔ انسان چاند پر چہل قدمی کرسکتا ہے تو غم کا مداوا نہیں کرسکتا۔ مگر شرط ہے انسان بن چکا ہو۔

حفیظ احمد گرول، دربھنگہ (بہار)

س:۔ موجودہ زمانے میں کس ملک کی عورتوں نے زیادہ ترقی کی ہے؟

ج: جسے اصل ترقی کہہ سکتے ہیں وہ صرف کمیونسٹ ملکوں کی عورت نے کی ہے وہ ہر طرح مرد کے برابر حقوق پا چکی ہے کوئی تفریق نہیں۔ عورت مرد دونوں انسان مانے جاتے ہیں۔ پھر بھی بہت سی راحتیں کوئی بھی نظام نہیں دے سکتا۔ میاں بیوی کے درمیان محبت مشینوں سے پیدا نہیں کی جاسکتی۔ مادی ترقی بیشک روسی عورت نے کرلی ہے مگر جذباتی سکون کی کون گارنٹی کرسکتا ہے۔ کام سے لوٹ کر بیوی گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے شوہر آرام سے ووڈکا پیتا ہے۔ روسی مرد اپنی عورتوں کی گھریلو کام میں مدد نہیں کرتے۔

ایم۔ جہاں، دہلی

س:۔ عصمت آپا! کیا دلی میں کوئی ایسا سنیٹر یا ایسی تنظیم ہے جو پڑھی لکھی اور بالکل بے سہارا لڑکیوں کو کام سکھانے اور روزگار دلانے کا کام کرتا ہو؟ یا پھر جہاں سے خاطر خواہ مشورے مل سکتے ہوں۔ اگر ہے تو براہِ کرم تحریر فرمائیں مع پتے کے ساتھ

ج: پڑھی لکھی لڑکی بے سہارا کیسے ہوگی؟ علم بہت بڑا سہارا ہے۔ آپ کون سا کام سیکھنا چاہتی ہیں۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں مسز سبھدرا جوشی کا نمبر تلاش کرکے انہیں فون کرکے ملاقات کا وقت لیجیے۔ ان سے مشورہ لیجیے۔ بہت نیک خاتون ہیں مدد کریں گی۔

راشدہ ہاشمی، نگینہ

س:۔ خوش رہنا بہتر ہے یا دوسرے کو خوش رکھنا؟

ج: کسی کو دکھ پہنچا کر صرف کمینے انسان ہی خوش رہ سکتے ہیں۔ دنیا کے دکھ دور کرنے والا ہی خوش رہ سکتا ہے۔ اس لئے خوش رہنے کے لئے دوسروں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ورنہ ناخوش انسان آپ کی خوشیوں کو خاک میں ملا دیں گے۔

فضل محمد خان، امروہہ

س:۔ انسان کی کون سی عادت نہیں چھوٹتی ہے؟

ج: آسانی سے تو بچپن کی بڑی عادتیں نہیں چھوٹتیں۔ وہ خواہ اچھی ہوں یا بُری۔

س:۔ آپ کی نظر میں کیا حسن والیاں ظالم نہیں ہے؟

ج: اگر حسن والیاں ظالم نہ رہیں تو کتنے شاعروں کا دیوالہ نکل جائے گا۔ ناز و انداز کی بجلیاں ٹپکانا نگاہوں کے تیر برسانا چھوڑ دیا تو عاشقوں کے غزل یتیم ہوجائیں گے

مرد فرمانبردار، دبی دبائی بیوی

مگر بہنسر والی معشوقہ پسند کرتے ہیں۔

نواب اصغر علی نور جہاں بیگم دھنباد

س:۔ بڑوں کی بات نہ مان کر کب پچھتاوا ہوتا ہے؟

ج: بڑوں کی بات اگر درست ہو تو اب میں چاہے پانسہ اُلٹا بھی پڑ جائے تو مان لینے میں ہرج نہیں۔ بات ہو، حکم ہو دھمکی کے نہ ہو تو مان لینا چاہئے۔ پھر چاہے فیصلہ اپنی مرضی سے کیا جائے۔ بچوں کی طرح بعض بزرگ بھی مچل جاتے ہیں۔ بہلا دیجئے۔

س:۔ کیا بیوی کی رائے شوہر کے لئے سدا فائدے مند ثابت ہوتی ہے؟

ج: سدا کا بچھلا آزیادتی ہے۔ ماننے کی بات ہو تو مان لینا چاہئے۔ ویسے وہ میاں بیوی بہت دُکھی رہتے ہیں جو ایک دوسرے پر جبریہ اپنا حکم صادر کرتے ہیں طلاق کی یا بیوی کی طرف سے میکے جانے کی دھمکی حماقت ہے۔

س:۔ کیا شوہر کے لئے بیوی کی مدد ضروری ہوتی ہے؟

ج: اگر جان بوجھ کر بے سہارا جاہل گنوار عورت تلاش کی ہے تو بہت بہتر ہے جو بویا ہے وہ کاٹئے۔ اور مدد لازمی ہے ورنہ اسے کہیں نوکری کرنے دے۔ چاہے برتن مانجھے کہ ہو ورنہ کیا پڑھی سے کوئی اُمید وابستہ کرنا چاہئے کہ وہ بیوی کی مدد کرے گا۔

سدبینہ اختر، علی گڑھ

س:۔ کیا کوئی چیز ایسی بھی ہے جسے کبھی زوال ہی نہیں آتا؟

ج: اس گول دنیا میں نہ کچھ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے شکلیں بدلتی ہیں نہ اس میں کوئی بیرونی مادہ آکر مل سکتا ہے نہ ایک ذرہ بھی کم ہو سکتا ہے۔ موت زندگی کا چکر چلتا جا رہا ہے کچھ ضائع نہیں ہوتا۔

س: آپ کے دور اور آج کے دور کے علی گڑھ میں کیا فرق ہے؟

ج: ہمارے زمانے میں لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ اب کسی بھی طریقے سے صرف ڈگریاں لینے آتے ہیں۔ تاکہ نوکری ہاتھ آئے۔ سُنا ہے اب تو علی گڑھ میں وہ واپس لوٹ آئے ہیں جنہیں ڈگریاں تو مل گئیں نوکریاں نہیں ملیں مفت، بلا اجازت رہتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور نئے کم سن لڑکوں پر دھونس جماتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں لڑکے شریر تھے شرارتیں کرتے تھے۔ ان کی حرکتوں سے کبھی یونی ورسٹی بند نہیں ہوئی کئی بار سال میں یونی ورسٹی جانا ہوتا تھا۔ کبھی کسی نے بیہودہ بات نہیں کی۔ آج یونی ورسٹی اکھاڑہ بن گئی ہے لوگ علی گڑھ کے پڑھے لڑکوں کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔

محمد حفظ الرحمن، پٹنہ ۶

س:۔ کیا عورت مرد کی اصلاح کر سکتی ہے؟

ج: عورت مرد کو بھی جنم دیتی ہے پالتی ہے ابتدائی تعلیم دیتی ہے اگر باپ بھی ذرا سی لے تو بچہ کامیاب زندگی کی طرف بڑھتا ہے۔ بیویاں گمراہ شوہر کو خاک سدھاریں گی

س:۔ سب سے مشکل کام کون سا ہے؟

ج: جینا۔ پوری ایمان داری اور شان سے جینا کہ ضمیر کچوکے نہ دے۔ بڑا آسان بھی ہے یوں جینا اگر کچھ وفادار فرض شناس انسانوں کے بہت دوست ہوتے ہیں بچے اور بے غرض دوست اور عزیز میسر نہ ہوں تو جینا دشوار ہو جاتا ہے

س:۔ جھوٹ سے کہاں ڈر لگتا ہے؟

ج: جب جھوٹے کو لوگ سچا سمجھ کر دھوکا کھا جائیں۔ اگر ضمیر بیدار ہے تو خود اپنے آپ سے نفرت ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے۔

کوثر پروین، آسنسول

س:۔ یہ سچ ہے کہ غم کی زندگی بسر کرنے والوں کو موت ہی سنوار سکتی ہے؟

ج: جو اپنی حالت نہیں سنبھال سکتے اپنا حق لینے کی سمجھ بوجھ اور ہمت نہیں رکھتے موت ان پر رحم کھا کر ان کا پردہ ڈھک لیتی ہے۔

س:۔ وقت، دولت اور قسمت میں سے کون افضل ہے؟

ج: طاقت جو وقت کو غلام بناتی ہے اور قسمت تو ایک ڈھکوسلہ ہے غریبوں کو اگر بتانے کا کہ ان کی قسمت خراب ہے قسمت اس کے ساتھ ہے جو دولت سے طاقت ور بن جاتا ہے۔

دیس بدیس کی خبریں

عورتوں کے لئے آمدنی کا ایک نیا ذریعہ

بیویوں کو مارنے پیٹنے کی وبا ساری دنیا میں موجود ہے۔ ترقی یافتہ ممالک بھی اس کی زد سے [illegible] پہلے جاپان کے وزیر اعظم ساٹو نے بیان دیا تھا کہ وہ اکثر اپنی بیوی کو پیٹتے ہیں۔ انھیں اس بات کو بیان کرنے میں نہ شرمندگی تھی اور نہ احساسِ گناہ۔ انگلستان کے مہذب لوگ بھی بیویوں کو مارتے پیٹتے ہیں۔ وہاں کی وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے عورت ہونے کے ناتے اس شرمناک حرکت کے خلاف قانون بنایا ہے۔ اس قانون کے تحت بیویوں کو شدید ضرب آنے کی صورت میں سرکار معاوضہ دے گی۔ اس معاوضہ کی ادائی اس طرح ہو گی۔

شوہر کی مار پٹائی سے ناک کا بانسہ ٹوٹ جائے تو بیوی کو ساڑھے چار ہزار روپے معاوضہ ملے گا۔

سامنے کے دو دانت ٹوٹنے کی صورت میں ۸ ہزار روپیہ۔

بینائی کو نقصان پہنچنے کی صورت میں ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ۔

معاوضہ کی رقم صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب بیوی پولیس میں رپورٹ درج کرائے۔ خاوند پر ضربِ شدید کا مقدمہ قائم ہو۔ اس پر فردِ جرم لگے اور اس کا جرم ثابت ہو جائے۔ انگلستان کی مار کھانے والی عورتوں نے اس قانون کا خیر مقدم کیا ہے۔ یہ اسکیم تجربہ کے طور پر دو سال کے لئے نافذ کی گئی ہے۔ مگر لوگوں کو اندیشہ ہے کہ اس سے بیویوں کو مارنے کی وبا کم نہ ہو گی۔ کیوں کہ معاوضہ تو سرکار دے گی۔ یہ اچھا انصاف ہے کہ خاوند مارے اور سرکار جرمانہ بھرے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ جرمانہ شوہروں سے ہی وصول کیا جائے۔

۴ نوزائیدہ بچوں نے تین لاکھ روپیہ کمایا

دنیا میں پہلا ٹیسٹ ٹیوب بچہ انگلستان میں پیدا ہوا تھا۔ سائنس کے اس کمال نے دنیا میں دھوم مچادی تھی۔ بچے کے ماں باپ ساری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ اخباروں نے لاکھوں روپیہ ادا کر کے ان کی کہانی شائع کی پھر تو ٹسٹ ٹیوب بچوں کی قطار لگ گئی اور ان کی پیدائش کوئی ہنگامہ خیز خبر نہ رہی لیکن جڑواں ٹسٹ ٹیوب بچوں کی پیدائش کی بھی حیرت سے سُنی جاتی ہے۔ اب ایک نئی خبر نے اس طرح کی پُرانی خبروں کو روکھا پھیکا بنا دیا ہے۔ گزشتہ دنوں انگلستان میں ایک نہ دو بلکہ پورے چار جڑواں بچوں نے جنم لیا۔ یہ چاروں ٹیسٹ ٹیوب بچے ایک گھنٹے کے عرصے میں پیدا ہوئے۔ اخبارات کو اس تجربے کے متعلق معلومات حاصل تھیں۔ ایک ہفتہ وار اخبار اس پیدائش کی کہانی کے حقوق تین لاکھ روپے میں خریدنے کے لئے تیار تھا لیکن اخبار کے یوم اشاعت اور پیدائش کے دن تین دن کا فاصلہ تھا۔ اخبار والوں نے اسپتال کے عملہ کو ہدایت کی کہ وہ اس پیدائش کی خبر کو تین دن تک صیغۂ راز میں رکھیں۔

اسپتال کے عملے نے اخبار کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسپتال میں تین دن خاموشی رہی چوتھے دن اخبار میں یہ کہانی شائع ہوئی تو دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ دنیا میں پہلی بار ۴ ٹیسٹ ٹیوب بچے ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ ان کا وزن ۲ سے ۴ پاؤنڈ تک تھا۔ یہ بچے سیزرین آپریشن سے پیدا ہوئے تھے۔ ماں کی عمر ۳۵ سال ہے اس کا خاندانی منصوبہ بندی کے تحت آپریشن ہو چکا تھا۔ آپریشن کے بعد اس کے یہاں نارمل پیدائش نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے اس نے ٹسٹ ٹیوب کی ترکیب آزمائی۔

ٹسٹ ٹیوب بچوں کے لئے عورت کا بیضہ لیبارٹری کے جار میں رکھا جاتا ہے اگر عورت کے رحم میں ایک ہی بیضہ داخل

کیا جائے تو بچے کی پیدائش کا امکان صرف تین فی صد رہتا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر اکثر تین بلکہ بہ بیضے رحم میں رکھتے ہیں۔ ان میں سے دو تین بیضے ضائع ہو جاتے ہیں اور ایک بیضہ بچے کی پیدائش کا سبب بن جاتا ہے۔ انگلستان کے اس کیس میں چاروں بیضے کامیاب ہو گئے اور نتیجہ چار توام بچوں کی پیدائش کے روپ میں ظاہر ہوا۔ اخبار سے اسپتال کو تین لاکھ روپے مل گئے۔ یہ روپیہ اسپتال میں آئندہ ریسرچ کے لئے کام آئے گا۔

ہنسی کی سزا

صبح کے ۵ بجے کا وقت تھا۔ نیر دہلی میں دو بہنیں ایک ریسٹورنٹ میں رات کی ڈیوٹی ختم کر کے گھر واپس آ رہی تھیں۔ اچانک انہیں راستے میں ایک مرد ملا، جو فٹ پاتھ پر بیٹھا شیو بنا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں آئینہ اور دوسرے میں صابن کے جھاگ سے بھرا برش تھا۔ ایک بہن نے اس کی ہیئت دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ وہ اسے دیکھ کر ہنستی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ مرد کو اس بات پر بہت غصہ آیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فٹ پاتھ سے ایک پتھر اٹھایا اور پوری طاقت سے لڑکی کی طرف کھینچ مارا۔ پتھر لڑکی کے سر پر لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ دوسری بہن نے جب یہ ماجرا دیکھا تو فوراً گھر کی طرف دوڑی۔ وہاں سب کو جگایا، قریب سے ڈاکٹر کو ساتھ لیا اور زخمی بہن کے پاس پہنچ گئی۔ اس وقت تک وہاں پولیس بھی پہنچ چکی تھی۔ پولیس نے لڑکی کو کار میں بٹھایا اور اسپتال روانہ ہو گئی۔ لڑکی اسپتال پہنچی تو ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کے سر سے خون بہت بہہ چکا ہے۔ اسے مزید خون دینے کی کوشش کی گئی لیکن وہ خون ملنے سے پہلے ہی مر گئی۔

ایک عورت سال بھر میں کتنا کام کرتی ہے

کیا عورت واقعی صنفِ نازک ہے۔ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ رومانیہ کے سائنس دانوں نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہے۔ اس رپورٹ کے کچھ حصے درج ذیل ہیں۔

ایک عورت گھر میں کام کاج کرتی ہے کبھی کبھی بازار سے سودا سلف خریدتی ہے۔ اس طرح وہ سال میں ۲۰۰۰ کیلو میٹر چلتی ہے اگر اس کے پاس ۲ بیڈ روم کا فلیٹ ہے تو وہ دن بھر میں دس ہزار بار قدم اٹھاتی ہے۔ اگر ان تمام برتنوں کا وزن کیا جائے جو ایک عورت سال بھر میں صاف کرتی ہے تو یہ وزن ۵ ٹن تک پہنچ جاتا ہے۔ اس میں ۸ ہزار چمچے چھریاں ہوتی ہیں۔ ۱۳ ہزار پلیٹیں ۶ ہزار کپ اور طشتریاں اور ۳ ہزار ہانڈیاں بھی ہوتی ہیں۔ کیا اتنا کام کرنے والی عورت کو صنفِ نازک کہا جا سکتا ہے۔ اگر مرد بھی عورت کا ہاتھ بٹاتے ہیں تو اس رپورٹ میں اس بات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔

بیوی کی دعا کا اثر

جان فاگن اسکاٹ لینڈ میں رہتا ہے اس کی عمر ۷۰ سال ہے۔ ۷ سال پیشتر اسے معدے کا کینسر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے جان کو لا علاج قرار دے دیا۔ جان کے پادری نے اس کی بیوی سے کہا کہ وہ اپنے خاوند کی صحت کے لئے دعا کرے۔ بیوی نے پوچھا کہ وہ اس مصیبت کی گھڑی میں کس کو پکارے۔ پادری نے جواب دیا کہ اوگلوی اسکاٹ لینڈ کا ایک مشہور عالم تھا آج سے ۳۷۰ سال پہلے اسے اپنے عقیدے کے جرم میں قتل کر دیا گیا تھا۔ تم اس سے اپنے خاوند کی صحت کے لئے دعا مانگو۔ بیوی پادری کی بات سن کر تیار ہو گئی۔ اس نے ہفتے تک اوگلوی سے دعا مانگی۔

اُدھر جان کی حالت بگڑ رہی تھی اس کی نبض بہت سست ہو گئی تھی۔ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے آخری بار رخصت لی اور مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ایک اسے اپنے جسم میں ایک تبدیلی محسوس ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو بہتر پایا۔ اس کی نبض معمول پر آ گئی۔ سانس کی رفتار درست ہو گئی۔ چند ہفتوں میں وہ بھلا چنگا ہو گیا۔ ڈاکٹر حیران تھے کہ جان کس طرح تن درست ہو گیا لیکن اس کی بیوی کو معلوم تھا کہ اوگلوی نے اس کی دعا سن لی ہے۔ شدہ شدہ یہ خبر پوپ کو پہنچی۔ پوپ نے جان کو روم بلایا اسے ملاقات کا شرف بخشا تحفے میں اسے ایک تسبیح دی اور اوگلوی کو کیتھولک چرچ کا ولی مان لیا گیا۔ پوپ کو یہ حق ہے کہ وہ کسی بھی مُردہ انسان کو ولی قرار دے دے لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس سے کم از کم دو کرامتیں ظہور میں آئی ہوں۔

اوگلوی کے معاملے میں اس شرط کو نرم کر دیا گیا۔ جان کو صحت عطا کرنے کی ایک ہی کرامت مان لی گئی۔

پہلا انعام بالکل درست حل پر : بارہ ہزار روپے، دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر : آٹھ ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ، آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعہ ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں، ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرطیں شمع مینی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ جمعہ ۲۵ جنوری ۱۹۸۵ء آٹھ بجے رات تک۔ ۲۸ جنوری ۱۹۸۵ء کو پانچ بجے سہ پہر تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کرلئے جائیں گے۔

شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۰

					■	■
ک	س		جھ	ی	■	■
ا	ا	ا	ے	■	پ	
ن		ہ	■	ت	د	
و	ت	■	س		س	
ن	■	ح	س	ط		
■	ی	ن	ا		ا	ل

اشارے

اوپر سے نیچے :

۱۔ خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
—— شبِ ہجراں کی تمنا، مرے آ گئے

۲۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ —— معلوم ہونا چاہئے تھا کہ ناکامی کو کوئی قبول نہیں کرتا، کامیابی کو سب گلے لگاتے ہیں

۳۔ —— تو دونوں کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس میں زور زبردستی بیکار

۴۔ میر صاحب! آپ کے پاس —— ہے جو میرے پاس نہیں۔ اس کا فائدہ اٹھائیے

۵۔ فسادیوں نے ملک بھر میں ہزاروں —— کو جلا ڈالا اور لاکھوں بےقصور انسان تباہ و برباد

۸۔ یہ مسلسل —— کی آواز تو مجھے پاگل کر دیگی بند

۹۔ پرانی چیزیں خریدتے وقت ٹھوک بجا کر —— مطمئن ہونے کے بعد سودا کرنا چاہئے

۱۰۔ تاج محل، اجنتا، ایلورا اور کونارک جیسی —— یادگاروں پر ہر ہندوستانی کو فخر ہونا چاہئے

دائیں سے بائیں :

۶۔ حُسن میں حُور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
—— کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

۷۔ بخار کی —— کم ہونے پر بعید کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ اسی لئے

شمع ادبی معمے (شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۰) ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۰ کا صحیح حل بشکل ۲۹ جنوری ۱۹۸۵ء کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام یافتگان کے نام ماہنامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام یافتگان کی تفصیلات شمع مارچ ۱۹۸۵ء میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں۔

پہلا انعام :

بارہ ہزار روپے نقد

یا ایک ۵۱ سینٹی میٹر کا رنگین ٹی وی اور تین ہزار روپے نقد

دوسرا انعام :

آٹھ ہزار روپے

- ★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!
- ★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔
- ★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔ فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ۔
- ★ صرف دس اشارے
- ★ انعام پانا کس قدر آسان!
- ★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں، یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔
- ★ صحیح حل : جوابی لفافہ بھیج کر منگوائیے یا پھر اگلے ماہنامہ بانو یا ماہنامہ شمع میں دیکھئے۔
- ★ شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۰ کا نتیجہ ماہنامہ بانو (نئی دہلی) اور مارچ ۱۹۸۵ء کے ماہنامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔
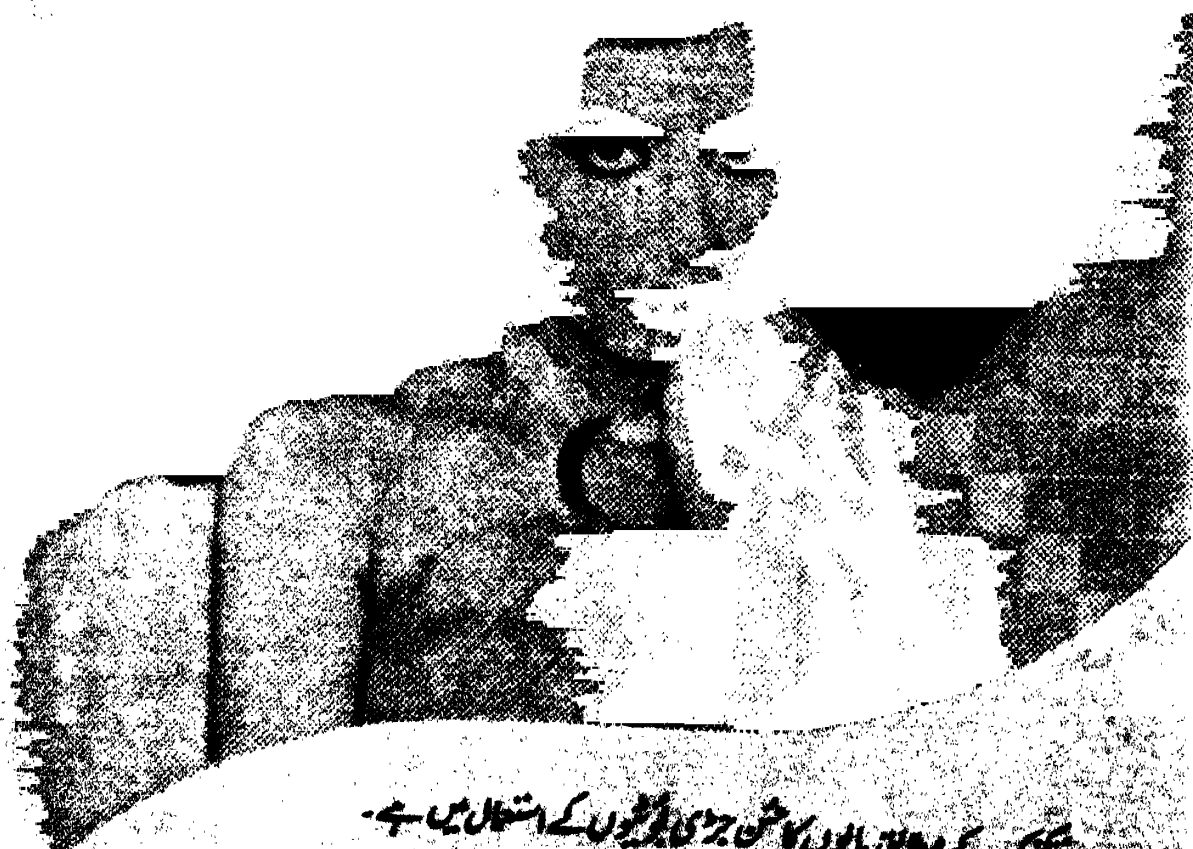
Registered with the Registrar of New...

اگر بال وقت سے پہلے سفید ہونے لگیں، کنگھی کے ساتھ گرنے لگیں، بالوں میں خشکی (بھوسی) پیدا ہو جائے اور سر پر کھجلی شروع ہونے لگے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کے سر کے بال بیمار ہو گئے ہیں۔ بالوں کی تمام خرابیاں دور کرنے کے لئے بالوں میں زُلفی ہیر ٹانک ڈالئے۔ یہ دوسرے تیلوں سے دس گنا بہتر ہے یہ بالوں کی جڑوں کے نیچے تک پہنچ جاتا ہے اور بالوں کی تمام بیماریوں کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیتا ہے۔ "زلفی" تیل نہیں بالوں کی غذا ہے — سر دھونے کے لئے "زلفی بالوں کا کالا صابن" یا زلفی پاؤڈر استعمال کیجئے جو بالوں کو صاف کرتا، ملائم بناتا اور ان کو تیزی سے بڑھاتا ہے۔

قیمت زلفی ہیر ٹانک : ۱۸ روپے
قیمت زلفی بالوں کا کالا صابن : آٹھ روپے
قیمت زلفی پاؤڈر : آٹھ روپے

شیخ [illegible] کیمیکل لیبارٹریز [illegible]

افتتاحیہ

قدرت نے کم و بیش ہر انسان کو برداشت کی قوت بخشی ہے۔ عورت اس معاملے میں مردوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ جسمانی تکلیف کی برداشت اس میں مردوں سے زیادہ ہے۔ لیکن ذہنی تکلیف کا معاملہ الگ ہے۔ جسمانی تکلیف کا علاج تو ڈاکٹر کے پاس ہو جاتا ہے، لیکن ذہنی تکلیف کا علاج اکثر حالات میں خود انسان کے پاس ہوتا ہے اگرچہ وہ اسے عمل میں لانے سے جھجکتا ہے۔

صبر اور برداشت کا مادّہ انسان کی بہتر صفات میں سے ہے، لیکن ان کا غلط استعمال انسان کی صحت پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔ انسان اپنے دوست، رشتہ دار یا پڑوسی کے سلوک سے ناراض ہو جاتا ہے لیکن تعلقات کو قائم رکھنے کی وجہ سے زبان نہیں کھولتا۔ وہ دل میں اندر ہی اندر کُڑھتا ہے لیکن حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ آپ کو دوپہر کو سونے کی عادت ہے، لیکن آپ کی سہیلی پڑوسن اُسی وقت آن ٹپکتی ہے۔ آپ زبردستی مسکرا کر اس کا استقبال کرتی ہیں — نیند سے آپ کی آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں لیکن آپ ہیں کہ دل کی بات زبان پر نہیں لاتیں۔ اس طرح آپ کی سہیلی کا حوصلہ بڑھتا ہے اور وہ اسی وقت آپ کے گھر آنے لگتی ہے۔

بہتر یہ ہے کہ اگر آپ کو کوئی بات بُری لگے تو اندر ہی اندر کُڑھنے کی بجائے اُسے زبان پر لے آئیں۔ مغربی ممالک میں سگریٹ کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ ہو رہا ہے۔ لوگ بڑی تعداد میں سگریٹ چھوڑ رہے ہیں۔ اگر محفل میں کوئی انسان سگریٹ پینے لگتا ہے تو اس سے صاف الفاظ میں کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ سگریٹ نہ پیئے۔ وہاں اس بات کا بُرا نہیں منایا جاتا۔ اگر ہم بھی یہی طریقہ اختیار کریں اور حرفِ شکایت نرمی سے زبان پر لے آئیں تو نہ صرف ہماری صحت پر اچھا اثر پڑے گا بلکہ دوستانہ تعلقات پہلے سے بھی زیادہ خوش گوار ہو جائیں گے۔

سعدیہ دہلوی

بانو

نگراں: یوسف دہلوی
مدیرہ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر: شمیم آراء دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اڑتیسواں سال، ۵ واں شمارہ
اس شمارے کی قیمت: چار روپے
سالانہ قیمت: اڑتالیس روپے

مقامِ اشاعت: شمع بلڈنگ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس: 3161601 SHMA IN
ٹیلی فون: 272066, 272067, 272068
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس
مالکان: شمع میگزین
طابع و ناشر: یونس دہلوی

مرتبہ: بمبئی آفسیٹ پریس، دہلی
مطبوعہ: روبی پرنٹنگ پریس، دہلی

بہار آپ کے آنگن میں !

بانو بہنوں کے اصرار پر کئی سال بعد بانو کا سال نامہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ بانو کا اپریل ۱۹۸۵ کا شمارہ ہوگا، جو مارچ ۱۹۸۵ میں شائع ہوگا — دلچسپی اور افادیت کے اس انمول خزانے کو جمع کرنے میں ادب اور صحافت کے ان گنت جگمگاتے ستاروں کی محنت اور لگن شریک رہی ہے۔ خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، کیفی اعظمی، قتیل شفائی، رام لال، کوثر چاندپوری، مسرور جہاں، مسعودہ حیات اور شعر و ادب کے آسمان کے دوسرے چاند سورج اس محفل میں جلوہ گر ہیں۔ نشاطِ مطالعہ فراہم کرنے کے علاوہ سائنس، سیاست، واقعات حاضرہ اور دوسرے شعبوں سے متعلق چیدہ چیدہ مضامین کے ذریعہ سال نامہ آپ کو زیادہ باخبر، زیادہ باشعور بنائے گا۔

سال نامہ بانو ہر صورت میں حاصل کیجئے۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیجئے۔

خوب صورتی اور افادیت کا یہ ضخیم مرقع، جس کی قیمت دس روپے ہوگی، سالانہ خریداروں کو مفت پیش کیا جائے گا۔ سال نامہ رجسٹری سے منگوانے کے لئے سالانہ خریدار خریداری نمبر کے حوالے کے ساتھ ۳ روپے منی آرڈر کے ذریعہ جلد بھیج دیں۔ نئے خریدار بھی یہ شاندار تحفہ مفت حاصل کرنے کے لئے اڑتالیس روپے سالانہ قیمت ارسال فرمائیں۔ ان کے لئے رجسٹری کا خرچ ہم برداشت کریں گے۔

ماہ نامہ بانو،
آصف علی روڈ،
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ہم جب کسی مصوّر یا سنگ تراش کا
ہ کار دیکھتے ہیں تو بے اختیار مُونہہ سے
ہ نکل جاتی ہے۔ مصوّر کا شاہکار کاغذ کا
ساج ہوتا ہے اسی طرح مصنّف کی تخلیق
ی کاغذ کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔
لا و کتابت کے لئے بھی کاغذ کی ضرورت
ڈتی ہے۔ دیواروں پر لگے کیلنڈر اور وال
پیپر بھی کاغذ کے بنے ہوتے ہیں لیکن کاغذ
کا ایک اور استعمال بھی ہے اور وہ ہے کاغذ
کو موڑ کر آرٹ کی تخلیق کرنا۔ اس آرٹ کو
وری گامی کہتے ہیں۔ اس کی ابتدا جاپان سے
ہوئی اور پھر یہ آرٹ دھیرے دھیرے
یورپ پہنچ گیا۔

اوری گامی جاپانی زبان کا لفظ ہے
اوری کے معنی ہیں موڑنا اور گامی کاغذ کو کہتے
ہیں۔ اس کی ابتدا سیکڑوں سال پہلے جاپان
کے مندروں میں ہوئی۔ جاپان میں بدھ مذہب

کاغذ کا انوکھا استعمال

وصی احمد

کی ایک شاخ قائم ہے۔ اسے شنیٹو کہتے ہیں اوری گامی شنیٹو مندروں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس آرٹ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں کاغذ کو کاٹا نہیں جاتا اور نہ اسے گوند سے چپکایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے بچے اکثر کاغذ کی ناؤ یا طیارے بنا لیتے ہیں لیکن جاپانی بچے کاغذ سے بے شمار چیزیں تخلیق کرتے ہیں۔ ابتدائی زمانے میں کاغذ بہت مہنگا تھا۔ اور یہ آرٹ امیر لوگوں تک ہی محدود تھا لیکن آج کاغذ ارزاں ہے۔

جاپان کے کنڈرگارٹن اسکولوں میں ۳ - ۲ سال کے بچوں کو اس آرٹ کا شوق دلایا جاتا ہے۔ اس سے بچے کی تخلیقی صلاحیتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ جاپان میں اوری گامی کے ماہرین کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں تک پہنچتی ہے کاغذ سے کیا کیا چیزیں بن سکتی ہیں ان کی تعداد دیکھ کر دماغ حیران ہو جاتا ہے۔ اوری گامی بچوں کے کھیل تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اب اس کے ماہرین بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ٹوکیو کے آکیرا یوشی زاوا کاغذ موڑنے کے فن کے سب سے بڑے ماہر مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اس فن پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ نئے نئے ڈیزائن تخلیق کیے ہیں۔ ان کے ڈیزائن کے باریکیاں دیکھ کر دل عش عش کرنے لگتا ہے۔
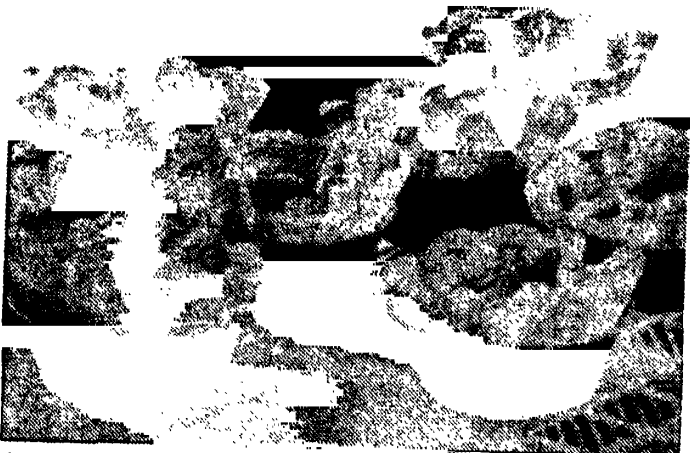
تو وہ اُچھلنے لگتا ہے۔ اوری گامی میں تخلیق
کی پرواز کی کوئی حد نہیں ہے۔
جاپان میں اوری گامی کا آرٹ دو حصوں
میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک حصہ روایتی کہلاتا
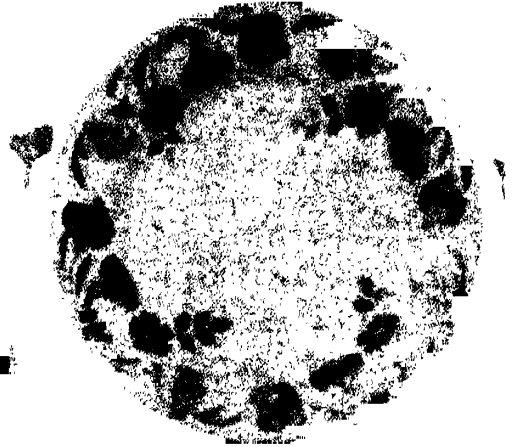
جاپان کی عورتیں بھی کاغذ موڑنے کے
ی ماہر ہوتی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس
یں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے
بالغہ نہ ہوگا۔ اوری گامی صدیوں سے ان کی
تی میں ملا ہوا ہے۔ جاپانی گھروں میں اوری
ی کی بہار دیکھنے کے قابل ہوتی ہے
پانی گھر زیادہ تر لکڑی کے بنے ہوتے ہیں
ھر میں لوگ فرش پر بیٹھتے ہیں۔ فرش پر خوب صورت
نائی بھی ہوتی ہے۔ دیواروں دروازوں پر
ختلف نقش و نگار بنے ہوتے ہیں۔ ان
یسا اوری گامی کے ڈیزائن سونے پر سہاگہ معلوم
ہوتے ہیں۔ یہ ڈیزائن گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزوں
مثلاً کیتلی، پیالی، چمچے اور ہاتھ کی باسکٹ
سے جڑے ہوتے ہیں جاپانی عورتیں بڑی محنت
اور لگن سے کاغذ کے ڈیزائن تیار کرتی ہیں۔
کوئی عورت ایسا پرندہ بناتی ہے کہ جب اس
کی دُم کھینچو تو اس کے پر ہلنے لگتے ہیں۔
دوسری عورت کاغذ سے ایسا مینڈک تیار
کرتی ہے کہ جب اس کی کمر پر اُنگلی رکھو

ے اس میں شادی یا بچہ کی پیدائش پر رنگین
لفافوں پر ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔ تعزیت
ے لفافے الگ ہوتے ہیں۔ ان لفافوں کے
تھ ڈیزائن کو جوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرا حصہ
شی کہلاتا ہے۔ اس میں ڈیزائن بنانے
آزادی ہوتی ہے جب کسی کو تحفہ پیش کیا
جاتا ہے تو اس کے ساتھ اس ڈیزائن کو بھی
ر دیا جاتا ہے۔

ان ڈیزائنوں میں چرند پرند مچھلیاں
پھول حتیٰ کہ انسانی شکلیں بھی ہوتی ہیں۔ اس
ے علاوہ اس آرٹ کو دوا کے طور پر بھی استعمال
کیا جاتا ہے۔ مشرقی ممالک میں نیک فال
شگون لینا ایک عام روایت ہے۔
جاپان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اگر گھر
کوئی شخص بیمار ہو جائے تو کاغذ کے پرندے
بنا کر اس کے چارپائی کے نزدیک رکھ دیئے
جاتے ہیں جو انسان بیمار کی عیادت کرنے
آتا ہے وہ ایک نہ ایک پرندہ پلنگ کے پاس
رکھ دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ذخیرہ ایک ہزار
تک پہنچ جاتا ہے۔ ایک ہزار پرندوں کا جھگمٹ
بیمار کے پلنگ کے پاس جمع ہو تو اسے جلد
شفا ہو جاتی ہے۔ ۱۹۴۵ میں امریکہ نے ہیروشیما
اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا تھا جس کے نتیجے
میں تقریباً ۲ لاکھ انسان ہلاک ہو گئے تھے۔
جو لوگ اس دھماکے میں زخمی ہوئے تھے ان کے
جسم میں ریڈیائی اثرات آج تک موجود ہیں
ان کے زخموں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن
ان کے رشتہ دار آج بھی اوری گامی کی
کرامت پر یقین رکھتے ہیں۔ ہر مریض کے
بستر کے پاس ایک ہزار کاغذی پرندے
موجود رہتے ہیں۔

اوری گامی نے ماہرین نفسیات کے
لئے بھی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ جب ایک
بچہ کاغذ سے آرٹ کی تخلیق کرتا ہے تو استاد
اس کے فن سے اس کی فطرت اور صلاحیت کا
اندازہ لگاتے ہیں۔ کند ذہن بچے کاغذ کی
ناؤ یا پرندوں سے آگے نہیں بڑھتے لیکن ذہین
بچے پیچیدہ سے پیچیدہ ڈیزائن تیار
کرتے ہیں۔ اگر بچے کو سپاہی بننے کا شوق
ہے تو وہ ٹینک، توپ اور بندوق بناتا ہے
اگر وہ انجینئر ہے تو عالیشان فرنیچر اور موٹر کاریں
بناتا ہے۔ اس طرح والدین کو ابتدا میں ہی
بچے کی فطری صلاحیتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔

جس طرح باغبانی انسان کو صبر اور
برداشت کی تعلیم دیتی ہے اسی طرح اوری گامی
کا فن بھی صبر اور استقلال سکھاتا ہے۔
ایک پیچیدہ ڈیزائن تیار کرنے میں گھنٹوں
لگ جاتے ہیں۔ اس طرح بچے محنت اور لگن
سے کام کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ ماں بچے کے
سامنے کاغذ کے چند ٹکڑے رکھ دیتی ہے۔
بعض اوقات وہ اس سے کوئی خاص چیز
بنانے کی فرمائش کرتی ہے اور کبھی اس کے
ذہن کو آزاد چھوڑ دیتی ہے۔ ایک فلاسکیپ
کاغذ سے کیا چیز بن سکتی ہے اس کا اندازہ
ایک نوجوان لڑکی کی تخلیق سے لگایا جا سکتا
ہے اس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے سے
تین پرندے بنائے۔ ایک بڑا پرندہ درمیان
میں اور دو چھوٹے پرندے اس کے بازوؤں
سے لٹکے ہوئے تھے اور لطف یہ ہے کہ
یہ تخلیق بغیر کاغذ کو کاٹے عمل میں آئی تھی۔
سنگ تراش کے مجسمے صدیوں تک
محفوظ رہتے ہیں۔ آئل پینٹنگ بھی برسوں
خراب نہیں ہوتی لیکن کاغذ کو یہ خصوصیت
حاصل نہیں۔ کاغذ کی ناؤ دیکھتے ہی دیکھتے
ڈوب جاتی ہے۔ کاغذ کے کھلونے دیرپا
نہیں ہوتے۔ لیکن اس سے انسان کے جمالیاتی
ذوق کو ضرور جلا ملتی ہے۔

ممی! خدا حافظ

...پرائے دیس کو اب جا رہی ہیں آپ
...مجھ کو چھوڑتے ہوئے گھبرا رہی ہیں آپ
مجھ کو جو پیار آپ کا ملتا تھا مل گیا
اب آپ کیا کریں کہ زمانہ بدل گیا

...نے بیچ دھار میں چھوڑا ہمارا ساتھ
...تھے وہ اس طرح سے کہ پھر کی نہ کوئی بات
اپنے جو تھے کبھی وہ سب ہی غیر ہو گئے
رشتے جو دوستی کے تھے اب بیر ہو گئے

...آسرا تھیں آپ جواں بھی حسین بھی
...کا سکون لٹ گیا راتوں کی نیند اڑی
پہلے تو پیٹ بھرنے کا شیدا سوال تھا
وہ حل ہوا تو چار سو شیطاں کا جال تھا

...مجبور ہو کے آپ نے ڈھونڈا کسی کا ساتھ
...مت ہی ممی کو مل گیا اک مہرباں کا ہاتھ
شوہر وہ آپ کے تو ہیں، پاپا میرے نہیں
ان میں کہاں جو شفقتیں پاپا کے دل میں تھیں

...ر کو بھی پیار کرتے ہیں وہ مانتی ہوں میں
...غیر ہی ابھی تو نہیں جانتی ہوں میں
مجھ کو خدا پہ چھوڑیئے اور آپ جایئے
مجھ بد نصیب کے لئے مت دل دکھایئے

...ں ہوسٹل میں رہ کے پڑھائی کروں گی اب
...شتے جو ٹوٹنے لگے ہیں اب توڑ دوں گی سب
خود کو بدل سکی تو میں آ جاؤں گی وہیں
ایسا نہ ہو سکا تو میں کھو جاؤں گی یہیں

میری دعا ہے آپ کو اتنی خوشی ملے
آئے نہ یاد میری نہ دل آپ کا دکھے

عفت بجنوری

ماں کی فضیلت

صاف کہتا ہے قرآں حقیقت بھی ہے
میری ماں تیرے قدموں میں جنت بھی ہے

ماں کی ممتا کی تعریف کیسے کروں
میری طاقت نہیں ہے قلم سے لکھوں
میری ماں کس مصیبت سے پالا مجھے
سہہ کے تکلیف راحت سے پالا مجھے
لوریاں دے کے مجھ کو سلاتی رہی
فرض اپنا سمجھ کر نبھاتی رہی
میں جو سوتا نہ تھا تو بھی سوتی نہ تھی
پھر بھی مجھ سے پریشان ہوتی نہ تھی
میری راحت سے بھی تجھ کو راحت ملی
میری زحمت سے بھی تجھ کو زحمت ملی
تو نے ایسا پلایا ہے خونِ جگر
جس کی قیمت نہ میں دے سکا عمر بھر
جس کی قیمت نہیں ایسی دولت بھی دی
یہ حقیقت ہے دنیا کی عزت بھی دی
یعنی تعلیم دی دین و قرآن کی
یہ ہے پہچان بڑی اک مسلمان کی
علم ہی سے حقیقت کا رستہ ملا
میری ماں سچ ہے وحدت کا رستہ ملا
تو نے مجھ کو بتایا کہ رب ایک ہے
سارے نبیوں سے اعلیٰ لقب نیک ہے
"قومی یکجہتی" کا درس تو نے دیا
کیسے بھولے گا احسان کوئی ترا
قومی یکجہتی ہی دیش کی شان ہے
جو نہ مانے حقیقت میں نادان ہے
دیش پر جاں لٹانے کو تو نے کہا
دیش پرست کہلانے کو تو نے کہا
دین اور دھرم کی یہ نصیحت بھی ہے
میری ماں تیرے قدموں میں جنت بھی ہے

ثمر مانچوی
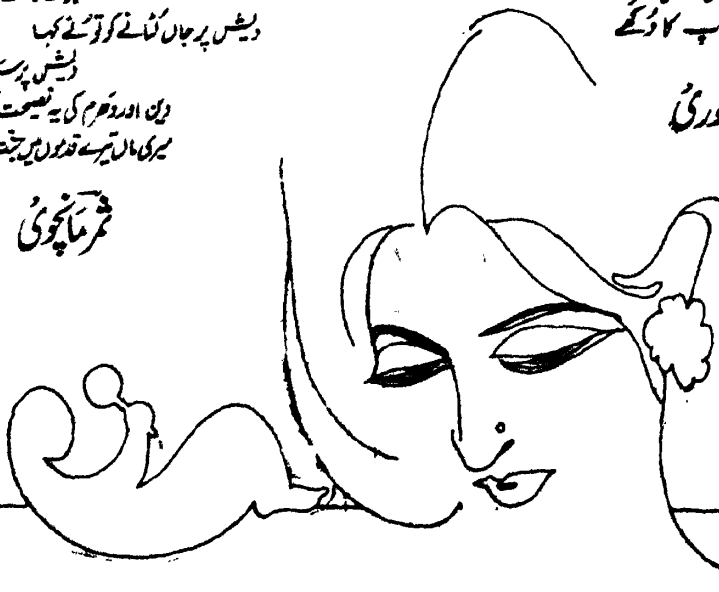
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختمِ عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

(فیض)

لیکن فیض احمد فیض کی داستانِ عشق ختم نہیں ہوئی۔ جب تک اردو زبان زندہ رہے گی فیض کا نام زندہ رہے گا۔
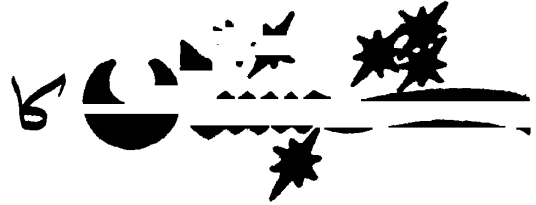
فیض احمد فیض نمبر

ایک یادگار دستاویز کی شکل میں آنے والی نسلوں کے ذہن میں فیض کے فن کا چراغ روشن رکھے گا

فیض نمبر میں فیض کا بکھرا ہوا صد رنگ، سدا بہار کلام آپ کو ایک جگہ مل جائے گا۔ اس کے علاوہ سوانحی مضامین اور تنقیدی جائزے، نادر و نایاب تصویریں، ذاتی خطوط، ان کی ذات سے وابستہ ایسی باتیں جن کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ فیض کے متعلق بہت کچھ آپ 'شبستان' کے فیض احمد فیض نمبر میں دیکھ سکیں گے جس کی تیاری میں ہندوستان، پاکستان، روس اور انگلستان کی مقتدر ہستیاں تعاون کر رہی ہیں۔

فیض احمد فیض کی وفات کے بعد ان کے پہلے یومِ پیدائش (۱۳- فروری ۱۹۸۵) کے موقع پر 'شبستان' کا نذرانۂ عقیدت "فیض نمبر" کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

آپ اس نمبر کو ہمیشہ محفوظ رکھنا پسند کریں گے۔ اس نمبر کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے۔

قیمت: پندرہ روپے

اپنی کاپی آج ہی محفوظ کرا لیں: **شبستان** اردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

نکہت پروین

مظلوم عورتوں کی مدد کے لئے لال سائیکل والیوں کی فوج

انگریزی کے ایک مشہور مصنف جان ماسٹرز نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گزارا تھا۔ ان کے ناولوں میں ہندوستان کی معاشرت کی ایک دھندلی تصویر ملتی ہے۔ ان کا ایک ناول "بھوانی جنکشن" بہت مشہور ہے اس ناول پر اس نام کی ایک فلم بھی بن چکی ہے۔ "بھوانی جنکشن" میں جان ماسٹرز نے ہندوستان کی جنگِ آزادی کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ ہندوستان میں "ملک چھوڑو" کی تحریک زوروں پر تھی، کانگریس کے والنیٹر حکومت کے لئے مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ ایک ایسا ہی گروہ ریلوے اسٹیشن کے پاس جمع ہو گیا انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ریل گاڑی کو اسٹیشن سے گزرنے نہیں دیں گے۔ اس زمانے میں انگریز بدحواس ہو گئے تھے۔ جگہ جگہ فوج تعینات تھی کانگریس کے ورکرز نے گاڑی روکنے کے لئے ایک ترکیب نکالی۔ وہ سب ریل کی پٹری پر لیٹ گئے ریل گاڑی اسٹیشن پر تیار کھڑی تھی لیکن ریل کے آگے سفید دھوتی کرتے اور گاندھی ٹوپی میں ملبوس لوگ لیٹے ہوئے تھے۔ ان میں شہر کے تاجر بھی تھے اور وکیل بھی۔ سوشل ورکر بھی تھے اور سرمایہ دار بھی۔ یہ سب لوگ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھی ٹرین کے آگے لیٹے ہوئے تھے۔ ریل کے انگریز حکام حیران تھے کہ اب کیا کریں۔ فوج کو گولی چلانے کا حکم دیں، لاٹھی چارج کریں یا ٹرین ان لوگوں پر سے گزار کر لے جائیں۔ ایک انگریز افسر نے نروس ہو کر فوج کو گولی چلانے کا حکم دیا تو دوسرے افسر نے اسے ٹوکا کہ اس طرح نہتے لوگوں کو گولی مارنے سے حکومت بدنام ہو جائے گی۔ اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے گاؤں سے کچھ بھنگی بلائے اور ان کو حکم دیا کہ پٹری پر لیٹے ہوئے مظاہرین پر پیشاب کریں۔ جیسے بھنگی ان لوگوں کے قریب پہنچے اور اپنا ارادہ ظاہر کیا، یہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ ملک کے لئے جان دے سکتے تھے لیکن ایمان نہیں۔

عین ممکن ہے کہ یہ واقعہ فرضی ہو لیکن جان ماسٹرز کا ہندوستان آج بھی کہیں کہیں زندہ ہے۔ گزشتہ دنوں اس کی ایک دلچسپ مثال دیکھنے میں آئی۔ اتر پردیش کے ایک گاؤں میں ہریجن عورتوں کو راشن کا گیہوں حاصل کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ ان کے پاس جتنے راشن کارڈ تھے، گاؤں کے زمین دار نے مستعار لے لئے تھے۔ زمین دار نے یہ کارڈ ان عورتوں کو واپس نہیں دئے۔ جب عورتوں نے اپنے راشن کارڈ واپس مانگے تو اس نے جواب دیا کہ وہ راشن کارڈ کہیں رکھ کر بھول گیا ہے۔ دراصل اس نے یہ کارڈ سنبھالے تھے اس کے گھر میں شادی کی دعوت ہوتی یا کوئی تیوہار آتا تو وہ گاؤں کے بنئے سے راشن حاصل کر لیتا۔ اس طرح اسے سرکاری نرخ پر کافی راشن مل جاتا۔ زمین دار اور بنئے کی ملی بھگت تھی۔ جب زمین دار کو راشن کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ یہ کارڈ بنئے کے حوالے کر دیتا۔ بنیا سستے داموں گیہوں حاصل کرتا اور اونچے داموں بیچ دیتا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے۔

ہریجن عورتوں نے بلاک ڈیولپمنٹ افسر سے رجوع کیا۔ اس نے ان کی شکایت کو ہمدردی سے سنا۔ اس نے اس مسئلے کا حل نکالا کہ ان عورتوں کو نئے راشن کارڈ دے دئے جائیں۔ لیکن یہ ایک دیر طلب حل تھا پرانے

راشن کارڈ کینسل کئے جاتے اور ان کی جگہ نئے
شن کارڈ تقسیم کئے جاتے تو اس میں وقت
نتا۔ ہری جن عورتیں غریب ہیں ان کے پاس
ومت کے سست رفتار انصاف کے لئے
ت نہیں تھا۔ جب تک نئے راشن کارڈ
بتے، ان کے بچے بھوکے رہتے۔ انہوں نے
بنیے سے رجوع کیا اور اسے سرکاری افسر کا
لم سنایا، لیکن بنیا ٹس سے مس نہ ہوا۔
ن کا ایک ہی جواب تھا: راشن کارڈ لاؤ اور
شن لے جاؤ۔ ہری جن عورتیں بنیے کا ٹکا سا
اب سن کر مایوس ہو گئیں۔ لیکن انہوں نے ہمت
ہاری۔ وہ قریب کے گاؤں میں گئیں اور وہاں
ے لوگوں کو اپنا دکھڑا سنایا۔ ان عورتوں کے
امنے بھی کم و بیش یہی مسئلہ درپیش تھا۔
ب عورتیں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔

اس دوران گاؤں میں خبر اڑی کہ سرکاری
ودام سے راشن کا ذخیرہ گاؤں پہنچ گیا ہے۔
اؤں میں راشن موجود تھا لیکن غریب عورتیں
بنا راشن حاصل نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ صورتِ حال
اقابلِ برداشت تھی۔ آخر ان عورتوں کو ایک
رکیب سوجھی۔ انہوں نے ایک جلوس کی شکل
ں بنیے کی دکان پر دھاوا بول دیا۔ اس جلوس
ں تقریباً ۱۵۰ عورتیں شریک تھیں۔ جب یہ
جلوس نعرے لگاتا ہوا بنیے کی دکان پر پہنچا
بنیا ذرا بھی نہ گھبرایا۔ عورتوں نے راشن کی مانگ
کی تو اس نے اپنے پرانا جواب دہرایا:
راشن کارڈ کے بغیر وہ ایک دانہ بھی دینے کو
تیار نہیں۔ عورتوں نے دکان لوٹنے کی دھمکی
ی تو بنیے نے کہا کہ وہ پولیس کو بلا لے گا۔
عورتیں پولیس کی دھمکی سن کر بھی خوف زدہ
نہ ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک پولیس

آئے گی وہ گیہوں کا ذخیرہ برباد کر دیں گی۔
بنیے نے پوچھا "یہ کام کس طرح انجام دو گی؟"
عورتوں نے جواب دیا "ہم گیہوں کے انبار
میں تھوک دیں گے۔ ۱۵۰ عورتوں کا تھوک
سارے گیہوں کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے"
یہ دھمکی سن کر بنیے کی سٹی گم ہو گئی۔ گیہوں ہری جن
کے تھوک سے گندہ ہو گیا تو اسے کوئی کوڑی
کے مول بھی نہیں لے گا۔ پولیس لاکھ ان عورتوں
کو گرفتار کرے لیکن اس کا کاروبار تو چوپٹ
ہو جائے گا۔ آخر بنیے نے گھٹنے ٹیک دیئے
اور ان کے ہاتھ راشن فروخت کرنے کے
لئے تیار ہو گیا۔

دراصل یہ کارنامہ اکیلی ہری جن عورتوں
کے بس کا نہیں تھا۔ اس میں عورتوں کے
ایک ادارے کی مدد شامل تھی۔ یہ عورتوں کا
ایک گروہ ہے جو گاؤں گاؤں پھر کر غریب عورتوں
کے دکھ درد دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
ان عورتوں کی پہچان یہ ہے کہ ان کے پاس لال رنگ
کی سائیکلیں ہیں۔ ہندوستان اور خاص طور
پر اتر پردیش کے دور افتادہ دیہات میں جہاں عورت
آج بھی گھونگھٹ کاڑھ کر نکلتی ہے، ان عورتوں
کا سائیکل پر فراٹے بھرانا ایک عجیب منظر
پیش کرتا ہے۔ گاؤں کی عورتیں مانگ میں سیندور
بھر کر اور سر پر ساڑی کا آنچل ڈال کر نکلتی
ہیں۔ وہ غیر مرد سے بات کرنے میں بھی ہچکچاہٹ
محسوس کرتی ہیں۔ ادھر یہ عورتیں سیندور اور آنچل
سے بے نیاز ہو کر مردوں سے بے تکلف باتیں
کرتی ہیں، اور ان سے عورتوں کے مسئلوں پر
بحث کرتی ہیں۔ ان کے کام کا دائرہ عورتوں تک
ہی محدود نہیں ہے۔ وہ گاؤں کے غریب اور
بے سہارا بچوں کے لئے بھی وقت نکالتی ہیں۔

انہوں نے دیہات میں بال واڑی کا ادارہ قائم
کیا ہے۔ گاؤں کے بچے ان بال واڑیوں میں جمع
ہو جاتے ہیں۔ کچھ ہمدرد عورتیں ان کو لکھنا پڑھنا
سکھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ حفظانِ صحت کے
اصول بھی سکھاتی ہیں۔

ہندوستان کے بڑے شہروں میں
عورتوں کے کئی فلاحی ادارے قائم ہیں، لیکن ان
کے کام کا دائرہ شہر تک ہی محدود ہے۔ گاؤں
کی غریب عورتوں کو کون پوچھتا ہے؟ تین سال
پہلے اقوامِ متحدہ نے عورتوں کا عالمی سال منانے
کا فیصلہ کیا تو تمام دنیا میں عورتوں کے جلسے ہوئے
تقریریں ہوئیں، ریزولیوشن پاس ہوئے، اخبارات
میں مضامین لکھے گئے لیکن یہ شور شرابہ شہروں تک ہی
محدود رہا۔ گاؤں کی عورتوں کو اتنے بڑے واقعہ کی
سن گن بھی نہیں ملی۔ وہاں غریب عورتوں کے
مسئلے جوں کے توں رہے۔ اس صورتِ حال
سے نمٹنے کے لئے گاؤں کی عورتوں نے خود اپنے
ادارے قائم کئے۔ اتر پردیش کے دیہات میں
ایک ایسا ہی ادارہ بنا اس کی ممبروں کو لال سائکلیں
دی گئیں۔ ابھی اس گروپ میں سے عورتیں شامل
ہیں۔ یہ اپنی سائیکلوں پر سوار گاؤں گاؤں پھرتی ہیں
ان کے گاؤں میں داخل ہوتے ہی شور مچ جاتا
ہے۔ بچے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں۔
"لال سائیکل والی آ گئی۔ لال سائیکل والی آ گئی۔"
مرد بھی گھروں سے نکل آتے ہیں کہ دیکھیں کہ اب
یہ عورتیں کیا گل کھلاتی ہیں۔

گزشتہ دنوں اقوامِ متحدہ نے ۸ مارچ
کو عورتوں کا عالمی دن قرار دیا۔ اس بار یہ خبر شہروں
تک محدود نہ رہی۔ شہر کے فلاحی اداروں نے
یہ خبر لال سائیکل والیوں تک پہنچا دی۔ خبر ملنے

...دیر تھی کہ ایک جلسہ کا انتظام ہو گیا۔ اس جلسے میں حاضرین کی تعداد... تھی۔ اس جلسے میں دھواں دار تقریریں ہوئیں۔ مردوں نے تعجب سے لال سائیکل والیوں کے کارنامے سنے۔ ان کی تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ مرد کی حاکمیت اور عورت کی محکومیت کا تصور پرانا ہو گیا ہے۔ مرد زبردستی اپنی مرضی عورت پر نہیں تھوپ سکتا۔ وہ اس کی لونڈی نہیں ہے۔ ابھی یہ جلسہ جاری تھا کہ ایک افسر کی بیوی نے اپنے خاوند کی شکایت کی۔ اس نے نہ صرف اپنی بیوی کو گالیاں دی تھیں بلکہ اس کی پٹائی بھی کی تھی۔ یہ افسر ظاہر میں لال سائیکل والیوں کے ساتھ تھے، عورتوں کے ہمدرد تھے، ان کے حقوق کے حامی تھے، لیکن یہ سب زبانی جمع خرچ تھا۔ اندر سے وہ بھی مرد کی برتری کے قائل تھے۔ لال سائیکل والیوں نے جب یہ کہانی سنی تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ انہوں نے راتوں رات افسر کے خلاف پوسٹر لکھے۔ صبح تک مظاہرے کی تیاری مکمل ہو گئی۔

صبح کو جب یہ گاندھی وادی افسر اپنے دفتر پہنچے تو وہاں ایک سو عورتوں کا ہجوم ان کے انتظار میں کھڑا تھا۔ یہ عورتیں ہاتھوں میں پوسٹر لئے کھڑی تھیں۔ اس خاموش مظاہرے کو دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ انہوں نے فوراً ان عورتوں کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور سب کے سامنے اپنی بیوی سے معافی مانگ لی۔

ان کارناموں سے لال سائیکل والیوں کا رعب دیہات میں قائم ہو گیا۔ لوگ اب ان سے ڈرنے لگے ہیں۔ عورتوں کا کوئی مسئلہ نہیں جو ان کے دائرے سے باہر ہو۔ جہیز کی ناجائز مانگ ہو یا حفظانِ صحت کا مسئلہ درپیش ہو، یہ عورتیں فوراً وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ گاؤں والے ان سے ڈرتے ہیں۔ عورتیں ان کے راستے میں آنکھیں بچھاتی ہیں۔ آخر ان کے دکھ درد کو سننے والا کوئی تو ملا۔ اس گروپ کی ایک ممبر سے کسی نے پوچھا کہ تم کو اس ادارے میں داخل ہونے کا خیال کیسے آیا تو اس نے جواب دیا "میری زندگی میں کوئی مقصد نہیں تھا۔ پہلے باپ کی دھمکیاں سنو، پھر خاوند کا ظلم سہو اور اس کی نازبرداریاں کرو۔ میں خود کو پنجرے میں بند مینا سمجھتی تھی۔ جس کی اپنی کوئی زندگی نہیں۔ جو دوسروں کے رحم و کرم کا محتاج ہے۔ میں اس زندگی سے بیزار تھی۔ اس ادارے نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے۔ مجھے بہت تھوڑی تنخواہ ملتی ہے، لیکن مجھے زندگی میں ایک مقصد مل گیا ہے۔"

ہر ماں اور باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کا لاڈلا دنیا کی آنکھ کا تارا بنے ۔ صرف اُن کا ہی نہیں، قوم کا مُلک کا بھی نام روشن کرے، دُنیا کی ذمّہ داریوں کا بوجھ اُٹھائے ۔ یہ خواہش اپنی جگہ ٹھیک ہے، مگر آپ نے اِس سِلسلے میں کیا کچھ کیا ہے ۔ اس کی ابتدا پنگوڑے میں ہی کرنی چاہیئے ۔ اپنے لاڈلے کو **"ممتا"** دیجئے، یہ ننھے بچّوں کا خاص ٹانک ہے، جو ایک ماں کی طرح ان کی حفاظت کرتا ہے ۔ جسم میں کیلشیم کی کمی کو دُور کر کے ہڈیوں کے ٹیڑھے پن کو روکتا ہے ۔ ننھے بے زبان بچّوں کو قبض سے نجات دلاتا ہے ۔ نزلہ اور زکام میں بھی مفید ہے ۔ بچّوں کو ہنستا اور خوش و خرّم رکھنا ہی **"ممتا"** کا کام ہے ۔ اپنے بچّے سے پیار ہے تو اُسے **"ممتا"** ہی دیجئے اور دیکھئے وہ کتنی جلدی جلدی پروان چڑھتا ہے ۔

قیمت فی شیشی : آٹھ روپے

شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) **لیبارٹیریز**، لال کنواں، دہلی

سچ تو یہ ہے کہ میں نے دو نوں میں سے ایک نعش بھی نہیں دیکھی — لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ دونوں نعشیں، ہر وقت، ہر لمحہ، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میرے ساتھ ساتھ، میرے آس پاس رہتی ہیں۔ میں کسی پل ان سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا پاتا۔ ان کی سوالیہ نظریں میرے اوپر مرکوز رہتی ہیں۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک ہی سوال ہوتا ہے:

"کیوں؟ — کیوں؟"

اور میں سوچتا رہتا ہوں کہ اس 'کیوں' کا جواب انہیں کیا دوں۔ اکثر تو وہ چار آنکھیں بڑھتے بڑھتے سیکڑوں اور ہزاروں آنکھیں بن جاتی ہیں۔ اور ہر آنکھ میں ایک ہی سوال ہوتا ہے: "کیوں — کیوں؟"

ہاں تو میں آپ کو دو نعشوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس میں ایک نعش تو زینو بیہ کی ہے اور دوسری رانو کی۔ ان دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے، سوائے اس کے کہ دونوں ہمارے اس سماج کی شریف خاندانوں کی پڑھی لکھی، قبول صورت اور سلیقہ مند لڑکیاں تھیں۔ دونوں کی شادی ہوئی اور دونوں مر گئیں۔ وہ موت نہیں جس کے لئے لفظ 'برحق' کہا جاتا ہے، بلکہ وہ موت جس کو حادثہ کہا جاتا ہے، جو ماں باپ اور عزیزوں پر ایک سانحہ بن کر گزرتی ہے اور قیامت بن کر غضب ڈھاتی ہے اور اپنوں کو ہی نہیں، غیروں کو بھی خون کے آنسو رلاتی ہے۔ تو ایسی موت تھی زینوبیہ اور رانو کی، جو اس سماج کی لڑکیاں تھیں اور دونوں نعش بن کر ایک سوالیہ نشان بن گئیں — آپ کے لئے، ہمارے لئے، اس سماج کے لئے — اور اب ہم چور بنے ان کی سوال کرتی نظروں سے چھپتے پھر رہے ہیں، کیوں کہ ہم بھی اس سماج میں رہتے ہیں۔

زینوبیہ کے والد کی وفات
ہوئی تو وہ صرف آٹھ سال کی تھی۔ ایک بھائی
اس سے بڑا تھا اور دو بہنیں اور ایک بھائی
اس سے چھوٹے تھے۔ بڑا بھائی بھی کوئی
زیادہ عمر کا نہ تھا۔ اس نے دسویں کا امتحان
دیا تھا باقی سب چھوٹے کلاسوں میں تھے
اور موت کا مطلب نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن
جب دُودھ کی بجائے چائے اور پراٹھوں
کی جگہ روٹی ملنے لگی، جب کاپی کتابوں کی
ضروریات کو ٹالا جانے لگا، جب اماں ہر
ضرورت اور فرمائش پر انہیں جھڑکنے لگیں،
تب موت کا مطلب ان کی بھی سمجھ میں آ گیا۔
اماں سیدھی سادی گھریلو پڑھی لکھی خاتون تھیں،
پھر بھی انہوں نے بڑی ہمت اور صبر و استقلال
سے کام لیا۔ جائداد کی تھوڑی سی آمدنی میں بچوں
کی پرورش کی اور سب کی تعلیم کا بھی دھیان
رکھا۔

بڑا بھائی افسر بی۔ اے کرنے کے
بعد ملازمت کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا۔
قصبے کا سیدھا سادا لڑکا جب حالات کے
ہاتھوں، بڑے شہروں کے بحرِ زخار میں کودا تو
اپنی حفاظت کے لئے اکیلے سیدھے ہاتھ
پاؤں مارتا ہوا آخر ساحلِ اُمید سے جا لگا۔ اسے
مُلازمت مل گئی۔ ہزار دو ہزار کی نہیں، پانچ
چھ سو کی لیکن یہ بھی غنیمت تھا، ورنہ بے چاری
ماں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں اس کا بھولا بھالا بچہ
کسی حادثاتی دلدل میں پھنس کر اپنی نیکی
شرافت اور آن ہی کو نہ گنوا بیٹھے۔ یہ بھی شاید
اس کی دُعاؤں ہی کا اثر تھا کہ افسر کو اپنی منزل
مل گئی اور سلیقہ مند ماں اس قلیل آمدنی میں بھی
بیٹی کے جہیز کے ساتھ ہونے والی بہو کی بری
کے لئے بھی کچھ نہ کچھ جوڑنے لگی۔ ان کے
وقتوں میں تو جہیز اور بری حیثیت کے موافق
ہی دی جاتی تھی، لیکن اب وقت بدل گیا
تھا اور شاید اس بدلتے ہوئے وقت کا
سب سے زیادہ اثر بیٹی والوں ہی پر پڑا تھا۔
دیکھتے ہی دیکھتے پھول جیسی بیٹیاں ثانوی چیز
بن گئیں اور جہیز کو اوّلیت حاصل ہو گئی۔ اب تو
کیا اپنے اور کیا پرائے، سب ہی جہیز لینے کی
دوڑ میں شامل ہو کر گویا ایک دوسرے سے
بازی لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اور
ان کی ایسی ہی کوششوں کے دوران نہ جانے
کتنی لڑکیاں اور کتنے خاندان پامال ہو گئے۔
لیکن پیچھے جھک کر ان کُشتوں کو دیکھنے کی
فرصت کسے تھی؟

ان کی سسرال والے سب نہایت
آسودہ حال تھے خصوصاً زینوبیہ کے حقیقی
چچا تو لاکھوں میں کھیلتے تھے۔ لیکن بڑے
گھر کی بیوی کا دباؤ کچھ ایسا تھا کہ نہ کبھی بھائی
سے کھلے دل سے مل سکے اور نہ بھائی کے
انتقال کے بعد یتیم بھتیجوں بھتیجیوں کی
کفالت ہی کر سکے۔ لیکن جب ان کا انتقال
ہوا تو افسر ان کے گھر تعزیت کے لئے چلا گیا۔
ایک شہر میں رہ کر یہ کیسے ممکن تھا کہ چچا مرے
اور بھتیجا پُرسے بھی نہ جائے۔ افسر نے چچا کے
سوئم اور چالیسویں میں بھی شرکت کی۔ وہیں اس
کی دوستی چچا زاد بھائی رفیق سے ہو گئی۔ رفیق
بے حد ملنسار اور با اخلاق لڑکا تھا اور ان دنوں
سعودی عرب میں کسی اچھی ملازمت پر لگا ہوا تھا۔
رشتے داری جب دوستی میں بدلی تو
رفیق افسر کے ہمراہ اپنی چچی سے بھی ملنے گیا۔
اور وہیں اس نے پہلی بار زینوبیہ کو دیکھا۔ بڑے
شہروں کی تیز طرار آمادہ بے حجاب لڑکیوں کے
مقابلے میں اسے سیدھی سادی زینوبیہ بہت
پسند آئی۔ گھر واپس جا کر اس نے ماں سے زینوبیہ
کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ شادی کی خواہش
بھی ظاہر کی۔ ماں نے اس کی پسند سے اختلاف
کیا اور کئی اچھے خاندانوں کی مال دار فیشن ایبل
لڑکیوں کا تذکرہ کیا۔ پھر ان کی اور زینوبیہ کی
حیثیتوں میں جو نمایاں فرق تھا، وہ بھی بیٹے کے
گوش گزار کیا۔ لیکن رفیق نے ان کی کوئی
بھی دلیل ماننے سے انکار کر دیا اور گھنٹے ہر طرح
انہیں کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر
بیٹے کی ضد کے سامنے انہیں ہار ماننا پڑی۔
اور جب انہوں نے اس چھوٹے سے قصبے کے
چھوٹے سے گھر میں جا کر رفیق کے لئے زینوبیہ
کا ہاتھ مانگا تو کسی کو یقین ہی نہ آیا۔ اور جب
یقین آیا تو جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہو گیا،
کیونکہ رفیق کو اپنی ملازمت پر جلدی واپس جانا
تھا۔

زینوبیہ کی بری دیکھ کر تو سب نے
اس کی قسمت پر رشک کیا۔ اکیاون جوڑے
ایک سے ایک بھاری اور قیمتی۔ ساتھ میں
زیورات کے سترہ سیٹ۔ منوں میوہ اور
دیگر لوازم۔ زینوبیہ نے سوچا کہ کہیں وہ خواب
ہی نہ دیکھ رہی ہو کہ آنکھ کھلے تو پتہ چلے کہ سویرا
ہو گیا۔ لیکن جب ساس نے اس کی بلائیں
لے کر ارمان بھرے لہجے میں کہا: "اس
چاند سے چہرے پر سے تو میں اپنی ساری دولت
وار کر دوں" تب جا کر کہیں اسے اپنی خوش نصیبی
کا یقین آیا۔ اس کا جہیز بری کے مقابلے میں
بہت کم تھا۔ لیکن یہ شادی جہیز اور بری کا

مقابلہ کرنے کے لئے ترکی نہیں گئی تھی جو کسی
کو ملال ہوتا۔ یوں زینوبیہ بیاہ کر سسرال
چلی گئی۔

شوہر کی رفاقت میں ایک مہینہ پر لگاکر
اڑ گیا ــــ رفیق نے اس سے وعدہ کیا تھا
کہ اگلی بار وہ جلدی ہی آئے گا، اور اس کے
ویزا کا انتظام کرکے اسے ساتھ ہی لے جائے گا۔
اتنی جلدی شوہر سے پھر ملنا سوہانِ روح ضرور تھا
لیکن قانونی ضابطوں کی پابندی تو بہر حال
کرنا ہی تھی اور رفیق اس کو ڈھیروں تسلیاں
اور دلاسے دے کر اپنی ملازمت پر واپس
چلا گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں زینوبیہ کے
لئے دن کاٹنے مشکل ہو گئے۔ لیکن اس نے
ساس سے میکے جانے کے لئے ایک بار بھی
نہیں کہا، مبادا وہ برا مانیں۔ لیکن کبھی کبھی انسر
اس سے ملنے چلا آتا تھا یا پھر فون ہی پر خیریت
معلوم کرنے پر اکتفا کرتا تھا۔ بڑے شہروں
میں فاصلے بھی بڑھتے جا رہے تھے ـــ اس
لئے جلدی جلدی ملنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔

پھر اماں کا خط آیا، جس میں انہوں
نے اپنی علالت کا سرسری سا ذکر کیا تھا۔ زینوبیہ
تڑپ تڑپ کر رہ گئی ــــ وہ جانتی تھی کہ اماں
اپنی بڑی سے بڑی تکلیف کو بھی چھپا کر رکھتی
ہیں، اس لئے جب بیماری کا ذکر کیا ہے تو
یقیناً ان کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔
وہ دو روز سوچتی رہی کہ آج ضرور چچی امی سے اماں
کی بیماری کا تذکرہ کرکے میکے جانے کی اجازت
لے لے گی ــــ لیکن ساس اور نند کا پروگرام
کچھ ایسا ٹائٹ ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہہ ہی نہیں
پاتی تھی ــــ آدھے دن تک تو دونوں ماں بیٹی
سوتی رہتی تھیں ـــ پھر ناشتہ نکالنے اور
غسل کے بعد شام کو باہر جانے کی تیاریاں
شروع ہو جاتی تھیں۔ کلب، پارٹیاں، فلم اور
دعوتیں ان کی روزمرہ کی مصروفیات تھیں اور
روزانہ آدھی رات کے بعد ہی ان کی واپسی
ہوتی تھی ــــ وہ اتنے بڑے گھر میں اکیلی
بیٹھی ٹی۔وی۔ دیکھتی رہتی اور جب آدھی
رات کے بعد ساس کی آخری خدمات انجام
دے کر بستر پر گرتی تو صبح پانچ بجے گھڑی
کا الارم ہی اسے جگا کر یاد دلاتا کہ میم صاحب کی
بیڈ ٹی کا وقت آ گیا ہے۔

زندگی کے شب و روز اس قدر الجھ کر رہ گئے
تھے کہ وہ کچھ سوچ ہی نہیں پاتی تھی۔ اماں
کا اگلا خط کافی تسلی بخش تھا جس سے
اسے کچھ اطمینان ہوا۔ انسر بھی ان دنوں گھر
ہی پر تھا، اور یہ بات اس کے لئے کافی
تسلی کا سبب بنی۔ اپنی اتنی مصروفیت کا اسے
کبھی شکوہ نہیں ہوا کیوں کہ وہ تو کام کرنے
کی پہلے ہی سے عادی تھی۔ اس لئے تو یہ بات
بھی محسوس نہیں کی کہ اس کے آنے کے بعد
چچی امی نے بائی کو چوری کا الزام لگا کر جان بوجھ کر
نکالا تھا۔ وہ تو 'خدمت میں عظمت' کے
مقولے پر گامزن تھی۔ پھر جب ایسے میں
رفیق کا خط آ جاتا تو وہ اپنی ساری تھکن بھول کر
اس کے خیالوں میں گم ہو جاتی ـــ ہر خط میں
رفیق جلد آنے کے وعدے کے ساتھ
اس بات کا تذکرہ کرنا نہیں بھولتا تھا کہ وہ
اسے اپنے ساتھ ہی لے جائے گا۔ کبھی نئے
گھر کا ذکر ہوتا، کبھی ان چیزوں کا تذکرہ ہوتا
جو وہ دھیرے دھیرے گرہستی کے لئے
خرید رہا تھا اور اس کے لئے گھر کو سجا رہا تھا
اور تب اس کا من چاہتا کہ وہ اڑ کر رفیق کے
پاس پہنچ جائے اور اس کی باہنوں میں سما کر
ہجر میں گزرے شب و روز کی داستان
سنا دے۔

رفیق نے اطلاع دی تھی کہ وہ عید
کرنے کے لئے گھر آ رہا ہے اور اس کے بعد
وہ زینوبیہ کو بھی اپنے ساتھ لے جائے گا
یہ بات اس نے اپنی ماں کو بھی لکھ دی تھی تب
ایک دن زینوبیہ نے اپنی ساس سے کہا:
"چچی امی، میں کچھ دن کے لئے اماں کے پاس
جانا چاہتی ہوں۔ سب سے مل لوں۔ ان کے
ساتھ جاؤں گی تو واپسی سال دو سال سے پہلے
نہیں ہو گی۔"

"ہاں ہاں ضرور چلی جاؤ" ساس نے
محبت سے کہا۔

"آپ کو تکلیف ہو گی ـــ لیکن میں جلد
ہی واپس آ جاؤں گی۔"

"اے بی تکلیف اور راحت کا کیا وہ
تو لگی ہی رہتی ہے۔ اب تم خدا رکھے رفیق کے
ساتھ جاؤ گی تو کیا تکلیف نہیں ہو گی؟"

"میری چچی امی!" اس نے ان کے گلے
میں باہیں ڈال کر کہا۔ "اگر آپ کی خوشی نہ ہو گی
تو ــــ تو میں نہیں جاؤں گی۔"

"ارے میں اس لئے تھوڑا ہی کہہ رہی
ہوں ـــ وہ تو ایک بات کہی تھی میں نے"
ساس نے ذرا نخوت سے کہا۔ اور زینوبیہ نے
محسوس کیا کہ ساس کا لہجہ اس وقت ملائم ہونے
کے باوجود کیسا سخت تھا۔ وہ چپ ہو گئی

زینوبیہ میکے گئی تو پورے پانچ ماہ
کے بعد اماں اور بہن بھائیوں سے ملی تھی
اور محلے والیوں نے تو اس کی بے مروتی کے
خوب خوب شکوے کئے۔ اب بھلا وہ ان

سے کیا ہوتی کہ لڑکی پرائی ہوجائے تو بے مروت
تو ہو ہی جاتی ہے۔ آنا جانا اپنے بس میں کب
رہ جاتا ہے۔ وہ گھر آکر اور سب سے مل کر
بہت خوش تھی۔ مانوس لوگ، مانوس ماحول، اس
کے سسرال کے گھر سے کیسا مختلف کیسا اپنا اپنا
سا الگ رہا تھا۔ یہ شاید رفیق کی غیر موجودگی
کے سبب ہو، ورنہ لڑکی تو جس دن بیاہ کر جاتی
ہے، اسی دن سے وہ گھر اس کا اور میکہ پرایا ہو جاتا
ہے۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ اس کی نئی زندگی کا سفر ابھی
شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ سفر تو اس دن شروع
ہوگا جس دن وہ رفیق کے ساتھ جائے گی،
ایک نیا گھر بسائے گی، اسے اپنے ہاتھوں
سے سجائے اور سنوارے گی، رفیق کے آرام و
آسائش کا خیال رکھے گی، اس کی پسند ناپسند
کا دھیان رکھے گی۔ بیس پچیس دن کا
ساتھ بھی کوئی ساتھ ہوتا ہے۔ ابھی تو دونوں
نے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھا بھی نہیں
تھا۔ یہ سب تو لمبی رفاقت ہی میں ممکن تھا
اور اس رفاقت کی وہ کیسی آرزو مند تھی۔

زینو بیہ نے سسرال جانے سے پہلے
سب بہن بھائیوں سے ان کی فرمائشیں پوچھ کر
نوٹ کیں۔ ساس اور نند کے لئے خوب صورت
تحفے خریدے — شوہر کے لئے چکن کے کرتے
منگوائے۔ امی نے جو اس کے واسطے عید پر
پہننے کے لئے غرارہ سوٹ بنوایا تھا، اس پر
اپنے ہاتھ سے سلمہ ستارہ کا خوب صورت
کام بنایا — وہ اپنی یہ عید رفیق کے ساتھ
دل کی بھرپور امنگوں اور خوشیوں کے ساتھ
منانا چاہتی تھی۔

جب وہ چھوٹے بھائی کے ہمراہ سسرال
پہنچی تو رفیق کو وہاں موجود پایا — وہ کئی روز
قبل آچکا تھا۔ اسے بے حد کوفت ہوئی کہ
رفیق نے اپنے آنے کی پہلے سے اس کو
اطلاع کیوں نہ دی، ورنہ وہ میکے میں اتنے روز
کیوں رہتی؟ پہلے ہی نہ آجاتی؟ لیکن رفیق
نے اپنے رویہ سے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ اس
کے میکے میں رہنے سے ناخوش ہے۔ زینو بیہ
کے تحفے پاکر سب ہی خوش تھے۔ رفیق بھی
اس کے لئے کئی خوب صورت ساڑیاں اور
نئے ڈیزائن کا ڈائمنڈ کا سیٹ لایا تھا۔
رفیق نے اسے بتایا کہ وہ گھر کا اور ضروریات
کا سامان خرید کر اپنی نئی زندگی کی ابتدا کرنے
کے لئے سارا انتظام کر کے ہی آیا ہے۔

زینو بیہ اس کے خیال اور محبت پر نہال
ہوگئی اور خوشی خوشی رفیق کے ہمراہ جانے
کے انتظامات کرنے لگی۔ چھوٹا بھائی دو روز
رک کر واپس چلا گیا۔ بھائی کے جانے کے
بعد وہ اداس ہوگئی۔ کیا اپنے گھر اور اپنے
گھر والوں سے اس کا رشتہ بس اتنا ہی رہ گیا
ہے کہ کبھی جا کر غیروں کی طرح مل آئے؟ لیکن
غیر لوگ بھی تو اتنے اپنے بن جاتے ہیں جن سے
ایک پل جدا رہنے کو جی نہ چاہے — یہی اس
دنیا کی ریت ہے — کیسی عجیب، لیکن کیسی
پیاری!

مسجد سے گولے داغ کر عید کا چاند
ہونے کا اعلان کیا گیا تو زینو بیہ نے سب سے
پہلے رفیق کو عید کی مبارک باد دی۔ رفیق
نے اسے گلے سے لگا لیا — ان دونوں کو
اس عید کی دوہری خوشی تھی۔ ایک تو شادی
کے بعد یہ ان کی پہلی عید تھی، پھر عید کے بعد
ہی ان کو اپنی نئی زندگی کا سفر شروع کرنا تھا۔
رات میں جب بہت سا کام نمٹا کر زینو بیہ سونے
کے لئے جانے لگی تو ساس نے بڑی محبت سے
اسے اپنے پاس بلایا اور اس کی پیشانی چوم کر
کہنے لگیں "کیسی تھکی تھکی اور نڈھال سی ہو رہی
ہے میری بچی۔"

"ارے نہیں امی! اتنی بھی تھکی نہیں
ہوں — کوئی زیادہ کام بھی تو نہیں تھا!"
زینو بیہ ساس کی اس محبت پر سچ مچ خوش
ہوگئی۔

تب ہی ساس نے اپنی بیٹی سے کہا
"ذرا اپنی بھابی کو وہ ٹانک تو پلا دو جو میں روز
پیتی ہوں۔ اس سے تھکن بھی دور ہوگی، اور
نیند بھی خوب آئے گی۔"

"ٹانک کی کیا ضرورت ہے؟ بس
سو جاؤں گی تو تھکن خود بخود دور ہو جائے گی!"
زینو بیہ نے نرمی سے کہا لیکن وہ نہیں مانیں
اور زینو بیہ کو اپنے سامنے ٹانک کے دو بڑے
چمچے پلوائے اور بڑی محبت سے آرام کرنے
کی ہدایت کی۔

زینو بیہ اپنے کمرے میں گئی تو رفیق
اس کا انتظار کر کے سو چکا تھا۔ وہ بھی بتی
بجھا کر لیٹ رہی اور جلد ہی نیند کی آغوش
میں چلی گئی۔

اچانک آدھی رات کو زینو بیہ کی
طبیعت خراب ہوگئی۔ اس نے رفیق کو جگا کر
پانی مانگا اور پانی پیتے ہی پیتے گردن ڈال دی۔
رفیق گھبرا گیا — اس نے جلدی سے اپنی
ماں کو جگایا۔ ماں نے زینو کو دیکھا تو سر پیٹ لیا
"لگتا ہے کہ اس نے کوئی الٹی سیدھی
زہریلی چیز کھالی ہے۔ کیا تم سے کوئی بات ہوگئی
تھی؟ لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟"

"میں تو سو گیا تھا۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں

کہ یہ کب آکر سوتی۔" رفیق نے کہا۔

"اب کیا ہوگا؟" ساس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔"

"ایسا غضب بھی نہ کرنا، ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ نیچے کے فلیٹ سے ڈاکٹر نرنجن کو بلا لو — وہ سنبھال لیں گے۔"

ڈاکٹر نرنجن نے زینوبیہ کو دیکھا تو اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ رفیق کو سکتہ سا ہو گیا۔ اسے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ کوئی اتنی جلد بھی مر سکتا ہے۔ ابھی کل شام تک وہ ہنس بول رہی تھی، اس کی گردن میں بانہیں ڈالے عید کی مبارک باد دے رہی تھی۔ اسے تو اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ ڈاکٹر اور ماں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی۔ جب اس کے حواس ذرا درست ہوئے تو اس نے افسر کو فون کیا۔

افسر دوڑا ہوا آیا۔ بہن کی موت کا یقین کیسے آتا؟ نہ بیمار، نہ دکھی — اچھی بھلی تن درست لڑکی یوں اچانک کیسے مر سکتی ہے لیکن بہن کی نعش دیکھ کر یقین کرنا پڑا کہ کبھی کبھی انہونی بھی ہو جاتی ہے۔ اس نے رفیق سے شکوہ کیا کہ اُسے بہن کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع کیوں نہ دی گئی، اسے اسپتال کیوں نہ لے جایا گیا۔ رفیق کیا جواب دیتا؟ وہ تو زینو کی موت سے خود ہی بدحواس اور دل گرفتہ ہو رہا تھا — ساس چپکے چپکے تدفین کا انتظام کر رہی تھی کہ افسر نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی بہن کی نعش کو وطن لے جائے گا، اس دیارِ غیر میں اسے دفن نہیں کرے گا، ورنہ ماں کا کلیجہ یہ خبر سن کر پھٹ جائے گا۔ بیٹی کی نعش دیکھ کر شاید انہیں صبر آجائے۔

ہوائی جہاز کے ذریعہ زینوبیہ کی نعش وطن لے جائی گئی۔ افسر اور رفیق بھی ساتھ تھے۔ جانے سے پہلے ماں نے اپنے بدحواس بیٹے کو کافی سبق پڑھائے اور اچھی طرح سمجھا بجھا دیا کہ کوئی ایسی بات مونہہ سے نہ نکالے جو وہ لوگ پھنس جائیں — افسر سے تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ وہ رفیق کے ہمراہ جانے کی ضد کر رہی تھی اور رفیق اس بار کی بجائے اگلی بار لے جانے کا وعدہ کر رہا تھا۔ بس اس غصے میں اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی اور جان دے دی۔

زینوبیہ کی ماں اور بھائی بہن اس کہانی پر کیسے یقین کرتے؟ زینوبیہ جس طرح ہنسی خوشی رفیق کے ہمراہ جانے کا انتظام کر رہی تھی اس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ رفیق اس بار بیوی کو ہمراہ لے جانے پر آمادہ ہے۔ رفیق کے خط کا ذکر بھی تو اس نے سہیلیوں سے کیا تھا۔ ماں کو بھی بتایا تھا۔ اس لئے اس نئی بات پر کس کو یقین آتا؟ لیکن زینوبیہ کی نعش اس کی موت کا یقین دلا رہی تھی۔ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ کون جانے؟ لیکن جو کچھ ہوا وہ سامنے تھا۔ ایک نعش کی صورت میں۔

زینوبیہ کی تدفین کے بعد رفیق ضروری کاموں کا عذر پیش کر کے فوراً چلا گیا۔ اس نے اپنی چہیتی بیوی کا سوئم بھی نہیں کیا شاید ماں کی فہمائش کے مطابق ہی اس نے ایسا کیا تھا — اور یوں زینوبیہ کی داستان ختم ہو گئی۔

ابھی دوسری نعش کی کہانی باقی ہے۔

رانو متوسط طبقے کی لڑکی تھی۔ اس کے پتا ایک کارخانے میں فورمین تھے۔ سب سے بڑی وہی تھی۔ اس کے بعد پانچ بھائی بہن اور تھے۔ ایک ساتھ چھ بچوں کی پرورش اور تعلیم کا بار اٹھانا اس کے پتا کی ہمت سے باہر تھا۔ لیکن زمانے کا رنگ دیکھتے ہوئے انہوں نے پیٹ کاٹ کاٹ کر سارے بچوں کو پڑھایا لکھایا۔ ماں باپ رانو کا بیاہ جلد سے جلد کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن لڑکے دیکھتے بھالتے وقت اتنا گزرا کہ رانو نے بی۔ اے کر لیا۔ پھر خوش قسمتی سے ایک ایسا لڑکا مل گیا جو دان جہیز نہیں مانگ رہا تھا۔ لڑکا اپنی بڑی بہن کے پاس بمبئی میں رہتا تھا۔ بیاہ ٹھہرانے والے نے بتایا تھا کہ لڑکے کا میڈیکل شاپ ہے۔ اچھا کام چلتا ہے۔ اکیلا لڑکا ہے۔ نہ کوئی جھگڑا نہ جھمیلا — لڑکا صرف دسواں پاس تھا لیکن یہی کیا کم تھا کہ وہ لوگ بغیر دان جہیز کے لڑکی کو سویکار کر رہے تھے۔

رانو سمجھدار تھی۔ ماں باپ کی پریشانیوں سے واقف تھی۔ اس لئے اس نے بھی رشتے کی مخالفت نہ کی حالانکہ اس کے من میں ہونے والے جیون ساتھی کی تعلیم کی کمی نے چبھن سی پیدا کر دی تھی۔ لیکن سب ہی باتیں تو نہیں مل سکتیں، اس لئے وہ چپ رہی اور شادی کے بعد سسرال چلی گئی۔ ماں باپ نے حیثیت کے موافق گہنا پاتا اور کپڑا لتا بھی دیا اور کچھ ضروری سامان بھی کہ لڑکی کو سسرال میں طعنے نہ ملیں کہ ابھاگن بالکل ہی خالی ہاتھ آئی ہے۔

پہلا صدمہ تو اس وقت رانو پر گزرا تھا جب اس نے پتی کی کم علمی کا ذکر سنا تھا۔

مگر اس سے بھی زیادہ دکھ اسے پتی کا چہرہ دیکھ کر ہوا۔ ایسا بدصورت پتی تو اس نے سپنے میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ رانو کافی قبول صورت اور اسمارٹ تھی۔ اس کے سپنوں میں بھی ہر لڑکی کی طرح ایک سجیلا سانولا شہزادہ بستا تھا۔

لیکن اس کے سپنے اس طرح ٹوٹ کر بکھرے کہ وہ انہیں سمیٹ بھی نہ سکی اور اسے وہ دن یاد آئے جب وہ اپنی سہیلیوں کے بیاہ پر ان کے پتی کی خوب خوب نقلیں اتارتی تھی اور صاف صاف کہتی تھی کہ وہ تو کبھی کسی لنگور سے بیاہ نہ کرے گی، خواہ ساری عمر کنواری رہے۔ لیکن اس کے پتا جی لین دین کے بغیر بیاہ ہونے کی خوشی میں اور اس سے بھی بڑھ کر اپنی مجبوری کے سبب لڑکے کی بدصورتی کو بھی فراموش کر گئے۔ پھر لڑکیوں کا مقدر تو سدا سے یہی رہا ہے کہ پتی کو پرمیشور مانو، خواہ وہ پرمیشور بھگوان کا روپ ہو یا راکھشس کا۔ اس لئے رانو نے بھی اسے سویکار کر لیا اور اپنے بھاگیہ پر شاکر ہو گئی۔

چھوٹی سی گھٹی گھٹی کھولی جس میں نہ نل تھا، نہ سنڈاس۔ پانی بھرنے کے لئے باہر سڑک کے نل پر لائن لگانا پڑتی تھی۔ چند روز تو اس کے پتی سبھاش نے پانی بھرا پھر نند کے حکم سے اسے یہ کام سونپ دیا گیا۔ اپنے گھر، محلے اور کالج کا کھلا کھلا ماحول یہاں ایک گندی کھولی میں سمٹ کر رہ گیا اور اس کی ساری صلاحیتیں مٹی کے تیل کے چولہے پر کھانا پکانے کی نذر ہو گئیں۔ ساتھ ہی سبھاش جب روز شراب پی کر اسے پیٹنے لگا اور جہیز نہ ملنے کے طعنے دینے لگا تو وہ تقدیر سے شکوہ کر بیٹھی۔ اس کے پتی کا موٹر ورکشاپ نہیں تھا، بلکہ وہ کسی ورکشاپ میں معمولی سا مستری تھا۔ یہ حقیقت تو رانو کو چند ہی دنوں میں معلوم ہو گئی تھی۔ اوپر سے اس کا اور نند کا خراب برتاؤ — رانو چند ہفتے میں پیلی پڑ گئی اس کی مسکراہٹیں کھو گئیں اور اس کی چنچلتا ایک گہری اداسی میں بدل گئی۔ یہ کیسا نرکھ تھا جہاں جل جل کر زندہ رہنا تھا۔ اور دکھ سہہ کر خاموش سہنا تھا مگر جس دن سبھاش شراب کے نشے میں اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر آیا اور رانو سے اس کے پاس بیٹھنے کے لئے کہا تو رانو اس کا یہ حکم نہ مان سکی نتیجے میں اس کی جم کر پٹائی کی گئی۔ اور اس کے مونہہ سے ڈھیروں خون گرا — اس دن اس نے چھپا کر پتا کو چٹھی لکھی کہ فوراً آکر اسے ساتھ لے جائے اس کی جان کو خطرہ ہے۔ جس روز ایک بدنصیب باپ کو بیٹی کی یہ چٹھی ملی اسی رات اسے رانو کی موت کا ٹیلی گرام ملا۔ اسے تو بیٹی کو لینے جانا ہی تھا، اس لئے وہ پہلی ٹرین سے بمبئی روانہ ہو گیا۔

جب غم زدہ باپ پہنچا تو اس کی پڑھی لکھی، چاند جیسی بیٹی کا انتم سنسکار ہو چکا تھا — سبھاش اور اس کی بہن نے بتایا کہ رانو نے غصے میں چوہے مار دوا کھا لی تھی باپ نے شکوہ کیا کہ اسے اسپتال کیوں نہ لے جایا گیا تو سبھاش نے ترشی اور حقارت سے کہا "آپ کی آوارہ اور بدمعاش بیٹی کو میں نے بغیر جہیز کے سویکار کیا تھا اور اس نے یہاں مونہہ پر کالک مل دی اگر اس کی مرضی نہیں تھی تو پھر اس کا بیاہ کیوں کر دیا جو اس نے آتم ہتیا کر لی؟ اسپتال جا کر ہمیں ہتھکڑیاں تو لگوانا نہیں تھیں۔"

غیرت دار باپ اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ لا سکا۔ محلے والوں نے ان سے سبھاش اور اس کی بہن کی بھی بہت سی برائیاں کیں اور بتایا کہ اس سے پہلے وہ ایک اور بیاہ کر چکا ہے۔ وہ لڑکی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور یوں اپنی جان بچائی تھی۔ محلے والوں نے ان سے پولیس کی کارروائی کرنے کی بھی بات کہی۔ اور ساتھ دینے کا وعدہ بھی کیا — لیکن بوڑھا باپ رو دھو کر چپ چاپ لوٹ گیا — نہ اس کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا، نہ اس کے حالات اس کی اجازت دیتے تھے۔ دو بیٹیاں اور بیاہنے کو بیٹھی تھیں۔ ان کو ان حالات میں کون پوچھتا — مرنے والی تو جا چکی تھی۔ اب زندہ جانوں کی فکر کرنا تھی جو پہاڑ سمان اس کی چھاتی پر دھری تھیں۔

اب یہ دو نعشیں ایک سوالیہ نشان بنی ہم سے پوچھ رہی ہیں:

"ایسا کیوں ہوا؟"

"ایسا کب تک ہوگا؟"

"اس کا انت کب ہوگا؟"

اور ہم سے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا ہے۔ لیکن ہم ان کی عزت کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے سے کترا بھی رہے ہیں — حالاں کہ ہم اپنی ذمہ داریوں سے آنکھیں نہیں چرا سکتے۔ جب تک ہم جہیز لینے اور دینے کی رسم کا خاتمہ نہیں کریں گے، زینو اور رانو اس طرح مرتی رہیں گی اور ہم ہر روز ان کے مرنے کا تماشہ دیکھتے رہیں گے۔

لیکن کب تک — آخر کب تک؟ ■

ابھاگن

جب سے آئی بن کے دُلہن
جُدا جُدا سے رہتے ہو تم
بات بھی اب تک کی نہیں تم نے
کیا اتنی بدصورت ہوں میں ؟
سانولا رنگ بھایا نہیں کیا ؟
ہاتھ کی مہندی مہک اٹھی ہے
کنگن میرے بول رہے ہیں
مانگ کے تارے تجھ کو بلائیں
نک بیسر ہے کانوں کے جھمکے
کیا صورت میری اتنی بُری ہے
کب تک یوں خاموش رہوں میں
جہیز نہ ملنے کا یا غم ہے
بھید ہے کیا یہ مجھ کو بتاؤ

بنی ہوئی ہوں جیسے ابھاگن
خفا خفا سے رہتے ہو تم
چاہے کبھی بھی مجھ سے ملے نہ تم نے
یا پتھر کی مورت ہوں میں ؟
کیا میں تم کو بھائی نہیں کیا ؟
آگ سی دل میں دہک اٹھی ہے
ساز مرا یہ کھول رہے ہیں
تجھ سے ساجن دل کی صدائیں
چم چم جگنو جیسے چمکے
یا من میں کوئی اور بسی ہے
دل کی باتیں کس سے کہوں میں
یا کوئی بات ہے جو مجھ میں کم ہے
کیوں ہو خفا یہ مجھ کو بتاؤ

سونی پڑی ہیں دل کی گلیاں
سوکھی ہیں کھلنے پر کلیاں

رزاق اختر

شکوہ

آپ میں ستاری، قہر اور تیغ، اقتدار ہے
دیوتا بھی آپ ہیں، اس سے کبھی کب انکار ہے؟
آپ کی عظمت، بلندی کا بھی اُس کو اعتراف!
اپنی کمتری و پستی کا بھی اُس کو اعتراف!

آپ سے شکوہ ہے لیکن اُس کو پیار سے دیوتا!
اُس پجارن نے کبھی جذبات کی بھی قدر کی!
کیا پجارن کا کوئی بھی حق نہیں تھا آپ پر؟
آپ نے اُس بے زبان کے حق کو پہچانا کبھی؟
یا چڑھاوے کا اُسے سوکھا ہوا سمجھا تھا پھول؟
اپنی سیوا کے لئے داسی اُسے سمجھا کئے!
اُس کے ایثار و محبت کا صلہ بھی کچھ دیا؟؟
پیار کتنا بے غرض تھا آپ کا ضعفِ مزاج؟
اُس میں جذبوں کی لطافت تھی یا بے خلوص؟
جسم کی سرحد سے آگے بھی بڑھا تھا یہ کبھی؟
کیا نہیں تھی کارفرما اس میں جنسی تشنگی؟

اس کرم فرمائی کا آخر نتیجہ یہ ہوا
بچے جننے کا مشین اُس ذات کو سونپا گیا!

نجمہ عزیز مرادآبادی

چاند سا چہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن یہ مہاسے یا گرمی دانے خود بخود تو دُور نہیں ہوں گے۔ انہیں دُور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سپر۔ یہ ایک یونانی دَوا ہے جس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو کچھ دیر کے لئے دبا دیتے ہیں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان تیز دواؤں سے آپ کی نازک اور ملائم جلد جَل بھی جایا کرتی ہے۔ خون سپر تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دُور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنائے رکھنے میں مدد دیتی ہے اور ان تمام وجوہات کو دُور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ، دھبے اور کھجلی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اور پھر آپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سپر کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے لگتا ہے۔

قیمت فی شیشی: دس روپے

شمع لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ابرار احمد

دنیا کے سب سے کم عمر باپ کی کہانی

الاسکا امریکہ کی پچاسویں ریاست ہے۔ اس کا علاقہ ... امریکہ سے جدا ہے۔ یہ جغرافیائی طور پر امریکہ سے جُڑی ہوئی نہیں ہے۔ الاسکا اور امریکہ کے درمیان کینیڈا کا وسیع و عریض ملک ہے۔ الاسکا کے ایک طرف کینیڈا ہے اور دوسری طرف روس کا مشرقی کنارہ۔ یہ ریاست امریکہ کے انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے آدھے سال منجمد رہتی ہے۔ یہاں غضب کی سردی پڑتی ہے۔

پچھلے دنوں اس جما دینے والی سردی میں محبت کی حرارت پیدا ہوئی اور ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔

گزشتہ سال گرمی کے موسم میں ایک خاندان الاسکا منتقل ہوا۔ یہ خاندان امریکہ کی ایک ریاست ٹمینے سے آیا تھا۔ یہ تین انسانوں پر مشتمل تھا۔ وارڈن اس کی بیوی اور ان کا ۱۲ سالہ بچہ پال وارڈن۔ پال وارڈن ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ الاسکا میں پال وارڈن کی دوستی ایک لڑکی سے ہو گئی۔ اس لڑکی کا نام وینڈی ہے۔ گزشتہ سال اس کی عمر ۱۵ سال تھی۔ وارڈن اس سے تین سال چھوٹا تھا مگر اس کی گول مٹول اور خوش شکل لڑکے میں نہ معلوم کیا کشش تھی کہ وینڈی پہلی نظر میں ہی اس پر فریفتہ ہو گئی۔ وارڈن نے ابھی تیرہویں سال میں قدم رکھا تھا۔ اسے محبت کے رازہائے سربستہ کا پتہ نہیں تھا۔ وہ ابھی محبت اور شادی کے جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بچہ پیدا کرنا تو دُور کی بات ہے۔ لیکن وینڈی کی بے تحاشا محبت کے آگے وہ بھی مجبور ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں میں دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ پال وارڈن کو جب بھی اسکول کے کام سے چھٹی ملتی وہ دوڑ کر وینڈی کے پاس پہنچ جاتا وینڈی اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتی غرض دونوں اپنا خالی وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے اور محبت کے نشے میں مست تھے۔

یہ نشہ اس وقت ٹوٹا جب وارڈن کے باپ نے اعلان کیا کہ نومبر شروع ہو گیا ہے۔ الاسکا میں برف باری شدید سے شدید تر ہو رہی ہے۔ اب ہمیں واپس اپنے وطن ٹمینے سی چلنا چاہئے۔ یہ اعلان ایک بجلی بن کر پال اور وینڈی پر گرا۔ دونوں ایک دوسرے سے ایک لمحہ کے لئے بھی جُدا نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اب ہمیشہ کی مفارقت ان کا مقدر تھا۔ ۱۲ برس کا بچہ باپ کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا۔ تو بہ تقدیر اسے الاسکا چھوڑنا پڑا۔

پال وارڈن نے الاسکا کیا چھوڑا وینڈی کی دنیا ہی تباہ ہو گئی۔ وہ دن رات پال کے خیال میں ڈوبی رہتی۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لیتے ادھر پال وارڈن کا بھی یہی حال تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹیلی فون پر بات کرتے۔ دوبارہ ملنے کی اسکیمیں بناتے۔ امریکہ میں چھٹی کے دن اور ہر رات کے ۱۱ بجے کے بعد ٹیلی فون کی شرح میں بہت کمی ہو جاتی ہے یہ شرح تقریباً ۲ روپے منٹ ہوتی ہے۔ اس میں فاصلہ کی کوئی قید نہیں۔ فاصلہ ۲ سو کیلو میٹر ہو یا ۲ ہزار ٹیلی فون کا نرخ ایک ہی ہوتا ہے۔ وینڈی کو جب بھی موقع ملتا وہ ٹیلی فون کا ڈائل گھماتی اور لامتناہی گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس طرح یہ سلسلہ دو تین مہینے چلتا رہا۔

ایک دن وینڈی نے ٹیلی فون پر پال کو بتایا کہ وہ حاملہ ہے۔ اب وہ کیا کرے

ہال نے جب یہ خبر سنی تو وہ فوراً گھبرایا۔ اس نے فوراً جواب دیا کہ ہم دونوں شادی کرلیں گے۔

وینڈی نے جب ہال کا فیصلہ سنا تو اس کی طبیعت کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ اس نے ہمت کر کے اپنے والدین کو بھی یہ خبر سنادی۔ اس کے والدین اس حادثے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ وینڈی کے باپ نے کہا کہ تم ابھی چھوٹی ہو۔ تمہیں شادی کا لائسنس نہیں مل سکتا۔ ۱۸ سال سے کم عمر میں شادی کرنا غیر قانونی ہے۔ تم بچے کو ضائع مت کرو۔ اسے پیدا ہونے دو۔ پیدائش کے بعد بچہ کو کوئی بھی گود لے لے گا۔ وینڈی نے باپ کا فیصلہ ہال کو سنایا تو وہ تلملا کر رہ گیا۔ اس نے وینڈی سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ اس نے اپنے سیونگ اکاونٹ سے ۲ ہزار ڈالر (۲۲ ہزار ہندوستانی روپیہ) نکالے اور الاسکا روانہ ہو گیا۔ یہ روپیہ اس نے اپنے باپ کے ساتھ پارٹ ٹائم کر کے بچایا تھا۔

ادھر وینڈی کے باپ کو خدشہ تھا کہ ہال یہ خبر سنتے ہی الاسکا پہنچ جائے گا۔ اسے ہر حالت میں اس شادی کو روکنا تھا۔ اس نے وینڈی کو اپنے ایک دوست کے گھر بھیج دیا۔ کسی انسان کو وینڈی کے جانے کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس کے باپ نے اپنے دوست کو ہدایت کی کہ وہ وینڈی کو اپنے گھر میں چھپائے رکھے۔ اسے گھر سے نہ نکلنے دے۔

ہال جب الاسکا پہنچا تو سیدھا وینڈی کے گھر گیا۔ وینڈی کے والدین نے سرد مہری سے اس کا استقبال کیا۔ ہال نے پوچھا وینڈی کہاں ہے۔ تو انہوں نے اس بات کو ٹال دیا۔ انہوں نے کہا کہ وینڈی اپنی کسی سہیلی کے گھر گئی ہے انہیں اس کا گھر نہیں معلوم۔ وہ اس بارے میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ ہال سمجھ گیا۔ وینڈی کو اس کے والدین نے کہیں چھپا دیا ہے۔ وہاں اُمید بر نہ آتی دیکھ کر وہ خود ہی وینڈی کی تلاش میں جُٹ گیا۔ الاسکا میں سخت برف باری ہو رہی تھی۔ ایسے میں وہ اپنی محبوبہ کو کہاں تلاش کرے۔ اس نے کئی پڑوسیوں اور دوستوں کے دروازے کھٹکھٹائے لیکن سب نے انکار میں سر ہلا دیا۔ کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ آخر اس کی اُمید بر آئی۔ وینڈی کی ایک رازدار سہیلی نے اس کا پتہ بتا دیا۔ ہال دوڑتا ہوا اس پتے پر پہنچا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کی آواز سنتے ہی وینڈی دوڑتی ہوئی باہر آئی اور اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے ہال کو بتایا کہ میرا باپ اس شادی کا سخت مخالف ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی ہماری شادی نہیں ہونے دے گا۔ اب ہم کیا کریں اور کہاں جائیں۔ ہال اس کی داستان سن کر ذرا نہ گھبرایا۔ اس نے وینڈی کو اپنے ساتھ لے جانے کا پروگرام بنالیا۔

وینڈی رات کے اندھیرے میں کسی نہ کسی طرح اپنے گھر پہنچ گئی۔ اس کے والدین ایک پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ وینڈی چپکے سے گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے الماری سے اپنے کپڑے نکالے اور گھر سے باہر آکر سیدھی ہوائی اڈے پہنچ گئی۔ ہال وہاں اس کا منتظر تھا۔ دونوں چند ہی گھنٹوں میں ہال کے وطن میں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ہال نے باپ کو اپنے فیصلے سے مطلع کیا۔ باپ کو ان واقعات کی سن گن ضرور تھی لیکن وہ ہال کی شادی کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ ابھی ہال کے کھیلنے کھانے کی عمر ہے۔ اس عمر میں اس پر شادی اور بچے کا بوجھ ڈالنا ظلم تھا۔ اس لئے ہال کے فیصلے کی مخالفت کی لیکن ہال اپنے فیصلے پر اٹل تھا۔ باپ پریشان تھا کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ وہ تمام رات اسی ادھیڑبن میں جاگتا رہا۔ یہ رات اس کی زندگی کی سب سے جاں گداز رات تھی۔ اسے ایک اہم فیصلہ کرنا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم اور دشوار فیصلہ تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہال کی شادی کر دینی چاہئے۔ ایک طرف وہ دادا بننے والا تھا۔ دوسری طرف ہال اور وینڈی کی بے تحاشا محبت تھی۔ وہ ایک دوسرے کو کتنا چاہتے تھے۔ انہیں الگ کرنا ظلم ہوگا۔ صبح ہوتے ہی جب اس نے ہال اور وینڈی کو اپنا فیصلہ سنایا تو وہ دونوں خوشی سے اُچھل پڑے۔ اور اس سے لپٹ گئے۔

شادی کا فیصلہ تو ہو گیا لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ لڑکی کی عمر ۱۸ سال سے کم ہو تو والدین کی اجازت ضروری ہے۔ ہال کے باپ کو علم تھا کہ اسے یہ اجازت کبھی نہیں مل سکے گی۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ ایک جج اس کا قریبی دوست تھا۔ اس نے اسے اپنی بپتا سنائی تو وہ دونوں بچوں کی شادی کرانے کے لئے تیار ہو گیا۔ دوسرے روز دونوں کی شادی ہو گئی۔

ادھر وینڈی کے الاسکا سے چلے جانے کے بعد اس کے والدین پریشان تھے۔ انہیں

معلوم تھا کہ وینڈی کہاں گئی ہے۔ وینڈی کی ماں اپنی بیٹی کا تعاقب کرتے ہوئے فینکس پہنچ گئی۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کے باوجود ٹرپ کا ایک پتہ وینڈی کی ماں کے پاس تھا اس نے وینڈی کو شادی کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کی درخواست پر عدالت میں یہ شادی کینسل ہوسکتی تھی۔ دونوں پارٹیوں میں اس بات پر مباحثہ ہوا۔ آخر وینڈی کی ماں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے بعد وینڈی اور بال کی شادی دوبارہ عدالت میں ہوئی۔ اس بار یہ شادی قانونی تھی۔ اس میں وینڈی کی ماں کی اجازت شامل تھی۔ جج کے سامنے صرف ایک رکاوٹ تھی۔ دونوں کی عمر شادی کے قابل نہیں تھی لیکن وینڈی حاملہ تھی۔ دونوں کا آپس میں بہت پیار تھا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے جج نے کم عمری کے قانون کو نظر انداز کردیا۔

شادی کے بعد وینڈی اور بال اپنے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ ایک ٹریلر تھا۔ یہ دو پہیوں پر ایک چھوٹا سا مکان ہوتا ہے جسے کار کے ساتھ جوڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا ہے۔ یہ ٹریلر مکان کے قریب ہی کھڑا تھا۔ دونوں نے اس میں اپنا گھر بنالیا۔ بال نے اسکول کی تعلیم ختم کرنی تھی وہ اپنے اسکول میں واپس پہنچ گیا جہاں وہ آٹھویں کلاس میں زیر تعلیم تھا۔ وینڈی کو دسویں کلاس میں داخلہ مل گیا چند مہینوں کے بعد اس خاندان میں ایک تیسرے فرد کا اضافہ ہوگیا۔ وینڈی کے یہاں لڑکی پیدا ہوگئی۔ پیدائش کے وقت اس کا وزن ۷ پاونڈ تھا۔ اس کا نام ہیتھر رکھا گیا۔ بچی کی پیدائش کے فوراً بعد بال اسپتال کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے فخر اور حسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنی بچی کو پلنگ سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا۔ اس نے کہا میں دنیا کا سب سے خوش نصیب اور مسرور باپ ہوں۔

امریکہ کی ۵۰ ریاستوں میں آج تک ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ ایک ۱۲ سالہ بچہ خود ایک بچے کا باپ بن گیا ہو۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اتنی کم عمری میں شادی کرنا اور بچہ پیدا کرنا غلط ہے۔ دونوں جب بڑے ہوں گے تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا یہ شادی زیادہ دن نہیں چل سکے گی لیکن بال اور وینڈی کو ان باتوں کی مطلق پرواہ نہیں۔ دونوں اپنی محبت میں مگن ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ لوگوں کو شبہات کو غلط ثابت کردیں گے۔

●

مہربانو

سلور کے برتن صاف کرنے کے بعد آخری بار دھوتے وقت پانی میں تھوڑا سا دودھ ملا دیں اور اس پانی میں برتن ڈال کر نکال لیں۔ آپ دیکھیں برتن میں ایک خاص چمک آجائے گی۔

●

کانچ کے برتن کو دھوتے وقت تھوڑا سا کپڑوں میں دینے والا نیل پانی میں ملالیا جائے تو اس سے برتن کے داغ دھبے صاف ہوجاتے ہیں۔

●

براس کے برتن صاف کرنے کا ایک گھریلو اور آسان نسخہ یہ ہے کہ ایک سنگترا لیں۔ اس کو بیچ سے کاٹ لیں۔ اس کے اوپر تھوڑی سی باریک جلی ہوئی لکڑی کی راکھ ڈال لیں پھر اس سے برتن کو رگڑ لیں۔ برتن میں ایک نئی چمک آجائے گی۔

●

تانبے یا براس کے برتنوں پر کبھی کبھی ہرے رنگ کے دھبے پڑجاتے ہیں۔ ان کو اگر سرکہ اور نمک ملاکر رگڑا جائے تو نہایت آسانی سے صاف ہوجاتے ہیں۔

●

برتنوں کو چمکانے کا ایک طریقہ یہ ہے۔ دو چائے کے چمچے امونیا تھوڑا سا گرم پانی اور سوڈا یا صابن ملائیں۔ اور اس سے برتن صاف کریں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے۔ دو یا تین ٹماٹر لیں۔ ان کا رس نکال لیں اور گودے کا اچھی طرح پیسٹ بنالیں۔ پھر اس میں تھوڑا سا SABAMMONIAC ملالیں۔ اب اس کو سلور کے برتنوں پر لگائیں اور تھوڑی دیر لگا رہنے دیں دو تین منٹ بعد دھولیں۔ اور فوراً سوکھے کپڑے سے برتن صاف کردیں۔

تین نئی کشیدہ کاریاں

(اُردو ہندی میں) قیمت : ۱۸ روپے

(علاوہ محصول)

سارہ کشیدہ کاری

(اُردو ہندی میں) قیمت : ۱۰ روپے (علاوہ محصول)

راسیہ کشیدہ کاری

(اُردو ہندی میں) قیمت : ۱۲ روپے (علاوہ محصول)

اگر آپ کپڑے کو کشیدہ کاری کے اچھے ڈیزائن سے مزین کریں تو اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور محفل میں آپ کے کپڑوں کو غور سے دیکھا جاتا ہے۔

کشیدہ کاری کے نمونے دیدہ زیب، خوب صورت اور نظر فریب ہونے چاہئیں۔ علاوہ ازیں جدید دور کی تبدیلیوں کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہو تو پھر آپ سوسائٹی میں منفرد حیثیت کی حامل ہو جائیں گی۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کے پاس جدید وضع کے ڈیزائن ہوں۔ اِن تینوں کشیدہ کاریوں میں موڈرن ڈیزائن، ہر قسم کی بیلیں، کرتوں کے گلے، ساڑیوں کے بوڈر، کٹ ورک غرض یہ کہ آپ کی ہر ضرورت کے ڈیزائن ان میں موجود ہیں۔

اِن کے علاوہ مختلف ڈیزائن کی کشیدہ کاریاں

بانو کشیدہ کاری ۱۵ روپے   فردوس کشیدہ کاری ۱۲ روپے   زینت کشیدہ کاری ۱۴ روپے   شمع کشیدہ کاری ۱۰ روپے۔

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ٹھنڈے اور گرم رنگوں کو پہچانئے

شفیق ریاض

رنگوں کے معاملے میں ایک حقیقت یہ ہے کہ دراصل رنگوں کا کوئی وجود نہیں۔ صرف ایک رنگ سچا ہے۔ باقی سب نظر کا فریب ہے۔ یہ سچا رنگ سفید ہے۔ جب ہم کسی رنگین لٹو کو زور سے گھماتے ہیں تو اس کا رنگ بھی سفید ہو جاتا ہے۔ جوں جوں لٹو کی رفتار کم ہوتی ہے اس کے رنگ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ رنگ کئی چیزوں سے مل کر بنتے ہیں اس میں ہماری آنکھ کا شیشہ، ہوا کا دباؤ اور بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ قوس قزح کو دیکھ کر اس بات کا ثبوت مل جاتا ہے فضا میں سات رنگوں کی بہار دل کو فرحت بخشتی ہے۔

دھنک، اصل پانی کے ننھے ننھے قطرے ہوتے ہیں جو سورج کی روشنی کو زمین پر منعکس کرتے ہیں۔

رنگ کے ماہرین نے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک گرم اور دوسرا ٹھنڈا۔ ان دونوں کے بیچ میں سفید رنگ ہے۔ جو غیر جانبدار ہے۔ گرم رنگوں کی فہرست میں لال، عنابی، بھورا اور زرد رنگ آتے ہیں۔ لال کے ضمنی رنگ گلابی، مرکری، نارنجی، فالسئی وغیرہ ہیں۔ بھورے رنگ میں چاکلیٹی کتھئی اور ہلکا براؤن رنگ شامل ہے۔ زرد میں بسنتی، بسکٹی کریم اور فاختئی رنگ شامل ہیں۔ یہ سب رنگ گرم ہیں۔ اس لئے انہیں جاڑے میں پہننا چاہئے۔ ٹھنڈے رنگوں میں نیلا اور سبز رنگ شامل ہیں۔ ان میں آسمانی دھانی لاجوردی۔ فیروزی گہرے اور گہرا سبز رنگ شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لباس گرمیوں میں پہننے چاہئیں لباس زیب تن کرتے وقت موسم کا ضرور خیال رکھیں۔

ٹھنڈے اور گرم رنگ بھی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک ہلکا اور دوسرا گہرا ہلکے اور گہرے رنگوں میں یہ فرق ہے کہ یہ دھوپ کی شعاعوں پر مختلف اثر ڈالتے ہیں۔ ہلکا رنگ اور خاص طور پر سفید رنگ روشنی کو خواہ سورج کی ہو یا بجلی کے بلب کی باہر کی طرف منعکس کرتا ہے۔ سفید رنگ کا لباس زیب تن ہو تو حرارت جو روشنی کا جزو ہے بدن میں پہنچنے نہیں پاتی۔ اس لئے لوگ اکثر گرمیوں میں سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں لٹھا، ململ، کیمبرک لون اور ٹوریا سفید رنگ میں ملتے ہیں۔ پاپلین اور ڈریا وائل بھی سفید ہی پسند کی جاتی ہے۔ سفید رنگ کے ساتھ اتنی رعایت ضرور برتی جاتی ہے کہ اس کے بجائے کریم۔ زرد، بسکٹی بسنتی یا بادامی کلر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سارے ہلکے رنگ ہیں اور سورج کی روشنی کو باہر کی طرف منعکس کرتے ہیں۔

اس کے برعکس جاڑوں میں گہرے رنگ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان میں سورج کی روشنی کو جذب کرنے کی طاقت ہوتی ہے سائنس کی اس دریافت سے پہلے لوگوں کو یہ بات معلوم تھی۔ وہ جاڑوں میں اکثر گہرے رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔ سیاہ رنگ میں حرارت جذب کرنے کی طاقت سب سے زیادہ ہوتی

ہے۔ سردی میں لوگ اسی لئے سیاہ اچکن کا
انتخاب کرتے ہیں۔ اگر آپ جاڑے میں اونی
لباس پہنیں اور اس کا رنگ ہلکا ہو تو آپ اون
سے تو گرمی حاصل کرلیں گے لیکن سورج کی گرمی
آپ کے جسم تک نہ پہنچ سکے گی۔ اس کے
برعکس اگر آپ سیاہ یا براؤن سوتی قمیص پر ہی
اکتفا کریں تو آپ کو اون کی گرمی تو نہ مل سکے گی
لیکن سورج کی حرارت آپ کے جسم تک پہنچ
جائے گی۔ ایک لڑکی جو جاڑوں میں سفید کپڑے
پہن کر پھرتی ہے رنگ کے ماہرین کے نزدیک
بے وقوف سمجھی جائے گی۔ یہی اندازہ اس لڑکی
کے متعلق لگایا جائے گا جو گرمیوں میں گہرے
رنگ کے کپڑے پہنتی ہے۔

چھتری کے موجد نے یہ معلوم کیوں
سیاہ کپڑے کا انتخاب کیا۔ جاڑے کی
دھوپ سے بچنے کے لئے سیاہ چھتری کا
استعمال مناسب ہے۔ اس طرح سورج کی
گرمی چھتری کے کپڑے میں جذب ہو کر جسم کو
سینک پہنچاتی ہے۔ لیکن جاڑے میں چھتری
کون استعمال کرتا ہے۔ سائنس دانوں کے
نزدیک چھتری دو رنگوں کی ہونی چاہئے اوپر کا
رنگ سفید ہو تاکہ وہ گرمی کو باہر کی طرف پھینکے اور
اندر کا رنگ سبز ہو تاکہ وہ جسم کو ٹھنڈک پہنچائے۔
عورتیں اس معاملے میں خوش نصیب ہیں کیوں کہ
وہ سیاہ چھتری کا استعمال نہیں کرتیں سیاہ
چھتری مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ عورتوں
کی چھتریاں ہلکے رنگ کی ہوتی ہیں۔ چھتری کی یہ
وضع سائنٹفک ہے مگر مرد شرم کے مارے
زنانی چھتری استعمال نہیں کرسکتے۔ اس لئے
دھوپ میں جلتے بھنتے رہتے ہیں۔ ہاں ٹریفک
کا کانسٹیبل ضرور چھتری کا استعمال کرتا ہے۔
لیکن یہ چھتری حکومت دیتی ہے۔ بازار میں عام
طور پر سفید چھتری دستیاب نہیں ہوتی۔

رنگوں کا امتزاج بھی ان کی خاصیت
کو بدل دیتا ہے۔ لال رنگ گرم ہوتا ہے اور
نیلا ٹھنڈا۔ دونوں رنگ ملائے جائیں
تو قاسنی رنگ بن جاتا ہے اس طرح ایک
معتدل کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ زرد اور
نیلا ملانے سے سبز رنگ بن جاتا ہے۔

سیاہ رنگ ایک عجیب چیز ہے یہ سارے
رنگوں پر چھا جاتا ہے۔ اسے کنٹراسٹ کے لئے
استعمال کیا جاتا ہے بہت زیادہ گورے رنگ
پر خوب پھبتا ہے۔ سیاہ اچکن میں سفید رومال
لگایا جاتا ہے تو ڈنر سوٹ میں سفید پھول۔ اگر
سانولی لڑکیاں سیاہ کپڑا استعمال کریں گی تو
اوپر سے نیچے تک سیاہ معلوم ہوں گی۔ انہیں
شوخ اور چمکیلے کپڑے پہننے چاہئیں۔

لباس پر رنگوں کے بیل بوٹے اور لکیریں
بھی توجہ کی مستحق ہیں۔ اگر آپ کا قد چھوٹا ہے تو
افقی لکیروں والا لباس نہ پہنیں اس سے آپ
کا قد اور چھوٹا معلوم ہوگا۔ ایسا لباس پہنیں
جس میں لائنیں اوپر سے نیچے آتی ہوں۔ اس سے
قد لمبا معلوم ہوگا۔ لمبی عورتیں اپنے قد کو زیادہ
نمایاں کرنا چاہیں تو یہی لباس آزما سکتی ہیں۔ قد
بہت لمبا ہو تو آڑی ترچھی اور افقی لائنوں والا
لباس پہنیں۔ موٹی عورتیں بڑی بڑی بوٹیوں والا
لباس نہ پہنیں اس سے موٹاپا اور نمایاں ہوگا
انہیں چھوٹی اور ہلکی بوٹیوں والا لباس پہننا چاہئے۔
موٹی عورتوں کو تنگ لباس بھی نہیں پہننا چاہئے
دبلا دکھائی دینے کی کوشش میں وہ اور زیادہ
موٹی اور مضحکہ خیز معلوم ہوں گی۔ انہیں تھوڑا
ڈھیلا لباس پہننا چاہئے۔

لباس کے بعد گھر کی سجاوٹ کا نمبر آ
ہے۔ اس بارے میں بھی رنگوں سے واقفیت
ضروری ہے۔ اگر آپ کا کمرہ روشن اور ہوادار
اس میں دھوپ آتی ہے تو اسے گرم رنگ سے
اور گرم نہ بنائیں۔ اس پر ٹھنڈے رنگوں ک
پینٹ کریں۔ ہلکا نیلا آسمانی یا ہلکا سبز استعما
کریں ٹھنڈے اور نسبتاً اندھیرے کمر
میں ہلکے اور گرم رنگ استعمال کریں۔ مث
کریم، بسکٹی، خاکی یا ہلکا گلابی رنگ۔ سفید
رنگ سے بھی کمرہ روشن معلوم ہوتا ہے۔

سونے کے کمرہ میں گرم رنگ ہو گا تو نیند مشکل سے
آئے گی۔ ٹھنڈے رنگ خواب آور ہوتے ہیں۔
ان کمروں میں ہلکا نیلا آسمانی یا ہلکا سبز رنگ
کرائیں یہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔

اگر آپ کا کمرہ چھوٹا ہے تو اس میں ایک
رنگ کرائیں۔ رنگ ہلکا ہو مگر رنگ کراتے
وقت یہ التزام رکھیں کہ دیواریں چھت حتیٰ
دروازے کھڑکیاں اور الماریاں بھی ایک ہی
رنگ کی ہوں۔ اگر دروازے کھڑکیاں الگ ا
کے رنگ کے ہوئے تو رنگ کی رفتار رک
جائے گی۔ جب سارا کمرہ ایک رنگ کا ہوگا
تو وہ بڑا معلوم ہوتا ہے۔ کمرے کا رنگ سفید
گہرے یا آسمانی ہو تو بہتر ہے۔

کمرے میں رنگ کراتے وقت اس
بات کا خیال رکھیں کہ فرنیچر، الماریاں، بستر اور
پردے کس رنگ کے ہوں۔ آپ کی کلر اسکیم
اس طرح کی ہونی چاہئے کہ جو دیکھے آپ کے
ذوقِ سلیم کی داد دے۔ کمرے کے مختلف رنگوں
میں بہتر تو یہ ہے کہ ایک ہی رنگ ہلکے اور بھاری
شیڈ استعمال کئے جائیں مثلاً اگر دیوار کا
رنگ ہلکا نیلا ہو تو پردے گہرے نیلے یا زنگا

ہوں۔ جیسے سیٹ بھی اسی شیڈ میں ہوں۔ بستر کے چادریں اور تکئے بھی انہیں شیڈ میں ہوں۔ اگر آپ دیواروں پر رسیلا بسکٹی، یا کریم کلر کرانا چاہتی ہیں تو آپ کو باقی رنگ بھی گرم استعمال کرنے چاہئیں۔ لیکن شیڈ ہلکے — بھاری ہوں مثلاً زرد دیوار کے لئے لال قالین عنابی پردے اور براؤن فرنیچر ہونا چاہئے۔

ایک ہی کلر کے ہلکے بھاری شیڈ کے علاوہ کنٹراسٹ یعنی مخالف رنگ کا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے مہارت اور ذہانت کی ضرورت ہے۔ اگر کنٹراسٹ غلط ہو تو ذوقِ سلیم پر گراں گزرے گا۔ مثلاً اگر سبز پردے کے ساتھ لال قالین اور براؤن پردے کے ساتھ نیلی دیوار ہوگی تو دیکھنے والا آپ کے ذوق کا ماتم کرے گا۔

بہتر کنٹراسٹ یہ ہیں۔ زرد اور نیلا اگر صوفے کی سیٹ اور پشت پر الگ الگ رنگ کا کپڑا چڑھانا چاہتی ہیں تو سیٹ نیلے رنگ کی اور پشت زرد رنگ کی ہو سکتی ہے۔ نیلے اور گہرے لال کا کنٹراس بھی چل سکتا ہے لیکن یہ کنٹراسٹ صوفے اور بستر تک ہی محدود رہے تو بہتر ہے۔ دیواروں اور پردوں پر کنٹراسٹ کا عمل نہ دہرائیں۔

اگر آپ کو کوئی خاص رنگ مرغوب ہو تو دل کھول کر اسے استعمال کریں۔ گھر کی سجاوٹ میں سارا سامان پردے، قالین، میز کرسی، پلنگ پوش غرض ہر چیز ایک ہی رنگ کی ہو سکتی ہے لیکن اس کو اُجاگر کرنے کے لئے ایک ترکیب استعمال کرنی پڑے گی۔ مثلاً اگر سارا کمرہ گہرے رنگ سے بھر گیا ہے تو اسے اُجاگر کرنے کے لئے ایک سرخ رنگ کا گلدان۔ یا تانبے کی پیالی رکھ دیں تاکہ گہرے رنگ کی یکسانیت ختم ہو جائے۔ گہرے اور لال کا کنٹراسٹ اس رنگ میں چار چاند لگا دے گا۔ یہ ترکیب ہر رنگ پر استعمال کی جا سکتی ہے۔ اگر کمرہ ہلکا نیلا ہے تو بھی سرخ رنگ کی کوئی چیز کمرے کے کونے میں رکھ دیں۔

آج کل ایک نیا کلر مارکیٹ میں آیا ہے اسے آف وائٹ کہتے ہیں۔ یہ سفید رنگ نہیں بلکہ سفیدی مائل ہے۔ گلابی رنگ آج کل آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے۔ یہ کچ کل نانا رنگ سمجھا جاتا ہے۔

●●

میرا پسندیدہ شعر

منزل تلاش کرتے ہیں منزل کے آس پاس
کشتی ہماری ڈوبی ہے ساحل کے آس پاس
(نامعلوم) محمد شہاب الدین سعید، لہریاسرائے بہار

●

ملول تھا دلِ آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہوا تو خراش بھی نہ رہی
(فیض احمد فیض) عطیہ شاہین صدیقی، لکھنؤ

●

وہ عکس بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے
(بیگم ممتاز مرزا) فرخ مصطفےٰ جامعہ نئی دہلی

رہے جو یاس سے محفوظ ڈھونڈ ایسی تمنا کو
نہ ہو حسرت کا جس کو خوف وہ ارمان پیدا کر
(رشاد عظیم آبادی) ایس شاہین مغل پورہ حیدرآباد

●

تجھ کو دکھ کہ مری چارہ گری کیسے ہو
مجھ کو یہ غم ہے مرے زخم نہ بھر جائیں کہیں
مہ جبیں قریشی، صدر بازار دہلی

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر
(اقبال) مہر بانو، دہلی

●

بہت پہلے ترے قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
(فراق گورکھپوری) مس صدیقہ آفریں، شکرانوی

●

لالہ رخوں کی بھیڑ میں کس کس کو میں چُنوں
اس ذوقِ انتخاب نے رُسوا کیا مجھے
(ساغر نظامی) مہرالنساء، کرجگی گلی پرانی دہلی

اس وقت آپ کو کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے —

ایسا شعر جسے آپ بار بار سننا یا گنگنانا چاہتی ہیں؟ اس شعر کے حُسن، اثر اور کیفیت میں دوسروں کو بھی شریک کیجئے۔ جس کارڈ یا کاغذ پر آپ اپنا پسندیدہ شعر لکھ کر بھیجیں، اس پر اپنا نام، پتہ ضرور درج کریں۔ اگر معلوم ہو تو شاعر کا نام بھی تحریر کریں۔ "میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ذہنی ورزش

انعام:
ایک سوان پریشر کوکر

اپنی ذہانت کو آزمائیے، اپنی معلومات کا امتحان لیجئے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوان پریشر کوکر حاصل کرسکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوئے تو انعام پانے والے کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔
۱۵ مارچ ۱۹۸۵ تک ہمیں ملنے والے جوابات اس مقابلے میں شریک ہوسکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر ۳" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۔ ہندوستانی قانون جو شاردا ایکٹ کے نام سے مشہور ہے، کس سماجی برائی کے خلاف ہے؟

۲۔ ایورسٹ کی چوٹی پہلی بار کس نے سَر کی؟

۳۔ انڈین اسکول سرٹیفکیٹ امتحان کا سابق نام کیا تھا؟

۴۔ بچوں کے نئے ذریعۂ تعلیم کی موجد میڈم مانٹی سوری کس ملک کی رہنے والی تھیں؟

۵۔ اُردو ناول "ٹیڑھی لکیر" کس نے لکھا ہے؟

۶۔ وامق عذرا کی رومانی داستان کس ملک سے متعلق ہے؟

۷۔ کون سی خاتون بُلبلِ ہند کے نام سے مشہور تھیں؟

۸۔ اُردو کا پہلا غزل گو شاعر کون تھا؟

۹۔ چیچک کا مرض دنیا کے کون سے ملک میں باقی ہے؟

۱۰۔ حبّہ خاتون کا تعلق ہندوستان کے کس صوبے سے تھا؟

● "ذہنی ورزش نمبر ۲" اور "ذہنی ورزش نمبر ۳" دونوں کا نتیجہ بانو: اپریل ۱۹۸۵ میں شائع ہوگا۔

کیا کچھ نہیں تھا جہیز میں۔
سُوئی سے دھاگے سے لے کر فریج اور اسٹیل کی الماری تک مکمل گرستی تھی۔ بلکہ ایک نہیں، دو دو گرہستیاں کیوں کہ بہت سی چیزیں ایسی تھیں کہ دو دو تھیں۔ مثلاً ریڈیو دو، پریشر ککر دو، ساس پین دو، سنگھار دان دو، ہیٹر تو دو نہیں تین اور بھی ان گنت چیزیں تھیں جو ایک سے زیادہ تھیں۔ بات یہ تھی کہ ایک ایک چیز اگر جہیز میں تھی تو دوسری جوڑ رہی تھی، تحفے میں آئی تھی۔

لمبا چوڑا ہال جہیز کے سامان سے اس طرح بھرا تھا کہ اب اس میں کوئی بھی چیز رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ چاروں طرف نائلن کی ڈوریاں باندھ کر الگنی سی بنائی گئی تھیں جن پر بیش قیمت ساڑیاں، جگ مگ کرتے غرارہ سوٹ اور دیدہ زیب شلوار سوٹ ٹنگے تھے۔ ان کے ساتھ ہی خوب صورت بیڈ کور، تکیے کے غلاف میز پوش، ٹرے کور، ٹی کوزیاں اور تولیے بھی لگے ہوئے تھے۔ فوم کے گدوں اور ایرانی مخمل کے تکیوں نے ڈبل بیڈ کی شان بڑھا دی تھی ساتھ ہی شنیل کے لحافوں نے دیکھنے والوں کو بار بار اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ صوفہ سیٹ شان دار قالین کے اوپر سجا تھا تو رنگین ٹی وی آبنوسی سنگھار میز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ دیوار کی گھڑی شاید باہر کی تھی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھی ٹائم پیس بھی فارن کا مال تھی۔ مشین کے ساتھ ٹیبل فین چمک رہا تھا اور ڈائننگ ٹیبل کی چمک دار سطح لوگوں کو اپنے چہرے دیکھنے کے لئے اشارے کر رہی تھی۔ لمبے چوڑے ٹرنک اور چھوٹے بڑے کئی سوٹ کیس اوپر تلے دھرے تھے۔ لیمن سیٹ کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا اور پھر ٹی سیٹ، ڈنر سیٹ، کافی سیٹ

لوگ حیرت اور مسرت سے جہیز دیکھتے اور آپس میں باتیں کرتے۔

"بھئی، بہت جہیز دیا ہے زیدی صاحب نے اپنی بیٹی کو۔"

"جواب نہیں ہے صاحب۔ اس شہر میں کم از کم کسی لڑکی کو ابھی تک اتنا جہیز نہیں ملا۔"

"شادی بھی بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوئی ہے۔"

"کیا کہنا جناب۔ برسوں یاد رہے گی یہ رونق، یہ دھوم دھام، یہ شان اور یہ کھانا!"

"واقعی جواب نہیں تھا کھانے کا۔ اصلی گھی میں پکا ہوا قورمہ اور بریانی اور سیخ کے کباب اور ان کے ساتھ مہکتی ہوئی شیرمالیں اور پھر

پستہ، بادام کے رس گلّوں سے بھرا ہوا زردہ۔ پھر کھانے کے بعد خالص دُودھ کی کافی۔ ہر خاص و عام کے لئے برابر کا سلوک۔ کسی کو شکایت نہیں، کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہیں۔ یہ عالم تھا کہ براتیوں کے کھانے کے بعد پورا شہر کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ "اور لا" "اور لا" کی صدائیں بلند تھیں اور ساقی کی فیاضی دیکھنے کے لائق تھی۔ ایک طرف سبزی خور صاحبان کے لئے انتظام تھا۔ کئی طرح کی سبزیاں، پوریاں، کچوری، مٹھائیاں، رائتہ، مٹر پلاؤ۔ زیدی صاحب ہر شخص کے پاس جاتے، کھانے کے لئے اصرار کرتے، پھر ان کی نگاہ دُولہا پر جم جاتی۔ مانا کہ وہ اس شادی میں لُٹ گئے تھے اور دو لڑکیوں کی شادیوں کا بھوت ابھی سامنے ناچ رہا تھا، پھر بھی لڑکا ان کو لاکھوں میں ایک ملا تھا۔

خوب صورت اور تن درست بھی اور انجینیئر بھی قسمت نے یاوری کی تھی کہ رشتہ طے ہو گیا تھا، ورنہ اس لڑکے کے بھاؤ بڑے اونچے تھے۔ بعض وقت ایسا لگتا تھا کہ ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکے گا لڑکے کے والد کی مانگیں بڑھتی ہی جاتی تھیں۔ عین بیعت پر بھی انہوں نے اسکوٹر کی مانگ کر دی تھی وہ تو کہو خود لڑکے نے یہ کہہ کر ان کی رُکی ہوئی سانس پھر جاری کر دی تھی کہ اسکوٹر وہ ابھی نہیں پھر کسی موقع پر لے لے گا۔ پھر بھی کی تلوار گویا کسی بال سے بندھی لٹک رہی تھی، خیر، دیکھا جائے گا اور کچھ نہیں تو بیگم کے زیورات فروخت کر دئے جائیں گے۔ فی الحال تو عزت و آبرو کے ساتھ لڑکی کو رخصت کرنا ہے۔ ان کے چہرے کی جھرّیوں میں اضافہ ہو گیا تھا، پھر بھی وہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دولہا کے والد کے سامنے بچھے جا رہے تھے: بات بات پر ہاتھ جوڑ رہے تھے۔

وہ ایک طرف بیٹھا خاموشی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

رات کی جاگ اس کی آنکھوں میں گلال بنی ہوئی تھی اور تکان نے اس کے خوب صورت چہرے کی کشش کو ایک نیا رنگ عطا کر دیا تھا بیلے اور گلاب کے لمبے گھنے سہرے کو اس نے اپنے سر پر لپیٹ لیا تھا اور گرمی سے تنگ آ کر سنہری سلکن شیروانی کو اتار کر کرسی پر ڈال دیا تھا۔ علی گڑھ کاٹ کے پاجامے پر کھجور سے رنگ کا کرتا پہنے وہ بڑی بے تکلفی سے بیٹھا ہوا تھا۔ بڑے سے پنڈال میں مرد کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور قناتوں کے پیچھے عورتوں کی سُریلی چیخیں اور نازک قہقہے اُبھر رہے تھے۔ دُلہن کی سہیلیاں بار بار اس کے پاس آتیں، مذاق کرتیں اور ہنستی کھلکھلاتی بھاگ جاتیں۔ لال، پیلے، فالسئی، فراک سوٹ اور شلوار سوٹ میں ملبوس۔ گوری، سلونی، موٹی، دبلی، چھریری لڑکیاں۔ خوشی سے کھلنا رہیں اور ہنستی ہوتی۔ ان کی آنکھوں میں خواب دمک رہے تھے۔ ایسے ہی ایک خوب صورت دن کا تصور ان کے دلوں کو گُدگُدا رہا تھا۔ ان لڑکیوں میں دُلہن کی دونوں چھوٹی بہنیں بھی تھیں۔ سانولے رنگ کی پُر کشش لڑکیاں منجھلی کا نقشہ بے حد تیکھا اور جاذبِ نظر تھا۔ براؤن رنگ کا پرنٹڈ شلوار سوٹ اس پر خوب کھل رہا تھا۔ چھوٹی ذرا دبے سلونے رنگ کی تھی جسم بھی بھرا بھرا تھا اور نقشہ کچھ بھدا تھا۔ پھر بھی بُری نہیں تھی۔ اس کی دُلہن البتہ بے تحاشا گوری تھی اور بڑے ہی خوب صورت نین نقش کی مالک تھی اس نے شادی سے پہلے ایک تقریب میں اس کو دیکھا تھا اور پسند کیا تھا، پڑھنے سے ظاہر کی وہ لڑکی بڑی ہنس مکھ اور خوش مزاج بھی تھی۔ اسے اپنی قسمت پر جس قدر ناز ہوتا کم تھا۔

حسین اور ہنس مکھ دُلہن اور اتنا سا جہیز۔ اس کے ابّا نے گویا اس کی پوری پوری قیمت وصول کر لی تھی۔ یہ شادی ان ہی کی مرضی اور پسند سے ہوئی تھی۔ انہوں نے کئی ماہ زبردست کھوج کے بعد پتہ لگایا تھا کہ لڑکی کے والد بڑی تگڑی آسامی ہیں۔ نہ صرف خاصا نقد روپیہ ان کے ہاتھ آئے گا، بلکہ ٹرک بھر کر جہیز بھی ملے گا۔ ایک ساتھ کئی جگہ انہوں نے رشتے کی بات چلا رکھی تھی سب سے زیادہ آسانی سے ہڑپ کر لینے والا لقمہ تر زیدی صاحب ہی تھے۔ جس قدر سیدھے اور نیک وہ تھے اتنی ہی ان کی بیگم بہت جلد بات مان لینے والی ہتھیار ڈال دینے والی اور شیشے میں اُتر جانے والی ہستی تھیں۔ جو دُولہا کے والد نے کہا، انہوں نے مان لیا۔ اس کو اپنے والد کی زیادتی کا پوری طرح احساس تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ لڑکی کی شادی اعلیٰ پیمانے پر کرنے کے لئے زیدی صاحب نے اپنی عمر بھر کی خون پسینے کی گاڑھی کمائی پانی کی طرح بہا دی تھی اور اب دوسری لڑکیوں کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ اپنی دُبلی پتلی سیدھی سادی سی خوش دامن کو دیکھ رہا تھا جو اس کی ہونے والی تازہ تازہ اور نک چڑھی پھوپی اور کرخت چہرے والی خالہ اماں کی خوشامد میں لگی ہوئی تھیں۔

رخصتی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ پان اور الائچی کی طرح

محفل میں گردش کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے رشتہ دار جوانی کو سے بیڑی پیتے تھے بھی سو دفعہ سوچتے تھے قیمتی سگریٹوں کا مہکتا ہوا دھواں اُڑا اُڑا کر قہقہے لگا رہے تھے۔

پھر اس نے دیکھا کہ زیدی صاحب اس کے والد کے سامنے انکساری اور فرماں برداری کا پیکر بنے کھڑے ہیں اور اس کے والد حکمانہ انداز میں کہہ رہے ہیں: "جی ہاں، جہیز کو لے جانے کے لئے ٹرک کا انتظام آپ ہی کو کرنا ہوگا اور جہیز کو قاعدے سے پیک کرانا بھی آپ کا کام ہے اور جناب عالی ٹرک کا کرایہ بھی آپ ہی کو دینا ہوگا"

"جی — جی ہاں:" زیدی صاحب کی آواز رک رہی تھی: "ضرور یہ سب میرا فرض ہے۔ آپ فکر نہ کیجئے۔"

"جہیز میں ایک چیز کی کمی رہ گئی صاحب" انہوں نے آنکھیں چمکائیں اور پان کی خوشبودار پیک زور سے تھوکی۔

"کمی؟ کیسی کمی؟ کس چیز کی کمی؟"

زیدی صاحب کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

"ٹیبل فین تو دو دے آپ نے — سیلنگ فین ایک بھی نہیں دیا۔"

"جی؟" زیدی صاحب کو شاید چکر آنے لگا تھا، کیوں کہ انہوں نے قنات کا سہارا لے لیا تھا۔

"اگر اس کا انتظام بھی کر دیتے تو بہتر ہوتا" یہ کہہ کر کسی جواب کا انتظار کئے بغیر وہ آگے بڑھ آئے۔ سیدھے اپنے بیٹے، یعنی دولہا کی طرف۔

"ٹھیک کیا نا میں نے؟" انہوں نے جھک کر سرگوشی کی: "سیلنگ فین ضروری ہے — ہے نا؟"

"ٹھیک ہے ابو—" اس نے ایک گہری سانس لی: "مگر آپ نے اپنے خستہ مکان کے ان بوسیدہ کمروں کا خیال بھی فرمایا جن کی چھتیں اس قابل نہیں ہیں کہ سیلنگ فین کا بوجھ اٹھا سکیں۔"

"واہیات بات:" ابو ناراضگی سے بولے: "ہم اس نقد رقم سے سب سے پہلے کمروں کی چھتیں پکی کرائیں گے۔" پھر ان کا چہرہ چمک اٹھا۔ خوشی سے کپکپاتے لہجے میں بولے: "میں نے سنا ہے سلامی میں چھ ہزار مل رہے ہیں۔ پورے چھ ہزار۔ مکان کافی حد تک درست ہو جائے گا!"

"ہوں!" اس نے دھیرے سے کہا اور زندگی میں پہلی بار اس کو اپنے ابو پر غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا کہ ابو سے پوچھے: ابو ابھی آپ کے پاس بھی ایک بیٹی ہے جس کی شادی کرنا ہے۔ آپ بھی بیٹی کے باپ ہیں، مگر وہ ان کے سامنے بول نہ سکا۔ اس کے والد ساری زندگی ایک سخت گیر قسم کے ٹیچر رہے تھے۔ گھر میں بھی اپنے کو ماسٹر ہی سمجھتے تھے۔

اس کی خالہ اور امی سرگوشیاں کرتی اس کے قریب آگئی تھیں۔

"بہت جہیز ہے بھئی۔ اور دوہرا دوہرا ہے۔ ہمیں اتنی امید نہیں تھی۔" امی کہہ رہی تھیں: "میری تو ساری فکریں دور ہو گئیں۔" انہوں نے اپنا موٹا ہاتھ لہرایا تو چوڑیاں کھنک اٹھیں۔

"کیسی فکریں؟" خالہ نے پوچھا۔

"اے یہی رخسانہ کے جہیز کی۔ دن رات کی نیند اور چین حرام تھا۔ اب بھلا کاہے کی فکر۔"

امی ہنسیں: "یہ سارا جہیز ایک کمرے میں بند کر دوں گی۔ ان شاء اللہ اب یہ جوں کا توں رخسانہ کے ساتھ جائے گا کیوں اجو؟" انہوں نے دولہے سے پوچھا۔

وہ کچھ جواب نہ دے سکا بس اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"ارے بے، دولہا میاں بڑے بے تاب ہیں۔ دوڑے دوڑے پھرتے ہیں" کسی طرف سے آواز آئی۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے رشتے کی ایک سلج شرارت سے ہنستی چلی جا رہی تھی۔ اسی وقت اندر کسی نے ڈھولک ٹھنکائی۔ کئی سُریلی، کھنکتی ہوئی آوازیں اٹھیں اور فضا پر چھا گئیں۔

بنا بیٹھا ہے سالیوں سے جھگڑا مچاتا ہے
بنا کیا مانگے جلدی سے تازہ تیلو نگے

اس کے سامنے ایک پیارا سا چہرہ آگیا۔ گورا سرخ، معصوم چہرہ، ابھرے ہوئے گلابی ہونٹ، پتلی خوب صورت ناک۔ آئینہ سی پیشانی۔ گہری گہری آنکھیں۔

آرسی مصحف کے وقت اس کے اور دلہن کے اوپر ایک لال دوپٹہ ڈال دیا گیا۔ دونوں کے درمیان قرآن شریف تھا اور خوب صورت منقش آئینہ۔ سورہ اخلاص پڑھنے کے بعد اس کو ہدایت ملی کہ دلہن کا چہرہ آئینے میں دیکھے۔ اس نے بڑے اشتیاق کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر دلہن کے چہرے پر پڑی پھولوں کی لڑیاں ہٹائیں اور آئینے کی بجائے اس کے آئینے سے چہرے پر نظریں جما دیں۔ اس کی بہن دوپٹے میں جھانک رہی تھی۔ ہنس کر اس نے چٹکی لی: "ارے بھائی

جان، آئینے میں دیکھیے، آئینے میں!"

"جی ہاں آئینے میں، مگر صرف دیکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ کچھ کہنا بھی پڑے گا۔" دُلہن کی ممانی بولیں۔

"کیا کہنا پڑے گا؟" اس نے پوچھا۔

آئینے کے فریم میں دُلہن کا حسین چہرہ کسی شاہ کار کے مانند جڑا ہوا تھا۔ پتلی سی ناک میں سونے کی نتھ۔ ماتھے پر جڑاؤ ٹیکہ۔ مانگ میں افشاں۔ رخساروں پر لالی۔ بے حد حسین۔ بے حد پُرکشش۔ بڑی ہی معصوم۔

"کیا کہنا ہے؟" اس نے کچھ بے قراری سے پوچھا۔

"یہی: بیوی آنکھیں کھولو، میں تمھارا غلام ہوں۔" چہکتی ہوئی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی ان گنت قہقہے اُبھرے۔

"ہاں بھئی، یہ تو کہنا ہی پڑے گا۔"

"نہیں کہو گے دُولہا میاں تو دُلہن آنکھیں نہیں کھولے گی۔"

"کہہ دیجیے بھائی جان۔ رسم ہے یہ۔" بہن نے سرگوشی کی۔ "آپ کے بہنوئی نے بھی کہا تھا۔"

وہ ہنس پڑا۔ دھیرے سے اس نے کہا۔

"بیوی آنکھیں کھولو، میں ......!"

مگر اس کے غلام کہنے سے قبل ہی دُلہن نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آئینے میں اس کی نظریں دو گہری جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب گئیں۔ وہ ڈوب گیا۔ کھو گیا۔

"بس!" ایک ہاتھ بڑھا اور دُلہن کے چہرے پر سہرے کی لڑیاں پھر لرزنے لگیں۔

پھر اور بھی کئی دل چسپ رسمیں ہوئیں۔ اور دُلہن کو ایک لڑکی گود میں اُٹھا کر لے گئی۔

اس کی دُلہن تو بے حد خوب صورت ہے، لیکن دونوں بہنیں معمولی صورت کی ہیں۔ اس ایک شادی میں زیدی صاحب کنگال ہو گئے ہیں۔ اب وہ شاید ان دونوں لڑکیوں کو اتنا جہیز نہ دے سکیں۔ یہ دھوم دھام نہ کر سکیں۔ اتنی شان دار ضیافت نہ کر سکیں۔ پھر کیا ہوگا ان لڑکیوں کا؟ کون پوچھے گا انھیں؟ کون دروازہ کھٹکھٹائے گا ان کا؟ کون آئے گا ان کے خوب صورت خوابوں میں؟ کون بسے گا ان کے معصوم ارمان بھرے دلوں کی دھڑکنوں میں؟ اور یہ دونوں بے چارے ماں باپ۔ تب کیا کریں گے؟

وہ ٹہلتے ٹہلتے رُک گیا۔ جہیز کے کمرے میں اس کے خاندان والے بھرے پڑے تھے۔ ندیدوں کی طرح ایک ایک چیز کو چھوتے اور دیکھتے ہوئے۔

"یار لگتا ہے ہمیں یہاں سے ایک آدھ لڑکی کو اور لے جانا پڑے گا۔" اس کا ماموں زاد بھائی کہہ رہا تھا۔

"ہاں یار، ٹرک بھر کر جہیز جو لینا ہے۔" پھوپی زاد بھائی کہہ رہا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو لڑکو!" اس کے ابّو نے ان دونوں کو جھڑکا۔ "اب زیدی کے پاس ہے کیا جو دیں گے؟ ویسے بھی ملک میں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے — لڑکیوں کی بھی اور جہیز کی بھی۔"

اس کو ایسا لگا جیسے ابّو نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے، آگ کی لاتعداد چنگاریاں تھیں جو ہر سمت بکھیر دی تھیں۔

"سمدھی صاحب، ٹرک آگیا ہے۔ سامان پیک کراؤں؟" زیدی صاحب بڑی لجاجت سے کہہ رہے تھے۔

"جی ہاں!" ابّو نے بڑی شان سے گردن اکڑا کر کہا۔ "فوراً پیک کرا دیجیے۔ دیر نہ ہو، ورنہ رات کے کھانے کا انتظام بھی کرنا ہوگا آپ کو!"

زیدی صاحب بے چارے تیزی سے باہر بھاگے اور ابّو کے ساتھ ہی کئی رشتہ داروں نے قہقہہ لگایا۔

اس کو یہ سب ذرا بھی پسند نہیں آرہا تھا۔ دل میں ایک خلش تھی جو بڑھتی ہی جارہی تھی، پھیلتی ہی جارہی تھی —: گھر کے اندر رُخصتی کا انتظام ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان لڑکا بڑی درد بھری آواز میں رُخصتی نظم پڑھنے لگا تھا:

ماں باپ کی دُعا لو جاؤ خدا نگہباں

دُلہن کی ننھی منی چیخیں ماحول کو سوگوار بنا رہی تھیں۔ ہر آنکھ پُرنم تھی۔ ہر ہاتھ میں رُومال تھا۔ خوش تھے تو صرف اس کے ابّو۔ اُن کا چہرہ دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں فتح کی چمک تھی۔ چال میں اکڑ تھی۔ ہمیشہ دبا جُھکا رہنے والا سینہ اصیل مُرغ کی طرح پھُولا ہوا تھا۔ جہیز کا سامان ان کی نگرانی میں پیک ہو رہا تھا۔ زیدی صاحب ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔ جُھکا ہوا سر، آنکھوں میں آنسو، لبوں پر کپکپاہٹ، بیٹی کی جُدائی کا درد دل میں۔

پھر اس نے دیکھا ابّو تیزی سے بڑھے اور زیدی صاحب کے پاس آکر بولے "جناب آپ کو اسکوٹر کا وعدہ یاد ہے؟"

"جی ہاں!" زیدی صاحب نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "آپ فکر نہ کیجیے۔ میں اسکوٹر بھی دوں گا، چاہے گھر بیچ کر دوں۔"

"پھر قیام کہاں فرمائیں گے، محترم ؟"
ابو ہنسے۔

اب اس سے برداشت نہ ہوسکا۔ دونوں کے پاس آکر بڑے ہی اٹل، بیباک اور مضبوط لہجے میں بولا "ابو مجھے اسکوٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس موٹر سائیکل ہے۔ اسکوٹر لے کر کیا کروں گا ؟"

"بے وقوف ہو تم" ابو خفا ہوگئے "یہ اسکوٹر کی ضرورت تم کو نہیں ہے تو راشد کو ہے۔ اسے کالج جانے میں زحمت ہوتی ہے"

"جی نہیں، میں اسکوٹر نہیں لوں گا"
اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ابو کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ کڑک کر بولے "ٹھیک ہے تو پھر چھوڑ دو۔ جہیز بھی یہیں چھوڑ جاؤ"

میں یہی سوچ رہا تھا۔ آپ نے میری سوچ کو الفاظ دے دیئے — ہاں میں جہیز بھی یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ کچھ نہیں لوں گا"

"کیا بک رہے ہو بدبخت !" ابو دہاڑے۔

"صحیح کہہ رہا ہوں مجھے کچھ نہیں چاہیے جو چاہیے تھا، وہ مجھے مل گیا" پھر اس نے حیران حیران سے کھڑے زیدی صاحب کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی سے کہا "آپ یہ سامان پیک کرا کے رکھ لیں۔ کچھ دن بعد آپ کو کسی اور نوجوان کی قیمت لگانی ہوگی۔ ایک بوسیدہ گھر بنوانا ہوگا اس وقت یہ سب کام آئے گا"

اپنے سامنے اس نے جہیز کا کمرہ بند کرایا، تالے کی چابی مبہوت بنے ہوئے زیدی صاحب کی جیب میں ڈالی اور سرگوشیاں کرتے ہوئے مجمع کو چیرتا ہوا، جگہ بناتا ہوا سیدھا گھر کے اندر گھس گیا۔ اس جگہ جہاں اس کی دلہن بیٹھی تھی۔

چند لمحوں بعد ہی اس کی پھپھول سی کار اپنی پیاری سی معصوم سی گڑیا سی دلہن کو لئے ہوئے تیزی سے لمبی سیدھی سڑک پر اڑتی چلی جارہی تھی اور اس کے ابو چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے

"خدا کی قسم بیکار ہاتھ سے نکل گیا ! پیدا کیا۔ پڑھایا لکھایا۔ اس قابل کیا — اور کم بخت نکل گیا ہاتھ سے ! ارے کم از کم چابی ہی میرے ہاتھ سے دے گیا ہوتا۔ کیسی نافرمان اولاد ہے آج کل کی"

●

اس مقابلے کے آغاز میں ہی بانو بہنوں اور بھائیوں نے کافی جوش و خروش دکھایا۔ موضوع کی تائید اور مخالفت میں خوب تحریری گرما گرمی رہی۔ بشریٰ نجمیں (نئی دہلی ۲۵) کی تحریر پہلے انعام (سو روپے) کی حق دار ٹھیرائی گئی۔ سعیدہ جیوریا (حیدرآباد ۲۹) کو دوسرا انعام (پچاس روپے) اور سید جہاں آرا بیگم جہاں (کلکتہ ۱۷) کو تیسرا انعام (تیس روپے) دیا جا رہا ہے۔ انعام حاصل کرنے والی تحریریں یہاں شائع کی جا رہی ہیں۔

یہ وقت کا ایک اہم مسئلہ ہے جس پر غور و خوض ضروری ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ہم کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ہندوؤں میں تو اس طرح کی شادی کا عام رواج ہے اور وہ اس طرح کی شادی کو برا بھی نہیں سمجھتے لیکن مسلمانوں میں آج بھی ایسے دقیانوسی لوگ موجود ہیں جو ہر نئی بات پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، چاہے وہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو۔ اگر کسی نے شادی کے لئے اشتہار دے دیا تو یہ لوگ خواہ مخواہ چونک جائیں گے کہ ہائے ہائے اس لڑکی (یا لڑکے) میں کیا عیب ہے یا یہ کہ اس کی شادی نہیں ہو رہی ہو گی جو اس نے یہ طریقہ اپنایا۔ یہ بیچارے اس نکتے کو نہیں سمجھتے کہ یہ طریقہ کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ اسلام میں اس کی مخالفت تو نہیں آئی ہے۔

آپ خود سوچیے کوئی شریف لڑکی ہے جو خوب صورت بھی ہے، پڑھی لکھی بھی ہے، خاندان بھی اچھا ہے، پھر بھی اس کی شادی نہیں ہو رہی ہے تو کیا اس کو حق نہیں ہے کہ وہ اشتہار کا طریقہ اپنائے؟ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ اس اشتہار کو ہزاروں لوگ پڑھیں گے اور ان ہزاروں میں، بہت نہیں تو چند ایسے ضرور ہوں گے جو اس کے رشتے کے لئے اس کے گھر آئیں گے۔ اس طرح کسی اچھی جگہ لڑکی کی شادی ہو سکتی ہے۔ آپ ہی بتائیے اشتہار دینا اس کے لئے فیض رساں ہوا یا نہیں؟ اشتہار کے ذریعہ اس کی رسائی ممکن ہو سکتی ہے۔

یہ درست ہے کہ کبھی کبھی ایسی شادی میں دھوکا بھی ہوتا ہے، لیکن اس کا تدارک ناممکن نہیں۔ اچھی طرح معلومات کرنے کے بعد اگر رشتہ طے کیا جائے تو دھوکہ کھانے کا امکان ختم ہو سکتا ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اشتہار دینا مناسب نہیں ہے ان کا شمار تعلیم یافتہ لوگوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم کا مطلب تو یہ ہے کہ اس سے ذہنوں کی تاریکی دور ہو۔ یہ تو سراسر نادانی کہیے کہ جس چیز سے فائدہ پہنچ سکتا ہے اس کو نامناسب سمجھا جائے۔ کاش ایسے لوگ اپنے ذہن کے دریچوں کو کھول کر اس قسم کی فضول باتوں کو دماغ سے نکال کر نئی روشنی میں جینا سیکھیں کیونکہ آدمی زمانے کے ساتھ چلنے پر مجبور ہے، ورنہ آج

بیٹھے ہیں کہ رشتے اوپر سے بن کر آتے ہیں انسان اپنی جستجو اور محنت سے مقدر کا رشتہ ہی تلاش کرتا ہے۔ ایسی تلاش کسی طریقے سے کی جائے بہر طور مناسب ہو گی۔ بعض اوقات گھر بیٹھے رشتے آ جاتے ہیں لیکن اسے اچھی قسمت ہی کہا جا سکتا ہے۔ رشتے از خود نہ آئیں تو رشتوں کی آمد کے انتظار میں وقت گنوانا دانشمندی نہیں۔ آج کل شہر میں شادی کرانے والے مراکز قائم ہو گئے ہیں۔ وہاں بھی مناسب رشتہ مل سکتا ہے کیونکہ وہاں ہر طرح امیدواروں کے نام درج رہتے ہیں اور اچھا انتخاب کرنے میں کافی سہولت مل جاتی ہے۔ اگر ان مرکزوں میں بھی بات نہ بن سکے تو ایسی صورت میں اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار لازماً دینا چاہیے۔ اخبار ہزاروں ہاتھوں تک پہنچتا ہے اور اسی تناسب سے لوگ مناسب رشتے کی تلاش میں صاحب اشتہار تک پہنچتے ہیں اس طرح اچھے رشتے کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔

اشتہار دینے میں ایک سہولت یہ بھی ہے کہ وقت کی بچت ہوتی ہے اور براہ راست رشتے طے ہو جاتے ہیں۔ مشاطہ یا درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں رہتی اشتہار دینے میں بیرون ملک میں رہنے والوں کو بھی اپنی پسند کی شادی کرنے کا موقع ملتا ہے اور مقامی امیدواروں کی دوسرے ملکوں میں گھر بسانے کی خواہش بھی آسانی سے پوری ہو جاتی درج کی جاتی ہیں۔ اس سے اپنی پسند کم وقت میں زیادہ محنت کئے بغیر حاصل کی جا سکتی ہے۔

سعیدہ، جیوریا

شادی جیسے مقدس فریضے کے لئے

اشتہار دینا بظاہر اچھا تو نہیں لگتا لیکن موجودہ زمانے میں انہونی باتیں بھی ہونی بن گئی ہیں۔ وقت سب کچھ کراتا ہے۔ پہلے زمانے میں اپنے خاندان اور رشتے داروں میں شادیاں ہوا کرتی تھیں لڑکیوں کی تعداد بھی کم تھی۔ جہیز جیسی کوئی بیماری نہ تھی۔ اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ غیروں میں شادیاں ہونے لگیں۔ جہیز کی منڈیوں میں لڑکیاں بکنے لگی ہیں۔ غریب اور اوسط درجے کے خاندانوں میں کئی کئی لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں۔ صرف جہیز نہ دے سکنے کے باعث ان کی شادی کہیں نہیں ہو پاتی، چاہے وہ کتنی ہی تعلیم یافتہ، خوب صورت اور گنوں والی ہوں۔ اگر لڑکے ملتے بھی ہیں تو جہیز کی مانگ کی لمبی چوڑی فہرست کے ساتھ جس کا بوجھ غریب والدین اٹھا نہیں سکتے۔ ایسی صورت میں اشتہار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اشتہار کے ذریعے رشتے کی تلاش میں آدمی عموماً کامیاب ہوتا ہے۔ وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کوئی نامناسب اقدام نہیں بلکہ اچھے رشتے کے حصول کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اسی لئے آج کل شادی بیاہ کے لئے یہ طریقہ عروج پر ہے۔

سید جہاں آرا بیگم جہاں

محمد علی

ایک گھر میں ۲۱ عورتیں بیوہ ہوگئیں

ارتقا کے ماہرین کی تحقیقات کے بموجب انسان کی آفرینش کی عمر جان داروں میں سب سے کم ہے۔ آج سے لاکھوں سال پہلے دنیا میں کئی قوی ہیکل جانور پائے جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ جانور دنیا سے مٹ گئے۔ انسان کی عمر دس لاکھ برس سے زیادہ نہیں لیکن انسان کیا آیا کہ جانوروں کی شامت آگئی۔ اس نے ہزاروں جانوروں کا شکار کیا خدا نے اسے ذہانت اور قوتِ گویائی سے مالامال کیا تھا۔ اس نے اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا اور اشرف المخلوقات بن گیا۔ اس طرح انسان کو مخلوقات میں اشرف ہونے کا اعزاز تو حاصل ہوگیا، لیکن اس میں چھپا ہوا جانور نہ مٹ سکا۔ تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کی درندگی بھی برقرار رہی۔ گزشتہ دنوں اس کی مثال ہندوستان کے مختلف شہروں میں ملی۔ ہندوستان کی راج دھانی دہلی اس معاملے میں پیش پیش تھی۔

شریمتی اندرا گاندھی کا قتل ایک بھیانک اور بے رحمانہ فعل تھا لیکن اس جرم کی سزا ان لوگوں کو بھی ملی جن کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہمیں سیاست کے جوڑ توڑ سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں لوگوں کے ردِ عمل کے سماجی پہلو پر نظر ڈالنی ہے اس بار فسادات میں لوگوں کے غصہ کا نشانہ مرد بنے۔ حملہ کرنے والوں نے عورتوں کو ایذا نہیں پہنچائی لیکن آخر میں نقصان عورتوں کا ہی ہوا۔ ان کی جان تو بچ گئی لیکن ان کی زندگی کا سہارا ختم ہوگیا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے باپ شوہر اور بچوں کو جلتے دیکھنا ایک ایسا تجربہ ہے جسے زندگی بھر بھلانا ممکن نہیں لیکن سوال موجودہ زندگی کا ہے۔ مل سہارا ختم ہوجانے سے عورت پر کیا بیتے گی یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ ہمارے سماج میں بیوہ کی سماجی حیثیت کیا ہے؟ ہر شخص انہیں رحم اور ہمدردی کا مستحق سمجھتا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ نئی نویلی دلہن ہو یا بال بچوں والی عورت، بیوگی کا زخم مشکل سے ہی مندمل ہوتا ہے نئی بیاہی عورت کو ممکن ہے کہ دوسرا شوہر مل جائے لیکن جس عورت کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں، اسے کون سہارا دے گا؟ لڑکیوں کی تعلیم کی ذمہ داری کون اپنے سر لے گا؟ گھر کا خرچ کون چلائے گا؟

دہلی کے ایک علاقے ہری نگر میں ایک بڑا خاندان رہتا تھا۔ ۳۰ کمروں کا یہ بھرا پُرا گھر ایک مشترکہ خاندان کی ملکیت تھا جب حملہ آور اپنے کام سے فارغ ہوئے تو اس خاندان میں ۲۱ بیوائیں چھوڑ گئے۔ ایک ہی گھر میں اتنی عورتوں کا یک لخت بیوہ ہوجانا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان میں ۱۸ سے ۶۰ سال تک کی عورتیں شامل ہیں۔ ان کی عمر میں فرق ضرور ہے، لیکن ایک بات ان سب میں مشترک ہے اور وہ ہے بیوگی کا داغ۔ گھر میں کوئی کمانے والا نہ ہو تو ان کی روزی روٹی کس طرح چلے گی؟ یہ سوال پہاڑ کی طرح ان کے سامنے کھڑا ہے۔ زندگی کے سہارے یکا یک چھن گئے۔ دل کے صدمے کے ساتھ پیٹ بھرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ حکومت نے فساد زدہ لوگوں کی مدد کا وعدہ کیا ہے لیکن کیا یہ مدد ان کی خوشیاں واپس لا سکتی ہیں؟ اب دیکھنا یہ ہے کہ دہلی اور دوسرے شہروں کی فساد کی ماری عورتیں کس طرح اپنی زندگی کو سنوارتی ہیں۔ ○

عشرت راشدی

ں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے
کیا جس کے ایک کونے پر لکھا تھا:
ے لئے"۔ اس کا دل جانے کیوں زور
دھڑک رہا تھا۔ پسینے کی باریک
یں ماتھے سے بہنے لگیں جبکہ دیگر
ہتیں۔ آخر اس نے اپنے ہوش و حواس
بارکے تحریر پڑھنا شروع کی:
پیاری پیاری امّی!
ہ مہینے بیت چکے ہیں۔ آپ مجھ سے
ملنے نہیں آئیں۔ کیا آپ کو اپنی سروس
مجھ سے زیادہ عزیز ہے جو اب مہینے
میں ایک بار بھی نہیں آتیں؟ امّی اب
میں ساتویں جماعت میں پڑھتی ہوں۔ خوب
دل لگا کر علم حاصل کروں گی، پھر نوکری
کروں گی۔ امّی، میں آپ کی لڑکی نہیں
لڑکا ہوں۔ آپ کو وہ آرام دوں گی جو
ایک لڑکا بھی اپنے ماں باپ کو نہ دے سکتا
ہو۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کتنی مصیبت
سے مجھے لکھا پڑھا رہی ہیں۔ لیکن دیکھئے نا
امّی، ہوسٹل میں سب ہی لڑکیوں کے
ماں باپ ملنے کے لئے آتے ہیں۔ میرے
والد کے لئے آپ کہتی ہیں کہ پردیس
گئے ہیں۔ لیکن آپ تو اپنے دیس میں ہیں
امّی، مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہو تو معاف
کر دیجئے اور اب ضرور ملنے چلی آیئے۔
آپ کی بیٹی ——— نسرین بانو
ں آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں آڑی ترچھی
یا بناتی ہوئی دامن میں جذب ہوتی چلی گئیں۔
ے کسی کی آمد نے اسے چونکا دیا۔ سامنے
کا شوہر کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جیسے اس کا
ا وجود سوکھے پتے کی طرح کانپ اٹھا۔ لفافہ
ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

سہیل لفافہ ہاتھ سے اٹھاتے ہوئے آگے
بڑھا اور اپنی بیوی کو اس طرح پریشان دیکھ کر
اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"ارے کیا بات ہے زیبہ؟ تمہاری
طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ یہ خط کس کا ہے؟
کیا ماموں جان نے بھیجا ہے؟ کیا ان کی طبیعت
خراب ہے؟" اس نے ایک سانس میں سوالات
کی بوچھار کر دی لیکن جب اسے اپنے سوالات
کا جواب نہ ملا تو وہ لفافے کو بغور دیکھنے لگا اور
پھر اس مختصر سی تحریر نے اسے پل بھر میں سب
کچھ سمجھا دیا اور اس کی ساری ہمدردی کافور ہو گئی۔
دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے اور آنکھوں
پر لالی امڈ آئی اور وہ زور سے چیخ اٹھا "تو یہ
ہے تمہاری خاموشی کا راز! کمینی عورت! تم
دھوکے باز ہو! بدکردار ہو! فاحشہ ہو! تمہارا
ہر ماہ اپنے ماں باپ سے ملنے جانا ایک بہانہ
تھا۔ تم تو اپنے پاپ کی دیکھ بھال کے لئے
جایا کرتی تھیں، میں نے تمہیں کیا سمجھا تھا اور تم
کیا نکلیں۔ میں ہی بدھو ہوں جو آٹھ دس
برس سے تمہاری بے وفائی کو محبت سمجھتا رہا۔
اب تم ایک منٹ کے لئے بھی اس گھر میں نہیں
رہ سکتیں۔ چلی جاؤ یہاں سے! جلدی کرو،
ورنہ اگر میرا ہاتھ اٹھ گیا تو اچھا نہ ہو گا۔ میں
نہیں چاہتا کہ تمہاری بدنامی کے ساتھ میرا
نام بھی لیا جائے۔ بہتری اسی میں ہے کہ تم میکے
چلی جاؤ۔"

زیبا بس زار و قطار روئے جا رہی تھی۔
اس کی آواز جیسے حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی۔
لاکھ بولنے کی کوشش کے باوجود اس کی زبان سے
ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔ آخر اس نے اپنی پوری
قوتِ گویائی کو سمیٹا اور کہا "سہیل! میرے
سرتاج! بات وہ نہیں ہے جیسے تم سمجھ رہے ہو۔
میں بہت پہلے تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی،

لیکن جانے کیوں بتا نہ سکی۔"
اس سے پہلے کہ وہ سچائی بتاتی، سہیل نے بات کاٹ دی! "مجھے اب ایک لفظ نہیں سننا۔ خیریت اسی میں ہے کہ اب تم اس گھر سے نکل جاؤ اور میکے چلی جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی ایک زوردار طمانچہ اس نے زیبا کے مونھ پر رسید کر دیا۔ اب زیبا کے لئے کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اپنے آنسوؤں کو پی کر وہ میکے چلی گئی۔

وقت کا پنچھی پنکھ پسارے اُڑتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو ماہ گزر گئے۔ زیبا نے سوچا کہ معاملے کو مزید طول دینا نامناسب ہے، وہ کاغذ قلم لے کر خط لکھنے بیٹھ گئی۔

میرے پیارے سرتاج!
آداب و تسلیمات۔
ہم خیر و عافیت سے ہیں خدا کرے آپ بھی بخیر ہوں۔ میں سچائی بہت پہلے بتا دینا چاہتی تھی لیکن آپ کی بے پناہ محبت نے میرے حوصلے بلند کر دئے اور میں دانستہ خاموش ہو گئی تھی۔
ہماری شادی ہوتے دس برس کا عرصہ بیت چکا ہے۔ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کے باوجود آپ مجھے بے حد ٹوٹ کر چاہتے رہے۔ مگر آپ میرے ہم سفر، میرے ناخدا ہو کر بھی اصلیت نہ سمجھ سکے اور ایک معمولی تحریر کی بنا پر غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ یہاں تک کہ مجھے گھر سے نکال دیا۔ سچائی یہ ہے کہ یہ لڑکی جس نے خط لکھا ہے میرے چچا جان کی لڑکی کی امانت ہے۔ آپ اسے میری اپنی بیٹی سمجھ رہے ہیں، مگر وہ میری بھانجی ہے۔ مجھے ایک دن اپنی چچازاد بہن کا تار ملا تھا کہ میں اس کے پاس پہنچوں۔ اس کا شوہر ہندوستان سے باہر روپیہ کمانے کی غرض سے گیا تھا لیکن ایک سال گزرنے پر بھی نہ اس کا کوئی خط آیا نہ اس نے وہاں سے کوئی رقم بھیجی۔ جب میں اپنی چچازاد بہن سے ملنے کے لئے پہنچی تو جیسے میرے ہوش اُڑ گئے۔ وہ زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھی اور اس کے قریب ہی ایک چاند سی لڑکی لیٹی مسکرا رہی تھی۔ قسمت کا کھیل کہئے یا قدرت کی ستم ظریفی، میری چچازاد بہن نے زبان سے کچھ نہ کہا، صرف اپنی بچی کی طرف ایک نظر کرتے ہوئے میرے چہرے کو دیکھا اور پھر ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ میں بس دیکھتی رہ گئی۔
میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اس معصوم کو اپنے گھر لے آؤں۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اسے ماں کی کمی کا احساس نہ ہونے دوں گی۔ لیکن دو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ میں آپ سے منسلک ہو گئی۔ میں ہر ماہ میکے کا بہانہ کر کے اس سے ملنے جاتی تھی۔ اور سرس کا بہانہ بنا کر یہاں آتی تھی، وہ بچی یہی سمجھتی رہی کہ میں یہاں سروس کرتی ہوں۔ میں نے اپنے ماں باپ کو قسم دے رکھی تھی کہ یہ راز کبھی اس پر یا کسی اور پر ظاہر نہ ہونے دیں۔ جب وہ پانچ برس کی ہو گئی تو میں نے اسے گرلس ہاسٹل میں داخل کر دیا۔ آج وہ ساتویں جماعت کی طالبہ ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ وہ آج بھی مجھے اپنی حقیقی ماں سمجھتی ہے۔ میں آپ کو بہت پہلے اس سچائی سے روشناس کرا دیتی، لیکن آپ نے موقع ہی نہ آنے دیا۔ اور مجھے گھر سے نکال دیا۔
میرے سرتاج، اب میں اسے سب کچھ بتا دوں گی کہ وہ کس کی اولاد ہے، یہ بھی واضح کر دوں گی کہ اس کی اپنی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ آپ میری اس "چھوٹی سی بے وفائی" کو معاف کر دیجئے۔
آپ کی منتظر — زیبا

زیبا کی تحریر نے جیسے سہیل کو ایک بھیانک خواب سے چونکا دیا۔ وہ ایک دم چونکا "میرے خدا! یہ میں نے کیا کیا! اپنی وفا کی دیوی پر بے وفائی کا الزام دھر دیا!" اس نے فوراً لکھنا شروع کیا۔
پیاری زیبا!
میں آ رہا ہوں۔ نسرین اب صرف تمہاری بیٹی نہیں، بلکہ میری بھی بیٹی کہلائے گی۔ خدا نے ہمیں بامراد کر دیا، ہمیں اولاد دے دی۔
تمہارا اور صرف تمہارا
سہیل

نیرج نراش

ج ۲۰۰ سال پہلے ہندوستان کے
ہمالیوں میں سکم ایک نیم خود مختار
سکم کے مہاراجہ کا تعلق ہندوستان
ت سے تھا شاہی خاندان میں لوگ کے
شادیاں تبت میں ہوتی تھیں۔ یہاں
ہ کا رواج ہے۔ ۱۹۷۵ء میں سکم باقاعدہ
ن میں شامل کر لیا گیا۔ اب یہ ہندوستان
صوبہ ہے لیکن اس کی تہذیب ہندوستان
ہے۔ نیرج نراش کا لڑکپن اور جوانی
گزری۔ انہوں نے وہاں کے مشن
سے ہائر سیکنڈری پاس کیا اور
سے بی۔ اے کیا۔ آج کل وہ دلی
تجارتی ادارے سے وابستہ ہیں لیکن
ذاری ہوئی زندگی ان کی شخصیت پر ایک
پ چھوڑ گئی ہے۔

نیرج دہرہ دون میں پیدا ہوئیں۔ وہ چار
کی تھیں کہ ان کے والدین نے دہرہ دون
ے دیا۔ ان کے والد نراش ایک جرنلسٹ
م میں ان کا اپنا پریس ہے۔ ان کی
ٹیچر ہیں۔ انہوں نے مانٹیسوری طریقہ
تربیت حاصل کی۔ وہ سکم میں ٹیچر بن گئیں۔
ں نے وہاں اپنا ذاتی اسکول کھول لیا
ج اب بھی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے
راج دھانی گنگٹاک جاتی ہیں۔ گنگٹاک
ے لئے پہلے کلکتہ سے دارجیلنگ
ہے۔ وہاں سے کالمپونگ اور وہاں سے
۔

گنگٹاک سکم کا ایک ہی شہر ہے باقی
یہ دیہات پر مشتمل ہے۔ یہاں کے
ں غذا چاول ہے۔ اس کے علاوہ چینی
ے مثلاً نوڈلز اور چاؤمین بھی رائج ہیں۔
ں نیپالیوں کی آبادی تقریباً ۶۰ فی صد

ہے۔ وہاں لوگوں کا لباس تبتیوں کی طرح
ایک لمبی عبا ہے۔ مردوں کا چغہ پیر کے ٹخنے اور
ہاتھ کے پہنچے تک پہنچتا ہے لیکن عورتوں کا
چغہ نیم آستین کا ہوتا ہے اسے باکو کہتے ہیں وہاں
کی عورتیں شادی کے بعد مانگ میں سیندور
نہیں لگاتیں۔ بلکہ اپنے باکو پر ایک ایپرن نما
رومال باندھتی ہیں جسے پانگ ون کہتے ہیں۔
اگر مرد دائیں کان میں ایک بُندا پہنے تو اس کا
مطلب یہ ہے کہ وہ راج دربار میں افسر رہ چکا ہے۔
سکم میں شادی والدین طے کرتے ہیں۔
لڑکے والے منگنی کے لئے لڑکی کے گھر جاتے
ہیں ساتھ میں چاول کی بوریاں۔ سورا اور کھادا
لے جاتے ہیں۔ کھادا سلک کا ایک اسکارف ہوتا
ہے۔ اس اسکارف کا زندگی کے ہر شعبہ میں استعمال
ہوتا ہے۔ کسی دوست رشتہ دار یا بادشاہ کا
استقبال کرنا ہو تو اسے اسکارف پیش کیا
جاتا ہے۔ منگنی اور شادی کے موقع پر بھی اسکارف
کا تبادلہ ہوتا ہے حتیٰ کہ جنازے میں شرکت
کرنی ہو تب بھی اسکارف پیش کیا جاتا ہے
یہ ہمیشہ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ سکم میں طلاق
کا رواج نہیں بلکہ ایک دفعہ شادی ہو گئی تو
ہو گئی۔ اگر میاں بیوی میں ناچاقی پیدا ہو جائے
تو انہیں اختیار ہے کہ وہ دوسرے انسان
سے تعلق پیدا کر لیں۔ اس میں کوئی عیب نہیں
سمجھا جاتا۔

سکم کے لوگ نہایت سادہ دل ہوتے
ہیں۔ چھل کپٹ ان میں نام کو نہیں۔ نیرج کو
اس بارے میں ایک واقعہ یاد ہے۔ ان کی
ماں کے یہاں ایک گوالن دودھ دیا کرتی تھی
جب گھر میں ایک بچہ کا اضافہ ہوا تو ان کی ماں نے
گوالن سے کہا کہ دوسرے دن سے زیادہ دودھ
لائے۔ دودھ تو آ گیا لیکن وہ بہت پتلا تھا ماں
نے گوالن سے شکایت کی تو اس نے معصومیت
سے جواب دیا کہ میرے پاس اتنا ہی دودھ تھا
لیکن جب آپ نے زیادہ دودھ کی فرمائش کی
تو ناچار مجھے اس میں پانی ملانا پڑا۔ ماں ہنس کر
خاموش ہو گئی۔ سادگی کے علاوہ خوش سلیقگی
بھی ان لوگوں کی خاصیت ہے۔ یہ لوگ خاموش
طبیعت اور پُرسکون ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ کے
موقع پر بھی سب رسمیں خاموشی سے ادا
کی جاتی ہے۔ دھوم دھڑکا اور لاؤڈ اسپیکر کا
استعمال نہیں ہوتا۔ یہ لوگ بہت مہمان نواز
ہوتے ہیں۔

نیرج کبھی سکم کے دیہات میں گئیں تو
وہاں کے لوگوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔
وہاں تعظیم کے لئے "لا" کا لفظ استعمال ہوتا
ہے۔ یہ بھائی میاں۔ صاحب یا جناب کے
مترادف ہے۔ مثلاً لوگ نیرج کو نیرج لا
کہتے تھے۔

سکم کا اصلی نام ڈینزونگ ہے

وہاں کے لوگ اپنے علاقے کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور فلم اسٹار ڈینی ڈینزونگپا کا نام صرف ڈینی ہے۔ ڈینزونگپا کے معنی ہیں سکم والا۔ سکم کے لوگ بھوت، پریت اور خبیث روحوں میں یقین رکھتے ہیں۔ وہاں مریض کو ڈاکٹر کے بجائے بھوت اتارنے والے کے پاس لے جاتے ہیں اسے جھانکری کہتے ہیں۔ بیماری کے معنی ہیں کہ کوئی بدروح انسان کے جسم میں گھس گئی ہے۔ جھانکری نقارہ بجاتا ہے اور منتر پڑھ کر مریض کا علاج کرتا ہے۔ سکم کی زندگی میں لاما کا بڑا دخل ہے۔ یہ بدھ خانقاہوں میں رہتے ہیں۔ شادی بیاہ ہو یا بچے کی پیدائش لاما کی شرکت اس میں ضروری ہے۔ بچے کا نام بھی وہی تجویز کرتا ہے۔

سکم کی عورتوں کو سماجی آزادی حاصل ہے۔ وہ آزادانہ شراب پیتی ہیں۔ یہ ایک قسم کی بیئر ہوتی ہے جسے چھانگ کہتے ہیں۔ عورتیں سگریٹ کا استعمال بھی کثرت سے کرتی ہیں۔ چینی آبادی سارے شمال مشرق میں عام ہے اور سکم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ نیرجا وہاں بیس سال رہیں جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر دلی آئیں تو یہاں پہنچ کر انہیں گھٹن محسوس ہوئی۔ یہاں انہوں نے کرائے پر مکان لینا چاہا تو سب مالک مکان ان سے یہی پوچھتے تھے۔ تم اکیلی کیوں رہنا چاہتی ہو۔ کیا تمہارا دلی میں کوئی رشتہ دار نہیں۔ تم گھر میں ریڈیو یا ٹرانزسٹر بجاؤ گی۔ کیا تمہارے گھر میں گوشت پکے گا۔ کیسے لوگ تم سے ملنے آئیں گے۔ اور تو اور ہاسٹل میں بھی وہاں کی میٹرن نے یہی سوال کیا کہ تمہارا مقامی سرپرست کون ہے اس سے چھٹکارا پا کر لائیں۔ نیرجا نے جواب دیا اگر میرا کوئی مقامی سرپرست ہوتا تو میں ہوسٹل میں کیوں رہتی۔ پھر بھی فارم کا پیٹ بھرنے کے لئے انہوں نے ایک مقامی سرپرست ڈھونڈ نکالا اور انہیں ہاسٹل میں جگہ مل گئی۔ دلی جیسے بڑے شہر میں لڑکیوں کے صرف ۵ ہاسٹل ہیں اور یہ سب بھرے رہتے ہیں۔ انتظار کرنے والوں کی فہرست طویل ہے۔ نیرجا نے اب ہاسٹل چھوڑ دیا ہے۔ انہیں نئی دلی کے ایک مکان میں برساتی کرائے پر مل گئی ہے۔ انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ شادی کو وہ عورت کی زندگی کا ماحصل نہیں سمجھتی ہیں لیکن اگر کوئی مناسب لڑکا مل گیا تو انہیں شادی کرنے میں کوئی عار نہیں ہوگا۔

صحت سے متعلق معلومات

جوابات

۱۔ **صحیح :** اگر کسی کے حلق میں کچھ پھنس جائے تو اس کا سر آگے کی طرف جھکائیں اور دونوں کندھوں کے درمیان زور سے ہاتھ ماریں۔ اگر اس سے بھی کھانا باہر نہ نکلے تو اس کے پیچھے کھڑے ہو جائیں، دونوں ہاتھوں سے اس کا جسم جکڑ لیں، ایک ہاتھ کی مٹھی بند کر کے دوسرے ہاتھ سے اس مٹھی کو پیٹ پر ماریں۔ کئی بار ایسا کریں، تاکہ کھانا حلق سے باہر نکل آئے۔ پیٹ کو دبانے سے پھیپھڑے سے ہوا خارج ہوتی ہے اور حلق میں پھنسی ہوئی چیز نکل آتی ہے۔

۲۔ **غلط :** ایام عموماً ۴۰ اور ۵۵ سال کی عمر کے درمیان بند ہوتے ہیں۔

۳۔ **غلط :** سینے کی گھٹن ۹۰ فی صد بے ضرر ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی گھٹن محسوس ہونے پر ڈاکٹر کی رائے لینی ضروری ہے۔

۴۔ **صحیح :** کافی میں کیفین ہوتی ہے۔ اس سے تھکان اور افسردگی دور ہوتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں دردِ سر کا باعث ہوتی ہیں۔

۵۔ **صحیح :** تازہ تحقیقات کے بموجب زکام میں گنگنا پانی کاغذ کی نلکی سے پینا چاہئے اور اس کے بعد مرغ کی گرم گرم یخنی اسے بھی کاغذ کی نلکی سے پینا چاہئے۔ اس کے بعد ناک کھل جاتی ہے۔

سنگ دل

ایم مبین

اس کی سسکیاں رُکنے کا نام نہیں ...ہی تھیں۔

گزشتہ دنوں کی ایک ایک بات اس ...ہن میں کسی فلم کی تصویروں کی طرح اُبھرتی ...ا دل ان باتوں کو سوچ سوچ کر بھر آتا اور ...وں میں آنسو ایک بار پھر اُبل پڑے۔

اس حالت میں وہ کتنی دیر سے لیٹی تھی ...سے اس بات کا پتہ نہیں تھا۔ گھر میں ...کوئی بھی نہیں تھا جو آکر اس سے اس کا ...، پوچھتا یا اسے تسلی دیتا۔ دیپا اور سلیم کالج ...تھے۔ نوکر کو اس نے سبزیاں اور دوسرا ...ان لانے کے لئے بازار بھیج دیا تھا۔ اگر ...بھی گیا ہوگا تو کمرے میں جھانکنے کی ہمت ...کرے گا۔ یہ سوچ کر کہ وہ آرام کر رہی ...، وہ اپنے کاموں میں لگ گیا ہوگا۔ دیپا ...کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔

آج بھی وہی ہوا تھا جسے وہ مسلسل تین ...سے چپ چاپ برداشت کئے جا رہی تھی ...ن آج کی بات ایسی تھی کہ وہ برداشت نہیں ...سکی اور اس کا دل بھر آیا۔ جاوید نے فیصلہ ...کر دیا تھا، "اگر تم سے یہ سب برداشت ...ہوتا تو تم اپنے گھر جا سکتی ہو۔ اگر تمہیں اس ...یں رہنا ہے تو تمہیں اس طرح رہنا پڑے گا ...طرح میں چاہتا ہوں!"

اور وہ سسکتی ہوئی دیر سے یہی سوچ ...رہی تھی کہ وہ کیا فیصلہ کرے؟ جاوید کی بات ...لے؟ یا اپنے دل کے کہنے پر عمل کرے؟ ...جاوید کی بات مان لیتی ہے تو اسے زندگی بھر ...ٹ گھٹ کر، کسی کی محتاج رہ کر غلاموں کی ...زندگی گزارنی پڑے گی۔ اسے اپنی مرضی ...کوئی کام کرنے کی آزادی نہیں ملے گی۔

اسے اپنی خواہشوں کا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر ایک لاش کی طرح زندگی گزارنی ہوگی۔

اگر اپنے دل کی بات مان لیتی ہے تو بھی سامنے صرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی ہے۔ ان اندھیری راہوں پر ایک انجان سی منزل کی طرف اسے ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلنا پڑے گا۔

بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے جاوید کا چہرہ ناچنے لگتا۔ پرکشش، وجیہہ چہرہ لیکن جذبات سے بالکل عاری۔ گٹھیلا جسم اور پرکشش شخصیت کا مالک جاوید۔ پہلی بار جب اس نے جاوید کو دیکھا تھا تو اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا اور ہزاروں خواب اس کی آنکھوں میں تیرنے لگے تھے۔ اس نے تو برسوں سے اسی طرح کے شریکِ حیات کے خواب سجائے تھے۔ اپنے ہونے والے شریکِ حیات کی جس طرح کی صورت اس نے راتوں کو جاگ جاگ کر تراشی تھی، جاوید بالکل اسی کے مطابق تھا۔ لیکن اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اتنی پرکشش شخصیت کا مالک اتنا سنگ دل ہوگا۔

تین مہینے سے ہر لمحہ اسے یہی محسوس ہوا تھا کہ جاوید کے سینے میں دل ہے ہی نہیں۔ اگر دل ہے بھی تو پتھر کا ہے۔ نہ اس کی اپنی کوئی خوشی ہے، نہ اس کا اپنا کوئی دکھ ہے، جس میں وہ دوسرے دل کو شریک کرے۔ اس کے لئے جب اپنی خوشیاں اور دکھ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے تو دوسرے دل کی خوشیاں اور غم بھی اس کے لئے بے معنی تھے۔ وہ تو صرف حکم چلانا اور حکم کی تعمیل نہ کرنے والے کو سزا دینا جانتا تھا۔ خود دوسروں کا حکم

نہ ملنے پر اسے معافی مانگنا بھی نہیں آتا تھا۔
"نہیں، نہیں، میں اس جہنم میں اپنی زندگی نہیں گزار سکتی۔ یہاں تین مہینے کا ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی کی طرح گزرا ہے۔ ہر لمحے میری خواہشوں، میرے جذبات کا خون ہوا ہے۔ میں زندگی بھر یہ اذیت برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتی۔ میں زندگی شوہر کے بغیر گزار لوں گی اور وہ شوہر بھی کس کام کا جس کو بیوی کی کسی بھی بات کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ شوہر سے دور رہ کر کم سے کم اس ذہنی اذیت سے نجات تو مل جائے گی۔"

ایک اٹل فیصلہ کر کے وہ اٹھی، اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھے اور اپنے کپڑے سوٹ کیس میں بھر کر میکے جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔

جب سے شادی ہوئی تھی، جاوید نے کبھی اس سے ہنس کر یا پیار بھرے لہجے میں ایک بات بھی نہیں کی تھی۔ وہ تو اس سے بات بھی بہت کم کرتا تھا۔ وہی اگر کوئی بات چھیڑ دیتی تو اس کی بات کا مختصر سا جواب دے دیتا تھا۔ اسے تو اس کا زیادہ زور سے ہنسنا بھی پسند نہیں تھا۔
"یہ کیا بدتمیزوں کی طرح زور زور سے کھلکھلا کر ہنستی رہتی ہو۔"
جب کئی بار جاوید نے یہی بات دہرائی تو اس نے ہنسنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ہر بات میں جاوید اس کی توہین کرتا ہے، یہ دیکھ کر اس نے بھی جاوید سے باتیں کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنے دل میں جاوید کے لئے کچھ کچھ بیزاری محسوس کرنے لگی تھی۔ اور یہ بیزاری اس وقت اور زیادہ بڑھ گئی تھی جب جاوید نے اس کے سلیم اور دیبا سے باتیں کرنے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔
"یہ کیا ہر وقت دونوں کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں فضول سی باتیں کر کے ان کی پڑھائی کا قیمتی وقت برباد کرتی رہتی ہو۔ تم گھر کی بڑی ہو۔ تمہیں تو انہیں پڑھائی کی تاکید کرنی چاہئے۔ اور تم ہو کہ خود انہیں پڑھائی سے روکتی ہو....."
یہ بات سن کر اس کے دل پر ایک گہری چوٹ لگی تھی۔ دیبا اور سلیم کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ لیکن کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔
اس بات کا غصہ اس نے سلیم اور دیبا پر ہی اتارا تھا اور اس طرح ایک طرح جاوید سے بدلہ لے لیا تھا۔ وہ جب بھی اس سے کسی موضوع پر بات کرنے کی کوشش کرتے، وہ انہیں بری طرح جھڑک دیتی۔
"ان فضول باتوں میں اپنا وقت برباد نہ کرو۔ یہ تمہاری پڑھائی کا وقت ہے۔"
اس کے بعد وہ دونوں بھی اس سے کچھ کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے۔ کئی دن تک اس کے دل میں ایک ندامت کا جذبہ سر اٹھا رہا تھا کہ اس نے ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں کیا؟ لیکن وہ معافی کے ذریعہ اپنے دل کی ندامت کو دور نہیں کر سکی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کسی حرکت کی وجہ سے پھر جاوید اسے باتیں سنائے۔
شادی کے بعد ایک معمول سا بن گیا تھا:
سویرے جلد اٹھ کر وہ سب کے لئے ناشتہ تیار کرتی۔ سلیم اور دیبا ناشتہ کر کے کالج چلے جاتے اور جاوید آفس۔ اس کے بعد وہ کبھی خود بازار چلی جاتی یا کبھی نوکر کو بھیج کر سامان وغیرہ منگا لیتی۔ پھر گھر کے کاموں میں لگ جاتی۔ ان سے فارغ ہوتی تو دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع۔ اس درمیان سلیم اور دیبا کالج سے آجاتے، جاوید بھی آفس سے آجاتا۔ سب ایک ساتھ بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھا لیتے۔ کھانے کے بعد سلیم اور دیبا اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے چلے جاتے اور جاوید آفس چلا جاتا۔ وہ بھی ہلکی سی جھپکی لے لیتی یا کسی رسالے یا ناول میں کھو جاتی۔ پھر رات کے کھانے کی تیاری اور پھر کھانے کے بعد سونے کی۔
چاہے چھٹی کا دن آئے یا کوئی اور دن، ان معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ نہ کہیں آنا جانا، نہ کبھی دو گھڑی ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق کی باتیں۔ اس بے کیف سی زندگی میں کوئی غلطی ہو جاتی تو باتیں سننی پڑتی تھیں۔
رات کی بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ سلیم کہنے لگا کہ کالج کے کچھ دوست اسے فلم میں جانے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ اس نے کہا "بھیا تو فلم دیکھنے کے لئے جانے کی اجازت نہیں دیں گے اور اگر میں نہیں گیا تو دوست ناراض ہو جائیں گے اور میرا مذاق اڑائیں گے۔"
سلیم کی بات سن کر اسے سلیم پر ترس آ گیا۔ خود اس کا دل کہنے لگا کہ اتنی بھی پابندی بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے سلیم کو سنیما جانے کی اجازت دے دی اور اس بات کا پورا خیال رکھا کہ اس بات کا پتہ جاوید کو نہ چلنے پائے۔ وہ رات کو اس وقت تک جاگتی رہی جب تک سلیم فلم دیکھ کر واپس گھر نہیں آ گیا۔ لیکن پتہ نہیں کیسے اس بات کی جاوید کو سن گن مل گئی۔ اس نے سلیم سے تو کچھ نہیں کہا، لیکن اس کی خبر لے ڈالی۔
"آخر اس میں برائی کیا ہے؟ سلیم سمجھدار ہے۔ اس پر اس طرح کی پابندیاں

ٹھیک نہیں ہے"۔ وہ جھنجھلا کر بولی۔
"تم میرے گھر کے ماحول کو بگاڑ رہی ہو۔"
نے سخت لہجے میں کہا اور پھر صاف
"تمہیں اس گھر میں رہنا ہے تو اس طرح
ے گا جس طرح میں چاہتا ہوں ورنہ تم
جا سکتی ہو۔"
اور اس نے طے کر لیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے
یکے چلی جائے گی۔
"بھابی! سوٹ کیس میں کپڑے بھر تے
اچانک وہ دیبا کی آواز سن کر چونک
۔ وہ شاید کالج سے واپس آگئی تھی۔
"آں" اس نے چونک کر مڑ کر دیکھا۔
"کیا کر رہی ہو؟" دیبا نے پوچھا۔
"اپنے گھر جا رہی ہوں" اس نے
دیا۔
"ہمیں چھوڑ کر؟" دیبا کی آواز میں کچھ
دتھا کہ اسے سن کر وہ بھی تڑپ اٹھی۔
ر دیکھا تو دیبا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
کے قریب ہی سلیم سر جھکائے کھڑا

"بھابی، ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ" دیبا آکر
ے لپٹ گئی۔ اور سسکنے لگی۔
"بھابی، جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار میں
۔ اس کی تم جو سزا دو، مجھے قبول ہے
اتنی بڑی سزا تو نہ دو، ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ۔
کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔
سے لپٹ کر رو دئے جا رہی تھی سلیم کی
یں بھی آنسو آگئے تھے۔
"بھابی!" سلیم کہنے لگا "مانا بھیا نے
لک کوئی خوشی نہیں دی۔ ہمیشہ تمہیں نظر انداز
رہے لیکن وہ اتنے برے نہیں ہیں

جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ اور تم ایسے وقت میں انہیں
چھوڑ کر جا رہی ہو جب انہیں تمہاری ضرورت ہے۔
اگر تم چلی گئیں بھابی تو وہ ٹوٹ جائیں گے۔ پہلے
سے زیادہ سنگ دل ہو جائیں گے۔ تم ہی تو اپنے
برتاؤ اور پیار سے بھیا کے پتھر دل کو موم کر سکتی
ہو۔ اگر تم ہی یہاں نہیں رہو گی تو پھر یہ کیسے ہوگا؟"
سلیم کی تڑپ دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔
اس نے اپنے دوپٹے سے دیبا کے آنسو پونچھے
اور اسے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے بولی "نہیں
پگلی! میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"
سلیم بھی پلنگ پر بیٹھ گیا۔
"بھابی، بھیا پہلے ایسے نہیں تھے لیکن
حد سے زیادہ ذمہ داریوں کے بوجھ نے انہیں
سخت بنا دیا ہے" دیبا کہنے لگی "جب وہ
صرف سولہ سال کے تھے تو ہمارے ابا کا انتقال
ہو گیا تھا۔ اس وقت ہم بہت چھوٹے چھوٹے
تھے۔ امی کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھیں پھر
بھلا وہ کاروبار کیا سنبھالتیں۔ اس لئے سارا
کاروبار بھیا کو سنبھالنا پڑا۔ اس چھوٹی سی عمر
میں ان کے کاندھے پر کئی ذمہ داریاں آگئیں۔
جب ان کے کھیلنے کودنے کے دن تھے
تو انہوں نے کاروبار بھی سنبھالا اور گھر بھی۔ ان
الجھنوں نے ان کی شخصیت میں نہ صرف سنجیدگی
پیدا کر دی، بلکہ انہیں کافی سخت بھی بنا دیا
اور پھر جب امی بھی نہیں رہیں تو بھیا کی ذمہ داریاں
اور بھی زیادہ بڑھ گئیں۔ ان پر ہماری پرورش
دیکھ بھال کا بوجھ بھی آگیا۔ وہ کاروبار کے ساتھ
گھر بھی دیکھنے لگے۔ اگر انہوں نے ہم پر پابندیاں
لگائیں تو صرف ہماری بھلائی کے لئے کہ کہیں ہم
اپنے اوپر کسی بڑے کا دباؤ نہ پا کر بھٹک نہ جائیں۔
ہم پر بھیا نے جتنی پابندیاں لگا رکھی ہیں ان

کا ہمیں کوئی دکھ نہیں ہے۔ ہمیں اس بات کا
احساس ہے کہ انہوں نے ایسا ہماری بھلائی
کے لئے ہی کیا ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت ضرور
دکھ ہوگا جب تم بھیا کو سمجھے بغیر ہمیں اور بھیا کو
چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔"
دیبا نے اتنی سمجھ داری کی باتیں کی تھیں کہ
اس کا دل ندامت سے بھر گیا۔ دیبا اس سے
چھوٹی ہو کر اتنی سمجھ داری سے سوچتی ہے اور اس نے
تو بات کی تہہ تک پہنچے بغیر ایک ایسا فیصلہ کر لیا
تھا جس سے اس کی زندگی تباہ ہو سکتی تھی۔
سچ مچ اس نے جاوید کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔
"نہیں دیبا!" وہ ایک نئے عزم کے
ساتھ بولی "میں تمہیں اور تمہارے بھیا کو
چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ سچ مچ اس وقت تمہارے
بھیا کو میری ضرورت ہے۔" وہ اٹھ کر اپنے
کاموں میں لگ گئی۔
جاوید جب دوپہر کا کھانا کھانے کے
لئے آیا تو وہ اس کے ساتھ اس طرح پیش آنے
لگی جیسے سویرے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس بات
کو محسوس کر کے پہلے تو وہ بھی چونک پڑا، پھر
ایک فاتحانہ تاثر اس کے چہرے پر ابھر آیا۔
"تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم میرے
گھر میں اس طرح رہو گی جس طرح میں چاہوں گا؟"
"اور کر بھی کیا سکتی ہوں؟" وہ پیار
بھرے لہجے میں بولی "کرنا ہی پڑا۔ بیوی
جو ٹھہری۔ ورنہ کون مجھے پوچھے گا۔"
اس نے یہ بات کچھ اتنے معصوم انداز
سے کہی تھی کہ اس کی بات سن کر جاوید زور سے
ہنس پڑا۔
اس نے عرصے بعد جاوید کے ہونٹوں
پر ہنسی دیکھی تھی۔

"نکہت" جاوید بولا "سلیم کا یہ میڈیکل
کا آخری سال ہے۔ اور تم خود جانتی ہو کہ اس
کے لئے یہ کتنا اہم سال ہے اگر وہ اس طرح
پڑھائی کے تین اہم گھنٹے فلموں میں برباد کرے
تو اس کی پڑھائی پر کیا اثر نہیں پڑے گا؟"
"روزانہ سات آٹھ گھنٹے تو پڑھتا
رہتا ہے۔ کیا ہفتے میں اسے ایک دن بھی دو چار
گھنٹے کی تفریح نہیں چاہئے۔ پھر یہ تو بتایئے
گزشتہ چار برس میں وہ کتنی بار کس کس مضمون
میں فیل ہوا ہے؟"
اس کی بات سن کر جاوید کسی گہری سوچ
میں ڈوب گیا۔ پھر اس سے بولا "یہ بات تھی
تو اسے مجھ سے اجازت لینی چاہئے تھی۔ کیا میں اسے
اجازت نہ دیتا؟"
"ہاں ہاں، گزشتہ برسوں میں تو اس نے
جب بھی آپ سے کسی بات کی اجازت مانگی،
آپ نے اسے اجازت دے ہی دی!" وہ ہاتھ
نچا کر بولی "اسے پتہ تھا کہ آپ اجازت نہیں
دیں گے، اس لئے اس نے مجھ سے اجازت
مانگی۔ اور میں نے یہ سوچ کر اسے اجازت
دے دی کہ میں بھی تو اس گھر کی کچھ ہوں ——
مجھے کیا پتہ تھا کہ میرا تو اس گھر میں کوئی مقام ہی
نہیں ہے۔"
"کیسی باتیں کرتی ہو نکہی۔" جاوید بولا "تم
ہی تو اس گھر کی بڑی ہو۔"
"لیکن مجھے کوئی حق نہیں ہے۔" وہ بولی
تو جاوید پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔
اس دن وہ بہت خوش تھی۔
جاوید سے دو تین باتیں ہی کیوں نہ ہوئی ہوں،
لیکن دل کھول کر باتیں ہوئی تھیں، ورنہ اس سے
پہلے تو یہ حالت تھی کہ جاوید کبھی کوئی ایسی بات
کہہ دیتا تھا جس سے اسے غصہ آ جاتا تھا
اور بات آگے بڑھتی ہی نہ تھی۔ یا جاوید کی بے رخی
کی وجہ سے وہ خود جاوید سے بات نہ کرتی تھی یا
پھر اس کی کوئی بات جاوید کو بری لگ جاتی تھی اور
جاوید اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ اور پھر وہ
بھی جاوید کو بات کرنے کے لئے مجبور نہیں
کرتی تھی۔ لیکن اس دن کی بات ہی الگ تھی۔
اس دن سلیم اور دیبا نے جاوید کی شخصیت
ایک کتاب کی طرح اس کے سامنے کھول کر
رکھ دی تھی اور اس نے طے کر لیا تھا کہ آج اگر
جاوید کوئی کڑوی بات بھی کہہ دے گا تو وہ برا
مان کر بات ختم نہیں کرے گی، بلکہ بات کو آگے
بڑھانے کی پوری کوشش کرے گی۔
اس کا غرور ٹوٹا تو جاوید کو بھی کھلنے کا
موقع ملا۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔
رات کو ہی اس نے جاوید کو اس بات
کے لئے آمادہ کر لیا تھا کہ چھٹی چھٹیوں کی طرح
گزاری جائے گی۔ کوئی بھی گھر کی چار دیواری میں
قید ہو کر نہیں رہے گا۔ اس تجویز پر پہلے اسے
جاوید کی ایک دو سخت سست باتیں بھی سننی
پڑی تھیں۔ لیکن جب وہ اپنی ضد پر اڑی رہی تو
جاوید کو بھی مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑے۔
اگلے روز سارا دن پر لطف گزرا۔ فلم میں
سب ساتھ گئے۔ اپنی اپنی پسند اور ضرورت
کی خریداری بھی کی۔ شام کو واپس آئے تو سب
کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔
"دیکھا، آج کی اس چھٹی سے سلیم اور
دیبا کتنے خوش ہیں؟"
"سچ سچ مجھے بھی آج اس طرح ساتھ
گھومنے میں بڑا مزہ آیا۔"
"آپ نے خود اپنی ان خوشیو
کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔" وہ بولی۔
"نکی، ایسا میں نے سلیم اور دیبا
کے لئے کیا تھا۔"
"جی نہیں" وہ بولی "سچ تو یہ ہے
بھلائی اور آزادی کے درمیان کوئی حد نہ
کر سکے تھے۔ آپ نے اپنے بہن بھائی
اپنے کاندھے پر لی لیکن آپ نے اسے
ڈھنگ سے نبھایا۔ ہر بات میں صرف
اور فیصلے کو پتھر کی لکیر سمجھا۔ اور اس ضد
پتھر بن گئے۔ نہ آپ پر کسی کے احسا
کوئی اثر ہوتا تھا، نہ آپ نے کسی کو اپنے
اور احساسات سمجھنے کا موقع دیا۔"
جاوید دیر تک اس کی باتوں پر
رہا۔ جاوید کو اس حالت میں دیکھ کر وہ ڈر گئی
"آپ کو میری باتیں بری تو نہیں
اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں نکی" جاوید بولا "تم نے
سچ کہا۔ میں اپنی ذمہ داری نبھاتے ہو
سے عاری ہو گیا تھا۔ آج تمہاری باتوں
مجھے انسان کے ان نرم احساسات اور
کا احساس دلایا۔"
جاوید کی باتیں سن کر اس کی آنکھ
چمکنے لگیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی
اور پیار سے جاوید کا پتھر کا دل بھی پگھل
ہے۔ تبھی جس کی طرف سے وہ اتنی مایوس
تھی کہ اس کی وجہ سے وہ اپنے گھر کو چھوڑ
تیار ہو گئی تھی، اس سنگ دل جاوید کو
کے پیار نے نرم دل بنا دیا تھا۔

پیٹ کا درد

ہیلتھ کلب

ایام کی ابتدا عورت کے بالغ ہونے
ے۔ گرم ممالک میں لڑکی کو نو دس برس
ماہ داری شروع ہو سکتی ہے، جب کہ
ں میں یہ سولہ سترہ برس کی عمر میں شروع
ہ۔ ہندوستان میں عموماً بارہ تیرہ سال
ں ایام کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات ایک انجان
زندگی میں ایک نفسیاتی حادثہ بن سکتی
لڑکی خوف زدہ ہو سکتی ہے۔ اسی لئے
ہیئے کہ وہ ایام کے شروع ہونے سے
ں کو اس بات سے آگاہ کر دے۔ یہ ایک
یز ہے۔ اس سے گھبرانا اور خوف کھانا غلط
ن اوقات مائیں اس سلسلے میں غلط رویہ
رتی ہیں۔ ایک ماں کی کئی بیٹیاں تھیں۔
اوند اس کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کی
ں زندگی ناخوشگوار تھی۔ جب اس کی پہلی
ے اسے اپنے ایام شروع ہونے کے بارے
تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور بولی " ہائے
ٹی! اب تیرے لئے مصیبت کا دور
ہو گیا! اب تیری شادی کی فکر کرنی ہے
ں تجھے کیسا شوہر ملے گا و تیری زندگی کیسے
" لڑکی قدرتی طور پر پریشان ہو گئی۔ اسے
ے قاعدہ اور درد کے ساتھ آتے رہے۔

ابتدا میں ایام کی بے قاعدگی سے پریشان
ں ضرورت نہیں ہے۔ دو تین سال تک
بے قاعدگی قدرتی ہے۔ اس کے علاوہ
یوں کو ایام سے پہلے پانی خارج ہوتا ہے
ل اگر بدبودار اور خراب رنگ کا نہیں
سے بھی گھبرانے کی بات نہیں۔ اگر کبھی
درد یا جلن کا احساس نہ ہو تو اسے قدرتی علامت
سمجھنا چاہئے۔

ماہ داری کے دوران کچھ عورتوں کو
درد کی شکایت ہوتی ہے۔ یہ شکایت اتنی عام
ہے کہ شاید ہی کوئی عورت یہ دعوی کر سکے
کہ اسے زندگی میں ایک بار بھی یہ شکایت نہیں
ہوئی۔ اس بیماری کے دوران کولہے میں
شدید درد ہوتا ہے۔ درد کی شدت ہر عورت
میں یکساں نہیں ہوتی۔ کسی کو معمولی سی تکلیف
ہوتی ہے تو کوئی درد کی شدت سے تڑپ
اٹھتی ہے۔ اس ضمن میں یہ جاننا ضروری ہے
کہ درد ایام سے کتنے دن پہلے اٹھتا ہے۔ بعض
عورتوں کو ایام سے تین چار روز پہلے کولہے
کے نچلے حصے میں معمولی درد کی شکایت ہوتی
ہے، جو ایام کے پہلے روز ہی رفع ہو جاتی ہے
یہ علامت ان عورتوں میں زیادہ پائی جاتی
ہے جو گھر سے باہر کام کرتی ہیں۔ ایام ان کے
کام میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں، اس لئے وہ
ان کی آمد سے پہلے ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔
عام گھریلو عورتیں اس شکایت سے دور رہتی
ہیں۔

ایام کی بے قاعدگی اور درد جسم میں
تھکان کا احساس پیدا کر دیتے ہیں۔ عورتوں کو
قبض کی شکایت بھی ہو سکتی ہے اور درد سر بھی
طبیعت میں چڑچڑاپن اور جھنجلاہٹ بھی پیدا
ہو جاتی ہے۔ اس جھنجلاہٹ سے سارا گھر
متاثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایام کے دوران
درد کی شکایت کسی جسمانی خرابی کی وجہ سے بھی
ہو سکتی ہے۔ اس لئے ایک بار ڈاکٹر سے ضرور
رجوع کرنا چاہئے۔ اگر کوئی اور شکایت نہ ہو تو
صحت کا خیال رکھنا کافی ہے۔ صحت بخش غذا
ہلکی ورزش اور گہری نیند صحت کے لئے ضروری
ہیں۔ نیند نہ آئے تو ٹرانکوالائیزر کی ایک گولی
سوتے وقت کھالیں۔ یہ دوا مسکن اور بے ضرر
ہوتی ہے۔ اس دوران میٹھی چیزوں سے پرہیز
کریں۔ جلاب بھی نہ لیں۔ نوجوان لڑکیوں میں
ایام کے دوران درد کی شکایت دو تین سال
تک ہوتی ہے۔ عمر بڑھتی ہے تو درد کی شکایت
بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ پچیس تیس سال کی
عمر میں شاذونادر ہی یہ شکایت باقی رہتی ہے۔

شادی کے بعد بھی یہ شکایت کم ہو جاتی ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد اور بھی کم ہو جاتی ہے کثیر الاولاد عورتوں کو ایک بچے والی عورت کے مقابلے میں یہ شکایت بہت کم ہوتی ہے۔ بانجھ عورتوں میں بھی یہ شکایت نہیں پائی جاتی۔ بعض عورتوں کو ایام کے درد کے ساتھ سینے میں بھی درد محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ درد عموماً ایام سے پہلے ہوتا ہے۔ ایام شروع ہوتے ہی سینے کا درد بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اگر سینے میں درد محسوس ہو تو نمکین چیزوں سے پرہیز کریں۔ مشروبات کا استعمال بھی کم ہونا چاہئے۔ بعض عورتوں کو ایام کے دوران پیٹ کے نچلے حصے میں شدید درد محسوس ہوتا ہے۔ بعض اوقات ڈاکٹر بھی اس معاملے میں دھوکا کھا جاتے ہیں اور اسے اپنڈکس کا درد سمجھ بیٹھتے ہیں۔ کچھ عورتیں اسی مغالطے کی وجہ سے آپریشن کی میز پر پہنچ گئیں، لیکن وہاں اپنڈکس صحیح سلامت نکلی۔

صحت سے متعلق معلومات

نیچے لکھے ہوئے سوالات کا جواب 'صحیح' یا 'غلط' میں دیں۔

(۱) اگر کسی انسان کے حلق میں کھانا پھنس جائے تو کیا اس کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارنا چاہیے؟

(۲) اگر لڑکپن میں ایام جلد شروع ہو جائیں تو کیا ادھیڑ عمر میں جلد بند بھی ہو جاتے ہیں؟

(۳) اگر سینے میں گٹھلی محسوس ہو تو کیا یہ کینسر کا پیش خیمہ ہے؟

(۴) اگر سینے میں درد ہو تو کیا گرم گرم کافی کی پیالی سکون پہنچاتی ہے؟

(۵) زکام ہو تو کیا مرغ کی یخنی فائدہ پہنچاتی ہے؟

جوابات صفحہ ۴۲ پر

کہتے ہیں کہ ایک ہی باغ میں کھلنے والے پھول
جدا جدا ہوتی ہیں۔ کوئی پھول کسی سہرے
بنتا ہے تو کوئی کسی قبر یا مزار کے لئے منتخب
یہی بات شیراز اور فراز پر بھی صادق آتی
یہی ماں کے پیٹ سے ایک ہی وقت میں
ے بیٹوں کی تقدیروں میں زمین آسمان کا
یہ فرق کبھی کبھی اتنا شدید ہو جاتا کہ فراز
یر کو دل ہی دل میں بے شمار صلواتیں سُنا
ں اوقات اسے ماں باپ پر بھی شدت سے
جنھوں نے امیر کبیر پھوپی کی گود میں اسے
یراز کو دے دیا۔ اسی لئے شیراز کو دنیا کا
ام میسر تھا۔

راز آج ہی شیراز سے مل کر آ رہا تھا اور اس
ں کے بعد بہت سی پچھلی باتیں اس کے
پر اُجاگر ہو گئی تھیں۔

یاض احمد کے گھر جب دو جُڑواں بچوں نے
اض احمد کی چہیتی اور دولت مند بہن عذرا
بھاوج سے ایک بچہ مانگ لیا۔ دونوں نے
ز کو عذرا کا بیٹا بنا دیا۔ ویسے عذرا بیگم کو
اچھا لگتا تھا لیکن فراز ذرا کمزور تھا، اس
دل یا سے الگ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا
سے دونوں بھائیوں کے بیچ ایک دراڑ
شیراز پھوپی پھوپا دونوں کا لاڈلا تھا۔
ت اس کے قدموں میں تھی یہ سب دیکھ کر
سے ہی محرومی اور یاسیت کا شکار ہو گیا
لت کا حصول اس کے لئے ایک چیلنج بن
یشہ وہ عجیب عجیب خیالوں میں گم رہتا
نے کی دُھن اور شیراز سے آگے نکل جانے
غ میں اس طرح سما گیا تھا جیسے پتھر میں
ی تحریر۔ مگر اس جنون سے اتنا فائدہ ضرور
میدان میں شیراز ہمیشہ پیچھے رہا اور فراز

جگمگاتے اندھیرے

آصفہ نزہت صدیقی

نے ہر امتحان میں ٹاپ کیا۔ شیراز کو تعلیم بوجھ لگتی اس لئے اس کے موجودہ والدین نے تعلیم ختم کرا کے اپنے پھیلے ہوئے بزنس کا بار اس کے کاندھوں پر ڈال دیا۔ فراز ایف۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد انجینئرنگ میں چلا گیا۔ ایک دن وہ کالج سے واپس آیا تو گھر اُسے سنسان سا لگا۔ فیاض صاحب اور ان کی بیگم کہیں گئے ہوئے تھے اور فراز کو چائے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی، اس لئے وہ رخسار کے کمرے کی طرف بڑھا جو اس کی اکلوتی بہن تھی اور سارے بے حد عزیز تھی۔ رخسار بھی شیراز کی نسبت فراز کو زیادہ چاہتی تھی۔ وہ دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھی، لیکن فراز پر بڑی بہن کی طرح حکم چلاتی اور شیراز سے ہمیشہ لڑتی رہتی۔

فراز جب رخسار کے کمرے میں پہنچا تو رخسار چہرے پر رسالہ رکھے ہوئے سو رہی تھی۔ فراز نے ایک ہاتھ سے اس کی لمبی چوٹی پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے رسالہ اٹھایا، مگر پھر گھبراہٹ میں رسالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا کیونکہ رخسار کے کپڑوں میں ملبوس وہ دوسری ہی لڑکی تھی۔ دونوں کے مونہہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اسی درمیان رخسار بھی دوڑتی ہوئی آ گئی

اور وہ بھی پورا قصہ سمجھ گئی۔ ہنستے ہوئے اس نے اپنی چہیتی سہیلی کا تعارف فراز سے کرایا۔ لڑکی بری طرح جھینپ رہی تھی رخسار نے کپڑوں کی تبدیلی کا واقعہ بھی اُسے بتایا۔ دوپہر کو خوب موسلا دھار بارش ہوئی تھی اور دونوں کالج سے آتے ہوئے پانی میں شرابور ہو گئی تھیں۔ اس لئے اس نے رخسار کے کپڑے پہن کر اپنے کپڑے الگنی پر ڈال رکھے تھے۔ یہ حسین حادثہ فراز کے دل میں ہلچل مچا گیا آج تک وہ صرف دولت کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ عورت کے بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ لیکن اس روز کے بعد سے رخسار کی سہیلی کا سانولا سلونا چہرہ دل کی جھیل میں مقید ہو کر رہ گیا۔

ایک دن اچانک شیراز وارد ہوا اس نے ہنستے ہوئے خوش خبری سنائی کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ ماں باپ نے سُنا تو خوشی سے جھوم گئے۔ رخسار بھی بہت خوش تھی۔ مگر فراز نے بے تابی سے پوچھا "کہاں کر رہے ہو شیراز شادی؟" شیراز نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "ڈیڈی کے چھوٹے بھائی ہیں نا جن کا بزنس ہمارے بزنس سے بھی بڑا ہے؟ ان کی اکلوتی بیٹی ہے — ڈیڈی چاہتے ہیں کہ گھر کی دولت گھر میں ہی رہے۔"

ماں باپ بیٹے کو مزید دولت ملنے کی خوشی میں نہال ہو گئے اور فراز نے دل میں سوچا اللہ میاں نے اس شیراز کو مونہہ میں سونے کا چمچہ دے کر دُنیا میں اتارا ہے۔ رخسار شیراز سے ایک دو باتیں کر کے چلی گئی۔ فیاض صاحب ان کی بیگم بھی اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے تو تنہائی پا کر فراز نے جلے دل کے ساتھ شیراز سے کہا "اچھی جگہ ہاتھ مارا ہے! تمہاری خوش بختی کے قائل

ہو گئے ہم تو!"

شیراز نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم بھی ایک سال بعد ایک قابل انجینئر بننے والے ہو اور ملازمت ملتے ہی لڑکیوں کے والدین کے لئے تم لقمۂ تر بن جاؤ گے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس گولڈن چانس کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ برسرِ روزگار ہوتے ہی ساون کی پھوار کی طرح رشتے تمہارے منتظر رہیں گے۔ عقل سے کام لے کر غربت کی ان ذلت آمیز تاریکیوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دو۔ سوسائٹی میں اپنا مقام بناؤ۔ ظاہر ہے ہم بڑے گھر کے داماد بنیں گے تو ہماری بہن بھی کسی بڑے اور دولت مند گھرانے کی بہو بن سکتی ہے۔"

شیراز کی تمام تمام باتیں فراز کے دماغ میں اترتی جا رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شیراز حقیقت بیان کر رہا ہے۔ واقعی دولت آج زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ لیکن اچانک ذہن میں چھناکا سا ہوا اور دیوارِ دل پر وہ چہرہ پھر ابھر آیا جسے ایک دفعہ دیکھا تھا اور دوسری بار دیکھنے کی تمنا بھی۔ دل کی آواز پر وہ بے چین ہو گیا۔ مگر اس نے تھپک تھپک کر دل کو خاموش کر دیا۔ شیراز کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہ بیٹھا سوچتا رہا۔ اچانک کمرے میں رخسار داخل ہوئی اور فراز ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

رخسار نے متانت سے کہا۔ "گھبرائیے نہیں بھیا، میں نے آپ کی اور شیری بھیا کی ساری گفتگو سن لی ہے۔ بھیا! شیری بھیا جو کچھ کر رہے ہیں، یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن آپ کی کھوپڑی میں جو زہر انہوں نے گھولا ہے، وہ ہمارے اس چھوٹے سے کنبے کے لئے ہلاکت کا سبب بن جائے گا۔ بھیا! جتنا بڑا ہاتھی لائیں گے، اتنے ہی اونچے گھر کے دروازے کرنے پڑیں گے۔"

"خاموش رہو!" فراز نے اپنے غصہ کو دباتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا مجھے رائے دینے کا۔ میں اپنا اچھا برا خود سمجھتا ہوں۔ آج کی دنیا میں دولت کے بغیر جینا ایسا ہی جیسے کوئی لنگڑا لولا محتاجی کی زندگی بسر کرے۔ شیراز کو دیکھ کر تو دولت کی پیاس اور بڑھ جاتی ہے۔ میں بچپن سے ہی اس کے قیمتی اور خوب صورت کھلونے اور کپڑے دیکھ کر ترسا ہوں۔ اس کی معمولی سی معمولی چیز دیکھ کر میں محرومی کی آگ میں جلا کرتا تھا۔ اب یہ موقع کھو کر کیا میں ہمیشہ مفلسی کی زندگی بسر کروں؟ ابو کے زمانے میں تو ہمیشہ گھنی بوٹی نیا شوربا والا معاملہ رہا۔ امی بچپن میں آڑے نہ آتیں تو آج میں پھوپی جان کا بیٹا ہوتا اور آج میرا طرزِ زندگی کتنا اعلیٰ ہوتا۔ مگر خرابیٔ قسمت کہ یہ ہو نہ سکا۔ لیکن اب جو راہ پیدا ہوئی ہے میں اسے ضرور اپناؤں گا۔ اپنی تعلیم کا، اپنی ڈگری کا پورا پورا فائدہ اٹھاؤں گا۔ سمجھیں تم!"

برسوں کا غبار آج فراز کے لبوں تک آ ہی گیا۔ غصے کی شدت میں وہ سب کچھ کہہ گیا۔ رخسار نے ایک نظر بھائی کو دیکھا اور اسے شدید دکھ کا احساس ہوا۔۔۔ بھائیوں پر ہی نہیں، بلکہ ان جیسی ذہنیت رکھنے والے تمام نوجوانوں پر۔ مردہ قدموں سے وہ وہاں سے جانے لگی۔ اچانک فراز کو کچھ یاد آیا اور اس نے رخسار کو روکتے ہوئے کہا۔ "رخسار، تمہاری وہ سہیلی جس سے اچانک میری مڈبھیڑ ہو گئی تھی، اس کا باپ کیا کرتا ہے؟" فراز کا سوال سنتے ہی رخسار بھڑک اٹھی۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "بھیا، وہ لڑکی آپ جیسے زر پرستوں کے لئے نہیں بنی ہے۔ وہ بہت ہی باکردار اور شریف لڑکی ہے۔ آپ جیسے لڑکوں کو ریشم کا کفن اور سونے کی قبر چاہیئے اور یہ چیزیں اس کے یہاں عنقا ہیں کیوں کہ اس کا باپ بھی ابو کی طرح متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا ہے سمجھے آپ؟" اور پھر رخسار جھٹکے سے نکل گ

شیراز کی شادی ہوئی اور خوب دھ ہوئی۔ طرفین نے ارمان نکالنے کے بہانے فضول خرچی کی اور جہیز کا جگمگاتا انبار کو دیکھ تو شیراز سے زیادہ فراز خوش ہو رہا تھا کیو اس میں اسے اپنا مستقبل اتنا ہی روشن نظر آ تھا۔

شادی کے چند ہفتے بعد فراز نے بہن کی م سماجت کی اور اسے لے کر شیراز کے گھر رو کیوں کہ وہ بھاوج سے درخواست کرنا چاہ کہ اپنی ہی طرح کی کوئی سونے کی چڑیا اس کے بھی تلاش کر دیں۔ دونوں پھوپی کے گھر پہنچے تو ش اور اس کی دلہن ناشتہ کر رہے تھے۔ شیراز اصرار کر کے دونوں بہن بھائی کو بھی میز پر بٹھا لیا فراز سے صبر نہ ہو سکا اور ناشتے کے بیچ ہی وہ اص موضوع پر آ گیا۔ شیراز نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ رخ خاموش بیٹھی رہی۔ شیراز کی بیوی نے سب کچھ سننے کے بعد بڑی رعونت سے کہا۔ "ویسے تو میری سب ہی سہیلیاں لکھ پتی والدین کی بیٹیاں ہیں، مگر ایک د کے علاوہ سب ہی آپ سے زیادہ کوالیفائیڈ لڑک کے لئے بک ہو چکی ہیں۔"

رخسار نے پہلی بار زبان کھولی۔ "گویا اچھا مال تو بک چکا ہے، بچا کھچا کوڑا کچرا ہی ہمیں بتائیے بس میرے بھائیوں کے ہاتھوں میں ٹی وی، فریج، کار کی لسٹ دے دیجئے۔ لڑکی کیسی بھی چل جائے گی۔"

دونوں بھائیوں نے تیز نظروں سے بہن کو گھورا اور اسے خاموش رہنے کی تنبیہ کی۔ شیراز کی بیوی بات سمجھ ہی نہ سکی تھی، اس لئے اس نے سلسلۂ گفتگو پھر جاری کرتے ہوئے کہا۔ "فراز صاحب آپ بالکل بے فکر رہیے میں آپ کے معیار کی کوئی

ی ضرور دیکھوں گی۔ اپنی سہیلیوں کے ماں باپ
ذرا مکھن لگانا پڑے گا، کیوں کہ صرف انجینرنگ
ڈگری پر ہی بھاری جہیز نہیں ملتا' بلکہ ذاتی پراپرٹی
ی کچھ ہونی چاہیے۔ ویسے آپ اطمینان رکھئے،
جی میں آپ کو کار ضرور دلاؤں گی۔"

شیراز نے مسرت سے بے قابو ہوتے ہوئے
ہا " چلو فراز' اس بات پر میری طرف سے منہ
ما کر لو۔ لو یہ حلوا کھاؤ۔"

شیراز نے خوب صورت طشتری فراز کی طرف
مائی۔ لیکن اچانک چھن سے آواز ہوئی اور طشتری
ں پر گر کر چور چور ہو گئی۔ نازک سی چینی کی طشتری
لی سے شیراز کے ہاتھ سے کیا گری ؛ جیسے بھونچال
یا۔ شیراز کی نئی نویلی دلہن کا چہرہ غصہ سے سرخ
یا۔ اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا
دیا نا میرے قیمتی سیٹ کو برباد! ایاں گفتہ دل بے رحم،
اسی کو کہتے ہیں۔ اپنی محنت سے کما کر لائے ہوتے تو
ایسی ناقدری نہ کرتے۔ مگر بے پرواہی کا یہی عالم رہا تو
میرا لاکھوں کا سامان اس طرح ٹوٹے کا ڈھیر بنا نظر
آئے گا۔ پرائے مال پر عیش کرنا ہے تو کچھ سلیقہ بھی
سیکھئے۔ مگر سلیقہ آئے کہاں سے؟ جس نے ایسی
نادر چیزیں دیکھی بھی نہ ہوں وہ انہیں استعمال
کرنے کے ڈھنگ کیسے جان سکتا ہے؟......"

شیراز کی دلہن دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ شیراز
کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ بے بسی اس کے چہرے
سے عیاں تھی۔ فراز اور رخسانہ بھی گم صم بیٹھے تھے
فراز کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ سوچ
رہا تھا کہ اگر جتن کر کے اس نے کسی مالدار گھر کی لڑکی
سے شادی کر بھی لی تو اسے کتنی بھاری قیمت ادا کرنا
ہو گی۔ ساری زندگی وہ اسی طرح خوار ہوتا رہے گا
عمر کا ہر پل اس کے لئے سُبکی، خفت اور تحقیر کا پیامی
ثابت ہو گا۔ گھریلو زندگی میں چاہت کی بہار آنا تو
دور کی بات ہے۔ ہر دم لعن طعن کی خزاں چھائی
رہے گی۔

کچھ دیر بعد رخسانہ کا ہاتھ پکڑ کر فراز اٹھ کھڑا
ہوا اور شیراز سے کہا: اچھا شیراز' ہم چلتے ہیں۔ شیراز
نے بے بسی کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس
سے معافی چاہی، شیراز کی دلہن نے بھی انہیں نہیں
روکا۔ اس کا تو منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

باہر نکلتے ہی فراز کے وجود میں سائیں سائیں
کرتے ہوئے جھکڑ ڈر کر گئے۔ رخسانہ کی سہیلی
کا سانولا سلونا چہرہ جگمگاتے چاند کی طرح اس کے
دل کی جھیل میں پھر اُتر آیا اور اس نے تہیہ کر لیا
کہ گھر پہنچتے ہی اپنی بہن کی منت سماجت کرے گا۔
کہ اس چاند کو ہمیشہ کے لئے گھر کے آنگن میں
لانے میں اس کی مدد کرے۔ ■■

خیال اپنا اپنا

نتیجہ بانو: مئی ۱۹۸۵ میں شائع ہو گا۔

یہ انعامی مقابلہ آپ کو موجودہ دور کے مختلف مسئلوں اور سوالوں کے بارے میں اظہارِ رائے کا موقع اور دعوت دیتا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات اور فکری نتائج دوسروں تک پہنچائیے اور انعام حاصل کیجئے۔

پہلا انعام : سو روپے
دوسرا انعام : پچاس روپے
تیسرا انعام : تیس روپے

اس ماہ کا سوال ہے : کیا ملازمت کرنے والی عورتیں بچوں کی بخوبی نگہداشت نہیں کر سکتیں؟

اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ لفظوں میں اپنے خیالات ہمیں لکھ بھیجئے۔ آپ کی تحریر ۱۵- مارچ ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جانی چاہئے:

"خیال اپنا اپنا" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ایک مریض ڈاکٹر کے پاس نظر ٹیسٹ کرانے کے لئے پہنچا۔ ڈاکٹر نے اس سے کہا سامنے کا چارٹ پڑھیے۔"

مریض نے چارٹ پر نگاہ دوڑائی اور بولا۔" میں نہیں پڑھ سکتا۔"

"ڈاکٹر نے کہا۔ ذرا اور قریب ہو کر پڑھو۔"

مریض تھوڑا سا آگے بڑھا اور پھر بولا۔

"میں نہیں پڑھ سکتا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ ذرا اور قریب ہو کر پڑھو۔"

مریض تھوڑا سا آگے بڑھا اور پھر بولا

"ڈاکٹر صاحب، آپ یقین کریں میں نہیں پڑھ سکتا۔"

ڈاکٹر بولا۔ "تو ذرا اور قریب ہو کر پڑھو"

مریض زچ ہو کر بولا "ڈاکٹر صاحب، میں بہت قریب سے بھی نہیں پڑھ سکتا۔ میں تو بالکل ان پڑھ ہوں۔"

●

کرایہ دار: کل رات بارش کے دوران چھت سے پانی اس طرح ٹپکتا رہا کہ ساری رات میں نہانے پر مجبور رہا۔ آپ اس سلسلے میں کچھ کریں گے یا نہیں؟

مالک مکان: آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ آپ کہیں تو میں آپ کو صابن اور تولیہ بھی فراہم کر دوں۔

●

ایک نوجوان جب اپنی کار پارک کر کے جانے لگا تو ایک پولیس افسر نے قریب آکر اس کو یاد دلایا "جناب آپ کی کار کی نمبر پلیٹ اُلٹی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" نوجوان نے کہا "اس طرح مجھے کار کی تلاش میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوتی۔"

●

امتحان کے ایک پرچے میں سوال تھا گائے پر ایک مضمون لکھئے۔ ایک لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ گائے کے بارے میں کیا لکھے۔ اس نے بہت دیر سوچنے کے بعد یوں لکھا۔

گائے ہماری ماتا ہے۔

اس کے آگے مجھے کچھ نہیں آتا ہے۔

جب اُستاد نے پرچہ دیکھا تو اسے بہت غصہ آیا۔ اور اس نے اس پرچے کے نیچے لکھ دیا۔

بیل تمہارا باپ ہے

ٹھہرو بیٹا باپ ہے۔

●

ایک کنجوس باپ نے اپنے بیٹے کو ایک نیا چشمہ دلوایا۔ بیٹا کرسی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

کنجوس باپ نے بیٹے کو آواز لگائی۔

کیوں بیٹا کچھ پڑھ رہے ہو؟

کچھ نہیں ڈیڈی۔

باپ نے پھر پوچھا تو کچھ لکھ رہے ہو؟

جی نہیں ڈیڈی۔

باپ نے غصے سے کہا۔ تو پھر چشمہ اُتار کر کیوں نہیں رکھ دیتے۔ لگتا ہے تمہیں فضول خرچی کی عادت پڑ گئی ہے۔

●

ایک شخص نے دیکھا۔ ملا نصیر الدین ایک قبر کے پاس بیٹھا زار و قطار رو رہا ہے۔ اس شخص نے پوچھا کیا یہ قبر آپ کے فرزند کی ہے؟ نصیر الدین نے جواب دیا نہیں۔ والدہ یا والد صاحب کی قبر ہے۔

نصیر الدین نے کہا نہیں۔ یہ میری بیوی کے پچھلے شوہر کی قبر ہے۔ خود تو مر گیا اور اپنی بلا میرے سر ڈال گیا۔

●

خود بھی ہنسیے، دوسروں کو بھی ہنسایئے۔ نئے نئے، مزہ دار، چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجیے۔ پرانے گھسے پٹے، بار بار سنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجیے، کیوں کہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

بیوٹی کارنر

حسن کاری میں خوشبو کا استعمال

شہناز حسین

مورخین یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ خوشبو کس نے ایجاد کی۔ لیکن خوشبو کا استعمال دنیا میں اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسان کی تہذیب۔ آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے ہندوستان سے مشک اور عنبر، عود اور لوبان روم کے دربار میں پہنچتے تھے۔ ہندوستان کے تاجران خوشبوؤں کی منھ مانگی قیمت پاتے تھے۔ عرب ممالک میں آج بھی خوشبو کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کا عطر آج بھی وہاں مقبول ہے لیکن اب اس کی جگہ یورپ کے بنے ہوئے سینٹ لے رہے ہیں۔

خوشبو کا استعمال عطر اور سینٹ تک محدود نہیں ہے خوشبودار صابن، اُبٹن اور خوشبودار مٹی کے ڈھیلوں کا استعمال بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ پہلے بزرگ عورتیں کنواری لڑکیوں کو عطر استعمال کرنے سے منع کرتی تھیں، لیکن اب ہلکے سینٹ نکل آئے ہیں اور کنواری لڑکیاں انہیں استعمال کرتی ہیں۔ عطر اور سینٹ کے علاوہ خوشبودار مٹی کا استعمال بھی عام ہے اس مٹی کو باریک کپڑے کے تھیلے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ خوشبو کی یہ چھوٹی تھیلیاں انگریزی دوا فروشوں کے یہاں عام ملتی ہیں۔ انہیں کپڑے کے صندوق یا الماری میں رکھنے سے کپڑوں میں بھینی بھینی خوشبو بس جاتی ہے۔ اگر لڑکیاں سینٹ کا استعمال نہ کریں تو کوئی مضائقہ نہیں، کپڑوں سے نکلتی ہوئی خوشبو مہمان کی دل کشی کے لئے کافی ہے۔

خوشبو کے استعمال کے لئے بھی حسنِ انتخاب ضروری ہے۔ اس کے لئے آپ کو اپنی شخصیت اور پسند کا خیال رکھنا چاہئے۔ اگر آپ میں نسوانیت کا عنصر زیادہ ہے، آپ لمبے بال رکھنا پسند کرتی ہیں، گھر میں کوئی مہمان آئے اور اس کی گود میں پیارا بچہ ہو تو آپ اُسے گود میں لینے کی خواہش کرتی ہیں، بازار میں کوئی بچہ گاڑی دکھائی دے جائے تو اس میں جھانکتی ہیں، آپ کو مردانہ لباس پہننا پسند نہیں، گھرداری اور گھر کو سجانے کا شوق ہے — اگر آپ اس ٹائپ کی عورت ہیں تو آپ کو ہلکے زرد، نیلے اور گلابی رنگ زیادہ پسند ہونے چاہئیں۔ اس ٹائپ کی عورتوں کے لئے ایسے عطر یا سینٹ مناسب ہیں جو پھولوں سے تیار کئے گئے ہوں۔ کچھ لوگ اس بات کو پڑھ کر یہ سوچیں گے کہ عطر اور سینٹ تو پھولوں سے ہی تیار کئے جاتے ہیں لیکن یہ بات زیادہ صحیح نہیں ہے مثلاً خس کا عطر پھولوں سے تیار نہیں کیا جاتا۔ صندل کا عطر بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ عطریات کے کچھ ماہرین مٹی کا عطر بھی بناتے ہیں۔ ایسی لڑکیوں اور عورتوں کو جوہی، چنبیلی، موتیا اور گلاب کے عطر استعمال کرنے چاہئیں۔ سینٹ خریدیں تو اس کی شیشی پر بھی پھول کا نام پڑھ کر خریدیں۔

اس کے برعکس اگر آپ کو کھیل کود لینا

ہے، گھر میں آپ کا کام گھٹتا ہے۔ آپ بال کٹوانا چاہتی ہیں، آپ جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ بازار میں نکلتی ہیں تو ہمیشہ ان سے آگے نکل جاتی ہیں، آپ کی دوست آپ کو ٹوکتی ہیں کہ ذرا آہستہ چلیے۔ ان عادتوں کے معنی یہ ہیں کہ آپ گھریلو ٹائپ عورت نہیں ہیں۔ اس صورت میں آپ کو وہ عطر یا سینٹ استعمال کرنے چاہئیں جو لکڑی سے بنائے گئے ہوں۔ اس میں صندل اور خس کا عطر سر فہرست ہے۔ اس کے علاوہ روز وڈ اور لیونڈر بھی مناسب ہیں۔

اگر آپ کتابوں کی شوقین ہیں، زیادہ وقت مطالعہ میں گزارتی ہیں، اسکول یا کالج میں اپنی سہیلیوں کا ہوم ورک کراتی ہیں، سنجیدہ ہیں، لباس اور میک اپ میں قدامت پسند ہیں، تو آپ کو ہلکے سینٹ استعمال کرنے چاہئیں۔ ایسے سینٹ بھی جن میں لونگ الائچی یا ادرک کی خوشبو شامل ہو۔

اگر آپ آرٹسٹ ہیں، شعر و شاعری سے لگاؤ ہے، موسیقی پسند کرتی ہیں، غزلوں کے ریکارڈ سنتی ہیں، فلمی رسالے پڑھتی ہیں، لباس میں کنٹراسٹ پسند کرتی ہیں، لال اور فالسئی رنگ آپ کو اچھے لگتے ہیں تو آپ کو معقول خوشبو استعمال کرنی چاہئے۔ نہ بہت تیز نہ بہت ہلکی۔

اگر آپ اعلیٰ ذوق کی مالک ہیں، لڑکیوں سے زیادہ مردوں سے باتیں کرنا بہتر سمجھتی ہیں، نئے نئے فیشن آزماتی ہیں، حسن کاری میں دلچسپی ہے، زیور اور کپڑے کے انتخاب میں لوگ آپ سے مشورہ لیتے ہیں، آپ خود ہلکا زیور اور ہلکے رنگ کے لباس پسند کرتی ہیں، آپ کو سیر و سیاحت کا شوق ہے، تو آپ کو اعلیٰ قسم کے سینٹ استعمال کرنے چاہئیں۔

سستی اور عام خوشبو آپ کے لئے نہیں۔ آپ تیز خوشبو والے عطر مثلاً حنا بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ یا ایسے ولایتی سینٹ جن میں مشرقی جڑی بوٹیوں کا یا پھولوں کا استعمال کیا گیا ہو۔ مشرق اور مغرب کے ملے جلے سینٹ آج کل بہت مقبول ہیں۔

خوشبو کے استعمال کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ لوگ اسے پہچان لیں۔ آپ جس انسان کے قریب بیٹھی ہوئی اس کو خوشبو کی لپٹ پہنچ جائے۔ لیکن اس میں بھی اعتدال سے کام لینا ضروری ہے۔ اگر آپ تیز خوشبو والا عطر استعمال کریں تو اس کے استعمال میں کفایت سے کام لیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے، خوشبو کا دائرہ عطر اور سینٹ کی شیشیوں تک محدود نہیں۔ صابن اور اُبٹن بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ میسور کا صندل سوپ بہت عرصے سے ہندوستان میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ ذرا ہلکا ہوتا ہے۔ اس کی ٹکیہ چار یا پانچ بار نہانے سے گھل جاتی ہے۔ لیکن غسل کے بعد جسم سے صندل کی بھینی بھینی خوشبو نکلتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ گرمیوں میں خس کا صابن اور لیڈی کاین کا صابن بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جاڑے میں صندل سوپ مناسب ہے۔

اُبٹن کا استعمال اب تقریباً متروک ہو چکا ہے مگر شادی بیاہ کے موقع پر اسے خوب استعمال کیا جاتا ہے۔ دولہا دلہن کے لئے اُبٹن لگانا ایک پرانی رسم ہے۔ لیکن یہ شادی کے دن تک ہی محدود ہے۔ پہلے گیلا اُبٹن جسم پر لگایا جاتا ہے پھر خشک اُبٹن کی مدد سے اسے جسم سے چھڑا لیا جاتا ہے۔ اس عمل سے جسم میں آ[illegible] کی خوشبو بسی رہتی ہے۔ عام دنوں میں لگانا دردِ سر ہے۔ صابن کا استعمال [illegible] آسان ہے۔ اس لئے لوگ صابن کو [illegible] ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن یورپ نے اُبٹن [illegible] ہی میں دریافت کیا ہے۔ وہاں لوگ ا[illegible] مشرق کا عجوبہ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں [illegible] ہوتا ہے کہ وہ زمانہ جب ہندوستان [illegible] حسن کاری کا سامان یورپ جاتا تھا، پھر آ گیا ہے۔ گویا تاریخ خود کو دہرا رہی [illegible] میں جب گزشتہ دنوں یورپ گئی تو وہا[illegible] ہندوستان کا تیوہار منایا جا رہا تھا۔ میں [illegible] بھی اس جشن میں حصہ لیا۔ لندن کے سب [illegible] بڑے اسٹور سیلف ریجز میں ایک اس[illegible] لگایا۔

نمائش کے پہلے دن ہی لوگوں کا [illegible] بندھ گیا۔ میں سیلز گرل کی مدد کے لئے ا[illegible] پر پہنچ گئی۔ وہاں اتنی بھیڑ تھی کہ خود میرے [illegible] وہاں داخل ہونا مشکل ہو گیا۔ وہاں کا منظ[illegible] دیکھنے کے لائق تھا۔ عورتیں ایک دوسر[illegible] پر ٹوٹ رہی ہیں کہ کہیں ہندوستان کی جڑ[illegible] بوٹیوں سے تیار کیا ہوا میک اپ کا سامان ا[illegible] کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ کوئی عورت مال کے دام نہیں پوچھتی تھی بس اسے یہی ف[illegible] تھی کہ سامان نہ ختم ہو جائے۔ ایسا معلوم ہو[illegible] تھا کہ یہ سارا سامان مفت تقسیم ہو رہا ہے۔ یہ عورتیں اس قدر پاگل ہو گئیں کہ انہیں تہذیب اور اخلاق کا خیال بھی نہیں رہا۔ سامان ایک عورت کو دیتی تو دوسری اسے جھپٹ لیتی کہ یہ تو مجھے چاہئے۔

ہاں، تو بات خوشبو کی ہو رہی تھی۔ اب

دیکھ رہے ہیں۔ بالکل غیر جانب داری
سے۔ یوں ہی تو کہانیوں کا جنم ہوتا ہے۔
کوئی نفسیاتی وجہ بھی ہو سکتی ہے جس کے
پیچھے بھی کوئی دل چسپ حقیقت ہوگی۔

پیاری سلطانہ، گنٹور (آندھرا)

س :۔ آنٹی! کیا آج کے دور میں دوستوں
پر بھروسہ کرنا حماقت ہے اور انسان
اپنی عادت سے کب باز آتا ہے؟

ج شوہر کے سوا اور بھروسہ کس پر کر سکتی ہے
بیوی؟ اگر بری عادتیں ہیں تو روٹی کپڑے
کی خاطر جھیلنا ہی پڑیں گی۔ خود چار پیسے
کمانے کی سکت ہو تو گزارا ممکن ہے
اگر رکھنا نہیں تو بیوی مختلف طریقوں سے
انتقام لے سکتی ہے۔ یا علیحدہ ہو کر کوئی
اور سہارا ڈھونڈ لے۔

س :۔ انسان پتھر دل کب کیوں بن جاتا ہے
اور کسی کی ہمدردی دوسرے کے زخم پر
نمک پاشی کب بن جاتی ہے؟

ج مثلاً میں خود اس وقت دل پر پتھر رکھ کر
آپ کو رائے دے رہی ہوں۔ ہمدردی کا
دعویٰ نہیں کہ نمک پاشی کا خدشہ ہے۔
مگر سچ تو یہ ہے کہ میاں بیوی کے جھگڑوں
کا فیصلہ کوئی تیسرا نہیں کر سکتا جس شوہر کا
آپ ذکر کر رہی ہیں وہ صاف گو نہیں۔

س :۔ جسم اور کپڑے گندے ہوں تو پانی سے
صاف کر لیا جاتا ہے لیکن کسی کا دل
گندہ ہو تو؟

ج دل کسی کا گندہ نہیں ہوتا ذہن گندہ
ہوتا ہے۔ کوئی نفسیات کا ماہر ہی
ایسے قابلِ رحم انسان کا علاج کر سکتا ہے
تیرے میرے نسخے کام نہیں آتے۔

اپنی آگ میں خود جلنا ہوتا ہے۔ اگر شوہر
اس مرض میں مبتلا ہو تو اس کی تعلیم اور
تربیت کا قصور ہو سکتا ہے یا رسیلا
زندگی میں اس کی ذلت کی جاتی ہے
جس کا احمق بیوی سے انتقام لیتا ہے۔

اقبال احمد صدیقی، کسرول مراد آباد

س :۔ جس کی بیوی کالی ہو اسے حوریں کالی
ملیں گی یا گوری؟

ج جہاں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی
نعوذ باللہ، غالب ضرور دوزخ میں
رونق افروز ہوں گے۔ ولائتی تو کالی رنگت
پر مرتے ہیں۔ میاں کالا ہو تو کالی بیوی
سے بہت بدکتا ہے۔ گورے کالوں
پر ہی مرتے ہیں۔

س :۔ کیا حوریں صرف کنواروں کو ملیں گی؟

ج اگر ملیں تو صرف مولویوں ملاؤں اور پیروں
کو ملیں گی۔ باقی بچیں تو امیروں کو
ملیں گی کہ وہ حج کر کے خیرات کر کے
مسجدیں بنا کر سیٹ جنت میں ریزرو
کروا لے جائیں گے۔ شاید کنواروں کو
تو نہیں ملیں گی کہ دنیا میں شادی نہ کر کے
کفرانِ نعمت کے سزاوار ہوں گے۔

تسنیم فاطمہ شمسی، مراد آباد

س :۔ غریب کا دل اتنا نازک اور فیاض
دل کیوں ہوتا ہے؟ جب کہ امیر اور غریب
دونوں ایک ہی خدا کے بندے ہیں!

ج بندھا مار کھاتا ہے۔ عام طور پر غریب
امیر کے آگے سر جھکا کر جیتا ہے اس کا
افسر اس سے امیر ہوتا ہے۔ غریب کا تو
پتھر کا کلیجہ ہوتا ہے۔

س :۔ کسی کا دکھ درد سن کر غریب ہی کیوں
تڑپتا ہے؟ جب کہ اس سے کوئی رشتہ
بھی نہ ہو؟

ج زبانی جمع خرچ کرتا ہوگا غریبوں کی اتنی
زبردست طاقت ہے مگر غریب ہی
امیر کی جان و مال کی حفاظت اور چوکیداری
کرتا ہے۔ اس کی خدمت گزاری کرتا
ہے۔ دنیا میں زیادہ غریب ہیں امیر گنتی
کے امیر حکومت کرتے ہیں۔ ان سے
غلاظت اٹھواتے ہیں اوپر سے ٹھوکر
مارتے ہیں۔ وہ سہتا ہے بے حس اور
بے شرم ہے ورنہ ایران کے بادشاہ
جیسا امیر کا حال دم بھر میں کر سکتا ہے
امیر چور ڈاکو اسمگلر راج کرتے ہیں! اس
میں کس کا قصور ہے چند امیروں کا
یا کروڑوں غریبوں کا؟ غریبی ایک لعنت
ہے اس پر فخر کرنا حماقت ہے۔

نسیم جعفری، رانچی

س :۔ زندگی خوشی کے بوجھ سے کب
دب جاتی ہے؟

ج خوشی ضرورت سے زیادہ بھاری بھرکم
اور موٹی تازی ہو تو اس کا بوجھ اپنی جان
پر ہی پڑتا ہے۔ بوجھ عام طور پر مرد ہی
ڈھوتے ہیں خوشی حاصل کرنا ہی تو
مقصدِ زندگی بن گیا ہے۔ چوری سے
بے ایمانی سے اسمگلنگ سے جیسے
بھی ملے لینا ہی ایمان بن گیا ہے۔

س :۔ زندگی غم کے بوجھ سے کب دب جاتی ہے؟

ج جب بھی غموں کا پہاڑ سامان پڑھے پڑتا ہے
انسان نصیب کو کوستا ہے بوجھ کو ہٹانے کی
ترکیب نہیں سوجھتی۔

چال ڈھال کو کیسے متوازن بنائیں

پاکیزہ حبیب

مگر اس پر بیرونی اثرات کے پڑنے ہے اس میں خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان سے پہلے اس کائنات میں جانوروں کا دور دورہ تھا۔ اس لئے اُن کی عادات اور چال ڈھال سے انسان بھی متاثر ہوئے۔ مستی بھری چال کو مورنی کی چال کہا گیا، دھیمی رفتار سے چلنے والے کو کچھوا چال اُچک اُچک کر چلنے والے کی چال کو خرگوش اور مینڈک کی چال بتایا گیا۔ پٹک مٹک کر چلنے والے انداز کو بطخ کی چال سے تشبیہ دی گئی۔

اخلاقی قدروں کا تقاضہ ہے کہ انسان کو نظر نیچی کر کے چلنا چاہئے مگر اس سلسلے میں یہ طنز بھی گڑھا گیا ہے کہ دشمن کی نظر ہمیشہ پیروں کی طرف ہی رہتی ہے۔ اس اخلاقی پہلو سے قطع نظر چال دو طرح کی ہوتی ہے۔ متوازن اور غیر متوازن۔ اگر انسان میانہ روی سے چلے تو یہی متوازن چال ہوتی ہے۔ غیر متوازن چال کئی طرح کی ہوتی ہے، شلاً بطخ کی طرح ایسے چلنے والے عموماً اپنے پیروں کو بطخ کی طرح گھسیٹ کر چلتے ہیں۔ عموماً یہ کیفیت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا جسم غیر متناسب، بھدا اور بے ڈول ہوتا ہے۔ بطخ کی طرح چال میں پاؤں کا انگوٹھا سیدھا نہیں پڑتا، بلکہ دوسرے پاؤں کے انگوٹھے کی طرف مڑا ہوا پڑتا ہے۔ اس غیر متوازن چال کو درست کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ چلنے والا یہ تصور کرے کہ اس کے راستے میں ایک سیدھی لکیر کھینچ دی گئی ہے یا وہ پُل صراط سے گذر رہا ہے۔ اور اسی اعتبار سے محتاط ہو کر چلے

دیوار سے لگ کر سیدھا کھڑا ہونے سے بھی غیر متوازن چال درست ہو سکتی ہے کیونکہ اس طرح سے پیٹ اندر کی طرف ہو جاتا ہے جب کہ بڑھا ہوا پیٹ چلنے میں پیروں کو متزلزل کر دیتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ چلنے میں ہمیشہ پیٹ اندر کی طرف اور چھاتی باہر کی طرف ہو۔ کندھے سیدھے اور کولہے اندر کی جانب ہوں گویا ایک رسی ریڑھ سے باندھ دی گئی ہے جس کے کھنچاؤ سے پیروں میں حرکت آ رہی ہے اس ورزش کو پابندی سے کرنے میں آخر میں اتنی مہارت حاصل ہو جائے گی کہ پھر کچھ مشکل معلوم نہ ہو گا۔ اگر پوری ریڑھ دیوار کو چھونے لگے تو گھٹنوں میں بہت ہلکا سا خم آ جائے گا۔

شروع شروع میں اس طرح چلنے میں کچھ مشکل اور عجیب سا محسوس ہو گا کیونکہ جسم کی جو رگیں ڈھیلی چھوڑ دی گئی تھیں۔ اب وہ اپنی جگہ پر آ رہی ہیں۔ اس سے پیٹ کا مٹاپا بھی کم ہو گا اور اس کے ساتھ ہی پیٹ کے اندرونی حصے بھی متوازن اور متناسب ہو جائیں گے۔

مشرقی اقدار کی حامل عمر رسیدہ خواتین لڑکیوں بالیوں کی چال کی درستگی پر بہت زور دیا کرتی تھیں۔ وہ نوعمر لڑکیوں سے کہا کرتی تھیں کہ انہیں اپنے سر پر کتاب رکھ کر چلنا چاہئے کیونکہ ذرا سی بے قاعدگی یا بے احتیاطی سے کتاب سر سے نیچے گر سکتی ہے۔

دورِ جدید میں شاید دکان داروں نے اپنے شوکیسوں میں قدآدم شیشے چلنے والوں کی غیر متوازن چال کو درست کرنے کے لئے لگائے

[illegible] سراپا کا جائزہ لے اور کن انکھیوں سے یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ اس کی چال میں کوئی قابلِ گرفت تو بات نہیں

چال ڈھال کو اس لئے بھی قابلِ غور اور قابلِ اصلاح مرحلہ کہا جاتا ہے کہ انسان کا پہلا قدم جس سمت میں اور جس زاویے سے پڑے گا لامحالہ اگلا قدم بھی اسی سمت اور اسی زاویہ سے اٹھے لہذا کوشش کرنا چاہئے کہ پہلا ہی قدم صحیح سمت میں اٹھے، کیوں کہ ایک بار تجربہ کرنے کے بعد تو انسان لکیر کا فقیر ہو جاتا ہے۔

چال ڈھال کے تزلزل اور بے ضابطگی سے انسان کی ذہنی کیفیات بھی جھلکتی ہے مثلاً جب ذہن پریشانی سے دوچار ہوتا ہے تو انسان جلد جلد قدم اٹھاتا ہے۔ اس وقت اسے یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ مگر اسے دیکھ کر دوسرے لوگ غلط نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔

تاڑ آسن چال ڈھال کو درست کرنے کے لئے بہترین طریقہ مانا گیا ہے۔ اس میں ایڑیاں ملا کر ہاتھ اوپر اٹھا کر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ کوئی اوپری طاقت ہوا میں کھینچ رہی ہے دس منٹ تک یہ ورزش کرنے سے ریڑھ کی ہڈی اور رگیں بھی سیدھی ہو جاتی ہیں یہ آسن خاص طور سے جھک کر چلنے والوں کے لئے جن کے قد لمبے ہوتے ہیں بہت مفید رہتا ہے۔

بڑے بڑے ہوٹلوں اور صحت کلبوں میں ایسی مشینیں بھی نصب ہو گئی ہیں، جن سے چال ڈھال درست ہوتی ہے۔

اپنی مرضی سے ان میں سے کوئی طریقہ چُن کر اس پر عمل کرنے سے انسان خصوصاً لڑکیاں اور خواتین اپنے نکتہ چینوں کا مونہہ بند کر سکتی ہیں۔ ■■

صاحب :

ـــروری کے مطالعہ کی شروعات
افتتاحیہ سے کی جو حسبِ روایت
پُر اثر ہے۔ نئے کالموں کے اضافے
ید دلکش بنا دیا ہے۔ ضرورت
ہے کہ بانو میں کم از کم دس صفحات
افہ ہو تاکہ مضامین اور کہانیوں کے
ارید کھا جاسکے۔

شمارہ کے تمام افسانے اچھے ہیں۔
ہ صفیہ سلطانہ کا "چارہ گر" ڈاکٹر
ں کا "سفر ٹی ون اسے" تنویر اختر
ندھیرے کے خلاف" اور سعید فریدی
آرزو" بے حد پسند آئے۔
ذ میں مصنف نے پردیسیوں کی
ے دلکش انداز میں پیش کیا ہے
سروں کی خواہشات کی تکمیل اور
ی خاطر وہ اپنوں سے دور وطن کو
جاتے ہیں۔

متین صدیقی، حیدرآباد

حبہ :

، فروری کا افتتاحیہ پسند آیا یہ دیکھ کر
، بانو ایک ماڈرن عورت کا رسالہ
ہار حود اسلامی قدروں کا علم بردار
دے زورِ شباب اور زیادہ!

فریدہ شیخ، بمبئی ۹۴

زوری کا بانو "حسنِ ترتیب کا شاہ کار ہے۔
دل کے زخم" پسند آئی "چارہ گر"
ہے خاص طور سے ڈاکٹر کا یہ جملہ
ہ پسند آیا "تم مریض ہو میں ڈاکٹر ہوں۔
لاج میں کروں گا"

افسانہ "لونڈی" کا مرکزی کردار کم زور ہے
ویسے وقت گزاری کے لئے افسانہ بُرا نہیں!
منظوم حصے بھی قابلِ تحسین ہیں۔

فریدہ بیگم، جمشید پور

مدیر دیدی :

بانو : فروری ملا۔ سرورق کی جتنی تعریف
کی جائے کم ہے۔ افتتاحیہ کا کیا کہنا۔ وہ تو ہمیشہ
بڑھ چڑھ کر ہی ہوتا ہے۔ بانو ہمارا بہترین ساتھی
ہے کبھی دل نہیں لگتا تو ہم پرانے شمارے
پڑھنے لگتے ہیں۔ پتہ نہیں بانو سے اتنا پیار
کیوں ہے۔

شمیم سلطانہ، گنٹور

مدیرہ صاحبہ :

سب سے زیادہ خوشی آپ کے اس
اعلان سے ہوئی کہ بانو کا یادگار سالنامہ جلد ہی
منظرِ عام پر آرہا ہے۔ اس اعلان نے تو
بے صبری اور بھی بڑھا دی ہے کہ بس جلد مارچ
آجائے اور سالنامہ ہمارے ہاتھوں میں آجائے۔

فروری کے بانو میں افتتاحیہ اور
گیتانجلی ایر سے ملاقات بہت پسند آئی۔
سعید فریدی کا افسانہ "تکمیلِ آرزو" آج کے
دور کی صحیح عکاسی ہے۔ ساتھ میں بانو کا نیا
روپ بہت اچھا لگا۔ مبارک ہو۔

جویریہ صدیقہ سہروردیہ، گیورائی بیڑ

محترمہ :

جنوری کا شمارہ پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے
بانو کے ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔
جا بجا انعامی مقابلے نئے نئے کالموں کا آغاز
اور سب سے بڑھ کر سالنامہ کی اشاعت کی
خبر جسے پڑھ کر دل مچلنے لگا۔

اس بار کہانیوں میں "ایک خط" نے
بہت متاثر کیا۔ غیر ممالک جا کر روپیہ کمانے
کی ہوس ایک ناسور ہے۔ ازدواجی زندگی
پر اثر انداز ہونے کے ساتھ یہ ملک و قوم کی
ترقی میں بھی رکاوٹ بنی ہے۔ خورشید ملک
نے ماہرِ جراحی کی طرح اس ناسور کی تشریح
کی ہے۔

"باورچی خانہ" میں گاجر کے تین چار
لوازم دیکھ کر آپ کی موقع شناسی کی داد دینی
پڑے گی کیوں کہ آج کل بازار میں گاجروں کی
افراط ہے۔

سبحان خاں محبوب خاں
ناسک سٹی

سوئیٹ بہن :

جنوری کا شمارہ اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ اس شمارے کے سارے افسانے معیاری ہیں بخاص طور پر "یادوں کے سہارے" اور "ایک خط" مضامین میں "بالوں پر ستاروں کا اثر" اور "بچوں کی خود اعتمادی میں والدین کا حصہ" قابلِ ستائش ہے۔ افتتاحیہ اپنی مثال آپ ہے۔ "بزمِ بانو" کے تحت عصمت آپا کے جوابات پڑھ کر دل عش عش کر اُٹھتا ہے۔

صدیقہ آفرین شکر اللہ، مونگیر

محترمہ :

جنوری کا بانو ایک ریلوے بک اسٹال سے خریدا۔ عورتوں کا رسالہ ہے مگر سفر میں پورا پڑھ ڈالا۔ بہت لطف آیا۔ آپ کی کاوشوں کا بھی اندازہ ہوا کہ آپ خواتین کو گھر بیٹھے پورے جہان سے روشناس کراتی رہتی ہیں۔ شہناز رفیع چودھری کا مضمون "عورتوں کی نفسیات اور ہائی بلڈ پریشر" بہت معلوماتی تھا۔ عورتیں اور لڑکیاں اس مضمون سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہیں۔ "بچوں کی خود اعتمادی میں والدین کا حصہ" بھی بہت پسند آیا۔

نادرہ مجاز، کلکتہ

ڈیئر دیدی :

بانو : جنوری پا کر دل کھِل اُٹھا۔ افتتاحیہ ہمیشہ کی طرح بہت پیارا ہے۔ سرِ ورق دیکھ کر نگاہ ہٹانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ افسانے وغیرہ سب ہی اچھے ہیں۔ مگر افسانے ذرا طویل ہوں تو زیادہ مزہ آئے۔ ہمارا جی نہیں بھرتا۔ بہت مختصر ہوتے ہیں۔

یاسمین سلطانہ، گنٹور

سوئیٹ بہن :

جنوری کا شمارہ موصول ہوا حسبِ معمول تمام مضامین دلچسپ اور معلوماتی تھے۔ خاص طور پر شہناز رفیع چودھری کے تینوں مضامین بہت پسند آئے۔ "عورتوں کی نفسیات اور ہائی بلڈ پریشر" بہت معلوماتی رہا۔ "خزاں والی مہندی" اور "نئی بانات" بھی خوب تھے۔ آپ بھی چھانٹ کر ایسے مضامین شائع کرتی ہیں جو افادیت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ کہانی "ذلّت کی صلیب" نے دل پر بہت اثر کیا۔ کاش لڑکیاں کچھ عقل سے کام لیں۔ اتنی اچھی کہانی لکھنے پر احمد حسین حیات کو مبارک باد۔ سال نامہ کا شدت سے انتظار ہے۔ اُمید ہے وہ ادبی دنیا میں ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔

شافیہ اسلم، علی گڑھ

محترمہ :

جنوری کا بانو نظر نواز ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی افتتاحیہ اپنی مثال آپ ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں سب ہی تخلیقات معیاری ہیں۔ خاص طور سے بشریٰ جبیں کی کہانی "یادوں کے سہارے" بہت اچھی کہانی ہے۔ خورشید ملک کا "ایک خط" متاثر کرتا ہے۔ قلم کار نے بڑی خوب صورتی سے ایک ایسی عورت کے جذبات، احساسات اور خیالات کی عکاسی کی ہے جس کا خاوند دوسرے ملک جا کر دولت کمانے میں کچھ اس طرح مصروف ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے جذبات سے قطعی لاعلم ہو جاتا ہے۔ کہانی میں یہ جملہ "ویسے اگر میرے قدم بہک جاتے تو!؟" دل کی گہرائیوں کو چھو گیا۔ واقعی گزرے ہوئے پل زندگی میں دوبارہ نہیں آتے اور انسان کو اس بات کا پچھتاوا ہوتا رہتا ہے کہ اس نے وقت کی قدر کیوں نہیں کی۔ "بزمِ بانو" بھی خوب ہے۔

رحیم انور، کاماریڈی

نتیجہ
تصویر کا عنوان
فروری ۱۹۸۵ء

بانو، فروری میں سرِ ورق کے اندرونی صفحہ پر ایک تصویر عنوان کے بغیر شائع کی گئی تھی جس کا عنوان بانو بہنوں بھائیوں کو تجویز کرنا تھا۔ اس مقابلے میں سب سے اچھا عنوان (یہی ہے زندگی) محمد ذوالفقار خاں (کلکتہ - ۱۶) نے بھیجا ہے۔ انہیں انعام میں زلفی پاؤڈر کے دو پیکٹ بھیجے جا رہے ہیں۔

محترمہ سعدیہ صاحبہ :

جنوری کا شمارہ نئی سج دھج کے ساتھ دیکھ کر ہماری خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ بانو کے پُرانے کالم "ان سے ملیے" "بزمِ بانو" اور "کہنی سنی" تو ہمیشہ قارئین پسند کرتے رہے اور کرتے رہیں گے۔ نئے کالموں میں "ذہن و دل" "خیال اپنا اپنا" "تبسم" اور "میرا پسندیدہ شعر" کی شروعات کا قارئین یقیناً خیر مقدم کریں گے۔ اس بار جنا ئرا اندرمان نکیار کی خاتون امینہ ذوالفقار سے ملاقات، اندراجی سے متعلق شہناز حسین کا مضمون اور شاہدہ سعید کا مضمون "شادیاں کیوں ناکام ہوتی ہیں؟" بہت پسند آئے۔ افسانوں میں بشریٰ جبیں کا "یادوں کے سہارے" کافی اچھا لگا اگرچہ اس کا موضوع نیا نہ تھا۔

رفیق وصال، اندور

دیس پردیس کی خبریں

امریکہ کے ہر ۱۰ انسانوں میں ایک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔

یوری گیلر ٹیلی پیتھی کا ایک مشہور ماہر ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کی قوت سے آہنی سلاخ توڑ سکتا ہے یوری اسرائیل کا باشندہ ہے۔ آج کل وہ امریکہ میں رہتا ہے۔ حال ہی میں اس نے اپنی روحانی طاقت کا ایک اور مظاہرہ پیش کیا۔

اس نے ایک اخبار کے تعاون سے اعلان کیا کہ وہ ایک مقررہ وقت پر اور مقررہ تاریخ کو امریکہ کے ایک شہر میں ہوگا۔ اس نے اخبار کے ان قارئین سے جو ٹیلی پیتھی میں شدھ بدھ رکھتے ہیں اپیل کی کہ وہ اس مقررہ وقت پر اپنی ذہنی قوت کو میری طرف منتقل کریں۔ بعد میں وہ مجھے بتائیں کہ میں امریکہ کے کس شہر میں کھڑا ہوں اور کس عمارت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں میں ۱۵ منٹ تک اس جگہ کھڑا رہوں گا۔

یوری کے اس اعلان پر ۷۵ انسانوں نے لبیک کہا۔ یہ تمام لوگ ٹیلی پیتھی میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ مقابلہ کا وقت آیا اور یوری نے واشنگٹن کا انتخاب کیا۔ عمارت کے لئے اس نے واشنگٹن کے مشہور مینار مونومنٹ کا انتخاب کیا اس نے مقررہ وقت پر اس مینار کے پاس پہنچ کر اپنی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اپنے دماغ سے خیال کی لہریں ان لوگوں کی طرف بھیجیں جو اس کے اشارے کے انتظار میں بیٹھے تھے یوری کو بعد میں ان کے جوابات موصول ہوئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ۷۵ انسانوں میں ۵ نے اس کے سوال کا بالکل ٹھیک جواب دیا۔ ان میں ایک عورت ہیلن نے جو واشنگٹن سے ۲ ہزار میل دور رہتی ہے اپنے خط میں لکھا کہ میں وقتِ مقررہ پر اپنی آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ میں نے یوری کی آنکھوں سے وہ منظر دیکھنا چاہا جس کا اشارہ اس مقابلے میں تھا۔

میں نے ۵ منٹ تک اپنے خیال کو اسی نقطہ کی طرف جمائے رکھا لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا لیکن ۵ منٹ گزرنے کے بعد مجھے نظر کے سامنے ایک مینارہ ابھرتا نظر آیا میں سمجھ گئی کہ یہ مینار واشنگٹن مونومنٹ ہے تھوڑی ہی دیر میں یہ تصویر اور واضح ہو گئی میں اس مینار کے گرد لوگوں کو چلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں خود بھی وہیں کھڑی ہوں۔

یوری کے تجربے سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ امریکہ میں ہر دس انسانوں میں ایک انسان ٹیلی پیتھی کی فطری صلاحیت رکھتا ہے

ازدواجی زندگی سے متعلق
کچھ نئے انکشافات

امریکہ میں شادی شدہ جوڑوں کے بارے میں ایک سروے کیا گیا۔ یہ سوال اور جواب کی شکل میں ہے۔

س: ۱ ایک عورت جو اپنے خاوند کی خوبیاں بیان کرتی ہے۔ اسے دوسرے مردوں سے اچھا ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کیا وہ واقعی اپنے خاوند کو اتنا باکمال سمجھتی ہے؟

ج: نہیں۔ جب ایک عورت اپنے خاوند کے متعلق شیخی بگھارتی ہے تو وہ دراصل خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ اسے باکمال انسان ملا ہے لیکن اسے خود اس بات پر شک ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل میں یہ بات جانتی ہے کہ اس کا خاوند ایک معمولی انسان ہے۔

س: اگر شادی کے بعد پہلا سال خیر خوبی سے ختم ہو جائے تو کیا یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے بعد میاں بیوی میں کوئی جھگڑا نہیں ہوگا۔

ج: نہیں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ زیادہ تر جھگڑے شادی کے پہلے ۲ سال میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد گھر میں سکون آجاتا ہے لیکن ۵۰ اور بعض اوقات ۶۰ سال کے لگ بھگ اختلافات پھر نمودار ہوتے ہیں۔ انسان اکثر ۴۵ - ۵۰ سال کی عمر میں اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لیتا ہے تو اسے اپنی ازدواجی زندگی خالی خالی نظر آتی ہے۔

س ۔ اگر ایک عورت کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہے تو کیا ہوتا ہے ؟ اس کا جسم بے ہنگم ہو جاتا ہے ۔ ؟

ج یہ سچ ہے اگر عورت ازدواجی زندگی میں ناآسودہ ہے تو وہ اس کا بدل کھانے میں ڈھونڈتی ہے ۔ جھنجھلاہٹ میں وہ کھانے پر ٹوٹ پڑتی ہے ۔ زیادہ کھانے سے جسم اور بھی فربہ ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں ازدواجی زندگی میں بھی رخنہ پڑ جاتا ہے ۔ جسم جتنا بے ہنگم ہوتا ہے مرد کی توجہ اتنی ہی کم ہو جاتی ہے ۔

س :۔ کیا مرد عورت کی جسمانی خوب صورتی پر مرتے ہیں یا عورت مرد کی جسمانی خوب صورتی پر ؟

ج مرد عورت کی جسمانی خوب صورتی پر فدا ہوتے ہیں ۔ لیکن عورت کے لئے مرد کی خوب صورتی اہم نہیں ۔ وہ اس کے مزاج ، اولوالعزمی ، بہادری اور ذہانت سے متاثر ہوتی ہے

س :۔ کیا خاوند اور بیوی کی شکایتوں کی بنیاد ایک ہے ؟

ج نہیں ۔ عورت مرد سے کہیں زیادہ روپے کی کمی اور مہنگائی کی شکایت کرتی ہے مرد کی بری عادتوں کا رونا روتی ہے ۔ میاں کی بدزبانی اور بدمزاجی کی شکایت کرتی ہے ۔ اس کی شکایتوں کا دفتر مرد سے کہیں زیادہ بھاری ہوتا ہے ۔ مرد بھی شکایت کرتے ہیں ۔ لیکن یہ صرف دو باتوں میں عورت کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں ۔ ایک سسرال کے لوگوں سے ناراضگی اور دوسرے ازدواجی تعلقات میں ناآہنگی ۔

اگر نے نہ پائے تھے کہ ......

تائیوان کی راجدھانی تائی پے میں ہونا کی ایک عورت نے خودکشی کی کوشش کی ۔ اس کی عمر ۲۳ سال ہے ۔ اسے طلاق ہو گئی تھی ۔ اس حادثے نے اس کے دل و دماغ پر برا اثر ڈالا ۔ وہ اپنے فلیٹ میں تنہا رہتی تھی ۔ ایک دن اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اس کا فلیٹ نویں منزل پر تھا اس نے فلیٹ کی بالکنی سے چھلانگ لگا دی ۔ مگر ابھی اس کی زندگی کے دن باقی تھے ۔ آٹھویں منزل کی بالکنی پر لوہے کا ایک ہک لگا ہوا تھا ۔ ہک کا جسم اس سے مس ہوا تو اس کی قمیص ہک میں پھنس گئی اب وہ اس آنکڑے سے لٹک رہی تھی ۔ اس نے چلانا شروع کیا ۔ لوگوں نے فائر بریگیڈ کو فون کیا وہ لوگ سیڑھی لگا کر آٹھویں منزل پر پہنچ گئے اور لڑکی کو بچا لیا ۔

بانجھ عورتوں کے لئے خوشخبری

آج کل ہر طرف فیملی پلاننگ کا شور ہے اس شور و غل میں ان لوگوں کی صدا سنائی نہیں دیتی جو اولاد سے محروم ہیں ۔ بچوں کی پیدائش کی روک تھام کے لئے بیسیوں وسائل موجود ہیں ، لیکن بانجھ عورتوں کا علاج دشوار ہے ۔ اب ان لوگوں کے لئے اندھیرے میں امید کی کرن نظر آ رہی ہے ۔ ڈاکٹر شاستری چنڈی گڑھ میں آیورویدک انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں انہوں نے بانجھ عورتوں کے لئے دو آیورویدک دوائیں دریافت کی ہیں ایک کا نام 'سمن گلی' ہے دوسری کا نام 'آتم گپتا' ہے ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ دونوں دوائیں بانجھ پن کو ختم کر سکتی ہیں ۔ آتم گپتا مردوں کے لئے بھی مفید ہے ۔

اس سے پہلے ڈاکٹر شاستری گنجے پن کے لئے سر سندری تیل ایجاد کر چکے ہیں ۔ جلد کے لئے سر سندری پیسٹ بھی ایجاد کر چکے ہیں ۔ اب دیکھنا ہے کہ 'سمن گلی' اور آتم گپتا اولاد کی خواہش مند عورتوں کے لئے کتنی مفید ثابت ہوتی ہیں ۔

جب تک لاش تب تک آس

فرانس میں ۴۷ سالہ ڈاکٹر مارٹینو نے اپنی مردہ بیوی کو ڈیپ فریزر میں بند کر دیا ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ سائنس جلد اتنی ترقی کر لے گی کہ ان کی بیوی کے جسم کو دوبارہ زندگی مل جائے ڈاکٹر مارٹینو کی بیوی کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی اس کی عمر ۴۹ سال تھی ڈاکٹر نے مردہ ڈی بیڈیوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر ریسرچ کی ہے ۔ وہ اپنی بیوی کی زندگی میں بھی اس بارے میں تبادلۂ خیال کرتے تھے ۔ دونوں اس بات کا عہد کر چکے تھے کہ ان میں سے جو پہلے مرے گا اس کا جسم دوبارہ زندگی پانے کی امید پر منجمد کر دیا جائے گا ۔ اب ڈاکٹر کی بیوی کا جسم ۶۰ سینٹی گریڈ یعنی نقطۂ انجماد سے ۶۰ ڈگری نیچے کے درجۂ حرارت پر رکھا ہوا ہے ۔ لیکن فرانس کی حکومت اس کے آڑے آ گئی ۔ فرانس میں یہ بات غیر قانونی ہے ۔ حکومت کو جب اس بات کا علم ہوا تو ڈاکٹر پر مقدمہ قائم کر دیا گیا ۔

ڈاکٹر کا بیان ہے کہ اگر وہ یہ مقدمہ ہار گیا تو اپنی بیوی کی نعش کو امریکہ بھیج دے گا وہاں ایسا کوئی قانون نہیں ہے ۔

■

بیس ہزار
روپے کے انعامات

پہلا انعام: بارہ ہزار روپے نقد
یا ایک ۵۱ سینٹی میٹر کا رنگین ٹی وی
اور تین ہزار روپے نقد
دوسرا انعام: آٹھ ہزار روپے

.20.0 | 0.00

پہلا انعام بالکل درست حل پر: بارہ ہزار روپے، دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: آٹھ ہزار

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ، آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر
ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعہ ادا کی جا سکتی ہے، نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ
والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج
حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی کوپن بھیجنے کی ضرورت نہیں، کوپن بھیجنے کی شرط
شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ہفتہ ۲۳۔ فروری ۱۹۸۵ (آٹھ بجے رات
۲۶۔ فروری ۱۹۸۵ کو دو بجے بعد دوپہر تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کر لئے جائیں گے۔

شمع منی معمہ نمبر ۱۱۱

ی		ا	د	ا	ن
	ک	ن	ا		
		ے	ا	ل	
ڑ			گ	و	
	و			گ	
ت		ک			
ی	ے	ڑ	ی		

اشارے

دائیں سے بائیں:

۱۔ مجھے سخت ندامت ہے۔ میں نے ـــــ میں جو کچھ بھی کیا تھا اس کے لئے میں قصوروار ہوں لیکن

۲۔ ایسی ـــــ موت سے خدا بچاتا رہے۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہے مگر

۳۔ ہاتھ پیر ـــــ بغیر ملنے والی روٹی انسان کو ہمیشہ کے لئے ناکارہ کر دیتی ہے

۴۔ ایک دو دن کا ـــــ ہو تو کوئی چپ بھی کر جائے۔ یہ تو عمر بھر کا رونا ہے

۵۔ ـــــ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ، غالب

اوپر سے نیچے:

۶۔ ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار ـــــ ہے

۷۔ پیسے کو ـــــ کر تو رکھا نہیں جا سکتا۔ آخر گرفت میں سے نکل ہی جاتا ہے

۸۔ کوئی شے رائیگاں نہیں۔ ـــــ میں پڑی ہوئی بیکار سے بیکار چیز بھی کسی نہ کسی کام آ سکتی ہے

۹۔ آنکھوں میں آزادی کے خواب ہو
اور دلوں میں انقلاب کی بجلیاں۔
پھر وہ متوالے

۱۰۔ ایک جاہل، گنوار بڑھتے بڑھتے
پہنچ گیا! آخر اس میں کچھ تو صلاحیت

شمع ادبی معمے (شمع منی معمہ نمبر ۱۱۱) ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی

شمع منی معمہ نمبر ۱۱۱ ... ۱۹۸۵ کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور
والوں کے نام ماہنامہ ... میں شائع کئے جائیں گے ... والوں کی تفصیلات: شمع اپریل ۱۹۸۵ میں بھی شائع

★ کوئی کوپن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔
آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔

★ فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ۔

★ صرف دس اشارے

★ انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔

★ صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجئے یا پھر اگلے ماہنامہ بانو یا ماہنامہ شمع میں دیکھئے۔

★ شمع منی معمہ نمبر ۱۱۱ کا نتیجہ ماہنامہ بانو (نئی دہلی) اور اپریل ۱۹۸۵ کے ماہنامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

طرح کے بالوں کے لئے زلفی
بال آپ چاہے جس طرح سنواریں مگر ان میں
ے زلفی ہیر ٹانک ہی کیوں کہ یہ دوسرے تیلوں سے دس
گنا بہتر ہے۔ یہ بالوں کی جڑوں کے نیچے تک پہنچ جاتا ہے اور
الوں کی تمام بیماریوں کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیتا
ہے۔ زلفی تیل ہی نہیں بالوں کی غذا بھی ہے۔ سر دھونے
کے لئے "زلفی بالوں کا کالا صابن" یا زلفی پاؤڈر استعمال
کیجئے جو بالوں کو صاف کرتا، ملائم بناتا اور ان کو تیزی
سے بڑھاتا ہے۔ قیمت زلفی ہیر ٹانک: پندرہ روپے
قیمت زلفی بالوں کا کالا صابن: آٹھ روپے
زلفی پاؤڈر: آٹھ روپے
لیباریٹریز لال کنواں، دہلی

افتتاحیہ

دُنیا جب تک قائم ہے، شاید اس وقت تک انسان مختلف گروہوں میں بٹے رہیں گے۔ مذہبی عقیدے، سیاسی اور سماجی نظریات، جغرافیائی سرحدیں، نسل اور قومیت کا اختلاف انسانیت کو الگ الگ زمروں میں تقسیم کرتے رہیں گے۔ یہ رنگارنگی دنیا کو حسین تر بناتی ہے۔ بگاڑ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی فرد، گروہ یا قوم یہ سمجھ بیٹھے کہ صرف وہ صحیح راستے پر ہے، صرف وہ برحق ہے، صرف وہ قابلِ پیروی ہے۔ یہ میلان ٹکراؤ پیدا کرتا ہے اور اسی رسہ کشی میں جان لینے اور دینے تک کی نوبت آجاتی ہے۔

اِس کشمکش اور اختلاف کو محبت اور علم سے ہی گوارا (بلکہ خوش گوار) بنایا جاسکتا ہے۔

پیار محبت سے زندگی کی ساری تلخیاں مٹھاس میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور علم سے عقل پر پڑے ہوئے جہالت کے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں۔

چراغ کی ساخت کسی بھی قسم کی ہو، اس کی زیادہ اہمیت نہیں۔ اہم تو وہ روشنی ہے جو ہر چراغ پھیلاتا ہے۔ اگر ہم چراغ کی ساخت کو مستقل دیکھتے رہیں تو ہمیں ایک کے دو اور دو کے چار نظر آنے لگیں گے۔ لیکن ہم اگر اس کی روشنی کو توجہ کا مرکز بنائیں تو پھر ہمیں اپنے چاروں طرف نور ہی نور نظر آئے گا، اس کے سوا کچھ نہیں۔

نقطۂ نظر کا اختلاف کتنا غیراہم (اور کبھی کبھی بے بنیاد) ہوتا ہے، اس کی تائید میں بچپن میں پڑھی ہوئی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک ستم ظریف ایک ہاتھی کو ایک اندھیرے کمرے میں لے گیا جہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ ان کے لئے اندھیرے میں آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے ان میں سے ہر شخص نے ہاتھی کو اپنے ہاتھ سے چھو کر دیکھا اور اس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی۔ ٹٹولنے پر ایک آدمی کا ہاتھ ہاتھی کی سونڈ پر پڑا، اِس لئے وہ کہنے لگا "ارے! یہ تو بالکل پانی کے پائپ کی طرح ہے۔" دوسرے نے ہاتھی کا کان چھوا اور کہا "نہیں، یہ پنکھے کی طرح ہے۔" تیسرے کے ہاتھ ہاتھی کی ٹانگ آئی، لہٰذا وہ بولا "نہیں یہ تو کھمبا ہے۔" ایک اور شخص نے ہاتھی کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "یہ تو بالکل شاہی کرسی لگتی ہے۔" اگر اس کمرے میں موجود اشخاص کے پاس روشن شمع ہوتی تو ان کی باتوں میں یہ اختلافات نہ ہوتے اور سب ایک ہی نتیجے پر پہنچتے۔

سعدیہ دہلوی

نگراں: یوسف دہلوی
مدیرہ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اڑتیسواں سال، ۴۵۹ واں شمارہ
عام شمارے کی قیمت: چار روپے
سالانہ قیمت: اڑتالیس روپے

مقامِ اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس: 3161601 SHMA IN
ٹیلی فون: 779066, 779067, 779068
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان: شمع میگزین 777053, 776956
طابع و ناشر: یونس دہلوی

ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس، دہلی
مطبوعہ: روبی پرنٹنگ پریس، دہلی

[illegible] ہوتا
ہے کہ یہ شہری بالوں اور نیلی [illegible] والی لڑکی
کس طرح فر فر اردو بول رہی ہے اور وہ بھی
خالص دلی کی زبان اور لہجے میں۔ یہی نہیں
امینہ کو فارسی، عربی، روسی، جرمن، فرنچ اور ہسپانوی
زبانوں پر بھی عبور حاصل ہے۔ انگریزی تو
ان کی تقریباً مادری زبان ہے کیوں کہ ان
کی والدہ انگریز تھیں۔ والد دلی کے مشہور
بیرسٹر اور ایڈیٹر نورالدین احمد تھے۔

پچھلے دنوں دلی کے [illegible] کلچرل سینٹر
میں امینہ کی خطاطی کی نمائش منعقد ہوئی۔
یہ نمائش دلی کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ تھی۔

نمائش کے افتتاح کے موقع پر ملک کی اکثر
نامی گرامی ہستیاں موجود تھیں۔ جناب ظہور قاسم
اس محفل کے مہمانِ خصوصی تھے۔ دو سال پہلے
ہندوستان سے ایک مہم قطب جنوبی کے
متعلق سائنٹیفک معلومات حاصل کرنے گئی تھی
ظہور قاسم اس مہم کے سربراہ تھے۔

اس نمائش میں امینہ کی خطاطی کے کچھ
ہ نمونے پیش کئے گئے۔ امینہ کو اردو فارسی
ر نی اور روسی شاعری سے بے حد لگاؤ ہے۔
نہوں نے اپنے پسندیدہ شعراء کے کلام کو خطاطی
کے خدوخال میں ڈھال دیا ہے۔ ان میں پندرہویں
صدی کے صوفی شاعر مولانا روم، حافظ سعدی
در اردو کے شاعروں غالب، میر، فیض اور
قبال کے اشعار ملتے ہیں۔ آمینہ کا کمال یہ ہے
کہ انہوں نے روسی اور ہندوستانی شاعروں
ں خیال کا تولّد دریافت کیا ہے اور ان دونوں
یالوں کو نہایت خوبصورتی سے ایک ہی
رم میں سمو دیا ہے۔

امینہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے خطاطی
ں جانوروں کا انتخاب اس لئے کیا ہے کہ وہ
سانی مسرت اور سافریت اور شعور کی ترجمانی
رتے ہیں۔ امینہ نے دنیا کے مختلف ملکوں
ں کامیابی کے ساتھ اپنے فن کی نمائش کی ہے
ن کے فن نے امریکہ، جاپان، روس اور انگلستان
ں خاص مقبولیت حاصل کی ہے۔ کئی ملکوں
کے قومی آرٹ میوزیم امینہ کی تصویریں حاصل
ر چکے ہیں۔ بی بی سی اور ماسکو ٹیلی ویژن نے
ینہ کے فن پر کئی فلمیں بھی بنائی ہیں۔

امینہ کا بیان ہے کہ ان کا فن ان کے
لد کی ہمت افزائی اور رہنمائی کا مرہونِ منت

منصور حلاج کے فارسی اشعار

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں — (غالب)
اور روسی شاعر پشکن کا اس موضوع پر اظہارِ خیال

ہے۔ اور اس نے ان کی نمائش سے ان کو خراجِ
عقیدت پیش کر رہی ہیں۔ اس امر کی وضاحت
کے لئے ان کی تصویر دل پر امینہ بنتِ احمد لقمان
احمد کے دستخط ہوتے ہیں۔

امینہ دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ان کی ابتدائی
تعلیم دہلی کے کوئین میری اسکول میں ہوئی۔
اس کے بعد انہوں نے لندن میں آرٹ کی تعلیم
حاصل کی۔ آرٹ کی تعلیم کے علاوہ امینہ نے
ماسکو یونیورسٹی سے لسانیات میں ڈاکٹریٹ
حاصل کی۔ انہوں نے دہلی کی جواہر لال نہرو
یونیورسٹی، ماسکو یونیورسٹی اور امریکہ کی کئی
یونیورسٹیوں میں کچھ عرصے کے لئے تعلیم دی ہے۔
پنڈت جواہر لال نہرو جب روس گئے تھے تو
امینہ نے ان کے مترجم کی حیثیت سے کام
کیا تھا۔ اسی طرح روس کے وزیر اعظم مارشل
بلگانن اور خروشچیف جب دہلی آئے تھے
تو ان کی ترجمانی کے فرائض بھی امینہ نے ہی
انجام دئے تھے۔ اس کے بعد امینہ نے
مسز گاندھی، ذاکر حسین اور رادھا کرشنن
کے لئے بھی مترجم کی حیثیت سے کام کیا تھا۔
نو سال پہلے جب راجیو گاندھی ماسکو یونیورسٹی
گئے تھے تو امینہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔

امینہ نے تقریباً ساری دنیا کی سیاحت
کی ہے۔ لیکن انہیں اپنا وطن دہلی بہت
عزیز ہے۔ انہیں اپنے "دہلی والی" ہونے پر
ناز ہے۔ ان کا کہنا ہے "میرے خیال میں
دلی سے اچھا دنیا میں کوئی شہر نہیں ہے۔
پھر دلی تو ۲۲ خواجہ کی چوکھٹ ہے اور یہیں
میرے والدین کی قبریں ہیں۔ میرے والدین
کے مزار دلی کی جامع مسجد سے متصل شاہ
کلیم اللہ کے قدموں میں ہیں۔"

شیخ سعدی کے اشعار

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے — فیض

آ دھمکا ہوا ہوتا ہے تو کوئی چیک اِن۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اگر کبھی اتفاق سے کوئی مہمان گھر میں موجود نظر آ گئے تو آس پڑوس والے خیریت پوچھنے اور افسوس ظاہر کرنے چلے آتے ہیں۔

ہمارے یہاں مہمان ہر قسم کے اور دنیا کے ہر کونے سے آتے ہیں۔ بعض اوقات تو مہمانوں کی رنگارنگی، مزاجوں اور طبیعتوں کا اختلاف، پسند اور ناپسند کا معیار دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارا گھر مینارِ بابل کا منظر پیش کرتا ہے۔ مہمانوں میں کوئی نفسیاتی مریض ہوتا ہے تو کوئی جسمانی، کوئی جادو ٹونے کا قائل ہوتا ہے تو کوئی نذر نیاز کا۔ کہیں سے مرچوں کی دھانس آتی ہے تو کہیں سفید پیپرز کا ڈھیر جل رہا ہے۔ کوئی جینوا کا ذکر کرتا ہے تو کوئی مسٹر جناح کا۔

گزشتہ مہینے اللہ میاں نے شاید اوروں کے گھر کی نعمتوں کا رخ بھی ہمارے گھر کی طرف کر دیا۔

میری بساط سے سوا مجھ کو ملی ہیں نعمتیں

ہر طرف مہمان ہی مہمان۔ غول در غول، ہجوم در ہجوم آواز لگا لگا کے اپنے تلاش کرنے پڑتے تھے۔ یہ حال تھا کہ ڈرائینگ روم، ڈائینگ روم یہاں تک کہ باورچی خانے میں بھی رات کو بستر لگ جاتے تھے۔ بس باتھ ٹب میں تکیہ لگانے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

جی نہیں، ہمارے گھر میں کسی کے ہاتھ پیلے نہیں ہو رہے تھے اور اللہ گواہ ہے ہم نے کسی اور تقریب کے لئے بھی دعوت نامے چھپوا کر نہیں بٹوائے تھے، یہ تو بس اللہ کی مہربانی تھی۔ سب اپنے ننھے منوں کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان سب چُنوں، پپو اور گڈو کی بدولت ہم بچوں کے بارے میں اتنا جان گئے کہ اگر رات کی خاموشی میں آواز آتی تو ہم فوراً پہچان جاتے کہ رو کون رہا ہے مہمان کا بچہ یا بلی کا بچہ۔ اور صبر کا یہ عالم تھا کہ جب کسی چنو یا منو نے ایک کھلونا توڑا تو ہم مسکرا کر فوراً دوسرا کھلونا پیش کر دیتے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ گھر میں توڑنے پھوڑنے کو کچھ باقی نہ رہا۔ بقولِ غالب۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتے ہیں رہزن کو

ڈانٹا تو ہم نے کبھی اپنے نوکر یا اس کے بچے کو بھی نہیں۔ مزاج ہی ایسا پایا ہے۔ یوں بھی آج کل کے ننھے منے اینٹی بائیوٹک بچوں کو دیکھ کر بے چاروں پر ترس آتا ہے۔ بچے کے دانت ابھی نکلے ہیں کہ اس کا پیٹ دواؤں کا گودام بن چکا ہوتا ہے۔

اللہ بخشے نانی اماں کو، وہ تو ہر مرض کا علاج گُڑ دودھ میں ہلدی ملا کر یا الائچی کی چائے پلا کر کر دیتی تھیں۔ خاک مٹی میں اصلی گھی کی تاثیر تھی اور برسات کے پانی میں کھیلنے کودنے میں تریاق کی جگہ صحت بانٹتی تھی۔ ساری عمر کسی اسپیشلسٹ کی شکل تک نہ دیکھی۔

ایک ہم آج کل کی ماؤں کو دیکھتے ہیں۔ بچہ ابھی گود میں ہی ہے کہ کھلونوں کے ساتھ شوکیس میں دوائیاں بھی سج جاتی ہیں۔ اور اسپیشلسٹ صاحب کا کیا کہنا ان کی فیس سے ہی بچوں کی صحت اور والدین کے سوشل اسٹیٹس کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

فریاد کرنا ہمارا معمول کا شیوہ نہیں۔ یہ مرحلہ ہمارے لئے [illegible] عورتوں کی طرح اس [illegible] ہے۔ حق تو یہ ہے کہ کچھ لوگ کہیں مہمانوں سے ہی ڈر لگتا ہے۔ ہاں ہمیں عورت ہونے کے ناطے ایک خیال نے بہت دنوں سے دماغ اور دل کو ضرور پریشان کر رکھا ہے اور جو بات ہم کہنے والے ہیں، ہمیں پورا یقین ہے کہ ہماری طرح اور بھی بہت سی کام کرنے والی بہنوں کی حد تک بھی سچ ہوگی۔ مہمانوں کی ضد ہوتی ہے کہ ہم ان کے ساتھ دن بھر گھومیں پھریں۔ ان کو شاپنگ کرانے یا چاٹ کھلانے یا کسی سے ملاقات کرانے کے لئے جائیں۔ ہمیں ارمان ہے تو اس بات کا کہ کوئی ہمارے ایک بجے دفتر کے وقت پر چاٹ کھلانے کے لئے لے جانے کی فرمائش کیوں نہیں کرتا۔ ہم بھی دفتر روز جاتے ہیں۔ کام بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ لوگ عورت کے دفتری کام کی اہمیت کو نہیں سمجھتے یا یوں کہہ دیں کہ شاید سمجھنا نہیں چاہتے۔ ہم خود بھی مہمان بن کر لوگوں کے ہاں رہتے ہیں، لیکن ہفتے دس دن سے زیادہ نہیں ٹکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں میزبان کے طور پر اس وقت ہماری اپنی برائیاں ہی سامنے نہ آ جائیں۔ اس کے علاوہ زیادہ دن گھر سے دور رہنے پر ہمارا جی گھبرانے لگتا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں جنت میں بھی ہمیں اپنے گھر کا تصور اداس نہ رکھے۔ ہم چاہے دنیا کے کسی کونے میں بھی ہوں، اپنے گھر میں لگے ہوئے پھول، کمرے میں پلے ہوئے مچھر اور برابر کے کمرے میں ٹھیرے ہوئے مہمان ہمیں یاد آتے رہتے ہیں۔

> دُکان پر ساڑی دیتے ہوئے اس نے ریکوں پر لگے گرم کپڑوں کے تھانوں کی طرف دیکھا۔ کچھ پسندیدہ کپڑوں کے بھاؤ بھی دریافت کئے۔ اسے اندازہ ہوا کہ تین ساڑیوں کی مزدوری سے بھی سُوٹ کا اچھا کپڑا نہ آسکے گا۔

اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف کمل سے لَو میرج کرلی تھی اس وقت بھی ہنگامہ کھڑا ہوا تھا مگر وہ اس کی پروا کئے بغیر تین کپڑوں کے ساتھ گھر سے چلی آئی تھی۔ اسے اس وقت بھی معلوم تھا کہ محبت کی راہیں اس کے لئے اتنی ہموار نہیں ہیں۔ غریبی کا اژدہا مُونہہ پھاڑے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے اُونچے اور کھاتے پیتے گھرانے کی آسائشیں چھوڑ کر کمل کے ساتھ اس کے گھر آگئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنی لگن اور ایثار سے گھر کو جنت بنا سکتی ہے۔ اسے کمل سے بے پناہ محبت تھی۔ اس لئے اس نے اس کی غریبی کو بھی مُسکراتے چہرے کے ساتھ گلے لگالیا۔ کمل ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھا، مگر تنخواہ اور ٹیوشن کی محدود آمدنی میں ریشماں نے کبھی اسے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ یہاں آکر ناآسودہ ہے۔ وہ خود تنگ دستی کی ہر مصیبت جھیل سکتی تھی، مگر کمل کے چہرے پر کسی قسم کا ملال اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اسے ہر وقت خوش رُو اور خوش پوش دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے اندر شاید یہ احساس بھی کہیں کام کر رہا تھا کہ اس کے گھر والے اگر کمل کو کہیں دیکھیں تو اچھے کپڑوں میں دیکھیں۔ اسی سوچ نے اس کے دل میں کمل کے لئے سُوٹ خریدنے کی لگن پیدا کردی تھی۔ اور اس لئے وہ جی توڑ کر محنت کر رہی تھی۔ مسلسل کام نے اس کی صحت پر بھی اثر ڈالا تھا۔ اس کی خوبصورتی ماند پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دکھائی دینے لگے تھے۔ چہرے کی سُرخی زردی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ اس پر ہی بس نہیں بلکہ وہ کمل کے کپڑوں کی لگن میں اپنے کپڑوں کی طرف سے بے پروا ہو گئی تھی۔ کئی کئی دن ایک ہی ساڑی بغیر دھوئے پہنے رہتی گھر کے کام پر مناسب دھیان نہ دینے کی وجہ سے کھانا بھی ٹھیک طرح نہ بن پاتا تھا جس سے گھر میں عموماً تلخی پیدا ہوجاتی اور اس بات پر بھی اس کو ہی بُرا بھلا سُننا پڑتا۔ مگر وہ کمل کے چہرے پر غربت کی پرچھائیں نہیں دیکھنا چاہتی تھی، اس لئے وہ اذیت کے لمحات میں بھی پوری لگن سے محنت کر رہی تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ریشماں نے جھٹ ساڑی ٹرنک میں رکھ دی اور کُنڈی کھولنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے تعجب ہوا کہ کمل آج اتنی جلد کیسے لوٹ آیا مگر دروازہ کُھلنے پر جب اس نے کمل کی بجائے روزی کو وہاں کھڑے دیکھا تو سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

روزی مُسکرا کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی "ریشماں دیدی، کمل جی جس وقت گھر آئیں تو ان سے کہہ دیجئے گا کہ آج وہ ذرا جلد پڑھانے آجائیں مجھے دو پیپر تیار کرنے ہیں۔"

ریشماں ؟ — ریشماں کو تعجب ہوا کہ روزی کو اس کا نام کیسے معلوم ہوگیا یقیناً کمل نے بتایا ہوگا اور شاید اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے روزی کی شرارت بھری آنکھوں اور بے باک اندازِ گفتگو سے اُلجھن ہونے لگی۔ اس نے روزی سے بیٹھنے کے لئے کہا تو روزی چلبلا پن ظاہر کرتے ہوئے بولی "یہ ریشماں تو شاید اسلامی نام ہے اور کمل —"

"دیکھئے میں آپ کا پیغام کمل کو دے دوں گی مگر ہمارے نجی معاملات میں آپ کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔" ریشماں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا اور روزی معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

ریشماں کا دل سہم سا گیا۔ شام کو جب اس نے کمل سے اس بارے میں ذکر کیا تو وہ مُسکرا کر بات ٹال گیا اور چائے پی کر ٹیوشن پڑھانے کے لئے روانہ ہوگیا۔ ریشماں نے سوچا کہ وہ اسے ٹیوشن پڑھانے سے منع کر دے لیکن وہ اس سے پہلے کمل کے لئے سُوٹ تیار کر لینا چاہتی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنی محنت سے ٹیوشن جتنے پیسے خود ہی پیدا کر سکتی تھی

چار دن کی لگاتار محنت سے آخر اس نے سنیچر کو ساڑی مکمل کرلی اور کمل کے چلے جانے کے بعد گھر میں تالا لگا کر وہ الپسرا کلاتھ ہاؤس جا پہنچی۔ دُکان پر ساڑی دیتے ہوئے اس نے ریکوں میں لگے گرم کپڑوں کے تھانوں کی طرف دیکھا۔ کچھ پسندیدہ کپڑوں کے بھاؤ بھی دریافت کئے۔ اسے اندازہ ہوا کہ تین ساڑیوں کی مزدوری سے بھی سُوٹ کا اچھا کپڑا نہ آسکے گا۔ اس کے لئے کم از کم ڈھائی سو روپے اور درکار تھے جس کے لئے ایک اور ساڑی تیار کرنا ضروری تھا۔ اس نے التجا بھری نگاہوں سے دُکان دار کی

انور حسین

شادیوں کو کامیاب بنانے والی مشین

یہ ایک عام کہاوت ہے کہ شادی
جوا ہے۔ اور یہ بھی کہ جو شادی کرتا ہے
بھی پچھتاتا ہے اور جو نہیں کرتا وہ بھی۔
ادیب کا قول ہے کہ شادی ایک ایسا
ل ہے جس میں ہیرو پہلے ہی باب میں مر جاتا
ہے۔ شادی پر کتنے ہی اعتراض کیوں نہ ہوں
بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ شادی کا
ادارہ دنیا میں قائم رہے گا۔ آج سے ساٹھ ستر
سال پہلے مغربی ممالک میں ہندوستان کی طرح
روایتی شادیاں ہوتی تھیں۔ اس میں سماجی پوزیشن
دولت، خاندان، اور شرافت دیکھی جاتی تھی۔
محبت کی شادی انیسویں صدی میں عام نہیں تھی۔
پھر بیسویں صدی میں محبت کی شادی کا رواج
شروع ہوا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دو انسان ایک
دوسرے سے محبت کرتے ہوں تو شادی کی بنیاد
زیادہ پائیدار ثابت ہوتی ہے لیکن یہ اندازہ
غلط ثابت ہوا۔ محبت کی شادیاں دھڑا دھڑ
ناکام ہونی شروع ہو گئیں۔ لیکن اس کے باوجود
لوگوں نے اس اصول کو خیرباد نہیں کہا۔ شادی
کو ابھی چند سال بلکہ چند مہینے بھی گزرنے نہیں
پاتے کہ میاں بیوی میں ناچاقی شروع ہو جاتی
ہے۔ عورت آج کل معاشی طور پر آزاد ہوتی جا رہی
ہے۔ وہ مرد سے روٹی کپڑے کا سوال نہیں
کرتی۔ یہ چیز طلاق لینے میں اور زیادہ مددگار
ثابت ہوئی۔ آج کل امریکہ میں ہر تیسری شادی طلاق
پر ختم ہوتی ہے۔ لوگ حیران ہیں کہ دو انسان جو
ابتدا میں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں،
شادی کے چند مہینوں میں ہی ایک دوسرے
کی شکل سے بیزار کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس
مسئلے کو سلجھانے میں نفسیات اور عمرانیات
کے ماہروں اور دوسرے سائنس دانوں نے

> کیرلیان نے درخت سے ایک پتہ توڑ کر اس کو درمیان سے کاٹ دیا۔ پھر اس نے ایک خاص کیمرے سے کٹے ہوئے پتے کا فوٹو اتارا۔ اس فوٹو میں نہ صرف بچے ہوئے پتے کا فوٹو تھا بلکہ اس حصے کا دھندلا سا عکس بھی شامل تھا۔

بہت سر کھپایا، لیکن انہیں ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ آخر روس کے سائنس داں اس سوال کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

روس ایک کمیونسٹ ملک ہے۔ وہاں شادی کی رسم بہت سادہ طریقے سے انجام پاتی ہے، طلاق بھی آسان ہے۔ روس میں طلاق کا تناسب امریکہ سے کم نہیں ہے۔ طلاق کو دشوار بنانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ شادی کی بنیاد کو زیادہ پائیدار بنانا ضروری ہے لیکن اس کام کو کس طرح انجام دیا جائے؟ گزشتہ دنوں روس کے کچھ خلابازوں نے فضا میں کئی روز تک پرواز کرنی تھی۔ روس کے سائنس دانوں کو یہ فکر تھی کہ زمین سے ہزاروں میل دور ان لوگوں میں جھگڑا نہ ہونے پائے۔ انہوں نے اس بات کا حل ڈھونڈنے کے لئے ایک سائنٹفک طریقے کا سہارا لیا۔

یہ کیرلیان طریقہ کہلاتا ہے۔ اسے کیرلیان نامی ایک روسی سائنس داں نے بہت عرصہ پہلے دریافت کیا تھا۔ اس طریقہ کی بنیاد ایک خاص قسم کی فوٹو گرافی ہے، جو ایک خاص کیمرے سے کی جاتی ہے۔

کیرلیان نے درخت سے ایک پتہ توڑ کر اس کو درمیان سے کاٹ دیا۔ پھر اس نے ایک خاص کیمرے سے کٹے ہوئے پتے کا فوٹو اتارا۔ اس فوٹو میں نہ صرف بچے ہوئے پتے کا فوٹو تھا بلکہ اس حصے کا دھندلا سا عکس بھی شامل تھا جو اسے کاٹ کر الگ کر دیا گیا تھا۔ کیرلیان نے لوگوں کی توجہ چاند کے ہالے کی طرف بھی مبذول کرائی۔ ہم جب چاند کی ابتدائی تاریخوں میں اس کی طرف دیکھتے ہیں تو اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی چمکتا نظر آتا ہے لیکن باقی چاند کا ہالہ بھی دھندلا سا نظر آتا ہے۔ ہم اکثر بزرگوں اور پیغمبروں کی تصویروں کے پیچھے بھی ایک ہالہ دیکھتے ہیں۔ یہ چاند کی شکل میں ان کے سر کے پیچھے نظر آتا ہے۔ یہ ہالہ عقیدت مندوں کے دماغ کی اختراع نہیں ہے۔ بلکہ ایک سائنٹفک حقیقت ہے۔ ہر انسان کے جسم سے ایک خاص قسم کی روشنی پھوٹتی ہے۔ سائنس دانوں نے اسے بایو انرجی کا نام دیا ہے۔

بایو انرجی کی دریافت روس سے ہندوستان پہنچی تو بنگلور میں ایک سائنس داں نے اس پر ریسرچ شروع کی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان شعاعوں کا فوٹو کھینچ کر ان سے مختلف لوگوں کی جسمانی کیفیت کا اندازہ لگائیں۔ انہوں نے ایک کیمرہ ایجاد کیا جو انسان کے جسم سے پھوٹتی ہوئی شعاعوں کا فوٹو کھینچ سکتا تھا۔ کسی انسان کے ہاتھ کو ایک پلیٹ پر رکھ کر اس کا فوٹو اتارا جاتا ہے۔ اس کی انگلیوں سے نکلتی ہوئی لکیریں اس کی جسمانی کیفیت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ انہوں نے ہزاروں فوٹو کھینچے تو انہیں یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک خاص بیماری کی شعاعیں ہر فوٹو میں ایک جیسی ہیں۔ اس طرح وہ انسان کے جسم میں پیدا ہونے والی بیماری کا پہلے سے پتہ لگا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر کا ایک اسسٹنٹ شوگر کی مرض میں مبتلا تھا، لیکن وہ اپنی بیماری سے بے خبر تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ سے نکلتی شعاعیں دیکھیں تو اسے فوراً باخبر دار کر دیا۔ اسسٹنٹ اسپتال گیا تو ڈاکٹر کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔

رُوس میں سائنس داں پہلے پہل اس طرح کے امکانات سے بے خبر تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ فضا میں پرواز کرنے والے خلاباز آپس میں مل جل کر رہیں۔ انہوں نے اس کے لئے بایو انرجی کی شعاعوں کا سہارا لیا۔ تمام خلابازوں کی شعاعیں ایک جیسی تھیں۔ روسی سائنس داں مطمئن ہو گئے اور خلابازوں کو فضا میں روانہ کر دیا۔ اس تجربے کی کامیابی سے سائنس دانوں کو ایک اور خیال آیا۔ اگر اس سے چند خلابازوں کی طبیعت کی ہم آہنگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو اس تجربے کو عام آدمیوں پر کیوں نہ استعمال کیا جائے؟ دو شادی شدہ انسانوں کو اس تجربے سے بیش بہا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ روس میں طلاق کی رفتار تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ زیادہ تر طلاقیں شادی کے پہلے تین سال میں ہوتی ہیں۔ ایسی طلاقوں کا تناسب ۰ فی صد ہے۔

روس میں عام انسانوں پر بایو انرجی کا تجربہ ۱۹۸۰ میں شروع ہوا۔ سائنس دانوں نے کورٹ شپ کرنے والے جوڑوں کو لیبارٹری میں آنے کی دعوت دی۔ وہ شادی سے پہلے ان کی بایو انرجی کی کیفیت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ۲۴۷، ۱۵ جوڑوں نے اس دعوت پر لبیک

کہا۔ ان کی بایوانرجی کا امتحان لیا۔ مشین نے
بتایا کہ ان جوڑوں میں ۹۸۰۸ جوڑے ذہنی
ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ بعد میں ان میں سے
۸۷۵۷ جوڑوں نے شادی کرلی۔ اس بات
کو ۳ سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا، لیکن ابھی
تک ایک بھی طلاق کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ چونکہ
شادی کے پہلے تین سال ہی خطرناک ثابت
ہوتے ہیں۔ اس لئے سائنس داں یہ وثوق
سے کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ زندگی میں یہ جوڑے
ہنسی خوشی رہیں گے۔ ابھی تک یہ تجربہ ۱۰۰ فی صد
کامیاب رہا ہے۔

جن جوڑوں کی بایوانرجی میں مطابقت
نہیں تھی، ان کی تعداد ۱۴۹۵ تھی۔ ان کو آنے
والے خطرے سے خبردار کر دیا گیا۔ ان میں سے
۲۲۳۲ جوڑوں نے سائنس دانوں کا مشورہ
مان لیا۔ انہوں نے شادی کا پروگرام کینسل کر دیا
ایک بس نکل گئی تو کیا غم ہے۔ تھوڑی دیر میں
ہی دوسری بس آجائے گی۔

اس کے برعکس ۳۱۶۳ جوڑوں نے
ڈاکٹر کی بات کو مجذوب کی بڑ سمجھا۔ انہیں اپنی
لازوال محبت پر پورا یقین تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر
کا مشورہ ٹھکرا دیا اور شادی کرلی۔ یہ ایک عبرت انگیز
بات ہے کہ دو جوڑوں کو چھوڑ کر باقی سارے
جوڑے طلاق لے کر ایک دوسرے سے علیحدہ
ہو گئے۔ یہ سب کچھ ان ہی تین برسوں میں پیش
آیا جو روس میں خطرناک سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ
شرمندہ ہو کر ڈاکٹر کے پاس آئے۔ وہ پچھتا رہے
تھے کہ کیوں انہوں نے ڈاکٹر کا مشورہ نہیں مانا
اور بایوانرجی کی مشین کو مداری کا کھیل سمجھا۔ اگر
وہ مشین کا کہا مان لیتے تو شادی اور طلاق کے
درمیان جو ذہنی اذیتیں انہیں پہنچیں وہ ان سے
محفوظ رہتے۔

سوال یہ ہے کہ انسانی برادری کو اس
عظیم الشان ایجاد سے کیوں محروم رکھا جائے
کسی امریکہ میں یہ مشین ایجاد ہوتی تو تہلکہ مچ جاتا۔
اس کا پیٹنٹ کرا لیا جاتا۔ اشتہار بازی پر کروڑوں
روپیہ خرچ ہوتا۔ لوگ اس مشین کی بدولت
لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی بن جاتے۔ مگر روس کا معاملہ
ذرا الگ ہے۔ وہاں بے شمار روپیہ کمانے کے
ذرائع نہیں ہیں۔ تقریباً ہر چیز ملک کی ملکیت
ہے۔ انسان اپنے کام کے عوض آرام سے رہ سکتا
ہے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔

کیرلیان طریقہ سارے سائنس دانوں کو معلوم
ہے، لیکن یہ مشین اس تجربے کی انتہا ہے۔ روس
نے ایٹم بم کے نسخے کی طرح اس کو بنانے کی ترکیب
بھی اپنے ہی پاس محفوظ رکھی ہے۔ سائنس دانوں
کو صرف اتنا بتایا کہ انہیں اس مشین کو مکمل کرنے
میں کئی سال لگ گئے۔ انسان کے جسم میں بایوانرجی
دوڑتی پھرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ جسم سے باہر بھی
رہتی ہے۔ یہ شعاعیں نہایت باریک ہوتی ہیں۔
لیکن ان کی تصویر اتارنا ممکن ہے۔ سائنس دانوں
نے دریافت کیا کہ ایک انسان کی بایوانرجی دوسرے
انسان کی انرجی پر اچھا یا برا اثر ڈالتی ہے۔ شادی
کے لئے جوڑے چننے میں اس اصول سے کام لیا
گیا تھا۔

سائنس دانوں نے مشین کا فارمولا تو نہیں
بتایا، لیکن اس کے استعمال کا طریقہ واضح کر دیا ہے
عورت اور مرد کو الگ الگ کمرے میں رکھا
جاتا ہے۔ عورت ایک کرسی پر آرام سے بیٹھ جاتی ہے،
اس وقت وہ خوش و خرم ہونی چاہئے۔ اگر طبیعت
میں افسردگی یا کھنچاؤ ہے تو مشین کا زیادہ فائدہ

طلاق کے بعد بھی مسلم عورتوں کو نان نفقہ کا حق حاصل ہے

سپریم کورٹ کا فیصلہ

سپریم کورٹ نے ۲۳ اپریل
۱۹۸۵ کو یہ فیصلہ دیا ہے کہ طلاق شدہ
مسلم عورت کے نان نفقہ کی سابق شوہر
پر ذمہ داری کے سلسلے میں تعزیرات ہند
کی دفعہ ۱۲۵ اور مسلم پرسنل لاء میں کوئی
تضاد نہیں ہے۔ چیف جسٹس وائی وی
چندر چوڑ کی صدارت میں سپریم کورٹ کی
آئینی بنچ نے اس فیصلے میں کہا ہے کہ قرآن مجید
کی آیات ۲۴۱-۲۴۲ اس ضمن میں سب سے
بڑی سند ہیں۔ پیغمبر اسلام کی تاکید کے بموجب
مسلمان شوہر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی مطلقہ
بیوی کے نان نفقہ کا خرچ برداشت کرے۔

نہیں ہوگا۔ اس حالت میں اس کا ہاتھ ایک د
کی پلیٹ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ پلیٹ تاروں
ذریعہ کیمرے سے جڑی ہوتی ہے۔ اس میں صرف
منٹ خرچ ہوتے ہیں۔ یہی عمل دوسرے کمرے
میں مرد کے ساتھ دہرایا جاتا ہے پھر دونوں کو
ایک ساتھ بٹھا کر یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔
اس کے بعد جو تصویر نکلتی ہے وہ دل کے کا
کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

اس مشین کی کامیابی سے متاثر ہو کر
کی وزارتِ صحت نے ایسی ۳۰ مشینیں تیار
کرائی ہیں جو روس کے ۱۵ بڑے شہروں میں نصب
کی جائیں گی۔ ان شہروں میں طلاق کا تناسب
سب سے زیادہ ہے۔ ابتدا میں یہ امتحان ضر
ہوگا۔ بعد میں شادی کے لائسنس کی طرح اسے
بھی لازمی قرار دیا جائے گا

میر کا شعر ہو غالب کی غزل لگتی ہو
سانس لیتا ہوا اک تاج محل لگتی ہو
(نامعلوم) محمد اشرف علی خاں، حیدرآباد

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
(غالب)

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
(فراق گورکھپوری) مس سیدہ رابعہ رشید، نرمل

ہم نے دل میں سجا لیے گلشن
جب بہاروں نے بے رُخی کی ہے
(فیض احمد فیض) مس رابعہ محمود اختر، نرمل

پاتے ہیں کچھ گلاب چٹانوں میں پرورش
آتی ہے پتھروں سے بھی خوشبو کبھی کبھی
(نامعلوم) نکہت ظفر عابدی، کانپور

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہے مردوں کی شمشیریں
(علامہ اقبال)

محمد شاہد، اورنگ آباد

تیرے بغیر بھی گزرے گی زندگی لیکن
بہت اداس، بہت بے قرار گزرے گی

اے دوست تجھ سے ترکِ تعلق کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی
(نامعلوم) نکہت پروین شگفتہ، گرڈیہہ

میں خنجر یقین تھا زہریلا سانپ تھا
قاتل بھی آستیں میں چھپائے گیا مجھے
(شاہد ساگری) عظمیٰ پروین، بھوپال

روح کا کرب نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے
لاکھ ہونٹوں پہ تبسم کو سجائے رکھئے
ساغر دارثی

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب دوبارہ ہم ملیں تو کوئی شرمندہ نہ ہو
(بشیر بدر) عائشہ خاتون، شاہجہاں پور

محلوں کی بلندی کی خواہش میں منبا...
ویران گھروندے میں اک دن تجھے...
فہیمہ شاہین، ناگ...

حشر میں سچ ہے کہ ہوگا نہ کسی کا...
آج بھی کون ہے اپنا کہ پرایا...
ضیاء شاہد، ناگ...

نکھر گئے ہیں پسینے میں بھیگ کر عار...
گلوں نے اور بھی شبنم سے تازگی...
شمع پروین، را...

میری نگاہِ شوق سے پاکر وقارِ حسن...
تم مجھ سے روٹھ جاؤگے ایسا گماں...
عبدالغفار، ناراتو...

میرے سوا نہیں ہے کوئی میری کائنا...
میں خود ہی اپنی دھوپ ہوں خود سایہ دار
روزی رانی، مظفرپور،

کیا خبر قافلۂ شوق کو لوٹا کس...
راہ میں کوئی نہ تھا راہ نما سے
عائشہ فرحانہ ناز، ...

اس وقت آپ کو کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے ایسا شعر جسے آپ بار بار سننا یا گنگنانا چاہتی ہیں؟ اُس شعر کے حُسن، اثر اور کیفیت میں دوسروں کو بھی شریک کیجئے۔ جس کارڈ یا کاغذ پر آپ اپنا پسندیدہ شعر لکھ کر بھیجیں، اس پر اپنا نام، پتہ ضرور درج کریں۔ اگر معلوم ہو تو شاعر کا نام بھی تحریر کریں۔

"میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ایثار کا پھل

محمد خورشید خاں

شاہین سے جب صابر کی پہلی ملاقات ہوئی تھی تو دونوں کو گمان بھی نہ تھا کہ ایک دن وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آجائیں گے کہ سارے فاصلے مٹ جائیں گے۔

صابر ایک دن اپنی بھتیجی رخشی کو اسکول میں داخل کرنے کی غرض سے گیا تھا۔ شاہین نے رخشی کا ٹیسٹ لینے کے بعد کہا تھا: "کم زور ہے چھٹی کلاس میں چل نہ سکے گی!"

"مہربانی کر کے اسے چلنا سکھا دیجئے گا۔ اسی لئے لایا ہوں ورنہ جہاں تک کمزور رہنے کا تعلق ہے، نہ جانے کب سے ایک ہی جگہ کھڑی ہے۔ بہت غریب ہے اُستانی صاحبہ۔"

"ہم انگلی پکڑ کر چلنا نہیں سکھاتے۔" شاہین نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "اُستانی صاحبہ" کا لقب اسے بہت گراں گزرا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے وہ کوئی بوڑھی ٹیچر کی طرح ہو، جس کے سر کے بال تک بالکل سفید ہو گئے ہوں۔

"اس کو دھکیل کر چلائیے یا مار کر چلائیے، کسی بھی طرح اس بے چاری کو مستقبل کی سنہری وادیوں تک پہنچا دیجئے!"

"بہت شاعرانہ باتیں کرتے ہیں آپ!" شاہین کا غصہ کافور ہو گیا تھا۔ "مستقبل کی سنہری وادیوں" کا ذکر سن کر اس کے دل میں نہ جانے کتنے ارمان مچلنے لگے تھے۔ "اچھا ٹھیک ہے! اس کو چھوڑ جائیے اور ٹرانسفر سارٹی فکٹ جلد بھجوا دیجئے گا ـــــ اور سنئے۔ آئندہ مجھے اُستانی صاحبہ ہرگز نہ کہئے گا۔"

"بہت بہتر محترمہ! اگر آپ کو یہ نام اتنا بُرا لگتا ہے تو ہم اپنے الفاظ واپس لیتے ہیں۔ کیا فون پر بات کرنے کی اجازت ملے گی؟ کیا اپنا نام بتائیں گی آپ؟"

تاریخ کا سب سے زیادہ معاوضہ پانے والا شاعر

مغل شہنشاہ اورنگ زیب (ہندوستان) کے دربار کے عربی شاعر زبیر نے اپنی خدمات کے عوض مال و دولت لینے سے انکار کر دیا تھا مگر بعد میں بہت اصرار کئے جانے پر اس نے ہر سال دو مٹھی ہیرے لینا منظور کر لیا۔ اس طرح وہ دس برس تک حضرت محمد الرسول اللہ ﷺ کے یوم ولادت و وفات پر شاہی خزانہ میں جا کر ہیروں سے دونوں مٹھیاں بھر کر ہیرے لیتا رہا۔

"اس کی ضرورت نہیں، ہماری ہیڈ مسٹریس ذرا سنکی ہیں۔ فون پر کسی کے مرنے کی بھی خبر آتی ہے تو انہیں گمان ہوتا ہے کہ شادی کا پیغام دیا جا رہا ہے۔ ویسے مجھے شاہین مقبول کہتے ہیں۔" شاہین نے کہا۔

"اور میں محمد صابر ہوں۔ سپریم انٹرپرائزز میں فیلڈ آفیسر کی حیثیت سے کام کرتا ہوں۔ وہیں سے فون پر رخشی کے بارے میں آپ سے پوچھتا رہوں گا۔"

شاہین ہنستے ہوئے بولی۔ "میں کسی انفارمیشن بیورو میں ملازم نہیں ہوں کہ بار بار رخشی سے متعلق خبریں مہیا کرتی رہوں۔ لڑکی آپ ہی سب کچھ بتا دیا کرے گی۔"

پھر رخشی نے جس رفتار سے اپنی کمی پوری کی، اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ شاہین نے اس فاصلے کو طے کر لیا جو شاہین اور صابر کے درمیان حائل تھا۔ وہ دونوں اتنے قریب آگئے کہ ایک دوسرے کی دھڑکنوں کو بھی آسانی سے سن لیا کرتے تھے۔ لیکن صابر ایک خاص منزل پر پہنچ کر رک گیا تھا اور اس کے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ مگر شاہین ہر لمحہ صابر کے وجود میں جذب ہونے کے لئے بے قرار تھی۔ صابر نے شادی کی خواہش کبھی ظاہر نہیں کی تھی۔ اور اب تو وہ بڑی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ شاہین سے دور رہنے کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا اور اس کے پاس آنے کا حوصلہ بھی اپنے اندر نہ پاتا تھا۔

آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ خنک تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ گرج دار بادلوں اور بجلی کے خوف سے وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر کی سمت جا رہا تھا۔ مہینوں بعد آج آفس سے گھر جاتے ہوئے وہ خود کو کچھ بشاش محسوس کر رہا تھا۔ سامنے دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ شگفتہ چہرہ، آنکھوں میں چمک۔ اس کا جی چاہا کہ پھول جیسے ہونٹوں کو چھو لے۔ لیکن وہ ٹھٹھک گئی۔ تب صابر کو احساس ہوا کہ سامنے شاہین نہیں، رضیہ ہے اور اس کے ساتھ ہی صابر کے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"شاہین — شاہین — شاہین" اس کے دل نے آواز دی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ آواز شاہین تک نہیں پہنچ سکے گی۔ شریک حیات خوب صورت ہو، نازک اندام ہو، خوش کلام ہو، سلیقہ مند اور وفا شعار ہو — یہ کون نہیں چاہتا۔ شاہین میں یہ ساری خوبیاں تھیں۔ لیکن پھر بھی صابر نے جب شاہین کو جیون ساتھی بنانے کے لئے

ہاں، کبھی تھی تو اس نے اس خیال کے لئے اپنے دل پر سے اختیار کرنا چاہا تھا۔ اس کو وہ خیال کہ کہیں رضیہ کو چاہتا تھا اور اسے یقین تھا کہ رضیہ بھی اس کو چاہتی ہے۔ اس دن جب اس نے رضیہ سے زندگی کے راستے پر قدم بقدم، شانہ بشانہ ساتھ چلنے کی بات کی تو رضیہ کے جواب نے اسے [illegible] کر دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رضیہ اس پیشکش کو ٹھکرا دے گی۔ جسے وہ تحفہ سمجھ رہا تھا، اسے دوستی کا نام دے [illegible] اس کا دل توڑ دے گی، کسی اور کا تذکرہ کر [illegible] اسے مایوس کر دے گی۔ اس سے پہلے کہ [illegible] رضیہ کے انکار کی تاب نہ لا کر دیوانہ ہو جا[illegible] شاہین نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

شاہین سے شادی کے بعد بھی رضیہ کا خیال صابر کو بے چین کرتا رہا۔ لیکن صبر کا سہارا بھی لیا تھا۔ دونوں کے راستے الگ الگ تھے۔ تاہم الگ الگ راستوں کے باوجود اکثر دونوں ملتے رہتے تھے۔ رضیہ ہر بار صابر کا استقبال مسکراہٹوں سے کرتی لیکن کچھ دن سے صابر محسوس کر رہا تھا کہ رضیہ کے رویے میں اب وہ گرم جوشی نہیں رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں زندگی سے بھرپور چمک نہیں اداسیاں ہی اداسیاں ہیں؟ یہ صابر نہیں سمجھ سکا۔

"کیسے ہو؟" وہ جب بھی ملتی یہ پوچھنا نہ بھولتی جیسے اسے صابر کا بہت خیال ہو۔

"شاہین کیسی ہے؟" یہ اس کا دوسرا سوال ہوتا تھا۔

"ازدواجی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی ہے؟ شاہین تمہارا خیال رکھتی ہے نا؟"

"تم اس کے ساتھ محبت سے پیش آ[illegible]

...یخ کا سب سے زیادہ
...وضہ پانے والا شاعر

...شہنشاہ اورنگ زیب (ہندوستان) کے دربار
...بی شاعر ذریہیر نے اپنی خدمات کے عوض مال ودولت
...ے انکار کر دیا تھا مگر بعد میں بہت اصرار کئے جانے پر
...نے ہر سال دو مٹھی ہیرے لینا منظور کر لیا، اس طرح
...ن برس تک حضرت محمد الرسول اللہ صلعم کے یوم ولادت
...ات پر شاہی خزانہ میں جا کر بوری میں سے دو مٹھیاں
...ر ہیرے لیتا رہا۔

"اس کی ضرورت نہیں، ہماری ہیڈ مسٹریس
...تی ہیں۔ خواہ پر کسی کے مرنے کی بھی خبر آتی ہے
...گمان ہوتا ہے کہ شادی کا پیغام دیا جا رہا ہے۔
...ہے شاہین مقبول کہتے ہیں"۔ شاہین نے
...

...اور میں محمد صابر ہوں۔ سپریم انٹرپرائزز
...انجینیئر کی حیثیت سے کام کرتا ہوں۔ وہیں
...پر رخشی کے بارے میں آپ سے
...وں گا۔"

...شاہین ہنستے ہوئے بولی "میں کسی اغوا کنندہ
...مجرم نہیں ہوں کہ بار بار رخشی سے متعلق
...رتی رہوں۔ لڑکی آپ ہی سب کچھ بتا دیا
...

...رخشی نے جس رفتار سے اپنی کمی پوری
...سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ شاہین نے

اس فاصلے کو طے کر لیا جو اس کے اور صابر کے درمیان حائل تھا۔ وہ دونوں اتنے قریب آگئے کہ ایک دوسرے کی دھڑکنوں کو بھی آسانی سے سُن لیا کرتے تھے۔ لیکن صابر ایک خاص منزل پر پہنچ کر رُک گیا تھا اور اس کے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ مگر شاہین ہر لمحہ صابر کے وجود میں جذب ہونے کے لئے بے قرار تھی۔ صابر نے شادی کی خواہش کبھی ظاہر نہیں کی تھی۔ اور اب تو وہ بڑی اُلجھن میں پڑ گیا تھا۔ شاہین سے دُور رہنے کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا اور اس کے پاس آنے کا حوصلہ بھی اپنے اندر نہ پاتا تھا۔

آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا جھکڑ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ گرج دار بادلوں اور بجلی کے خوف سے وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر کی سمت جا رہا تھا۔ مہینوں بعد آج آفس سے گھر جاتے ہوئے وہ خود کو کچھ بشاش محسوس کر رہا تھا۔ سامنے دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اس کے سامنے کھڑی تھی شگفتہ چہرہ آنکھوں میں چمک اس کا جی چاہا کہ پھول جیسے ہونٹوں کو چھو لے۔ لیکن وہ پیچھے کھسک گئی۔ تب صابر کو احساس ہوا کہ سامنے شاہین نہیں رضیہ ہے اور اس کے ساتھ ہی صابر کے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"شاہین ــــ شاہین۔ شاہین" اس کے دل نے آواز دی یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ آواز شاہین تک نہیں پہنچ سکے گی۔ شریک حیات خوب صورت ہو، نازک اندام ہو، خوش کلام ہو، سلیقہ مند اور وفا شعار ہو ــــ یہ کون نہیں چاہتا۔ شاہین میں یہ ساری خوبیاں تھیں۔ لیکن پھر بھی صابر نے جب شاہین کو جیون ساتھی بنانے کے لئے

"ہاں" بھی تھی تو اس ذرا سی "ہاں" کے لئے اسے اپنے دل پہ بے انتہا جبر کرنا پڑا تھا، اس لئے کہ وہ شاہین کو نہیں رضیہ کو چاہتا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ رضیہ بھی اس کو چاہتی ہے۔ ایک دن جب اس نے رضیہ سے زندگی کے طویل راستے پر قدم بقدم، شانہ بہ شانہ ساتھ چلتے رہنے کی بات کہی تو رضیہ کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رضیہ اس کی پیش کش کو ٹھکرا دے گی، جسے وہ محبت سمجھتا رہا تھا، اسے دوستی کا نام دے کر اس کا دل توڑ دے گی، کسی اور کا تذکرہ کر کے اسے مایوس کر دے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ رضیہ کے انکار کی تاب نہ لا کر دیوانہ ہو جاتا، شاہین نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

شاہین سے شادی کے بعد بھی رضیہ کا خیال صابر کو بے چین کرتا رہا۔ لیکن صبر کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ دونوں کے راستے الگ الگ تھے۔ تاہم الگ الگ راستوں کے باوجود اکثر دونوں ملتے رہتے تھے۔ رضیہ ہمیشہ کی طرح صابر کا استقبال مُسکراہٹوں سے کرتی۔ لیکن کچھ دن سے صابر محسوس کر رہا تھا کہ رضیہ کے رویّے میں اب وہ گرم جوشی نہیں رہی ہے، اس کی آنکھوں میں زندگی سے بھرپور چمک نہیں اُداسیاں ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ صابر نہیں سمجھ سکا۔

"کیسے ہو؟" وہ جب بھی ملتی، یہ پوچھنا نہ بھولتی، جیسے اُسے صابر کا بہت خیال ہو۔

"شاہین کیسی ہے؟" یہ اس کا دوسرا سوال ہوتا تھا۔

"ازدواجی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی ہے نا؟ شاہین تمہارا خیال رکھتی ہے نا؟"

"تم اس کے ساتھ محبت سے پیش آتے

ں پر تم کبھی بگڑ تے تو نہیں؟"
وہ شاہین کے بارے میں بہت
اتیں پوچھتی اور صابر کو ازدواجی زندگی
اب بنائے رکھنے کے مشورے
ر چلی جاتی۔ اور صابر اس کے متعلق سوچتا
ا تا۔

ایک شام کینٹین میں چائے کے دوران
نے صابر سے پوچھا۔ "شاہین ماں بن رہی
ا؟"

"ہاں!" صابر نے مختصر سا جواب دیا۔
"اس کی صحت تو ٹھیک ہے؟"
"ہاں۔"

رضیہ نے نظریں جھکا لیں اور بالکل
س رہی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ کچھ دیر
بولی۔

"یہ دن عورت کے لئے بہت کٹھن
تے ہیں۔ ایک ایک پل اس کا خیال رکھنا
سپتال میں چیک اپ بھی کراتے رہنا۔"

صابر نے مسکرا کر کہا۔ "میں تو مرد ہوں۔
کیا معلوم کیا ہوتا ہے ان دنوں میں۔ تم
ت ہو۔ تم سمجھ سکتی ہو۔ تم ہماری شادی کے
ر کبھی گھر نہ آئیں۔ کم از کم ان دنوں تو تمہیں
ہیے تھا کہ اس سے ملتیں، اسے سمجھاتیں، کچھ
مورے دیتیں۔ یوں بھی وہ تمہاری پیاری
سہیلی رہی ہے۔"

رضیہ اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ کچھ
لی نہیں۔

"چلو گی میرے ساتھ یا خود آؤ گی؟"
صابر نے پھر کہا۔

جب کئی بار صابر نے اپنا سوال دُہرایا
تو رضیہ تنک کر بولی۔ "آجاؤں گی کسی دن۔" اور اس

سے پہلے کہ صابر کچھ کہتا، وہ فوراً کینٹین کے باہر
چلی گئی۔

رضیہ صابر کے لئے ایک پہیلی سے
کم نہ تھی — ناقابلِ حل پہیلی۔

چاندنی رات تھی۔ فضا میں پیار کی
خوشبو مہک رہی تھی۔ صابر شاہین کی زلفوں
سے کھیل رہا تھا۔ ان دونوں کے رشتوں کے
مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے آنے والا
شاہین کے چہرے پر خوبصورت عکس بن کر
چمک رہا تھا۔

شاہین نے کہا۔ "ہم جو ایک دوسرے
کے اتنے قریب ہیں، اتنے خوش ہیں۔ جانتے
ہو یہ سب کس کی مہربانی ہے؟"

"کس کی؟" صابر نے سرگوشی میں کہا۔
"یہ سب رضیہ کی مہربانی ہے۔" شاہین
نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ یہ
جملہ ادا کیا۔

"رضیہ؟" "رضیہ!"
"ہاں۔"
"کیسے؟" صابر نے پوچھا۔ اس کا
ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

"میں نے رضیہ سے تمہیں مانگ لیا
تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تم سے پیار
کرتی ہے۔"

صابر چونک پڑا اور حیرت سے شاہین
کو دیکھنے لگا۔ "رضیہ انکار کر دیتی تو میں ساری
زندگی ان خوشیوں کے لئے محروم رہتی۔"

"اور تم نے ان خوشیوں کے بدلے
کیا دیا رضیہ کو؟" صابر بغیر رُکے بولا۔
شاہین کے چہرے پر اچانک اُداسی

سب سے مہنگی دوا کی خوراک

بارہ [illegible] ہندوستان کے بادشاہ [illegible]
(۱۳۲۸ — ۱۳۱۵) کو ایک بار [illegible] کے دوران [illegible]
[illegible] کے ذریعے [illegible] تیار [illegible] ہزار
[illegible] قیمت کی دوا کی ایک خوراک پینے کے لئے دی گئی تھی
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

چھا گئی۔ آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے
لگے اور خوشیوں کے دوش پر سوار جگمگاتی ہوئی
حسین رات غموں کے کرب انگیز اندھیروں
میں گم ہوتی چلی گئی۔

شاہین کے اس انکشاف سے صابر کو
معلوم ہو گیا کہ رضیہ نے اس طرح اسے کیوں ٹھکرایا
تھا۔ رضیہ نے صرف شاہین کی خوشی کے لئے
اپنے پیار کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ تاہم سب کچھ
جان لینے کے باوجود صابر کے پاس اس کے
سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ شاہین کو معاف کر دے،
اس لئے بھی کہ وہ اب اس کے بچے کی ماں بننے
والی تھی۔ اور ایسی حالت میں اسے کسی غم سے
آشنا بھی نہیں ہونا چاہئے۔

جب تخلیق کا درد شدت اختیار کر گیا
تو شاہین کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ بچہ
آپریشن سے پیدا ہوا۔ ایک ننھی سی جان صابر

کے بانہوں میں تھکنانے لگی تھی۔ لیکن شاہین ایسی بے ہوش ہوئی کہ پھر کبھی ہوش میں نہ آئی۔

شاہین کی موت صابر کے لئے ایک بڑا سانحہ تھی۔ بچّے کو پالنا بھی اس کے لئے آسان نہ تھا۔ لیکن رضیہ نے خلافِ توقع اس کی مشکل آسان کردی۔ اس نے بچّے کو سینے سے لگالیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہی اس کی ماں ہو۔ شاہین کے ہوتے ہوئے وہ کبھی صابر کے گھر نہ آئی، لیکن اب وہ ہر روز اس کے گھر آجاتی۔ پُورا دن بچّے کے ساتھ گزارتی اور شام کو صابر کے آنے کے بعد اپنے گھر چلی جاتی۔ اسی لئے صابر بھول گیا تھا کہ دروازے پر مُسکراہٹ سے اس کا استقبال کرنے والی شاہین نہیں رضیہ ہے۔

تیز چلتی ہوئی ہوائیں طوفان کی شکل اختیار کرتی جارہی تھیں۔ بادل گوٹ کر برس پڑنے پر آمادہ تھے۔ بجلیاں کوندرہی تھیں۔ صابر اس طوفان سے بے خبر ماضی اور حال کے خیالوں میں گھرا ہوا تھا کہ رضیہ کو اس نے اپنے سامنے سے گزرتا دیکھا۔ یہ وقت اس کے گھر جانے کا تھا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچی تو صابر نے پکار کر کہا: "رضیہ! باہر طوفان ہے دروازہ بند کرکے لوٹ آؤ۔"

صابر کی آواز جیسے رضیہ کے پیروں کی زنجیر بن کر رہ گئی۔ وہ رُک گئی، پلٹ کر صابر کو دیکھا اور پھر دروازے کی طرف مُڑ گئی۔ دروازے کے پٹ تیز ہواؤں کی تاب نہ لاکر دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔

رضیہ نے پھر ایک بار گھوم کر صابر کو دیکھا اور آہستگی سے دروازہ بند کردیا۔ پھر صابر کے سامنے سے گزرتی ہوئی وہ اس کمرے میں چلی گئی جہاں بچّہ سورہا تھا۔ جہاں پہلے کبھی شاہین رہا کرتی تھی۔

دروازہ بند ہوجانے سے طوفان کا شور اندر کچھ کم ہوگیا، لیکن صابر کے اندر ماضی اور حال کے خیالات کے ٹکراؤ سے ایک نئے طوفان نے جنم لے لیا۔ اور جب طوفان تھما تو ہنگامہ خیز تمام شب کے پُرسکون آغوش میں سمٹ کر کھوگئی۔ اور اس کے ساتھ ہی صابر نے دیکھا کہ رضیہ اس کے بچّے کو سینے سے لگائے اطمینان اور سکون سے سو رہی تھی۔ اور تب صابر کو کچھ ایسا احساس ہوا جیسے اس کے اندر کا طوفان بالکل تھم گیا ہو۔

○○

مہربانو

اگر آپ کی آنکھیں دُکھ رہی ہیں تو ترش انگوروں کا پانی شیشی میں ڈال لیں اور ڈراپر سے بُوند بُوند دُکھتی ہوئی آنکھوں میں ڈالیں۔ بہت جلد آرام ہوگا۔

●

مکڑی عام طور پر زہریلی نہیں ہوتی، مگر اس کی بعض قسمیں زہریلی ہوسکتی ہیں۔ اگر مکڑی کے کاٹنے کے بعد زہریلی علامات ظاہر ہونے لگیں تو چولائی کا ساگ گھونٹ کر لیپ کریں۔

●

اگر سبز ساگ نہ ہو تو خشک ساگ لے کر پانی یا سرکہ میں گھونٹ کر لیپ کردیں۔ اس سے زہریلے اثرات دُور ہوجائیں گے۔

●

دانتوں کی بیماری دُور کرنے اور دانتوں کو چمک دار بنانے کے لئے آم کے پتّے لے کر سائے میں سکھالیں۔ پھر برابر کا نمک ڈال کر انہیں باریک پیس لیں، اس سفوف سے دانت صاف کریں۔

●

جامن کی لکڑی کا کوئلہ اور نمک ملاکر منجن بنائیں اور اسے مسوڑھوں پر ملیں۔ یہ خون آنے کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔

●

دست آنے کے لئے گولر کے نرم پتّے تین ماشہ پانی میں گھونٹ چھان کر پلائیں۔ ایک ہی خوراک سے دست بند ہوجائیں گے۔

●

اگر سر میں جوئیں پڑجائیں تو پیاز کا عرق نکال کر بار بار سر میں لگائیں۔ ساری جوئیں مرجائیں گی۔

شہر کے درمیان خشکی کا جہاز

راحت علی

بحری جہاز کی کئی قسمیں ہوتی ہیں مثلاً جنگی جہاز، سامان ڈھونے والے جہاز، تیل بردار جہاز (جسے آئل ٹینکر کہتے ہیں) اور مسافروں کو لے جانے والے جہاز جن میں عیش کے سب سامان مہیا ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے ذاتی جہاز رکھتے ہیں۔ انہیں انگریزی میں "یاٹ" کہتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں امیر آدمیوں کو ذاتی جہاز رکھنے کا بہت شوق ہے۔ متوسط درجے کے لوگ بھی چھوٹا سا جہاز رکھ کر اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ دنیا میں سب سے بڑا ذاتی جہاز ملکہ الزبتھ کے پاس ہے۔ اس کی لمبائی ۴۱۲ فٹ ہے۔ اس میں زندگی کے تمام لوازم مہیا ہیں۔ لیکن اب سعودی عرب کے بادشاہ فہد نے ملکہ الزبتھ کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان کا ذاتی جہاز ۴۷۰ فٹ لمبا ہے، یعنی ملکہ کے جہاز سے ۵۸ فٹ زیادہ۔ اس کی آرائش اور ساز و سامان دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

شاہ فہد کے اس جہاز کا نام "عبدالعزیز" ہے۔ یہ بادشاہ کے والد کا نام بھی تھا۔ اس جہاز میں ۴ عرشے ہیں۔ بحری زبان میں منزل کو عرشہ کہتے ہیں سفید رنگ کے اس جہاز [illegible] میں ۶۰ مہمانوں کے رہنے کی جگہ ہے [illegible] کے رہنے کے کمرے الگ ہیں۔ بادشاہ کے [illegible] میں جا بجا نیلم جڑے ہوئے ہیں۔ نہانے کا [illegible] سنگِ مرمر کا ہے۔ نل، پائپ اور جالیاں [illegible] قیراط سونے کی ہیں۔ اس کے علاوہ جہ[illegible] میں سنگِ مرمر کا سوئمنگ پول ہے۔ [illegible] کا غسل لینے کے لیے بھی کئی حمام ہیں۔

"عبدالعزیز" میں ایک چھوٹا سا [illegible] بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر اور نرسوں کے [illegible] ہیں۔ اسپتال میں ادویات اور آپریشن کی [illegible] سہولتیں موجود ہیں۔ مریض کو فوراً بڑے [illegible] لے جانا پڑے تو ہیلی کوپٹر بھی موجود ہے۔ [illegible]

، بیگمات پردے میں رہتی ہیں۔ اس
، ان کے لئے بھی الگ کمرے ہیں۔ ایک
ل بادشاہ کے حرم کے لئے مخصوص ہے'
زیز' انگلستان کے شہر ساؤتھ ہمپٹن میں
ہے۔ اس کی تعمیر کے دوران اس کے
طرف بڑی بڑی دیواریں کھڑی کردی
، تاکہ آنے جانے والوں کی نگاہوں سے
ہے۔

سعودی عرب کے ایک تاجر
، خشوگی نے بھی ایک ذاتی جہاز تعمیر کرایا
اس کا نام بنیلہ دوئم ہے۔ یہ جہاز تین
ہے۔ اس میں بھاپ کے ۲ غسل خانے
سوئمنگ پول ہے۔ ایک سینما ہے، نل
ٹیاں اور دروازوں کے ہینڈل اور چٹخنیاں
۲۴ قیراط سونے کی ہیں۔ اس جہاز میں
پٹر کے اترنے کی جگہ بھی ہے۔ اس کے
ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی نصب ہے، جس کا سلسلہ
ئٹ سے ملتا ہے۔ عدنان خشوگی ایک
پتی بلکہ عرب پتی تاجر ہیں۔ وہ سعودی عرب
یک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔
یکہ کے شہر لاس انجلز میں تعلیم حاصل
ہے تھے کہ انہیں تجارت کرنے کا خیال
تجارت میں انہیں زبردست کام یابی
ل ہوئی۔ انہوں نے ایک ۱۷ سالہ
ں لڑکی سے شادی کرلی۔ ان کے پاس دو
ب ہوائی جہاز تھے۔ ایک میں وہ اپنی
بچوں اور نوکروں کے ساتھ سفر کرتے
۔ دوسرے میں ان کا سامان رکھا جاتا تھا
ں انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی
بچوں کو ماں سے جدا کرکے سعودی عرب
بھیج دیا۔ ماں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا
بچے تو اسے نہ مل سکے لیکن اس نے خشوگی کی
جائیداد سے کروڑوں روپے جرمانہ وصول کرلیا
خشوگی کے لئے یہ نقصان اونٹ کے مونہہ میں
زیرے کے برابر تھا۔ انہوں نے امریکہ چھوڑ دیا
اور فرانس کے جنوبی ساحل پر رہائش اختیار کرلی
ان کا ذاتی جہاز وہیں لنگر ڈالے کھڑا رہتا ہے۔

ان شان دار بحری جہازوں کے ساتھ
ایک اور بحری جہاز کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس
جہاز کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پانی میں چلنے کی
بجائے ٹھوس زمین پر کھڑا رہتا ہے۔ یہ جہاز نما
مکان ایک ہندوستانی جوڑے کی ملکیت ہے۔
یہ جوڑا جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن میں رہتا ہے۔
میاں کا نام دو کی راجا دورائی ہے اور بیوی کا نام
لیلاوتی۔ یہ لوگ (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے)
اصل میں جنوبی ہند کے رہنے والے ہیں۔ ان کے
آباد اجداد جنوبی افریقہ میں آباد ہوگئے تھے۔
راما دورائی کی عمر ۶ سال ہے۔ وہ ڈربن کے
ایک مشہور تاجر ہیں، ان کے دل میں ہمیشہ ایک ہی
آرزو تھی۔ وہ ایک ایسا گھر تعمیر کریں جو اپنی مثال
آپ ہو۔ ان کی بیوی لیلاوتی بھی ان کی ہم خیال
ہیں۔ دونوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ وہ اپنے
گھر کو ایک بحری جہاز کی شکل میں تعمیر کریں گے۔
یہ جہاز نما مکان حال ہی میں مکمل ہوا ہے جب
لوگ اس مکان کو دور سے دیکھتے ہیں تو حیرت
میں پڑ جاتے ہیں۔ انہیں زمین پر ایک بحری جہاز
کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے جیسے وہ اس کے
قریب آتے ہیں جہاز کے خدوخال زیادہ صاف نظر
آتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں' واقعی یہ ایک بحری جہاز
ہے لیکن پانی کا دور دور تک نشان نہیں۔ مکان
کے قریب پہنچ کر ان پر حقیقت واضح ہوجاتی ہے
لیلاوتی نے اس جہاز نما مکان کا نام 'نوح کی کشتی'
رکھا ہے۔

'نوح کی کشتی' میں بھی عام بحری جہازوں
کی طرح ۳ منزلیں ہیں۔ اس کی لمبائی ۱۴۵ فٹ
اور چوڑائی ۲۲ فٹ ہے۔ جب لیلاوتی تیسری
منزل سے آس پاس کے عام مکانوں کو دیکھتی
ہیں تو ان کا سر فخر سے اونچا ہوجاتا ہے۔ وہ خود
کو جہاز کا کپتان سمجھتی ہیں۔ لیلاوتی کے خاوند کو
سیاحت کا شوق ہے۔ لیکن ۶۷ سال کی عمر میں
یہ شوق محنت طلب معلوم ہوتا ہے۔ اگر سفر کے
لئے اصلی بحری جہاز میسر نہیں تو پتھر اور سیمنٹ
کا بنا ہوا جہاز ہی سہی۔

'کشتی نوح' اب ڈربن میں سیاحوں کی
دل چسپی کا مرکز بن گیا ہے۔ لوگ دور دور سے اس
مکان کو دیکھنے آتے ہیں۔ یہ مکان اب شہر میں ایک
سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لوگ جب کسی کو
بتاتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ جہاز سے آگے جاکر
دائیں طرف مڑ جانا یا میرا مکان جہاز سے ایک
کلو میٹر دور ہے۔

لیلاوتی کا جہاز ہر طرح کے عیش و آرام
کے سامان سے آراستہ ہے، اس کے کمروں
کی ساخت بھی جہاز کے کمروں سے مشابہت
رکھتی ہے۔ برآمدے کی جگہ جہاز کا عرشہ ہے۔
دیوار پر لنگر کا نشان ہے۔ کمروں میں جہاز کے
کیبن کی طرح گول کھڑکیاں ہیں' جو پورٹ ہول
کہلاتی ہیں۔ اوپر کی منزل پر جہاز کو موڑنے والی
چرخی ہے۔ یہاں تک کہ مکان کا پھاٹک بھی جہاز
کے زینے یا گینگ وے کی طرح بنا ہوا ہے۔

جنوبی افریقہ میں لیلاوتی کا مکان 'کشتی نوح'
اپنی نوعیت کا واحد مکان ہے جس کی بنیاد پانی کی بجائے
ٹھوس زمین پر قائم ہے۔ □□

عقیدت بحضور

اداسیوں کو خوشی کی خبر غریب نواز
ابھی شب کی سلگتی سحر غریب نواز
شعور و فکر بھی ہو معتبر غریب نواز
پڑے جو آپ کی ہم پر نظر غریب نواز
ہے سرحدوں سے کہیں ماورا دلوں کا جہاں
عطا کرم کی رہے عمر بھر غریب نواز
مقام و مرتبہ، ہندالولی کہیں جن کو
کہیں فقیر، کہیں مقتدر غریب نواز
وہ سلسلہ جو کئی سلسلوں کا مرکز ہے
طریقتوں کا تناور شجر غریب نواز
قدم قدم کی تھکن کو سکون کا مژدہ
بقا کی راہ نظر تا نظر غریب نواز
وہ معجزہ بھی تو اریخ میں درخشاں ہے
کہاں وہ قوت ظالم کدھر غریب نواز
مرے کلام کے عرفان آگہی کے طفیل
ہو زندگی بھی مری با اثر غریب نواز

اسلم میاں نے شفقت بھرے

بہو کو پکارا "سیما بیٹے!"

سیما ان کی آواز سن کر دوپٹہ درست کرتے

ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی "جی ابا جان"

"بھئی، ذرا باورچی خانے کی طرف بھی

سلسلہ کام کریمن پر ہی نہ چھوڑ دینا۔ پرسوں

ت نے قورمہ جلا ڈالا تھا۔ اور ہاں، وہ

سات بجے کے قریب آجائیں گے"

سیما نے زیرِ لب مسکرا کر کہا "آپ فکر

یے۔ مہمانوں کے آنے سے پہلے سب کچھ

ہو جائے گا۔ میں اب بھی باورچی خانے

ہی آئی ہوں"

"فیرنی کے لئے پستہ بادام اور کیوڑا

ں؟ سب تو رکھے ہوں گے۔ کل چار کلو

ایا تھا۔ اور ہاں، سلیم کب تک لوٹے گا؟

وہ آج میں نے ان سے جلد آنے کے لئے

ہ تو دیا تھا۔"

"ارے بھئی، ڈاکٹروں کا بھی کوئی وقت

نا ہے؟ کوئی ایمرجنسی کیس آگیا تو جانے کب

نا ہو؟ اور ہمارے بڑے برخوردار کلیم میاں کو بھی

ج ہی جانا تھا۔ ٹور ٹال دیتے کسی طرح"

سیما کچھ سوچ کر بولی "جی وہ چلتے چلتے ایک

بات کہہ گئے تھے"

"کیا کہہ گیا تھا؟"

"وہ کہہ گئے تھے کہ شادی کی تاریخ ستمبر

کے پہلے ہفتہ میں مقرر ہو جائے تو بہتر ہے۔"

کریمن نے باورچی خانے سے سر نکال کر سیما

کو پکارا "بہو رانی، ذرا ادھر دیکھیو تو۔ پلاؤ کو

دم کر دوں؟"

سیما جب اس گھر میں دلہن بن کر

> آج خوشی سے گھر کے در و دیوار ناچ رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں سجی ہوئی ہر چیز سیما کی سلیقہ مندی کی خاموش کہانیاں سُنا رہی تھیں

آئی تھی تو ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ سلیم ان دنوں پانچ برس کا ہوگا دوسرے ہی سال امی کو فالج نے آگھیرا۔ کمزور تو پہلے ہی تھیں بیماری کا مقابلہ نہ کرسکیں اور اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ابھی سیما کے پہننے اوڑھنے کے دن تھے کہ گھر میں اکیلی عورت ہونے کے ناتے ساری ذمہ داریاں اسی پہ آپڑیں۔ سلیم بچہ تھا۔ ماں کا غم برداشت نہ کرسکا اور اکثر بیمار رہنے لگا۔ بھائی کی فکر میں کلیم ہر وقت پریشان رہنے لگا۔ سیما نے اپنی خدمت، ممتا اور پیار سے سلیم کو سنبھال لیا۔ سلیم نے جب بھابی کے اندر ماں کی جھلک دیکھی تو آہستہ آہستہ سارا دُکھ بھول گیا۔ دن پر لگاکر اُڑنے لگے۔ سیما دو بچوں کی ماں بن گئی۔ سلیم کی جانب سے اس کی توجہ کم نہ ہوئی۔ سلیم نے اعلیٰ پوزیشن سے ہائر سیکنڈری کا امتحان پاس کرلیا تو اسلم میاں کے بچپن کے دوست حبیب خان نے اپنی بیٹی آسیہ کا رشتہ سلیم سے طے کردیا۔ آسیہ نہایت خوب صورت اور گھریلو لڑکی تھی جو گھر کے ہر فرد، خاص طور سے سیما سے بے حد مانوس تھی۔ سلیم خود اسے پسند کرتا تھا۔ ہائر سیکنڈری کے بعد سلیم نے میڈیکل میں داخلہ لے لیا اپنی ذہانت اور محنت کی وجہ سے آج وہ ایک نہایت باصلاحیت سرجن تھا۔ اپنی شرافت اور غریب نواز عادت کی وجہ سے اسے شہر میں ہر جگہ سراہا جانے لگا تھا۔ حبیب خان لوگوں کے مُنہ سے اپنے ہونے والے داماد کی تعریفیں سُن کر پھولے نہ سماتے تھے۔ انہوں نے چپکے چپکے آسیہ کی شادی کی تیاریاں مکمل کرلیں اور اسلم میاں سے کہہ دیا کہ وہ اپنی امانت کو لے جائیں۔

آج خوشی سے گھر کے در و دیوار ناچ رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں سجی ہوئی ہر چیز سیما کی سلیقہ مندی کی خاموش کہانیاں سُنا رہی تھی۔ اسلم میاں کی مزاحیہ باتوں سے ہنس ہنس کر سب کا بُرا حال تھا۔ انہوں نے اپنی ہونے والی ہمدھن یعنی حبیب خان کی بیگم کو اپنی باتوں کا نشانہ بنا رکھا تھا کھانا تیار ہوچکا تھا۔ کریمن ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے برتنوں کو ایک سفید کپڑے سے صاف کررہی تھی۔ سیما کی نظریں بار بار دیوار پہ ٹنگے ہوئے سنہری کلاک کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ بظاہر وہ قہقہوں میں شامل تھی۔ مگر اندر سے کچھ پریشان بھی تھی۔ اسکوٹر کی آواز سُن کر سب لوگ خاموش ہوگئے اور دروازے کی طرف کچھ اس طرح دیکھنے لگے جیسے وہ دروازہ نہیں کسی سنیما کا پردہ تھا۔

سیما چلتے چلتے دروازے کی طرف بڑھی سلیم سیما کو دیکھتے ہی سرگوشی میں بولا "سوری بھابی، آج بھی لیٹ ہوگیا۔"

ہیلمٹ سنبھالتا ہوا وہ آگے بڑھا اور سب کو سلام کرکے صوفے پہ بیٹھ گیا چہرے سے وہ کافی پریشان لگ رہا تھا حبیب خان نے خاموشی کو توڑا۔ "آج ڈاکٹر صاحب بہت لیٹ ہوگئے بھئی۔"

سلیم ادب سے بولا "جی انکل، ایک ایکسیڈنٹ کیس آگیا تھا، جس کی وجہ سے رُکنا پڑا۔"

ایکسیڈنٹ کے متعلق کچھ بات چیت کرنے کے بعد سلیم اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جب وہ کپڑے بدل کر لوٹا تو کھانا لگ چکا [illegible] کھانے سے فارغ ہوکر پھر سب لوگ دیوان اور صوفوں پہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ عشا کی اذان ہوئی تو عورتوں نے اپنے اپنے پلو دُرست کئے اور بچوں کو بولنے سے منع کرنے لگیں۔ اسلم میاں اور حبیب خان نماز کے لئے اُٹھ گئے۔ آسیہ کی چھوٹی بہن عالیہ سلیم کو باتوں باتوں میں چھیڑنے لگی۔ حبیب خان کی بیگم، سیما کے آگے آپ کی تعریفوں کے پُل باندھتے کھول کر میٹھا [illegible] تھوڑی دیر بعد نماز سے فارغ ہوکر دونوں دوست قہقہے بکھیرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ حبیب خان کی طرف سیما نے پان کی طشتری بڑھائی "شکریہ" کہہ کر انہوں نے ایک پان اُٹھایا اور مُنہ میں رکھ لیا پھر بولے "ہاں بھئی اسلم، بتاؤ، کب کی تاریخ رکھ لیں۔ باقاعدہ رسم دوستوں اور رشتہ داروں کے سامنے ادا ہوجائے گی۔"

اسلم میاں نے سگریٹ سُلگایا اور خوش ہوکر بولے "ہاں بھئی خان، نیک کام میں دیر کیسی کلیم نے ستمبر کے پہلے ہفتے کی کسی بھی تاریخ کے لئے کہا ہے۔ باقی سلیم سے پوچھ لو۔"

حبیب خان سلیم کی طرف متوجہ ہوئے "کیوں سلیم بیٹے، تمہارا کیا خیال ہے؟"

سلیم، جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا پھیکی سی مُسکراہٹ بکھیر کر بولا "جی۔ بہتر انکل میں تو خود چاہتا ہوں کہ کام جتنی جلد ہوجائے اچھا ہے میرے بھی کئی مسئلے ہیں۔"

حبیب خان نے مُسکرا کر پوچھا "میرے

"خبردار اس سے آگے ایک لفظ بھی کہا تو یہ پٹھان بھول جائے گا کہ تم کس کے بیٹے ہو میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنے گرے ہوئے اتنے لالچی ہو گئے"

میں کھاتا ہوں۔"

سلیم کچھ تیور بدل کر بولا "شادی کے بعد تو میری زندگی بننے والی ہے، انکل۔"

اسلم میاں نے ایک لمبا کش کھینچا اور حیران ہو کر بولے "یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو سلیم؟"

سلیم باپ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر حبیب خان سے بولا "اب دیکھئے نا انکل، میں ایک میڈیکل آفیسر ہوں میرے ساتھی ڈاکٹروں کے پاس کاریں ہیں اور میرے پاس؟ وہی پرانا ٹوٹا ہوا اسکوٹر! سچ، بڑی شرم آتی ہے۔ ایک چھوٹا یا مرسڈیز نہ سہی کم سے کم فیئٹ تو دیں گے ہی آپ۔ آخر آپ اچھے بزنس مین ہیں۔"

سلیم کی بات سن کر سب لوگ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اسلم میاں نے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر سلیم کو خفگی نظروں سے دیکھا اور بولے "یہ کیا مذاق ہے؟ تم ہوش میں بھی ہو؟"

سلیم آنکھیں پھیر کر بولا "ابا، آپ نہیں سمجھتے اس دور کے تقاضوں کو۔"

حبیب خان کا چہرہ فق ہو چلا تھا۔ وہ لرزتی آواز میں بولے "سلیم! تم اتنے پڑھے لکھے ہو کر جہیز کا مطالبہ کرتے ہو؟"

سلیم مصنوعی ہنسی ہنس کر بولا "اونو انکل! یہ لفظ تو آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے۔ میں تو آپ سے آپ ہی کی بیٹی کے لئے مدد مانگ رہا ہوں۔ اب دیکھئے نا، فنڈ اور انشورنس کٹ کٹا کر صرف دو ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں۔ بتلائیے، کیا سکھ دے پاؤں گا آپ کی بیٹی کو؟ اگر آپ اپنے اندرا کالونی والے پلاٹ پر لاکھ دو لاکھ خرچ کر کے میرا کلینک بنوا دیں تو آپ کی بیٹی پر دولت کی بارش کر دوں۔ پھر دنیا کا ہر وہ سکھ جس کے بارے میں وہ سوچ سکتی ہے، میں اسے دوں گا۔"

بیٹے کی باتیں سن کر اسلم میاں سکتے میں آ گئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرش کو گھورنے لگے۔ حبیب خان گڑگڑا کر بولے "مگر بیٹے، میری اتنی حیثیت نہیں، جتنا تم سوچ رہے ہو۔ میرے تین بچیاں اور بھی ہیں۔ اور پھر میں تو تھوڑا سا کم ہو جو تم ....."

سلیم غصے میں آکر حبیب خان کی بات کاٹتے ہوئے بولا "سب کچھ دے کر آپ مجھ پر احسان نہیں کریں گے۔ آپ اپنی بیٹی کے سکھ کے لئے دیں گے۔ یاد رکھئے، اگر ایک ڈاکٹر داماد چاہئے، تو یہ سب کچھ کرنا ہوگا، ورنہ ڈھونڈ لیجئے کوئی میونسپلٹی کا چپراسی یا کلرک اپنی بیٹی کے لئے۔"

حبیب خان کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ اور پھٹ پڑے "خبردار! اس سے آگے ایک لفظ بھی کہا تو یہ پٹھان بھول جائے گا کہ تم کس کے بیٹے ہو، میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنے گرے ہوئے، اتنے لالچی ہو گئے۔ میں نے جب یہ رشتہ طے کرنے کی غلطی کی تھی، اس وقت تم صرف ہائر سیکنڈری پاس تھے، ڈاکٹر نہیں، اور پوچھو اپنے اس باپ سے جو خاموش بیٹھا میری عزت کا تماشا دیکھ رہا ہے کہ تم کو ڈاکٹر بنانے میں میرا کتنا ہاتھ ہے۔ ارے میں نے تو ذات پات کا فرق بھی نہ دیکھا۔ صرف دوستی دیکھی، ـــــ دوستی۔"

حبیب خان غصے سے کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے، جوتا پہن کر چھڑی سنبھالی اور بیگم سے بولے "چلو بیگم، آؤ شمو۔ ان خود غرضوں کے گھر مجھے ایک پل نہیں ٹھہرنا۔"

سلیم ہل کھا کر بولا "آپ حد سے بڑھ رہے ہیں!"

اسلم میاں نے کھڑے ہو کر کانپتے ہاتھوں سے حبیب خان کا کندھا پکڑ لیا، اور بولے "خان، تم اس بدتمیز کی باتوں پر نہ جاؤ۔ خدا کے لئے میری دوستی کا خیال کرو۔"

"اسلم، دوستی کا ہاتھ تیری خاموشی سے ظاہر ہے کہ سارا ڈرامہ تیرا ہی رچا ہوا ہے۔ ہٹ جا میرے راستے سے۔"

کاندھا چھڑا کر حبیب خان نے اپنی بیگم کی کلائی پکڑی اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے باہر لے گئے۔ پیچھے پیچھے عالیہ روتی ہوئی چل دی۔

سیما پتھر کی مورتی بنی سب کچھ دیکھتی رہ گئی۔ اس کا سکتہ اس وقت ٹوٹا جب اسلم میاں گرجے: "دیکھا اپنی اوقات؟ پیدا ہوتے ہی مر گیا ہوتا تو آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ میری عمر بھر کی دوستی مٹی میں ملا دی!"

سیما اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے ان کے قریب آئی۔ سلیم ایک بے جان لاش کی طرح بیٹھا تھا۔

"ابا! خدا کے لئے صبر کیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا!" سیما نے دردبھری آواز میں اسلم میاں کو دلاسا دیا۔

سیما کی آواز سنتے ہی اسلم میاں برس پڑے "اس گھر کو بگاڑنے والی تم ہو، صرف تم!

کندھے پر بٹھائی ہوئی لاش کے ساتھ رقص

افریقہ میں کیمرون علاقہ میں رہنے والی کالی نسل کے ایک فرد کی لاش کو خوب زرق برق کپڑے پہنا کر اور سر پر تاج پہنا کر گھنٹوں چلنے والے ایک رقص میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس رقص میں یہ سجائی لاش آدی واسیوں کے کندھوں پر لٹکائی جاتی ہے

...دیکھ لیا آج بے جا لاڈ پیار اور چھوٹ کا نتیجہ"

سیما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلیم ...گردن جھکائے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا

گیارہ بج چکے تھے سیما بچوں کو سلا کر ...کے قدموں سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ...ی روشنی میں اسلم میاں بیٹھے، سگریٹ پھونک رہے ...ے۔ سگریٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے قریب ...ی ہوئی تپائی پر اور نیچے فرش پر بکھرے پڑے ...۔ سیما ان کے قریب آکر آہستہ سے بولی ...پ سوئے نہیں ابھی تک ابا جان؟"

اسلم میاں نے اسے دیکھے بغیر ایک ...کش کھینچا اور سرد آہ بھر کر بولے۔

"اب شاید کبھی نہ سو سکوں گا سیما بیٹے، میں تو یہ سوچ سوچ کر مرا جا رہا ہوں کہ کل جب ہمارے گھر کی یہ بات گلیوں اور بازاروں میں پھیلے گی تو — توبہ توبہ! اس خبیث نے تو شہر میں رہنے کے قابل نہ چھوڑا۔" کچھ سوچ کر وہ سیما کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولے۔ "تم ہی کوشش کرو شاید مان جائے اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہو۔"

"جی — میں دیکھتی ہوں۔"

سلیم کا کمرہ روشن تھا۔ سیما نے آہستہ سے دروازہ چھوا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر سلیم کرسی پر بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا۔ وہ سیما کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "بھابی! آپ! اس وقت؟"

"بس سلیم!" سیما بھرآئی ہوئی آواز میں بولی "یہ سب اچانک کیا ہو گیا؟ تو نے سب کے سپنوں کو کرچی کرچی کیوں کر ڈالا؟ کس بات کا بدلہ لیا ہم سے آج تو نے؟"

"بھا — بی! وہ..." وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"وہ" سیما زخمی ناگن کی طرح بل کر چیخی۔

"مر گئی تیری بھابی۔ تیرا کسی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں، کوئی ناتا نہیں۔" بتا وہ کون تھا جس نے سارے گھر کو جلا کر راکھ بنا دیا؟ کون تھا وہ جس نے نہ رشتوں کی پروا کی اور نہ انسانیت کا پاس رکھا! بول! جواب دے، کون تھا وہ؟ وہ تم ہرگز نہ تھے۔"

سلیم نے دائیں ہاتھ کی پشت سے پیشانی کو صاف کیا جس پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئی تھیں۔

"وہ میں ہی تھا۔ بھابی — وہ میری ضرورتیں تھیں۔"

"ضرورتیں؟ ایک دن میں ضرورت مند بن گئے تم؟ لالچی، بد اخلاق اور بدتمیز ہو گئے تم؟ تم جھوٹ بول رہے ہو! ان ہاتھوں نے تم کو پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ تم ان کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اپنی بھابی کی آنکھوں پر تم پردہ نہیں ڈال سکتے۔ دنیا کی آنکھوں میں ضرور دھول جھونک سکتے ہو۔"

سلیم گردن جھکائے بیٹھا تھا اس کی آنکھوں سے قطرے فرش پر ٹپکنے لگے۔

سیما پھر سنبھل کر بولی۔ "ذرا باہر نکل کر دیکھو ابا کی حالت۔ خدا نہ کرے ان کو کچھ ہو گیا تو؟ اور تیرے بھیا پہلے ہی سے بلڈ پریشر کے مریض ہیں، وہ سنیں گے تو؟"

سیما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سلیم بے چین ہو اٹھا اور تڑپ کر بولا "بھابی — پلیز!"

"سچ سچ بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کون سی ایسی مجبوری تھی جس پر تم نے سارے اپنوں کو قربان کر دیا۔ بتاؤ۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو قسم پروردگار کی صبح ہوتے ہی میری لاش دیکھو گے۔"

"نہیں بھابی، ایسا نہ کہئے۔ میری ماں دو دفعہ مر جائے گی۔ میں بھی جانتا تھا کہ سلیم ساری دنیا کو دھوکا دے سکتا ہے، مگر اپنی بھابی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔"

سیما آنکھیں پھاڑے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تھوک نگل کر بولا۔

"دراصل میں — ڈاکٹر زرینہ سے بے حد پیار کرتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ میں اس سے شادی کا وعدہ کر چکا ہوں۔ بھابی، میں لالچی نہیں ہوں، مگر نسبت توڑنے کے لئے اس کے سوا میرے پاس اور کوئی جواز نہ تھا۔"

سیما سنتے سنتے برف کی سل بن چکی تھی کمرے سے باہر کسی کے قدموں کی چاپ دروازے سے الگ ہوتی چلی گئی۔

دوسروں کی قسمت کا حال بتلانے والی حساب داں

شکنتلا دیوی :

مشہور انسانی کمپیوٹر شکنتلا کے
نام سے کون واقف نہیں ہے۔
ہندوستان کے علاوہ شکنتلا
نے یورپ اور امریکہ میں بھی اپنی قابلیت کے
جھنڈے گاڑ دئے ہیں۔ وہ چند لمحوں میں
حساب کے اتنے پیچیدہ سوال حل کر دیتی
ہے جنہیں حل کرنے میں ایک ریاضی داں
کو کئی گھنٹے صرف کرنے پڑتے ہیں۔ ایک
بار اس نے آسٹریلیا میں ایک کمپیوٹر کو تین
سیکنڈ سے مات دے دی تھی۔ اس نے یورپ
اور امریکہ کا کئی بار دورہ کیا اور ہر بار وہاں
سے کامیاب ہو کر واپس آئی۔

آج شکنتلا کو قابل رشک کامیابی
حاصل ہے۔ لوگ اس کی حیرت انگیز ذہنی صلاحیت
پر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ اس کے پروگرام
بہت دلچسپی سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن
ان تمام کامیابیوں کے باوجود شکنتلا کی زندگی
تنہائی کا شکار ہے۔ اس کا باپ کرناٹک
میں کھوپڑی جادو کے تماشے دکھاتا تھا۔
جب اس نے شکنتلا کی ماں سے شادی
کی تو اس کی عمر ساٹھ سال اور اس کی ماں
عمر ۱۴ سال تھی۔ اس شادی کے نتیجے میں
آٹھ بچے پیدا ہوئے۔ شکنتلا ان میں سے
ایک ہے۔ اس کا باپ کبھی کبھی اسکول
کے بچوں کو جادو کا تماشا دکھاتا تھا تو شکنتلا
کو بھی ساتھ لے جاتا۔ یہ چھوٹی سی لڑکی بچوں
کو کئی طرح کے کرتب دکھاتی۔ اور چند
پیسے کما لاتی تھی۔ بچپن میں اسے کبھی پیٹ بھر
کھانا نصیب نہیں ہوا۔ باپ اور بھائیوں
کی پلیٹوں سے جو کچھ روکھا سوکھا بچ جاتا
وہ اسے بھی مل جاتا۔ بعض اوقات وہ بھوکے
پیٹ ہی سو جاتی۔ ماں اسے بدصورت سمجھتی
گھر میں کوئی اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھتا تھا
لیکن اس کی فطری صلاحیت ابھر رہی تھی
وہ خود حیران تھی کہ قدرت نے حساب کا
خزانہ اس کے دماغ میں کیسے بھر دیا
جب سترہ اٹھارہ سال کی تھی تو اسے
ایک مداح نے لندن کا ٹکٹ دلوا دیا۔ شکنتلا
جس نے کبھی شمالی ہندوستان بھی نہیں دیکھا
تھا ایک بیک لندن پہنچ گئی۔ اس شہر میں پہلے
تو اس کے بلند بانگ دعووں کو مجذوب کی
بڑ سمجھا گیا۔ لیکن جب ایک مقابلہ میں اس
نے پیچیدہ پیچیدہ سوال حل کئے تو لوگوں نے
سنجیدگی سے دیکھنا شروع کیا۔ لوگوں کا خیال
تھا کہ اس کے پاس کوئی جادو ٹونا یا تعویذ
ہے۔ یا وہ کسی سائنس کے آلے کی مدد لے
رہی ہے۔ جب ان الزامات کی تحقیقات
کی گئی تو وہ بالکل بے بنیاد نکلے۔ شکنتلا
لندن میں کسی بھی جگہ جانے کو تیار تھی وہاں
کی بہت سی کونسلوں نے اسے اپنی بیٹھکوں
میں بلایا۔ وہاں حاضرین نے اس سے پیچیدہ
اور طولانی سوال کر کے پریشان کرنا چاہا
لیکن شکنتلا کی ذہانت اور صلاحیت کے آگے
ان کی ایک نہ چلی۔ مہمان حیران تھے کہ وہ
ملک جسے وہ غریبی اور جہالت کے منجدھار
میں محسوس کرتے ہیں جہاں لوگوں کو پیٹ
بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ وہاں ایک
سترہ سالہ لڑکی ان کو بے وقوف بنا رہی
ہے۔ ایک صاحب نے اس سے اتنا
طولانی سوال پوچھا جسے حل کرنے میں
آٹھ گھنٹے درکار ہوں گے۔ وہ ابھی سوال
ختم بھی نہ کرنے پائے تھے کہ شکنتلا نے
اس کا جواب بورڈ پر لکھنا شروع کر دیا جیسے
جیسے چاک بلیک بورڈ پر حرکت کرتا سوال
پوچھنے والے کی جان پر بن رہی۔ آخر خدا
خدا کر کے وہ جواب ختم ہوا جس نے نصف
بورڈ منور کر لیا تھا۔ حاضرین نے سوال
کرنے والے کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات
میں سر ہلا دیا۔ پھر کیا تھا تالیوں کی گونج
میں لوگوں نے شکنتلا کو گود میں اٹھا لیا

وُہ بے ایمان نہیں تھی، فراڈ نہیں تھی۔ اُس کی آستین کے پیچھے کوئی آلہ چھپا ہُوا نہیں تھا۔ یہ ثابت ہُوا تو اس پر اعتراض کرنے والے اپنا سا مونہہ لے کر رہ گئے۔ اس میٹنگ میں ریاضی کے پروفیسر بھی تھے۔ اور ماہرین بھی۔ دونوں نے اپنے ارمان پُورے کرلئے لیکن شکنتلا کو مات نہ دے سکے۔

شکنتلا، جسے پہلے اپنے ملک میں قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا ہندوستان واپس کیا آئی کہ لوگوں نے اس کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔ ہمارے ملک میں یہ ایک عجیب طریقہ رائج ہے کہ ہم انسان کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتے جب تک یورپ والے بھی اسے تسلیم نہیں کرلیں۔ ایک دفعہ وہاں آپ کی دھاک بیٹھ جائے پھر کیا ہے سارا ہندوستان آپ کے قدموں میں ہے۔ یہ ہمارے مُلک کی بدنصیبی ہے کہ انسان کو اپنی صلاحیت منوانے کے لئے باہر جانا پڑتا ہے۔ پھر یہ لوگ جب باہر چلے جائیں تو واپس آنا نہیں چاہتے۔ سائینٹیفک وسائل کی کم یابی کا اعتراض اپنی جگہ ہے۔ لیکن ناقدردانی کا اعتراض سرِفہرست رہتا ہے۔ شکنتلا ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کی آنکھیں مغرب کی روشنی سے چکاچوند ہو جائیں واپس آگئی۔

اس ملک میں شکنتلا کی بڑی واہ واہ ہُوئی۔ اس کے دماغ میں ایسی کون سی کل تھی جو ریاضی کے مشکل سے مشکل سوال چند لمحوں میں حل کر دیتی تھی۔ اس کا جواب تو اس صلاحیت کو بخشنے والا ہی جانتے۔

ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم جس مسئلہ پر گھنٹوں سر کھپاتے ہیں، شکنتلا اُسے چٹکیوں میں حل کر دیتی ہے۔ بعض اوقات ان جلسوں میں شکنتلا کو شکست بھی ہُوئی لیکن یہ عارضی تھی۔ اس کا جواب سوال کرنے والے کے حل سے نہیں ملتا تھا لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہوگئیں شکنتلا آخر انسان ہے ایک مشین بھی غلطی کرسکتی ہے لیکن جلد ہی اس ڈھول کا پول کھل گیا شکنتلا ذرا بھی گھبرائی۔ اس نے اپنے سوال کرنے والے سے پُوچھا کہ وہ اپنے طولانی طریقے سوال کو دوبارہ حل کرے ممکن ہے کہ اس سے جمع تفریق اور ضرب وتقسیم میں کہیں چھوٹی سی غلطی ہوگئی جو پُورے جواب میں مشترک رہی ہو۔ سوال کرنے والا اپنے جواب کو دوبارہ حل کرنے میں منہمک ہوگیا۔ واقعی خود اس سے اپنا ہی سوال حل کرنے میں: اسی چوک ہوگئی تھی۔ شکنتلا کے چہرے پر فاتحانہ مُسکراہٹ نمودار ہُوئی اور ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ اب شکنتلا کا اصرار ہوتا ہے کہ لوگ سوال پُوچھنے کے لئے گھر سے تیار ہوکر آئیں اور اُن کے جوابات ان کے پاس ہوں۔

شکنتلا کی شہرت اب ہندوستان تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس انسانی کمپیوٹر کو مہذب دُنیا کے سارے لوگ جانتے ہیں۔ وہ امریکہ جائے یا کینیڈا، لندن جائے یا آسٹریلیا، اس کی آمد سے پہلے اس کے کارناموں کی فہرست اخباروں میں شائع ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ ہندوستان کی جادُوگرنی کو دیکھنے اور ملنے کے بے قرار ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے کمپیو جلسہ گاہ میں نصب ہو جاتے ہیں شک کمپیوٹر سے خوف زدہ نہیں، اس میں میں کمپیوٹر اس کا سب سے بڑا رقیب وہ کمپیوٹر کو اپنا بھائی اور شریک کار سمجھتی ہے۔ کمپیوٹر دنیا میں ہر جگہ مل سکتا لیکن شکنتلا دُنیا میں ہر جگہ ایک ہی وقت میں کیسے رہ سکتی ہے۔ شکنتلا ایک دن مر جائے گی، کمپیوٹر زندہ رہیں گے یہ مقابلہ صرف شکنتلا کی زندگی تک محدود ہے

اب شکنتلا نے ریاضی کے مشکل سوال حل کرنے پر اکتفا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اُسے اپنے دماغ پر بھروسا ہے۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے گی، اُسے آسانی سے پُورا کرے اُس نے نیومرولوجی (یعنی علم اعداد) پر عبور حاصل کیا۔ کچھ دنوں میں ہی اس علم کی ماہر ہو گئی۔ اس کے بعد اُس نے جیوتش سیکھا! کی تعلیم بھی آسان ثابت ہُوئی۔ وہ منٹوں میں جنم کنڈلی تیار کرلیتی۔ ایک اِنسان کو اُس کا چہرہ دیکھ کر اس کا ستارہ بتاتی۔ اس مضمون سے دوسرے مضمون نکلے ہندوؤں میں جنم کنڈلی دکھائے بغیر شادی کا مہورت نہیں نکلتا۔ سوال یہ ہے کہ تمام شادیاں اگر جنم کنڈلیوں کو ملا کر ہوئی ہیں اور شُبھ گھڑی میں ہی بیاہ ہوتا ہے تو لوگ آئے دن اخبارات میں لڑکیوں کے جلائے جانے کی خبریں کیوں پڑھتے ہیں؟ سسرال میں ناچاقی کیوں ہوتی ہے؟ میاں گھر چھوڑ کر کیوں بھاگ جاتا ہے؟ ان سب مصیبتوں کی روک تھام کس لئے کی گئی تھی؟ کیا یہ

دھوکا اور فراڈ ہے؟ کیا جیوتشی نے
...وں کے تیرے جنم کنڈلی بدل دی۔ یا
...کا غلط ترجمہ کیا اور بھولے بھالے لوگ
...کے جھانسے میں آ گئے۔

بہر حال اس طرح جیوتش کا علم بدنام
... اس کی ساکھ خراب ہو گئی۔ لوگ
...وں پر ہنستے ہیں۔

جیوتش ایک پرانا علم ہے۔ صدیوں سے
...یا ہوا ہے۔ اگر اس میں کوئی غلطی نکلتی
ہے تو وہ جیوتشی کی غلطی ہے۔ شکنتلا اس فن
...و اس کا پرانا مقام دلانا چاہتی ہے۔ اس
نے جیوتش پڑھا۔ ویسے بھی اس کے وطن کرناٹک
میں جیوتش ایک کاٹیج انڈسٹری ہے۔ ہر تیسرا
آدمی جیوتش کا عالم ہے۔ شکنتلا نے جیوتش کا
علم حاصل کرنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے
وہ اس کی ماہر بن گئی۔ وہ ریاضی میں پہلے ہی
جینیس تھی۔ اب جیوتش میں بھی جینیس ہو گئی۔ اس
طرح اس کی جوانی کے پندرہ سال گزر گئے۔

اب شکنتلا کی زندگی کا دوسرا پہلو
سامنے آتا ہے۔ ہوٹلوں کے آرام دہ کمرے
جھلملاتی روشنیاں اور لوگوں کی واہ واہ ہی
زندگی نہیں۔ جب تک یہ سب چلتا رہتا
دل میں امنگیں اٹھتی ہیں۔ دل کامیابی کے
نشے سے جھوم اٹھتا ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد شو
ختم ہو جاتا ہے۔ اور لوگ مسکراتے ہوئے
اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں مگر شکنتلا
کہاں جائے؟ اس کا تو کوئی گھر نہیں ہے۔ ماں
باپ موجود نہیں، بہن، بھائی اپنے اپنے گھروں
کے ہو بیٹھے۔ صرف شکنتلا اکیلی ہے۔ ریاضی کی
مہارت، نہ انڈا ابال سکتی ہے، نہ کھانا
پکا سکتی ہے۔ نہ خاوند اور بچوں کو پیار دے
سکتی ہے۔ شکنتلا غریبی کے ماحول سے اتنا
اوپر اٹھ آئی تھی کہ اس کے لئے اپنے
سمبندھیوں میں شادی کرنا ممکن تھا۔
اس نے جی کڑا کر کے شادی کے لئے اخبار
میں اشتہار دیا۔ خوش قسمتی سے اسے ایک
لڑکا مل گیا جو اس سے شادی کرنے کے لئے
راضی ہو گیا۔ یہ لڑکا بنگال کا ایک آئی اے
ایس آفیسر تھا۔ شکنتلا اس شادی سے بہت
خوش تھی۔ یہ شادی کامیاب رہی جہاں اس کے
میاں کی پوسٹنگ ہوتی وہاں اسے گھر مل جاتا
وہ اس کے لئے مزے مزے کے کھانے
پکواتی۔ غریبی کا تصور اب دھندلا ہو گیا تھا
وہ دونوں اونچی سوسائٹی میں گھومتے شکنتلا
اب باہر کے دوروں پر کم جاتی۔ اس کے ایک
لڑکی پیدا ہو گئی۔ اب یہ خاندان
تین آدمیوں پر مشتمل تھا۔

شکنتلا کا خاوند بنگال کا ایک پڑھا
لکھا افسر تھا۔ جب کہ شکنتلا سرے سے
اسکول ہی نہیں گئی۔ اس کو اسکول جانے
کی ضرورت کیا تھی؟ اسکول کے ٹیچر اس کی
بے پناہ فطری صلاحیت سے پناہ مانگتے تھے
اسکول نہ جانے سے شکنتلا کو صرف ایک
نقصان پہنچا کہ وہ بچپن کی سہیلیوں اور دوستوں
سے محروم ہو گئی۔ جب کھیلنے کھانے کے دن
تھے تو وہ اپنے ماں، باپ اور بہن،
بھائیوں کے لئے روٹی، روزی کا بندوبست
کر رہی تھی۔ وہ اسکول جاتی اور اپنے باپ
کے ساتھ جادو کے کرتب دکھاتی۔ لیکن اسکول
میں داخلہ ملنا دوسری بات تھی۔ شاید یہی
بات تھی کہ دونوں میاں بیوی میں ناچاقی پیدا
ہو گئی۔ جس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر
ہوا۔ اب شادی کے چودہ سال ایک سہانا
سپنا معلوم ہوتے ہیں۔ انوپما بھی اس کے
ساتھ نہیں ہوتی۔ وہ دہرہ دون میں زیر تعلیم ہے۔

اب شکنتلا پھر اکیلی ہے۔ وہ اب
بھی ہندوستان کے مختلف شہروں کے
دورے کرتی ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں
رہتی ہے۔ اس کی مانگ کی کوئی کمی نہیں۔
جیوتش کے متوالے پروانوں کی طرح اس کے
گرد گھومتے رہتے ہیں۔ وہ آج دلی میں ہے
تو کل بمبئی اور پرسوں کلکتے میں۔ ان شہروں
میں پہنچ کر وہ اخبارات میں آمد کا اعلان کرتی
ہے۔ ضرورت مند آتے ہیں اور اس کی قابلیت
اور شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کچھ عرصہ
ہوا وہ دلی کے اشوکا ہوٹل میں پندرہ دن
رہی۔ اخبار میں روزانہ اس کا اشتہار موجود
ہوتا۔ پھر بعد میں خبر آئی کہ دلی میں اس کا کام
پورا ہو چکا ہے۔ اگلا قیام آسام میں تھا۔
وہاں بھی لوگ اس کے منتظر اور اس کی
صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے بے چین
تھے۔ اس کا کمرہ شان دار ہوٹل میں محفوظ
رہتا۔ آسام کے بعد بنگال اور پھر اڑیسہ
ہندوستان ایک بڑا ملک ہے اور شکنتلا
کی عمر ۴۴ سال ہے۔ کل کی بدصورت
لڑکی آج کی باوقار اور حسین عورت بن چکی
ہے۔ وہ نہایت خوش مزاج اور جلد گھلنے ملنے
والی عورت ہے۔ اپنے ملنے والوں کی
ہمدرد ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ
یہ تمام خوبیاں اسے اتنی بھری پھری
دنیا میں ایک چھوٹا سا گھر عطا نہیں کر سکیں

■■

تبسم

ایک نوجوان سرِ راہ ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر اُس کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے مچل اٹھا آخر ایک ترکیب اُس کی سمجھ میں آئی۔ وہ لڑکی کے پاس جا کر بولا "محترمہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے"
لڑکی نے جواب دیا "جی ہاں، ضرور دیکھا ہوگا۔ میں پاگل خانے کی نرس ہوں۔"

●

"ڈاکٹر صاحب، میری زبان دیکھیے۔ میں پانچ منٹ سے باہر نکالے بیٹھی ہوں" مریضہ چلائی۔
"بس محترمہ، اب آپ اپنی زبان اندر کر لیں۔ مجھے آپ کے لیے نسخہ لکھنا تھا۔ وہ میں نے سکون سے لکھ لیا" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

●

ایک نوجوان پانچویں مرتبہ بھی امتحان میں فیل ہو گیا۔ دوستوں نے اُس سے پوچھا "اِس مرتبہ بھی تم فیل ہو گئے۔ گھر کیا جواب دو گے؟"
نوجوان بولا۔ "میں نے گھر خط لکھ دیا ہے کہ نتیجہ نکل آیا ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ نتیجہ حسبِ دستور ہے۔"

●

چرس کے نشے میں دُھت ایک شخص جھومتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ایک پرانی قبر میں گر گیا۔ وہاں پھر آرام نصیب ہوا تو اسے نیند آگئی۔ اگلی صبح کو وہ سو کر اٹھا اور قبر سے باہر نکلا تو خود کو قبروں سے گھرا پایا۔ اُس نے ایک نظر اُس قبر پر ڈالی جس سے وہ برآمد ہوا تھا اور پھر بڑبڑانے لگا "غضب خدا کا! قیامت کا دن آگیا اور میں واحد مردہ ہوں جو اپنی قبر سے نکل آیا ہوں۔ باقی مردے بے خبر پڑے سو رہے ہیں۔"

●

دو دوست آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اچانک اُن میں سے ایک نے کہا "مارے گئے یار، میری بیوی اور محبوبہ ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہیں۔" دوسرے دوست نے کہا۔ "کمال ہے۔ میں بھی یہ ہی بات کہنے والا تھا۔"

●

استاد نے قواعد پڑھاتے ہوئے اپنے ایک شاگرد ماجد سے کہا "کوئی ایسا جملہ بناؤ جس میں ماضی، حال اور مستقبل، تینوں کا ذکر ہو۔"
ماجد نے جواب دیا "سو سال پہلے مجھے تم سے پیار تھا، آج بھی ہے کل بھی رہے گا۔"

●

ایک بار اکبر بادشاہ سے لوگوں نے فریاد کی آپ کے دورِ حکومت میں ایک ایسا شخص ہے جس کا مونہہ اگر صبح صبح دیکھ لیا جائے تو دن بھر کھانا نہیں ملتا۔ بادشاہ نے آزمانے کے لیے اُس شخص کو بلا کر اپنے کمرے کے سامنے سُلا دیا اور صبح کو سب سے پہلے اس کا مونہہ دیکھا۔ اور واقعی کوئی ایسی بات ہو گئی کہ اس روز بادشاہ شام تک کھانا نہ کھا سکا۔ چنانچہ بادشاہ نے اس شخص کو پھانسی کا حکم صادر کر دیا، مگر بیربل کو اُس شخص پر رحم آگیا۔ بیربل نے بادشاہ سے پوچھا "آپ اسے پھانسی کیوں دے رہے ہیں؟"
بادشاہ نے جواب دیا "یہ منحوس ہے۔ جو بھی آدمی صبح کو اس کا مونہہ دیکھتا ہے، اُسے شام تک کھانا نصیب نہیں ہوتا۔"
یہ سُن کر بیربل نے کہا "اور اپنے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ آپ نے اُس کا مونہہ صبح کو دیکھا تو آپ کو کھانا نہیں ملا۔ اور اس نے صبح کو آپ کا مونہہ دیکھا تو اسے موت کا حکم مل گیا۔"

●

ایک صاحب بہت دیر سے ایک دُکان میں کھڑے تھے۔ جب دکان دار نے دیکھا کہ انہوں نے کچھ خریدا ہی نہیں تو وہ جھنجلا گیا اور ان صاحب سے پوچھ بیٹھا "آخر آپ کو کیا چاہیے؟"
اُن صاحب کے مونہہ سے اچانک نکلا "موقع۔"

●

خود بھی ہنسیے، دوسروں کو بھی ہنسائیے۔ نئے نئے، مزہ دار، چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجیے۔ پرانے، گھسے پٹے، بار بار سُنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجیے، کیوں کہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

یہ کیسے رشتے

عنبری رحمٰن

جب سے بہو آئی تھی، گھر کا سارا کام کاج اس نے سنبھال لیا تھا۔ اب شانتی کے شب و روز صرف آرام میں گزرتے تھے۔ عمر کا کارواں اپنا سفر طے کرتا ہوا بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ چکا تھا۔ اور زندگی ہولے ہولے موت کی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔
شانتی کو وقت سے شکایت ہو چلی تھی کہ اب وہ پہلے کی طرح اپنا سفر تیزی سے کیوں نہیں طے کرتا؟ لیکن اس کیوں کا جواب بھلا اسے کون دیتا!

اس شام کو شانتی کو یکایک خیال آیا کہ آج سنیچر کا دن ہے اور آج کے دن اس کا لاڈلا بیٹا انوپ اسی کے ہاتھوں کی بنی کھیر کھاتا ہے۔ وہ لپک کر باورچی خانے میں پہنچ گئی۔
لتا کی نظر جب اپنی ساس پر پڑی تو وہ بولی "ماں جی! آپ پھر چلی آئیں؟ میں نے ہزار بار کہا ہے کہ میری موجودگی میں آپ کو کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب آپ کی عمر کام کرنے کی نہیں، بلکہ آرام کرنے کی ہے۔"

بے چاری لتا کیا جانتی تھی کہ ساس کو یہ آرام ہی بڑھاپے کے بوجھ تلے دبائے جا رہا ہے۔ شانتی مسکراتے ہوئے بولی "شاید تجھ کو آج کا دن یاد نہیں بہو۔ آج سنیچر ہے نا! انوپ آج میرے ہاتھوں کی بنی کھیر جو کھائے گا۔ آج کا دن کا مجھے کتنی بے قراری سے انتظار ہوتا ہے یہ بھلا تو کیا جانے!"

شانتی کی ممتا سے لبریز باتوں کو سن کر لتا مسکراتی ہوئی چل دی اور شانتی دودھ کی ہانڈی لئے گیس کے چولہے کی طرف بڑھی۔ اتنے میں نوکرانی چمپا نے ٹوکا "میں آپ کی مدد کروں، مالکن؟"

"بالکل نہیں تو اچھی طرح جانتی ہے کہ میں اپنے انوپ کا کام اپنے ہاتھوں سے ہی کرنا پسند کرتی ہوں۔ انوپ ہی تو وہ چراغ ہے جس کی روشنی کے سہارے میں بڑھاپے کی تاریک راہوں پہ بےفکر چل رہی ہوں۔ تو جانتی ہے کہ اس کھیر میں انوپ کو میری ممتا کی کیسی مٹھاس ملے گی۔"

چمپا کے چلے جانے کے بعد شانتی ماضی کی حسین وادیوں میں کھوتی چلی گئی۔ کتنے سال گزر گئے تھے۔ ایک آدرش ہندوستانی عورت کی طرح شانتی نے اپنے شوہر کے قدموں تلے ہی اپنی جنت کو تلاش کر لیا تھا۔ شوہر کی خدمت اور انوپ کی پرورش میں اتنے سال کیسے گزر گئے! اس بات کا ذرہ برابر بھی احساس اسے نہ ہو سکا تھا۔

دودھ کو ابلتے دیکھ کر شانتی کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"ماں! ماں! تم کہاں ہو؟ میں تمہارے لئے بہت بڑی خوش خبری لے کر آیا ہوں۔" انوپ کی آواز شانتی کے کانوں سے ٹکرائی۔ چونک کر پلٹی تو سامنے انوپ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے بولا "ماں میرا پروموشن ہو گیا۔ میری تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے اور ساتھ ہی میرا [illegible] بمبئی ہو گیا ہے۔ مجھے کل ہی لتا کو لے کر بمبئی جانا ہے۔"

شانتی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ہنسے یا رو[illegible]

ہنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا
یپ کیا تم یہاں کچھ دن اور نہیں ٹھہر سکتے ؟"

"نہیں ماں، ڈیوٹی پر جلد پہنچنا نہایت
ری ہے اور ہاں، ماں سُنا ہے بمبئی میں
ن کا ملنا بہت دشوار مرحلہ ہے۔ وہاں جو
ٹ مجھے مل رہا ہے، وہ کافی چھوٹا ہے۔
لئے تم کو اور بابوجی کو یہیں رہنا پڑے گا۔
رچ کے لئے ہر ماہ پیسے بھیجتا رہوں گا۔
اں ماں، آج تو چھٹی وار ہے تم نے میرے
ذ کھیر تو ضرور بنائی ہو گی ؟"

"ہاں بیٹا، میں بھلا کھیر بنانا کیسے
ول سکتی ہوں"۔ شانتی کو اپنا کلیجہ بیٹھتا محسوس
رہا تھا۔ انوپ تیزی کے ساتھ بہو کے
رے کی طرف بڑھا۔ آج اس کی باتوں نے
نتی کو عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا اور کمزور
ردیا تھا۔ یہ قدرت کا کیسا نظام ہے کہ
الدین اپنی اولاد کو اپنے ہی خون سے سینچ کر
ا کرتے ہیں، وہی بعد میں اپنی اولاد پر بوجھ
جاتے ہیں۔ شانتی نے بھی انوپ کی پرورش
کوئی کسر باقی نہ رکھ چھوڑی تھی، اس نے
پ کو اس طرح پالا تھا جیسے گلشن میں ایک
ا پھول کے نازک پودے کو پالتا ہے۔
جب ان پودوں میں پھول نکلیں تو سارے
شن میں اپنی خوشبو پھیلا سکیں۔ اور تب
ی ساری محنت و مشقت بھول جاتا
لیکن جب ایسے میں پھول خود ہی مالی
جدا ہو جائے اور اس کی محبت، محنت،
ت اور چاہت کو فراموش کر کے
دوسرے کے گلے کا ہار بن جائے تو مالی
ل پر کیا گزرے گی ؟ انوپ نے تو
ی سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ اپنے

پتا کے بڑھاپے کی کھلے ساگر کو اپنے
ساتھ لے گیا تو ہمارے دل پر کیا گزرے
گی۔ کیسے کٹے گی کانٹوں سے بھری تنہا زندگی؟
اس طرح کے بے شمار سوالات کے ناگ شانتی
کے چین کو ڈس رہے تھے۔

شانتی انوپ سے بہت کچھ کہہ کر
کی بھڑاس نکال لینا چاہتی تھی، مگر کہہ نہ
سکی کیوں کہ وہ شروع سے ہی کم گو تھی۔ جہاں
زبان سے کام لینا چاہیے، وہاں بھی وہ خاموشی
سے کام لیتی تھی۔ وہ اچھی طرح اس بات
سے واقف تھی کہ زندگی میں ایک ایسا دور
بھی آتا ہے جب والدین کی نصیحت اور
محبت بھی زہریلی اور کڑوی لگنے لگتی ہے۔
ایسے میں خاموشی ہی سب سے بہترین علاج
ہے۔ وہ تھکی تھکی سی اپنے کمرے میں آگئی۔

شانتی کے شوہر کو ریٹائر ہوئے ابھی
چند مہینے ہی گزرے تھے۔ موہن داس کا زیادہ
وقت بیوی بچوں کے درمیان ہی گزرتا اور باقی
وقت اپنے دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے
میں۔ شانتی نے موہن داس کو جب انوپ کے
بمبئی جانے کی خبر سنائی تو وہ بس خاموشی کے
ساتھ اپنی بیوی کے سینے سے اٹھتی ہوئی
ہوک اور اپنے درد کا موازنہ کرتے رہے۔
دوسرے دن انوپ لتا اور اپنے بیٹے ساگر
کے ساتھ بمبئی چلا گیا۔ ان کے جانے کے
بعد میں یہ دونوں ٹوٹ اور بکھر کر رہ گئے۔

"سُنا تم نے؟" اپنا انوپ کتنا
عقل مند ہو گیا ہے؟ ہر مہینے ہم لوگوں کے
خرچ کے لئے پانچ سو روپیہ بھیجا کرے گا"
اتنا کہتے کہتے ایک زہریلی مسکراہٹ موہن داس

کے ہونٹوں پر پھیل گئی جس میں درد کا بھی
سنگم تھا۔

"جن ہاتھوں نے ساری زندگی بیٹے
کو خوشیاں دی ہیں، وہی ہاتھ آج اپنے بیٹے
سے چند روپیوں کی بھیک ہرگز نہیں لیں گے
شانتی، میں ریٹائر ہوا ہوں، میرا ضمیر نہیں۔ میری
آتما آج بھی زندہ ہے۔ انوپ کو ہماری خوشیوں
کا خیال نہیں رہا۔ اس نے تو ایک نئی دنیا
بسا لی۔ مگر ہماری دنیا تو ہمیشہ کے لئے اُجڑ گئی۔
اس گھر کو اس کی دولت کی کھنک کی ضرورت
نہیں، بلکہ اس کے بیٹے کی کلکاریوں کی ضرورت
ہے" کہتے کہتے موہن داس رو پڑے۔

"آپ اتنے فکرمند کیوں ہیں؟ انوپ
کے آگے ساری زندگی پڑی ہے۔ ہمارا کیا ہے؟
ہم بوڑھے ہو چلے ہیں اور ساتھ ہی ہمارے
ارمان اور خواب بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ بھلا
آج کے نوجوانوں کے پاس اتنا وقت کہاں
جو ہمارے بوڑھے اور دیوانے جذبات کا
خیال کریں۔ ان کا ایک ایک پل قیمتی ہے
اور ہمارا ایک ایک پل بے معنی اور بے مقصد
ہے۔ پہلے انوپ کے بڑے ہونے کے
انتظار میں جیتے تھے اور اب اپنی موت کی
راہ دیکھ کر سانسوں کے ان کمزور دھاگوں کو
اُمید کی جھوٹی تسلی دے لیں گے مگر ہم انوپ
کا احسان کبھی نہیں لیں گے"۔

اس کے بعد موہن داس اپنے دلی
جذبات کو چھپانے کے لئے اخبار اٹھا کر
پڑھنے لگے اور شانتی خلا میں اس طرح گھورنے
لگی جیسے ماضی کے جھروکوں میں اس چھوٹے
سے انوپ کو ڈھونڈ رہی ہو جو اس کے بغیر
ایک پل بھی نہیں رہتا تھا۔

گیت

یہ پاکباز صحبتیں، حجاب دل کی نعمتیں
جو ہم نہیں تو کچھ نہیں!

یہ کائنات رنگ و بو، یہ قافلے حیات کے
یہ زندگی کے راستے، یہ راستے ثبات کے
حیات جاں کے نام ہیں
ثبات جاں کے نام ہیں
کہ محفلوں کی رونقیں — جو ہم نہیں تو کچھ نہیں!

وہ جنت عزیز ہو کہ چاہتوں کا نور ہو
وہ راحت وصال ہو کہ صبح کا سرور ہو
کہ چاہتوں کے نور میں
کہ صبح کے سرور میں
محبتیں عنایتیں — جو ہم نہیں تو کچھ نہیں!

وہ قرب جاں اگر نہیں نہ صبح ہو نہ شام ہو
شراب وصل پی سکو مگر سبھی حرام ہو
قرابتوں کی شام میں
محبتوں کے جام میں
یہ چاہتوں کی لذتیں — جو ہم نہیں تو کچھ نہیں!

نہ چل سکو گے دھوپ میں اگر کہیں گھٹا نہ ہو
نہ مل سکیں گی منزلیں اگر کوئی دعا نہ ہو
یہ زلف کی حسیں گھٹا
کہ ساتھ اک لب دعا
یہ ہم سفر کی شوکتیں. — جو ہم نہیں تو کچھ نہیں!

بغیر از خلوص دل سکون نہیں جہاں میں
ہنسی نہیں اگر کہیں تو کیا ہے گلستاں میں
تمہارے اس جہان میں
ہنسی کے گلستان میں
حریم دل کی راحتیں — جو ہم نہیں تو کچھ نہیں!

اکیلا ہی اکیلا ہو نہ ماں، بہن، نہ بیٹیاں
نہ ہوں اگر شریک غم، رفیق دل، حریم جاں
یہ ماں بہن یہ بیٹیاں
یہ غم گسار بیبیاں
نظر نواز حرمتیں۔ — جو ہم نہیں تو کچھ نہیں!

گیت

چھم چھم چھم پائلیا باجے چوڑیاں کھن کھن کھنکے رے
ناگن جیسے ڈسنے لگے ہیں بھر کو جھونکے پون کے رے
من الجھن سلجھا رے
آجا پیا پیا آجا رے

جب چندا بدلی میں آئے، نس نس میں اگنی بھر جائے
دل کچھ بھی نہ سمجھائے، میں رہ جاؤں آس لگائے
کیا کروں اب سمجھا رے
آجا پیا، پیا آجا رے

جب سے بلم تم مجھ سے روٹھے نیند گئی ہوئے سپنے جھوٹے
قسمت پھوٹی اور دل ٹوٹے، نین ہمریا کیسے چھوٹے
آکے مجھے بہلا جا رے
آجا پیا، پیا آجا رے

گھر سے نکل کر تم کو پکاروں، چاروں طرف کی باٹ نہاروں
شیشہ دیکھوں زلف سنواروں، تن من سب کچھ تم پر واروں
آجا دل کے راجا رے
آجا پیا، پیا آجا رے

کوثر بھگوت پوری

گیت

وہ چہرہ یاد آئے گا

کچے آموں کی خوشبو جب فضا میں پھیل جائے گی
ہوا چہرے سے خوابیدہ تمنائیں جگائے گی
پپیہے کی صدا کا نشہ رگ رگ میں سمائے گا
وہ چہرہ یاد آئے گا

دشاؤں کے لبوں پر گیت جھولوں کے ابھر آئے
سکھی کے پی پرائے اور اپنے نین بھر آئے
خوشی کا یہ سماں اشکوں میں بہتا بیت جائے
وہ چہرہ یاد آئے گا

جسے دیکھے بنا آنکھوں نے ہر ساون گزارا تھا
جسے پانے کی خواہش نے ہمارا دکھ سنوارا تھا
گھٹا کو دیکھ کر یادوں کا ساون دل پہ چھائے گا
وہ چہرہ یاد آئے گا
وہ چہرہ یاد آئے گا

[illegible]

ناری نکیتن کا حالِ زار

انوار احمد

ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں تیس برس پہلے ناری نکیتن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ناری نکیتن کے معنی ہیں عورتوں کی پناہ گاہ۔ یہاں سماج کی ستائی ہوئی لڑکیوں کو رکھا جاتا ہے۔ زیادہ تر لڑکیاں اغوا شدہ ہوتی ہیں۔ ان کیسوں میں عدالت مجرم کو جیل بھیج دیتی ہے اور لڑکی کو ناری نکیتن۔ اس ادارے کے منتظمین اس بات کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ ان لڑکیوں کی شادی کر دی جائے۔ انہیں سینے پرونے اور موسیقی کی معمولی تعلیم دی جاتی ہے لیکن انہیں ایسا کوئی ہنر نہیں سکھایا جاتا جس کی مدد سے وہ اپنی آئندہ زندگی اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر گزار سکیں۔ لڑکیوں کی شادی ہی ان کے مسائل کا واحد حل سمجھا جاتا ہے۔ شادی کے لئے امیدوار لڑکوں کا انٹرویو لیا جاتا ہے۔ یہ انٹرویو ناری نکیتن کا بورڈ لیتا ہے۔ اگر لڑکا امتحان میں پورا اترے تو اس کی شادی ناری نکیتن کی لڑکی سے کر دی جاتی ہے۔ لڑکی کو جہیز میں زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ایک

فہ بھی دیا جاتا ہے اور اس طرح بورڈ
ں کے سر سے یہ ذمہ داری اُتر جاتی ہے۔
یہاں تک سب ٹھیک ہے لیکن
کے بعد لڑکی پر کیا گزرتی ہے' اس کی
ت نہیں کی جاتی۔ زیادہ تر لڑکیاں قحبہ
ے لائی جاتی ہیں۔ شادی کے اُمیدوار
و یہ بات سمجھا دی جاتی ہے لیکن لڑکی
رے میں کوئی ٹریننگ نہیں دی جاتی
یہ شادیاں ناکام بھی ہو جاتی ہیں اور
اری نکیتن پہنچ جاتی ہیں۔

حال ہی میں دلّی کے کچھ سوشل ورکروں
یقات کی تو پتہ چلا کہ ناری نکیتن کا
ہایت ناقص ہے۔ کمروں میں روشن
ں۔ باورچی خانے میں بھی بجلی کا بلب
ڑکیاں چیتھڑے لگائے پھر رہی ہیں۔
یاں صرف پھٹی کوٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے
ہ نے لنگی پہن رکھی ہے۔ ایک لڑکی
ے کے نام پر صرف ایک تولیہ ہی باندھ
۔ تقریباً ساری لڑکیاں ننگے پاؤں
۔ لڑکیوں نے شکایت کی کہ اسٹاف
، انہیں اکثر مارتے پیٹتے رہتے ہیں۔
ڑکیاں گھر سے بھاگ کر آتی ہیں اس
ب نفسیاتی مریض سمجھا جاتا ہے لیکن
لاج پر توجہ نہیں دی جاتی۔ لڑکیاں
یا دست کاری سیکھنا چاہتی ہیں تاکہ
یروں پر کھڑی ہو سکیں، لیکن ناری نکیتن
کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہاں کے
کو صرف ایک ہی فکر رہتی ہے۔ کسی
لڑکی کی شادی ہو جائے۔ اس کے
ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اکثر شادی
ان کے دکھوں کا علاج ثابت نہیں ہوتی۔
ایک مدراسی لڑکی کی شادی بیکانیر کے ایک
نوجوان سے کر دی گئی۔ شادی کے بعد لڑکی
نے ناری نکیتن کو کئی خط لکھے کہ اس کا خاوند
شرابی ہے اور اسے مارتا پیٹتا رہتا ہے۔ اس
نے درخواست کی کہ اسے اپنے خاوند سے
نجات دلائی جائے۔ لیکن منتظمین کے کانوں
پر جوں بھی نہ رینگی۔ نتیجے میں لڑکی پھر مدراس
بھاگ گئی۔ کچھ لڑکیوں سے شادی کرنے والے
قحبہ خانوں کے دلال تھے۔ انہوں نے لڑکیوں
کو شادی کے بعد فروخت کر دیا۔ قحبہ خانوں پر
پولیس نے چھاپے مارے اور یہ لڑکیاں
واپس ناری نکیتن پہنچ گئیں۔

دلّی کے سوشل ورکروں نے جب
یہ رپورٹ سپریم کورٹ میں پیش کی تو قانون کی
مشینری حرکت میں آ گئی۔ ججوں نے ناری نکیتن
کے منتظمین کو حکم دیا کہ آئندہ شادیوں کا سلسلہ
بند کر دیا جائے کوئی شادی سپریم کورٹ کی
منظوری کے بغیر عمل میں نہ لائی جائے۔ اس حکم
کو تین سال گزر گئے۔ ناری نکیتن میں ایک
بھی شادی نہیں ہوئی لیکن اس سے لڑکیوں کا
مسئلہ حل نہیں ہوا۔ لڑکیاں اس زندگی سے
تنگ آ چکی ہیں۔ وہ باہر کی دنیا میں سانس
لینا چاہتی ہیں۔ شادی ایک خطرہ ہی سہی لیکن
اس سے ان کو ناری نکیتن کی زندگی سے تو چھٹکارا
مل جاتا تھا۔ اب یہ سہارا بھی نہیں رہا لڑکیوں
کی افسردگی اور جھنجھلاہٹ بڑھ گئی۔ وہ بات
بات پر لڑتی ہیں۔ کبھی منیجر کا گھیراؤ کرتی ہیں تو کبھی
آپس میں لڑتی ہیں۔ آپس کی لڑائی کی بنیاد کبھی
چائے کی پیالی، کبھی صابن کی ٹکیاں، کبھی
ایک چپاتی ہوتی ہے۔ آخر غصہ اور جھنجھلاہٹ
کس پر نکالا جائے؟

سوشل ورکروں نے جب ان لڑکیوں
سے بات چیت کی تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ لڑکیاں
فطرتاً اتنی لڑاکا اور بدمزاج نہیں۔ یہ زمانے کی
ستائی ہوئی ہیں زندگی کے دکھوں نے
ان کو چڑچڑا بنا دیا ہے۔ انہوں نے سوشل
ورکروں کو بتایا کہ وہ کوئی کام سیکھنا چاہتی
ہیں تاکہ وہ زندگی میں مرد کی محتاج نہ رہیں۔
شادی ان کے مسئلے کا واحد علاج نہیں ہے
اگر شادی ناکام ہو جائے تو وہ اپنے ہُنر کے
بوتے پر زندگی کی گاڑی چلا سکتی ہیں ناری نکیتن
میں شادیوں کا سلسلہ کورٹ کے حکم سے
بند ہے ہُنر اور دست کاری کی تعلیم نہ ہونے کے
برابر ہے۔ ایسی صورت میں وہ کیا کریں اور کہاں
جائیں؟ وہ ساری عمر تو ناری نکیتن میں نہیں
گزار سکتیں۔ سوشل ورکروں نے ان کی بپتا
ہمدردی سے سنی اور ان کی زندگی میں سدھار
لانے کے لئے کچھ تجویزیں پیش کیں۔ ان میں سب
سے اہم تجویز لڑکیوں کو کوئی ہُنر سکھانا ہے۔
اس کے علاوہ یہ لڑکیاں ہمدردی کی بھوکی ہیں۔
کوئی انسان پیدائش سے بُرا نہیں ہوتا حالات
اسے بُرا بنا دیتے ہیں لیکن اس کی نیکی اچھائی
اس کے دل میں بند رہتی ہے۔ اگر اس اچھائی کو
صدا دی جائے تو اس کا جواب یقیناً اچھا ہی ہوتا
ہے۔ ایک دفعہ انسانیت کا رشتہ قائم ہو جائے
تو دوستی اور محبت کا رشتہ بھی قائم ہو جاتا ہے۔
دلّی کی سوشل ورکر اس بات کی کوشش میں
لگی ہوئی ہیں کہ ناری نکیتن کا انتظام نئی بنیادوں
پر کیا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انہیں اپنے
مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

●●

بانو نئی دہلی

ذہنی ورزش

انعام:
ایک سوال
پر شیر کوکر

اپنی ذہانت کو آزمایئے، اپنی معلومات کا امتحان لیجئے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوال پر شیرکوکر حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوئے تو انعام پانے والے کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا۔ اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔
یکم جون ۱۹۸۵ تک ہمیں ملنے والے جوابات اس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر ۵" ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۔ منشی پریم چند کا اصلی نام کیا تھا؟

۔ مغل بادشاہ جہاں گیر کی ماں کا نام کیا تھا؟

۔ مشہور ناول "آگ کا دریا" کس کی تصنیف ہے؟

۔ چاند پر سب سے پہلے کس ملک کا جھنڈا پہنچا؟

۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی میں کون سا بڑا ہے؟

۔ ملک کے غداروں میں میر جعفر کا تعلق بنگال سے تھا میر صادق کا تعلق کس صوبے سے تھا؟

۔ دنیا کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن کس ملک میں ہے؟

۔ بھیل قبیلہ کس صوبے میں آباد ہے؟

۹۔ دنیا کا پہلا عالمی اسلامی جشن کس ملک میں منایا گیا تھا؟

۱۰۔ ہندوستان کے صوبوں کی کل تعداد کتنی ہے؟

ذہنی ورزش

(۱) ....
(۲) ....
(۳) ....
(۴) ....
(۵) ....
(۶) ....
(۷) ....
(۸) ....
(۹) ....
(۱۰) ....
نام : ....
پتہ : ....
....

قلم کے جادوگر الیاس سیتاپوری کے دو تازہ ترین شاہ کار
پارسائی کا خمار
قیمت: بیس روپے 20/- معہ ڈاک خرچ الگ
آشنا پرست
قیمت: پندرہ روپے 15/- معہ (ڈاک خرچ الگ)
اُن انسانوں کی کہانیاں جو بادشاہ تھے، وزیر تھے، مصاحب تھے، امیر تھے، فن کار تھے، پرستار تھے، عاشق تھے، محبوب تھے، رقیب تھے، دوست تھے، دشمن تھے، جھوٹے تھے، سچے تھے۔ انسانوں کے وہ تمام رُوپ جو ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ گرفت، نشہ، سحر، سوز و گداز ..... وہ سب جو آپ چاہتے ہیں۔
الیاس سیتاپوری کے دیگر شاہ کار بھی شمع بک ڈپو نے عمدہ کاغذ پر فوٹو آفسیٹ سے شائع کئے ہیں۔
آج ہی ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر گھر بیٹھے وی پی ڈاک سے منگوا لیجیے، یا اپنے اخبار فروش سے طلب کیجیے!
ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں۔
شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
آپ کو ہندوستان کے کسی گوشے میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں اُردو، انگریزی، ہندی، پنجابی کتابیں یا رسائل منگوانے ہوں تو شمع کے ادارے کو خدمت کا موقع دیجیے۔ غیر ممالک میں شہر شہر نئے ایجنٹ بنائے جا رہے ہیں!!
غیر ملکی پروانے اپنے اپنے ملک کے لئے قیمت اور محصول ڈاک معلوم کرنے کے لئے تحریر فرمائیں، پھر ڈرافٹ بھیجیں۔
بانو نئی دہلی

عشرت راشدی

کے لوگ

"ہاں کردو بیٹی، ہاں کردو!" اس کے بوڑھے باپ نے ہمدردانہ اور خوشامدانہ لہجے میں اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری عمر اب کافی ہو چلی ہے۔ کوئی ہم عمر رشتہ آنے سے تو رہا۔ اور آئے بھی کیسے! ہم خود کئی رشتے ٹھکرا چکے ہیں۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟ اتنی بڑی بڑی جہیز کی مانگیں کہاں سے پوری کرتے ہم؟ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے دو چار بیٹیاں نہ دیں۔ ورنہ اپنے آپ کو بیچ کر بھی۔۔۔!"

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

وہ بھی اپنے باپ کے گلے سے لگ کر سسک سسک کر رو پڑی۔

"وہ بہت مال دار شخص ہے۔ آئے دن بمبئی آتا جاتا رہتا ہے۔ ایک خوب صورت کوٹھی اور ایک لاکھ روپے کی گراں قدر رقم۔ پیسہ بہت بڑی چیز ہے بیٹی۔ یہ قسمت والوں کو ہی ملتا ہے۔ پھر وہ چار مہینوں کے لئے تھوڑا ہی باہر جا رہا ہے۔ ہر ماہ آنے کا وعدہ کر رہا ہے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم ہاں کر دو اور شادی کے لئے راضی ہو جاؤ۔ میں تمہارا باپ ہوں، تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"

اور اس نے 'ہاں' کر دی۔

دیکھتے ہی دیکھتے شادی کی ساری رسمیں مکمل ہو گئیں اور وہ اس کے ساتھ اک خوب صورت ہوٹل میں جا ٹھہری۔ اس نے اپنے وعدے کے مطابق ایک خوب صورت کوٹھی کے کاغذات اور ایک لاکھ کا چیک حجلۂ عروسی میں قدم رکھنے سے پہلے اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

پورا ڈیڑھ ماہ گزر گیا، لیکن اسے پتہ تک نہ چلا کہ کب دن نکلا کب رات بیتی۔ وہ تو اس وقت چونکی جب اس کے شوہر نے ہولے سے اس کے کان میں کہا۔ "تمینہ! میں جا رہا ہوں۔ ہر ماہ

انشاءاللہ ضرور آتا رہوں گا۔ اپنا خیال رکھنا۔"
اور پھر وہ چلا گیا

وقت کا پنچھی پنکھ پسارے اُڑتا رہا۔ مہینہ، پھر مہینے، پھر پورا سال بیت گیا۔ خدا نے مزید اس پر اپنا کرم کیا اور اس کے گھر میں ایک چاند سی لڑکی کا اضافہ ہو گیا۔ لیکن وہ ایسا گیا کہ پھر نہ لوٹا۔ درجنوں خطوط اس کے بتائے ہوئے پتہ پر ارسال کئے گئے، لیکن لاحاصل۔ رہا سہا باپ کا سایہ بھی اس کے سر سے اُٹھ گیا اور وہ بالکل کسی ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح تنہا سمندر کے آغوش میں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگی۔ اس کی اپنی خواہش، اس کی اپنی خوشیاں جیسے اس سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئیں۔

وقت اسے زخم پر زخم دیتا رہا اور وہ برداشت کرتی رہی۔ ہوس کے گندے اس کے ارد گرد منڈلانے لگے، لیکن وہ ان سب کا مقابلہ کرتی رہی اور اپنے دامنِ عصمت کو داغ دار ہونے سے بچاتی رہی۔ اسے اُمید تھی کہ ایک دن وہ ضرور آئے گا اور اپنی چاند سی بیٹی کو دیکھ کر پھر کبھی نہ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دن گزرتے رہے اور اسی کشمکش میں برسوں بیت گئے۔ اس کی خوب صورت لڑکی اب جوان ہو چلی تھی۔ اپنے آپ کی حفاظت کرتے کرتے وہ اس قدر تھک چکی تھی کہ اب اسے خود بہلانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن آج کے جہان میں بے غرض سہارا کون بن سکتا ہے؟ غیروں کا تو کیا ذکر اپنوں پر بھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ جوان لڑکی کی فکر روگ اسے گھن کی طرح چاٹتی رہی۔

اب وہ کیا کرے؟ کدھر جائے؟ یہ کیسی زندگی ہے؟ یہ کیسا امتحان ہے؟ وہ سجدے میں گڑگڑاتی رہی اور خدا سے پوچھتی رہی۔ اس نے خوب دعائیں مانگیں کہ کہیں سے کوئی اچھا سا رشتہ آ جائے تو وہ اپنی لڑکی کو اس کے پلّو باندھ دے۔ لیکن رشتہ آنا تو درکنار، کسی نے بات تک نہ کی۔ ہاں، اس نے ان گنت بھوروں کو اس کچی کلی کے آس پاس منڈلاتے ہوئے ضرور محسوس کیا۔ یہ دیکھ کر وہ اور بھی فکر مند ہو گئی۔

ایک دن اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی محلے کے مولانا صاحب اس کی لڑکی کے لئے ایک مالدار شخص کا پیام لے کر آئے تھے۔ کہنے لگے بہن، مانا کہ اس کی عمر پچاس سے تجاوز کر گئی ہے، لیکن دولت ہی اصل عمر ہے' اصل جوانی ہے۔ ایک تو عمر شخص جس کو غریبی نے بچپن سے اپنے شکنجے میں پیسا ہو، جوان ہوتے ہوئے بھی بوڑھا دکھائی دیتا ہے۔ ویسے بھی اب تمہارا کیا بھروسا؟ ہمیشہ تو بیمار رہتی ہو۔ میری مانو تو رضیہ کا بیاہ اس سے کر دو۔ وہ اپنے ساتھ رضیہ کو اپنے ملک لے جانا چاہتا ہے۔ تمہیں شادی کے اخراجات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ سب اخراجات برداشت کرے گا۔ اور تمہیں بطور نذرانہ پچاس ہزار بھی دے گا۔ اچھی طرح سوچ لو تمہاری رضیہ کی اس سے شادی نہ ہوئی تو کوئی سلطانہ اس سے بیاہ کر لے گی۔ میں تمہارا پڑوسی ہوں۔ اس لئے پہلے تمہارے بارے میں نہ سوچوں تو.....

مولانا اپنا بیان ختم کرتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔

جاتے جاتے پھر مولانا نے ایک گھنٹہ سوچ کر جواب دینے کی مہلت عطا کر دی۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئی کہ کیا کرے اور کیا جواب دے۔ کہیں اس کی زندگی کی طرح اس کی پھول سی لڑکی کی زندگی بھی برباد نہ ہو جائے۔ لیکن وہ تو لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانے کو کہہ رہا ہے۔ اس کی نیت صاف ہی ہو گی۔ اس نے بار بار سوچا اور پھر مولانا کو بُلا بھیجا۔

قاضی صاحب نکاح کے لئے اپنے رجسٹر میں خانہ پُری کر رہے تھے۔ دولہا اپنے چند دوستوں کے درمیان مسند پر بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے کہ ایجاب قبول کرایا جاتا، شمینہ نے چلمن کی اوٹ سے جھانکا ——— اور اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

بیس برس پہلے کا جاوید' اس کا اپنا شوہر پھر نوشہ بنا بیٹھا تھا۔ وہ زور سے چیخی: "جاوید! جاوید! یہ تم کیا کرنے جا رہے تھے؟ اپنے ہی خون سے اپنا نکاح!" قاضی صاحب، پڑھائیے نکاح بے شک اس کلی پر ان کا ہی حق ہے، کیوں کہ یہ ان ہی کے باغ کی کلی ہے" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ "آج سے بیس برس پہلے انہوں نے مجھ سے بیاہ رچایا تھا۔ کچھ دن کا ساتھ رہا تھا پھر یہ چلے گئے تھے اور کبھی نہ لوٹے۔ پوچھئے ان سے قاضی صاحب، یہ اس قدر نیچ، کمین اور خود غرض بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے اللہ! یہ تیری کیسی دنیا ہے!" اور ایک بھیانک چیخ کے ساتھ وہ زمین پر گر پڑی۔

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا ———

آہستہ آہستہ سب لوگ کھسک کر باہر نکل گئے ——— اور جب اسے ہوش آیا تو اپنی ہمیشہ کی نیند سوئی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر وہ رونے کی بجائے زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسنے لگی۔

●●

نجمہ عزیز مرادآبادی

بچوں کو ساتھ سُلانا محبت نہیں عداوت ہے

والدین، بھائی بہن اور دادا دادی یغرہ بچوں کو اپنے ساتھ سُلانے کو محبت اور یار کی علامت یا ثبوت خیال کرتے ہیں۔ کسی مد تک یہ بات سچ بھی ہے۔ ہمیں جن بچے سے جتنی زیادہ محبت ہوتی ہے ہم اسے اتنا ہی یادہ اپنے قریب رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماں اگر اپنے ننھے منے کو اپنی چھاتی اور اپنی گود سے محروم کر دے تو ماں کی ممتا اور محبت مشکوک ہو سکتی ہے۔ ممتا کی ماری عورت اپنے بچے کو اپنے قرب سے محروم کر ہی نہیں سکتی۔ اس کی محبت بے غرض ہوتی ہے۔ بچے کو جی کا جنجال بنائے پھرتے رہنے سے اسے کوئی مالی فائدہ نہیں ہوا کرتا ورنہ کوئی دوراندیش ماں مستقبل میں ہی کسی مالی نفع کی توقع رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی ماں کو کسی طرح پہلے سے علم ہو جائے کہ اس کا بچہ بڑا ہو کر مجرم بنے گا، ماں باپ کو قتل کر ڈالے گا یا گھر کو تباہ و برباد کر ڈالے گا۔ تو ماں کی تشویش اور فکر مندی تو عین فطرت کے مطابق ہو گی، ہر وقت ہوشیار اور چوکنا رہنے کی بات بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہو گی لیکن ایسے خطرناک بچے سے جان چھڑانے کو پھر بھی آمادہ نہ ہو گی۔ وہ ایسے بچے کو بھی زہر وغیرہ دے کر ہلاک نہیں کر سکتی، بے اعتنائی کی شدت سے اسے مرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ کسی یتیم خانے وغیرہ میں لاوارثوں کی زندگی گزارنے کے لئے نہیں ڈال سکتی۔

یہ اور ایسی کتنی ہی باتیں ہیں جو ماں باپ کی ممتا اور شفقت کا بیّن ثبوت ہیں۔ ایسی صورت میں بڑوں کا بچوں کو اپنے ساتھ سُلانا عام رواج کی شکل اختیار کر گیا ہے اور ہر گھر میں اس رواج کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

بچپن کا دور نشوونما کا اہم دور ہوتا ہے۔ اس دور میں جسم کے اندر بڑی تیزی سے تبدیلی رُونما ہوتی ہے۔ اس دَور میں اعصابی طاقتیں پیدا ہو کر زندگی کے معاون و مددگار بنتی رہتی ہیں۔ اگر اس قسم کی تبدیلی اور معاونت کے دَور میں بچوں کو اپنے بڑوں کے ساتھ سونا پڑے تو بچے کم زور اور نحیف، زرد رو، پژمُردہ شُست، غبی اور چڑ چڑے ہو جائیں گے۔

لیکن لوگ اس رواج کو سینے سے لگائے رہنے کے نقصانات کو نہیں جانتے یا کبھی ان نقصانات کا انہیں خیال ہی نہیں آتا۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ شفقت کسی وقت عداوت کا رُوپ بھی اختیار کر سکتی ہے۔

بچوں کا بڑوں کے ساتھ سونا خواہ کسی مجبوری کے تحت ہو یا بخوشی بہرصورت حفظانِ صحت کی رو سے بچوں کے لئے مُضر (کبھی کبھی مہلک بھی) ہے۔ بہت سے بچے اس ضرر رساں دُلار کا شکار رہ جاتے ہیں اور اپنی اعصابی اور ذہنی قوتوں کو مضمحل کر لیتے ہیں۔

بچپن کا دور نشوونما کا اہم دور ہوتا ہے۔ اسی دَور میں جسم کے اندر بڑی تیزی سے تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اسی دَور میں اعصابی طاقتیں پیدا ہو کر زندگی کی معاون و مددگار بنتی رہتی ہیں۔ اگر اس قسم کی تبدیلی اور معاونت کے دَور میں بچوں کو اپنے بڑوں کے ساتھ سونا پڑے تو بچے کم زور اور نحیف، زرد رو، پژمُردہ، شُست، غبی اور چڑ چڑے ہو جائیں گے، تجربات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کم زور، طاقت ور سے اور بیمار، تن درست سے بہت کچھ قوتِ حیات یا زندگی کی حرارت جذب کر سکتے ہیں۔ تکان اور ماندگی کی حالت میں دوسرے شخص سے جسم دبوانا، درد کے وقت پنڈلیوں وغیرہ کی مالش کرانا اسی لئے فوری طور پر فیض رساں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دو جسموں کے باہم ملنے سے ایک جسمانی برق یا برقی کرنٹ دوسرے میں نفوذ کر جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بڑے شخص کے ساتھ بچوں کو سُلا کر بچوں کے اجسام کی برق غیر محسوس طور پر بڑوں کے جسموں میں جذب ہوتی ہوگی۔

امریکہ کے ایک سینے کے اسپیشلسٹ نے اپنی ریسرچ کے دوران یہ ثابت کیا تھا کہ ایک بچہ اپنی ماں کے ساتھ سونے اور ہر وقت اس سے لپٹے رہنے کی وجہ سے بے وقت موت کے مُونہہ میں پہنچ گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک عورت کو پھیپھڑوں کی کم زوری سل اور دق لاحق ہوئی، جو لاعلاج بیماری تھی۔ اس کا شیر خوار بچہ ہر وقت ماں کے گلے کا ہار بنا رہتا تھا۔ دیکھنے والوں کی نظر میں مریضہ چند گھنٹوں کی مہمان معلوم ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ کئی ماہ تک زندہ رہی۔ اسی درمیان بچہ جو پہلے تن درست تھا رفتہ رفتہ بیمار ہونے لگا۔ اس کا تر و تازہ چہرہ مرجھا گیا۔ یہاں تک کہ ہڈیاں نکل آئیں۔ آخر بچے نے ماں کے دُودھ کا حق ادا کیا اور ماں سے پہلے اپنی جان خدا کے سپرد کر دی۔ اس کی بیماری کا سبب فوری طور پر کسی کی سمجھ میں نہ آسکا۔ مذکورہ اسپیشلسٹ نے ہی اصل وجہ کا انکشاف کیا۔ اس حقیقت کو تو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ مریض جسم کے جراثیم صحت مند جسم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ کلیہ پاس سونے والے بچے پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

جو ماں باپ اپنے بچوں کی بہتر صحت اور نشوونما کے خواہاں ہیں انہیں سب سے پہلے یہی احتیاط کرنی چاہئے کہ بچوں کو بڑوں کے ساتھ نہ سونے دیں۔ یہی نہیں، انہیں یہ خیال بھی رکھنا چاہئے کہ مریض بچوں اور تن درست بچوں کو بھی الگ الگ سلائیں، چوں کہ بیمار بچے کی بیماری کا علم نہیں اکثر فوری طور پر نہیں ہو پاتا، اس لئے بیمار اور تن درست بچے میں امتیاز کر لینے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ پس بچوں کو الگ ہی سُلانا حفظِ ماتقدم کے طور پر بہتر ہے۔ بچوں کے ایک ہی بستر پر سونے سے جہاں مریض بچے کے جلد تن درست ہونے کی توقع ہے، وہاں تن درست بچے کے جلد بیمار ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔

○○

وہ ۱۰۰ برس کی عمر میں بھی جوانوں کی طرح تندرست ہے

فضل کریم

انجیل میں انسان کی عمر ۱۲۰ سال بتائی گئی ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق انسان کی عمر ۱۰۰ برس ہوتی ہے۔ پہلے ۲۵ سال برہم چریہ یعنی کنوارے پن کے ہیں۔ اگلے ۲۵ سال گرہست کے لئے۔ اس کے بعد ۲۵ سال دنیا سے رفتہ رفتہ بے تعلقی کے ہیں۔ آخری ۲۵ سال سنیاس کے ہیں جس میں گھر بار، بیوی بچے روپیہ پیسہ سب کچھ چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ انسان کی عمر کی یہ تقسیم فرضی ہے۔ بہت کم لوگ ۱۰۰ برس کی عمر پاتے ہیں اور جو پاتے ہیں وہ بھی دنیا سے بے تعلق نہیں ہوتے۔ چہ مو بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ کچھ لوگ اس کی عمر ۱۰۵ بتاتے ہیں اور کچھ ۱۱۰ لیکن ۱۰۰ برس کی عمر میں کوئی شبہ نہیں۔

چہ مو ایک غریب ہریجن عورت ہے۔ وہ کرناٹک کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہے۔ اس کا خاوند مر چکا ہے۔ اس کے دو بیٹے ہیں۔ پہلے بیٹے کی عمر ۷۰ سال ہے اور دوسرے کی ۶۲ سال۔ چہ مو نے غریب ہریجنوں کی طرح زندگی گزاری ہے۔ اس نے اپنی عمر کی درازی کے لئے کوئی صحت بخش غذا نہیں کھائی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس نے زندگی بھر ڈاکٹری دوا استعمال نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ چہ مو کبھی بیمار ہی نہیں پڑتی اور اگر اسے کبھی نزلہ، کھانسی یا بخار ہوا بھی تو اس نے گھریلو جڑی بوٹیوں سے اپنا علاج کر لیا۔ چہ مو کو ایسی بے شمار دوائیں یاد ہیں جن کی تیاری میں چند پیسے ہی خرچ ہوتے ہیں۔

چہ مو کی شادی ۱۲ سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔
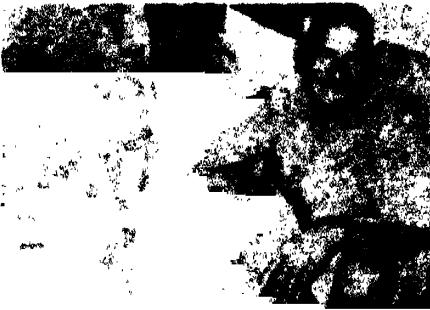
۲۵ سال بعد اس کا خاوند چل بسا۔ اس وقت اس کے بڑے بیٹے کی عمر ۲۲ سال اور چھوٹے بیٹے کی عمر ۲ سال تھی۔ چومو کے خاوند نے اس کے نام پھوٹی کوڑی بھی نہیں چھوڑی۔ اسے اپنا پیٹ پالنے اور دونوں بیٹوں کی پرورش کرنے کے لئے محنت مزدوری کرنی پڑی۔ کرناٹک میں تنکوں کی باسکٹ اور تھیلے تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ وہاں کی کاٹیج انڈسٹری ہے۔ چومو نے بھی یہ فن سیکھ لیا

اس کا پہلا بیٹا جوان تھا۔ وہ کھیت میں مزدوری کرتا تھا۔ اس طرح زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح چلتی رہی۔ چومو جسمانی لحاظ سے طاقت ور نہیں ہے۔ وہ ایک دھان پان عورت ہے۔ اس کا قد صرف ۵ فٹ ہے۔ لیکن اس میں قوتِ ارادی اور خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس نے کبھی اپنی ضرورت کے لئے کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا، کبھی کسی سے مدد نہیں مانگی۔ اسے خود پر بھروسا تھا۔ وہ صبح کو ندی پر جا کر نہاتی، ندی میں گھر کے میلے کپڑے دھوتی، پھر گھر پہنچ کر کھانا تیار کرتی اور گھر کے کام دھندوں سے فارغ ہو کر تھیلے اور باسکٹ بنانے بیٹھ جاتی۔ اس پروگرام میں کبھی فرق نہیں آیا۔ چومو کی صحت کا راز غالباً اس کی ان تھک محنت میں ہی پوشیدہ ہے۔

چومو کی بینائی ابھی تک ٹھیک ہے۔ وہ ۲۰ فٹ کے فاصلے سے انسان کو پہچان لیتی ہے۔ اس نے ابھی تک چشمہ استعمال نہیں کیا اس کے دانت ابھی تک سالم ہیں، جب کہ اس کے دونوں بیٹوں کے دانت ٹوٹ چکے ہیں۔ چومو نے یوگا ورزشیں نہیں کیں، کوئی خاص دانتوں کا منجن یا بالوں کا تیل نہیں استعمال کیا، فیس کریم اور لوشن کا اس نے نام بھی نہیں سُنا۔ ۹۵ سال کی عمر تک وہ تنکوں کی باسکٹ اور تھیلے بُنتی رہی۔ پانچ برس سے اس نے باسکٹ بُننا چھوڑ دیا ہے۔ چومو کو یاد ہے کہ جب اس نے پہلی بار تنکوں کی باسکٹ بنائی تھی تو بازار میں اس کی قیمت صرف ایک آنہ تھی۔ جو آج کے چھ پیسوں کے برابر تھی۔ لیکن بازار میں چاول بھی ایک آنے کا ایک سیر مل جاتا تھا۔ آج ایک باسکٹ کی قیمت چھ روپیہ ہے۔ چومو نے کبھی سو روپے کا نوٹ نہیں دیکھا۔ ۱۰۰ روپیہ تو دُور کی بات ہے اس نے کبھی ۱۰ اور ۵ روپے کا نوٹ بھی نہیں دیکھا۔ اس کی تمام زندگی پیسہ، اکنی، چونی اور ایک روپیہ کے گرد گھومتی رہی۔ کرناٹک کے ہریجن گوشت کھاتے ہیں۔ چومو کو گوشت پسند ہے لیکن غریبی کی وجہ سے اسے شاذونادر ہی گوشت کھانا نصیب ہوتا تھا۔ جس دن گھر میں گوشت پکتا، اس روز اس کی عید ہوتی۔ وہ مچھلی اور مُرغی بہت شوق سے کھاتی ہے۔ مچھلی اسے دریا سے مُفت مل جاتی ہے۔ وہ اس عمر میں بھی دریا میں جال ڈال کر مچھلیاں پکڑ لیتی ہے۔

چومو کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گئی۔ اس نے شہر کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ اس نے سنیما کا نام تو سُنا ہے، لیکن دیکھا آج تک نہیں۔ آج تک اس نے کبھی ووٹ بھی نہیں دیا اس کو سیاست کی الف ب بھی نہیں معلوم۔ چار برس پہلے وہ اپنی ایک بھانجی سے ملنے قریب کے گاؤں گئی تو پہلی بار اس نے بس کا سفر کیا۔ چومو نے بڑھاپے میں شراب پینا بھی شروع کر دیا ہے۔ جوانی میں اسے یہ لت نہیں تھی۔ لیکن گاؤں کے ٹھیکے والے سے اسے یہ شکایت ہے کہ وہ دیسی ٹھرا بہت مہنگا بیچتا ہے۔ ۵۰ پیسے میں اسے ایک گلاس ہی ملتا ہے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار چومو ٹھیکے پر جاتی ہے اور اپنا شوق پورا کر لیتی ہے۔

چومو کی تمام سہیلیاں مر چکی ہیں۔ جو عورتیں اس کی جوانی کے زمانے میں پیدا ہوئیں یا شادی کے بعد گاؤں میں آئیں، وہ بھی دنیا سے سدھار گئیں۔ اس کی جوانی کی تمام دوست اور رشتہ دار مر گئیں۔ لیکن چومو خود کو تنہا محسوس نہیں کرتی۔ وہ اپنے بیٹے بہو پوتے پوتیوں میں مگن رہتی ہے۔ ایک چار سالہ ننھا پڑپوتا ہر وقت اس کی گود میں رہتا ہے۔ چومو اب بھی کام کاج سے جی نہیں چُراتی۔ اگر دن کے وقت گھر کا کوئی فرد سو رہا ہو تو وہ اسے پھٹکارتی ہے "ارے دن میں سوؤ گے تو اپاہج اور بے خوف بن جاؤ گے!" چومو کو بارش کے سیزن میں بھی چین نہیں۔ وہ بارش میں بھیگتی ہوئی پاس کے جنگل سے تنکے چُنتی ہے۔ اس کا بیٹا اور بہو اسے لاکھ کہتے رہیں، لیکن وہ ان کی ایک نہیں سنتی۔ اب کبھی کبھی اس کے جوڑوں میں درد رہتا ہے۔ لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتی۔ اس کا حافظہ بھی کچھ خراب ہو گیا ہے۔ اکثر اسے کل کی بات بھی یاد نہیں رہتی لیکن اسے بچپن کی ساری باتیں یاد ہیں۔ بوڑھے لوگوں میں یہ بات عام پائی جاتی ہے۔ ان کا حافظہ تو خراب ہو جاتا ہے لیکن اس خرابی کا اثر ماضی قریب پر ہی پڑتا ہے۔ بچپن اور جوانی کی باتیں یادداشت کے خزانے میں محفوظ رہتی ہیں۔

چومو کی درازیٔ عمر کا راز کیا ہے اس نے کبھی صحت کی دیکھ بھال نہیں کی۔ کبھی مقوی غذائیں نہیں کھائیں۔ اس کی زندگی کا محور ایک ہی تھا: کام کام اور زیادہ کام۔ اسے کام سے کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ یہ فرصت اسے آج بھی نصیب نہیں ہے۔ شاید یہی لگن اس کی درازیٔ عمر کا راز ہے۔

انسری مصطفیٰ

کٹنی بڑھیا

انسری مصطفیٰ

بچپن میں آپ نے اکثر اپنی دادی ماں یا نانی ماں سے کہانیاں سنی ہوں گی۔ بادشاہوں کی کہانیاں، پریوں کی کہانیاں تین بہنوں کی کہانیاں کسان کی بیٹی کی کہانی ... لگ بھگ ہر کہانی میں آپ کو کوئی نہ کوئی کردار ایسا ضرور ملا ہوگا جس کا کام آپس میں متفرقہ پیدا کرنا، بھائی کو بھائی سے لڑانا، ساس کو بہو کے خلاف ورغلانا، بہو کو ساس کے خلاف بھڑکانا، باپ کو بیٹے سے اور بیٹے کو باپ سے جدا کرنا، شوہر کے دل میں بیوی کے لئے شک پیدا کرنا اور بیوی کو شوہر سے بدظن کرتا رہا ہوگا۔ اور ان کاموں میں آپ کو زیادہ تر عورتیں ہی پیش پیش نظر آئی ہوں گی ان ہی کرداروں اور اس طرح صفات کی حامل عورتوں کو کہانی کی زبان میں کٹنی بڑھیا کہا جاتا ہے۔

ہر دور اور ہر معاشرہ میں یہاں تک کہ تین چار خاندانوں کے مشترکہ گھرانے میں بھی ایک نہ ایک ایسی کٹنی بڑھیا آپ کو ضرور نظر آئے گی جو معاشرے کے تالاب کو ایک گندی مچھلی کی طرح گندا کر کے رکھ دیتی ہے۔

کوئی ضروری نہیں کہ اس قسم کی صفات کی عورتیں عمر رسیدہ ہی ہوں۔ یہ مرض تو نوخیز کلیوں اور جوان عورتوں میں بھی سرایت کر جاتا ہے — لیکن بڑی تعداد سن رسیدہ عورتوں کی ہی ہوتی ہے — اگر کم عمری میں یہ مرض لگتا بھی ہے تو اپنے بڑوں سے ہی لگتا ہے۔ بیٹی پوتی یا نواسی اپنی ماں، دادی یا نانی کو جیسا کرتے ہوئے دیکھتی ہے، ویسا ہی اثر قبول کرتی ہے — اس طرح موروثی بیماریوں کی طرح اس موذی مرض کے جراثیم بھی ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

عورتیں معاشرتی تعلقات کی نشوونما کی معمار ہوتی ہیں — آپ کے تعلقات پڑوس سے شوہر اور دیگر عزیز و اقارب سے کیسے ہیں؟ اس کا انحصار اسی بات پر ہے کہ آپ کے معاشرہ میں کٹنی بڑھیا کا وجود ہے کہ نہیں — اگر ہے اور معاشرے کے افراد باشعور نہیں تو معاشرہ گندا

ہو کر رہے گا ۔ اگر نہیں ہے یا پھر معاشرے کے افراد باشعور ہیں تو پھر پورا معاشرہ گل و گلزار بنا رہے گا ۔

اس ترقی یافتہ دور میں بھی عورتوں کا زیادہ وقت گھروں میں ہی گزرتا ہے اور اُن کے پاس مَردوں کے مقابلے میں کافی خالی وقت ہوتا ہے مثل مشہور ہے: خالی گھر شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی فتنہ پرور عورتوں کو فتنہ پھیلانے کا خاص موقع مل جاتا ہے ... جہاں چار عورتیں جمع ہوئیں وہیں شیطانی صفت کی یہ مخلوق بھی پہنچ گئی ۔

اگر وہ کسی ساس کے پاس گئی تو پھر اُس کا انداز تکلم اس طور پر ہو گا: "اجی اماں، آپ بھی کیا غضب کی عورت ہیں ۔ اس بڑھاپے میں بہو کے ہوتے ہوئے بھی کام میں جان کھپانا پڑتا ہے ایک ہمیدن کی بہو ہے ۔ رات دن ساس کی خدمت میں لگی رہتی ہے ۔ کیا مجال کہ ساس کو کسی کام میں ہاتھ لگانے دے .... بس دن بھر بیٹھ کر ٹلی کاٹتی رہتی ہے ۔"

اگر کسی بہو کے پاس گئی تو پھر اس کے کہنے کا انداز یوں ہو گا: "اری بیٹی، کیا نصیب ہیں تیرے! ماں کے گھر میں رانی بنی رہتی تھی اور یہاں ابھی ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں چھوٹی اور کام کرنے لگی ۔ ایک سلیمنی کی ساس ہے ۔ بہو کے آگے بچھی بچھی رہتی ہے ۔ کیا مجال جو بہو کو پھول کا تنکا بھی اٹھانے دے ۔ راج کرتی ہے، راج ۔"

اور اگر وہ آپ کے کسی پڑوسی کے یہاں گئی تو اس طور پر مخاطب ہو گی: "اجی بہن، کیا زمانہ آگیا ہے ... گھر میں جوان ... لڑکی ہے اور مُوا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بٹھا ہے ۔ گھر میں دو دو بیری کے پیڑ لگائے ہوئے ہے اور سوچتا ہے ڈھیلے بھی نہ گریں ۔ وہ تو گریں گے ہی ۔ ذرا لڑکیوں کی چال تو دیکھو ۔ کیسے مٹک مٹک کر چلتی ہیں ۔ ہر وقت جنگلے کے پاس کھڑی ہو کر ہر آنے جانے والے کو دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھورا کرتی ہیں ۔ لڑکیاں بے چاری قسمت کی ماری بھی کیا کریں، سُن لینا کسی نہ کسی دن اُڑن چھو ہو گئیں ۔"

اور اگر وہ آپ کے کسی عزیز کے پاس جائے گی تو پھر وہاں اس کے کہنے کا انداز کچھ اس قسم کا ہو گا: "اجی توبہ کرو ۔ انسانوں کا خون ہی سفید ہو گیا ہے ۔ دیدے کا پانی ہی مر گیا ہے کہنے کو تو رشتہ دار بنے پھرتے ہیں، مگر کبھی جھوٹے مُونہہ پوچھتے بھی نہیں ۔ ایک تم ہو کہ ان لوگوں کے لیے جان دیے رہتی ہو ۔ کیا کچھ نہیں کیا تم نے ان لوگوں کے لیے ۔ مگر اُف توبہ! خدا جھوٹ نہ بلوائے، تم لوگوں کے بارے میں کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کیا کرتی ہے ۔ مجھ سے تو سنا بھی نہیں جاتا ۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی ہوں ۔ غضب خدا کا!"

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو بے حد چاہتا ہے تو یہ بھی اس کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے ۔ چار عورتوں کے بیچ (خاص کر ایسی عورتوں کے سامنے جن کا شوہر ان پر پوری توجہ نہیں دیتا) یوں کہے گی: "کتنی خوش نصیب ہے فہمیدہ ۔ اس کا شوہر اس پر جان چھڑکتا ہے ۔ وہ جو کہتا ہے پورا کرتا ہے ۔ ایک میرا داماد ہے مُوا کبھی سیدھے مُونہہ بات ہی نہیں کرتا ۔ ہر وقت میری بیٹی کے پیچھے لٹھ لیے پڑا رہتا ہے ۔" گویا یوں کہہ کر اور اُن عورتوں کو سُنا کر وہ یہ جتانا چاہتا ہے کہ میں ہی نصیبوں جلی نہیں، بلکہ تم سب بھی نصیبوں جلی ہو

سب سے مزہ دار بات تو یہ ہے کہ ان تمام خرافات کے باوجود کٹنی بڑھیا کو بھی اس بات کا احساس ہوتا کہ اُس کے اِس گھناؤنے کردار سے کتنے گھر تباہ ہو رہے ہیں ۔ اگر وہ کبھی کسی معاملے میں دھر بھی لی گئی تو نہایت ڈھٹائی سے اپنی صفائی میں یوں کہے گی: "توبہ توبہ، بی بی اِس بڑھاپے میں کیوں میری مٹی خراب کرتی ہو ۔ لگائی بجھائی کرنے والوں پر خدا کی مار ۔ میں کیا نہیں جانتی کہ اس قسم کی عورتوں کا جہنم میں بھی ٹھکانا نہیں ۔ ہمارے نبیؐ نے کیا نہیں فرمایا کہ ہم نے جہنم میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہی دیکھی ہے ۔" اور آپ اس کی باتوں کو سُن کر اپنا سا مونہہ لے کر جائیں گی ۔

یہ ہے وہ کردار جس سے آپ کو چوکنا رہنا ہے اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کا گھر اور آپ کا معاشرہ پاکیزہ اور امن کا گہوارہ ہو تو ایسی کٹنی بڑھیا کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیں ۔ اُس کی چکنی چپڑی باتوں کو اُسی کے مونہہ پر دے ماریں ۔ یہ نہ سوچیں کہ وہ آپ کے سامنے آپ کی نہیں بلکہ دوسروں کی برائی کر رہی ہے ۔ یقین جانئے وہ دوسروں کے سامنے آپ کی برائی بھی اسی طرح کرے گی اس لئے کہ یہ اُس کی عادتِ ثانیہ بن چکی ہے ۔ محلے بھر کی خبریں وہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں پہنچاتی ہے خبروں کے اس ریڈیو اسٹیشن کو بند کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ آپ اپنا دروازہ اس کے لئے بند کر دیجئے ۔ کم از کم آپ کا گھر تو اس کی شر سے محفوظ ہو جائے گا ۔ اور پھر جب ایک گھر سے دوسرے گھر اور دوسرے گھر سے تیسرے گھر میں بھی اس کے ساتھ اس قسم کا سلوک ہو گا تو پھر اسے یا تو اپنی عادت ترک کرنی پڑے گی یا پھر وہ گوشہ نشیں ہو جائے گی ۔

●●

نتیجہ:

خیال اپنا اپنا

کیا ملازمت کرنے والی عورتیں بچوں کی بخوبی نگہداشت نہیں کرسکتیں؟

اس مقابلے کی بیشتر تحریروں میں نئے اور پرانے ذہن، رویے کی انتہائیں جلوہ گر نظر آئیں تاہم کچھ تحریروں میں توازن کی جھلک بھی موجود تھیں۔ مہر حسن (دہلی ۶) کی تحریر پہلے انعام (سو روپے) کی حق دار ٹھہرائی گئی۔ انیس حسن (دہلی ۶) کو دوسرا انعام (پچاس روپے) اور زبیدہ بیگم ناز (سکندرآباد، آندھرا) کو تیسرا انعام (تیس روپے) دیا جا رہا ہے۔ انعام پانے والی تحریریں یہاں شائع کی جا رہی ہیں۔

پہلا انعام:

عورت نام ہے ایک ماں کا، عورت نام ہے ایک بیوی کا، عورت نام ہے ایک بیٹی کا۔ اور ان کے علاوہ عورت نام ہے ایک مشین کا، جو کبھی تھکتی نہیں۔ مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ملازمت کرنے والی عورتیں بچوں کی بخوبی نگہداشت نہیں کرسکتیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ ایسی عورتیں اپنے شوہر اور گھربار کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتیں۔ آج کے دور میں جب عورت ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھ سکتی ہے، اولمپک کھیلوں میں حصہ لے کر تمغے جیت سکتی ہے، وہ گھر کی حد تک بھی زیادہ ذمہ داری کا ثبوت دیتی ہے۔ ایسی عورتوں کے بچے زیادہ لائق ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ خود قابل اور لائق ہوتی ہیں۔ وہ اپنے دماغ میں یہی بات رکھ کر اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہیں کہ ان کے بچے قابل اور لائق بنیں۔ یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ صرف گھریلو عورتوں کے بچوں کے مقابلے میں ان عورتوں کے بچے زیادہ لائق ہوتے ہیں جو نوکری کرتی ہیں اور خود اعتمادی کے ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی کی پوری زندگی کا ہر پل مصروفیت میں گزرا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے بچوں کی نگہداشت اس طرح حسن و خوبی سے کی جس کی مثال راجیو گاندھی ہمارے سامنے ہیں۔ اگر نوکری کرنے والی عورتیں اپنی نوکری اور بچوں کی پرورش دونوں میں توازن قائم رکھیں تو وہ نوکری کے ساتھ بچوں کی نگہداشت بہت اچھی طرح کرسکتی ہیں۔

مہر حسن، دہلی ۶

دوسرا انعام:

عورت صنف نازک ہے۔ خدا نے ہی عورت اور مرد کو دنیا میں کام بانٹ کر بھیجا ہے۔ جب تک عورت اپنے ماں باپ کے گھر ہے، اس کا کام ہے پڑھنا لکھنا، گھر کی دیکھ بھال کرنا، ماں باپ کی خدمت کرنا اور ان کو خوش رکھنا۔ اس کے بعد جب وہ سسرال چلی جاتی ہے تو گھر اور شوہر کی دیکھ بھال اور بچوں کی نگہداشت ہی اس کا مقصد زندگی ہونا چاہئے۔

ملازمت پیشہ عورت کتنی ہی محنتی اور جفاکش کیوں نہ ہو، وہ گھریلو محاذ پر مشین جیسی تیزی سے کام تو کرسکتی ہے لیکن اپنے فرائض کو بخوبی اور خوش اسلوبی سے نہیں انجام دے سکتی۔ جو عورت نوکری کرسکتی ہے (چاہے وہ نوکری ضرورتاً کرے یا شوقیہ) یہ ضرور چاہے گی کہ وہ اپنی نوکری میں کسی قسم کی کوتاہی نہ آنے دے۔ جب وہ نوکری سے تھکی ہاری گھر آئے گی تو سب سے پہلے گھر کی دیکھ بھال کرے گی تاکہ دوسرے لوگ اس پر انگلیاں نہ اٹھائیں۔ اس کے بعد وہ یہ سوچے گی کہ اس کا شوہر گھر آنے والا ہے۔ اس لئے اس کے کام پورے کرسکے۔ دوسرے دن نوکری پر جانے کی دہشت بھی اس پر سوار ہوگی۔ ان سب باتوں کے نتیجے میں کوشش کے باوجود وہ اپنے بچوں کی زندگی کے اس خلا کو پُر نہیں کرسکتی جو اس کی مناسب توجہ نہ ملنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ جلدی جلدی کچھ اچھا برا پکا کر بچوں کو کھلا تو سکتی ہے۔ مگر لگن کے ساتھ نہیں، وہ بچوں کا ہوم ورک بھی کرا سکتی ہے۔ مگر اچھے ڈھنگ سے نہیں۔

ہر بچے کا پہلا مدرسہ اس کا گھر اور پہلی اس کی ماں ہوتی ہے۔ اس وقت بچہ جو کچھ اچھا برا سیکھ لیتا ہے تمام زندگی اس کے نقوش قائم رہتے ہیں۔ ملازمت کرنے والی ماں اپنے بچوں کو مادی عیش و آرام اور زندگی کی سہولتیں تو دے سکتی ہے مگر جس ممتا سے خدا نے اس کو نوازا ہے۔ اس سے وہ اپنے بچوں کو سرشار نہیں کرسکتی۔

انیس حسن، دہلی ۶

تیسرا انعام:

ایک زمانہ تھا کہ عورت مردوں کی غلام ہوا کرتی تھی اور مرد اس کے ساتھ برے سے برا سلوک کیا کرتے تھے لیکن آج کے دور میں عورت نے مرد کے شانہ بشانہ چل کر سماج میں اپنا خاص مقام بنا لیا ہے۔ آج کی عورت ہر وہ کام بخوبی کرسکتی ہے جس پر مرد اپنا اجارہ سمجھتے تھے۔ اور ملازمت تو آج کی عورت کے لئے عام سی بات ہے۔ آسمان کو چھوتی ہوئی اس مہنگائی کے دور میں ملازمت عورت کے لئے شوق نہیں، ضرورت ہے۔

بعض گھرانوں میں نوکر عورت کو اتنی آزادی ملنے پر اسے بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں عورت صرف گھر چہار دیواری میں رہ کر بچوں کو پالتی رہے مگر آج کی عورت پڑھی لکھی اور قابل ہے اس کا بھی سماج میں کچھ مقام ہے۔ وہ اپنی ہستی کو تسلیم کرانا چاہتی ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ایک ملازمت پیشہ عورت اپنے بچوں کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کرتی۔ بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ دنیا سے باخبر پڑھی لکھی عورت اپنے بچے کی بہتر طور پر نگہداشت کرسکتی ہے۔

اس سوال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض عورتیں جو ملازمت پیشہ نہیں ہیں وہ گھر کی چہار دیواری کو ہی اپنی دنیا سمجھتی ہیں۔ اسی طرح اپنی اولاد کی پرورش اور نگہداشت نہیں کر پاتیں جس طرح ہونی چاہئے۔ یہ سوچنا ہی مضحکہ خیز ہے کہ ملازمت پیشہ عورت اپنے بچے کی نگہداشت اچھی طرح نہیں کرسکتی۔ کیوں کہ ملازمت پیشہ عورت کے لئے تعلیم اور قابلیت اولین شرط ہے۔ سچ تو یہ ہے ایک ملازمت پیشہ عورت اپنے بچوں کی بہتر اور قابل رشک ڈھنگ سے نگہداشت کرسکتی ہے۔

زبیدہ بیگم ناز، سکندرآباد، آندھرا

●●

گردن کا درد

انسان کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی درخت کے تنے کی طرح ہوتی ہے۔ گردن تک پہنچتے پہنچتے یہ ہڈیاں چھوٹی ہوجاتی ہیں۔ گردن کا درد ان ہی چھوٹی ہڈیوں میں ہوتا ہے اسے اسپان ڈی لائی ٹس کہتے ہیں۔ یہ بوڑھوں کی نسبت جوان میں زیادہ ہوتا ہے اس کے کئی سبب ہوتے ہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اسکول کا کام کرتے ہیں یا بستر پر ایک ہی حالت میں لیٹ کر کتاب پڑھتے ہیں تو اس سے گردن اکڑ جاتی ہے۔ لوگ دفتر میں بیٹھ کر ٹائپ کرتے ہیں فائلوں کا مطالعہ کرتے ہیں یا کھانسی اور زکام کی حالت میں زور سے چھینکتے ہیں تو اس سے بھی گردن کی ہڈیوں پر اثر پڑتا ہے کسی جسمانی حادثے کے بعد بھی یہ مرض پیدا ہوسکتا ہے۔ جسمانی حادثے کا اثر دماغ پر پڑے تو اس سے بھی یہ مرض رونما ہوسکتا ہے۔ ایک بار یہ مرض پیدا ہوجائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گردن کی ہڈیاں اس مرض کو آسانی سے قبول کر لیتی ہیں اس طرح یہ روگ بار بار ہوتا رہتا ہے۔

گردن اکڑ جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان ہڈیوں پر زیادہ بوجھ پڑ رہا ہے۔ جب انسان زور سے چھینکتا ہے تو لامحالہ اس کا اثر گردن پر پڑتا ہے۔ گردن کے اعصاب اس جھٹکے کو برداشت کرنے کے لئے سکڑ کر سخت ہوجاتے ہیں تاکہ ہڈیاں اس کے اثر سے محفوظ رہیں۔ یہ قدرت کا نظام ہے جس طرح تیز روشنی سے آنکھوں کو بچانے کے لئے پلکیں خود بخود بند ہوجاتی ہیں، اسی طرح ہڈیوں کو بچانے کے لئے اعصاب خود بخود سکڑ جاتے ہیں اگر ایسا واقعہ بار بار پیش آئے تو اعصاب سختی کے عادی ہوجاتے ہیں اور اس طرح خود ایک بیماری بن جاتے ہیں۔ یہی بیماری اسپان ڈی لائی ٹس کہلاتی ہے۔ انسان کی ریڑھ کی ہڈی بانس کی طرح سیدھی نہیں ہوتی۔ اس میں ایک قدرتی خم اور لچک ہوتی ہے اس بیماری میں یہ لچک ختم ہوجاتی ہے اس بیماری کے مریض لوگوں کے ایکسرے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی چھوٹی ہڈیاں نئی شکل اختیار کر رہی ہیں۔ ۴۰ سال کی عمر کے بعد عموماً ہوتا ہے۔ ہڈی بڑھ جائے تو اس کا بڑھا ہوا حصہ اعصاب میں چبھتا ہے۔ اس چبھن سے شدید تکلیف ہوتی ہے۔ اگر انسان کا قد چھوٹا ہو تو تکلیف میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ ہڈی کو اِدھر اُدھر پھیلنے کا راستہ نہیں ملتا...... لمبے انسانوں میں یہ مرض نسبتاً کم پایا جاتا ہے۔ جسم لمبا ہو تو ہڈی ادھر ادھر راستہ ڈھونڈ نکالتی ہے اور انسان تکلیف سے بچ جاتا ہے لیکن چھوٹے قد کے انسانوں کو اس بات سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ بڑھی ہوئی ہڈی آخر کار گھس جاتی ہے اور حالات معمول پر آجاتے ہیں تاہم اس کام کی تکمیل میں کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔

زیادہ عمر کے مریضوں میں درد کی بجائے

سر چکراتا ہے. بعض اوقات آنکھوں کے آگے
اندھیرا چھا جاتا ہے. دماغ میں بلیک آوٹ ہو جاتا ہے.
اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بڑھی ہوئی ہڈی نے
خون کا دوران روک دیا ہے. دماغ کو خون کی سپلائی
کم ہونے سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے.

اگر گردن کا درد شدید ہو تو اس سے بازو شانے حتیٰ کہ سینہ بھی متاثر ہو سکتا ہے انسان تکلیف سے بے چین ہو جاتا ہے. کچھ ڈاکٹر گردن میں ایک پٹا کر باندھ دیتے ہیں. اس طرح ہڈی اور اعصاب میں فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن کالر کا استعمال عموماً ضروری نہیں ہوتا. اس مرض میں سب سے زیادہ ضروری چیز آرام ہے. نرم گدیلوں پر سونا غلط ہے اونچا تکیہ بھی نہ رکھیں. تکیہ اگر بالکل استعمال نہ کریں تو زیادہ بہتر ہے. اگر تکیے کے بغیر گزارہ نہ ہو تو ایک نرم اور پتلا تکیہ استعمال کیا جا سکتا ہے. اگر درد معمولی ہو تو اسپرو کا استعمال کافی ہوتا ہے. زیادہ درد کی صورت میں ایسی دوا استعمال کرنی چاہیے جس سے درد کے ساتھ سوجن کو آرام آجائے. گرم پانی کی بوتل، روئی کی سنکائی اور انفرا ریڈ لیمپ کی شعاعیں بھی مفید ثابت ہوتی ہیں اس مرض کی ایک عام دوا آیوڈیکس ہے اس سے اعصاب کو سکون ملتا ہے. لیکن آیوڈیکس کو زور سے نہ رگڑیں اس سے درد میں اضافہ ہوگا. ہلکے ہلکے مالش کریں. آیوڈیکس ملنے کے بعد سنکائی کرنا مضر ہے مالش کرنے کے بعد ایک روئی کا پیڈ یا کپڑا باندھ کر سو جائیں.

درد کو بالکل آرام آجائے تو غفلت سے کام نہ لیں. یہ درد پھر ہو سکتا ہے حفظ ماتقدم کے لیے گردن کی ورزش سے اعصاب ڈھیلے ہو جائیں گے. کچھ عرصے کے بعد ذرا بھاری ورزش کریں. دونوں ہاتھوں کو گردن کے پیچھے کی طرف لے جائیں. دونوں ہتھیلیوں کا کپ بنا کر گردن کو آگے کی طرف جھکانے کی کوشش کریں لیکن خود گردن کو پیچھے کی طرف جھکائیں. یہ رسہ کشی گردن کے اعصاب کو مضبوط بنا دے گی. یوگا ورزشیں بھی مفید ثابت ہوتی ہیں. لیکن یوگا ورزش وہی مفید ثابت ہوتی ہے جس میں گردن کی ورزش شامل ہو. دوسری ورزشیں (مثلاً سر کے بل کھڑا ہونا) مضر ثابت ہو سکتی ہیں.

بعض عورتوں کو کتاب پڑھے بغیر نیند نہیں آتی. اس عادت میں کوئی برائی نہیں، لیکن بستر پر دو تکیے لگا کر آدھا لیٹے اور آدھا بیٹھے اور گھنٹوں گردن کو جھکائے بغیر کتاب پڑھنا اس بیماری کو دعوت دینا ہے کتاب ضرور پڑھیں، لیکن گردن کو ڈھیلا رکھیں اور کبھی کبھی اسے حرکت دیتی رہیں. سنیما دیکھتے وقت کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ بانس کی طرح اکڑا بیٹھا رہتا ہے سنیما کے پردے پر نگاہ جمی ہے تو اس سے بینائی کو نقصان پہنچتا ہے اور گردن سیدھی رہے تو اس میں درد پیدا ہو جاتا ہے. تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سنیما کے پردے سے نگاہیں ہٹا لیں. اگر سین کمزور ہو تو اس فالتو وقت سے فائدہ اٹھائیں. چند سیکنڈ ادھر ادھر دیکھیں. گردن کو ادھر ادھر گھمائیں، اس عادت سے آپ کو فائدہ پہنچے گا.

ایلوپیتھی کے علاوہ ہومیوپیتھی میں بھی گردن کے درد کا علاج مفید ثابت ہو سکتا ہے فیصلہ آپ کے اعتقاد پر منحصر ہے. ■■

نتیجہ
تصویر کا عنوان

بانو اپریل ۱۹۸۵

بانو اپریل ۱۹۸۵ میں سرورق کے اندرونی صفحہ پر دو تصویریں عنوان کے بغیر شائع کی گئی تھیں. جس کا عنوان بانو بہنوں بھائیوں کو تجویز کرنا تھا. اس مقابلہ میں تصویر نمبر ۱ کا عنوان "محبت زندگی ہے" لطیف النساء بیگم. حیدرآباد اور تصویر نمبر ۲ کا سب سے اچھا عنوان "رخصتی کے بعد" سعیدہ معاریہ حیدرآباد نے بھیجا ہے. ان میں ایک کو 'بضعینہ' کے دو پیکٹ، اور نمبر ۲ کو زلفی پاوڈر کے دو پیکٹ بھیجے جا رہے ہیں.

ایم۔ رشید اختر سیوہاری

تاریکی۔ گہری تاریکی، دھیرے دھیرے یہ اندھیرا دھندلکے میں تبدیل ہونے لگا۔ صبح کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ آدھی رات سے جاگتی ہوئی زرینہ کی آنکھیں صبح کے خوش گوار جھونکوں سے بند ہونے لگیں اور وہ پھر سو گئی۔ لیکن جلد ہی امّی کی آواز سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو اُس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ آج اُس کی کیفیت ہی دوسری تھی، ہچکیاں اور سسکیاں تھیں کہ رُکنے کا نام نہ لیتی تھیں، سر جھکا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔ بہت دیر کے بعد اُسے ہوش آیا۔ اس نے جلدی جلدی دوپٹے سے آنسو خشک کئے اور بالوں کو ٹھیک کرتی ہوئی امّی کے پاس چلی گئی۔ برابر کے کمرے میں امّی تلاوت میں مشغول تھیں۔ زرینہ ان کے پاس جا بیٹھی۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے تلاوت ختم کر دی اور قرآن مجید بند کر دیا۔

"بیٹی، دیکھنا ناشتہ تیار ہو گیا ہے؟"

امّی نے قرآن مجید کو جزدان میں لپیٹ کر الماری میں رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

"جی اچھا" زرینہ یہ کہتے ہوئے باورچی خانہ کی طرف چل دی۔ "بُوا، کیا میں تمہاری کچھ مدد کروں؟" اس نے نصیبا بُوا سے بڑی محبت سے پوچھا۔

"نہیں بیٹی، کام ہی کیا ہے۔ آج تو چھ ہی آدمیوں کا ناشتہ ہے۔ روغنی روٹی تیار ہے۔ انڈوں کا خاگینہ بنا رہی ہوں، چائے بھی تیار ہی سمجھو۔ بس تم ذرا ٹرے اٹھا دو، اور بیٹی دیکھنا۔ بھیّا رام لال کے لئے تھوڑے سے نمکین اور میٹھے بسکٹ نکال دینا، شاید وہ ہمارے گھر کے کھانے سے پرہیز کریں۔" نصیبا بُوا ایک ہی سانس میں یہ سب کچھ کہتی چلی گئیں۔

"لو بُوا، یہ لو ٹرے ہے۔ بسکٹ تمہارے پاس ہی نعمت خانے میں رکھے ہیں، کہو تو میں نکال دوں۔" زرینہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"اے بیٹی، خاک مجھے میری یاد ہے۔ میں بھی کیسی بھلکڑ ہوں، خود ہی تو بسکٹوں کے ڈبے شام رکھے تھے اور اب میرے مغز میں ہی نہیں رہا۔ ایسی تو بوڑھی بھی نہیں ہوئی۔ ابھی ہوں گی کوئی ساٹھ کے پیٹے میں۔ وہ تو خدا تمہارا بھلا کرے کہ تم نے گھر میں جگہ دے دی۔ نہیں تو اُن کے مرنے کے بعد پتہ نہیں کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی۔" نصیبا بُوا نے پیالے کلتے ہوئے اپنی الف لیلیٰ چھیڑ دی۔

"اچھا بُوا، میں تو چلی" زرینہ ہنستے ہوئے اندر کی طرف مڑی۔ "تم ناصر کے ہاتھ ناشتہ پہلے باہر بھجوا تا، پھر تم خود اپنے لئے نکال کر ہمارا ناشتہ اندر بھیج دینا۔" زرینہ نے رُک کر ہدایت دی۔ یہ ہدایت آج ہی کے لئے مخصوص نہ تھی بلکہ وہ روزانہ ہی بُوا کی یاد دہانی کراتی کہ پہلے مہمانوں

پھر نوکروں کو اور بعد میں خود اس کے اور
ی کی آنٹی کے لئے ناشتہ بھیجیں اور اس کی اس
یت پر سختی سے عمل بھی ہوتا تھا۔ اُنّی بھی خیال
تی تھیں کہ اس کے خلاف نہ ہونے پائے۔ وہ
بھتی تھیں کہ ان کے اس عمل سے ان کے خاوند
ر مرحوم سلطان احمد صاحب کی روح کو سکون ملے گا
ر ان کی بیٹی خوش ہوگی اور سب سے بڑی بات
ر ان کا خدا خوش ہوگا جس نے زرینہ جیسی بیٹی
ی انہیں عطا کی ہے۔

زرینہ ان کی اکلوتی اور بے پناہ لاڈلی
بچی تھی۔ اس کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی
کے لئے تیار رہتی تھیں۔ اس کے آرام کی خاطر
وہ ہر تکلیف اٹھاتیں۔ اس کی ہر جائز خوشی پوری
رنا گویا ان کا مقصدِ زندگی تھا۔ لیکن ان کی اصل
بت کی دلیل ان کی وہ بہترین تربیت اور تعلیم تھی
جو زرینہ کا کردار بجانے اور سنوارنے میں مددگار
نی تھی۔ صاف ستھری اور سادہ سی نظر آنے
والی زرینہ کسی کو احساس نہ ہونے دیتی کہ وہ کتنے
پانی میں ہے۔ یہ سادگی اور سنجیدگی رابعہ خاتون کی
مرہونِ منت تھی۔ انہوں نے جس طرح لگن اور فکر
کے ساتھ زرینہ کو ایک بہترین انسان کا روپ
دیا تھا وہ صرف ان ہی کا حصہ تھا اور آج وہ
اس میں انسانیت کا درد اور انسان سے محبت
محبت دیکھتیں تو نہال نہال ہو جاتیں۔ ان کی
آنکھیں بھر آتیں اور وہ گود پھیلا پھیلا کر زرینہ
کو دعائیں دیتیں۔

یہ گھرانہ پوری بستی میں فرشتوں کا گھرانہ
مشہور تھا۔ سلطان احمد صاحب مرحوم انسانی عجائبات
میں سے ایک عجوبہ تھے۔ قدرت نے شاید انہیں
انسانی خدمت کے لئے ہی پیدا کیا تھا۔ وہی خون
تھا جو زرینہ میں منتقل ہو کر اُسے انسانیت کی
روح دے گیا تھا۔ زرینہ کو دیکھنے والے بڑے
بوڑھے یہ کہتے تھے کہ وہ سلطان احمد کی تصویر
ہے۔ صورت شکل ہی میں نہیں بلکہ اخلاق و کردار
اور عادات و اطوار میں بھی۔

سلطان احمد صاحب اپنی بستی کے سب
سے بڑے فارمر تھے لیکن ساتھ ہی سب سے
بڑے انسان بھی تھے۔ ان کے طویل و عریض
فارم پر کام کرنے والوں میں بستی کے ہندو مسلمان
اور سکھ سب ہی شامل تھے اور ان میں ہر فرد
ان سے خوش تھا بلکہ اپنی جگہ یہ سمجھتا تھا کہ سلطان
صاحب اس پر زیادہ مہربان ہیں۔ ان کے انتقال
پر پوری بستی کے ہر گھر پر اس طرح غم کے بادل چھا گئے
تھے جیسے وہ اسی گھر کے فرد تھے۔ اور حق یہ ہے کہ وہ
تھے بھی ایسے ہی درد مند دل کے مالک۔ بستی کے
ہر گھر کے غم اور خوشی میں وہ اسی طرح شریک ہوتے
جس طرح گھر کا سرپرست ہوتا ہے۔ ان ہی کا دم تھا
کہ بستی کے کسی فرد کی کوئی پریشانی بستی سے باہر نہ جانے
پاتی تھی۔ آپس کے جھگڑوں اور مقدموں میں صرف
سلطان احمد صاحب کا نام لینا کافی ہوتا اور وہ جو
فیصلہ کر دیتے اُسے بستی کا ہر فرد تسلیم کرتا۔

اسی چاند کا ایک ٹکڑا زرینہ تھی جو رابعہ
جیسی نیک خاتون کی پُرشفقت گود میں پل کر بدرِ کامل
بن گئی تھی۔ ہر زبان پر اس کی دردمندی اور نیکی
کے قصیدے تھے اور ہر دل سے اس کے لئے دعائیں
نکلتی تھیں۔

آج وہی دوسروں کو خوش رکھنے والی زرینہ
غمگین تھی۔ اپنے دُکھ سے نہیں بلکہ پڑوسی کے دکھ
سے وہ روئی تھی۔ اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی غم
تھا بلکہ اس لئے کہ اس کا بھائی، ایک انسان،
اس کا پڑوسی دُکھی تھا۔ پڑوسی جس کا حق سگے بھائی
کی طرح ہوتا ہے۔ جس کے گھر فاقہ ہو تو پڑوسی کے
لئے کھانا حرام ہو جاتا ہے۔

کرپارام کے گھر میں آج سناٹا تھا۔ نہ تو
کی بیوی تلسا کی آواز سنائی دے رہی تھی، نہ بچوں کے
ہنسنے کھیلنے کا شور۔ خود کرپارام بھی گھر میں خاموش
پڑا تھا، ورنہ رات کو سونے سے پہلے اور صبح سے
سویرے وہ گیتا کا پاٹھ ضرور کرتا جس کی آواز زرینہ
بھی سنتی اور یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی کہ یہ لوگ
اپنی سادہ زندگی میں بڑے خوش ہیں۔ انہیں دولت
کی تمنا نہیں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ تارہ جو ایک
کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی کرپارام کے ساتھ تنگی
ترشی سے گزر کرتے ہوئے بھی خوش تھی لیکن جب
زرینہ کو یہ معلوم ہوا کہ تارہ کے ماتا پتا نے صرف اس
لئے تارہ کو اپنے پاس بلا لیا کہ وہ اُسے غریبی میں رہتے
ہوئے نہ دیکھ سکتے تھے تو اس کا دل غم سے پھٹنے لگا
اور وہ رات بھر نہ سو سکی۔

ناشتے کے دوران ہی زرینہ نے ارادہ کر لیا
کہ وہ تارہ کے پتا چندر کانت سے ملنے تلک نگر ضرور
جائے گی اور پھر وہ اُنّی سے اجازت لے کر روانہ
ہو گئی۔

چندر کانت ایک پڑھے لکھے اور سنجیدہ
آدمی تھے۔ زرینہ سے مل کر بڑے خوش ہوئے۔
"تارہ دیوی!" انہوں نے تارہ کو آواز دی۔
تارہ اوپر سے آ کر زرینہ سے لپٹ گئی۔ اس کی
آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے چپکے سے
زرینہ کے کان میں کہا۔ "میری بہن! مجھے میرے گھر
لے چلو، میں اپنے پتی کے ساتھ غریبی میں رہنا چاہتی
ہوں۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہوں گے۔"

زرینہ نے اس کی کمر تھپتھپائی۔ "گھبراؤ نہیں"
اور پھر وہ چندر کانت کی طرف متوجہ ہوئی۔ "چاچا جی
میں بہت تھوڑی دیر کے لئے صرف آپ سے ملنے

ئی ہوں اور آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں ہاں، ضرور کہو بیٹی۔"

"چاچا جی! مجھے میرے پتا جی نے بتایا تھا کہ آپ جو کچھ بھی بنے ہیں وہ پچھلے دس برس میں بنے ہیں۔"

"ہاں بیٹی، تم نے سچ سنا ہے۔ ہم پر دس سال پہلے ایسا بھی سمے بیتا ہے کہ ہمارے گھر میں دوسرے وقت چولہا بھی نہ جلتا تھا۔"

"تو کیا وہ سمے آپ کو اب تک یاد ہے؟" زرینہ نے گویا تعجب سے کہا۔

"ارے بیٹی، اس سمے کو کیسے بھول سکتے ہیں۔" چندر کانت جی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تو پھر کیا وہ خدا جس نے آپ کو اس پریشانی سے نکال کر اس حالت تک پہنچایا، اب بدل گیا ہے؟ کیا اس میں اتنی شکتی نہیں کہ وہ اسی طرح کسی دوسرے کی دشا کو بدل سکے اور اُسے غریب سے امیر کر سکے؟ کیا اس کے لئے صرف آپ ہی ایسے بندے ہیں جن پر وہ یہ مہربانی کر سکتا ہے؟" زرینہ کا لہجہ تیز ہوتا چلا گیا۔

"ارے بیٹی، یہ تم کیسی باتیں کرتی ہو؟" چندر کانت اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "بھگوان کی لیلا نرالی ہے، وہ جس کو چاہے پل بھر میں امیر سے غریب اور غریب سے امیر کر دے۔ اس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ وہ جب دیتا ہے اُسے کوئی روک نہیں سکتا اور جب چھینتا ہے تو کوئی ......" اور اچانک وہ چونک کر زرینہ کی صورت دیکھنے لگے۔

"جی ہاں چاچا جی، آج دولت کے گھمنڈ میں آپ نے اپنی بیٹی کو اس کے پتی سے اور اس کے بچوں کو اُن کے پتا سے الگ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ کیا آپ بھول گئے کہ جو خدا آپ کو غریب سے امیر بنا سکتا ہے وہ کرپا رام کی غریبی کو بھی امیری سے بدل سکتا ہے۔ آپ بھگوان کے بھگت ہو کر بھول گئے کہ وہ سب کا ہے اور سب سے محبت کرتا ہے۔ آپ نے یہ اچھا نہیں کیا چاچا جی!" کہتے کہتے زرینہ کی آواز بھرا گئی اور اس نے مونہہ پھیر لیا۔

ایک منٹ تک چندر کانت سکتے کی حالت میں بیٹھے ایک ٹک زرینہ کو دیکھتے رہے۔ پھر بڑی مشکل سے ان کی زبان سے نکلا۔ "میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوں بیٹی۔ تم جیسے کہو، میں ویسے کرنے کو تیار ہوں۔"

اور پھر دو بچوں کے ساتھ چار آدمیوں کا یہ قافلہ پریم نگر کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔

■■

خیال اپنا اپنا

نتیجہ بانو، جولائی ۱۹۸۵ میں شائع ہوگا

یہ انعامی مقابلہ آپ کو موجودہ دور کے مختلف مسئلوں اور سوالوں کے بارے میں اظہارِ رائے کا موقع اور دعوت دیتا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات اور فکری نتائج دوسروں تک پہنچائیے اور انعام حاصل کیجئے۔

پہلا انعام : سو روپے
دوسرا انعام : پچاس روپے
تیسرا انعام : تیس روپے

اس ماہ کا سوال ہے : **کیا لڑکی کی شادی کم عمری میں کر دینی چاہئے؟**

اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ لفظوں میں اپنے خیالات ہمیں لکھ بھیجئے۔ آپ کی تحریر یکم جون ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جانی چاہئے:

"خیال اپنا اپنا" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیوٹی کارنر

شہناز حسین

گرمیوں میں تروتازہ کیسے رہیں؟!

گرمی کے موسم میں بہت پیاس لگتی ہے۔ جسم سے جتنا پسینہ نکلتا ہے، پانی سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔ پسینے کے ساتھ بدن سے نمک بھی خارج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اس کی تلافی کے لئے نمک کے زیادہ استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔ اگرچہ ایک چمچہ بھر نمک پانی کے ایک گلاس کے ساتھ استعمال کیا جائے تو نمک کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن تازہ تحقیقات کے بعد ڈاکٹر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فالتو نمک کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلڈ پریشر کے مریضوں کو فالتو نمک کا استعمال فائدے کی بجائے اُلٹا نقصان پہنچاتا ہے۔ مارچ، اپریل کے مہینے سے گرمی کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ اس موسم میں پانی کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ ہم گزشتہ شمارہ میں آپ کو پانی کی اہمیت بتا چکے ہیں۔ سردی میں پیاس نہیں لگتی، اس لئے پانی کا استعمال بھی کم ہو جاتا ہے، لیکن آپ کو چاہئے کہ پیاس نہ ہونے کے باوجود پانی کے ۸ گلاس ضرور پئیں۔ گرمی میں اس مشورے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان ایک دن میں عام طور پر اس مقدار سے زیادہ پانی پی لیتا ہے۔

گرمی میں سب سے زیادہ زحمت خشکی سے ہوتی ہے۔ جب گرم ہوا اور لُو چلتی ہے تو فضا میں نمی کا نام نہیں رہتا۔ یہ گرمی اور خشکی انسان کی جلد کے لئے نقصان دہ ہے۔ خشکی سے جلد کی نمی غائب ہو جاتی ہے اور چہرے پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے کمرے میں نمی کی فضا برقرار رکھیں۔ گزشتہ زمانے میں لوگ خس کی ٹٹیاں استعمال کرتے تھے۔ خس کی ٹٹی پر پانی چھڑکنے سے نہ صرف کمرے کی فضا ٹھنڈی اور معطر ہو جاتی تھی، بلکہ نمی بھی برقرار رہتی تھی۔ اب خس کی ٹٹیوں کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ ان کی جگہ کولر نے لے لی ہے۔ کولر بھی اچھی چیز ہے۔ ہوا میں پانی کے ذرات مل کر اسے ٹھنڈا کرتے ہیں اور پانی کی وجہ سے نمی قائم رہتی ہے۔ سخت گرمی میں کولر کا استعمال مفید ہے۔ اگر آپ کولر استعمال کرنے کی وسعت نہیں رکھتیں تو صرف پنکھے سے بھی کام چل سکتا ہے۔ لیکن پنکھا کمرے کی ہوا کو گردش دیتا ہے۔ اس میں نمی پیدا نہیں کرتا۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ کمرے میں پانی کا ایک ٹب یا بالٹی رکھ لیں۔ پنکھے کی ہوا پانی کے ذرات سے مل کر نمی پیدا کر دے گی۔ اگر گھر میں پنکھا بھی نہ ہو تو پانی کی بالٹی یا ٹب پر ہی اکتفا کریں۔ باہر سے آنے والی گرم ہوا اس پانی سے مل کر مرطوب ہو جائے گی۔ گرمی سے پانی کم ہو جائے گا۔ جس

ا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوا میں شامل ہو گئیں۔

ایر کنڈیشنر بہت مہنگی مشین ہے۔ ایک ٹن کا ایر کنڈیشنر ں ہزار روپے سے کم میں نہیں ملتا۔ اور یہ بھی صرف ایک چھوٹا کمرہ ہی ٹھنڈا ر سکتا ہے۔ بڑے کمرے کے لئے ۱½ یا ۲ ٹن کا ایر کنڈیشنر ہونا چاہئیے۔ ں کی قیمت پندرہ ہزار سے بیس ہزار تک ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بلی کا خرچ ۔۔ ا روپے ماہانہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ یر کنڈیشنر خریدنا ہر ایک کی بس کی بات نہیں، کیونکہ اس میں کمرے سے ی کھینچنے کی مشین بھی لگی ہوتی ہے۔ اسے "ڈی ہیومی ڈی فائر" کہتے ہیں۔ رے میں گرمی اور رطوبت کا نام نہ ہو تو بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن یہ چیز لد کے لئے نقصان دہ ہے۔ ایر کنڈیشننگ سے دور رہیں تو اچھا ہے۔

گرمیوں میں باورچی خانے میں داخل ہونا بُرا لگتا ہے۔

باہر لو چل رہی ہو اور اندر چولہے کی آگ ہو تو جی اُلٹ جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ چولہے کے پاس پانی کی ایک بالٹی رکھ لیں۔ ٹب، ناند، برتن، غرض باورچی خانے میں کوئی بھی بڑا برتن ہو، اسے پانی سے بھر لیں۔ اس سے آپ کا کام آسان ہو جائے گا اور آپ کی جلد کو بھی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اگر کمرے میں پانی رکھنے کا انتظام نہیں ہو سکتا تو گملوں سے کام چل سکتا ہے۔ بچوں والے گھر میں پانی کی بالٹی یا ٹب کمرے میں رکھنا درد سر ہے۔ اس کے علاوہ اس سے جگہ بھی گھر جاتی ہے۔ گملے سے نہ صرف کمرے کی نمی برقرار رہتی ہے بلکہ کمرے کی خوب صورتی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اگر کمرے میں دھوپ نہیں آتی تو منی پلانٹ کا پودا لگا سکتی ہیں۔ یہ بغیر دھوپ کے نشو و نما پاتا ہے۔ گملوں میں آسانی یہ ہے کہ انہیں آسانی سے اِدھر اُدھر رکھا جا سکتا ہے۔

گھر میں نوزائیدہ بچہ ہو تو کمرے میں نمی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ گرم اور خشک ہوا سے بچے کی ناک کے نتھنے سوکھ جاتے ہیں۔ گلا خشک ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ اعضا جراثیم کے حملے کو روک نہیں سکتے۔ جراثیم ناک اور منہ کے ذریعے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ بچوں میں بڑوں کی نسبت مدافعت کی طاقت کم ہوتی ہے۔ اس لئے بچے کے کمرے میں نمی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر بچہ آپ کے پاس سوتا ہے تو کمرے میں پانی کی موجودگی آپ دونوں کو فائدہ پہنچائے گی۔ بچے میں جراثیم سے مدافعت کی طاقت پیدا ہو گی اور آپ کی جلد نمی کی وجہ سے ملائم اور لچک دار رہے گی۔

اگر آپ سادہ پانی پینا پسند نہیں کرتیں تو اسے ذائقہ دار بنانے کے لئے اس میں لیموں کا عرق ملالیں۔ بوتلوں میں بند مشروبات بھی ٹھیک ہیں۔ لیکن ہم ان کے زیادہ استعمال کا مشورہ نہیں دے سکتے۔ یہ کافی مہنگے بھی ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو مالی وسعت حاصل ہے تو بوتلوں میں بند مشروبات کے بجائے پھلوں کا رس نکال کر پئیں۔ ہلکی چائے اور کافی بھی ٹھیک ہیں۔ لیکن ان دونوں چیزوں کا زیادہ استعمال مناسب نہیں۔

چہرے کی خوب صورتی کے لئے اس کی صفائی بہت ضروری ہے رات کو سوتے وقت منہ دھو کر سوئیں۔ اگر کلینزنگ کریم نہیں استعمال کر سکتیں تو صابن اور پانی ہی کافی ہے۔ صبح کو اٹھ کر بھی صابن اور پانی سے منہ دھوئیں۔ فالتو نمی حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ صبح کو منہ دھونے کے بعد ایک برتن میں پانی ڈالیں۔ اس میں تھوڑی سی برف ملالیں۔ اب اس پانی میں چہرے کو غوطہ دیں۔ آدھے منٹ تک سانس روک کے رکھیں۔ ایک دو بار ایسا کرنے سے آپ اپنے اندر حیرت انگیز تبدیلی محسوس کریں گی۔ آپ کی جلد کا ڈھیلا پن دور ہو جائے گا۔ آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ جلد کے مسامات سکڑ جائیں گے۔ اس علاج میں اس بات کا دھیان رکھیں کہ پانی بہت زیادہ ٹھنڈا نہ ہو۔ بہت زیادہ ٹھنڈا پانی چہرے پر سُرخ لکیریں پیدا کر دے گا۔

کچھ عورتوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ صبح کو اٹھنے کے بعد ان کی آنکھیں سوجی سوجی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھوں کے نیچے کی جلد میں پانی بھر جاتا ہے۔ یہ سوجن عارضی ہوتی ہے اور گھنٹہ دو گھنٹہ میں خود ہی غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ دو گھنٹے صبر نہیں کر سکتیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ روئی کے دو ٹکڑے لیں اور انہیں ٹھنڈے دودھ میں بھگو لیں اس کے بعد انہیں آنکھوں پر رکھیں۔ دس منٹ میں ہی سوجن دور ہو جائے گی۔ اگر آپ روئی اور دودھ کے جھنجھٹ میں نہیں پھنسنا چاہتیں تو کھیرے کی دو گول قاشیں کاٹ کر آنکھوں پر رکھ لیں۔ یہ علاج بھی چند منٹ میں سوجن سے نجات دلا دے گا۔

چہرے پر کریم لگاتے وقت اس بات کا دھیان رکھیں کہ مالش انگلی کے پوروں سے کریں پورا ہاتھ استعمال نہ کریں۔ چہرے کی جلد ایک نازک شے ہے اس سے کشتی لڑنے کی ضرورت نہیں۔ پورے ہاتھ سے مالش کرنے سے چہرے کی کھال لٹک جاتی ہے اور کھال کے ریشے خراب ہو جاتے ہیں۔ مالش کرتے وقت انگلی کے پوروں کو دائرے کی شکل میں حرکت دیں۔ اوپر سے نیچے کی طرف حرکت نہ دیں اس حرکت سے بھی کھال لٹک جاتی ہے۔ ●●

بزم بانو ؟ !

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دلچسپ جوابات دیتی ہیں۔
ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔
سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں صرف نام لکھنا کافی ہے۔
مدیرہ

بزم بانو
ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ نئی دہلی ۲

کوثر پروین، آسنسول

س: زندگی میں صرف خوشیاں ہی ہوتیں تو؟

ج: پھر تو بس کھانا پینا اور سونا ہی سب سے زیادہ مشکل کام نظر آتا جب تک دنیا میں سب ہی خوش نہ ہوں اکیلا انسان کیسے خوش رہ سکتا ہے؟

س: کیا انسان مر کر بھی زندہ رہتا ہے؟

ج: پتہ نہیں مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے شاید اصل زندگی کا لطف مرنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے! اور پھر انسان مر جاتا ہے۔ مگر انسان اسی رفتار سے پیدا بھی ہوتا ہے۔ کون جانے مرنے کے بعد ہی اصل زندگی شروع ہوتی ہو۔

خان عبدالسلام جائسی، امروہہ

س: انسان اپنی زندگی کو بوجھ کب سمجھتا ہے؟

ج: انسان ذہنی طور پر جب تک کم سن ہوتا ہے زندگی بڑی بوجھل معلوم ہوتی ہے ذرا سی بات پر مر جانے کو جی چاہتا ہے پھر ان دکھوں کا چٹخارہ پڑ جاتا ہے اور بوجھ عزیز از جان ہو جاتا ہے۔

س: انسان اپنی نظر میں کب گر جاتا ہے؟

ج: جب وہ کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جس کا دوسروں کو پتہ نہیں ہوتا اور بدی کی سزا انہیں ملتی جن کے ساتھ دغا کی ہو وہ صدق دل سے پیار کرتے ہیں تب ذہن پر جوتے برسنے لگتے ہیں

محمد مغیث احمد، پٹنہ

س: انسان کو دلی سکون کب ملتا ہے؟

ج: موت کے بعد۔ شاید ویسے سکون بازار میں نہیں ملتا۔ ذہنوں میں پرورش پاتا ہے۔ ایمانداری سے اپنی زندگی کی تنقید ضروری ہے۔

س: آپ کی نظر میں سب سے بڑا دشمن انسان کا کون ہوتا ہے؟

ج: ماحول۔ اور سب سے بڑا دوست بھی۔ رشتہ دار، پڑوسی، دوست احباب، درسگاہیں سلیقے بھی پہلے بھی سیاسی اور اقتصادی حالات بھی۔ لیکن جینے والے کا اس میں اپنا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔

محمد الیاس عروج، امروہہ

س: کیا ہر بیوی اپنے شوہر کو شک بھری نظروں سے دیکھتی ہیں؟

ج: وہ بیوی جس کا شوہر ہی اسکا اکلوتا سہارا ہوتا ہے۔ وہ ہر دم ڈری سہمی رہتی ہے کہ کم بخت چھوڑ کر کسی اور کے پنجے میں نہ پھنس جائے ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ قابل رحم ہیں ایسے شوہر جنہیں بیویوں کا بس چلے تو صندوق میں بند کر کے رکھیں۔ اگر شوہر ہاتھ سے نکل جائے تو الزام بھی تو بیوی ہی جھیلتی ہے۔ اس لئے مالِ عرب پیشِ عرب بنا کے رکھتی ہے۔

س: احساسِ برتری عورتوں میں زیادہ ہوتا ہے یا مردوں میں؟

ج: جنہیں دنیا برتر مانتی ہے وہ عورت مرد دونوں ہی خود پرست ہوتے ہیں بڑے لطف کی بات ہے کہ جو احساسِ کمتری کے شکار ہوتے ہیں وہی اپنی برتری جتاتے ہیں۔ غور سے مطالعہ کیجئے معلوم ہو جائے گی اصلیت۔ جب بھی کوئی بڑھ چڑھ کر ڈینگیں مارے سمجھ لیجئے ستو تھا چپٹا باجے گھنا۔"

س: آج [illegible] آپ کے قریبی دوستوں میں سے تھے؟

ج: جی ہاں، ان کی بیگم سے بھی میری بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کی بہن تو پڑوسن تھیں۔ ہر بزم کا آنا جانا تھا۔ اور رشتہ داروں سے بھی اچھے مراسم تھے۔ ویسے سب ہی ادیب اور شاعر میرے لئے رشتہ داروں سے بڑھ کر تھے اور اب بھی ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی، گجراتی، مراٹھی اور سندھی کے ادیبوں سے بھی میل جول ہے۔ لکھنے والوں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں سے میل جول رکھے۔

میرے پوتوں نواسوں کی عمر کے بچوں سے بھی میری بڑی دوستی ہے۔ ان سے بے تکلفی سے باتیں کرنا، تاش کھیلنا انہیں سمجھنا پہچاننا ہی میرا مشغلہ ہے۔ اور پیشہ بھی۔ اور خطوں کے ذریعہ کچھ آپ سے بھی سوالوں کے بہانے جان پہچان ہو جاتی ہے۔

التمش ربانی، ماریس کورٹ

س: کیا ہم کسی کے قلبی کیفیات تک پہنچ سکتے ہیں؟

ج: یہ تو آزمانے کے بعد ہی فیصلہ ہو سکتا ہے جسے تلاش ہوتی ہے وہ پا ہی لیتا ہے کہتے ہیں دل سے ہی دل کے حالات معلوم کئے جاتے ہیں۔

س: انسان عالم حیرت کے مقام کو کب پہنچتا ہے؟

ج: جب ہی چاہے۔ ویسے صبح اخبار کھول کر پہلے صفحے پر نظر پڑتے ہی عالم حیرت میں پہنچا جا سکتا ہے عیرت زدہ ہونے پر کوئی ٹیکس تو نہیں دینا پڑتا۔

رحیم النساء بخشی، بنگلور (کرناٹک)

س: انسان گناہ کو جانتے ہوئے بھی گناہ کیوں کرتا ہے؟

ج: دنیا میں گناہ اور ثواب کی ناپ تول کے لئے کوئی پیمانہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔ کوئی ایک روٹی چرانے پر جیل بھگتتا ہے کوئی کروڑوں چرا کر بھی دیا دھرم کا ٹھیکہ دار بن جاتا ہے۔

س: بچپن میں پیار مفت ملتا ہے جوانی میں پیار چرانا پڑتا ہے تو بڑھاپے میں؟

ج: بڑھاپے میں مفت تقسیم کرنا پڑتا ہے۔

س: کون سی حرکت بنتے کام کو بگاڑ ڈالتی ہے؟

ج: اپنی کوئی غلطی مگر زیادہ تر زیادہ طاقت ور کم زور کا کام بگاڑ کر اپنا اُلو سیدھا کرتا ہے۔

خان عبدالسلام جائسی، محلہ قریشی امروہہ

س: کیا لڑکی کی ہر ادا کے پیچھے مکر و فریب پوشیدہ ہوتا ہے؟

ج: یہ تو وہی بتا سکتا ہے جو لڑکیوں کی اداؤں پر ریسرچ کر رہا ہو۔ لڑکیاں مکر و فریب میں بھی لڑکوں کے مقابلہ میں پچھڑی ہوتی ہیں۔ چور، ٹھگ، گرہ کٹ عورتیں زیادہ نہیں ہوتیں۔ اس میدان میں مردوں کی تجتی ہے اخباروں میں زیادہ تر مرد ہی عورتوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

س: انسان کی زندگی کا کون سا پہلو سب سے زیادہ حیران کن ہوتا ہے؟

ج: انسان کی زندگی اس ماحول سے بنتی [illegible] بڑھتا ہے اور [illegible] حیرانیاں پریشانیاں بھی ملتی ہیں اور مسرتیں بھی۔ زندگی کا ہر موڑ انجان اور اچانک لگتا ہے۔ اگر تجربے کے طور پر آپ کسی کی زندگی کا گہرا مطالعہ کریں تو اس کے افعال پر حیران نہیں ہوں گے۔ اس کے رویئے زندگی کا مقابلہ کرنے کا انداز صاف بتا دے گا کہ وہ کیا ہے کیسا ہے۔ پھر حیران نہ ہوں گے۔

امتیاز علی نصرت، پداپلی، کریم نگر

س: کیا تدبیروں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں؟

ج: اور کیا حماقتوں سے تقدیریں بدل سکتی ہیں۔ خدا نے اپنی نشان دار دنیا بندوں کو بخشی، عقل اور سمجھ دی۔ مکمل آزادی دی۔ پیغمبر بھیجے۔ اس کے بعد بھی انسان جانور بنا ہے تو تقدیریں کیسے بدل سکتی ہیں۔

س: انسان کا سچا ساتھی کون ہے؟

ج: عقل اور جانکاری۔ عقل مند بگڑے کام بنانے کی ترکیب تو سوچنے کی طاقت تو رکھتا ہے اور علم اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ عقل مند انسانوں نے دنیا کو خدا کی رحمتوں سے فیض یاب ہونا سکھایا۔ مشینیں ایجاد کیں۔ جو لوگ غلامی کی زنجیروں میں بندھے انسان کرتے تھے آج مشینیں کرتی ہیں۔

عزیزہ سعدیہ بہن!
سال نامہ ملا۔ سب سے پہلے تمہارا سفرنامہ پڑھا اور منہ سے بے ساختہ واہ نکلا۔ اچھی معلومات ہیں اور صاف ستھرا دل نشین انداز بیان مجھے بے حد پسند آیا۔ تمہارے انداز بیان نے تو متاثر ہی نہیں، مسخر بھی کر لیا۔ سفرنامے کا اختتام جس والہانہ انداز سے کیا ہے، اس سے تو میرا دل جھوم اٹھا۔ اب تک دو تین مرتبہ پڑھ چکی ہوں۔ امید ہے آئندہ بھی تمہاری ایسی خوب صورت تحریریں پڑھنے کو ملیں گی۔

ہاجرہ نازلی بمبئی

بے حد پیاری سعدیہ:
کل دوپہر کو کام سے دہلی تو بانو کا سال نامہ ملا۔ بے حد اچھا لگا۔ تمہارا سفرنامہ بہت اچھا لگا۔ سفر کی روداد تم سے سن بھی چکی تھی، مگر پڑھنے میں اور بھی مزہ آیا تمہارے لکھنے کا انداز بہت خوب صورت ہے۔
دل چاہتا ہے کہ تمہیں مبارک باد دوں مگر مبارک باد تو ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔ اتنی بہت سی محبت کے لئے بس دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ تم کو ہر خوشی دے۔

شکیلہ، الہ آباد

میری پیاری سعدیہ:
بانو کا سال نامہ ملا۔ اسے پاتے ہی میں اس کی دلچسپیوں میں کچھ اس طرح کھو گئی کہ اپنا دکھ بھی بھول گئی۔ جب سے دہلی سے آئی ہوں، بیمار رہوں۔ کان میں تکلیف ہے اور اس کی وجہ سے چکر آتے ہیں۔
پچھلے دنوں تو طبیعت بہت خراب تھی۔ اب دو تین دن سے کچھ ٹھیک ہے

سال نامہ کا گیٹ اپ اچھا لگا۔
تمہارا سفرنامہ دلچسپ ہے لکھنے کا طریقہ بھی پسند آیا۔ عصمت آپا کی کہانی پڑھی۔ ایک دو شاعروں کا کلام پڑھا سب اچھے ہیں۔ کہانیاں دو ایک پڑھیں۔ ایک دم نہیں پڑھ سکی ہر جگہ الجھا تا ہے پورا سال نامہ پڑھ لوں گی تو تفصیل سے رائے لکھوں گی۔

جمیلہ مجیب علی گڑھ

ڈیئر باجی:
سال نامہ دیکھ کر یہ کہاوت میرے لئے سچ ثابت ہو گئی کہ صبر کا پھل میٹھا ہے۔ اس سے پہلے مجھے یہ حقیقت جاننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ سال نامہ دیکھتے ہی انتظار میں جو مصیبت اٹھائی تھی جیسے اس کا صلہ مل گیا۔ پورا سال نامہ جب پڑھ لوں گی تو رائے ضرور لکھوں گی۔ بانو کو سنوارنے، سجانے اور خوب صورت بنانے میں کوئی آپ سے سلیقہ سیکھے۔ خوب سے خوب تر کی جو تلاش ہے، نسوانی جریدوں کے سلسلے میں وہ صرف بانو دیکھ لے۔ خدا اس کو نظر بد سے بچائے۔

جویریہ صدیقی حیدرآباد

ڈیئر باجی:
بانو کا سال نامہ اپنی خاص جدت کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ یقیناً بانو کو خواتین کا بہترین رسالہ کہا جا سکتا ہے۔ مزہ تو یہ ہے کہ خواتین کے علاوہ حضرات بھی اسے اتنے ہی ذوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے حسن سے متاثر رہتے ہیں۔ سال نامہ میں مضامین نظم و نثر کا انتخاب خوب ہے مگر نہ جانے کیوں ان کی ترتیب نہیں جچی۔ کچھ تخلیقات جن کو پہلے جگہ دی جانی چاہئے تھی۔ انہیں پیچھے دھکیل دیا گیا ہے بہرحال اتنا خوب صورت سال نامہ نکالنے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

انیس ساجدہ سبزواری گیا

سعدیہ صاحبہ:
بانو کا شاندار سال نامہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بے حد سجا سجایا خوب صورت کمال کرنا کوئی آپ لوگوں سے سیکھے۔
آپ کا سفرنامہ دلچسپ ہوتے

ہوئے پُر از معلومات بھی ہے۔ عصمت آپا
کی کہانی ان کے طرز کی منفرد کہانی ہے۔
رام پال ساٹھ برس کے ہوگئے، وقت
دبے پاؤں گزر جاتا ہے اور ہمیں احساس
بھی نہیں ہوتا۔ "بھگوان اور خدا" کتنا پیارا
پیارا مضمون ہے۔ رام پال کو مبارک باد
قیصر تمکین کو مدت کے بعد بانو کے صفحات
پر دیکھا۔ باجرہ شکور سے بھی ملاقات ہوگئی
بھئی خوب کیا بات ہے۔ عبدالغنی شیخ نے
محنت سے لکھا اور اچھا لکھا۔
رفیعہ منظور الامین، کیفی اعظمی،
گربچن سنگھ، محسنہ جیلانی، جیلانی بانو ــــ
کس کس کی تعریف کروں۔
فیاض اختر، بمبئی ۲۰

عزیز بہن:
طویل انتظار کے بعد سالنامہ اپنی
تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔
سرورق قابلِ تعریف ہے اور افتتاحیہ بھی
سالنامہ کی ساری تخلیقات معیاری ہیں۔
ایم مبین کا افسانہ "دیوی" قابلِ تحسین ہے۔
قاضی انصار نے اپنی نظم "سمجھوتا" میں مختصر
لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی کا سرمایہ
فراہم کرنے کی کوشش میں یقیناً کامیابی حاصل
کی ہے۔ پسندیدہ شعر میں انیس فاطمہ بمبئی
کا انتخاب کردہ شعر بہت عمدہ ہے۔
یونس ندیم، دُبلڑانہ)

محترمہ:
اس مرتبہ ایک طویل مدت کے بعد
سالنامہ شائع ہوا ہے۔ لیکن مقامِ مسرت
ہے کہ یہ بھی ان ہی دیرینہ شان دار روایات
کا حامل ہے جو گزشتہ خاص نمبروں کا طرۂ
امتیاز رہا ہے۔ اپنے ظاہری حسن و دل کشی اور
یہ شمارہ لاجواب مضامین نظم و نثر کے لحاظ
سے یہ نمبر بھی انتہائی جاذبِ نظر اور مسحور کن
ہے۔ میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔
کشور، سہارنپور

محترمہ:
آپ کی ان تھک محنتوں کا ثمر "بانو"
سالنامہ ۱۹۸۵ ہماری امیدوں کے عین
مطابق ہے۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔
ایس ایم یوسف، الہ آباد

سعدیہ صاحبہ:
"بانو" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا پڑھ کر
دل باغ باغ ہوگیا۔ اس شمارے میں نامور
قلم کاروں کی تخلیقات کو دیکھ کر بانو کی مقبولیت
کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ناچیز کا ایک مشورہ
ہے کہ آپ اپنے افتتاحیہ کو کتاب کی
شکل دیں تو یہ ایک قابلِ قدر کارنامہ ہوگا۔
افتتاحیہ کی بدولت زندگی گزارنے
کے مفید مشورے ہمیں حاصل ہوتے
رہتے ہیں۔
رحیم انور، کامارڈی

محترمہ:
مارچ کا شمارہ نظر نواز ہوا حسبِ معمول
تمام مضامین معیاری تھے عطیہ پروین کا
افسانہ "نافرمان" بہت پُر اثر ہے۔ کاش
سب لڑکے ایسے ہی ہوجائیں تاکہ لڑکیاں
جہیز کی بھینٹ چڑھنے سے بچ سکیں۔
مسرور جہاں کا افسانہ "دو نعمتیں" پڑھ کر کچھ
عجیب سا محسوس ہوا۔ آخر زینوبیہ کی ساس
نے اس کو زہریلی دوائیاں پلادی، جب کہ
ان کے درمیان جہیز کے بارے میں کبھی کوئی
تلخ کلامی بھی نہ ہوئی تھی اور نہ اس کی ماں
جہیز کم لانے پر اس سے ناخوش تھی۔
"تبسم" اور "میرا پسندیدہ شعر"
اچھے کالم ہیں۔ قارئین یقیناً ان کا پُرجوش
خیر مقدم کریں گے۔
قاضی تنویر احمد، علی گڑھ

مائی ڈیر۔
سالنامہ بانو ملا شکریہ۔ اس بار
افتتاحیہ بہت ہی خوبصورت ہے مبارک
قبول فرمائیے۔ آج کل عورت بہت کمزور ہوتی جا
رہی ہے یہ مرد کا زمانہ ہے عورت ہمیشہ سے ہی بدنصیب
ہے۔ بانو میں تمام افسانے اچھے ہیں ہمیں صرف
آپ سے ایک ہی شکایت ہے کہ ہم کو بانو وقت
پر نہیں ملتا۔ بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔
شمیم سلطانہ، پیاری سلطانہ، گنٹور

سعدیہ صاحبہ!
سالنامہ ملا شکریہ! سچ مچ سالنامہ
بے حد حسین ہے اس کی تعریف کرنا گویا آفتاب
کو دیا دکھانا۔ یہ آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے
کہانی "گناہ کی تلافی" "سات دریا آگ کے"
"پیاس تپتے دریا کی" وغیرہ بے حد پسند آئیں
سب ہی کچھ تو اچھا لگا کس کس کو بتاؤں غرض
سارا سالنامہ ہی خوب صورت ہے۔
قمر سلطانہ، سیتاپور

ڈیر ایڈیٹر صاحبہ:
سالنامہ بہت خوب صورت ہے سالنامہ
نہ ملنے کی کئی سال کی تھکاوٹ دور ہوگئی۔ ہمیں
اُمید ہے کہ اب آپ ہر سال اس روایت کو
قائم رکھیں گی۔
عظمیٰ، رام پور

باورچی خانہ

مستاوا (ایران)

چاول : ۵۰۰ گرام
چنے کی دال : ۲۵۰ گرام
قیمہ (سینا موٹا) : ۵۰۰ گرام
لال مرچ : ایک چائے کا چمچہ
دھنیا : ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر : ۲ عدد
دہی : آدھی پیالی
پودینے کی پتیاں : (سوکھی) ایک چائے کا چمچہ
لہسن : ۲ جوے
پیاز : (درمیانہ سائز) ایک ڈلی
گھی : آدھی پیالی
نمک : حسب ذائقہ

چاول کو اور دال کو صاف کر کے تین گھنٹے کے لئے علیحدہ علیحدہ بھگو دیں۔ دہی کو پھینٹ لیں۔ قیمہ کو دھو لیں، ٹماٹروں کو دھو کر کچومر کاٹ لیں، پیاز اور لہسن کو چھیل لیں پیاز کے لچھے کاٹ لیں اور لہسن کو لمبائی کے رُخ سے باریک باریک کاٹ لیں۔

ایک دیگچی میں پیاز کے لچھے اور گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز بادامی ہو جائے تو لال مرچ، دھنیا، نمک اور پاؤ پیالی پانی ڈال کر مسالہ بھون لیں پھر قیمہ ڈال دیں۔ قیمہ گل جائے تو ٹماٹر ڈال دیں ٹماٹروں کا پانی بھن جائے تو آنچ سے اتار لیں۔

ایک دیگچی میں دال اور دال چاول گلنے کے اندازکا پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ دال ادھ گلی ہو جائے تو چاول اور نمک ڈال دیں دونوں چیزیں گل جائیں تو آنچ سے اتار لیں پھر اس میں دہی ڈال کر اچھی طرح ملا دیں۔

ڈش میں چاول نکال لیں پھر اس پر قیمہ پھیلا کر ڈال دیں قیمہ پر پودینے کی پتیاں چھڑک دیں۔

فرائنگ پان میں باقی کا گھی اور لہسن ڈال کر آنچ پر رکھ دیں لہسن بادامی ہو جائے تو گھی سمیت ڈش میں ڈال دیں اور گرم گرم کھائیں

گوانیز پٹیٹو (گوا)
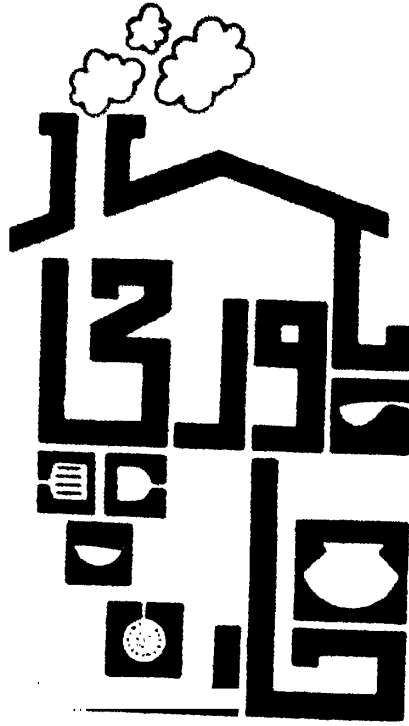
آلو : ایک کلو
ٹماٹر : ۳۰۰ گرام
مٹر : ۵۰۰ گرام
ناریل (تازہ) : آدھا
لال مرچ (ثابت) : ۱۲ عدد
دھنیا : ۲ چائے کے چمچے
خشخاش : ۲ چائے کے چمچے
دارچینی : ۲ ٹکڑے
لونگ : ۳ عدد
کالی مرچ : ۴ عدد
لہسن : ایک چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانہ سائز) : ۲ ڈلی
گھی : حسب ضرورت
نمک : حسب ذائقہ

آلوؤں کو چھیل کر دھو لیں پھر چار چار ٹکڑے کر لیں۔ ٹماٹروں کو دھو کر چار چار ٹکڑے کر لیں۔ مٹر کے دانے نکال لیں۔ ناریل کو کدوکش کر لیں۔

کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی ہلکا سا گرم ہو جائے تو آلو ڈال دیں آلو بادامی ہو جائیں تو گھی سے نکال لیں اور کڑھائی کو بھی آنچ سے اتار لیں۔

فرائنگ پان میں تین ٹیبل اسپون گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں پھر اس میں لال مرچ، دھنیا، خشخاش، دارچینی، لونگ اور کالی مرچ ڈال کر دو چار منٹ بھون لیں۔ پھر آنچ سے اتار کر سل پر باریک پیس لیں پھر اسی فرائنگ پان میں مزید دو ٹیبل اسپون گھی اور ناریل ڈال کر دو چار منٹ بھون لیں پھر اس کو بھی الگ سل پر باریک پیس لیں۔

مٹر کو ابال لیں۔ پیاز کو بغیر چھیلے آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز کا اوپری چھلکا کالا ہو جائے تو آنچ پر سے ہٹا لیں، پیاز ٹھنڈی ہو جائے تو جلا ہوا اوپر کا چھلکا اتار دیں اور پیاز کو سل پر

ترتیب:-

رشیدہ خاتون

پیس لیں۔

ایک دیگچی میں ٹماٹر اور پانچ پیالی پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں ٹماٹر گھل جائیں تو آنچ سے اتار لیں تھوڑے ٹھنڈے ہو جائیں تو چھلنی میں چھان کر گودا اور پانی رکھ لیں پھوک پھینک دیں۔

ٹماٹروں کے پانی میں تمام پسی ہوئی چیزیں ڈال کر اچھی طرح ملا لیں، اس میں لہسن اور نمک ڈال کر آنچ پر رکھ دیں، دو چار منٹ بعد آلو اور مٹر ڈال دیں پھر دو چار منٹ بعد آنچ سے اتار لیں۔

اسپینش رائس (اسپین)

چاول : ۳۰۰ گرام
فرانس بین : ۱۰۰ گرام
آلو : ۱۰۰ گرام
گاجر : ۱۰۰ گرام
مٹر کے دانے : ۱۰۰ گرام
پنیر : ۴ ٹیبل اسپون
ٹماٹر : (درمیانہ سائز) ۳ عدد
دہی : ۲ ٹیبل اسپون
لونگ : ۴ عدد
کالی مرچ : ۴ عدد
لال مرچ : ۱۰ عدد
دار چینی : ۲ انچ کا ٹکڑا
پیاز (درمیانہ سائز) : ایک ڈلی
لہسن : ایک چائے کا چمچہ
گھی : ۸ ٹیبل اسپون
نمک : حسب ذائقہ

چاولوں کو دھو کر دو گھنٹے کے لئے بھگو دیں پھر نمک ڈال کر ابال لیں فرانس بین کو دھو کر باریک باریک کاٹ لیں آلو اور گاجر کو چھیل کر دو دو سینٹی میٹر کے چوکور ٹکڑے کر لیں پھر آلو، مٹر، گاجر اور فرانس بین کو تھوڑا نمک ڈال کر ابال لیں۔

آدھے ٹماٹروں کا کچومر کاٹ لیں باقی کے ٹماٹروں کے پتلے پتلے گول قتلے کاٹ لیں۔ لال مرچ کو ایک دو منٹ بغیر گھی کے بھون لیں پھر کالی مرچ، لونگ اور دار چینی کے ساتھ سل پر تھوڑا پانی ڈال کر باریک پیس لیں۔ پنیر کو کدوکش میں کس لیں۔ پیاز چھیل کر باریک کچومر کاٹ لیں۔

ایک دیگچی میں پانچ چھ ٹیبل اسپون گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ ایک دو منٹ بعد اس میں پسے ہوئے مسالے، دہی، لہسن اور تھوڑا نمک ڈال کر دو چار منٹ بھون لیں پھر سبزیاں ڈال کر دو چار منٹ بھونیں، پھر چاول ڈال دیں اور مزید دو چار منٹ بھون کر آنچ سے اتار لیں۔

ایک بیکنگ ڈش میں باقی کا گھی مل دیں پھر اس میں پکے ہوئے چاول ڈال کر پھیلا دیں، چاولوں پر ٹماٹر کے قتلے پھیلا دیں پھر ان پر پنیر چھڑک دیں پھر ڈش کو دس منٹ کے لئے گرم اوون میں رکھ دیں پھر اوون سے نکال کر گرم گرم ہی کھانے کے لئے پیش کر دیں۔

امریکن چوپ سوئے (چائینز)

نوڈلز : ۲۰۰ گرام
بند گوبھی : ۵۰۰ گرام
فرانس بین : ۱۵ عدد
گاجر : ۲ عدد
پیاز : (درمیانہ سائز) ۲ ڈلی
اجینو موتو : ایک چائے کا چمچ
سرکہ : پونی پیالی
چینی : آدھی پیالی
کورن فلور : ۲ ٹیبل اسپون
سویا ساس : ڈیڑھ ٹیبل اسپون
ٹماٹو کیچپ : ۴ ٹیبل اسپون
چلی ساس : ڈیڑھ چائے کا چمچ
ریفائنڈ آئل : حسب ضرورت
نمک : حسب ذائقہ

سبزیوں کو دھو کر گاجروں کو چھیل لیں پھر ان کو پاؤ سینٹی میٹر موٹا اور چار چار سینٹی میٹر لمبا کاٹ لیں۔

نوڈلز کو نمک کے پانی میں ابال لیں، پھر اس کے تین حصے کر لیں۔ ایک حصہ نوڈلز الگ رکھ لیں دو حصہ نوڈلز کو تیز گرم گھی میں کراری کر کے نکال لیں۔

ایک دیگچی میں سرکہ، چینی، کورن فلور، سویا ساس، ٹماٹو ساس، اور تھوڑا سا نمک ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ ساس گاڑھا ہو جائے تو آنچ سے اتار لیں۔

ایک دیگچی میں چار ٹیبل اسپون آئل اور سبزیاں ڈال کر تیز آنچ پر رکھ دیں۔ دو چار منٹ بعد اس میں ساس، ابلی ہوئی نوڈلز، چلی ساس اور پیاز ڈال دیں۔ دو چار منٹ بعد آنچ سے اتار لیں پھر فوراً ہی آدھی تلی ہوئی نوڈلز ڈال کر خوب اچھی طرح ملا لیں۔

ایک پھیلی ہوئی ڈش میں تیار نوڈلز یا چوپ سوئے نکال لیں پھر اس پر باقی کی تلی ہوئی نوڈلز پھیلا کر ڈال دیں۔

دیس بدیس کی خبریں

بڑی لڑکی ہونے کا نتیجہ

مدھیہ پردیش کے رتلام ضلع میں ایک انوکھا قبیلہ آباد ہے۔ یہ رتلام کے علاوہ منڈسور میں بھی آباد ہے۔ اس قبیلہ کی ایک عجیب رسم یہ ہے کہ بڑی لڑکی کو طوائف کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ باچھڑا کہلاتا ہے۔ اس بات کا اب تک پتہ نہیں چلا کہ اس رسم کی ابتدا کب ہوئی۔ لیکن گھر کی بڑی لڑکی اپنی قسمت پر شاکر ہوتی ہے وہ آسانی سے یہ پیشہ قبول کرلیتی ہے، غالباً صدیوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ گھر کی دوسری لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے۔ وہ اپنی گرہستی سنبھالتی ہیں۔ ایسے خاندان کی تعداد تقریباً پندرہ ہزار ہے۔

باچھڑا لوگوں کا یہ رواج دور دور تک مشہور ہے۔ یہ اپنی بڑی لڑکی کی قربانی دینے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ شرم کی بات تو دور رہی، انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس رواج کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شہروں سے قحبہ خانوں کے دلال یہاں آکر اپنا ڈیرہ ڈال دیتے ہیں۔ وہ لڑکی کے ماں باپ سے لڑکی کا سودا طے کرکے اُسے اڑا لیتے ہیں۔ یہ لڑکی اپنے علاقے میں رہے یا کسی شہر میں چلی جائے خاندان سے اس کا تعلق برقرار رہتا ہے، بھائی بہنوں کی شادی ہو یا کوئی تیج تیوہار ہو بڑی بہن اس میں ضرور شرکت کرتی ہے۔ گھر والے اس کی ایسی ہی آؤ بھگت کرتے ہیں جیسے کوئی لڑکی سسرال سے میکے آئی ہو۔ اُسے اپنے پیشے سے کوئی اُلجھن نہیں ہوتی، نہ اس کی عزت اور احترام میں کوئی فرق آتا ہے۔

منڈسور کے سیاسی لیڈر اس رواج کو ختم کرنا چاہتے ہیں، ان کی کوشش ہے کہ اسمبلی میں اس رواج کے خلاف قانون پاس کیا جائے اور بڑی لڑکی کو طوائف بننے پر مجبور کرنا قانوناً جرم قرار دیا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں ان کی کوشش بے کار ثابت ہوئی۔ آج تک ان کو کوئی عرضی موصول نہیں ہوئی جس میں لڑکی نے خود اس رواج کے خلاف آواز اُٹھائی ہو۔ جب عورتیں خود اس رواج سے مطمئن ہیں تو قانون بنانا بے کار ہے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ انہیں رواج کی برائیوں سے آگاہ کیا جائے اور ان میں ذہنی اور سماجی بیداری کی جائے۔

باچھڑا لوگوں میں ناجائز بچوں کی تعلیم بھی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ اسکول کا فارم بھرنا ہو تو باپ کے خانے میں کیا لکھا جائے۔ ان بچوں نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ باپ کے خانے میں بھی ماں کا نام بھر دیا جائے۔

دُنیا کا پہلا ہوٹل جو کمپیوٹر سے چلتا ہے

ہندوستان کے ۵ اسٹار ہوٹلوں میں ملازموں کی بھرمار ہوتی ہے۔ بعض ہوٹلوں میں ان کی تعداد مسافروں سے دُگنی ہو جاتی ہے، اس سے ہوٹل کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ملازم کی تنخواہ کم ہوتی ہے لیکن جن ملکوں میں تنخواہیں بہت زیادہ ہیں وہ اپنا کام مشین سے چلاتے ہیں۔

حال ہی میں جاپان کی راجدھانی ٹوکیو میں ایک ایسا ہوٹل کھلا ہے جس کی تمام ضروریات کمپیوٹر سے پوری ہو جاتی ہیں۔ اس ہوٹل کا نام "شین جوکو واشنگٹن" ہے۔ اس کی ۲۵ منزلوں میں دو ہزار سے زیادہ کمرے ہیں۔ ایک سنگل کمرے کا کرایہ ۳۰۰ روپے ہے۔ جب آپ اس ہوٹل میں داخل ہوتے ہیں تو اس کا دروازہ خودبخود کھل جاتا ہے۔ ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد کوئی کلرک، بیرا یا منیجر دکھائی نہیں دیتا۔ صرف کمپیوٹروں کی قطار نظر آتی ہے۔ جب آپ ایک کمپیوٹر کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو ٹیلی ویژن اسکرین پر ایک عورت کی تصویر نمودار ہوتی ہے جو آپ کو خوش آمدید کہتی ہے۔ اگر آپ کا کمرہ پہلے سے بک ہے تو آپ اپنا بکنگ نمبر کمپیوٹر میں ڈال دیتے ہیں اور کمپیوٹر سے ایک پلاسٹک کارڈ باہر نکل آتا ہے۔ یہ آپ کے کمرے کی چابی ہے۔ اگر آپ نے کمرہ پہلے سے ریزرو نہیں کرایا تو آپ کمپیوٹر سے سوال کرسکتے ہیں۔ ایک بٹن دبانے سے اسکرین پر ہوٹل کے خالی کمروں کی تفصیل اور کرایے کے متعلق معلومات درج ہو جاتی ہیں۔ آپ حسب ضرورت اپنے کمرے کا انتخاب کرسکتے ہیں لیجیے آپ کی بکنگ ہوگئی۔

دوسرا مرحلہ کمرے کی قیمت ادا کرنے کا ہے۔ کمرے کا کرایہ پیشگی لیا جاتا ہے۔ کرایے کے علاوہ کچھ زائد رقم بھی پیشگی لی جاتی ہے۔ آپ کی ٹیلیفون کال، کھانے یا شراب کا خرچ اس میں سے وضع ہو جاتا ہے۔ قیمت ادا کرنے کے لئے ہوٹل کا اپنا کریڈٹ کارڈ ہوتا ہے۔ اگر اس کارڈ کو کمپیوٹر میں داخل کر دیں تو ادائیگی قبول کرلی جاتی ہے۔ اگر آپ نقد روپیہ دینا چاہیں تو ایک مشین نقد روپیہ بھی لیتی ہے۔ یہ مشین نوٹ کی رقم پڑھ کر آپ کو باقی رقم واپس

بانو نئی دہلی

کر دیتی ہے۔ یہ مرحلے طے کرنے کے بعد آپ اپنے کمرے میں جاتے ہیں۔ دروازہ مقفل ہے۔ اس مشین سے حاصل کیا ہوا پلاسٹک کارڈ داخل کریں تو دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے، اس تمام کارروائی میں ۴۵ سیکنڈ لگتے ہیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنا پلاسٹک کارڈ بستر کے پاس لگے ہوئے کمپیوٹر میں ڈال دیں تو سارے کمرے میں بجلی آجاتی ہے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فریج، ایر کنڈیشنز، سب چلنے لگتے ہیں، کمرے سے باہر نکلیں تو کارڈ مشین سے نکالتے ہی ساری بجلی آف ہو جاتی ہے۔ اس طرح بجلی کا خرچ بھی بچتا ہے۔ کمرے کے فریج میں سے کوئی کولڈ ڈرنک یا شراب نکالیں تو فوراً مشین آپ کے بل میں رقم جمع کر لیتی ہے۔ ہوٹل میں آپ کے قیام کی مدت ختم ہو جائے تو آپ مشین سے اپنا بل مانگتے ہیں۔ مشین فوراً یہ بل مہیا کرتی ہے۔ آپ روپیہ ادا کرتے ہیں تو مشین سے آپ کو نہ صرف باقی رقم مل جاتی ہے بلکہ ہوٹل کے فارم پر چھپی ہوئی رسید بھی!

جب آپ ہوٹل خالی کر دیں تو آپ کے کمرے کا کوڈ نمبر فوراً تبدیل ہو جاتا ہے، اب آپ پرانے کارڈ سے اپنے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دو ہزار کمروں کے اس ہوٹل میں صرف ۱۳۰ ملازم ہیں اور وہ بھی صرف ہوٹل کی عمارت کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

محبت کی سزا: ۲۲ سال قید

میری کی عمر ۶۳ سال ہے۔ آج سے ۲۴ سال پہلے اس کے خاوند کا انتقال ہوا تو اس کی دماغی حالت بگڑ گئی۔ اس کے گھر میں دو لڑکیاں تھیں جب میری نے چیخنا چلّانا شروع کیا تو لڑکیاں گھبرا گئیں۔ انہوں نے ایک رشتے دار سے مشورہ طلب کیا تو اس نے میری کو پاگل خانے بھیجنے کا مشورہ دیا۔ لڑکیوں کو [illegible] تھی۔ انہوں نے پاگل خانے کے متعلق کہانیاں سن رکھی تھیں کہ وہاں مریضوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے ہیں، وہ اپنی ماں کو وہاں کیسے بھیج دیں؟ لڑکیوں کے ایک دوست نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اسے ایک کرسی سے باندھ دیں۔ لڑکیوں نے اس کے مشورہ پر عمل کیا اور اپنی ماں کو ایک کرسی کے ساتھ باندھ دیا۔ اس طرح وہ گھر میں توڑ پھوڑ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کرسی پر ہی کھانا کھاتی، وہیں پیشاب پاخانہ کرتی اور وہیں سو جاتی۔ اسی طرح سات سال گزر گئے۔

جب لڑکیوں کی شادی ہو گئی تو انہیں اپنے خاوندوں کے ساتھ دوسرے شہر جانا پڑا۔ یہ لوگ ارجنٹائن کی راجدھانی بیونس آئرز کے پاس رہتے تھے۔ اب انہیں نقل مکان کر کے شمالی ارجنٹائن جانا تھا۔ انہوں نے اپنی ماں کو بھی ساتھ لیا اور دوسرے شہر جا کر بس گئیں۔ اس شہر میں جو مکان ان کو ملا وہ بہت چھوٹا تھا، اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ ایک ٹوٹی پھوٹی بس کو جو اُن کے مکان سے ۱۰۰ گز کے فاصلے پر کھڑی تھی، میری کے کمرے میں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے ماں کو بس کی ایک سیٹ سے باندھ دیا۔ وہ اسے وقت پر کھانا دیتی تھیں، وقفے وقفے سے اس کے کپڑے بھی تبدیل کرا دیتی تھیں۔ اس طرح ۲۲ سال گزر گئے۔ کسی کو اس بات کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ پڑوسی اکثر بس میں سے آتی ہوئی خوفناک آوازیں سنتے تو یہی سمجھتے کہ کوئی کتّا یا جنگلی جانور بس میں گھس گیا ہے، لیکن ایک دن ایک پڑوسی ہمت کر کے بس میں داخل ہو گیا۔ وہاں کا نظارہ دیکھتے ہی وہ خوف زدہ ہو کر باہر نکل آیا۔ بس میں جا بجا باسی روٹیاں، گندے کپڑے اور پیشاب پاخانہ پڑا تھا۔ اس کی بو ۱۰۰ گز تک پہنچتی تھی۔

بانو نبی دہلی

اس پڑوسی نے پولیس کو [illegible] نے میری کی رسیاں کھولیں تو وہ کرسی سے کھڑی نہ ہو سکی۔ ۲۰ سال سے بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی تھی۔ پولیس اسے اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹر حیران تھے کہ میری ۲۰ سال تک کس طرح زندہ رہی۔ انہوں نے میری کو اسپتال میں داخل کر دیا۔ جہاں اس کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ علاج معالجے کے بعد اس کی طبیعت کو قدرے سکون ہے۔ پولیس نے میری کی لڑکیوں کے خلاف کیس درج نہیں کیا۔ انسان کو اس طرح باندھ کر رکھنا جرم ہے۔ لیکن لڑکیوں کے اس عمل کے پیچھے محبت کارفرما تھی۔ وہ اپنی ماں سے جدا ہونا نہیں چاہتی تھیں، اسے پاگل خانے نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔

جب ٹخنہ گھٹنا بن گیا

امریکہ کی میڈیکل ہسٹری میں اس وقت ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جب ایک ۱۱ سالہ لڑکی جوڈی کی ٹانگ ران کی جگہ جوڑ دی گئی۔ جوڈی کی ران کی ہڈی گل گئی تھی لیکن اس کی ٹانگ کی ہڈی سلامت تھی۔ عام حالات میں ڈاکٹر جوڈی کی ران کا بایاں حصہ کاٹ دیتے اور اس کی جگہ مصنوعی ٹانگ لگا دیتے لیکن مشکل یہ آپڑی کہ مصنوعی ٹانگ گھٹنے سے پاؤں تک جوڑی جاتی ہے۔ ران سے پاؤں تک مصنوعی ٹانگ لگانا ممکن نہ تھا۔ ادھر جوڈی کی ٹانگ کی ہڈی ٹھیک تھی۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ جوڈی کی ٹانگ کاٹ کر اسے ران کی جگہ جوڑ دیا جائے۔ یہ آپریشن نو گھنٹے تک جاری رہا۔ اس درمیان جوڈی کی ٹانگ جسم سے ۹۰ منٹ تک علیحدہ رہی۔ ڈاکٹروں نے ران کی ہڈی نکال کر اس کی جگہ ٹانگ کی ہڈی جوڑ دی۔ اس طرح ٹخنے گھٹنے بن گئے اور گھٹنے سے نیچے مصنوعی ٹانگ لگا دی گئی۔ یہ آپریشن اپنی قسم کا پہلا آپریشن تھا۔

بیس ہزار

روپے

انعامات

پہلا انعام: بارہ ہزار روپے نقد

یا ایک ۵۱ سینٹی میٹر کا رنگین ٹی وی

اور تین ہزار روپے نقد

دوسرا انعام: آٹھ ہزار روپے

پہلا انعام بالکل درست حل پر : بارہ ہزار روپے، دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر : آٹھ ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معمّوں کے نقد ناموں کے ذریعہ ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ اور ہر حل پر صحیح انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معمّوں کی دوسری تمام شرطیں شمع مینی معمّوں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ : ہفتہ یکم جون ۱۹۸۵ء تا شام چھ بجے تک

پیر، ۳۔ جون ۱۹۸۵ء کو پانچ بجے سہ پہر تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کرتے جائیں گے۔

شمع مینی معمّہ نمبر ۱۱۴

ب			ٹھ			
ے	ا	س		پ		
	ج	م	ک		ن	
ا	ا	ی		و		ک
س	س		ی		ا	
ی		ح	س	ط		
		ا		ت	ع	ا

اشارے

اُوپر سے نیچے :

۱۔ دل لگا کر ـــــ بھی غالب بھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب مجھے

۲۔ جب تک ماتحت اپنا کام ٹھیک ـــــ کرتے رہیں افسران کو دخل نہیں دینا چاہیے

۳۔ بیوقوفی سے کام بگڑ جائے گا۔ جہاں ـــــ سے کام نہ نکلے وہاں

۴۔ ہزار جتن کرنے کے بعد بھی ہوتا وہی ہے جو قسمت کا لکھا ہے۔ انسان ـــــ ہے

۵۔ پھیلنے دو ـــــ اور خوب پھیلنے دو۔ حالات خراب ہوتے ہیں تبھی انقلاب آتا ہے

دائیں سے بائیں :

۶۔ نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں "لو نام نہ ـــــ کا مرے آگے"

۷۔ لالہ جی سے روپے پیسے کی بات ـــــ تو سن لیتے ہیں۔ ویسے بہرے بنے رہتے ہیں!

۸۔ ہندوستان نے روس اور امریکہ دونوں سے ـــــ امداد تو حاصل کی لیکن کسی طاقت کو اپنے معاملات میں دخل انداز ہونے نہیں دیا

۹۔ یہ ستارے ایک فلم میں کام کرنے کا لاکھوں روپے تو معاوضہ لے لیتے ہیں۔ پھر ـــــ کے نخرے دکھاتے ہیں

۱۰۔ کسی نہ کسی پر تو ـــــ کرنا ہی پڑتا ہے۔ زندگی میں

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔
آپ ہر حل پر انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔

★ فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ۔

★ صرف دس اشارے

★ انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معمّوں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

★ صحیح حل : جوابی لفافہ بھیج کر منگوائیے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھیے۔

★ شمع مینی معمّہ نمبر ۱۱۴ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور جولائی ۱۹۸۵ء کے ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

شمع ادبی معمّے (شمع مینی معمّہ نمبر ۱۱۴) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی

شمع مینی معمّہ نمبر ۱۱۴ کا صحیح حل : بدھ ۵۔ جون ۱۹۸۵ء کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہ نامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع، جولائی ۱۹۸۵ء میں بھی شائع کی جائیں گی۔

Registered with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 741/57 Regd. No. D(C) 1

افتتاحیہ

انسان کی انسانیت وہی پہچان سکتا ہے جس کے پاس خود انسانیت ہو۔ خدا نے انسان کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے والی قوت عطا فرمائی ہے۔ خدا نے انسان کو نہ محض مجبور بنایا ہے، نہ مختارِ مطلق بلکہ اس کے پاس جتنی بھی سمجھنے اور پڑھنے کی قوت ہوگی اُتنی ہی آسانی سے وہ دوسروں کو پرکھ سکے گا۔ اگر ہم چاند اور سُورج کی روشنی کو بھی دیکھنا چاہیں گے تو ہمارے پاس آنکھ کی روشنی ہونی چاہیے۔ جس انسان کے پاس اپنی قابلیت نہیں ہوگی وہ دوسروں کو نہیں پہچان سکتا۔

چشم پیدا کُن کہ بینی آشکار

اللہ کا نور ہر جگہ موجود ہے۔ اور اگر یہ نور ہمیں نظر نہیں آتا تو قصور ہماری نظر اور قلب کی سیاہی کا ہے۔

ذکرِ الٰہی رُوح کی غذا، حمد و ثنا رُوح کی شراب اور حیا رُوح کا لباس ہے۔ انسانی دماغ عقل کا مرکز ہے۔ اور دل مرکزِ محبت۔ اور آنکھ مرکزِ حیا ہے۔ اِن مرکزوں کو انسان دُرست کرلے تو وہ چشم بینا عطا ہوگی جس سے اللہ کا نور بھی نظر آئے گا اور انشاءاللہ حقائق سے پردہ اُٹھے گا۔

سعدیہ دہلوی

بہ یادگار: یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر: شمیم آزاد دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اڑتیسواں سال، ۴۶۰ واں شمارہ
عام شمارے کی قیمت: چار روپے
سالانہ قیمت: اڑتالیس روپے

مقامِ اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس: 3161601 SHMA IN
ٹیلی فون: 279066, 279067, 279068
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان: شمع میگزینز 277053, 276956
طابع و ناشر: یونس دہلوی

ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس، دہلی
مطبوعہ: روبی پرنٹنگ پریس، دہلی

خرید کر پڑھئے : مانگ کر پڑھئے : یا پھر چوری کر کے پڑھئے

یہ ہے ہی اتنا خوب صورت،

تنا دل کش،

تنا مکمل کہ اسے

سی طرح بھی حاصل کریں

یونکہ یہ فیض کی شخصیت اور فن

ر ایک شان دار ادبی دستاویز ہے

اس میں شامل ہیں:

قیمت :
پندرہ روپے

★ خلوت اور جلوت کے بھید کھولنے والے ذاتی نقوش۔

★ نادر و نایاب تصویریں۔ ★ سدا بہار، ہزار رنگ و منتخب کلام۔

★ فیض کی شخصیت کے وہ ڈھکے چھپے گوشے جن پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا گیا ہے۔

★ ہندوستان، پاکستان، رُوس اور انگلستان کے دانش وروں کی مشترکہ کاوشوں کا گلدستہ۔

ساری اُردو دنیا میں شبستان کے "فیض نمبر" کا چرچا ہے

اس سے پہلے کہ اسٹاک ختم ہو جائے آج ہی اپنے قریبی نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہِ راست ہم سے منگوائیے۔

شبستان اُردو ڈائجسٹ آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

الوداع ابّا حضور....

مرحوم حافظ محمد یوسف دہلوی کو خراجِ عقیدت

الله بخشے میرے دادا ابا کو جیسے
گاڑی کا ہارن بجتا ہمارا گھر بچوں کی آوازوں
سے گونج اٹھتا "ابا آگئے، ابا آگئے"
ہوئے سب بچے ان کے کمرے
میں پہلے ہی سے گھس جاتے۔ ابا داخل ہوتے
سب سے پہلے اپنی الماری سے چاکلیٹ
نیاں نکال کر سب بچوں کو اپنے ہاتھوں
سے بانٹتے — صبح گھر کا ہر بچہ ابا کو سلام
کرکے اسکول جاتا۔ ابا کی سائیڈ ٹیبل پر
تفسیروں کی لاٹ کھڑی ہوتی۔ ہم سلام کرکے
ٹھنی اٹھا کر اسکول کے لئے بھاگ جاتے
اسی طرح ہم نے چھوٹی سی عمر سے بزرگوں
کو سلام کرنے کی عادت اختیار کی یہ گھر کی
روایتیں میری بھتیجیوں یعنی ابا کی پرپوتا پوتی
تک چلتی رہی۔

ابا کو ہم بچوں کی شرارتیں اور ان
کے میں کھیلنا کودنا اور شور مچانا
بے حد پسند آتا۔ بلکہ جب امی ڈیڈی
ہمارے شور سے گھبرا کر ہمیں باہر کھیلنے کے
لئے کہتے تو ابا ان کو منع کرتے تھے ہم بچوں کو
اور غل غپاڑہ کرنے دیتے۔ کتنی اور
بھی باتیں یاد رہی ہیں جیسے کبھی اگر ہماری
آنکھ کھل جاتی تو صبح فجر کے وقت ابا کی تلاوت
قرآن شریف سے گھر گونج رہا ہوتا۔

وقت کی پابندی آپ کی زندگی کا ایک اہم
اصول تھا۔ گھر سے وہ ٹھیک پونے نو بجے
نکل جاتے۔ ان کے جانے اور آنے کے
وقت سے ہم گھڑی ملا سکتے تھے۔ چاہے
کچھ بھی ہو جاتا۔ آپ کے اصولوں اور وقت
کی پابندی میں فرق نہ آتا۔ تیز بخار میں
بھی ابا کو وقت پر جاتے دیکھا ہے
وہاں جا کر وہ آرام کر لیتے۔ لیکن گھر روزانہ کے
معمول کے مطابق واپس آتے۔ کسی نکاح
ولیمہ میں یا کسی اور تقریب میں بتائے ہوئے
ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے۔

لیکن ہمارے ہندوستان میں

ابا، بڑے بھائی (نعیم) چھوٹے بھائی (وسیم) اور میں (سعدیہ دہلوی)

ابّا ہمارے ابّا زندگی کے ساتھ

وقت کی اتنی قدر کہاں۔ ابّا جب پہنچتے تو کبھی ہال میں جھاڑو دی جا رہی ہوتی اور کہیں بریانی دم لے رہی ہوتی۔ ابّا کچھ دیر بیٹھ کر واپس لوٹ آتے اور میزبان کو کہلوا بھیجتے کہ ان کی شرکت ہو چکی ہے۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ تقریب تین سال پہلے ہمارے شمع دفتر کی بلڈنگ میں آگ لگ گئی تھی۔ نیچے کی منزل سے شعلے اٹھ رہے تھے اور پوری بلڈنگ کی بجلی جا چکی تھی۔ فائر بریگیڈ آگ بجھا رہے تھے۔ اور ہم خود اس کی سیڑھی سے نیچے اترے۔ سارے دفتر میں کھلبلی مچی ہوئی تھی لیکن ابّا بالکل اطمینان سے اپنے کیبن میں بیٹھے ہوئے موم بتی کی روشنی میں اپنا کام کرتے رہے۔ اللہ پر ان کو پورا بھروسا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے وقت کے مطابق نیچے اترے۔

اب یہ سب باتیں سوچتے ہوئے دل اداس سا ہے اور ایک عجیب سا کھوکھلا پن محسوس ہو رہا ہے۔ ہمارے پیارے دادا جو ہم سب کو اتنا چاہتے تھے جن کے وجود سے ہمارے گھر کی خیر و برکت اور رونق قائم تھی۔ وہ ستون وہ سایہ دار درخت اب نہیں رہا۔

ہمیں یہ احساس ہے کہ ہم آج جو کچھ بھی ہیں اپنے دادا کی حوصلہ افزائی اور دعاؤں کی بدولت ہیں۔ جب بھی ہم نے کوئی نیا کام کیا تو ابّا کا ہاتھ اپنے سر پر ضرور رکھوایا اور ہماری کامیابیوں پر ابّا گھر میں مٹھائی ضرور بانٹتے۔ خاص طور پر ہمارے لکھنے اور پڑھنے کی عادت سے ابّا بہت خوش ہوتے۔ اسکول کے زمانے سے ہی ہم ابّا کی طرح صحافی بننے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ شوق کی انتہا اس عمر میں یہاں تک پہنچی کہ ایک روز اپنا جیب خرچ جمع کر کے ہم چپ چاپ ایک کرائے کا ٹائپ رائٹر گھر لے آئے۔ سوچتے ہیں تو کل ہی کی بات لگتی ہے جب اس روز ہم اپنے کمرے میں ٹائپ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اور ابّا وہاں سے گزرے پل بھر کے لئے اس وقت جب ابّا نے ہمیں غور سے دیکھا تو ہم گھبرا گئے تھے کہ اب ڈانٹ پڑی لیکن ابّا نے ہمارے قریب آ کر ماشاءاللہ کہا۔ پیٹھ ٹھونکی اور ہم کو ایک نیا ٹائپ رائٹر دلوانے کا وعدہ کیا۔ وہ اکثر مذاق میں کہتے "کاش یہ لڑکا ہوتی تو سارا دفتر سنبھال لیتی"۔ لڑکی ہونے کے باوجود انہوں نے ہمارے ہر کام پر حوصلہ افزائی کی۔ اور چند سال پہلے جب ہم نے دفتر میں بیٹھنا شروع کیا تو ابّا نے ہمیں پھولوں کا ہار پہنایا۔ انہیں ہمارے شوق کا احساس تھا اور وہ ہمیں اپنے جدوجہد کے قصے سنایا کرتے۔

ابّا کی کامیابی میں ان کی محنت، ایمانداری اور قوتِ ارادی شامل تھی۔ ابّا عالم گیر شہرت کے مالک تھے۔ اس کے باوجود ہم نے ان کو ہمیشہ سادہ زندگی گزارتے دیکھا انہیں کبھی شہرت کی تلاش نہ تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کے چند ہی گھنٹے بعد بی بی سی کی عالمی سروس میں اردو کے لئے ابّا کی خدمات کو سراہا گیا۔

ان کے انتقال کی خبر آل انڈیا ریڈیو اور ٹی۔ وی کے ذریعہ دور دور تک پھیل گئی ملکی اور غیر ملکی اخبارات نے ابّا حضور کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ راشٹرپتی ذیل سنگھ اور مرکزی وزیرِ اطلاعات نے ان کی وفات پر گہرے افسوس کا اظہار کیا۔ دنیا کے کونے کونے سے ہم سب کے نام ہمدردی کے فون، تار، ٹیلکس اور تعزیت نامے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ابّا حضور ان سب سے بے پروا ہیں۔ وہ ہم سب کو اس رمضان المبارک ۴ ۲ مئی بروز جمعہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

ہم اللہ میاں سے دعا کرتے ہیں کہ ابّا حضور کو جنت الفردوس میں مقام اعلیٰ عطا فرمائے۔ اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

سر بانو

حمد آباد کے شعلے کب رد ہوں گے

پچھلے کچھ عرصے سے گجرات میں ہر شخص ایک دوسرے کو مار رہا ہے۔ اونچے طبقے کے لوگ نیچے طبقے کے لوگوں سے لڑ رہے ہیں۔ درمیانی طبقے کے لوگ اونچے طبقے کے لوگوں سے جلن حسد رکھے ہوئے ہیں اور ان کے خلاف ہیں۔ ہندو مسلم آپس میں لڑ رہے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر طرف ایک افراتفری مچی ہوئی ہے۔

اب یہ بڑھتے بڑھتے ایک بڑے فساد کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ہر طرف خون خرابا، مار دھاڑ، لوٹ کھسوٹ، غرض جدھر دیکھیے ادھر خون ہی خون ہے۔ اخباروں کی سرخیوں میں مرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

آج کل احمدآباد میں صورت حال بہت پیچیدہ، بہت نازک، بہت سنگین ہے۔ اینٹی ریزرویشن تحریک کی آڑ میں احمدآباد میں بعض اپوزیشن لیڈر فرقہ واریت کو ہوا دے کر قومی مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بے گناہ لوگ مارے جا رہے ہیں۔ املاک تباہ ہو رہی ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب اینٹی ریزرویشن تحریک وزیر اعلیٰ کو برطرف کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اینٹی ریزرویشن تحریک آج سے ۵ سال پہلے بھی گجرات میں چلائی گئی تھی۔ گجرات سرکار نے پسماندہ طبقوں کے لئے ریزرویشن میں اضافے کا فیصلہ اب کافی عرصہ پہلے ملتوی کر دیا تھا۔ پھر بھی اس

پولیس پر سے اعتماد اُٹھ جانے کے بعد احمد آباد فوج کے پہرے میں

اضافہ کے خلاف چلائی جانے والی تحریک
جاری رہی۔ اس کے ساتھ تشدد کا دور بھی
جاری رہا۔ تحریک سے وابستہ متعدد ا
جن میں طلباء بھی شامل تھے، گرفتار کر لئے
گئے۔ یہ گرفتاریاں تحریک کی بدامنی کی شکل
اختیار کر لینے کے بنا پر ہوئی تھیں مگر انہیں
تحریک جاری رکھنے کا بہانہ بنا لیا گیا۔ بعد
اس تحریک میں جونیئر ڈاکٹر بھی شامل ہو گئے
جن کو حکومت نے برطرف کر دیا۔ اس کے بعد
حکومت نے ریزرویشن کے مخالفوں کے
کچھ مطالبات مان بھی لئے، جو طلباء گرفتار
ہوئے تھے، انہیں رہا کر دیا مگر پھر بھی یہ تحریک
جاری ہے۔ اس کے ساتھ گجرات میں سرکاری
ملازموں نے بھی غیر معینہ مدت کے لئے
ہڑتال کر دی ہے۔ احمد آباد کے علاوہ دیگر
کئی مقامات پر بھی آتش زنی، لوٹ مار،

ایک دکان کو، ایک روزی کے ذریعہ کو فسادیوں نے ملیا میٹ کر دیا

شہر کے وسط میں کرنجا پولیس اسٹیشن کے بالکل قریب ایک گھر کو زمین بوس کر دیا گیا

سل وغارت گری کی واردا تیں ہو رہی ہیں۔
ب آپس میں بھی لڑنے مرنے لگے ہیں۔
سادیوں پر قابو پانے کے لئے جابجا آنسو گیس
کے گولے چھوڑے جا رہے ہیں، گولیاں
پلائی جا رہی ہیں، شرپسندوں نے دُکانیں
وٹ لی ہیں، مکانوں کو آگ لگائی ہے۔
تقریباً پانچ ماہ سے یہ لڑائی چل رہی ہے
مرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔
سپتال زخمیوں سے بھرے پڑے ہیں۔
احمد آباد اور ریاست کے دوسرے
علاقوں میں پولیس کی زیادتیوں کے خلاف
جلوس نکالے جا رہے ہیں۔ کرفیو کے باوجود
کئی علاقوں میں آگ لگائی گئی اور زبردست
پتھراؤ کیا گیا ہے۔ شرپسند اپنی حرکتوں سے
باز نہیں آ رہے ہیں۔ تباہی کے اس طوفان سے
نہ صرف احمد آباد بلکہ گجرات کے دوسرے

بربادی کے دیو کا ناچ

مشتعل اسٹوڈنٹس یونین کے صدر اما کانت کی جیپ ہائی کورٹ کے پاس شعلوں میں لپٹی ہوئی

حصّوں کے لوگوں کو بھی زبردست مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ احمد آباد میں یہ فرقہ وارانہ تصادم اور گروہی تصادم بڑے پیمانے پر لوٹ مار اور بربادی کا سرچشمہ بن رہے ہیں۔

ایسی حالت میں احمد آباد کو فوج کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ غیر معیّنہ مدّت کے لئے کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ اس سے حالات سدھرنے کی کچھ امید ہو چلی ہے۔ یوں بھی چونکہ اینٹی ریزرویشن تحریک چلانے والوں کے مطالبات مان لئے گئے ہیں، اس لئے اب اس تحریک کا کوئی جواز نہیں رہ گیا ہے۔ کچھ لوگ حکومت کے ساتھ گفت و شنید کرنے کو تیار ہیں مگر طلبا کے ساتھ کچھ لیڈر تحریک جاری رکھنے اور اسے گجرات سے باہر تک پھیلانے پر زور دے رہے ہیں۔

یہ لڑائی تو ایک نہ ایک دن بند ہو جائے گی (اور سب کی دعا ہے کہ جلد از جلد بند ہو جائے) لیکن یہ سوچنے کا مقام ہے کہ جن لوگوں کے گھر تباہ ہو گئے، جو بچے یتیم ہو گئے، جو عورتیں بیوہ ہو گئیں، جن کے گھر اور کاروبار آگ کی لپیٹ میں آ گئے، ان بے چاروں کا کیا ہوگا؟ آئے دن کسی نہ کسی شہر میں یہ ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا اثر پوری قوم اور پورے ملک پر پڑتا ہے۔ یہ ہنگامے ملک کی جڑیں کمزور کر دیتے ہیں۔ کیا تشدد کے اس طوفان کو فنا کرنے کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی؟ ○○

نیشنل اسٹوڈینٹس یونین کے صدر اماکانت کو پولیس مارنے پیٹنے کے بعد پولیس وین میں ڈال کر لے گئی

سنسان سڑکوں پر فوج کی گشت

جہاں جہیز کی چیزوں کا استعمال گناہ ہے!

انور احمد

ہندوستان میں جہیز کی رسم صدیوں سے موجود ہے۔ آج کل جہیز کا موضوع زیادہ اہم بن گیا ہے۔ جہیز نہ ملنے پر بہو کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اخباروں میں آئے دن عورتوں کے جلا دینے کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ حکومت نے جہیز پر پابندی لگا دی ہے لیکن یہ صرف قانونی کارروائی ہے۔ جہیز مانگنے کی رسم آج بھی موجود ہے۔ آیئے، ہم آپ کو ہندوستان کے ایک ایسے خطے میں لے چلتے ہیں جہاں جہیز کی رسم ایک مختلف شکل میں پائی جاتی ہے۔

ہندوستان کے جنوبی علاقے میں چیٹی ذات کے لوگ رہتے ہیں۔ یہ لوگ بنئے ہیں۔ ان کا پیشہ تجارت ہے۔ چیٹی لوگ جنوبی ہند کے کئی ضلعوں میں پائے جاتے ہیں، لیکن ایک علاقہ جہیز کی عجیب و غریب رسم کے لئے مشہور ہے یہ لوگ نالو کوٹائی ناگار تھار چیٹی کہلاتے ہیں۔ ہندوستان کے سب سے پہلے وزیر خزانہ سر شان مو کھم چیٹی تھے۔ ایک افواہ کے مطابق انہوں نے اپنی وزارت کے زمانے میں ایک کروڑ روپے کا نفع کمایا تھا جس کے نتیجے میں ان کو حکومت سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔

چیٹی زیادہ تر دیہات میں رہتے تھے — ہندوستان کی بے روزگاری اور غربت کو دیکھتے ہوئے یہ لوگ تجارت کے لئے سیلون برما اور ملایا جاتے تھے۔ جب وہاں سے روپیہ کما کر یہ ہندوستان واپس آتے تو گاؤں میں اپنی شان دکھانے کے لئے بڑے بڑے گھر بناتے۔ ان گھروں میں ایک خاص بات یہ ہوتی تھی کہ یہ چھوٹے اور بڑے دو قسم کے کمروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ بڑے کمرے رہائش کے لئے ہوتے تھے اور چھوٹے کمرے جہیز کے برتن جمع کرنے کے لئے۔ جی ہاں، لڑکی کے پیدا ہوتے ہی یہ لوگ جہیز کا سامان جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آج کل شہروں کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ لوگ دیہات چھوڑ کر شہر کا رُخ کر رہے ہیں۔ چیٹی بھی شہروں میں منتقل ہو گئے۔ لیکن شہر کے مکانوں میں اتنی گنجائش کہاں کہ چیٹی لڑکی کا جہیز اس میں سما سکے۔ اس لئے اب یہ لوگ خود تو شہر میں رہتے ہیں اور گاؤں کا مکان جہیز کے سامان سے بھرا رہتا ہے

چیٹی خاندان کی عورتیں بڑی کفایت شعار اور سوجھ بوجھ کی مالک ہوتی ہیں۔ وہ نہ سینما جاتی ہیں اور نہ ریسٹورنٹ میں دعوتیں اڑاتی ہیں۔ وہ نئے فیشن کے کپڑے بھی نہیں سلواتیں غرض فضول خرچی ان کو چھو کر بھی نہیں جاتی۔ ان کو بس ایک ہی شوق ہے، ان کے روپیہ کا بس ایک ہی مصرف ہے، اور وہ ہے جہیز کا سامان خریدنا۔ یہ سلسلہ تمام عمر چلتا رہتا ہے۔ بازار میں کوئی نئی قسم کا برتن آیا تو اُسے جھٹ خرید لیا۔ میکسی، اوون، چولہا۔ غرض جو نئی چیز بازار میں فروخت ہونے کے لئے آئی، چیٹی عورت اسے فوراً خرید لیتی ہے۔ برتن خواہ وہ پیتل کے ہوں یا ایلومینیم کے، درجنوں کی تعداد میں خرید لئے جاتے ہیں۔ یہ سامان گاؤں کی حویلی کے چھوٹے کمروں میں بند رہتا ہے۔ برتنوں کے علاوہ گھر کے استعمال کی دوسری چیزیں، مثلاً پلنگ کی چادریں، کمبل، تکیے اور پلنگ پوش بھی سامان کے ذخیرے میں آتے ہیں۔ گھڑیاں، ریڈیو سگرٹ لائیٹر — جو الم غلم بازار میں ملا سے خرید لیا اور گاؤں کی حویلی میں بھجوا دیا۔ وہاں یہ سامان خاک دھول میں اٹا پڑا رہتا ہے۔ اس کے باہر نکلنے کا موقع شادی کے قریب ہی آتا ہے۔

شادی کے موقع پر لڑکی والے گاؤں پہنچتے ہیں۔ نانی، دادی، خالہ، پھوپھی اور ان کے بچے بھی لڑکی والوں کی مدد کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ کیوں نہ ہو آج ساری عمر کی محنت کا پھل ملنے والا ہے۔ سمدھیانے والوں کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔ لڑکی کی رشتہ دار عورتیں حویلی کے کمرے کھولتی ہیں۔ برتنوں سے خاک دھول صاف کی جاتی ہے۔ انہیں دھو مانجھ کر چمکایا جاتا ہے۔ ایک کمرے میں پیتل کی تھالیاں ہیں تو دوسرے میں پتیلیاں ہی پتیلیاں۔ کپڑوں کو دھوپ لگائی جاتی ہے۔ کمبل کو کیڑا لگ گیا تو اسے دل پر پتھر رکھ کر کوڑے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ ایک کمرے میں بجلی کا سامان تو دوسرے میں سوٹ کیسوں کا انبار۔ کچھ سامان نمائش کے قابل نہیں ہوتا اسے فروخت کر دیا جاتا ہے اور اس کے بدلے دوسرا سامان خرید لیا جاتا ہے۔ دو چار دن میں یہ سب کام انجام پا جاتا ہے۔ مکان کی جھاڑ پونچھ کرنے کے بعد برتنوں کی قطار لگ جاتی ہے۔ بس نمائش تیار ہے۔ رشتے داروں کو دعوت نامے بھیجے جاتے ہیں اور وہ مقررہ دن بسوں میں بیٹھ کر گاؤں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں دوپہر کا کھانا پیش کیا جاتا ہے اور شام کی چائے بھی۔ لڑکے کی ماں اور اس کے دوسرے رشتہ دار لڑکے کو ملنے والے جہیز کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ لڑکے کی ماں خوش ہے کہ اس کے ہونہار بچے نے کتنا جہیز کمایا ہے۔ لڑکی کی ماں خوش ہے کہ اس کی زندگی بھر کی محنت

ٹھکانے لگ گئی۔

اسی نمائش میں رشتہ دار اور دوست احباب بھی ہوتے ہیں۔ یہاں عورتیں اپنے سامان کا میزبان کے سامان سے مقابلہ کرتی ہیں۔ کوئی کہتی ہے "ارے تم صرف ۱۲ پتیلیاں دے رہی ہو؟ میں نے ۱۵ دی تھیں۔ تمہارا فرنیچر کتنا معمولی ہے۔ میری بہن نے ساگوان کا فرنیچر دیا تھا!" جس عورت نے اپنی لڑکی کو کم جہیز دیا تھا، وہ حسد کی آگ میں جلتی ہے۔ جس نے زیادہ دیا تھا وہ خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ غرض تمام دن ایک ہنگامہ رہتا ہے۔ جس طرح نمائش میں لوگ ہر اسٹال پر جاکر چیزیں دیکھتے ہیں، اسی طرح یہ لوگ ہر کمرے کا سامان دیکھتے ہیں اور ساتھ میں دعوت بھی اڑاتے ہیں۔

خدا خدا کر کے شادی کا دن آتا ہے اور یہ سارا جہیز لڑکی کے گھر سے لڑکے کے گھر منتقل ہو جاتا ہے۔ پلنگ ایک ہوتا ہے، لیکن پلنگ کی چادریں ۱۵ ہوتی ہیں۔ اگر ڈبل بیڈ ہے تو ۱۰ تکیے بھی ہوتے ہیں۔ پرانے شیفر اور پارکر کے قلم، ۲۰ سال پرانی جیبی گھڑی، درجنوں بنیان اور قمیضیں، سوٹ کے پیس، غرض کئی ٹھیلوں میں سامان بھر کر ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتا ہے۔

جہیز تو دولہا کے گھر پہنچ گیا، لیکن دلہن گھر پہنچنے کے بعد اپنا جہیز کا سارا سامان جوں کا توں کمروں میں بند کر دیتی ہے۔ دلہن کے جہیز کے ساتھ کچھ سامان لڑکے کی ماں کے لئے بھی ہوتا ہے۔ یہ جہیز کا ۱۰ فی صد ہوتا ہے۔ جہیز کو دوبارہ کمروں میں بند کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو یہ جہیز اس کے کام آئے گا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ موقع پندرہ بیس سال بعد ہی آئے گا۔ اگر لڑکی پیدا ہی نہیں ہوئی تو یہ سامان بھی بے کار پڑا رہے گا۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ممکن ہے کہ پوتی کے کام آجائے۔ غرض سامان کا استعمال کرنا بے عزتی سمجھا جاتا ہے۔ اگر لڑکے والے غریب ہیں تو لوگ کہیں گے کہ ان کے پاس اپنا سامان نہیں تھا۔ اس لئے یہ جہیز کا سامان استعمال کر رہے ہیں۔ غریب لوگوں کو یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ جب ان کی لڑکی جوان ہوگی تو اس کے لئے جہیز کا سامان کہاں سے آئے گا؟ وقت پر کون بھاگ دوڑ کرے گا؟ امیر لوگ جہیز کے سامان کو استعمال کرنا بے عزتی سمجھتے ہیں۔ ساس کے علاوہ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کمروں میں کون کون سی چیز کہاں پڑی ہے۔ ایک برتن نکالنے کے لئے سارا کمرہ چھاننا پڑے گا۔

جہیز کا سامان کمروں میں حفاظت سے بند رہتا ہے۔ اگر لڑکا اور لڑکی اپنا چھوٹا سا گھر بسانا چاہیں تو بھی انہیں یہی مشورہ ملتا ہے کہ جہیز کا سامان مت استعمال کرو۔ بہتر یہ ہے کہ نیا سامان خرید لو۔ چنانچہ یہ لوگ نیا گھر بناتے ہیں تو نیا سامان خریدتے ہیں۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ پھر اپنی لڑکی کے لئے جہیز کا سامان خریدنے میں جٹ جاتے ہیں۔ یہ سامان پرانے جہیز میں ملا دیا جاتا ہے۔ جہیز کا سامان خریدنا چیٹی عورتوں کی فطرت ثانیہ ہے۔ اگر کوئی عورت اپنی نوزائیدہ بچی کے لئے جہیز کا سامان نہ خریدے تو دوسری عورتیں حیرت سے اس کا مونہہ تکتی ہیں۔ "ارے تمہارے گھر میں لڑکی موجود ہے اور تم سامان نہیں خریدتیں؟" آپ انہیں کتنا ہی یقین دلائیں کہ پہلے ہی سے بہت سا سامان موجود ہے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض گھروں میں تین نسلوں سے جہیز جمع ہو رہا ہے۔ ایک عورت اپنی بیٹی کے لئے جہیز جمع کرتی ہے اور پھر بیٹی اپنی بیٹی کے لئے۔ اس طرح نانی کا جہیز نواسی تک پہنچتا ہے۔ کپڑوں میں دیمک لگ جائے، فرنیچر خراب ہو جائے، چیزیں پرانے فیشن کی ہو جائیں، ان کا استعمال متروک ہو جائے مگر انہیں اس بات کی پرواہ نہیں۔ چیٹی عورت دنیا سے بے خبر سامان خریدنے میں لگی رہتی ہے۔ اسے بس ایک ہی دھن رہتی ہے کہ نئے سے نیا سامان خریدے اور اسے پرانا ہونے کے لئے کمرے میں بند کر دے۔ ان کے گھر ڈپارٹمنٹ اسٹور معلوم ہوتے ہیں۔

چیٹی عموماً مال دار ہوتے ہیں اور اس مضحکہ خیز رسم کو آسانی سے جاری رکھ سکتے ہیں۔ لیکن سارے چیٹی مال دار نہیں ہیں۔ چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ آج کی تنخواہ میں اتنا سامان خریدنے کی سکت نہیں ہے۔ سامان کے ساتھ لڑکوں کی قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔ لیکن آمدنی کا تناسب اس حساب سے نہیں بڑھا ہے۔ اس کی مثال ایک واقعہ سے دی جا سکتی ہے۔ ایک چیٹی عورت نے خاوند کے لئے اشتہار دیا۔ وہ ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ اس کی تنخواہ ۴۰۰ روپے ماہوار تھی۔ لیکن ماں اور نانی کا جہیز گھر میں بھرا ہوا تھا۔ خاوند کی قیمت ادا کرنے کے لئے وہ تقریباً ایک ہزار برتن چھ ہزار روپے نقد اور پندرہ اشرفیاں دینے کو تیار تھی۔ اتنی گراں قیمت ادا کرنے پر اسے کون ملا؟ مل کا ایک مزدور، جو ۵ روپے روزانہ پر ایک عارضی نوکر تھا۔ وہ نہ تعلیم یافتہ تھا اور نہ زمین کا مالک تھا۔ اس کے پاس رہنے کے لئے اپنا مکان بھی نہیں تھا۔ لیکن وہ چیٹی تھا۔ یہ خاصیت اس کو ہزاروں روپیہ کے جہیز کا مالک بنانے کے لئے کافی تھی۔ بعض اوقات گراں قیمت جہیز دینے پر بھی نوجوان اور کنوارا چیٹی نہیں ملتا۔ اکثر ۶۰ برس کا رنڈوا ہی ملتا ہے۔ مگر چیٹی عورتیں اسے بھی غنیمت سمجھتی ہیں۔ آخر برسوں سے جمع کیا ہوا جہیز کس کام آئے گا؟

■■

ادھورا سماج

ابن حسن خورشید رام پوری

اجنبی شہر میں اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر اس کو سڑک ناپتے ہوئے کافی دن بیت گئے تھے۔ ان سڑکوں پر بلند و بالا عمارتوں کے درمیان نجانے کتنی بار سورج اس کے سر پر آیا اور اس کے سائے کو گھٹاتا ہوا گزر گیا۔ اب وہ خود کو کچھ بکھرا بکھرا سا محسوس کرتا، لیکن اس میں حوصلہ باقی تھا۔ ان دنوں اس درمیان اس کے سامنے حصولِ مقصد کے کئی راستے آئے لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے نام پر بھی بٹہ لگے۔ وہ ابھی پوری طرح ناامید بھی نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں کوئی نہ کوئی اُمید کی کرن ضرور چمکتی نظر آتی۔ اور یہی کرن اس کو ڈامر کی چکنی، چمکتی اور دھوپ سے تپتی سڑک پر کسی خود کار مشین کی طرح دوڑاتی رہتی۔

سورج کا بے رحم آتش فشاں اس کے جسم کو برف کی طرح پگھلاتا رہا۔ جب پسینے میں شرابور اس کے جسم سے ایک دو ہوا کے جھونکے ٹکراتے ہوئے نکل جاتے تو وہ تھوڑی دیر کے واسطے سکون محسوس کرتا۔ اور پھر چند ہی منٹ بعد وہ خود کو پہلے سے بھی زیادہ تھکا ہوا اور نڈھال پاتا۔ بھوک اور پیاس کی شدت کو وہ برداشت کرتا لیکن جب اس کو نقاہت کا بہت احساس ہوتا تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں اور انگوٹھے کی مدد سے اپنی خالی کوکھ کو دبانا شروع کر دیتا۔ سڑک کے دوسری جانب ایک درخت کے سائے میں وہ چاٹ والے کو کھڑا دیکھتا، جہاں خوش پوش افراد ہاتھ پر چاٹ کا پتہ رکھے ہر غم و فکر سے دُور چاٹ کھانے میں مصروف نظر آتے۔ اور جب وہ چاٹ کے خالی پتے کو ایک جانب پھینک کر بڑی نزاکت سے جیب سے رومال نکال کر اپنا مونھ صاف کرتے تو اسی وقت پاس کھڑے ہوئے بچے پتے کو اُٹھا کر اسی طرح چاٹ جاتے جس طرح ان لوگوں کے مونھ پر لگی ہوئی باقی چاٹ کو ان کا رومال چاٹ گیا تھا۔ خود اس کو اپنے پیٹ میں کوئی چیز گھومتی ہوئی معلوم ہوتی۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی خشک زبان پھیرتا اور پھر خود سے کہتا۔ "کیا بچے واقعی قوم کی امانت ہوتے ہیں؟ کیا یہی وہ بچے ہیں جن کو اپنے کاندھوں پر ملک اور قوم کا بوجھ اٹھانا ہے؟" اس منظر کو دیکھ کر اس کے دل میں ایسی نفرت پیدا ہوتی کہ اس کا حلق تک کڑوا ہو جاتا اور وہ ایک طرف کو مونھ پھیر کر تمام کڑواہٹ تھوک دیتا۔

غیر مانوس چہروں کے درمیان انجانے راستوں پر گھومنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ بلکہ اب تو یہی راستے اس کا سب کچھ تھے۔ راستے، راستے، راستے ہی راستے۔ وہ بے دم ہو کر کہیں فٹ پاتھ پر کسی درخت کے سہارے ٹیک لگا کر دم بھر کو بیٹھ جاتا تو چند سانس سے اطمینان کے ضرور میسر ہو جاتے۔ اور پھر یہ اطمینان ہی اس کے دماغ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا۔ لیکن جب تشنگی کے نشتر اس کے حلق کو بُری طرح چھیدنے کا عمل پھر شروع کر دیتے تو وہ اپنے بکھرے ہوئے خیالات کو یکجا کر کے دو بُوند پانی کی خاطر میونسپلٹی کے نل کی تلاش میں چل دیتا۔ اور پھر جہاں کہیں بھی اس کو پانی کا نل دکھائی دیتا، وہ ٹونٹی کو اس طرح مونھ لگا کر چسکی بھرتا جیسے کوئی دودھ پیتا بچہ بھوک سے بیتاب ہو کر ماں کی چھاتی کو جھنجوڑتا ہے۔ پھر وہ دھوپ کی تمازت سے کھولتے ہوئے پانی کے ان گنت گھونٹ چڑھا جاتا اور پھر کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگتا۔

اس کی زندگی کا ایک اور سورج غروب ہو گیا تھا۔ وہ نیلے آسمان کے سائے میں ایک جگہ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، جہاں سڑک خاموش تھی — اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے اس کے پڑوسی تھے — انجان اور تھوڑی دیر کے پڑوسی، بے درد دیوار کے مکیں، گویا زندہ لاشیں۔ لیکن یہاں خراٹوں کی آواز تھی، جس سے زندگی کا کچھ سُراغ ملتا تھا۔ وہ آج بھی ہر روز کی طرح پورے دن کی بھاگ دوڑ

کے بعد بہت تھک چکا تھا۔ اس کے منتشر دماغ میں وہ ادارے گھوم رہے تھے جہاں سے اسے 'کوئی جگہ خالی نہیں ہے' کہہ کر ٹرخا دیا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں، جو پہلے کے مقابلے میں کچھ سکڑ چکی تھیں، بلند عمارتوں میں واقع دفتروں کو دیکھ رہی تھیں جن میں داخل ہوا اور مایوس ہو کر باہر نکلا تھا۔ وہ اپنے تھکے ہوئے دماغ سے کتنے ہی سوال کر بیٹھا۔ ہر جگہ ناکامی، مسلسل ناکامی۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟ اور پھر اس میں [illegible] چیخنے کی [illegible] نہ رہی۔ اس کا سر گھوم گیا، بالکل اس طرح جیسے تیز ہوا کے جھونکے سے کاغذ کی پھرکی گھومتی ہے۔ اس کا احساس جو ابھی اس کے جسم کی طرح لاغر نہیں ہوا تھا، خود کو ایک بھیڑ کے درمیان گھرا ہوا پا رہا تھا۔ ایسی بھیڑ میں جس میں ہر انسان نامکمل ہے، ادھورا ہے، ناآسودہ ہے۔ اور پھر اس بھیڑ کے ہر انسان سے اس نے طرح طرح کے سوال پوچھے۔ اور ہر سوال پر اس نے اس بھیڑ کو ناچار مجبور اور مایوس پایا۔ اور پھر جواب نہ ملنے پر اس نے اس بھیڑ کے ہر انسان کو گونگا، بہرا اور اندھا محسوس کیا — ایسا اندھا جو آنکھیں تو ہو لیکن بینائی سے عاری ہو، ایسا بہرا جو کان رکھتے ہوئے بھی قوتِ سماعت سے محروم ہو۔ اور زبان؟ ہاں زبان تو ہو، لیکن صرف ایسی زبان جو گالی دے سکتی ہے، طنز کر سکتی ہے، لیکن حق نہیں کہہ سکتی۔ یہ زبان رکھتے ہوئے بھی گونگے ہیں۔ اور پھر اس نے خود کو بھی اس بھیڑ میں شامل پایا: میں بھی تو اسی اندھے، گونگے اور بہرے سماج کا ایک فرد ہوں۔ میں بھی تو ان میں سے ایک ہوں۔ میں بھی اس سماج کا حصہ ہوں جہاں کے سکے پر ایک طرف رشوت کی مہر اور دوسری طرف سفارش کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اور اس سکے کی جھنکار پر سماج کا ہر ادنیٰ و اعلیٰ انسان ناچتا نظر آتا ہے۔

سوچ کے اس مرحلے پر آ کر وہ خود کو کمزور اور ادھورے سماج کا فرد سمجھنے لگتا۔ اور پھر یہ احساس اس کی روح کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ اس کے ذہن میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا جاتا اور اس اندھیرے میں وہ بھٹک کر کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ دماغ کے گوشہ گوشہ میں ایک طوفان اٹھتا — ایسا طوفان جس کا مقابلہ کرنا اس کے بس سے باہر ہوتا۔ وہ اپنے سر کو دونوں گھٹنوں کے درمیان کس کے جکڑ لیتا — بالکل اس طرح جیسے جلد ساز کتاب کو شکنجے میں کستا ہے۔ اس کو اپنے دماغ کی ایک ایک رگ تڑکتی چٹختی معلوم ہوتی۔ وہ گھبرا کر اپنے سر کو زور سے جھٹکتا اور ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک خیال گردش کر جاتا — ایسا خیال جو اس کے جسم کے ہر حصہ میں ایک شور پیدا کر دیتا۔ بالکل اس طرح جیسے طوفان زدہ دریا پر کوئی تیز رفتار ٹرین پل پار کرتی ہے۔ لیکن وہ ایسی حالت میں بھی فیصلہ کر ہی لیتا ہے۔ تیز رفتار ٹرین پل سے گزر جاتی اور سارا شور ختم ہو جاتا۔

اس روز جب وہ دوبارہ اس حالت میں آیا کہ کچھ سوچ سکے، کچھ دیکھ سکے، تو اس نے خود کو ایک انجانے اور غریب مانوس 'گھر' میں پایا۔ اس گھر میں وہ لاعلمی کی حالت میں کئی مرحلوں سے گزرنے کے بعد پہنچا تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ یہاں وہ کس طرح آیا؟ کب آیا؟ کون اسے لایا؟ یہ سب نہ جانتے ہوئے بھی اس نے خود کو مطمئن پایا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ صرف چھت کے سائے کے واسطے نہیں، بلکہ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو بھی ترس رہا تھا۔ اور آج؟ آج وہ پیٹ بھر روٹی کھانے کے بعد چھت کے سائے میں اس طرح سویا تھا جیسے برسوں کی محنت اور مشقت کے بعد کوئی اہم مقصد پورا ہو جانے پر کسی انسان کو چین کی نیند آ جاتی ہے۔ یہ چار دیواری تنگ سہی تو کیا ہوا۔ سر پر سایہ تو تھا۔ یہ جگہ اس کے لئے باعثِ عزت نہ سہی، یہاں روٹی تو تھی۔

وہ حوالات کے گندے فرش پر بیٹھا نہ جانے خود سے کیا کیا کہتا رہتا۔

عدالت کی اذیت ناک کارروائی سے اس کو جلد ہی نجات مل گئی۔ عدالت نے اس پر اور اس کی جوان زندگی پر بہت بڑا احسان کیا۔ قانونی محافظوں کو اس کے صاحبِ علم ہونے پر رحم آیا — اس علم پر جو اس کو ایک وقت کی روٹی نہ دے سکا تھا۔ عدالت کو ان ڈگریوں پر ترس آیا جو اس کو ملازمت دلانے کے واسطے کارآمد نہ تھیں۔ اس نے خود سے گڑگڑا کر اپنی داستان سنائی اور عدالت سے درخواست کی کہ اگر اس کو اس علم کی بنا پر عدالت کہیں چپراسی کی ملازمت بھی دلا دے تو بہت بڑا احسان ہوگا۔ مگر عدالت نے اپنے فیصلے میں علم کی اس ناقدری پر پرزور احتجاج کیا اور رحم کھا کر اس کو بری کر دیا۔

خودکشی کی ناکام کوشش کے الزام سے باعزت بری ہونے کے بعد وہ عدالت کے کمرے سے اپنے ضمیر پر انجانا سا بوجھ لیے باہر نکلا تھا۔ وہ آہستہ روی سے قدم اٹھا رہا تھا اور سوچ رہا تھا، 'کیا اب یہ زمین میرا بوجھ اٹھا سکے گی؟'

چلتے چلتے وہ حوالات کی کوٹھری کے پاس آ کر رک گیا۔ جیسے اس جگہ سے اس کا کوئی خاص رشتہ ہو۔ یکایک اس کو ایک زور کی ٹھوکر لگی اور پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ دور بہت دور آسمان پر اسے ان گنت پرندے اپنی پرواز میں مصروف نظر آئے۔ اور وہ جیسے ان کی پرواز کے ساتھ دور بہت نکل گیا — بہت دور نکل گیا۔

استقبالِ رمضاں

پھر فضائے دو جہاں پر ابرِ رحمت چھاگیا
پھر فضیلت اور عظمت کا مہینہ آگیا
ہر مسلماں پھر پیامِ زہد و تقوے پاگیا
خوش ہیں مومن پا کے رمضانُ المبارک کی نوید
کیوں نہ اِس ماہِ مبارک کو کہیں خوش آمدید

دن مُبارک ہیں کہ توفیقِ ہدایت عام ہے
اِن دنوں جشنِ تراویح و تلاوت عام ہے
زہد ہے، پرہیزگاری ہے، عبادت عام ہے
جا بجا ہے اہتمامِ جشنِ قرآنِ مجید
کیوں نہ اِس ماہِ مبارک کو کہیں خوش آمدید

اس کی آمد سے منور مسجدوں کے بام و در
اس کا آنا باعثِ صد خیر ہوتا ہے مگر
کوچہ و بازار ہیں معروف، با رونق ہیں گھر
جاتے جاتے بھی یہ دیتا ہے پیامِ جشنِ عید
کیوں نہ اِس ماہِ مبارک کو کہیں خوش آمدید

اہمیت اِس ماہ کی ہر شخص کو معلوم ہے
اس سے جو محروم ہے سب سے بڑا محروم ہے
اس کی خیر اور اس کی برکت کی جہاں میں دھوم ہے
اہلِ ایماں کے لئے ہے ایک مژدہ اک نوید
کیوں نہ اِس ماہِ مبارک کو کہیں خوش آمدید

جن پہ روشن اِس مہینے کے فضائل ہوگئے
ترک کی راہِ بدی نیکی پہ مائل ہوگئے
اس کی عظمت کے وہ مومن دل سے قائل ہوگئے
وہ نہیں چھوڑیں گے روزہ، چاہے گرمی ہو شدید
کیوں نہ اِس ماہِ مبارک کو کہیں خوش آمدید

یاد ہی رہ جائیں گے صبر و قناعت کے یہ دن
یعنی بیداری کی یہ راتیں، عبادت کے یہ دن
روح کی تسکیں کا حاصل، دل کی راحت کے یہ دن
مومنو اِس ماہ کی ایک اِک ساعت سعید
کیوں نہ اس ماہِ مبارک کو کہیں خوش آمدید

وہ جو چاہے عیش بھی ہم اہلِ غم کو بخش دے
اِس مبارک ماہ کے صدقے میں ہم کو بخش دے
دامنِ رحمت ہماری چشمِ نم کو بخش دے
الغرض کچھ بھی نہیں ہے اس کی رحمت سے بعید
کیوں نہ اِس ماہِ مبارک کو کہیں خوش آمدید

وقار مانوی

صحیح جواب ذہنی ورزش نمبر ۴

۱۔ ارجمند بانو
۲۔ اہلیہ بائی
۳۔ دہلی
۴۔ پٹنہ
۵۔ زبیدہ خاتون
۶۔ فیض احمد فیض
۷۔ ایران
۸۔ برطانیہ
۹۔ ہیروشیما
۱۰۔ قنوج

اس مقابلے میں سب سوالوں کے صحیح جواب بھیجنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام کی حق دار ڈاکٹر انجلی (نئی دہلی) قرار پائیں۔ ان کو ایک سوان پرلیشر کو کر بھیجا جارہا ہے۔

صحیح جواب ذہنی ورزش نمبر ۵

۱۔ وجئے پت رائے
۲۔ جودھابائی
۳۔ قرۃ العین حیدر
۴۔ روس
۵۔ قطب جنوبی
۶۔ دکن
۷۔ ہندوستان
۸۔ مدھیہ پردیش
۹۔ انگلستان
۱۰۔ ۲۲

اس مقابلے میں سب سوالوں کے صحیح جواب ۱۲۸ بہنوں، بھائیوں نے ارسال کیے ہیں۔ قرعہ اندازی کے انعام کی حق دار مس وسیم (دہلی) قرار پائیں۔ ان کو ایک سوان پرلیشر کو کر بھیجا جارہا ہے۔

اکیلی والدین

شرافت حسین

بچے کی صحیح نشوونما کے لئے ماں باپ کی موجودگی ضروری ہے۔ عورت بیوہ ہو جائے یا خاوند اسے چھوڑ دے تو اس کے لئے تنہا بچوں کا پالنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ماں نہ ہو تو باپ کے لئے بچے کا پالنا اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین کی رائے ہے کہ گھر میں ماں باپ کے درمیان ناچاقی ہو تو بچوں کی نشوونما پر برا اثر پڑتا ہے، لیکن اگر والدین میں ایک سرے سے ہی موجود نہ ہو تو بچہ صحیح تربیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ بچے کی دنیا ماں باپ کے گرد ہی گھومتی ہے۔ لیکن اب مغربی ممالک میں یہ تصور فرسودہ سمجھا جانے لگا ہے۔ وہاں ایک نیا لفظ ایجاد کیا گیا ہے۔ اور وہ ہے "واحد والدین"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بچے کی پرورش ماں باپ میں سے صرف ایک کرتا ہے۔ وہاں ایک ماں یا ایک باپ والے خاندان وجود میں آ رہے ہیں۔ امریکہ اس سلسلے میں سب سے آگے ہے۔

واحد والدین والے خاندان کا سبب طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح ہے۔ گزشتہ پندرہ برس میں امریکہ میں طلاق کی شرح دگنی ہو گئی ہے۔ طلاق کے بعد بچے کی ذمہ داری ماں پر پڑتی ہے گو کبھی کبھی باپ بھی یہ ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے لیکن باپ کی نگرانی میں چلنے والے خاندان کا تناسب صرف ۱۰ فی صد ہے۔ ۹۰ فی صد خاندان عورت ہی چلاتی ہے۔ اگر واحد والدین والے خاندانوں کی شرح اسی طرح بڑھتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب امریکہ کے آدھے بچے ان ہی خاندانوں میں پرورش پائیں گے۔ وہ خاندان جو ماں باپ مل کر چلاتے ہیں اقلیت میں رہ جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر کا تصور ہی مٹ جائے گا۔

موجودہ دور کا یہ سماجی انقلاب عورتوں کی تحریک آزادی کا مرہونِ منت ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس تحریک سے نہ صرف عورتوں کو فائدہ پہنچا ہے بلکہ مردوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ جہاں اس تحریک کی وجہ سے عورتوں کو تجارت اور ملازمت میں نئے مواقع میسر آئے، وہاں مرد بھی عورت اور بچوں کی ذمہ داری سے آزاد ہو گیا ہے۔ گزشتہ زمانے میں اگر ایک عورت بھری ہوئی بس میں سوار ہوتی تھی تو مرد اخلاقاً اپنی سیٹ چھوڑ دیتا تھا۔ عورت اس تعظیم کو اپنا حق سمجھ کر سیٹ پر قبضہ کر لیتی تھی۔ اب نہ صرف مرد اپنی سیٹ پر سے نہیں اٹھتے، بلکہ عورت بھی اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھاتی۔ اگر کوئی مرد اپنی سیٹ چھوڑ دے تو عورت یہ پیش کش قبول نہیں کرتی۔ مرد اور عورت سب برابر ہیں، پھر یہ رعایت کیوں؟ عورت صنفِ نازک نہیں ہے۔ وہ کمزور نہیں ہے۔ یہ سب مردوں کا پروپیگنڈہ ہے۔ وہ بس میں کھڑی رہ سکتی ہے۔ عورت نے اس پر بس نہیں کیا، اس نے آزادی کی راہ میں ایک اور قدم اٹھایا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ اکیلی زندگی بسر کر سکتی ہے حتیٰ کہ اسے اپنا بچہ پالنے کے لئے بھی مرد کی ضرورت نہیں۔ جب بچے پالنے کے لئے باپ کی ضرورت نہیں تو شادی ہی کیوں کی جائے؟ بچہ شادی کے بغیر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر کسی کو ماں بننے کی خواہش ہو تو اسے اس کے لئے شادی کا جھنجھٹ کیوں پالا جائے؟ لیکن شادی کے بغیر جو پیدا ہو اسے ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔ انگریزی لغت میں ابھی تک ایسے بچے کے لئے کوئی دوسرا لفظ ایجاد نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ آئندہ ماہر لسانیات کوئی ایسا لفظ ایجاد کریں جس میں کلنک کا شائبہ نہ ہو۔

امریکہ میں ایسے بچوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ آج کل ہر ۵ بچوں میں سے ایک بچہ اسی قبیل کا ہے۔ لیکن یہ تناسب سفید فام لوگوں میں ہے۔ امریکہ کے حبشی اس معاملے میں سفید لوگوں سے دو قدم آگے ہیں۔ امریکہ کے حبشیوں میں ہر ۱۰۰ بچوں میں ۵۶ بچے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ عورتیں شادی کے بغیر بچے کیوں پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ ایک ڈاکٹر نے ایسی ماؤں سے سوال کیا تو انہوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ہمیں ایک ایسے انسان کی ضرورت ہے جو زندگی بھر ہم سے محبت کرے۔ خاوند کا کیا اعتبار؟ آج محبت جتا رہا ہے، کل کسی دوسری عورت کے پیچھے دیوانہ ہو کر ہم کو چھوڑ جائے۔ اس بات میں ایک حد تک صداقت ہے۔ شادی اور طلاق امریکہ میں ایک مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ ایسا انسان جو ساری عمر ایک ہی عورت کے ساتھ زندگی بسر کرے، خاصا بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ انسان اپنی پہلی شادی کا ذکر اس طرح کرتا ہے جیسے راستے کا ایک کانٹا تھا۔ اگر عورت کو ماں بننا ہے تو وہ شادی اور طلاق کے جھنجھٹ میں کیوں پھنسے؟ طلاق کے کیس میں روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ دل بُرے ہوتے ہیں۔ عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ بچے کس کے پاس رہیں۔ ایک عورت کے ذہن پر طلاق کے مقدمے کے دوران اور خاص طور پر طلاق کے بعد بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے شادی کا جھمیلا کیوں پالا جائے؟ ذیل میں ہم ایک ایسی عورت کی کہانی پیش کرتے ہیں جس نے بغیر شادی کے بچہ پیدا کیا تھا۔

لیزا ایک کیتھولک لڑکی ہے۔ وہ اپنے باپ کے پاس رہتی تھی۔ اس کی ماں کو طلاق ہو گئی تھی۔ باپ نے دوسری شادی رچالی۔ جس عورت سے باپ نے دوسری شادی کی، وہ بھی ایک جوان لڑکی کو ساتھ لائی تھی۔ لیزا جب حاملہ ہوئی تو اس نے ہمت کرکے باپ کو یہ بات بتائی۔ اس کا خیال تھا کہ باپ یہ بات سن کر آپے سے باہر ہو جائے گا، اسے ڈانٹے گا، پھٹکارے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے صرف اتنا کہا: "ٹھیک ہے، تم بچے کی ماں بننے والی ہو۔ میں تمہیں اسقاط کا مشورہ نہیں دوں گا، کیوں کہ میں کیتھولک ہوں۔ کیتھولک فرقہ میں اسقاط بچے کا قتل تصور کیا جاتا ہے۔ تم بچہ ضرور پیدا کرو، لیکن اسے گھر میں مت رکھو، کسی لاولد جوڑے کو دے دو وہ اسے قانوناً گود لے لے گا۔" لیزا نے باپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

لیزا ان دنوں ایک تاجر کے دفتر میں کام کر رہی تھی۔ یہ تاجر اس کے باپ کا دوست تھا۔ جب حمل کو چار مہینے گزر گئے تو اس تاجر نے جس کا نام جان تھا، لیزا کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ وہ اسے سیڑھیوں سے اترنے نہیں دیتا تھا۔ جب لیزا بازار جاتی تو وہ دفتر کا ایک آدمی اس کے ساتھ بھیج دیتا تاکہ وہ لیزا کا خیال رکھے۔ اس کی حد درجے دیکھ بھال اور احتیاط نے لیزا کو بیزار کر دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فلوریڈا میں اپنی ماں کے ساتھ رہے گی۔ جان نے جب یہ بات سنی تو اس نے وعدہ کیا کہ لیزا جب چاہے اپنے پرانے کام پر واپس آسکتی ہے۔ لیزا کے باپ نے جب اس کی روانگی کی خبر سنی تو اطمینان کا سانس لیا۔ لیزا اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔

فلوریڈا میں لیزا کی ماں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ماں کے ساتھ رہ کر اس نے سکون محسوس کیا۔ اس نے سگریٹ پینا چھوڑ دیا۔ وہ صبح کو پندرہ منٹ تیرتی، دن بھر گھر کا کام کاج کرتی۔ اس نے لوگوں سے میل جول نہیں بڑھایا۔ ان حالات میں لوگوں سے ملنا جلنا اسے پسند نہیں تھا۔

پانچ مہینے کے بعد لیزا کے یہاں بچہ پیدا ہو گیا۔ اس نے بچے کا نام مائیکل رکھا۔ پیدائش کے سرٹیفکیٹ میں باپ کے خانہ میں اس نے صرف 'جان' رکھا۔ مائیکل کی پیدائش سیزیرین تھی۔ پیدائش کے بعد نرس نے اسے چت لیٹنے نہ دیا۔ اسے اگلے دن تک بستر اونچا کرکے ٹیک لگائے بیٹھنا پڑا۔ جب ڈاکٹر اسپتال آیا تو اسے لیزا کو ٹیک لگائے بیٹھا دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ لیزا کو چت لیٹنا تھا۔ نرس کی غلطی کی وجہ سے لیزا چت نہ لیٹ سکی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس بے احتیاطی کا خمیازہ لیزا کو ساری عمر بھگتنا پڑے گا۔ وہ ہمیشہ دردِ سر کا شکار رہے گی۔ ڈاکٹر کی پیش گوئی سچ نکلی۔ آج بھی لیزا ہفتے میں ایک بار شدید درد کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس دن اسے دردِ سر دور کرنے کی آٹھ دس گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔

مائیکل کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد لیزا نے باپ کے پاس واپس جانے کا ارادہ کیا تو اس کی ماں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ باپ کو جب لیزا کے ارادے کا علم ہوا تو اس نے بھی لیزا کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی رہے۔ اس نے کہا کہ فلوریڈا کی آب و ہوا خوش گوار ہے۔ اس سے بچے کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔ باپ بھی لیزا سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ لیکن لیزا نے اس کا مشورہ نہیں مانا۔ وہ اپنے پرانے کام پر واپس جانا چاہتی تھی۔ اس نے جان کو فون کیا۔ جان نے جواب دیا کہ وہ اپنے وعدے پر قائم ہے۔ لیزا نے اس سے کہا کہ وہ دو مہینے کے بعد دفتر پہنچ جائے گی۔ اس کے بعد لیزا نے باپ کے شہر میں قسطوں پر ایک فلیٹ خریدنے کا انتظام بھی کر لیا۔

چھ ہفتے گزرنے کے بعد لیزا نے جان کو پھر فون کیا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ کیا جان ابھی تک اپنے وعدے پر قائم ہے۔ جان کی سکریٹری نے فون اٹھایا لیکن جان فون تک نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جان نے وہ ملازمت

...اور کو دے دی ہے۔ لیزا نے ہمت نہ ہاری
...نے ایک دوسرے تاجر کو فون کیا وہ بھی
...کے باپ کا دوست تھا۔ اس کا نام جیک
... جیک نے اس کی داستان سنی تو اس
...مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔ لیزا اپنے باپ کے
...پہنچی تو جیک کے یہاں ملازم ہو گئی۔ وہ ایک
...صلاحیت لڑکی ہے۔ کچھ ہی دن میں اس کو
...مل گئی اور وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔
...بھی پتے سے مایوس ہو گیا۔ لیزا اپنے لڑکے
...ساتھ اکیلی زندگی بسر کرنے لگی۔

مائیکل کی عمر اب دس سال ہے۔ جب
...دن اجنبی لیزا اور مائیکل سے ملتا ہے تو وہ
...پوچھتا ہے کہ آپ کے خاوند کیا کام کرتے
...۔ لیزا کی سمجھ میں آ جاتی ہے: "میں اور شادی شدہ؟
...تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے؟" لیزا گھر کا
...کام کرتی ہے، لیکن بھاری میز کھسکانا اور
...جلے ہوئے بلب بدلنا اس کے بس کا روگ
...نہیں۔ اس نے مائیکل کو ہدایت کی ہے کہ جب
...گھر میں کوئی مہمان آئے تو اس سے بلب بدلنے
...درخواست کرے۔ لیزا کو مائیکل کے
...ساتھ رہنے میں ایک دلچسپ تجربہ ہوا۔ پڑوس
...کے لوگ اسے تنہا جان کر اپنے بچوں کو اس کے
...گھر بھیجنے لگے۔ مائیکل اکیلا ہے۔ گھر میں باپ
...نہیں ہے۔ بچے مائیکل اور لیزا کے تنہائی کا احساس
...مٹا دیں گے۔

امریکہ میں بچوں کی دیکھ بھال ٹیڑھی کھیر
ہے۔ بچوں کے ساتھ رہنے کے لئے انسان
تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ یہ کام "بے بی سٹنگ"
کہلاتا ہے۔ ماں باپ کام پر جائیں تو بچے کو
بے بی سٹر کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ لیزا کے
پڑوسیوں کو مفت کی بے بی سٹنگ مل رہی
تھی وہ اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھاتے؟ پڑوس
کے بچے اس کے گھر میں مائیکل سے کھیلتے لیکن
وہ دیواروں کو گندا کر دیتے۔ کمرے میں پیشاب
کر دیتے۔ کچھ دن بعد لیزا کو معلوم ہوا کہ پڑوسی
اس کی تنہائی کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس نے
بچوں کو اپنے گھر میں آنے سے منع کر دیا۔ اس نے
بچوں سے کہا کہ وہ اس کے گھر میں آنے کے بجائے
مائیکل کو اپنے گھر لے جائیں۔ بچوں نے کہا کہ وہ
ایسا نہیں کر سکتے۔ لیزا نے وجہ پوچھی تو انہوں نے
جواب دیا "آپ اکیلی ہیں"۔ لیزا نے ان کو ڈانٹ کر
بھگا دیا۔ یہ بچے اپنے والدین کی بات دہرا رہے
تھے۔

لیزا کو صرف ایک فکر کھائے جاتی ہے
اگر مائیکل بیمار ہو جائے تو وہ کیا کرے؟ وہ
صبح سے شام تک دفتر میں کام کرتی ہے۔ بیمار
بچے کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ ان حالات
میں اسے مائیکل کو کسی پڑوسی کے گھر میں چھوڑنا
پڑتا ہے۔ وہ ان کا احسان اٹھانا نہیں چاہتی
لیکن اسے یہ کڑوی گولی نگلنی پڑتی ہے۔ اسے
بہرحال ماں کی ذمہ داری نبھانی ہے۔ اس کے
علاوہ اس نے مائیکل کو اپنے گھر کا پتہ، فون نمبر،
پڑوسی کا نام اور پولیس کا ٹیلی فون نمبر رٹا دیا ہے۔
تاکہ اگر وہ بازار میں بھٹک جائے یا راستہ بھول
جائے تو اسے اپنا گھر ڈھونڈنے میں آسانی ہو۔

لیزا پر اب بھی دردِ سر کا حملہ ہوتا ہے
یہ ان دنوں کی یادگار ہے جب نرس نے اسے
مائیکل کی پیدائش کے بعد ٹیک لگا کر بیٹھنے کو
کہا تھا۔ اس دن وہ آنکھوں پر نقاب چڑھا لیتی
ہے۔ پردے کھینچ دیتی ہے۔ بستر پر لیٹنے کے
بعد وہ مائیکل سے کہتی ہے "بیٹا، میں تم سے بات
نہیں کر سکتی۔ میں دیکھ بھی نہیں سکتی۔ میرے
سر میں شدید درد ہے"۔ مائیکل جواب دیتا ہے۔
"ماں، مجھے بتاؤ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے۔
میں تمہاری دیکھ بھال کروں گا"۔ لیزا اسے دوا کا
نام بتاتی ہے۔ مائیکل دوڑ کر دوا لے آتا ہے
اور ماں کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے۔ ماں اور بیٹا گھر میں
اکیلے رہتے ہوں تو دونوں ایک دوسرے کا خیال
رکھتے ہیں۔

عام طور پر جب بچہ ماں کو پریشان کرتا ہے
تو ماں کہتی ہے "ٹھہر جا! باپ کو آنے دے۔
وہ تیری مرمت کریں گے"۔ یہ اس کے گھر میں ہوتا
نہیں ہے۔ وہ ماں ہے اور باپ بھی۔ بچہ ماں سے
دھتکار کھا کر ماں کے پاس دوڑا ہوا آتا ہے۔ لیزا
کے گھر میں یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ کبھی کبھی مائیکل
کو سزا دیتی ہے۔ پھر تین منٹ انتظار کر کے
اسے دلاسا دیتی ہے۔ اس طرح وہ ماں اور باپ
دونوں کا کام پورا کر دیتی ہے۔

عام طور پر جب میاں بیوی میں جھگڑا
ہوتا ہے تو میاں بیوی کو ڈانٹ پلاتا ہے۔ مائیکل
نے مرد کا رول سنبھال لیا ہے۔ جب لیزا اس
سے کہتی ہے "جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے
سو جاؤ" تو مائیکل کہتا ہے "تم سو جاؤ رات
بہت ہو گئی ہے"۔ اب سوال یہ ہے کہ گھر کا سربراہ
کون ہے۔ لیزا کہتی ہے "ہم دونوں ہیں"۔

لیزا مائیکل کے ساتھ پرسکون زندگی
بسر کر رہی ہے۔ اسے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا
نہیں۔ اس کی زندگی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا
کہ ایک اکیلی عورت کے لئے بچے کو پالنا
مشکل ہے۔ لیکن لیزا کا کہنا ہے کہ وہ عام
عورتوں کو اس راستے کو اختیار کرنے کا مشورہ
نہیں دے سکتی۔ ●

تبسم

بیوی نے شوہر سے شکایت کی:
"تم نے اپنے دوست سے یہ کیوں کہا کہ بہترین کھانا پکانے کی وجہ سے تم نے مجھ سے شادی کی ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں آلو تک نہیں اُبال سکتی۔"
شوہر نے جواب دیا "مگر مجھے تم سے شادی کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی سبب تو بتانا ہی تھا۔"

●

دو آئرش دیہاتی ہوائی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ دورانِ سفر کیپٹن نے اعلان کیا "جہاز کا ایک انجن خراب ہو گیا ہے۔ مگر مسافروں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرا انجن بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ البتہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچنے میں دس پندرہ منٹ کی دیر ہو جائے گی۔"
کیپٹن کا اعلان سن کر ایک آئرش نے دوسرے کے کان میں کہا "اگر دوسرا انجن بھی خراب ہو گیا تو ہمیں آج کی پوری رات یہیں فضا میں گزارنی پڑے گی۔"

●

شوہر: میرا خیال ہے پیاری! تم کبھی کبھی جھوٹ بھی بولا کرتی ہو، یعنی یوں ہی تفریحاً۔
بیوی: ہاں، کیوں نہیں، اب کوئی اپنے شوہر کی تعریف بھی نہ کیا کرے۔

●

باپ نے ڈاکٹر کو فون کیا "ڈاکٹر صاحب، آئیے میرے بیٹے نے میرا قلم نگل لیا ہے۔"
"میں آ رہا ہوں" ڈاکٹر نے جواب دیا "مگر اس دوران تم کیا کرتے رہے ہو؟"
"میں اس وقت سے پنسل استعمال کر رہا ہوں۔" باپ بولا۔

●

ایک ڈاکٹر کو شادی کی تقریب کے بعد جب بیوی کے پاس آرسی مصحف کے لئے بٹھایا گیا تو اس نے سب کچھ بھول بھال کر بیوی کی نبض دیکھنا شروع کر دی اور نبض کی رفتار سے گھبرا کر بولا "ادھر! ذرا اپنی زبان تو دکھاؤ۔"

●

ایک صاحب کو ہر بات پر اعتراض کرنے کی عادت تھی۔ ایک دن وہ گھر آئے تو انہیں کوئی بات قابلِ اعتراض نظر نہ آئی۔ اس پر وہ بہت جھنجھلائے۔ اتنے میں ان کی نظر بیوی پر پڑی۔ فوراً بولے "بیگم! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت فضول خرچ ہوتی جا رہی ہو۔"
بیوی نے پوچھا "وہ کیسے؟"
ان صاحب نے کہا "بھئی جب ایک ہی چوٹی سے کام چل سکتا ہے تو دو چوٹیاں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

●

لیکن "ڈارلنگ" شوہر نے بے بسی سے کہا "ہم نے اگر نئی کار خرید لی تو اس کی قیمت کہاں سے ادا کریں گے؟"
"بس تم میں یہی بری عادت ہے" بیوی تنک کر بولی "تم ایک وقت میں سارے مسائل جمع کر لیتے ہو۔"

●

ایک صاحب دفتر سے گھر پہنچے تو اپنے چھوٹے بچے کو دہلیز پر بیٹھے دیکھا۔ باپ نے بیٹے سے وہاں بیٹھنے کی وجہ پوچھی تو بیٹے نے برہم ہو کر جواب دیا "پاپا آپ کی بیوی سے میرا نباہ نہیں ہو سکتا۔"

■■

خود بھی ہنسئے، دوسروں کو بھی ہنسائیے۔ نئے نئے، مزہ دار، چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجیے۔ پرانے، گھسے پٹے، بار بار سنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجیے، کیونکہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

بچے کی نشوونما پر توجہ دیجئے

ڈاکٹر وکیل قریشی

آپ کا بچہ خوب کھانے پر بھی کمزور کیوں رہ جاتا ہے؟ اکثر مائیں اپنے بچے کو دکھاتے ہوئے ڈاکٹر سے شکایت کرتی ہیں: "ڈاکٹر صاحب، اس بچے کی غذا تو دوسرے بچوں سے زیادہ ہی ہے، لیکن یہ اس قدر دبلا ہے کہ بس ہڈی اور چمڑا۔"

ماؤں کی یہ شکایت بجا ہے۔ مگر کیا آپ جانتی ہیں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

آپ بچے کو زیادہ سے زیادہ کھانا اور وقت بے وقت اسے کھانے کے لئے دینا ہی اس کی صحت کے لئے اچھا تصور کرتی ہیں۔ لیکن اسی طرح کھانا دے کر آپ خود غیر محسوس طور پر بچے کی بیماری کا باعث بنتی ہیں۔

اس طرح کے تمام سوالات کا تعلق بچے کی کسی بیماری سے نہیں، بلکہ بچے کی نشوونما سے ہے۔ آپ کہتی ہیں کہ "ڈاکٹر، میرا بچہ نہایت کمزور ہے۔" "ڈاکٹر میرا بچہ ابھی چل پھر نہیں سکتا۔" "میرا بچہ ابھی تک بول نہیں رہا ہے۔" لیکن اس قسم کی کمی کا سبب کوئی روگ نہیں، نشوونما پر مناسب دھیان نہ دینا ہے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ابھی تک ہندوستان میں کوئی ایسا معیاری چارٹ ہی نہیں جو بچے کی عمر کے ساتھ اس کی بڑھوتری اور وزن کو ظاہر کرے۔ اس کے لئے یہاں کے ڈاکٹروں کو مغربی ممالک میں کام آنے والے چارٹ پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ویسے اس کا اطلاق ہندوستان میں بھی تقریباً ٹھیک ہی ثابت ہوتا ہے۔

نشوونما سے مراد بچے کی ذہنی اور جسمانی بڑھوتری یعنی تمام جسمانی اور ذہنی افعال کی طبعی طور پر انجام دہی ہے۔ اسی لئے ماؤں کے لئے نشوونما کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے، تاکہ جب وہ یہ محسوس کریں کہ بچے کی نشوونما ٹھیک طرح نہیں ہو رہی ہے تو بچے کو کسی ڈاکٹر کو دکھا سکیں اور اس سے مشورہ کر سکیں۔ اگر وہ طبعی نشوونما کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتی ہوں تو بچہ جیسا بھی بڑھ رہا ہے، ماں اسے طبعی سمجھے گی اور بے پروائی برتے گی۔

انسان کی نشوونما پیدائش سے لے کر ۵۰ سال کی عمر تک ہوتی رہتی ہے لیکن اگر بچے کی دیکھ بھال کم از کم ۲ سال یا زیادہ سے زیادہ ۵ سال تک اچھی طرح کی جائے تو یہی بچے کے لئے اچھی صحت کی ضمانت ہے۔

بچے کے پیدا ہوتے ہی رونے سے مراد یہ ہے کہ وہ دنیا پر اپنا وجود ثابت کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک ماحول کو چھوڑ کر دوسرے ماحول کو اپنانے کا اعلان کرتا ہے۔ بچے کا رونا اس کے صحت مند ہونے کی دلیل ہے۔

بچے کی اصل نشوونما پیدائش کے پندرہ دن بعد شروع ہوتی ہے۔ یہ دراصل ظاہری نشوونما ہے۔ اندرونی اعضا کی نمو تو شروع سے ہی جاری رہتی ہے۔

پیدائش کے وقت بچے کی آنکھیں روشنی محسوس کرتی ہیں۔ اس کا اظہار وہ

> یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ابھی تک ہندوستان میں کوئی ایسا معیاری چارٹ ہی نہیں جو بچّے کی عمر کے ساتھ اس کی بڑھوتری اور وزن کو ظاہر کرے اس کے لئے یہاں کے ڈاکٹروں کو مغربی ممالک میں کام آنے والے چارٹ پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

آنکھیں بند کر کے یا جھپک کے کرتا ہے۔

پیدائش کے وقت بچّے کا وزن اوسطاً ۵½ سے ۷ پونڈ تک ہوتا ہے۔ اس میں کمی بیشی ماں کی غذا، ماحول، نسل اور جُڑواں ولادت سے ہوتی ہے لیکن یاد رہے کہ بچّے کا وزن ۴ پونڈ سے کم ہو تو یہ تشویش کی بات ہے۔

ابتدائی دس دن میں بچّے کا وزن کم ہو جاتا ہے وہ ۱۵ ویں دن سے وزن حاصل کرتا ہے۔ بچّے کو مناسب مقدار میں دُودھ مل رہا ہو تو ایک صحت مند بچّہ دو پونڈ وزن ہر ماہ حاصل کر لیتا ہے۔ چوتھے مہینے تک بچّے کا وزن پیدائش کے وقت کے وزن سے دوگنا ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک سال کے اختتام تک تین گنا اور چوتھے سال تک لگ بھگ چالیس پونڈ ہو جاتا ہے۔

ایسے بچّے کا قد جس نے ماں کے پیٹ میں پورا وقت (یعنی ۹ ماہ) گزارا ہو، پیدائش کے وقت ۲۰، ۲۱ انچ ہوتا ہے۔ ایک سال تک اس کا قد تقریباً تیس انچ ہو جاتا ہے۔ دوسرے سال کے اختتام پر قد ۳۵ انچ تیسرے سال تک ۳۷ر۵ انچ اور چوتھے سال تک ۴۰ انچ ہو جاتا ہے۔ اس طرح قد اور وزن چار سال تک ۴۰ انچ اور ۴۰ پونڈ تک پہنچ جاتے ہیں۔

پیدائش کے وقت بچّے کے سر کا اوسط قطر ۱۳ سے ۱۳ر۵ انچ تک ہوتا ہے اس قطر کی کمی یا زیادتی کئی بیماریوں کے نتیجے میں ہو سکتی ہے۔ اس قطر میں ہر ماہ آدھے انچ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح چھ ماہ کے اختتام پر سر کا قطر تقریباً ۱۶ انچ ہو جاتا ہے۔ ایک سال کی عمر میں ۱۹ انچ اور ۸ سال کی عمر میں بلوغت میں پائے جانے والے سر کے برابر ہو جاتا ہے۔ آٹھ سال کی عمر کے بعد سر کے قطر میں کوئی بڑھوتری نہیں ہوتی۔ پیدائش کے وقت بچّے کے سر کی ہڈیاں آپس میں جُڑی ہوئی نہیں ہوتیں۔ ان کے درمیان کی خالی جگہ کو تالو کہا جاتا ہے یہ ہڈیاں بتدریج آپس میں ملتی رہتی ہیں اور دو سال میں پوری طرح مل جاتی ہیں۔

بچّے کے سینے کا قطر پیدائش کے وقت سر کے مقابلے میں آدھے سے ایک انچ تک چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ بتدریج بڑھتا رہتا ہے اور پانچ سال کی عمر میں سینے کا قطر سر کے مقابلے میں دو انچ بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح بچّے کا اوپری دھڑ پیدائش کے وقت نچلے دھڑ سے بڑا ہوتا ہے۔ لیکن دونوں کے بڑھنے کے تناسب میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے اسی لئے ۸ سال کی عمر تک دونوں دھڑ (اوپری اور نچلا) برابر ہو جاتے ہیں۔

جسمانی نشو و نما کے ساتھ بچّے کی ذہنی نشو و نما بھی ہوتی رہتی ہے۔ پیدائش کے ساتھ ہی بچّہ روشنی کے لئے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ اگر اس کی آنکھ کے قریب روشنی لے جائی جائے تو وہ فوراً آنکھیں مُوند لیتا ہے یا پلک جھپکنا شروع کرتا ہے۔ پیدائش کے تقریباً ۱۵ دن بعد سے ڈیڑھ ماہ بعد تک بچّہ کروٹ لینے کی کوشش شروع کرتا ہے۔ چھٹے ہفتے میں وہ سر اور سینے کو اُوپر اٹھاتا ہے۔ چوتھے مہینے اس کی گردن ٹھہر جاتی ہے۔ چھٹے ماہ میں وہ سہارے سے بیٹھ سکتا ہے۔ اپنے ہاتھوں کو مُنہ تک لے جاتا ہے اور چیزوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ سات آٹھ ماہ میں وہ بغیر کسی سہارے کے بیٹھ سکتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے چیزوں کو پکڑ سکتا ہے، مگر ان کو دُور پھینک نہیں سکتا۔ نویں ماہ میں وہ چیزوں کو دُور پھینک سکتا ہے۔ ایک سال میں وہ سہارے سے چل سکتا ہے۔ ڈیڑھ سال میں وہ بغیر سہارے کے چل سکتا ہے اور تین سال میں بھاگ سکتا ہے۔ اسی طرح پیدائش کے بعد تیسرے ہفتے میں بچّہ آواز کی سمت دیکھتا ہے۔ چھٹے ہفتے میں روشنی کی سمت دیکھتا ہے اور روشنی کے ساتھ آنکھوں کو حرکت دیتا ہے۔ دوسرے ماہ میں اگر آپ اسے مخاطب کریں تو ہنستا ہے۔

تیسرے اور چوتھے ماہ میں وہ روشنی پر آنکھیں جما سکتا ہے اور مُونہہ سے آوازیں نکالتا ہے چھٹے ماہ میں وہ ماں کو پہچاننے لگتا ہے۔ دسویں ماہ میں وہ چھوٹے اور غیر واضح الفاظ مُونہہ سے نکالتا ہے۔ ایک سال کی عمر میں وہ الفاظ ادا کر سکتا ہے۔ ڈیڑھ سال میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ تین سال میں بات کو سمجھنے لگتا ہے اور چھوٹے چھوٹے اسباق اور نظمیں یاد کر سکتا ہے۔ ○○

جگمگاتی روشنیوں میں زخشی

منزل شان سے سجی کھڑی تھی۔ ساٹھ سالہ رئیس زخشی نے اپنی پانچویں شادی پر کوٹھی کو دلہن کی طرح اس اہتمام کے ساتھ سجایا تھا جیسے وہاں کسی کنوارے کی شادی ہو رہی ہو۔ سیٹھ زخشی قیمتی سوٹ پہنے، منہ میں سگار دبائے دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا رہے تھے۔

شاہین بوجھل دل کے ساتھ اپنے شوہر کی شادی میں آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔ اس وقت اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کہیں دور سب کی نظروں سے اوجھل ہو کر اپنی قسمت پر آنسو بہائے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کی سوتیلی بیٹی ماہ جبیں اس کے قریب آگئی اور بولی "امی، آپ جائیے! آرام کیجئے۔ تھک گئی ہوں گی۔"

ایک پل کے لئے رُک کر شاہین نے اس پُر خلوص لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر وہاں سے چلی آئی۔ دلہن کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ دلہن کا چہرہ پھول کی طرح کھِلا ہوا ہے اور خوشی کی چمک اس کی آنکھوں میں لہرا رہی ہے۔

نہ جانے تمہاری یہ خوشی کتنے دن کی ہے! شاہین سوچتی ہوئی آگے نکل گئی۔

زخشی صاحب کا اصول تھا کہ وہ ایک وقت میں دو بیویوں سے زیادہ نہ رکھتے تھے جب کوئی نئی تتلی پسند آتی تو وہ فوراً کسی پہلی بیوی کی چھٹی کر دیتے

ساری رات شاہین جاگتی رہی

اور سوچتی رہی: "کاش کوئی مجھے ساری دولت لے لے اور کہیں سے تھوڑا سا سکون لا کر بخش دے۔"

ساری رات وہ یادوں کے ریلے میں بہتی رہی۔

امی اور ابو کی موت کے بعد کوئی سہارا نہ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بہن بھائی، ان کی ذمہ داری، گھر کا خرچ، سب ایک دم سے آن پڑا تھا۔ بے چارے بڑے بھائی جان نے پڑھائی چھوڑ کر معمولی سی ملازمت کر لی۔ اس طرح بسر اوقات ہونے لگی۔

وہ کالونی جس میں یہ لوگ رہتے تھے۔ سیٹھ زخشی کی ملکیت تھی۔ اس کے ایک کوارٹر میں یہ لوگ رہتے تھے۔

اس روز صبح سے سیٹھ صاحب کی بُوا دوبارہ آچکی تھیں۔ شاہین کو تشویش ہوئی۔ جب کمرے سے زور زور سے قاسم کے بولنے کی آواز آئی تو وہ آہستہ سے کمرے کے دروازے
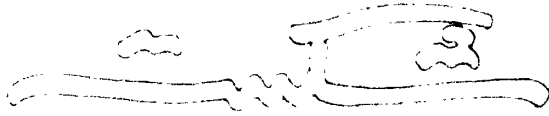
کے باہر کھڑی ہوکر سُننے لگی۔ اپنا نام سُن کر وہ ٹھٹھک گئی۔

بُوا کہہ رہی تھیں "بیٹا، میں کیا کروں؟ کئی بار سیٹھ صاحب کو سمجھا چکی ہوں مگر ان کی یہی ضد ہے کہ قاسم سے جاکر کہہ کہ اگر وہ اپنی بہن کا رشتہ ان سے کر دے تو وہ قاسم کو اپنے مِل میں نوکر رکھ لیں گے اور بچّوں کو اچھے اسکول میں ....."

"بس کرو بُوا، بس کرو!" قاسم سر پکڑ کر درد سے چیخا۔ "میرے سامنے ہی میری بہن کی قیمت لگائی جا رہی ہے! میں اس خبیث بُڈھے کو جان سے مار دوں گا۔" غصّہ کی شدّت سے قاسم کے مُونہہ سے الفاظ ٹُوٹ کر نکل رہے تھے۔

بُوا ناک پر اُنگلی رکھ کر بولیں "بیٹا میری مانو تو مکان خالی کر دو۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

شاہین دروازے کے باہر کھڑی سُن رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ "تین مہینے کا کرایہ کہاں سے آئے گا؟ اب تو اُدھار بھی بہت زیادہ چڑھ چکا ہے۔ ان چار چھوٹے بہن بھائیوں کا کیا ہوگا؟"

اتنے میں اندر سے قاسم کی آواز آئی "جاؤ، جاکر کہہ دو، ہم مکان خالی کر دیں گے۔"

شاہین کے دل میں ایک دم خیال آیا "صرف میری وجہ سے سب اس گھر سے نکالے جائیں گے۔ اور صرف میری ہی وجہ سے ان کی زندگی سنور بھی سکتی ہے۔ تو پھر ــــ تو پھر ....." اس کے دماغ میں بجلی سی کوندی! اور اسی پل ایک فیصلہ اس نے کر ڈالا۔

بُوا کمرے سے نکلیں تو شاہین ان کو اپنے کمرے میں لے آئی۔

"بُوا!" اس کی آواز میں درد تھا، کرب تھا۔ "سیٹھ صاحب سے کہہ دو کہ شادی ہم کو منظور ہے۔ مگر ان کو بھی اپنی شرط پوری کرنا ہو گی۔"

"کیا؟" بُوا کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"ہاں بُوا، میری طرف سے اجازت ہے۔ شادی مجھ کو کرنا ہے اور میں اجازت دے رہی ہوں نکاح کی تیاری کرو۔"

بُوا نے کچھ کہنا چاہا مگر شاہین نے بُوا کو خاموش کر دیا۔

جب قاسم نے سُنا تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ لپکا ہوا شاہین کے پاس آیا۔

"شاہین، میری پیاری بہن، یہ میں کیا سُن رہا ہوں؟"

"بھائی جان، جو آپ نے سُنا ہے، بالکل ٹھیک ہے۔ میری بھی کچھ خواہشات ہیں جو بغیر پیسے کے پوری نہیں ہو سکتیں۔" شاہین خون کے آنسو پی کر بولی۔

وہ پیٹھ موڑ کر نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ اس نے چہرہ قاسم کی طرف نہیں کیا کہ کہیں اس کی یہ چوری، یہ قربانی پکڑی نہ جائے۔ چُپکے سے آنسو پونچھ کر بولی "بھائی جان، آپ فکرمند نہ ہوں۔ میں یہ سب کچھ اپنی مرضی، اپنی خوشی سے کر رہی ہوں۔"

"شاہین، میری بہن، میری دعا ہے کہ تم سدا خوش رہو۔"

پھر شاہین کی شادی کی تیاری شروع ہو گئی اور ایک دن شاہین رُخصت اپنے شوہر کی لمبی چوڑی کار میں بیٹھ گئی۔

رُخصت ہوتے وقت اس نے آنسو بھی نہ بہایا۔ سارے آنسو تو وہ پہلے ختم کر چکی تھی۔

اگلے دن اس نے بھائی کا انتظ[ار] کیا مگر کوئی نہ آیا۔ اسی طرح ہر روز وہ لاچا[ر] انتظار کرتی رہی۔

ایک دن ناشتے کے دوران اس نے اپنے شوہر سے کہا "آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا؟"

"ارے ہاں بیگم، کیوں نہیں؟ ا[بھی] قاسم کو بُلواؤ، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔" شاہین نے ڈرائیور کو فوراً گاڑی لے[کر] بھیجا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ڈرائیور نے آکر بتایا کہ مکان پر تالا لگا ہے۔ پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ وہ لوگ مکان خالی کر کے تین دن ہوئے چلے گئے ہیں۔ کہاں گئے ہیں، کچھ معلوم نہیں۔ یہ چابی پڑوس میں دے گئے تھے اور سیٹھ صاحب کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کر گئے تھے۔

سیٹھ صاحب نے ڈرائیور سے چابی لے کر طنز اور حقارت کے ساتھ کہا "ہُونہہ! اتنے غیرت مند تھے تو اپنی بہن کی شادی مجھ سے کیوں کی تھی۔"

سیٹھ رحمٰن کی بات سن کر شاہین کو ایسا لگا جیسے وہ اس وقت کسی طوفان کی زد میں ہو۔ کب سیٹھ صاحب اُٹھ کر چلے گئے، اس کو خبر تک نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر وہ اسی طرح میز پر سر رکھے آنسو بہاتی رہی۔ اس کی سوتیلی بیٹی ماہ جبین جو آج کل یہیں تھی، اس کی ہم عمر تھی وہ اس کا سر سہلا سہلا کر اس کو دلاسا دینے لگی

"ماہ جبیں! میں تنہا رہ گئی — بالکل اکیلی!"
بار بار سسکیوں کے درمیان کہتی رہی۔
اتنی قربانی دے کر اسے کیا ملا تھا؟ ...کی خوشیوں کے لئے اس نے اپنے ارمانوں ...خون کر لیا، جن کو در در کی ٹھوکروں سے ...جانے کے لئے ایسے آدمی کو اپنایا جو کار کے ...ل کی طرح بیوی کو بھی بدلنے کا عادی تھا، وہ ...جانے کس حال میں ہوں گے جانے ان ...بھی ملاقات بھی ہو گی یا نہیں۔

وہ سسک سسک کر روتی رہی اور ...جبیں اس کو تسلیاں دیتی رہی۔ دن گزرتے ...لئے۔ شوہر کی خوشی کے لئے وہ کٹھ پتلی کی طرح ...چتی رہی، مگر کچھ ہی عرصہ بعد سیٹھ رخشی دوسری ...شلی کے چکر میں ہوٹلوں اور کلبوں کے چکر ...گانے لگے۔

شاہین سب کچھ سنتی رہی، دیکھتی رہی ...خر وہ وقت آ ہی گیا جب سیٹھ صاحب نے ...بڑے اطمینان سے یہ خبر شاہین کو سنائی ...کہ اگلے ہفتے ان کو ہوٹل الپرا کی مشہور ڈانسر ...سے نکاح کرنا ہے۔ شاہین یہ سننے کے لئے ...پہلے ہی اپنے آپ کو تیار کئے بیٹھی تھی۔ اس ...نے اپنے چہرے پر کسی قسم کی ناگواری نہ ...آنے دی۔

"حیرت ہے! تم تو اس طرح اطمینان سے بیٹھی ہو جیسے کسی اور کے متعلق بات ہو رہی ہو!" سیٹھ صاحب بولے۔

"سیٹھ صاحب!" شاہین نے پُر سکون لہجے میں کہا۔ "میں جاہل عورتوں کی طرح ...رادویلا مچانا پسند نہیں کرتی۔ یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔ آخر مجھ سے پہلے بھی تو کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔"

"ہونہہ!" وہ جھنجھلاتے ہوئے چلے گئے۔

ماہ جبیں نے لاکھ اپنے ڈیڈی کو سمجھایا کہ اب اور شادی نہ کریں چھوٹی امی ہر طرح بہت اچھی ہیں، انہوں نے آپ کے لئے بہت بڑی قربانی دی ہے، مگر سیٹھ رخشی پر تو شادی کا بھوت سوار تھا۔ انہوں نے بیٹی کو ڈانٹ دیا اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔

"تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ تم اس گھر کے معاملوں میں دخل نہ دو!"

پیچھے سے کسی نے آکر شاہین کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گئی اس نے مڑ کر دیکھا تو ماہ جبیں کھڑی تھی۔

"چھوٹی امی! آپ سوئیں نہیں ابھی تک؟"

"اوہ! کیا سب مہمان چلے گئے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی ہاں، سب کو رخصت کر کے آئی ہوں۔ مگر آپ سوئیں کیوں نہیں ابھی تک؟"

"تم ایک عورت ہو اور عورت کے جذبات کو اچھی طرح جانتی ہو۔" شاہین نے کہا۔

ماہ جبیں نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری۔ شاہین نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "تم میری وجہ سے پریشان نہ ہو۔ جاؤ، جا کر سو جاؤ۔ بہت تھک گئی ہو گی۔"

مگر پھر شاہین نے دیکھا کہ ماہ جبیں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ہونٹ پھڑپھڑائے ہوئے۔ بال پریشان۔ رنگت زرد۔ آنکھوں کے بھیگے گوشے نہ جانے کون سی بات اگلنے کو بے تاب تھے۔

"ماہ جبیں!" شاہین نے تڑپ کر کہا۔ "ایسا کرو، کچھ دن کے لئے اپنے گھر ہو آؤ۔ تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور اس ماحول سے بھی دور ہو جاؤ گی۔"

"گھر — کون سا گھر؟" اس کی آنکھوں میں وحشت بھر آئی۔

شاہین نے گھبرا کر پوچھا۔ "تم کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ کیسی باتیں کرتی ہو؟ اللہ رکھے تمہارے گھر کو، تمہارے شوہر کو۔"

"امی! اب میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ کل ارشی کا ٹیلیگرام آیا ہے۔ انہوں نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ وہاں انہوں نے ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔"

"کیا؟" شاہین کو ایسا لگا جیسے وہ کسی طوفانی جھکڑ کی لپیٹ میں آ گئی ہے۔

"کبھی کبھی بڑوں کے گناہ کی سزا چھوٹوں کو مل جاتی ہے۔ ڈیڈی کے گناہوں کا کفارہ مجھ کو ادا کرنا پڑا ہے۔ قدرت نے آپ کا انتقام مجھ سے لیا ہے۔"

"اور تم اتنا بڑا غم کل سے تنہا اٹھائے پھر رہی ہو؟"

"تو کیا کرتی۔ ڈیڈی تو اپنی شادی کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ آپ ویسے ہی بہت پریشان تھیں۔" وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

شاہین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سیٹھ صاحب کی شکست پر قہقہے لگائے یا اس معصوم لڑکی کی قسمت پر روئے۔ اس وسیع و عریض کوٹھی میں دو بدنصیب عورتیں ایک دوسرے کے گلے لگی آنسو بہا رہی تھیں۔

○○

اب کی بار
گرمیوں میں
جنّت جیسا
لُطف لیجئے
شربت شمع
پھولوں، پھلوں اور
جڑی بوٹیوں کی
تازگی اور خوشبوؤں سے بھرپور
شمع لیباریٹریز کا
آپ کے لئے
بالکل نیا تحفہ
تن من کی
پیاس بُجھائے
شربت شمع
SHARBAT
SHAMA
شربت شمع
شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز۔ لال کنواں، دہلی

رخصتی

گو ہر نثار کرتی ہے
ہر شے، اُداس تر ہو کر
کو بے قرار کرتی ہے
اشکبار کرتی ہے

تے ہونٹ، غم زدہ چہرے
دل کا پتہ بتاتے ہیں
ئے کھوتے سے یہ در و دیوار
ڑے لے میں گنگناتے ہیں
نہ رو کر ہمیں رلاتے ہیں

تک دل کی راہ سُونی ہے
آنکھوں میں آنسو جلتے ہیں
مناظر، دھواں دھواں ہو کر
ی جاں پہ چھائے جاتے ہیں
بھی ہم مسکراتے جاتے ہیں

دعا ہے کہ اک نئے گھر میں
مسرت تجھے میسّر ہو
نی دیس کی ہواؤں میں
لمحہ، ترا معطّر ہو
یت کی ہر سحر منوّر ہو

راہی ٹانڈوی

جادۂ عشرت کا سفر

رخصت اے روحِ پدر لختِ جگر نورِ نظر
ہو مبارک یہ تجھے "جادۂ عشرت کا سفر"
ہر قدم پر یونہی گل ہائے تمنا مہکیں
گلشنِ دل میں یونہی پیار کے طائر چہکیں
تیری سانسوں میں گھلے باغِ وفا کی خوشبو
اپنے ہمراہ لئے جا یہ دُعا کی خوشبو
مضطرب دل ہے مگر لب پہ دُعا ہے بیٹی
دل تری ماں کا ابھی ٹوٹ رہا ہے بیٹی
ہاں مجھے تیرے بچھڑنے کا بہت غم ہے مگر
رسمِ دنیا سے ہوں مجبور مری لختِ جگر
فرضِ لازم تری شادی کا کر ڈالا
ہو کے مجبور تجھے خود سے جدا کر ڈالا
جا رے گھر سے یہ پیغامِ محبت لے جا
دامنِ دل میں چھپا کر یہ نصیحت لے جا
گیت سسرال کے ہر حال میں اب گانے ہیں
تجھ کو شوہر کے سب ہی حکم بجا لانے ہیں
وضع داری کا سدا اونچا یوں پرچم رکھنا
ہو جو تجھ پہ کوئی ناراض تو سر خم رکھنا
حوصلہ مند اگر ہے تو سفر طے ہوگا
مشکلیں آئیں گی راہوں میں مگر طے ہوگا
ڈگمگانا نہ کبھی ختم سفر ہونے تک
شمع ہر حال میں جلتی ہے سحر ہونے تک

رئیس الدین رئیس

سہاگ رات

سہاگ رات بڑی دل نواز ہوتی ہے
کہ دو دلوں میں حسیں ساز باز ہوتی ہے

مگر یہ رات مری زندگی میں جب آئی
تو صبح تک مجھے ڈستی رہی یہ تنہائی
نہ آنے والے کے قدموں کی آہٹیں جاگیں
نہ نرم پھولوں کے بستر پہ سلوٹیں جاگیں
شبِ وصال یونہی جاگتے ہوئے گزری
تمام رات یہی سوچتے ہوئے گزری
نہ میرے چہرے سے گھونگھٹ کوئی اٹھائے گا
نہ میرے جاگتے خوابوں میں کوئی آئے گا

میں کم نصیب ہوں میرا جہیز بھی کم ہے
بس اتنی بات پہ وہ چشمِ یار برہم ہے

سیف سہسرامی

دل اگر پھول نہ تھا، کانچ کا ٹکڑا ہوتا
توڑنے والے کو اِک زخم تو آیا ہوتا
اسما حسین ، دہلی

کر باندھو، مقدر کے سہارے بیٹھنے والو
شکستِ عزم سے راہوں کا پیچ و خم نہ بدلے گا
(ماہر لکھنوی) نظیر سہروردی، بیڑ

ہمیں کہتی ہے دنیا زخمِ دل زخمِ جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو تم بھی ہو آخر نظر والے
(سائل دہلوی) فریدہ گوہر، نرمل

بہت سنجیدگی بھی چوس لیتی ہے لہو دل کا
اِسی خاطر تو ہم زندہ دِلی کو پیار کرتے ہیں
(نامعلوم) عالیہ فاطمہ قاضی، بیجاپور

ڈھونڈتا پھرتا ہوں لوگوں میں شباہت اُس
کہ وہ خوابوں میں بھی لگتی ہے خیالوں جیسی
(احمد فراز) نظیر سہروردی، حیدرآ

یہاں شکلِ مہر و وفا کہیں نظر آئے کس طرح ہم نشیں
کہ نگار خانۂ دہر کے ہر اک آئینہ میں غبار ہے
(شرر مونگیری) صبیحہ پروین، آدم پور

اپنا سر میرے شانے پہ رہنے بھی دو
پھر یہ لمحے کہاں لوٹ کر آئیں گے
(میر عظمت علی کیف، ناگپوری) نثار اختر انصاری، ناگپور

چراغاں کر کے دل بہلا رہے ہو کیا جہاں د
اندھیرا لاکھ روشن ہو اُجالا پھر اُجالا ہے
(شکیل بدایونی) شیخ آصفہ بدر، پر

آئینہ ٹوٹ بھی جائے تو کوئی بات نہیں
دل نہ ٹوٹے کہ یہ بکتا نہیں بازاروں میں
(جاوید وششٹ) شاہین، نظام آباد

کون روتا ہے کسی اور کے غم پر یار و
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا
(ساحر لدھیانوی) رعنا نشاط، آمبور

دل دھڑکتا ہے تو پہروں نہیں سونے د
نیند آتی ہے تو احساس جگا دیتا ہے
(گوہر عثمانی) مہ جبیں ، بر

وہ شہرِ دل جو حوادث کی آج منزل ہے
اُجڑ چکا ہے مگر دیکھنے کے قابل ہے
(صبا حسینی) حسین عالم، حیدرآباد

یقیں کی حد میں عزم مستقل معراجِ عظمت ہے
اِسے ذوقِ طلب ! وہم و گماں سے کچھ نہیں ہوتا
(بہار الہ آبادی) فرح مبین سہروردی، بیڑ

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا
(اقبال ساجد) رخسانہ، علی گڑ

کون کہتا ہے کہ ہم تم میں جدائی ہوگی
یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی
طلعت رخسانہ مختار، جمشید پور

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے محفل کی
(نامعلوم) نسیم اختر دیلوری، مدراس

بنا بنا کے مٹائے گئے نقوش ج
ترے بغیر مکمل نہ ہو سکی تص
(کیفی اعظمی) اِم نجمہ خلیل، رامنا پی

اس وقت آپ کو کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے ایسا شعر جسے آپ بار بار سننا یا گنگنانا چاہتی ہیں ؟ اُس شعر کے حُسن، اثر اور کیفیت میں دوسروں کو بھی شریک کیجئے۔ جس کارڈ یا کاغذ پر آپ اپنا پسندیدہ شعر لکھ کر بھیجیں، اس پر اپنا نام، پتہ ضرور درج کریں۔ اگر معلوم ہو تو شاعر کا نام بھی تحریر کریں۔

"میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

…یم موشیرا

…بیس جڑواں بچوں کی ماں

ممتاز علی

…ڑواں بچوں کی پیدائش کوئی غیر معمولی
…م آئے دن یہ خبر سنتے رہتے ہیں۔ کبھی
…ن بلکہ چار بچے بھی ایک ساتھ پیدا
…لیکن برازیل کی مریم مورمیرا نے دس
…بچوں کو جنم دے کر ایک عالمی ریکارڈ قائم
… لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے پہلے
… سات بار جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ یہ سب
…یں۔ دوسرے خاوند سے پھر جڑواں بچے
…ے۔ یہ دونوں لڑکے تھے۔ اس کے بعد
…ں ایک ساتھ پیدا ہوئیں۔ اس طرح ۴۲
…عمر میں مریم ۲۰ بچوں کی ماں بن گئی۔

مریم جب ۱۶ سال کی تھی تو ایک نجومی
…ں کا ہاتھ دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ اس کے
…ں بار جڑواں بچے پیدا ہوں گے۔ مریم نے
…ی بات کو ہنس کر ٹال دیا تھا۔ اس کو کیا
…تھی کہ وہ ایک دو بار نہیں، بلکہ دس بار جڑواں
… کو جنم دے گی۔ وہ جب ۱۵ سال کی تھی تو
… ایک معمولی تاجر سے محبت ہو گئی۔ اس تاجر
…ر ۳۰ سال تھی۔ ۱۶ سال کی عمر میں مریم کی شادی
…ی۔ شادی کے بعد اس کی ماں اسے ایک نجومی
… پاس لے گئی۔ اس نجومی نے مریم کا ہاتھ دیکھا

تو وہ حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے کہا "تمہارے یہاں
کئی بار جڑواں بچے پیدا ہوں گے" حمل کے دوران
مریم کو اس بات کا یقین تھا کہ اس کے یہاں
لڑکی پیدا ہوگی۔ اسے نجومی کی پیش گوئی کا بھی
خیال تھا۔ اس لئے جب اس نے آنے والے
بچے کے لئے کپڑے سینے شروع کئے تو ہر لباس
کا جوڑا ہی تیار کیا۔ اس کا خیال صحیح ثابت ہوا
اس کے یہاں دو لڑکیاں ایک ساتھ پیدا ہوئیں
اس کے بعد مریم کے یہاں ہر سال بچے
پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ہر بار لڑکیاں ہی پیدا
ہوئیں۔ جب مریم کی عمر ۴۲ سال کی تو وہ ۲۰ بچوں
کی ماں تھی۔ سب سے بڑی لڑکی کی عمر صرف ۲۰
سال کی تھی۔ ان بچوں کو پالنے کے لئے اسے گھر
کو ایک کارخانہ کی طرح چلانا پڑا۔ اس کام کے
لئے محنت اور مستعدی کی ضرورت تھی۔ ایک
بچے نے پیشاب کر دیا اس کا جانگیہ بدلنا ہے، دوسرا
دودھ کے لئے رو رہا ہے، ابھی اسے دودھ پلایا
تو تیسرا پلنگ سے گر پڑا۔ مریم گھر میں جیسے پھرکی
کی طرح گھومتی پھرتی۔ اسے روزانہ صبح کو
۵ بجے اٹھنا پڑتا۔ بستر سے اٹھتے ہی وہ باورچی خانے
کی طرف بھاگتی۔ بچوں کا دودھ گرم کرتی۔ شوہر کا

ناشتہ تیار کرتی۔ جب بچے جاگ جاتے تو پھر
رات گئے تک اسے سونا نصیب نہیں ہوتا۔ مریم
کو ایسی کوئی رات یاد نہیں جس میں ۳ گھنٹے سے
زیادہ سوئی ہو۔ بچوں کو دودھ پلانے سے پہلے
بوتلوں کو ابلتے ہوئے پانی سے دھونا بھی ضروری
تھا تاکہ وہ جراثیم سے پاک ہو جائیں۔ دودھ
کے ساتھ بچوں کو پھلوں کا عرق بھی پلانا ضروری
تھا۔ وہ درجنوں کے حساب سنگترے خریدتی تھی،
کاٹ کر ان کو نچوڑتی۔ اور بچوں کا پیٹ بھرتی۔ اس
طرح اسے ہر روز اسے دا بوتلیں پانی اور دھونی
پڑتیں۔

اتنے سارے بچے گھر میں ہوں تو غلط فہمی
پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ان بچوں میں جڑواں بھی
ہوں تو غلط فہمی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ جڑواں بچے
اکثر ہم شکل ہوتے ہیں مریم کو اس غلط فہمی کی
وجہ سے کئی بار مضحکہ خیز صورت کا سامنا کرنا پڑا
مثلاً ایک بچے نے دودھ کے لئے رونا شروع
کیا تو مریم بھاگی بھاگی باورچی خانے میں گئی اس
نے دودھ گرم کیا۔ اور بوتل کو اس بچے کے منہ
سے لگا دیا۔ مگر بچے نے دودھ پینے سے انکار کر دیا
مریم حیران رہ گئی کہ ابھی تو یہ بچہ دودھ کے
لئے بلبلا رہا تھا۔ اب یکایک اسے کیا ہو گیا
پھر اسے خود ہی اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا۔
جو بچہ دودھ کے رو رہا تھا۔ وہ یہ بچہ نہیں تھا
بلکہ اس کا ہم شکل دوسرا بچہ تھا۔

اتنے بچوں کو نہلانا بھی دردِ سر تھا اگر
مریم ہر بچے کو الگ الگ غسل کراتی تو اسے کام
کام میں آدھا دن صرف کرنا پڑتا۔ پھر ہنڈیا روٹی
کون کرتا۔؟ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے
اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے ربڑ کا ایک
بڑا ٹب خرید لیا۔ اسے وقتِ ضرورت ہوا سے

میرا پسندیدہ شعر

دل اگر پھول نہ تھا، کانچ کا ٹکڑا ہوتا
توڑنے والے کو اِک زخم تو آیا ہوتا
اسما حسین ، دہلی

ہمیں کہتی ہے دنیا زخمِ دل زخمِ جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو تم بھی ہو آخر نظر والے
(سائل دہلوی) فریدہ گوہر، نرمل

یہاں شکلِ مہر و وفا کہیں نظر آئے کس طرح ہم نشیں
کہ نگار خانۂ دہر کے ہر اک آئینہ میں غبار ہے
(شرر مونگیری) صبیحہ پروین، آدم پور

آئینہ ٹوٹ بھی جائے تو کوئی بات نہیں
دل نہ ٹوٹے کہ یہ بکتا نہیں بازاروں میں
(جاوید وششٹ) شاہین، نظام آباد

وہ شہرِ دل جو حوادث کی آج منزل ہے
اُجڑ چکا ہے مگر دیکھنے کے قابل ہے
(صبا حسینی) حسین عالم، حیدرآباد

کون کہتا ہے کہ ہم تم میں جدائی ہوگی
یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی
طلعت رخسانہ مختار، جمشید پور

بہت سنجیدگی بھی چوس لیتی ہے لہو دل کا
اِسی خاطر تو ہم زندہ دلی کو پیار کرتے ہیں
(نامعلوم) عالیہ فاطمہ قاضی، بیجاپور

اپنا سر میرے شانے پہ رہنے بھی دو
پھر یہ لمحے کہاں لوٹ کر آئیں گے
(میر عظمت علی کیف، ناگپوری) نثار اختر انصاری، ناگ

کون روتا ہے کسی اور کے غم پر یارو
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا
(ساحر لدھیانوی) رعنا نشاط، آمبور

یقیں کی حد میں عزم مستقل معراجِ عظمت ہے
اے ذوقِ طلب! وہم و گماں سے کچھ نہیں ہوتا
(بہار الہ آبادی) فرح مبین سہروردی، بیڑ

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے محفل کی
(نامعلوم) نسیم اختر دیلوری، مدراس

کہ پابند ہو، مقدر کے سہارے بیٹ
شکستِ عزم سے راہوں کا پیچ و خم
(ماہر لکھنوی) نظیر سہروردی

ڈھونڈتا پھرتا ہوں لوگوں میں شبا
کہ وہ خوابوں میں بھی لگتی ہے خیا
(احمد فراز) نظیر سہروردی

چراغاں کرکے دل بہلا رہے ہو کیا جہ
اندھیرا لاکھ روشن ہو اُجالا پھر اُ
(شکیل بدایونی) شیخ آصفہ بد

دل دھڑکتا ہے تو پہروں نہیں
نیند آتی ہے تو احساس جگا د
(گوہر عثمانی) مہ جبیں

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ ج
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ ج
(اقبال ساجد) رخسانہ ،

بنا بنا کے مٹائے گئے نقوش
ترے بغیر مکمل نہ ہو س
(کیفی اعظمی) ام نجمہ غنیل ، را

اس وقت آپ کو کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے ایسا شعر جسے آپ بار بار سن
یا گنگنانا چاہتی ہیں؟ اُس شعر کے حُسن، اثر اور کیفیت میں دوسروں کو بھی
شریک کیجئے۔ جس کارڈ یا کاغذ پر آپ اپنا پسندیدہ شعر لکھ کر بھیجیں، اس پر اپنا نام، پتہ ضرور
درج کریں۔ اگر معلوم ہو تو شاعر کا نام بھی تحریر کریں۔

"میرا پسندیدہ شعر" ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مریم موشیلا

بیس جڑواں بچوں کی ماں

ممتاز علی

جڑواں بچوں کی پیدائش کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ہم آئے دن یہ خبر سنتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی دو، تین بلکہ چار بچے بھی ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں لیکن برازیل کی مریم موریرا نے دس جڑواں بچوں کو جنم دے کر ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے پہلے خاوند سے سات بار جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ یہ سب لڑکیاں ہیں۔ دوسرے خاوند سے پھر جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ یہ دونوں لڑکے تھے۔ اس کے بعد دو لڑکیاں ایک ساتھ پیدا ہوئیں۔ اس طرح ۴۲ سال کی عمر میں مریم ۲۰ بچوں کی ماں بن گئی۔

مریم جب ۱۶ سال کی تھی تو ایک نجومی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ اس کے ہاں کئی بار جڑواں بچے پیدا ہوں گے۔ مریم نے نجومی کی بات کو ہنس کر ٹال دیا تھا۔ اس کو کیا خبر تھی کہ وہ ایک دو بار نہیں بلکہ دس بار جڑواں بچوں کو جنم دے گی۔ وہ جب ۱۵ سال کی تھی تو اُسے ایک معمولی تاجر سے محبت ہو گئی۔ اس تاجر کی عمر ۲۰ سال تھی۔ ۱۶ سال کی عمر میں مریم کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد اس کی ماں اُسے ایک نجومی کے پاس لے گئی۔ اس نجومی نے مریم کا ہاتھ دیکھا تو وہ حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے کہا "تمہارے یہاں کئی بار جڑواں بچے پیدا ہوں گے۔" حمل کے دوران مریم کو اس بات کا یقین تھا کہ اس کے یہاں لڑکی پیدا ہو گی۔ اُسے نجومی کی پیش گوئی کا بھی خیال تھا۔ اس لئے جب اس نے آنے والے بچے کے لئے کپڑے سینے شروع کئے تو ہر لباس کا جوڑا ہی تیار کیا۔ اس کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ اس کے یہاں دو لڑکیاں ایک ساتھ پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد مریم کے یہاں ہر سال بچے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ہر بار لڑکیاں ہی پیدا ہوئیں۔ جب مریم کی عمر ۴۲ سال کی تو وہ ۲۰ بچوں کی ماں تھی۔ سب سے بڑی لڑکی کی عمر صرف [illegible] سال کی تھی۔ ان بچوں کو پالنے کے لئے اسے گھر کو ایک کارخانہ کی طرح چلانا پڑا۔ اس کام کے لئے محنت اور مستعدی کی ضرورت تھی۔ ایک بچے نے پیشاب کر دیا اس کا جانگیہ بدلنا ہے، دوسرا دودھ کے لئے رو رہا ہے۔ ابھی اُسے دودھ پلایا تو تیسرا پلنگ سے گر پڑا۔ مریم گھر میں جلے پیر کی بلی کی طرح گھومتی پھرتی۔ اُسے روزانہ صبح کو ۵ بجے اٹھنا پڑتا۔ بستر سے اٹھتے ہی وہ باورچی خانے کی طرف بھاگتی۔ بچوں کا دودھ گرم کرتی۔ شوہر کا ناشتہ تیار کرتی۔ جب بچے جاگ جاتے [illegible] رات گئے تک اُسے سونا نصیب نہیں ہوتا۔ مریم کو ایسی کوئی بات یاد نہیں [illegible] نہ وہ سوئی ہو۔ بچوں کو دودھ پلانے سے پہلے بوتلوں کو اُبلتے ہوئے پانی سے دھونا بھی ضروری تھا تاکہ دودھ کی بوتلیں جراثیم سے پاک ہو جائیں۔ دودھ کے ساتھ بچوں کو پھلوں کا عرق بھی پلانا ضروری تھا۔ وہ درجنوں کے حساب سے سنگترے خریدتی۔ انہیں کاٹ کر نچوڑتی۔ اور بچوں کا پیٹ بھرتی۔ اس طرح اسے ہر روز درجنوں بوتلیں بھی دھونی پڑتیں۔

اتنے سارے بچے گھر میں ہوں تو غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ان بچوں میں جڑواں بھی ہوں تو غلط فہمی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ جڑواں بچے اکثر ہم شکل ہوتے ہیں۔ مریم کو اس غلط فہمی کی وجہ سے کئی بار مضحکہ خیز صورت کا سامنا کرنا پڑتا۔ مثلاً ایک بچے نے دودھ کے لئے رونا شروع کیا تو مریم بھاگی بھاگی باورچی خانے میں گئی۔ اس نے دودھ گرم کیا اور بوتل اس بچے کے منہ سے لگا دی۔ مگر بچے نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔ مریم حیران رہ گئی کہ ابھی تو یہ بچہ دودھ کے لئے مچل رہا تھا۔ اب یکایک اسے کیا ہو گیا۔ پھر اسے خود ہی اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا۔ جو بچہ دودھ کے لئے رو رہا تھا، وہ یہ بچہ نہیں تھا بلکہ اس کا ہم شکل دوسرا بچہ تھا۔

اتنے بچوں کو نہلانا بھی دردِ سر تھا۔ اگر مریم ہر بچے کو الگ الگ غسل کراتی تو اسے اس کام میں آدھا دن صرف کرنا پڑتا۔ پھر ہنڈیا روٹی کون کرتا؟ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے ربڑ کا ایک بڑا ٹب خرید لیا۔ اسے وقتِ ضرورت ہوا سے

پھسلایا جا سکتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول بن جاتا۔ مریم اس میں پانی بھر کر صحن میں رکھ دیتی۔ سب بچّے اس میں بیٹھ جاتے۔ مریم اس پانی میں تھوڑا سا صابن ملا دیتی۔ بچّے اس میں بیٹھ کر کلکاریاں مارتے رہتے۔ اس طرح ایک دفعہ ،ی سب بچے نہا لیتے۔

مریم ایک غریب عورت تھی۔ اس کا خاوند ایک معمولی دکان دار تھا، گھر بھی بہت بڑا نہیں تھا۔ اس میں صرف ایک بیڈ رُوم تھا۔ مریم نے ڈرائنگ روم کو بچّوں کی نرسری میں تبدیل کر دیا۔ اب سوال یہ تھا کہ ایک کمرے میں ۱۴ بستر کس طرح لگائے جائیں۔ مریم نے یہ مسئلہ بھی حل کر لیا۔ اس نے دو بڑے گدّے خرید لئے ان دونوں کو ملا کر ایک جہازی بستر تیار ہو گیا۔ اس جہازی بستر کو ۱۴ حصّوں میں تقسیم کیا گیا۔ بستروں کی تقسیم اس طرح ہوئی کہ اس میں ایک یا ڈیڑھ فٹ کے فاصلے سے لکڑی کی چھوٹی چھوٹی دیواریں کھڑی کر دی گئیں۔ اس طرح ۱۴ بستر تیار ہو گئے۔

بچّوں کے غسل اور بستر کا مسئلہ حل ہو گیا۔ تو تیسرا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اتنے سارے بچّوں کو ہوا خوری کے لئے کس طرح لے جایا جائے ہر بچّہ گاڑی میں دو بچّے بیٹھ سکتے ہیں۔ اس طرح مریم کو سات بچّہ گاڑیوں کی ضرورت تھی۔ اُس کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ وہ اتنی بچّہ گاڑیاں خرید سکے اگر وہ گاڑیاں خرید بھی لے تو وہ اور اس کا خاوند صرف دو گاڑیاں ہی چلا سکتے ہیں۔ مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ مریم اور اس کے خاوند کو ایک ترکیب سوجھی۔ انھوں نے منڈی سے سنگترے رکھنے کی خالی پیٹیاں مفت حاصل کر لیں۔ ان پیٹیوں کے نیچے اُنھوں نے پہیے لگائے۔ ہر پیٹی میں دونوں طرف لکڑی کی بنچ بنا دی۔ اس بنچ پر رُوئی کی گدیلے رکھ دیئے ہر پیٹی میں دو بچے آمنے سامنے بیٹھ سکتے تھے ایسی تین چار پیٹیاں ایک ساتھ جوڑ دی گئیں۔ ان پر الگ الگ رنگ کیا گیا، تاکہ ہر بچّہ اپنی سیٹ پہچان لے۔ اس طرح ایک چھوٹی سی ٹرین تیار ہو گئی۔ مریم نے ریل گاڑی کا تصوّر مکمل کر لینے کے لئے اس میں ایک چھوٹی سی گھنٹی بھی لگا دی۔ گھنٹی بجتے ہی سب بچیاں اس میں بیٹھ جاتیں۔ مریم اس گاڑی کو کھینچ کر انھیں باغ میں لے جاتی۔ اس گاڑی کی ایجاد نے محلّے بھر میں دُھوم مچا دی۔ محلّے کے سارے بچّے مریم سے درخواست کرتے کہ وہ بھی ایک دفعہ اس ریل گاڑی کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ مریم گاڑی کو کھینچ کر باغ لے جاتی تو وہاں لوگوں کی بھیڑ اکٹھی ہو جاتی سب حیرت سے اس گاڑی کو دیکھتے اور مریم کی ہمّت کو داد دیتے۔

• بچّوں کا یہ کارخانہ خیر خوبی سے چل رہا تھا کہ مریم پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس کا خاوند اُسے چھوڑ کر چلا۔ مریم اُداس ہو گئی اُسے اپنے خاوند سے بہت محبت تھی اس کی اُداسی اتنی بڑھ گئی کہ اس نے ایک بار خودکشی کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن بچیوں کی شکل دیکھ کر اس میں ذمّہ داری کا احساس پیدا ہوا۔ اُس نے زندہ رہنے اور اپنی بچیوں کو پالنے کا مصمم ارادہ کر لیا انسان میں ہمت ہو تو خدا بھی مدد کرتا ہے، مریم کے خاوند کو بھاگے ہوئے ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مریم کو ایک اور ساتھی مل گیا۔ دونوں نے شادی کر لی۔ دوسرا خاوند پہلے سے بھی زیادہ ذمّہ دار ثابت ہوا۔ اس نے مریم کی ۱۴ لڑکیوں کو اپنی اولاد سمجھا اور اپنی کم تنخواہ کے باوجود مریم اور اس کی لڑکیوں کو تنگی]
دیا۔

مریم کی دوسری ش[ا]
نہ گزرا تھا کہ اُس کے یہاں [
ہوئے۔ اس بار دونوں لڑکے [
کے یہاں ۱۶ بچّے تھے۔ لوگوں [
بچّوں کا یہ سیلاب اب رُک [
سال کے بعد اس کے یہاں پھر [
پیدا ہوئیں۔ اور اُس کے سال [
لڑکیاں ۲۰ بچّوں کے بعد یہ سیلا[ب
مریم کی لڑکیاں جوان [
نے محلّے کے لڑکوں سے راہ و رسم [
بھی ان لڑکیوں سے مزاح کی کیا [
ایک لڑکی سینما جانے کا وعدہ کر [
آنے پر اپنی ہم شکل بہن کو بھیج دیتی [
یہی سمجھتا کہ وہ اپنی محبوبہ کے س[اتھ]
کر وہ اس کی بہن کے ساتھ ہوتا۔
جب یہ راز کھلتا تو لڑکیاں اس کا مذ[اق]
وہ شرمندہ ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ سب لڑکی[اں]
ہو گئیں اور وہ اپنے گھروں کو سدھا[ریں]
پاس صرف ۶ بچّے رہ گئے۔ ان میں نو [
ہیں۔

مریم کا بیان ہے کہ اسے [
بچّوں کی ذمہ داری سنبھالنے میں ا[
پیش نہیں آئی۔ وہ انھیں خدا کا عطیہ [
رہی۔ وہ زندگی بھر مصروف رہی لیکن [
ایک پل کے لئے بھی کوفت کا سامنا [
پڑا۔ اس کا دوسرا خاوند اس سے بہ[
ہے۔ اس کے پیار اور اپنی ممتا کے بل [
۲۰ بچّوں کی پرورش کی ذمّہ داری خیر [
سے نبھا دی۔ ■

سماج

ایس۔ایس۔ چاولہ

ہونی کو انہوں نے ان ہونی سمجھ کر

کر لیا میں تو کہوں گی کہ میرے ماں باپ

...ل رہی تھی۔ انہوں نے پہلے تو گھی اور آگ کو

...کر دیا اور پھر یہ سمجھتے رہے کہ آگ کی تپش

...ی پگھلے گا نہیں۔

ہم مہاراشٹر کے ایک چھوٹے سے

...میں رہتے تھے۔ باپ امیر تو نہیں تھے، مگر اچھے

...نے پیتے لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ میرے

...اور ماں باپ دونوں کو ناز تھا کہ ان کے گھرانوں کا

...مہاراجہ چھترپتی شیواجی کے خاندان سے

...

ہم پانچ بہنیں تھیں۔ میرا نمبر دوسرا تھا۔

...نے دسویں پاس کی اور اس کی اچھی شکل و

...ت اور گن دیکھ کر رشتے کی بات چیت

...جگہ چلی۔ ان ہی دنوں ہمارے پڑوس میں

...کا رہنے والا ایک نوجوان انجینئر آکر

...نے لگا۔ نام تھا نوین راماسوامی۔ تنخواہ تھی

...روپیہ ماہوار۔ ایک بڑا پروجیکٹ

...سے تین میل دور شروع ہو رہا تھا۔

...میں نوین بھی آیا تھا۔ نوین پچیس سال کا ہوگا۔

...رنگ لمبا قد۔ چھریرہ بدن، حلیم، کم گو۔

...رے گھر کے سامنے کے گھر میں وہ کرایہ دار

...کر آیا تھا۔ اور میرے ماں باپ نے پہلی غلطی یہ

...اسے اپنے گھر لے آئے۔ چوں کہ کوئی اچھا

...شہر میں نہیں تھا۔ اس لئے ان کی ضد تھی کہ

...شام کو ان کے گھر کھانا کھائے۔ شاید ان کا

...تھا کہ اتنے بڑے پروجیکٹ میں کوئی اچھا سا

...انہیں بھی مل جائے گا۔ مگر کام کی زیادتی کی

...نوین ہر اتوار کی شام کو ہی آتا تھا۔

ہمارے گھر میں باپ کے سوا کوئی مرد

...تھا۔ ہم سب کے درمیان اب نوین آیا تو بڑی

> نہ معلوم نوین کے دل میں کیا بات سمائی کہ اس نے ایک اتوار کی شام کو کھانا کھاتے ہوئے میرا ذکر گھر بھر کے سامنے کر دیا۔ اس نے کہا سیما ہی کیوں سارا گھر کا کام کرتی ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ روٹی پکاتے ہی دیکھا ہے جب اس کو پڑھائی کا اتنا شوق ہے تو اس کو پڑھائی کے لئے وقت کب ملتا ہوگا!

بہن اس سے گھل مل کر باتیں کر لیتی تھی۔ مجھ سے چھوٹی بہن بہت چنچل تھی۔ وہ نوین کو خوب چھیڑتی رہتی تھی۔ میں خاموش اپنے کاموں میں لگی رہتی۔ میرا کام تھا اسکول جانا۔ گھر میں کھانا بنانے میں مدد کرنا۔ مجھے پڑھائی سے بہت دلچسپی تھی۔ ایک دو دفعہ بڑی بہن نے نوین سے کچھ کہا بھی تھا کہ وہ میری کچھ مدد کرے۔ مگر میں نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔

بڑی بہن کی چھ ماہ کے اندر شادی ہو گئی۔ میں خاموش طبع تھی۔ اس لئے نوین سے کبھی گفتگو نہ کر سکی مگر میری چھوٹی بہن نوین سے کافی بے تکلف ہو گئی۔ نہ معلوم نوین کے دل میں کیا بات سمائی کہ اس نے ایک اتوار کی شام کو کھانا کھاتے ہوئے میرا ذکر گھر بھر کے سامنے کر دیا۔ اس نے کہا "سیما ہی کیوں سارا گھر کا کام کرتی ہے؟ میں نے اسے ہمیشہ روٹی پکاتے ہی دیکھا ہے۔ جب اس کو پڑھائی کا اتنا شوق ہے تو اس بے چاری کو پڑھائی کے لئے وقت کب ملتا ہوگا؟"

یہ بات نوین نے تو سرسری انداز سے کہہ دی مگر ہمارے گھر میں یہ بات بم کی طرح پھٹی اور جب بم پھٹتا ہے تو تباہی لاتا ہے۔ سب حیران تھے کہ نوین نے سیما کے متعلق یہ بات کہنے کی جرأت کیسے کی؟ میں نے بھی حیرت سے نوین کی طرف اس طرح دیکھا جیسے نوین کے سر پر سینگ اُگ آئے ہوں۔ میں سوچ رہی تھی کہ نوین کو میری پڑھائی سے کیا مطلب؟

نوین نے جھجک کے بغیر بات کو آگے بڑھایا "اگر سیما اچھی طرح پڑھ سکے تو وہ پروفیسر، ڈاکٹر یا انجینئر بن سکتی ہے۔ اتنی لائق لڑکی کو گھر کے کھونٹے سے باندھنے سے آپ کو کیا فائدہ؟"

میرے پتا جی نے کہا "ہر گھر کا ایک ماحول ہوتا ہے۔ گھر کے بچے اسی ماحول میں ڈھلتے ہیں۔ اور وہی سانچے ان کو زیب بھی دیتے ہیں۔ سوچو تو سہی اگر سیما زیادہ پڑھ لکھ گئی تو ہمیں اس کے لئے مناسب رشتہ کیسے مل سکے گا؟ پھر عورت خواہ کتنا ہی پڑھ لکھ جائے زندگی میں دو اہم کام اسے ضرور کرنے پڑتے ہیں۔ پہلا گھر سنبھالنا اور دوسرا بچوں کی پیدائش اور ان کی دیکھ بھال کرنا۔ اس لئے سیما جتنا آسانی سے پڑھ لے بس وہی ہمارے لئے اور اس کے لئے ٹھیک ہے۔"

ویسے تو یہ بات یہیں ختم ہو گئی، مگر کئی دنوں میں اس نے اپنے گھونسلے بنا لئے اور یہ ذہن خیال کا تنکا ڈھونڈ کر لاتے اور گھونسلے کو مضبوط بنانے چلے جاتے کہ آخر نوین سیما میں کیوں دلچسپی لیتا ہے؟

گرمیوں کے دن تھے۔ ایک دوپہر کو میں اسکول سے آ رہی تھی۔ مجھے کچھ کتابیں کی جلدیں بندھوانا تھیں۔ دکان دار مصروف تھا۔ گرمی کی وجہ سے پسینہ ہلکی ہلکی نہریں بن کر میرے جسم پر بہہ رہا تھا۔ اتنے میں نوین وہاں سے گزرا اور اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا "یہاں کھڑی کیا کر رہی ہوں؟" میں نے مقصد بتایا تو اس نے کتابیں مجھ سے لے لیں اور دکاندار کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتابیں کل ضرور مل جانی چاہئیں۔

پھر ایک پیڑ کی چھاؤں تلے ہم کھڑے ہو گئے۔ نوین نے کسی تمہید کے بغیر کہا "میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے تمہیں اپنے سپنوں میں سجا لیا ہے۔ میں ان سپنوں کو اصلیت کا روپ دینا چاہتا ہوں۔ میں اگر شادی کروں گا تو صرف تم سے ہی کروں گا۔"

میں اچانک یہ بات سُن کر گھبرا گئی۔ اپنے اُوپر قابو پاتے ہوئے بولی "آپ بے کار نہ سوچیں۔ میری منزل آپ سے بالکل الگ ہے۔ مجھے ابھی بہت پڑھنا ہے اور شادی کے متعلق میں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہے۔"

ہم دونوں کو باتیں کرتے ہوئے میری چھوٹی بہن نے بھی دیکھا اور ایک پڑوسی نے بھی۔ یہ بات ہمارے گھر رائی کا پربت بن کر پہنچی۔ میرے ماں باپ کو بتایا گیا کہ ہم دونوں گھنٹوں ایک دوسرے سے کھڑے باتیں کرتے رہے تھے۔ اس رات ماں نے غصے میں آکر مجھے پہلی دفعہ مارا۔ اور باپ نے کہا "تم میرے خاندان کے ماتھے پر کلنک کیوں لگانے پر تُلی ہوئی ہو؟" میں نے لاکھ صفائی پیش کی، مگر کسی نے میری سُنی ہی نہیں۔

اگلے ایک سال میں نوین نے مجھے قریب بیس بار سڑک پر روکا اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی، مگر میں راستہ کاٹ گئی۔ تاہم گھر میں یہی خبر پہنچی کہ ہم دونوں بہت دیر تک گھل مل کر باتیں کرتے رہے تھے۔ اور ہر بار مجھ پر بُری طرح مار پڑتی۔

کچھ دن بعد اس چھوٹے سے [illegible] کہ نوین نے سیما کے عشق میں ناکام رہنے پر شراب پینی شروع کر دی ہے۔ وہ دیوداس بن گیا ہے اور اسے اپنا ہوش تک نہیں رہتا ہے۔

[illegible] سوال جانا بند کر دیا گیا۔ اب
[illegible] گھر کی روٹی پکانا، برتن مانجھنا، کپڑے
[illegible] دیا گیا تھا۔ میلے کپڑے پہننے میں گھر کی بڑی
[illegible] لگتی تھی۔

کچھ دن بعد اس چھوٹے سے شہر میں
[illegible] آگ کی طرح پھیل گئی کہ نوین نے سیما
[illegible] عشق میں ناکام رہنے پر شراب پینی شروع کر دی،
وہ دیوداس بن گیا ہے اور اسے اپنا
[illegible] تک نہیں رہتا ہے۔

مجھے نوین سے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ لگاؤ
[illegible] حالت کو دیکھتی تو کبھی ہنس دیتی اور کبھی
[illegible] کیا یہی ہے ہندوستانی لڑکی کا مقدر؟
[illegible] نے عشق کیا بھی نہیں ہے۔ اس پر یہ
[illegible] ہے۔ اگر کبھی میں سچ مچ عشق کر بیٹھتی تو کیا
ہوتا؟ طعنے اور مار میرا مقدر بن گیا تھا۔

ایک اتوار کو میں سبزی لینے گئی تو
نوین میرے نزدیک آیا اور اس نے کہا "تمہارے
بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہوتا رہتا ہے جسے
سن کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ چند دن اور
انتظار کرو۔ پھر میں تمہیں اس نرک سے نکال کے
لے جاؤں گا۔"

اس دن پھر میری پٹائی ہوئی۔ میں زندگی سے
اتنی تنگ آ چکی تھی کہ موت کی دعائیں مانگنے لگی۔
اب میں اکثر سوچتی تھی کہ کیوں نہ نوین کے ساتھ چلی
جاؤں۔ اس بدنامی یا نرک سے، اس روز روز کی
مار سے مجھے چھٹکارا تو مل جائے گا۔

دو مہینے بعد ہمارے ایک قریبی رشتہ دار
کی شادی تھی۔ گھر کے سب لوگ اس میں مصروف
تھے۔ اسی گہما گہمی میں مجھے نوین کا سندیسہ
ملا کہ میں اس سے چند لمحوں کے لئے بازار کے آخری
کنارے پر مل لوں تو بہت ضروری کام ہے۔

میں جانے نہ جانے کے مراقبے سوچتی ہوئی وہاں
پہنچی۔ وہ جیپ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے
دیکھتے ہی کہا "سیما! تم اس نرک سے اس
روز روز کی بدنامی سے چھٹنا چاہتی ہو تو میرے
ساتھ اسی وقت چلی چلو۔ یا گھر واپس جانا چاہتی ہو تو
گالیاں سہنے کی خو سن لینا۔"

کسی غیبی طاقت نے جیسے میرے جسم
اور روح کو دھکا دیا اور میں نے اپنا پہلا قدم
جیپ میں رکھ دیا۔

ناسک جہاں سے لڑکی کی [illegible]
[illegible] ہندوستان [illegible] سمجھی جاتی ہے جہاں
[illegible] آدمی لے گھر سے جاتے دیکھتے ہیں وہاں
کتنی آنکھیں نم ہوتی ہیں، وہاں سے میں اکیلی
نکل آئی تھی محض اس لئے کہ میں [illegible]
بدنام کر دی گئی تھی۔ ہم نے ایک چھوٹے سے
اسٹیشن سے گاڑی پکڑی اور ناگپور پہنچ گئے
ہم دونوں کو دیکھ کر نوین کے گھر والے حیران رہ گئے۔
وہ تو نوین کی شادی کسی اچھے گھرانے میں کرنے
کی سوچ رہے تھے۔ آخر سسرال والوں نے
بہو کو قبول کر لیا تاہم ایک مسئلہ ان کے سامنے
تھا۔ ان کے گھر میں جوان بیٹی تھی اور انہیں ڈر تھا
کہ اگر یہ بات اڑ گئی کہ ان کا لڑکا ایک غیر ذات کی
لڑکی کو بھگا کر لایا ہے تو ان کی لڑکی کی شادی کی
راہ میں اڑچن آ سکتی ہے۔

اس مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ نکالا گیا۔ نوین
سے میری شادی شہر کے ایک دور دراز کے
[illegible] مندر میں ہوئی اور اس شادی کو [illegible]
[illegible] رکھا گیا ہے۔ [illegible] ماں باپ برادری
کے ساتھ آتے تو انہیں شادی کے [illegible]
[illegible] میں [illegible]
[illegible] ساتھ تھا۔ وہ [illegible] انہوں نے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] میں انہوں نے نوین [illegible]
نکال دیا۔

ہم کچھ اتنے دن [illegible] جہاں
نوین کو کبھی کام ملتا کبھی نہ ملتا۔ زندگی کی گاڑی
مشکل سے چل رہی تھی۔ کبھی کھانے کو مل جاتا
اور کبھی فاقہ رہتا۔ [illegible] مکان کا کرایہ بھی
نہ دے پاتے۔

میں نے [illegible] شروع کر دئے۔
[illegible] میں ایک [illegible] رہتے تھے۔ انہوں
نے اور ان کی بیوی نے مجھے بیٹی بنا لیا [illegible]
مجھے اپنا [illegible]
ان [illegible] کرتا [illegible] آخر [illegible] میں ہم اپنے
پاؤں پر [illegible] سے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے آنگن
میں چھوٹا سا چاند بھی اتر آیا۔ ہم نے اپنے لڑکے کا
نام مہیش رکھا۔

نوین نے اب اپنا کام شروع کر دیا تھا

اور ہمارا سفر کانٹوں کی راہ سے مڑ کر پھولوں کی راہوں پر آگیا تھا۔ رمیش بڑا ہو گیا۔ اپنے شہر سے دور ایک بڑے کالج میں وہ لیکچرر ہو گیا تھا۔ اس کی دوستی ایک بہت بڑے گھرانے کی لڑکی کملا سے ہو گئی۔ ہم نے دونوں کی محبت کا احترام کیا اور ان دونوں کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔

رمیش اور کملا نے مجبور کیا کہ میں اور نوین ان کے پاس چند دن آکر رہیں۔ ہم ان کے یہاں چلے گئے۔ گیارہویں دن کی بات ہے کہ کملا کی ماں اور اس کی کچھ رشتہ دار عورتیں بھی مدعو تھیں۔ باتوں باتوں میں کہیں میں نے کہہ دیا کہ کملا کی باتوں میں ابھی بچپن ہے۔ کملا کی ماں نے اس بات کو چوٹ سمجھا اور تڑ سے کہہ دیا "ہم نے تو کملا کو ہر اس گن سے آراستہ کیا ہے جس کی کسی بھی ہندوستانی لڑکی کو شادی شدہ زندگی میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ آخر اس میں کیا کمی ہے؟ یہ بھی سن لو کہ یہ نہ کہنا! بیا ہتا ہے، گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی نہیں ہے۔" اتنا کہہ کر وہ غصے میں اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے ساتھ مہمان عورتیں بھی چلی گئیں۔

میرا منہ غصہ سے لال تھا اور جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ بات صرف رمیش کے منہ سے نکل کر ہی ان تک پہنچ سکتی ہے۔ تو کیا رمیش اپنی ماں کے متعلق ایسی باتیں کر سکتا ہے؟

رمیش رات کو دیر سے آیا تو کملا نے اس کے خوب کان بھرے۔ رمیش مجھ پر بری طرح برس پڑا۔ "ماں، ہمارا سماج میں ایک مقام ہے۔ آپ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ کملا کی برائی اس کی ماں کے سامنے کریں؟"

اس ساری رات کو میں روتی رہی۔ صبح کو میں نے نوین سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ نوین چاہتا تھا کہ یہ بات کسی طرح ٹھنڈی پڑ جائے آخر ایک ہی بیٹا ہے۔ اس سے بھی لڑ لیا گیا تو دنیا میں دوسرا کون سا گھر ہے آنے جانے کا۔ مگر میں غصے میں بھری پڑی تھی اس لئے اس دن ایک دفعہ پھر میں نے اپنے شوہر، بیٹے اور بہو کو چھوڑ کر اپنی راہ لی اور اپنے گھر چلی آئی۔

دوسرے دن نوین آگیا۔ میں چوٹ کھائی ناگن کی طرح تھی جو اچھل اچھل کر وار کرتی ہے۔ میں نے قسم کھائی کہ میں اب ترقی کی معراج پر پہنچ کر ہی دم لوں گی۔ میں نے اپنے کام کو بڑھا دینے کا ارادہ کیا۔ سرنارفی ماں کی ٹریننگ کام آئی اور اچار، مربے، چٹنی، اسکواش، سیرپ کے کام کو بڑھانے کی دھن میرے دماغ میں سما گئی۔ دو سال کی انتھک محنت کے

> میں سب سے ناراض ہو سکتی تھی مگر اس معصوم بچی پر کیسے خفا ہوتی جو مالا بکھر گئی تھی اسے بچی کی آمد نے پھر پرو دیا۔

بعد میرے مال کی مانگ دیس کے کونے کونے سے آنے لگی پھر غیر ملکی آرڈر بھی ملنے لگے۔ تیسرے سال میں خود باہر کے ملکوں میں اپنے مال کو فروغ دینے کے لئے گئی۔ اس درمیان رمیش اور کملا کئی بار آئے کہنے لگے "ہمیں معاف کردو" مگر میں تو جیسے پتھر دل کی ہو گئی تھی۔ میرے تجربے نے مجھے بتایا تھا کہ یہ سماج غریب، محتاج اور گرتے ہوئے انسانوں کو تو ٹھوکر پر ٹھوکر مارتا ہے مگر دولت مند اور رسوخ والوں کے آگے اپنی ناک رگڑتا ہے۔ میں نے پہلی زندگی کا مزہ تو خوب چکھا تھا۔ اب میں دوسری زندگی کا مزہ دیکھنا چاہتی تھی۔

میری دولت روز بروز بڑھ رہی تھی اب فیکٹری میں ہزاروں آدمی کام کرتے تھے نوین نے اپنا کام چھوڑ کر میری مدد کرنی چاہی مگر میں نے اس سے مدد لینے سے انکار کر دیا۔

رمیش اور کملا کے گھر بیٹی پیدا ہوئی۔ بچی دو ماہ کی ہوئی تو وہ دونوں بچی کو لے کر خود میرے پاس آئے اور انہوں نے بچی کو میری گود میں ڈال دیا۔ بچی میری گود میں آکر مسکرانے لگی اور اس نے میرے ہاتھ کی ایک انگلی مضبوطی سے پکڑ لی۔ ممتا کا اتھاہ دریا کنارے توڑ کر باہر آنے کو تیار تھا۔ میں سب سے ناراض ہو سکتی تھی، مگر اس معصوم بچی پر کیسے خفا ہوتی؟ جو مالا بکھر گئی تھی، اسے بچی کی آمد نے پھر پرو دیا ہم نے ایک ماہ بعد اپنی پوتی کی آمد کی خوشی میں ایک زبردست پارٹی دینے کا پروگرام بنایا۔ نوین، رمیش اور کملا نے مجھے نہیں بتایا، مگر انہوں نے میرے مائیکے اور سسرال کے سب لوگوں کو بلاوا بھیجا۔ وہ سب بخوشی چلے آئے۔ اس پارٹی میں کئی وزیر، کئی ملکوں کے سفیر، ملک کے چوٹی کے صنعت کار شامل تھے۔ اخباروں اور رسالوں کے نمائندہ اور فوٹو گرافر بھی آئے تھے۔ نوین نے کہا "سیما مجھے تم پر ناز ہے"۔ ماں باپ اور سسرال والے میرے آگے بچھے جا رہے تھے۔

گھروں میں، محفلوں میں اس پارٹی کا چرچا کئی دن تک جاری رہا۔ ہر جگہ میری تعریف کی جا رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ کیسا سماج ہے؟ اسی سماج نے کبھی مجھ پر کیچڑ اچھالے تھے اور مجھے زمین کی مٹی کا ایک حصہ بنا دیا تھا۔ آج وہی سماج مجھے آکاش پر چڑھا کر میری تعریف کر رہا تھا۔ ●

شہناز حسین

بیوٹی کالج

وس میں ہندوستانی سنگھار کے سامان نے تہلکہ مچادیا

رُوس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ
ال عورتیں مغربی ممالک کی عورتوں کی طرح میک اپ
ں کرتیں ۔ فیشن ایجاد کرنے کے بڑے بڑے ادارے
لایں ۔ روس میں تمام تجارت سرکار کے ہاتھ میں ہے۔
ں جب روس جانے کے لئے تیار ہوئی تو مجھے اندیشہ
ا کہ میرا سفر ایک کامیاب سفر ثابت نہیں ہوگا گذشتہ
ال ہندوستان کا یوم آزادی روس میں منایا گیا تو اِس
قعہ پر ہندوستان کی حکومت نے وہاں ایک نمائش
نتظام کیا ۔ ٹریڈ فیئر اتھارٹی کے سربراہ جناب محمد یونس نے مجھے
ہ دستانی وفد میں شامل ہونے کا مشورہ دیا ۔ گجرات
، وزیر اعلیٰ سولانکی کو اس تجارتی میلہ کا افتتاح کرنا
ا ، روس میں غضب کی سردی پڑتی ہے لیکن اگست
ہینہ بہت خوش گوار تھا ۔ ہم لوگ ماسکو پہنچے تو دوسرے
ز ہی نمائش کے کام میں مصروف ہو گئے ۔

ہندوستانی میلہ کا افتتاح بڑی دھوم دھام
سے ہوا ۔ دونوں ملکوں کا قومی ترانہ بجایا گیا مسٹر سولانکی
نے میلہ کا افتتاح کیا مجھے ایک اسٹال مل گیا جہاں
ہندوستان کی جڑی بوٹیوں سے بنائی ہوئی کریم اور
دوسری مصنوعات دکھانا تھیں ۔ مجھے روسی زبان کا
ایک لفظ بھی نہیں آتا ۔ ویسے اشاروں کی زبان ایک
بین الاقوامی زبان ہے ۔ لیکن اشاروں سے لیکچر تو نہیں
دیا جاسکتا ۔ روس کی حکومت نے مجھے ایک رُوسی
خاتون مہیا کر دی ۔ یہ میری باتوں کا روسی زبان میں
ترجمہ کرتی تھی ۔ اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کے پویلین
میں میری مترجم لوڈ دیلانے میری تقریر کا بہت اچھا
ترجمہ کیا ۔ میں نے وہاں موجود عورتوں کو بتایا کہ
بازار کی بنی ہوئی مصنوعات جن میں مصنوعی چیزیں
ملی ہوتی ہیں ۔ انسان کی صحت اور جلد کے لئے
خراب اور نقصان دہ ہیں ۔ اس کے برعکس قدرتی
جڑی بوٹیوں میں صحت اور خوب صورتی کا راز چھپا
ہوتا ہے ۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہندوستان میں یہ
گھریلو نسخے صدیوں سے استعمال ہوتے ہیں یہ کم خرچ
بھی ہیں اور فائدہ مند بھی ۔ ہندوستان نے اس سلسلے
میں پہل کی ہے ۔ یہ پہلا ملک ہے جہاں اس ضمن میں
کام ہو رہا ہے ۔ ہندوستان میں ہم نے میک اپ
کا طریقہ بدل دیا ہے ۔ لوگوں کو بازاری اور مہنگی چیزیں
استعمال کرنے کے بجائے انہیں صدیوں پرانے تجربوں
سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی ہے ۔ میں نے یہ بھی
کہا کہ یہ سب زبانی جمع خرچ نہیں ہے ۔ بلکہ میں آپ
لوگوں پر یہ بات ثابت کرنے آئی ہوں کہ قدرتی جڑی
بوٹیوں سے جلد کو کتنا فائدہ پہنچتا ہے ۔ میں آپ کا
مفت میک اپ کروں گی ۔ اس کے بعد آپ کو
خود ہی میری بات کا یقین آجائے گا ۔

میرا خیال تھا کہ میرے بیان کے بعد روسی
عورتیں جھجکتے جھجکتے مجھے پرکھنے کے لئے آئیں گی لیکن میرا
یہ اندازہ غلط نکلا ۔ میرا بیان سن کر جیسے سیلاب کا بند
ٹوٹ گیا ۔ عورتوں کا ایک ریلا میری طرف بڑھا اور
میک اپ کی کرسی کے لئے چھینا جھپٹی ہونے لگی میرے
ساتھ ایک مددگار لڑکی بھی تھی ۔ اس کا نام فرح ہے
ہم دونوں کے درمیان ایک ہی کرسی تھی اس لئے
اسٹال میں پانچ کرسیوں کا انتظام کیا گیا ۔ عورتوں کا
ہجوم دیکھ کر ہم نے ہر امیدوار کو صرف تین منٹ کا
وقت دیا ۔ ہر تین منٹ کے بعد جب میک اپ کی
کرسی خالی ہوتی اور عورتوں کی ایک فوج اس پر قبضہ
کرنے کے لئے آگے بڑھتی ۔ میں پریشان تھی کہ اس
بھیڑ کو کیسے قابو میں لایا جائے ۔ میں نے ان عورتوں
کے نمبر الاٹ کئے ۔ تاکہ وہ صبر سے انتظار کریں ۔
جب ان کا نمبر پکارا جائے تب ہی کرسی پر بیٹھیں ۔
اس طرح کچھ امن وامان قائم ہوا ۔ اور ہم لوگ

اطمینان سے تمام دن کام کرتے رہے۔

دوسرے روز مجھے ڈر تھا کہ گذشتہ روز کی پبلسٹی عورتوں کی فوج میں اضافہ کردے گی۔ اس دھکم پیل میں کیا ہوگا؟ لیکن اسٹال پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اسٹال کے باہر زنجیر لگادی گئی ہے عورتیں اس زنجیر کے باہر ہی انتظار کریں گی۔ یہ انتظام دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ہمارا اسٹال ایک بالکنی میں ہے میلے کے منتظمین کو اندیشہ تھا کہ عورتوں کے بوجھ سے پورا برآمدہ ہی ٹوٹ کر نیچے نہ آپڑے۔ اس زنجیر سے بھی عورتوں کے جوش وخروش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی عورتوں کی دھکم پیل سے یہ زنجیر دوبار ٹوٹی۔ ہم نے اسٹال کے باہر ایک بورڈ لگایا تھا جس پر لکھا تھا جڑی بوٹیوں کے سنگھار، ۱۱ بجے سے ۱۲ بجے تک لیکن کام شروع ہونے کے بیس منٹ کے اندر اتنا ہجوم جمع ہوگیا کہ ایک روسی منتظم دوڑا دوڑا میرے پاس آیا اور مجھے تنبیہ کی کہ اگر میں نے ان لوگوں کو نہ روکا تو بالکنی گر جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ ایک گھنٹہ کام کرو اور ایک گھنٹہ آرام۔ اس طرح تمہیں بھی تھوڑا سکون ملے گا۔ اور بالکنی بھی گرنے سے بچ جائے گی۔ میری مترجم نے یہ پیغام وہاں کھڑی روسی عورتوں کو سنایا۔ لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ عورتیں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ انھوں نے کہا بالکنی گرتی ہے تو گرنے دو۔ ہم گریں گے تو ہندوستانی عورت اور اس کے سنگھار کے سامان کے ساتھ گریں گے۔

ہم نے منتظم کے اصرار پر اس کی بات مان لی اور ایک گھنٹہ کے وقفے سے کام کرنا شروع کردیا۔ ہم ایک گھنٹہ کے بعد کام بند کردیتے۔ ہمیں امید تھی کہ اس وقفہ میں یہ عورتیں بھی ہمارا پیچھا چھوڑدیں گی۔ لیکن توبہ کیجئے اس وقفے میں بھی وہ وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ منتظم نے مجھ سے کہا کہ آئندہ آپ اپنا اسٹال گراؤنڈ فلور پر لگائیں تاکہ اس کے گرنے کا احتمال نہ رہے۔

میں نے اسٹال پر ایک کاپی رکھ دی تھی جو عورت مجھ سے میک اپ کراتی، اس کتاب میں اپنی رائے لکھ دیتی۔ جب میں نے یہ کاپی دیکھی تو تقریباً ہر عورت نے ایک ہی بات لکھی تھی تم یہاں سے واپس ہندوستان نہ جاؤ۔ ہمیں اتنا ہی خوب صورت بنا دو جتنی کہ ہندوستانی عورت ہوتی ہے۔

ماسکو کے ٹیلی ویژن نے ہمارا اسٹال دکھایا۔ اخباروں نے بھی ہمارا تذکرہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ روس میں کوئی پرائیویٹ ادارہ ہمارا سامان نہیں خرید سکتا۔ ساری خریداری حکومت کے ذمہ ہوتی ہے۔ میرے سنگھار کے سامان کی فہرست کافی لمبی تھی۔ اس میں ۵۵ چیزیں تھیں۔ حکومت نے لوگوں کا شوق دیکھا تو روس کے نائب وزیر ہمارے اسٹال پر آئے انھوں نے اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن سے اس بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا تم روس کا سمیٹک بنانے والوں سے ملی ہو؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ دوسرے روز میک اپ انڈسٹری کے چار افراد مجھ سے ملنے آئے ان میں دو عورتیں اور مرد تھے۔ انھوں نے مجھ سے دواؤں کے نسخے طلب کئے۔ اس کے بعد ایک اور وفد بھی مجھ سے ملا اور ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کی درآمد کے متعلق سوالات کئے۔

میلے کا اختتام ہوا تو ہم لوگ ہندوستان واپس آئے۔ روس کا سفر بہت دلچسپ رہا میں جب بھی بازار میں نکلتی لوگ مجھے پہچان جاتے اور کہتے "ہمیں ہندوستان سے محبت ہے۔"

جوابا

۱۔ غلط۔ زہریلی چیز جب معدے سے اوپر آئے گی تو ہوا کی نالی اور نرخرہ کو اتنا ہی نقصان پہنچائے گی جتنا معدے میں داخل ہونے کے دوران پہنچا سکتی ہے۔ البتہ بعض حالات میں قے کرانا ضروری ہوسکتا ہے بہتر یہ ہے کہ مریض کو فوراً اسپتال لے جائیں۔

۲۔ غلط۔ نکسیر پھوٹنے کا سبب یہ ہے کہ ناک کی اندرونی جھلی پھٹ جاتی ہے۔ باربار ناک سنکنے والوں کو اس پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر روئی کو ناک میں بھر دیں تو اس سے یہ خرابی پیدا ہوتی ہے کہ روئی ہٹانے سے جھلی پھر پھٹ جاتی ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ سیدھے بیٹھ جائیں۔ سر کو پیچھے کی طرف لے جاکر انگلی اور انگوٹھے سے ناک کو بند کریں پانچ منٹ انتظار کریں۔ نکسیر بند ہوجائے گی۔ اگر افاقہ نہ ہو تو کھلی ہوئی برف ناک پر رکھیں۔

۳۔ غلط۔ ہلکا کھانا کھانے سے جو کمی پیدا ہوتی ہے، بھاری ناشتہ اس کی تلافی کردیتا ہے۔

۴۔ صحیح۔ جگر کا وزن انسانی جسم کا [illegible] حصہ ہوتا ہے۔

۵۔ صحیح۔ شدید درد سر کے مریض تخلیقی قوت کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ بہت حساس بھی ہوتے ہیں۔ عورتوں میں یہ مرض مردوں سے اتنا زیادہ پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس فرق کی وجہ معلوم نہیں کرسکے۔

ذہنی ورزش

انعام:
ایک سوان
پریشر کوکر

اپنی ذہانت کو آزمائیے، اپنی معلومات کا امتحان لیجئے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوان پریشر کوکر حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوئے تو انعام پانے والے کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا
اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔
۲۰۔ جون ۱۹۸۵ تک ہمیں ملنے والے جوابات اس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۔ انڈین نیشنل کانگریس کس سنہ میں قائم ہوئی تھی؟

۲۔ ۶۔ مئی ۱۸۶۵ کو ہندوستان کی دو عظیم ہستیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے نام کیا ہیں؟

۳۔ اردو کا سب سے پہلا ڈراما کس نے لکھا تھا؟

۴۔ اردو کا سب سے ضخیم داستان کا نام کیا ہے؟

۵۔ دلی کے مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلے کا مزار دلی کی کس درگاہ میں واقع ہے؟

۶۔ موجودہ لوک سبھا میں ایک فلمی اداکارہ منتخب ہوئیں ان کا نام کیا ہے؟

۷۔ میگھالیہ کی راج دھانی کا نام کیا ہے؟

۸۔ جوٹ (پٹ سن) دنیا کے کس ملک میں پیدا ہوتی ہے؟

۹۔ ہندوستان میں سونے کی کان کون سی ریاست میں ہے۔

۱۰۔ کشش ثقل کا قانون کس سائنس داں کی دریافت ہے؟

ذہنی ورزش نمبر

۱
۲
۳
۴
۵
۶
۷
۸
۹
۱۰

نام : ....

پتہ : ....

رمضان المبارک میں

فیوض و برکات سے مالا مال ہونے کے لئے

اسلامی کتب

کا مطالعہ فرمائیے اور ایمان کو تازہ کیجیے

اسلامی نام — مختار — 16/-
آئینۂ کملیات — صوفی عزیز الرحمٰن مرحوم (پانی پتی) — 20/-
آثار نبوت — مجاز اعظمی — 4/-
اسلامی تاریخی کہانیاں — عبدالمومن الفاروقی — 4/-
انسانیت کا پیغام — وحید الزماں قاسمی — 4/-
اصلاح الرسوم — مولانا اشرف علی تھانوی — 4/-
اسلامی آداب — وحید الزماں قاسمی — 4/-
اسلام کا تبلیغی نظام — مولانا عبدالقیوم — 2/-
اسلامی اخلاق — مصطفےٰ احسن — 3/-
اسلام اور فیملی پلاننگ — علامہ زید ابوالحسن فاروقی — 7/-
درس قرآن — مولانا فرصغ احمد — 4/-
دعائے گنج العرش — مختار — 3/-
روشنی کے مینار (حصہ اول) — ضیاء تسنیم بلگرامی — 20/-
روشنی کے مینار (حصہ دوم) — ضیاء تسنیم بلگرامی — 20/-
حیات المسلمین — مولانا اشرف علی تھانویؒ — 5/-
جنت کا راستہ — مفتی حفیظ الدین
خدا کا انعام — وحید الزماں قاسمی — 3/-
کتاب الطہارت — مفتی حفیظ الدین
معجزات النبی — مولانا احتشام الحسن — 1/50
معارف السنۃ — مولانا احتشام الحسن — 1/50
مدنی زندگی اور غزوات اسلام — مولانا عبدالقیوم — 10/-
عہد رسالت کی مقدس خواتین — زاہد رضوی — 2/50
قرآن اور عورت — النور علی — 2/-
رسول خدا کے اخلاق — مولانا عبدالقیوم — 2/50
شہید اسلام — صادق حسین سردھنوی — 1/50
سیرت فخر دو عالمؐ — م۔ عطاء اللہ خاں — 8/-
تعبیر نامہ خواب (عربی) علامہ محمد بن سیرین — (اردو ترجمہ) سید حبیب احمد ہاشمی — 8/-
تعبیر خواب — احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 12/-
اعمال قرآنی — مولانا اشرف علی تھانویؒ — 14/-
مکتوبات نبویؐ — مولانا سید محبوب رضوی — 8/-
رحمت عالمؐ — سید سلیمان ندوی — 14/-
7/-

قرآن حکیم مترجم رنگین مع مکمل تفسیر بیان القرآن (مجلد چرمی) — مولانا اشرف علی تھانوی — 160/-
تفسیر مکمل بیان القرآن (دو حصوں میں مجلد چرمی) — 240/-
المنجد (عربی اردو لغت میں سب سے بڑی) مجلد چرمی — 100/-
شہید اعظم — مولانا ابوالکلام آزاد — 5/-
سیدہ کا لال — علامہ راشد الخیری
آمنہ کا لال — علامہ راشد الخیری — 5/-
خم خانۂ تصوف (جدید تذکرۂ اولیائے ہندوپاک) — ڈاکٹر ظہیر الحسن شارب — 25/-
تذکرۂ جمیل (سوانح مخدوم صابر کلیریؒ) — حاکم علی پیرزادہ — 10/-
دلی کے بائیس خواجہ — ڈاکٹر ظہیر الحسن شارب — 28/-
معین الہند — ڈاکٹر ظہور الحسن شارب — 15/-
انوار حرم (نعتیں اور سلام) — مولانا علیم اختر مظفر نگری — 2/-
اللہ والے سیریز ۱ — ڈاکٹر ظہور الحسن شارب — 5/-
اللہ والے سیریز ۲ — ضیاء تسنیم بلگرامی — 4/-
اللہ والے سیریز ۳ — ابوالمنصور سرہدی — 4/-
اللہ والے سیریز ۴ — ڈاکٹر ظہیر الحسن شارب — 4/-
اللہ والے سیریز ۵ — ابوالمنصور سرہدی — 4/-
اللہ والیاں — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 20/-
اسلامی روزے — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 10/-
رہنمائے سفر حج — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 18/-
مسلمان فاتحین — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 15/-
ہماری نماز — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 10/-
ہمارے پیغمبر — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 15/-
ہمارے ولی — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 11/-
کربلا سے کوفہ تک — تالیف: سید منظم تمار پرولانہ ردولوی — 7/-
شاہنامۂ کربلا — سید منظم تمار پرولانہ ردولوی — 12/-
اسماء الحسنیٰ — مرتبہ: عمر الہی — 6/-
کلمۂ طیبہ کی برکت اور درود شریف کی فضیلت — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 17/00
بیماریوں کا روحانی علاج — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 10/-
خدا کے دوست — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 8/-
رہنمائے عملیات — مرتبہ: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی — 15/-

آج ہی ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر گھر بیٹھے وی پی ڈاک سے منگوائیے یا اپنے اخبار فروش سے طلب کیجیے!

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں

مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیرون ملک منگوانے والے اپنے ملک کے لئے قیمت اور محصول ڈاک معلوم کرنے کے لئے تحریر فرمائیں پھر ڈرافٹ بھیجیں

●● آپ کو ہندوستان کے کسی بھی گوشے میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں اردو، انگریزی، ہندی، پنجابی کتابیں یا رسائل منگوانے ہوں تو فوراً ہماری خدمات کا موقع دیجئے۔ غیر ممالک میں ہر شہر سے ایجنٹ بنائے جا رہے ہیں۔

ہما نئی دہلی

اکرم فاروقی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی

اُس بستی اور برادری کی دیرینہ روایات کے مطابق زاہد علی کو نکاح کے بعد چار دن اپنی سسرال ہی میں قیام کرنا تھا۔ شادی کی رسموں کے بعد برات واپس جا چکی تھی صرف دولہا میاں اور ان کے قریبی دوست حشمت خاں وہاں مقیم تھے۔ لڑکی والے کام کاج سے بے حد تھک چکے تھے، لیکن ان کے چہرے اس حقیقت کے گواہ تھے کہ وہ لڑکی کی شادی کے بعد تھکن کے باوجود بے پایاں سکون محسوس کر رہے ہیں۔

عام نوجوانوں کی طرح زاہد نے بھی شادی سے پہلے اپنے دل میں ایک خوب صورت سی دنیا آباد کر رکھی تھی، وہ شدّت سے ان لمحات کا منتظر تھا جب وہ پہلی بار کاظمہ کو دیکھے گا۔ اُس نے سُنا تھا کہ کاظمہ بہت دل کش نقش و نگار کی جاذب نظر لڑکی ہے۔ لمحہ لمحہ اُس کا اشتیاق اور اضطراب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ اس رات میلاد شریف کی آراستہ ہوگی جو سحر تک چلے گی، اور قبیلے کے دستور کے مطابق دولہا کو بھی اس میں شرکت کرنا ہوگی تو وہ اپنی ذات کے حصار میں بل کھا کر رہ گیا۔ دراصل پانچ سو کلو میٹر دور گاؤں کے رسم و رواج زاہد کے گاؤں کے رواجوں سے بالکل مختلف تھے، لیکن بہرحال اُسے سرِ تسلیم خم کرنا تھا۔

شام کے کھانے کے لئے بیٹھک میں دستر خوان بچھا دیا گیا تھا۔ کاظمہ بیاہ کا سُرخ جوڑا پہنے اِس طرح کام کاج اور خاطر داری میں لگی تھی جیسے وہ اپنی نہیں کسی سہیلی کی شادی کی دعوت کا اہتمام کر رہی ہو، لیکن اتنی بھاگ دوڑ اور مصروفیات کے باوجود کوئی کانٹا تھا جو رہ رہ کر اس کے ذہن میں اُبھرتا اور دھیرے سے کسی

نس میں اِس طرح چھپ جاتا کہ وہ ترتیب کردہ جاتی پھر دوسرے لمحے یہ سوچ کر اُسے قرار آجاتا کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

دراصل کاظمہ نے بیاہ کا جوڑا پہلی بار نہیں، دوسری بار پہنا تھا اور زاہد اس حقیقت سے ناواقف تھا۔ اس کے گھر والوں کے علم و اطلاع کے مطابق کاظمہ ایک کنواری لڑکی تھی۔ بیچ والوں نے اس بات کو اس لئے صیغۂ راز میں رکھا تھا کہ کاظمہ کی شادی میں کوئی رخنہ نہ پڑے۔ لڑکی والوں نے کسی ایسے شخص کو بھی مدعو نہیں کیا تھا جو اس راز سے پردہ ہٹا سکتا۔ اس طرح پوری رازداری کے ساتھ یہ بیل منڈھے چڑھی تھی۔ لیکن کاظمہ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ کسی نہ کسی دن جب زاہد کو حقیقت کا علم ہوگا تو اُس کا کیا ردِ عمل ہوگا۔

دو سال پہلے جب کاظمہ نے پہلی بار بیاہ کا سُرخ جوڑا پہنا تھا تو اس وقت اُس کے جذبات آج سے بالکل مختلف تھے۔ اس دن اس کے دل میں نہ کوئی خوف تھا نہ وسوسہ، بلکہ بیکراں خوشی تھی۔ گو عام لڑکیوں کی طرح رخصتی کے وقت وہ بھی روئی تھی۔ لیکن دل کی منڈیروں پر اُس کے جو دیپ مالائیں سجائی تھیں انہوں نے رنگ و نور کا ایک ایسا ماحول پیدا کردیا تھا جس میں ترنم تھا، ساز تھا، ایک ایسا وجد آفریں کیف تھا جس نے اس کے خوابوں کو بھی بدامال کر دیا تھا

لیکن وہ ہفتے میں ایک دن اسکول جاکر مہینے بھر کے دستخط رجسٹر حاضری پر کر آتا اور کوئی محکمۂ تعلیم کا افسر اس کی غیر حاضری کا جواب طلب کرکے اپنی نوکری کو الجھن میں ڈالنے کا جوکھم مول نہیں لیتا تھا اس طرح اسکول سے اُس کا ماہانہ وظیفہ بندھا ہوا تھا۔ دن بھر اپنے کھیتوں پر رہنا، کھلیانوں کی نگرانی کرنا یا چوپال پر بیٹھ کر گاؤں کے بھولے بھالے کسانوں کے جھگڑے نمٹانا اُس کا معمول تھا۔ جو اُس کے فیصلے کو نہ مانتا وہ دارو غہ جی سے کہہ کر اس کا چالان کرکے سرکاری مہمان بنوا دیتا۔ اس لئے عام لوگ اُسے ماسٹر جی کے نام سے نہیں، چھوٹے پردھان جی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

> کاظمہ جب دُلہن بن کر رئیس احمد کے گھر آئی تو گاؤں میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ سب ہی نے شادی کی تقریبات میں اپنی اپنی حیثیت کے مطابق بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور پوری گرم جوشی کے ساتھ شادی کا کام کاج کرایا۔

راج کماروں کا راج کمار دیتا کہ کسی وزیر حکومت کا جلال تھا۔ شادی سے پہلے اُس نے دل میں جو رنگا رنگ خاکے بنائے تھے، وہ کچھ اور تھے۔ اُس نے اکثر اپنے خواب آگیں تنہائیوں میں سوچا تھا کہ اُس کا دولہا اُس کی طرح دِل کش نقش و نگار کا مالک ہوگا، گورا چٹّا رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑی چھاتی غلافی آنکھیں، ستواں ناک۔ لیکن رئیس احمد خوب صورت تھا نہ دل کش، وہ سانولا تھا، چیچک رو تھا، پستہ قد تھا۔ یہ سب کچھ بھی نبھ جاتا اگر وہ خوش کلام ہوتا، خوش اخلاق ہوتا اور دامن نواز ہوتا۔

ابھی شادی ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ بے چاری دُلہن کو حکم ہوگیا کہ وہ چولہا چکی سنبھالے، یوں مہارانی بنے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ کسان کے گھر تو دس کام ہوتے ہیں بہو تو ہوتی ہی اس لئے ہے کہ وہ ساس نندوں کا ہاتھ بٹائے بلکہ ساس کو مسہری پر بٹھا کر خود تیلی کے بیل کی طرح جٹ جائے اور نندوں سے بھی کہہ دے کہ وہ بھی آرام سے بیٹھیں، سارا کام دھام بہو خود سنبھالے گی، کاظمہ کپڑے دھوتی، مسالہ پیستی، اناج پھٹکتی، ودی ہوتی سانی کرتی اور گھر بھر کی روٹی بناتی۔

پاؤں کی جوتی بتاتا اور کبھی ملازمہ کے لقب سے نوازتا۔ دراصل اس کے خیالات فرسودہ، مکروہ اور غیر اسلامی تھے، اور یہی وجہ تھی کہ جب ظلم و تشدد کا پیالہ لبریز ہو گیا تو ایک دن جوالا مکھی پھٹ گیا۔ گھر میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوا۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے دبی دبی زبان میں کاظمہ کی حمایت کی اور اس کے ابا اور بھیا سے سارا حال کہہ سنایا۔ پنچایت ہوئی اور نوبت مقدمے بازی تک پہنچ گئی، آخر بات طلاق پر آکر ختم ہو گئی۔ عورتیں طلاق ملنے پر عموماً رو یا کرتی ہیں لیکن کاظمہ نے شکرانے کے دو نفل پڑھے اور اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کیا کہ اس نے بڑے پیر صاحب کی نیاز دلائی۔ لیکن وہ اپنے والدین اور بھائیوں کے لئے ایک بار پھر مسئلہ بن کر ان کے سامنے آگئی تھی، حالانکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوبارہ اس کا کہیں نکاح ہو، اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اللہ رسولؐ کرکے اپنی زندگی گزار دے گی۔ لیکن اس سماج کو کیا کہا جائے جو جوان بیوہ، یا مطلقہ کو پھوٹی آنکھ نہیں دیکھتا۔ آخر بیچ والوں کو ان کا معقول حق ادا کرکے زاہد علی سے کاظمہ کا رشتہ طے کر دیا گیا اور یہ بات راز میں رکھی گئی کہ کاظمہ ایک مطلقہ عورت ہے

شام کا کھانا کھانے کے بعد جب سالیوں نے دولھا بھائی کا جوتا چوری کیا اور جوتا چرائی کے عوض معقول رقم کا مطالبہ کیا تو دولھا نے ہنسی خوشی رقم ادا کر دی۔ سب کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ زاہد علی ایک ہنس مکھ نوجوان ہے۔

ایک موا وہ پہلا مرد تھا، اور یہ دیکھو ایک یہ بھلا مانس ہے۔" کاظمہ کی یک چشم خالہ نے جب خوشی خوشی اپنے جذبات کا اظہار کیا تو ہنسی مذاق کا خوش گوار ماحول یکایک ٹھنڈا پڑ گیا۔ سب کے چہروں پر ایسی مردنی چھا گئی جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

"کیا مطلب؟" زاہد علی نے چونک کر پوچھا

کاظمہ کی خالہ سادہ لوح تھیں اور حالات سے بے خبر تھیں، اس لئے انہوں نے سچائی کے ساتھ زاہد علی کو بتا دیا کہ کاظمہ کا پہلا شوہر رئیس احمد تھا جو بہت ظالم آدمی تھا۔ اس لئے اس سے طلاق لے لی گئی تھی۔ گھر کے تمام لوگ اشاروں میں منع کرتے رہے کہ "خالہ ان باتوں کا کیا موقع ہے؟" لیکن خالہ بھلا کب ماننے والی تھیں، ان کا ٹیپ ریکارڈ جب شروع ہوتا تو رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

کاظمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ تھام لیا اور وہاں سے ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے کمرہ میں آگئی اور تکئے میں مونھ چھپا کر اس طرح زار و قطار رونے لگی جیسے اس گھر میں شادی نہیں کسی کی موت ہو گئی ہو، اس کے دماغ کی نس نس پھٹنے لگی، وہ چاہتی تھی کہ اچھا ہو وہ پاگل ہو جائے۔ لیکن پاگل ہو جانا اس کے بس میں نہ تھا تاہم موت تو اس کے اختیار میں تھی۔

زاہد علی اس انکشاف کو سن کر سراپا حیرت بن گیا، اس کا مونھ اس طرح کھلا کا کھلا رہ گیا جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو، کچھ لمحوں کے بعد وہ تیزی سے اٹھا اور باہر آکر حشمت خاں سے کچھ رازدارانہ طور پر گفتگو کی اور بجھے بجھے قدم لئے اندر لوٹ گیا جہاں یک چشم معصوم فطرت خالہ گالی کوسنوں کے حصار میں قید تھیں۔

"ہاں تو خالہ، کچھ اور سناؤ اس کی باتیں، کیسا تھا وہ آدمی؟" زاہد کا چہرہ اس حقیقت کا غماز تھا کہ اسے اپنی زندگی کے ساتھ کئے ہوئے مذاق کا شدید ترین احساس تھا۔

"اری خالہ، تُو نے کس جنم کا بدلہ اپنی بھانجی سے نکالا؟" ظرافت اماں سے نہ رہا گیا تو وہ بھی مزاجاً خالہ کو برا بھلا کہنے لگیں۔ یا خالہ بھی ایسی مٹی کی بنی ہوئی تھیں کہ ان پر کسی کا کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے القصہ ... کی ایک رئیس احمد کے ظلم و ستم کی ساری ... زاہد علی کو سنا دی۔ زاہد علی کے چہرے پر آتے ... رنگ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ ... بے حد غصے میں تھا اور انتقام کی آگ ... کے دل میں بھبھک رہی تھی کیوں کہ یہ مذاق نہ صرف اس کی زندگی کے ساتھ کیا گیا تھا بلکہ ... کے سادہ لوح ضعیف والدین کی بھی ہنسی اڑائی گئی تھی۔ وہ بار بار چارپائی سے کبھی اٹھتا، کبھی بیٹھتا، کبھی اس پہلو، کبھی اس پہلو۔

باہر حشمت خاں نے اپنا بستر باندھ ... تھا۔ کاظمہ اپنی تقدیر کے لکھے سے واقف تھی وہ جانتی تھی کہ جب اُسے پہلی ہی شادی راس نہ آئی تو۔ دوسری کیوں کر راس آئے گی لیکن وہ اب کسی قیمت پر زندہ رہنے کے لئے تیار نہ تھی وہ سرعت کے ساتھ اپنے بستر سے اٹھی، جب وہ گہرے کنویں کی منڈیر کی طرف بڑھنے والی تھی تو ایک پل کے لئے وہ رکی، کچھ سوچا اور دوسرے لمحے غسل خانے میں گئی۔ ہاتھ مونھ دھویا اور دوبارہ خود کو سجایا سنوارا تاکہ دنیا والے دیکھ لیں کہ حیادار دلہن مرنے کے بعد بھی کتنی معصوم اور خوبصورت لگتی ہے۔ مرنے سے پہلے اس کے دل میں بری طرح ایک خواہش نے سر ابھارا کہ وہ ایک بار جی بھر کے زاہد علی کو دیکھ لے۔ جب کاظمہ زاہد علی کے روبرو آکر بیٹھی تو عشا کی اذان نے گفتگو میں بریک لگا دیا۔ زاہد علی نے "جلّ شانہٗ" کہتے ہوئے ایک لمحے کے لئے کاظمہ کو دیکھا اور دوسرے لمحے مسکراتے ہوئے اپنی بڑی سالی سے مخاطب ہوا۔

"باجی، کیا میلاد شریف رات بھر چلے گا؟"

■■

نور نسیم

ایک رکشا والی کی کہانی

اگر آپ سے یہ سوال کیا جائے کہ کیا آپ نے عورت کو سائیکل رکشا چلاتے دیکھا ہے تو ظاہر ہے آپ کا جواب نفی میں ہوگا۔ ممکن ہے کہ یہ احمقانہ سوال سن کر آپ ہنس پڑیں۔ بھلا عورت بھی سائیکل چلا سکتی ہے۔ عورت آج کل ہر اس میدان میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے جو مردوں کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن سائیکل رکشا کھینچنا دوسری بات ہے یہ میدان مردوں کے لیے ہی مخصوص ہے اور رہے گا۔ لیکن ہم آج آپ کو ایسی عورت سے ملواتے ہیں جو سائیکل رکشا چلاتی ہے۔ وہ بھی کسی گاؤں گوٹھ میں نہیں، بلکہ ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں۔

ہاجرہ بیگم کی عمر ۴۷ سال ہے۔ اس کا وطن بنگلہ دیش ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے وہ پاکستان کے شہر کراچی میں رہتی تھی۔ پاکستان میں مشرقی پاکستان کے لوگ گھروں میں ملازمت کرتے تھے زیادہ تر ہوٹل کے باورچی، بیرے اور خانساماں تھے کاروبار اور اونچی ملازمتیں ان کی تقدیر میں نہیں تھیں بھی کراچی کے ایک مال دار گھرانے میں آیا کی نوکری کرتی تھی۔ اس کا خاندان مشرقی پاکستان میں رہتا تھا جہاں اس کے ماں باپ اور بہن بھائی تنگ ترشی سے گزر کرتے تھے۔ ہاجرہ کراچی میں دو وقت کی روٹی اور معمولی تنخواہ پر گزر کرتی تھی کہ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں پاکستان کو شکست ہوئی۔ بنگلہ دیش ایک آزاد اور خود مختار سلطنت بن کر دنیا کے نقشے پر ابھرا تو پاکستان میں رہنے والے بنگالیوں نے بھی اپنے وطن کی راہ لی۔ ہاجرہ بھی کراچی سے ڈھاکہ کے لئے روانہ ہوگئی۔ لیکن بنگلہ دیش پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ اس کا سونار بنگال مٹی کا ڈھیر ہو چکا ہے۔ اس کی ماں اور دو بھائی جنگ کے دوران ختم ہو گئے تھے دوسرے بہن بھائی بھوک سے مجبور ہو کر گھر چھوڑ چکے تھے۔ ان کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ گھر میں صرف ایک بوڑھا باپ رہ گیا تھا۔ ہاجرہ نے جب یہ منظر دیکھا تو پریشان ہوگئی۔ کراچی واپس جانے کا سوال نہیں تھا۔ بنگلہ دیش اس وقت ایک معاشی بحران سے گزر رہا تھا۔ وہاں دو وقت کی روٹی ملنا دشوار تھا۔ لیکن ہاجرہ نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے چھوٹے موٹے کام کئے محنت مزدوری کی اور باپ کی روٹی کا سہارا بن گئی۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً ۳۰ سال تھی۔

ہاجرہ نے بنگلہ دیش میں جوں توں کر کے چار سال پورے کئے تو اسے خیال آیا کہ وہ یہاں جان توڑ محنت کے باوجود بھی بڑی مشکل سے [illegible] ہوتی ہے۔ اب وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب بنگلہ دیش میں نہیں رہے گی۔ اسے خواجہ معین الدین سے بے حد عقیدت تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ وہ اجمیر جا کر خواجہ کے آستانے پر حاضری دے۔ ہاجرہ نے بنگلہ دیش سے اجمیر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس نے ارادہ تو کر لیا لیکن اس کے پاس پاسپورٹ نہیں تھا جب پاسپورٹ نہیں تو ہندوستان کا ویزا کہاں سے ملتا۔ پھر اس کے پاس سفر خرچ کے لئے روپیہ بھی نہیں تھا۔ اس کے پاس صرف ہمت اور حوصلہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہندوستان جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ اسے یقین تھا کہ اجمیر والے خواجہ اپنے عقیدت مند کی ضرور مدد کریں گے۔

ہاجرہ [illegible] ہندوستان کے لئے [illegible] ہندوستان کی سرحد پر اسے ایک پولیس افسر نے روکا تو اس نے کہا میں خواجہ بابا کی زیارت کے لئے اجمیر جا رہی ہوں۔ [illegible] میں [illegible] نے کیا یہاں [illegible] نے ہاجرہ سے دوسرا سوال نہیں کیا۔ وہ کلکتہ پہنچی تو اس کے پاس اجمیر جانے کے لئے کرایہ نہیں تھا [illegible] کے لئے [illegible] دہلی پہنچنا تھا۔ وہ بغیر ٹکٹ ٹرین پر سوار ہوگئی اور کسی نہ کسی طرح دہلی پہنچ گئی۔ [illegible] کے قریب تو پہنچ گئی لیکن اس کی جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ سفر کی تھکن نے اس کا جوڑ جوڑ دکھا رکھا تھا۔ بھوک سے انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ ہاجرہ اسٹیشن کے پاس ایک چائے کی دکان کے قریب بیٹھ گئی۔ یہ ایک چائے والے کا ڈھابہ تھا۔ لوگ چائے اور [illegible] نوش

کررہے تھے۔ ہاجرہ کو بڑے زور کی بھوک لگی تھی، لیکن اس کی غیرت بھیک مانگنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ چائے والے نے اس کی حالت دیکھی تو وہ اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ اس نے اسے چائے پلائی ساتھ میں کچھ کھانے کو بھی دیا۔ ہاجرہ نے بھیک لینے سے انکار کر دیا تو چائے والے نے اُسے ملازم رکھ لیا۔

ہاجرہ نے کچھ دن ریسٹورینٹ میں کام کیا۔ پھر وہ ایک تماشا دکھانے والی کمپنی میں گیٹ کیپر بن گئی۔ دو وقت کی روٹی کا سہارا تو مل گیا، لیکن اس کی دلی خواہش ابھی تشنہ تھی۔ اس پر اجمیر پہنچنے کی دھن سوار تھی۔ اس نے کام کے دوران کچھ روپیہ جوڑ لیا اور اجمیر روانہ ہوگئی۔ یہ عرس کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے سے زائرین اجمیر پہنچ رہے تھے۔ ان میں غریب ہاجرہ بھی شامل تھی۔ اس کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی۔

دہلی پہنچ کر ہاجرہ کے سامنے پھر روٹی کا سوال کھڑا ہوگیا۔ اس نے بنگلہ دیش میں کبھی کبھی تفریحاً سائیکل رکشا چلایا تھا۔ دلی پہنچنے کے بعد اس نے سائیکل رکشا چلانے کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ وہ ایک دو سائیکل رکشا مالکوں کے پاس گئی لیکن انہوں نے اُسے ٹال دیا۔ لیکن ایک رکشا مالک کو اس پر رحم آگیا۔ اس نے ہاجرہ کو رکشا دے دیا۔ ہاجرہ کی عمر اس وقت ۲۸ سال تھی اس نے بال چھوٹے کرائے، دوپٹے کو خیر باد کیا اور دلی کی تنگ گلیوں میں رکشا چلانا شروع کر دیا۔

ہاجرہ کو دلی میں رکشا چلاتے سات سال گزر گئے ہیں۔ اب وہ محنت مشقت کی عادی ہو گئی ہے [illegible]

رکشا چلانے سے گریز کرتی ہے عام طور پر وہ دوپہر کے ۲ بجے ہی کام ختم کر دیتی ہے۔ اسے مردوں سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ رکشا چلانے والوں کی برادری اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے۔ اگر اسے کبھی خطرہ محسوس ہوا تو ان سواریوں سے تھا جو اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔

ہاجرہ کے پاس رہنے کے لئے مکان نہیں ہے۔ وہ ایک معمولی سے جھونپڑے میں رہتی ہے۔ یہ جھونپڑا ایک پیپل کے درخت کے نیچے ہے۔ گھر کے سامان کے نام پر اس کے پاس کچھ ٹوٹے پھوٹے برتن ہیں، ایک بستر ہے اور کچھ کپڑے۔ جب سردی کے موسم میں یخ بستہ ہوائیں چلتی ہیں تو ہاجرہ اپنے جھونپڑے میں سردی سے کپکپاتی رہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ حکومت اس کو ایک اچھا مکان عنایت کر دے۔ لیکن اس کی درخواست کس طرح قبول ہو؟ وہ ایک بنگلہ دیشی ہے۔ حکومت سے مکان حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ درخواست دہندہ ہندوستانی ہو۔

ہاجرہ کو روٹی کا سہارا تو مل گیا لیکن اس کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے حادثے بھی ہوئے کہ [illegible] ایک مہینہ بستر پر پڑا رہنا پڑا [illegible] اس ایک مہینے میں اسے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا [illegible] لیکن ہاجرہ [illegible] نہیں چھوڑ سکتا۔

ہر عورت شادی کے سپنے دیکھتی ہے لیکن

ہاجرہ نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ وہ کہتی ہے شادی کر کے کیا کرنا ہے؟ اسے مرد کی رفاقت کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی مدد آپ کر سکتی ہے۔ ساتھی کے نام پر اس نے ایک کتا پال رکھا ہے۔ یہ کوئی اعلیٰ نسل کا کتا نہیں ہے، بلکہ گلی کا آوارہ جانور ہے۔ کتے نے ہاجرہ کا سہارا پا کر گلی گلی گھومنا بند کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ہاجرہ کی طرح تنہا ہے۔

ایک بار کسی اخبار کے نامہ نگار نے ہاجرہ کی زندگی کے حالات اخبار میں شائع کئے تو ٹیلی ویژن والے بھی اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کا ایک مختصر انٹرویو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا تو لوگوں کی ہمدردی جاگ اٹھی۔ بریلی کارپوریشن بینک نے ہاجرہ کو اپنا رکشا خریدنے کے لئے قرض دیا۔ اب ہاجرہ ایک رکشا کی مالک ہے، جس پر اس کا نام انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ رکشا کی مالک بن جانے کے بعد اس کی زندگی کچھ آسان ہو گئی ہے، لیکن وہ ابھی تک غریب ہے۔ کبھی کبھی جب اس کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو وہ اپنا رکشا کرائے پر دے دیتی ہے۔ ایسے بھی اس کا رکشا روزانہ شام کے وقت کرائے پر چلتا ہے، کیونکہ ہاجرہ شام کے وقت رکشا نہیں چلاتی۔

خواجہ اجمیری سے اُسے بہت عقیدت ہے۔ وہ سال بھر پیسہ جمع کرتی ہے [illegible] بنگلہ دیش نہیں گئی [illegible] پاسپورٹ نہیں [illegible] کبھی ملنے کی اُمید ہے کیونکہ [illegible] لوگوں کو پاسپورٹ [illegible]

تھے۔ ہاجرہ کو بڑے زور کی بھوک لگی تھی،
ی کی غیرت بھیک مانگنے کی اجازت نہیں دیتی
ئے والے نے اس کی حالت دیکھی تو وہ اس
نے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے اسے چائے
ہیں کچھ کھانے کو بھی دیا۔ ہاجرہ نے بھیک
کار کر دیا تو چائے والے نے اُسے ملازم رکھ

جرہ نے کچھ دن ریسٹورینٹ میں کام کیا۔
نما شادی کھانے والی کمپنی میں گیسٹ کیپر لگی۔
روٹی کا سہارا تو مل گیا، لیکن اس کی
بھی تشنہ تھی۔ اس پر اجمیر پہنچنے کی دھن سوار
نے کام کے دوران کچھ روپیہ جوڑ لیا۔ اور اجمیر
۔ یہ عرس کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کے
سے زائرین اجمیر پہنچ رہے تھے۔ ان
رہ بھی شامل تھی۔ اس کی دیرینہ آرزو
.

پہنچ کر ہاجرہ کے سامنے پھر روٹی کا سوال
س نے بنگلہ دیش میں کبھی کبھی تفریحاً
چلایا تھا۔ دلی پہنچنے کے بعد اس نے
چلانے کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا
ہ ایک دو سائیکل رکشا مالکوں کے پاس
ں نے اُسے ٹال دیا۔ لیکن ایک رکشا
پر رحم آگیا۔ اس نے ہاجرہ کو رکشا دے دیا۔
وقت ۲۸ سال تھی اس نے بال
ے، دوپٹے کو خیرباد کیا اور دلی کی تنگ
نا چلانا شروع کر دیا۔

نا کو دلی میں رکشا چلاتے سات سال
اب وہ محنت محنت کی عادی ہو گئی ہے
کرنے سے نہیں گھبراتی۔ وہ مشرقی دہلی
تک پہنچ جاتی ہے، لیکن اندھیرے میں

رکشا چلانے سے گریز کرتی ہے عام طور پر وہ دوپہر
کے ۳ بجے ہی کام ختم کر دیتی ہے۔ اسے مردوں سے کوئی
خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ رکشا چلانے والوں کی برادری
اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے۔ اگر اسے کبھی خطرہ
محسوس ہوا تو ان سواریوں سے تھا جو اچھے گھرانے سے
تعلق رکھتی تھیں۔

ہاجرہ کے پاس رہنے کے لئے مکان نہیں ہے۔
وہ ایک معمولی سے جھونپڑے میں رہتی ہے۔ یہ جھونپڑا
ایک پیپل کے درخت کے نیچے ہے۔ گھر کے سامان کے
نام پر اس کے پاس کچھ ٹوٹے پھوٹے برتن ہیں، ایک
بستر ہے اور کچھ کپڑے۔ جب سردی کے موسم میں یخ بستہ
ہوائیں چلتی ہیں تو ہاجرہ اپنے جھونپڑے میں سردی
سے کپکپاتی رہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ حکومت اس کو
ایک اچھا مکان عنایت کر دے۔ لیکن اس کی درخواست
کس طرح قبول ہو؟ وہ ایک بنگلہ دیشی ہے۔ حکومت
سے مکان حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ درخواست
دہندہ ہندوستانی ہو۔

ہاجرہ کو روٹی کا سہارا تو مل گیا، لیکن اس کی
زندگی میں کبھی کبھی ایسے حادثے بھی ہوئے کہ یہ سہارا
بھی چھٹتے چھٹتے رہ گیا۔ ایک بار وہ کپڑے دھو رہی تھی کہ
اس کا پاؤں پھسل گیا نتیجے میں اسے ایک مہینہ بستر پر گزارنا
پڑا۔ جب کام نہیں تو روٹی کہاں سے ملے۔ اس ایک
مہینے میں اسے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک
بار کچھ غنڈوں نے اس کا جھونپڑا گرا دیا۔ اس کا چولہا پانی
سے بھر دیا۔ کھانے میں کیچڑ ڈال دی۔ لیکن ہاجرہ نے ہمت
نہ ہاری۔ وہ غنڈوں سے نہیں ڈرتی۔ غنڈے اندر
سے بزدل ہوتے ہیں۔ ان کا مقابلہ ہمت اور بہادری
سے کیا جائے تو وہ زیر ہو جاتے ہیں۔ ہاجرہ کے پاس
اپنی مداخلت کے لئے ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ ہے
ہمت۔ اسے اپنے عورت ہونے کا کوئی افسوس نہیں
ہے اسے یقین ہے کہ اسے کوئی نہیں چھیڑ سکتا۔

ہر عورت شادی کے سپنے دیکھتی ہے لیکن
ہاجرہ نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ وہ کہتی ہے
"شادی کر کے کیا کرنا ہے؟ اسے مرد کی رفاقت
کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی مدد آپ کر سکتی ہے۔
ساتھی کے نام پر اس نے ایک کتا پال رکھا ہے۔
یہ کوئی اعلیٰ نسل کا کتا نہیں ہے، بلکہ گلی کا آوارہ
جانور ہے۔ کتے نے ہاجرہ کا سہارا پا کر گلی گلی گھومنا
بند کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ہاجرہ کی
طرح تنہا ہے۔

ایک بار کسی اخبار کے نامہ نگار نے ہاجرہ
کی زندگی کے حالات اخبار میں شائع کئے تو ٹیلی ویژن
والے بھی اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کا ایک مختصر
انٹرویو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا تو لوگوں کی ہمدردی
جاگ اٹھی۔ بریلی کارپوریشن بینک نے ہاجرہ کو اپنا
رکشا خریدنے کے لئے قرض دیا۔ اب ہاجرہ ایک
رکشا کی مالک ہے، جس پر اس کا نام انگریزی میں
لکھا ہوا ہے۔ رکشا کی مالک بن جانے کے بعد اس
کی زندگی کچھ آسان ہو گئی ہے، لیکن وہ ابھی تک
غریب ہے۔ کبھی کبھی جب اس کی طبیعت خراب ہوتی
ہے تو وہ اپنا رکشا کرائے پر دے دیتی ہے۔ ایسے
بھی اس کا رکشا روزانہ شام کے وقت کرائے پر
چلتا ہے، کیوں کہ ہاجرہ شام کے وقت رکشا نہیں
چلاتی۔

خواجہ اجمیری سے اُسے ابھی تک عقیدت
ہے۔ وہ سال بھر پیسہ بچاتی ہے، تاکہ سالانہ عرس
میں شریک ہو۔ ہاجرہ کی عمر اب ۳۵ سال ہے۔ وہ
ابھی تک اپنے وطن بنگلہ دیش نہیں گئی۔ اور جائے
بھی کیسے؟ اس کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے اور نہ
کبھی ملنے کی اُمید ہے کیوں کہ وہ ہندوستانی نہیں
ہے۔ 'بے ملک' کے لوگوں کو پاسپورٹ نہیں ملتا۔
●●

صداقت

[illegible]م کر اپنے کلیجے سے لگائی ہوگی
میری چٹھی جو ترے ہاتھ میں آئی ہوگی
ایک اک لفظ کے مفہوم کو سمجھا ہوگا
ایک اک حرف کی تحریر پڑھائی ہوگی

جب پڑھا ہوگا میں پھر دل کا تو مرجھاتا ہوگا
سانس بھی سینے میں مشکل سے سمائی ہوگی
اشک آنکھوں میں اچانک چھلک آئے ہوں گے
دھندلی دھندلی سی ہر اک شے نظر آئی ہوگی

دل پہ احساس نے خنجر سے چلائے ہوں گے
غم نے اک آگ سی سینے میں لگائی ہوگی
جب کنیزوں نے دلہن تجھ کو بنایا ہوگا
تیرے ہاتھوں کی حنا رنگ نہ لائی ہوگی

جوڑا شادی کا لگا ہوگا کفن خود جس میں
اپنی بیٹھی ہوئی میت نظر آئی ہوگی
تیری آنکھوں میں دلِ کاوش کا منظر ہوگا
تیری ڈولی جو کہاروں نے اٹھائی ہوگی

تیرے دولہا نے جو گھونگھٹ ترا پلٹا ہوگا
میری آواز ترے کانوں میں آئی ہوگی
اجنبی لب جو تیرے ہونٹوں پہ مچلے ہوں گے
میری خوشبو تری سانسوں میں سمائی ہوگی

اور پھر وقت سے خود ہاتھ ملا کر تو نے
شمع بجتے ہوئے لمحوں کی بجھائی ہوگی
خانۂ دل سے مجھے اپنے نکالا ہوگا
سوچ سے میری ہر یاد بھلائی ہوگی
ایک اک خط مرا گن گن کے جلایا ہوگا
ہر نشانی مری چن چن کے مٹائی ہوگی
پھر سرِ راہ کبھی مجھ کو جو دیکھا ہوگا
میری صورت بھی تجھے یاد نہ آئی ہوگی

رفیق شاہین

ماں

دکھوں کی ماری ہوئی [illegible] پیاری پیاری ماں
یہ خوش نصیبی ہے میری [illegible] بیٹا ہوں
میں تیری جان ہوں تیرے جگر کا ٹکڑا ہوں
میں کچھ نہ ہو کے بھی تیری نظر میں ہیرا ہوں

[illegible] مجھ کو میں دل سے بھلا نہ پاؤں گا
میں تیرے [illegible] کا قرض چکا نہ پاؤں گا
[illegible] جا نہ پاؤں گا

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

رفیق شاہین

رہے تھے۔ ہاجرہ کو بڑے زور کی بھوک لگی تھی، لیکن اس کی غیرت بھیک مانگنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ چائے والے نے اس کی حالت دیکھی تو وہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اسے چائے کے ساتھ میں کچھ کھانے کو بھی دیا۔ ہاجرہ نے بھیک لینے سے انکار کر دیا تو چائے والے نے اُسے ملازم رکھ لیا۔

ہاجرہ نے کچھ دن ریسٹورینٹ میں کام کیا۔ وہ ایک تماشا دکھانے والی کمپنی میں گیٹ کیپر ہو گئی۔ محنت کی روٹی کا سہارا تو مل گیا، لیکن اس کی خواہش ابھی تشنہ تھی۔ اس پر اجمیر پہنچنے کی دُھن سوار تھی۔ اس نے کام کے دوران کچھ روپیہ جوڑ لیا اور اجمیر پہنچ گئی۔ یہ عرس کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے سے زائرین اجمیر پہنچ رہے تھے۔ ان میں ہاجرہ بھی شامل تھی۔ اس کی دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔

دہلی پہنچ کر ہاجرہ کے سامنے پھر روٹی کا سوال کھڑا ہو گیا۔ اس نے بنگلہ دیش میں کبھی کبھی تفریحاً سائیکل رکشا چلایا تھا۔ دلّی پہنچنے کے بعد اس نے رکشا چلانے کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ وہ ایک دو سائیکل رکشا مالکوں کے پاس گئی، ان لوگوں نے اُسے ٹال دیا۔ لیکن ایک رکشا والے کو اس پر رحم آ گیا۔ اس نے ہاجرہ کو رکشا دے دیا۔ ہاجرہ کی عمر اس وقت ۴۸ سال تھی اس نے بال کٹوا کر لڑکی کا روپ اختیار کر لیا، دوپٹے کو خیرباد کیا اور دلّی کی سڑکوں پر رکشا چلانا شروع کر دیا۔

ہاجرہ کو دلّی میں رکشا چلاتے سات سال ہو گئے ہیں۔ اب وہ سخت محنت کی عادی ہو گئی ہے اور لمبے فاصلے طے کرنے سے نہیں گھبراتی۔ وہ مشرقی دہلی کی کالونی تک پہنچ جاتی ہے، لیکن اندھیرے میں رکشا چلانے سے گریز کرتی ہے عام طور پر وہ دوپہر کے ۳ بجے ہی کام ختم کر دیتی ہے۔ اسے مردوں سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ رکشا چلانے والوں کی برادری اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے۔ اگر اسے کبھی خطرہ محسوس ہوا تو ان سواریوں سے جو اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔

ہاجرہ کے پاس رہنے کے لیے مکان نہیں ہے۔ وہ ایک معمولی سے جھونپڑے میں رہتی ہے۔ یہ جھونپڑا ایک پیپل کے درخت کے نیچے ہے۔ گھر کے سامان کے نام پر اس کے پاس کچھ ٹوٹے پھوٹے برتن ہیں، ایک بستر ہے اور کچھ کپڑے۔ جب سردی کے موسم میں یخ بستہ ہوائیں چلتی ہیں تو ہاجرہ اپنے جھونپڑے میں سردی سے کپکپاتی رہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ حکومت اس کو ایک اچھا مکان عنایت کر دے۔ لیکن اس کی یہ درخواست کس طرح قبول ہو؟ وہ ایک بنگلہ دیشی ہے۔ حکومت سے مکان حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ درخواست دہندہ ہندوستانی ہو۔

ہاجرہ کو روٹی کا سہارا تو مل گیا، لیکن اس کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے حادثے بھی ہوئے کہ یہ سہارا بھی چھٹتے چھٹتے رہ گیا۔ ایک بار وہ کپڑے دھو رہی تھی کہ اس کا پاؤں پھسل گیا نتیجے میں اسے ایک مہینہ بستر پر گزارنا پڑا۔ جب کام نہیں تو روٹی کہاں سے ملے۔ اس ایک مہینے میں اسے بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک بار کچھ غنڈوں نے اس کا جھونپڑا اُکھاڑ دیا۔ اس کا چولہا پانی سے بھر دیا۔ کھانے میں کیچڑ ڈال دی۔ لیکن ہاجرہ نے ہمت نہ ہاری۔ وہ غنڈوں سے نہیں ڈرتی۔ غنڈے اندر سے بزدل ہوتے ہیں۔ ان کا مقابلہ ہمت اور بہادری سے کیا جائے تو وہ زیر ہو جاتے ہیں۔ ہاجرہ کے پاس اپنی مدافعت کے لیے ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ ہے ہمت۔ اسے اپنے عورت ہونے کا کوئی افسوس نہیں ہے اسے یقین ہے کہ اسے کوئی نہیں چھیڑ سکتا۔

ہر عورت شادی کے سپنے دیکھتی ہے لیکن ہاجرہ نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ شادی کر کے کیا کرنا ہے؟ اسے مرد کی رفاقت کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی مدد آپ کر سکتی ہے۔ ساتھی کے نام پر اس نے ایک کتا پال رکھا ہے۔ یہ کوئی اعلیٰ نسل کا کتا نہیں ہے، بلکہ گلی کا آوارہ جانور ہے۔ کتے نے ہاجرہ کا سہارا پا کر گلی گلی گھومنا بند کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ہاجرہ کی طرح تنہا ہے۔

ایک بار کسی اخبار کے نامہ نگار نے ہاجرہ کی زندگی کے حالات اخبار میں شائع کیے تو ٹیلی ویژن والے بھی اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس کا ایک مختصر انٹرویو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا تو لوگوں کی ہمدردی جاگ اٹھی۔ بریلی کا پہرلال بینک نے ہاجرہ کو اپنا رکشا خریدنے کے لیے قرض دیا۔ اب ہاجرہ ایک رکشا کی مالک ہے، جس پر اس کا نام انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ رکشا کی مالک بن جانے کے بعد اس کی زندگی کچھ آسان ہو گئی ہے، لیکن وہ ابھی تک غریب ہے۔ کبھی کبھی جب اس کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو وہ اپنا رکشا کرائے پر دے دیتی ہے۔ ایسے بھی اس کا رکشا روزانہ شام کے وقت کرائے پر چلتا ہے، کیوں کہ ہاجرہ شام کے وقت رکشا نہیں چلاتی۔

خواجہ اجمیری سے اُسے ابھی تک عقیدت ہے۔ وہ سال بھر پیسہ بچاتی ہے، تاکہ سالانہ عرس میں شریک ہو۔ ہاجرہ کی عمر اب ۵۵ سال ہے۔ وہ ابھی تک اپنے وطن بنگلہ دیش نہیں گئی۔ اور جائے بھی کیسے؟ اس کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے اور نہ کبھی ملنے کی اُمید ہے کیوں کہ وہ ہندوستانی نہیں ہے۔ بے ملک کے لوگوں کو پاسپورٹ نہیں ملتا۔

●●

ہندوستان میں کیتھولک فرقے کی تاریخ
خاصی پرانی ہے۔ پرتگیزیوں کی آمد کے ساتھ کیتھولک
پادری بھی ہندوستان پہنچے تھے اور انھوں نے
ہندوستان کے ساحلی علاقے میں عیسائی مذہب کی
اشاعت کی تھی۔ گوا پرتگیزیوں کا مرکز تھا ہندوستان
میں کیتھولک فرقے کی تاریخ تقریباً چار سو سال پرانی
ہے۔ ۔۔۔ مذہب کے بہت پابند ہوتے ہیں ویسے
بھی ہندوستان کی آب و ہوا مذہب کے لئے بہت سازگار
ہے۔ ۔۔۔ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ میوریل
بھی کیتھولک ہیں لیکن وہ مذہبی تعصب سے بہت
دور ہیں۔

میوریل کا شعبۂ تعلیم سے گہرا تعلق ہے آج
کل دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج اور جے۔ ایم۔ سی
گرلز کالج کی پارٹ ٹائم لیکچرر ہیں۔ اس سے پہلے
وہ مہارانی کالج میں پڑھاتی تھیں۔ میوریل کی
ذات ایک انجمن ہے۔ وہ انگریزی ادب پڑھاتی
ہیں لیکن ان کا دل صحافت کا شیدائی تھا۔ اس
میدان میں بھی انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس
کے علاوہ انھوں نے دنیا کی سیاحت بھی کی ساٹھ
سال کی عمر میں بھی ان میں جوانوں جیسی پھرتی ہے۔
میوریل بنگلور میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان
کے ماں باپ اصل میں گوا کے رہنے والے تھے۔
چھ بچوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کا گھرانا
بہت تعلیم یافتہ تھا۔ ماں اور باپ دونوں اعلیٰ
پایہ کے ڈاکٹر تھے۔ باپ ہندوستان کے پہلے سرجن
تھے۔ جنھوں نے انگلستان سے ایف آر سی ایس
کیا۔ میوریل کی ماں نے بہت لمبی عمر پائی۔ ۱۹۷۳ء
میں ان کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت اُن کی
عمر سو برس کی تھی۔ میوریل نے آکسفورڈ یونی ورسٹی
میں تعلیم حاصل کی۔ ان کی زندگی میں آکسفورڈ یونیورسٹی
ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا کہنا
ہے کہ انھوں نے اپنی ماں کے بعد سب سے زیادہ
آکسفورڈ کا اثر قبول کیا۔

ان سے ملئے

میوریل وصی

میوریل کا گھرانا بہت زیادہ مالدار نہیں
تھا۔ بنگلور میں ایک شاندار گھر تھا۔ جو کتابوں
سے بھرا رہتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں کتابیں بیڈ
روم میں کتابیں۔ حتیٰ کہ ڈائننگ روم میں بھی
کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ہر کمرہ ایک لائبریری
نظر آتا تھا۔ لڑکیوں کو زیورات یا بھڑکیلے اور
قیمتی کپڑوں کا شوق نہیں تھا۔ انھیں صرف کتابوں
کا شوق تھا۔ انھیں یہ شوق ماں باپ سے ورثہ میں
ملا تھا۔ میوریل کی ماں پیانو بہترین بجاتی تھیں۔
انھیں گانے کا بھی بہت شوق تھا گو ان کی آواز
زیادہ سُریلی نہیں تھی۔
میوریل آکسفورڈ سے واپس آئیں تو انھوں
نے اپنی زندگی کا آغاز تدریس سے کیا۔ وہ مہارانی
کالج میسور میں لیکچرار مقرر ہو گئیں۔ میوریل کو لکھنے
لکھانے کا بہت شوق ہے بعد میں یہی شوق اُن کو
دلی لے آیا۔ دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی
میوریل کو وزارت مواصلات میں نوکری مل گئی۔
وہ تعلقات عامہ کے محکمہ میں کام کرنے لگیں یہیں
ان کی ملاقات محمد وصی سے ہوئی۔ محمد وصی شعبہ
تعلقات عامہ میں افسر تھے۔ فیض احمد فیض اس
شعبے کے سربراہ تھے۔ اس زمانے میں حکومت
پریس کے افسروں کو اعزازی طور پر فوجی عہدہ دیا
کرتی تھی۔ فیض احمد فیض کرنل تھے اور محمد وصی کیپٹن
میوریل کی ملاقات محمد وصی سے ہوئی تو دونوں
ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ ایک دفعہ میوریل
کو کلکتہ جانا تھا۔ اس زمانے میں جنگی حالات
کی وجہ سے ریزرویشن کی مشکلات تھیں۔ کسی نے
ان سے کہا کہ کیپٹن وصی کو مشکل کام آسان بنانے
کا ملکہ حاصل ہے۔ اس طرح ان کی ملاقات ہوئی
اور یہ ملاقات محبت میں بدل گئی۔
سید محمد وصی گورکھپور کے زمیندار تھے
وہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ نہرو
خاندان سے اُن کے قریبی تعلقات تھے۔ محمد وصی
کچھ سال انگلستان میں بھی رہے تھے۔ وہ مذہبی
معاملات میں خاصے روادار تھے۔ ان کے خاندان
میں اُن کا کوئی قریبی عزیز نہیں تھا۔ صرف ایک
بھائی تھا جس کے کبھی برسوں میں وفات ہوئی
تھی۔ محمد وصی کو میوریل سے شادی کرنے میں کوئی
دقت نظر نہ آئی اور انھوں نے شادی کی خواہش
ظاہر کر دی۔ محمد وصی کی بات اور تھی۔ ان کا کوئی
قریبی عزیز نہ تھا جو اس سے شادی کی مخالفت
کرتا۔ لیکن میوریل کے یہاں بھرا پرا کنبہ تھا کیتھولک
اپنے مذہب کی پابندی میں خاصے سخت ہوتے ہیں
ان کی ماں کو مذہبی فرق پر اتنا اعتراض نہیں تھا
جتنا محمد وصی کے خاندانی پس منظر پر۔ محمد وصی ایک
زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی
عادتیں رئیسانہ تھیں جب کہ میوریل عوام کے طبقے
سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے خیال میں یہ طبقاتی
فرق شادی کی کامیابی میں سدراہ بن سکتا تھا۔
میوریل کے والد تنگ دل نہیں تھے۔ انھوں
نے شادی کی اجازت دے دی۔ آخر میں ماں
بھی راضی ہو گئیں۔ ایک چچا البتہ بہت ناراض
ہوئے اور بہت عرصے تک ناراض رہے۔ آخر
۱۹۴۵ میں یہ شادی ہو گئی۔ بین المذاہب
شادیوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں فریق
روادار اور وسیع النظر ہوں۔ اس جوڑے میں یہ
صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں میوریل

لتہ ا [illegible]

ہکا ابجھن میں دونوں [illegible] ے

یان ایک دفعہ بھی مذہبی بحث نہیں ہوئی
ے بھی محمد دمی ایک خاموش طبع اور سنجیدہ
ن تھے ۔ میوریل کو باتیں کرنے کا شوق ہے۔
رہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی ۔ یہ ایک
یاب شادی تھی ۔ محمد دمی سے میوریل کے یہاں
ے لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام جہاں آرا رکھا گیا
۱۹ میں محمد دمی کا انتقال ہوگیا ۔

میوریل کو اپنی زندگی میں ہر طبقے اور
رفرقے کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا انھیں
ملمان پسند ہیں ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی فطرت
سادہ ہے ۔ میوریل خود بھی بہت صاف گو واقع
ئی ہیں ۔ اسی لئے ان کو اس فرقے کے لوگ
ند ہیں ۔ لیکن انھیں اس فرقے کی پس ماندگی بُری
تی ہے ۔ ان کی رائے میں مسلمان جدید تہذیب
ے بیزار ہیں وہ اپنی صدیوں پُرانی روایات کو
سینے سے لگائے بیٹھے ہیں یہی ان کی پس ماندگی
سبب ہے ۔ انھیں چاہئے کہ جدید تعلیم سے پورا
ئدہ اٹھائیں ، سائنس پڑھیں اور تعلیم کے میدان
ں آگے بڑھیں ۔ مسلمانوں کو مطالعہ کا شوق نہیں
دتیں خاص طور پر اپنا وقت ضائع کرتی ہیں شادی
یاہ پر خوب فضول خرچی سے کام لیتی ہیں مسلمان
ام طور پر کفایت شعار نہیں ہوتے ۔ مسلمانوں کو
ابئے کہ وہ اپنی عورتوں کو جدید تعلیم سے روشناس
رائیں ۔ بچہ کا پہلا اسکول ماں کی گود ہے اگر
ُسے یہاں تعلیمی ماحول ملا تو وہ بڑا ہو کر خود بھی
علیم سے لگاؤ رکھے گا ۔

میوریل نے تمام دنیا کا سفر کیا ہے
نھوں نے امریکن عورتوں کا بہت نزدیک سے
مطالعہ کیا ۔ اُن کے خیال میں امریکن عورت ہندوستانی

یں زیادہ کام کرتی ہے اگر آمدنی
[illegible] نہ ہو تو وہ گھر کے بجٹ کو متوازن کرنے کے
لئے کام کرتی ہے شام کو گھر پہنچ کر کھانا تیار کرتی
ہے ۔ میاں کے دوستوں کی دعوت کا انتظام کرتی
ہے ۔ اگر اس سے کہیں کوتاہی ہوجائے تو میاں کی
جلی کٹی بھی سنتی ہے ۔ ہندوستانی عورت کو بہت
آسانیاں میسر ہیں ۔ متوسط طبقے کی عورتیں کام نہیں
کرتیں ۔ نوکر آسانی سے مل جاتے ہیں اس لئے یہاں
کی عورتیں کاہل ہیں ۔ اس کے برخلاف امریکن عورت
بہت مستعد ہے ۔ امریکہ میں شادی بھی عورت کے
مستقبل کو محفوظ نہیں کرتی ۔ اگر خاوند بیوی کو چھوڑ
کر چلتا بنے تو بیوی کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا
ہے ۔ جب اُسے عدالت سے طلاق مل جاتی ہے
تو خاوند اسے دوسری شادی تک گذارے کا الاؤنس
دیتا ہے ۔ لیکن اکثر خاوند ایک دو قسطوں کے بعد
مونہہ پھیر لیتے ہیں ۔ اب پھر عدالت کا دروازہ
کھٹکھٹانا پڑتا ہے ۔ خاوند کی تلاش شروع ہوتی ہے
اور اس سے زبردستی پیسے وصول کئے جاتے ہیں ۔
بہت سی عورتیں اس جھگڑے میں وقت ضائع
نہیں کرتیں ۔ خاوند اگر قسط ادا نہ کرے تو وہ خود کام
شروع کردیتی ہیں بچے ہوں تو انھیں تعلیم دلاتی ہیں ۔
اسی اثنا میں دوسرے خاوند کی تلاش بھی جاری
رہتی ہے ، جو بڑی مشکل سے ملتا ہے ۔

میوریل کے خیال میں امریکن عورت
کی زندگی خاصی کٹھن ہے امریکہ میں ڈیٹنگ (یعنی
لڑکے اور لڑکی کا ایک دوسرے کے ساتھ ملنا جلنا)
ضروری خیال کیا جاتا ہے ۔ پھر جب لڑکا لڑکی کو
پسند کرے تو شادی کی جلدی ہوتی ہے اس جلد بازی
کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے
کو اچھی طرح سمجھے بغیر شادی کرلیتے ہیں ۔ شادی کے
بعد ساتھ رہنے سے تمام اختلافات سطح پر آجاتے
ہیں ۔ لڑائی جھگڑے شروع ہوجاتے ہیں نوبت
طلاق پر پہنچ جاتی ہے طلاق سے زندگی میں جو خلا

پیدا ہوتا ہے اسے دوسری شادی سے بھرنے
کی جلدی ہوتی ہے یعنی ایک غلطی کے بعد دوسری
غلطی کا خطرہ مول لیا جاتا ہے ۔ طلاق کے بعد
بچے کی مصیبت آجاتی ہے ۔ نوجوان مطلقہ کو کنوارے
مرد قبول نہیں کرتے ۔ انھیں مطلقہ مرد ہی مل سکتا ہے ۔
اس کے علاوہ امریکہ کی حکومت میں عورت کی
کوئی اہمیت نہیں ۔ اسی لئے وہاں کی عورتوں کی
تحریک آزادی بڑے زور و شور سے چل رہی ہے ۔
میوریل اس تحریک کے حق میں ہیں ۔ امریکن عورتوں
پر مردوں نے بہت سختی کی ہے ۔ اب گویا تنگ
آمد بجنگ آمد والا معاملہ ہے ۔ ہندوستان میں
عورتوں کی پوزیشن امریکن عورتوں سے بہت
مختلف ہے ۔ اس لئے یہاں اس تحریک کی ضرورت
نہیں ۔

میوریل لڑکیوں کی کم عمری میں شادی کرنے
کے خلاف ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ شادی سے
عورت کے کیریر پر بُرا اثر پڑتا ہے ۔ خاص طور پر
اگر عورت ڈاکٹر یا سائنس داں ہے تو اسے شادی
کافی مہنگی پڑتی ہے ۔ وہ اپنے کام کو پورا وقت
نہیں دے سکتی اپنے کیریر سے انصاف نہیں
کرسکتی ۔ ہندوستان میں شادی کے بعد عورت
کو ایک پوزیشن حاصل ہوجاتی ہے وہ مسز فلاں
بیگم فلاں بن کر سمجھتی ہے کہ اس کی زندگی کا مشن
پورا ہوگیا ۔ سوسائٹی میں اسے ایک پوزیشن حاصل
ہوگئی ہے ۔ یہ بات نامناسب ہے ۔ شادی
شادی ہوتی ہے ، کوئی امتحان نہیں جس کو
پاس کرکے عورت فخر محسوس کرے ۔

میوریل کی لڑکی جہاں آرا اپنی ماں کے
خیالات سے متفق ہیں انھوں نے ابھی تک شادی
نہیں کی ہے اور نہ مستقبل قریب میں ان کا شادی
کرنے کا ارادہ ہے جہاں آرا نے بھی آکسفورڈ
میں تعلیم حاصل کی ہے وہ دلی میں کتابوں کا
کاروبار کرتی ہیں ۔ ■■

خوش قسمت

عظمیٰ محمود سیوہاروی

وہ اس گھر میں دلہن بن کر آئی تو گھر میں داخل ہوتے ہی حیران رہ گئی۔ ویران سا گھر جس میں نہ چہل پہل تھی نہ روشنیاں۔ نہ ڈھولک کی تھاپ تھی نہ پائل کی جھنکاریں۔ اسے گود میں اٹھا کر چھپر کھٹ تک لے جانے والی کوئی نند تھی، نہ چہکتی ہوئی بات بات پر ٹوکنے والی ساس۔ ایک بیمار بوڑھا پلنگ پر دو تکیوں کے بل اٹھ کر بہو کی صورت دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک معمولی صورت کی سادہ لباس پہنے ہوئے لڑکی ہنستی ہوئی اوپر کی منزل سے نیچے اتر رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون اپنے چشمے کو دوپٹے سے صاف کر کے ناک پر جما رہی تھیں۔ اور اس کا شوہر اس بیمار بوڑھے کو سہارا دے کر بٹھا رہا تھا۔

یہ تھا اس کا پہلا دن جو شوہر کے گھر طلوع ہوا تھا اور اس کی زندگی میں شام کا دھندلکا بکھیر گیا تھا۔

"کیا دیکھا تھا باجی بیگم نے اس گھر میں میرے لیے؟ کیا یہی ویرانیاں اور اداسیاں جو آج پہلے ہی دن میرا استقبال کر رہی ہیں؟ کیا یہی بوڑھے اور بیمار جو میرے لیے چشم براہ تھے؟ کیا یہی لق و دق بڑا سا مکان جس کی برسوں سے مرمت بھی نہیں ہوئی ہوگی؟

کیا میں اسی گھر کے لیے پیدا ہوئی تھی اور لاڈ و پیار میں پل کر جوان ہوئی تھی؟ اس گھر کے لیے جہاں نہ شان و شوکت تھی، نہ چمک دمک، نہ خوب صورت فرنیچر تھا' نہ فریج اور ٹی وی جہاں ہر طرف ایک سناٹا اور ویرانی تھی اور موت کی سی خاموشی۔

وہ کالج کی ایک چہکتی ہوئی' جھومتی ہوئی کلی تھی۔ سوشل پروگراموں میں حصہ لینے والی۔ ڈراموں کی جان۔ کالج کی شان۔ کھیلوں کے میدان میں سب سے آگے۔ وہ جسے اس کی ٹیچرس 'اسمارٹ' کے نام سے پکارتیں۔ جس کی خوش پوشی کی مثال دی جاتی۔ یاد ہے اسے وہ ڈرامہ جس میں اس نے ایک غنڈے کا رول ادا کیا تھا۔ سر پر کالی مخمل کی ٹوپی آڑی لگا کر گلے میں سرخ رومال باندھ کر جب وہ اسٹیج پر آئی تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ اس کی پرنسپل بھی ایک لمحے کے لیے مبہوت ہو کر اسے دیکھتی رہ گئی تھیں اور اس وقت تو لوگوں کی چیخیں ہی نکل گئی تھیں جب اس نے چاقو کی نوک سے پرنسپل کے سامنے رکھا ہوا سیب اٹھا کر کھانا شروع کر دیا تھا۔

اور پھر اس وقت وہ خود کو کتنا اونچا محسوس کرنے لگی تھی جب وزیر داخلہ نے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر اسے فرسٹ پرائز دیا تھا۔ اور آج وہ خود کو کتنا چھوٹا محسوس کر رہی ہے جب اس کا پلو ایک سیدھے سادے مذہبی سے آدمی کے پلو سے باندھ دیا گیا تھا اور وہ شہر کی چکیلی، چہکتی مہکتی زندگی سے نکال کر قصبے کی سادہ اور بے رنگ زندگی میں پھینک دی گئی تھی۔ کیا یہی اس کے خوابوں کی تعبیر اور یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا؟

وہ اپنے بوڑھے خسر اپنے شوہر کے عزیز باپ کے سرہانے کھڑی سوچ رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے رم جھم برس رہے تھے۔

اچانک اس نے اپنے شانوں پر دو مضبوط ہاتھوں کا محبت بھرا دباؤ محسوس کیا اور وہ چونک پڑی۔

"یہ میرے والد صاحب ہیں— تمہارے ابا جان" اس کے شوہر کی شیریں، محبت میں ڈوبی ہوئی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اس کا شوہر بیمار بوڑھے کو گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا چکا تھا۔

وہ آگے بڑھی اور پٹی کے برابر کھڑے ہو کر اس نے اپنے خسر کو سلام کیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر خاموش سلام۔

"بیٹی" ایک لرزتی ہوئی کمزور اور بیمار آواز ابھری۔ "خدا تمہیں ہمیشہ سلامت اور خوش و خرم رکھے ہم مسلمان ہیں۔ السلام علیکم سے ہماری گفتگو کی ابتدا ہوتی ہے۔" اور ان کا بوڑھا لرزتا کانپتا ہاتھ اس کے سر پر رکھنے کے لیے اٹھا۔ شوہر نے پشت پر تکیہ لگا کر ان کو اٹھایا اور آہستہ سے ہاتھ پکڑ کر ابا جان کے قریب پٹی پر بٹھا دیا۔

"بیٹی" بوڑھی آواز میں مسرت اور شفقت کا بے پایاں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ "آج تک میری تین بیٹیاں تھیں آج سے خدا نے مجھے چوتھی بھی دے دی۔ تم خود کو اس گھر کی بہو ہرگز نہ سمجھنا، بلکہ وہی سمجھنا جو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ دیکھو تمہاری ماں آ رہی ہیں۔ کھڑی ہو اور انہیں سلام کرو۔"

"میری بچی" بوڑھی خاتون جو بڑی مشکل سے کمرے سے باہر آئی تھیں، آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئیں۔ "کیسی پیاری ہے میری بیٹی؟" وہ اس کا مکھڑا دونوں ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگیں اور پُرخلوص دعاؤں کی بوچھار اس پر ہونے لگی۔

اس کا غرور بوڑھی خاتون کی بے پناہ شفقت اور ممتا کے طوفان میں بہہ کر نہ معلوم کہاں چلا گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس کا وجود پگھلنے لگا۔

"کیسی ناسمجھ تھی وہ کہ دور ہی سے اس گھر سے نفرت کرنے لگی تھی اور ان فرشتہ صفت بزرگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ کیسے پُرخلوص تھے یہ وجود۔ پیار ہی پیار، مٹھاس ہی مٹھاس۔ بے غرض بے لوث۔ ناولوں اور فلموں میں تو کوئی بھی ساس سسر ایسے نہیں ہوتے۔ سسرال میں تو یہ خلوص اور شفقت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ کیسی خوش قسمت تھی وہ کہ اسے ایسا گھر ملا جو اس کا اپنا گھر ہے۔ ○○

دیس پردیس کی خبریں

میک اپ کا سامان مُفت حاصل کرنے کا طریقہ

ایک گاڑی مدراس کے ہوائی اڈے سے کسٹم کا ضبط شدہ مال سرکاری گودام میں لے جا رہی تھی۔ اچانک اس کا ٹائر پھٹ گیا جس کے نتیجے میں گاڑی ایک درخت سے ٹکرا کر اُلٹ گئی۔ ڈرائیور اور محافظ بے ہوش ہو گئے۔ پڑوس کے گاؤں میں جب یہ خبر پہنچی تو وہاں سے لوگوں کی بھیڑ بے تحاشا گاڑی کی طرف دوڑی۔ اس بھیڑ میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے جب وہ گاڑی کے پاس پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں وی سی آر ٹرانزسسٹر اور دوسرا بجلی کا قیمتی سامان بکھرا پڑا ہے۔ لوگوں نے سارا سامان سڑک سے اُٹھانا شروع کر دیا۔ عورتوں نے سینٹ کی شیشیاں لپ اسٹک اور ہیئر ڈرائیر اٹھائے۔ بچوں نے کھلونے اور ٹرانزسسٹر چُن لئے اور مالِ غنیمت لے کر گاؤں واپس پہنچ گئے۔ بعد میں پولیس کی جماعت گاؤں میں پہنچی۔ اور گھروں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ ٹرانزسسٹر اور وی سی آر تو مل گئے لیکن سینٹ کی شیشیاں خالی ہو چکی تھیں۔ اس کے علاوہ میک اپ کا سارا سامان غائب تھا۔

چٹ شادی پٹ طلاق

۱۸ سالہ ڈونا لندن کے ایک ریسٹورنٹ میں چائے پینے گئی وہاں اس کی ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی۔ ڈونا پہلی ہی ملاقات میں اس کی گرویدہ ہو گئی۔ یہ نوجوان جونی بیڑے میں کام کرتا تھا۔ وہ ۱۰ روز کی رخصت پر لندن آیا تھا۔ ڈونا نے اس نوجوان سے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کیا۔ وہ سات روز تک ایک دوسرے سے ملتے رہے نوجوان نے ڈونا سے شادی کی درخواست کی۔ ڈونا اس کی محبت سے اتنی متاثر تھی کہ اس نے فوراً ہاں کر دی۔ آٹھویں روز ان کی شادی ہو گئی لیکن شادی کے بعد نہ جانے کیا بات ہوئی کہ دونوں ایک دوسرے کی شکل سے بیزار ہو گئے۔ شادی کے تیسرے روز دولہا واپس اپنے جہاز پر چلا گیا اور ڈونا نے عدالت میں طلاق کی درخواست دے دی۔ اس کا بیان ہے کہ ہماری محبت پاگل پن کے سوا کچھ نہیں تھی۔

جنگ کی تباہ کاریاں

ویٹ نام کی جنگ میں امریکہ کے بمبار طیاروں نے پٹرول سے بھرے بم گرائے یہ ناپام بم کہلاتے ہیں۔ بم کے پھٹتے ہی پٹرول بھبک اُٹھتا ہے۔ ایسی ہی ایک بمباری میں ایک ۸ سالہ بچی اپنے جلتے ہوئے کپڑوں میں دہشت زدہ ہو کر بھاگ رہی تھی کہ ایک نامہ نگار نے اس کا فوٹو کھینچ لیا۔ یہ فوٹو ساری دنیا کے اخباروں میں شائع ہوا۔ اس فوٹو سے ویٹ نام کی جنگ کی تباہ کاریاں دنیا کے عوام کے سامنے آ گئیں۔ یہ فوٹو صحافت کی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بمباری کی شکار یہ لڑکی ۸ سالہ کِم پھان تھی۔ یہ بُری طرح جل گئی تھی۔

ویت نام کی راجدھانی ہوچی منہ (سابق — سائی گون) میں اس کا علاج چلتا رہا۔ اس بات کو ۱۲ سال گزر گئے۔ پھان اب ۲۱ سال کی ایک جوان عورت ہے۔ اس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ ناپام میں نہ جانے کون سا کیمیائی مادہ تھا کہ پھان کے زخم بار بار کھل جاتے تھے۔ اس کی جھلسی ہوئی کھال سے اس کا چہرہ اور جسم بدنما ہو گئے تھے۔

گزشتہ دنوں پھان مغربی جرمنی کے ایک اسپتال میں داخل ہو گئی۔ وہاں ڈاکٹر نے پلاسٹک سرجری سے اس کی جھلسی ہوئی کھال کو بدل دیا۔ پھان جرمنی میں ۲ مہینے رہی۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اس کے زخم بار بار کھلتے رہیں گے۔ اس لیے اسے میڈیکل کالج چھوڑ دینا چاہیے۔ پھان ڈاکٹر بننا چاہتی تھی لیکن اب اس کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ اس کے سر میں اب بھی شدید درد اٹھتا ہے۔ آج بھی اسے جنگ کا وہ بھیانک دن یاد آتا ہے تو وہ کانپ اٹھتی ہے۔

ماں مٹی باپ کلنگ

انگلستان کے شہر ہل میں ایک انوکھی شادی ہوئی۔ دولہا ایک نوجوان لڑکا ہے اس کا قد ۶ فیٹ ۱۰ انچ ہے جب کہ دلہن ٹھگنی ہے۔ اس کا قد ۳ فیٹ ۱۱ انچ ہے۔ شادی کے دن دولہا نے ریشم کا لمبا کوٹ اور اونچا ہیٹ پہنا جس سے اس کا قد اور بھی اونچا معلوم ہونے لگا۔ دلہن نے بھی سفید ریشم کا لباس پہنا۔ اس کا وزن ۵۰ پاونڈ ہے۔ جب چرچ میں شادی کی رسم ادا ہو گئی تو پادری نے دولہا سے دلہن کو انگوٹھی پہنانے کے لیے کہا۔ دولہا کو انگوٹھی پہنانے کے لیے تقریباً رکوع میں جانا پڑا۔ چرچ سے نکلنے کے بعد دولہا نے دلہن کو اپنی پیٹھ پر سوار کر لیا۔

دولہا کے والدین اس رشتے کے خلاف تھے۔ دونوں میں کئی مہینے سے کورٹ شپ چل رہا تھا۔ ان کے دوست ان کا مذاق اڑاتے۔ انہیں یہ سارس اور چڑیا کی شادی معلوم ہوتی تھی لیکن وہ دونوں محبت کے نشے میں مست تھے۔ انہوں نے مذاق اڑانے والوں کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ دولہا کے والدین کی مخالفت اس قدر بڑھ گئی کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے بات چیت بند کر دی۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس مضحکہ خیز شادی میں شرکت سے بھی انکار کر دیا۔

دولہا دلہن اس شادی کے بعد بہت خوش ہیں۔ وہ بچے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے بچے نارمل ہوں گے۔

ملکۂ حسن نانی

گزشتہ دنوں لندن میں ایک انوکھا مقابلۂ حسن منعقد ہوا۔ اس مقابلے میں نوجوان لڑکیوں کی بجائے دادیاں اور نانیاں حصہ لے رہی تھیں۔ جین راڈ سب سے حسین نانی منتخب ہوئیں۔ جین کی عمر ۵۰ سال ہے۔ ان کی دو لڑکیاں ہیں، دو نواسے ہیں۔ جین کو انعام میں ۵ ہزار روپے اور چاندی کا کپ ملا۔ جین کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو بچوں کی نانی ہیں۔

مئی ۱۹۸۵ء میں سرورق کے اندرونی صفحہ پر ایک تصویر عنوان کے بغیر شائع کی گئی تھی جس کا عنوان بانو بہنوں اور بھائیوں کو تجویز کرنا تھا

اس مقابلے میں سب سے اچھا عنوان "آس کے پنچھی" الیاس انور، کلکتہ — ۱۵ نے بھیجا ہے۔ انہیں انعام کے ۵۰ روپے منی آرڈر کے ذریعہ بھیجے جا رہے ہیں۔

نتیجہ: خیال اپنا اپنا

کیا اعلیٰ تعلیم عورتوں کا مستقبل سنوار سکتی ہے؟

اس مقابلے میں حصہ لینے والی زیادہ تر بہنوں اور بھائیوں نے اعلیٰ تعلیم کو عورتوں کے لئے مفید اور ضروری قرار دیا۔ تاہم کچھ تحریروں میں قدامت پسندی کی جھلک بھی نمایاں رہی مسز جاوید (دہلی ۶) کی تحریر پہلے انعام (سو روپے) کی حق دار ٹھہرائی گئیں۔ غزالہ تبسم (مراد آباد) کو دوسرا انعام (پچاس روپے) اور نسیمہ بانو (دھن باد) کو تیسرا انعام (تیس روپے) دیا جا رہا ہے۔ انعام حاصل کرنے والی تحریریں یہاں شائع کی جا رہی ہیں۔

پہلا انعام:

شرم و حیا کے بعد عورتوں کا دوسرا گہنا تعلیم ہے۔ اور اگر وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو تو کیا کہنا۔ تعلیم کا مقصد صرف ڈگریاں حاصل کر کے نوکری کرنا نہیں ہوتا۔ اکثر سننے میں آیا ہے کہ ہم کو اپنی لڑکی سے نوکری تھوڑا ہی کرانی ہے جو ہم اسے پڑھائیں۔ وہ نہیں جانتے کہ تعلیم تو عورت کا گہنا ہے۔ اس سے انسانی شخصیت اُبھرتی ہے۔ خود اعتمادی بڑھتی ہے، مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، زندگی میں غم جھیلنے اور خوشی میں بے قابو نہ ہونے کی ہمت پیدا ہوتی ہے، سوسائٹی میں عزت ملتی ہے۔ خاندان میں رہنا آتا ہے۔ بچوں کی پرورش شوہر سے برتاؤ، سسرال والوں کے ساتھ رہنا، دوسروں سے برتاؤ۔ غرض ہر بات میں قرینہ آتا ہے۔ پہلے زمانے میں عموماً لڑکوں کی تعلیم پر تو خاص توجہ دی جاتی تھی، مگر لڑکیوں کو تعلیم نہیں دلائی جاتی تھی۔ شاید اس وقت کے لحاظ سے یہ بات اتنی نامناسب بھی نہیں تھی۔ مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔ لوگوں کی ذہنیت بدل گئی ہے۔ شادی بھی اب بیوپار ہو گئی ہے۔ جو لوگ اپنی لڑکیوں کو زیادہ جہیز نہیں دے سکتے، ان کے لئے شادی مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ اگر شادی کسی طرح ہو بھی جاتی ہے تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

اس دَور کو دیکھتے ہوئے بھی تعلیم لڑکی کے لئے ایک مضبوط ہتھیار ہے۔ شادی سے پہلے کا بھی اور بعد میں بھی۔

یہ حقیقت ہے کہ چاہے عورت کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو۔ کتنی بھی بڑی نوکری کیوں نہ کرتی ہو، اس کو گھر گرہستی لازماً کرنا پڑتی ہے۔ شوہر کی خدمت، بچوں کی پرورش اس کا فرض ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت نوکری کے ساتھ ان سب باتوں کو بھی بخوبی انجام دے سکتی ہے۔

یہ اعلیٰ تعلیم کا ہی نتیجہ ہے کہ آج کل ہر شعبہ میں عورتیں مردوں کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے خاندان کی کفالت میں بھی مدد دے رہی ہیں۔ اسی طرح وہ آنے والی نسلوں کا مستقبل بھی سنوار رہی ہیں، ملک و قوم کی خدمت بھی کر رہی ہیں، سماج کو بھی اُونچا اٹھا رہی ہیں۔ یہ سب اعلیٰ تعلیم کا کرشمہ ہے۔

اعلیٰ تعلیم نہ صرف عورت کا گہنا ہے بلکہ پوری انسانیت کا نور ہے۔ اعلیٰ تعلیم انسانی شخصیت میں چار چاند لگا دیتی ہے۔

مسز جاوید، دہلی ۶

دوسرا انعام:

حسین مستقبل کا تصور ہی ماضی و حال کی تلخیوں کو بھلا سکتا ہے۔ والدین اپنے بچوں کی پیدائش سے ہی ان کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ مستقبل ایک ایسا تناور درخت ہے جس کے بیج کو بچپن سے ہی زرخیز مٹی میں بونے کی جستجو کی جاتی ہے تاکہ یہ درخت زیادہ سے زیادہ پھول پھل سکے۔

یہاں عورت کے مستقبل کا جائزہ اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے لیا جا رہا ہے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ایک جاہل عورت میں نمایاں فرق ہے۔ پڑھی لکھی ماں اپنے بچوں کی مناسب نگہداشت کر سکتی ہے۔ تعلیم یافتہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ گھریلو اور بیرونی مسئلوں پر آزادانہ تبادلۂ خیال کر سکتی ہے۔ وہ زندگی کی اُلجھنوں کو اپنی سُوجھ بُوجھ سے سُلجھا سکتی ہے اپنے اور اپنے کنبے کی معاشی حالات کو بہتر بنا سکتی ہے۔ وہ دوسرے تمام فرائض بھی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی ہے، جب کہ ایک جاہل عورت سے ہم یہ توقع نہیں کر سکتے۔

لڑکوں کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے والدین انہیں اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ اگر اعلیٰ تعلیم دلانے کی ایسی کوشش لڑکیوں کے لئے بھی کی جائے تو یقیناً لڑکیوں کا مستقبل بھی سنور سکتا ہے۔

آج عورتیں بھی اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ہندوستان کے تقریباً ہر شعبے میں عورتیں کام کر رہی ہیں۔ یہ سب اعلیٰ تعلیم ہی کی دین ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد عورت کے بہت سے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ آج تعلیم کو لڑکیوں کا حُسن مانا جاتا ہے ایک تعلیم یافتہ لڑکا قبول صورت لیکن تعلیم یافتہ لڑکی کو اپنی زندگی کا ہم سفر بنانا زیادہ پسند کرتا ہے بہ نسبت ایک حسین لیکن جاہل لڑکی کے۔ اس طرح ذہنی ہم آہنگی بھی قائم رہتی ہے جو کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

ہمارے سماج میں جہیز کی بیماری کینسر کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ ازدواجی زندگی ایک ریت کا گھروندا بن گئی ہے۔ ایسے غیر یقینی حالات میں بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ عورت اپنی معاشی ضرورتوں اور اپنے مستقبل کے لئے دوسروں کی محتاج بننے کی بجائے خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر خود اپنا سہارا بن سکتی ہے۔

اگر ہمیں اپنے ملک کی معاشی و معاشرتی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ اپنی نئی نسل کو اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا ہوگا۔ آج کی معصوم بچیاں کل کی مائیں ہیں۔ ماں کی گود کو ہی بچے کی پہلی درس گاہ مانا جاتا ہے۔ اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لئے خواتین کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا اتنی ہی ضروری ہے جتنا اچھی صحت کے لئے وٹامن سے بھرپور کھانا۔ اسی طرح عورتوں کی ترقی و بہبود کا متوازن نظام قائم ہو سکتا ہے جو اُن کی شخصیت کی تکمیل اور خوش گوار مستقبل کے لئے نہایت ضروری ہے۔

غزالہ تبسم، مراد آباد

تیسرا انعام:

تعلیم کی بدولت ہمارے ملک کی خواتین آج ہر شعبہ میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔ تعلیم ہی کی بدولت اندرا گاندھی اور سروجنی نائیڈو جیسے نام تاریخ میں ابھرے ہیں۔ تعلیم عورتوں کا اپنا مستقبل ہی نہیں اُن کے ساتھ پورے خاندان کا مستقبل روشن کرتی ہے۔ پڑھی لکھی ماں اپنے بچوں کی مناسب نگہداشت کر سکتی ہے۔ تعلیم یافتہ بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ گھریلو اور بیرونی مسئلوں پر تبادلۂ خیال کر سکتی ہیں اور تمام فرائض بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں۔

معاشرہ میں عورتوں کا مقام، نئی نسل کے لئے عورت کا رول، غرض ہر لحاظ سے تعلیم کا ایک روشن پہلو ہے جو توجہ طلب ہے۔ تعلیم یافتہ عورت اپنے پورے کنبے کے ساتھ اپنے ملک کے معاشی، سیاسی اور سماجی حالات کو بھی سُدھار سکتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم عورتوں کی شخصیت کو سنوار کر انہیں زیادہ پُرکشش بنا دیتی ہے۔ غرض ہر لحاظ سے اعلیٰ تعلیم عورتوں کا مستقبل سنوارنے میں بھرپور مدد دیتی ہے۔ اس لئے والدین کو چاہئے کہ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب کریں۔ یہ پورے ملک کے لئے بھی فلاح و بہبود کا کام ہوگا۔

نسیمہ بانو، دھن باد

اپنڈکس کیا ہے؟
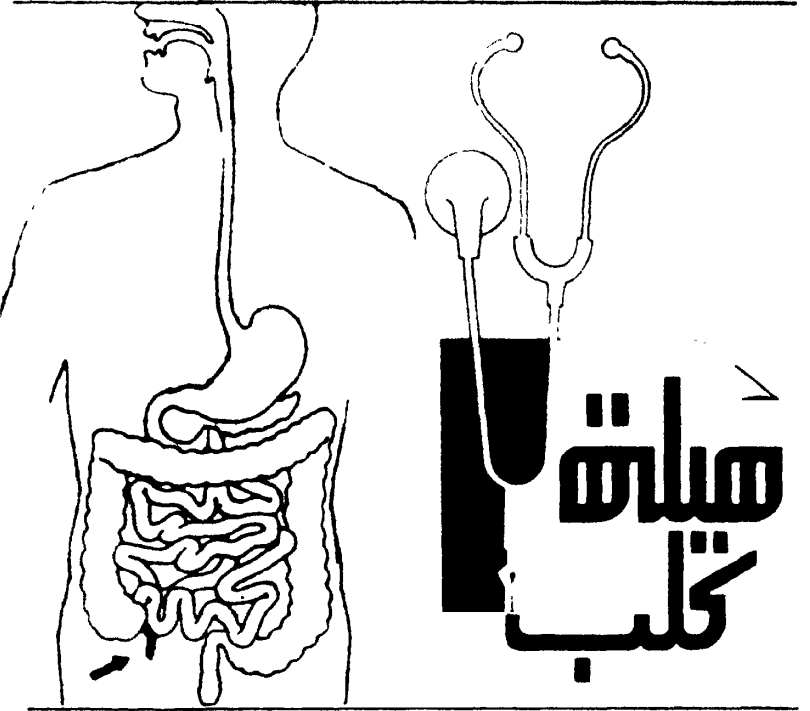
ڈارون کی تھیوری کے مطابق انسان کا ارتقا بندر کی نسل سے ہوا ہے۔ دنیا میں بندروں کی ساٹھ ستر قسمیں ہیں۔ ان میں صرف ایک کو انسان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ باقی بندر درختوں پر اُچھلتے کودتے ہی رہ گئے۔ جب انسان دونوں پیروں پر کھڑا ہوگیا تو دُم کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ آہستہ آہستہ یہ دُم غائب ہوگئی۔ لیکن اس کی جڑ جسم میں باقی رہ گئی جسم کا یہ فالتو پرزہ اپنڈی سائیٹس یا اپنڈکس کہلاتا ہے جانوروں میں بڑی اور چھوٹی آنت کے درمیان جگہ ہوتی ہے کہ فضلہ کا گزرنا آسان ہو جاتا ہے انسان کے جسم میں یہ جگہ اتنی سکڑ گئی کہ ہاتھ کی چھنگلی کے برابر رہ گئی۔ کئی بار کھانے کا کوئی معمولی ٹکڑا اس آنت میں پھنس جاتا ہے۔ دوسری طرف راستہ بند ہونے سے اس میں زہر پھیل جاتا ہے۔ ایک مٹر کا دانہ یا امرود کے کے بیج بھی قیامت برپا کر سکتے ہیں۔ اپنڈکس میں زہر پھیل جائے تو ابتدا میں معمولی درد ہوتا ہے۔ اپنڈکس کی پہچان یہ ہے کہ پیٹ کے نچلے حصے میں درد ہوتا ہے یہ درد ہمیشہ دائیں جانب ہوتا ہے۔ ناف سے نیچے دائیں جانب پیٹ کو دبائیں تو ٹیس اٹھتی ہے۔ لوگ اکثر اس کو ریحی درد سمجھ کر ٹال جاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر مریض کو دیکھ کر صحیح اندازہ لگالیتے ہیں۔ اس میں بھی ان کے تجربے اور مہارت کو دخل ہوتا ہے۔ ورنہ اپنڈکس کی تشخیص کے لئے نہ کوئی ایکس رے ہے اور نہ کوئی دوسرا اوزار۔ بعض اوقات ڈاکٹر کی تشخیص بھی غلط ثابت ہوتی ہے۔

آج کل اپنڈکس کا علاج اینٹی بایوٹیک سے ہوتا ہے۔ اینٹی بایوٹیک کی دریافت سے پہلے آپریشن ہی اس کا واحد علاج تھا یورپ میں یہ خیال عام تھا کہ قدرت نے انسانی جسم میں دو چیزیں فضول پیدا پیدا کی ہیں۔ ایک گلے کے ٹانسل اور دوسری اپنڈکس اب یہ خیال بدل گیا ہے۔ اب ڈاکٹر ٹانسل نکلوانے کا مشورہ نہیں دیتے۔ لیکن اپنڈکس ابھی تک فضول سمجھی جاتی ہے۔ اگر اپنڈکس کا علاج اینٹی بایوٹیک سے نہ کیا جائے یا صحیح اینٹی بایوٹیک نہ دی جائے تو زہر تیزی سے پھیل جاتا ہے۔ پیٹ کا نچلا حصہ سوج جاتا ہے۔ یہ سوجن خطرناک ثابت ہوتی ہے اپنڈکس میں پیپ پڑجاتی ہے۔ اس وقت اس کا نکلوانا ضروری ہوجاتا ہے۔ اگر سوجن زیادہ بڑھ جائے تو اپنڈکس پھٹ جاتی ہے اور مواد سارے پیٹ میں پھیل جاتا ہے۔ نارمل اپنڈکس کو ماہر سرجن ۵ منٹ میں نکال سکتے ہیں لیکن پھٹی ہوئی اپنڈکس کے ریزے چننا دشوار ہوتا ہے اس میں کئی گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ نتیجے میں مریض کو صحت ہوجائے۔ اس وقت یہ بیماری مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔ جان کا خطرہ [illegible] فی صد تک بڑھ جاتا ہے۔

آج کل سرجن فوراً ہی اپنڈکس کو نکلوانے کا مشورہ نہیں دیتے۔ وہ پہلے زہر باد اور سوجن ختم کرنے کے لئے اینٹی بایوٹیک دوائیں دیتے ہیں سوجن ختم ہوجانے کے ایک یا دو مہینے کے بعد آپریشن سے اپنڈکس نکال دیتے ہیں۔ عورتوں کو اپنڈکس ہوجائے تو اس کی تشخیص اور بھی مشکل ہوجاتی ہے۔ اپنڈکس کا درد پیٹ کے دائیں اور نچلے حصے میں ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ درد اتنا بڑھ جاتا ہے کہ ناف کے اوپر اور پیٹ کے بائیں حصہ میں بھی محسوس ہونے

ممکن ہے کہ یہ درد اپنڈکس کی سوجن کی وجہ سے نہ ہو بلکہ بچہ دانی میں اترنے والی نالی میں ہو۔ پیشاب گردے سے بن کر مثانے میں آتا ہے۔ پیشاب کی یہ نالی بھی قریب سے گذرتی ہے اگر پیشاب میں پتھری یا پتھری کے ریزے ہوں تو یہ بھی مغالطہ پیدا کرسکتے ہیں۔ ڈاکٹر فیصلہ نہیں کرسکتا کہ مریض اپنڈکس کے درد میں مبتلا ہے یا اس کا درد کسی اور وجہ سے ہے۔

اپنڈکس میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ پیٹ خالی رکھا جائے۔ اینٹی بایوٹیک کی دریافت سے پہلے مریض کا کھانا بند ہوجاتا تھا اگر اپنڈکس پھٹ جائے تو مریض کو آپریشن کے بعد بھی کئی روز تک کھانے کا ایک دانہ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ پانی بھی جسم کی رگ میں سوئی کے ذریعہ پہنچایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر بخار اترنے کا انتظار کرتے تھے جب آنتیں اپنا نارمل کام کرنے لگتیں تو مریض کو سیال غذا دی جاتی تھی۔

ڈاکٹر آج بھی مریض کا کھانا پینا بند رکھتے ہیں۔ گلوکوز رگ میں سوئی لگا کر دی جاتی ہے لیکن اینٹی بایوٹیک بھی ساتھ ساتھ دی جاتی ہے۔ سیال کھانا بھی مونہہ یا ناک کے ذریعے جسم میں پہنچ جاتا ہے۔ اپنڈکس میں تشخیص کی مشکل کے ساتھ ایک خرابی یہ ہے کہ اس کا فوراً اور مناسب علاج نہ کیا جائے تو یہ مہلک ثابت ہوسکتی ہے اگر آپ ایسی جگہ رہتی ہیں جہاں دور دور تک اسپتال نہیں ہے اور اپنڈکس کا حملہ ہوتا ہے تو طبی امداد کیسے پہنچے گی اگر سوجن بڑھ گئی ہے تو فوراً ہی آپریشن کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر اپنڈکس پھٹنے سے پہلے نکال دی جائے تو جان کا خطرہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

صحت سے متعلق آپ کی معلومات

ان سوالات کا جواب صحیح یا غلط میں دیں
صفحہ ☐ پر ملاحظہ فرمائیں

۱۔ اگر کوئی انسان زہریلی چیز [illegible] کیا اسے فوراً قے کرانی چاہیئے۔

۲۔ اگر نکسیر جاری ہوجائے تو کیا [illegible] روئی بھر دینی چاہیئے۔

۳۔ کیا بھاری ناشتہ کرنے اور ہلکا کھانے سے وزن کم ہوجاتا ہے؟

۴۔ کیا جگر انسانی جسم کا سب سے [illegible] عضو ہے؟

۵۔ جس عورت کو شدید درد سر کی بیماری ہے۔ کیا وہ ذہین، حوصلہ مند سلیقہ مند اور [illegible] ہے۔

■■

خیال اپنا اپنا

نتیجہ بانو: جولائی ۱۹۸۵ میں شائع ہوگا

یہ انعامی مقابلہ آپ کو موجودہ دور کے مختلف مسئلوں اور سوالوں کے بارے میں اظہار رائے کا موقع اور دعوت دیتا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات اور فکری نتائج دوسروں تک پہنچایئے اور انعام حاصل کیجئے۔

پہلا انعام: سو روپے دوسرا انعام: پچاس روپے تیسرا انعام: تیس روپے

اس ماہ کا موضوع سپریم کورٹ کا وہ حالیہ فیصلہ ہے جس کے مطابق بیوی کو طلاق دینے کے بعد بھی شوہر اسے نان نفقہ دینے کا پابند ہے صرف اس صورت میں اس پر بیوی کے نان نفقہ کی ذمہ داری عاید نہیں ہوگی جب بیوی خود کفیل ہو یا دوسری شادی کرلے (اسلامی فقہ کے مطابق عورت طلاق کے بعد صرف عدت کی میعاد تک اپنے شوہر سے گزربسر کے لئے رقم کا مطالبہ کرسکتی ہے) آپ کا کیا خیال ہے؟

اس ماہ کا سوال ہے کیا طلاق کے بعد بھی شوہر بیوی کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہے؟

اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ لفظوں میں اپنے خیالات ہمیں لکھ بھیجئے۔ آپ کی تحریر ۲ جولائی ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جانی چاہئے:

خیال اپنا اپنا ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شان دار حویلیاں جو برسوں سے ویران پڑی ہیں

سیکڑوں سال پہلے راجستھان میں پالی کے مقام پر ایک سوداگر طبقہ رہتا تھا یہ لوگ پالی وال کہلاتے تھے۔ تجارت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ یہ لوگ جین مذہب سے تعلق رکھتے تھے جینی لڑائی جھگڑے سے دور رہتے ہیں۔ وہ ایک چیونٹی کو بھی مارنا گناہِ عظیم سمجھتے ہیں۔ گھاس پر بھی ننگے پاؤں چلتے ہیں کہ کہیں ان کا جوتا کسی کیڑے مکوڑے کو نہ کچل دے۔

آپ نے اکثر جینی سادھوؤں کو دیکھا ہوگا۔ یہ لوگ مونہہ پر کپڑے کی پٹی باندھے پھرتے ہیں کہ کہیں کوئی اڑتا ہوا بھنگا ان کے مونہہ میں جا کر ہلاک نہ ہو جائے۔ یہ لوگ زراعت سے پرہیز کرتے ہیں، کیوں کہ زمین پر ہل چلانے سے کیڑوں مکوڑوں کی موت ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ صرف تجارت کرتے ہیں۔ پالی وال بھی تاجر تھے لیکن ان کی بے شمار دولت ہی ان کی جانی دشمن بن گئی۔ ان کے آس پاس رہنے والے قبیلے اور راجہ مہاراجہ اکثر ان کی بستی پر ڈاکہ ڈالتے اور سب کچھ لوٹ کر لے جاتے۔ یہ لوگ مال دار تھے لیکن رات کو اس ڈر سے چین سے سو نہیں سکتے تھے کہ نہ معلوم کس وقت لالچی پڑوسی ان پر حملہ کر دیں اور ان کی دولت لوٹ کر لے جائیں۔

پالی وال کسی ایسے راجہ کی تلاش میں تھے جو ان کی حفاظت کر سکے۔ جلد ہی ان کو اپنی تلاش میں کامیابی مل گئی۔ قنوج کا راجہ سیاد جی ان کے علاقے سے گزرا تو انہوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ ان کی مدد

لگتا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر مخمصے میں پڑ جاتے ہیں ممکن ہے کہ یہ درد اپنڈکس کی سوجن کی وجہ سے نہ ہو بلکہ بچہ دانی میں اترنے والی نالی میں ہو۔ پیشاب گردے سے بن کر مثانے میں آتا ہے۔ پیشاب کی یہ نالی بھی قریب سے گذرتی ہے اگر پیشاب میں پتھری یا پتھری کے ریزے ہوں تو یہ بھی مغالطہ پیدا کرسکتے ہیں۔ ڈاکٹر فیصلہ نہیں کرسکتا کہ مریض اپنڈکس کے درد میں مبتلا ہے یا اس کا درد کسی اور وجہ سے ہے۔

اپنڈکس میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ پیٹ خالی رکھا جائے۔ اینٹی بایوٹیک کی دریافت سے پہلے مریض کا کھانا بند ہوجاتا تھا اگر اپنڈکس پھٹ جائے تو مریض کو آپریشن کے بعد بھی کئی روز تک کھانے کا ایک دانہ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ پانی بھی جسم کی رگ میں سوئی کے ذریعہ پہنچایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر بخار اترنے کا انتظار کرتے تھے جب آنتیں اپنا نارمل کام کرنے لگتیں تو مریض کو سیال غذا دی جاتی تھی۔

ڈاکٹر آج بھی مریض کا کھانا پینا بند رکھتے ہیں۔ گلوکوز رگ میں سوئی لگا کر دی جاتی ہے لیکن اینٹی بایوٹیک بھی ساتھ ساتھ دی جاتی ہے۔ سیال کھانا بھی منہ یا ناک کے ذریعے جسم میں پہنچ جاتا ہے۔ اپنڈکس میں تشخیص کی مشکل کے ساتھ ایک خرابی یہ ہے کہ اس کا فوراً اور مناسب علاج نہ کیا جائے تو یہ مہلک ثابت ہوسکتی ہے اگر آپ ایسی جگہ رہتی ہیں جہاں دور دور تک اسپتال نہیں ہے اور اپنڈکس کا حملہ ہوتا ہے تو طبی امداد کیسے پہنچے گی اگر سوجن بڑھ گئی ہے تو فوراً ہی آپریشن کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر اپنڈکس پھٹنے سے پہلے نکال دی جائے تو جان کا خطرہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

صحت کے متعلق آپ کی معلومات کا امتحان

ان سوالات کا جواب صحیح یا غلط میں دیں۔ صحیح جواب صفحہ ☐ پر ملاحظہ فرمائیں

۱۔ اگر کوئی انسان زہریلی چیز کھالے تو کیا اسے فوراً قے کرانی چاہئے۔

۲۔ اگر نکسیر جاری ہوجائے تو کیا ناک میں روئی بھر دینی چاہئے۔

۳۔ کیا بھاری ناشتہ کرنے اور ہلکا کھانا کھانے سے وزن کم ہوجاتا ہے؟

۴۔ کیا جگر انسانی جسم کا سب سے بڑا عضو ہے؟

۵۔ جس عورت کو شدید درد سر کی بیماری ہو ہے، کیا وہ ذہین، حوصلہ مند سلیقہ مند اور محنتی ہے۔

■■

خیال اپنا اپنا

نتیجہ بانو: جولائی ۱۹۸۵ میں شائع ہوگا

یہ انعامی مقابلہ آپ کو موجودہ دور کے مختلف مسئلوں اور سوالوں کے بارے میں اظہارِ رائے کا موقع اور دعوت دیتا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات اور فکری نتائج دوسروں تک پہنچایئے اور انعام حاصل کیجئے۔

پہلا انعام: سو روپے دوسرا انعام: پچاس روپے تیسرا انعام: تیس روپے

اس ماہ کا موضوع سپریم کورٹ کا وہ حالیہ فیصلہ ہے جس کے مطابق بیوی کو طلاق دینے کے بعد بھی شوہر اسے نان نفقہ دینے کا پابند ہے۔ صرف اس صورت میں اس پر بیوی کے نان نفقہ کی ذمہ داری عاید نہیں ہوگی جب بیوی خود کفیل ہو یا دوسری شادی کرلے (اسلامی فقہ کے مطابق عورت طلاق کے بعد صرف عدت کی میعاد تک اپنے شوہر سے گزربسر کے لئے رقم کا مطالبہ کرسکتی ہے) آپ کا کیا خیال ہے؟

اس ماہ کا سوال ہے کیا طلاق کے بعد بھی شوہر بیوی کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہے؟

اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ لفظوں میں اپنے خیالات ہمیں لکھ بھیجئے۔ آپ کی تحریر ۲ جولائی ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جانی چاہئے:

"خیال اپنا اپنا" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شان دار حویلیاں جو برسوں سے ویران پڑی ہیں

سیکڑوں سال پہلے راجستھان
پالی کے مقام پر ایک سوداگر طبقہ رہتا تھا
ب پالی وال کہلاتے تھے۔ تجارت ان کی
ٹی میں پڑی تھی۔ یہ لوگ جین مذہب سے
ق رکھتے تھے جینی لڑائی جھگڑے سے
ر رہتے ہیں۔ وہ ایک چیونٹی کو بھی مارنا گناہ عظیم
ھتے ہیں۔ گھاس پر بھی ننگے پاؤں چلتے ہیں کہ
ہیں ان کا جوتا کسی کیڑے مکوڑے کو نہ کچل دے۔
پ نے اکثر جینی سادھوؤں کو دیکھا ہوگا۔ یہ
ے مونہہ پر کپڑے کی پٹی باندھے پھرتے
، کہ کہیں کوئی اڑتا ہوا بھنگا ان کے مونہہ
ں جاکر ہلاک نہ ہو جائے۔ یہ لوگ زراعت
ہ پرہیز کرتے ہیں، کیوں کہ زمین پر ہل چلانے
ہ کیڑوں مکوڑوں کی موت ہو سکتی ہے۔ یہ

لوگ صرف تجارت کرتے ہیں۔ پالی وال بھی
تاجر تھے لیکن ان کی بے شمار دولت ہی ان
کی جانی دشمن بن گئی۔ ان کے آس پاس رہنے
والے قبیلے اور راجہ مہاراجہ اکثر ان کی بستی پر
دھاوا بولتے اور سب کچھ لوٹ کر لے جاتے۔ یہ
لوگ مال دار تھے لیکن رات کو اس ڈر سے
چین سے سو نہیں سکتے تھے کہ نہ معلوم کس وقت
لالچی پڑوسی ان پر حملہ کر دیں اور ان کی دولت
لوٹ کر لے جائیں۔

پالی وال کسی ایسے راجہ کی تلاش میں
تھے جو ان کی حفاظت کر سکے۔ جلد ہی ان کو
اپنی تلاش میں کام یابی مل گئی۔ قنوج کا راجہ
سیاہ جی ان کے علاقے سے گزرا تو انہوں
نے اس سے درخواست کی کہ وہ ان کی مدد

کرے۔ بدلے میں وہ اسے مال و دولت
سے بے نیاز کر دیں گے۔ سیاہ جی نے ان کی
درخواست منظور کر لی۔ اس طرح راجستھان
ں راٹھور سلطنت کی بنیاد پڑی۔ لیکن یہ
ن و امان بھی عارضی ثابت ہوا۔ سیاہ جی
م کا سیاہ نہیں تھا، دل کا بھی سیاہ تھا۔
لی میں اپنے قدم جمانے کے بعد اس نے
ں پالی وال کی دولت پر قبضہ کرنا چاہا۔
ب رو ہولی کے موقع پر جب سب لوگ
ف رلیوں میں مست تھے، اس نے پالی وال
حملہ کر دیا۔ اس نے ہر خاندان کے سربراہ کو قتل
دیا اور ان کی دولت پر قبضہ جما لیا۔ ان کا
سوالا ہی ان کی جان کا لاگو ہو گیا۔ پالی وال حیران
ہ کہ وہ کیا کریں اور کہاں جائیں۔ یہ بات ۰۰۷
ل پرانی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں کے
شروع ہو گئے۔ راجپوتوں نے لڑائی کے
پالی وال سے چندہ مانگا۔ انہوں نے
حجت کی تو زبردستی ان سے روپیہ وصول
یا۔ پالی وال نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مارواڑ کو چھوڑ کر
جائیں گے۔ انہوں نے پناہ ڈھونڈنے
لئے ایک ایسے علاقے کا انتخاب کیا جو

لڑائی جھگڑوں سے دور تھا۔ یہ جیسلمیر تھا،
جو راجستھان کے آخری سرے پر واقع ہے۔
پالی وال مارواڑ سے ہجرت کر کے جیسلمیر آ گئے۔
یہاں انہیں امن و امان سے رہنے کا موقع
مل گیا۔

جیسلمیر پہنچ کر پالی وال نے دوبارہ
تجارت شروع کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھر
مال دار بن گئے۔ سارے علاقے کی تجارت
ان کے ہاتھوں میں آ گئی۔ وہ چرواہوں سے
بھیڑوں کا اون خریدتے، کسانوں کی زمین
گروی رکھ کر انہیں سود پر روپیہ دیتے،
گوالوں سے گھی خریدتے اور ہندوستان
کے مختلف علاقوں میں منہ مانگے داموں
فروخت کرتے۔ وہ خود تو کھیتی نہ کرتے لیکن
کھیتوں پر ان کا قبضہ ہوتا۔ وہ سرکار کو لگان
ادا کرتے اور راجہ کا خزانہ پالی وال کی دولت
سے ہمیشہ بھرا رہتا۔ اس طرح تقریباً ۵۰۰ سال
گزر گئے۔ پالی وال نے جیسلمیر میں شان دار
حویلیاں تعمیر کرائیں۔ وہاں لوگ پہلے جھونپڑوں
میں رہتے تھے جو گھاس پھوس سے تیار
کی جاتی تھیں۔ پالی وال نے پہلی بار زرد

پتھر کا استعمال کیا۔ ان کی حویلیوں کی شان دار
کھڑکیاں اور دروازے سنگ تراشوں کی
صناعی کا بہترین نمونہ تھے۔ برآمدوں میں
نفیس پچی کاری کا کام دیکھتے ہی بنتا تھا۔
پالی وال عورتیں خاوند کی کمائی پر عیش
کرتیں۔ گھر میں نوکروں کی فوج موجود رہتی۔
عورتیں پردے میں رہتیں۔ انہیں باہر نکلنے کی
ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ سونے چاندی کے
زیورات سے لدی رہتیں، چاندی کے برتنوں
میں کھانا کھاتیں، بازو ہاتھی دانت کے
کڑوں سے ڈھکے رہتے، لڑکیوں کو لاکھوں
روپیہ کا جہیز ملتا اور وہ تمام زندگی عیش و
عشرت میں گزارتیں۔ لیکن یہ امن و امان اور
خوش حالی بھی عارضی ثابت ہوئی۔ اور پالی وال
ایک بار پھر انسان کے ظلم کا شکار بن گئے۔

آج سے ۱۵۰ برس پہلے جیسلمیر کا
راجہ راول مول راج تھا۔ اس کے دیوان کا
نام مہتہ سروپ سنگھ تھا۔ یہ بہت ظالم اور
جنگجو انسان تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں
سے پالی وال کو لوٹنا شروع کر دیا۔ مہتہ سروپ سنگھ
کی موت کے بعد اس کا بیٹا ظالم سنگھ وزیر اعظم
بنا تو وہ اپنے باپ سے بھی دو ہاتھ آگے
نکل گیا۔ وہ نام کا ہی ظالم نہیں تھا بلکہ کردار
کا بھی شقی القلب تھا۔ کسی انسان کو ذرا سی
بات پر قتل کر دینا اس کے لئے مذاق سے
زیادہ نہیں تھا۔ راجہ نے اس کے ظلم کے
خلاف احتجاج کیا تو اس نے راجہ کو ہی گدی
سے اتار دیا اور ایک کٹھ پتلی راجہ گج سنگھ
کو گدی پر بٹھا دیا۔ اس راجہ کو گدی پر بٹھانے
کے بعد ظالم سنگھ کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا

ممتاز، اُڈلے

۱۔ عورت کی زندگی کی سب سے اہم خاصیت کیا ہے؟

ج: مختلف طبقوں کی زندگی بھی مختلف ہے۔ ایسا طبقہ بھی ہے جس کی عورتیں کھاتی ہیں موٹی ہو جاتی ہیں تو ہیلتھ سنٹر جا کے چربی گھلاتی ہیں۔ ایسی بھی ہیں جو دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہیں والدین یا شوہر کو خوش کرنے والے کام کرتی ہیں۔ اکثریت ایسی ہے جو مرد عورت بچے صبح سے شام تک جُٹ کر کام کرتے ہیں اور آدھے پیٹ ہو جاتے ہیں۔

س: بچے ماں کی صحبت کا زیادہ اثر لیتے ہیں یا باپ کی؟

ج: دونوں مل کر ہی اسے جنم دیتے ہیں۔ ماں کے پاس زیادہ رہنے کا موقع ملتا ہے ایسے بچے خوش قسمت ہیں جن سے والدین بات چیت کریں۔ دوست بن کر ہنسیں کھیلیں ان سے رائے لیں حکم نہ دیں، رائے دیں۔ ڈانٹیں کم سمجھائیں زیادہ۔ میری بیٹیوں سے دُوری رہی مگر نواسے سے بڑی گہری دوستی ہے۔ بہت باتیں ہوتی ہیں تاش کھیلتے ہیں ان کے دوست بھی آ جاتے ہیں۔

ملک احمد عابد، وارنگل

س: میری کمزوری لڑکیاں ہے بتائیے کیا کروں؟

ج: اسے کمزوری کیوں کہتے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے میں دلچسپی لے کر قانونِ قدرت کی پابندی کرتے ہیں یہ کوئی مرض نہیں ہے۔ کمزور خواہ مخواہ کہا ہے۔ اسے عیب نہ سمجھئے کوئی تہذیب سے گری ہوئی حرکت نہیں کرتے تو آپ صحت مند ہیں۔

محفوظ گرول۔ دربھنگہ

س: دو آدمیوں کے درمیان صلح کرانا کیسا ہے؟

ج: کسی عقل مند کا خیال ہے کہ
جب کہ دو مُوذیوں میں ہو کھٹ پٹ
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

محمد اسرافیل، مارسین، ایم یو

س: تنہائی پسند انسان کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ج: انسان چاہے تو بھیڑ بھاڑ میں بھی تنہا رہ سکتا ہے۔ مگر مجھے تو بھیڑ میں ہی کہانیاں ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ رات کو جب سب سو جاتے ہیں تب لکھتی پڑھتی ہوں۔ سب اپنے کام میں لگ جاتے ہیں، میں سو جاتی ہوں۔ اگر خواب دیکھنے لگیں تو وہ تنہائی بھی ختم ہو جاتی ہے ہر انسان زندگی کے اصول اپنی مرضی سے بناتا ہے۔

س: کبھی خیالوں ہی خیالوں میں آنسو آ جائیں تو؟

ج: تو پوچھ ڈالئے۔ آنسو آنکھوں کی روشنی بڑھاتے ہیں۔ دُھلائی ہو جاتی ہے کبھی کبھی رو لینا بُرا نہیں خاص طور پر کسی خیال پر آنسو آ جائیں تو حساس ہونے کی نشانی ہے۔

سلطان احمد اشک، کریم نگر

س: غیرت کی چنگاری کب سُلگتی ہے؟

ج: کوئی نا انصافی اور جب سے واسطہ پڑ جائے جو لعنت ملامت یا گالی کی صورت میں بغیر قصور کے گرتی پڑے تو یہ انسان کی خودداری پر ابھارتی ہے چنگاری شعلہ بھی بن سکتی ہے جو بہت کچھ بھسم کر جاتی ہے۔

س: قناعت پسندی عورت میں زیادہ ہوتی ہے یا مرد میں؟

ج: قناعت زنانی مردانی نہیں ہوتی۔ قناعت صفت ہے۔ یہ تو تربیت پر منحصر ہے لیکن جو انسان احساس کمتری میں گرفتار ہو گا جسے مستقبل سے خوف آتا ہو گا وہ قناعت کر کیا جانے گا۔ عام طور پر عورتیں والدین بھائیوں کے رحم و کرم پر جیتی ہیں پھر شوہر پر روٹی کپڑے کا بوجھ پڑتا ہے تو اسے خوش رکھنا پڑتا ہے۔ نہ جیسے ہے ایسی عورتوں سے بھی ڈرتی ہیں جو بھولی بھالی عورتوں کے شوہر چھین لے جاتی ہیں۔ یہ ذہنی بے اطمینانی انہیں پیچھے سے دُور کر دیتی ہے۔ جو ڈرتی ہے کہ کل کیا ہو گا وہ قناعت کو کیا جانے قابلِ رحم ہیں ایسی عورتیں جو اپنے مرد کو بھی قناعت سے محروم کر دیتی ہیں۔

ظہیر الدین انصاری، داؤد نگر (بہار)

س: غصہ آئے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج: پہلے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیجئے پھر الحمد شریف تین بار پڑھئے۔ ایک دم دماغ میں بجلی سی دوڑنے لگے گی اور غصہ قابو میں آ جائے گا۔

موتیوں کی بیلیں

سعدیہ صاحبہ :

بانو کا سال نامہ نظر نواز ہوا۔ کیا خوب ہے! سرِ ورق دیکھتے ہی دل خریدنے کے لئے بے قابو ہو گیا۔ ابھی صرف افتتاحیہ اور سفرنامہ ہی پڑھا ہے لطف آ گیا۔ خدا کرے آپ ایسے خوب صورت نمبر ہزاروں سال تک نکالتی رہیں۔

حبیب اللہ خان نیلام

بہن سعدیہ صاحبہ :

بانو : میں ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ تمام مضامین اور افسانے اچھے لگے۔ ڈاکٹر امینہ احمد اور شکنتلا دیوی کے بارے میں پڑھ کر اپنے ملک پر فخر ہونے لگا کہ کیسی کیسی لڑکیاں اور عورتیں ملک کا نام روشن کر رہی ہیں۔

اس بار آپ کا افتتاحیہ اور مضمون "وہ آئے تو آتے چلے گئے" دونوں پسند آئے۔ افسانوں میں شافعہ شاد کا "قیمت بے قیمت" محمد بشیر کا "جواز" عشرت راشدی کا "پتھر کے لوگ" اور منبری رحمٰن کا "یہ کیسے رشتے" بہت اچھے لگے۔ "یہ کیسے رشتے" میں مصنفہ نے یہ بات بتانے کی کام یاب کوشش کی ہے کہ کس طرح بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک ماں باپ اپنی اولاد کا ساتھ دیتے ہیں۔ جس کے صلہ میں اولاد انہیں تنہا چھوڑ کر اپنا مستقبل سنوارنے چلی جاتی ہے۔

متین صدیقی، حیدر آباد

سعدیہ صاحبہ :

سچ مچ سال نامہ بے حد حسین ہے اس کی تعریف کرنا گویا آفتاب کو دِیا دکھانا ہے۔ یہ آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ کہانیاں "گناہ کی تلافی" "سات دریا آگ کے"

"پیاس نیچے دریا کی" وغیرہ بے حد پسند آئیں۔ سب ہی کچھ تو اچھا لگا۔ کیا کیا بتاؤں غرض سارا سال نامہ ہی خوب صورت ہے۔

قمر سلطانہ، سیتاپور

سعدیہ بی بی :

سال نامہ میں آپ کا افتتاحیہ پڑھا۔ آپ نے اولیاء اللہ سے فیض حاصل کر کے اپنے نفس کو مار کر حُسنِ سلوک کو اپنانے کی تاکید کی ہے۔ مگر کہتے ہیں کہ جو اس راستے پر گامزن ہونے کی ہمت کریں گے۔ بچھو تو غیر جانور ہے اور اس کا کام ڈنک مارنا ہی ہے۔ اگر اس نے ڈنک مارنے کا فعل انجام دیا ہے تو یہ اس کا فطری عمل ہے۔ مگر آج کے انسان بچھو سے کہیں زیادہ زہریلے جانور بن کر دوسروں کی راہ کو پُرخار بناتے جاتے ہیں۔ کیا آپ کہتی ہیں کہ ان کے ساتھ بھی حُسنِ سلوک کرنا چاہیے؟ کتنی ایسی بے زبان بہوئیں ہیں جن پر رات دن شوہر، ساس نند کے ڈنک وار کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ بے چاریاں اپنی جان سے جاتی ہیں۔ کیا ان کو بھی چھوڑ دیا جانا چاہیے؟ وہ انسان جو تیں ہے اُٹھ گیا جس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تھی۔ اسی لئے کسی شاعر نے کہا تھا کہ "فرشتے سے مشکل ہے انسان بننا" آج کا انسان تو جانوروں سے کچھ زیادہ ہی ظالم ہو گیا ہے۔ اس کو حُسنِ سلوک سے نہیں سدھارا جا سکتا۔ اس کو تو صرف سماجی بائیکاٹ سے سُدھارا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے تمام سہولتوں کے راستے بند کر دینے چاہئیں، تب ہی وہ سُدھر سکتا ہے۔ کوئی اسے مُنہ بھی نہ لگائے تو وہ اپنی غلطی کا احساس کر کے سُدھر سکتا ہے۔ آج کی دنیا میں اگر سب لوگ حضرت نظام الدین اولیاء کے راستے پر چلنے تو بُرائی اپنے آپ ختم ہو جاتی مگر مشکل تو یہی ہے کہ کوئی بھی شخص حضرت نظام الدین اولیاء کے راستے پر نہیں چلتا، بلکہ بچھو کی روش اپنائے ہوئے ہے۔ اس لئے اس کی سرکوبی ضروری ہے۔ حُسنِ سلوک صرف اس کے ساتھ کرنا چاہیے جس میں خلوص کی کچھ بُو باس ہو، جو زبان سے نہ سہی فعل سے کسی کے اچھے سلوک کا جواب دے سکے۔

یا کم از کم اس کا احسان مند تو ہو۔ آج کے انسانوں کے دماغ تو شیطان کے کارخانے بنے ہوئے ہیں۔ وہ ہر پل یہ منصوبہ بناتے رہتے ہیں کہ کس طرح کس کو ضرر پہنچایا جائے ان کے ساتھ وہی سلوک روا ہے جو ان کو سدھارنے کے لئے موزوں ہو۔

عالم شاہ، کھمم (آندھرا)

سعدیہ بہن:

سال نامہ نظر نواز ہوا۔ ٹائٹیل کا جواب نہیں۔ سال نامہ پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ ہر تخلیق اپنی جگہ شاہکار ہے۔

سال نامہ ایک حسین گل دستے سے کم نہیں۔ ہر پھول اپنی جگہ خوب ہے۔

ثمینہ شادان، رامپور

ڈیر مدیرہ صاحبہ:

۱۹۸۵ کا سال نامہ بہت خوب ہے سال نامہ سے کئی سال کی محرومی کی تلافی ہو گئی اُمید ہے کہ اب آپ ہر سال اس روایت کو قائم رکھیں گی۔ اس بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ سال نامہ میں بڑی بڑی نام ور ہستیوں نے حصہ لیا ہے۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ آئندہ بھی بانو کی محفل میں حصہ لیں تا کہ بانو اتنا ہی دل چسپ اور خوب صورت بنا رہے۔

عظمیٰ، رام پور

سعدیہ صاحبہ:

سال نامہ بک اسٹال سے خرید کر بے پناہ مصروفیت کے باوجود پڑھ ہی ڈالا۔ یہ سہرا آپ کے سر ہے کہ سال نامہ اس قدر سجا سنوار کر پیش کیا ہے کہ بے اختیار دل سے واہ نکلی۔ آپ کا سفر نامہ پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ آپ نے بانو کی ادارت سنبھالی ہے تو یقیناً اب بانو کا مزاج اور معیار بدلے گا۔ صاف ستھرے مضامین اور شعری تخلیقات بانو کی ایک اہم روایت ہیں۔ اس روایت کو برقرار رکھئے گا۔ نئے کالموں کے اضافے کے لئے مبارک باد۔

آپ کے سفر نامہ میں مولانا نیازی صاحب کا شعر آپ کے جذبات کی آئینہ دار ہے۔ شعر پڑھ کر "آمین" کہا اور دعا کی کہ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

سال نامہ میں "روانی شادی"، "آگ کے سات دریا" اور "زخموں کے سوداگر" بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ شعری تخلیقات بھی خوب صورت ہیں۔ تمام لکھنے والوں کو مبارک باد۔

گوہر شیخ پوری، وارانسی

سعدیہ صاحبہ:

سال نامہ سچ مچ فردوسِ نظر ہے۔ دل کی کلیاں کھل اُٹھیں۔ اور آنکھوں کی جنت مسکرا پڑی۔ سال نامہ صرف گل ہائے رنگ رنگ سے سجا ہوا، مہکتا ہوا ایک چمن ہے، بلکہ کہکشاں کی طرح روشن، ستاروں کی طرح تابندہ، چاند کی طرح حسین، قوسِ قزح کی طرح رنگین، دُلہن کی طرح سجا سنورا اور تاج محل کی طرح لاثانی ہے۔ اتنا پیارا، خوب صورت، دل کش اور نظر فریب سال نامہ نکالنے پر مبارک باد۔

سعید فریدی، وارانسی

سعدیہ بہن:

سال نامہ میرے ہاتھ میں ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے اس نے مجھ پر جادو کر کے اپنے قبضہ میں کر لیا ہے، کیوں کہ میں تمام ہی ناولوں کو چھوڑ کر اسی کا مطالعہ شوق و ذوق سے کر رہا ہوں۔

سال نامہ کے سب ہی مضامین عمدہ تھے۔ میرا پسندیدہ شعر "تبسم" کہنی ہوئی، بزمِ بانو، اقوالِ زرّیں، اور افتتاحیہ تو بانو کی جان ہیں۔

آفاق احمد احسان، بستی پور

سعدیہ آپا:

کافی لمبے عرصے کے بعد بانو کا سالنامہ ہاتھ آیا اور جب افتتاحیہ پر نظر پڑی تو زرینہ آنٹی کے نام کی جگہ آپ کا نام پڑھ کر پہلے کچھ تعجب ہوا، کچھ اُلٹ پلٹ کر بانو کی تلاش کی تو سارا ماجرا سمجھ میں آ گیا۔ اُمید ہے آپ کے مبارک قدم بانو کی دل کشی اور خوب صورتی شگفتہ گل کی طرح نکھار لائیں گے۔

گزشتہ سال بانو میں آپ کے فوٹوگرافی کے شوق کے بارے میں پڑھا تھا اور یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی کہ آپ خوب صورتی کو قید کرنے کی شوقین ہیں۔ اُمید کرتی ہوں، آپ کی ادارت میں بانو میں رنگین، دل کش اور حسین تصویروں کا اضافہ ضرور ہو جائے گا۔

آپ کا افتتاحیہ ایک ایسا حسین پھول ہے جس میں اصلاح کے رنگ کے ساتھ ادب کی خوشبو بھی آتی ہے۔

سال نامہ بہت اچھا رہا۔ کچھ نئے کالم دیکھ کر خوشی ہوئی۔

آپ کا "سفر نامہ" پسند آیا۔ کچھ اور اس طرح کے سفر نامے شائع کر کے لطف اندوز ہونے کا موقع دیں۔

پمّی، پٹنہ (بہار)

○○

...0,000.00

پہلا انعام بالکل درست حل پر : بارہ ہزار روپے، دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر : آٹھ ہزار ر

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر، ادبی معموں کے نقدناموں کے ذریعہ ادا کی جاسکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں، ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہوسکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں، ٹوکن بھیجنے کی شرط کے سوا شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مینی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

...روپے کے انعامات

پہلا انعام:

بارہ ہزار روپے نقد

یا ایک ۵۱ سینٹی میٹر کا

رنگین ٹی وی اور

تین ہزار روپے نقد

دوسرا انعام:

آٹھ ہزار روپے

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ : ہفتہ ۶ جولائی ۱۹۸۵ء۔ آٹھ ۸ جولائی ۱۹۸۵ کو پانچ بجے سہ پہر تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کئے جائیں گے۔

شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۵

ی		ا	ف	س	ب
■	ن	و	ٹ	ن	
	■	ا	کھ		
ا		■	ت	د	
	ل		■	ب	
و		کھ		■	■
ن	ل	ی	ے	■	■

اشارے

دائیں سے بائیں :

۱۔ پہاڑوں پر جانے کی ـــــ ہواؤں سے بچنا چاہئے۔ خاص طور سے

۲۔ ایٹمی تباہ کاری اگر شروع ہو گئی تو ـــــ میں ساری دنیا ویران ہو جائے گی

۳۔ لڑکا پڑھا لکھا ہو برسرِ روزگار ہو۔ اس کے بعد ـــــ جائے کہ شریف اور ملنسار بھی ہو

۴۔ بخار کی ـــــ میں کھانا پینا پڑھنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ بس

۵۔ ـــــ ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالب

اوپر سے نیچے :

۶۔ آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل ـــــ

۷۔ سکھ اور دکھ ہمارے اپنے کرموں کا پھل ہے۔ ـــــ وہ ہے جو

۸۔ جب تک ہم ـــــ کر نہیں رہیں گے محبت اور مروت سے دور رہیں گے

۹۔ میں بھی کبھی گولیاں نہیں کھیلا تھا جو ان ـــــ میں آجاتا۔ فوراً ہی

۱۰۔ عوام سیاست دانوں کے ـــــ میں آجاتے ہیں اور مذہب زبان یا علاقہ کے نام پر کہیں نہ کہیں قتل و خون

●●

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں ـــــ فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ۔

★ صرف دس اشارے

★ انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقدنامے استعمال کئے جاسکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔

★ صحیح حل : جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجئے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھئے۔

★ شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۵ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور اگست ۱۹۸۵ کے ماہ نامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

شمع ادبی معمے (شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۵) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۵ کا صحیح حل : بدھ، ۱۰ جولائی ۱۹۸۵ کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہ نامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع، اگست ۱۹۸۵ میں بھی شائع کی جاسکتی ہیں۔

The Registrar of Newspapers at R.N. No. 741 - 7 Regd. No. D-(E)

جدید تکنیک کے مطابق بالوں کا حسن جڑی بُوٹیوں کے استعمال میں ہے۔

ٹریٹ آملہ شکاکائی ہیئر آئل اور ٹریٹ ہربل ہیئر سوپ، آملہ، شکاکائی، مہندی اور دیگر جڑی بوٹیوں سے تیّار کئے گئے ہیں۔ یہ جڑی بوٹیاں لمبے، گھنے، چمکیلے اور کالے بالوں کو بڑھانے کے لئے صدیوں سے مشہور ہیں۔

جی ڈی انٹرنیشنل پوسٹ بکس [illegible]

افتتاحیہ

خدا نے ہمارے لئے دنیا کی تقریباً سب چیزیں حلال کردی ہیں۔ صرف چند چیزیں حرام ہیں۔ انسان کے لئے انہیں کھانا تو درکنار، چھونا بھی حرام ہے۔ لیکن سال میں ایک مہینہ ایسا بھی آتا ہے جب حلال چیزیں دن بھر کے لئے حرام ہو جاتی ہیں۔ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ اس سال رمضان شدید گرمی کے دوران آیا۔ آپ تشنگی بارش گرمی سے پریشان گھر پہنچتی ہیں۔ آپ کا نوکر شربت کا ٹھنڈا گلاس بناکر آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ شربت ہے جو حلال ہے۔ آپ کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں، لیکن آپ اس گلاس کو ہاتھ بھی نہیں لگاتیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ رمضان کے مہینے میں دن بھر کے لئے حلال شے بھی حرام بن جاتی ہے۔ یہی روزے کا فلسفہ ہے، جو صبر اور برداشت کی طاقت پیدا کرتا ہے۔ خدا حلال رزق کو بھی ممنوع قرار دیتا ہے۔ اس مہینے میں لوگ برائیوں سے دور رہتے ہیں۔ اس کے بعد عید آتی ہے۔ صبر کے بند کھل جاتے ہیں۔ کھانے پینے پر سے پابندی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سب سے بڑا تہوار ہے۔ جب انسان کو اپنی مہینہ بھر کی ریاضت کا پھل ملتا ہے۔ دلوں کی کدورت دور ہو جاتی ہے۔ لوگ خوشی خوشی ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔

ہم بھی اپنی جانب سے بانو پڑھنے والی بہنوں کو عید کی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

سعدیہ دہلوی

بہ یادگار: یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اڑتیسواں سال، ۴۶۱ واں شمارہ
عام شمارے کی قیمت: چار روپے
سالانہ قیمت: اڑتالیس روپے

مقام اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس: 3161401 SHMA IN
ٹیلی فون: 278066, 278067 278068
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان: شمع میگزین 277053, 276956
طابع و ناشر: یونس دہلوی

ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس، دہلی
مطبوعہ: روبی پرنٹنگ پریس، دہلی

راجیو گاندھی
کی
سیاسی زندگی میں عورتوں کا حصّہ

یہ ایک عام خیال ہے کہ یہ مردوں
ی دنیا ہے۔ یہ خیال ایک حد تک صحیح
ی ہے مغربی ممالک میں عورتیں مردوں
ے دوش بدوش کام کرتی ہیں مگر سیاست
ں وہاں ابھی تک مردوں کی اجارہ داری ہے
نگلستان میں آج پہلی بار عورت وزیراعظم ہے
امریکہ میں ایک عورت کو صدر بننے میں غالباً
۵۰ سال لگ جائیں گے۔ ہندوستان کو یہ فخر ہے
کہ اتنے بڑے ملک کی وزیراعظم بننے کا فخر
ایک عورت کو حاصل ہوا۔ اندرا گاندھی کے
وزیراعظم بننے کے بعد عورتوں کا سیاست میں
داخلہ شروع ہو گیا۔ موجودہ وزیراعظم نے عورتوں
کو سیاست میں بڑھاوا دینے کے لئے مزید قدم
اٹھایا ہے۔

ہندوستان کی پارلیمنٹ میں آج
۶۶ عورتیں ممبر ہیں۔ ان میں ۴۲ لوک سبھا
میں ہیں اور ۲۴ راجیہ سبھا میں۔ گزشتہ
الیکشن میں کانگریس آئی نے ۳۸ عورتوں
کو ٹکٹ دیا تھا ان میں سے ۲۶ عورتیں منتخب
ہو گئیں۔ راجیو گاندھی نے ایک بڑا قدم یہ
اٹھایا کہ پہلی بار ایک عورت کو کیبنٹ منسٹر

محسنہ قدوائی

راجندر کماری باجپئی

شیلا کول

وجینتی مالا

بنایا۔ ان کا نام محسنہ قدوائی ہے۔ کابینہ میں
یہ خاتون وزیر صحت ہیں۔ مشہور صحافی
مارگریٹ الوا بھی منسٹر آف اسٹیٹ ہیں۔
راجیو گاندھی نے نہ صرف عورتوں کو وزارت
میں جگہ دی۔ بلکہ ایک نیا شعبہ بھی قائم کیا۔
یہ شعبہ سوشل ویلفیئر اور عورتوں سے متعلق
ہے۔ اس کی وزیر کا نام رگاتھم چندر شیکھر
ہے۔ یہ خاتون جنوبی ہند سے تعلق رکھتی ہیں
اور پرانی کانگریس کارکن ہیں۔ مارگریٹ الوا
کے پاس پارلیمنٹری کاموں کا شعبہ ہے۔
بارکی راج دلاری سنہا ہوم منسٹری میں منسٹر
آف اسٹیٹ ہیں۔ راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئرمین
نجمہ ہبتہ اللہ کو چنا گیا۔ یہ مولانا آزاد
کی نواسی ہیں۔ بی بی امرجیت کور آل انڈیا کانگریس
کمیٹی کی ڈپٹی سکریٹری ہیں۔ دلی کانگریس کی
چیئرمین بیگم تاج دار بابر ہیں۔

پارلیمنٹ میں لوک سبھا کے ممبروں کی
تعداد ۶۰۰ تک پہنچتی ہے۔ لیکن گزشتہ
الیکشن میں پنجاب اور آسام میں مختلف وجوہ
کی بنا پر الیکشن نہیں ہوئے، اس لئے
ممبروں کی تعداد ۵۴۴ رہی۔ ان میں عورتوں کی
تعداد ۴۲ ہے، یعنی تقریباً ۸ فی صد۔ ہندوستان
میں عورتوں کی آبادی ۵۰ فی صد ہے۔ اس کو
دیکھتے ہوئے یہ تناسب کم معلوم ہوتا ہے لیکن
ابھی اس کام کی ابتدا ہے

ہندوستان کی پارلیمنٹ کے علاوہ
ریاستی اسمبلیوں میں بھی عورتوں کی تعداد بڑھائی
جا رہی ہے۔ مہیلا کانگریس کی ممبروں کی تعداد
اب ۱۰ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ مہیلا کانگریس
نے مانگ کی ہے کہ ہندوستان کے ہر
حلقہ سے ایک اسمبلی کی ممبر ضرور منتخب ہونی
چاہئے۔ راجیو گاندھی نے اعلان کیا ہے
کہ اگر پارلیمنٹ میں عورتوں کا تناسب ۸
فی صد ہے تو صوبائی اسمبلی میں اسے بڑھا کر
۲۰ فی صد کر دیا جائے گا۔

راجیو گاندھی کے اس اعلان سے
عورتوں میں بیداری اور امید کی لہر دوڑ گئی۔
اس کا ثبوت ایک دلچسپ واقعہ سے ملتا
ہے۔ گزشتہ دنوں ایک عورت مدھیہ پردیش
کے علاقہ چھتیس گڑھ سے دلی آئی۔ اسے
آل انڈیا کانگریس کے جنرل سکریٹری سری
کانت ورما سے ملنا تھا۔ اس نے اپنے
نام کی چٹ بھجوائی۔ اس چٹ میں ایک
خانہ تھا جہاں لکھا تھا: آپ کی آمد کا
مقصد کیا ہے؟ اس عورت نے اس کی
خانہ پری اس طرح کی: "اسمبلی الیکشن کے
ٹکٹ کے لئے"۔ سری کانت حیران رہ گئے
انہوں نے پاس بیٹھے ہوئے ایک صحافی
سے کہا۔ آپ نے دیکھا، اگر یہ چٹ کوئی
مرد بھجواتا تو اس کی خانہ پری سرکاری کام سے
کرتا۔ لیکن اس عورت نے صاف صاف
لکھ دیا کہ اسے کیا کام ہے، جب کہ مرد
گھما پھرا کر بات کرتے ہیں"۔ اس عورت کو
بلایا گیا تو اس نے کہا "راجیو گاندھی نے
اعلان کیا ہے کہ اسمبلی کے لئے اقلیتوں،
عورتوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کو ٹکٹ ملنا چاہئے
میں ایک عورت ہوں، مسلمان ہوں، تعلیم یافتہ

بالو نمی، دلی

خدمت ہوں ۔ میں اس ٹکٹ کی مستحق ہوں۔
عورت کو ٹکٹ دے دیا گیا۔
گزشتہ الیکشن میں بنگال کے
داور علاقے سے ممتا بنرجی نے اپنے
سٹ مخالف کو ۲۰ ہزار ووٹ سے ہرایا۔
کی عمر ۴۰ سال ہے، جب کہ ان کے
ف سوم ناتھ بنرجی ایک پرانے کمیونسٹ
ہوں بندے سابق فلم ایکٹرس منی ملا
پرانے اور منجھے ہوئے سابق کانگرسی
دیا۔ آج کی پارلیمنٹ میں ڈاکٹر، پروفیسر
شل ورکر اور انجینئر سب ہی شامل
گو یہ بات ضرور ہے کہ ان میں سے کچھ
تیں لیڈروں کی بہو یا بیوی ہیں۔ مثلاً لوک پتی
پاٹھی کی اور اوما شنکر ڈکشت کی بہو
یمنٹ کی ممبر بن گئیں۔ اڑیسہ کے وزیراعلیٰ
نائک کی بیوی جینتی پٹنائک بھی اسی
ے میں شامل ہیں۔ بہار کے وزیراعلیٰ
بیوی منورما سنگھ بھی اسی شمار میں آتی ہیں
بہار کے لیڈر ستیہ نرائن سنہا کی بیوی کشوری
ہا بھی۔ اسی طرح بیگم عابدہ احمد جو فخرالدین
احمد مرحوم کی بیوہ ہیں، پارلیمنٹ کی ممبر منتخب
ہیں۔

یہ سب عورتیں پڑھی لکھی ہیں۔ شیلا
ت (اوما شنکر ڈکشت کی بہو) نے تاریخ
ایم اے کیا ہے۔ وہ قنوج سے منتخب
ئی ہیں جب اوما شنکر ۱۹۶۹ میں بیمار
ئے تھے تو انہوں نے ان کی کچھ سیاسی
ذاری سنبھال لی تھی۔ ڈکشت آج کل بنگال
ے گورنر ہیں محسنہ قدوائی نے ایمرجنسی کے
ر کانگریس کا وقار بلند کر دیا تھا۔ انہوں نے
اعظم گڑھ سے اس وقت کانگریس کا الیکشن
جیتا جب کانگریس کی ساکھ بگڑ چکی تھی مسز
گاندھی اتر پردیش سے ایک سیٹ بھی نہیں
جیت سکی تھیں محسنہ کی فتح کے بعد شمالی ہند
میں کانگریس کے نیم مردہ جسم میں جان پڑنی
شروع ہوئی پھر یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ اور
ایک دن اندرا گاندھی کی جیت تک پہنچ گیا۔
راجیو گاندھی کی پالیسی کو دیکھ کر یہ امید
ہوئی ہے کہ مستقبل قریب میں عورتیں ہندوستان
کی سیاست میں بھرپور حصہ لیں گی اور اپنے
حقوق کے لئے جدوجہد کریں گی۔

ممتا بینرجی ◄

وجینتی مالا

بنایا۔ ان کا نام محسنہ قدوائی ہے۔ کابینہ میں یہ خاتون وزیر صحت ہیں۔ مشہور صحافی مارگریٹ الوا بھی منسٹر آف اسٹیٹ ہیں۔ راجیو گاندھی نے نہ صرف عورتوں کو وزارت میں جگہ دی، بلکہ ایک نیا شعبہ بھی قائم کیا۔ یہ شعبہ سوشل ویلفیر اور عورتوں سے متعلق ہے۔ اس کی وزیر کا نام مرگاتھم چندر شیکھر ہے۔ یہ خاتون جنوبی ہند سے تعلق رکھتی ہیں اور پرانی کانگریس کارکن ہیں۔ مارگریٹ الوا کے پاس پارلیمنٹری کاموں کا شعبہ ہے۔ بہار کی راج دلاری سنہا ہوم منسٹری میں منسٹر آف اسٹیٹ ہیں۔ راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئرمین کے لئے نجمہ ہبتہ اللہ کو چُنا گیا۔ یہ مولانا آزاد کی نواسی ہیں۔ بی بی امرجیت کور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ڈپٹی سکریٹری ہیں۔ دلی کانگریس کی چیئرمین بیگم تاج دار بابر ہیں۔

پارلیمنٹ میں لوک سبھا کے ممبروں کی تعداد ۵۰۰ تک پہنچتی ہے۔ لیکن گزشتہ الیکشن میں پنجاب اور آسام میں مختلف وجوہ کی بنا پر الیکشن نہیں ہوئے، اس لئے ممبروں کی تعداد ۵۴۴ رہی۔ ان میں عورتوں کی تعداد ۴۲ ہے، یعنی تقریباً ۸ فی صد۔ ہندوستان میں عورتوں کی آبادی ۵۰ فی صد ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے یہ تناسب کم معلوم ہوتا ہے لیکن ابھی اس کام کی ابتدا ہے۔

ہندوستان کی پارلیمنٹ کے علاوہ ریاستی اسمبلیوں میں بھی عورتوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ مہیلا کانگریس کی ممبروں کی تعداد اب ۱۰ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ مہیلا کانگریس نے مانگ کی ہے کہ ہندوستان کے ہر پارلیمنٹری حلقہ سے ایک اسمبلی کی ممبر ضرور منتخب ہونی چاہئے۔ راجیو گاندھی نے اعلان کیا ہے کہ اگر پارلیمنٹ میں عورتوں کا تناسب ۱۰ فی صد ہے تو صوبائی اسمبلی میں اسے بڑھا کر ۲۰ فی صد کردیا جائے گا۔

راجیو گاندھی کے اس اعلان سے عورتوں میں بیداری اور اُمید کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا ثبوت ایک دل چسپ واقعہ سے ملتا ہے۔ گزشتہ دنوں ایک عورت مدھیہ پردیش کے علاقہ چھتیس گڑھ سے دلی آئی۔ اسے آل انڈیا کانگریس کے جنرل سکریٹری سری کانت ورما سے ملنا تھا۔ اس نے اپنے نام کی چٹ بھجوائی۔ اس چٹ میں ایک خانہ تھا جہاں لکھا تھا: آپ کی آمد کا مقصد کیا ہے؟ اس عورت نے اس کی خانہ پری اس طرح کی: "اسمبلی الیکشن کے ٹکٹ کے لئے"۔ سری کانت حیران رہ گئے انہوں نے پاس بیٹھے ہوئے ایک صحافی سے کہا۔ آپ نے دیکھا، اگر یہ چٹ کوئی مرد بھجواتا تو اس کی خانہ پری 'سرکاری کام' سے کرتا۔ لیکن اس عورت نے صاف صاف لکھ دیا کہ اسے کیا کام ہے، جب کہ مرد گھما پھرا کر بات کرتے ہیں۔" اس عورت کو بلایا گیا تو اس نے کہا "راجیو گاندھی نے اعلان کیا ہے کہ اسمبلی کے لئے اقلیتوں، عورتوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کو ٹکٹ ملنا چاہئے میں ایک عورت ہوں، مسلمان ہوں تعلیم یافتہ

...تحق ہوں۔ میں اس ٹکٹ کی مستحق ہوں۔
...رت کو ٹکٹ دے دیا گیا۔

گزشتہ الیکشن میں بنگال کے
...دیور علاقے سے ممتا بنرجی نے اپنے
...ست مخالف کو ۲۰ ہزار ووٹ سے ہرایا۔
...کی عمر ۲۷ سال ہے، جب کہ ان کے
...لف سوم ناتھ بنرجی ایک پرانے کمیونسٹ
... جنوبی ہند سے سابق فلم ایکٹرس جینتی مالا
... ایک پرانے اور منجھے ہوئے سابق کانگرسی
...کو ہرا دیا۔ آج کی پارلیمنٹ میں ڈاکٹر، پروفیسر
...شل ورکر اور ایکٹریس سب ہی شامل
... گو یہ بات ضرور ہے کہ ان میں سے کچھ
...تیں لیڈروں کی بہو یا بیوی ہیں۔ مثلاً لوک پتی
...پاٹھی کی اور اوما شنکر ڈکشت کی بہو
...لیمنٹ کی ممبر بن گئیں۔ اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ
...نائک کی بیوی جینتی پٹنائک بھی اسی
...رے میں شامل ہیں۔ بہار کے وزیر اعلیٰ
... بیوی منورما سنگھ بھی اسی شمار میں آتی ہیں
...بہار کے لیڈر ستیہ نرائن سنہا کی بیوی کشوری
...سنہا بھی۔ اسی طرح بیگم عابدہ احمد جو فخر الدین
... احمد مرحوم کی بیوہ ہیں، پارلیمنٹ کی ممبر منتخب
...ہوئیں۔

یہ سب عورتیں پڑھی لکھی ہیں۔ شیلا
...شت (اوما شنکر ڈکشت کی بہو) نے تاریخ
...سا ایم اے کیا ہے۔ وہ قنوج سے منتخب
...ئی ہیں جب اوما شنکر ۱۹۶۹ میں بیمار
... گئے تھے تو انہوں نے ان کی کچھ سیاسی
...ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ ڈکشت آج کل بنگال
...کے گورنر ہیں۔ محسنہ قدوائی نے ایمرجنسی کے
...بعد کانگریس کا وقار بلند کر دیا تھا۔ انہوں نے

ممتا بنرجی ◄

اعظم گڑھ سے اس وقت کانگریس کا الیکشن
جیتا جب کانگریس کی ساکھ بگڑ چکی تھی۔ مسز
گاندھی اتر پردیش سے ایک سیٹ بھی نہیں
جیت سکی تھیں۔ محسنہ کی فتح کے بعد شمالی ہند
میں کانگریس کے نیم مردہ جسم میں جان پڑنی
شروع ہوئی۔ پھر یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ اور
ایک دن اندرا گاندھی کی جیت تک پہنچ گیا۔
راجیو گاندھی کی پالیسی کو دیکھ کر یہ امید
ہوئی ہے کہ مستقبل قریب میں عورتیں ہندوستان
کی سیاست میں بھرپور حصہ لیں گی اور اپنے
حقوق کے لئے جدوجہد کریں گی۔

اُتّر دکھّن

سرور جہاں

"اے، میں نے کہا دلہن بیگم — کھانا پک گیا؟"

"اُو — ہو، اس بُڈھیا کو تو دن رات پیٹ کی لگی رہتی ہے!"

خاندانی نواب زادی کی اداس بہو نے اپنی بگڑی زبان میں بڑی ناگواری سے ساس کو جواب دیا۔ اور لکڑی کی تھاپی سے دھما دھم کر کے صابن لگے کپڑوں کو پیٹنے لگی تو جیسے وہ تھاپی ساس کی چھاتی پر دنادن برس رہی ہو۔

ساس نے بہو کی بکواس سن کر سوچا۔

آج کے زمانے سے تو وہی زمانہ اچھا تھا جب رئیس اور نواب بیاہتاؤں کو چھپر کٹ پر بٹھا کر، مہارانی بنا کر راج کراتے تھے۔ خود بھلے ہی باہر نیچ ذات عورتوں سے جی بہلائیں، لیکن بیاہتا کے مرتبے اور عزت میں ذرا جو فرق آنے دیں۔ وہ بیگم بنی پورے گھر پر حکومت کرتی تھیں۔ اور شوہر کم از کم گھر کے اندر ان کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے تھے۔ اور بیگم بھی یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہ جو صاحب اس وقت ان کے سامنے مسکین صورت بنائے بیگم بیگم کی تکرار کر رہے ہیں، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو تلے اوپر کئی سوکنوں کا جلاپا اندر ہی اندر دے چکے ہیں۔ اور اب بھی کون سے تائب ہو گئے ہیں اپنی حرکتوں سے۔ لیکن سب اپنا اپنا فرض سمجھتے بوجھتے بھی — کیا مجال ہے جو بیگم، میاں کی اطاعت، فرماں برداری، خدمت اور دل جوئی میں کمی کر دیں۔ ملازموں کو حکم احکام دیں گی تو اس طرح جیسے ان کے میاں کسی ریاست کے حاکم ہوں۔ یوں تو میاں کی فضول خرچی سے نالاں رہیں گی، لیکن ذرا بھی میاں کا چہرہ اترا دیکھا تو رکھی دھری رقم میاں کے حوالے کر کے شاد ہو گئیں۔ ایک ان کی بہو ہے۔ کیا مجال ہے جو دو پیسے فضول خرچ کرے۔ ایک ایک پائی جوڑتی ہے۔ ہے نا نیچ ذات۔ یہ کیا جانے پیسہ خرچ کرنا۔ میاں کو بھی کون سا سمجھتی ہے۔ اے، آنا تک تو بسواتی ہے، ان کے خاندان میں کبھی کسی نے کاہے کو ایسے کام کئے ہوں گے۔ خدا رکھے نوکروں کی ریل پیل رہتی تھی۔ اس کے باوجود یہ نحوست پیسے کام گھر کے نوکروں تک سے نہیں لئے جاتے تھے کہ مارے رہا دھکم، پھٹا پھٹ کپڑے دُھل رہے ہیں۔ ایک چھوڑ چار دھوبی مع اپنے خاندان کے ملازم تھے۔ اگر کسی غریب شریف کے ہاں ملازم نصیب نہ ہوتا، پاس پڑوس کے غریب لوگوں کو چار پیسے تھما کر گھر کے کام کرا لئے جاتے تھے۔ یہ نہیں کہ میاں خود گیہوں کی گٹھری لے کر سائیکل یا موٹر سائیکل پر رکھ کر آٹا پسوانے چکی کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ اے، اب اس کو کیا کہیں جب اپنے ہی

جیسے قیامت ساری ہی تھی۔ دل آیا تو اس کالی
بھتنی مدراسی نرس ہی پر آیا۔ جیسے اعلیٰ
خاندانوں میں رشتے ٹھکرائے۔ ایک سے
ایک پری پیکر اس کے واسطے دیکھی اور
اس نے رد کر دی۔ صاحب زادے کو کوئی
حور پری پسند ہی نہ آئی۔ کسی کے قد میں نقص
نکالا، کسی کے رنگ میں کمی نظر آئی، کوئی
ناک نقشے میں ہیٹی لگی۔ موٹی دیکھی تو دُبلی کی
فرمائش کی۔ سانولی دیکھی تو گوری کے لئے
مچلے۔ اور جب پسند کرنے پر آئے تو اس
کالی موٹی بھینس کو دل دے بیٹھے.....

ساس نے اپنے کھرّے پلنگ پر
دو چار کروٹیں بدلیں۔ پھر اُٹھ کر صراحی سے
پانی اُنڈیل کر پیا، جو خالی پیٹ میں تیر کر
لگا۔ اور خیالات کا سلسلہ پھر ماضی سے
جُڑ گیا۔

ایک وہ تھے — تحصیل دار —
بے چارے نے گھر بھر کی دعوت کی۔ باتوں
باتوں میں یہ تک سُنا دیا کہ وہ بیٹی کو پچیس
تولے سونا اور ڈھائی سیر چاندی دیں گے۔ تانبے
کے برتنوں کا حساب منوں میں تھا۔ داماد کو
نگ دس ہزار نقد دینے کے لئے کہہ رہے
تھے۔ پھر لڑکی کیسی خوب صورت تھی، جیسے
اندر کا اکھاڑا۔ لیکن صاحب زادے کو وہ
رشتہ پسند نہ آیا۔ ہزار ہا عیب نکالے
بیٹھیں۔ اے اب تو لڑکے والے بھیک کا
پیالہ لے کر مانگنے نکلتے ہیں۔ اور ایک ایک
نام گنواتے ہیں — یہ لیں گے، وہ لیں گے۔
زمانہ اور تھا جب لوگ کہتے تھے، جس نے
دی اس نے سب کچھ دیا اور اب تو یہ
ہے کہ سب کچھ مقدم ہے ایک لڑکی کے
سوا۔ کہ بھئی جب جہیز سمیٹنے سے فرصت
ملے گی تو (اگر یاد رہا) لڑکی کو بھی لیتے جائیں گے
اور بھول جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔
تو بے چارے تحصیل دار صاحب شاید
زمانے کے چلن کو دیکھ کر جہیز کی فہرست
بتلانے لگے تھے کیسی شرم آئی تھی یہ سُن کر۔ خیر
ہو جاتی تو اچھا تھا۔ جو دیتے اپنی خوشی سے
دیتے۔ ان کی بھی عزت بڑھتی، اپنی بھی عزت
رہ جاتی۔ یہ تو نہ ہوتا کہ بہو صاحبہ ٹھن ٹھن
کرتے بکس میں نیلون کی نیلی پیلی
ساڑیاں رکھے آ گئیں کیا جہیز، کیا مان گون
جس کو دیکھو ہنسی اُڑا رہا ہے: اے! یہ
آپ کی بہو ہیں؟ ارے! کیا سچ مچ یہ
بہا عالم کی دُلہن ہیں!

ساس کے پیٹ میں بھوک کی
ایک تیز لہر اُٹھی — انہوں نے سر اُونچا
کر کے دُھوپ کو دیکھا — اندازہ لگایا
کہ بارہ بج چکے ہوں گے — ایک دفعہ پھر
آواز لگائی:

"اے دُلہن!" اس بار ان کی آواز
میں کسی قدر نرمی اور مٹھاس تھی۔ نیچے سے
کپڑوں اور تھالی کی پھٹا پھٹ کی آوازیں
آنا بھی بند ہو گئی تھیں اور رنگ رنگ کی
خوشبو چلی آ رہی تھی۔ کھانا پک گیا ہو گا۔
"اے دُلہن! اب تو بارہ بج گئے!"
ان کی بہو سارا کھانا ناریل کے تیل
میں پکاتی تھی۔ نگوڑا ایسا لگتا تھا کہ سر کا
تیل کھانے میں گر گیا ہے۔ بھپک بھپک کر
ناریل کے تیل کی بُو آتی تھی۔ قورمہ، سبزی،
دال، حد ہے کہ نہ ایک بار بریانی بنائی
تو وہ بھی ناریل کے تیل میں۔ اوپر سے
نہ جانے کون کون سے ڈھنگ سے کھانا
پکانے کی ترکیبیں ہیں تو وہ لاجواب سالن
ہرے رنگ کا۔ دال سفید رنگ کی۔ گوشت
کا سالن کیچڑ سے ملتا جلتا۔ اور کھانوں کے
نام بھی ایسے جو کم بخت زبان پر نہ چڑھیں:
اڈلی، ڈوسا، سانبھر! اے ہمارے ابا
حضور تو جب بھی شکار پر جاتے تھے، سانبھر
ضرور مار کر لاتے تھے۔ اور خود کبھی شکار کا
گوشت نہیں کھاتے تھے۔ وہ سارا کا سارا
ملازموں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ امّی حضور
ہرنی اور نیل گائے کے کباب لگواتی تھیں۔
ایسے اچھے کہ دس گھر خوشبو جاتی تھی —
اور اب سارے گھر میں بدبو کے بھپکے ہیں۔

"اے دُلہن، اب تو ایک سے
اوپر ہو گیا۔ کیا آج ابھی تک کھانا نہیں پکا؟"
اس بار ان کی آواز کچھ کمزور تھی۔
دُلہن نے نیچے ٹھن ٹھن کر کے اسٹیل کے
بھگونے میں اسٹیل کا چمچہ چلایا، جیسے چاٹ
والے بڑے سے توے پر لوہے کا کرچھل
بجاتے ہیں — اور پھر بڑے اطمینان سے
لہکی: "اب ہی گھنٹہ آدھ لگے گا، کانے ہیں۔
آپ آرام کرو۔ جب تیار ہوں گا، ہم کھڑی
دے دے گا۔"

آرام کروں؟ ارے آرام تو اس دن
مر گیا تھا جب اس بے وقوف عقل کے
دشمن نے اس گنوار سے باقاعدہ شادی کی
تھی۔ لاکھ سمجھایا بجھایا کہ ایسی عورتوں سے
شادی نہیں کی جاتی۔ بس پڑا رہنے دو اسے
ایک طرف کو۔ شادی بیاہ تو برابر والوں میں
کیا جاتا ہے۔ لیکن اس نے ایک نہ مانی۔

اس کی تو ایک ہی رٹ تھی: میں باپ
کی روایت کو ختم کر دوں گا۔ ایک ہی
ہی کروں گا اور ایسے کروں گا۔ اور خوب
دھوم دھام سے کروں گا۔ پھر باجے گاجے
شادی کی۔ سارے زمانے نے تماشا
دیکھا۔ چپ چپاتے کرتا تو ہماری ناک تو
کٹتی۔ کیا کہتے ہیں اسے - اماں! واہ!
کیا نام ہے: اماں! اوپر سے کہتا ہے:
ان کے وطن میں ساری کنواری لڑکیوں کو
اماں کہتے ہیں۔ اے بیوی ہمارے ہاں
کسی کنواری کو اماں کہنا گالی دینے کے برابر
ہے۔ ایک یہ ہیں کہ ان کے ہاں کنواری
لڑکیوں کو اماں کہا جاتا ہے ۔ نہ بی بی، نہ
صاحب زادی۔ توبہ توبہ! اور کیا ہوگا۔
نہ اپنی تہذیب، نہ اپنا خاندان۔ تو
اماں سے شادی کریں یا اماں کی اماں سے۔
پہلے تو کہو ان کے دوست نے مجھ کو بہت سمجھایا
سمجھایا کہ اجازت دے دیجئے۔ اگر بغیر
اجازت کرلی تو آپ کو اور زیادہ دکھ ہوگا۔
ہاں بھئی، اپنی عزت کے لئے یہ بھی کیا۔
اجازت بھی دی اور شادی میں بھی شریک
ہوگئے۔ کل کلاں کو بہو بیگم بھی طعنہ دے گی
کہ تم نے تو لاکھ چاہا کہ یہ شادی نہ ہو اور تمہارا
لڑکا ہمیں بیاہ کر نہ لائے۔ لیکن دیکھو ہم
کس شان سے بیٹھے تمہاری چھاتی پر مونگ
دل رہے ہیں۔ خیر، مونگ تو وہ اب بھی دل رہی
ہے چھاتی پر۔

کہاں تو یہ تھا کہ صاحبزادے
دس بجے سے پہلے بستر سے نہیں اٹھتے تھے
کہاں اب پانچ بجے صبح کو اٹھتے ہیں۔ سائیکل
پر دودھ والے کی بالٹی لٹکا کر دو میل سے دودھ
لینے جاتے ہیں۔ اے جاتے کیا ہیں،
وہی حکم دیتی ہے کہ سامنے کا دودھ بانہوا دودھ
لاؤ۔ ادھر سے ناشتے ہی نہ پراٹھے نہ انڈے
نہ بالائی نہ دہی، نہ روغنی، نہ خاگینہ۔ بس پتلے
پتلے چار توس، ذرا سا پیلا پیلا مکھن چپڑ کر
چائے کے گلاس کے ساتھ سامنے رکھ دیتی
ہے۔ لو ہو گیا ناشتہ۔ ہم نے تو بھی چلئے
کے ساتھ باسی روٹی کھانے کی عادت ڈال
لی۔ اس سے پیٹ تو بھرتا ہے۔ اس
کے بعد صاحب زادے تو ادھر سدھارے
کام پر، ادھر دلہن بیگم نے بھی ریل پکڑی
اور ریل پر سوار ہو کر نوکری پر چلی گئیں۔
رہ گئی میں تو سارا دن گھر کے کام میں لگی
رہتی ہوں اور پھر جب شام کو وہ نوکری سے
لوٹتی ہے تو سارے گھر کا ہر کام بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔
دو گھنٹے چخ چخ کر کے دماغ چاٹ لیتی ہے۔
اب دو دن سے بخار آگیا ہے ادھر میم صاحب
کو کھانا پکانا پڑا تو اور کچھ بس نہ چلا تو فتوے
دینے لگی۔ کہتی ہے: ٹیفائڈ ہو جائے گا
کھانا کھا کر۔ صاحب زادے بھی اس کی ہاں
میں ہاں ملاتے ہیں۔ اوپر سے ستم یہ کہ میرے
سوئی بھی وہی لگاتی ہے جس وقت وہ میری
سوکھی ہوئی بانہہ میں سوئی گھونپتی ہے تو میاں
کی خوشی دیکھنے لائق ہوتی ہے۔ اور پھر وہ اس
کو مارے دلار کے ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر
صاحب کہتے ہیں۔ اے یہ تو کیا، اس
کے تو پورے خاندان میں کہیں کوئی ڈاکٹر نہ ہوگا
جس اسپتال میں دیکھو یہی بھری ہیں۔
اماں باوا بھی خوب ہیں کہ ریل پہ بٹھا کر اتنی
دور بھیج دیتے ہیں کہ جاؤ اماں ساس سب کو
الو بنا دو جا کے۔

اب اسی کو دیکھ لو۔ اتنے دن ہوگئے
ہم لوگوں میں رہتے، لیکن اپنی زبان نہ چھوڑی
پھر بات چیت ایسی لاجواب کہ کیا کہتے
کہیں گی: جی، آپ راتب کھایا؟ اور
میاں سے فرمائیں گی: تو کچھ کھاتے ہی نہیں ہو
اور سب دھرا کا دھرا ہے۔ اور میاں ہیں کہ
اس لولی لنگڑی بات چیت پر نہال ہوئے
جاتے ہیں۔ اس کی تعریف کرتے کرتے
نہیں تھکتے۔ کھانا بھی اس کے ہاتھ کا پسند
ہے۔ سب مرغ، مچھلی، بریانی، شاہی ٹکڑے
اور کباب کھانا بھول گئے۔ اور تو اور گھر کا
خرچ بیٹے سے میں ہی کرتی تھی۔ دلہن بیگم
نے ایک آدھ مہینے تو دیکھا، پھر کہنے لگیں،
امی، تم کتنا پیسہ کھرچا کرتا ہے، اس
تاریکے سے ہم کریں گا کھرچہ ۔ ہمیں کو کمانا
پڑتا ہیں۔ تم کیا جانو پیسہ کیسا آتا ہیں؟
صاحب زادے بھی اس کی ہاں
میں ہاں ملانے لگے۔ میں گھرداری کرتی تھی
تو یہ کیسے کیسے نخرے کرتے تھے۔ اب کریں
نخرے تو ذرا میں بھی دیکھوں ۔ دو وقت کا
کھانا ایک ہی وقت پکا کر رکھ دیتی ہے۔
ذرا کام میں کسی دن دیر ہو جائے تو چلاتی ہے
اب اتی رات کو کائے کو آیا۔ اور کوئی تمارا
نوکرانی لگتا ہے کہ آدی رات تک جاگے گا؟
اب کی باری اتی رات کو آیا تو دروجہ مت
بجانا۔ جالی میں کاٹا پڑا ہے۔ چپ چاپ
کا کے سو جا۔

ایک دن صاحب زادے دوستوں
کے کہنے سننے سے تاش شہر میں کھیلنے
چلے گئے۔ گھر واپس آئے تو پیچھے سے پھیری
ہوگئے۔ بہت پھیکا سا نہ کھانے کو

صبح کو جو ناشتے پہ بیٹھی سو الگ۔ ایک یہ تھی
کہ آدھی آدھی رات تک گرمائی پر کھانا
لگائے بیٹھی انتظار کرتی رہتی تھی۔ اب بیوی
کے راج میں ٹھنڈا کھانا مل جائے تو وہی
غنیمت ہے۔

کلیجے میں پھر ہوک اٹھی تو ساس نے
آواز دی "اے دلہن، اب تو دو بج گئے
کب تیار ہوگا کھانا؟
"گیس ختم ہوگیا تیل ہی نہیں ہے۔
آپ کا بیٹا کو بولا تھا تیل لانے کو۔ پر اس
کا آرٹ تو آپ خوب لگا کر رکھا ہوا ہے۔
کچھ کام جو کر سکے وہ ہے۔ اب آپ آرام سے
سو رہئے۔"
اور سچ مچ ان کے ہاتھ پیر ٹھنڈے
ہو گئے۔ کھانے کی جو ذرا سی امید تھی گیس
ختم ہونے کی خبر سن کر وہ بھی ختم ہو گئی۔
ہمت کرکے اٹھیں، صراحی سے کٹورے
میں پانی انڈیلا اور پی کر لیٹ رہیں۔ پھر سو گئیں،
یا غش کھا گئیں یہ خدا جانے۔ البتہ سانس
دھیرے دھیرے آجا رہی تھی۔
رات گئے کسی نے ان کا بازو ہلایا
تو وہ چونک پڑیں۔
"کیا دلہن نے کھانا بھیجا ہے؟"
غریب کھانے کا خیال لے کر سوئی تھیں انہیں
تو کھانا ہی یاد رہا۔
"کھانا؟ اب کھانا صبح کو کھائیے گا۔
رات کے بارہ بجے ہیں۔ بس یہ دودھ پی کر
سو رہیے۔"
بیٹے نے گلاس ان کو تھما دیا اور نیچے
اتر گیا۔ ماں سوچ رہی تھی، خدا جانے
اس نے بھی کچھ کھایا پیا یا سارے دن
کی محنت کے بعد فاقے سے ہی سو رہے گا۔
نیچے سے مدراسی بہو کی آواز آ رہی
تھی "ایو۔ یو، صبح کا واسطے دودھ رکھا
تھا۔ تم جاکے اپنی ماں کو دے آیا۔ بوڑھیا
ایک رات ایسے نہیں سو سکتا تھا؟
مر جاتا کیا؟"
بیٹے نے کیا کہا، وہ نہ سن سکیں۔
دودھ کے گھونٹ ان کے حلق میں پھنسنے
لگے۔ نیچے سے "ایو۔ یو" کی آوازیں
اب بھی آ رہی تھیں — دودھ کا گلاس
جوں کا توں چارپائی کے نیچے کھسکا کر وہ بے سدھ
ہو کر پڑ گئیں۔

●

خیال اپنا اپنا

نتیجہ بانو: اگست ۱۹۸۵ میں شائع ہوگا

یہ انعامی مقابلہ آپ کو موجودہ دور کے مختلف مسئلوں اور سوالوں کے بارے میں اظہارِ رائے کا موقع اور دعوت دیتا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات اور فکری نتائج دوسروں تک پہنچائیے اور انعام حاصل کیجئے۔

پہلا انعام : سو روپے

دوسرا انعام : پچاس روپے

تیسرا انعام : تیس روپے

اس ماہ کا سوال ہے: **کیا عورتوں کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے؟**

اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ لفظوں میں اپنے خیالات ہمیں لکھ بھیجئے۔ آپ کی تحریر ۲۰ جولائی ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جانی چاہئے:

"خیال اپنا اپنا" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میرا سلام لے جا

قسمت کے آسماں پر
سیارۂ کہکشاں پر
چمکا ترا ستارا
اُس در پہ حاضری کا
تجھ کو ہوا اشارا
اے بختیار بندے
اے کامگار بندے
تیری مراد مندی
تقدیر کی بلندی
تجھ کو پکارتی ہے
آ باریاب ہوجا
اے ذرّۂ محبت
جا آفتاب ہوجا
دربار میں چلا ہے
سرکار میں چلا ہے
رختِ سفر اُٹھالے
اللہ کے حوالے
یثرب کے جانے والے
بس اِک پیام لے جا
میرا سلام لے جا

میری یہ سرد آہیں
یہ منتظر نگاہیں
ان کا خیال کرنا
لیکن نہیں مناسب
کچھ عرضِ حال کرنا
وہ جانتے ہیں سب کچھ
پہچانتے ہیں سب کچھ
ناشاد آرزوئیں
برباد آرزوئیں
بیتاب ہو رہی ہیں
تاہم خموش رہنا
آنکھوں سے دیکھتا جا
مونہہ سے مگر نہ کہنا
یہ صبح و شام میرے
سب سامنے ہیں تیرے
اِن میں کوئی بھلائی
دیتی نہیں دکھائی
لے جاسکے تو بھائی
یہ صبح و شام لے جا
میرا سلام لے جا

جا ہر طرح سلامت — لے جا مری محبت — لے جا مری عقیدت
میرا سلام لے جا — میرا سلام لے جا

حفیظ جالندھری

تبسم

ایک عورت کی نظر کم زور تھی ایک دن وہ ایک ڈاکٹر صاحب کے پاس گئی اور بولی: ڈاکٹر صاحب مجھے ہر چیز دو دو دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ کیا آپ چاروں کو ایک ہی بیماری ہے۔

●

خاتون نے نوکری کے لئے آئی ملازمہ سے: "تم اپنی پہلی مالکہ کو کیوں چھوڑ کر آئی ہو؟"
ملازمہ: تو کیا میں اسے بھی ساتھ لاتی؟

●

دو دہشت پسند ایک ہوٹل کو بموں سے تباہ کرنے کے لئے کار میں جا رہے تھے ایک جگہ سڑک میں گڑھے تھے اور کار جھٹکے کھانے لگی۔ ذرا آہستہ چلاؤ۔ کہیں بم راستے میں ہی نہ پھٹ جائے۔

●

ایک صاحب حجامت بنوانے کے لئے ربر کی دُکان پر گئے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے تینوں کو مختصر کر دینا۔ حجام نے حیرت سے پوچھا ... ہاں، سر کے بال، داڑھی اور اپنی گفتگو۔

●

ایک ایسا کمپیوٹر ایجاد ہوا ہے جو عورتوں کا بہت ہی بہی خواہ ہے۔ وہ اپنے مقابل کھڑے ہوئے شخص سے چند سوالات کرتا ہے اور ان کے جوابات سن کر اس شخص کی اصلی عمر بتا دیتا ہے۔ اس کا ایک سوال یہ ہے کہ آپ خاتون ہیں۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو الیکٹرونک ذہن فوراً اعلان کرتا ہے تب آپ کی عمر ۲۰ سال ہے۔

●

اکبر الہ آبادی کے ایک نہایت بے تکلف دوست نے جب انہیں ایک ایسی ٹوپی دکھائی جس پر "قل ھو اللہ" کڑھا ہوا تھا تو آپ نے ہنستے ہوئے فرمایا۔ چیز تو اچھی ہے اگر کسی دعوت میں کھانا آنے میں دیر ہو جائے تو فوراً ٹوپی پیٹ پر رکھ لیجئے۔ سب سمجھ جائیں گے آپ کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔

●

ایک عورت اپنے شوہر کی دل کی بیماری سے بہت پریشان تھی۔ ڈاکٹر نے اسے رائے دی کہ وہ اپنے شوہر کا دل بدل دے تو عورت راضی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے دل بدل دیا۔ کچھ دنوں بعد وہ عورت ڈاکٹر کے پاس پہنچی تو شکایت کرنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب غضب ہو گیا میرے شوہر بالکل بدل گئے ہیں۔ وہ پہلے جیسے نہیں رہے۔ پہلے وہ مجھ سے جو بھی وعدہ کرتے تھے اسے پورا کرتے تھے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ وہ وعدے تو سب کرتے ہیں مگر کوئی وعدہ پورا نہیں کرتے۔"

یہ سن کر ڈاکٹر مسکراتا ہوا بولا۔ "محترمہ اس وقت میرے پاس کسی عام آدمی کا دل اسٹاک میں نہیں تھا اس لئے میں نے ان کو ایک لیڈر کا دل لگا دیا تھا۔"

●

ڈاکٹر: میں مریض کی صرف آنکھیں دیکھ کر بتا دیتا ہوں۔ اسے کون سا مرض ہے تمہاری بائیں آنکھ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں تپِ دق ہے۔
مریض: مگر میری بائیں آنکھ تو پتھر کی بنی ہوئی ہے۔

●

خود بھی ہنسئے، دوسروں کو بھی ہنسائیے۔ نئے نئے، مزہ دار، چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجئے۔ پرانے، گھسے پٹے، بار بار سنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجئے، کیوں کہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

سعدیہ دہلوی

اللہ بخشے نانی اماں تو یہ کہتی تھیں:
"ارے بند کر اس کم بخت ٹی۔ بی کو!"
اماں کو تو پرکھی نواسیوں کے سکھانے اور پڑھانے کے باوجود ساری عمر ٹی۔ وی کہنا نہ آیا۔ اس تماشائی ڈبے کو مرتے دم تک وہ ٹی۔ بی ہی کہتی رہیں۔ اس وقت تو ہم بھی سب کے ساتھ مل کر اماں کا انگریزی تلفظ صحیح کرنے پر تلے رہتے، لیکن آج احساس ہوتا ہے کہ نانی اماں بالکل درست کہتی تھیں۔ ٹی۔ وی کی بیماری تو ٹی۔ بی سے بھی بدتر ہے۔ ٹی۔ بی کا تو آج کل علاج بھی ہو جاتا ہے لیکن اس کم بخت ٹی۔ وی کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔

ہمارے بچپن میں ٹی۔ وی نیا نیا آیا تھا۔ ایک مہینے تک ہم اس کے آگے پابندی سے بیٹھے رہے۔ شکر ہے کہ ان دنوں کرشی درشن سے اچھا کوئی پروگرام نہیں ہوا کرتا تھا۔ کھاد کے بارے میں سنتے سنتے ٹی۔ وی کی بیماری خود ہی دور ہو گئی۔ اب ہم سب گھر کے بچے ایک بار پھر چور سپاہی، لنگڑی ٹانگ، وغیرہ کھیلنے لگے۔ کرائے پر سائیکل بھی لیتے اور محلے بھر میں دوڑاتے پھرتے۔ اور شام ہوتے ہی انڈیا گیٹ آئس کریم کھانے نکل جاتے۔

آج جب کہ گھر میں دوسری نسل کے

گئی ہم عمر بچے بھی ہم کسی کو باغ میں کھیلتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ ہمارے زمانے میں باغ میں کھلے پھول اور کلیاں ہمیں دیکھ کر مسکراتی تھیں۔ اب وہ بھی اداس اداس سی رہنے لگی ہیں۔ اسکول سے بچے گھر آئے، جوں توں کر کے ہوم ورک سے فارغ ہوئے اور ٹی۔ وی کے سامنے جم کر بیٹھ گئے۔

آس پڑوس میں بچے جاتے ہیں تو وہاں بھی ٹی۔ وی سے نجات نہیں۔ ہماری بھتیجی اپنی سہیلی کے ہاں جب بھی جاتی ہے، ہم اس کی واپسی پر پوچھتے ہیں کہ بیٹی کیا، کیا، تو جواب ہمیشہ ایک ہی ملتا ہے؟ "ویڈیو فلم دیکھی تھی!" اللہ غارت کرے اس ٹی۔ وی اور ویڈیو کو جس کی بدولت گھروں میں تہذیب ختم ہوتی جارہی ہے۔ حال ہی میں ایک غم زدہ باپ نے ہم سے کہا "کیا کروں گھر جلد جاکر۔ گھر جاؤ تو بچوں سے کھیلنے اور باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے کمروں میں جاؤ تو سب عینکوں کے سہارے ٹی۔ وی یا ویڈیو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ کچھ بات کرو تو جواب ملتا ہے؟ "اوہ! ڈیڈی پلیز کیپ کوائٹ" میں پھر چپ چاپ گھر سے باہر چلا جاتا ہوں، ورنہ بچے مجھے مستقل چپ کرانے میں لگے رہیں۔

ہم خود اس بیماری سے تنگ ہیں جس کے گھر جاؤ، وہ ٹی۔ وی دیکھنے میں مصروف ہے۔ آپ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے جاتے ہیں اور میزبان آپ کو دیکھتے ہی ٹی۔ وی کے آگے ایک کرسی اور لگوا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ٹی۔ وی کی آواز بھی اور تیز کرادی جاتی ہے۔ ہم نے تو اپنے گھر میں ٹی۔ وی کئی مہینے سے گودام میں بند کر رکھا ہے۔ خبریں صبح کو اخبار میں پڑھ لیتے ہیں۔ بچوں پر بے حد سختی کر رکھی ہے حالانکہ زمانے کی رفتار سے بچوں کو بچانا بڑا مشکل کام ہے۔ اوپر نیچے، آس پڑوس میں جاکر بچے تاک جھانک کرتے ہی رہتے ہیں۔

آج کے پڑھے لکھے لوگوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اچھی ہر سائز کی اولاد کے ساتھ ہر قسم کی فلمیں کیسے دیکھ لیتے ہیں۔

ہم تو آج بھی کبھی باپ یا صاحب کے ساتھ اتفاق سے فلم دیکھ رہے ہوں اور یہ بھی دیکھ رہے ہوں کہ ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے سے کچھ زیادہ قریب ہو رہے ہیں تو فوراً پانی پینے یا فون کرنے کے بہانے باہر چلے جاتے ہیں۔ اپنے اس لحاظ اور تہذیب پر ہمیں ناز ہے۔ افسوس کہ اب یہ سب مٹتا جارہا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ہم اپنے ایک دوست کے گھر گئے۔ وہاں فلم چل رہی تھی۔ ایک کرسی ہماری بھی لگ گئی۔ دوست کا چار سال کا بیٹا ہیما مالنی اور دھرمیندر کی آنے والی قسمت کی پیش گوئی کرتا رہا کہ کب غنڈے آئیں گے اور کب ہیرو آئے گا۔ یہاں تک کہ جب ہیروئن کو چکر آیا اور وہ گر پڑی تو صاحب زادے بولے "اب یہ ماں بن جائے گی!" سب گھر والوں نے اس کی بات پر قہقہہ لگایا۔ گھر کی بیٹیاں بھی بیٹھی تھیں، ماں باپ بھی اور نوکر بھی۔ شرم صرف ہمیں آئی۔

ہم سے زیادہ ہماری ننھی بھتیجیوں کو اور ان کی سہیلیوں کو فلم اداکاروں کی پہچان ہے۔ فلموں کے نام کہانیاں اور گانے ان کو رٹے ہوئے ہیں۔ اللہ جھوٹ سے بچائے، ہمیں تو ۱۵ سال کی عمر تک راجیش کھنہ اور جتیندر کی شکل میں کوئی فرق نہیں نظر آتا تھا۔ اب بچوں کی ذہنیت کا یہ عالم ہے کہ دن کا حساب ٹی۔ وی سیریل سے لگایا جاتا ہے آج "ہم لوگ" آنا ہے تو یہ دن ہوگا اور فلاں پروگرام ہے تو وہ دن ہوگا بس وہی ہے زندگی

●●

عفت فریدی

"روشنی! پاس ہو جانے پر [illegible]
پریس کردو"۔ نزہت نے [illegible] اٹھتے
ہوئے کہا۔

"روشنی، ذرا یہاں آنا۔ بہت دیر ہو رہی
ہے۔" اوپر کی منزل سے بھائی کی آواز آئی۔
"روشنی بیٹی! ذرا یہاں آنا۔ سالن جل رہا
ہے"۔ باورچی خانے سے اماں نے پکارا۔
روشنی بے چاری عجیب گھبراہٹ کے
عالم میں تھی کہ کدھر جائے۔ ساڑھی اٹھائی تو منے
کے رونے کی آواز سن کر اوپر بھاگی۔ منے کو لے کر
وہ باورچی خانے میں گھس گئی۔
پرویز اوپر کی منزل پر کچھ کھٹ پٹ
کر رہے تھے اور سب کی آوازیں بھی سن رہے
تھے۔ وہیں سے زور سے بولے "ارے تم
سب نے مل کر تو روشنی کو پاگل بنا دیا۔ وہ کوئی
مشین نہیں، تمہاری طرح انسان ہے انسان"۔
تھوڑی دیر تک تو پرویز کی بات کا
کسی نے جواب نہ دیا، پھر زینب ہاتھ میں ناول
لئے کمرے سے نکلی اور پرویز سے بولی۔
"بھائی جان، روشنی یہ کام نہیں کرے گی تو اور
کون کرے گا؟ اماں یتیم خانے سے اسے صرف
آرام کرنے کے لئے تھوڑا ہی لائی ہیں"۔
"زینب!" پرویز کو بہت غصہ آیا۔
"تجھ سے کتنی بار کہا ہے کہ میرے سامنے
ایسی باتیں نہ کیا کر"۔
"اوہو! بڑے آئے غصہ کرنے والے!"
زینب منہ بگاڑتی کمرے میں چلی گئی۔ وہاں
سے برابر اس کے بڑبڑانے کی آواز آ رہی تھی، مگر
پرویز نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔
وہ باورچی خانے میں کھڑی روشنی کو دیکھ رہا تھا
جو گود میں منے کو سنبھالے کھڑی مسالا بھون رہی

تھی پرویز کو اس پر بہت ترس آیا۔ کتنی پیاری ہے روشنی۔ نزہت اور زینب تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ اگر یہ کسی خوش حال گھر میں ہوتی تو اس عمر میں پڑھتی [illegible] مگر بے چاری کی قسمت ہی خراب تھی۔

پرویز روشنی کے بارے میں سوچتا ہوا نیچے آگیا۔ باورچی خانے میں جاکر اس نے منے کو روشنی کی گود سے لے لیا اور آہستہ سے بولا۔
"روشنی! زینب کی باتوں کا برا نہ ماننا۔ اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔"
"نہیں نہیں۔" روشنی روہانسی ہو کر بولی۔
"بھائی صاحب میں بھلا سچ بات کا برا کیسے مان سکتی ہوں؟ زینب بی بی نے جو کہا ٹھیک ہی کہا۔"

اماں بی کے قدموں کی چاپ سن کر پرویز وہاں سے کھسک لیا اور روشنی کے آنکھوں سے دو موتی اس کے گالوں پر ڈھلک گئے۔ مگر اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے اور اپنے غم کو ضبط کر کے کام کرنے میں لگ گئی۔

"نزہت آپا، پلیز جلدی آئیے۔" روشنی نے کہا۔
"ہائیں! تو اب تم انگلش داں ہو گئیں!" پرویز نے روشنی کو چھیڑا۔
"کتنے سال ہو گئے آپ کے ساتھ رہتے ہوئے۔ ایک لفظ انگلش کا سیکھ لیا تو کیا غضب ہو گیا۔" روشنی نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "ویسے میں نے تو انگلش کے اور بھی بہت سے الفاظ سیکھ لئے ہیں جیسے آئی ایم سوری، اوکے۔ آئی سی۔ ایکس کیوز می وغیرہ۔"
"ارے واہ! اب تو تم کسی انگریز کے

ہاں آرام سے کام کر سکتی ہو۔" پرویز نے روشنی کو چڑاتے ہوئے کہا۔
"ارے بھائی صاحب تم نے انگریزوں کا نام لیا ہے مجھے تو بڑے گھناؤنے لگتے ہیں، جیسے چھلا شلجم۔" روشنی نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

پرویز نے ایک زوردار قہقہہ لگایا روشنی ہنسنے لگی۔
"کیا تم کو پرویز کا نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا دوست بھی گھناؤنا لگتا ہے روشنی؟" نزہت نے روشنی کو چھیڑتے

زینب تو طنز کا تیر چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور روشنی کا دل بری طرح زخمی ہو گیا۔ بے بسی کے دو آنسو اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

ہوئے پوچھا۔
"ارے نہیں، وہ تو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" روشنی کے منہ سے بے اختیار نکلا تو نزہت اور پرویز نے زوردار قہقہہ لگایا۔ روشنی کچھ کھسیا گئی اور صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ "میرا مطلب ہے مجھے پ... میں... نہیں نہیں... میرا مطلب ہے کہ وہ مجھے گھناؤنے نہیں لگتے۔"
گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نہ جانے کیا کیا نکل رہا تھا۔ پرویز اور نزہت اس کی سادگی پر ہنسے جا رہے تھے۔

اتنے میں زینب [illegible] ہوئے بولی۔ "[illegible] روشنی [illegible] رہی ہو! کچھ دونوں کی بات کر رہی [illegible] ہو؟"
زینب تو طنز کا تیر چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور روشنی کا دل بری طرح زخمی ہو گیا۔ بے بسی کے دو آنسو اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

پرویز کو زینب پر غصہ تو بہت آیا، لیکن اس نے کچھ کہنا بیکار سمجھا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے دن پرویز نے زینب سے پوچھا۔ "زینب! تجھے کیا ملتا ہے روشنی کے دل پر وار کر کے!"
زینب مسکرا پڑی اور پرویز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "بہت مزہ آتا ہے!"
"اور اگر کوئی تیرے دل کو اسی طرح ٹھیس پہنچائے تو بھی کیا تجھے مزہ آئے گا؟"
پرویز نے نرمی سے کہا۔
"میں اتنی بے بس نہیں ہوں کہ کسی کو جواب نہ دے سکوں۔" زینب نے اکڑتے ہوئے کہا۔
"زینب، میں تجھے اتنا گرا ہوا نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میری بہن کے ایسے خیالات ہیں۔ کسی کی بے بسی سے فائدہ اٹھانا بہت بری بات ہے، زینب!" پرویز نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"آپ کو اس سے اس قدر ہمدردی کیوں ہے، بھائی جان؟" زینب نے برا سا منہ بنا کر کہا۔
"میں سمجھ گیا تیرے جلنے کی وجہ۔" پرویز

نے مسکرا کر کہا۔
"کیا؟ ذرا مجھے بھی بتائیں۔" زینب نے
دلچسپی سے پوچھا۔
"روشنی کی خوبصورتی۔" پرویز نے
ایک تیر چھوڑا۔
"بھائی صاحب!" زینت دہاڑی۔
"سمجھائی کر دی ہوتی ہے زینب" پرویز
نے کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔
"امی، بھائی صاحب کو سمجھائیے ذرا۔
ہر وقت میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔"
زینب نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

صبح کا وقت تھا جیکب پرویز سے
ملنے کے لئے آیا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر کی دو چار
باتوں کے بعد اچانک اس نے پرویز سے کہا
"روشنی ٹھیک ہے نا؟"
پرویز ایک لمحے کے لئے چونکا، لیکن
پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے
لگی۔ "ہاں ہاں، بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"
اتنے میں پردہ ہٹا اور روشنی ہاتھوں
میں بڑا سا گلدستہ لئے ڈرائنگ روم میں
داخل ہوئی۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں گم تھی کہ
اس کو وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوا۔
پھر جیسے ہی اس کی نظر صوفے پر بیٹھے ہوئے
جیکب پر پڑی وہ بری طرح چونک گئی۔
"اوہ آپ!" وہ ہکلاتے ہوئے
بولی۔
پرویز اور جیکب اس کی بوکھلاہٹ
سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔
"روشنی بھی مسٹر جیکب کو اپنے ہاتھ
کی مزہ دار کافی نہیں پلاؤ گی کیا؟" پرویز نے
مسٹر جیکب پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"جی، بہت اچھا۔" روشنی نے کہا
اور گلدستہ میز پر رکھ کر گلدان میں لگا کر
تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔
پرویز نے مسکرا کر جیکب کی طرف
دیکھا تو وہ ابھی تک اس پردے کو گھور رہا
تھا جس کو ہٹا کر روشنی جا چکی تھی۔ پرویز نے
آہستہ سے جیکب کا شانہ ہلایا تو وہ جیسے
خواب سے چونک گیا۔ "آئی ایم سوری پرویز۔"
"ارے یار! اس میں افسوس کی کوئی
بات نہیں۔ روشنی ہے ہی ایسی چیز۔ لاکھوں میں
ایک۔ میرے ماموں اور ممانی جان اس
کو بچپن میں ہی چھوڑ کر اس جہاں سے چلے گئے
تھے۔ جب سے یہیں پر رہتی ہے۔" پرویز
نے روشنی کی اہمیت بڑھانے کے لئے
جیکب سے جھوٹ بولا۔
جیکب نے سیدھے بیٹھتے ہوئے
کہا: "پرویز، دراصل مجھے ہندوستانی لڑکیاں
ہی پسند ہیں۔ جو بات یہاں کی لڑکیوں میں ملتی ہے
وہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتی ہے۔ پرانی
تہذیبی قدریں، جو کہیں پر بھی دیکھنے کو نہیں
ملیں گی، یہاں موجود ہیں۔"
"تو میرے یار! تم اس وقت ہندوستان
میں ہی بیٹھے ہو۔ دیر کس بات کی ہے؟"
پرویز نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔
"ممی انگلینڈ سے لکھتے لکھتے تھک
جا رہی ہیں کہ تم شادی کر لو لیکن میں نے
لکھ دیا ہے کہ شادی میں کسی انڈین فیملی میں
ہی کروں گا۔ اور وہ وقت بھی اب قریب
آ گیا ہے پرویز، صرف تمہاری رضامندی
کی ضرورت ہے۔"
"ارے بھئی میاں بیوی راضی تو کیا
کرے گا قاضی۔ مجھے تم کیوں گھسیٹ رہے ہو بھیا؟"
پرویز نے ہنستے ہوئے کہا۔
"یہ تو تم دوسرے ملکوں کی بات
کہہ رہے ہو۔ یہاں پر صرف بیوی کے راضی
ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، بلکہ ماں باپ کا
راضی ہونا زیادہ ضروری ہے۔"
"تو میں کس لڑکی کا ماں باپ ہوں بھئی؟"
پرویز نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

"ماں باپ دونوں انگریز ہیں تو یہ—"
جیکب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اچانک پردے کے پیچھے آہٹ ہوئی پھر زینب ہاتھ میں کافی کی ٹرے لئے ہوئے داخل ہوئی۔

روشنی کی جگہ زینب کو دیکھ کر جیکب اور پرویز دونوں حیران تھے؛ زینب نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا "روشنی مُنّے کو سُلا رہی تھی، اس لئے کافی میں لے آئی" حالانکہ یہ سراسر جھوٹ تھا، روشنی ٹرے لے کر آ رہی تھی تو راستے میں زینب نے اس سے ٹرے لے لی تھی اور اس کو کوئی اور کام بتا دیا تھا۔

زینب نے جیکب کی طرف دیکھا جو اس سے بے نیاز کسی پینٹنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زینب کو جیکب بہت پسند تھا۔ خاص طور پر اس کی نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں پر تو زینب فدا تھی۔ مگر جیکب نے کبھی اس پر توجہ نہ دی۔ اس کو ٹھیک اپ کے غلاف میں لپٹی ہوئی لڑکیاں قطعی پسند نہ تھیں، وہ تو روشنی کی سادگی، بھولپن اور معصومیت کا گرویدہ تھا۔ زینب نے جیکب کو کافی پیش کی تو اس نے دھیرے سے شکریہ کہا اور پیالی سنبھال لی۔ زینب کچھ دیر وہیں کھڑی رہی مگر اپنی طرف کسی کو بھی متوجہ نہ پاکر وہاں سے ہٹ گئی۔

کافی ختم کرکے جیکب کھڑا ہو گیا۔ پرویز نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "اچھا' تو میں امّاں سے بات کر لوں ؟"

"ہاں ہاں' ضرور۔ تمہارا بہت احسان ہوگا۔" جیکب نے زور سے پرویز کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

گھر میں پرویز نے جب جیکب کے پیغام کا ذکر چھیڑا تو نزہت بولی "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ روشنی کی زندگی بن جائے گی"

"مگر ایک بات ہے باجی میں نے جیکب سے روشنی کا تعارف اپنی ماموں زاد بہن کی حیثیت سے کرایا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ راز کھل جائے اور روشنی کی زندگی تلخ ہو جائے" پرویز نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"ارے بھئی' جب تک ہم میں سے ہی کوئی یہ راز نہ کھولے' جیکب کو حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا!" نزہت نے بغور پرویز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

زینت اس بات چیت کے درمیان خاموش بیٹھی رہی۔ امّاں نے پان چباتے ہوئے کہا "ارے' مجھے تو صرف یہ غم ہے کہ ر[...]
کیسی انگریز کے گھر کیسے رہے گی ؟ نم[...]
روزے کی کیسی پابند ہے ؟"

"امّاں آپ کو شاید معلوم نہیں جیک[...]
کرکے مسلمان ہے۔ اس کا اصلی نام جاوید[...]
ہے۔ دراصل اس کے والد ہندوستانی مسلم[...]
ہیں اور ماں انگریز جن کا اثر جیکب پر ایسا پ[...]
ہے کہ وہ بھی انگریز معلوم ہوتا ہے۔ ا[...]
ماں جیکب' تو اسے پیار سے پکارتی ہ[...]

"اچھا !" اس انکشاف پر سب ح[...]
زدہ تھے۔

دروازے پر کال بیل بجی تو پر[...]
نے زینب سے دروازہ کھولنے کو کہا ا[...]
خود کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ زینب[...]

جواب ذہنی ورزش نمبر [...]

۱- ۱۹۸۵
۲- موتی لال نہرو
۳- امانت لکھنوی
۴- طلسم ہوشربا
۵- نظام الدین
۶- وجینتی مالا
۷- شیلانگ
۸- بنگلہ دیش
۹- کرناٹک
۱۰- نیوٹن

نتیجہ
ذہنی ورزش
نمبر ۶

اس مقابلے میں حصہ لینے والوں کی تعداد اس بار بھی کافی تھی۔ اور صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ قرعہ اندازی کے ذریعے انعام کی حق دار مسز صدیقی (نئی دہلی) قرار پائیں۔ ان کو ایک سوان پریشر کوکر بھیجا جا رہا ہے۔

جھٹ پٹ اپنے کمرے میں گئی اور چند منٹ
بعد جب ڈرائنگ روم میں پہنچی تھی
تیز تیز اس کو دیکھ کر مسکرا دی۔ کیونکہ
ان چند منٹوں میں اس نے خاصا میک اپ
چڑھا لیا تھا۔

ڈرائنگ روم کا باہر کھلنے والا دروازہ
کھلا تو سامنے ہی جیکب کھڑا تھا۔

"ہیلو!" جیکب نے دھیرے سے
زینب سے کہا۔

زینب بولی "معاف کیجئے گا دروازہ
کھولنے میں ذرا دیر ہوگئی۔ وہ روشنی ہے نا،
کم بخت بڑی کام چور ہے۔ اتنی دیر سے
کہہ رہی ہوں، دروازہ کھول دو۔ اٹھتی ہی
نہیں رہی تھی۔"

زینب کی بات سن کر جیکب کی پیشانی
پر بل پڑ گئے۔ اس نے زینب کے میک اپ
میں پُتے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے بڑے
ناگوار لہجے میں کہا "زینب تمہیں ایسا نہیں
کہنا چاہئے۔ آخر روشنی تمہاری بہن ہی تو ہے"

"کون کہتا ہے وہ میری بہن ہے
منحوس۔ اماں یتیم خانے سے کام کرنے کے
لئے اٹھا لائی تھیں اس کوڑے کو!" زینب
نے جیکب کی بات کا بُرا مانتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا تم نے؟ کیا روشنی تمہاری
ماموں زاد بہن نہیں؟" جیکب نے حیران
ہو کر پوچھا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔ یہ ہماری
نوکرانی ہے وہ!" زینب نے تیر نشانے
پر لگتے دیکھا تو جوش میں بولی۔

"اچھا تو پرویز نے مجھ سے جھوٹ
کہا تھا!" جیکب کی حالت عجیب ہوگئی۔

زینب نے کوئی جواب نہیں دیا اور
وہاں سے رفو چکر ہوگئی۔ اس کا کام تو ہو ہی
گیا تھا۔

پرویز جب ڈرائنگ روم میں آیا
تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اندر آکر
زینب سے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار
کر دیا۔

کئی دن گزر گئے نہ تو جیکب ملنے
آیا، نہ ٹیلی فون ہی کیا۔ پرویز سے نہ رہا گیا
اور وہ جیکب کے گھر پہنچ ہی گیا۔ پرویز کو دیکھ کر
جیکب نے مُونہہ پھیر لیا۔

پرویز کو اپنے کانوں پر یقین
نہیں آرہا تھا جیکب نے اس کے آگے
کیا کہا وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا ضبط کے
باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے
اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ خوشی
کے آنسو تھے یا غم کے۔

"او ہو! تو آپ ہم سے ناراض ہیں!
پرویز نے قہقہہ لگایا۔ "ذرا یہ بھی تو بتائیں
حضور کہ بندے سے کیا خطا ہوئی ہے!"

جیکب نے سنجیدگی سے پرویز سے
پوچھا "پرویز، تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں
بولا تھا؟ بتاؤ"

"جھوٹ؟ کیسا جھوٹ؟" پرویز
کے دل میں خدشہ پیدا ہوا۔

"یہی جھوٹ کہ روشنی تمہارے ماموں
کی بیٹی ہے، جب کہ وہ تمہارے ماموں کی
لڑکی نہیں، یتیم خانے سے لائی گئی ہے"

"او جیکب مجھے معاف کر دو!" پرو[illegible]
کا اندازہ کیا۔ "جیکب میں روشنی کو اپنی [illegible]
بہنوں سے بھی زیادہ چاہتا ہوں میں چاہتا [illegible]
کہ روشنی بھی اچھے گھر میں جائے جہا[ں]
وہ آرام و سکون سے زندگی گزارے جب
میں نے تمہیں اس کی طرف راغب دیکھا [illegible]
میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی میں نے سو[چا]
اگر تمہیں یہ معلوم ہوگیا کہ یہ بے سہارا لاوارث [illegible]
تو تمہارے دل میں اس کی قدر کم ہو جائے [illegible]
اسی لئے میں نے..." اس کے آگے پر[ویز]
کچھ نہ بول سکا۔ الفاظ اس کے گلے میں پھن[س]
گئے۔

"پرویز، کیا تم مجھے اس قدر گرا ہوا
سمجھتے ہو؟" جیکب نے دہاڑا۔

پرویز ششدر رہ گیا کہ جیکب کا [illegible]
مطلب ہے۔ کیا وہ یہ جان کر بھی روشنی [illegible]
شادی کرنے کو تیار ہے؟

"کیا تم اب بھی روشنی سے شادی [illegible]
کا ارادہ رکھتے ہو؟" پرویز نے حیرت [illegible]
پوچھا۔

"اب تو ارادے پہلے سے زیادہ [illegible]
ہو گئے ہیں۔" جیکب نے اعتماد کے [illegible]
کہا۔ "میں نے ممی کو تار دے دیا ہے
دوپہر کی فلائٹ سے وہ آ رہی ہیں اور یہ [illegible]
ان ہی کے سامنے ہو گی۔"

پرویز کو اپنے کانوں پر یقین نہیں
تھا جیکب نے اس کے آگے کیا کہا [illegible]
بھی نہیں سن رہا تھا ضبط کے باوجو[د]
کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ ا[سے]
بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ خوشی کے آنسو [تھے یا]
غم کے۔

PRESSURE COOKER
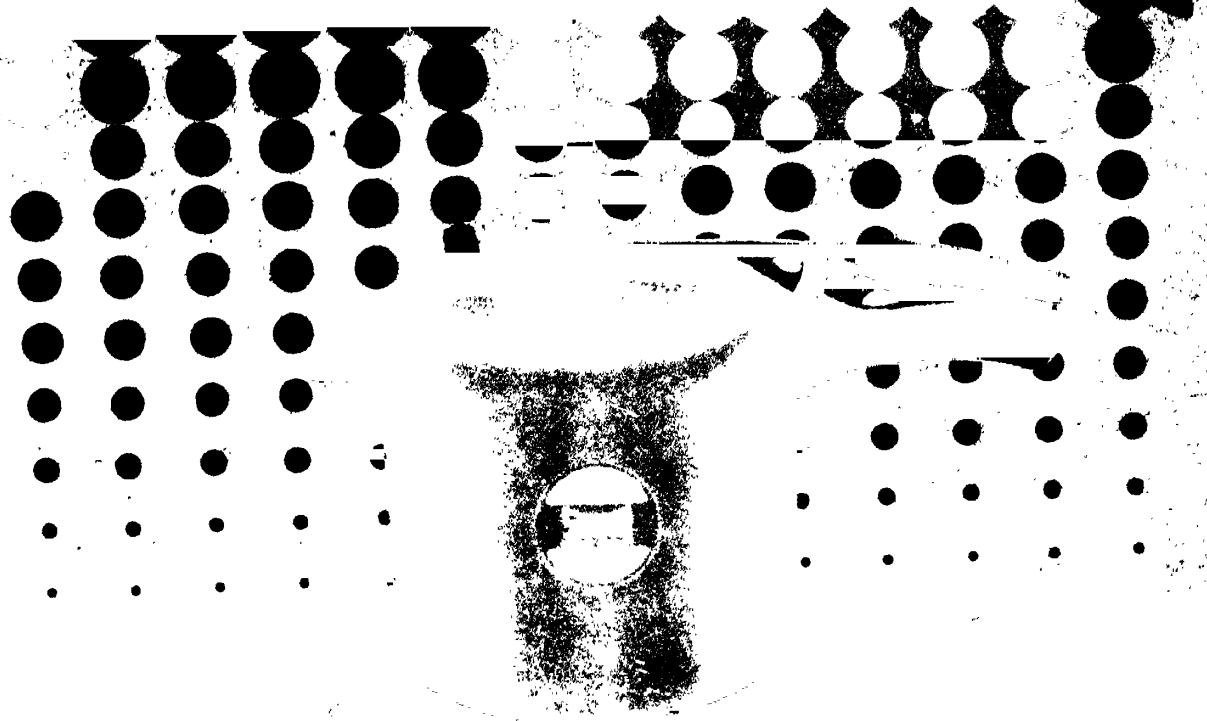
سجاد ظہیر

عورتوں کی آزادی پر ایک یادگاری تقریب

پچھمی دنیا میں آج کل عورتوں کی آزادی کا بڑا چرچا ہے۔ عورتوں کی آزادی کے طرفدار کہتے ہیں کہ اگرچہ قانونی طور سے عورتوں کو سیاسی، سماجی اور معاشی میدانوں میں مردوں کے برابر حقوق مل گئے ہیں، لیکن عملی طور پر ایسا نہیں ہے۔ مثلاً انگلینڈ میں تقریباً سات آٹھ سال پہلے اسقاطِ حمل کی قانونی اجازت دے دی گئی ہے، لیکن اس سلسلے میں میڈیکل انتظامات قابلِ اطمینان نہیں ہیں۔ پھر یہاں ایسے بھی گروہ ہیں جو عمل کر دلانے کی اس قانونی اجازت کے مخالف ہیں اور اس قانون کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ عورتوں کی آزادی کی تحریک کے رہنماؤں کی بنیادی دلیل یہ ہے کہ مردوں نے صدیوں سے طرح طرح کی غلط اور غیر سائنسی دلیلیں دے کر عورتوں کو ان کے جائز برابری کے حقوق سے محروم کرنے کے لئے ایک طرح کی ایسی ذہنی فضا پیدا کر دی ہے جس کے سبب سے خود عورتوں میں اپنی کم تری کا اور بعض باتوں میں بے بسی کا احساس پیدا ہو گیا ہے حال ہی میں یہاں پر میری نظر سے ایسی کتابیں اور رسالوں اور اخباروں میں چھپنے والے ایسے کئی مضامین گزرے ہیں جن میں بڑی شد و مد کے ساتھ ان پرانی دلیلوں کی تردید کی گئی ہے اس سلسلے میں انگلینڈ کی عورتوں کی تحریک ویمنز لب کی ایک لیڈر جرمین گریر کی کتاب خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔ جرمین گریر یہاں کی ایک یونی ورسٹی میں انگریزی لٹریچر پڑھاتی ہیں اور ان کی کتاب سے ان کی بڑی لیاقت کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں سوکھی بحثیں اور سائنٹفک معلومات ہی نہیں ہیں اس میں طنز اور مزاح اور جوش و خروش بھی ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی بھی اسے پڑھے گا وہ عورتوں کی آزادی کی تحریک کے مقاصد کا اگر پوری حد تک نہیں تو بڑی حد تک ضرور قائل ہو جائے گا۔

اور پھر میرا ذہن اپنے دیس کی طرف جاتا ہے اور مجھے چالیس پچاس برس پہلے کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جب لکھنؤ کے ایک محلے میں خود میری ماں بہنیں ڈولی اور پالکی میں گھونگھٹ

ہوئی بیٹھی تھیں اور جب وہ پالکی پر سوار
...تی تھیں تو ان کے بوجھ کو اٹھانے والے کہار
...سے کے لئے ڈیوڑھی سے ہٹ جاتے تھے
...پنے کو شریف یا اونچے درجے کے سمجھنے والوں
...گھر دو حصوں میں بٹے ہوتے تھے: مردانہ
...زنانہ حصہ۔ کوئی غیر مرد زنانے میں نہیں جا سکتا
...ا اور گھر کی بہو بیٹیاں مردانے میں قدم نہیں
...کھ سکتی تھیں اور غیر مردوں سے پردہ کرتی تھیں
...ے یاد ہے کہ ۱۹۱۶ میں لکھنؤ میں کانگریس کا
...الانہ اجلاس ہوا تھا۔ کانگریس کے لیڈروں
...ں شریمتی سروجنی نائیڈو بھی تھیں۔ وہ بھی لکھنؤ
...یں اور سارے لکھنؤ میں کھلبلی مچ گئی، اس لئے
...ہ وہ کانگریس کے مرد لیڈروں لوک مانیہ تلک
...ی جی وغیرہ کے ساتھ ڈائس پر بیٹھتی تھیں
... جلسوں میں تقریر کرتی تھیں۔ وہ میرے
...الد کو جانتی تھیں اور ان سے انہوں نے کہا
کہ ہماری والدہ بیگم وزیر حسن اور ہماری بہنوں سے
ملنے کے لئے ہمارے گھر پر بھی آئیں گی۔ اس خبر سے
ہمارے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ ہمارے گھر کی
عورتیں سب پردہ کرتی تھیں۔ چنانچہ شریمتی
سروجنی نائیڈو جس دن ہمارے گھر پر آئیں
خاص انتظام کیا گیا۔ گھر کی خوب صفائی
ہوئی سب بیبیوں نے بھڑک دار کپڑے
پہنے اور مسز نائیڈو سے ملنے کے لئے گھر کے
ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئیں۔ لیکن وہاں کسی
مرد کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میری عمر اس
وقت گیارہ بارہ سال کی تھی اس لئے میں بھی
ڈرا سہما اور جھجکتا ہوا اس کمرے میں موجود
تھا۔ شریمتی سروجنی نائیڈو کی پرکشش
شخصیت کا جو مجھ پر گہرا اثر ہوا اس کا مجھے
ابھی تک احساس ہے۔ اس وقت وہ جوان
اور دبلی اور بڑی خوب صورت لگتی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ تیز تیز چلتی ہوئی اور اپنی
بڑی بڑی آنکھوں اور تنی ہوئی اور اوپر کی
طرف اٹھی ہوئی چتون سے سارے کمرے کا
جائزہ لیتی ہوئی وہ اندر داخل ہوئیں اور مسکراتی
ہوئی میری ماں کے پاس بیٹھ گئیں۔ چند لمحوں
میں ہنس ہنس کر اور تھوڑی دیر بعد زور زور سے
قہقہے لگا کر انہوں نے میری ماں سے اس طرح
باتیں شروع کیں کہ بناوٹ اور رکھ رکھاؤ کی
برف جیسے پگھل گئی اور ساری دنیا کی عورتوں
کا جیسا دستور ہے تھوڑی دیر میں سروجنی
نائیڈو اور میری ماں اپنے اپنے بچوں، شوہروں
اور مختلف دوستوں کی اور اپنے جاننے والوں
کی بیویوں کی باتیں کرنے لگیں۔

ہندوستان کی آزاد عورت کی شاید
یہ پہلی جھلک تھی جو ہمارے گھر میں ہوا کے
ایک تازہ جھونکے کی طرح داخل ہوئی اور جس
نے یقینی طور پر اس بند اور گھٹے ہوئے
ماحول میں کچھ بہتر تبدیلی پیدا کی ہو گی لیکن
میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں اس سلسلے
میں بڑے پیمانے پر اور بنیادی طور پر تبدیلی
ہماری تحریکِ آزادی کے ساتھ ساتھ آئی
ہزاروں کی تعداد میں ہمارے دیس کی عورتوں
نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ جلوسوں میں مردوں
کے ساتھ مارچ کیا
جیلوں میں گئیں۔ اور ان میں صرف اوسط طبقے
کی لکھی پڑھی عورتیں ہی نہیں بلکہ مزدور اور کسان
عورتیں بھی شامل تھیں۔ یہ اسی جدوجہد کا
نتیجہ ہے کہ آج ہمارے دیس کی پردھان منتری
ایک خاتون ہیں اور عورتوں کا حصہ برابری کی
سطح پر ہماری زندگی کے ہر شعبے میں دن بدن
بڑھتا جا رہا ہے۔ پچھم کے دیسوں میں بھی عورتوں
کی آزادی کے سلسلے میں بنیادی تبدیلی ان کے
دو عالمی جنگوں میں حصہ لینے کی وجہ سے ہی
آئی، جب انہوں نے گھر کی چار دیواری سے
نکل کر کارخانوں، فیکٹریوں، دفتروں، اسپتالوں
اور جنگ کے میدان میں بھی قدم رکھا۔

ایک زمانہ وہ تھا جب عورتیں گھر سے
نکلتے ہوئے ڈرتی اور جھجکتی تھیں اور آج
ان کو اپنی موجودہ آزادی ناکافی معلوم ہو رہی
ہے۔ میری جب شادی ہوئی تو میری بیوی
پردہ کرتی تھیں۔ شادی کے دوسرے دن سے
انہوں نے پردہ چھوڑ دیا آج ان کی اور میری
بیٹیاں یورپ کی یونیورسٹیوں میں ریسرچ
کر رہی ہیں۔ اور میری بیوی کبھی کبھی مجھ سے
پوچھتی ہیں کہ تم اپنے کو روشن خیال اور ترقی پسند
آدمی کہتے ہو، لیکن سچ بتاؤ کیا عورت کو اصلی
برابری کا درجہ دینے کے لئے تم اپنی ذمہ داریوں
کا بوجھ بڑھانے کے لئے تیار ہو؟ اور میں اپنے
دل میں سوچتا ہوں کہ اس اصلی برابری کو حاصل
کرنے کے لئے ابھی مردوں کو بہت کچھ سبق
سیکھنے ہوں گے۔ اور عورتوں کو اور بھی جدوجہد
کرنا ہو گی۔

○○

یہ مضمون سجاد ظہیر صاحب نے
لندن میں لکھا تھا۔ اس مضمون
کی بنیاد پر مرحوم نے بی بی سی
پر ایک تقریر کی تھی مگر یہ
مضمون کہیں شائع نہیں ہوا۔
علی باقر

قطعۂ تاریخ

بروفاتِ حسرت آیات محترم الحاج حافظ محمد یوسف دہلوی صاحب

مدیر اعلیٰ شمع میگزین، نئی دہلی

تو نے ڈھایا اجل یہ کیسا ستم — دفعتاً بچھ گئی صفِ ماتم
سوگواری کا ہے عجب عالم — دل بھی گریاں ہے آنکھ بھی پرنم
دلی کی ایک نامور ہستی — سب کی غم خوار، محسن و ہمدم
بانیِ شمع حافظِ یوسف — تھے اُجالے میں جن کے دم سے ہم
تیرگی میں وہ ہم کو چھوڑ گئے — فرقتِ دائمی کا دے کر غم
آج پروانے بھی ہیں رنجیدہ — شمع کی لَو بھی آج ہے مدھم
مژدۂ غم فضائے دہلی کو — دہلوی خاندان میں ہے غم
کیا ستم ہے کہ اُٹھتے جاتے ہیں — صاحبِ دلِ مخیر، اہلِ کرم
ہے جہانِ صحافت افسردہ — یوسفِ دہلوی کا ہے ماتم
یہ جو داغِ مفارقت ہے ملا — یہ غمِ مشترک ہے ہم سب کا
سب اراکینِ شمع غمگیں ہیں — اُٹھ گیا سر سے آپ کا سایہ
اب یہی مرضیِ خدا تھی خیر — ہم کو یہ داغ دل پہ سہنا تھا
اب تو یہ ہے بجائے آہ و بُکا — صبر سے کام لیں کریں یہ دُعا
بخشے مرحوم کو خدائے کریم — خلد میں بھی مراتبِ اعلیٰ
اُس جہاں میں بھی سرخرو کر دے — جیسے دنیا میں سرفراز کیا
نسبتِ خاص جن کو تھی اُن سے — ان کو توفیقِ صبر بھی ہو عطا
اب رہیں وہ دیارِ رحمت میں — شجرِ سایہ دارِ رحمت میں
ان کو اعلیٰ مقام بخشے خدا — خاص اپنے جوارِ رحمت میں
مجھ کو فکرِ سنِ وفات جو تھی — ایک آواز غیب سے آئی
ہے وقارؔ ایک مصرعہ حسبِ حال — ہے تاریخِ حضرتِ یوسف

لے جہانِ صحافتِ اُردو
دل پہ ا، ۰۰ داغِ فرقتِ یوسف
۱۹۸۵ء

وقار مانوی

اپنی ذہانت کو آزمایئے، اپنی معلومات کا امتحان لیجیے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوال پریشر کوکر حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوئے تو انعام پانے والے کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا
اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔

۱۵۔ جولائی ۱۹۸۵ تک ہمیں ملنے والے جوابات اس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر ۶" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۔ قدیم دور کی ایک ملکہ نے خود کو سانپ سے کٹوا کر خودکشی کی تھی۔ اس کا نام کیا ہے؟

۲۔ جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے مرنے سے چند گھنٹے پہلے کس عورت سے شادی کی تھی؟

۳۔ عرب ممالک میں آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک کون سا ہے؟

۴۔ ہندوستان کا سابق صوبہ آسام آج کل کتنی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے؟

۵۔ لعل (یاقوت) کی کانوں کے لئے کون سا شہر مشہور ہے؟

۶۔ دنیا کا ۹۰ فی صدی ابرق ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے یہ ہمارے ملک کی کس ریاست میں پیدا ہوتا ہے؟

۷۔ "شریر بیوی" کا مصنف کون ہے؟

۸۔ دنیا کی سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب کون سی ہے؟

۹۔ ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی نے کس سنہ میں کام شروع کیا تھا؟

۱۰۔ مسٹر جناح کی بیوی کس فرقے سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا نام کیا ہے؟

ذہنی ورزش نمبر

(۱) ....
(۲) ....
(۳) ....
(۴) ....
(۵) ....
(۶) ....
(۷) ....
(۸) ....
(۹) ....
(۱۰) ....

نام : ....

پتہ : ....

اجالا

ش صغیر ادیب
(بلیک برن، لنکا شائر، انگلستان)

میری ناک سرخ ہو رہی تھی۔ ہونٹوں اور گالوں پر سرخی آمیز نیلاہٹ دوڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ سی چھائی ہوئی تھی اور سارا بدن ہولے ہولے اس طرح تھرتھرا رہا تھا جیسے خشک پتّہ کانپتا ہے۔ اس خراب و خستہ حالت کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں بیمار تھا یا جرے کسی بدترین دشمن نے مجھے زہر دے دیا تھا۔

بلکہ نزع جیسی اس کیفیت کا اصل سبب یہ تھا کہ اس شام غضب کی سردی تھی۔ درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے اتر گیا تھا۔ سڑکوں پر ایک باریک سی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ یہ دراصل سڑکوں پر پھیلی ہوئی نمی تھی جو جم کر برف بن گئی تھی۔ مگر مزید ستم یہ تھا کہ برفیلی ہوا بھی چل رہی تھی۔ جب کوئی یخ بستہ جھونکا

چہرے سے ٹکراتا تو ایسا لگتا جیسے گالوں پر بھرپور طمانچے لگ رہے ہوں۔ اور یہ ہوا کے ان طمانچوں کا ہی اعجاز تھا کہ میرا چہرہ چقندر بن گیا تھا۔ بدن کانپ رہا تھا اور جوتوں کے اندر پاؤں ٹھٹھر کر ایسے اکڑ سے گئے تھے کہ انگلیوں میں درد ہونے لگا تھا مگر کیا کرتا؟ مجبوری تھی۔ اپنے اختیار کی بات ہوتی تو کبھی اس

ذہنی ورزش

اپنی ذہانت کو آزمایئے، اپنی معلومات کا امتحان لیجئے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوان پریشر کوکر حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوئے تو انعام پانے والے کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔ ۱۵۔ جولائی ۱۹۸۵ تک ہمیں ملنے والے جوابات اس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر ۷" ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۔ قدیم دور کی ایک ملکہ نے خود کو سانپ سے کٹوا کر خودکشی کی تھی۔ اس کا نام کیا ہے؟

۲۔ جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر نے مرنے سے چند گھنٹے پہلے کس عورت سے شادی کی تھی؟

۳۔ عرب ممالک میں آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک کون سا ہے؟

۴۔ ہندوستان کا سابق صوبہ آسام آج کل کتنی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے؟

۵۔ لعل (یاقوت) کی کانوں کے لئے کون سا شہر مشہور ہے؟

۶۔ دنیا کا ۹۰ فی صدی ابرق ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے یہ ہمارے ملک کی کس ریاست میں پیدا ہوتا ہے؟

۷۔ "شریر بیوی" کا مصنف کون ہے؟

۸۔ دنیا کی سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب کون سی ہے؟

۹۔ ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی نے کس سنہ میں کام شروع کیا تھا؟

۱۰۔ مسٹر جناح کی بیوی کس فرقے سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا نام کیا ہے؟

ذہنی ورزش نمبر

(۱) ....
(۲) ....
(۳) ....
(۴) ....
(۵) ....
(۶) ....
(۷) ....
(۸) ....
(۹) ....
(۱۰) ....
نام : ....
پتہ : ....

اجالا

ش صغیر ادیب
(بلیک برن، لنکا شائر، انگلستان)

میری ناک سُرخ ہو رہی تھی۔ ہونٹوں اور گالوں پر سُرخی آمیز نیلاہٹ دوڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ سی چھائی ہوئی تھی اور سارا بدن ہولے ہولے اس طرح تھر تھرا رہا تھا جیسے خوفناک بچہ کانپتا ہے۔ اس خراب و خستہ حالت کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں بیمار تھا یا جبر کسی بدترین دشمن نے مجھے زہر دے دیا تھا۔ بلکہ نزع جیسی اس کیفیت کا اصل سبب یہ تھا کہ اس شام غضب کی سردی تھی۔ زیرِ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچے اُتر گیا تھا۔ سڑکوں پر ایک باریک سی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ یہ در اصل سڑکوں پر پھیلی ہوئی نمی تھی جو جم کر برف بن گئی تھی۔ مگر مزید ستم یہ تھا کہ برفیلی ہوا بھی چل رہی تھی۔ جب کوئی یخ بستہ جھونکا چہرے سے ٹکراتا تو ایسا لگتا جیسے گالوں پر بھرپور طمانچے لگ رہے ہوں۔ اور یہ ہولے ان طمانچوں کا ہی اعجاز تھا کہ میرا چہرہ چقندر بن گیا تھا۔ بدن کانپ رہا تھا۔ جوتوں کے اندر پاؤں ٹھٹھر کر ایسے اکڑے ہوئے تھے کہ انگلیوں میں درد ہونے لگا تھا مگر کیا کرتا؟ مجبوری تھی۔ اپنے اختیار کی بات ہوتی تو کبھی اس

موسم میں باہر نکلتا۔ میں تو اپنے کمرے میں نرم گرم لحاف میں دبکا ہوا 'بالِ جبریل' کے اشعار بیٹھے پڑھ رہا تھا۔ کمرے میں ہیٹر کی بے حد لطیف اور راحت آمیز گرمی تھی۔ ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی باہر جانے کا تصور نہیں تھا لیکن یکایک میرے دوست جمیل الزماں قادری کا فون آگیا۔ کہنے لگا، فوراً آؤ، بہت ضروری کام ہے۔ میں نے موسم کی دہائی دی 'بالِ جبریل' کا حوالہ دیا۔ یہ بھی کہا کہ کچھ تو خدا کا خوف کرو، ایسی غضب کی سردی میں ایک بے چارے سیدھے سادے شریف آدمی کو تکلیف پہنچا رہے ہو، جہنم کی آگ میں جلو گے، خدا اپنے معصوم بندوں پر ستم کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا وغیرہ۔ مگر وہ نہیں مانا۔ کہنے لگا، تم اور معصوم! لاحول ولا قوۃ! فوراً آؤ، ورنہ میں فی الفور دوستی ختم کر دوں گا۔

اب چونکہ میں جمیل الزماں قادری سے دوستی ختم کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا، لہٰذا ناچار اٹھنا پڑا۔ نرم گرم لحاف اور 'بالِ جبریل' چھوڑتے ہوئے بڑا قلق ہوا تاہم مجبوری تھی، قہر درویش برجانِ درویش کی تصویر بن کر کپڑے پہنے، 'مفلر لپیٹا' دستانے چڑھائے اور زیرِ لب جمیل الزماں قادری کو ایک موٹی سی گالی دے کر نکل کھڑا ہوا۔

سڑکوں پر سناٹا تھا۔ کون بھلا ایسے واہیات موسم میں خواہ مخواہ باہر نکلنا پسند کرتا ہے؟ صرف کہیں کہیں کچھ لوگ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ میں گردن جھکائے دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے لپکتا جھپکتا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی آنے میں ابھی کچھ دیر تھی چنانچہ میں کیفے میں گھس گیا، کافی کا کپ لیا اور ایک ایسی سیٹ بیٹھنے کے لئے منتخب کی جو ہیٹر کے قریب تھی۔ آرام سے کرسی پر نیم دراز ہونے کے بعد میں نے دستانے اتارے، کافی کا ایک بڑا گھونٹ بھرا، پھر ایک سگریٹ جلائی اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کیفے میں میرے سوا صرف چار افراد اور تھے۔ ایک جھول سا بوڑھا ایک غلیظ سا بھاری بھرکم کوٹ پہنے قدرے فاصلے پر کونے میں بیٹھا تھا اور اپنے سامنے دھری ہوئی چائے کی پیالی کی سطح کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے اس میں اپنے مستقبل کا عکس دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسری ایک بے حد خوب صورت عورت تھی جو دروازے کے قریب بیٹھی تھی۔ اس کے سر کے بال قریب قریب اڑ چکے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک رنگین رسالہ تھا اور وہ اتنے انہماک سے اس کے مطالعہ میں مصروف تھی کہ ایسا لگتا تھا جیسے اسے اپنے آس پاس کی کوئی خبر ہی نہ ہو۔ ان دونوں افراد کے علاوہ دو نوجوان لڑکیاں تھیں جو مجھ سے اگلی میز پر بیٹھی تھیں ان کی پشت میری جانب تھی اور وہ اپنی باتوں میں اتنی محو تھیں کہ انہوں نے اس بات پر کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی کہ کوئی ان کے پیچھے کی میز پر آ کر بیٹھ گیا ہے۔ دونوں بدستور باتوں میں جٹی رہیں۔ ان میں سے ایک کے بال ہلکے بھورے تھے اور اس نے کتھئی رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ دوسری کے بال سیاہ تھے۔ اس کی گردن بے حد شفاف اور خوب صورت تھی۔ اس کا رنگ بھی بے حد صاف تھا۔ اس نے غالباً کسی قسم کی مصنوعی فر کا کوٹ پہن رکھا تھا جو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں خاموش بیٹھا چائے پیتا رہا اور بے دھیانی میں کبھی ادھر ادھر اور کبھی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ جہاں اب ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو گئی تھی۔ دونوں لڑکیاں چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی ان کا کوئی جملہ میرے کانوں میں بھی پڑ جاتا تھا۔ تاہم میرا دھیان ان کی طرف کم تھا اور جمیل الزماں قادری کی طرف زیادہ تھا۔ کم بخت! نامعقول! خود تو اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھا ہوگا اور مجھے اس غضب کی سردی میں باہر نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، چند میل کا ہی تو فاصلہ ہے۔ ابھی پہنچتا ہوں تمہارے پاس اور پھر ایسی خبر لوں گا برخوردار کہ تا عمر یاد رکھو گے۔ میں نے دل ہی دل میں طے کیا۔

یکایک میں چونکا۔ سیاہ بالوں والی لڑکی کی آواز کانوں میں آئی۔ وہ کافی شوخ اور تیکھے لہجے میں کہہ رہی تھی: "نہیں بھئی، یہ لوگ مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔"

"کیا اس لئے کہ وہ سیاہ فام ہیں؟"

یہ بات بھورے بالوں والی لڑکی نے کہی۔

میں نے فوراً جمیل الزماں قادری کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور توجہ سے ان کی باتیں سننے لگا۔ سیاہ بالوں والی لڑکی نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر کہنے لگی "نہیں، نہیں، یہ بات نہیں ایشیائی کالے تو نہیں عموماً سانولے ہوتے ہیں اور سانولا رنگ مجھے اچھا بھی لگتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ یہ لوگ اچھے نہیں ہوتے

"کیا مطلب؟"

"اب بے وقوف نہ بنو" سیاہ بالوں والی نے کہا "تم تو جانتی ہو، یہ لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ تہذیب تو ان کے قریب سے

نڈری، نیز یہ جاہل اور گنوار ہوتے
ا نے اتنی ترقی کرلی، لیکن یہ لوگ
پچھلی صدی میں رہ رہے ہیں۔"
سنہرے بالوں والی لڑکی بولی۔ "مگر
یں وہ تو ان کی اپنی تہذیب ہے
ف لائف۔"
"ارے چھوڑو بھی۔ تم تو خواہ مخواہ
نوں کی طرف داری کرتی ہو۔" سیاہ
لی لڑکی نے کہا۔ "ورنہ حقیقت یہ
یہ لوگ انتہائی جاہل اور گنوار ہوتے
ا تو ان کے وے آف لائف کو
حال میں بھی گوارا نہیں کرسکتی۔"
اس وقت میری عجیب سی حالت تھی
دلے ہکا بکا سا بیٹھا تھا اور پلک جھپکائے
سیاہ بالوں والی لڑکی کی سنہری شفاف
ن کو گھور رہا تھا۔ ہر چند کہ میرا ایسا کوئی
نہ تھا کہ ان کی باتوں میں دخل دوں،
اس لڑکی کے آخری دو الفاظ کا ردِ عمل
ایسا ہوا کہ میں نے فوراً ہی اپنے "اجڈ"
"گنوار" ہونے کا ثبوت دے دیا۔ کھنکھار کر
صاف کیا اور اونچی آواز میں کہا۔ "معاف کرنا
ے تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہئے۔"
دونوں ہی چونک کر گھومیں اور ایک
دیسی آدمی کو اپنا مخاطب پاکر وہ خفت سی چپ ہوگئی
بن سیاہ بالوں والی لڑکی جسے میوس کہہ کر
طب کیا گیا تھا، کچھ اس طرح گھبرا گئی جیسے
ے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ اس کے
رے پر ندامت کی جھلک نظر آئی مگر صرف
ند لمحے کے لئے۔ پھر وہ فوراً ہی خود کو سنبھال کر
دلیری سے ہنسنے لگی اور صاف آواز میں بولی
"آئی ایم ساری۔"

میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھائی
میوس کے خوب صورت چہرے کو دیکھا اور دھیمے
لہجے میں کہا۔ "تم جو کچھ کہہ رہی تھیں اس کا ایک
پہلو اور بھی ہے اور وہ یہ کہ جب تم پیٹھ پیچھے کسی کا
اس طرح مذاق اُڑاتی ہو تو اس کا تو کچھ نہیں بگڑتا
لیکن تمہارا اپنا اخلاق ضرور مشکوک ہوجاتا ہے۔"
"لیکن مسٹر، میرا یہ مطلب نہیں تھا میں تو
دراصل یہ کہہ رہی تھی کہ ...."
"تم جو کچھ کہہ رہی تھیں میں اس کا مطلب
اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر اس کے لئے تمہیں الزام
دینا شاید درست نہ ہوگا۔ دراصل بات یہ ہے
کہ ...."
ممکن ہے بات اور بڑھتی اور باقاعدہ
بحث کی شکل اختیار کرلیتی۔ میوس کے انداز
سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ آسانی سے میدان
چھوڑنے والی نہیں۔ مگر نہ تو بات آگے بڑھی نہ مجھے
اپنا جملہ پورا کرنے کا موقع ملا۔ اسپیکر پر اچانک
ٹرین کی آمد کا اعلان کیا گیا۔ میں نے جلدی سے
دستانے اٹھائے، دونوں لڑکیوں کی طرف
دیکھا اور آہستہ سے مسکرا کر کہا۔ "میں بے جا
مداخلت کے لئے معذرت چاہتا ہوں لیکن
جانے سے پہلے اتنا ضرور کہوں گا کہ کبھی فرصت
ملے تو ہماری تہذیب کے اچھے پہلوؤں کے
بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل کرلینا، ہوسکتا
ہے کہ تمہارے خیالات میں کچھ تبدیلی آجائے۔
اچھا خدا حافظ ....." یہ کہہ کر میں دروازے
کی جانب بڑھ گیا۔

یہ میوس سے پہلی ملاقات تھی جو ظاہر
ہے کہ کسی بھی پہلو سے خوش گوار نہیں تھی۔ مجھے
دو چار روز تک میوس اور اس کی باتوں کا خیال
آتا رہا۔ پھر میں بھول گیا۔ ضرورت بھی کیا تھی!
انگلستان میں تو یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ کسی ہوٹل میں
کسی پارک میں کبھی اسٹور میں یا راستہ چلتے، کہیں
نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی ہمیں ایسی باتوں کا سامنا
کرنا ہی پڑتا ہے۔ کون ایسی باتوں کو یاد رکھے
نظر انداز کردینا اور بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے
چنانچہ میں نے بھی میوس کو اپنے ذہن کے مکان
سے پکڑ کر نکال باہر کیا اور اپنے شب و روز کے
معمولات میں گم گیا۔
یہ واقعہ کوئی سولہ سال پہلے پیش آیا تھا
ان دنوں مجھے انگلینڈ گئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ
نہیں ہوا تھا۔ شاید دو سال ہوئے تھے۔ شروع
شروع میں مجھے خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا
تھا۔ وجہ یہ ہے کہ میں ڈاکٹر، انجینئر یا کچھ
نہیں تھا کہ فوراً ہی کوئی معقول ملازمت مل جاتی
ایک کاغذ کا پرزہ جیب میں تھا جس سے پتہ چلتا
تھا کہ میں نے میٹرک پاس کر رکھا ہے مگر وہ کافی
نہیں تھا چنانچہ کچھ دن اپنے اُردو محاورے
کے مطابق جوتیاں چٹخانی پڑیں۔ پھر ایک
فیکٹری میں نوکری مل گئی۔ ان دنوں میں چودھری
عبدالخالق کے مکان کے ایک کمرے میں رہتا
تھا۔ چودھری عبدالخالق کا مکان تین منزلہ
تھا اور اس میں میرے اور چودھری جی کے
علاوہ چھ افراد اور بھی رہتے تھے۔ ایک سکھ، دو
ہندو اور باقی سب مسلمان۔ برصغیر میں ان تینوں
قوموں کے درمیان ضرور بڑے اختلاف ہوں گے
لیکن اس گھر میں نہیں تھے۔ سب مل جل کر رہتے
تھے۔ حالاں کہ سنیچر اتوار کی شاموں کو جب اکثر
سب کے سب نچلی منزل کے وسیع سٹنگ روم
میں بیٹھتے تو بہت زور و شور سے مختلف موضوعات
پر بحث ہوتی۔ سیاست کا ذکر بھی چلتا، سردار

کرپال سنگھ، اننت راج سکسینہ اور محمد امین بسمل خوب لڑور زور سے بولتے کہ بحث مباحثہ ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ چودھری عبدالخالق اپنے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے حقہ پیتے رہتے جو انہوں نے بطورِ خاص وطن سے منگوایا تھا اور مسکراتے رہتے۔ خود بحث میں حصّہ بہت کم لیتے تھے۔ کبھی کبھی بحث ایسا رنگ اختیار کر لیتی کہ فریقین کے چہروں سے برہمی جھلکنے لگتی ہے شبہ ہوتا کہ اب تعلقات میں شاید دراڑ پڑ جائے گی لیکن ہوتا کچھ نہیں۔ اختلافات اور اعتراضات کو محض الفاظ تک ہی رکھا جاتا ہے۔ تلخی دلوں تک نہ پہنچ پاتی اور بحث کسی نتیجے پر پہنچے بغیر خود بخود ختم ہو جاتی۔ پھر محمد امین بسمل اچانک کہتا "اچھا یار سنگھ، گولی مار ان باتوں کو چل ذرا چل کر خواجہ کی دکان سے قیمہ لے آئیں۔ آج آلو، مٹر اور قیمے کا سالن بنائیں گے۔"

"ہاں یار چل، ان سالی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ ممّی یا...."

محمد امین بسمل کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے، ایک ساتھ کھانے پکانے اور ایک ہی فیکٹری میں کام کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ سردار کرپال سنگھ بھی سالا، سالی جیسے الفاظ کا استعمال بڑی بے تکلفی سے کرنے لگا تھا۔

ان دنوں میری شفٹ صبح کی ہوا کرتی تھی۔ ڈھائی بجے گھر آتا تو کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کرتا اور پھر کالج پہنچ جاتا۔ میری جیب میں کاغذ کا جو ٹکڑا تھا اور جس کی بدولت مجھ پر میٹرک پاس کی تہمت لگی تھی۔ وہ ٹکڑا مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ویسے بھی وہ ایک ٹکڑا وطن میں تو شاید کسی کام آجاتا، لیکن فرنگیوں کے ملک میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

چنانچہ میں نے طے کیا کہ اگر زندگی میں کچھ کرنا اور کچھ بننا ہے تو پھر زیادہ بڑی ہمت اپنے سر لینے کا اہتمام کرنا پڑے گا۔ یہی سوچ کر میں شبینہ کلاسوں میں داخل ہوا تھا جو کورس میں کر رہا تھا اس کی مدت تین سال تھی۔ چھ ماہ گزر چکے تھے ڈھائی سال ابھی باقی تھے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جب عشق کے مارے اپنے محبوب سے بچھڑنے کے بعد بھی ساری عمر گزار لیتے ہیں، لیڈرانِ کرام، کرسی کے انتظار میں برسوں صبر و سکون کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زندگی گزار لینے جیسا کارنامہ مجھ سے سرزد ہو سکتا ہے تو پھر میں ڈھائی سال کی مدت کیوں نہیں گزار سکتا؟ بلاشبہ میں یہ کارنامہ بھی انجام دے سکتا ہوں۔ بس ایک ذرا سی ہمت درکار ہے۔ ذرا سے صبر و سکون کی ضرورت ہے۔ ڈھائی سال یوں گزر جائیں گے کہ پتہ بھی نہ چلے گا چنانچہ میں ہر شام بڑی باقاعدگی سے کالج میں حاضری دے کر صبر و ضبط کا مظاہرہ کرنے میں جٹا ہوا تھا۔

میوس میرے ذہن سے نکل چکی تھی۔ ویسے بھی اسے یاد رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر کبھی کبھار دھیان آ بھی جاتا تو میں سر جھٹک کر اس طرح اس کا خیال ذہن سے نکال دیتا جیسے ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی اڑائی جاتی ہے۔ جہنم میں جائے مجھے کیا؟ کون سی خاص بات تھی بھلا اس میں کہ اسے یاد رکھوں؟ مانا کہ خوب صورت تھی لیکن اس کے خیالات تو خوب صورت نہ تھے۔ ہم ایشیائیوں کو کم تر، گنوار، جاہل اور نہ کیا کیا سمجھتی ہے۔ ایسی لڑکی کو بھول جانا ہی بہتر ہے لیکن اتفاقات کے تھیلے میں ان گنت رنگ برنگی تھیلیاں ہوتی ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کون سے رنگ کی تھیلی نکل پڑے۔ ایک شام جب میں لپکتا جھپکتا کالج کے کوریڈور سے جا رہا تھا تو دفعتاً وہ نظر آگئی میں نے فوراً پہچان لیا تھا تاہم تعجب کی بات یہ تھی کہ اس نے بھی مجھے پہچان لیا کیوں کہ جب وہ میرے قریب سے گزرنے لگی تو اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ناچ گئی۔

میں نے یکایک مسکرا کر کہا "ہیلو"

"ہیلو" اس کی مترنم آواز نے [illegible] دی۔

پھر وہ آگے بڑھ گئی اور میں اپنے رُوم کی طرف چل دیا۔

اس روز کینٹین میں جو کچھ ہوا تھا اور میوس نے ایشیائیوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، اس کے بعد نہ تو اس کا کوئی امکان تھا اور نہ ہی یہ کوئی تک کی بات تھی کہ ہم دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہوتا۔ مگر یہ بے تکی بات بھی نہ جانے کیسے ہو گئی۔ کبھی کاریڈور میں سامنا ہو جاتا کبھی کینٹین میں اور لائبریری میں۔ ہیلو کا تبادلہ ہوتا۔ اکثر دو ایک باتیں بھی ہو جاتیں۔ رفتہ رفتہ ہم اچھے خاصے دوست بن گئے۔ معلوم ہوا کہ میوس پہلے ایک قریبی شہر میں رہتی تھی پھر ہمارے شہر میں آگئی اور ایک بڑے اسٹور میں ملازم ہو گئی مگر وہ اپنی ملازمت سے خوش نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے شبینہ کلاسیں جوائن کر لیں۔ [illegible] سال کے والد کا انتقال ہو چکا تھا ماں زندہ تھی مگر مستقل بیمار رہتی تھی۔ میوس کے اوپر اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی تھی جب اس نے اپنی ماں کے بارے میں پہلی بار مجھے تفصیل سے بتایا تو میری

یے والی سبھی ترقی کا جلد لے لیا تھا میں نے
اطمینان سے کہا " تو تم اپنی ماں کو اولڈ
ہوم کیوں منتقل نہیں کر دیتیں ؟"
" مجھے اچھا نہیں لگتا "
" کیوں ؟ "
" یہ تو کچھ اچھی بات نہیں" میوس کہنے
رہ اگرچہ بہت سے لوگ یہی کرتے ہیں مگر
یہ طریقہ پسند نہیں۔ آخر کو وہ میری ماں ہیں۔
دں نے مجھے پالا پوسا ہے اور میں سمجھتی ہوں
اب یہ میرا فرض ہے کہ عمر کے اس حصے میں
ب وہ معذور ہو گئی ہیں، میں ان کی دیکھ بھال
دں "

" مگر اس طرح تو تمہاری اپنی آزادی میں
نی خلل پڑتا ہے "
" کیا مطلب ؟ "
" بھئی ایک تو یہ کہ تمہیں ان کے طرح طرح
ے کام کرنے پڑتے ہیں۔ وقت پر دوا اور کھانا
ینا پڑتا ہے۔ ہر ہفتے ہسپتال لے جانا پڑتا
ہے۔ اور پھر ہو کر ختم ہفتے کی شاموں کو گھر میں بیٹھنا
پڑتا ہے۔ حالاں کہ ان شاموں کو تم باہر جا سکتی
ہو، کلب، ڈانس ہال، پب وغیرہ۔ لیکن تمہیں تو
اپنے سارے عیش تیاگنے پڑتے ہیں "
میوس ذرا سا چونکی۔ اس نے تجسس آمیز
نظروں سے مجھے گھورا پھر کہنے لگی " تم یہ ساری
باتیں کس نیت سے کہہ رہے ہو۔ اگر میں پب اور
ڈانس ہال پر اپنی ماں کی خدمت کو ترجیح دیتی ہوں
تو اس میں کیا حرج ہے ؟ "
میں نے شرارت سے مسکرا کر اور اپنی آواز
میں قدرے تیکھا پن پیدا کر کے کہا " کیوں کہ اس
حرکت میں تو خاصی جہالت اور گنوار پن ہے "
" کیا مطلب ؟ وضاحت کرو۔ وضاحت

کرو " میوس لپک کر بولی۔
" مطلب یہ کہ تم لوگ تو بڑے مہذب اور
ترقی یافتہ لوگ ہو۔ حقیقت پسند بھی ہو اور فرد
کی آزادی کے حامی بھی۔ اسی لئے تم نے اولڈ پیپل
ہوم بنائے ہیں تاکہ جب ماں باپ بوڑھے اور
ناکارہ ہو جائیں تو انہیں وہاں منتقل کر دیا جائے
اور وہ اپنی اولاد پر بوجھ نہ بن سکیں کیوں کہ ایک
انسان کو بہر حال یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے
انسان کی زندگی کو تلخ بنائے چاہے وہ ماں باپ
ہی کیوں نہ ہوں۔ جب کہ ہم لوگ گنوار پس ماندہ
اور جاہل ہیں، اولڈ پیپل ہوم نہیں بناتے اور ... "
میں نے یکایک چھلانگ لگائی اور
دروازے کی جانب بھاگا۔ میوس نے دانت
پیس کر مجھے ایک ننھی سی خوب صورت سی گالی دی
تھی اور نمک کی شیشی پوری قوت سے پھینک کر
ماری تھی جو خوش قسمتی سے میرے نہیں دروازے
پر لگی اور ٹوٹ کر چور چور ہو گئی۔
رفتہ رفتہ ہماری دوستی کچھ اور بڑھی۔ اکثر
ملاقاتیں ہوتی رہتی۔ میوس خوب صورت تو تھی ہی،
لیکن ذہین اور خوش اخلاق بھی تھی۔ اور یقیناً
اسی بنا پر ہماری دوستی بڑھی تھی تاہم اس کا ہرگز
یہ مطلب نہ تھا کہ اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی
واقع ہوئی تھی۔ خوش اخلاقی اور ذاتی نظریات کا
کبھی کبھی آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پس ماندہ
اقوام اور خصوصاً برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کے
بارے میں اس کے خیالات بدستور وہی تھے
جن کا اظہار اس نے کینیڈے میں کیا تھا۔ کبھی کبھی بحث
چھڑ جاتی تو وہ خوب زور زور سے بولتی " یہ لوگ
جاہل ہوتے ہیں۔ گندے اور گنوار ہوتے ہیں
آج بھی دو سو سال پہلے کی دنیا میں جی رہے ہیں۔ ان
لوگوں کے یہاں دنیا کی ہر برائی موجود ہے، اور

تہذیب تو ان کے قریب سے بھی نہیں گزری۔ آج
بھی ان کے یہاں کے جادو ٹونا اور طرح طرح کی
فرسودہ اور وحشیانہ رسمیں رائج ہیں۔ دنیا ترقی
کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئی لیکن یہ لوگ آج بھی
جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور بھوکوں مرتے ہیں۔
ارے انہیں تو پینے کے لئے صاف پانی تک
میسر نہیں " وغیرہ۔ میوس اور بھی کئی طرح کی
باتیں کرتی اور سند کے طور پر رڈیارڈ کپلنگ
ٹیلی ویژن کی ڈاکومنٹری یا اخباری مضامین
کا حوالہ دیتی۔ قدرتی بات ہے کہ ایسے موقعوں
پر میں بہت جز بز ہوتا۔ کم بخت نے بلبل
سفید فام بندریا! اپنی جانب سے بھرپور اور
مدلل جواب دینے کی کوشش بھی کرتا —
کبھی بات بنتی، کبھی نہ بنتی۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے
اس چھوٹے سے گروپ میں صرف میں ہی ایک
ایشین تھا۔ باقی تین چار افراد انگلش یا آئرین
تھے اور وہ عموماً غیر جانب دار رہتے۔ اگر کبھی
بولتے بھی تو میوس کا ہی ساتھ دیتے ~~مگر~~
~~[illegible]~~ مگر یہ ضرور ہے
کہ میوس بحث کی تلخی اور گرما گرمی کے باوجود
اپنے دل میں کچھ نہیں رکھتی تھی۔ بحث ختم ہوتی تو
وہ پھر پہلے ہی کی طرح خوش مزاج بن جاتی اور
ہماری دوستی میں کوئی فرق نہ آتا۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا کہ ایک
دن میرا دوست ایاز مجھ سے ملنے کے لئے آیا اور
میں نے اس کا تعارف میوس سے کرایا۔
ایاز بلیک برن میں رہتا تھا، جہاں
وہ ٹیلی ویژن بنانے والی ایک کمپنی میں ملازم تھا
اور شام کی کلاسوں میں کالج بھی جایا کرتا تھا۔ وہ
میرا بچپن کا دوست تھا۔ چند سال پہلے جب ہم

دونوں اپنے گاؤں احمد پور میں تھے اور کچی دیواروں والے مڈل اسکول کی آٹھویں جماعت میں پڑھا کرتے تھے تو ہم دونوں ہی فلم ایکٹر بننے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ایاز بہت وجیہ تھا۔ بڑا تیکھا ناک نقشہ تھا اس کا۔ رنگ بھی بہت صاف تھا۔ لہٰذا اس نے طے کر لیا تھا کہ ہیرو بنے گا اور دلیپ کمار اور محمد علی جیسے اداکاروں کی چھٹی کر دے گا جب کہ میرا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ قسمت کی طرح رنگ روپ نے بھی مجھے دھوکا دیا تھا۔ اس بنا پر میرا ارادہ تھا کہ ولن بنوں گا اور قریب قریب ہر فلم میں ایاز کی ہیروئن کو اغوا کر لے جایا کروں گا۔

لیکن بڑے ہوئے تو ہم فلموں کی بجائے انگلستان پہنچ گئے۔

ایاز اور میوس کا پہلا تعارف رسمی قسم کا تھا اور میرا خیال تھا رسمی ہی رہے گا لیکن اگلے چند ہفتوں میں کئی بار ان کی ملاقات ہوئی اور ان کی دوستی رسمیات سے آگے بڑھ گئی۔

بلیک برن اور پریسٹن کے درمیان محض چند میل کا فاصلہ ہے۔ پہلے ایاز بہت کم پریسٹن آیا کرتا تھا، اب بار بار آنے لگا اور اس وقت تو نہیں لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ جب بھی آتا تھا میوس سے ضرور ملتا تھا۔ ان دنوں کبھی مجھے یہ گمان تک نہ ہوا تھا کہ ان دونوں نے دلوں کے تبادلے وغیرہ کا کوئی پروگرام بنا رکھا ہے۔ یہ شبہ پہلی بار مجھے اس وقت ہوا جب ایک شام میں نے ٹاؤن سینٹر میں انہیں اس حالت میں دیکھا کہ میوس کا ہاتھ ایاز کے بازو میں حمائل تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے قریب قریب جڑے ہوئے اس طرح چل رہے تھے کہ میرے ذہن میں فوراً ہی "ایک جان دو قالب" والا محاورہ قلابازیاں کھانے لگا۔ آخر وہ چند دنوں میں اس شبہ کو اور بھی تقویت ملی اور پھر ایک دن تصدیق بھی ہو گئی جب میرے استفسار پر ایاز نے مان لیا کہ وہ واقعی میوس کو پسند کرتا ہے۔

"کیا وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے؟"

"ہاں، مجھے یقین ہے۔"

"تم اس سے شادی وغیرہ کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟" میں نے ذرا تشویش سے پوچھا۔

"یہ تو ذرا قبل از وقت ہے۔ کیا کہہ سکتا ہوں؟ شاید...." ایاز نے جواب دیا۔

اب میں نے ولن کے بجائے سائڈ ہیرو کا رول ادا کرنا شروع کیا۔ کیوں کہ سائیڈ ہیرو عموماً ہیرو کا ہمدرد ہوتا ہے۔ میں نے کہا "مگر پیارے ایاز، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میوس کے خیالات ہم ایشیائیوں کی بابت کیا ہیں۔ وہ ہمیں جاہل، گنوار اور نہ جانے کیا کیا سمجھتی ہے ہماری تہذیبی قدروں اور ہماری تاریخ کا مذاق اُڑاتی ہے۔ کہتی ہے، ہم لوگ بہت تنگ دل ہوتے ہیں، کیوں کہ ہم اپنی عورتوں کو گھروں میں بند کر کے رکھتے ہیں، انہیں ایک کالا کپڑا اُڑھاتے ہیں اور انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ غیر مردوں سے بات چیت کر سکیں، وغیرہ۔ اب تم خود ہی سوچو کہ اگر تم نے اس سے شادی کی تو...."

ایاز ٹھنڈی سانس لے کر بولا "یہ تو سب ٹھیک ہے اور میرے دل میں تھوڑا تذبذب بھی ہے۔ مگر...."

"مگر کیا؟"

ایاز نے خجل ہو کر کہا "کیا کروں یار، وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ یہ سالا دل...."

میں چپ ہو گیا۔ ایاز کی آخری بات سچی تھی کہ میں تو کیا، ارسطو اور افلاطون بھی اس بات کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ میں اس "سالے دل" کی کارفرمائیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ تو ازل سے کافر ہے اور ابد تک رہے گا۔ یہ کسی کی نہیں سنتا۔ عقل سے اس کا سدا کا بیر ہے۔ ہمیشہ اپنی من مانی کرتا ہے۔ اس "سالے دل" کے ہاتھوں اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ مجنوں نے صحرا کی خاک چھانی۔ فرہاد نے دُودھ کی نہر نکالی اور پھر ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہیوال اور روپ متی باز بہادر، اور پھر بے شمار وہ جو دل کے ہاتھوں مِٹ گئے لیکن جن کا نام کتابوں میں نہیں لکھا گیا۔ اس دل کے کارن دنیا میں ان گنت جنگیں ہوئیں، تاریخ کے دھارے مڑ گئے۔ تہذیبوں کے رُخ بدل گئے۔ اگر یہ دل کم بخت کافر دل نہ ہوتا تو انسانی تاریخ اتنی رنگا رنگ اور اتنی سنسنی خیز نہ ہوتی۔ تاج محل نہ بنتا، دیوانِ غالب نہ لکھا جاتا۔ اور نہ ان گنت کہانیاں رقم ہوتیں۔ مگر یہ دل ہی ہے جس نے اس رُوکھی پھیکی، بے کار، واہیات اور لایعنی زندگی میں ان گنت معنی اور بے شمار رنگ بھر دیئے ہیں اور ہزار بُرائیوں کے باوجود دنیا کو اس قابل بنا دیا ہے کہ آدمی یہاں زندہ رہنے کی تمنا کرے۔

یہ کافر دل ایاز اور میوس کے سینے میں بھی موجود تھا چنانچہ اتنے زمینی تضادات کے باوجود وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی چھ ماہ بعد ان دونوں نے شادی کر لی۔

شادی کے بعد میوس بلیک برن چلی گئی اور اگلے چھ ماہ بالکل اسی طرح گزرے جس طرح گزرنے چاہئیں تھے یعنی انہیں یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ سورج مشرق سے نکلتا

ہے یا مغرب سے۔ بلکہ لگتا بھی ہے یا وہ بھی ہنی مون پر چلا گیا ہے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے وہ اعتدال پر آگئے اور روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہو گئے۔ زندگی میں محبوب کے ملن کا مدھر، خنک اور مدہوش کن سایہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ مسائل کی کڑی دھوپ بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے نشاط انگیز سائے سے نکل کر آخرکار دھوپ میں آگئے۔ انہوں نے ایک اچھا سا مکان خرید لیا اور ہر چند کہ ایاز کی آمدنی معقول تھی، پھر بھی میوس نے ٹاؤن ہال میں ایک مناسب سی ملازمت حاصل کر لی کچھ تو اس بنا پر کہ وہ سارے دن کی تنہائی سے بچنا چاہتی تھی اور کچھ اس لئے کہ اس طرح وہ ایاز کا ہاتھ بھی بٹانا چاہتی تھی، کیوں کہ ایاز کو ہر ماہ ایک معقول رقم گاؤں بھیجنا پڑتی تھی میوس کو یہ علم نہیں تھا کہ گاؤں میں کیا حالات ہیں لیکن اسے جب یہ معلوم ہوا کہ ایاز کے ماں باپ اور چھوٹی بہن کا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے اور یہ کہ انہوں نے ایاز کے ایما پر کچھ زمین خریدی ہے، اس کا قرض بھی سر پر ہے تو اس نے خود ہی ایاز سے اصرار کیا کہ گاؤں پیسے بھیجنے میں کبھی کوئی تاخیر نہ ہونی چاہئے۔ یہ بات ایاز کے لئے ممکن ہے تعجب خیز تھی مگر میرے لئے نہیں۔ میں جانتا تھا کہ ماں باپ کے ضمن میں میوس کے خیالات کیا ہیں۔

میں بدستور پریسٹن میں تھا اور میرے شب و روز معمول کے مطابق تھے، یعنی روکھے پھیکے بے تکے، بے رنگ۔ مگر میں مطمئن تھا اس لئے نہیں کہ میں کوئی بہت صابر و شاکر اور قانع قسم کا آدمی ہوں، بلکہ اس لئے کہ میں کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ انگور اگر رسائی سے باہر ہوں تو بہتر حکمتِ عملی یہی ہے کہ انہیں نظرانداز کر دیا جائے اور یہ ڈھنڈورا پیٹا جائے کہ انگور کھٹے ہیں اور یہ کہ انگور بھی بھلا کوئی کھانے کی چیز ہیں میرا طرزِ عمل بھی لاشعوری طور پر کچھ ایسا ہی تھا۔ خود فریبی کبھی کبھی بڑی مونس اور غم گسار ثابت ہوتی ہے۔

ایاز اور میوس سے پابندی سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ تو کم ہی آتے، لیکن میں پابندی سے جایا کرتا تھا۔ ایاز سے شادی کرنے اور ایک اچھی بیوی کی طرح گھر گرہست زندگی گزارنے کے باوجود میوس کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ چنانچہ اب بھی اکثر یہ ہوتا تھا کہ ایسے مواقع آ جاتے جب مشرقی تہذیب اور برصغیر کے موجودہ حالات پر گرما گرم بحثیں ہوتیں میوس خوب بڑھ چڑھ کر بولتی ہاتھ ہلا ہلا کر زور زور سے کہتی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ وقت کے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ اندھیرے میں رہنے پر کیوں بضد ہو؟ روشنی میں کیوں نہیں آتے؟ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب احمقانہ نظریات اور لایعنی رسموں کے سہارے زندگی گزاری جا سکتی تھی۔ یہ حقیقت کی دنیا ہے اور اب بھی تمہیں اتنا موقع حاصل ہے کہ اپنے تاریک گھروں کے دروازے کھولو اور روشنی اور تازہ ہوا اندر آنے دو۔ ورنہ تمہارے یہاں جو یہ غربت ہے، مسائل ہیں اور اندھے نظریات ہیں یہ ایک دن تمہیں لے ڈوبیں گے اور۔۔۔"

میں جب بھی میوس کی زبان سے ایسی باتیں سنتا تو ڈر سا جاتا اور ہمدردی سے ایاز کو دیکھنے لگتا۔ مجھے ایسا لگتا کہ یہ گاڑی چلنے والی نہیں۔ ایاز اور میوس دونوں کے خیالات میں زمین و آسمان کا فاصلہ ہے۔ محبت کے سوا ان کے درمیان کوئی بات بھی مشترک نہیں اور زندگی صرف محبت کے سہارے نہیں گزرتی جب مزاج کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو اکثر محبت بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے۔ مجھے ڈر لگتا کہ انجام کار میوس اور ایاز کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔ ابھی نئی نئی شادی ہے۔ محبت کا نشہ طاری ہے لہٰذا دونوں درگزر اور رواداری سے کام لیتے ہیں لیکن جب یہ نشہ اترے گا تو شاید کوئی بھی رواداری سے کام نہیں لے گا۔ دونوں کے خیالات اور مزاج کا تضاد دراڑ پیدا کرے گا اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ میرے اس خدشے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی تھی کہ میوس نے شادی کے بعد اپنے روزانہ کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ اب بھی اسکرٹ پہنتی تھی۔ اکثر ڈانس ہال اور پب بھی جایا کرتی تھی۔ گھر میں صرف انگریزی کھانے پکاتی اور ہونٹوں میں لگا کر سگریٹ پیتی تھی حالانکہ میں ایسی کئی انگلش عورتوں کو جانتا تھا جنہوں نے ایشیائی مردوں سے شادی کرنے کے بعد نہ صرف ساڑی یا شلوار قمیص پہننا شروع کر دیا تھا بلکہ اردو یا پنجابی بھی سیکھ لی تھی اور ایشیائی دکان داروں سے سبزی گوشت وغیرہ خریدتے وقت بالکل ایشیائی عورتوں کی طرح کٹ حجتی کرتی تھیں۔

ایک دن میں بلیک برن پہنچا تو ایاز کے گھر میں دو تین دوست پہلے ہی سے موجود تھے۔ میوس بھی تھی اور خاصی دھواں دھار قسم کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ایک صاحب نے اپنی بیٹی کو گولی مار دی تھی۔ یہ صاحب بولٹن میں رہتے تھے۔ ان کے چار بچے تھے،

جن کی پیدائش تو دہلی میں ہی ہوئی تھی، لیکن پلے بڑھے بولٹن میں تھے۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن گولی مارنے کی ضرورت انہیں اس وجہ سے پیش آئی تھی کہ ان کی صاحب زادی نے اچانک شادی کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس میں کوئی بری بات نہیں تھی۔ شادی تو سب ہی کرتے ہیں، مگر خرابی دراصل یہ تھی کہ ان کی صاحب زادی کافی دن سے چوری چھپے عشق فرما رہی تھی اور یہ کہ ان کے بوائے فرینڈ کا تعلق کسی دوسرے فرقے سے تھا۔ جب ان صاحب کے اوپر یہ حقیقت کھلی کہ ان کی ناک کے نیچے یہ سب کچھ ہوتا رہا اور انہیں شبہ تک نہ ہوا تو قدرتی بات ہے کہ انہیں سخت غصہ آیا اور پھر جب ان کی بیوی نے انہیں مزید طیش دلایا کہ "ارے کھڑے کھڑے منہ کیا دیکھتے ہو گولی مار دو اس کم بخت کلموہی کو!" تو انہوں نے واقعی پستول اٹھایا اور گولی چلا دی۔

یہ ایک راز تھا کہ ان صاحب کے پاس پستول کہاں سے آیا مگر غنیمت یہ تھا کہ لڑکی بچ گئی تھی اور رائل انفرمری میں صبر و سکون سے اپنا علاج کرا رہی تھی۔ اس واقعے کی پوری تفصیل اس روز کے مقامی اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اور رپورٹر نے خبر کچھ ایسے انداز میں لکھی تھی کہ پڑھنے والوں کو لڑکی سے شدید ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ بے چاری مظلوم لڑکی، جو ایک جاہل باپ کی عصبیت کا شکار ہو گئی تھی۔ اس بات نے میوس کو بھی متاثر کیا تھا اور اسی بنا پر اس نے گفتگو چھیڑی تھی اور گو ایاز اور دوسرے افراد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بات اس طرح نہیں ہے جس طرح نظر آتی ہے، بلکہ اس کے کچھ اور پہلو بھی ہیں اور ان پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً یہی کہ کیس کو نشلا کی تعلق پیدا نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ فرد کی آزادی کا زمانہ ہے۔ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے برے بھلے کا فیصلہ خود کرے۔ کسی دوسرے کو اس کی زندگی میں روڑا اٹکانے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ لڑکی چونکہ بالغ ہے اور پڑھی لکھی بھی، لہٰذا اسے یہ حق ملنا ہی چاہیے کہ وہ اپنے شریکِ زندگی کا انتخاب خود کرے، اس میں بھلا جرم کی کیا بات ہے؟

میں نے اب تک گفتگو میں کوئی دخل نہیں دیا تھا لیکن جب میوس نے آخری بات کہی تو میں نے زور سے میز پر مکا مار کر کہا، "ہے!"

"کیا ہے؟"

"دراصل تم سمجھو گی نہیں۔" میں نے کہا "تم فرد کی آزادی کی بات کرتی ہو لیکن اس امر پر دھیان نہیں دیتیں کہ انسان کو اگر شترِ بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ ایک ایسی نفسا نفسی اور افراتفری پیدا ہو جائے گی جس کا کوئی علاج ممکن نہ ہو گا۔ اس کے ان گنت نمونے تمہیں یورپ میں جگہ جگہ دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔" میں نے رک کر سانس لی۔ "کبھی تم قبرستان گئی ہو؟"

"ہاں۔ کیوں؟" میوس حیرت سے بولی۔

"تم نے دیکھا ہو گا کہ تمہارے یہاں کے قبرستان بہت صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک خاص حسن، ترتیب اور سلیقہ ہوتا ہے۔ اب یہ تعجب کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ تم لوگ اپنے قبرستانوں میں تو ترتیب اور نظم کے قائل ہو لیکن معاشرے کو جنگل کے جھاڑ جھنکار کی طرح کھلا چھوڑنا چاہتے ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں معاشرے کا حشر بھی وہی ہو گا جو جھاڑ جھنکار کا ہوتا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ معاشرے میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے کچھ اصول اور قواعد بنائے جائیں اور ... "

"کیا بکواس کرتے ہو" میوس نے بات کاٹ کر کہا "یہ سب بکواس ہے، اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ خود غرض ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم لوگ عورتوں پر اپنی برتری ہر حال میں قائم رکھنا چاہتے ہو اور اس مقصد کے لیے تہذیب و تمدن کے نام پر طرح طرح کی لولی لنگڑی تاویلیں تلاش کرتے ہو۔"

"حد ہو گئی! کیا واہیات بات ہے!" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

یہ آخری بحث تھی جو میوس سے ہوئی۔

اس کے بعد پھر ایسا موقع نہیں آیا، کیونکہ چند ماہ کے بعد کچھ عجیب اور غیر متوقع اتفاقات پیش آئے جن کے نتیجے میں ایک طرف تو مجھے پریسٹن چھوڑ کر اپنے دوست جمیل الزماں قادری کے پاس چارلے جانا پڑا۔ دوسری طرف ایسٹر کی چھٹیوں میں ایاز لندن گیا تو اسے وہاں ایک زیادہ بہتر ملازمت مل گئی چنانچہ اس نے بھی بلیک برن کو خیرباد کہہ دیا۔ اب ہمارے درمیان ڈھائی سو میل سے زیادہ کا فاصلہ حائل تھا۔ ملنے ملانے میں پہلے بھی کچھ ایسی گرم جوشی نہیں تھی۔ اب جو دوری پیدا ہوئی تو ملاقات کا سلسلہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ بس کبھی کبھار یہ ہوتا کہ چھٹیوں میں ہم لندن

چلا گیا یا ایاز ہمارے آ گیا۔ رفتہ رفتہ اس میں بھی کمی آ گئی۔ یہی حال خط و کتابت کا ہوا۔ پہلے خاصی باقاعدگی تھی، پھر لمبے لمبے وقفے پڑنے لگے۔ فون کا سہارا صرف اسی صورت میں لیا جاتا جب کوئی فوری ضرورت پیش ہوتی۔ ربط و تعلق میں کمی کے باوجود مجھے تمام اہم باتوں کی اطلاع بہرحال مل جایا کرتی تھی مثلاً جب ایاز کے یہاں پہلی بچی نغمیہ اور پھر دونوں لڑکوں طارق اور راشد کی پیدائش ہوئی۔ اسی طرح جب انہوں نے اپنا ذاتی مکان خریدا۔ یا پھر جب ایاز پہلی بار میوس اور بچوں کو لے کر احمد پور گیا تو مجھے اطلاع مل گئی مجھے ان باتوں سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ کہ میرے ذہن میں شک و شبہ بدستور موجود تھا۔ ڈر لگا رہتا تھا کہ محبت اور رواداری کے جس کچے دھاگے سے دونوں بندھے ہوئے ہیں وہ ایک دن انجام کار ٹوٹ جائے گا۔ اور دونوں اپنے اپنے راستوں پر چل پڑیں گے اس خوف کی بنیاد یہ تھی کہ میں نے اس قسم کی کئی شادیوں کو ناکام ہوتے ہوئے دیکھا تھا یورپ کے آزاد ماحول کی پروردہ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے، لیکن اپنی آزادی میں کسی کی دخل اندازی گوارا نہیں کرتی۔ میں سوچتا تھا کہ ابھی چند سال اور شاید دونوں میں نبھ جائے، لیکن جب بچے بڑے ہوں گے تو اختلافات کا پیدا ہونا لازمی ہے کیوں کہ ایاز ان کی تعلیم و تربیت اپنی منشا کے مطابق کرنا چاہے گا، جب کہ میوس انہیں اپنے راستے پر چلانے کی خواہش مند ہوگی، اور نتیجہ اس صورت میں صرف ایک ہی ہوگا، یعنی جو تم بیزار۔

مگر یہ صورتِ حال تو چند سال کے بعد پیش آنے والی تھی ابھی تو وہ دونوں بہت بہت خوش تھے اور محبت سے رہ رہے تھے۔ اور میرے لئے وقتی طور پر ہی سہی یہ بہرحال خوشی کی بات تھی۔

اگلے چار پانچ سال میں میوس دو بار اور احمد پور گئی اور دونوں بار ایاز اس کے ساتھ نہیں تھا۔ دوسری بار جب وہ گئی تو ایک سال سے زیادہ اس نے گاؤں میں گزارا۔ جمیل الزماں قادری بھی میرے ہی گاؤں کا ہے۔ اس کے بھائی کے خط پابندی سے آیا کرتے تھے، جن میں اکثر میوس کا ذکر بھی ہوتا۔ اس کے خطوط سے کئی بار میوس کے بارے میں خاصی دلچسپ اور عجیب اطلاعات ملیں۔ مثلاً یہ کہ میوس بڑے ٹھاٹ سے گاؤں میں رہتی ہے باغات کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اس کا کافی وقت کھیتوں میں بھی گزرتا ہے۔ یعنی گاؤں کی دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی اپنے کھیتوں میں اپنے سسر اور ملازموں کے ساتھ باقاعدگی سے کام کرتی ہے۔ فصل کی دیکھ بھال کرنا، پانی دینا اور دوائیں وغیرہ چھڑکنا۔ جب پہلی بار یہ باتیں میرے علم میں آئیں تو قدرتی بات ہے کہ مجھے اچنبھا ہوا۔ یہ خاصی غیر متوقع بات تھی میوس کی شخصیت کا یہ ایک ایسا روپ تھا جو پہلی بار میرے علم میں آیا تھا حالانکہ جمیل کے بھائی کے بیان کے مطابق کسی نے میوس سے اس قسم کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے بالکل نہیں کہا تھا۔ ایاز کے ماں باپ اور بہن تو اس کا بڑا مان کرتے تھے۔ کچھ اس طرح رات دن خدمت میں لگے رہتے تھے گویا وہ کوئی شہزادی ہو اور شروع میں اس کا رویہ تھا بھی کچھ شہزادیوں ہی جیسا۔ لیکن دھیرے دھیرے وہ خود ہی دلچسپی لینے لگی پہلے گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا شروع کیا پھر کھیتوں میں جا پہنچی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے گاؤں کا ماحول اور کھلی فضا اور کھیتوں کا فطری حسن بہت بھا گیا تھا اور اس نے اپنی ذات کا وہ رخ جو خود اس سے مخفی تھا دریافت کر لیا تھا، ورنہ تو وہ پھولوں کے پودے اپنے ہاتھ سے لگاتی نہ کھیتوں کی دیکھ بھال کرتی اور نہ ایک سال سے زیادہ عرصہ وہاں گزارتی۔ وجہ کچھ بھی ہو یہ اطلاع اگر ایک طرف میرے لئے تعجب خیز تھی تو دوسری طرف اس میں میرے لئے ایک سنسنی خیز قسم کی مسرت بھی تھی۔ باوجود اس کے کہ میں میوس کے اس نئے روپ کی کوئی عقلی توجیہ کرنے سے قاصر تھا۔

جب ایاز اور میوس کی شادی ہوئی تھی اس وقت مجھے انگلینڈ آئے ہوئے کوئی دو سال ہوئے تھے۔ اب سولہ برس گزر چکے ہیں اس تمام عرصے میں ایک بار بھی وطن نہیں گیا اس میں کچھ تو میری کاہلی کو دخل تھا اور کچھ دوسری وجوہ بھی تھیں۔ لیکن اس سال جب گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو جمیل الزماں قادری کے اکسانے پر میں نے بھی گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے سوچا، بے شک میں اکیلا ہوں ماں باپ اللہ کو پیارے ہوئے، گاؤں میں اب ایسا کوئی نہیں جسے میری ذرا بھی پروا ہو، لیکن گاؤں تو ہے۔ وہاں وہ گلیاں اور کھیت اور باغات اور ندی کا کنارہ تو ہے جن کی خوشبو آج تک میری سانسوں میں بسی ہوئی ہے اور وہ بھی ضرور مجھے یاد کرتے ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں نے بوریا بستر باندھا ٹکٹ کٹایا اور

جن کو یہ تشویش تو دل میں ہی ہوئی تھی لیکن
پہلے بڑے بڑائی میں تھے۔ بظاہر سب کچھ
ٹھیک ٹھاک تھا لیکن گولی مارنے کی ضرورت
انہیں اس وجہ سے پیش آئی تھی کہ ان کی
صاحب زادی نے اچانک شادی کرنے کا
ارادہ کرلیا تھا۔ اس میں کوئی بری بات نہیں تھی۔
شادی تو سب ہی کرتے ہیں مگر خرابی دراصل
یہ تھی کہ ان کی صاحب زادی کافی دن سے چوری
چھپے عشق فرما رہی تھی اور یہ کہ اس کے بوائے فرینڈ
کا تعلق کسی دوسرے فرقے سے تھا جب ان
صاحب کے اوپر یہ حقیقت کھلی کہ ان کی ناک
کے نیچے یہ سب کچھ ہوتا رہا اور انہیں شبہ تک
نہ ہوا تو قدرتی بات ہے کہ انہیں سخت غصہ آیا
اور پھر جب ان کی بیوی نے انہیں مزید طیش
دلایا کہ "ارے کھڑے کھڑے منہ کیا دیکھتے
ہو گولی مار دو اس کم بخت کلموہی کو" تو انہوں نے
واقعی پستول اٹھایا اور گولی چلا دی۔

یہ ایک راز تھا کہ ان صاحب کے
پاس پستول کہاں سے آیا مگر غنیمت یہ تھا
کہ لڑکی بچ گئی تھی اور رائل انفرمری میں صبر و سکون
سے اپنا علاج کرا رہی تھی۔ اس واقعے کی پوری
تفصیل اس روز کے مقامی اخبار میں شائع ہوئی
تھی۔ اور رپورٹر نے خبر کچھ ایسے انداز میں لکھی تھی
کہ پڑھنے والوں کو لڑکی سے شدید ہمدردی
محسوس ہوتی تھی۔ بے چاری مظلوم لڑکی، جو
ایک جاہل باپ کی عصبیت کا شکار ہو گئی تھی
اس بات نے میوس کو بھی متاثر کیا تھا اور اسی
لیے اس نے گفتگو چھیڑی تھی اور گو ایاز اور
دوسرے افراد نے اسے سمجھانے کی کوشش
کی کہ بات اس طرح نہیں ہے جس طرح نظر آتی
ہے، بلکہ اس کے کچھ اور پہلو بھی ہیں اور ان پر غور
کرنا بھی ضروری ہے۔ [illegible] میوس
کو شادی کے تعلق پر [illegible] تھی۔ اس کا کہنا تھا
کہ ہر فرد کی آزادی کا زمانہ ہے ہر انسان کو یہ
حق حاصل ہے کہ وہ اپنے برے بھلے کا فیصلہ
خود کرے کسی دوسرے کو اس کی زندگی میں
روڑا اٹکانے کا اختیار نہیں ہونا چاہئے۔ لڑکی
چونکہ بالغ ہے اور پڑھی لکھی بھی، لہٰذا اسے یہ
حق ملنا ہی چاہئے کہ وہ اپنے شریکِ زندگی کا
انتخاب خود کرے، اس میں بھلا جرم کی کیا
بات ہے؟

میں نے اب تک گفتگو میں کوئی دخل
نہیں دیا تھا لیکن جب میوس نے آخری بات
کہی تو میں نے زور سے میز پر مکا مار کر کہا،
"ہے!"

"کیا ہے؟"

"دراصل تم سمجھو گی نہیں۔" میں نے کہا
"تم فرد کی آزادی کی بات کرتی ہو لیکن اس
امر پر دھیان نہیں دیتیں کہ انسان کو اگر شتر بے مہار
کی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کا کیا نتیجہ
نکلے گا۔ ایک ایسی نفسا نفسی اور افراتفری پیدا
ہو جائے گی جس کا کوئی علاج ممکن نہ ہوگا۔ اس
کے ان گنت نمونے تمہیں یورپ میں جگہ جگہ
دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔" میں نے رک کر سانس
لی۔ "کبھی تم قبرستان گئی ہو؟"

"ہاں۔ کیوں؟" میوس حیرت سے
بولی۔

"تم نے دیکھا ہوگا کہ تمہارے یہاں
کے قبرستان بہت صاف ستھرے ہوتے
ہیں۔ ان میں ایک خاص حسن، ترتیب اور
سلیقہ ہوتا ہے۔ اب یہ تعجب کی بات نہیں تو
اور کیا ہے کہ تم لوگ اپنے قبرستانوں میں تو ترتیب
[illegible] جس کے
[illegible] چاہتے ہو۔
ظاہر ہے کہ اس صورت میں معاشرہ منتشر
بھی ہو جائے گا [illegible] جنگل کا ہوتا ہے
لہٰذا یہ ضروری ہے کہ معاشرے میں نظم و ضبط
قائم رکھنے کے لئے کچھ اصول اور قاعدے بنائے
جائیں اور ..."

"کیا بکواس کرتے ہو"، میوس نے بات
کاٹ کر کہا۔ "یہ سب بکواس ہے، اصل بات
یہ ہے کہ تم لوگ خود غرض ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم لوگ عورتوں پر اپنی
برتری ہر حال میں قائم رکھنا چاہتے ہو اور اس مقصد
کے لئے تہذیب و تمدن کے نام پر طرح طرح
کی لولی لنگڑی تاویلیں تلاش کرتے ہو۔"

"مصیبت ہوگئی! کیا واہیات بات ہے!"
میں نے جھنجھلا کر کہا

یہ آخری بحث تھی جو میوس سے ہوئی۔
اس کے بعد پھر ایسا موقع نہیں آیا کیونکہ چند
ماہ کے بعد کچھ عجیب اور غیر متوقع اتفاقات
پیش آئے جن کے نتیجے میں ایک طرف تو
مجھے پریسٹن چھوڑ کر اپنے دوست جمیل الزماں
قادری کے پاس [illegible] پڑا۔ دوسری
طرف ایسٹر کی چھٹیوں میں ایاز لندن گیا تو اسے
وہاں ایک زیادہ بہتر ملازمت مل گئی چنانچہ
اس نے بھی بلیک برن کو خیرباد کہہ دیا۔ اب ہمارے
درمیان ڈھائی سو میل سے زیادہ کا فاصلہ
حائل تھا۔ ملنے ملانے میں پہلے بھی کچھ ایسی
گرم جوشی نہیں تھی۔ اب جو دوری پیدا ہوئی تو
ملاقات کا سلسلہ نہ ہونے کے برابر ہو گیا۔
بس کبھی کبھار یہ ہوتا کہ چھٹیوں میں میں لندن

چلا گیا یا ایاز ہمارے آ گیا۔ رفتہ رفتہ اس میں بھی کمی آ گئی۔ یہی حال خط و کتابت کا ہوا۔ پہلے خاصی باقاعدگی تھی، پھر لمبے لمبے وقفے پڑنے لگے۔ فون کا سہارا صرف اسی صورت میں لیا جاتا جب کوئی فوری ضرورت پیش ہوتی۔ ربط و تعلق میں کمی کے باوجود مجھے تمام اہم باتوں کی اطلاع بہرحال مل جایا کرتی تھی مثلاً جب ایاز کے یہاں پہلی بچی نفیسہ اور پھر دونوں لڑکوں طارق اور راشد کی پیدائش ہوئی۔ اسی طرح جب انہوں نے اپنا ذاتی مکان خریدا۔ یا پھر جب ایاز پہلی بار میوس اور بچوں کو لے کر احمد پور گیا تو مجھے اطلاع مل گئی مجھے ان باتوں سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ کہ میرے ذہن میں شک و شبہ بدستور موجود تھا۔ ڈر لگا رہتا تھا کہ محبت اور رواداری کے جس کچے دھاگے سے دونوں بندھے ہوئے ہیں وہ ایک دن انجام کار ٹوٹ جائے گا۔ اور دونوں اپنے اپنے راستوں پر چل پڑیں گے اس خوف کی بنیاد یہ تھی کہ میں نے اس قسم کی کئی شادیوں کو ناکام ہوتے ہوئے دیکھا تھا یورپ کے آزاد ماحول کی پروردہ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے، لیکن اپنی آزادی میں کسی کی دخل اندازی گوارا نہیں کرتی۔ میں سوچتا تھا کہ ابھی چند سال اور شاید دونوں میں نبھ جائے، لیکن جب بچے بڑے ہوں گے تو اختلافات کا پیدا ہونا لازمی ہے، کیوں کہ ایاز ان کی تعلیم و تربیت اپنی منشا کے مطابق کرنا چاہے گا، جب کہ میوس انہیں اپنے راستے پر چلانے کی خواہش مند ہوگی۔ اور نتیجہ اس صورت میں صرف ایک ہی ہوگا، یعنی جوتم پیزار۔

مگر یہ صورتِ حال تو چند سال کے بعد پیش آنے والی تھی ابھی تو وہ دونوں بہت بہت خوش تھے اور محبت سے رہ رہے تھے۔ اور میرے لئے وقتی طور پر ہی سہی یہ بہرحال خوشی کی بات تھی۔

اگلے چار پانچ سال میں میوس دو بار احمد پور گئی اور دونوں بار ایاز اس کے ساتھ نہیں تھا۔ دوسری بار جب وہ گئی تو ایک سال سے زیادہ اس نے گاؤں میں گزارا۔ جمیل الزماں قادری بھی میرے ہی گاؤں کا ہے۔ اس کے بھائی کے خط پابندی سے آیا کرتے تھے، جن میں اکثر میوس کا ذکر بھی ہوتا۔ اس کے خطوط سے کئی بار میوس کے بارے میں خاصی دلچسپ اور عجیب اطلاعات ملیں۔ مثلاً یہ کہ میوس بڑے ٹھاٹ سے گاؤں میں رہتی ہے باغات کی دیکھ بھال کرتی ہے اور اس کا کافی وقت کھیتوں میں بھی گزرتا ہے یعنی گاؤں کی دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی اپنے کھیتوں میں اپنے سسر اور ملازموں کے ساتھ باقاعدگی سے کام کرتی ہے۔ فصل کی دیکھ بھال کرنا، پانی دینا اور دوائیں وغیرہ چھڑکنا۔ جب پہلی بار یہ باتیں میرے علم میں آئیں تو قدرتی بات ہے کہ مجھے اچنبھا ہوا۔ یہ خاصی غیر متوقع بات تھی میوس کی شخصیت کا یہ ایک ایسا روپ تھا جو پہلی بار میرے علم میں آیا تھا حالانکہ جمیل کے بھائی کے بیان کے مطابق کسی نے میوس سے اس قسم کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے بالکل نہیں کہا تھا۔ ایاز کے ماں باپ اور بہن تو اس کا بڑا مان کرتے تھے۔ کچھ اس طرح رات دن خدمت میں لگے رہتے تھے گویا وہ کوئی شہزادی ہو اور شروع میں اس کا رویہ تھا بھی کچھ شہزادیوں ہی جیسا لیکن دھیرے دھیرے وہ خود ہی دلچسپی لینے لگی پہلے گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا شروع کیا پھر کھیتوں میں جا پہنچی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے گاؤں کا ماحول اور کھلی فضا اور کھیتوں کا فطری حسن بہت بھا گیا تھا اور اس نے اپنی ذات کا وہ رخ جو خود اس سے مخفی تھا دریافت کر لیا تھا، ورنہ تو وہ پھولوں کے پودے اپنے ہاتھ سے لگاتی نہ کھیتوں کی دیکھ بھال کرتی اور نہ ایک سال سے زیادہ عرصہ وہاں گزارتی۔ وجہ کچھ بھی ہو یہ اطلاع اگر ایک طرف میرے لئے تعجب خیز تھی تو دوسری طرف اس میں میرے لئے ایک سنسنی خیز قسم کی مسرت بھی تھی۔ باوجود اس کے کہ میں میوس کے اس نئے روپ کی کوئی عقلی توجیہ کرنے سے قاصر تھا۔

جب ایاز اور میوس کی شادی ہوئی تھی اس وقت مجھے انگلینڈ آئے ہوئے کوئی دو سال ہوئے تھے۔ اب سولہ برس گزر چکے ہیں اس تمام عرصے میں ایک بار بھی وطن نہیں گیا اس میں کچھ تو میری کاہلی کو دخل تھا اور کچھ دوسری وجوہ بھی تھیں۔ لیکن اس سال جب گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو جمیل الزماں قادری کے اکسانے پر میں نے بھی گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے سوچا بے شک میں اکیلا ہوں ماں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے، گاؤں میں اب ایسا کوئی نہیں جسے میری ذرا بھی پروا ہو، لیکن گاؤں تو ہے۔ وہاں وہ گلیاں اور کھیت اور باغات اور ندی کا کنارہ تو ہے جن کی خوشبو آج تک میری سانسوں میں بسی ہوئی ہے اور وہ بھی ضرور مجھے یاد کرتے ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں نے بوریا بستر باندھا ٹکٹ کٹایا اور

...بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی
اور سڑکیں بھیگی ہوئی تھیں کیونکہ تھوڑی
دیر پہلے بارش ہونے لگی تھی۔ میں نے
...کیس پائیدان پر رکھا اور بادامی رنگ
کے دروازے کا بٹن دبایا اور ایک منٹ انتظار
کیا۔ پھر دروازہ کھلا اور میوس نظر آئی۔ اس نے
ایک خوشی سے قریب قریب چیخ کر کہا۔
ارے تم! آؤ اندر آؤ۔

جب ہم اطمینان سے صوفوں پر بیٹھ گئے
میں نے ذرا اچنبھے سے میوس کا جائزہ لیا۔
...ئیس سال ہوئے پچھلی بار اسے دیکھا تھا ان
...تین برسوں میں وہ خاصی بدل گئی تھی۔ اب
اس کا جسم قدرے بھر گیا تھا اور وہ پہلے کے
مقابلے میں زیادہ خوب صورت، باوقار اور شائستہ
نظر آئی۔ اسکرٹ اور بلاؤز کی بجائے اس نے پیازی
رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھا تھا سر پر دوپٹہ
بھی قرینے سے پڑا تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ
اب اس نے اردو، پنجابی بھی خاصی سیکھ لی تھی
اور انگلش لہجے میں اردو بولتے ہوئے بہت
بھلی لگتی تھی۔ جب میں نے اس کے لباس کی
تعریف کی تو ہنس کر کہنے لگی۔

"بہت آرام ملتا ہے اس میں۔ اب تو
گھر میں یہی پہنتی ہوں۔ ہاں، باہر جاتے وقت
ٹرائوزر چڑھا لیتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"ارے اس لباس میں باہر جاتی ہوں تو
کم بخت، بے وقوف لوگ اس طرح گھورنے
... وہ ہنسنے لگی۔

میں نے جیب سے ... نکالا اور
اس سے سگریٹ کے لئے پوچھا لیکن اس
نے انکار کر دیا۔ کہنے لگی "میں تو کافی دن ہوئے
چھوڑ چکی ہوں۔"

یہ سن کر مجھے تعجب ہوا لیکن میں نے
کچھ کہا نہیں۔ ایک سگریٹ جلائی، پھر پوچھا
"سب لوگ کہاں ہیں؟"

"ایاز تو کام پر گئے ہیں۔" وہ بڑے
سکون سے کہنے لگی "طارق اور راشد اسکول
گئے ہیں۔ ابھی ان کی سالانہ چھٹیاں نہیں ہوئی
ہیں۔"

"اور نفیسہ؟"

میوس چند لمحے چپ رہی پھر بولی "اسے
تو میں نے پچھلے مہینے احمد پور بھیج دیا ہے۔ اب
وہ چار پانچ سال وہیں اپنے دادا دادی کے پاس
رہے گی اور وہیں پڑھے گی۔"

"اچھا، کیوں؟" میں نے چونک کر
حیرت سے پوچھا۔

میوس نے جواب دینے میں ایک بار
پھر تامل کیا، کچھ دیر خاموش رہی، پھر
ہنسنے لگی۔ کچھ عجیب سی ہنسی تھی کہ اس میں ایک
قسم کی پشیمانی کا عکس بھی شامل تھا۔ پھر وہ
کہنے لگی "تو میں کیا کرتی؟ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ تم
تو جانتے ہو کہ یہاں کا ماحول کتنا خراب ہے
یہاں لڑکیوں کو بگڑتے ذرا دیر نہیں لگتی خاص
طور پر لڑکیوں کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے
ایک بار غلط راستے پر چل نکلیں تو پھر کوئی
انہیں نہیں روک سکتا۔ بدقسمتی سے نفیسہ کے
ساتھ بھی کچھ یہی صورت تھی۔ ایک روز میں
... واپس آ رہی تھی تو میں نے نفیسہ کو
... حالانکہ اس وقت اسے اسکول میں ہونا
چاہیے تھا مگر وہ ایک بند دکان کے سائبان
کے نیچے ایک لڑکے کے ساتھ کھڑی منہ سے منہ ملائے
سگریٹ پی رہی تھی۔ میں حیران رہ گئی۔ بارہ سال
لڑکی اور کنگ سائز سگریٹ۔ ابھی میں گم صم
سی کھڑی تھی کہ یکایک لڑکے نے نفیسہ کی کمر
میں ہاتھ ڈال کر اسے کھینچا اور پھر دونوں ایک
دوسرے کو رومیو جولیٹ کی طرح چومنے لگے۔"
میوس ایک لمحے کے لئے رکی، پھر مسکرا کر بولی
"بعد میں جب میں نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہ
سگریٹ بھی چرس کی تھی۔ اب تم ہی بتاؤ
اس صورت میں کیا کرتی؟ یہاں اس کی دیکھ
بھال تو مشکل تھی۔ لہٰذا میں نے ایاز سے کہہ کر
اسے احمد پور بھجوا دیا۔ وہاں اپنے دادا دادی کے
پاس رہے گی تو کوئی خدشہ نہیں رہے گا پھر
یہ بھی ہے کہ وہاں وہ ادب و آداب اور تمیز و تہذیب
سیکھے گی۔ یہاں یہ سب باتیں اسے کون سکھاتا۔"

"یہ واقعی عجیب بات ہے۔" یہ جملہ میں نے
کچھ اس طرح کہا جیسے مجھے معلوم نہ ہو کہ کیا کہوں۔
میوس نے قدرے رک کر کہا۔
"ایاز کو میں نے سگریٹ اور بوسے بازی والی
بات نہیں بتائی تھی تم بھی ذکر نہ کرنا ورنہ انہیں
تردد ہوگا۔" یہ کہتے کہتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی
"تم آرام سے بیٹھو، میں تمہارے لئے چائے
بناتی ہوں۔"

وہ کچن میں چلی گئی۔ میں نے دھیان سے
سے دریچے سے باہر دیکھا۔ بادل یکایک چھٹ گئے
سورج نکل آیا تھا اور ہر طرف سنہرا چمکیلا
اجالا رفتہ رفتہ پھیلتا جا رہا تھا۔

■■

ملکہ خورشید

اللہ!

لمبے چوڑے برآمدے میں سہری کفن اوڑھے ہوئے جو لاش پڑی ہے، وہ ایک چالیس سالہ مرد کی میت ہے۔ سب مرد باہر چلے گئے ہیں، اور جنازہ اندر عورتوں کے دیدار کے لیے رکھا ہوا ہے۔ سسکیوں اور آہوں سے فضا میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔

دو عورتیں ایک کو پکڑے ہوئے میت کے قریب لاتی ہیں، یہ جنازہ اس کے بیٹے کا ہے۔ تقریباً ستر سالہ بوڑھی عورت کی آنکھوں پر کبھی نہ چھٹنے والی دھند چھا گئی۔ نحیف جسم میں رعشہ دور سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ فضا میں کچھ تلاش کرنے کے انداز میں غیر شعوری حرکت کر رہے ہیں۔ شاید وہ اپنا عصا ڈھونڈ رہی ہے۔ عورتوں نے ضعیفہ کو میت کے سرہانے بٹھا دیا ہے اور دونوں طرف سے اُسے پکڑے ہوئے ہیں۔ بینائی سے محروم آنکھیں، جھریوں سے بھرا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے، وہ دونوں ہاتھوں سے ٹٹول کر بیٹے کا لمس محسوس کرتی اس کے سینے پر ہاتھ پھیرتی ہے گالوں کو سہلاتی ہے، پیشانی، ہونٹ، آنکھوں سب کا لطیف وہ اپنی انگلیوں میں محفوظ کر لینا چاہتی ہے۔ زیرِ لب بڑبڑاتی بھی جا رہی ہے "روٹھ گیا ہے پگلے! آنکھیں کھول اماں سے بھی کوئی روٹھتا ہے؟ مگر تو تو ضدی ہے بچپن کا میں جانتی ہوں آنکھیں نہیں کھولے گا۔ ہٹیلا کہیں کا۔ عورتوں میں ہچکیوں اور سسکیوں کی آوازیں تیز ہو جاتی ہیں۔

ایک جوان العمر عورت میت کے قریب آئی بلکہ لائی گئی ہے۔ پاگلوں کی طرح چیخ رہی ہے پچھاڑیں کھا رہی ہے۔ کئی عورتوں نے اسے سنبھال رکھا ہے اسے کپڑوں کا ہوش نہیں، بالوں میں خاک پڑی ہے گداز کلائیاں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نشتر سے لہولہان ہیں۔

یہ مرنے والے کی بیوی ہے۔

اس کی نگاہوں میں اندھیرا ابھر گیا ہے جس اندھیرے میں اس کے شوہر کا لمحہ لمحہ معدوم ہوتا ہوا روشن ہیولا ہے۔ شدتِ غم سے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے ہیں۔ وہ اپنے مردہ شوہر سے یا شاید خدا سے پوچھنا چاہتی ہے کہ اب وہ کیسے جئے گی۔ زندگی کی گاڑی کو اب کون کھینچے گا۔ اس کے ہونٹوں پر الفاظ ٹوٹ پھوٹ جا رہے ہیں۔ اچانک وہ اپنے قریب کھڑی ہوئی نو سالہ بیٹی کو کھینچ کر زور سے بھینچ لیتی ہے ——— گڈی تیرے ابا..... گڈی گھبرا کر اور بھی زور زور سے رونے لگتی ہے اور وہ عورت نڈھال ہو کر گرنے لگتی ہے۔

نو سالہ بچی بے ہوش ماں کے پہلو سے لگی بلک رہی ہے۔ سات برس اور پانچ برس کی دو بچیاں باپ کے آخری دیدار کے لیے میت کے قریب لائی گئی ہیں۔ الجھے بال، سوجی آنکھیں، خشک لب، آنسوؤں سے دھندلائی نظروں سے وہ باپ کے شفیق چہرے کو تک رہی ہیں۔ باپ کی محبت پاس آنکھیں آج بند ہیں بچیوں کی زبان سے صرف "ابا ابا" کی تکرار نکلتی ہے وہ اپنے ابا کو جگانا چاہتی ہیں کہ انھوں نے ابا کو ہمیشہ جاگتے، بولتے، ہنستے دیکھا تھا۔

تین سال کا ایک گول مٹول سا بچہ صحن کے ایک گوشے میں گیلی مٹی سے کھیلنے میں مصروف ہے زور سے رونے اور چیخنے کی آواز سن کر عورتوں کی

دیکھتا ہے اور پھر اپنے کھیل میں مشغول ہوجاتا ہے۔ برآمدے میں ایک طرف چوکی پر پانچ چھ ماہ کا ایک خوب صورت بچہ منہ میں نپل لیے زور زور سے ہاتھ پاؤں کلکاریاں مار رہا ہے۔ غالباً وہ تقدیر کے اس مذاق پر ہنس رہا ہے یا شاید کاتبِ تقدیر سے احتجاج کر رہا ہے۔ بچے کی غوں غاں اور چوکی پر اس کے ایڑیاں پٹکنے کی آوازیں اس ماحول میں غیر مانوس سی لگتی ہیں۔

یہ مرحوم کے پانچ بچے ہیں۔

"دیر ہو رہی ہے۔ پردہ کرلو۔" باہر سے کوئی آواز دیتا ہے۔ عورتیں سمٹ کر برآمدے میں پردے کے پیچھے چلی جاتی ہیں۔ مرد صحن میں آجاتے ہیں اور اٹھا کر چل دیتے ہیں۔

جنازہ باہر جاتے دیکھ کر بیوہ ایک دلدوز چیخ مارتی ہے "اللہ!——" اس آواز میں اتنا کرب اتنا بھولا کی بجے کہ ساری عورتیں زور سے رو پڑتی ہیں۔ اچانک وہ عورت اپنا سر دیوار پر پٹکنے لگتی ہے۔ عورتیں اسے پکڑتی ہیں لیکن بیوہ کی پیشانی خون آلود ہوگئی ہے۔

لوگ جنازہ دفن کرکے آگئے ہیں۔

بیوہ عورت اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو دیکھ کر پھر بے قرار ہو کر رُو پڑتی ہے۔ زمین پر اس کا واحد سہارا، اس کے سر کا سائبان گر گیا تھا۔ اس کی تڑپ پر ہر آنکھ نم تھی۔

بھیّا، اب میں کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟ بچوں کو لے کر۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی ہتھیلیوں پر اپنا زخمی چہرہ رکھ کر رُو پڑتی ہے۔ بھائی خود بھی رو پڑتا ہے۔ "ایسا نہ کہو حلیمہ، یہ بچے میرے جگر پارے ہیں۔ تمہارے تو چار بھائی ہیں، تم ہلکان کیوں ہوتی ہو۔ صبر کرو بہن۔"

بیوہ کے بھائیوں نے یتیم بچوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا ہے۔ گویا وہ زمانے کے حوادث سے ان بچوں کو محفوظ رکھنے کا عہد کر رہے ہوں۔ لیکن مرحوم کی ماں جانتی ہے کہ اس کی بیوہ بہو کے یہ الفاظ اور یہ ارادے وقتی ہمدردی اور رحم کے جذبوں کی دین ہیں وہ خود بھی پینتیس سال پہلے اس آگ میں جلی تھی اس کے بھائیوں کے کئے ہوئے ایسے ہی وعدے سوکھے تنکوں کی طرح چرمرا کر ٹوٹ گئے تھے۔ اس نے اپنے چار بچوں کے ساتھ جس طرح تڑپ تڑپ کر ترس ترس کر زندگی کا سفر طے کیا تھا، یہ وہی جانتی تھی اس کے بھائیوں کی محبت اور جذبہ پاسبانی بہت جلد دم توڑ گئے تھے۔ آج تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے ضعیفہ تصور میں بہو کا مطمئن چہرہ دیکھ رہی ہے لیکن وہ خوب جانتی ہے کہ اس ہمدردی، رحم اور غمگساری کے جذبے کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے۔ ( )

برسات میں پیاز گھر میں رکھنے سے اُگ آتی ہے اور خراب ہوجاتی ہے۔ اس سے بچنے کے لئے پیاز کے مُونہہ کو گرم توے پر جلا کر اسٹور کریں۔

●

آنکھوں میں آنسو لانے والے پانی کو کم کرنے کے لئے پیاز کو کاٹنے سے پہلے فریج میں رکھیں یا پیاز کے دو ٹکڑے کرکے ایک بار پانی سے دھولیں۔

●

چقندر کو سُرخ رکھنے کے لئے انہیں دو انچ لمبے ڈنٹھلوں کے ساتھ اُبالیں۔ سلاد میں ملانے کے لئے چقندروں کو اُبالنے سے پہلے چھیلا جائے۔

●

سلاد کو فریج میں زیادہ دیر تک تازہ رکھنے کے لئے سلاد کی ٹرے کو توجہ سے ڈھک دیں۔

●

اجوائن آسانی کے ساتھ گھروں میں گملوں میں اُگایا جاسکتا ہے۔ اس کے پتوں کو سکھا کر رکھ لیں اور سوپ، اسٹو، سلاد وغیرہ میں استعمال کریں۔ اسی طرح پودینہ کے پتے بھی سکھا کر رکھے جاسکتے ہیں۔

●

فصل کے موقع پر ٹماٹر کے ٹکڑے کرکے سُکھا کر رکھ لیں اور جب ٹماٹر نہ مل رہے ہوں یا مہنگے ہوں تو استعمال کریں۔ سوکھے ٹماٹروں کو بند ڈبے میں رکھیں۔ اور کبھی کبھی دُھوپ دکھا دیا کریں۔

طلاق کے بعد عورت کے حقوق

انیس سہروردی

ملک کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ کی پانچ ججوں پر مشتمل بنچ نے حال ہی میں ایک اپیل محمد احمد خاں بنام شاہ بانو کو مسترد کرتے ہوئے جو فیصلہ دیا ہے، وہ اس وقت سارے ملک میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ عورتوں کی تنظیمیں (جن میں بعض مسلم خواتین بھی شامل ہیں) اس فیصلے کی تائید کر رہی ہیں، لیکن علماء کرام اور مسلم تنظیمیں اس فیصلے کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت قرار دے کر اس کے خلاف ملک گیر سطح پر احتجاج کر رہی ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس فیصلے کے قانونی اور سماجی پہلو کو سمجھے بغیر اس کو جذباتی انداز میں دیکھا جا رہا ہے۔ بہرحال جب تک موجودہ قوانین میں کوئی ایسی ترمیم نہیں ہوتی جو سپریم کورٹ کے فیصلے کو بے اثر بنا دے اس وقت تک یہ فیصلہ اپنی جگہ پر ہے۔ اور وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کی ستائی ہوئی ہیں، اپنے گزارے یا نفقہ کے لئے مجسٹریٹ کے سامنے درخواست دے سکتی ہیں۔ اگر ان کی درخواست قانون میں موجود شرطوں کو پورا کرتی ہے تو سپریم کورٹ کے فیصلے کو نظیر اور سند مان کر عدالت ان کے حق میں فیصلہ کرے گی۔

سپریم کورٹ کے اس حالیہ فیصلہ میں کوئی نئی بات نہیں کی گئی ہے، بلکہ اس سلسلے میں سابق فیصلوں کو بحال رکھا گیا ہے، اور قانون کی جو تشریح کی گئی ہے وہ اس عبارت کی بنیاد پر ہے جو قانون میں موجود ہے۔ اس سے پہلے سپریم کورٹ نے دو اور مقدموں بائی طاہرہ بنام علی حسین فدا علی چھتیا اور فضلن بی بی بنام کے قادر ولی میں بھی مسلم عورتوں کے طلاق کے بعد حقوق تسلیم کئے تھے۔ لیکن سپریم کورٹ کی جسٹس مرتضیٰ افضل علی اور جسٹس اے ورداراجن پر مشتمل ایک بنچ نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ دو فیصلے صحیح نہیں ہوئے اور ان میں مسلم پرسنل لا (شریعت) نفاذ ایکٹ ۱۹۳۷ کو نظر انداز کیا گیا ہے، اس لئے یہ معاملہ انہوں نے چیف جسٹس کے حوالے کیا تاکہ اس کی سماعت پانچ ججوں پر مشتمل بنچ کے ذریعہ ہو۔ اب پانچ ججوں پر مشتمل اس بنچ نے سابق فیصلوں کو بحال رکھا ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ضرورت مند بیوی نابالغ جائز یا ناجائز بچوں اور والدین کی کفالت کے لئے ضابطہ فوجداری میں جو دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ ہیں، مسلمان بھی اس کے تحت قانونی کارروائی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ سپریم کورٹ کی رائے میں مسلم پرسنل لا (شخصی قوانین) کا اطلاق صرف دیوانی کے معاملات تک محدود ہے۔ ضابطہ فوجداری سے کسی کو مذہب کی بنا پر مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔

علماء کرام کا موقف یہ ہے کہ مسلمان شوہر پر طلاق کے بعد بیوی کی کفالت کی ذمہ داری صرف مہر کی ادائی اور عدت کی میعاد میں نفقہ کی ادائی تک محدود ہے۔ سپریم کورٹ نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا ہے چنانچہ موجودہ قانون اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کی بنیاد پر مسلمان عورت عدت کی میعاد گزر جانے کے بعد بھی اگر وہ ضرورت مند ہے اور شوہر خوش حال ہے تو گزارے یا نفقہ کی ادائی کا مطالبہ عدالت کے ذریعہ کر سکتی ہے اور عدالت سے اس کے حق میں حکم جاری ہو سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ یہ رقم پانچ روپے ماہوار سے زیادہ نہ ہوگی۔

اس سلسلے میں عدالت صرف یہ دیکھے گی کہ (۱) عورت نے شادی نہیں کی ہے (۲) وہ اپنی کفالت نہیں کر سکتی، (۳) اس کے شوہر کی حالت ایسی ہے کہ وہ گزارے یا نفقہ کی ادائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایک اور بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ شوہر گزارے کی ادائی کے لئے عورت کو (اگر اسے طلاق نہیں ہوئی ہے) ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ ضابطہ فوجداری کی دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ میں بیوی کی جو تعریف کی گئی ہے اس میں مطلقہ بیوی کو بھی شامل

کیا گیا ہے۔ ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ اگر شوہر نے دوسری شادی نہیں کی ہے یا کوئی عورت اس کے ساتھ نہیں رہتی تو وہ اپنی بیوی کے لئے نفقہ کی ادائی منظور کرنے سے قبل یہ غور کرسکتا ہے کہ وہ ساتھ رہے۔ ایسی صورت میں مجسٹریٹ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ عورت کے عذر کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے۔ قانون میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اگر مرد نے دوسری شادی کرلی ہے یا کوئی داشتہ رکھ لی ہے تو عورت کی طرف سے الگ رہنے کا یہ معقول جواز مانا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں ایسی صورت میں عورت الگ رہتے ہوئے بھی گزارے کا مطالبہ کرسکتی ہے اور عدالت اس کے حق میں فیصلہ کرے گی۔

اسلام میں مجبوری کے تحت طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے طلاق کو سہل اور آسان بھی بنایا گیا ہے، لیکن طلاق کو اچھی بات نہیں مانا گیا ہے۔ اگر اس پہلو کو سامنے رکھا جائے تو سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے غیر ذمہ دارانہ طلاق کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں اس کمیٹی کی رپورٹ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو حکومت پاکستان نے ۴ اگست ۱۹۵۵ کو شادی اور خاندان سے متعلق قوانین کا جائزہ لینے کے لئے قائم کیا تھا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سماج کی ایک دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی تھی۔

"بغیر کسی معقول وجہ کے بڑی تعداد میں مطلقہ عورتوں کو طلاق مل رہی ہے انہیں اس طرح سڑک پر ڈالنے کی اجازت نہ ملنی چاہیے کہ نہ ان کے سر پر چھت ہو اور نہ ان کے پاس اپنی اور بچوں کی کفالت کا ذریعہ ہو۔"

ایک اور سوال یہ قابل غور ہے کہ کوئی مسلمان چوری یا کوئی اور جرم کرتا ہے تو اس وقت کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ اسے ملک کے قانون کی بجائے اسلامی قوانین کے مطابق سزا دی جائے۔

اگر مسلمان چوری، جوا، غبن اور دیگر جرائم کی پاداش میں تعزیرات ہند اور ضابطۂ فوج داری کے تحت سزا پاتے ہیں تو انہیں کیوں ضابطۂ فوج داری کی ان دفعات سے مستثنیٰ کیا جائے جو سماج میں ضرورت مند افراد کو فاقوں اور گداگری سے بچانے کے لئے بنائے گئے ہیں؟

اسلام میں اور قرآن مجید میں جگہ جگہ ضرورت مندوں، محتاجوں اور مفلسوں کی مدد اور کفالت پر زور دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کسی عورت کو محض طلاق کی وجہ سے مفلس، نادار اور محتاج رہنے پر مجبور کیوں کیا جائے اور کیوں کہ اسے اس قانونی رعایت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے جو ملک کے عام قانون کے تحت اسے مل سکتی ہے۔

ضابطۂ فوج داری کی دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ صرف مطلقہ عورتوں کے لئے نہیں ہیں۔ بوڑھے والدین جو اپنی کفالت نہیں کرسکتے، وہ اولاد جن کے باپ ان کی کفالت نہیں کررہے ہیں ان کو بھی ان دفعات سے مدد مل سکتی ہے۔

جو لوگ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کو بے اثر بنانے کے لئے وہ قوانین میں ترمیم یا مسلمانوں کو ان سے مستثنیٰ کرانے کے لئے کوشاں ہیں۔ ان سے یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہے کہ جب بے سہارا اور ضرورت مند والدین، بیویوں اور بیٹے بیٹیوں کو قانون کی یہ پناہ حاصل نہیں ہوگی تو وہ اس کی کیا متبادل صورت پیدا کریں گے؟ ہمارے جو یتیم خانے ہیں ان کی حالت بیان کرنے کی ضرورت نہیں کوئی عورت اگر آدھی رات کو بلا قصور گھر سے نکالی جائے تو شہر ہو یا قصبہ، اسے سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ مشکل سے ملے گی۔

دوسروں کے گھروں میں جھوٹے برتن مانجھنا یا کپڑے سی سی کر آنکھیں پھوڑنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ ایسی مثالیں ہر جگہ مل جائیں گی افسوس یہ ہے کہ ان کی حالت دیکھ کر ہمیں اسلامی تعلیمات کی روشنی راہ نہیں دکھاتی لیکن اگر سپریم کورٹ نے ایسی صورتوں میں صاحب حیثیت مردوں پر کفالت کی ذمہ داری ڈال دی ہے تو اس فیصلے کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ وہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحت مند معاشرے کی تعمیر میں معاون ہے یا مزاحم؟ اگر اس سے ضرورت مندوں اور مظلوموں کی مدد اور دادرسی کا کوئی جواز پیدا ہوتا ہے تو اس کی مخالفت میں یہ شدت سمجھ میں نہیں آتی۔

زُلفوں کی کہانی عورتوں کی زبانی

رعنا کوثر

بالوں کی تاریخ خود انسان کی تاریخ
ا طرح قدیم کہی جا سکتی ہے۔ ابتدائی دَور کے
نسان کے لئے اس کے بال ایک بڑا مسئلہ
ن گئے ہوں گے۔ بالوں کو تراشنے اور سنوارنے
ا ہنر تو انسان کو بعد میں آیا ہوگا لیکن سب سے
پہلے اُلجھے ہوئے بالوں کو سُلجھانے کی ضرورت
اُس نے لازماً محسوس کی ہوگی۔ کنگھے اگرچہ
انسان کی آفرینش کے ہزاروں سال بعد بنائے
گئے تھے، لیکن انسان نے شروع میں کنگھے اور
کنگھیوں کا کام اپنی انگلیوں سے لینا شروع کر دیا
تھا۔ یہی انگلیاں جو تاریخی دَور سے قبل کنگھیوں
کا کام دیتی تھیں، آج بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی
کنگھے کے طور پر استعمال کی جاتی رہی ہیں۔

زلفوں اور گیسوؤں کو سنوارنے کی
خواہش اِنسان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ خصوصاً
عورتوں کے لئے زلفوں کو سنوارنا حقیقت میں
ان کے بناؤ سنگھار میں درجۂ اوّلیت رکھتا ہے،
عورتوں کی لمبی زُلفیں اور گھنے گیسو جہاں
اُن کے حُسن و جمال کا خزانہ ہیں وہیں یہ کبھی کبھی
اُن کے لئے وبالِ جان بھی بن جاتے ہیں۔ پُرانی
داستانوں اور قصے کہانیوں میں بیشتر ایسے واقعات
پڑھنے میں آتے ہیں جن میں اس امر کا اشارہ
ہوتا ہے کہ سیاہ گھنی اور لمبی زلفوں والی عورتیں
کبھی جنوں اور ارواحِ خبیثہ کا شکار ہو جایا کرتی
تھیں۔ آج بھی جہاں تہذیب و تمدن اور تعلیم و
تربیت کی بھرپور روشنی نہیں پہنچی ہے ایسے فرضی
اور من گھڑت واقعات سننے میں آتے رہتے ہیں۔

بہرحال یہ مسلّمہ امر ہے کہ عورتوں کی
خوب صورتی کا راز آج بھی ان کی زلفوں میں
پنہاں ہے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب میں
بیوہ عورتوں کے سر کے بالوں کو اِسی لئے مونڈ
دیا جاتا تھا کہ اُن میں حُسن اور جنسی کشش ختم
ہو جائے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال پذیر دَور
میں جب شہنشاہ فرخ سیر کی ایک بیوہ ملکہ
سے ہندوستان کے شاہ گر وزیر حسن علی خاں
نے ازدواجی رشتے کی خواہش کا اظہار کیا تو
اُس حسن و جمال کی ملکہ نے اپنے بالوں کو منڈوا کر
بے چارے وزیر کی طلب کو ٹھنڈا کر دیا۔

قدرت نے مردوں اور خاص طور سے
عورتوں کے بالوں کو عجیب و غریب خصوصیات
کا حامل بنایا ہے۔ ان کے سروں کے یہ بال اُن
کے لئے ٹوپی اور چھتری کے فرائض بھی انجام
دیتے ہیں اور ان کی صحت میں بھی بڑی حد تک
معاونت کرتے ہیں۔

سر کے بال سردی، زکام اور نزلے کے
اثرات کو دُور کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں
اور کئی بیماریوں کا مداوا بھی بن جاتے ہیں۔

انسان کے جسمانی نظام میں اس
کے دوسرے اعضاء صرف ایک حد تک
بڑھتے رہتے ہیں لیکن بالوں کے مسلسل بڑھتے
رہنے کی کوئی حد نہیں ہے۔ جب دوسرے اعضاء
کی ارتقائی رفتار سست پڑ جاتی ہے تو بھی
بال برابر بڑھتے رہتے ہیں۔ انسانی جسم کے
بعض عضو اگر کاٹ دئے جائیں تو ان کی نشوونما
ختم ہو جاتی ہے لیکن بالوں کو جتنا تراشا جائے
وہ اتنے ہی تیزی سے بڑھتے ہیں۔

ایک خصوصیت بالوں کی یہ بھی ہے
کہ ان کی تراش و خراش سے انسان کو کوئی تکلیف
نہیں پہنچتی۔ کوئی دُکھ یا درد محسوس نہیں ہوتا،
جب کہ دوسرے کسی بھی عضو کی تراش خراش
کی جائے تو انسان کبھی کبھی شدتِ درد سے چیخ
اٹھتا ہے اور بسا اوقات تو بعض اعضاء کے

کیا گیا ہے۔ ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ اگر شوہر نے دوسری شادی نہیں کی ہے یا کوئی عورت اس کے ساتھ نہیں رہتی تو وہ اپنی بیوی کے لئے نفقہ کی ادائی منظور کرنے سے قبل یہ غور کر سکتا ہے کہ وہ ساتھ رہے۔ ایسی صورت میں مجسٹریٹ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ عورت کے عذر کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے۔ قانون میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اگر مرد نے دوسری شادی کر لی ہے یا کوئی داشتہ رکھ لی ہے تو عورت کی طرف سے الگ رہنے کا یہ معقول جواز مانا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں ایسی صورت میں عورت الگ رہتے ہوئے بھی گزارے کا مطالبہ کر سکتی ہے اور عدالت اس کے حق میں فیصلہ کرے گی۔

اسلام میں مجبوری کے تحت طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ طلاق کو سہل اور آسان بھی بنایا گیا ہے، لیکن طلاق کو اچھی بات نہیں مانا گیا ہے۔ اگر اس پہلو کو سامنے رکھا جائے تو سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے غیر ذمہ دارانہ طلاق کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں اس کمیٹی کی رپورٹ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو حکومت پاکستان نے ۴ اگست ۱۹۵۵ کو شادی اور خاندان سے متعلق قوانین کا جائزہ لینے کے لئے قائم کیا تھا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سماج کی ایک دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی تھی۔

"بغیر کسی معقول وجہ کے بڑی تعداد میں جن ادھیڑ عمر عورتوں کو طلاق مل رہی ہے انہیں اس طرح سڑک پر ڈال دینے کی اجازت نہ ملنی چاہئے کہ نہ ان کے سر پر چھت ہو اور نہ ان کے پاس اپنی اور بچوں کی کفالت کا ذریعہ ہو۔"

ایک اور سوال یہ قابل غور ہے کہ کوئی مسلمان چوری یا کوئی اور جرم کرتا ہے تو اس وقت کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ اسے ملک کے قانون کی بجائے اسلامی قوانین کے مطابق سزا دی جائے۔

اگر مسلمان چوری، جوا، غبن اور دیگر جرائم کی پاداش میں تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری کے تحت سزا پاتے ہیں تو انہیں کیوں ضابطہ فوجداری کی ان دفعات سے مستثنیٰ کیا جائے جو سماج میں ضرورت مند افراد کو فاقوں اور گداگری سے بچانے کے لئے بنائے گئے ہیں؟

اسلام میں اور قرآن مجید میں جگہ جگہ ضرورت مندوں، محتاجوں اور مفلسوں کی مدد اور کفالت پر زور دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کسی عورت کو محض طلاق کی وجہ سے مفلس، نادار اور محتاج رہنے پر مجبور کیوں کیا جائے اور کیوں کہ اسے اس قانونی رعایت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے جو ملک کے عام قانون کے تحت اسے مل سکتی ہے۔

ضابطہ فوجداری کی دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ صرف مطلقہ عورتوں کے لئے نہیں ہیں۔ بوڑھے والدین جو اپنی کفالت نہیں کر سکتے، وہ اولاد جن کے باپ ان کی کفالت نہیں کر رہے ہیں ان کو بھی ان دفعات سے مدد مل سکتی ہے۔

جو لوگ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کو بے اثر بنانے کے لئے وہ قوانین میں ترمیم یا مسلمانوں کو ان سے مستثنیٰ کرانے کے لئے کوشاں ہیں۔ ان سے یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہے کہ جب بے سہارا اور ضرورت مند والدین، بیویوں اور بیٹے بیٹیوں کو قانون کی یہ پناہ حاصل نہیں ہوگی تو وہ اس کی کیا متبادل صورت پیدا کریں گے؟ ہمارے جو یتیم خانے ہیں ان کی حالت بیان کرنے کی ضرورت نہیں کوئی عورت اگر آدھی رات کو بلا قصور گھر سے نکالی جائے تو شہر ہو یا قصبہ، اسے سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ مشکل سے ملے گی۔

دوسروں کے گھروں میں جھوٹے برتن مانجھنا یا کپڑے سی سی کر آنکھیں پھوڑنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ ایسی مثالیں ہر جگہ مل جائیں گی افسوس یہ ہے کہ ان کی حالت دیکھ کر ہمیں اسلامی تعلیمات کی روشنی راہ نہیں دکھاتی لیکن اگر سپریم کورٹ نے ایسی صورتوں میں صاحب حیثیت مردوں پر کفالت کی ذمہ داری ڈال دی ہے تو اس فیصلے کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ وہ اسلامی نقطہ نظر سے صحت مند معاشرے کی تعمیر میں معاون ہے یا مزاحم؟ اگر اس سے ضرورت مندوں اور مظلوموں کی مدد اور دادرسی کا کوئی جواز پیدا ہوتا ہے تو اس کی مخالفت میں یہ شدت سمجھ میں نہیں آتی۔

زُلفوں کی کہانی مورتوں کی زبانی

رعنا کوثر

بالوں کی تاریخ خود انسان کی تاریخ کی طرح قدیم کہی جا سکتی ہے۔ ابتدائی دَور کے انسان کے لئے اس کے بال ایک بڑا مسئلہ بن گئے ہوں گے۔ بالوں کو تراشنے اور سنوارنے کا ہُنر تو اِنسان کو بعد میں آیا ہو گا لیکن سب سے پہلے اُلجھے ہوئے بالوں کو سُلجھانے کی ضرورت اُس نے لازماً محسوس کی ہو گی۔ کنگھے اگرچہ انسان کی آفرینش کے ہزاروں سال بعد بنائے گئے تھے، لیکن انسان نے شروع میں کنگھے اور کنگھیوں کا کام اپنی انگلیوں سے لینا شروع کر دیا تھا۔ یہی انگلیاں جو تاریخی دَور سے قبل کنگھیوں کا کام دیتی تھیں، آج بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی کنگھے کے طور پر استعمال کی جاتی رہتی ہیں۔

زلفوں اور گیسوؤں کو سنوارنے کی خواہش اِنسان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ خصوصاً عورتوں کے لئے زلفوں کو سنوارنا حقیقت میں ان کے بناؤ سنگھار میں درجۂ اوّلیت رکھتا ہے۔

عورتوں کی لمبی زلفیں اور گھنے گیسو جہاں اُن کے حُسن و جمال کا خزانہ ہیں وہیں یہ کبھی کبھی اُن کے لئے وبالِ جان بھی بن جاتے ہیں، پُرانی داستانوں اور قصّے کہانیوں میں بیشتر ایسے واقعات پڑھنے میں آتے ہیں جن میں اس امر کا اشارہ ہوتا ہے کہ سیاہ گھنی اور لمبی زلفوں والی عورتیں کبھی جنوں اور ارواحِ خبیثہ کا شکار ہو جایا کرتی تھیں۔ آج بھی جہاں تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت کی بھرپور روشنی نہیں پہنچی ہے ایسے فرضی اور من گھڑت واقعات سننے میں آتے رہتے ہیں۔

بہرحال یہ مسلّمہ امر ہے کہ عورتوں کی خوب صورتی کا راز آج بھی ان کی زلفوں میں پنہاں ہے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب میں بیوہ عورتوں کے سر کے بالوں کو اِسی لئے مونڈ دیا جاتا تھا کہ اُن میں حُسن اور جنسی کشش ختم ہو جائے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال پذیر دَور میں جب شہنشاہ فرخ سیر کی ایک بیوہ ملکہ سے ہندوستان کے شاہ گر وزیر حسن علی خاں نے ازدواجی رشتے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُس حسن و جمال کی ملکہ نے اپنے بالوں کو منڈوا کر بے چارے وزیر کی طلب کو ٹھنڈا کر دیا۔

قدرت نے مردوں اور خاص طور سے عورتوں کے بالوں کو عجیب و غریب خصوصیات کا حامل بنایا ہے۔ ان کے سروں کے یہ بال اُن کے لئے ٹوپی اور چھتری کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں اور ان کی صحت میں بھی بڑی حد تک معاونت کرتے ہیں۔

سر کے بال سردی، زکام اور نزلے کے اثرات کو دُور کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور کئی بیماریوں کا مداوا بھی بن جاتے ہیں۔

انسان کے جسمانی نظام میں اُس کے دوسرے اعضاء صرف ایک حد تک بڑھتے رہتے ہیں لیکن بالوں کے مسلسل بڑھتے رہنے کی کوئی حد نہیں ہے۔ جب دوسرے اعضاً کی ارتقائی رفتار سُست پڑ جاتی ہے تو بھی بال برابر بڑھتے رہتے ہیں۔ انسانی جسم کے بعض عضو اگر کاٹ دئے جائیں تو ان کی نشوونما ختم ہو جاتی ہے لیکن بالوں کو جتنا تراشا جائے وہ اتنے ہی تیزی سے بڑھتے ہیں۔

ایک خصوصیت بالوں کی یہ بھی ہے کہ ان کی تراش و خراش سے انسان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی، کوئی دُکھ یا درد محسوس نہیں ہوتا، جب کہ دوسرے کسی بھی عضو کی تراش خراش کی جائے تو انسان کبھی کبھی شِدّتِ درد سے چیخ اٹھتا ہے اور بسا اوقات تو بعض اعضاء کے

کیا گیا ہے۔ ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ اگر شوہر نے دوسری شادی نہیں کی ہے یا کوئی عورت اس کے ساتھ نہیں رہتی تو وہ اپنی بیوی کے لئے نفقہ کی ادائی منظور کرنے سے قبل یہ غور کر سکتا ہے کہ وہ ساتھ رہے۔ ایسی صورت میں مجسٹریٹ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ عورت کے عذر کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے۔ قانون میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اگر مرد نے دوسری شادی کر لی ہے یا کوئی داشتہ رکھ لی ہے تو عورت کی طرف سے الگ رہنے کا یہ معقول جواز مانا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں ایسی صورت میں عورت الگ رہتے ہوئے بھی گزارے کا مطالبہ کر سکتی ہے اور عدالت اس کے حق میں فیصلہ کرے گی۔

اسلام میں مجبوری کے تحت طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے طلاق کو سہل اور آسان بھی بنایا گیا ہے، لیکن طلاق کو اچھی بات نہیں مانا گیا ہے۔ اگر اس پہلو کو سامنے رکھا جائے تو سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے غیر ذمہ دارانہ طلاق کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں اس کمیٹی کی رپورٹ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو حکومت پاکستان نے ۴ اگست ۱۹۵۵ کو شادی اور خاندان سے متعلق قوانین کا جائزہ لینے کے لئے قائم کیا تھا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سماج کی ایک دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی تھی۔

رد بغیر کسی معقول وجہ کے بڑی تعداد میں جن ادھیڑ عورتوں کو طلاق مل رہی ہے انہیں اس طرح سڑک پر ڈال دینے کی اجازت نہ ملنی چاہئے کہ نہ ان کے سر پر چھت ہو اور نہ ان کے پاس اپنی اور بچوں کی کفالت کا ذریعہ ہو۔"

ایک اور سوال یہ قابل غور ہے کہ کوئی مسلمان چوری یا کوئی اور جرم کرتا ہے تو اس وقت کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ اسے ملک کے قانون کی بجائے اسلامی قوانین کے مطابق سزا دی جائے۔

اگر مسلمان چوری، جوا، غبن اور دیگر جرائم کی پاداش میں تعزیرات ہند اور ضابطۂ فوجداری کے تحت سزا پاتے ہیں تو انہیں کیوں ضابطۂ فوجداری کی ان دفعات سے مستثنیٰ کیا جائے جو سماج میں ضرورت مند افراد کو فاقوں اور گداگری سے بچانے کے لئے بنائے گئے ہیں؟

اسلام میں اور قرآن مجید میں جگہ جگہ ضرورت مندوں، محتاجوں اور مفلسوں کی مدد اور کفالت پر زور دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کسی عورت کو محض طلاق کی وجہ سے مفلس، نادار اور محتاج رہنے پر مجبور کیوں کیا جائے اور کیوں کہ اسے اس قانونی رعایت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے جو ملک کے عام قانون کے تحت اسے مل سکتی ہے۔

ضابطۂ فوجداری کی دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ صرف مطلقہ عورتوں کے لئے نہیں ہیں۔ بوڑھے والدین جو اپنی کفالت نہیں کر سکتے، وہ اولاد جن کے باپ ان کی کفالت نہیں کر رہے ہیں ان کو بھی ان دفعات سے مدد مل سکتی ہے۔

جو لوگ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کو بے اثر بنانے کے لئے وہ قوانین میں ترمیم یا مسلمانوں کو ان سے مستثنیٰ کرانے کے لئے کوشاں ہیں۔ ان سے یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہے کہ جب بے سہارا اور ضرورت مند والدین، بیویوں اور بیٹے بیٹیوں کو قانون کی یہ پناہ حاصل نہیں ہوگی تو وہ اس کی کیا متبادل صورت پیدا کریں گے؟ ہمارے جو یتیم خانے ہیں ان کی حالت بیان کرنے کی ضرورت نہیں کوئی عورت اگر آدھی رات کو بلا قصور گھر سے نکالی جائے تو شہر ہو یا قصبہ، اسے سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ مشکل سے ملے گی۔

دوسروں کے گھروں میں جھوٹے برتن مانجھنا یا کپڑے سی سی کر آنکھیں پھوڑنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ ایسی مثالیں ہر جگہ مل جائیں گی افسوس یہ ہے کہ ان کی حالت دیکھ کر ہمیں اسلامی تعلیمات کی روشنی راہ نہیں دکھاتی لیکن اگر سپریم کورٹ نے ایسی صورتوں میں صاحب حیثیت مردوں پر کفالت کی ذمہ داری ڈال دی ہے تو اس فیصلے کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ وہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحت مند معاشرے کی تعمیر میں معاون ہے یا مزاحم؟ اگر اس سے ضرورت مندوں اور مظلوموں کی مدد اور دادرسی کا کوئی جواز پیدا ہوتا ہے تو اس کی مخالفت میں یہ قباحت سمجھ میں نہیں آتی۔

زلفوں کی کہانی عورتوں کی زبانی

رعنا کوثر

بالوں کی تاریخ خود انسان کی تاریخ کی طرح قدیم کہی جا سکتی ہے۔ ابتدائی دور کے انسان کے لئے اس کے بال ایک بڑا مسئلہ بن گئے ہوں گے۔ بالوں کو تراشنے اور سنوارنے کا ہنر تو انسان کو بعد میں آیا ہوگا لیکن سب سے پہلے اُلجھے ہوئے بالوں کو سلجھانے کی ضرورت اُس نے لازماً محسوس کی ہوگی۔ کنگھے اگرچہ انسان کی آفرینش کے ہزاروں سال بعد بنائے گئے تھے، لیکن انسان نے شروع میں کنگھے اور کنگھیوں کا کام اپنی انگلیوں سے لینا شروع کر دیا تھا۔ یہی انگلیاں جو تاریخی دور سے قبل کنگھی کا کام دیتی تھیں، آج بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی کنگھے کے طور پر استعمال کی جاتی رہتی ہیں۔

زلفوں اور گیسوؤں کو سنوارنے کی خواہش انسان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ خصوصاً عورتوں کے لئے زلفوں کو سنوارنا حقیقت میں ان کے بناؤ سنگھار میں درجۂ اولیت رکھتا ہے۔ عورتوں کی لمبی زلفیں اور گھنے گیسو جہاں اُن کے حسن و جمال کا خزانہ ہیں وہیں یہ کبھی کبھی اُن کے لئے وبالِ جان بھی بن جاتے ہیں۔ پُرانی داستانوں اور قصّے کہانیوں میں بیشتر ایسے واقعات پڑھنے میں آتے ہیں جن میں اس امر کا اشارہ ہوتا ہے کہ سیاہ گھنی اور لمبی زلفوں والی عورتیں کبھی جنوں اور ارواحِ خبیثہ کا شکار ہو جایا کرتی تھیں۔ آج بھی جہاں تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت کی بھرپور روشنی نہیں پہنچی ہے ایسے فرضی اور من گھڑت واقعات سننے میں آتے رہتے ہیں۔

بہرحال یہ مسلّمہ امر ہے کہ عورتوں کی خوب صورتی کا راز آج بھی ان کی زلفوں میں پنہاں ہے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب میں بیوہ عورتوں کے سر کے بالوں کو اسی لئے مونڈ دیا جاتا تھا کہ اُن میں حسن اور جنسی کشش ختم ہو جائے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال پذیر دور میں جب شہنشاہ فرخ سیر کی ایک بیوہ ملکہ سے ہندوستان کے شاہ گر وزیر حسن علی خاں نے ازدواجی رشتے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُس حسن و جمال کی ملکہ نے اپنے بالوں کو منڈوا کر بے چارے وزیر کی طلب کو ٹھنڈا کر دیا۔

قدرت نے مردوں اور خاص طور سے عورتوں کے بالوں کو عجیب و غریب خصوصیات کا حامل بنایا ہے۔ ان کے سروں کے یہ بال اُن کے لئے ٹوپی اور چھتری کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں اور ان کی صحت میں بھی بڑی حد تک معاونت کرتے ہیں۔

سر کے بال سردی، زکام اور نزلے کے اثرات کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور کئی بیماریوں کا مداوا بھی بن جاتے ہیں۔

انسان کے جسمانی نظام میں اس کے دوسرے اعضاء صرف ایک حد تک بڑھتے رہتے ہیں لیکن بالوں کے مسلسل بڑھتے رہنے کی کوئی حد نہیں ہے۔ جب دوسرے اعضاء کی ارتقائی رفتار سست پڑ جاتی ہے تو بھی بال برابر بڑھتے رہتے ہیں۔ انسانی جسم کے بعض عضو اگر کاٹ دیئے جائیں تو ان کی نشوونما ختم ہو جاتی ہے لیکن بالوں کو جتنا تراشا جائے وہ اتنے ہی تیزی سے بڑھتے ہیں۔

ایک خصوصیت بالوں کی یہ بھی ہے کہ ان کی تراش و خراش سے انسان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ کوئی دُکھ یا درد محسوس نہیں ہوتا، جب کہ دوسرے کسی بھی عضو کی تراش خراش کی جائے تو انسان کبھی کبھی شدتِ درد سے چیخ اٹھتا ہے اور بسا اوقات تو بعض اعضاء کے

آپریشن کے لئے اُسے بے ہوشی کی دوا سنگھائی جاتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوجاتا ہے کہ اعصابی کمزوری یا بڑھاپے کی آمد سے انسانی بالوں کا رنگ بدلنے لگتا ہے اور وہ آخر کار سیاہی سے سفیدی میں بدلنا شروع ہوجاتے ہیں۔

قدرت نے بالوں کو نسلی شناخت کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ ہر ملک، ہر قوم، ہر خطۂ زمین کے لوگوں کے بال یکساں نہیں ہوتے۔ بالوں کی عام طور پر تین اقسام پائی جاتی ہیں۔ سیدھے کھڑے، لہریے، گھنگریالے، سخت اور ملائم۔ افریقی باشندوں کے بال عام طور پر سخت اور گھنگھریالے ہوتے ہیں۔ بسا اوقات محض بالوں سے معلوم کرلیا جاتا ہے کہ یہ کس نسل کے باشندوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ شعبۂ سراغ رسانی نے بالوں کے ذریعے جرائم کرنے والوں کی شناخت کرنے میں اتنی ترقی کرلی ہے کہ مجرم کے ایک بال سے یہ معلوم کرلیا جاتا ہے کہ وہ کس نسل کا شخص ہوسکتا ہے۔

تمام دُنیا میں (جاپان کو چھوڑ کر) ہندوستان کی عورتوں نے بالوں کو سنوارنے میں خاص مہارت حاصل کی ہے۔ ہندوستانی عورتوں نے ہزاروں برس پہلے ہی حُسن کے اس راز کو دریافت کرلیا تھا۔ اپنی خوب صورتی کو دوبالا کرنے کے لئے انہوں نے زلفوں کو بڑھانے کا سہارا لیا۔ اپنے بالوں

اور دوسری جڑی بوٹیوں کا استعمال اُس وقت سیکھا جب دوسری اقوام کی عورتوں، خصوصاً یورپین اور افریقی عورتوں نے بالوں کے اندر جوئیں پڑجانے یا انہیں سنوارنے کے لئے زیادہ وقت نہ دینے کی وجہ سے اُنہیں کانوں کے آگے سے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ قدیم ہندوستان کی عورتوں نے ان لیکھوں اور جوؤں کو ختم کرنے کے لئے پیاز کے عرق کو تیل کے ساتھ ملنے کا نسخہ دریافت کرلیا تھا۔

مغلیہ سلطنت کی پُرانی دستاویزات کے حالیہ انکشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کی حرم سراؤں میں رہنے والی بیگمات کو قدیم زمانے کی مہارانیوں اور راج کماریوں کی طرح اپنی زلفوں کو سنوارنے کا بڑا شوق تھا۔ جہانگیر کی ملکہ اکثر جنوبی ہندوستان سے ایسی جڑی بوٹیاں منگواتی رہتی تھی جن سے بالوں میں نہ صرف چمک دمک اور سیاہی قائم رہے بلکہ ان کی نشوونما کی رفتار بھی بڑھتی رہے۔ اسی دور میں اکثر حسین جمیل کنیزاؤں کو زلفیں بڑھانے کی اس لئے اجازت نہیں تھی کہ وہ شہنشاؤں اور شاہ زادوں کی ہوس پرست نگاہوں کا شکار نہ بن سکیں۔

ہندوستان کی تہذیب و تمدن میں بُت تراشی ایک ایسا فن تھا جسے ستائش کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ بُت تراشوں کی بڑی

بُت تراشوں نے قدیم زمانے کی تاریخ اور معاشرت کے طریقوں کو پتھروں کی کے ذریعہ ہم تک پہنچانے کا عظیم کارنامہ دیا ہے۔ ان ہی آذروں نے اُس دور کی کے بالوں کی وضع قطع اور ان کو سنوار کے بہت سے نمونے آنے والی نسلوں لئے ورثے کے طور پر چھوڑے ہیں۔ ان کی مُورتیوں کی کچھ تصاویر ہمیں اس بات کا فراہم کرتی ہیں کہ ہزاروں سال پرانی تہذ میں عورتوں نے اپنی زلفوں کی آرائش کے جو ڈیزائن وضع کئے تھے وہ آج بھی ہندو کی اعلیٰ سوسائٹی میں عام ہیں۔ آج بھی د کناٹ پلیس، بمبئی، کلکتہ، مدراس اور ترقی یافتہ شہروں میں ایسی خواتین دکھائی دیتی جن کے زلفوں کو سنوارنے کے طریقے کم و بیش وہی ہیں جو ہمیں سانچی، اجنتا، ایلورا وغیرہ بنی ہوئی مورتوں کے سروں پر دکھا دیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے آج کی فیشن زدہ عورتوں نے زلفوں کو سنوار کے لئے ان ہی ڈیزائنوں اور طریقوں کو ترجیح دے رکھی ہے یا دوسرے لفظوں میں ان کی من و عن نقل ہے جو آج سے ہزاروں برس پیشتر ہندوستان کی خواتین کے لئے روزمرہ کا مشغلہ بنے ہوئے تھے

ان تصاویر کے بغور مطالعہ کے بعد بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ زلفوں کو سنوارنے

ان سے ملئے

ڈاکٹر افتخار بیگم صدیقی

آج کل تعلیم کا بڑا زور ہے شہروں میں اچھے اسکولوں میں داخل ہونے کے لئے بچوں کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، ان کے والدین کو کیا کیا پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں، یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے لیکن کچھ انسان ایسے بھی ہیں جنہوں نے اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ انہوں نے گھر میں ہی تعلیم حاصل کی اور پرائیویٹ طالب علم کے طور پر امتحان پاس کئے اور اسی طرح کامیابی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔ افتخار بیگم کا شمار ان ہی انسانوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے پرائیویٹ میٹرک پاس کیا اسی طرح انٹر کیا۔ بی اے کے دو سال کے دوران انہوں نے ضرور کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی لیکن پھر ایم اے پرائیویٹ طور پر پاس کیا اور اس کے بعد پی ایچ ڈی۔ آج کل وہ دہلی کے ذاکر حسین کالج میں اردو کی تعلیم دے رہی ہیں۔

افتخار بیگم کا جنم بدایوں کے ایک ایسے خاندان میں ہوا جو اپنی علمیت اور شرافت کے لئے مشہور ہے۔ ان کے خسر مولوی ضیا احمد بدایونی اردو، فارسی اور عربی کے عالم تھے اور دادا مولوی شفیع احمد امیر مینائی کے شاگرد تھے افتخار کے بڑے بھائی پروفیسر ظفر احمد صدیقی علی گڑھ میں شعبۂ فلسفہ کے صدر تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور ان کی کئی تصانیف ہیں۔ غرض ددیہال اور ننیہال دونوں میں مذہب اور شعر و ادب کا چرچا تھا۔ یہی وہ اثرات تھے جو افتخار کے مزاج میں بھی رچ بس گئے۔ ان کے والد تعلیم یافتہ تھے، لیکن اس زمانے کے لحاظ سے پرانے خیال کے تھے انہوں نے لڑکیوں کو تو اسکول کی تعلیم نہ دلائی لیکن لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست گھر پر ہی کیا۔

۱۹۴۷ میں تقسیم کے بعد افتخار کے بھائی انہیں علی گڑھ لے آئے۔ یہاں بھی ان کی پرائیویٹ تعلیم جاری رہی۔ کچھ درسی کتابیں بھائی پڑھا دیتے۔ کچھ افتخار اپنی لگن سے پڑھ لیتیں۔ ۱۴ سال کی عمر میں انہوں نے میٹرک پاس کر لیا۔ اس کے بعد انٹر کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۶ سال کی عمر میں انہوں نے انٹر میں ٹاپ کیا۔ اس کے بعد وہ دو سال کے لئے کالج میں باقاعدہ داخل ہو گئیں۔

۱۸ سال کی عمر میں انہوں نے بی اے پاس کر لیا۔ پھر ان کی شادی اپنے ماموں کے لڑکے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی سے ہو گئی۔ ڈاکٹر صدیقی اس وقت دلی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور مختلف ادبی اور علمی اداروں کے رکن ہیں۔ دہلی یونیورسٹی سے وہ تقریباً ۲۲ برس سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے مومن، درد اور فانی پر تحقیقی کام کر کے آئندہ کام کرنے والوں کے لئے نئے راستے متعین کئے ہیں وہ ایک مخلص باپ مخلص شوہر اور مخلص استاد ہیں۔ شادی کے بعد افتخار کا تعلیم کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لئے رک گیا۔

لیکن جب ان کی بیٹی نرسری میں جانے کے قا[بل] ہو گئی تو افتخار پھر تعلیم حاصل کرنے میں منہ[مک] ہو گئیں۔ دلی یونیورسٹی سے انہوں نے پرائیویٹ ایم اے پاس کیا وہ یونیور[سٹی] میں اول آئیں۔ اس کے بعد بیٹھنے کی بجا[ئے]

آپریشن کے لئے اُسے بے ہوشی کی دوا سنگھائی جاتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوجاتا ہے کہ اعصابی کمزوری یا بڑھاپے کی آمد سے انسانی بالوں کا رنگ بدلنے لگتا ہے اور وہ آخر کار سیاہی سے سفیدی میں بدلنا شروع ہوجاتے ہیں۔

قدرت نے بالوں کو نسلی شناخت کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ ہر ملک، ہر قوم، ہر خطۂ زمین کے لوگوں کے بال یکساں نہیں ہوتے۔ بالوں کی عام طور پر تین اقسام پائی جاتی ہیں۔ سیدھے کھڑے، لہریلے، گھنگریلے، سخت اور ملائم، افریقی باشندوں کے بال عام طور پر سخت اور گھنگھریالے ہوتے ہیں۔ بسا اوقات محض بالوں سے معلوم کرلیا جاتا ہے کہ یہ کس نسل کے باشندوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ شعبۂ سراغ رسانی نے بالوں کے ذریعے جرائم کرنے والوں کی شناخت کرنے میں اتنی ترقی کرلی ہے کہ مجرم کے ایک بال سے یہ معلوم کرلیا جاتا ہے کہ وہ کس نسل کا شخص ہوسکتا ہے۔

تمام دُنیا میں (جاپان کو چھوڑ کر) ہندوستان کی عورتوں نے بالوں کو سنوارنے میں خاص مہارت حاصل کی ہے۔ ہندوستانی عورتوں نے ہزاروں برس پہلے ہی حُسن کے اس راز کو دریافت کرلیا تھا۔ اپنی خوب صورتی کو دوبالا کرنے کے لئے انہوں نے زلفوں کو بڑھانے کا سہارا لیا۔ اپنے بالوں میں چمک دمک اور سیاہی پیدا کرنے اور سیاہی

اور دوسری جڑی بوٹیوں کا استعمال اُس وقت سیکھا جب دوسری اقوام کی عورتوں، خصوصاً یورپی اور افریقی عورتوں نے بالوں کے اندر جوئیں پڑجانے یا انہیں سنوارنے کے لئے زیادہ وقت نہ دینے کی وجہ سے اُنہیں کانوں کے آگے سے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ قدیم ہندوستان کی عورتوں نے ان لیکھوں اور جوؤں کو ختم کرنے کے لئے پیاز کے عرق کو تیل کے ساتھ ملنے کا نسخہ دریافت کرلیا تھا۔

مغلیہ سلطنت کی پُرانی دستاویزات کے حالیہ انکشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کی حرم سراؤں میں رہنے والی بیگمات کو قدیم زمانے کی مہارانیوں اور راج کماریوں کی طرح اپنی زلفوں کو سنوارنے کا بڑا شوق تھا۔ جہانگیر کی ملکہ اکثر جنوبی ہندوستان سے ایسی جڑی بوٹیاں منگواتی رہتی تھی جن سے بالوں میں نہ صرف چمک دمک اور سیاہی قائم رہے بلکہ ان کی نشوونما کی رفتار بھی بڑھتی رہے۔ اِسی دور میں اکثر حسین جمیل کنیزاؤں کو زلفیں بڑھانے کی اِس لئے اجازت نہیں تھی کہ وہ شہنشاؤں اور شاہزادوں کی ہوس پرست نگاہوں کا شکار نہ بن سکیں۔

ہندوستان کی تہذیب و تمدّن میں بُت تراشی ایک ایسا فن تھا جسے ستائش کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ بُت تراشوں کی بڑی اہمیت تھی۔ انہیں راج دربار سے بڑے بڑے [illegible]

بُت تراشوں نے قدیم زمانے کی تاریخ و
اور معاشرت کے طریقوں کو پتھروں کی تراش
کے ذریعہ ہم تک پہنچانے کا عظیم کارنامہ ا
دیا ہے۔ ان ہی آذروں نے اُس دور کی
کے بالوں کی وضع قطع اور ان کو سنوار
کے بہت سے نمونے آنے والی نسلوں
لئے ورثے کے طور پر چھوڑے ہیں۔ ان
کی مورتوں کی کچھ تصاویر ہمیں اِس بات
فراہم کرتی ہیں کہ ہزاروں سال پرانی تہ
میں عورتوں نے اپنی زلفوں کی آرائش
جو ڈیزائن وضع کئے تھے وہ آج بھی ہن
کی اعلیٰ سوسائٹی میں عام ہیں۔ آج بھی
کناٹ پلیس، بمبئی، کلکتہ، مدراس ا
ترقی یافتہ شہروں میں ایسی خواتین دکھائی
جن کے زلفوں کو سنوارنے کے طریقے ک
وہی ہیں جو ہمیں سانچی، اجنتا، ایلورا
بنی ہوئی مورتوں کے سروں پر دکھ
دیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو یہ محسوس ہو
آج کی فیشن زدہ عورتوں نے زلفوں کو
کے لئے ان ہی ڈیزائنوں اور طریقوں
رکھی ہے یا دوسرے لفظوں میں ان
نقل ہے جو آج سے ہزاروں برس پیش
کی خواتین کے لئے روزمرّہ کا مشغلہ تھے
اِن تصاویر کے بغور مطالعہ
بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ زلفوں کو
کے فن نے ترقی کی بجائے اپنی رفتار
[illegible]

ڈاکٹر افتخار بیگم صدیقی

ان سے ملئے

آج کل تعلیم کا بڑا زور ہے شہروں میں اچھے اسکولوں میں داخل ہونے کے لئے بچوں کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں' ان کے والدین کو کیا کیا پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں' یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے لیکن کچھ انسان ایسے بھی ہیں جنہوں نے اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ انہوں نے گھر میں ہی تعلیم حاصل کی اور پرائیویٹ طالب علم کے طور پر امتحان پاس کئے اور اسی طرح کامیابی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔ افتخار بیگم کا شمار ان ہی انسانوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے پرائیویٹ میٹرک پاس کیا اسی طرح انٹر کیا۔ بی اے کے دو سال کے دوران انہوں نے ضرور کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی لیکن پھر ایم اے پرائیویٹ طور پر پاس کیا اور اس کے بعد پی ایچ ڈی۔ آج کل وہ دہلی کے ذاکر حسین کالج میں اردو کی تعلیم دے رہی ہیں۔

افتخار بیگم کا جنم بدایوں کے ایک ایسے خاندان میں ہوا جو اپنی علمیت اور شرافت کے لئے مشہور رہا ہے۔ ان کے خسر مولوی ضیاء احمد بدایونی اردو، فارسی اور عربی کے عالم تھے اور دادا مولوی شفیع احمد امیر مینائی کے شاگرد تھے افتخار کے بڑے بھائی پروفیسر ظفر احمد صدیقی علی گڑھ میں شعبۂ فلسفہ کے صدر تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور ان کی کئی تصانیف ہیں۔ غرض ددھیال اور ننھیال دونوں میں مذہب اور شعر و ادب کا چرچا تھا۔ یہی وہ اثرات تھے جو افتخار کے مزاج میں بھی رچ بس گئے۔ ان کے والد تعلیم یافتہ تھے لیکن اس زمانے کے لحاظ سے پرانے خیال کے تھے انہوں نے لڑکوں کو تو اسکول کی تعلیم دلائی لیکن لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست گھر پر ہی کیا۔

۱۹۴۷ میں تقسیم کے بعد افتخار کے بھائی انہیں علی گڑھ لے آئے۔ یہاں بھی ان کی پرائیویٹ تعلیم جاری رہی۔ کچھ درسی کتابیں بھائی پڑھا دیتے۔ کچھ افتخار اپنی لگن سے پڑھ لیتیں۔ ۱۴ سال کی عمر میں انہوں نے میٹرک پاس کر لیا۔ اس کے بعد انٹر کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۶ سال کی عمر میں انہوں نے انٹر میں ٹاپ کیا۔ اس کے بعد وہ دو سال کے لئے کالج میں باقاعدہ داخل ہو گئیں۔

۱۸ سال کی عمر میں انہوں نے بی اے پاس کر لیا۔ پھر ان کی شادی اپنے ماموں کے لڑکے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی سے ہو گئی۔ ڈاکٹر صدیقی اس وقت دلی یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور مختلف ادبی اور علمی اداروں کے رکن ہیں۔ دہلی یونی ورسٹی سے وہ تقریباً ۲۲ برس سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے مومن' درد اور فانی پر تحقیقی کام کر کے آئندہ کام کرنے والوں کے لئے نئے راستے متعین کئے ہیں وہ ایک مخلص باپ مخلص شوہر اور مخلص استاد ہیں۔ شادی کے بعد افتخار کا تعلیم کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لئے رک گیا۔

لیکن جب ان کی بیٹی نرسری میں جانے کے قابل ہو گئی تو افتخار پھر تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئیں۔ دلی یونی ورسٹی سے انہوں نے پرائیویٹ ایم اے پاس کیا وہ یونی ورسٹی میں اول آئیں۔ اس کے بعد بیٹھنے کی بجائے

سکھانے کا مرحلہ ان کے سامنے آیا۔ علی گڑھ کے ویمنز کالج میں افتخار بیگم کا تقرر ہو گیا۔

اب میاں دلی میں تھے اور بیوی علی گڑھ میں لیکن یہ گاڑی کسی نہ کسی طرح چلتی رہی دلی سے علی گڑھ دو گھنٹے کی مسافت ہے کبھی ہفتہ اتوار کو میاں علی گڑھ چلے جاتے کبھی افتخار دلی آجاتیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں دونوں ساتھ ہی رہتے۔ یہ سلسلہ دس سال تک چلتا رہا۔ اس دوران افتخار پی ایچ ڈی کی تیاری کرتی رہیں۔ ۱۹۷۳ میں یہ مرحلہ بھی سر ہو گیا۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کے لئے افتخار نے اردو شاعری میں میر سے پہلے کے چند شاعروں کا کلام تلاش کیا۔ ان شاعروں میں شاکر ناجی سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ افتخار نے ان کے کلام کو ایڈیٹ کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ شاکر ناجی کا زمانہ اورنگ زیب کے بیٹے معظم شاہ کے دور حکومت کا ہے۔ اس کے بعد افتخار دلی میں ہی بس گئیں۔

افتخار کے دو لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی ہے اور اس کے ماشاءاللہ تین بچے ہیں دوسری لڑکی اور دونوں لڑکے ابھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں

افتخار کے والد مولوی اقبال احمد بدایوں کی ایک معزز شخصیت تھے۔ ان کی والدہ اردو اور فارسی جانتی تھیں۔ انہیں شاعری سے فطری لگاؤ تھا لیکن اس زمانے میں عورتوں کا غزل کہنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ان کی شاعری حمد اور نعت تک محدود رہی افتخار کو بھی تصنیف و تالیف سے دلچسپی ہے۔ وہ افسانے اور مضامین لکھتی ہیں غزل اور نظم میں بھی طبع آزمائی کرتی ہیں۔ ان کی پرورش ایک قدامت پسند گھرانے میں ہوئی، لیکن اس کے باوجود وہ دقیانوسی خیالات نہیں رکھتیں انہوں نے ماڈرن زمانے کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے۔ اس زمانے میں مذہب سے بے نیازی عام ہے، لیکن افتخار نے مذہب کا دامن نہیں چھوڑا۔ انہیں حیرت ہوتی ہے کہ لوگ مذہب کا دامن چھوڑ کر کس طرح زندگی بسر کر لیتے ہیں۔ افتخار نماز روزہ کی پابند ہیں اور حج بیت اللہ سے بھی سرفراز ہو چکی ہیں۔ وہ تو پردہ بھی کرنا چاہتی ہیں لیکن یونی ورسٹی کے ماحول میں ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اسلام سے گہری عقیدت کے باوجود ان کے مزاج میں تعصب نام کو نہیں ہے۔ ان کے پڑوس میں ہندو سکھ وغیرہ آباد ہیں۔ جب افتخار میلاد کی مجلس منعقد کرتی ہیں تو ان کے پڑوسی بھی اس میں شرکت کرتے ہیں۔

افتخار ماں باپ کی پسند کی شادی کو محبت کی شادی پر ترجیح دیتی ہیں۔ آج کل سائنس داں رشتہ داروں میں شادی کرنے کو غلط سمجھتے ہیں۔ اس طرح آبائی بیماریاں بچوں میں زیادہ آسانی سے منتقل ہو سکتی ہیں لیکن اگر آبائی بیماریاں موجود نہ ہوں تو ان شادیوں میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

خود افتخار کی شادی ان کے ماموں کے بیٹے سے ہوئی ہے۔ ان کی بڑی لڑکی کی شادی ان کے بھانجے سے ہوئی ہے۔ افتخار کی رائے میں "کزن میریجیز" اس لئے اچھی ثابت ہوتی ہیں کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے ہیں۔ اس طرح نبھانا آسان ہو جاتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ افتخار کے گھر کا ماحول پرسکون اور محبت بھرا ہوا ہے۔ وہ میکے اور سسرال دونوں میں ہر دل عزیز ہیں۔ ان کی رائے کی اہمیت ہے۔ شوہر اور بیوی، دونوں کے درمیان ایک ایسا رابطہ ہے جس نے گھر کے ماحول کو خوش گوار بنا دیا ہے۔ افتخار اپنے طالب علموں میں بھی ہر دل عزیز ہیں۔

آج کل ساری دنیا میں عورتوں کی آزادی کا شور برپا ہے۔ ہندوستان بھی اس کی لپیٹ سے محفوظ نہیں۔ عورتوں کا کہنا ہے کہ مرد نے ہمیشہ عورت پر ظلم کیا ہے افتخار کی رائے اس بارے میں بہت دلچسپ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عورت ہمیشہ مظلوم نہیں ہوتی۔ وہ ظالم بھی ہو سکتی ہے۔ اس بات کا فیصلہ طبقاتی اختلاف کرتے ہیں۔ غریب اور جاہل عورت کا کوئی ہمدرد نہیں ہوتا وہ میاں کی جوتیاں کھاتی ہے اور اسے عورت کی قسمت سمجھ کر سہہ لیتی ہے۔ لیکن امیر اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

افتخار کا مشاہدہ ہے کہ امیر اور برسر روزگار عورت ظالم بھی ہو سکتی ہے۔

افتخار شعر بھی کہتی ہیں۔ غزل کے مقابلے میں ان کا رجحان نظم کی طرف زیادہ ہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ نظم اس وقت لکھی جب وہ حج کے لئے اپنے دو سالہ بچے کو گھر پر چھوڑ کر جا رہی تھیں۔ افتخار نے اب تک تین کتابیں لکھی ہیں۔ پہلی کتاب 'ارشادات قرآنی' ہے دوسری 'بڑوں کا بچپن' اس پر دلی اکاڈمی سے انہیں انعام ملا ہے۔ تیسری کتاب 'شرح دیوان فانی' ہے۔ اس پر یوپی اکاڈمی سے انعام ملا ہے فانی کے دیوان کی شرح لکھ کر گویا افتخار نے ان سے ہم وطنی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ○○

دیس بدیس کی خبریں

...ن لڑکیوں کے لیے خوش خبری

...اگلے وقتوں میں یہ قول مشہور تھا
...گرم رکھو اور سر ٹھنڈا۔ لیکن موجودہ
...نے یہ مقولہ غلط ثابت کر دیا ہے۔
...کے ایک ڈاکٹر نے اس سلسلے میں کچھ
...پ تجربے کیے۔ اس نے دس عورتوں
...یے ہیلمیٹ پہنائے جن میں ایک بیٹری
...ی۔ اس بیٹری کی مدد سے سر کا ٹمپریچر
...درجہ سینٹی گریڈ بڑھ گیا۔ دوسری دس
...ں ننگے سر تھیں۔ ان دونوں ٹیموں کو کچھ
...ات دیے گئے۔ یہ معمولی جمع، تفریق کے
...ل تھے۔ مگر جو عورتیں ہیلمیٹ پہنے ہوئے
...ں انھوں نے زیادہ صحیح جواب دیے۔
...کے سوچنے کی رفتار دوسری عورتوں سے
...ز تھی۔ دوسرے تجربے میں عورتوں کے
...منے کئی بار لائٹ آن کی گئی۔ پھر ان عورتوں
...سوال کیا گیا کہ لائٹ کتنی مرتبہ جلائی گئی
...ی۔ اس مرتبہ بھی ہیلمیٹ پہننے والی عورتوں
...زیادہ صحیح جواب دیے۔ اس کے بعد یہ
...ربہ بچوں پر آزمایا گیا۔ یہاں بھی نتیجہ وہی نکلا
...م ہیلمیٹ پہنے ہوئے بچوں کے دماغ کی رفتار
...ز ہو گئی۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ آنے والے
...ندرہ بیس برس میں اس طرح کے ہیلمیٹ عام طور
...ازاروں میں ملنے لگیں گے۔ اسکول جانے والے
بچے خاص طور پر ہیلمیٹ پہن کر اسکول کا کام
...کریں گے۔ گرم ہیلمیٹ میں ایسی خود کار بیٹری
...گی ہوگی جو اس کا ٹمپریچر ایک درجہ سینٹی گریڈ سے
زیادہ بڑھنے نہیں دے گی لیکن یہ دریافت ابھی
ابتدائی مرحلوں میں ہے۔ اس لیے ڈاکٹروں
نے تنبیہ کی ہے کہ جب تک تجربات پورے نہ
ہو جائیں عام لوگوں کو اپنے طور پر گرم ہیلمیٹ
نہیں پہننا چاہیے۔

ایک لمبی جدائی

۱۹۱۳ میں امریکہ کے ایک علاقے
میں زبردست سیلاب آیا۔ ایک گاؤں میں
ایسی تباہی مچی کہ وہاں کوئی بھی زندہ نہیں رہا
۲۵ سالہ سوزان ان دنوں اپنی نانی کے پاس
دوسرے گاؤں میں تھی۔ اس نے جب یہ خبر
سنی تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسے معلوم
ہوا کہ گاؤں میں اس کا چھوٹا بھائی کرسٹوفر
بھی مر چکا ہے۔ کرسٹوفر اس وقت ۲۳ سال
کا نوجوان تھا۔ سوزان اپنے گاؤں میں
نہیں گئی، بلکہ شادی کر کے دوسری جگہ آباد
ہو گئی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو یاد کر کے
بہت روتی تھی، اِدھر اس کا بھائی کرسٹوفر
زندہ تھا اور اس کی تلاش میں سرگرداں تھا
وہ سیلاب سے بچ گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے
وہ جب بھی اپنی بہن کا پتہ چلانے کی کوشش
کرتا، اسے ناکامی نصیب ہوتی۔ وقت گزرتا
گیا۔ سوزان اور اس کا شوہر ایک جگہ جم کر
نہیں رہتے تھے۔ اسی لیے جب بھی کرسٹوفر
کو اپنی بہن کا پتہ ملتا اسے یہ معلوم ہو جاتا
کہ وہ پھر کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئی۔ آخر
اس نے ہمت ہار دی۔ اس طرح ۷۰ سال
گزر گئے۔ کرسٹوفر کو یقین تھا کہ اس کی بہن
مر کھپ گئی ہوگی اگر وہ زندہ ہوگی تو اس کی عمر
۹۵ سال ہونی چاہیے۔ خود اس کی عمر ۹۳ سال
تھی۔ لیکن قدرت کو ان کا ملاپ منظور تھا۔
امریکہ میں ایک فلاحی ادارہ ہے جسے سالویشن
آرمی کہتے ہیں، ان لوگوں نے ایک شعبہ قائم
کیا ہے جو بچھڑے ہوئے رشتے داروں کا پتہ
چلاتا ہے۔ ان لوگوں نے کرسٹوفر کی مدد کی
اور اسے اپنی بہن کا پتہ چل گیا۔ اس نے
بہن کو خط لکھا۔ بہن نے کانپتے ہوئے ہاتھوں
سے خط کھولا تو اس سے "میری پیاری بہن"
کے آگے کچھ نہ پڑھا گیا۔ اس کی آنکھوں میں
آنسو تیر رہے تھے۔ پھر دونوں نے ٹیلی فون پر
بات کی اور دوسرے دن کرسٹوفر اپنی بہن کے
گھر پہنچ گیا۔ سوزان اسے ایک نظر میں پہچان
گئی۔ ۷۰ سال کے طویل وقفے میں اس کے
خدوخال زیادہ تبدیل نہیں ہوئے تھے۔

■■

نتیجہ: خیال اپنا اپنا

کیا لڑکی کی شادی کم عمری میں کردینی چاہیئے؟

اِس بار مقابلے میں حصہ لینے والے زیادہ تر بہنوں بھائیوں نے کم عمری کی شادی کو غلط قرار دیا۔ نور جہاں صاحبہ (دہلی ۲) کی تحریر پہلا انعام (سو روپے) کی حق دار ٹھیرائی گئیں۔ طلعت خورشید (علی گڑھ) دوسرا انعام (پچاس روپے) عائشہ مشیر علوی (لکھنؤ) تیسرا انعام (تیس روپے) دیا جارہا ہے۔ انعام حاصل کرنے والی تحریریں یہاں شائع کی جارہی ہیں۔

پہلا انعام:

قدیم زمانے سے ہندوستان میں لڑکی کی شادی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ آج بھی جب کہ ہندوستان میں عورت کا ایک مقام بن گیا ہے۔ عورت خلا میں پہنچ گئی ہے۔ ایورسٹ کی چوٹی پر جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ ملک کی وزیر اعظم بن گئی ہے اس کے باوجود یہ مسئلہ اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ آج کل تقریباً ۵۰ فی صدی گھروں میں لڑکی کی شادی کا مسئلہ موجود ہے۔ آج کل اس معاملہ میں لڑکی کے خیالات بھی جلدی جلدی بدل رہے ہیں جن والدین نے اپنے بچوں کی شادی کم عمری میں اس وجہ سے نہیں کی کہ ہم اپنی بچیوں کو پڑھا لکھا کر ان کو کسی لائق بنا کر ان کو پیروں پر کھڑا کر کے شادی کریں گے تو اب ان کے لیے بھی بڑی مشکل سامنے آگئی ہے کہ یا تو لڑکے والے یہ کہہ کر رشتہ قبول نہیں کرتے کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہے یا پھر یہ ہوتا ہے کہ پختہ عمر کو پہنچ کر پڑھ لکھ کر لڑکی کا معیار بدل جاتا ہے اور اس کو خود کو ہی کوئی رشتہ مشکل سے پسند آتا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ اتنی تکلیف دہ بات نہیں ہے جتنی کم عمری کی شادی ہے۔ اس عمر میں ماں باپ جس کے ساتھ چاہیں باندھ دیں۔ اس میں اتنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اگر صلاحیت ہوتی بھی ہے تو بغاوت کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کم عمری کی شادی لڑکی کے بجائے والدین کی مرضی سے ہوتی ہے اور پھر سسرال میں جا کر بھی اس کو حالات سے مقابلہ کرنے، ماحول میں گھلنے ملنے اور اتنا بڑا بوجھ سنبھالنے کی اہلیت کم ہی ہوتی ہے۔

ہر والدین کا فرض یہ ہے کہ جب تک ان کی لڑکی پوری طرح بالغ نہ ہو جائے زمانے کے نشیب و فراز سے واقف نہ ہو جائے۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل نہ ہو جائے۔ اس کی زندگی کا رُخ نہ پلٹیں۔ کم عمری کی شادی سماجی اور ازدواجی دونوں پہلوؤں سے ہی مضر ہے۔ کیوں کہ وہ صرف عمر کے لحاظ سے ہی کم عمر نہیں ہوتی بلکہ دماغی اور جسمانی طور پر بھی کمزور ہوتی ہے۔ اگر خدانخواستہ اس پر بُرے حالات کا سامنا کرنے کا وقت آئے تو وہ مشکل سے ہی کر پائے گی اور انجام آخر وہی ہوگا جو ہندوستان کے ۵۰ فی صدی گھرانوں میں ہو رہا ہے اور اس سے پوری قوم کی اور نسلوں کی بربادی ہے۔ ان ہی حالات کو غور کرنے کے بعد ہندوستان میں قانوناً بھی کم عمری کی شادی جُرم ہے۔

آخر میں مَیں یہی کہوں گی کہ کم عمری میں لڑکی کی شادی ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ ورنہ یہ اس کے اور اس کے گھر والوں کے حق میں ایسا ہی ہوگا جیسے کونین کی گولی پر شکر چڑھی ہوئی۔

نور جہاں، دہلی ٦

دوسرا انعام:

شادی نام ہے ایک ایسی عمارت کا جو دو افراد کی آپسی پہچان، اعتماد اور ایثار کے ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ شادی ایک ایسا لڈّو ہے جو کھائے پچھتائے جو نہ کھائے پچھتائے، مگر میں اِس بات سے متفق نہیں ہوں۔ شادی اگر صحیح عمر میں ہو تو اس میں عام طور سے کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اکثر والدین اپنی بیٹی کو بوجھ سمجھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ جلد از جلد اس کی شادی کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرلیں اور وہ اپنی بیٹی کی چھوٹی عمر میں ہی شادی کر دیتے ہیں۔ جب کہ اس کے کھیلنے کھانے کے دن ہوتے ہیں اس پر نہ جانے کتنی ہی ذمہ داریاں آجاتی ہیں۔ شوہر کی ذمہ داری، بچوں کی ذمہ داری اور اکثر سب لوگ ساتھ رہتے ہیں تو ساس سسرا اور نہ جانے کتنے ہی لوگوں کی ذمہ داری اس پر آجاتی ہے۔ وہ لڑکی جسے اِس عمر میں صحت مند ہونا چاہیئے۔ دن بدن کمزور ہوتی جاتی ہے اور اگر طلاق ہو جائے اور وہ ماں باپ کے گھر آبیٹھے تو اکثر اسی کو موردِ الزام ٹھیرایا جاتا ہے اور کوئی یہ نہیں سوچتا کہ یہ قصور اس بے چاری کا نہیں ہے بلکہ خود ان کا ہے۔ کیوں انہوں نے اس معصوم لڑکی کی شادی اتنی چھوٹی عمر میں کی کہ جب وہ اتنی سمجھدار نہیں تھی نہ ہی اس کی ذہنی صلاحیت کی اتنی نشوونما ہو پائی تھی کہ یک لخت وہ اتنی ساری ذمہ داریاں اٹھائے میری نظر میں تو لڑکی کی شادی چھوٹی عمر میں کرنا سراسر اُس پر ظلم کرنا ہے کیوں کہ جب اس کی شادی چھوٹی عمر میں ہوگی تو نہ تو اس کی تعلیم ہی پوری ہو پائے گی جو آج کے زمانے میں اتنی ہی اہم ہے جیسے ہوا اور پانی اور بالفرض اگر اُس پر کوئی بُرا وقت آگیا تو نہ تو وہ خود ہی اپنا پیٹ پال سکے گی اور نہ ہی اپنے بچوں کا، کیوں کہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ اور پھر ہم خود ہی سوچ سکتے ہیں ایسی لڑکی دوسروں کی غلامی کرنے اور اپنے ماں باپ کی ناانصافی پر زندگی بھر رونے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی ہے جنہوں نے اس کو اپنا بوجھ سمجھ کر جیتے جی جہنم میں پھینک دیا ہے۔ یہ تو ایک ایسی برائی ہے جسے کسی نے بھی نہیں سراہا بلکہ اس کو دنیا سے مٹانے کے لئے لوگوں نے کتنی جدوجہد کی اور جی جان ایک کر کے اسے کتنی مشکل سے ختم کر سکے۔ جیسا کہ راجہ رام موہن رائے کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اب ہر عقل مند آدمی سوچ سکتا ہے کہ لڑکی کی شادی چھوٹی عمر میں کرنی چاہیئے یا نہیں؟

طلعت خورشید، علی گڑھ

تیسرا انعام:

شادی ایک مقدس معاہدہ ہے جو لڑکے اور لڑکی کے درمیان باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شادی کم عمری میں کر دینا چاہیئے یا بڑی عمر میں اس بارے میں ہماری مقدس کتاب کلام پاک کا فرمان ہے کہ لڑکی کی شادی میں عجلت کرنا چاہیئے میں اس کو پوری طرح مانتی ہوں کیوں کہ کم عمری کی شادی میں ہی زندگی کا حقیقی لطف مضمر ہے۔ اور فائدہ بھی ہے ماں باپ جلد ہی ایک بہت بڑے فرض سے آزاد ہو جاتے ہیں کم عمر ہونے کی وجہ سے لڑکی آسانی سے اپنے آپ کو دوسرے ماحول میں ڈھال لیتی ہے دوسرے بڑھاپا آنے سے پہلے ہی بچوں کو پال پوس کر اپنے گھر بار کا کر دیتی ہے اور نواسوں پوتوں کو بھی پھلتے پھولتے دیکھ لیتی ہے اِس طرح خاندانی روایات اور اقدار نسلاً در نسلاً حسن و خوبی سے منتقل ہوتی رہتی ہیں اور مذہبی اور اخلاقی قدریں بھی جن کی آج کے سماج کو بہت ضرورت ہے جب کہ پختہ عمر کی شادیاں اختلافات کی نذر ہو جاتی ہیں اور اگر دب بھلے ہی نہ لوٹیں مگر ذہنی خلفشار کا باعث بنتی ہیں پھر بچے کم سن ہی ہوتے ہیں کہ باپ ریٹائر ہو جاتا ہے یا اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے تب بچوں کو ساری عمر محرومی کا شکار ہونا پڑتا ہے اِس لیے کم عمر میں ہی لڑکیوں کی شادی کر دینی چاہیے

عائشہ مشیر علوی، لکھنؤ

ی؛
ے تو ہندوستان میں تمہیں ایک ساتھ رہتے
ے ہزار برس ہوئے ہوں گے اور شروع
لے تم مجھ سے کہیں چھوٹی ہو لیکن جب
تو بہت کچھ اپنے ساتھ لائی تھیں اور
ے ہم میں "ہم سایہ ماں جایہ" کا رشتہ
ہمیں یاد ہے نا کہ تمہارے بھیا البیرونی

البیرونی گیارہویں صدی میں آئے تھے اور کاشی میں گنگا تٹ پہ برسوں رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی صوفی، درویش اور سادھو سنت آپس میں ملتے جلتے رہتے ہوں گے۔ ملتان شہر میں کابل، قندھار سے تجارتی قافلے آتے ہوں گے اور مگدھ، اودھ میں پہنچ کر باہر کے بیوپاری کاروبار کرتے ہوں گے۔ پچھلے دنوں جب تم ملی تھیں تو تم نے پوچھا تھا "بہن" "تم یہیں کی ہو یا کہیں باہر سے آئی؟" میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ تہاس چپ ہے، تواریخ کے اوراق خاموش۔ کون جانے آریہ لوگ باہر سے آئے یا یہیں کے ہیں۔ وہی نہیں، دراوڑ بھی شاید آباد کار رہیں، اصلی باشندے نہیں۔ یہ بات بہرحال سچ ہے کہ یونانی، پارتھین، اسکائی، ہمن اور دوسرے گروہ گھوڑوں پر سوار، تلوار، ڈھال اور نیزے، بلم کے ساتھ آئے۔ مگر ان کے علاوہ وہ اپنی بولی ٹھولی، رہن سہن، رسم رواج بھی لائے۔ اور پھر بھارت کی مٹی میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں نباتات کے لیے سیدھی اپجاؤ ہے، وہاں خیالات کی فصل بھی یہاں خوب پھلتی پھولتی ہے۔ اور اب تو تمہیں یہاں رہتے ہوئے ہزار برس سے اوپر ہو گئے تھے۔ تمہارے دنوں میں ہی کبیر اور فرید، تلسی داس اور سورداس بھگتی رس گھولا، خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور حضرت نظام الدین، گورو نانک اور نام دیو نے پیغامِ حق سنایا۔ تم سب کو جانتی پہچانتی ہو۔ ان کو پڑھ کر سن کر تم خود کہا کرتی ہو کہ بھئی اس دیس کے باسی، چاہے وہ کسی بھی مذہب کے ہوں۔ لیکن ان سب کے لاشعور میں اک "دجلہ جمنی" کیفیت ہے، جو بظاہر دور نظر آتی ہے، مگر باطنی طور پر

دجلہ جمنی

پال

ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ کیا
خیال ہے تمہارا؟

تمہاری سکھی
سبھیتا

سبھیتا بہن

خط ملا۔ طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ دیکھو
بھئی جب ہم آج سے چند سو برس پہلے آپس میں
ملیں تو تمہاری جھولی میں برج بھاشا، کھڑی بولی اور
ہریانوی اور پنجابی کے پھول تھے۔ اور میں اپنے
دامن میں عربی، فارسی اور ترکی بھر کر لائی تھی۔
اور پھر ہم دونوں نے سر جوڑا اور ان کو ملا کر ایک
معجون تیار کی جس کا نام اردو رکھا۔ کیوں یاد ہے نا؟
اور پھر اُسے سب نے چکھا اور اپنایا، خواہ وہ سرشار
ہوں یا شرر، چکبست ہوں یا حالی، کرشن چندر ہوں
یا سعادت حسین منٹو ہو، یا راجندر سنگھ بیدی
اب کہاں تک نام گنواؤں۔ ماضی اور حال پر نظر
ڈالو۔ تو یہ بلا تفریق مذہب و ملت یہ آبِ حیات
ہر ایک نے پیا۔ مگر ہم فقط بول چال کے ذریعہ ہی
زندہ نہیں رہ سکتے۔ مختلف ضروریاتِ زندگی کو
بہت سے سہاروں کی ضرورت رہتی ہے۔ ان
سب کی آمیزش سے ہی سفینۂ حیات دریائے
وقت میں بہتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر
خوراک، پوشاک، رسم و رواج، عادات، عقیدے
لین دین، میلے ٹھیلے، تیوہار، بناؤ سنگھار، خوشی و
غم، گیت گانے، غرض از پیدائش تا مرگ زندگی
کے ساتھ کچھ نہ کچھ لگا ہی رہتا ہے۔ لامحالہ اس پر
گرد و پیش کا اثر بھی پڑتا ہے۔ ہم دونوں پڑوسنیں
چونکہ صدیوں سے ساتھ ساتھ رہ رہی ہیں، اس
لئے ہمارے اختلاف میں اشتراک کا عنصر پیدا
ہونا لازم تھا۔ روحانیت کے نقطۂ نظر سے
اُسے ہم کثرت میں وحدت کا نام دے سکتے ہیں،
جسے ایک نے اہم برہم کہا تو دوسرے نے
انا الحق کا نام دیا۔ ان کے علاوہ روزمرہ کے
معمولات نے ہمیں بہت کچھ سکھایا۔ کچھ تم نے
ہم کو دیا، کچھ ہم نے تم کو بتایا۔ اور اس لین دین
نے ہمیں اخوت اور محبت کا درس دیا۔ اسی لئے
تو اقبال نے فخر کے ساتھ کہا تھا: ہندی ہیں،
ہم وطن ہے....

تمہاری اپنی
تہذیب

پیاری تہذیب — آشیرواد:
نظرِ بد دُور۔ بھئی اب تو تم فلسفہ بگھارنے
لگی ہو۔ لیکن حقیقت سے معمور۔ دراصل
ہندوستانی سماج میں ایک بہت بڑی خوبی ہے
اس میں بے پناہ لچک ہے اور یہ وقت کے
سانچے میں ڈھل جانے کی قدرت رکھتا ہے
اس کے وسیلے آنگن میں آستک بھی ہیں اور
ناستک بھی۔ خدا پرست بھی مادہ پرست بھی
اور بُت پرست بھی ہر ایک اپنی اپنی ڈگر پہ چلتا
ہے اور لطف یہ ہے کہ کوئی کسی کا راستہ نہیں
کاٹتا۔ یہ بھارت کی بڑائی ہے کہ کچھ سماجی قیود
اور کچھ پابندیوں کے باوجود یہ ہر دور میں مختلف
انفرادی کرداروں کے حامل، مختلف طبقوں،
گروہوں اور جماعتوں کے لوگوں کو اپنے طور
پر اپنی پسندیدہ زندگی بسر کرنے کی اجازت دیتا
رہا ہے۔ اور اگرچہ چند نام و نہاد تاریخ داں
اصحاب نے چند واقعات کو توڑ مروڑ کر کسی خاص
شخصیت کو داغ دار کر کے منافرت پیدا کرنے
کی کوشش کی ہے تو اس کے برعکس بہت سے
ذی شعور سُلجھے ہوئے ذہنوں نے ان دھبوں
کو مٹا کر پھر ہم آہنگی اور بھائی چارہ پیدا کر دیا
ہے۔ شروع شروع میں یہ کائیاں ایک دوسرے
سے الگ تھلگ معلوم ہوتیں، مگر یہ ابتدائی دور
کے منفرد اندازِ فکر ہیں۔ برسہا برس کے میل
جول نے اس غیریت کے پردے اٹھا دئے ہیں
اور ہم اتنا گھل مل گئے ہیں کہ [illegible] جلی
ہو گیا۔ میں تم سے متفق ہوں کہ اس میل جول کا
ایک قیمتی ورثہ ہمیں اردو زبان کی شکل میں ملا،
جسے واگھہ سے ناگا اور لیہہ سے راس کماری
تک سمجھا اور بولا جاتا ہے۔ وطن تقسیم ہوا، مگر
اردو کے نام لیوا ہندوستان، پاکستان اور بنگلا دیش
سب ہی جگہ ہیں۔ اگر معاشی تقاضوں کے تحت
یہ کرۂ زمین کے مختلف علاقوں میں جا بسے ہیں
تو بھی تہذیبی، تمدنی لسانی اور ذہنی سرمایہ کے
طور پہ اردو کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اور
یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اس پر سیاسی جوڑ توڑ
اثر نہ کر سکا۔ یہی وہ زبان ہے جس نے انسانی
قدروں کا سدا ساتھ دیا ہے۔ لوگ اس کا
منبع دکن، دلی یا اودھ کے دربار مانتے ہیں۔
میرے خیال میں تو یہ مٹھوں اور درگاہوں سے
شروع ہوئی، جہاں سنسکرت اور عربی کی
بجائے: ہم کہیں اور تم سنو اور سمجھو کے تحت
اس کا جنم ہوا۔ کہو، کیا خیال ہے؟

تمہاری بہن
سبھیتا

سبھیتا جی۔ تسلیم:
اب تو تم عالمانہ باتیں کرنے لگی ہو۔ اور اس
پر طرہ یہ کہ مجھ سے ناقدانہ جواب سُننے کی آرزومند
بھی ہو۔ تو بھئی، اپنا یہ خیال ہے کہ دنیا میں ہر
شخص "میں" میں گرفتار ہے، 'انا' کا شکار ہے۔
اگر یہ بات نہ ہوتی تو جب مسلمان کوئی ہزار برس
قبل اپنی عربی۔ ایرانی تہذیب لے کر یہاں آئے
تو ہندوستانی رسم و رواج کو اپنے سے کم تر
سمجھا ہوگا۔ مگر اس کے برعکس ہندوستانیوں
کو اپنی یُگوں یُگوں سے چلی آئی سبھیتا سے پیار
ہوگا۔ پر وہ بہت طبقہ خود کو خلاصۂ کائنات سمجھتا

ں نے شہر ... مدارج ۔ اور پاٹھ شالوں
ل وچاروں ... کے رنگ میں رنگ کر
ور آدمی میں حد فاصل قائم کی ۔ مسلم
سلمانوں کے جذبۂ محبت و اصول مساوات
ر اخوت سے بے حد متاثر ہوئے، اگرچہ
ہی کٹر ملا جامد مذہبی اصولوں کے حامی
تاہم صوفیوں نے شاہی دربار دوں کی بجائے عام
اروں پر اپنے مسکن عوام کے لئے قائم کئے
س طرح تبلیغ کا کام شروع ہوا ۔ وہ اصل نہ
، اردو، بلکہ وہ دیدہ جبنی " تہذیب کا اصل ماخذ
عام تھے ۔ اور پھر بھگتی تحریک شروع ہوئی
ں صوفی درویشوں اور سنت مہاتماؤں نے
ا حصہ لیا ۔ مذہب یا دھرم انسانی فلاح و بہبود
ئے ہیں ۔ یہی اُن کا مسلک تھا ۔ تبلیغ کے دامن
ہت سے نومسلم ہوئے، لیکن پشتہا پشت کی
مخصوص تہذیب جو اُن کی رگ رگ میں پیوست
ے ایک دم بھول جانا اُن کے لئے ناممکن
، یہی نومسلم لوگ دونوں فرقوں میں حائل
فات کی خلیج کو پاٹنے کے لئے ایک پُل کا
دیئے گئے ۔ وقت کے تقاضوں نے دونوں
ں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع
ور ان دونوں کے میل جول نے دونوں کے
سہن میں اتحاد و یکجہتی کے علاوہ ایک رنگا رنگ
، اور نکھار بھی پیدا کر دیا ۔ اِس طرح قدیم اسلامی
بات اور ہندوانہ رسم و رواج کے سنگم نے
نیا معاشرتی، تمدنی اور تہذیبی باب کھولا ۔
ں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ لیا دیا
زندگی کے ہر شعبہ میں ایک دوسرے کے
ات، رسم و رواج اور دیگر روایات نے
ستہ آہستہ رخنہ اندازی کی ۔ پھر دونوں نے
نا اپنے اندر وقت کے تقاضوں کے ساتھ
پیدا کی اور ایک دوسرے کی تہذیب میں

اس طرح سمو گئے جیسے وہ الگ کی نہیں، خواہ ان
کی تہذیب ہو ۔ ہندوستان کی آب و ہوا میں یقیناً
کوئی جادو ہی ہے کہ یہ ہر کسی کو اپنا کر اپنا بنا لیتی ہے
جیسے میں اور تم ۔ کیوں ؟

فقط تمہاری
تہذیب

تہذیب آپا،

مجھے 'آپا' کا لفظ بہت پسند ہے ۔ اِس
میں اپنا پن ہے ۔ تم نے بہت گہری باتیں لکھیں
اس لئے مجھے بھی اس بار ذرا گہرائی میں جانا ہو گا ۔
تم نے مشترکہ تہذیب کی داغ بیل پڑنے کی نشان
دہی بڑے اچھے پیرائے میں کی ہے ۔ سب سے
پہلے اس سلسلے میں مشترکہ تیوہار رونما ہوئے ۔ یہ تیوہار
عام طور پر فیصلی ہوتے تھے ۔ پیٹ تو ہر ایک
کے ساتھ لگا ہے، خواہ وہ کسی عقیدے
سے تعلق رکھتا ہو ۔ پھر ان تیوہاروں سے نیچے تو
کا احساس ہوتا تھا، نہ ملاؤں پہ حرف آتا تھا ۔ مثال
کے طور پہ بسنت، بیساکھی، لوہڑی ۔ تیج (ساون
کے مہینوں میں) اور ہمالیہ پھولوں کی سیر، جن
میں ہندو مسلم اتحاد کی بھینی بھینی خوشبو ہے ۔
انسان کی تشکیل میں دو بنیادی باتیں کارفرما ہیں
، روحانیت اور مادیت ۔ ایک طرف مذہب،
عقیدہ فلسفیانہ غور و فکر اور دیگر پہلو روحانیت
کے زیر تحت ہیں دوسری طرف مادیت کو ہم
دو حصوں میں بانٹ سکتے ہیں، اوّلاً ذہن دوئم
جسم ۔ ذہن روحانیت اور مادیت کے درمیان ایک
شاہراہ ہے، جس پر چل کر انسان کبھی عرش
سے بلند ہو جاتا ہے اور اگر پھسلے تو فرش سے بھی
پست، قعر ظلمت میں جا گرتا ہے ۔ ذہن کے
مدارج ہر شخص اپنی اپنی سوچ کے مطابق حالات
کے تقاضوں کے تحت طے کرتا ہے ۔ کوئی پڑاؤ
کو منزل سمجھ کر ٹھہر جاتا ہے ۔ کوئی تیز گام ہوتا

ہے، کوئی سست رو، کوئی تازہ دم، کوئی تھکا
سے چُور ۔ یہ انفرادی بات ہے ۔ ہو سکتا ہے بنیادی طور
پر کسی خاص علاقے میں، کسی خاص زمانے میں،
کسی خاص حالات میں خاص وجوہ سے کشمکش کا شکار
ہوتا ہے ۔ یہ بات قطعی انفرادی ہے، اجتماعی نہیں
لیکن ان میں فرق بہت معمولی سا ہوتا ہے ۔
انسانی ادراک کے پیمانے سے اور جمع تفریق کے
بعد جواب کا نام تہذیب ہے، تہذیب کہیں باہر
سے آنے والے کسے اپنا نام "دجلہ" دے کر
ساتھ لاتے ہیں ۔ اور ادھر یہاں گھروں میں
بسنے والے اپنی سبھیتا کو " جنی " کہہ کر پکارتے
ہیں پہلے پہل تو دونوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے، لیکن
ریل کے ڈبے میں چڑھنے اور اندر بیٹھے ہوئے
مسافروں کی طرح بعد میں سمجھوتا ہو جاتا ہے اور
کیا لکھوں ؟ آگے تم جانتی ہی ہو کہ کیا ہوتا ہے
تمہاری سکھی
سبھیتا

میری سکھی،

واہ! کیا تان لی ہے کہ "دم پہ ہکو خیال"
بنا کر رکھ دیا ۔ مان لیا بھائی (معاف کرنا بہن)
ہاں، آمدم برسرِ مطلب ۔ روحانیت کے
اعتبار سے دونوں طبقے اپنے اپنے عقیدوں پر سختی
سے کاربند رہے ۔ اور جیسا کہ پہلے خطوط میں ذکر
آیا ہے، ان کی دیرینہ رفاقت نے صوفی مت،
کبیر پنتھی، گورو نانک جیسے معلم اور دیگر بھگتی
سنتوں، درویشوں گوروؤں اور روحانیت کے
علمبرداروں نے دونوں طبقوں میں یکجہتی
اور ہم آہنگی پیدا کرنے کو جنم دیا ۔ ہندوؤں کے
بھجن کیرتن نے سماع کی مجلسوں کو تقویت بخشی
درگاہوں پر اتنی ہی بھیڑ بھاڑ رہنے لگی جتنی مٹھوں
اور آشرموں میں ۔ ہر غم زدہ اپنے دکھ کا مداوا
تلاش کرنے آتا اور سکون پاتا ۔ چند خود غرض افراد

نے مذہب اور دھرم کے نام پر دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش ضرور کی، لیکن ان خدا کے بندوں نے انہیں ڈھا دیا۔ اور عام آدمی تو روزمرہ کے کام کاج میں اتنا مصروف تھا کہ اس کے لئے سب سے بڑا مسئلہ روٹی، کپڑا اور مکان تھا، جس کا براہِ راست تعلق جسم سے تھا۔

اس ذہن نے جہاں ایک طرف محبت، اخوت، رواداری، پیار اور ایک دوسرے کے لئے بھائی چارے کے جذبے کو ابھارا، وہاں اُس نے روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے بہت کچھ لینا دینا بھی شروع کیا۔ رہنا سہنا بولنا چالنا، لباس، پوشاک، بیاہ شادی، رسم و رواج، بناؤ سنگھار، میلے ٹھیلے، غمی خوشی، میلے تیوہار، کھیل تماشے، نظم، نثر، پڑھنا لکھنا، ہر میدان میں لین دین جاری رہا۔ ان کے علاوہ، زیورات، پھل پھول، باغ باغیچے، قیام، طعام مٹھائیاں اور مشروب، تہذیب و مشاغل، ادب و آداب، بزرگوں کا احترام، بچوں سے پیار، غرض زندگی کا ہر پہلو اس ملی جلی تہذیب سے متاثر ہوا۔ یہ اثر عام لوگوں پر بھی ہوا۔ جنہوں نے اپنے پڑوسیوں سے بہت کچھ سیکھا اور ان کو بہت کچھ سکھایا۔ تاریخ گواہ ہے کہ آدمی مدّتوں جانوروں کی طرح غاروں میں رہا، درختوں پر بندروں کی طرح شاخوں پر صدیاں بسر کیں۔ اس لئے روٹی، کپڑا اور مکان کے مثلث میں کھانے کا ذکر بہت اہم ہے۔ زندہ رہنے کے لئے بہت نہیں تو بھی جو میسر آ گیا (کچا گوشت یا پھل) وہی سہی۔ آگ کی دریافت نے انسان کو بہت کچھ دیا۔ جسم کو حرارت خوراک میں ذائقہ۔ "رگ وید" میں پہلا منتر "اگنی" پر ہی ہے۔ مدّتوں آتش پرستوں نے آگ کی پوجا کی اور اب بھی پارسی اس کو مقدس سمجھتے ہیں۔ اس دَور میں ہم نہ طبقاتی نظام میں منقسم تھے، نہ عقیدوں کے لحاظ سے الگ الگ تھے۔ جب آہستہ آہستہ ہم نے چوپایوں کی خو بو چھوڑ کر مہذب بننا شروع کیا تو تہذیب کا ایک نیا باب کھلا۔ اب کھانے کا ذکر آ ہی گیا ہے تو کسی روز دعوت پر بلاؤ کب آؤں؟

تمہاری بہن

تہذیب

میری بے تکلف بہن،

سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح تمہیں مدعو کروں۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ مزہ تو جب تھا کہ میری رسوئی میں کھانا بنا کر مجھے حیران کرتیں۔ میں تو چاول اور گیہوں کے کھیتوں میں پلی بڑھی۔ سبزیوں کی کیاریاں دیکھیں اور آنگن میں گائے بھینس کے کھونٹے۔ ہمارے یہاں جو کچھ پکتا، وہ ان کا ہی رہینِ منت تھا۔ جیسے دال بھات، چپاتی، کھچڑی کھیر، یوں تو ہندوستان میں چند فرقے گوشت خور بھی تھے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی سبزی خور بن چکے تھے۔ البتہ تم یہاں آنے سے پہلے بکریوں بھیڑوں کے ریوڑوں میں گھومیں۔ صبح کو مرغ کی بانگ سن کر جاگیں۔ اس لئے مُرغی، انڈے سے ہانڈی پکائی۔ مگر جب ہم ملے تو کھانے پینے کی ترکیبوں کا بھی تبادلہ ہوا۔ تمہیں یاد ہے، جب پچھلی مرتبہ تم نے ہماری دعوت کی تھی، تو خیر میں تو سبزی خور تھی، مگر تمہارے میاں نے ہمارے "ان" کو بھی بہت کچھ کھانا سکھا دیا تھا۔ ارے بھئی، ہمیں تو چاول — صرف چاول بنانے آتے تھے اور تم نے اس میں گوشت ملا کر، قبولی، بریانی، قیمہ پلاؤ، مچھلی پلاؤ، مرغ پلاؤ کھلایا — رات گئے تک ذکر کرتے رہے۔ لیکن میرے لئے تم نے مٹر پلاؤ یا پنیر اور کھمبیاں ڈھینگری ملا کے یکایک واہ! کیا بات پیدا کی۔ پھر میں نے تمہیں پوری، کچوری، سموسہ، نون بری کھلائی۔ تم نے کھتولی، کشک قتاب، تنوری، تکین پکوان بنائے اور ان کے ساتھ شیرمال، باقرخانی، کلچے، صاحب میری یاد تمہیں آٹے میں گھی گوندھ کے پراٹھے کھلانے کی تھی۔ لیکن تم کیا کم تھیں۔ سنّا، معذ تو چپ چاپ دیکھا، سیکھا اور پھر پکوان میں مثل طاقی اور پراٹھا بنگاتی، مغلئی، حیدرآبادی، پشاوری نان پکوائے۔

بھئی، دعوت والی بات غلط ہے۔ اب کے آؤ گی (اور ضرور آؤ۔ قسم ہے تم کو) تو میں تمہیں میٹھے پکوان، مال پوا، گلگلے کھلواؤں گی۔ اور تم، میٹھے پراٹھے، میٹھے سموسے اور محبوبی نان بنانا سیکھو گی۔ اپنے "اُن" کو بھی لانا۔ باقی ملنے پر۔

تمہاری دیدی

سبھیتا

میری چٹپٹی سبھیتا،

القاب سے حیران نہ ہونا۔ ہونٹوں کو چاٹ رہی ہوں اور زبان سے "سوں سوں" کر رہی ہوں۔ اس روز بازار کیا گئے، مزہ آ گیا۔ تم مجھے چاٹ کی دکان پر لے گئیں۔ آخر عورت جو ٹھیریں۔ ہماری صنف کو کھٹائی اور مرچ سے عشق ہے۔ تم نے چاٹ، دہی بڑے، آلو کی ٹکیاں، جل زیرہ، بارہ مسالے والی کیا چیز تھی وہ؟ نام یاد نہیں رہا، گول گپے، کھٹا میٹھا پانی، دہی املی والی پاپڑی۔ ساری نعمتیں کھلائیں۔ رات کو مجھ سے وہ پوچھنے لگے کہ سبھیتا کے ساتھ کیا کھایا۔ جب میں نے چٹخارے لے کے بتلایا تو ناک بھوں سکوڑ کر بولے "اونہہ! یہ بھی بھلا کوئی کھانے کی چیزیں ہیں۔ معدہ خراب کرنے کا اہتمام کرنے گئی تھیں؟ اب کل کہو گی، چلو ڈاکٹر کے پاس اور رات بھر کھوں کھوں کرو گی۔" میں جل ہی تو گئی۔ یہ ہم سے الگ ہو کر تمہارے ان کو ساتھ لے گئے تھے۔ میں نے کچھ طنزاً پوچھا تو آپ کہاں کہاں منہ مارتے رہے؟ وہ ہنسے اور بولے "جامع مسجد لے گیا تھا

اپنے یار کو۔ اور سیخ کباب، جلیبی، تلی مچھلی کھلوائی مان گئے نہیں یہ میں نے مونہہ بنا کر کہا "کھانے کے بعد حکیم جی سے دردِ شکم دُور کرنے والا چورن بھی لے آتے۔ تم کوا ہو گئے اور میں ساری رات جاگوں گی" "خیر بہن، نہ میرا گلا خراب ہوا اور نہ اُن کا پیٹ دُکھا۔ اور پھر ایسے سیر سپاٹے کے بعد اگر گھر میں نوک جھونک نہ ہو تو پھر کھانے کا کیا مزہ؟ ہاں، اب دیوالی نزدیک آرہی ہے۔ کہو، کیا کھلا رہی ہو؟ اور کیا لاؤں تمہارے لئے؟ اچھا، بند کرتی ہوں اِس خرافات کو۔ کہیں مجھے صرف پیٹو نہ سمجھ بیٹھو۔

تمہاری
تہذیب

پیاری تہذیب؛

بھئی، خط لکھنے کا سلیقہ تو کوئی تم سے سیکھے۔ میں نہ معلوم کیوں اُونچی آواز میں پڑھ رہی تھی اور یہ میری کرسی کے پیچھے کھڑے زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں چونکی۔ شرارتاً تیوری چڑھا کے کہا "کسی کا ذاتی خط پڑھنا شرم کی بات ہے" اور انہوں نے جواباً مونہہ بنا کر کہا "پڑھنا بری بات سہی، لیکن کراری بات سُننا (گالیوں کو چھوڑ کر) تعزیراتِ ہند کی زد میں نہیں آتی" آخر ہیں تو پولیس والے۔ مگر تمہارا خط سن کر کہنے لگے کہ اپنی سکھی کو لکھ دو کہ سب لوگ دیوالی کے تیوہار پر ضرور آئیں اور تم لوگوں کو اُس شبھ دِوس پر نمنترن کرنا تو ہمارا کرتویہ تھا۔ آج پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ اِن کو قانوں کے علاوہ دین دنیا کی خبر بھی ہے۔ کہنے لگے "لکھو، کہ اس دیوالی پر ہم آپ لوگوں کی خدمت میں لڈّو، پیڑے، امرتی، سندیش، چم چم، رس گلّا، سوہن بھوگ، لونگ لتا، چندر کلا، رس ملائی، مہی دانے، گھیور، گھر چن اور جو آپ کہیں گے، پیش کریں گے۔ اور یہ بھی لکھ دو کہ وہ اپنے محلّے کے جتن حلوائی سے برفی، جلیبی، قلاقند، گلاب جامن، بالوشاہی، گھمو جھے موتی چور لیتے آئیں۔ میں نے شرما کر کہا "اے! مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" تو بڑی سنجیدگی سے بولے۔ "بھئی مفت میں نہیں لے رہے ہیں۔ دام چکائیں گے۔ لیکن مٹھائی وہیں سے منگوائیں گے، کیوں کہ یہ چیزیں وہی بناتے ہیں۔ سوہن حلوا، شاہی حلوا بھی لکھ دو" سو بی بی، یہ اب تمہارا ہوا۔ ویسے نوکروں چاکروں میں بانٹنے کے لئے ہم نے ریوڑیاں، بتاشے، گزک، لورنڈہ، سیل کے لڈّو وغیرہ کا بندوبست کر لیا ہے۔ آنا ضرور۔ دسہرے پر بچوں نے ضد کر کے وہی پٹاخے، پھلجھڑیاں لیں جو ہمارے بھتیجے بھتیجی نے شب برات کو چلائے تھے۔

تمہاری اپنی سکھی
سجیتا

پیاری بہن؛

اتنا میٹھا خط نہ لکھا کرو۔ مٹھائی بہت ہے اور خواہشات کی بہتات۔ بچے جب سے دیوالی منا کر آئے ہیں، کبھی ایک فرمائش کرتے ہیں، کبھی دوسری۔ اب روز دستر خوان پر ایک نہ ایک میٹھی چیز ضرور ہوتی ہے۔ حلوا، سیویاں، فیرنی، فالودہ، میں نے کہا ہے کہ اپنی خالہ کے یہاں جاؤ اور مٹھا، رائتہ، مکھن کھا کر آؤ۔ آخر تم نے گائیں بھینسیں اپنی زمین پر رکھی ہیں۔ خالص دودھ ملتا ہے۔ اور یہاں تو گوالا چار روپے کلو میں، تین روپے کا سفید پانی ملاتا ہے ہاں اب سردیوں کا اختتام ہے۔ شربتوں کے دن آنے کو ہیں۔ گلاب، بادام انار کا شربت بنا رہی ہیں۔ گوبھی، شلغم کا اچار بھی ڈال رہی ہوں۔ بھجوا دوں گی۔ تم اپنے باغ سے موسم آنے پر آم کا اچار مُرَبّا نہ بھولنا۔ مختلف قسم کی چٹنیاں بھی دستر خوان پر بہار دیتی ہیں۔ ہمارے محلّہ میں ایک حکیم صاحب ہیں۔ گُل قند سے مربّوں تک ان سے بنانے کی ترکیب لکھ لوں گی۔ مل کر بنائیں گے۔ باتوں باتوں میں حکیم صاحب نے ایک عجیب بات بتائی کہ پان کا استعمال مسلمانوں نے ہندوؤں سے سیکھا۔ پرانے وقتوں میں "پان کا بیڑا" وہ اٹھاتا جو مشکل کام سرانجام دے سکے۔ لیکن بعد میں مسلمانوں نے اس میں بہت سی جدّتیں پیدا کر کے عوام میں مقبول کر دیا۔ پرانے زمانے میں ترکیب منقّش پاندان جہیز کا حصّہ ہوتا تھا اور بہو کے گھر چلن کا اندازہ اس کے پان کی گلوری بنانے اور پیش کرنے کے ڈھنگ سے کیا جاتا تھا اور اب تو کیا ہندو کیا مسلمان، یہ دونوں کا مشترکہ شغل ہے یہی قصّہ تمباکو کا ہے۔ یہ پرتگالیوں کی دین ہے شروع شروع میں ہندوؤں نے گڑگڑی اور مسلمانوں نے حقّہ پیچوان کے ذریعہ اُسے اپنایا۔ لیکن اب تو سگریٹ، بیڑی عوام کے لئے اور سگار پائپ خواص کے لئے ہو گئے ہیں۔ میں بھی کیا قصّہ لے بیٹھی۔ تمہیں تو سگریٹ کے دھوئیں سے بھی نفرت ہے۔ اور مجھے زردہ بالکل پسند نہیں۔ ہم لوگوں کی دنیا تو باورچی خانہ یا رسوئی گھر تک محدود ہے۔ اللہ اسے آباد رکھے۔

جواب کی منتظر
تہذیب

میری سُگھڑ سکھی؛

اب تو تم خاصی دنیا دار ہوتی جا رہی ہو۔ تمہاری ہتھیلی میں جو سوراخ تھا اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ تم نے اُسے پاٹنا شروع کر دیا ہے۔ اسی لئے باورچی خانے کو اپنی زندگی کا محور بنایا ہے۔ میری نانی جی کہا کرتی تھیں ہمارے گھروں میں کانسی پیتل کے برتن ہوا کرتے تھے۔ گاگر، چھاگل، کڑاہی، تھالی، گلاس، کٹورے

پھر توا، پرات، سل بٹہ، اوکھل، ہمارے رسوئی
گھر میں صراحی، لوٹا، ہاون دستہ، دیگ، پتیلہ،
دست پناہ، تمہارے باورچی خانے کی اولاد
ادھر سے یہ مذکورہ برتن آپ کے ہاں گئے۔ ہم
لوگ پتوں کے دونے بنا کر برہم سمجھ کر کھاتے
آپ لوگوں نے ہم کو مٹی کے گھڑے، صراحیاں،
ہانڈیاں، کوزے اور پھول لگانے کے لئے گملے،
پھول دان بنا کر دے، انگریزوں نے بھی ہمیں
پرچ، پیالے، گلاس اور چینی کے برتن دے۔
لیکن جیسی اُن کی حکومت ویسی اُن کی چیزیں۔
دیکھنے میں صاف ستھری لیکن ٹھیس لگنے سے
ٹوٹ جانے والی ہمارے بزرگوں کو تو اُن کے
برتن ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ وقت کے
ساتھ سبھیتا اور تہذیب، دونوں کو بدلنا پڑتا ہے
بس کیا اور تم کیا۔

اب دیکھو، کوٹ پتلون کا دور دورہ ہے۔
کبھی اس کو کرستانی لباس کہا کرتے جب آپ لوگ
غزنی، قندھار سے آئے تو وہاں کی آب وہوا نے
آپ لوگوں کو ایک مخصوص قسم کا لباس پہننے پر مجبور
کیا۔ گھیرے دار شلوار، لمبا کرتا، قبا، کُلاہ، لنگی،
پگڑی اور جوتی۔ یہاں کی نم آلود گرمی نے لباس کے
تکلف سے بے نیاز رکھا۔ ہم روئی، سوتی اور
لنگوٹی سے زیادہ کے خواہش مند نہ تھے۔ جب
آپ لوگ آئے تو ہم نے بھی خود کو زیادہ ڈھانپنا
شروع کیا۔ پھر تو دونوں نے مل جل کر مشترکہ
لباس بنائے۔ یہاں آکر آپ کو مضبوط دوہرے
تلے اور موٹے چمڑے والی جوتی کی ضرورت نہ تھی۔
پھر ہم نے کھڑاؤں کو تلا کبھی دی اور دونوں نے
مل کر سلیم شاہی، کاشانی، مخمل، چڑھواں
نوک دار، کھری، دیہاتی، سنہری، تلے دار اور
اب میں بوٹ، انگرکھا، سینڈل، چپل پہنے۔ آپ
کی بھاری بھرکم پگڑیوں نے ہندوؤں میں گول
پگڑی کا رواج پیدا کیا۔ کُلہ کی جگہ گول ٹوپی آگئی۔
اور پھر سیاست نے گاندھی ٹوپی اور جناح کیپ
کو جنم دیا۔ شمال مغربی ہندوستان میں شلوار
قمیص ہندو اور مسلمان دونوں پہنتے۔ اتر پردیش
میں کرتا پاجامہ بلا امتیاز مذہب وملت استعمال
ہوتا۔ ہندو عورتوں نے غرارہ پشواز آپ سے
لی اور ساڑھی چولی آپ کو دی۔ ہندوؤں کی
دھوتی کی جگہ مسلمانوں نے تہمد بند کا استعمال شروع
کیا۔ فرق باندھنے کا ہے۔ دجلہ جمنی تہذیب کی
ایک مشترکہ نشانی "اچکن" ہے۔ سب میں یکساں
مقبول۔

آپ کی
سبھیتا

میری سونے کی چڑیا:
خدا تمہیں سدا پیلا پھیلا رکھے (پیلے کا
مطلب یرقان زدہ نہیں، سونے کے زیورات
ہیں) اُس روز گئی تو میں تم سے ملنے کے لئے تھی۔
لے گئیں تم مجھے سیٹھ لکھپت والے کی نور چشمی
پھول وتی کی شادی پر۔ عورتوں کو تو بناؤ سنگھار
کرنا ہی تھا، مرد لوگ بھی کانوں میں بالیاں، گلے
میں کنٹھا، ہاتھوں میں سنہری کڑا اور انگلیوں میں
جواہرات سے جڑی انگوٹھیاں پہنے گھوم رہے تھے
گمربات پیسے کی ہے۔ کہتے ہیں بنئے کی کمائی بیاہ یا
حویلی نے کھائی۔ حویلی بھی بڑی محل نما تھی۔ تم تو
اُس روز شگون اور دوسری رسموں میں مصروف
تھیں۔ میری ایک شناسا بزرگ خاتون
اتفاق سے مل گئیں اور انہوں نے مختلف عورتوں
کی طرف اشارے کر کے زیورات کے بہت سے
نام گنوائے۔ کچھ یاد رہ گئے ہیں۔ جیسے بیج پھول،
لیس پھول، سہرا، ٹیکا، بندی، چمپا جبین پھول،
بندا، آویزہ، کرن پھول، بالیاں، پھول پتی
چمپا کلی، مور بھنور، جھمکا، بجلی مچھلی، پاپڑیاں، کنٹھا
پازیب، لونگ، کوکا، تیلی، پھول، نتھ۔ مجھے اعتراف
ہے کہ ہمارے ہاں بھی اہل ثروت کسی نہ کسی طور
پر زیورات کی نمائش کرتے ہیں۔ بعض خاندانی
گھروں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے
کی غرض سے زرگروں کا گھر بھرتے ہیں۔ اور
زرگر وہی پرانی شراب نئی بوتلوں میں بھر کر پیش
کرتے ہیں۔ جیسے گلوبند، مالا، ہار، گلوبند جڑاؤ،
نولکھا۔ بازوؤں کے لئے بازوبند، کنگن، گجرا،
چوڑیاں۔ کمر کے لئے طلائی پٹکا یا زنجیر۔ پاؤں
میں جھانجریں، پازیب۔ انگلیوں کے لئے طلائی یا
نقرئی انگوٹھیاں، چھلے اور نہ معلوم کیا کیا۔ میرے
خیال میں تو یہ خود نمائی اور خود ستائی کی نشانیاں
ہیں۔

تمہاری
تہذیب

پیاری بہن:
تمہارا خط ملا۔ زیورات واقعی ہم عورتوں
کی کمزوری ہیں۔ دراصل مرد نے قیدیوں والی
ہتھکڑی بیڑی کی بجائے سونے کی زنجیروں سے
ہم کو جکڑا اور ہم نے بلا سوچے انہیں اپنا لیا۔
موجودہ دور کی لڑکی اب ان سے بے نیاز ہوتی
چلی جارہی ہے۔ لیکن رنگ کوئی سا بھی ہو عادت
وہی رہتی ہے۔ گئے وقتوں میں خوشبوؤں کا رواج
تھا۔ ناریل، چنبیلی، بیلا، گلاب، مولسری، موگرہ،
کیوڑہ اور نہ معلوم کون کون سے پھولوں کے
عطر استعمال ہوتے تھے۔ ہوتے اب بھی ہیں،
لیکن بجائے قنوج کے پیرس والے۔ خواہ ان
میں لطافت کم ہو۔ بر سبیل تذکرہ، دادی جی اب
بھی اُس بوڑھی پھونس کو رانی اور اس کے اُجڈ
خاوند کو راجہ کہتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو بیاہ شادی
بزرگ طے کرتے تھے، تمام عمر نبھتی تھی۔ اب
تو عدالت سے شروع ہو کر عدالت میں ختم ہوتی

ہے۔ اور پھر وہ آج کل کے "بیوٹی سیلون" کو
بے نقط سناتی ہیں۔ الٹا سیدھا رنگ روغن۔
قینچی سے بیڑہ مونڈ دو اور روپے ہزاروں کے حوالے۔
پھر آہ بھر کے اپنی اس ماں کو یاد کر کے پرانے قصے
چھیڑتی ہیں جب کہ مشاطہ کا کام تھا بالوں کو گوندھنا
مینڈھیاں بنانا، ٹیڑھی ٹیڑھی مانگ سجانا،
جوڑوں میں پھول سجانا۔ مشاطگی انگریزی میں
بورڈ منگوا کر اور الٹی سیدھی حرکتوں سے نہیں
آتی۔ یہ تو بیٹی ماں سے سیکھتی تھی، جس نے
اپنی دادی پردادی سے یہ ہنر سیکھا تھا۔ اور پھر
جو دے دیا، لے لیا۔ نہ حجت، نہ تکرار۔ بلکہ اس
کے بعد ہزار ہزار بار دعا۔ ہمارے ہاں مانگ
میں سیندور سہاگ کی نشانی تھی۔ آپ لوگوں نے
اسے بنا سنوار کر افشاں کا نام دے دیا۔ اور ساتھ
ساتھ زلفوں کو سنوارنے، چوٹیوں کو سجانے،
اور لمبے ریشمی رنگ برنگے پراندوں کو لہرانے
کا کمال آپ لوگوں نے سکھایا۔ ہماری اماں بی
تو آج کل کی لڑکیوں کو "پرکٹی چڑیاں" کہتی ہیں۔
ویسے سکھی، سچ پوچھو تو رنگ برنگے دوپٹوں میں
ایک الگ شان ہوتی تھی اب میونسپل نل کے
پانی میں وہ پنگھٹ والی بات کہاں۔ میں بوڑھی
تو نہیں ہوئی، کیونکہ تہذیب یا سبھیتا وقت
کے ساتھ جوان ہوتی ہے، پھر بھی کبھی کبھی ہوک سی
اٹھتی ہے۔ اب تو سرخی سے گال لال ملیں تو ملیں،
شرم سے لال نہیں ملتے۔

ہاں، ابھی شاید کچھ دن تمہارے ہاں نہ
آسکوں۔ نیا مکان بنا رہے ہیں۔ انگریزی کی
مثل ہے کہ بے وقوف تعمیر کرتے ہیں عقل مند
ان میں رہتے ہیں۔ مگر نہ معلوم تمہارے میاں
نے ہمارے پتی دیو کے کان میں کیا پھونکا ہے
کہ جٹ گئے۔ دراصل فن تعمیر کو ہندوستان میں
تم نے ہی عروج پر پہنچایا ہے ورنہ ہم لوگ تو
"آشرم باسی" تھے کٹیاؤں میں ڈیرا۔

تمہاری
سبھیتا

میری گھر والی،

القاب کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے تمہیں
تمہارے پتی دیو سے چھین لیا ہے۔ میرا اشارہ
تمہارے اس نئے گھر سے ہے۔ جو تمہارے دیرینہ
خواب کی جیتی جاگتی تعبیر ہے۔ واقعی تمہارا کہنا سچ
ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں فن تعمیر کو
زندۂ جاوید کر دیا۔ ایک جیتی جاگتی مثال تو
تاج محل ہی ہے اور چپے چپے قلعے، محلات،
مقبرے، درگاہیں، حویلیاں۔ ہندوؤں نے بھی
گروہ، گودھیاں، چھتریاں، سمادھیاں جنتر منتر
اور مکانات بنوائے۔

میری پیاری بہن، روحی، کیشر، دوکان
ان تینوں کے بارے میں تو بہت کچھ کہہ سن لیا۔
اس کے علاوہ اس ایک ہزار سال کے میل جول
نے بہت سے رواج، طور طریقے، رفتار گفتار،
ادب و آداب یکساں کر دیے۔ جیسے بچے کی
پیدائش پر خوشی منانا، بچے کو مدرسے بھیجتے وقت
شیرینی بانٹنا، شادی سے پہلے سگائی، ہونے والی
دلہن کو زیورات اور کپڑے بھیجنا، ادھر سے لڑکے
والوں کو شگن یا نذرانہ، رمل، زائچہ، جیوتشی، نجومی
سے شبھ گھڑی ساعت سعید کا مقرر کرانا، پنڈت یا
ملا کا مذہبی اور دھارمک رسوم ادا کرنا، مانجھے
میں بٹھانا، تیل نل کی رسم، مائیوں کے دن، ابٹن
ملنا، سہاگ گیت گانا، مہندی کے نقش و نگار،
دولہا کا سہرا باندھنا۔ برات کا جانا گھوڑی، باجے،
بینڈ، تعارف یا ملنی، دعوت، بری جہیز، رخصتی،
مختصر یہ کہ عقیدوں کے مطابق رسوم الگ الگ،
مگر ان کی نوعیت یکساں، یہی تو "دجلہ جمنی" کہلاتی
ہے۔
ہے تو بدشگونی کی بات، مگر بعد از مرگ
مردے کا غسل، آخری درشن یا دیدار، جنازے کو
باری باری کندھا دینا، قبر یا چتا پر مٹی یا لکڑی
پھینکنا، ہندوؤں میں تیسرے روز تھیاں یا
پھول چننا، مسلمانوں میں سوم پر فاتحہ، سولہویں
دن کریا کی رسم یا چالیس روز کے بعد چہلم، مر
جانے والے کی روح یا آتما کو یاد کر کے خیرات دھن دان
شرادھ۔ کیا یہ سارے رواج ایک جیسے نہیں ہیں۔
یوں سمجھو کہ صدیوں کی رفاقت نے اپنے ایمان
دھرم پر قائم رہ کر بہت سی رسموں کو وقت کے
سانچے میں ڈھال کر ایسا اپنایا کہ پرائی معلوم نہیں
ہوتیں۔

تم بھی گوشت پوست کی بنی ہوئی ویسی ہی [illegible]
[illegible]
کے تمہارا نام سبھیتا ہے [illegible] تہذیب۔ ہم [illegible]
گوئیاں ہو، میں تمہاری سہیلی۔ ہزار برس کی رفاقت
کم نہیں ہوتی۔ اور وقت کے ساتھ انشاء اللہ
اس اخوت اور محبت میں ترقی ہی ہوگی۔ آمین۔
اب کس نے کس کو دیا اور کس نے کس سے
کیا کچھ سیکھا، اس سے غرض نہیں۔ بات فقط اتنی سی
ہے کہ ہندوستان کی تہذیب نے دونوں کو ایک
نئی تہذیب کا علم بردار بنا دیا، ایک نئی سبھیتا سکھائی
جس کا نام "دجلہ جمنی" ہے۔

تمہاری بہن
تہذیب

ہاں، اب کے "پھول والوں کی سیر" کے میلے
میں ایک ساتھ چلیں گے۔ تم جوگ مایا کے مندر
پر پنکھا چڑھانا اور میں حضرت بختیار کاکی کے مزار
پر چادر نذر کروں گی

تمہاری
تہذیب

بانو نئی دہلی

بیوٹی کا راز

شہناز حسین

سائنس دان آج کل بڑھاپے کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ آج تک یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ بڑھاپا کیا چیز ہے؟ چہرے پر آہستہ آہستہ جھریاں کیوں پڑ جاتی ہیں؟ دراصل انسان پیدا ہوتے ہی بوڑھا ہونا شروع ہو جاتا ہے، گو یہ سلسلہ ادھیڑ عمر میں پہنچ کر زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اب تک کی تحقیقات سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یہ ہیں۔ کہ ہر انسان کا جسم خلیوں سے بنا ہے۔ انسان کے جسم میں لاکھوں بلکہ کروڑوں خلیے ہوتے ہیں۔ یہ خلیے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں جب ایک خلیہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا خلیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خلیوں کی موت اور زندگی کا یہ لامتناہی سلسلہ انسان کی پوری زندگی کو محیط ہوتا ہے۔ بچپن اور جوانی میں جتنے خلیے مرجاتے ہیں ان کی جگہ اتنے ہی نئے خلیے جنم لیتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی ہے، یہ توازن بگڑنے لگتا ہے، مثلاً اگر ۱۰۰ خلیے ختم ہو گئے تو ان کی جگہ ۵۰ خلیے ہی کام کرتے ہیں۔ نئے خلیوں کی تعداد گھٹتی رہتی ہے۔ نئے خلیوں کے نہ بننے سے جلد پر اثر پڑتا ہے اور اس پر جھریاں پڑنے لگتی ہیں، کھال میں تناؤ باقی نہیں رہتا، وہ سوکھ کر لٹکنے لگتی ہے۔ یہ سلسلہ تیس پینتیس برس کی عمر میں شروع ہو جاتا ہے، گو اتنا نمایاں نہیں ہوتا۔

جب اتنی بات سمجھ میں آگئی تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلیوں کی موت اور زندگی میں توازن کیسے پیدا کیا جائے۔ اگر کسی دوا یا جڑی بوٹی سے اتنے خلیے پیدا کیے جا سکیں جتنے ختم ہو جاتے ہیں تو انسان کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ سائنس دان انسان کی زندگی کو طویل کرنے کا دعویٰ نہیں کرتے لیکن وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ مستقبل میں انسان ۸۰ برس کی عمر میں بھی بوڑھا معلوم نہیں ہوگا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اسے ۶۰ برس کی عمر تک پہنچنے کے لئے ۸۰ برس درکار ہوں گے، یعنی وہ ۸۰ برس کی عمر میں بھی ۶۰ برس کا معلوم ہوگا۔ تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ ادھیڑ عمر میں ایسٹروجن کی کمی ہو جاتی ہے۔ یہ نسوانی ہارمون ہیں جو جوانی کی دلکشی کو قائم رکھتے ہیں۔ دوران حمل ان ہارمونوں کی پیداوار بہت بڑھ جاتی ہے، اور وضع حمل کے بعد بہت کم رہ جاتی ہے۔ اس لئے حاملہ کے چہرے پر روپ رہتا ہے اور وضع حمل کے بعد چہرہ پہلے سے بھی زیادہ کمزور معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہارمون چالیس پینتالیس برس کی عمر کے بعد بہت کم رہ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے گردن اور چہرے پر جھریاں پڑنی شروع ہو جاتی ہیں۔ جب سائنس یہاں تک پہنچ گئی تو پھر بات آسان ہو گئی۔ اگر جوانی کا دارومدار ایسٹروجن پر ہے تو عورتوں کو بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ایسٹروجن کا استعمال شروع کر دینا چاہئے لیکن بات اتنی آسان نہیں۔ ہارمون کا غلط استعمال کینسر پیدا کر سکتا ہے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب خاندان میں کوئی عورت سینے کے کینسر میں مبتلا رہ چکی ہو۔ ایسٹروجن ایک نئی دریافت ہے یہ بہت مہنگی ہے۔ اس کے ضمنی اثرات کا کوئی پتہ نہیں۔ ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں یہ ارزاں ہو جائے اور اس کے ضمنی اثرات کے متعلق مکمل واقفیت حاصل ہو جائے۔

امریکہ میں آج کل ایسٹروجن کا بہت زور

اس کا ایک انجکشن فوری طور پر جھریاں ختم ہے۔ ۵۰ برس کی عمر کی عورت یک لخت س کی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی جھریوں پر استری کردی ہو، لیکن افسوس دیرپا نہیں ہوتا۔ انجکشن کا اثر صرف ۱۲ گھنٹے ہے اور اس کے بعد اسی تیزی سے تمام جھریاں ار ہوجاتی ہیں جتنی تیزی سے وہ معدوم ہوگئی ں۔ امریکہ میں اس انجکشن کو "سنڈریلا انجکشن" ہیں۔ آپ نے کہانیوں میں پڑھا ہوگا کہ سنڈریلا پنے شاہی لباس اور بلوری جوتوں کے ساتھ ف ایک رات ملتی ہے۔ صبح ہوتے ہی وہی پھٹے پرانے کپڑے پھر اس کے پر آجاتے ہیں۔ یڑ عمر کی عورتیں کسی پارٹی میں جانے سے پہلے انجکشن لگوا لیتی ہیں اور پارٹی میں سب کو رت زدہ کرکے ۱۲ گھنٹے کے اندر گھر واپس جاتی ہیں۔ ہندوستان میں یہ سب ممکن نہیں۔ لیکن جب ایسٹروجن کے متعلق تحقیقات مکمل ہوجائیں گی تو یہاں کی عورتیں بھی اس حیرت انگیز دوا سے فائدہ اٹھا سکیں گی۔

ایسٹروجن کے بعد پانی کا نمبر آتا ہے

پانی دواؤں میں سب سے سستا ہے۔ اس لئے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ جسم پر تیل کی مالش کرنے سے پانی پینا زیادہ بہتر ہے۔ سائنس دانوں نے جلد کے متعلق ایک دلچسپ تجربہ کیا انہوں نے جلد کے دو ٹکڑے کرلئے۔ ایک ٹکڑے کو تیل کی بوتل میں ڈال دیا اور دوسرے کو پانی کی بوتل میں۔ کچھ دن بعد جب دونوں ٹکڑوں کو باہر نکالا گیا تو تیل والا ٹکڑا جھریوں والے چمڑے میں بدل چکا تھا جب کہ پانی والا ٹکڑا ویسا ہی تروتازہ تھا۔ اس تجربے سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ پانی جلد کے لئے بہت مفید ہے۔ جلد کا پانی خشک ہوجانے سے اس پر جھریاں پڑجاتی ہیں۔ اس لئے ہمیں دن میں کافی پانی پینا چاہئے۔ دن میں کم از کم ۸ گلاس ضرور پینے چاہئیں۔ پانی کے متعلق اس انکشاف سے میک اپ کا سامان بنانے والوں کو ایک اور دوا ہاتھ لگ گئی اور وہ ہے موائسچرائزر موائسچرائزر کا سکہ تمام دنیا پر بیٹھ گیا۔ اس سے جلد کی نمی برقرار رہتی ہے اور جلد پر جھریاں نہیں پڑتیں آج کل دنیا کی تمام میک اپ کا سامان بنانے والی کمپنیاں بڑے زور شور سے موائسچرائزر بنا رہی ہیں۔

جس طرح جلد نمی سے تروتازہ ہوتی ہے اسی طرح حرارت سے خشک ہوجاتی ہے۔ جلد کو خراب کرنے میں سورج کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جو عورتیں دن بھر کھیتوں میں کام کرتی ہیں یا عمارت بنانے کے لئے ملبہ ڈھوتی ہیں ان کے جسم گٹھیلے ہوجاتے ہیں لیکن جلد کا ستیاناس ہوجاتا ہے۔ یہ عورتیں قبل از وقت بوڑھی معلوم ہوتی ہیں۔ دھوپ جلد کے لئے نقصان دہ ہے۔ آپ کو کبھی تیز دھوپ میں نکلنا پڑے تو چھتری کا استعمال کریں۔ بہت سرد اور تیز ہوا بھی جلد کے لئے نقصان دہ ہے۔

چہرے کی جھریوں سے زیادہ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کتنا ہی شاندار میک اپ کرلیں۔ کتنا ہی فاؤنڈیشن لگائیں۔ یہ حلقے چھپ نہیں سکتے۔ ان حلقوں کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں، بیماری، پریشانی، ذہنی تناؤ اور غذا کی خرابی کے علاوہ رات کو دیر تک جاگنے سے بھی یہ حلقے پیدا ہوجاتے ہیں۔ ہم پچھلے شماروں میں بتا چکے ہیں کہ آنکھوں کا نچلا حصہ جسم کی واحد جگہ ہے جہاں قدرت نے نمی کے غدود فراہم نہیں کئے ہیں۔ جلد کی خشکی سے سب سے پہلے یہی حصہ متاثر ہوتا ہے، اس لئے اس حصے کو بیرونی نمی کی ضرورت رہتی ہے۔ اگر سوتے وقت اس حصے پر کریم لگائیں تو بہت حد تک اندرونی نمی کی تلافی ہوسکتی ہے۔

مغربی ممالک میں چہرے کی جھریاں ہٹانے کے لئے کچھ ورزشیں عمل میں لائی جاتی ہیں۔ ان ورزشوں سے جھریاں تو صاف ہوجاتی ہیں لیکن چہرے پر سختی آجاتی ہے۔ ورزش سے چہرے کے اعصاب سخت ہوجاتے ہیں اور کرختگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لئے ہم ان ورزشوں کا مشورہ نہیں دے سکتے۔ البتہ گردن کی ورزشیں قابل عمل ہیں۔ ہمارے ملک میں اکثر عورتیں میک اپ کرتے وقت اپنی تمام توجہ چہرے پر صرف کرتی ہیں اور گردن، کلائی اور ہاتھوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتیں۔ یہ بہت بڑی بھول ہے۔ چہرہ میک اپ سے شاندار بنا ہو اور گردن میلی ہو تو ہر صاحب ذوق کو گراں گزرے گی۔ اس کے علاوہ ہاتھوں اور کلائیوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے۔ ادھیڑ عمر میں گلے کا گوشت لٹک جاتا ہے جسے ڈبل ٹھوڑی کہتے ہیں۔ ذیل میں ہم کچھ ورزشیں تجویز کرتے ہیں جن سے نہ صرف گلے کی جھریاں صاف ہوجائیں گی بلکہ ٹھوڑی کا فاضل گوشت بھی کم ہوجائے گا۔

(۱) اپنے سر کو ایک دائرے میں گھمائیے پہلے دائیں طرف سے پھر بائیں طرف سے، ابتدا میں یہ ورزش دو منٹ سے زیادہ نہ کیجئے

(۲) دانتوں کو مضبوطی سے بند کرلیجئے جبڑوں پر زور ڈالئے اور حلقوم کو پیچھے لے جانے کی کوشش کیجئے۔ ۵ منٹ انتظار کرکے ڈھیلا چھوڑ دیجئے۔ یہ ورزش ابتدا میں مشکل معلوم

شہناز حسین

سائنس دان آج کل بڑھاپے کی
یقیقات کر رہے ہیں۔ آج تک یہ بات کسی کی
مجھ میں نہیں آسکی کہ بڑھاپا کیا چیز ہے؟ چہرے
رآہستہ آہستہ جھرّیاں کیوں پڑجاتی ہیں ؟
ر اصل انسان پیدا ہوتے ہی بوڑھا ہونا شروع
ہوجاتا ہے، گو یہ سلسلہ ادھیڑ عمر میں پہنچ کر
یادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اب تک کی تحقیقات
سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یہ ہیں۔
ہر انسان کا جسم خلیوں سے بنا ہے، انسان
کے جسم میں لاکھوں بلکہ کروڑوں خلیئے ہوتے
یں۔ یہ خلیئے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں جب
یک خلیہ ختم ہوجاتا ہے تو اُس کی جگہ دوسرا
ٰلیہ پیدا ہوجاتا ہے۔ خلیوں کی موت اور
ندگی کا یہ لامتناہی سلسلہ انسان کی پوری
ندگی کو محیط ہوتا ہے۔ بچپن اور جوانی میں
جتنے خلیئے مرجاتے ہیں ان کی جگہ اُتنے ہی نئے
خلیئے جنم لیتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے انسان کی
عمر بڑھتی ہے، یہ توازن بگڑنے لگتا ہے، مثلاً
اگر ۱۰۰ خلیئے ختم ہوگئے تو ان کی جگہ ۵۰ خلیئے
ہی کام کرتے ہیں۔ نئے خلیوں کی تعداد گھٹتی
رہتی ہے۔ نئے خلیوں کے نہ بننے سے جلد پر اثر
پڑتا ہے اور اس پر جھرّیاں پڑنے لگتی ہیں، کھال
میں تناؤ باقی نہیں رہتا وہ سوکھ کر لٹکنے لگتی
ہے۔ یہ سلسلہ تیس پینتیس برس کی عمر میں شروع
ہوجاتا ہے، گو اِتنا نمایاں نہیں ہوتا۔

جب اتنی بات سمجھ میں آگئی تو پھر سوال
پیدا ہوتا ہے کہ خلیوں کی موت اور زندگی
میں توازن کیسے پیدا کیا جائے۔ اگر کسی دوا
یا جڑی بوٹی سے اتنے خلیئے پیدا کئے جا سکیں
جتنے ختم ہوجاتے ہیں تو انسان کبھی بوڑھا نہیں
ہوسکتا۔ سائنس دان انسان کی زندگی کو
طویل کرنے کا دعویٰ نہیں کرتے لیکن وہ یہ ضرور
کہتے ہیں کہ مستقبل میں انسان ۸۰ برس
کی عمر میں بھی بوڑھا معلوم نہیں ہوگا۔ یوں سمجھ
لیجئے کہ اسے ۶۰ برس کی عمر تک پہنچنے کے لئے
۸۰ برس درکار ہوں گے، یعنی وہ ۸۰ برس
کی عمر میں بھی ۶۰ برس کا معلوم ہوگا۔ تحقیقات
کے بعد معلوم ہوا کہ ادھیڑ عمر میں ایسٹروجن کی
کمی ہوجاتی ہے۔ یہ نسوانی ہارمون ہیں جو جوانی
کی دِل کشی کو قائم رکھتے ہیں۔ دورانِ حمل اِن
ہارمونوں کی پیداوار بہت بڑھ جاتی ہے، اور
وضع حمل کے بعد بہت کم رہ جاتی ہے۔ اِس
لئے حاملہ کے چہرے پر رُوپ رہتا ہے اور وضع
حمل کے بعد چہرہ پہلے سے بھی زیادہ کم رنگ معلوم
ہوتا ہے۔ یہ ہارمون چالیس پینتالیس برس کی
عمر کے بعد بہت کم رہ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے
گردن اور چہرے پر جھرّیاں پڑنی شروع ہوجاتی
ہیں۔ جب سائنس یہاں تک پہنچ گئی تو پھر
بات آسان ہوگئی۔ اگر جوانی کا دارومدار ایسٹروجن
پر ہے تو عورتوں کو بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتے
ہی ایسٹروجن کا استعمال شروع کردینا چاہئے
لیکن بات اِتنی آسان نہیں۔ ہارمون کا غلط
استعمال کینسر پیدا کرسکتا ہے، خاص طور پر ایسی
صورت میں جب خاندان میں کوئی عورت سینے
کے کینسر میں مبتلا رہ چکی ہو۔ ایسٹروجن ایک
نئی دریافت ہے یہ بہت مہنگی ہے۔ اس کے
ضمنی اثرات کا کوئی پتہ نہیں۔ ممکن ہے کہ مستقبل
قریب میں یہ ارزاں ہوجائے اور اس کے
ضمنی اثرات کے متعلق مکمل واقفیت حاصل
ہوجائے۔

امریکہ میں آج کل ایسٹروجن کا بہت زور

اس کا ایک انجکشن فوری طور پر جھریاں ختم
ہے۔ ۵۰ برس کی عمر کی عورت یک لخت
س کی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی
جھریوں پر استری کردی ہو، لیکن افسوس
دیرپا نہیں ہوتا۔ انجکشن کا اثر صرف ۱۲ گھنٹے
ہے اور اس کے بعد اسی تیزی سے تمام جھریاں
ار ہوجاتی ہیں جتنی تیزی سے وہ معدوم ہوئی
ں۔ امریکہ میں اس انجکشن کو "سنڈریلا انجکشن"
ہیں۔ آپ نے کہانیوں میں پڑھا ہوگا کہ سنڈریلا
نے شاہی لباس اور بلوری جوتوں کے ساتھ
ف ایک رات ملتی ہے۔ صبح ہوتے ہی وہی
نے پرانے کپڑے پھر اس کے پر آجاتے ہیں۔
یز عمر کی عورتیں کسی پارٹی میں جانے سے پہلے
انجکشن لگوا لیتی ہیں اور پارٹی میں سب کو
رت زدہ کرکے ۱۲ گھنٹے کے اندر گھر واپس جاتی
ں۔ ہندوستان میں یہ سب ممکن نہیں۔ لیکن
جب ایسٹروجن کے متعلق تحقیقات مکمل ہوجائیں گی
یہاں کی عورتیں بھی اس حیرت انگیز دوا سے
فائدہ اٹھاسکیں گی۔

ایسٹروجن کے بعد پانی کا نمبر آتا ہے

پانی دواؤں میں سب سے سستا ہے۔ اس لئے
اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ جسم پر تیل کی مالش
کرنے سے پانی پینا زیادہ بہتر ہے۔ سائنس دانوں
نے جلد کے متعلق ایک دل چسپ تجربہ کیا
انھوں نے جلد کے دو ٹکڑے کرلئے۔ ایک ٹکڑے
کو تیل کی بوتل میں ڈال دیا اور دوسرے کو پانی
کی بوتل میں۔ کچھ دن بعد جب دونوں ٹکڑوں کو
باہر نکالا گیا تو تیل والا ٹکڑا جھریوں والے ٹکڑے
میں بدل چکا تھا جب کہ پانی والا ٹکڑا ویسا ہی
تروتازہ تھا۔ اس تجربے سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ
پانی جلد کے لئے بہت مفید ہے۔ جلد کا پانی خشک
ہوجانے سے اس پر جھریاں پڑجاتی ہیں۔ اس لئے
ہمیں دن میں کافی پانی پینا چاہئے۔ دن میں کم از کم
۸ گلاس ضرور پینے چاہئیں۔ پانی کے متعلق اس
انکشاف سے میک اپ کا سامان بنانے والوں
کو ایک اور دوا ہاتھ لگ گئی اور وہ ہے موائس چرائزر
موائس چرائزر کا سکہ تمام دنیا پر بیٹھ گیا۔ اس سے
جلد کی نمی برقرار رہتی ہے اور جلد پر جھریاں نہیں پڑتیں
آج کل دنیا کی تمام میک اپ کا سامان بنانے والی
کمپنیاں بڑے زور شور سے موائس چرائزر بنارہی
ہیں۔

جس طرح جلد نمی سے تروتازہ ہوتی ہے
اسی طرح حرارت سے خشک ہوجاتی ہے۔ جلد کو
خراب کرنے میں سورج کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔
جو عورتیں دن بھر کھیتوں میں کام کرتی ہیں یا
عمارت بنانے کے لئے ملبہ ڈھوتی ہیں ان کے
جسم گٹھیلے ہوجاتے ہیں لیکن جلد کا ستیاناس ہوجاتا
ہے۔ یہ عورتیں قبل از وقت بوڑھی معلوم ہوتی
ہیں۔ دھوپ جلد کے لئے نقصان دہ ہے، آپ
کو کبھی تیز دھوپ میں نکلنا پڑے تو چھتری کا
استعمال کریں۔ بہت سرد اور تیز ہوا بھی جلد کے
لئے نقصان دہ ہے۔

چہرے کی جھریوں سے زیادہ آنکھوں
کے گرد سیاہ حلقے بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ آپ
کتنا ہی شان دار میک اپ کرلیں۔ کتنا ہی
فاؤنڈیشن لگائیں۔ یہ حلقے چھپ نہیں سکتے۔
ان حلقوں کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں، بیماری،
پریشانی، ذہنی تناؤ اور غذا کی خرابی کے علاوہ
رات کو دیر تک جاگنے سے بھی یہ حلقے پیدا ہوجاتے
ہیں۔ ہم پچھلے شماروں میں بتاچکے ہیں کہ آنکھوں
کا نچلا حصہ جسم کی واحد جگہ ہے جہاں قدرت
نے نمی کے ذخائر فراہم نہیں کئے ہیں۔ جلد کی خشکی
سے سب سے پہلے یہی حصہ متاثر ہوتا ہے، اس لئے اس
حصے کو بیرونی نمی کی ضرورت رہتی ہے۔ اگر سوتے
وقت اس حصے پر کریم لگائیں تو بہت حد تک
اندرونی نمی کی تلافی ہوسکتی ہے۔

مغربی ممالک میں چہرے کی جھریاں ہٹانے
کے لئے کچھ ورزشیں عمل میں لائی جاتی ہیں۔ ان
ورزشوں سے جھریاں تو صاف ہوجاتی ہیں لیکن
چہرے پر کھنچ آجاتا ہے۔ ورزش سے چہرے کے
اعصاب سخت ہوجاتے ہیں اور کرختگی پیدا ہوجاتی
ہے اس لئے ہم ان ورزشوں کا مشورہ نہیں
دے سکتے۔ البتہ گردن کی ورزشیں قابل عمل
ہیں۔ ہمارے ملک میں اکثر عورتیں میک اپ
کرتے وقت اپنی تمام توجہ چہرے پر صرف کرتی
ہیں اور گردن، کلائی اور ہاتھوں کو قابل اعتنا
نہیں سمجھتیں۔ یہ بہت بڑی بھول ہے۔ چہرہ
میک اپ سے شان دار بنا ہو اور گردن میلی ہو تو
ہر صاحب ذوق کو گراں گزرے گی۔ اس کے
علاوہ ہاتھوں اور کلائیوں کی نگہداشت بھی
ضروری ہے۔ ادھیڑ عمر میں گلے کا گوشت لٹک
جاتا ہے جسے ڈبل ٹھوڑی کہتے ہیں۔ ذیل میں
ہم کچھ ورزشیں تجویز کرتے ہیں جن سے نہ صرف
گلے کی جھریاں صاف ہوجائیں گی بلکہ ٹھوڑی کا
فاضل گوشت بھی کم ہوجائے گا۔

(۱) اپنے سر کو ایک دائرے میں گھمائیے
پہلے دائیں طرف سے پھر بائیں طرف سے،
ابتدا میں یہ ورزش دو منٹ سے زیادہ نہ کیجئے

(۲) دانتوں کو مضبوطی سے بند کرلیجئے
جبڑوں پر زور ڈالیے اور حلقوم کو پیچھے لے جانے
کی کوشش کیجئے۔ ۵ منٹ انتظار کرکے ڈھیلا
چھوڑ دیجئے۔ یہ ورزش ابتدا میں مشکل معلوم

ہوگی لیکن آہستہ آہستہ آپ کو اس پر عبور حاصل ہو جائے گا۔

(۳) گلے پر کسی اچھی کریم کی مالش کیجئے کریم میں کینولین اور وٹامن ملے ہوں تو بہتر ہے مالش کرتے وقت یہ دھیان رکھیئے کہ ہاتھ کی حرکت اوپر سے نیچے کی طرف ہو، دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں حرکت بھی مناسب ہے لیکن ہاتھ کو نیچے سے اوپر کی طرف ہرگز حرکت نہ دیں۔ اگر مالش کا رخ نیچے سے اوپر کی طرف ہو تو ٹھوڑی کے گوشت میں اضافہ ہو جائے گا۔ دائیں یا بائیں ہاتھ کی تین انگلیوں سے مالش کریں۔

(۴) اپنی ہتھیلی کو پیشانی پر رکھیں۔ سر کو جھکاتے وقت ہتھیلی سے پیشانی کو دبائیں ہتھیلی کا زور مخالف سمت میں نہیں ہونا چاہئے

پھر ہتھیلی کو سر کے دائیں طرف رکھیں اور سر کو دائیں طرف جھکائیں۔ ہتھیلی کا دباؤ بائیں طرف ہونا چاہئے۔ اسی طرح ہتھیلی کو سر کے بائیں طرف رکھیں اور یہی عمل دہرائیں۔

گردن کے لئے ان ورزشوں کے علاوہ حسب ذیل نسخہ روزانہ استعمال کرنا چاہئے۔

صبح سویرے اور رات کو سونے سے پہلے گردن پر کوئی لیمن کلینسنگ کریم لگائیں۔ کریم لگانے کے ذرا بعد اسے پونچھ ڈالیں۔ کریم کو پونچھنے کے لئے ایک پانی میں بھیگا ہوا روئی کا ٹکڑا استعمال کریں۔ خشک روئی کا ٹکڑا نہ استعمال کریں کیوں کہ یہ جلد کی نمی بھی جذب کرے گا۔ اب تین انگلیوں کی مدد سے مالش کریں۔ جب تک گردن میں حرارت اور تازگی کا احساس پیدا نہ ہو جائے یہ مالش جاری رکھیں

اس مالش سے دوران خون تیز ہو جاتا ہے۔

چہرے کے میک اپ کے لئے فاؤنڈیشن ضروری ہے۔ لیکن فاؤنڈیشن جلد کے لئے کچھ زیادہ مناسب نہیں۔ اس سے جلد کے مسامات بند ہو جاتے ہیں۔ انسان کی طرح اس کی جلد کو بھی ہوا کی ضرورت ہے۔ لیکن فاؤنڈیشن میک اپ کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری نظر سے ایسی سینکڑوں عورتیں گزری ہیں جو فاؤنڈیشن کا مستقل استعمال کرتی ہیں اور ان کی جلد بےداغ ہے۔ پھر بھی فاؤنڈیشن جتنا کم استعمال کیا جائے بہتر ہے۔ رات کو سونے سے پہلے میک اپ اتار لینا چاہئے۔ اگر رات بھر فاؤنڈیشن لگا رہے گا تو جلد کو آکسیجن نہ مل سکے گی جو جلد کو تر و تازہ رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

■■

میرا پسندیدہ شعر

خبر یہی عام تھی ہر سو دلوں کے بجھنے کی
وگرنہ شہر میں کچھ قحط روشنی کا نہ تھا
(حسن اجمل مسرت)   جویریہ صدیقہ حیدرآباد

○

مسجدیں بے روح سجدوں کی دکانیں بن گئیں
عشق کے اسرار سے خالی ہیں کعبے کے غلاف
(احسان دانش)

○

سر اٹھاؤ کہ فضا زیست سے معمور ہوئی
پو پھٹی، صبح ہوئی، ظلمتِ شب دور ہوئی
(نامعلوم)

نظیر سہروردی، گیورائی بیڑ

خلوص و محبت یہی تو ہے احساں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں
احسان محسن پوری

○

عمر رواں کو حاجتِ اذنِ سفر نہیں
انسان گھر میں رہ کے بھی اپنے سفر میں ہے

پوچھ لینا کبھی لمحات اگر فرصت دیں
ہم نے کیا سوچ کے پتھر سے بنا یا رشتہ
(گوہر شیخ پوری)   نیلوفر ناہید، الہ آباد

○

ہم نشیں مجھ سے میرے دل کی حقیقت مت پوچھ
اِک نشانی ہے یہ شاید کسی ویرانے کی
(ہمت رائے شرما)   نوری انیس فاطمہ، بمبئی

○

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی
(نامعلوم)

مرزا منور بیگ، ورنگل ■■

"میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سیب کی بھاجی

سیب : ۶ عدد
چینی : ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر (درمیانہ سائز) : ۳ عدد
پیاز (درمیانہ سائز) : ۳ ڈلی
ڈبل روٹی کے سلائس : حسبِ ضرورت
ہرے دھنئے کی پتیاں : ایک ٹیبل اسپون
گھی : ۳ ٹیبل اسپون
نمک : حسبِ ذائقہ

سیبوں کو چھیل کر چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ پیاز چھیل کر کچومر کاٹ لیں ٹماٹروں کا بھی کچومر کاٹ لیں۔

ایک دیگچی میں گھی اور پیاز ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز ادھ کچری ہو جائے تو اس میں لال مرچ، نمک اور ٹماٹر ڈال دیں۔ ٹماٹر گھل جائیں تو سیب اور چینی ڈال دیں اور آنچ دھیمی کر دیں۔ آٹھ دس منٹ بعد بھاجی گھی چھوڑنے لگے تو آنچ سے اتار لیں۔

ڈبل روٹی کے سلائسوں کو تکونا کاٹ کر سینک لیں اور ان کو ایک بڑی پلیٹ میں سجا لیں ان پر گرم گرم بھاجی رکھ کر اوپر سے ہرے دھنئے کی پتیاں چھڑک دیں۔

چوکلیٹ آئس کریم

دودھ (جوش کیا ہوا) : ایک لیٹر
کریم : ۱۰۰ گرام
کوکو : ۲ چائے کے چمچے
چوکلیٹ پاؤڈر : ڈیڑھ چائے کا چمچہ
کسٹرڈ پاؤڈر : ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ونیلا ایسنس : ایک چائے کا چمچہ
چینی : پونی پیالی

آدھی پیالی ٹھنڈے دودھ میں کوکو، چوکلیٹ پاؤڈر ڈال کر گھول لیں۔ باقی دودھ میں چینی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ دودھ ابال آنے لگے تو اس میں چوکلیٹ وغیرہ ملا ہوا دودھ ڈال دیں اور چمچہ چلاتی رہیں دودھ میں تھوڑا گاڑھا پن آجائے تو آنچ سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔

دودھ ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں ونیلا ایسنس اور کریم ملا دیں پھر سانچوں میں بھر کر ریفریجریٹر کے برف والے خانے میں جمانے کے لئے رکھ دیں۔ قلفے میں بھی ڈال کر جمائی جا سکتی ہے۔

ترتیب :-

رشیدہ خاتون

تازہ پھلوں کا شربت

اناناس (ایک انچ موٹا گول) : ایک ٹکڑا
چیری (تازہ) : ۱۲ عدد
اناناس کا عرق : ۲ پیالی
لیمن کی بوتل : ایک عدد
چینی (پسی ہوئی) : پاؤ پیالی
برف کا چورا : حسبِ ضرورت

اناناس کے ٹکڑے کا موٹا موٹا کچومر کاٹ لیں اور عرق میں چینی ڈال کر گھلا لیں پھر اس میں لیمن ملا لیں۔

گلاسوں میں پہلے تھوڑی برف اناناس کا پیڑا چیری ڈال دیں۔ پھر لیمن ملا اناناس کا جوس ڈال دیں۔

چٹپٹی مسور کی دال

دال مسور : ۲۵۰ گرام
لال مرچ : (ثابت) ۱۰ عدد
دھنیا : (ثابت) ۲ چائے کے چمچے
سفید زیرہ : (ثابت) ۲ چائے کے چمچے
ادرک : ڈیڑھ چائے کا چمچہ
لہسن : ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر (درمیانہ سائز) : ۸ ڈلی
ہرے دھنئے کی پتیاں : ایک ٹیبل اسپون
پیاز : (درمیانہ سائز) ۲ ڈلی
پیاز : (بہت چھوٹا سائز) ۸ ڈلی
گھی : پاؤ پیالی
نمک : حسبِ ذائقہ

دال کو صاف کر کے دھو لیں۔ پیاز کو چھیل لیں۔ پھر درمیانہ سائز کی پیاز کے

لچھے کاٹ لیں، پھر لال مرچ، دھنیا اور زیرہ
کو سل پر گیلا باریک پیس لیں، ٹماٹروں
کو دھو کر باریک کچومر کاٹ لیں۔

ایک پریشر کوکر میں دال ثابت پیاز
اور دال گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر کوکر
کو بند کر دیں پھر آنچ پر رکھ دیں۔ دال گل جائے
تو کوکر کو آنچ سے اتار لیں کوکر ٹھنڈا ہو جائے
تو کھول دیں۔

ایک دیگچی میں پیاز کے لچھے اور گھی
ڈال کر آنچ پر رکھ دیں، پیاز ادھ کچری ہو جائے
تو اس میں گیلے پسے ہوئے مسالے، ادرک
اور لہسن ڈال کر دو چار منٹ بھون لیں پھر
ٹماٹر ڈال دیں۔ ٹماٹر گھل جائے تو دال اور
نمک ڈال کر آنچ دھیمی کر دیں۔ آٹھ دس منٹ
بعد دال کو آنچ سے اتار لیں۔

دال ڈش میں نکالنے کے بعد ہرے
دھنیے کی پتیاں چھڑک دیں۔

ناریل گوشت

گوشت : (بغیر ہڈی کا) ایک کلو
ناریل (تازہ) : آدھا
ناریل کا دودھ : ۲ پیالی
آلو : ۵۰۰ گرام
ہری مرچ : ۸ عدد
کالی مرچ : ایک چائے کا چمچہ
ہرے دھنیے کی پتیاں : ڈیڑھ ٹیبل اسپون
خشخاش : ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ (ثابت) : ایک چائے کا چمچہ
جائفل : پاؤ چائے کا چمچہ
ہلدی : آدھا چائے کا چمچہ
ادرک : آدھے انچ کا ٹکڑا
لہسن : ایک چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانہ سائز) : ۲ ڈلی
گھی : پونی پیالی
نمک : حسب ذائقہ

گوشت کی درمیانہ سائز کی گول بوٹیاں
کرا لیں پھر دھو لیں۔ آلوؤں کو چھیل کر درمیانہ
سائز کے ٹکڑے کر لیں، ہری مرچوں کا باریک
کچومر کاٹ لیں، پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔
ناریل کو کدوکش کر لیں پھر آدھے ناریل میں
تین پیالی گرم پانی ڈال کر اس کا دودھ نکال کر
رکھ لیں۔

ایک برتن میں آدھے ناریل کا دودھ
ادرک، لہسن، ہری مرچ، کالی مرچ اور
تھوڑا سا نمک ڈال کر ملا لیں پھر اس میں
گوشت کی بوٹیاں ڈال کر خوب اچھی طرح
ملا لیں اور چار پانچ گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔

ایک دیگچی میں پاؤ پیالی گھی باقی کسا ہوا
ناریل اور تمام باقی مسالے ڈال کر اچھی طرح
بھون لیں پھر آنچ سے اتار کر آدھی پیالی
ناریل کا دودھ ملا کر رکھ دیں۔

ایک دیگچی میں پیاز کے لچھے اور باقی
گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں پیاز بادامی ہو
جائے تو گھی سے نکال کر کسی پلیٹ میں پھیلا دیں
تھوڑی ٹھنڈی ہو جائے تو ہاتھ سے مسل کر
کچومر بنا لیں پھر گھی میں پیاز بھنے ہوئے مسالے
اور مسالے لگا ہوا گوشت ڈال کر بھون لیں
پھر اس میں باقی ناریل کا دودھ اور گوشت
گلنے کے انداز کا پانی ڈال دیں گوشت ادھ گلا
ہو جائے تو آلو ڈال دیں آلو اور گوشت گل جائے اور
تھوڑا سا شوربہ باقی ہو تو آنچ سے اتار لیں۔

ڈش میں نکالنے کے بعد اس پر ہرے
دھنیے کی پتیاں چھڑک دیں۔

گولاش (ہنگری)

انڈر کٹ (گوشت) : ۵۰۰ گرام
ران کا گوشت : ۲۵۰ گرام
ٹماٹر : ۵۰۰ گرام
آلو (چھوٹا سائز) : ۲۵۰ گرام
آلو (بڑا سائز) : ۱۲۵ گرام
پیاز (بڑا سائز) : ۲ ڈلی
لال مرچ : ایک چائے کا چمچہ
ہرے دھنیے کی پتیاں : ۲ ٹیبل اسپون
گھی : آدھی پیالی
مکھن : ایک ٹیبل اسپون
نمک : حسب ذائقہ

گوشت کے ایک ایک انچ کے
چوکور ٹکڑے کرا لیں۔ ٹماٹروں کے چھلکے
اتار کر کچومر کاٹ لیں۔

پیاز چھیل کر ایک پیاز کے لچھے
کاٹ لیں اور ایک پیاز کو سل پر باریک پیس لیں
چھوٹے آلوؤں کو چھیل لیں۔

بڑے آلوؤں کو ابال کر چھیل لیں پھر ان کو
چمچے سے کچل کر تھوڑی سی لال مرچ، نمک اور
مکھن ملا کر رکھ لیں۔ ایک دیگچی میں پیاز کے لچھے
اور گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز بادامی ہو جائے
تو گھی سے نکال لیں پھر اسی گھی میں گوشت
اور پسی ہوئی پیاز ڈال دیں پیاز اور گوشت سرخی
مائل ہو جائے تو لال مرچ، نمک اور ٹماٹر ڈال دیں
گوشت ادھ گلا ہو جائے تو آلو ڈال دیں آلو گل
جائیں اور گوشت کا پانی بھن جائے تو آنچ سے
اتار لیں۔

...یہ صاحبہ:
...ماہ جون کا بانو نظر نواز ہوا۔ قبلہ
...محمد یوسف دہلوی صاحب کے انتقال
...بر سب سے پہلے بی بی سی کی اردو عالمی
...ں سے ملی۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس
...جگہ دے اور تمام متعلقین کو صبرِ جمیل
...فرمائے۔ (آمین)
جون کے پرچہ میں کوثر محمود کا افسانہ
...شکست" اور سلیقہ کلب کے تحت
...راتی مضمون" اینڈ کس کیا ہے" کافی
...پسند آئے۔ پرچہ کو خوب سے خوب تر
...نے کی سعی پر میری طرف سے دلی مبارک باد
...ول فرمائیں۔

نظیر سہروردی، حیدرآباد

...اری بہن سعدیہ:
اچانک سرپرست یوسف دہلوی
...احب کی وفاتِ ناگہانی کی خبر سن کر سخت
...دمہ ہوا۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ
مقام نصیب کرے، آمین۔
مرحوم بڑے پرہیزگار خدا پرست
تھے۔ ان کو رمضان المبارک جیسا مبارک
ماہ نصیب ہوا۔
ان کی وفات سے تاریخ ادب سے
ایک عظیم ہستی اور عظیم صحافی کا زبردست
نقصان ہوا۔ ان کی تلافی بہت مشکل ہے
خدا آپ سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔
آمین

دیبا ترنم، غزالہ تسنیم، گیا

محترمہ آداب:
حافظ جی کے سانحۂ ارتحال کی خبر سن کر
سب کو بہت افسوس ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم
کو غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

طلحہ تابش، پرتاپ گڑھ

سعدیہ صاحبہ:
آپ کے دادا ابا کے انتقال پر
بہت افسوس ہوا۔ میں بانو پابندی سے دیکھتی
ہوں اس ماہ کے تصویری عنوان کی جو آخری
تاریخ لکھی گئی ہے وہ ۱۵ مئی ہے یہ کیا
غضب ہے۔ جون کے پرچہ میں ۱۵ مئی آخری
تاریخ ہے۔ غالباً یہ ۱۵ جولائی ہے۔ جون کے
پرچہ کی تصویر کا عنوان میرے نزدیک
"برکھا کی رُت" موضوع ہوگا۔

رقیہ تنویر، حیدرآباد

محترمہ:
محترم یوسف دہلوی صاحب کے
انتقال پُرملال کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا۔
میں ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ان کی ذات
صحافیوں کے لئے قابلِ تقلید تھی۔ انہوں نے
نصف صدی سے زیادہ کئی نسلوں کی اپنے
رسائل اور جرائد کے ذریعہ ذہنی نشوونما کی
تھی۔ خدا آپ سب لوگ اور ادارہ شمع
بانو اور کھلونا کے اراکین کو صبرِ جمیل عطا
فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں
جگہ دے۔ آمین۔

ضیاء الرحمٰن غوثی، دہلی

پیاری سعدیہ!
آپ کے دادا جناب حافظ یوسف
دہلوی کے انتقال کی خبر پڑھ کر بے حد
دکھ ہوا۔ مرحوم برصغیر کی نامور علمی ادبی
اور صحافتی ہستی تھے۔ ان کی خدمات
دنیائے علم و ادب اور صحافت میں گرانقدر
اہمیت کی حامل ہیں خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت
میں جگہ دے اور آپ تمام لواحقین کو
صبرِ جمیل عطا فرمائے۔
(آمین ثم آمین)
اپنے گھرانے کے تمام افراد کی طرف سے
آپ کے گھرانے کے غم میں شریک آپ کی
دوست۔

صفیہ رشید، کراچی

محترم باجی:
حافظ صاحب کے انتقال کی خبر

پڑھ کر دلی رنج ہوا۔ دعا ہے اللہ رب العزت
مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ اور پس ماندگان
کو صبر کی توفیق عطا کرے۔ آمین

جس محنت، لگن اور دیانت کے
ساتھ مرحوم نے شمع گروپ کو عزت و
شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا تھا اب
آپ کا فرض ہے کہ اس روایت کو آگے
بڑھائیں۔

میں آپ کے اور سب کے غم میں
برابر کا شریک ہوں۔

احمد کلیم فیض پوری

سعدیہ صاحبہ:

بانو کا شمارہ ... سال نامہ دیکھ کر دل
باغ باغ ہو گیا۔ آپ کا سفرنامہ بہت اچھا
لگا۔ اس کی تعریف کرنا گویا آفتاب کو
چراغ دکھانا ہے۔ سال نامہ میں مضامین نظم و
نثر کا انتخاب خوب ہے۔ میری طرف سے
مبارک باد قبول فرمائیے۔

محمد اختر عبدالجلیل برسپلی گیٹ

پیاری سعدیہ:

سال نامہ کے سارے افسانے
بہت پسند آئے۔ مئی کا شمارہ بھی بہت خوب
رہا، ہمیشہ کی طرح افتتاحیہ بہت دل نشین
اور کارآمد ہے۔ زینت دیدی کی طرح آپ
بھی بہت اچھا لکھ لیتی ہیں۔ آخر میں ایک بار
پھر مبارک باد۔

یاسمین سلیم، آمبور

سعدیہ بہن:

مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ بانو ہمیشہ
گوناگوں خوبیوں کا مرقع رہا ہے۔ دل چسپ
افسانوں اور مرصع شعری تخلیقات کے علاوہ
معلوماتی مضامین کی وجہ سے ذہنی استعدادت
کے لئے روشنی کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں
دنیا میں پیش آنے والے عجیب و غریب اور
حیرت ناک واقعات پر سے کتنے فن کارانہ
انداز سے پردہ ہائے راز اٹھایا جاتا ہے
'شادیوں کو کامیاب بنانے والی مشین' اور
'دنیا ری نکیتن کا عالمی بازار' پڑھ کر اس بات
کا شدت سے احساس ہوا۔

"تبسم" اور عصمت چغتائی کے
'بزم بانو' میں سوالوں کے جواب پرچے کے
معیار کو اور بھی بلندی عطا کر رہے ہیں۔

افتتاحیہ کے زیر عنوان آپ کے بلند
خیالات پڑھ کر بے اختیار آپ کو داد دینے
کو جی چاہتا ہے۔

شافعہ شاد، فرید آباد

پیاری بہن:

بانو مئی کا ملا۔ آپ کے افتتاحیہ کا
تو جواب ہی نہیں۔ شافعہ شاد کا افسانہ "قیمت
بے قیمت" پڑھ کر آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔
عنبری رحمن کا "یہ کیسے رشتے" پڑھ کر دل
بہت اداس ہو گیا۔ معلوماتی مضامین "بچوں
کو ساتھ سلانا محبت نہیں عداوت ہے"!
اور "جیہ مودیوی کی لمبی عمر کا راز" بہت اچھے
لگے۔ "خیال اپنا اپنا" میں آپ نے ایچ
حسن (دہلی) کو دوسرا انعام دیا ہے۔ ان کا
ایک ایک لفظ دل کو چھو لینے والا ہے۔
واقعی ملازمت کرنے والی ماں اپنے بچوں کو
مادی عیش و آرام اور زندگی کی سہولتیں تو
دے سکتی ہے مگر جس ممتا سے خدا نے
اس کو نوازا ہے اس سے وہ اپنے بچوں کو
سرشار نہیں کر سکتی۔ اگر ہر ہندوستانی ماں اپنے
بچے کی صحیح تعلیم و تربیت کرے تو آج ملک میں
ایسے فرقہ وارانہ فسادات ہرگز نہ ہوتے۔ ماں
نوکری کے لئے اپنے بچوں کو نوکروں کے رحم و کرم
پر چھوڑ کر ملازمت کے لئے چل دیتی ہے تو بچوں
کے دل میں نہ تو بڑوں کی عزت رہتی ہے اور
نہ چھوٹوں سے محبت، بلکہ بغاوت پیدا ہو جاتی
ہے۔

یاسمین سلیم، آمبور

عزیز بہن:

بانو کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔
افتتاحیہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی دل کی گہرائی
کو چھو گیا۔ زیر نظر شمارے میں عنبری رحمن کا
لکھا افسانہ "یہ کیسے رشتے" آج کے سماج
کے ہر چھوٹے فرد کی کہانی ہے۔ شادی کے
بعد بیٹا عموماً اپنے والدین کو بھول جاتا ہے۔
اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس کی اپنی بھی کوئی
ذمہ داری ہے۔ ماں باپ جس پودے کو
اپنے خونِ جگر سے سینچتے ہیں، جب وہ تناور
درخت بن جاتا ہے تو اس کی ٹھنڈی چھاؤں
کے صرف بیوی بچے ہی حق دار ہوتے ہیں۔
اور والدین کے حصہ میں صرف غم و فکر کی
کڑی دھوپ ہی آتی ہے۔ کہانی "ایثار کا
پھل" بھی اثر انگیز ہے۔ واقعی عورت میں
ایثار کی صفت نمایاں ہوتی ہے۔ وہ محبت
میں مرد کو سب کچھ سونپ کر بھی چپ رہتی ہے
لیکن مرد ہمیشہ اس جذبہ کو سمجھنے سے قاصر رہتا
ہے۔ عشرت کا افسانہ "پتھر کے رنگ" بھی
سبق آموز ہے

رحیم انور، کاماریڈی

آؤ بزم بانو

عصمت چغتائی

> عصمت چغتائی آپ کے
> سوالات کے دلچسپ جوابات
> دیتی ہیں۔
>
> ایک پوسٹ کارڈ پر صرف
> دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے
> نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری
> ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔
> سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ
> نہ لکھیں صرف نام لکھنا کافی ہے۔
> مدیرہ
>
> بزم بانو
> ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

[عش]رت صبیحی، چوہڑ علی بلو در کھنگڑیا

[س]: کوئی عورت اپنے آپ کو صرف مردوں کی تفریح کیوں سمجھتی ہے؟

[ج] دنیا کی زیادہ تر عورتیں مردوں کی سیوا اور تفریح کے لئے ہیں۔ اگر بیوی سے تفریح نہ ہو سکے تو دوسری عورت کے پاس چلا جاتا ہے اس لئے بہت سی عورتیں صرف تفریح سمجھنے لگیں۔ وہ سانچے میں ڈھلتی ہیں سستی پڑتی ہیں آرام سے بھی رہتی ہیں۔ سرمایہ داری سماج کے لئے بہت ضروری ہیں۔

[س]: کون سی رشتے ہے جو لڑکی کو سسرال میں بھی میکے جیسا پیار دیتی ہے؟

ج وہ کوئی نہیں سسرال اور میکے میں پیار پانے کے لئے پیار دینے کا طریقہ اس لڑکی کو آتا ہے جو والدین کو پیاری ہے بوجھ نہیں۔ اسے محبت کرنے کا فن بچپن سے سکھایا گیا ہے۔ اسے دنیا سے پیار کا لین دین نبھانا آتا ہے۔

[سی]د شہاب الدین حیدر، لہریا سرائے

[س]: محبت کب روتی ہے؟

ج محبت تو ایک جذبہ ہے نہ وہ روتا ہنستا ہے نہ چھلکتا اور کھانستا ہے محبت کرنے والا ہی غافل ہوتا ہے کب؟ یہ تو وہی جانے کہ اس کے ہنسنے رونے کا ریکارڈ وہی رکھتا ہے۔

[ملا]کب ممتاز، اڑیسہ

[س]: انسان کو بہت زیادہ پریشانی کے عالم میں کیا کرنا چاہیے؟

ج پہلے تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پینا چاہیے رونے کو جی چاہے تو خوب رو لینا چاہیے۔ اس میں مشکل سے دس منٹ لگیں گے۔ اب پریشانی پر غور کرنا چاہیے علاج سوچنا چاہیے۔ دوست رشتہ داروں سے رائے لینا چاہیے۔

س: زندگی کی قیمت کب معلوم ہوتی ہے؟

ج جب وقت پر ایرپورٹ نہ پہنچے پر پلین کا ٹکٹ بے کار ہو جاتا ہے بس ٹرین اور ریل گاڑی بھی چھوٹ سکتی ہے۔ ویسے وقت پر توجہ نہ دینے سے جان بھی جا سکتی ہے۔ محبوب بھی روٹھ سکتا ہے ہمیشہ کے لئے۔

جمیل احمد اشک، کلیاکرتی، آندھرا

س: انسان اپنے آپ کو اکیلا کب سمجھتا ہے؟

ج جب کسی سے لگاؤ نہ ہو، محبت نہ ہو، تو دو بھیڑ میں بھی تنہائی محسوس ہوتی ہے جب بھی مجھے اکیلے پن سے واسطہ پڑتا ہے میں قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتی ہوں، باتیں کرتی ہوں۔

س: دنیا میں کون سی چیز نازک ہے؟

ج حساس دل جو انجانے لوگوں کا درد بھی اپنے اندر بھر لے۔ مثلاً آپ اس وقت تخیل میں فلسطینیوں کے خیمے میں چلے جائیے جو کھلے میدان میں ننھے بچوں کو بانہوں میں سمیٹے آسمان سے گزرتے بموں کو دیکھ رہے ہیں۔ کیا دیکھا؟ سب سے سستا کیمرہ اور ٹیلی ویژن آپ کا تخیل ہے اور جب ہی انسان دل کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ سکتا ہے سن سکتا ہے جل کر راکھ ہو سکتا ہے پھر جی اٹھتا ہے۔

برہان الدین، شکروولا۔ ایم۔ پی

س: رشوت خوری اور جہیز کی موت کب ہو گی؟

ج: جب لوگ رشوت دے کر نہیں اپنی محنت کے بل پر جینا سیکھیں گے عورت خود جہیز لینے سے انکار کرنا سیکھے گی۔ اپنی کمائی پر جیئے گی۔ ترقی کر کے عہدے پائے گی جہیز بھی تو رشوت ہے۔

س: آج انسان اپنے قریبی رشتہ داروں پر اعتبار کیوں نہیں کرتا؟

ج: کسی پر بھروسہ نہیں اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنا ہی دانش مندی ہے۔ بھیک مانگنا چھوڑ کر خود کچھ کرنا چاہیے۔

حامد مرزا، مہاراشٹر

س: صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو جائے تو؟

ج: تو گھونٹ گھونٹ پی لیجئے پیمانہ دھو مانجھ کر تالے میں رکھ دیجئے اور کنجی کھو دیجئے۔ غلط بات پر کبھی صبر نہ کیجئے۔

سید کرم۔ کریم نگر (اے پی)

س: انسان کی زندگی میں سب سے پہلے آنے والی چیز کون سی ہے؟

ج: سانس، دنیا میں آتے ہی جسم میں سانس لینے کا دم نہ ہو تو پیدا ہونا ہی بیکار جاتا ہے۔

س: دنیا میں پیار کا بدلہ بے وفائی کیوں ملتا ہے؟

ج: کبھی اس گھاٹے کے سودے سے واسطہ نہیں پڑا۔ بے غرض پیار کے جواب میں نفرت تو کبھی نہیں ملتی یہ پرانے گھسے پٹے اقوال ہیں جو اصولِ زندگی ہرگز نہیں۔ ضروری نہیں پیار کے جذبے میں ہر ایک کو بے وفائی ملے کبھی پیار کرنے والے حماقت پر مصر ہو جاتے ہیں۔ یا غلط فرد پر پیار جیسی دولت لٹاتے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دل اور دماغ کی تمام قوتوں کے ساتھ پیار کرنے میں گھاٹا نہیں نفرت کرنے والا خود بھی کرب سہتا ہے۔

رخسانہ جعفری، رانچی

س: زندگی وفا کے نام پر دھبہ کب بنتی ہے؟

ج: جب انسان خود اپنے ملک اپنے خاندان بلکہ اپنے وجود کے ساتھ ناانصافی کرے اور اسے وفا کا نام دے یا اسے جینا سمجھے تو اسے حماقت کہیں گے۔

س: کیا بے وفائی کرنے والوں کو منزل مل جاتی ہے؟

ج: اگر بے وفائی منزل سے کی ہے تو منزل کیسے ملے گی؟ اگر یوں ہی کسی سے بے وفائی کر ڈالی تو اگر ٹکٹ ٹھیک مقام کا ہے تو منزل مل ہی جائے گی۔

نادرہ نوشاد، دوبھری، آسام

س: زندگی اتنی حسین ہے پھر بھی لوگ زندگی سے گھبرا کیوں جاتے ہیں؟

ج: زیادہ مٹھاس سے بھی جی بھر جاتا ہے کوئی کام نہ ہو تو وحشت ہونے لگتی ہے۔ ذمہ داری کا کام زندگی کو خوش گوار بناتا ہے۔

س: اگر انسان کے اوپر مصیبت ہی مصیبت آئے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج: مصیبتوں کا علاج معلوم کرنے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ دنیا میں سوائے موت کے ہر غم کا مداوا موجود ہے

سلطان احمد ملک، کریم نگر

س: انسان کو شخصی آزادی کیوں حاصل نہیں ہے؟

نام کو تو حاصل ہے مگر سماج میں رہنے کے لئے چند اصولوں کی بیڑیاں ہتھکڑیاں لازم و ملزوم ہیں۔

س: انسان کی زندگی میں غموں کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟

ج: وہی جو خوشی کی ہے غم روزگار، غم دوست پھر ساری دنیا کا غم جان کو لگا ہوا ہے یہی انسان کا ورثہ ہے صرف ذہنی بیماروں کو کسی کا غم نہیں ہوتا۔ مبارک ہیں یہ غم کہ دماغی صحت کی پہچان ہیں۔

محمد ایوب، دھرم شالہ، مغل سرائے

س: کوئی بھی مرد اپنی عورت کے داغ دار ماضی کو برداشت کیوں نہیں کرتا؟

ج: مرد عورت کی روٹی کپڑے کا بوجھ اٹھاتا آقا اپنے نوکر پر ہر طرح کی دھونس جماتا ہے۔ خود اپنے سیاہ داغ کی ڈینگیں مارتا ہے لیکن خود کفیل عورت پر حکم نہیں چلا پاتا۔ نام بیوی ہوتا ہے جو عورت محکوم ہوتی ہے اس کی حالت نوکر سے بھی بدتر ہوتی ہے نوکر تو کہیں زیادہ تنخواہ ملے تو چل دیتا ہے بیوی کو کہاں پناہ مل سکتی ہے مرد خدائے مجازی ہوتا ہے۔

عورت آج بھی

افتتاحیہ

خوف کسی آنے والی حقیقی یا خیالی مصیبت یا خطرے کے احساس کا نام ہے۔ اس آنے والی بلا کے اندیشے دل میں پیدا ہونے والے درد اور چبھن کو خوف کہتے ہیں۔ دُکھ ماضی سے تعلق رکھتا ہے اور خوف مستقبل سے۔ خوف کے کئی سرچشمے ہیں۔ مثلاً رائج اخلاق اور قانونی نظام کی خلاف ورزی سے پیدا ہونے والا خوف، پل پل کا خوف وغیرہ۔ عدم اطاعت کے خوف کی بھی مختلف شکلیں ہیں۔ مثال کے طور پر نیت میں کھوٹ اور اپنے غلط اعمال کی سزا کا خوف۔ پل پل کا خوف ارادے بدلنے اور دماغ کی بے چینی سے پنپتا ہے۔ مستقبل کا خوف ماضی کے اعمال اور دُکھ درد سے منسلک ہوتا ہے۔ خوف کے مثبت اور تعمیری روپ بھی ہیں۔ اللہ کی محبت میں ہر وقت اپنے اعمال پر نظر رکھنا مومن کا خوف ہے۔ ولی کی پہچان اس کے دل میں اللہ کی بے پناہ محبت ہے۔ ولی کو اللہ سے جُدا ہونے کا خوف رہتا ہے۔

علم و خوف آپ کے ہتھیار ہیں۔ ان دونوں کے بیچ آنا ہے۔ اپنی اَنا سے ہوشیار رہیے۔ علم کی صلاحیت سے اپنی اَنا پر نظر رکھیے۔ اور مثبت خوف سے اس پر قابو پائیے۔ کامل خوف وہ ہے جو آپ کو غلط عمل سے روکتا ہے۔ آپ کو باقی زندگی کے بارے میں سوچنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ ہر آن اپنے نفس اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے کی شہ دیتا ہے۔

رسول اللہؐ کی حدیث ہے کہ حکمت کا آغاز اللہ کا خوف ہے اور جب انسان کو اللہ کا خوف ہوتا ہے، اللہ ہر شے کو اس سے خوف دلاتا ہے۔ اور جب انسان کو اللہ کا خوف نہیں ہوتا تو اللہ اس انسان کو ہر چیز سے خوف دلاتا ہے۔

سعدیہ دہلوی

یادگار: یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر: شمیم آزاد دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اڑتیسواں سال، ۴۶۲ واں شمارہ
[illegible] کی قیمت: چار روپے
سالانہ قیمت: اڑتالیس روپے

مقام اشاعت و صدر دفتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس: SHMA IN
ٹیلی فون: 272066, 272067 272068
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان: [illegible]
طابع و ناشر: یونس دہلوی

ناشر: [illegible] آفسٹ پریس، دہلی
مطبوعہ: [illegible] پرنٹنگ پریس، دہلی

... جناب سنیل دت نے فلم انڈسٹری کی طرف سے جناب ...
... ساحر کی ... اردو اکادمی کے سیکریٹری جناب ...

وزیر اطلاعات ونشریات جناب وی. این. گاڈگل خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ◄

... گل پوشی کی ▼

اقدام جو سنٹرل ہے۔

اکالی دل کے صدر سنت ہرچرن سنگھ لونگووال اور وزیر اعظم راجیو گاندھی کی بات چیت، مشورہ اور مذاکرات کے بعد آخر کار دونوں لیڈروں نے مسئلۂ پنجاب کا حل نکال کر ایک تاریخی سمجھوتے پر دستخط کر دئے ہیں۔

یہ سمجھوتا وزیر اعظم کا ایک سیاسی کارنامہ ہے۔ اس کارنامے کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے نہیں لگانا چاہئے کہ اس میں کون جیتا کس کے مطالبات زیادہ پورے ہوئے اور کون کتنا پیچھے ہٹا۔ بلکہ سمجھوتے کی افادیت پرکھنے کی اصل کسوٹی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے قومی اتحاد کو کتنا فائدہ ہوا ہے۔ اور ملک کی آبادی کا اکثریت کس حد تک اس سے مطمئن ہے۔

یہ سمجھوتا سنت ہرچرن سنگھ لونگووال کی فراست اور سیاست کی بھی روشن مثال ہے۔ جنہوں نے انتہا پسندوں کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر یہ تاریخ ساز قدم اٹھایا۔

یہ سمجھوتا پنجاب کے گورنر ارجن سنگھ کی سیاسی سوجھ بوجھ اور انتظامی صلاحیت کا بھی کارنامہ ہے۔ وزیر اعظم نے ان کے سپرد جو کام کیا تھا انہوں نے پانچ ماہ میں انجام دے دیا۔

سمجھوتے کی کوششوں کے ضمن میں ایک اور خاص نام سردار سوران سنگھ کا ہے ان کے علاوہ چند اور نام ور ہستیوں کے نام بھی ہیں۔

اس سمجھوتے میں نہ صرف وہ مطالبات شامل ہیں جو شروع میں اکالیوں نے گفت و شنید شروع کرتے وقت پیش کئے تھے۔ بلکہ دوسرے کئی علاقائی مسئلوں کا حل بھی موجود ہے مثلاً راوی اور بیاس کے پانی کی تقسیم کا مسئلہ۔ چنڈی گڑھ (جو کہ مرکز [illegible] زیر اہتمام علاقہ ہے) پنجاب کو سونپا جانا اور اس کے بدلے میں پنجاب کے ہندی بولنے والے علاقوں کو ہریانہ کو منتقل کرنا ہریانہ کے لئے نئی راجدھانی کا بندوبست ہو۔ علاقوں کی نئی حد بندی کا فیصلہ ایک کمیشن کرے گا جو اپنی رپورٹ دسمبر ۱۹۸۵ تک دے دے گا۔ اور علاقوں کا تبادلہ جنوری ۱۹۸۶ میں ہوگا۔

اس کے علاوہ سمجھوتے میں نیا گردوارہ ایکٹ بنانا، ۱۹۸۲ کے بعد ہلاک ہونے والوں کی جان کا اور املاک کے نقصان کا معاوضہ دینا پنجابی زبان کو فروغ دینا اور نومبر ۱۹۸۴ کے فسادات کی تحقیقات کا دائرہ وسیع کر کے دہلی کے علاوہ کانپور اور بوکارو بھی اس کے تحت لے آنا شامل ہیں۔

یہ جامع سمجھوتا ہندوستان کے اتحاد کے لئے یقیناً ایک بڑا قدم ہے۔ اس سمجھوتے نے مفاہمت کا جو پل تعمیر کیا ہے وہ اس کہانی کا آخری باب نہیں ہے۔ اس کے لئے ملک میں عام مفاہمت کی ایک فضا درکار ہے اور ایسی فضا پیدا کرنا ہر ہندوستانی کا کام ہے اگر اس سلسلے میں کوئی کوتاہی ہوئی تو یہ سمجھوتا گویا اپنی روح سے محروم ہو جائے گا۔ ○

وہ یادگار دن

سعدیہ دہلوی

مدینہ منورہ [illegible]
ن ایک مدت سے [illegible]
. گذشتہ رمضان المبارک کے آخرہ
میں یہ سعادت حاصل ہوئی۔ وہاں
مہینے کا کیف، نور اور رونق دیکھنے سے
رکھتے ہیں۔ ہمیں کچھ روزے مکہ معظمہ کے
نصیب ہوئے۔ جمعہ کے پیارے ہم حرم
[illegible]
[illegible]
[illegible]

رمضان [illegible]
ج جیسا سماں ہوتا ہے۔ ساری دنیا
وگ وہاں رمضان گزارنے کے لئے
ہزاروں کی تعداد میں لوگ عمرہ کرتے
ے نظر آتے ہیں۔ [illegible]
ہے، مسجد نبوی یا مکہ کے حرم شریف
نماز کے لئے کم سے کم ایک گھنٹہ پہلے
پنا پڑتا ہے، ورنہ جگہ نہیں ملتی۔ نماز کی
یں دُور دُور تک باہر سڑکوں پر چلی جاتی
۔ یہاں تک کہ مدینہ منورہ میں ایک جمعہ
، روز ہم نماز کے لئے جا رہے تھے تو دیکھا
چلے گھر سے کچھ ہی فاصلے تک جماعت
پہنچ گئی تھی، جب کہ اس گھر سے مسجد تک
ی دوری تھی کہ ہم کو پیدل جانے میں
سدہ بیس منٹ لگتے تھے۔ یہ بھی دیکھا
ہر طرف ٹریفک بند تھا اور دُور دُور تک
م تپتی ہوئی سڑکوں پر لوگ اطمینان سے
از پڑھ رہے تھے، اور سورج کی تیزی کا یہ
الم کہ گھر سے ٹھنڈے پانی سے بھیگے
ے رومال رکی تہہ سر پر باندھ کر چلتے
سے گھر سے نکل کر کچھ قدم چلنے پر ہی

سوکھ جاتے۔ ہاتھ پاؤں اور ہونٹ صحرا کی
خشک گرمی سے پھٹے رہتے۔ مگر ایسی شدید
گرمی میں وہاں سب لوگ روزے رکھتے
ہیں اور نماز پڑھنے کے لئے حرم شریف
آتے ہیں۔ صحیح معنوں میں روزوں کا کیف
یہی ہے۔ اور اللہ کی شان کہ وہ ہمیں روزے
رکھنے کی توفیق اور ہمت دیتا ہے۔
اب تو پھر بھی بہت سی آسانیاں
ہیں مگر [illegible]

دیورالہ کے قریب گاؤں میں ستی ماتا کی سمادھی

رانی ستی کا مندر، بھرت پور

ستیوں کے نام پر میلہ منانا کیا ستیوں کو دوبارہ زندہ نہیں کر رہا ہے؟

انور عظیم

عورت آج بھی ستی ہونا چاہتی ہے

ایک راجستھانی بیوہ کی کہانی

ہندوستان میں ستی کی رسم بہت پرانی ہے۔ مغل بادشاہ اکبر نے اِس رسم کو جرم قرار دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ بھی اِس رسم کو ختم کرانے میں ناکام ہوا۔ اس کے بعد لارڈ ولیم بینٹنک نے کمپنی کے دورِ حکومت میں ستی کے خلاف قانون بنایا۔ لیکن یہ قانون بھی ستی کو بالکل ختم کرنے میں ناکام رہا۔ ۱۹۴۷ کے بعد ملک آزاد ہوا اور یہ قانون سختی سے لاگو کیا گیا۔ ستی ہونے والی عورت کو خودکشی کے الزام میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مدد کرنے والوں کو ترغیبِ قتل کے جرم میں پکڑا جا سکتا ہے۔ عورتوں کی آزادی کی تحریک کے ہم نوا اس رسم کے خلاف ہیں۔ اس کے باوجود آج بھی کبھی کبھی اس رسم کو زندہ کرنے والی عورت کی داستان سننے میں آجاتی ہے۔

۲۵ سالہ جسونت کنور ۰ بچوں کی ماں ہے۔ اس کا خاوند گنپت سنگھ راجستھان کے گاؤں دیوی پورہ کا ایک غریب کسان تھا۔ وہ دمہ کا مریض تھا۔ گذشتہ دنوں وہ اس مرض کا شکار ہو کر مر گیا تو جسونت کنور نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ ستی ہو جائے گی۔ اس نے خاوند کے مرتے ہی اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ ستی

حادثہ

[illegible]
(شکاگو، امریکہ)

زندگی کے سفر کے دوران میں اتار چڑھاؤ بھی آتے ہیں اور حادثے بھی ہوتے ہیں اور ان تمام پریشانیوں کے اور رکاوٹوں کے باوجود زندگی کی گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ ایسا ہی ایک حادثہ نفیسہ کی زندگی میں پیش آیا ۔۔۔ اور وہ حادثہ تھا نفیسہ کی شادی کا۔ شادی اور حادثہ یوں تو ایک دوسرے کی ضد ہیں، لیکن نفیسہ کے ساتھ جو ہوا وہ ایک سچ ہے، ایک تلخ حقیقت ہے۔ کسے خبر تھی کہ جس حسین و دلفریب منزل کی طرف اس کی زندگی کی گاڑی بڑھ رہی ہے، وہ محض ایک سراب تھا۔ حالانکہ ساجد نے حقیقت کو چھپانے کی بہت کوشش کی، لیکن فریب کھل کر رہا۔ اور پھر نفیسہ نے اس دھوکے کے ساتھ ایک سمجھوتا کر لیا اور اسے اپنی قسمت سمجھ کر گلے لگا لیا۔

نفیسہ کی زندگی ویسے بھی کشمکش اور جدوجہد کا دوسرا نام رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اس زندگی سے مطمئن تھی اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے سامنے ایک خوش آئند مستقبل تھا۔ ایک درمیانی طبقے کے خاندان میں کسی فرد کا ڈاکٹری تعلیم حاصل کر لینا کس قدر مشکل ہوتا ہے یہ تو وہی سمجھ سکتے ہیں جو اس دور سے گزرے ہیں۔ ایک متوسط کلرک کی تنخواہ میں پانچ افراد خاندان کے اخراجات پورے کرنا مشکل ہی تو ہوتا ہے جب کہ ان میں کا ایک فرد ڈاکٹری تعلیم حاصل کر رہا ہو اور دوسرے دو افراد بھی کالج میں پڑھتے ہوں۔ نفیسہ سب سے بڑی تھی اور اس کے دو بھائی انٹر کے پہلے اور دوسرے سال میں تھے۔ کالج کی فیس، کتابوں کے اخراجات اور دوسرے خرچ مل ملا کر پورے نہیں پڑتے تو نفیسہ پڑوس میں ٹیوشن کر کے اپنی تعلیم کا خرچ کسی حد تک پورا کر لیتی۔

نفیسہ جب میڈیکل کالج کے آخری سال میں پہنچی تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر [illegible] کا فرض [illegible] نفیسہ کے والدین نے کبھی نہیں سوچا کہ نفیسہ تعلیم پوری کر کے کمانے لگے تو وہ اس کی آمدنی سے استفادہ کریں۔

ایک دن نفیسہ میڈیکل کالج کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی کہ ایک نوجوان نے جس نے مغربی انداز کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا، جس کے لمبے بال کانوں کو چھپاتے ہوئے گردن پر جھول رہے تھے، اس کو روک کر سوال کیا "کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ پرنسپل صاحب کا آفس کدھر ہے مجھے ان سے ملنا ہے۔"

نفیسہ نے دیکھا گوری رنگت اور تیکھے ناک نقشہ کا ایک نوجوان اپنے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نفیسہ نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آفس تو ادھر ہے لیکن شاید وہ آفس میں نہ ہوں۔ میں نے ابھی ان کی کار گیٹ سے نکلتے دیکھی ہے۔"

"اوہ!" نوجوان نے ہلکی سی سیٹی بجاتے ہوئے کہا "تو مجھے کل پھر آنا پڑے گا۔" ایک لمحے رک کر اس نے پھر کہا "میں ایک بزنس کے سلسلے میں پرنسپل صاحب سے ملنا چاہتا تھا۔ میں اپنا تعارف تو کرا دوں پہلے، مجھے ساجد کہتے ہیں ـــ ساجد علی۔ میں امریکہ میں رہتا ہوں اور میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے۔ میڈیکل ایکوپمنٹس سپلائی کرتا ہوں ـــ ہسپتالوں اور میڈیکل کالجوں کے لئے ـــ اب دیکھئے نا، دنیا نے کتنی ترقی کر لی ہے اور ہم اپنے ملکوں میں وہی دقیانوسی آلات استعمال کرتے ہیں۔" ایک لمحہ رک کر اس نے پھر کہا "اوہ، میں نے آپ کے بارے میں تو کچھ پوچھا

[illegible] جب وہ
مڑ کر گیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے
لگا تو نفیسہ نے کہا۔ "آپ کا اندازہ صحیح ہے۔
میں ابھی مکمل ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔ شاید تین چار
مہینے بعد ہو جاؤں۔ ابھی تو ہاؤس جاب کر رہی
ہوں۔"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"
یہ کہتے ہوئے ساجد نے اپنا دایاں ہاتھ مصافحہ
کے لئے آگے بڑھایا۔

نفیسہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ
شاید بھول رہے ہیں کہ آپ اس وقت امریکہ میں
نہیں ہیں۔"

"اوہ!" کہہ کر ساجد نے اپنا آگے بڑھا
ہوا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور کہا۔ "آپ گھر جا رہی ہیں؟
ناگوار خاطر نہ ہو تو میں آپ کو گھر پہنچا دوں؟
وہ سامنے میری ٹیکسی کھڑی ہے۔"

"جی شکریہ" نفیسہ نے ساجد کی بڑھتی
ہوئی بے تکلفی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے
ہسپتال جانا ہے وہاں میری ڈیوٹی ہے۔ اور
یہ ادھر کا گیٹ ہسپتال کا ہی ہے۔"

جب نفیسہ ڈیوٹی ختم کر کے ہسپتال
سے گھر کی طرف چلی تو راستے میں ساجد کے بارے
میں سوچنے لگی۔ نفیسہ کو اپنے بارے میں
اچھی طرح علم تھا کہ وہ بہت ہی معمولی شکل و صورت
کی لڑکی ہے۔ اس کا رنگ بھی سانولا تھا۔
مگر اس کے بارے میں اس کے والدین کو کوئی
فکر تھی تو بس یہی تھی کہ نفیسہ کی شادی میں اس کی

نفیسہ نے اپنی اس کمزوری کے بارے
میں آج تک کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسے دراصل
کبھی یہ سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ اس
کی زندگی کا اگر کوئی نصب العین تھا تو بس یہ
کہ جلد از جلد اپنی تعلیم پوری کر کے والدین کو
ان کی فکروں سے آزاد کر دے اور جہاں تک ہو سکے
ان کے بار کو ہلکا کر دے۔ لیکن آج زندگی میں پہلی
مرتبہ کسی نوجوان نے اس میں دلچسپی دکھائی تو
اس کا وہ احساس جاگ گیا جو کسی بھی نوجوان لڑکی
کا ایک حصہ ہوتا ہے اور جس کے جاگنے کے بعد
لڑکی اپنے آپ کو سمجھنے لگتی ہے کہ "میں بھی
کچھ ہوں۔" اس احساس کو لئے وہ گھر پہنچی اور اپنے
آپ کو آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اپنی شکل
آئینے میں دیکھ کر اسے وہ مایوسی نہیں ہوئی جو پہلے
ہوا کرتی تھی۔ اس کو اپنی معمولی شکل و صورت اور
سانولے رنگ میں بھی بڑی جاذبیت اور کشش
محسوس ہوئی۔ آج کے واقعہ نے اس کے ذہن
میں ایک نئی راہ کھول دی تھی۔

اس کے چند ہی دن بعد اس واقعہ کی
ابتدا ہوئی جو بعد میں اس کے لئے ایک حادثہ ثابت
ہوا۔ اس کے لئے ایک رشتہ آیا۔ "لڑکا امریکہ
سے آیا ہوا ہے۔ لاکھوں ڈالر کا بزنس ہے۔
کافی جائیداد ہے۔" یہ سن کر اس کے کان کھڑے
ہو گئے اور جب اسے پتہ چلا کہ لڑکے کا نام ساجد
علی ہے تو اسے کڑی سے کڑی ملانے میں دیر

اور عزت دار آدمی تھے، بالکل ہی مرعوب ہو گئے
مٹھائی اور [illegible] پھول
کے ٹوکرے، پھولوں کی کئی چنگیریاں اور نہ جانے
کیا کیا لایا تھا۔ چوہدری عزیز الدین کے پرانے
اور خستہ مکان کے سامنے ایک ساتھ دو چار
کاروں کا آ جانا تھا ۔۔۔ وہ تو بالکل بے حواس
ہو گئے۔ زندگی میں پہلی بار انہیں اپنی بے سروسامانی
بے بسی اور بے چارگی کا اس قدر شدت سے
احساس ہونے لگا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو
آتے آتے رہ گئے۔ جہاں وہ اس کیفیت سے
دوچار تھے، وہیں ان کا دل خوشی و مسرت کے
جذبات سے بھی سرشار تھا کہ نفیسہ اپنی زندگی میں
خوش رہے گی۔ ان کو صرف ایک بات کی فکر لگی ہوئی
تھی کہ وہ لوگ لڑکی پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ اور
اگر پسند کر لیں تو نہ جانے کیا کیا مطالبات ہوں۔
کتنا جہیز اور کتنی گھوڑے جوڑے کی رقم مانگیں۔
لیکن جب بات چیت کا مرحلہ آیا تو لڑکے والوں
نے نہ کسی جہیز کا مطالبہ کیا اور نہ کوئی شرائط رکھیں،
بلکہ لڑکی والوں کی ہر بات مان لی۔ لڑکی کو لڑکے
نے خود ہی پسند کر لی تھی وہ خواتین جو لڑکی کو دیکھنے
آئی تھیں کیا اعتراض کر سکتی تھیں؟ یہ تو سب
رسمی کارروائی تھی، ورنہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر
قیمت پر وہ نفیسہ کو اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں اور
عزیز الدین کو انہوں نے اس قدر مرعوب کر دیا
تھا کہ وہ اس کے لئے بسر و چشم تیار تھے۔ حالانکہ دبے
لفظوں میں عزیز الدین کے کچھ رشتہ داروں نے

ی کوٹ پتلون اور اس پر ہیٹ لگائیاں۔
ب دیکھ کر نفیسہ کے ماموں نے کہا یہاں تک
یہ لوگ صرف اپنی دولت کی تشہیر کرتا
نہیں۔ بس انہیں اپنے کپڑوں پر عطر چھڑکنا
ہے۔" لیکن بہو کے سامنے ان کی زبان
ہچکتی تھی پھر یہ بھی خطرہ تھا کہ لوگ یہ نہ کہیں
ی ہوئی بات پر روڑے اٹکا رہے ہیں۔
ت اور وضع داری میں عزیز الدین نے
ت نہیں کہا کہ تو کیا ہوا آخر پڑھے لکھے سمجھ دار
تھے۔ لوگوں کے چہروں پر عزیز الدین نے
الات پڑھ لئے، لیکن یہ کہہ کر ان کا منہ بند
دیا۔ لوگ دیہاتی یا بد سلیقہ ہیں تو کیا ہوا؟ میری
ی کو کون سا ان کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔
دی کے بعد دو چار مہینے لڑکی یہاں رہے گی اور
ں کے بعد اپنے شوہر کے پاس امریکہ چلی جائے گی
ر وہاں کون ہیں؟ نہ ساس سسر نہ نند دیور۔
ی رانی بن کر اپنے گھر راج کرے گی۔"

چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ دیکھتے ہی دیکھتے
یسہ عزیز الدین نفیسہ ساجد علی بن گئی اور اس
ح نفیسہ کی زندگی میں وہ حادثہ ہو گیا جو کسی کی
ندگی میں خانہ آبادی بن کر آتا ہے، لیکن نفیسہ کی
ندگی میں اگر خانہ بربادی بن کر نہیں آیا تو اس کی
میدوں آرزوؤں اور ارمانوں کا خون ضرور کر گیا

شادی کے بعد دو ہفتے پلک جھپکتے گزر
ئے۔ امنگوں کی راتیں، ولولوں کے دن۔ دو
ہفتے ہوتے ہی کتنے ہیں اور وہ بھی شادی کے

[illegible]
[illegible] ساجد علی امریکہ
کے لئے پرواز کر گیا۔

یوں بھی نفیسہ کے ہاؤس سرجن شپ پورا
کرنے میں تین مہینے اور باقی تھے اور ساجد علی نے
اپنی روانگی سے قبل ہی اسے امریکہ بلانے کی ساری
کارروائی مکمل کر دی تھی۔ چنانچہ ہاؤس سرجن شپ
کے پورا ہوتے ہوتے اس کو امریکہ کا ویزا بھی مل گیا
اور ادھر امریکہ سے ساجد علی کے خطوط اور ٹرنک کال
کا تانتا بندھ گیا کہ فوراً پہنچو۔

نفیسہ کے دل میں ایک طرف تو خوشی و
مسرت کے چشمے ابل رہے تھے۔ کچھ تو شوہر سے
ملنے کا اشتیاق اور کچھ امریکہ پہنچنے کی خوشی۔
دوسری طرف فکر اور خدشات سر ابھارتے کہ
پرایا ملک اور اجنبی آدمی — ساجد علی سے
تو دو ہفتے کی ہی شناسائی تھی اور دو ہفتوں
میں دو آدمیوں کے درمیان اجنبیت کہاں دور
ہوتی ہے۔ پھر اسے اپنے ماں باپ اور بھائیوں
سے جدا ہونے کا غم بھی تھا۔ لیکن وہ کر بھی کیا
سکتی تھی؟ یہ تو ہر لڑکی کا مقدر ہے۔ اپنوں کو
چھوڑ کر پرایوں کے ساتھ اپنا گھر بسانا ہی پڑتا
ہے۔ چنانچہ ایک دن اپنے چاہنے والے ماں باپ
اور محبت کرنے والے بھائیوں کو روتا تڑپتا
چھوڑ کر نفیسہ نیو یارک کے لئے پرواز کر گئی۔

راستے بھر نفیسہ مستقبل کے خوش آئند
خواب بنتی رہی۔ ساجد علی کا بہت بڑا کاروبار
ہے۔ وہ بہت مصروف رہتے ہوں گے۔ ان کا
مکان محل جیسا ہوگا۔ ہو سکتا ہے دو چار نوکر بھی
ہوں — یہاں آ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اس کی معلومات
کے مطابق امریکہ میں نوکر کہاں ملتے ہیں۔ امریکہ جیسے

[illegible]
ہے اور مشینوں نے ہر کام کو اس قدر آسان بنا دیا
ہے کہ نوکروں کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ کہیں وہ سوچ
کر ایسی آرام و آسائش کی زندگی کے بعد ساجد
علی اسے کہیں کام کرنے سے نہ روک دے۔ اس کی
تعلیم یوں ہی ضائع نہ جائے، اس کا امریکہ کے
ترقی یافتہ ہسپتالوں میں کام کرنے کی دیرینہ خواہش
صرف خواہش ہی بن کر رہ جائے۔

ائیرپورٹ سے ساجد علی اسے لے کر جب
گھر پہنچا تو اس کے تصور میں بنا ہوا محل دھڑام
سے زمین پر آ گیا۔ ساجد علی کا محل ایک چھوٹا سا
اپارٹمنٹ نکلا، جہاں رات میں پلنگ بچھا دو تو بیڈ روم
بن جاتا ہے اور دن میں پلنگ کھڑا کر دو وہ دیوار
کے اندر چلا جاتا ہے اور کمرہ ڈرائنگ روم بن جاتا
ہے۔ ایک کونے میں چھوٹا سا کچن دوسرے
کونے میں حمام اور بیت الخلا بس یہ تھی اس
محل کی کل کائنات جس کے خواب راستے بھر دیکھتے
ہوئے وہ یہاں پہنچی تھی۔

دو ایک دن بعد جب نفیسہ کی تھکن ابھی
پوری طرح اتری بھی نہیں تھی تو ساجد علی اسے لے کر
کام کی تلاش میں نکل گیا۔ نفیسہ کو معلوم تھا کہ اپنے
ملک میں ڈاکٹری کے سارے امتحانات پاس کرنے
کے باوجود جب تک امریکہ کا امتحان پاس نہ کیا
جائے یہاں کسی ہسپتال میں نوکری نہیں مل سکتی لیکن
ساجد علی نے یہ کہہ کر اس کا منہ بند کر دیا، "ابھی امتحان
میں چار پانچ مہینے اور باقی ہیں تب تک کوئی بھی
نوکری کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس طرح تم
اپنے آپ کو مصروف رکھ سکو گی اور گھر کا
اکیلا پن تمہیں بور نہیں کرے گا اور پھر یہاں
لوگ کوئی بھی کام کرتے ہوئے نہیں شرماتے۔"
اتنا کہہ کر ساجد علی نے دنیا جہاں کے [illegible] اسے

... سے کر ... بڑے آدمی ... اپنی زندگی میں یہ چھوٹا کام کیا تھا۔

امتحان تک چار پانچ مہینے نفیسہ نے جس مشقت سے گزارے، وہ کچھ اس کا ہی دل جانتا ہے۔ دن میں جاب کرتی، شام کو گھر آکر کھانا بناتی اور رات کو امتحان کی تیاری میں مصروف ہو جاتی۔ اس تمام عرصے میں اسے کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع بھی نہیں ملا کہ ساجد علی کا کیا کاروبار ہے اور وہ امپورٹ، ایکسپورٹ کا کاروبار کدھر ہے۔ لاکھوں کے بزنس اور محلوں کے خواب جو یہاں آنے سے پہلے وہ دیکھ آئی تھی، وہ تو گھر میں قدم رکھتے ہی ٹوٹ گئے۔ اب اس کو ساجد سے کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ویسے بھی حقیقت کو کوئی کب تک چھپا سکتا ہے؟ نفیسہ کو بھی معلوم ہو گیا کہ ساجد کا ایک چھوٹا سا اسٹور ہے اور یہی وہ لاکھوں کا بزنس ہے جس کے قصے وہ یہاں آنے سے پہلے سنتی تھی۔ ساجد کی بہنوں نے بتایا تھا کہ ان کے بھائی کا اسٹور اتنا بڑا ہے کہ گاہکوں کو کار میں بیٹھ کر گھومنا پڑتا ہے اور کار میں بیٹھے بیٹھے ہی لوگ شاپنگ کر لیتے ہیں۔ ایئرپورٹ سے آکر ٹیکسی والوں کو ساجد کا نام بتا دیں تو وہ اس کے گھر پہنچا دیتے ہیں، وغیرہ۔ کبھی سوچتے سوچتے نفیسہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ کہ کیا یہی وہ خوشگوار اور حسین مستقبل تھا جس کے لئے وہ اپنے ماں باپ کی محبت اور بھائیوں کے پیار کی قربانی دے کر سات سمندر پار آگئی تھی خصوصاً مختلف کمپنیوں کے بے تکے جاب کرتے ہوئے اسے اپنے آپ پر بڑی شرم آتی۔ اور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر وہ حقارت سے کہتی "ڈاکٹر نفیسہ ہونہہ!"

آج اس حادثے کو گزرے ہوئے پورے چار سال ہو گئے ہیں اور یہ حادثہ نفیسہ کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے اس نے اپنی زندگی سے ایک سمجھوتا کر لیا ہے۔ سارے امتحان پاس کر کے نفیسہ اب ڈاکٹر نفیسہ علی ایم ڈی بن گئی ہے اور ساجد علی کے لئے پیسہ بنانے والی ایک مشین، ساجد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اسے بیوی سے زیادہ ایک مشین کی ضرورت تھی — پیسہ بنانے والی مشین کی۔ اور اس نے وہ مشین حاصل کر لی تھی۔ لیکن نفیسہ اپنے مقصد میں ناکام رہی ہے وہ ساجد کے قالب میں ایک بے غرض، بے لوث پیار کرنے والے شوہر کو تلاش کرتی رہتی ہے۔ لیکن وہ اس میں ناکام ہے اور اب یہی ناکامی، محرومی اور مایوسی اس کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔

اگر آپ کو لیموں کے رس کی تھوڑی مقدار چاہیے تو لیموں پر کسی نوک دار چیز سے سوراخ کر لیں اور حسبِ ضرورت رس نچوڑ لیں۔

●

لیموں سے زیادہ رس حاصل کرنے کے لئے کاٹنے سے پہلے لیموں کو ایک منٹ تک گرم پانی میں بھگو کے رکھنا چاہئے۔

●

سالن کا رنگ اچھا رکھنے کے لئے پیاز کو زیادہ نہ بھونیں تھوڑا

سفید رہنے دیں۔

●

آلو کے تلے ہوئے قتلے یعنی چپس پلاسٹک کی تھیلی میں اچھی طرح منہ بند کر کے رکھیں ملائم نہیں ہوں گے۔

●

کٹے ہوئے لیموں، سیب اور سنترے کھلی ہوئی ہوا لگنے سے جلد بدرنگ ہو جاتے ہیں۔

●

آڑو اور آم کو پکانے کے لئے کاغذ میں لپیٹ کر ڈبے میں بند کر دیں۔

●

سلاد میں ملی جلی سبزیوں اور پتوں پر سرکہ یا لیموں کا رس نہ ڈالیں صرف کٹی ہوئی پیاز کو سرکہ یا لیموں کے رس سے الگ بھگو لیں اور پھر اس کے اوپر دوسری چیزیں کاٹ دیں۔

ہیرے کی کہانی

فضل کریم

ہیرا قدرت کا ایک بیش قیمت
نہ ہے۔ بعض ہیروں کی قیمت کروڑوں
روپے تک پہنچتی ہے۔ لیکن آپ کو یہ معلوم
کر کے حیرت ہوگی کہ ہیرا دراصل کوئلے کی
خالص شکل ہے۔ آج سے لاکھوں سال
پہلے لکڑی کے جنگل زمین کے نیچے دفن ہو گئے
تھے۔ ان میں آگ لگ گئی اور کوئلہ بھٹی میں
جل کر ہیرا بن گیا۔

ہندوستان گزشتہ زمانے میں ہیروں
کے لئے مشہور تھا۔ دنیا کے مشہور اور
بیش قیمت ہیرے مثلاً کوہ نور، ہوپ، ریجنٹ
اورلوف سب ہی ہندوستان کی کانوں سے
نکالے گئے تھے۔ کوہ نور کو جب ملکہ وکٹوریہ کے
تاج کی زینت بننے کے لئے لندن بھیجا گیا
تو یہ ایک بڑا اور ناتراشیدہ ہیرا تھا۔ اس
کے چوکور ٹکڑے بنانے کے لئے اسے بیلجیم کے
ایک مشہور جوہری کے پاس بھیجا گیا۔ اتنے
بڑے اور بیش قیمت ہیرے کو کاٹنا
دل گردے کا کام تھا۔ جوہری نے ڈرتے ڈرتے
اس پر چوٹ لگائی اور جب اسے یہ معلوم ہوا
کہ چوٹ صحیح لگی تو وہ خوشی کے مارے بے ہوش
ہو گیا۔

ہیروں کے لئے ہندوستان کی جگہ
اب جنوبی افریقہ نے لے لی ہے۔ ہندوستان
میں اب ہیرے کی کانیں موجود نہیں، سوا
پنا کے جہاں اب بھی کبھی کبھار ہیرے نکل
آتے ہیں۔ ہیرا سفید رنگ کا ہوتا ہے لیکن جوہری
ہیرے کے تین رنگ مانتے ہیں۔ سب سے
بیش قیمت ہیرا نیلگوں مائل ہوتا ہے۔ اسے
نیلی چھب والا ہیرا کہتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر
سفید اور تیسرے نمبر پر زردی مائل ہیرا آتا ہے
ہیرا خریدنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ لیکن
اب امریکہ کے سائنس دانوں نے صنعتی ہیرا
ایجاد کیا ہے۔ اس کا نام کیوبک زرکونیا ہے
اس ہیرے کی ایجاد نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے
جب یہ مصنوعی ہیرا ہندوستان پہنچا تو یہاں کے
جوہریوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کی قیمت
اصل ہیرے سے بہت کم ہے۔ اس لئے
اسے چاندی کی انگوٹھی میں جڑا جا سکتا ہے۔
اس کے بعد چاندی پر سونے کا پانی چڑھایا
جا سکتا ہے۔ اس طرح اس انگوٹھی میں اور
سونے کی اصلی ہیرے لگی انگوٹھی میں کوئی
فرق نہیں معلوم ہوتا۔ آپ اس انگوٹھی کو پہن کر
اپنی سہیلیوں پر رعب گانٹھ سکتی ہیں کہ آپ
نے اصلی ہیرے کی انگوٹھی پہنی ہے۔

یہ ہیرے دیکھنے میں اصلی ہیروں سے مشابہ
ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کی چمک دمک
عارضی ہوتی ہے۔ اصلی ہیرے کی آب کبھی
ختم نہیں ہوتی۔ جب کہ مصنوعی ہیرے تین
سال بعد اپنی آب و تاب کھو بیٹھتے ہیں۔ اگر
آپ ایسی انگوٹھی خریدنا چاہتی ہیں کہ آپ

کے بعد آپ کی بہو اور اس کے بعد آپ کی پوتی یا نواسی اس انگوٹھی کو پہنے تو آپ کو مایوسی ہوگی۔

اب سوال یہ ہے کہ اصلی ہیرے کی شناخت کیسے ہو۔ اس کے کئی طریقے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ آپ ہیرے کو زبان یا چہرے پر رکھ کر اس کی حرارت یا ٹھنڈک کا اندازہ لگائیں۔ اصلی ہیرا نسبتاً زیادہ ٹھنڈا محسوس ہوگا جب کہ مصنوعی ہیرا گرم محسوس ہوگا۔

اصلی اور نقلی ہیرے کی شناخت کرنے کی دوسری ترکیب یہ ہے کہ انہیں سانس کی نمی پہنچائی جائے۔ اس شناخت کے لئے دونوں قسم کے ہیروں کا موجود ہونا ضروری ہے۔

جب آپ اصلی ہیرے کو اپنے سانس کی نمی پہنچائیں گی تو اس پر ایک بادل سا نمودار ہو جائے گا۔ نقلی ہیرے پر بھی یہ بادل نمودار ہوگا، لیکن یہ بادل دیر تک موجود رہے گا جب کہ اصلی ہیرے سے یہ بادل جلد ہی غائب ہو جائے گا۔

تیسری شناخت یہ ہے کہ آپ اصلی ہیرے پر پانی کی ایک ننھی بوند رکھیں یہ بوند کافی دیر تک اپنی گولائی برقرار رکھے گی جب کہ نقلی ہیرے پر یہ بوند جلد ہی پھیل جائے گی۔

اصلی ہیرے کے کنارے اور کونے برسوں کے استعمال کے بعد بھی اپنی سختی نہیں کھوتے۔ جب کہ نقلی ہیرے کے کنارے دو تین سال کے استعمال کے بعد اپنی سختی کھو بیٹھتے ہیں۔ اصلی ہیرا نہایت تیز اور سخت ہوتا ہے۔ تاریخی روایتوں میں اکثر سننے میں آتا ہے کہ فلاں شہزادی نے اپنی عزت بچانے کے لئے انگوٹھی کا ہیرا کھا لیا یہ بات کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کیوں کہ اگر ہیرا گول ہے اور اس کے کنارے تیز اور نوکیلے نہیں تو یہ معدے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہاں تراشیدہ ہیرا جس کے کونے اور کنارے تیز ہوتے ہیں پیٹ میں چھری یا بلیڈ سے بھی زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط شیشہ ہیرے کی قلم سے کاٹ دیا جاتا ہے۔

ہیرے کی سختی ناپنے کے لئے ایک ترکیب یہ ہے کہ اسے نقلی یاقوت سے رگڑ کر دیکھیں۔ نقلی یاقوت یا روبی بازار میں عام ملتا ہے اس کی قیمت ۱۵ روپے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس یاقوت پر ہیرے سے لکیر کھینچ کر دیکھیں۔ اگر روبی پر لکیر نمودار ہو جائے تو ہیرا اصلی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہیرے پر لکیر نمودار ہو جائے تو ہیرا نقلی ہے۔

اصلی ہیرے میں کبھی کبھی یہ عیب ہوتا ہے کہ یہ بہت زیادہ صاف نہیں ہوتا۔ یہ عیب اسے کاٹنے اور پالش کرنے کے دوران پیدا ہوتا ہے۔ یہی اس کے اصلی ہونے کی پہچان ہے۔ نقلی ہیرے بہت صاف اور چمک دار ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔

اگر آپ ہیرے کو ایسے کاغذ پر رکھیں جس پر کچھ لکھا ہوا ہے تو آپ ہیرے کے نیچے لکھی تحریر نہیں پڑھ سکتیں۔ یہی بات اس کے اصلی ہونے کا ثبوت ہے۔ آپ نقلی ہیرے کے نیچے لکھی ہوئی تحریر آسانی سے پڑھ سکتی ہیں۔

آج کل اصلی ہیرے [illegible] امریکن ڈائمنڈ کے نام سے فروخت ہوتے ہیں۔ جب آپ آئندہ ہیرے کی انگوٹھی یا ناک کی کیل خریدنے جائیں اور جوہری آپ کو امریکن ہیرے کی انگوٹھی دکھائے تو آپ فوراً سمجھ جائیں کہ یہ امریکن ہیرا اصلی ہیرا نہیں بلکہ کیوبک زرکونیا ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے زرکونیا واقعی ایک بیش قیمت دھات ہے یہ ہر رنگ میں دستیاب ہے لیکن یہ ایک قدرتی پتھر ہے۔ اور قدرے مہنگا ہے جب کہ کیوبک زرکونیا نقلی دھات ہے جو کانوں سے نہیں نکلتی۔ بلکہ لیبارٹری میں بنائی جاتی ہے۔ لیکن اگر آپ کو ہیرے پہننے کا شوق ہے اور اس کے دیرپا ہونے کی پروا نہیں تو آپ شوق سے نقلی ہیرے کا زیور خرید سکتی ہیں۔ اصلی ہیروں سے بنا ہوا ایک کانوں کا بندا جس میں ایک قیراط کے دس ہیرے ہوں، سترہ اٹھارہ ہزار روپے سے کم نہیں ہوتا لیکن نقلی ہیرے کا بندا جس میں ایک قیراط کے ۱۰ ہیرے جڑے ہوں ۱۰۰ روپے کے آس پاس مل جاتا ہے۔ آپ نے دونوں بندوں کی قیمت کا فرق دیکھا؟ اصلی ہیرے کے ٹکڑے ۱۲ ہزار روپے فی قیراط ملتے ہیں، جب کہ نقلی ہیرے ۵ روپے قیراط کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں۔

اگر آپ کندن کی جیولری یا چاندی کے زیور سے بور ہو گئی ہوں اور ہیرے کا سیٹ پہننا چاہتی ہوں اور اس کے ساتھ آپ کی جیب اصلی ہیرے کا سیٹ خریدنے کی اجازت نہ دیتی ہو تو آپ کے مسئلہ کا جواب امریکن ہیرے کا سیٹ ہے۔

ایک شخص نے فوج میں ملازمت کی درخواست دی۔ افسر نے اس شخص کے چال چلن کے بارے میں جاننے کے لئے دریافت کیا: "تم فرصت کے اوقات لڑکیوں کے ساتھ تو نہیں گزارتے ہو؟"
اس شخص نے جواب دیا: "جی نہیں، بالکل نہیں۔"
افسر نے پوچھا: "کیا لڑکیوں کے ساتھ رہنے کو تمہارا دل نہیں چاہتا؟"
وہ شخص بولا: "دل تو چاہتا ہے، مگر میری بیوی اس کی اجازت نہیں دیتی۔"

کلیم اختر دل کش، کولار

○

ایک ماڈرن نوجوان دکان میں داخل ہوا اور دکان دار سے بولا: "مجھے کوئی ایسا عید کارڈ دکھایئے جس کے ایک کونے پر بہت خوبصورت گل دستہ بنا ہو، دوسرے کونے میں ایک دل اور تیر، اور نیچے لکھا ہو: "اس ہستی کے لئے جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔"
اتفاق سے دکان میں ایسا کارڈ موجود تھا۔ دکان والے نے دکھایا تو نوجوان بولا: "بالکل

ایک ڈبہ [illegible] دیجئے۔"

زہرہ حنا، حیدر آباد

○

تین بچے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ پہلے بچے نے دوسرے بچے سے کہا: "چنٹو تم کہاں پیدا ہوئے تھے؟"
دوسرا بچہ بولا: "ہم پیدا نہیں ہوئے تھے ہمارے ممی ڈیڈی بہت امیر ہیں، اس لئے ہمیں بمبئی سے خرید لائے تھے۔"
پھر دوسرے بچے نے پہلے بچے سے پوچھا: "منو تم کہاں پیدا ہوئے تھے؟"
منو نے جواب دیا: "ہم بھی پیدا نہیں ہوئے تھے ہمارے بھی ممی پاپا بہت امیر ہیں وہ مجھے لندن سے خرید کر لائے ہیں۔"
اب دونوں نے تیسرے بچے سے پوچھا: "اور چھوٹو تم کہاں پیدا ہوئے تھے؟"
چھوٹو کا جواب تھا: "ہمارے ابا امی بہت غریب ہیں، اس لئے انہوں نے مجھے گھر میں ہی بنا لیا۔"

سیدہ شبانہ قادری، خواجہ نگر، گلبرگہ

○

ایک شاعر اس کی بیوی نے کہا: "اجی سنئے! یہ کیا، جب دیکھو آپ کے ہاتھ میں قلم اور شاعری کی بیاض رہتی ہے۔ کاش میں بیوی

[illegible]
شاعر بولا: "ارے نہیں بیگم! کاش تم ڈائری ہوتیں تاکہ میں ہر سال بدل دیتا۔"

تمینہ روبینہ، آمبور

○

بیوی: اگر آپ کا مجھ سے پہلے انتقال ہو گیا تو میں ہر ہفتہ آپ کے پسندیدہ سگریٹ کا پیکٹ آپ کی قبر پر یہ ثابت کرنے کے لئے چڑھایا کروں گی کہ میں نے آپ کو فراموش نہیں کیا ہے۔
شوہر: کیا ماچس کی ڈبیا بھی لاؤ گی!
بیوی: بچکانہ باتیں نہ کیجئے ڈارلنگ آپ جس جگہ جائیں گے، وہاں سگریٹ سلگانے کے لئے ماچس کی ضرورت نہیں پڑ سکے گی۔

صبا کماری، پڈگھا

○

ایک صاحب میونسپل الیکشن میں جب جیت گئے تو ان سے ملنے جلنے والوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ ان کو رات کو سونے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھے۔ ایک رات کو وہ کھانا کھا کر صوفے پر بیٹھے تھے کہ ان کو جھپکی آگئی۔ اتنے میں نوکر دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا "باہر بارش آگئی ہے" وہ صاحب نیند کی حالت میں ہی بولے "اسے کہہ دو کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے" (تارہ شمیم، سیوان)

خود بھی ہنسئے، دوسروں کو بھی ہنسایئے۔ نئے نئے، مزہ دار، چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجئے۔ پرانے، گھسے پٹے، بار بار سنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجئے، کیوں کہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

گیت

پائل ٹوٹ گئی تو کیا ہے، ناچوں گی میں جھنن جھنن
سننے والا کوئی نہیں ہے، پاگل، پیاسا، پیار کا من

دھرتی ویراں، پیاسا ساگر، زخم کہیں تو داغ کہیں
اندھیاروں کا راج ہے من میں، پیار کا کوئی دیپ نہیں
دنیا بھر کے دکھ آتے ہیں، آ کر بس جاتے ہیں یہیں

اندھیاروں میں بھی ناچوں گی، ناچ جو ٹھہرا میرا فن
پائل ٹوٹ گئی تو کیا ہے، ناچوں گی میں جھنن جھنن

میٹھے بول سنوں تو کس سے کوئی ملے بھی بولنے والا
کون سی سمت، چلوں میں آخر، دیپ کہیں نہ کوئی اجالا
اندھیاروں نے جنم دیا، تنہائی نے مجھ کو پالا

ایسے میں نہ ناچوں گی تو بہلے کیسے میرا من
پائل ٹوٹ گئی تو کیا ہے، ناچوں گی میں جھنن جھنن

جھوٹے سارے پیار کے بندھن، جھوٹی ہے سنسار کی ریت
کوئی نہ سمجھے میرے من کو، کوئی نہ جانے پیار کی ریت
پیار کے دامن سے نکلی اقرار کی ریت، انکار کی ریت

پیار سے وابستہ ہے جگ میں رِیتوں کا ہر ایک چلن
پائل ٹوٹ گئی تو کیا ہے، ناچوں گی میں جھنن جھنن

سکھ کی آس لیے نکلی میں دکھ کے بھنور میں ڈوب گئی
نادانوں کی چاہ میں کھو کر اپنا من بھی ہار چلی
ایسے دن بھی گزرے ہیں جب تھا اپنا من میت کئی

اپنا سب کچھ ہار کے بھی میں ناچ رہی ہوں ست مگن
پائل ٹوٹ گئی تو کیا ہے، ناچوں گی میں جھنن جھنن

اندھیاروں سے ڈرنا کیا جب پریت کی من میں جوت جلی
تنہائی دو چار دنوں کی، وہ بھی شاید ٹوٹ گئی
من مندر کی چوکھٹ پر ہے خوشیوں کی بارات کھڑی

اب بھی دل میں آس ہے باقی آئے گا میرا ساجن
پائل ٹوٹ گئی تو کیا ہے، ناچوں گی میں جھنن جھنن

محمد یعقوب اسلم

گیت
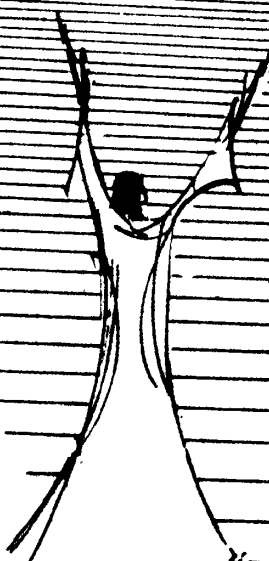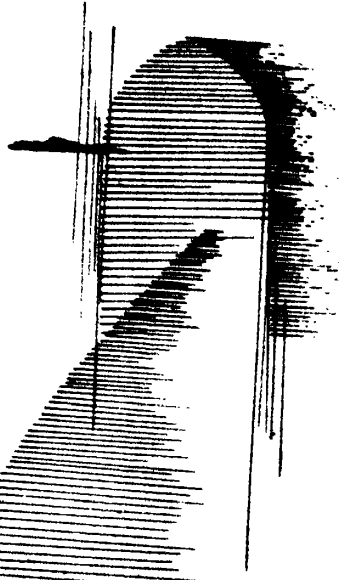
بن اُن کے لگتا ہے سکھی جیون پھیکا پھیکا
سچ کہتی ہے دنیا چاہت روگ بُرا ہے جی کا

لے آتے پیغام نہ جانے کون سا جھونکا ہی کا
ساری ساری رینا جاگوں کھول کے پٹ کھڑکی کا

مانوں گی احسان میں اُس کا دوں گی بہت دعائیں
لے آتے سندیس جو کوئی میرے پردیسی کا

خوابوں کی دنیا میں آخر کب تک سیر کروں میں
اُڑتے اُڑتے ٹوٹ چکا ہے اب تو پر پنچھی کا

گم صم بیٹھی تنہا پہروں اکثر میں یہ سوچوں
گھر آئیں پردیسی میرے دیا جلاؤں گھی کا

کب جانے پھر جوڑی ٹوٹے چھن چھن پائل بولے
کب جانے پھر پا کے ڈھونڈو تھنی بالی ٹیکا

اب پچھتانے سے کیا حاصل دیکھ مجھے سب کہتے
پردیسی کے پیار میں کیسا روگ لگایا جی کا

بھول بڑی کی دل دے کر بھی اک شاعر کو میں نے
کیا کرتی سو بھاؤ کچھ ایسا تھا نرموہی کا
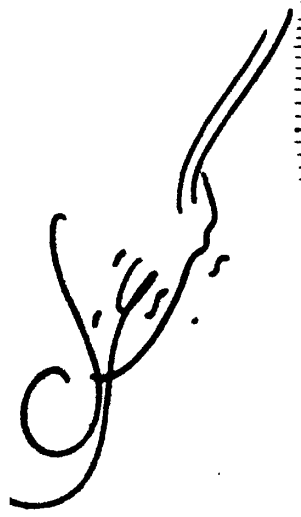
نیاز اعظمی

اُدھار کی زندگی

خورشید مسرت

اختر خان صاحب کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ وہ نواب صاحب کی مونچھ کا بال تھے سارے عیش انہیں میسّر تھے۔ کئی کئی نوکر چاکر کام کرنے والے۔ خان صاحب کے دادا بھی جاگیردار تھے، لہٰذا خان صاحب کو ورثہ میں جائداد وغیرہ بھی کافی ملی تھی۔ خان صاحب پڑھے لکھے انسان تھے گانے بجانے کے شوقین تھے۔ ایک تھیٹر کمپنی بھی بنا رکھی تھی۔ خان صاحب کی شادی بھی بڑے گھرانے کی لڑکی سے ہوئی تھی، مگر بد قسمتی سے وہ ان پڑھ تھیں پرانے رواجوں کی پابند۔ سخت پردہ کرتی تھیں۔ گھر میں میکے سے ساتھ آئی ہوئی نوکرانیاں تھیں، جو سارا کام کرتی تھیں۔ خان صاحب اپنی رنگ رلیوں میں مست رہتے تھے۔ مگر بیوی کو یہ گوارا نہیں تھا۔ اسی بنا پر میاں بیوی میں جھگڑا رہنے لگا۔ دونوں کی راہیں الگ تھیں۔ خان صاحب کی شادی کو پانچ سال بیت چکے تھے، مگر اولاد سے محروم تھے ان کی والدہ نماز پڑھ پڑھ کر بیٹے کے لئے دعائیں کرتیں، ہر مزار پر گڑگڑاتیں، خواجہ غریب نوازؒ کے مزار پر ماتھا رگڑتیں اور التجا کرتیں خواجہ! ایک پوتا مجھے دے دے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ میری بہو کو بانجھ کہنے پر تل جائیں۔" خدا کے دربار میں ان کی دعا قبول ہوئی اور خان صاحب کے یہاں پانچ سال بعد بچہ پیدا ہوا۔ بہو بیگم کی قسمت کا ستارہ اب عروج پر تھا۔

جیسے ہی ساس کو معلوم ہوا کہ بہو کا پاؤں بھاری ہے، بہو کے صدقے اترنے لگے۔ آہستہ چلنے کی ہدایت ملنے لگی۔ نوکرانیاں اور بڑھا دی گئیں تاکہ بہو کو پلنگ سے اترنا نہ پڑے۔ بہو بیگم آٹھوں پہر چھپر کھٹ پر بیٹھی رہتیں۔ بہو کا دل بہلانے کے لئے میراثنوں کو بلوا لیا جاتا۔ رات بھر محفل بھی رہتی۔ جیسے جیسے دن قریب آتے گئے، آؤ بھگت بڑھتی گئی۔

لڑکے کی ولادت ہوتے ہی دودھ پلانے والی انّا کو شہر بھر میں تلاش کیا جانے لگا۔ انّا حویلی میں لائی گئی۔ وہ بہو بیگم سے بھی کم عمر، جوان اور خوبصورت تھی۔ بہو بیگم کو سختی سے منع کر دیا گیا کہ وہ بچے کو دودھ نہ پلائیں۔

دن گزرتے گئے۔ شجاعت جوان ہو چکا تھا۔ پڑھائی کے لئے اسے باہر بھیج دیا گیا۔ خان صاحب کے یہاں بچوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ دو لڑکیاں بڑی ہو گئیں تو چوتھا لڑکا پیدا ہوا۔ بڑا لڑکا اپنی تعلیم پوری کر کے جب وطن واپس آیا تو خان صاحب لڑکیوں کی شادی سے سبک دوش ہو چکے تھے۔ نوکری سے بھی ریٹائر ہو گئے تھے۔ زمین وغیرہ کی دیکھ بھال چھوٹے لڑکے کے سپرد کر دی تھی۔ بڑا لڑکا تعلیم مکمل کر چکا تھا اور اب اچھی سروس پر لگ گیا تھا۔ خان صاحب چین کی بانسری بجا رہے تھے۔ بہو بیگم کی آرزو تھی کہ بڑے گھر کی لڑکی سے اپنے لڑکے کی شادی کریں۔ لڑکی کی تلاش کا کام جمن بی کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ خبر دیں کہ کہاں اچھی لڑکی اور اچھا جہیز مل سکتا ہے۔ آخر ایک لڑکی پسند آگئی جو کہ کرنل کی بیٹی تھی۔ آنا فانا بیاہ رچا دیا گیا۔ سارے شہر میں یہ خبر ایک آگ کی طرح

پھیل گئی کہ خان صاحب کے لڑکے کی شادی بڑے
لوگوں میں ہو رہی ہے۔ بہو بیگم نے سارے خاندان
کو اکٹھا کیا۔ شادیانے بجنے لگے۔ جس حصے میں رہتی
تھیں اس پر رنگ پالش ہونے لگی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ زیور
اور جوڑے تیار ہونے لگے۔ مٹھائی کنٹل کے حساب سے
بنوائی گئی۔ گھر کے لوگوں کی اچھی پوشاکیں سلیں۔ انّا بیا
کے لئے بھی چاندی کے کڑے بنے تاکہ دودھ کا حق
چاندی کے وزن کے برابر ہو جائے۔ فدن میاں کو
دادی ماں کے پاس بھیجا گیا کہ آپ کے پوتے کی شادی
ہونے والی ہے آپ مہمان آجائیں۔ دادا دادی کے
جوڑے سلوائے گئے۔ ہر قدم پر پیسہ کی بوچھار تھی۔
برات کا دن قریب آتا گیا۔ خوشیاں بڑھتی
گئیں۔ بہو گھر میں آگئی۔ ساس سسر صبح تڑکے بہو کا
مونھہ دیکھتے اور خوش ہوتے۔ کرنل صاحب نے
جہیز سے گھر بھر دیا تھا۔ جہیز میں نوکرانی بھی آئی تھی۔
وقت گزرتا گیا۔ بہو کے گھر خوشی ہونے والی
تھی۔ بچہ پیدا ہوتے ہی دادی ماں نے بچہ گود لے لیا۔
حویلی کی کایا پلٹ چکی تھی۔ نئی بہو رانی اب میم صاحب
بن چکی تھیں۔ بچہ ساس کی بغل میں ہوتا اور میم صاحب
پکچر میں۔ خان صاحب اور ان کی بیوی بہت ضعیف
ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنے جیتے جی دوسرے
لڑکے کی شادی کر دیں۔ ایک دن فدن میاں نے
آکر خبر دی کہ چھوٹے میاں کے لئے لڑکی تلاش کر لی
ہے، مگر غریب گھر کی ہے۔ بڑی دلہن کی برابری کی
نہیں ہے۔ انہوں نے کہا دلہن بی، پیسے پر خاک
ڈالو۔ خدا کا دیا بہت ہے۔ ہاں کر لو۔ لڑکی شکل
کی خوب صورت ہے۔ اس کے باپ سے بات کر لی
ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمیں کچھ نہیں چاہئے،
صرف لڑکا شریف ہو۔"

صغریٰ نے بچپن ہی سے کترن کترن بچاکر
[illegible] میں رکھنا شروع کر دی تھی۔ کچھ تلے دانیاں
گوکھرو اور چلے سنوار کر رکھ دیئے تھے۔ لڑکیاں کھیرے
ککڑی کی طرح بڑھتی ہیں۔ سسرال میں بھی سلیقہ کام
آئے گا۔ نہیں تو ماں کے جنم میں کیڑے ڈالیں گے کہ
کیا سکھایا تھا ماں نے۔ زرینہ نے جیسے ہی چودھویں
میں قدم رکھا، صغریٰ نے اسے نصیحتیں کرنا شروع کر دیں
"جب لڑکیاں جوان ہو جاتی ہیں تو سینہ تان کر نہیں
چلتیں۔ دوپٹے کا پلّو سینے پر ضرور ہونا چاہئے۔
کسی غیر مرد کی نگاہ سینے پر نہ پڑے۔ ماں کی نصیحت
زرینہ کو کڑوی لگتی اور تکیے میں مونھہ دے کر رونے
لگتی۔ زرینہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ مگر ان
کہنا کہ زرینہ جوان تھی۔ وہ جھکی جھکی اور سہمی سہمی رہتی۔
ایک دن کلو چاچا کی ماں نے صغریٰ سے کہا۔
"نگوڑی، بڑے گھرانے کا رشتہ تیری بیٹی کا لگا رہی ہوں
راج کرے گی۔"
"مگر چاچی، چھوٹا مونھہ بڑی بات۔ کیا چاچی
تم نے بڑی دلہن سے بات کر لی ہے۔" صغریٰ نے
پوچھا۔
"ہاں میں نے سب بات پکی کر لی ہے۔ بس
تیری ہاں کی دیر ہے۔"
زرینہ جو افلاس اور غریبی میں پلی تھی، بڑے
گھر کی بہو بن کر آگئی۔ چھوٹی بہو کے لئے جو پرانا مکان
تھا اس کی مرمت شروع ہو گئی۔ دلہن گھر آگئی۔ بہو
کو بڑے چاؤ سے لایا گیا۔
گرمی شباب پر تھی۔ نئی دلہن کی ساری رات
کروٹیں بدل بدل کر گزر جاتی ایک روز چھوٹے میاں
نے ماں سے درخواست کی "کیوں نہ ہم اوپری منزل
پر سو جایا کریں۔" درخواست منظور ہوئی۔ چھوٹی دلہن
اوپر رہنے لگیں۔ ایک کمرہ جس میں ٹوٹا پھوٹا سامان جمع
تھا۔ چاروں طرف مکڑی کے جالے اور تپا ہوا ٹین
جو کمرے کی چھت پر پڑا تھا۔ پورے دن دھوپ سے
[illegible] زرینہ کا سکھ چین
چھن چکا تھا۔ پوری رات ہاتھ سے پنکھا جھلتی اور
آنسو بہاتی۔ سورج نکلنے سے پہلے ایک آواز آتی۔
"ہمارے یہاں کا یہ رواج نہیں ہے کہ نئی دلہن دیر
تک سوئے۔ صبح تڑکے اٹھ کر سسر کے سلام کو آیا کرو۔"
زرینہ اپنی قسمت پر آنسو بہاتی اور ہر طرح خوش رہنے
کی کوشش کرتی۔ مگر ہر صبح ایک نئی مصیبت آ کھڑی
ہوتی۔ طعنوں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔ ساس
کہتی "ہماری بڑی بہو تو بیٹی جیسا سلوک کرتی ہے۔
جب سے تیرے منحوس قدم آئے گھر میں جھاڑو پھر
گئی۔ اگر ایسے ہی بڑے باپ کی بیٹی تھی تو جہیز میں
نوکرانی لاتی۔ اور سن کل باہر سے بڑی بہو آنے
والی ہیں۔ سارا کھانا تیار رہے۔ جیٹھ کے سامنے تمیز
سے آنا۔"
بڑی دلہن کے آنے کی خوشی میں لوگ جمع
ہوئے۔ ساس سسر بلائیں لیتے۔ آس پڑوس کی
عورتیں پوچھتیں "دلہن بی، کون سی بہو تمہارے مطلب
کی ہے؟" ساس اماں کہنا شروع کرتیں "اے ہے
بڑی بہو بڑے باپ کی بیٹی ہے چھوٹی دلہن اس کے
پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہے۔ بڑی بہو تو ہیرا ہے
ہیرا۔ سارا خرچ میرا وہی کرتی ہے۔ چھوٹی تو پھوہڑ
بھی ہے۔ اچھا کپڑا پہننا اس کو نہیں آتا۔
زرینہ کے پاس کچھ نہ تھا۔ بہت بوسیدہ
غسل خانہ جو ایک حویلی پار کر کے تھا کبھی کبھی غسل خانہ
میں لائن لگی رہتی۔ زرینہ اداس ہر ایک کا مونھہ تکتی
رہ جاتی۔ بڑی بہو زور سے کہتیں "اگر کل سے تم نے
پانی کے پیسے نہیں دئے تو نہانے مت آنا۔"
اکثر آس پڑوس کی عورتیں زرینہ کے پاس
آتیں زرینہ ہر مہمان کے لئے اپنی آنکھیں بچھاتی
خاطر مدارت کرتی، لیکن ہر مہمان اٹھتا اور کہتا ذرا
بڑی دلہن کے پاس بھی بیٹھ لیں۔" بڑی دلہن کی آواز آتی

"آئیے آئیے، آپ تو بڑے دنوں میں دکھائی دیں۔"

ہال نما کمرے میں صوفے پر مہمان کو بٹھایا جاتا اور نوکر کو آواز لگتی: ارے کہاں مر گیا! جلد بازار جا اور دو بوتل کولڈ ڈرنک کی لا دو اور حلوہ بھی ساتھ لانا ـــ پان دیسی کھائیں گی یا بنگلا؟ تمباکو لکھنؤ کا بڑا خوشبو دار ہے۔"

زرینہ کے لئے مسئلہ تھا پیسہ۔ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھاتی تو اوندھی گر جاتی۔ گھر کے ڈیکوریشن کے لئے سامان مہیا کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہاتھوں سے صفائی ستھرائی کرتی۔ خراب بلبوں کو رنگ کر کے اور پھول وغیرہ لگا کر گھر کو سجانے کی کوشش کرتی، مگر پھر بھی ناکام رہتی۔ اصلی فرنیچر نہیں تھا چند کرسیاں جو دیکھنے میں پرانے زمانے کی معلوم ہوتیں ان کو رنگ پالش کر کے بیٹھک میں ڈلوا دیا تھا۔ دیکھنے والے بیٹھے اور طنز بھرے جملوں سے نوازتے۔

زرینہ غریبی کی آگ میں تپ کر کندن ہو گئی تھی وہ اپنی خودداری کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتی تھی۔ گھر والوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اسے منظور نہ تھا۔ گھر میں اس کی حیثیت صرف ایک نوکرانی کی سی تھی۔ تنگ دستی اور افلاس نے اس کی ہمت توڑ دی تھی۔ سماج کے رواجوں نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ راتوں کو گھر والوں سے چھپ چھپ کر سلائی کرتی اور گزر بسر کرتی۔

زرینہ کی سزائیں سخت سے سخت کر دی گئیں۔ جو اناج فصل پر دیا جاتا تو وہ بھی بند کر لیا گیا۔ ظلم کی حدیں بڑھتی گئیں۔ زرینہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ وہ سسک سسک کر رو اٹھی۔ غریبی نے اس درجہ پر پہنچا دیا کہ لوگ افواہیں اڑانے لگے۔ اسے بدچلن، آوارہ کے نام سے پکارنے لگے۔ میاں بھی بدظن ہو گیا تھا۔ ایک چنگاری نے سارے گھر کو جلا ڈالا تھا۔

زرینہ جب میکے سے واپس آ کر ساس کی خدمت میں آداب بجا لاتی تو بڑی مرادوں سے وہ ساس کو تکتی کہ اب ساس کو لمبی چوڑی دعائیں دیں گی، مگر یہ حسرت اس کے دل میں رہ جاتی۔ زرینہ سوچتی، غریبی ایک جرم ہے۔ آخر میں بھی تو اسی گھر کی بہو ہوں مگر سماج کے رواجوں نے اس کی زبان پر تالا لگا دیا تھا۔ دل میں ایک طوفان لئے وہ پھر کام میں جٹ جاتی۔ ہر شخص کی آنکھوں سے انگارے اگلتے دیکھتی۔ گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہوتا۔ گھر والے یک زبان ہو کر کہتے: "آخر ہم کب تک دال کھائیں گے؟" دھوکہ کا چھوڑ دیا جاتا۔ پورا گھر واک آؤٹ کر جاتا۔ زرینہ روتی اور دوسرے وقت قرض ادھار کر کے اچھا کھانا پکا کر سب کو خوش کرتی۔ ہر صبح اس کے لئے پھانسی کا پھندا لٹکا رہتا۔ ادھار کی زندگی سے وہ تنگ آ چکی تھی۔ دوسروں کے رحم و کرم پر کب تک زندہ رہے؟

■■

اللہ میگھ دے

اختر الاسلام

گرمی کے موسم میں جب انسان گرمی
ے جھلس جاتا ہے اور اس کے بعد بارش کا موسم
نے پر بھی بارش کا چھینٹا نہیں پڑتا تو انسون کو بلانے
ے لئے لوگ طرح طرح کے ٹونے ٹوٹکے کرتے ہیں؛
عوامی رجحان کی عکاسی کرتے ہیں۔

مدھیہ پردیش کے مالوہ علاقہ میں عورتیں
ٹولیاں بناکر قریبی دیہات میں جاتی ہیں اور گھر گھر
نی مانگتی پھرتی ہیں۔ اس پانی کو وہ پیتیں نہیں، بلکہ
ین پر ادھر ادھر چھڑکتی ہیں۔ پانی دینے والی عورتیں
نہیں اپنے پانی کی اس طرح بربادی کرنے پر ٹوکتی
ہیں تو آپس میں تو تو میں میں اور گالی گلوچ ہو جاتی ہے
ر نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکا یک دونوں
رف کی عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہیں! اور اسی وقت
اچ گانے کی محفل سج جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس
کارروائی سے اندر دیوتا خوش ہو کر بارش کر دیتے ہیں۔

بہار میں اندر دیوتا کو خوش کرنے کے لئے
دسری ہی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ دربھنگہ میں چھوٹے
بھوٹے بچے اپنا منہ کالا کر کے مینڈکوں کی طرح
پھلتے کودتے ہیں۔ مظفر پور میں مٹی کے ایک گھڑے
کے اندر ایک مینڈک کو رکھ دیا جاتا ہے۔ جب وہ
رّاتا ہے تو گاؤں والے بارش کا لوک گیت گانا شروع
کر دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گیت کے ختم ہوتے
ہوتے برکھا رانی کی رم جھم شروع ہو جائے گی۔

راجستھان کے بنجاروں میں بارش کو دعوت
دینے کے لئے دو ادھیڑ عمر کی عورتیں سنسان جگہ پر
جاکر نوکیلی اور کٹیلی جھاڑیوں سے آپس میں ایک
دوسرے پر حملہ کرتی ہیں۔ جب دونوں کے زخموں
سے خون رسنا شروع ہو جاتا ہے تو دونوں رستے
ہوئے خون کو ایک دوسرے کے لگاتی ہیں۔ یہ
گویا بارش کے دیوتا کی خوشامد ہوتی ہے، جس سے
کبھی کبھی وہ مان بھی جاتا ہے اور بارش ہونے
لگتی ہے۔

کچھ راجستھانی علاقوں میں بارش کو بلانے
کے لئے گھروں کی لپائی پتائی کی جاتی ہے۔
آدمی کمہار کے یہاں جاکر اس کا چاک اٹھاکر کے
اسے پوجتے ہیں۔ اس سے دیوتا خوش ہو کر پانی
برسا دیتے ہیں۔ اگر بارش نہیں ہوتی تو کمہار کو
پوجا پاٹ کے بعد اپنا چاک بند رکھنا پڑتا ہے
پھر اس کے کھانے پینے کا تمام بار گاؤں والے
اٹھاتے ہیں۔ اس سے بارش کا دیوتا جلد ہی
پگھل جاتا ہے اور بارش ہونے لگتی ہے۔

پنجاب میں بارش کو بلاوا دینے کے لئے گرو
گرنتھ صاحب کا پاٹھ کیا جاتا ہے۔

بنگال میں بارش کے دیوتا کو راضی کرنے
کے لئے مہا چنڈی دیوی کی پوجا کی جاتی ہے۔

گجرات میں بارش کے دیوتا کو منانے کے
لئے گھروں میں دو دن تک چولہا نہیں جلایا جاتا۔
ان دو دنوں میں گھر کے باہر باسی کھانا سب لوگ
مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔

اس کے علاوہ گجرات میں جب خشک سالی
کا دور دورہ ہوتا ہے تو وہاں لڑکوں کی ٹولیاں اپنی
کسی ساتھی کو پیڑ کی ہری پتیوں کی پوشاک پہنا کر
گاؤں کے ہر گھر میں بھیجتی ہیں اور اس گھر کے کسی آدمی
سے اس پر پانی ڈالنے کے لئے اصرار کرتی ہیں۔
انہیں یقین ہے کہ اس طرح بارش ضرور ہو جاتی ہے

اتر پردیش میں کیول ذات کے لوگ گاؤں
کے ہر گھر میں جاکر گوبر کی مچھلیاں چپکا کر بارش
کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ویسے ہر ذات کے لڑکے
یہاں مشترکہ طور پر ٹولیاں بنا بنا کر گھر گھر جاتے
ہیں جن پر بھر بھر کر پانی ڈالا جاتا ہے۔ اس پانی
میں وہ لڑکے لوٹتے ہیں اور گانے گاتے ہیں۔
کالے میگھا پانی دے، پانی دے گڑ دھانی دے۔

○○

نسیم احمد

صدر ریگن کی بیٹی ایک دردِ سر

امریکہ کے صدر ریگن ایک قدامت پسند انسان ہیں۔ وہ ری پبلکن پارٹی کے نمائندے ہیں، جو اپنی روایت پرستی اور قدامت پسندی کے لئے مشہور ہے۔ لیکن خود ان کے گھر میں ایک ایسی لڑکی نے جنم لیا ہے جو روایت شکن ہے ان کی بیٹی کا نام پیٹی ڈیوس ہے۔ پیٹی اپنے باپ کے لئے ایک دردِ سر بن کر رہ گئی ہے۔

گزشتہ دنوں عورتوں کے ایک رسالے میں پیٹی کا ایک فوٹو شائع ہوا۔ اس میں وہ ایک ایسا بلاؤز پہنے ہوئے تھی جس میں سے جسم کا بالائی حصہ صاف نظر آتا تھا۔ یہ کپڑا مغربی ممالک میں بہت مقبول ہے اسے "سی تھرو" کہتے ہیں۔ عام طور پر کپڑا بدن کو ڈھانکنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن "سی تھرو" نام کا کپڑا ہے۔ اسے پہننا ایک تکلف سے زیادہ نہیں۔ پیٹی کا یہ فوٹو رسالے میں شائع ہوتے ہی امریکہ میں تہلکہ مچ گیا صدر ریگن بہت شرمندہ نظر آنے لگے۔ وہ خود اپنی جوانی کے زمانے میں ایک فلم ایکٹر تھے، لیکن اس زمانے میں ایسی بے ہودگیاں علی الاعلان نہیں کی جاتی تھیں۔

پیٹی دراصل شروع سے ہی روایت شکن رہی ہے۔ سماج سے بغاوت اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے' لیکن وہ کئی خوب صورت اور جوان مردوں کے ساتھ زندگی گزار چکی ہے۔ اس کے چاہنے والوں میں زیادہ تر فلم اسٹار اور گویّے ہیں۔ اس نے چرس کے دم بھی لگائے ہیں، مگر وہ اس کی عادی نہیں ہے۔ پیٹی سے جب اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے بے باکی سے جواب دیا: "ہاں میں نے چرس پی ہے اور خوب پی ہے لیکن اب میں اس عادت کو خیرباد کہہ چکی ہوں۔ ایسے بھی امریکہ کا کون سا امیر گھرانہ ہے جس کے بچے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے کبھی چرس کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

پیٹی صدر ریگن اور ان کی بیوی نانسی کی بیٹی ہے۔ نانسی صدر کی دوسری بیوی ہیں۔ ان کی پہلی بیوی جین وائی من تھی۔ ایک فلم میں پیٹی اور اس کی سوتیلی ماں کو ایک ساتھ رول پیش کیا گیا تو پیٹی نے انکار کر دیا۔ فلم میں پیٹی سوتیلی ماں کے بال پکڑ کر کھینچتی تو دیکھنے والوں کو مزہ آجاتا۔ نانسی نے ہمیشہ اپنے شوہر کو دنیا کے ہر انسان پر ترجیح دی ہے۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ ہر انسان کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ صدر ریگن کی کامیابی کے پیچھے ان کی بیوی نانسی کی ہمت افزائی اور محبت کارفرما ہے۔ لیکن نانسی اپنی محبت میں بیٹی کو کبھی بھول گئیں۔ ان کی سوانح عمری میں شاذونادر ہی ان کے تذکرہ ملتا ہے۔

جب پیٹی کالج میں پڑھتی تھی تو اس ایٹم بم' روس کی سرد جنگ اور صدر ریگن کی پالیسی کے خلاف جلوس میں حصہ لیا تھا۔ اس وہ اپنے باپ کی دشمن تھی۔ اسے روس کی ایک فلم کمپنی نے ایک رول پیش کیا۔ یہ فلم روس تیار ہونی تھی۔ صدر ریگن پریشان ہو گئے۔ ان بیٹی ایک دشمن ملک میں کام کرے' یہ کیسے ہو سکا ہے۔ پیٹی کو باپ کی حالت پر رحم آ گیا اور اس نے یہ رول کرنے سے انکار کر دیا۔

ایک بار پیٹی جنوبی فرانس میں ایک فلم میں کام کرنے گئی تو صدر ریگن نے سی آئی ڈی کے کوا فراد اس کے ساتھ بھیجے۔ یہ ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے۔ پیٹی کو مذاق سوجھا اس نے لوگوں کو تھکا تھکا کر ہرا دینے کی سوچی۔ اس نے روز میلوں دوڑنا شروع کر دیا۔ سی آئی ڈی کے موٹے موٹے آدمی اس کے پیچھے بھاگتے عجب مضحکہ خیز لگتے تھے لیکن وہ بے چارے کیا کرتے؟ یہ ان کی نوکری کا سوال تھا۔

جب صدر ریگن پر آخری چوٹ پیٹی نے لگائی تو اپنا نام بدل دیا۔ اس کا نام پیٹی ریگن تھا۔ اس نے ریگن کی بجائے اپنا نام پیٹی ڈیوس رکھ لیا۔ ڈیوس اس کے نانا کا نام تھا۔ ریگن نے جب یہ خبر سنی تو سکتے میں آ گئے۔ یہ چوٹ کاری تھی۔ ریگن نے پیٹی کو اس حرکت کے لئے کبھی معاف نہیں کیا۔

واشنگٹن کے وائٹ ہاؤس میں ایک کمرہ پیٹی کے لئے ریزرو ہے۔ لیکن پیٹی شاذونادر ہی باپ کے ساتھ رہتی ہے۔

○○

ذہنی ورزش

اپنی ذہانت کو آزمائیے، اپنی معلومات کا امتحان لیجئے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوال پر تیرہ کو کر حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوتے تو انعام پانے والے کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔

۲۵ اگست ۱۹۸۵ تک ہمیں ملنے والے جوابات اس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر ۸" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۔ دنیا کا سب سے گہرا سمندر کون سا ہے؟

۲۔ کینسر کے مریض دنیا کے کس ملک میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں؟

۳۔ چند سال پہلے سری لنکا کی وزیر اعظم ایک خاتون تھیں ان کا نام کیا ہے؟

۴۔ شیکسپیئر کے مشہور رومانی کردار رومیو اور جولیٹ کس ملک کے باشندے تھے؟

۵۔ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کا اصلی نام کیا تھا؟

۶۔ "توبۃ النصوح" کے مصنف کا کیا نام ہے؟

۷۔ لکھنؤ سے پہلے اودھ کا صدر مقام کون سا شہر تھا؟

۸۔ یہ مصرع کس شاعر کا ہے؟
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

۹۔ ایک غیر ملکی خاتون انڈین نیشنل کانگریس کی صدر بن چکی ہیں۔ ان کا نام کیا تھا؟

۱۰۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں عورتوں کا تناسب کتنے فی صد ہے۔ ۱۰، ۲۰ یا ۳۰؟

ذہنی ورزش نمبر

۱ ....
۲ ....
۳ ....
۴ ....
۵ ....
۶ ....
۷ ....
۸ ....
۹ ....
۱۰ ....
نام : ....
پتہ : ....

ذہنی ورزش نمبر ۷ اور نمبر ۸ کے جوابات اگلے شمارے میں شائع کیے جائیں گے۔
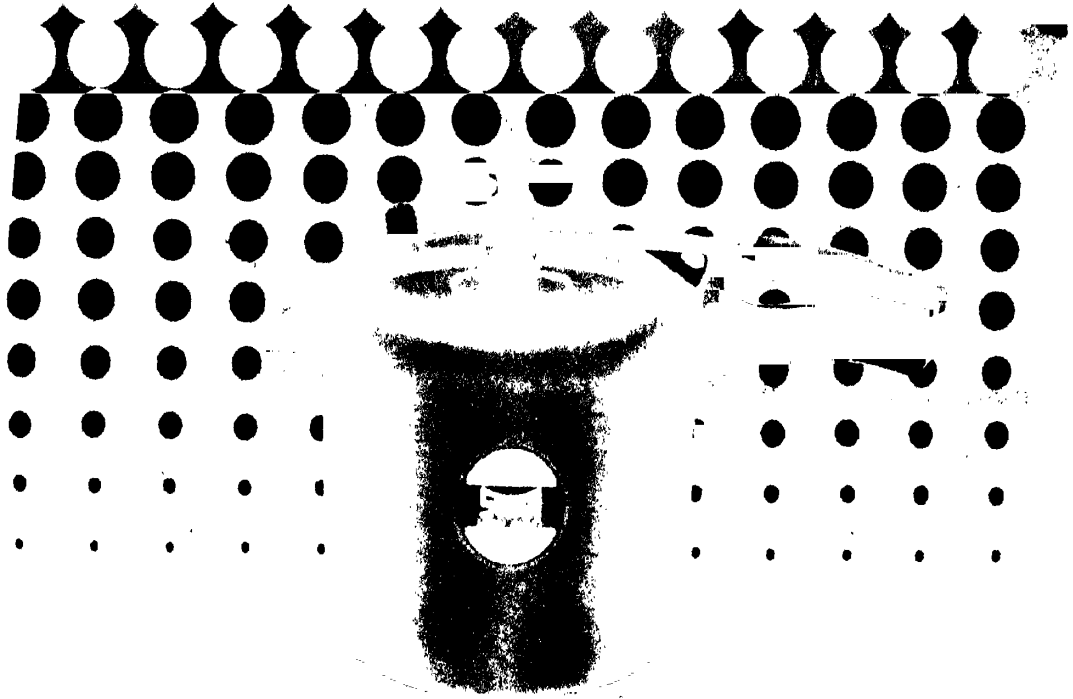
نجم السحر صدیقی

سوتیلی ماں

"کم بخت کہیں کا!" کہنے کے ساتھ ہی ایک زوردار تھپڑ معصوم وقار کے گال پر پڑا۔

ناہید کی پانچوں انگلیوں کے نشان وقار کے گورے گال پر ابھر آئے بے چارے کی ساری تکلیف آنسوؤں میں بدل گئی، لیکن ناہید کا ظلم یہیں تک تھا وہ کان اینٹھتے ہوئے بولی "کیوں کھینچنے سے پہلے تو شیطانی کر رہا تھا اور اب رو رہا ہے! تیری بدنصیب ماں مر گئی مگر تجھے چھوڑ گئی۔ نہ خود جیتا ہے اور نہ مجھے جینے دیتا ہے۔ کم بخت مرتا بھی نہیں!"

نئی ماں کے ان الفاظ کو سن کر وقار کے دل پر جیسے بجلی گر پڑی۔ وہ اپنی ماں کی برائی نہیں سن سکتا تھا لیکن بے چارہ بے بس تھا اپنی ماں کو یاد کر کے وہ پھپک پڑا۔
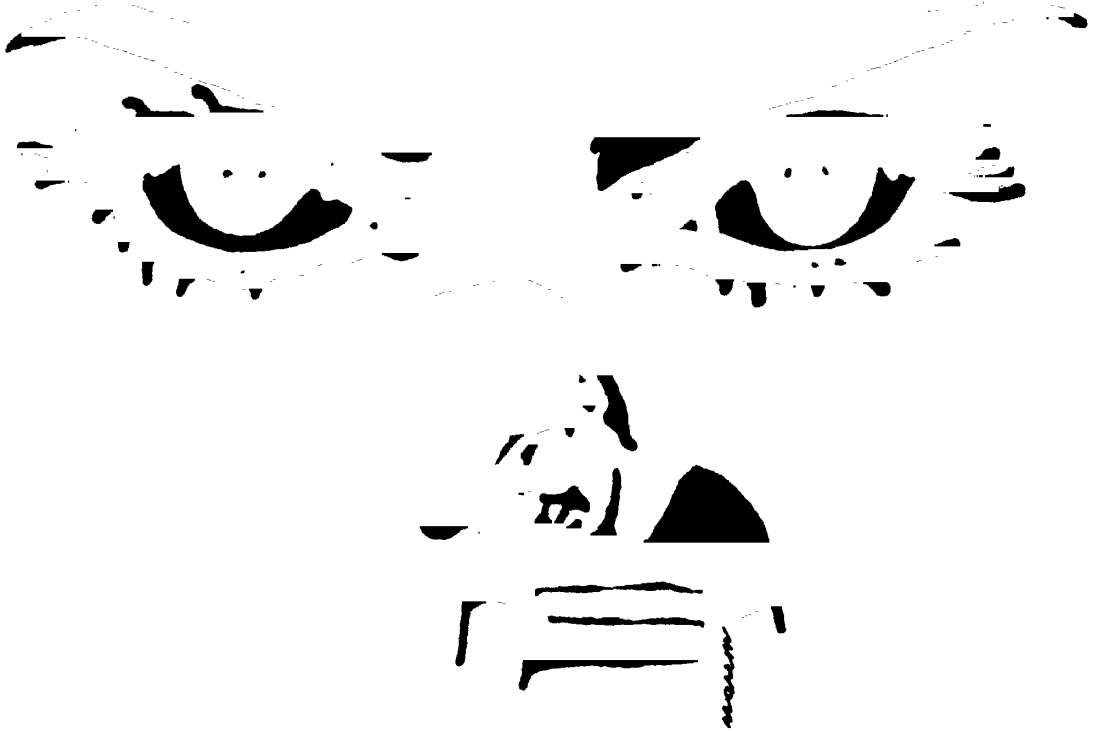
وقار کو روتے دیکھ کر ناہید اور زور سے چیخ پڑی: "چپ ہوتا ہے یا نہیں بدنصیب!"

اتنا کہہ کر ناہید ایک چھڑی اٹھا کر وقار پر سڑاک سڑاک برسانے لگی۔ وقار اس بے بسی کی مارے تڑپ اٹھا۔ یہ اس معصوم کے ساتھ کتنا بڑا ظلم تھا۔

"مت ماریے اماں! اب نہیں ہوگا۔"

اس نے التجا کی مگر ناہید پر تو جیسے بھوت سوار تھا۔ وہ اسی طرح وقار کو پیٹتی رہی۔

[illegible] افتخار اندر داخل ہو

انہیں اندر جو منظر دکھائی دیا اس کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ انہیں اس وقت یہ منظر حقیقت نہیں، بلکہ خواب دکھائی دے رہا تھا۔

ناہید کا خوب صورت چہرہ اس وقت افتخار کو ڈائن جیسا نظر آ رہا تھا۔ افتخار ناہید کے ہاتھ سے چھڑی چھین کر بولے "تمہیں کیا ہو گیا ہے، ناہید! جب دیکھو اس معصوم بچے کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ دن رات مارنا آخر کیوں؟ اس معصوم بچے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تم سے اس کی کیا دشمنی ہے؟"

"دشمنی؟ یہ میرا دشمن ہی تو ہے۔ دن رات دماغ چاٹے رہتا ہے۔"

"ناہید، تم ایک عورت ہو جس کے اندر محبت اور پیار کا جذبہ ہوتا ہے۔ تم اگر اسے اپنے پیدا کئے ہوئے بچے کی طرح پیار نہیں دے سکتیں تو کم از کم بچہ ہی سمجھ کر محبت کیا کرو۔ اسے بھی ماں کا پیار پانے کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن تم اسے پیار نہ دے سکیں تم اتنا سخت اور برا سلوک وقار کے ساتھ کرتی ہو مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم اتنے برے اخلاق سے پیش آؤ گی۔"

یہ کہہ کر افتخار نے وقار کو اپنی گود میں لے لیا۔ ڈرا ہوا وقار ابو کی گود میں جا کر سسکیاں لینے لگا۔ اچانک وقار کی نظر وقار کے گالوں کی طرف گئی اور غصے سے ابل پڑے "ناہید! یہ سب تم نے کیا کیا!"

ناہید کب ڈرنے والی تھی، بولی "ہاں سب میں نے ہی کیا ہے۔ کیوں مجھے تنگ کرتا ہے! کیا اختیار ہے اس کو میرے سامنے جینے کا! کیوں نہیں اپنی بدنصیب ماں کے ساتھ مر گیا!"

افتخار نے غصے کو پیتے ہوئے کہا "ناہید [illegible] اسے تم نے پیدا نہیں کیا ہے، لیکن دنیا کی نظروں میں اب تم ہی اس کی ماں ہو۔ تم کو ہی اس کی پرورش کرنی ہو گی۔"

ناہید اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی

افتخار نے ایک لمبی سانس لی اور وقار کو لئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کمرے میں جاتے ہی پل بھر کے لئے ان کے قدم رک گئے۔ سامنے شیریں کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ انہیں ایسا لگا جیسے تصویر کہہ رہی ہو "یہ تم نے کیا کیا؟ افتخار تم نے میرے وعدے کو بھلا کر میرے وقار کی زندگی خراب کر دی۔ منع کرنے پر بھی تم نے دوسری شادی کر لی یہ اسی کا نتیجہ ہے۔"

افتخار کو ایسا لگا کہ وہ خود ملزم ہیں اور وہ تصویر کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ "ابو! ابو! یہ کیا؟ آپ روتے کیوں ہیں؟" وقار نے معصومیت سے کہا۔

وقار کا معصوم اور شگفتہ چہرہ دیکھ کر افتخار کے آنسو رکنے کی بجائے اور بھی تیزی کے ساتھ بہنے لگے۔ وقار کو سینے سے لگائے وہ سوچنے لگے: "کتنی شیریں ہے اس کی آواز۔ کتنا پیار بھرا ہے اس کی آواز میں۔ لیکن ناہید کے اوپر اس کا کوئی اثر نہیں۔ میری غلطی کی سزا میرے جگر کے ٹکڑے کو، میری محبت کی اکلوتی نشانی کو مل رہی ہے۔ وہی وقار جسے میں نے کبھی بھولے سے تھپڑ بھی نہیں مارا، اسے اس طرح بے رحمی سے مارا جاتا ہے۔"

اسی لمحے افتخار کے کانوں میں ناہید کی آواز آئی "میں اپنے مائیکے جا رہی ہوں۔ اب اپنے دلارے کے ساتھ رہنا اس گھر میں۔ مجھے یاد نہ کرنا اور نہ مجھے لینے میرے مائیکے آنا۔ وقار جس دن مرے گا، میں گھی کا چراغ جلاؤں گی۔"

[illegible] "امّاں! امّاں! رک جائیے۔ میرا قسم ہے امّاں، آج سے میں ہی باہر چلا جاؤں گا۔ ابو! امّاں کو روک لیجئے۔ انہیں نہ جانے دیجئے۔ امّاں! امّاں!" وقار چلاتا رہا مگر ناہید نہ رکی

افتخار کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ ان کا دل پرانی یادوں میں کھو گیا۔ وہ دن یاد آئے جب ان کی شادی شیریں سے ہوئی تھی۔ شیریں کی خوب صورتی، خوش اخلاقی اور ہنر مندی سے گھر کے سب ہی لوگ خوش تھے۔ ایک پل بھی شیریں اپنے ساس سسر کی آنکھوں سے دور نہیں ہو سکتی تھی۔ افتخار کی ماں کہتی تھیں "شیریں میرے گھر کا نور ہے"۔ کتنی آرام دہ زندگی تھی۔ دونوں کی مسرت اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب شیریں نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا۔ گھر میں سب طرف خوشیاں منائی گئیں۔ لیکن یہ بہار چند روزہ تھی۔ ایک دن شیریں صبح کو سیر کرنے نکلی تو ایک سانپ کے زہر کا شکار ہو گئی۔ گھر کے سارے لوگوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر وہ اس دنیا سے چل بسی۔

مرتے وقت شیریں نے افتخار سے کہا۔ "اب تک میں نے آپ کی جتنی بھی خدمت کی، اس کا خیال کرتے ہوئے میرے وقار کا خیال رکھئے گا اور ہو سکے گا تو دوسری شادی نہ کیجئے گا، ورنہ میرا وقار..." اتنا کہہ کر اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

افتخار نے دوسری شادی اس خیال سے کی تھی کہ وقار آرام سے رہے گا۔ لیکن کیا ہوا!

○○

ہناز حسین

سانس کا صحیح استعمال

آج سے ہزاروں سال پہلے ہندوستان کے یوگی سانس کا صحیح استعمال کرنا جانتے تھے۔ ہندی میں اسے 'پرانایام' کہتے ہیں۔ پران کے معنی جان کے ہیں، لیکن دراصل یہ سانس کا دوسرا نام ہے، سانس ختم تو جان ختم، ہندوستان کے یوگی سانس کے صحیح استعمال سے صحت کو قائم رکھتے تھے۔ ان کی صحت موجودہ تہذیب کے پروردہ انسانوں سے بہتر تھی۔ آج زندگی آسان ہے۔ بجلی، پانی، ریل، ہوائی جہاز، گیس کے چولہے اور الیکٹرک کا سامان دستیاب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ڈاکٹروں کے کلینک میں بھی بھیڑ زیادہ ہو گئی ہے، شہروں میں لوگوں کو رات بھر نیند نہیں آتی۔ مرد دن بھر دفتروں میں سر کھپاتے ہیں لیکن تھکان کے باوجود رات کو نیند کی گولیوں کا سہارا لیتے ہیں۔ عورتیں گھروں میں بیٹھی بیٹھی وزن بڑھاتی ہیں اور پھر وزن کم کرنے کی ترکیبیں سوچتی ہیں۔ ان شکایات کے کئی اسباب ہیں۔ اسی طرح علاج بھی بہت ہیں لیکن ان میں ایک سادہ اور آسان علاج صحیح طور پر سانس کا استعمال ہے۔ یہ علاج اپنی پرانی تہذیب سے ہمیں ترکہ میں ملا ہے۔ اس علاج کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا اور نہ زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ ہندوستان میں جب یہ علاج دریافت ہوا تو اسے یورپ اور امریکہ

کے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہاں جگہ جگہ یوگا کلب کھل گئے۔ ہندوستان سے یہ علم سیکھ کر یورپ اور امریکہ کے لوگوں نے اِسے اختیار کر لیا لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے ملک میں لوگ اس سے ابھی تک بے اعتنائی برتتے ہیں۔

آج کل یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ سانس کا صحیح استعمال صحت کے لئے مفید ہے۔ اگر کچھ دیر سانس کی ورزش کی جائے تو نہ صرف جسم سے فاسد اور زہریلا مادّہ خارج ہوتا ہے بلکہ اکثر دوسری عام شکایتیں (اختلاج، بے خوابی، بھوک نہ لگنا، خراب دورانِ خون) بھی درست ہو جاتی ہیں۔

آکسیجن ہوا کا حصہ ہے آکسیجن زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اگر ہوا میں آکسیجن نہ ہو تو زندگی ختم ہو جائے۔ جب ہم اندر سانس لیتے ہیں تو ہوا کے ساتھ آکسیجن بھی جسم میں داخل ہو جاتی ہے اور خون میں مل جاتی ہے، جب ہم سانس باہر نکالتے ہیں تو ہمارے پھیپھڑے کاربن ڈائی آکسائیڈ خون سے خارج کر کے باہر پھینک دیتے ہیں اِس طرح بدن کی صفائی اور دھلائی ہوتی رہتی ہے۔ یہ صفائی دن رات چلتی رہتی ہے پرانایام یا سانس کی ورزش اِس صفائی کو زیادہ جاندار، زیادہ مفید بنا دیتی ہے۔

ہندوستان کے یوگیوں کو یہ بات معلوم تھی کہ آکسیجن خون صاف کرنے کے کام آتی ہے، خون صاف کرنے کی اس سے بہتر دوا موجود نہیں، دورانِ خون کو بہتر بنانے کے لئے بھی یہ اکسیر کا کام کرتی ہے۔ خون صاف ہوگا تو دورانِ خون بہتر ہوگا دورانِ خون بہتر ہوگا تو صحت بہتر ہوگی، دماغ صحیح طور پر کام کرے گا، جسم سالم دماغ سالم صحت مند جسم صحت مند دماغ کا ضامن ہوتا ہے۔

ذیل میں ہم سانس کی کچھ ورزشیں بیان کرتے ہیں۔ روز صبح کو اٹھ کر چند منٹ ان کو عمل میں لانے سے آپ اپنے اندر چستی اور پھرتی محسوس کریں گی۔ آپ کی صحت بہتر ہو جائے گی۔ دماغ سے فاسد خیالات اور بدن سے فاسد مادّہ خارج ہو جائے گا۔

● فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائیں پہلے ناک کا دایاں نتھنا ہاتھ کے انگوٹھے سے بند کر کے بائیں نتھنے سے سانس لیں، سانس اندر لیتے وقت اس بات کا دھیان رکھیں کہ سانس کی رفتار دھیمی ہو، تیزی سے سانس نہ لیں، اس کے بعد انگوٹھے سے بایاں نتھنا بند کریں اور سانس دائیں نتھنے سے باہر نکالیں، اس کی رفتار بھی آہستہ ہونی چاہئے۔ اِس عمل کو دس بار دہرائیں۔ اس ورزش سے نہ صرف خون صاف ہو جاتا ہے بلکہ ناک کی نالی بھی کھل جاتی ہے، زکام کی وجہ سے سر میں درد رہتا ہے تو اس میں بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

● ایک کرسی پر آرام سے بیٹھ جائیں۔ کمر کو کرسی کی پشت پر ٹکالیں۔ پیٹ اور سینے کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ اب تیزی سے سانس لے کر پیٹ کو پھلائیں اور دو سکینڈ انتظار کر کے مونہہ اور ناک کے راستے باہر نکال دیں، دوبارہ سانس لیتے وقت پیٹ کو ڈھیلا چھوڑ دیں، روزانہ ۳ منٹ تک یہ ورزش کرنا تمام جسم کے لئے مفید ہے۔

● کبھی کبھی چلتے ہوئے یا سیدھے کھڑے ہو کر مونہہ سے تھوڑا تھوڑا سانس باہر نکالیں مونہہ کو دائرے کی شکل میں بنالیں، جیسا سیٹی بجاتے وقت بنایا جاتا ہے۔ سانس کو پانچ چھ جھٹکوں میں باہر نکالنے کے بعد ناک کے راستے اسی طرح اندر کی طرف لیں۔ اگر آپ دوڑ لگا سکتی ہیں یا کم از کم چہل قدمی کر سکتی ہیں تو اس کے دوران بھی گہرے سانس لینا ضروری ہے۔ گہرا سانس لے کر اُسے اندر روکنا ٹھیک نہیں۔ اس طرح سینے پر دباؤ بڑھتا ہے، یہ عمل دورانِ خون میں مداخلت کرتا ہے۔

● اگر آپ کو اکثر زکام رہتا ہے یا آپ جلد تھک جاتی ہیں تو کھلی ہوا میں چھت پر کمرے کی کھڑکی کھول کر کھڑی ہو جائیں۔ سینے کے نیچے کی پسلیاں دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیں، اب آہستہ آہستہ گہرا سانس لیں۔ اس کے بعد مونہہ کے ذریعہ تمام سانس باہر نکال دیں۔ پسلیوں پر دباؤ ڈالیں تاکہ تمام سانس باہر نکل آئے۔ پانچ چھ بار یہ عمل دہرانے سے دماغی تھکان اور ذہنی تناؤ ختم ہو جاتا ہے اور ذہن صاف ہو جاتا ہے۔ یہ ورزش نہ صرف جسم کے لئے مفید ہے بلکہ آپ کی دماغی صلاحیتوں کو بھی بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اکسیر ہے۔

یوگا ورزشوں میں سانس کی ورزشیں دمہ اور زکام کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ عام طور پر جب ہم سانس لیتے ہیں تو بہت تھوڑی ہوا سینے کے اندر جاتی ہے اِس طرح آکسیجن کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ گہرا سانس لیتے وقت آکسیجن کی مقدار بڑھ جاتی ہے آکسیجن کی مقدار بڑھ جانے سے خون صاف رہتا ہے، دماغ صحیح طور پر کام کرنے لگتا ہے، مایوسی اور گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے۔ غسل سے جسم کی بیرونی کثافت دور ہو جاتی ہے لیکن سانس کی ورزش سے جسم کی اندرونی کثافت صاف ہو جاتی ہے۔ ■■

انسان کے سینے میں لنگور کا دل

ریاست علی

کئی سال پہلے ساؤتھ افریقہ کے ڈاکٹر کرسچین بارنارڈ نے ایک مریض کی جان بچائی تھی۔ یہ دل کا مریض تھا۔ اس مریض کے سینے میں ایک مرتے ہوئے آدمی کا دل لگایا گیا تو اسے نئی زندگی مل گئی۔ نئے دل والا مریض زیادہ دن تو نہیں جیا لیکن ڈاکٹر بارنارڈ کو دوامی شہرت حاصل ہو گئی۔ وہ دنیا کے پہلے سرجن تھے جنہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ اس کے بعد یہ آپریشن عام ہو گئے۔ کوئی انسان کار کے حادثے میں شدید زخمی ہو جائے اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ ہو تو اس کا دل کسی دوسرے مریض کو نئی زندگی عطا کر سکتا ہے۔ اس قسم کے آپریشن یورپ اور امریکہ کے علاوہ ہندوستان میں بھی ہو رہے ہیں۔ ان میں کامیابی کا تناسب بھی بڑھ رہا ہے۔

لیکن حال ہی میں امریکہ میں ایک ایسا آپریشن کیا گیا جو اپنی مثال آپ تھا۔ اس آپریشن سے ایک نوزائیدہ بچی کو نئی زندگی مل گئی۔

سوزان امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا میں رہتی ہے۔ اس کا خاوند مائیکل ایک انجینیئر ہے۔ سوزان کی عمر ۲۳ سال ہے۔ دونوں میاں بیوی روایت پسند اور پرانے خیالات کے انسان ہیں۔ ان کی شادی کو ۵ سال گزر گئے۔ وہ اولاد کے خواہش مند تھے۔ خدا نے ان کی سن لی اور ان کے یہاں ایک خوب صورت بچی نے جنم لیا۔ سوزان لڑکی کی پیدائش سے بہت خوش تھی لیکن افسوس کہ یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔

ڈاکٹروں نے اس کی لڑکی کیتھرین کا معائنہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اس کے دل کا نصف حصہ غائب ہے۔ دل کا بایاں حصہ بہت چھوٹا تھا۔ اس صورت میں لڑکی دو ہفتے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ سوزان نے جب یہ خبر سنی تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ خدا نے برسوں کی دعاؤں کے بعد اسے ایک بچی دی تو وہ بھی آدھے دل والی۔ اب وہ کیا کرے؟ اپنی بیٹی کے مرنے کا تماشا دیکھے؟ ڈاکٹروں نے کیتھرین کو ایک ایمبولینس میں رکھا تاکہ اسے فوراً طبی سہولت مل سکے۔ لیکن وہ سوزان کو تسلی نہ دے سکے۔ اس کی بیٹی دو ہفتے سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔

کیتھرین ایمبولینس میں رہ رہی تھی۔ اس کے زندگی کے چند دن ہی باقی تھے کہ ایک سرجن کو دور کی سوجھی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اگر اس نوزائیدہ کے سینے میں کسی جانور کا دل لگا دیا جائے تو اس کی زندگی کی امید ہو سکتی ہے۔ انسان اور بندر میں پرانا بھائی چارہ ہے۔ اس لئے قرعۂ فال لنگور کے نام نکلا۔ ڈاکٹر نے جب اپنا خیال سوزان کے سامنے پیش کیا تو وہ آگ بگولہ ہو گئی۔ اس کی بچی کے سینے میں ایک وحشی جانور کا دل؟ یہ ناممکن ہے۔ اسے بچی کی موت قبول ہے لیکن یہ منظور نہیں کہ وہ ایک وحشی جانور کا دل اپنے سینے میں لئے پھرے۔ اس نے ڈاکٹر کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنی بچی کو جانور نہیں بنانا چاہتی تھی۔ ماں باپ بچی کو لے کر گھر آ گئے۔ انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی بچی کو مرتے دیکھیں گے اگر خدا کو یہی منظور ہے تو یہی سہی۔ انہوں نے بچی کو بستر پر لٹا دیا اور اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ بچی کی عمر دس بارہ روز تھی۔ لیکن وہ جب بھی ماں سے اپنا نام

تی تو فوراً اس کی طرف دیکھ کر [illegible] لیتی
ے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ ماں سے
ں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی، لیکن
، اپنے فیصلے پر اٹل تھی۔

اسی ادھیڑ بن میں دو روز گزر گئے۔
یتھرین بستر مرگ پر تھی۔ اسے کوئی طبی
ہولت بھی میسّر نہیں تھی۔ لیکن اس کے
انس کی ڈور قائم تھی۔ اس کا ہر سانس آخری
انس معلوم ہوتا تھا۔ لیکن حقیقت میں
یسا نہیں تھا۔ سانس کی آمد و رفت ختم نہیں
ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیتھرین زندہ
ہنا چاہتی ہے۔ وہ موت سے لڑ رہی ہے۔
ں کی بہادری اور ہمت دیکھ کر ڈوکھیا ماں
ا دل بھی پسیج گیا۔ اگر خدا کیتھرین کو زندہ رکھنا

چاہتا ہے تو اسے کیا حق ہے کہ وہ اپنی بچی کو
موت کے حوالے کر دے۔ اس نے اپنا فیصلہ
بدل دیا اور بچی کو لے کر اسپتال پہنچ گئی۔ اس
نے آپریشن کے لئے اپنی منظوری دے دی۔
سرجن نے آپریشن کے لئے پلے پاؤنڈ
کے ایک لنگور کا انتخاب کیا۔ ابھی آپریشن
کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ کیتھرین کی حالت
خراب ہو گئی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ آپریشن
کے لئے دوسرے دن کا وقت مقرر تھا،
لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیتھرین صبح کی
روشنی نہیں دیکھ سکے گی۔ یہ رات سوزان
پر بھاری تھی۔ وہ تمام رات اپنی بچی کے
پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتی رہی اور خدا سے
دعا مانگتی رہی۔ آخر خدا نے اس کی سن لی۔
کیتھرین کی حالت سنبھل گئی۔ اس رات

اسپتال میں کوئی [illegible]
آنسو نہ تھا۔
آپریشن صبح ۸ بجے شروع ہوا۔
سرجن نے لنگور کا دل نکالا اس کا سائز
اخروٹ کے برابر تھا۔ یہ دل کیتھرین کے دل
سے جوڑ دیا گیا۔ سرجن کے لئے یہ پہلا تجربہ تھا
وہ آپریشن کی کامیابی کے باب میں بہت پر امید
نہیں تھا۔ لیکن جیسے ہی لنگور کا دل کیتھرین کے
دل سے جوڑا گیا اسی وقت دل کی حرکت نارمل
ہو گئی۔ ڈاکٹروں کی ٹیم آپریشن کی میز کے
چاروں طرف کھڑی تھی۔ کیتھرین کے دل کی حرکت
نارمل ہوتے ہی سب کے چہرے فرطِ مسرت
سے کھِل اٹھے۔ سب نے سرجن کو مبارک باد
دی۔ سرجری کی تاریخ میں پہلا تجربہ کامیاب
ہو گیا۔

○○

پدر گزیدہ

عبدالرب

قسمت کے بلند ستارے ماتھ لگ رہے

ہیں۔ دیو قامت جہاز اور آہنی ستون کی کشتیاں ہو ہیں
پیر سکتی ہیں۔ زندگی کی تمام حقائق سانسوں کے تاروں
کے ساتھ مل کر ایک مضبوط رسی بنا چکی ہیں۔ ہمارے بازو
شل اور ہاتھ زخمی ہوتے جاتے ہیں۔ سانسیں سے گویا شعلے
لپکتے ہیں۔ ہر طرف خطرہ کا احساس ہے جو حواس کو معطل
کئے دیتا ہے۔

بچے کی کلکاری سے فضا جھوم رہی ہے۔ اور
اچانک بندر کی کریہہ چیخ سے ماحول لرزنے لگا ہے۔
دھان کی کیاریوں کا پانی سوکھ گیا ہے سرسوں کے زرد
پھول شعلوں کی طرح دہک اٹھے ہیں۔ اور بندر کی چیخ
میری سماعت میں خراش ڈال گئی ہے اور میں سوچ کی
سطح سے ابھر آتی ہوں۔

ایک عجیب پیراگراف قلم کی زد میں آکر میرے
ہاتھ میں زخمی پرند کی مانند لرزنے لگا اور پلاٹ ذہن
کی دسترس سے نکل کر کمرے کے بلند روشن دان سے
پھلانگ گیا۔ دھم سے کوئی شے گری اور کمرے کے باہر
چیخ کی صورت میں بکھر گئی۔ میرے دل کے تار ستار کے
غم ناک سُر کی صورت فضا میں تیر گئے اور میں نے قلم پر
انگلیوں کی گرفت ڈھیلی کر کے اسے میز کے ماتھے پر
سجا دیا اور کاغذ کے پرزہ کو پرند کی مانند خلا میں اچھال کر
بھاگی۔

کمرے کے شمالی پہلو میں منیر کا شکستہ وجود
درد و غم سے لرز رہا تھا۔ میں منیر کے بکھرے وجود کو
آغوش مادری میں سمیٹ کر کمرے میں لے آئی۔ وہ خوف
سے پتھرائی آنکھوں میں پھر اسا حل لئے مجھے بھی نظر نہیں
آ رہا تھا۔ میں جسے تلاش کرنے میں آج بھی ناکام رہی،
وہ بہار، وہ شبنم سی تر و تازگی جو اس کے ہم عمر ساتھیوں
کے چہروں پر پائی جاتی تھی۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی
سسکیاں مچل رہی تھیں۔
آج پھر منیر کی چوری پکڑی گئی تھی۔ میں سوچنے

لگی کہ کیا بقراط نے کم سنی میں یہی حرکت نہ کی ہو گی ؟
اس کا باپ جو تعلیم کی ایک بڑی ڈگری کا مالک ہے،
ایک بزنس مین کہلاتا ہے — کیا وہ بغیر چوری کے اتنا
بڑا کاروبار چلا رہا ہے ؟ منیر اگر وقت سے پہلے آگے
بڑھ رہا ہے تو کیا یہی اس کی سزا ہے ؟ نہیں، مجھے ایسا
بھی تو نہیں سوچنا چاہیئے۔ یہ باغیانہ سوچیں تباہی و
بربادی کے طوفان ہیں جو اپنی تیز رو کے ساتھ سب
کچھ بہالے جاتے ہیں۔

میں نے ابتدا میں منیر میں مکمل بقراط بننے
کے جراثیم دیکھے تھے، لیکن وہ آج کا کنسلٹنٹ بنتا
جا رہا ہے۔ کل ہی کی تو بات ہے، چھت پر جو پڑوس
سے خشت باری کی شکایت آئی تھی اس پر اس کے پاپا
نے اسے رُوئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ بجلی کا
تار بٹ کر کمرے میں بند کر کے اس کی خوب دُھنائی کی
تھی۔ بقراط تو کیا سُقراط اور لقمان کی روحیں بھی بلبلا
اُٹھی ہوں گی۔ لیکن اگلے دن جب خشت باری کا الزام
غلط ثابت ہو گیا تو میں نے خود منیر میں تشدد کے کثیف
بادل دیکھے تھے۔ کیا بقراط یہ ظلم و ناانصافی برداشت
کر جائے گا ؟ نہیں نہیں، وہ خود کنسلٹنٹ بن
جائے گا۔

جب منیر بہت چھوٹا تھا تو اس کی زندگی سے

ر پورے چہرے کو دیکھ کر لہلہاتے دھان کے کھیتوں کا
ان ہوتا تھا اور اس کی مسکراہٹ سے سرسوں
ل جاتی تھی اور ماحول ہوتی جیسے پھولوں سے بھر
اتا تھا۔ اور آج وہی چہرہ لق و دق صحرا ہو گیا ہے۔
وہ ابھی دس گیارہ سال کا ہی ہے لیکن اس
سوچیں ہرگز اتنی کم بخت نہیں۔ وہ پلاننگ کرنا سیکھ
یا ہے۔ وہ بڑی سیٹنگ کے ساتھ سینما جاتا ہے۔
س طرح وہ پیسے حاصل کرتا ہے اور کون سی فلم
یکھتا ہے، یہ وہی جانے۔ وہ ایسا شاید اس لئے کرتا
کہ اس کے باپ کو سینما سخت ناپسند ہے۔ انہوں نے
نے ہوش میں کبھی فلم نہیں دیکھی۔ اس کا تذکرہ تک
ہیں پسند نہیں۔ لیکن منیر کے اسکول کے ساتھی سب
نے والدین کے ساتھ فلم دیکھ آتے ہیں، سیر و تفریح
تے ہیں اور ان پر تبصرہ کرتے ہیں تو ضرور منیر کے
کا بقراط بکھر جاتا ہے۔ منیر کے پاپا کو فضول سیر و تفریح
بھی پسند نہیں۔ انہیں اپنے کاروبار اور روپے کے لین
دین سے فرصت نہیں۔

منیر کے مزاج میں ایک عجیب و غریب انداز
رچ بس گیا ہے۔ احساسِ کمتری کا ان دیکھا تودہ اسے
آہستہ آہستہ پیس رہا ہے اور اس کی دبی دبی سی
شخصیت میرے دل پر آرے چلاتی رہتی ہے۔ ہنسنا
تو جیسے وہ بھول ہی گیا ہے۔ دن بھر کہیں ادھر اُدھر
مارے مارے پھرنا یا پھر گھر میں رہتے ہوئے خالی خالی
آنکھوں سے خلا میں گھورتے رہنا اس کی عادت بن
گئی ہے۔

آہ! بدنصیب منیر فیل ہو گیا، جبکہ اس
کی بڑی بہن تو فرسٹ پوزیشن اور فرسٹ ڈیویژن آئی
ہے۔ ہاں، میری بھی ساری محنت بے کار گئی۔ کتنی محنت
اور مستقل مزاجی سے اُسے پڑھایا۔ ٹیوٹر بھی لگوایا
اس کے پاپا نے بھی دن بھر یاد کرنے کے لئے سبق
دیئے، سوالات حل کرنے کے لئے۔ لیکن شام کو جب
اس سے جوابات چاہے تو وہ جیسے بالکل خالی الذہن
ہو گیا۔ انہوں نے طیش میں آکر بار بار اسے کرسی
سے اٹھا کر زمین پر دے مارا، لیکن بقراط؟ بقراط تو
اب بدل چکا تھا۔ وہ ایسا مضبوط اور آہنی کمپلائنٹ
بن چکا تھا جس پر آہنی وار بھی اثر نہیں کرتے۔

نرم و نازک منیر پر خوف، حادثات اور تشدد
کی اس قدر بوچھار پڑی کہ وہ بے خوف ہو گیا ہے۔ اس
پر ڈانٹ پھٹکار اسی طرح پھسل جاتی ہے جس طرح
نو مولود اروی کے پتے پر شبنم کا قطرہ۔ منیر کے لئے کاہل، غر
نکما، چور اور جو بھی دوسرے خطابات تجویز کئے گئے ان
کو اعزاز سمجھ کر جیسے اس نے اپنے سینے سے لگا لیا ہے
اور بقراط نے گویا سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔

○○

اقوالِ زرّیں

[illegible]

○

[illegible] کہتے ہیں: آدھا صبر اور آدھا شکر۔

○

[illegible]

○

[illegible]

○

[illegible]

نیند انسان کے لئے اتنی ہی ضروری
ہے جتنا کھانا پینا۔ شہروں میں کھانے پینے
کا سامان تو مل جاتا ہے لیکن نیند مشکل سے
آتی ہے۔ نیند نہ آنے کی بیماری دیہات
سے زیادہ شہروں میں پائی جاتی ہے۔ عموماً
یہ طبقہ اس کا شکار ہوتا ہے۔ یہ لوگ نیند
لانے کے لئے خواب آور گولیوں کا اور مسکن
دواؤں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان دواؤں
کی عادت پڑ جائے تو اس عادت سے چھٹکارا
پانا مشکل ہو جاتا ہے۔

نیند کا تعلق عمر سے بھی ہے جوانی کی
گہری نیند مشہور ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی
ہے، نیند کا عرصہ کم ہوتا جاتا ہے۔ عام طور
پر سات آٹھ گھنٹے کی نیند کافی ہوتی ہے لیکن
بعض لوگ چار پانچ گھنٹے میں ہی نیند کی ضرورت
کو پورا کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ
گہری نیند لمبی نیند سے کم عرصے میں نیند کی
ضرورت پوری کر دیتی ہے۔ بڑھاپے میں جلد کی
جلدی آنکھ کھل جاتی ہے۔ نیند ہلکی ہو تو ذرا سی
آہٹ سے انسان جاگ اٹھتا ہے۔ ۱۲ سال
کی عمر میں بچے کو ۹ گھنٹے کی نیند درکار
ہوتی ہے۔ ۲۰ سال کی عمر میں ۸ گھنٹے کافی
ہوتے ہیں۔ ۴۰ سال کی عمر میں ۷ گھنٹے، ۶۰
سال کی عمر میں ۶½ گھنٹے اور ۸۰ سال کی

عمر میں ۲ گھنٹے۔

بے خوابی سے انسان کا دن بھی خراب گزرتا ہے۔ وہ دن میں تکان محسوس کرتا ہے کام کے دوران اونگھتا رہتا ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ یادداشت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔

بے خوابی کی سب سے بڑی وجہ تناؤ ہے۔ کوئی وحشت خیز خبر سنی ہو تو رات بھر نیند نہیں آتی۔ کوئی بے حد خوشی کی خبر ہو یا کوئی سفر درپیش ہو تو بھی نیند نہیں آتی۔ دن بھر کام کی زیادتی سے تکان ہو تو بھی نیند آنکھیں چراتی ہے۔ کسی انسان کی حرکت سے طبیعت میں غصہ پیدا ہو جائے تو بھی یہ صورت درپیش آتی ہے۔ رات کو زیادہ کھا لیا ہو تو بھی یہ شکایت پیدا ہو سکتی ہے۔ سونے سے پہلے چائے یا کافی کا استعمال بھی نیند کو بھگا دیتا ہے۔ قبض سے بھی یہ بیماری پیدا ہو سکتی ہے۔ سگریٹ نوشی بھی اس کا سبب بن سکتی ہے۔ سب سے دلچسپ وجہ خود نیند کا انتظار ہے۔ اپنے انتظار کرنے والوں سے بھی نیند دور بھاگتی ہے۔

بے خوابی کا سب سے بڑا علاج

یہ ہے کہ وقت کی پابندی کی جائے۔ نیند اکثر مقررہ وقت پر آتی ہے۔ اگر سونے کا وقت نکل جائے تو نیند بھی ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ رات کو جلد سونے کی عادت ڈالیں۔ نصف شب سے ۲ گھنٹے پہلے کی نیند نصف شب کے بعد ۴ گھنٹے کی نیند سے بہتر ہے۔ امتحان کے موقع پر اکثر طالب علم راتوں کو دیر تک جاگتے ہیں۔ وہ خود کو چائے یا کافی کی مدد سے بیدار رکھتے ہیں، یہ غلط ہے۔ اس کوشش کا الٹا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ امتحان کے کمرے میں سوالات کو صحیح طور پر حل نہیں کر پاتے۔ اس کی وجہ دماغی تکان ہوتی ہے۔

ڈاکٹروں نے اس مرض کے بارے میں کھوج کی تو انہیں معلوم ہوا کہ وٹامن بی کامپلکس اور وٹامن سی کی کمی اس کی وجہ ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کیلشیم، میگنیشیم اور پوٹاشیم کی کمی بھی اس کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر انسان کی غذا میں یہ تمام چیزیں صحیح مقدار میں موجود ہوں تو نیند کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

نیند کے لئے سادہ غذا بہت ضروری ہے۔ میدہ کی بنی ہوئی چیزیں، مٹھائیاں، چائے، کافی، چاکلیٹ، بوتل میں بند شربت، مرغن اور گھی میں تر تراتے سالن، تلی ہوئی چیزیں یہ سب نیند کی دشمن ہیں۔ تیز نمک والی غذا اور تیز مسالے بھی نیند کو دور بھگا دیتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ ہلکا کریں۔ پھل، گیہوں کا دلیہ، دہی اور ٹوسٹ پر اکتفا کریں۔ دوپہر اور رات کے کھانوں میں سلاد کا دھیان رکھیں۔ کھیرا، ٹماٹر، چقندر کی سلاد بنا لیں دہی کا رائتہ بھی کھا سکتے ہیں۔ ایک وقت گوشت بھی کھائیں۔ اس سے جسم میں پروٹین پہنچتا ہے۔ سالن شوربے والا ہو تو بہتر ہے۔ سالن میں زیادہ گھی نہ ڈالیں۔ رات کو سونے سے پہلے گرم دودھ کا ایک کپ پی لیں۔ دودھ میں امینو ایسڈ ہوتا ہے۔ یہ نیند لانے میں مدد کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، نیند لانے کی کوشش کا نتیجہ اکثر الٹا ہوتا ہے نیند کی فکر کرنے کی بجائے اپنے دماغ کو دوسری طرف راغب کریں۔ مثلاً کوئی دلچسپ ناول پڑھیں، یا ریڈیو پر موسیقی سنیں۔ کتاب پڑھیں تو اتنی دلچسپ نہ ہو کہ رات کی نیند حرام ہو جائے۔ کتاب اتنی تہلکہ انگیز بھی نہ ہو جو اعصاب پر برا اثر ڈالے۔ بلکہ کوئی کتاب یا کوئی معمولی رسالہ پڑھیں، تا کہ بور ہو جائیں اور جماہیاں آنے لگیں۔ کوئی افسردہ کن اور غمناک واقعہ یاد آ جائے تو اسے یاد نہ کریں۔ بلکہ دماغ کو کسی خوش آئند واقعہ کی یاد دلائیں۔ نظر کے سامنے ایک سیاہ دیوار کا تصور کریں جس پر کچھ نہ لکھا ہو۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنیں۔ چت نہ سوئیں، بلکہ کروٹ لے کر سونے کی کوشش کریں۔ گھٹنوں کو خم دے کر تھوڑا سا اوپر کی طرف لے جائیں۔ سر اور کندھوں کو تھوڑا سا آگے کی طرف جھکائیں۔ رات میں دو تین بار کروٹ بدلنا مفید ہے ہاتھ اور پاؤں کی پوزیشن بھی بدلتی رہے۔

نیند لانے کے لئے گہرے سانس لینا بھی مفید ہے۔ کروٹ لے کر خوب گہرا سانس لے کر پیٹ کو پھیلائیں پھر سانس باہر نکالیں۔ یہ عمل تین بار دہرائیں۔ اس کے بعد گہرا سانس لے کر دس پندرہ سیکنڈ تک سانس کو سینے میں روکے رکھیں یہ عمل بھی تین بار دہرائیں۔

کپڑے کی تھیلی گرم پانی میں ڈبو کر کمر کو سینکنے سے بھی نیند جلد آ جاتی ہے۔ بعض اوقات پیروں کو گرم پانی کے برتن میں رکھنے سے بھی نیند فوراً آ جاتی ہے۔

○

مس رعنا کوثر

جودھا بائی اور نور جہاں کی رقیبانہ چشمکیں

مُغل حرم میں جہاں سیاسی اور ملک گیری کی سازشیں پکتی تھیں وہاں بیگمات میں آپسی رقیبانہ جھگڑے اور چشمکیں بھی جنم لیتی رہتی تھیں۔

جودھا بائی، جسے بدقسمتی سے بہت سے لاعلموں نے جہانگیر کی والدہ بتایا ہے۔ درحقیقت اس کی بیوی اور نور جہاں کی سوتن تھی۔ دونوں میں آئے دن ایک دوسرے کو شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کے سامنے نیچا دکھانے اور اس کی نظروں سے نیچا گرانے کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔

بلاشبہ دونوں سوتنیں تھیں اور سوکنوں میں ایسے مناقشے اور جھگڑے رونما ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن ان دونوں بیگمات میں نظریاتی اور عقائد کے بھی اختلافات تھے جن کا ذکر ان جھڑپوں کو سمجھنے میں قارئین کی مدد کرے گا۔

ملکہ نور جہاں جسے جہانگیر پہلے سے ہی جانتا اور چاہتا تھا۔ دورِ اکبری میں شیر افگن نامی مغل تعلقدار سے منسوب کر دی گئی تھی اور اسی شیر افگن سے اس کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام بھی مہر النساء تھا۔

عہدِ جہانگیری میں جب شیر افگن مارا گیا تو جہانگیر نے نور جہاں کو مغل حرم میں بُلوا کر اس خوبصورت، دانشور اور جوان العمر بیوہ سے شادی کر کے اسے نُور جہاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔

جودھا بائی اس سے قبل جہانگیر کے عقد میں آچکی تھی۔ یہ شادی جلال الدین محمد اکبر کے اس دور میں ہوئی تھی جب شہنشاہ جہانگیر شہزادہ تھا اور اسے عرفِ عام میں شیخو۔ اور سلیم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

جب نور جہاں جہانگیر کے حرم میں مع ایک خوبصورت بیٹی کے داخل ہوئی۔ اس وقت جودھا بائی جگت گوسائیں (ملکہ) کے لقب سے سرفراز ہو چکی تھی اور شہنشاہ شاہ جہانی صاحب قِرانِ ثانی پیدا ہو چکا تھا جسے دورِ شہزادگی میں خرّم کے نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔

بے یکھی قرارداد کے تحت راج پوت شہزادی کے بطن سے پیدا ہونے والے شہزادے ہی کو ولی عہد قرار دیا جاتا تھا۔ اس لئے جودھا بائی خرّم کو شہنشاہِ ہندوستان کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی جب کہ نور جہاں کی ہم نام بیٹی مہر النساء جہانگیر کے بیٹے شہریار سے بیاہ دی گئی تھی اور فطری طور پر نور جہاں کی یہ خواہش تھی کہ آنے والا ہندوستان کا شہنشاہ اس کا داماد ہی بنے اور آصف خاں کی بھی یہی دلی تمنا تھی کہ اس کی حقیقی بھانجی کا شوہر شہریار ہی جہانگیر کے بعد ولیٔ ہندوستان کے منصبِ جلیل پر فائز ہو۔

راج پوتوں میں بیوہ عورتیں نامبارک سمجھی جاتی تھیں اور انہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ بیوہ کا دوسری شادی کرنے کا کوئی سوال ہی راج پوت سماج میں نہیں اٹھتا تھا۔ اس وجہ سے بھی مہارانی جودھا بائی نور جہاں کو مغل حکومت کے لئے بدشگونی کا باعث سمجھتی تھی۔ جب کہ خود وہ اپنے کو سہاگن سمجھنے پر فخر کیا کرتی تھی۔

دونوں کی تہذیب اور تمدن میں فرق

تھا۔ زبانیں بھی الگ الگ تھیں۔ ایک
ایران کی تھی دوسری ہندوستان کی۔ ایک
کی زبان فارسی تھی — دوسری اگرچہ
فارسی سے نابلد نہیں تھی لیکن ہندوستانی
زبان یا اردو کی ماہر تھی۔

فطرت اور تربیت میں بھی دونوں متضاد
حیثیت کی مالک تھیں۔ نور جہاں اعلیٰ قسم کی
شاعرہ تھی۔ اسے علم و ادب کا ذوق تھا اور وہ
خواتین کے لئے طرح طرح کے ایسے ڈیزائن
بناتی تھی جو آج تک ہندوستان میں مروّج
ہیں۔ اس کے علاوہ نور جہاں کو نئے نئے اقسام
کی خوشبوؤں اور عطریات کے مرکبات بنانے
کا بے حد شوق تھا۔

جودھا بائی کے بارے میں یہ انکشاف
ناقابلِ یقین ہوگا کہ وہ صاحبِ قلم تو نہ تھی لیکن
ایسی صاحب سیف تھی جس نے ایک دو بار
خود مستقبل میں اپنے ہونے والے شوہر شہزادہ
سلیم سپہ سالار مغل افواج کے خلاف اپنے
باپ کی حکومت — تاج اور تخت کے دفاع
کے لئے دبا لیا تھا۔ اسے فنِ سپہ گری سے
زیادہ لگاؤ تھا۔

نور جہاں سیاسی چالوں سے واقف
تھی، جب کہ جودھا بائی صاف گو اور سیاسی
چالوں سے ناواقف تھی۔ دوسرے الفاظ
میں جودھا بائی بول بول کر سوچا کرتی تھی۔

جودھا بائی کو امام ربانی حضرت مجدد
الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے والہانہ
عقیدت تھی جب کہ نور جہاں ان سے اس
وجہ سے بھی ناراض تھی کہ وہ شہنشاہ جہانگیر
کے نظامِ حکومت کے خلاف تھے۔ اور اس
وجہ سے انہیں گوالیار قلعہ میں نظر بند کرانے
میں ملکہ نور جہاں کا کھلا ہوا ہاتھ تھا۔ حضرت
مجدد الف ثانی کی گرفتاری سے ناخوش
ہونے کی وجہ سے مہابت خاں نے نور جہاں
اور جہانگیر کو گرفتار کر لیا تھا۔ بعد میں حضرت
شیخ کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے مہابت
خاں نے دونوں کو رہا کر دیا تھا۔

نور جہاں نے جب شاہی حرم میں قدم
رکھا تو وہ دیکھ کر حیران و سراسیمہ ہو گئی کہ
وہاں کے ماحول پر جودھا بائی پوری طرح
سے حاوی تھی۔ اور ایک طرح سے اسی کا سکّہ
چلتا تھا۔ چنانچہ نور جہاں اکثر و بیشتر جودھا
بائی پر جملے کستی رہتی تھی۔ اور یہ محض اتفاق
ہی ہے کہ ہر بار اسے جودھا بائی کی جانب
سے ایسا جواب ملتا کہ وہ وقتی طور پر قوتِ
گویائی سے محروم ہو جاتی تھی۔

موسم گرما کا ایک دن تھا —
گرمی اپنے شباب پر تھی۔ سورج کی کرنیں
برقی تپش کی بارش کر رہی تھیں۔ نور جہاں
سفید لباس میں جو گرمی کا ملبوس ہے جہانگیر
کے پاس موجود تھی۔ جہانگیر کو اس وقت
جودھا بائی کا خیال آیا تو اسے طلب کیا گیا۔

جودھا بائی جس وقت شہنشاہ کے
سامنے آئی تو وہ سرتاپا اس سرخ لباس میں
ملبوس تھی — جو گرمی کو جذب کر لیتا ہے۔

جودھا بائی کو سرخ لباس میں دیکھ کر
نور جہاں نے ایک جملہ کس دیا — اس نے
شہنشاہ کو مخاطب کر کے کہا:

"دیکھا ظلِ سبحانی — یہ راجواڑے
کی رہنے والی۔ گرمیوں میں سرخ لباس زیبِ تن
کئے ہے!"

یہ سن کر جہانگیر نے معنی خیز نظروں
سے اپنی راج پوت بیگم کو دیکھا۔

جودھا بائی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح
فوراً ہی بولی:

"مہابلی — میں بیوہ نہیں ہوں —
خدا کی مہربانی سے میرا سہاگ قائم ہے —
اور — رہے گا — میری قسمت میں سفید
لباس نہیں ہے، جو ہندوستانی بیوہ عورتوں
کے لئے مخصوص ہے۔"

اور یہ کیسا اتفاق ہے یا کیسی پیش گوئی
تھی کہ واقعی جودھا بائی کی زندگی میں یہ لباس
زیبِ تن کرنے کا موقع ہی نہیں آیا۔ وہ سہاگن
ہی رہی جب کہ نور جہاں ایک بار پھر بیوہ ہوئی
اور جہانگیر کے انتقال کے بعد برسوں
زندہ رہی۔

علاوہ سوتن ہونے کے جودھا بائی کو
نور جہاں کے بیوہ ہو کر دوسرے مرد کی بیوی
ہونا بہت کھٹکتا تھا۔ اس لئے بار بار وہ اس
جانب اشارے کیا کرتی تھی۔

ایک دن جہانگیر نشے میں دھت
تھا۔ بجائے کنیزوں کے اس نے جودھا بائی
سے کہا کہ وہ اسے ایک پیالہ پانی پلائے۔
جودھا بائی نے سوچا کہ شاید جہانگیر نور جہاں
کے بہکانے سے یہ حقیر خدمت اس سے لے رہا
ہے —

جودھا بائی نے بہرحال حکم کی تعمیل
کی لیکن پانی کا پیالہ شوہر کو دینے سے پہلے
اس میں سے کچھ پہلے ہی پی لیا۔ اور پھر اسے
جہانگیر کے سامنے پیش کیا۔

یہ منظر دیکھ کر نور جہاں چونک پڑی
اور اس نے جہانگیر کو سناتے ہوئے کہا:

"دیکھئے ولی نعمت آپ کو جھوٹا پانی
جا رہا ہے!"
قبل اس کے کہ جہانگیر کی جانب
کسی ردِ عمل کا اظہار ہوتا جودھا بائی نے کہا۔
"جہاں پناہ کو جھوٹی چیزیں کھانے پینے
بے حد شوق ہے" یہ طعنہ بھی نور جہاں
بیوگی پر تھا۔
سطورِ اولین میں جودھا بائی کو جہانگیر
بیوی بتایا گیا ہے جب کہ بعض لوگ
ے جہانگیر کی ماں سمجھتے ہیں۔ ایسی ایک
لی ساغر نظامی مرحوم نے اپنی کتاب انارکلی
بھی کی ہے جس میں جودھا بائی کو جہانگیر
والدہ قرار دیا ہے۔ اس کتاب میں مرحوم
اکٹر ذاکر حسین صدرِ جمہوریہ ہند، پروفیسر
سلوب انصاری اور ڈاکٹر محمد حسن کے تبصرے
امل ہیں لیکن کسی نے بھی اس سراسر لغویات
فلم رسائی نہیں کی۔ مرحوم کے آصف نے
ی مغلِ اعظم میں اسی غلطی کا ارتکاب
رتے ہوئے لاکھوں سینما بینوں کے دل میں
بات بٹھا دی کہ جودھا بائی جہانگیر کی
ں تھی۔ اور یہ اتنی غلط بات ہے جسے دشنام
رازی پر معمول کیا جا سکتا ہے۔
بلا شبہ جہانگیر کی والدہ بھی ایک
اج پوت شہزادی تھی جس کا مزار سکندرا
ں اپنے شوہر اکبرِ اعظم کے ساتھ مریم زمانی
کے مقبرے کے نام سے موجود ہے۔
جہانگیر کی والدہ مریم زمانی بیگم راجہ بہارا مل
کچھوریہ والئ امیر (جے پور) کی بیٹی تھی جسے
اکبرِ اعظم نے مریم زمانی کا لقب دیا تھا۔
جگت گوسائیں کا نام بالمتی تھا اور
اسے جودھا بائی اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ

راجہ مالدیو کے بیٹے راجہ اُودے سنگھ
والئ جودھپور کی دختر تھی۔ اس حقیقت کا
انکشاف بھوپال کے دفترِ تاریخ منصرم
مرحوم عبد القدیر آزاد نے اپنی مشہور کتاب
"تاج محل" میں کیا ہے۔ فتح پور سیکری پر لکھی
گئی ایک آرکیالوجی کے محکمہ کی جانب سے
شائع کی گئی کتاب میں بھی اس حقیقت کا
تفصیلی ذکر ہے۔
جودھا بائی کو نور جہاں سے یوں بھی
چڑ تھی کہ وہ جہانگیر کی مے خواری کو ہوا دیتی
تھی جب کہ راج پوت ہونے کے باوجود
جودھا بائی کو جہانگیر کا قدح خور ہونا پسند
نہیں تھا۔ ایک دن عالمِ کیف و مستی میں
جہانگیر نے کہا۔
"جودھے بائی۔۔۔ آج ایک پیالہ تم بھی
پلا دو۔"
جودھا بائی یہ حکم کڑوا گھونٹ سمجھ کر پی گئی
لیکن جہانگیر شوہر ہونے کے علاوہ والئ
ہندوستان بھی تھا چنانچہ جودھا بائی نے
ایک لوٹے ہوئے شیشے کے پیالے میں
شراب بھر کر پیش کی تو نور جہاں نے اعتراض
اُٹھایا۔۔۔ مگر جہانگیر نے جودھا بائی
کی جانب مسکرا کر دیکھا تو اس نے کہا۔
"کیا کروں؟ جہاں پناہ کو ٹوٹی پھوٹی
چیزوں کو استعمال کرنے کی عادت ہے؟"
ایک دن سفر کے دوران کسی غریب
عورت کو پہننے کے لئے لباس دینے کو
جہانگیر نے جودھا بائی اور نور جہاں
دونوں سے کہا۔ نور جہاں نے ایک نیا قیمتی
جوڑا غریب عورت کو دیا لیکن جودھا بائی نے
اپنی اُترن اسے دی۔ جہانگیر نے کہا۔

"جودھے تمہیں کیا کمی ہے؟"
"کمی تو کچھ نہیں۔۔۔ لیکن جہاں پناہ
اُترن کو ہی سب سے اچھا سمجھتے ہیں اس لئے
میں نے اس لباس کا دینا ہی سب سے
اچھا سمجھا۔"
جہانگیر کی شراب تمل بہرحال
اپنے جم سے نہ چھلکی۔ اس کے برعکس ایک
دن جہانگیر اپنی راج پوت ملکہ سے بعد
مسرور ہوا۔ حالاں کہ اس واقعہ نے نور جہاں
کو بے حد افسردہ کر دیا تھا اور غلطی نور جہاں
کی ہی تھی۔
ایک روز جب نور جہاں جہانگیر کے
بالکل پاس ہی بیٹھی تھی، اپنے شوہر کی ایک
لطیف حرکت پر بولی "جہاں پناہ! آپ کے
مُونہہ سے بُو آ رہی ہے اُسے اُدھر ہی رکھئے"
جہانگیر نے جودھا بائی کو قریب بُلا کر کہا کہ وہ
اس کے مُونہہ کو سُونگھ کر بتلائے کہ کیا اس میں
سے بُو آ رہی ہے۔ لیکن جودھا بائی نے بھی سب
کے سامنے اس لطیف منظر کو پیش کرنے
سے احتراز کرتے ہوئے کہا۔
"جہاں پناہ میں نے دنیا میں کسی بھی مرد کے
مُونہہ کو اتنے قریب سے نہیں سُونگھا تو میں کیسے
بُو۔۔۔ اور۔۔۔ خوشبو میں تمیز کر سکتی ہوں۔
میری بہن نور جہاں کو ہی اس کا تجربہ ہے!"
جودھا بائی کو اپنے سُہاگن ہونے پر
بڑا ناز تھا۔ اسی لئے انتقال کے بعد اس کی وصیت
کے مطابق اسے اسی کے لباس میں ہوتے قصبہ
سُہاگ پورے میں دفن کیا گیا جہاں کی
چوڑیاں زمانے بھر میں مشہور ہیں۔۔۔ اور
ہندوستان میں چوڑیاں پہننے کا حق صرف
سُہاگنوں کو ہی ہوتا تھا۔

طوفان کے بعد

"آج بیچاری عید کھڑی ہے
آنگن میں کشکول لیے"
بہنا بھائی کوئی نہیں ہے
ماں بھی اپنے ساتھ نہیں
آسمان پر نظر جمائے
بابا میرے کیا تکتے ہیں
چھوٹی بچی آشا دس سے
وہ خود کو بہلاتے ہیں
جانے والے کیسے آئیں
وہ ہرگز نہ آئیں گے

بابا میرے۔ تم کو میری
ماں کی یاد ستاتی ہے
تم کو تنہا دیکھ کر بابا
آنکھ مری بھر آتی ہے
بہنا بھائی ماں کا غم تو
عیدوں کی میراث ہے بابا
ہم سے پہلے ایسا ہی غم
اوروں نے بھی پایا ہے
ان کے بھی گھر عید آتی ہے
اور گذر بھی جاتی ہے
وہ بھی غم کو بھول کے آخر
جیون میں لگ جاتے ہیں

ایسی عیدیں اور آئیں گی
اور گذر بھی جائیں گی
ہم کو آنے والے دن کو
آخر خوش بھی کرنا ہے
غم اور خوشیاں دونوں کے سنگ
جینا ہے اور مرنا ہے
اٹھو بابا۔ ہنس کر مجھ کو
عید مبارک باد کہو
دکھ کو اپنے رب کی مرضی
عید کو ایک سوغات کہو

"عید بیچاری دور کھڑی ہے
اس کو پاس بلا لو بابا
اپنے غم کو بھول کے اب تو
اس کا دل بہلا دو"

منصور اعجاز

ماں کے نام

عید کا چاند سرِ بام دمکتا ہوگا
اور وہ ہاتھ دعا کے لئے اٹھے ہوں گے
دل میں امڈے ہوئے جذبات کا طوفان
اور رہ رہ کے مجھے ڈھونڈتی ہوں گی نظریں

اپنے ہاتھوں میں رچائے ہوئے مہندی کے
آئینہ تھامے سرِ شام ہیں حسن مجمل
کہیں مائیں، کہیں بچے، کہیں کوئی لڑکی
مسکراتی ہوئی آنکھوں میں لئے میری غزل

طرب میں ڈوبا ہوا سارا زمانہ ہوگا
آج تجدیدِ محبت کا فسانہ ہوگا
عید کا چاند رفاقت کا بہانہ ہوگا

اس رفاقت کی تمنا ہے کہ ہر عید کی رات
خواب میں آتی ہے اور آ کے چلی جاتی ہے
ہاتھ بے سود اٹھے جاتے ہیں چھونے کو اسے
اور گلے ملنے کی حسرت ہے کہ رہ جاتی ہے

چاند کے رخ کو وہی آنکھوں نے چوما ہے اب
اس کی آنکھیں بھی اسی چاند کو تکتی ہوں گی
عید ملنے کا بہانہ ہے نبی آج کی رات
عید کی رات نہیں آج ہے معراج کی رات

محسنہ جیلانی
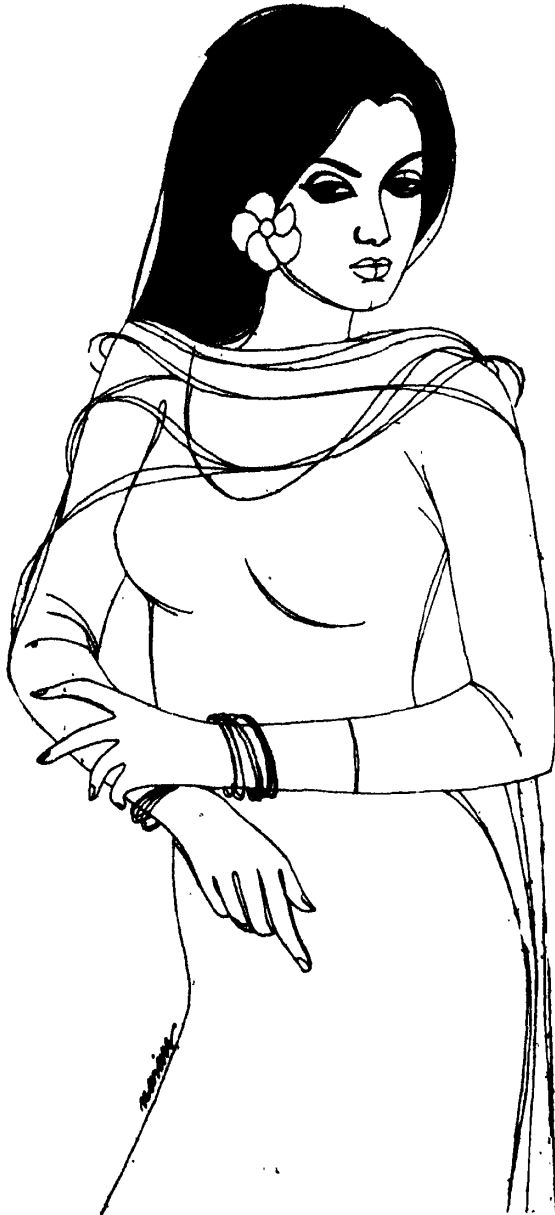
زکام کھانسی اور سردرد کے بعد کمر کا

غالباً دنیا کی سب سے عام بیماری ہے عورتیں
بیماری میں کچھ زیادہ ہی مبتلا دکھائی دیتی ہیں
عورتیں غربت کی وجہ سے مزدوری کرتی ہیں۔
سامان کا ٹوکرا سر پر اٹھا کر چلتی ہیں کسان
عورتوں کو فصل کاٹنے کے لیے گھنٹوں کمر کو
جھکانا پڑتا ہے مزدور عورتوں کو اینٹیں ڈھونی
پڑتی ہیں۔ شام کو جب یہ عورتیں محنت مشقت کر کے
واپس پہنچتی ہیں تو ان کا بدن تکان سے چُور
ہوتا ہے ایسے میں کمر کا درد سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن
جب متوسط اور امیر گھرانوں کی عورتیں اس بیماری
کی شکایت کرتی ہیں تو تعجب ہوتا ہے۔

کمر کا درد دراصل روزانہ کی زندگی میں بے احتیاطی
اور بے پروائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنا اٹھنے بیٹھنے
اور کام کرنے کا ڈھنگ بدل ڈالیں تو ہمیں اس
شکایت سے نجات مل سکتی ہے۔ اگر آپ ذیل کی
ہدایتوں پر عمل کریں تو بہت ممکن ہے کہ آپ کو
کمر کے درد سے نجات مل جائے۔

(۱) ہم جب فرش پر کھڑے ہوتے ہیں تو
اپنا بدن کا سارا بوجھ ایک پاؤں پر ڈال دیتے ہیں۔
اس طرح جسم کا توازن خراب ہو جاتا ہے۔ جسم کا
بوجھ دونوں پیروں پر برابر رہنا چاہیے۔ اگر آپ
کو ایک پاؤں پر زیادہ بوجھ ڈالنے کی عادت
ہے تو اسے یک لخت چھوڑنا مشکل ہوگا۔ اس
کی ترکیب یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد جسم کا بوجھ
دوسرے پاؤں پر ڈالیں۔ اس طرح پہلی غلطی
کی تلافی ہو جائے گی۔

(۲) جب فرش پر کھڑی ہوں تو کندھوں
کو سیدھا رکھیں۔ کمر کو جھکا کر چلنا خاکساری کی
دلیل تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کی قیمت کمر کے درد
کی شکل میں ادا کرنی پڑتی ہے۔
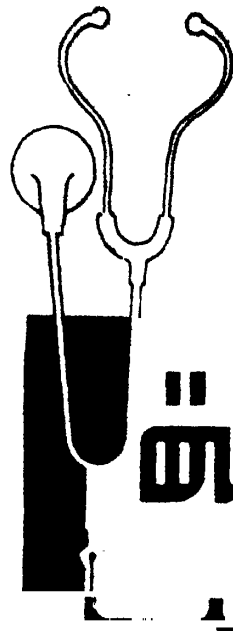
(۳) جب گھر کی صفائی کریں یا کپڑے
دھوئیں تو زیادہ دیر تک کمر کو جھکائے نہ رکھیں۔ اگر
ان کاموں سے نجات مشکل ہو تو تھوڑے تھوڑے
وقفے کے بعد کمر کو ضرور سیدھا کر لیں۔

(۴) گھر میں صوفے پر بیٹھیں یا ہاسٹل کی بنچ
پر، اس بات کا خیال رکھیں کہ صوفے یا آرام کرسی
کی اونچائی آپ کے پیٹ تک ہونی چاہیے۔ ایک
عام قاعدہ یہ ہے کہ صوفے کی پشت کی اونچائی
ہر حال میں بہتر ہے۔ یہ اونچائی اس کے ساتھ
کھڑے ہو کر بھی ناپی جا سکتی ہے۔ اگر یہ آپ
کے پیچھے تک پہنچتی ہے تو مناسب ہے۔

(۵) آپ کمرے کے فرش پر بیٹھیں یا دری
پر، اس بات کا دھیان رکھیں کہ کمر ٹکانے کے لیے
سہارا ہونا چاہیے۔ کمرے میں دیوار یا تکیے کا
سہارا کافی ہے۔ صوفے یا کرسی پر بھی ٹیک لگا کر
بیٹھیں، تاکہ کمر کو آرام ملتا رہے۔

(۶) جب کوئی وزنی چیز فرش سے اٹھائیں
تو اپنے جسم کو اس چیز کے قریب لے آئیں۔
بھاری صندوق اٹھاتے وقت اس بات کا خیال
رکھیں کہ وزن کا زور کولہوں اور گھٹنوں پر پڑے
کمر کو دوہرا کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۷) اگر فرش سے دُھلے ہوئے کپڑے
اٹھائیں تو گیلے کپڑے سیدھی کھڑی ہو کر نچوڑیں
جھکی ہوئی کمر سے بوجھ اٹھانا اور اسی حالت میں
نچوڑنا کمر کے درد کے لیے خطرناک ثابت ہوتا
ہے۔ یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھیں۔ ایک ہی وقت میں
بوجھ اٹھانا اور اُسے گھمانا یا موڑنا غلط ہے۔ اس
سے کمر پر دوہرا بوجھ پڑتا ہے۔

(۸) جب آپ کو چھینک آئے تو اوپر کی
طرف مونھ کر کے چھینکیں۔ نیچے کی طرف مونھ
جھکا کر چھینکنا ایک عام عادت ہے، لیکن صحت
کے لحاظ سے غلط ہے۔ مونھ کے آگے ہتھیلی رکھ
لیں لیکن مونھ اوپر ہی رکھیں۔ کھاتے وقت بھی
عورتیں مونھ کو جھکا لیتی ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ بلکہ
کمر پر ہاتھ رکھ سینے کو پیچھے کی طرف جھکا کر کھائیں۔
اس طرح کمر پر زور نہیں پڑتا۔ ہمیشہ سینہ نکال کر

کمائیں۔

(۹) اگر آپ کو سفر میں وزنی سوٹ کیس اٹھانا پڑے تو اس سے بھی پرہیز کریں۔ ایک وزنی سوٹ کیس کی چیزیں اگر دو چھوٹے سوٹ کیسوں میں منتقل ہو سکیں تو بہتر ہے۔ اس طرح کمر پر وزن برابر رہے گا۔ اگر ہو سکے تو ایسے سوٹ کیس استعمال کریں جن میں پہیے لگے ہوتے ہیں۔ اس طرح آپ کو بوجھ بھی کم محسوس ہوگا اور کمر پر وزن بھی نہیں پڑے گا۔

(۱۰) افسردگی کا موڈ ہو تو بھی مونھ لٹکا کر کمر نہ جھکائیں۔ فرش یا بستر پر بیٹھتے ہی ڈھیر نہ ہو جائیں۔ جب بھی بیٹھیں کمر سیدھی رکھیں۔

(۱۱) اگر آپ کے گھر میں میز، کرسی ہے تو اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کو میز پر سے کوئی چیز اٹھانے کے لئے بار بار نہ جھکنا پڑے۔ کرسی اونچی ہو اور میز نیچی تو آپ کو بار بار جھکنا پڑے گا۔ فرنیچر خریدتے وقت اس بات کا خیال رکھیں۔

(۱۲) کرسی یا صوفے پر بیٹھیں تو اس بات کا خیال رکھیں کہ صوفے یا کرسی کی اونچائی آپ کی ٹانگوں کی لمبائی سے زیادہ نہ ہو اور آپ آرام سے فرش پر پاؤں لٹکا سکیں۔ آپ کی ٹانگیں چھوٹی ہوں اور صوفہ یا کرسی اونچی ہو تو پاؤں ہوا میں معلق رہیں گے۔ یہ صورت غلط ہے۔

(۱۳) کمر کو سردی سے محفوظ رکھیں۔ گرمی میں پسینہ آئے تو فوراً پنکھا کھول کر پسینہ نہ سکھائیں اور پسینہ صاف کرنے کے لئے غسل خانے میں گھس جائیں۔ گرمی کے احساس کو فوراً ٹھنڈی ہوا یا ٹھنڈے پانی سے بدلنا غلط ہے۔ اس معاملے میں تحمل سے کام لیں، ورنہ کمر اکڑ جائے گی۔

(۱۴) اگر آپ نے کوئی بڑی خبر سنی ہے یا آپ کل کے اندیشے میں مبتلا ہیں تو اس سے بھی کمر کے اعصاب پر اثر پڑتا ہے۔ اگر آپ نروس ہیں تو کوئی ناول پڑھیں، یا سونے کی کوشش کریں، یا کسی سہیلی سے ملنے چلی جائیں۔ چہل قدمی سے ورزش بھی ہو جائے گی اور اعصاب کا تناؤ بھی دور ہو جائے گا۔

(۱۵) اگر درد کمر کے بالائی حصے میں ہو تو زیادہ بوجھ اٹھانے سے ہمیشہ پرہیز کریں۔

(۱۶) نفسیات کے ماہرین کی رائے میں کمر کا درد ازدواجی زندگی کی ناآسودگی سے بھی ہو سکتا ہے۔

ان ہدایات پر عمل کرنے کے بعد امید ہے کہ آپ کمر کے درد سے نجات پالیں گی۔ آپ کمر کا خیال رکھیں، کمر آپ کا خیال رکھے گی۔

■■

میرا پسندیدہ شعر

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام
(فیض احمد فیض) فریدہ گوہر (چنور)

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
(مرزا غالب) ذاکر حسین، وارث علی گنج

تم لاکھ چھپاؤ سینے میں، احساس ہماری چاہت کا
دھڑکن کا ہے تمہارا پیار وہاں، آواز یہاں تک آتی ہے
(قتیل شفائی) نوری انیس فاطمہ، بمبئی؟

اب میں سمجھا ترے رخسار پہ یہ تل کا وجود
دولتِ حسن پہ دربان بٹھا رکھا ہے
(فانی) سید معین الدین حبیب، حیدرآباد

اپنی خوشی میں غم کو بھی میرے نباہ لو
اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں
(نامعلوم) محمد امام الدین، مظفرپور (بہار)

یوں دیکھ رہے ہیں میری جانب وہ سرِ راہ
جیسے کہ کسی بات پر خوش بھی ہیں خفا بھی
(کنور مہندر سنگھ بیدی سحر) فریدہ حبیب، چنور

کچھ اتنے دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے
(ساحر لدھیانوی) فاطمہ سید علی قادری، لنگرگڑھ

کیا میرا بگاڑے گا شبِ غم کا اندھیرا
یادوں کے بہت دیپ جلانے کے لئے ہیں
علمی فرحانہ، آکولہ

"میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ان سے ملئے

ثریا حسین

گزشتہ صدی میں یورپ نے ایسے کئی عالم پیدا کئے جنہیں مشرقی علوم سے گہری دل چسپی تھی۔ انہیں مستشرق کہتے ہیں۔ میکس مولر جرمن تھے۔ ان کو ویدوں سے گہری دل چسپی تھی۔ یہ کہنا حقیقت سے بعید نہیں ہوگا کہ انہوں نے ویدوں کو گم نامی سے نکال کر خود ان کے ملک ہندوستان سے روشناس کرایا۔ ایسے ہی ایک مستشرق گارساں دتاسی تھے۔ یہ فرانسیسی تھے اور اردو، فارسی کے عاشق تھے۔ یہ ایک جید عالم تھے۔ اردو اور فارسی پر انہوں نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ ثریا حسین کی ڈاکٹریٹ کا موضوع بھی گارساں دتاسی تھے۔ وہ ان پر ریسرچ کرنے فرانس بھی گئیں۔

ثریا آج کل علی گڑھ میں اردو کی پروفیسر ہیں۔ وہ اُترپردیش کے ضلع بجنور کی رہنے والی ہیں۔ ان کا تعلق نہٹور کے سادات سے ہے۔ مشہور ادیب سجاد حیدر یلدرم ان کے رشتہ دار تھے۔ نہٹور ایک مردم خیز خطہ ہے۔ قرۃ العین حیدر کا تعلق بھی نہٹور سے ہے۔ ثریا کے والد سید عبدالوحید جامعہ سے وابستہ تھے۔ وہ شعیب قریشی کی دعوت پر جامعہ سے بھوپال چلے گئے۔ ثریا نے بھوپال کے سلطانیہ اسکول سے تعلیم کی ابتدا کی۔ مگر یہ تعلیم نرسری سے آگے نہ بڑھ سکی۔ انہوں نے پرائمری تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ وہ اسکول کی پہلی جماعت میں داخل ہوئیں اور ہوسٹل میں رہنا شروع کر دیا انہوں نے علی گڑھ سے ہی میٹرک اور بی اے کیا۔ اس دوران ان کی مستقل رہائش ہاسٹل

تھا پھر پیرس۔ اس کے بعد انہوں نے پہلے فارسی
میں اور پھر اردو میں ایم اے کیا۔ ایل ایل، بی
کیا اور علی گڑھ میں ہی پڑھانا شروع کر دیا۔

ثریا کو اپنی تعلیم کے دوران فرانس کے
مستشرق گارساں دتاسی سے دلچسپی پیدا ہو گئی
اسی زمانے میں فرنچ گورنمنٹ نے ریسرچ کے
لئے اسکالرشپ کا اعلان کیا تو ثریا نے فرانس
جانے کی ٹھان لی۔ ان کی درخواست منظور
ہو گئی اور وہ پیرس پہنچ گئیں۔ فرانس کی حکومت
طالب علموں سے کافی رعایت برتتی ہے۔

وہاں ہر سال مختلف ملکوں سے وظیفے پر تعلیم
پانے والے لوگ آتے ہیں۔ پیرس کی سار بون
یونی ورسٹی دنیا کی قدیم یونی ورسٹیوں میں سے
ہے۔ ثریا کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں پیرس
میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کا وظیفہ دو سال
کے لئے تھا۔ یہ دو سال انہوں نے گارساں دتاسی
کا مطالعہ کرنے میں گزارے۔ ان کا موضوع
تھا گارساں دتاسی کی علمی خدمات کا تجزیہ۔
اس وظیفے میں فرانس کے مختلف تاریخی مقامات
کی سیر بھی شامل تھی۔

پیرس میں ثریا کی ملاقات اظہار حسین سے
ہوئی۔ اظہار حسین وہاں ریاضی پر ریسرچ کر رہے
تھے۔ پیرس میں ایک ہم وطن اور ہم زبان کا ملنا
غنیمت تھا۔ اظہار حسین وہاں پہلے سے رہتے
تھے۔ انہوں نے فرانس کی تعلیمی اور سماجی زندگی
میں ثریا کی مدد کی۔ بعد میں ہندوستان پہنچ کر اظہار
حسین سے ثریا کی شادی ہو گئی۔ اظہار حسین شیعہ
[illegible] لیکن اس بات پر ان میں
[illegible]
پہلے دنوں ثریا نے اپنی پیرس کی زندگی

پر ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام ہے:
"پیرس سے پارس تک"۔ پارس دراصل فارس
ہے۔ جو ایران کا پرانا نام تھا۔ اظہار حسین کا
تقرر چند سال کے لئے ایران کی تبریز یونی ورسٹی
میں ہوا تو ثریا بھی چھٹیاں گزارنے تبریز چلی گئیں۔
انہوں نے علی گڑھ سے سال بھر کی چھٹی لے لی۔
اس سفر میں کچھ دیر پروفیسر نور الحسن بھی ان کے
ساتھ تھے۔ نور الحسن آج کل روس میں ہندوستان
کے سفیر ہیں۔ نور الحسن کو جب معلوم ہوا کہ ثریا
تبریز جا رہی ہیں تو انہوں نے وہاں کی یونی ورسٹی
کے ڈین کو خط لکھا۔ جب ثریا تبریز پہنچیں تو وہاں
یونی ورسٹی کے ڈین نے ان کو بلایا اور انہیں بتایا کہ
ان کا ارادہ ہے کہ تبریز یونی ورسٹی میں اردو کا شعبہ
کھولا جائے اور ثریا اس شعبہ کی سربراہ بن جائیں
ثریا وہاں چھٹیاں گزارنے گئیں تھیں۔ انہوں
نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اس طرح تبریز
یونی ورسٹی میں اردو کے فروغ کا سہرا ثریا کے
سر بندھ جاتا لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور
ثریا واپس علی گڑھ پہنچ گئیں۔ وطن واپس
آنے سے پہلے انہوں نے ایران کی سیر کی۔

اس کے بعد وہ اظہار حسین کے ساتھ چھٹیاں
گزارنے یورپ چلی گئیں۔ وہ ایران سے
ترکی پہنچیں تو وہاں انہیں ایک لڑکی ملی جو
اردو بولتی تھی اس لڑکی کا نام یوکسل تھا۔
یہ لڑکی نصف ہندوستانی (یا پاکستانی)
تھی۔ اس کے باپ ملتان کے رہنے والے
تھے۔ انہوں نے ایک ترکی عورت سے
شادی کر لی تھی۔ ترکی کے سفر کے دوران ثریا
سے یوکسل کی دوستی مضبوط ہو گئی۔

۱۹۸۲ میں فرنچ حکومت نے ثریا کو دوبارہ
فرانس آنے کی دعوت دی۔ وہاں انہیں جدید
سینما اور تھیٹر کا مطالعہ کرنا تھا۔ فرانس کا
یہ دورہ مختصر تھا۔ چند مہینے فرانس میں گزارنے
کے بعد ثریا واپس علی گڑھ پہنچ گئیں۔

ایران کے قیام میں ثریا نے ایک فارسی
فلم دیکھی۔ اس فلم کا نام تھا: "محلل" یعنی
حلالہ کرنے والا۔ ثریا اس فلم سے بہت متاثر
ہوئیں۔ ایران میں طلاق کا قانون، ہندوستان
سے مختلف ہے۔ وہاں ایک ہی نشست میں
خاوند بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا۔

وہابی فرقہ ایک عبارت کے بعد ایک طلاق کو
تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح تین طلاقیں عبارت
یا تین مہینے میں ہی انجام پاتی ہیں لیکن ایران کے
فقیہہ ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے۔ انہوں
نے تین طلاقوں کے درمیان تین تین مہینے کا
وقفہ رکھا ہے۔ ایران میں متعہ جائز تھا۔ لیکن
اب اس کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے۔

ثریا نے مشہور فرانسیسی ڈراما نگار
مولیئر کے دو ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس
کے علاوہ "انتخاب یلدرم" اور "مقالات یلدرم"
بھی ایڈٹ کئے ہیں۔ حسرت موہانی پر ایک سیمینار
میں بھی انہوں نے حصہ لیا ہے۔ ایک غزل
سیمینار بھی ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کا ایک پروجیکٹ بھی
ان کو ملا ہے۔ اس کا نام ہے سرسید اور ان کا
عہد۔ ثریا کو نیشنل لیکچرر کا اعزاز بھی ملا ہے
انہوں نے اس سلسلے میں ہندوستان کی کئی
یونی ورسٹیوں میں لیکچر دئے ہیں۔

ثریا کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی لڑکی
دیبا حسین ۲۲ سال کی ہیں اور میڈیکل کالج میں
تعلیم پا رہی ہیں۔ چھوٹی لڑکی سبا حسین اسکول
میں زیر تعلیم ہیں۔

OO

شمیم عالم مصحفی

چپکے سے بہار آئی

چپکے سے بہار آئی

نزہت بستر پر دراز سامنے دیوار پر آویزاں کلینڈر کو نہ جانے کتنی دیر سے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی، جس پر بنی ہوئی تصویر میں ایک معصوم بچہ اپنے انگوٹھے کو چوس رہا تھا۔

ہوا کا ایک نٹ کھٹ جھونکا رفیل بے زنجیر کی طرح کھڑکی کے راستے سے کمرے میں داخل ہوا، کھڑکی کے دونوں پٹ زوردار آواز کے ساتھ بغلی دیوار سے ٹکرائے۔ ریشمی پردہ پر کٹے پرندے کی مانند پھڑپھڑانے لگا۔ سامنے دیوار پر ٹنگا ہوا کلینڈر ریج کے گرد دو تین پیچ کھا کر فرش پر گر پڑا دیوار گھڑی نے بارہ بجنے کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی نزہت کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ گزشتہ سال کی طرح یہ سال بھی دبے پاؤں گزر چکا ہے۔ چند گھنٹے کے بعد نئے سال کا سورج اپنی سنہری کرنوں سے فضاؤں کی گود بھر دے گا۔ مگر خود اس کی گود پچھلے پانچ برس سے سونی پڑی ہے۔ شادی کے دو سال اس طرح گزر گئے جس طرح خوشبو کا لطیف جھونکا پل بھر میں دل و دماغ کو سرور سے ہم کنار کر کے گزر جاتا ہے۔ مگر پھر جوں جوں دن ماہ و سال میں تبدیل ہوتے گئے، ایک بچے کی چاہ میں

نزہت اپنے آپ کو بھی بھلا بیٹھی تھی۔ اس کی دلچسپی تمام چیزوں سے ختم ہو گئی۔ روشن خیالی کے باوجود بچے کی چاہ نے اُسے ہر اس جگہ پر بھی حاضری دلوائی جہاں روشن خیالی دم توڑ دیتی ہے، تعویذ اور گنڈے اس کے بازو سے بندھے اور کھلتے ہی رہتے۔ اس کی تمام تمنّائیں ختم ہو چکی تھیں، ساری خواہشیں بچے کی معصوم کلکاریوں کا محتاج بن کر رہ گئی تھیں۔ اس نے اپنے مکان کا ایک چھوٹا سا کمرہ نہایت سلیقے اور خوبصورتی سے سجا رکھا تھا۔ اس میں ایک پالنا تھا۔ خوب صورت دیدہ زیب ننھے منّے کھلونے تھے۔ شیشے کی الماری گڈے گڑیوں اور بچوں کے رنگ برنگے کپڑوں سے بھری پڑی تھی۔ ننھے منّے بچوں کی فریم میں جڑی ہوئی مختلف پوز والی تصویریں دیواروں پر آویزاں تھیں۔

ندیم اپنی بیوی نزہت سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ وہ اس کے اشاروں کا منتظر رہتا۔ نزہت جس طرح کہتی، وہ ویسا ہی کرتا۔ اُسے اپنی بیوی کے جذبات کا پورا خیال تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نزہت ذہنی مریض ہے اور ایسے مریض کی خواہش کا احترام کبھی کبھی مریض کو معتدل حالت پر لے آتا ہے، ندیم بھی اپنی بیوی کی خواہش کا احترام دِل سے کرتا تھا۔ وہ جب اس کی مطلوبہ چیزیں لا کر اس کے ہاتھوں میں دیتا تو وہ شگفتہ کلی کی طرح کھِل اُٹھتی۔ معصوم بچوں کی طرح انہیں اُلٹ پلٹ کر دیکھتی، پھر کمرے میں سجا کر رکھ دیتی ندیم کی آنکھیں اپنی بیوی کی اِس جنونی چاہت کو دیکھ کر چھلک پڑتیں۔ وہ اُسے دلاسا دیتا۔

"ڈیئر، ابھی تو ہماری شادی کو صرف پانچ سال گزرے ہیں۔ ہو جائیں گے بچے! اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ یہ تو ہمارے عیش و عشرت کے دن ہیں۔ بچے ہو جانے کے بعد پھر کہاں یہ لطف و کرم کے شب و روز نصیب ہوں گے۔ پھر آج کل کے بچے خدا کی پناہ! نہیں بھئی، ہم تو بن بچے اچھے ہیں، تم اپنی جان ہلکان کیوں کرتی ہو؟" نزہت ان باتوں کو صبر و سکون سے سنتی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب جھوٹے دلاسے ہیں، ورنہ بچے کی خواہش کسے نہیں ہوتی۔ اُسے تو ایک ننھا منا سا بچہ چاہیے تھا۔ اپنا بچہ جس پر وہ اپنی ممتا نچھاور کر سکے، جس کی توتلی زبان سے ممّی اور پپا جیسے شیریں الفاظ سُن سکے اور جو اُس کی راتوں کی نیند حرام کر دے، پَل بھر کے لئے بھی اپنی گود سے نیچے اتارنا چاہے تو مچل اٹھے؟ ذرا قریب سے گزرے تو آنچل تھام لے اور وہ "میرا لال" کہہ کر اُسے اپنے سینے سے لپٹا لے۔ اسی اُمید کے سہارے اس نے پانچ سال گنوا دیئے۔ مگر خواب حقیقت میں نہ بدل سکا۔ پڑوس کی عورتیں اُس سے ہمدردی جتاتیں، دلاسے دیتیں اور صبر کی تلقین کرتیں۔ ان ساری باتوں کو سُن سُن کر اُس کے کان پک چکے تھے۔ اسے پڑوسنوں سے ایک طرح سے نفرت سی ہو گئی تھی، جو گھر میں داخل ہوتے ہی اُس پر اپنی ہمدردیاں نچھاور کرنا اپنا حق سمجھتیں۔

دیوار گھڑی نے ایک بجنے کا اعلان کیا۔ نزہت کی نگاہ گھڑی کی جانب اٹھی اور پھر وہ سامنے ٹیبل پر رکھے ہوئے اخبار کو یوں ہی اُلٹنے پلٹنے لگی۔ یکایک اس کی نظر ایک سُرخی پر تھم سی گئی۔

"شوہر بیوی کی بے التفاتی کا شکار" اور اس سے پہلے کہ وہ پوری خبر پڑھتی اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دِل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ ایسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سُرخی صرف اسی کی توجہ کھینچنے کے لئے لکھی گئی ہے، اُس کی اپنی بے التفاتی کیا کم ایک بچے کی چاہ میں وہ اپنے محبوب شوہر کو بھلا بیٹھی، جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک پل اُس کی خوشیوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس احساس نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں اور جب اس کی آنکھوں کے سامنے سے دھند کے دبیز بادل چھٹ گئے تو اُس کی محبت پاش نظریں اپنے محبوب شوہر پر مرکوز ہو گئیں جو اس کے قریب ہی سو رہا تھا سوتے ہوئے وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی بچہ روتے روتے سو گیا ہو اور نیند میں بھی جس کے چہرے پر کرب کے آثار ہوں۔ ندیم کی اس حالت کو محسوس کر کے نزہت کے مونہہ سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ اُسے ایسا لگا جیسے ندیم اپنے دل کی زبان سے اس سے شکایت کر رہا ہے کہ نزہت میں نے اس پانچ سال کے عرصے میں تمہارے دامن کو خوشیوں اور مسرّتوں سے بھرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا مگر تم نے میری قدر نہیں کی۔ بچے کی چاہ میں میری محبت، خلوص اور ایثار سب کچھ بھلا دیا۔ پلیز، مجھ سے اس قدر بے التفاتی نہ برتو۔ میں بھی انسان ہوں، میرے سینے میں بھی دھڑکتا ہوا ایک دل ہے۔ مجھے بھی چاہت اور محبت کی ضرورت ہے، اس سے پہلے کہ مجھے تنہائی کا زہریلا ناگ ڈس لے، پلیز مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لو۔"

نزہت اپنے شوہر کے قریب گئی، اس کی آنکھیں ندامت سے چھلک پڑیں۔ اس نے سوچا کہ ندیم کو سینے سے لگا کر بچے کی طرح خوب پیار کرے مگر شرم مانع تھی، وہ ایسا نہ کر سکی۔ اس نے ندیم کے بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹا کر اس کی پیشانی کو چوم لیا اور پھر خود ہی شرم سے چھوئی موئی بن گئی۔

■■

سیاست پر محبت کی فتح

انوار عظیم

پچھلے سال اٹلی کا ایک باشندہ جارج چھٹیاں منانے رومانیہ گیا۔ وہاں ایک ریسٹورنٹ میں اس کی ملاقات ایلزا سے ہوگئی۔ وہ ایک ہی نظر میں اس پر فدا ہو گیا جارج اور ایلزا روز ملتے تھے۔ ایلزا بھی اسے پسند کرتی تھی۔ جارج کی چھٹیاں دو ہفتے میں ختم ہوگئیں تو اسے مجبوراً رومانیہ سے اٹلی واپس آنا پڑا۔ دوسرے ہفتے وہ پھر چھٹیاں منانے رومانیہ گیا۔ ایلزا اس کی منتظر تھی۔ دونوں میں محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ جارج نے ایلزا سے شادی کی درخواست کی تو ایلزا نے ہاں کردی۔ شادی کی بات تو طے ہوگئی لیکن مشکل یہ تھی کہ ایلزا جارج سے شادی نہیں کرسکتی تھی۔ رومانیہ ایک کمیونسٹ ملک ہے۔ وہاں کے قانون کے مطابق رومانیہ کا شہری کسی دوسرے ملک کے باشندے سے شادی نہیں کرسکتا۔

ایلزا نے حکومت سے درخواست کی کہ اسے جارج سے شادی کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن یہ درخواست نامنظور ہوگئی۔ تاہم ایلزا نے ہمت نہ ہاری اس نے رومانیہ کے صدر کو درخواست بھیجی لیکن وہ بھی نامنظور ہوگئی۔

ادھر جارج کی زندگی ایلزا کے بغیر اجیرن ہورہی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ اسے رومانیہ میں کام مل جائے تاکہ وہ ایلزا کے قریب رہ سکے۔ لیکن اس کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ وہ تیسری بار رومانیہ گیا اور ایلزا کو رومانیہ سے بھاگ جانے کی صلاح دی۔ ایلزا نے ایک ٹرک ڈرائیور سے بات چیت کی۔ ٹرک ڈرائیور راضی ہوگیا۔ رومانیہ سے اٹلی کا فاصلہ دو ہزار کیلومیٹر ہے۔ راستے میں یوگوسلاویہ ہے۔ یہ بھی کمیونسٹ ملک ہے ڈرائیور نے اس فاصلے کو طے کرنے کے لئے بیس ہزار روپیہ طلب کیا۔ ایلزا نے یہ رقم اس کے حوالے کردی مگر ایلزا کی بدنصیبی نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ڈرائیور رقم لے کر چمپت ہوگیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے حکومت کو بھی ایلزا کے ارادے سے آگاہ کردیا۔ نتیجے میں پولیس نے ایلزا کے فلیٹ کی تلاشی لی۔ وہاں ان کو اٹلی کی کرنسی مل گئی۔ غیر ملکی کرنسی ناجائز طور پر رکھنے کے جرم میں ایلزا کو گرفتار کرلیا گیا۔

ایلزا گرفتاری کے بعد چھ مہینے جیل میں رہی۔ جیل کے کمرے میں اس کے ساتھ درجن بھر عورتیں تھیں۔ کھانا ناقص تھا۔ رات بھر چوہے اسے تنگ کرتے تھے۔ اس کے سر میں چوٹیں پڑ گئیں۔ جارج کو چار مہینے کے بعد ایلزا کی حالت کا پتہ چلا تو وہ غصے سے دیوانہ ہوگیا وہ کسی بھی قیمت پر ایلزا کو رومانیہ سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اسے صلاح دی کہ وہ ایلزا کو اپنی کار میں چھپا کر اٹلی لے آئے لیکن یہ ناممکن تھا۔ سرحد پر ہر کار کی تلاشی ہوتی ہے۔ لیکن جارج نے ہمت نہ ہاری اس نے اپنی کار کے ڈیش بورڈ کے نیچے ایک جگہ بنائی جہاں ایلزا کو چھپایا جاسکتا تھا۔ چالیس دن تک جارج اور اس کے دوست اس کمپارٹمنٹ کو بنانے میں لگے رہے۔ جب یہ جگہ بن کر تیار ہوگئی تو اس کی لمبائی ۴ فٹ ۵ انچ تھی جب کہ ایلزا کا قد ۵ فٹ ۳ انچ تھا۔ یہ جگہ ۱۲ انچ اونچی اور ۱۰ انچ چوڑی تھی۔ ایلزا کو کسی نہ کسی طرح اس میں سمٹ کر لیٹنا تھا۔ یہ مسافت ۲۰ گھنٹے کی تھی ایلزا نے اپنا وزن کم کیا اور اس سفر کے لئے

تیار ہوگئی۔

جارج اپنی کار لے کر چوتھی بار رومانیہ کی راجدھانی بخارسٹ پہنچا۔ دس روز وہاں گزارنے کے بعد ان کا تاریخی سفر شروع ہوا۔ ایلزا کار کے خانے میں لیٹ گئی۔ جارج نے کمپارٹمنٹ بند کر دیا اور اس میں اسکرو لگا دئے۔ ایلزا کے سانس لینے کے لئے کمپارٹمنٹ میں سوراخ تھے لیکن جب کوئی گڑھا آتا تو کار جھٹکے کھاتی اور ایلزا کے سر میں چوٹ لگتی۔ دس ہزار کیلومیٹر اور ۲۰ گھنٹے کی مسافت اسے اسی طرح طے کرنی تھی۔ جارج کبھی کبھی کسی سنسان جگہ کار کھڑی کر دیتا اور ایلزا کا کمپارٹمنٹ کھول دیتا۔ پٹرول کی بدبو سے ایلزا کا دماغ ماؤف ہو جاتا تھا۔ وہ گھڑی بھر کے لئے کھلی ہوا میں سانس لیتی اور پھر کمپارٹمنٹ میں لیٹ جاتی۔ دس گھنٹے کی مسافت کے بعد یوگوسلاویہ کی سرحد آگئی اور کار کی جانچ شروع ہوگئی۔ سپاہیوں نے کار کی ڈکی کھولی، بونیٹ اٹھا کر دیکھا، پاسپورٹ چیک کیا۔ اس دوران ایلزا خدا سے دعا مانگتی رہی۔ اگر کہیں سپاہیوں کو شک ہوگیا تو وہ پھر پکڑی جائے گی اور اسے واپس رومانیہ بھیج دیا جائے گا۔ رومانیہ کی جیل اور وہاں کے چوہوں کا خیال آتے ہی اسے جھرجھری آگئی۔ لیکن سرحد پر سب کام بخیر و خوبی ہوگیا۔ یوگوسلاویہ کی مسافت طے کرنے کے بعد اٹلی کی سرحد آگئی۔ یہ امتحان کی آخری کڑی تھی۔ سپاہی آئے۔ کار کے دروازے کھلنے کی آواز آئی۔ ایلزا کے دل کی حرکت تیز ہوگئی۔ سپاہیوں نے ڈیش بورڈ کا معائنہ کیا۔ اسے ٹھوک بجا کر دیکھا۔ خوف کے مارے ایلزا کا خون جم گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں کار کے دروازے بند ہونے کی آواز آئی اور دونوں اٹلی کی سرحد میں داخل ہوگئے۔

اٹلی کی سرحد میں داخل ہوتے ہی جارج نے اسکرو کھولے اور ایلزا نے کار سے باہر نکل کر پہلی بار آزادی کی فضا میں سانس لیا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس نے قبر سے چھوٹی جگہ میں ۲۰ گھنٹے گزارے ہیں لیکن محبت جیت گئی تھی۔ جارج نے ایلزا سے شادی کر لی۔ ایلزا نے اٹلی کی حکومت سے سیاسی پناہ کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ اور یوں ۷ سال بعد محبت کی یہ کہانی ایک خوش گوار انجام پر پہنچ گئی۔ ○○

وہ بھوک میں انسان سے حیوان بن جاتے ہیں

بھی لوگ ہیں جنہیں بھوک اس شدت کے ساتھ ستاتی ہے کہ وہ بھوک میں انسان سے حیوان بن جاتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جن نے سامنے دنیا کی ں رکھی ہوں۔ مگر ہزار خواہش کے باوجود ایک لقمہ بھی نہیں حلق سے اتار سکتے کیوں کہ بھوک نہیں ہے ——— آج کل دس میں سے آٹھ آدمی معدہ کی تکلیفوں مبتلا ہیں۔ بھوک نہیں لگتی، زبردستی کچھ لے بھی لیا تو ہضم نہیں ہوتا، پیٹ میں غبارے کی طرح ہوا بھری رہتی ہے۔ کھٹی ڈکاریں آتی ہیں۔ آج ہی ہضمینہ ٹکیاں لیجئے جو بے حد مزے دار ہیں اور فائدے مند بھی۔ ہضمینہ معدہ کی شکایتیں دور کرتی ہے، کھانا ہضم ہونے لگتا ہے۔ اصلی خون صحیح مقدار میں بنتا ہے اور ے کی زردی کی جگہ سرخی کی جھلک آجاتی ہے۔ ہاضمہ درست ہے تو آپ کی صحت درست ہے۔ آج ہی ہضمینہ خود بھی لیجئے اور بچوں کو بھی دیجئے۔

ت فی شیشی: تین روپے پچیس پیسے

شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی
بانو نئی دہلی

کڑھائی کے عمدہ نمونے

بلڈ پریشر کے مریضوں کے لئے خوش خبری

جن عورتوں کو بلڈ پریشر کی شکایت ہوتی ہے، وہ عام طور پر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہیں۔ ڈاکٹر بازو پر ایک کپڑے کی پٹی کس کر باندھتا ہے، پھر مشین سامنے رکھ کر پمپ کو دباتا ہے، تب جا کر چیک کرنے والا آلہ بلڈ پریشر دکھاتا ہے۔ اب انگلستان میں ایک سائنس دان نے ایک پیڈ ایجاد کیا ہے۔ یہ بیٹری سے چلتا ہے، مریض کو کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پیڈ کو بازو پر رکھ کر ایک انگلی سے دباتے ہی بلڈ پریشر کے ہندسے سامنے آجاتے ہیں۔ اس عمل سے آستین کھولنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ امید کی جاتی ہے کہ عن قریب یہ پیڈ ہندوستان بھی پہنچ جائے گا۔

اُسے بس میں مفت سفر کرنے کی اجازت ہے

کیرالہ کے ایک مقام پر ایک انوکھا مسافر بس میں چڑھ جاتا ہے، وہ سامنے کے دروازے سے بس میں داخل ہوتا ہے اور آرام سے بس ڈرائیور کے پیچھے بیٹھ جاتا ہے۔ کنڈکٹر اس سے ٹکٹ کے پیسے نہیں مانگتا۔ یہ مسافر ٹکٹ خرید ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ انسان نہیں ایک بکری ہے جو صبح سویرے مقررہ وقت پر بس اسٹینڈ پر پہنچ جاتی ہے اور اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ جاتی ہے۔ دس کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد یہ بس منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہے، بکری دن بھر بازار میں پھرتی رہتی ہے۔ شام ہوتے ہی اُسی بس میں سوار ہو جاتی ہے، بس ڈرائیور، کنڈکٹر اور مسافر سب اس انوکھے مسافر کے عادی ہو گئے ہیں۔

دیس پردیس کی خبریں

وہ چوری کے نشان چھوڑ گئیں

بمبئی میں دو عورتیں اکثر سڑک پر ردّی اخبار اور کاغذ چنتی نظر آتی تھیں۔ یہ عورتیں جنوبی ہند کی رہنے والی ہیں۔ ردّی اخبار اور کاغذ چننا ان کا دکھاوا تھا، دراصل وہ عادی چور تھیں، ایک مہینے میں انہوں نے ۲۵ ہزار کا سامان چرایا۔ یہ الیکٹرانک کا سامان تھا لیکن چوری کے دوران ان سے ایک غلطی ہو گئی۔ انہوں نے ایک دوکان سے کیلنڈر کا بنڈل اٹھا لیا۔ اس بنڈل میں ایک ہزار کیلنڈر رکھے۔ اُن عورتوں نے قریب کی جھگی جھونپڑی کے رہنے والوں میں یہ کیلنڈر مفت تقسیم کر دئے۔ یہ سخاوت انہیں مہنگی پڑی۔ جب کیلنڈر کی چوری کی اطلاع پولیس میں گئی تو پولیس کو ہر مکان سے ایک چوری کیا ہوا کیلنڈر مل گیا۔ لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی تو سب نے ان دونوں عورتوں کا نام لیا، دونوں گرفتار کر لی گئیں اور چوری کا باقی سامان بھی برآمد ہو گیا۔

منی گھر، مستقبل کے ویٹنگ رُوم

آج کل شہروں میں جگہ کی قلت کا مسئلہ دردِ سر بن گیا ہے۔ زمین کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ امریکہ کے ایک انجینیر نے اس مسئلہ کا حل نکالا ہے۔ اُس نے پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے گھر بنائے ہیں۔ یہ گھر ایک کیپسول کی طرح ہیں اور پلاسٹک کے بنائے گئے ہیں۔ یہ ۴ فٹ اونچے، ۴ فٹ چوڑے اور ۸ فٹ لمبے ہیں۔ ۴ فٹ اونچے گھر میں انسان کھڑا نہیں ہو سکتا، لیکن ۸ فٹ گھر میں ایک طویل القامت آسانی سے سو سکتا ہے۔ اس بستر کے نیچے ٹائلیٹ ہے، سامنے ٹیلی ویژن لگا ہے۔ ٹیلی فون کا کنکشن بھی لگ سکتا ہے۔ اس کے انجینیر کا کہنا ہے کہ لوگ ہوائی اڈے پر جہاز کے لیٹ ہو جانے سے رات بھر کرسیوں پر بیٹھے رہتے ہیں، بیٹھے بیٹھے کمر دُکھنے لگتی ہے۔ انتظار کی اذیت الگ ہوتی ہے، اگر یہ کیپسول ہوائی اڈے پر لگ جائے تو انسان پاؤں پھیلا کر لیٹ سکتا ہے، آرام سے بیٹھ کر ٹی۔ وی پروگرام دیکھ سکتا ہے۔

اپنے عزیز اور دوستوں کو فون کر سکتا ہے۔ ہوائی اڈے کے علاوہ ریلوے اسٹیشن، پکنک کیمپ، یہاں تک کہ جیلیں بھی اِس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ ایک پلاسٹک کیپسول کی قیمت بیس ہزار روپے ہے، اسے آسانی سے بنایا اور کھولا جا سکتا ہے۔ قیدیوں کے لئے جیل کی ہر کوٹھری پر ۶ سے ۸ لاکھ روپے تک لاگت آتی ہے۔ اس انجینئر کا بیان ہے کہ وہ ۴ مہینے میں ایسے سو مکان بنا کر حکومت کو دے سکتا ہے۔ ایسے ۳۲ مکان، جن میں علیحدہ باورچی خانہ اور ٹوائیلیٹ روم بھی شامل ہوں ایک بڑے ٹرک میں بھر کر کہیں بھیجے جا سکتے ہیں۔

وہ ۱۰۹ سال کی عمر میں بھی چاق و چوبند

لوسی کی عمر ۴ سال تھی جب امریکہ میں بجلی کا بلب ایجاد کیا گیا۔ جب ۱۹۰۳ میں پہلا ہوائی جہاز زمین سے چند گز اوپر اٹھا تو اس کی عمر ۲۸ سال تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران اس کی عمر ۴۱ سال تھی۔ ۱۹۶۹ میں جب پہلا انسان چاند پر پہنچا تو لوسی کی عمر ۹۴ سال تھی۔ لوسی خدا کا شکر ادا کرتی ہے کہ اُس نے اپنی لمبی عمر میں انسان کی ترقی اور سائنس کی کرامتوں کا ایک پورا دور دیکھ لیا۔ لوسی آج بھی صحت مند ہے، وہ امریکہ کے ایک گاؤں میں رہتی ہے۔ وہ اپنے گھر میں اکیلی ہے، وہ روزانہ اپنے گھر کے لان میں پانی ڈالتی ہے اور اور مکھن خود تیار کرتی ہے یہاں تک کہ میدہ سے ڈبل روٹی بھی خود ہی تیار کرتی ہے۔ زندگی میں لوسی کا ایک ہی بار معمولی آپریشن ہوا، وہ فرش پر گر گئی تو اس کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اُسے جوڑنے کے لئے سرجن نے ہڈی کے درمیان ایک چھوٹی سی سلاخ ڈال دی۔

لوسی دراصل آرمینا کی رہنے والی ہے گزشتہ صدی میں ترکی اور آرمینا ہمیشہ دست بگریباں رہتے تھے۔ ترکی فوج آرمینا میں گھس جاتی اور وہاں قتلِ عام شروع کر دیتی۔ آرمینا کی فوج بھی موقع ملنے پر یہی عمل دُہراتی، لوسی کا خاوندان ہی جھگڑوں میں مارا گیا تو لوسی نے دوسری شادی کر لی۔ وہ دونوں آرمینا سے بھاگ کر بیروت آگئے، جہاں لوسی نے ۱۹۲۲ میں پہلی موٹر کار دیکھی۔

جب لوسی نے پہلی موٹر کار دیکھی تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ ایک گاڑی بغیر گھوڑے کے دوڑتی جا رہی ہے یہ کیسے ممکن ہے؟ ۴۷ سال کی عمر میں جب پہلا بجلی کا بلب روشن کیا تو وہ اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ بغیر تیل کے شیشے کا ایک ٹکڑا کس طرح روشنی دے سکتا ہے؟ ۱۹۲۳ میں لوسی اور اُس کا خاوند امریکہ چلے گئے۔ ۱۹۷۵ میں اُس کے خاوند کا انتقال ہوگیا۔ لوگوں نے اس کی درازئ عمر کے متعلق سوال کیا تو اس نے جواب دیا۔ "میری صحت کا راز دہی ہے، دہی زندگی کی اصل غذا ہے۔" لوسی صبح کو اٹھتی ہے اور گھر کے کام میں مصروف ہو جاتی ہے، اُس کے چار بچے، چھ پوتے اور سات پڑپوتے ہیں، اُسے امید ہے کہ وہ چاند پر انسان کے آباد ہونے تک زندہ رہے گی۔

ایک انسان نے چھ انسانوں کو نئی زندگی عطا کی

کارلوس امریکہ کا باشندہ تھا۔ جس کی عمر ۱۲ سال تھی، وہ کار کے حادثے میں بری طرح مجروح ہوگیا تو اس کی ماں نے ڈاکٹروں سے اُس کی زندگی کے متعلق سوال کیا۔ ڈاکٹروں نے کہا "کارلوس کی موت یقینی ہے، وہ چند دن کا مہمان ہے۔" اُس کی ماں نے یہ بات سنی تو ڈاکٹر سے کہا۔ "میرا بیٹا مجھے واپس نہیں مل سکتا لیکن اُس کی موت رائیگاں نہیں جانی چاہئے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے اعضاء دوسرے معذور لوگوں کو بخش دئے جائیں تا کہ انہیں نئی زندگی مل جائے۔ ڈاکٹروں نے کارلوس کی ماں کی ہدایت پر عمل کیا۔ اُس کے اعضا چھ مریضوں میں تقسیم کر دئے گئے، اُن میں سے دو مریض موت کے دہانے پر بیٹھے تھے۔ کارلوس کا دل ایک دل کے مریض کو دیا گیا۔ اس کا جگر ایک ایسی عورت کو دیا گیا جسے جگر کا کینسر تھا۔ اس بیماری سے اس کی موت یقینی تھی لیکن وہ کارلوس کا جگر پا کر دوبارہ تندرست ہوگئی۔ ایک انسان گُردے کا مریض تھا۔ وہ ہر تیسرے روز ڈائیلیسس کی مشین کے قریب بیٹھتا اور صبح کا سارا خون صاف کرتا تھا۔ کارلوس کا ایک صحت مند گردہ مل گیا تو اس مشین سے نجات مل گئی۔

کارلوس کا دوسرا گُردہ دوسرے مریض کے کام آیا۔ اُس کی ایک آنکھ ایک ایسی عورت کو ملی جو چار سال سے بالکل اندھی تھی۔ آج کارلوس کی آنکھ پا کر وہ بہت خوش ہے، اپنے پوتے پوتیوں کو دیکھ سکتی ہے کارلوس کی دوسری آنکھ ایک دوسری اندھی عورت کو دی گئی۔ اس طرح ایک انسان نے چھ انسانوں کو نئی زندگی عطا کی۔ ان میں سے دو انسان یقینی موت کے دہانے پر بیٹھے تھے۔ ■■

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دلچسپ جوابات دیتی ہیں۔

ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔ سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں صرف نام لکھنا کافی ہے۔

مدیرہ

بزمِ بانو
ماہنامہ "بانو" آصف علی روڈ نئی دہلی ۲

سلطان احمد اشک، کریم نگر

س:۔ غیرت کی چنگاری کب سلگتی ہے؟

ج: کسی نا انصافی اور جبر سے واسطہ پڑ جائے جو لعنت ملامت یا گالی کی صورت میں بغیر قصور کے ٹوٹ پڑے تو ہر انسان کی خودداری بیدار ہو جاتی ہے چنگاری شعلہ بھی بن سکتی ہے۔ جو بھسم بھی کر ڈالتی ہے۔

س:۔ قناعت پسندی عورت میں زیادہ ہوتی ہے یا مرد میں؟

ج: قناعت زنانی مردانی نہیں ہوتی۔ قناعت صفت ہے۔ یہ تو تربیت پر منحصر ہے۔ لیکن جو انسان احساسِ کمتری میں گرفتار ہوگا جسے مستقبل میں خوف آتا ہوگا۔ وہ قناعت کرنا کیا جانے عام طور پر عورتیں والدین بھائیوں کے رحم و کرم پر جیتی ہیں پھر شوہر پر روٹی کپڑے کا بوجھ پڑتا ہے تو اسے خوش رکھنا پڑتا ہے۔ بچپن سے ایسی عورتوں سے بھی ڈرتی ہیں جو بھولی بھالی عورتوں کے شوہر چھین لے جاتی ہیں۔ یہ ذہنی بے اطمینانی انہیں سچ سے دُور کر دیتی ہے جو ڈرتا ہے کہ کل کون پائے گا۔ وہ قناعت کو کیا جانے قابلِ رحم ہیں ایسی عورتیں جو اپنے مرد کو بھی قناعت سے محروم کر دیتی ہیں۔

محمد اسرافیل، اے ایم یو

س:۔ تنہائی پسند انسان کے بارے میں کچھ بتلایئے؟

ج: انسان چاہے تو بھیڑ بھڑکے میں بھی تنہا رہ سکتا ہے مگر مجھے تو بھیڑ میں ہی کہانیاں ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ رات کو جب سب سو جاتے ہیں تب لکھتی پڑھتی ہوں۔ سب اپنے کام میں لگ جاتے ہیں میں سو جاتی ہوں۔ اگر خواب دیکھنے لگوں تو وہ تنہائی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ہر انسان زندگی کے اصول اپنی مرضی سے بناتا ہے۔

س:۔ کبھی خیالوں ہی خیالوں میں آنسو آجائیں تو؟

ج: تو پونچھ ڈالئے۔ آنسو آنکھوں کی روشنی بڑھاتے ہیں۔ دُھلائی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی رو لینا بُرا نہیں۔ خاص طور پر کسی خیال پر آنسو آجائیں حساس ہونے کی نشانی ہے۔

محفوظ احمد گرول، دربھنگہ

س:۔ دو آدمیوں کے درمیان صلح کرانا کیسا ہے؟

ج: کسی عقل مند کا خیال ہے کہ:
جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

کوکب ممتاز، اڑیسہ

س:۔ عورت کی زندگی کی سب سے اہم خاصیت کیا ہے؟

ج: مختلف طبقوں کی زندگی بھی مختلف ہے۔ ایسا طبقہ بھی ہے جن کی عورتیں کھاتی ہیں موٹی ہو جاتی ہیں تو ہیلتھ سینٹر جا کے چربی گھلاتی ہیں۔ ایسی بھی ہیں جو دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہیں۔ والدین یا شوہر کو خوش کرنے والے کام کرتی ہیں اکثریت ایسی ہے جو مرد، عورت، بچے صبح سے شام تک جُٹ کر کام کرتے ہیں اور آدھے پیٹ سو جاتے ہیں۔

س:۔ بچے ماں کی صحبت کا زیادہ اثر لیتے ہیں یا باپ کی؟

ج: دونوں مل کر ہی اسے جنم دیتے ہیں۔ ماں کے پاس زیادہ رہنے کا موقع ملتا ہے

ایسے بچے خوش قسمت ہیں جن سے والدین بات چیت کریں۔ دوست بن کر ہنسیں کھیلیں۔ ان سے رائے لیں، حکم نہ دیں، رائے دیں۔ ڈرائیں کم سمجھائیں زیادہ۔ میری بیٹیوں سے دوری رہی مگر نواسے سے بڑی گہری دوستی ہے۔ بہت باتیں ہوتی ہیں تاش کھیلتے ہیں۔ ان کے دوست بھی آجاتے ہیں۔

یم۔ عبدالحق۔ جرلاساہی، کٹک

س :- کوئی کہتا ہے کہ عورت ایک پھول ہے کوئی کہتا ہے کہ عورت ایک شعلہ ہے حقیقت میں عورت کیا ہے؟

ج ہر جاندار شعلہ اور شبنم کا مرکب ہے بعض لوگوں میں توازن بگڑ جاتا ہے یا تو بات بات پر بھڑکتے ہیں یا سر جھکا کر زبردست کی دھونس سہہ لیتے ہیں۔

س :- آنٹی! کیا یہ سچ ہے کہ مرحوم سعادت حسن منٹو آپ کے قریبی دوستوں میں سے تھے؟

ج جی ہاں، اُن کی بیگم سے بھی میری بڑی گاڑھی چھنتی تھی ان کی بہنیں تو پڑوسن تھیں۔ ہر دم کا آنا جانا تھا۔ اور رشتہ داروں سے بھی اچھے مراسم تھے ویسے سب ہی ادیب اور شاعر میرے رشتہ داروں سے بڑھ کر تھے اور اب بھی ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی گجراتی مراٹھی اور سندھی کے ادیبوں سے بھی میل جول ہے لکھنے والوں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ میل جول رکھے میرے پوتوں، نواسوں کی عمر کے بچوں سے بھی میری بڑی دوستی ہے۔ ان سے بے تکلفی سے باتیں کرنا تاش کھیلنا انہیں سمجھنا پہچاننا ہی میرا مشغلہ ہے۔ اور پیشہ بھی اور خطوں کے ذریعہ کچھ آپ سے بھی سوالوں کے بہانے جان پہچان ہو جاتی ہے۔

التمش ربانی، مارسین گورٹ

س :- کیا ہم کسی کی قلبی کیفیات تک پہنچ سکتے ہیں؟

ج یہ تو آزمانے کے بعد ہی فیصلہ ہو سکتا ہے جسے تلاش ہوتی ہے وہ پا ہی لیتا ہے۔ کہتے ہیں دل سے ہی دل کے حالات معلوم کئے جاتے ہیں۔

س :- انسان عالمِ حیرت کے مقام کو کب پہنچتا ہے؟

ج جب جی چاہے۔ ویسے صبح اخبار کھول کر پہلے صفحے پر نظر پڑتے ہی عالمِ حیرت میں پہنچا جا سکتا ہے۔ حیرت زدہ ہونے پر کوئی ٹیکس تو نہیں دینا پڑتا۔

رحیم النساء بخشی، بلگام، (کرناٹک)

س : انسان گناہ کو جانتے ہوئے بھی گناہ کیوں کرتا ہے؟

ج دنیا میں گناہ اور ثواب کی ناپ تول کے لئے کوئی پیمانہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔ کوئی ایک روٹی چرانے پر جیل بھگتتا ہے۔ کوئی کروڑوں چُرا کر بھی دیا دھرم کا ٹھیکہ دار بن بیٹھتا ہے۔

س :- بچپن میں پیار مفت ملتا ہے جوانی میں پیار چُرانا پڑتا ہے تو بڑھاپے میں؟

بُڑھاپے میں مفت تقسیم کرنا پڑتا ہے۔

س :- کون سی حرکت ہے، ... بگاڑ ڈالتی ہے؟

ج اپنی کوئی غلطی مگر زیادہ تر زیادہ طاقتور کمزور کا کام بگاڑ کر اپنا اُلو سیدھا کرتا ہے۔

امتیاز علی نصرت، پداپلی، کریم نگر

س :- کیا تدبیروں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں؟

ج اور کیا حماقتوں سے تقدیریں بدل سکتی ہیں۔ خدا نے اتنی شان دار دنیا انسان کو بخشی، عقل اور سمجھ دی، مکمل آزادی دی۔ پیغمبر بھیجے۔ اس کے بعد بھی انسان جانور بنا رہے تو تقدیریں کیسے بدل سکتی ہیں۔

س :- انسان کا سچا ساتھی کون ہے؟

ج عقل اور جانکاری، عقل مند بگڑے کام بنانے کی ترکیب سوچنے کی طاقت رکھتا ہے اور علم اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ عقل مند انسانوں نے دنیا کو خدا کی رحمتوں سے فیض یاب ہونا سکھایا، مشینیں ایجاد کیں جو جبر غلامی کی زنجیروں میں بند ہے انسان کرتے تھے آج مشینیں کرتی ہیں۔

ظہیر الدین انصاری (بہار)

س :- غصہ آئے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج پہلے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیجئے پھر الحمد شریف تین بار پڑھئے ایک دم دماغ میں بجلی سی دوڑنے لگے گی اور غصہ قابو میں آجائے گا اب ٹھنڈے دماغ سے جس بات پر غصہ آیا اس پر سوچئے۔

○○

چٹپٹا مسالے دار گوشت

گوشت (بغیر ہڈی کا) : ایک کلو
لال مرچ (ثابت) : ۶ عدد
دھنیا (ثابت) : ۲ چائے کے چمچے
ہلدی : آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ سفید (ثابت) : ایک چائے کا چمچہ
دارچینی : ایک انچ کا ٹکڑا
چھوٹی الائچی (ثابت) : ایک عدد
لونگ : ۵ عدد
ادرک : ڈیڑھ چائے کا چمچہ
لہسن : ڈیڑھ چائے کا چمچہ
لیمو کا رس : ایک ٹیبل اسپون
لیمو کا چھلکا (سوکھا) : آدھا لیمو
ہرے دھنیے کی پتیاں : ایک ٹیبل اسپون
ٹماٹر : ۲۰۰ گرام
ناریل کا دودھ : ایک پیالی
پیاز (درمیانی سائز) : ۲ ڈلی
گھی : آدھی پیالی
نمک : حسب ذائقہ

گوشت کے درمیانہ سائز کے چوکور ٹکڑے کروالیں پھر دھولیں۔ دھنیا، زیرہ لونگ اور دارچینی کو بغیر گھی کے فرائنگ پان میں ڈال کر ہلکا سا بھون لیں پھر پیس لیں لال مرچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں، چھوٹی الائچی کے دانے نکال لیں۔ ادرک اور پیاز کو چھیل کر دونوں چیزوں کے لچھے کاٹ لیں۔ ٹماٹروں کو دھوکر کچھ دیر گرم پانی میں ڈال دیں پھر پانی سے نکال کر چھیل لیں اور چھلنی میں چھان کر گودا رکھ لیں۔ بیج اور چھلکے پھینک دیں۔ لیمو کے چھلکے کو

بھی پیس لیں۔
ایک دیگچی میں گھی اور پیاز کے لچھے ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز بادامی ہوجائے تو اس میں ادرک کے لچھے اور لہسن ڈال کر ایک دو منٹ بھون لیں پھر گوشت، ٹماٹر، ناریل کا دودھ اور لیمو کے رس کے علاوہ باقی تمام مسالے ڈال کر دو چار منٹ بھون لیں پھر گوشت ڈال دیں۔ گوشت کا نبساندہ پانی بھن جائے تو ناریل کا دودھ ٹماٹر کا گودا اور ایک پیالی پانی ڈال دیں گوشت گل جائے اور مسالہ گھی چھوڑ دے تو لیمو کا رس اور ہرے دھنیے کی پتیاں ڈال کر ایک دو منٹ بھون لیں پھر آنچ سے اتار لیں۔ ڈش میں نکالنے کے بعد باقی ہرے دھنیے کی پتیاں چھڑک دیں۔

رشیدہ خاتون
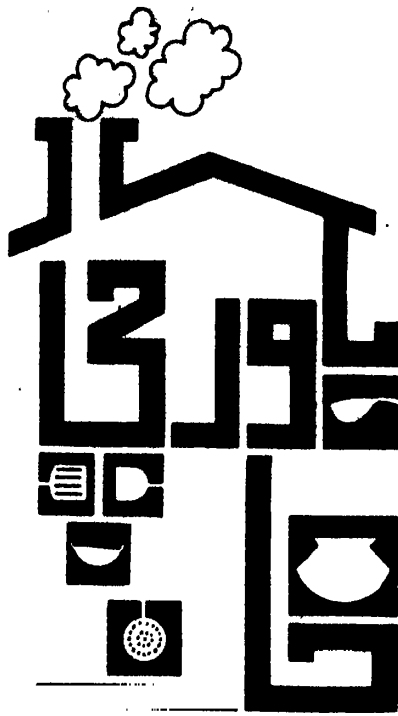
تلی ہوئی مسالے دار کلیجی

کلیجی (بکرے کی) : ایک عدد
لال مرچ : ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ : ایک چائے کا چمچہ
لیمو کا عرق : ایک ٹیبل اسپون
ادرک : ایک چائے کا چمچہ
لہسن : ڈیڑھ چائے کا چمچہ
سفید زیرہ (پسا ہوا) : ایک چائے کا چمچہ
گھی : حسب ضرورت
نمک : حسب ذائقہ

کلیجی کے درمیانہ سائز کے ٹکڑے کرکے دھولیں۔ تمام مسالوں کو لیمو کے عرق میں ملاکر کلیجی پر مل دیں اور ایک گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ فرائنگ پان میں تھوڑا سا گھی ڈال کر تیز آنچ پر رکھ دیں۔ گھی گرم ہوجائے تو اس میں تھوڑے سے کلیجی کے ٹکڑے ڈال دیں۔ ٹکڑے ایک طرف سے بادامی ہوجائیں تو ان کو پلٹ دیں۔ دوسری طرف سے بھی بادامی ہوجائیں تو نکال لیں۔ اسی طرح تمام کلیجی کے ٹکڑوں کو تل لیں اور گرم گرم ہری چٹنی کے ساتھ کھائیں۔

قیمہ بھری شملہ مرچ (جرمنی)

قیمہ (باریک مشین کا) : ۵۰۰ گرام
شملہ مرچ (بڑا سائز) : ۵ عدد
آلو (درمیانہ سائز) : ۴ عدد
دودھ (جوش کیا ہوا) : ڈیڑھ پیالی
ڈبل روٹی کے سلائس : ۴ عدد

میدہ : آدھی پیالی
انڈہ : ایک عدد
اجوائن : آدھا چائے کا چمچہ
کالی مرچ : ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ٹماٹر : ۵۰۰ گرام
لہسن : ایک چائے کا چمچہ
پودینہ کی پتیاں : ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانہ سائز) : ۲ ڈلی
مکھن : ۴ ٹیبل اسپون
نمک : حسب ذائقہ

قیمہ کو دھولیں۔ ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کو دودھ میں بھگو دیں تاکہ پھول جائیں، میدہ کو چھان لیں۔ پیاز چھیل کر کچومر کاٹ لیں۔ ٹماٹروں کو دھولیں پھر چار ٹماٹروں کے چھلکے کاٹ لیں باقی ٹماٹروں کو کچھ دیر گرم پانی میں ڈال کر گلا لیں پھر چھلنی میں چھان کر گودا رکھ لیں، بیج وغیرہ کو پھینک دیں۔

آلوؤں کو ابال کر چھیل لیں پھر ان کے بھی گول گول قتلے کاٹ لیں۔ مرچوں کو دھو کر کسی تیز چاقو سے ان کی ڈنڈیاں نکال دیں۔

ایک دیگچی میں قیمہ اور نمک ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ قیمہ کا پانی خشک ہو جائے تو آنچ سے اتار لیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں پیاز، آدھا کچومر، بھیگی ہوئی ڈبل روٹی اور آدھا چمچہ کالی مرچ ڈال کر خوب اچھی طرح ملا لیں پھر اس قیمہ کو ہری مرچوں کے اندر بھر دیں۔ قیمہ بچ جائے تو علیحدہ رکھ دیں۔

تین پیالی پانی میں آدھا چائے کا چمچہ نمک ڈال کر ابال لیں۔

ایک چوڑے پیندے کی دیگچی میں مرچوں کو برابر برابر رکھ دیں پھر اس میں ابلا ہوا پانی اس طرح ڈالیں کہ مرچوں کا پورا حصہ پانی میں ڈوب جائے پانی زیادہ ہو تو بچا لیں کم ہو تو اور ڈال دیں پھر اس دیگچی کو ڈھانپ کر تیز آنچ پر رکھ دیں پانچ منٹ بعد آنچ دھیمی کر دیں پندرہ منٹ بعد دیگچی کو آنچ سے اتار لیں اور مرچوں کو بہت احتیاط کے ساتھ کسی چھلنی میں رکھ دیں تاکہ ان کا پانی خشک ہو جائے۔

ایک دیگچی میں باقی پیاز اور ۲ ٹیبل اسپون مکھن ڈال کر آنچ پر رکھ دیں، پیاز ادھ کچری ہو جائے تو اس میں میدہ ڈال کر ایک دو منٹ کو بھون لیں پھر اس میں ٹماٹروں کا گودا، کالی مرچ نمک اور ایک پیالی پانی ڈال دیں ساس گاڑھا ہو جائے تو آنچ سے اتار لیں۔ ایک چکنی ہوئی ڈش میں مرچوں کو رکھ دیں پھر اس کے چاروں طرف ٹماٹر اور آلو سجا دیں اوپر سے پکا ہوا ساس ڈال دیں۔ فرائنگ پان میں باقی مکھن اور اجوائن ڈال دیں ایک منٹ بعد اجوائن سمیت مکھن اوپر سے مرچوں پر ڈال دیں۔

گوشت کی ڈبل روٹی (آسٹریلیا)

قیمہ (باریک مشین کا) : ۵۰۰ گرام
انڈے : ۸ عدد
کرم (سوکھی ڈبل روٹی کا چورا) : ۲ پیالی
رسک بسکٹ : ۴ عدد
دودھ (جوش کیا ہوا) : آدھی پیالی
ٹماٹر : ۳ عدد
سلاد کے پتے : حسب ضرورت
ہری مرچ : ۴ عدد
لال مرچ (تازہ) : ۴ عدد
کالی مرچ : پاؤ چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانہ سائز) : ۲ ڈلی
پودینہ کی پتیاں : (سوکھی) آدھا چائے کا چمچہ
کھانے کا سوڈا : ایک چٹکی
بیکنگ پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچہ
مکھن : پاؤ پیالی
نمک : حسب ذائقہ

چھ انڈوں کو سخت ابال کر چھیل لیں پھر ۴ انڈوں کے گول چھلکے کاٹ لیں۔ دو انڈوں کے چار چار ٹکڑے کر لیں۔ باقی کے دو انڈوں کو توڑ کر پھینٹ لیں۔ قیمہ کو دھو کر ٹماٹر اور سلاد کے پتوں کو بھی دھو لیں۔ لال مرچ اور ہری مرچ کے بیج نکال کر باریک کچومر کاٹ لیں۔ ڈبل روٹی کے چورے کو دودھ میں بھگو دیں۔ پیاز چھیل کر گول چھلکے کاٹ لیں ٹماٹروں کے بھی گول قتلے کاٹ لیں۔ رسک بسکٹوں کا باریک برادہ کر لیں۔

ایک دیگچی میں قیمہ اور نمک ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ قیمہ کا پسماندہ پانی بھن جائے تو آنچ سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں پھر اس میں ڈبل روٹی کا بھیگا ہوا چورا، ہری مرچ، لال مرچ، انڈے اور پودینے کی پتیوں کا چورا کر کے ڈال دیں پھر خوب اچھی طرح سب چیزوں کو ملا دیں۔

ڈبل روٹی کے سانچے میں سب طرف مکھن مل دیں پھر اس کے پیندے میں آدھا رسک کا چورا چھڑک دیں اس پر آدھا قیمہ ڈال دیں، قیمہ پر باقی رسک کا برادہ چھڑک دیں برادہ پر ایک ٹیبل اسپون مکھن گرم کر کے ڈال دیں پھر اس کو بند کر کے اوون میں رکھ دیں۔ آدھے گھنٹے بعد اوون سے نکال کر دیکھ لیں۔ ڈبل روٹی تیار ہو جائے تو اوون سے نکال لیں تھوڑی ٹھنڈی ہو جائے تو سانچے سے نکال کر اس کے سلائس کاٹ لیں۔ چاروں کی چکنی ہوئی ڈش میں پہلے سلاد کے پتے بچھا دیں پھر بیچ میں ڈبل روٹی کے سلائس اور اس کے چاروں طرف پیاز کے چھلکے ٹماٹر اور انڈے سجا دیں۔

○○

پیاری سعدیہ :

بانو، مئی میں "کہنی سنی" کے تحت قاضی تنصیر صاحب کا سلسلہ نظر نواز ہوا۔ قاضی صاحب کو افسانہ "دو نعشیں" (دو مارچ) میں زینو بیہ کی ساس کا رویہ بہتر نظر آیا۔ اگر ساس کا رویہ ابتدا ہی میں مخالفانہ ہوتا، کاش وہ پہلے سے اس شادی سے انکار کر دیتیں تو پھر زینو بیہ کی موت اور اس کی نعش ایک سوال نہ بنتی۔ افسوس تو اسی کا ہے کہ ساس نے اپنے رویہ سے قطعی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اس رشتے کی اس حد تک مخالف ہیں۔ زینو بیہ کی موت سے ان کی من پسند شادی کے لئے راستہ صاف ہو گیا — اور لطف یہ ہے کہ کسی کو ان پر شک بھی نہیں ہوا۔ کیا قاضی صاحب اخبار کا مطالعہ نہیں کرتے؟ روزانہ ایسی کتنی ہی خبریں آتی رہتی ہیں اور جو خبریں اخباروں تک نہیں پہنچتیں ان کی تعداد ان سے کہیں سوا ہے۔

آخر میں اتنا ہی عرض کروں گی کہ جہیز کی لعنت ایک عفریت کا روپ اختیار کر چکی ہے۔ اور بے قصور لڑکیاں آئے دن اس کا شکار بن رہی ہیں جیسی طرح زینو بیہ اور رانو کی موت نے دو خاندانوں کو ناقابلِ برداشت صدمہ سے دو چار کیا، اس طرح نہ جانے کتنے خاندان دکھ کے اتھاہ ساگر میں ڈوب کر اوپر والے سے بیٹی نہ دینے کی دعا مانگنے پر مجبور ہو گئے ہیں لیکن ہم جو بیٹیاں رکھتے ہیں۔ ان کے خوش گوار مستقبل اور محفوظ زندگی کی ضمانت کون دے گا؟

مسرور جہاں لکھنؤ

محترمہ سعدیہ صاحبہ:

بانو، مئی نظر نواز ہوا حسب معمول تمام مضامین معیاری ہیں۔ "دیس بدیس کی خبریں"

بہت اچھے انداز سے شائع ہوتی ہیں۔ ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ کہانی "ایثار کا پھل" دل کی گہرائیوں کو چھو گئی۔

مشورہ راہی، ورنگل

بہن سعدیہ:

میں بی۔ بی۔ سی سے آپ کا انٹرویو سن چکی تھی۔ اسی وقت سے آپ کے مداحوں میں ہوں۔ بانو کے نئے رنگ دیکھ کر آپ کی صلاحیتوں کا اور بھی قائل ہونا پڑا۔ سال نامہ بہت خوب ہے۔ مئی کا شمارہ بھی لاجواب ہے آپ نے جو نئے سلسلے شروع کئے ہیں وہ نوجوانوں کی دلچسپی اور توجہ کا تیزی سے محاصرہ کر رہے ہیں۔ میں تو خصوصاً "اپنا اپنا" کے اضافے سے بے حد خوش ہوں۔ اب تک اس سلسلے کے تحت جو موضوعات سامنے آئے ہیں، وہ سب ہماری دکھتی رگیں ہیں۔

عائشہ علوی جھنجھانہ

پیاری باجی :

بانو: مئی اپنی تمام تر رعنائیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ ویسے تو سب افسانے اور کالم "کہنی سنی" "بزم بانو" وغیرہ۔ بہت اچھے لگے مگر سب سے زیادہ کہانی "ایثار کا پھل" پسند آئی۔

ہاجرہ بی بی علی گڑھ

عزیز بہن :

سال نامہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ عصمت چغتائی کا "کنیا دان" مسرور جہاں کا "حسب نسب" کوثر چاندپوری کا "رومانی شادی" عطیہ پروین کا "دستی تنہائیاں" بہت دلچسپ ہیں۔ ادبی سماجی اور معلوماتی رسالوں میں اپنی نوعیت کا بانو واحد رسالہ ہے۔

ایسے اشعار ہرگز شائع نہ کریں جن کے ساتھ شاعر کا نام نہ لکھا ہو۔

ایس کے برہان الدین ورنگل

محترمہ :

بانو: مئی کے ذریعہ پہلی بار بانو سے تعارف ہوا۔ یہ رسالہ خواتین اور حضرات دونوں کے لئے بہت کارآمد ہے۔ تمام مضامین معیاری اور قابل تعریف ہیں۔ رسالہ انتہائی جاذب نظر اور سحر انگیز ہے۔

مہندر ناتھ کول (جموں توی)

RS. [illegible].00

پہلا انعام بالکل درست حل پر : بارہ ہزار روپے، دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر : آٹھ ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ : آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعہ ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں، بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں، ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مینی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ہفتہ، ۲۴۔ اگست ۱۹۸۵ء آٹھ بجے شام تک
پیر، ۲۶۔ اگست ۱۹۸۵ء تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کرلئے جائیں گے۔

شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۷

■	■		ب			د
■	■	و			ا	و
م		■	ڑ	ل	ل	س
ا		پھ	■	ی	ن	
ت	ہ			■	ے	و
ح	ر	ط			■	ن
ت	ا		ا	ے		■

اشارے

اوپر سے نیچے :

۱۔ غلطی اپنی ہو تو ــــــ سے شکوہ کیسا؟ احتیاط لازم

۲۔ آج کے مسائل سے آج ہی نبٹنے کی بجائے انہیں کل پر ــــــ سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدھے سے زیادہ مسائل تو خود بخود ختم ہو جاتے ہیں

۳۔ ــــــ باتیں یاد کرکے رونے سے کیا حاصل؟ حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے

۴۔ گھر والوں سے ــــــ کر پردیس میں اکیلے رہنا کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن

۵۔ تیری وفا سے کیا ــــــ تلافی؟ کہ دہر میں

دائیں سے بائیں :

۶۔ تیرے سوا بھی، ــــــ پہ بہت سے ستم ہوئے

۷۔ تمہاری جدائی کا ہر روز میرے دل میں کانٹا بنکر چبھتا ہے اور میرا دل ان بیشمار کانٹوں سے ــــــ ہوا ہے

۸۔ ــــــ کے حسن کو رنگوں کے ذریعہ تصویر میں قید کرنے کی کوشش تو ہزاروں لاکھوں مصوروں نے کی ہوگی

۹۔ ٹھیک ہے! میرے رشتہ داروں میں ــــــ کے عیب ہیں۔ لیکن تمہیں اس سے مطلب؟

۱۰۔ مذہب کے مقابلے میں سائنس کو زیادہ قابل اعتبار ماننے والوں سے پوچھئے، کیا سائنس کا محل محض ــــــ اور اندازوں کی بنیاد پر تعمیر نہیں کیا گیا!

■■

شمع ادبی معمے (شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۷) ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۲۷ اور ۲۸۔ اگست کو عید الضحیٰ کی تعطیل کے باعث شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۷ کا صحیح حل، جمعرات ۲۹۔ اگست ۱۹۸۵ء کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا ــــــ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہنامہ بانو میں شائع کئے

بیس ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام: بارہ ہزار روپے نقد
یا ایک ۵۱ سینٹی میٹر کا رنگین ٹی وی
اور تین ہزار روپے نقد
دوسرا انعام: آٹھ ہزار روپے

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔
آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔
فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف دس اشارے

★ انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔

★ صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجئے یا چھپا ہوا ماہنامہ بانو یا ماہنامہ شمع میں دیکھئے۔

★ شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۷ کا نتیجہ ماہنامہ بانو (نئی دہلی) اکتوبر ۱۹۸۵ء کے ماہنامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

ہر موسم کے لئے نباتاتی ٹانک

with the Registrar of Newspapers at R.N. No.
Regd. No. D-(C)
زلفی
اگر بال وقت سے پہلے سفید ہونے
لگیں، کنگھی کے ساتھ گرنے لگیں، بالوں میں
خشکی (بھوسی) پیدا ہو جائے اور سر پر گنج شروع
ہونے لگے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کے سر کے بال
بیمار ہو گئے ہیں۔ بالوں کی تمام خرابیاں دور
کرنے کے لئے بالوں میں زُلفی ہیر ٹانک
ڈالئے۔ یہ دوسرے تیلوں سے دس گنا بہتر ہے
یہ بالوں کی جڑوں کے نیچے تک پہنچ جاتا ہے
اور بالوں کی تمام بیماریوں کو شروع ہونے سے
پہلے ہی ختم کر دیتا ہے۔ "زُلفی" تیل نہیں بالوں
کی غذا ہے ـــــ سر دھونے کے لئے
"زلفی بالوں کا کالا صابن" یا زلفی پاؤڈر
استعمال کیجئے جو بالوں کو صاف کرتا،
ملائم بناتا اور ان کو تیزی سے بڑھاتا ہے۔
قیمت زلفی ہیر ٹانک : پندرہ روپے
قیمت زلفی بالوں کا کالا صابن
قیمت زلفی پاؤڈر
شیخ رونق ایند آیورویدک لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی
Zulfi
زلفی
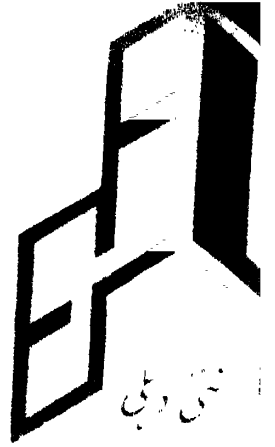
نئی دہلی

عورتوں میں تبدیلی کی لہر

نیا دو

ان ملشتری کی پرواز

ملاح

افتتاحیہ
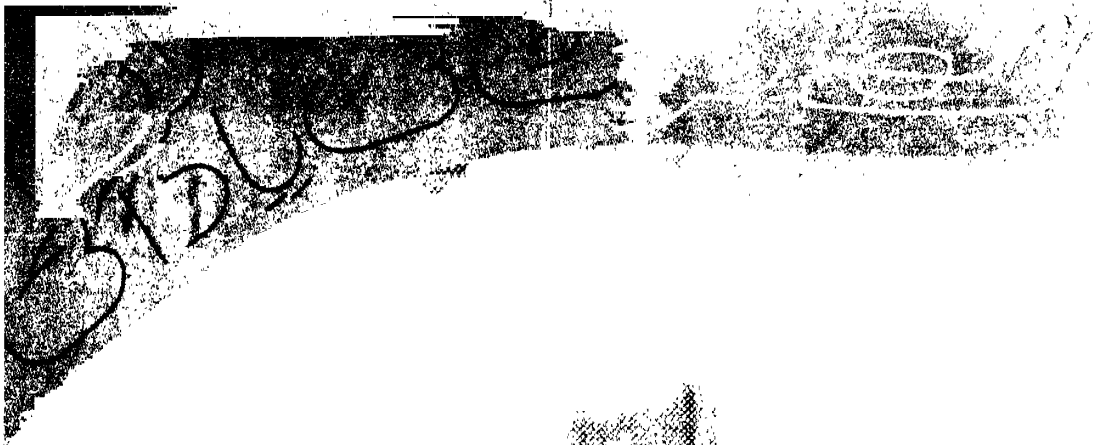
ایران میں عشق کا لفظ عاشقہ سے نکلا ہے۔ وہاں عاشقہ ایک بیل کا نام ہے جو درخت سے لپٹ جاتی ہے۔ جب یہ درخت کے چاروں طرف لپٹ جاتی ہے تو درخت مُرجھا کر مر جاتا ہے۔

اُردو لُغت میں عشق کے معنی ہیں: بے پناہ پیار۔ اور جس سے پیار ہے اُس پر جان تک نثار کرنا۔ محبت کی انتہا عشق ہے۔ فطری طور پر محبوب کے وصال کی طلب اپنی ذاتی خوشی اور مفاد کے لئے ہوتی ہے۔ لیکن رُوحانی عشق میں یہ طلب اپنے لئے نہیں، بلکہ صرف اللہ کے واسطے ہوتی ہے۔ یہ عشق اُس پروانے کی طرح ہے جو شمع کی خوب صورتی اور روشنی میں جل کر اپنا وجود مٹا دیتا ہے۔

عشق دِل کا حاکم ہے۔ اگر ہم حقیقی عشق کو دِل میں بسائیں تو ہمارا دِل نفرت، حسد، کینہ اور دوسری ہر آلودگی سے پاک ہوجائے گا۔ عشق کی آگ جب دِل میں بھڑکتی ہے تو ہر بُرے خیال کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جو ایمان لاتے ہیں اُن کو اللہ سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ اور ہمارے رسولِ پاکؐ کی حدیث ہے کہ جس شخص کو اللہ سے عشق ہے، جس کے عمل نیک ہیں اور جو اللہ تعالیٰ سے اپنے عشق کو دوسروں سے چھپائے رکھتا ہے، جب اُس کا انتقال ہوتا ہے تو وہ شہادت کا درجہ پاتا ہے۔

سعدیہ دہلوی

بہ یادگار: یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اڑتیسواں سال، ۴۶۳ واں شمارہ
عام شمارے کی قیمت: چار روپے
سالانہ قیمت: اڑتالیس روپے

مقامِ اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس: SHMA IN
ٹیلی فون: 272066, 272067 272068
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان: شمع میگزین
طابع و ناشر: یونس دہلوی

ٹائیٹل: بمبئی آفسیٹ پریس، دہلی
مطبوعہ: روبی پرنٹنگ پریس، دہلی

ہندوستان، پاکستان

اور بیرونی ممالک کے بزرگانِ دین

اور

صوفیائے کرام

کے حالاتِ زندگی، ان کی کرامات

اور تعلیمات

روشنی کے مینار

جسے ضیاء تسنیم بلگرامی نے انتہائی تحقیق و جستجو کے بعد اتنے آسان اور دل چسپ انداز میں لکھا ہے کہ کہانیوں کا گمان ہوتا ہے۔ روشنی کے مینار کے صفحات میں حضرت ابو داؤد طائیؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ نصیر الدین روشن چراغ دہلیؒ، حضرت شیخ سلیم چشتیؒ اور دوسرے بہت سے بزرگانِ دین کے واقعات تفصیل سے دیئے گئے ہیں۔

اسلام کے خاموش مبلّغوں کے پاکیزہ واقعات

روشنی کے مینار : حصّہ اوّل : بیس روپے
حصّہ دوم : بیس روپے
(ڈاک خرچ علیحدہ)

آج ہی ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر گھر بیٹھے وی پی ڈاک سے منگوایئے، یا اپنے اخبار فروش سے طلب کیجئے!

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں۔

غیر ملکی پرچے اپنے اپنے ملک کے لئے قیمت اور محصول ڈاک معلوم کرنے کے لئے تحریر فرمائیں۔ پھر ڈرافٹ بھیجیں۔

آپ کو ہندوستان کے کسی گوشے میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں اُردو، انگریزی، ہندی، پنجابی کتابیں یا رسائل منگوانے ہوں تو شمع کے ادارے کو خدمت کا موقع دیجئے۔ غیر ممالک میں شہر، شہر نئے ایجنٹ بنائے جارہے ہیں!

راحت علی

جب ہیروشیما پر قیامت نازل ہوئی
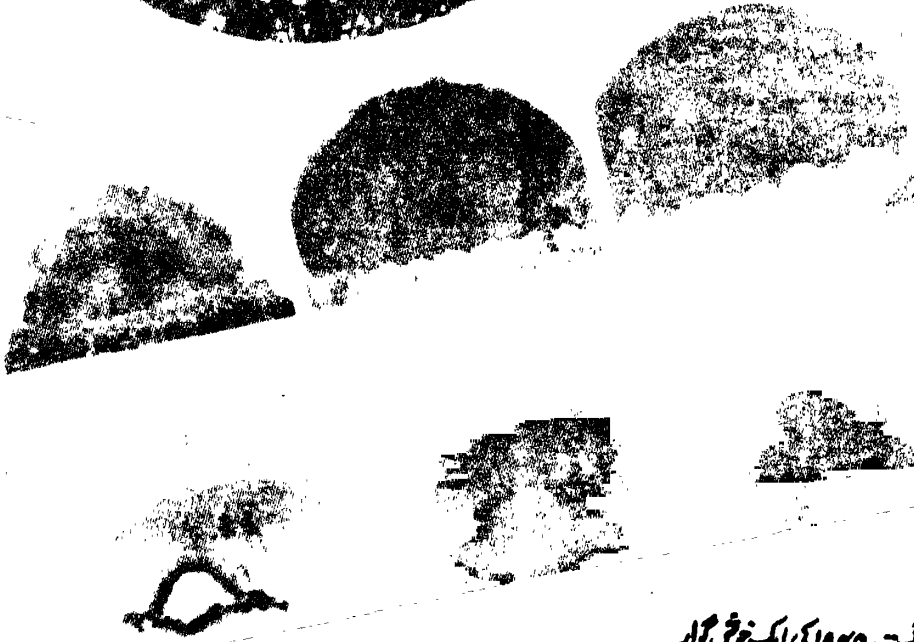
۶ اگست ۱۹۴۵ کی ایک خوش گوار صبح تھی۔ ایک بارہ سالہ بچی ہیروشیما میں اپنے مکان کے آگے کھیل رہی تھی۔ اس نے آسمان پر دیکھا تو دور فضا میں ایک ہوائی جہاز دکھائی دیا۔ ہیروشیما ہوائی لڑائی اور بمباری سے الگ تھلگ تھا۔ امریکن بمبار طیارے جاپان کی راجدھانی ٹوکیو پر ہزاروں ٹن بم برسا چکے تھے، لیکن ہیروشیما ابھی تک بمباری سے محفوظ تھا۔ اس وقت ۸ بج کر ۱۵ منٹ ہوئے تھے۔

یکایک اس بچی نے ایک سفید سی چیز ہوائی جہاز سے نکلتی دیکھی۔ دوسرے ہی لمحے ایک دھماکا ہوا۔ لڑکی منہ کے بل زمین پر گری اور بے ہوش

ہو گئی۔

یہ ایٹم بم کا دھماکہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں امریکہ اور جاپان ایک دوسرے کے حریف تھے۔ جنگ کا خاتمہ دُور دُور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ امریکہ کو جنگ میں خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ادھر ٹوکیو میں اسکول کی لڑکیاں جوڈو سیکھ رہی تھیں۔ تاکہ دست بدست لڑائی میں امریکن سپاہیوں کا مقابلہ کر سکیں ناچار امریکہ نے جاپان کو ڈرانے کے لئے ایٹم بم کا استعمال کیا۔ امریکہ نے فروری میں اس بم کا کامیاب تجربہ کیا۔ اور ایسے دس بم تیار کئے۔ ان کا خیال تھا کہ یکے بعد دیگرے دس بم پھینکنے سے جاپان گھٹنے ٹیک دے گا۔ ان کا اندازہ درست نکلا۔ جاپان نے دو ایٹم بم گرائے جانے کے بعد ہی ہار مان لی۔

اس بم کی تباہ کاری سے ساری ساری دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ ہیروشیما سمندر کے کنارے ایک خوبصورت شہر تھا۔ اس کی آبادی ۱۲ لاکھ تھی۔ دریا اپنے ڈیلٹا کے پاس سات شاخوں میں بٹ گیا تھا۔ اس طرح شہر چھ حصّوں میں تقسیم [illegible] حصّوں کو ملانے کے لئے ۸۱ پُل

تھے۔ ۶ اگست کی صبح کو ۸ بج کر ۱۵ منٹ پر یہ شہر بھرا پڑا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے یہ شہر خوفناک آگ میں جل رہا تھا۔ بمبار طیارے "اینولا گے" (یہ پائیلٹ کی ماں کا نام تھا) نے چھ میل کی بلندی سے ایٹم بم گرایا۔ جب یہ بم سطح سمندر سے ۱۸۰۰ فٹ بلندی تک پہنچا تو پھٹ گیا۔ اس کے پھٹتے ہی آگ اور دھوئیں کا ایک بھیانک شعلہ آسمان کی طرف لپکا۔ اس کی شکل پھول گوبھی یا آتش بدم کی طرح تھی۔ اس کے بعد ایک بھیانک دھماکہ ہوا آگ کی حرارت اس قدر تھی کہ میلوں دُور بیٹھے ہوئے لوگوں کے جسم جھلس گئے۔ آنکھوں کی پتلیاں گھل گئیں۔ ہزاروں لوگ آگ میں جل کر مر گئے ہزاروں ملبے کے نیچے دفن ہو گئے۔ لوگوں کے کپڑے جل کر تار تار ہو گئے۔

شہر میں ایک مکان بھی سلامت نہ رہا۔ سارا شہر ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ صرف میوزیم کی عمارت کا ڈھانچہ سلامت رہا۔ اگرچہ اس کا گنبد ٹوٹ کر گر پڑا تھا۔ یہ عمارت آج بھی اسی حالت میں باقی ہے۔ یہ ہیروشیما کے اس تباہ کن دن کی یاد دلاتی ہے۔ جس کے بعد دنیا کو اطمینان کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ ہیروشیما میں اس روز ایک

لاکھ ۴۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ اسی ہزار زخمی ہوئے۔ بعد میں یہ لوگ بھی چل بسے۔ اس کی وجہ وہ ریڈیائی راکھ تھی جو دھماکے کے بعد شہر پر نازل ہوئی تھی بلکہ راکھ جس کے بدن پر گری وہ ریڈیائی شعاعوں کا لقمہ بن گیا۔ یہ شعاعیں خون کا کینسر بن گئیں۔ کوئی ڈاکٹر اس مرض کا علاج نہیں کر سکا۔ اور مریض ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔

دوسرا بم ۹ اگست کو ناگاساکی پر پھینکا گیا۔ یہ شہر ہیروشیما سے چھوٹا تھا۔

۹ اگست کو ناگاساکی پر قیامت نازل ہوئی۔ آدھی آبادی اسی وقت جل کر راکھ ہو گئی۔ باقی ریڈیائی راکھ کا شکار ہو گئی۔ اس کے کچھ روز بعد جاپان نے صلح کی درخواست کی اور اس کے ساتھ ہی دوسری جنگِ عظیم کا خاتمہ ہو گیا۔

اگست ۱۹۸۵ میں اس واقعہ کو ۴۰ سال گزر گئے۔ ۶ اگست کو ہیروشیما پر اس بم کی ۴۰ ویں سال گرہ منائی گئی۔ جاپان کے وزیر[illegible] اس ماتمی جلسے میں شریک ہوئے۔ اس حادثے میں جو لوگ بچ گئے تھے وہ بھی اس جلسے میں شریک ہوئے۔ سب نے مل کر عالمی امن۔

...تھی۔ ہیروشیما پر جو بم گرایا گیا تھا وہ آج کے بم سے بہت چھوٹا تھا۔ آج اس بم سے ۱۰۰ گنا کے طاقت کے بم موجود ہیں۔ ان بموں کی تعداد پچاس ہزار ہے۔ ان میں سے چند بم ساری دنیا کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

ہیروشیما کے ایک میوزیم میں وہ تمام چیزیں نمائش کے لئے رکھی گئی ہیں۔ ان میں بچوں کے تار تار کپڑے ہیں، مڑے ہوئے برتن ہیں اس کے علاوہ ایک گھڑی بھی ہے جو ۸ بج کر ۱۶ منٹ پر بند ہو گئی تھی۔

می ساؤ کی عمر ۶ اگست ۱۹۴۵ کے دن ۱۴ سال تھی۔ وہ کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ ایٹم بم سے زخمی ہو گئی اور اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی تھی لیکن وہ بچ گئی۔ ایٹم بم سے بچنے والے گنے چنے انسان ہیں۔ وہ جاپان کی سوسائٹی میں ایک عجوبہ سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں جاپانی زبان میں ہیباکوشی کہتے ہیں۔ وہ جہاں جاتے ہیں لوگ حیرت سے ان کا منہ تکتے ہیں۔ می ساؤ لوگوں کی نگاہ سے بچنے کے لئے اپنے گاؤں چلی گئی۔ اس کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کے جسم میں ریڈیائی لہروں کے اثرات موجود ہو سکتے تھے جس سے بچہ معذور اور اپاہج ہو سکتا ہے۔ می ساؤ نے اپنی شادی کا خیال ترک کر دیا تھا لیکن گاؤں میں اس کی ملاقات ایک ہم عمر انسان کازاؤ سے ہو گئی۔ دونوں صلح کے لئے کام کر رہے تھے۔ دونوں جنگ کی تباہ کاریوں کے خلاف جلوس میں شرکت کرتے تھے۔ کچھ عرصے کی رفاقت کے بعد دونوں میں محبت ہو گئی۔ کازاؤ نے شادی کی تجویز پیش کر دی۔ می ساؤ کو ڈر تھا کہ شادی کے بعد اگر کوئی بچہ پیدا ہوا تو وہ معذور ہوگا۔ لیکن وہ کازاؤ کے اصرار پر [illegible] می ساؤ کی شادی ہو گئی۔ شادی کے ایک سال بچہ پیدا ہوا تو وہ نارمل تھا۔ دوسرا بچہ تین برس کے بعد بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ خون کے کینسر میں مبتلا ہے۔ می ساؤ کی رات کی نیند حرام ہو گئی۔ اسے احساسِ گناہ مارے ڈالتا تھا۔ اس کا بچہ اسپتال میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور وہ اس کو بچانے کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ آخر اس کا بچہ چل بسا۔ اب می ساؤ کی عمر ۶۱ سال ہے وہ ہیروشیما میں رہتی ہے چالیس سال میں ہیروشیما بدل گیا ہے لیکن می ساؤ چالیس سال پہلے کا وہ قیامت خیز دن نہیں بھول سکتی جب اس کا پورا خاندان آگ میں جل کر تباہ ہو گیا تھا۔ ●●

نیروبی میں عورتوں کی بین الاقوامی کانفرنس

اختر حسین

۱۹۷۵ میں اقوام متحدہ نے فیصلہ کیا تھا کہ اگلے دس سال عورتوں کے لئے مخصوص ہوں گے۔ عورتوں کا یہ دس سالہ دور میکسیکو کی کانفرنس سے شروع ہوا اور گزشتہ اگست میں نیروبی کانفرنس پر ختم ہوا۔ اسی طرح عورتوں کے عہد نے اپنے دس سال پورے کر لئے۔ نیروبی کانفرنس شہر کے مشہور کینیاٹا کانفرنس سنیٹر میں ہوئی۔ اس میں چودہ ہزار ڈیلی گیٹوں نے شرکت کی۔ بارہ ملکوں کے سربراہوں کی بیویاں اس کانفرنس میں موجود تھیں۔ ان میں فلپان کے صدر مارکوس کی بیوی امیلڈا، صدر ریگن کی بیٹی مارین ریگن، ہندوستان سے سیتا پائل، فرانس کے وزیر اعظم کی بیوی مادام پاپاندرو بھی شامل تھیں۔

یہ کانفرنس دو حصوں میں تقسیم تھی: ایک سرکاری اور ایک غیر سرکاری۔ ۱۰ جولائی کو غیر سرکاری کانفرنس شروع ہوئی۔ نیروبی کے ہوٹل اور ہوسٹل عورتوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ کینیا کی حکومت کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں عورتیں کینیا پہنچ جائیں گی۔ ان عورتوں نے مہینوں پہلے ہوٹل کے کمرے ریزرو کرائے تھے۔ لیکن بعد میں ایک کمرے میں دو اور بعض اوقات چار عورتوں کو ٹھونسنا پڑا۔ اس پر عورتوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

نیروبی ایک محفوظ شہر نہیں ہے۔ یہاں دن دہاڑے چھینا جھپٹی کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ اس کی روک تھام کے لئے حکومت نے سارے فقیروں، غنڈوں اور طوائفوں کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ طوائفوں کی گرفتاری پر ڈیلی گیٹوں نے احتجاج کیا۔ انہوں نے کہا کہ مرد عورت کو طوائف بناتے ہیں اور پھر خود ہی انہیں جیل میں بند کر دیتے ہیں۔ اس روک تھام کے باوجود کانفرنس کے پہلے دو روز میں چھینا جھپٹی کی پانچ وارداتیں ہوئیں۔

کانفرنس میں ہر وضع قطع کی عورتیں موجود تھیں۔ بنیان اور نیکر پہنی امریکن عورتیں اور سر سے پاؤں تک پردے میں ملبوس ایرانی عورتیں۔ ایرانی عورتوں نے کہا کہ ہمیں مردوں کے ساتھ برابری حاصل ہے۔ ہم اپنے خاوند کا انتخاب خود کرتے ہیں۔ اپنی جائداد اور سرمائے کی دیکھ بھال بھی خود کرتے ہیں۔ ہمیں اسلام پسند

[illegible] ملک میں مردوں اور عورتوں کا تناسب ایک اور چار کا ہے۔ مرد ایک ہی بیوی پر قناعت کرے گا تو باقی عورتیں کہاں جائیں گی؟ سوسائٹی اکیلی عورت کو بری نظر سے دیکھتی ہے۔ ہمیں دوسری، تیسری بلکہ چوتھی بیوی بننا منظور ہے، لیکن اکیلی رہنا منظور نہیں۔ اس کے علاوہ افریقہ کے کئی ملکوں میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ جنگ میں ہزاروں مرد ہلاک ہو جاتے ہیں عورت اور مرد کا تناسب بگڑ جاتا ہے۔ مرد کم ہوتے جا رہے ہیں اس کا علاج کیا ہے؟ مشرقی اور جنوبی افریقہ میں۔ ۹۰ فی صد مرد یا تو جنگ میں مصروف ہیں یا جیلوں میں بند ہیں۔

ووٹ کے حق پر بحث ہوئی تو کویت کا کیس پیش ہوا۔ کویت میں عورتوں کو الیکشن لڑنے کا حق نہیں ہے۔ انہیں ووٹ دینے کا حق بھی نہیں ہے۔ کویت کی حکومت عورت کو الیکشن کے جھگڑے سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ اس کا کام بچے پیدا کرنا اور انہیں پالنا ہے۔

مہاجر عورتوں کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ اس وقت دنیا میں ایک کروڑ عورتیں بے گھر ہیں اور بے سر و سامانی کی زندگی گزار رہی ہیں ان میں ہانگ کانگ کے سمندر میں چینی اور ویت نامی عورتیں اور فلسطین کی مہاجر عورتیں شامل ہیں۔ خود فلسطین میں سیکڑوں عورتیں جیل میں بند ہیں۔ وہ اسرائیلی مظالم کا شکار ہیں۔ ایران میں دس ہزار عورتیں جیلوں میں بند ہیں۔ ان میں سے کئی عورتوں کو گولی مار دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بھی ریزولیوشن پاس

[illegible] عورتوں السداوی ایک مشہور مصنفہ ہیں، جن کو اپنی تصنیفات کی وجہ سے کئی بار جیل جانا پڑا۔ انہوں نے عورت کے مقام پر ایک مقالہ پڑھا۔ ایک جج بھی موجود ہیں انہوں نے کہا کہ سارے قانون مردوں نے اپنی سہولت کے لئے بنائے ہیں۔ ان میں عورت کے لئے کوئی انصاف نہیں۔ جاپان اور تھائی لینڈ سے بھی کئی تعلیم کار عورتیں آئی تھیں۔

پاکستان کی مشہور شاعرہ کشور ناہید نے اپنے بچپن کے تجربات سنائے۔ ہندوستان کی شاعرہ، رقاصہ اور مصورہ چندر لیکھا کو ملیریا نے گھیر لیا اور وہ کانفرنس میں شرکت نہ کر سکیں۔ ہندوستان کی سوشل ویلفیئر وزیر نے اعلان کیا کہ انہوں نے غیر سرکاری کانفرنس میں شرکت کے لئے ۵۰ عورتوں کا لشکر بھیجا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے یہ تعداد معقول ہے مہاراشٹر کی ڈاکٹر ملگاؤڈے نے ایک مقالہ پڑھا اس میں ان نابالغ لڑکیوں کا ذکر تھا جنہیں مرد طوائف بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ صرف بمبئی شہر میں ایسی لڑکیوں کی تعداد بیس ہزار ہے۔

فلپائن کی عورتوں نے یک آواز ہو کر امریکہ کے صدر ریگن اور فلپائن کے صدر مارکوس کی ملی بھگت کے خلاف آواز بلند کی۔ یہ احتجاج صدر مارکوس کی بیوی کی موجودگی کے باوجود ہوا۔ روس کے ڈیلی گیشن کی لیڈر مشہور خلا باز عورت والن ٹینا ترشکووا تھیں۔ انہوں نے امریکہ پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ انہوں نے امریکہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ ہتھیاروں کی دوڑ کو آسمانوں تک لے جانا چاہتا ہے۔ افغانستان کی حکومت نے بھی امریکہ کے خلاف احتجاج کیا کہ وہ ہتھیار

سپلائی کرکے [illegible] ہے۔ ویت نام کی [illegible] احتجاج کیا۔ امریکن ڈیلی گیشن [illegible] اس کے مخالفین نے جھوٹ بولنا [illegible] وہ بھی ساری باتیں سچ کہی جاتیں۔ [illegible] ویت نام کے الزام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہزاروں، بلکہ لاکھوں عورتیں ویت نام سے بھاگ چکی ہیں۔ اس جنگ کی وجہ سے ہزاروں عورتیں موت کا شکار ہو گئیں۔ ہزاروں آج بھی وہاں سے بھاگنے کے لئے تیار بیٹھی ہیں۔

جب فلسطین سے چند عورتوں کا ڈیلی گیشن نیروبی پہنچا تو حکومت نے چار عورتوں کو واپس بھیج دیا۔ صرف دو عورتوں کو شرکت کی اجازت ملی۔ فلسطین کی مظلوم عورتوں پر ایک فلم دکھانے کی باری آئی تو اس کی نمائش کی اجازت بھی نہیں ملی۔ اس فلم کا نام تھا: "لیلیٰ اور بھیڑیئے"۔

ہندوستان میں جہیز کے لئے عورتوں کو جلانے کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ ۱۹۷۵ میں جب عورتوں کی پہلی کانفرنس میکسیکو میں منعقد ہوئی تھی تو ہندوستان میں ان مظالم کی تعداد ۵۰۰ سالانہ تھی۔ دس برس کے بعد یہ تعداد ۴۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ آخر ایسی کانفرنسوں سے کیا فائدہ؟ بہر حال کانفرنس میں کئی ریزولیوشن پاس کئے گئے جن میں جیل میں بند عورتوں کی رہائی کے مطالبے کئے۔ عورت کی گھریلو محنت کے لئے مالی معاوضہ کی مانگ کی گئی۔ کچھ عورتوں نے کہا کہ عورتوں کا بین الاقوامی دس سالہ عہد ختم ہے۔ اسے بڑھا کر اکیسویں صدی تک لے جایا جائے۔

دُودھ کی مکھّی

قیصر تمکین (کمبران، یوکے)

شبیر مرزا کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ ان کا پارہ چڑھ گیا

حسبِ عادت انہوں نے روٹیاں گنیں دسترخوان میں صرف چھ چپاتیاں تھیں۔ انہوں نے غصے میں پوچھا "ابھی سکندر نے کھانا نہیں کھایا ؟"

لڑکیاں چُپ رہیں۔ مطلب یہ تھا کہ باپ کا خیال درست تھا اور ان چھ چپاتیوں پر ہی باپ بیٹے کو صبر کرنا تھا۔ انہوں نے بغیر بگھاری ہوئی ارہر کی دال کے ساتھ جیسے تیسے کر کے ڈھائی تین روٹیاں زہر مارکیں اور نماز پڑھنے محلّے کی مسجد میں چلے گئے۔

واپس آکر وہ حسبِ معمول آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور وظیفہ پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز ہوئی ابھی کچھ رات زیادہ نہیں گئی تھی، مگر سب لوگ اس طرح مُنہ ڈھانپے پڑے تھے گویا اب اُٹھنا ہی نہ ہو۔ جب دستک کی آواز بڑھی تو شبیر مرزا سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سکندر مست ہاتھی کی طرح جھومتا، اکڑتا ہوا داخل ہوا۔ شبیر مرزا ناگواری کے عالم میں پھر چُپ چاپ جاکر لیٹ گئے۔

سب لڑکیاں ابھی تک سوئی ہوئی بنی پڑی تھیں، مگر بھائی کے آتے ہی ایک نے کروٹ بدلی کیوں کہ بھائی کو کھانا کھلانے تو اُٹھنا ہی تھا۔

ساجدہ نے اُٹھ کر کھانا گرم کیا اور جب تک سکندر نے کپڑے بدلے، اس نے دسترخوان بچھا دیا۔ اس وقت دال کے ساتھ ایک تلا ہوا انڈا بھی تھا۔ سکندر اپنے کھانے کے بارے میں بہت محتاط تھا اور ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ

"کھاؤں گا نہیں تو کماؤں گا کیا؟"

روٹیاں صرف تین تھیں۔ سکندر نے کچھ کہنا چاہا۔ وہ شاید زور سے بگڑتا، مگر ساجدہ نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پہلے اس گھر میں ڈانٹنے ڈپٹنے کا حق صرف مشیر مرزا کو تھا، مگر جب سے ان کی پنشن ہوئی اور بڑا لڑکا سکندر روزی سے لگا، یہ حق صرف اسی کا ہو گیا۔ چنانچہ اب گھر میں سب لوگ صرف اسی کے غصے سے ڈرتے تھے۔

مشیر مرزا کھری چارپائی پر بیٹھے ہوئے اوراد و وظائف میں مصروف تھے۔ انہوں نے آنچل پر دھیان دیا۔ ساجدہ باورچی خانے سے کچھ روٹیاں دوپٹے کے آنچل سے چھپاتی ہوئی لائی اور سکندر کے سامنے رکھ دیں۔ مشیر مرزا وظائف بھول گئے۔ ان کے دل پر عجیب گھونسا سا لگا۔ ان کو دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ انہوں نے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا، بلکہ قلق اپنی لڑکی کے رویّے پر ہوا۔ مگر پھر ان کو یاد آیا کہ سکندر مرزا جوان ہے، برسرِ روزگار ہے اور اس گھر میں ان کی پنشن کے بعد جو سرد جنگ کا ماحول پیدا ہو گیا ہے، اس میں ان کی حیثیت ایک پیچھے ہٹتے ہوئے شکستہ پا سپاہی کی سی ہے۔ مشیر مرزا نے اپنی سو روپلی کی تنخواہ میں سات اولاد پالی تھیں، جن میں سے چار جوان لڑکے تھے۔ انہوں نے پچھلے بیس بائیس برس برابر بغیر گھی کی دال اور روٹی پر بسر کئے تھے اور ۲۴ گھنٹوں میں صرف ایک وقت کھانا کھانے کی عادت انہوں نے اسی وقت سے ڈال لی تھی جب سے تنخواہ اور بچوں کی فیس میں تفاوت ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ مگر آج ان کے اشارۂ چشم و ابرو پر چلنے والی رفیقۂ حیات بھی ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی اور ہر بات پر لڑکے کے ساتھ ہو جاتی تھی۔ شوہر کے بارے میں بیگم ہمیشہ یہی کہتیں "اونہہ انہیں بکنے دو۔ ان کو تو جھک جھک کرنے کی عادت پڑ گئی ہے!"

سکندر نے پورا کٹورا بھر پانی پینے کے بعد زور سے ڈکار لی اور پوچھا "تو پھر کل کیا بڑی باؤلی والے آئیں گے؟"

یہ بات بتول کی نسبت کے بارے میں تھی، اس لئے لڑکیاں چُپ رہیں مگر ماں اپنے پلنگ پر کچھ کسمسائیں اور پھر بیٹے کو خوش کرنے کی نیت سے اُٹھ کر بیٹھ گئیں "ہاں محمدی بوا کہہ تو گئی ہیں۔" اس کے بعد وہ زور زور سے کھجور کا پنکھا جھلنے لگیں، گویا گرمی سے بے حال ہو رہی ہوں اور سکندر کے سوال پر نہیں بلکہ گرمی کی شدت کی بنا پر نیند سے بیدار ہوئی ہوں۔

بڑی باؤلی والوں نے بتول کے لئے شادی کا پیغام بھیجا تھا اور ماں بیٹے آپس میں مشورہ کر کے اس سلسلے میں فیصلے کئے دے رہے تھے۔ مشیر مرزا سے کسی نے رسمی طور پر بھی کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ مشیر مرزا کو اس وقت غصہ آ گیا۔ ان کو خیال آیا کہ اب اگر وہ نہ چونکے تو ساری بازی ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ وہ کھنکھار کر اُٹھ بیٹھے "یہ کیا؟ بڑی باؤلی والوں کا کیا قصہ ہے؟"

سکندر کو اس دخل در معقولات پر بہت غصہ آیا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا بیگم بول اُٹھیں "اے وہی بتول کی نسبت۔ ایسے بن رہے ہو جیسے بچے ہوں۔ کچھ معلوم ہی نہ ہو"

"کس مردود نے اس نسبت کی بات کی؟" مشیر مرزا نے زور سے اپنی پرانی آن بان والی آواز نکالی، جس میں آج بھی نہ جانے کیوں ایسی گرج تھی کہ سب سہم اُٹھے۔

"ارے، دھیرے دھیرے بولئے محلے والے کہیں گے کہ کیا رات دن ان کے یہاں اُودھم مچا رہتا ہے۔" بیگم نے آواز دھیمی کر کے بہت ہی درشت لجاجت کے ساتھ کہا۔

"میں نے کہہ دیا، میری زندگی میں بتول کا رشتہ اس لچے لفنگے نام کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔"

یہ آواز اپنی بازگشت کے ساتھ محلے میں دُور دُور تک پہنچ گئی اور سکندر نے دسترخوان تہہ کرتے ہوئے پہلو بدلا۔ "میں نے کہا آپ چُپ بھی ہوں گے کہ نہیں؟"

بیگم نے فوراً صلح کے خیال سے شوہر اور بیٹے کے آگے ہاتھ جوڑنا شروع کر دئے مگر مشیر مرزا اپنے جلال پر آ چکے تھے اور انہوں نے انگریزی کا سہارا لیا "یو شٹ اپ!"

انگریزی میں ڈانٹنے کا یہ فائدہ تھا کہ آواز کی گرج میں اضافہ ہو جاتا اور آس پاس کی عورتیں جو ہنگامے کی آواز سنتے ہی سارے کام چھوڑ کر بڑے ذوق و شوق سے اس طرف کان لگا دیتی تھیں، لڑائی کے چٹ پٹے مزے سے محروم رہ جاتیں۔ ماں بہنیں سکندر کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے اس کو الگ گھسیٹ لے گئیں اور مشیر مرزا دونوں ہاتھ پیچھے باندھے ہوئے دیر تک غصے میں ٹہلتے ہوئے بڑبڑاتے رہے۔

دوسرے دن مشیر مرزا اپنے پنشن کے کاغذات پر دستخط کرانے اور بینک کا چکر کاٹنے میں مصروف رہے اور گھر میں بتول کی شادی کی بات طے بھی ہو گئی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ عجلت سکندر کو تھی جو جلد سے جلد

گھر میں کمانے والوں کی تعداد گھٹانے کا آرزومند تھا۔

بشیر مرزا زیادہ تر وقت نماز اور اوراد و وظائف میں گزارتے اور گھر میں بتول کی شادی کی تیاریاں ہوتی رہتیں۔ وہ جب بھی گھر میں داخل ہوتے تو سب لوگ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے۔ کبھی وہ دیکھتے کہ ماں بیٹیوں میں بہت ہی رازداری سے تبادلہ خیال ہو رہا ہے مگر ان کے آتے ہی باتوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور بیگم مصنوعی غصے کے ساتھ بات بدل کر کسی بیٹی کو ڈانٹتیں "اے یہ سوئی تم نے پھر کھو دی۔ کیا مجال ہے کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر رکھی مل جائے۔"

بشیر مرزا بعض وقت سب کے بیچ میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتے مگر جتنی دیر تک وہ بیٹھتے ایسی کشیدگی کی فضا رہتی کہ سب کے اعصاب متاثر ہونے لگتے۔ اور ایک ایک کر کے سب لوگ کسی نہ کسی طرح وہاں سے ٹل جاتے۔ بشیر مرزا اکیلے جھک مارنے کو رہ جاتے۔

ایک دن بشیر مرزا بیٹھے تھے کہ ایک مراثن آ گئی اور اس نے بہت ہی خوشامدانہ انداز میں کہا "میاں مبارک ہو۔ اب چار ہی دن میں بیٹی خیر سے اپنے گھر بار کی ہو جائے گی۔"

بشیر مرزا سب کچھ جانتے اور سمجھتے بوجھتے ہوئے بھی انتہائی ناگواری اور بہت ہی سنسنی خیز بے باکی سے بولے "کس کی شادی؟ کیسی شادی! میری مرضی سے کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ مجھ سے کچھ مطلب نہیں۔"

بیگم سناٹے میں آ گئیں۔ مراثن بھی دنگ رہ گئی۔ مگر بشیر مرزا یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے "میں تو اپنے جیتے جی اس لغو تقریب میں شرکت نہیں کروں گا۔"

بیگم گھبرا گئیں۔ بشیر مرزا نے جس تلخی اور حسرت تک مایوسی کے لہجے میں یہ جملے کہے تھے ان کی چبھن اور دردانگیزی کو وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس کے علاوہ ان کو یہ بھی ڈر تھا کہ مراثن کس طرح ان سب باتوں کا بتنگڑ بنائے گی۔

اور ہوا بھی یہی۔ ادھر تو بیگم بشیر مرزا کی منت سماجت کرنے لگیں، کیونکہ اب یہی راستہ رہ گیا تھا اور دوسری طرف مراثن نے پوری بات خوب نمک مرچ لگا کر لڑکے والوں میں جا کر سنائی۔ وہ لوگ بھی چونک گئے۔ اتنا اندازہ تو سب کو تھا کہ بشیر مرزا کی خلاف یہ شادی ہو رہی ہے مگر یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ حالات اتنے سنگین ہیں۔ شام تک دو تین رشتہ دار بشیر مرزا سے ملنے آ پہنچے۔ انہوں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پوچھا "تو پھر اس تقریب میں آپ کی شرکت یقینی نہیں ہے؟"

اس وقت تک بشیر مرزا کا دل بیگم کی منت سماجت سے پگھل چکا تھا اور کچھ وہ خود بھی معاملے کی نزاکت کا احساس کر چکے تھے، اس لئے انہوں نے سیدھا ہاتھ اٹھا کر ایک استفہامیہ انداز میں گھمایا اور بولے "کیوں نہیں؟ کیوں نہیں؟"

پوچھنے والے قدرے خفیف ہو کر بولے "نہیں — مطلب یہ کہ — وہ شاید — شاید آپ کچھ — کہتے ہیں کہ اس رشتے کی موافقت میں نہیں تھے۔"

"اگر میں موافقت میں نہیں تھا تو یہ رشتہ ہو کیسے رہا ہے؟" انہوں نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر پھر ایک خاص انداز سے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو گلاس کی شکل میں گھمایا، گویا کسی ترتیب کا بھاؤ بتا رہے ہوں۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر اس قصے کے بعد لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ بشیر مرزا نے طوعاً و کرہاً اس رشتے کو منظور کر لیا ہے، اس لئے اب ذرا اطمینان اور قدرے بے خوفی سے ان کی موجودگی میں کپڑوں کی سلائی اور دوسرے انتظامات کا ذکر بھی ہونے لگا۔ پھر بھی بشیر مرزا ہر مسئلے میں جا بے جا اپنی ٹانگ اڑانے سے باز نہ آتے۔ مثلاً ایک بار جب عورتیں فراکوں اور جمپروں کی باتیں کر رہی تھیں تو وہ سب کی موجودگی میں بگڑ کر بولے "یہ فراکیں وراکیں ہمارے یہاں نہیں چلیں گی۔ سب غیر شرعی باتیں ہیں۔"

"اب آپ عورتوں کے بیچ میں مت دخل دیا کیجئے۔" بیوی نے اس نسوانی خشونت سے کام لیا جہاں بڑے بڑے مجازی خداؤں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔

بشیر مرزا تقریباً نیم دیوانگی کے لہجے میں ڈپٹ کر بولے "کیسے نہ بولوں؟ میری بیٹی کی بات ہے۔ میرے ہوتے ہوئے میری بیٹیاں جمپر اور فراکیں نہیں پہنیں گی۔ صرف قمیصیں پہنیں گی قمیصیں۔ سن لیا!"

سب لوگوں نے چپ رہنے میں ہی بھلائی سمجھی۔ فراکیں اور جمپر اور معلوم نہیں کن کن نئے فیشنوں کے غیر ساتر لباس تیار ہوتے رہے۔ مگر بشیر مرزا کی موجودگی میں ان کو "قمیص" کہا جاتا۔

برات کے کھانے کی فہرست تیار ہونے لگی تو پھر بشیر مرزا مجبور ہو کر آپے سے باہر ہو گئے "یہ سب کہاں سے آئے گا؟ کس برتے پہ بڑائی دکھائی جا رہی ہے؟ بس سادہ سالن اور نان کافی ہے۔ ہماری حیثیت ہے کہ ہم پلاؤ اور مرغ کے خواب دیکھیں؟"

ایک بار پھر ان کی اور سکندر کی ٹھ بھیڑ ہوتے ہوتے رہ گئی، مگر سب بھائی بہنوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کیا۔ "بھائی میاں رہنے دیجئے" ابا میاں کو خفا ہونے دیجئے۔ ان کے جاننے والے آئیں گے تو خالی سالن روٹی کھلادی جائے گی۔ برات کا کھانا تو ڈھنگ کا ہی ہوگا۔ نہیں تو سب تھو، تھو کریں گے۔"

مہمانوں کی فہرست تیار ہونے لگی تو مشیر مرزا نے اپنی رضاعی بہنوں، مشفق بہن، قیامن بہن، اور رفیقن بہن کے نام گنائے اس بار بیگم بپھر م بھیٹں "یہ سب حرام خور ہیں کام کے وقت مُونہہ نہیں دکھاتیں۔ روٹیاں توڑنے اور عیب نکالنے کو آجائیں گی۔"

"خاموش! خبر دار جو ایک حرف مُونہہ سے نکالا۔ تمہاری اب یہ ہمت کہ میرے مُونہہ پر میری دُودھ شریک بہنوں کو حرام خور کہو۔ حرام خور تم، تمہارے گھر والے، تمہارے باپ دادا جو مسجدوں کے چندے ہڑپ کر گئے . . . ،"

ہر چند کہ سکندر اس وقت گھر میں نہیں تھا اور سب بیٹیاں اور بیٹے ماں پر چُپ رہنے کے لئے زور دے رہے تھے، مگر مشیر مرزا کی بیگم نہ مانیں اور جم کر لڑنے کو تیار ہو بیٹھیں "میں کہتی ہوں نہ مشفق بہن، نہ قیامن بہن کوئی نہیں آئے گا۔ اگر یہ نٹنیاں آئیں تو میں چُوڑیاں پیس کر کھالوں گی۔ اے ہاں، کوئی سگی بہن ہو تو برداشت کرے۔"

مشیر مرزا جُز بُز ہوئے اور ڈپٹ کر بولے "میں نے کہا کہ تم چُپ بھی رہوگی کہ . . . "

"کہ کیا؟ کیا کیجئے گا آپ؟ میں نہیں چُپ رہوں گی۔ نہیں چُپ رہوں گی نہیں . . . "

اتنے میں ڈپٹی صاحب کے یہاں سے سواریوں کی آمد کی خبر ملی اور ڈیوڑھی پر کہاروں نے آواز لگائی۔ مشیر مرزا اخبار دیکھنے لگے اور بیگم بڑی شاداب اور شگفتہ مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے بولیں "آؤ آؤ بہن۔ بڑی دیر کردی۔ ابھی تمہارے بھائی صاحب کہہ ہی رہے تھے کہ کیا بات ہے، احتشامن بہن نہیں آئیں۔"

پھر ذکر چھڑ گیا اگلی پچھلی تقریبوں کا۔ اور مشیر مرزا ظہر کی نماز کے لئے مسجد چلے گئے۔

شادی کے دن لڑکے والوں نے کچھ پاؤں پھیلائے اور ناصر میاں نے، جو بی، کام فیل تھے، اپنے مطالبات کی ایک خاصی طویل فہرست گنائی۔ ابھی تک مشیر مرزا ٹھنڈے تھے اور سب سے خندہ پیشانی سے پیش آرہے تھے۔ دُولہا میاں کی خواہشات سُن کر آگ بگولا ہوگئے۔ تیر کی طرح ان کے پاس پہنچے اور تلوار کی دھار کی طرح تیز اور کاری طنز کے ساتھ بولے "میاں صاحب زادے، تمہارے باپ دادا نے بھی کبھی ریفریجریٹر دیکھا تھا؟"

محفل میں سناٹا چھا گیا۔ قاضی صاحب ذرا غیر شعوری طور پر کچھ پیچھے کھسک گئے اور ناصر میاں برہم ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے "یہ میری بے عزتی ہے۔"

"بے عزتی؟ برخوردار عزت ہے کس کی؟ زندگی بھر مسجدوں میں خیرات کے ٹکڑوں پر پلنے والے تمہارے باپ کو میں نے ہی پڑھوایا۔ میں نے ہی فاخر مرحوم کو حیدرآباد بھجوا کر وظیفہ دلوایا۔ بھول گئے آج اپنی حیثیت؟ اللہ کی شان آج تم کو ریفریجریٹر چاہیے۔ تمہاری حیثیت کیا ہے؟ ساٹھ روپے کی کلرکی پر بیٹھے ہیں اگر کچھ ہوتے تو کیا کرتے؟"

سکندر آگے بڑھا۔ اس نے باپ کو زور سے پیچھے کھینچا اور سب سے کہنے لگا۔ "آپ ان کی باتوں کا بُرا نہ مانئے گا۔ آج کل ان کا ذہن ماؤف ہے۔"

دو تین اور مہمانوں نے بڑھ کر مشیر مرزا کو پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے ان کو لے گئے اور ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ لالہ گوری شنکر افسوس کرتے ہوئے کہنے لگے "چچ چچ! ایشور موت دے دے، پر پاگل نہ کرے!"

لیکن مشیر مرزا کی تلخ بیانی کام کر گئی۔ ناصر میاں اور ان کے گھر والوں کو پھر وہ دن یاد آگئے جب مشیر مرزا سے خوشامد کرکے وہ سب لوگ انگریزی اور ریاضی سیکھنے آتے تھے۔ ناصر میاں کو بتول کا فلمی ستاروں کی طرح خوب صورت چہرہ یاد آگیا۔ پھر وہ تمام گھرانے یاد آئے جہاں ان کی شادی کے پیغام "بوجہ" مسترد کر دئے گئے تھے۔ وہ سکندر کے دو چار جملوں ہی سے من گئے۔ انہوں نے سوچا "ارے ہاں، پاگل کی بات کا کیا بُرا ماننا۔"

مبارک سلامت کا شور پھر اُٹھا، رات گئے تک تقریب کی چہل پہل جاری رہی۔ دوسری طرف اندھیری کوٹھری میں مشیر مرزا چیختے چلاتے اور بکتے جھکتے ہوئے سچ مچ پاگل ہوگئے تھے۔ انہوں نے دیوار سے سر پھوڑ لیا اور بے ہوشی کے عالم میں معلوم نہیں کیا کیا بڑبڑاتے ہوئے آخری سانسیں لے رہے تھے۔ کسی کو ان کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

بتول رخصت ہوکر سسرال جا رہی تھی۔ ہاں مگر مشیر مرزا کے جیتے جی نہیں۔ ●

نذیر احمد

چینی عورتوں میں تبدیلی کی لہر
ایک نیا دور

آج سے ۴۰ سال پہلے چین میں چیانگ کائی شیک کی حکومت تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہاں کمیونسٹ انقلاب آیا تو چیانگ کائی شیک کی حکومت ختم ہو گئی۔ ماؤزے تنگ چین کے نئے حکمراں بن گئے۔ چین کمیونزم کو پھیلانے میں روس سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ گیا۔ یہی نہیں، بلکہ چین نے روس کو رجعت پسند کہنا شروع کر دیا۔ اس طرح دونوں دوست ملکوں میں ٹھن گئی۔ ماؤ بوڑھے ہو گئے تو ان کی چوتھی بیوی چنگ چیانگ نے حکومت میں دخل دینا شروع کر دیا۔ انہیں حکومت میں تین ساتھی اور مل گئے۔ یہ "چار کا گروہ" کہلاتا تھا۔ انہوں نے چین میں سختی سے کمیونزم پھیلانا شروع کیا۔ آئے دن جلوس نکلتے، پوسٹر بازی ہوتی۔ غرض ایک طرح کی ایک خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ماؤ کے انتقال کے بعد حالات معمول پر آ گئے۔ چین میں نئی حکومت قائم ہوئی "چار کی ٹولی" پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں سزائیں دی گئیں۔ ماؤ کی بیوی کو جیل بھیج دیا گیا۔

آج کا چین کمیونزم پر سختی سے عمل پیرا
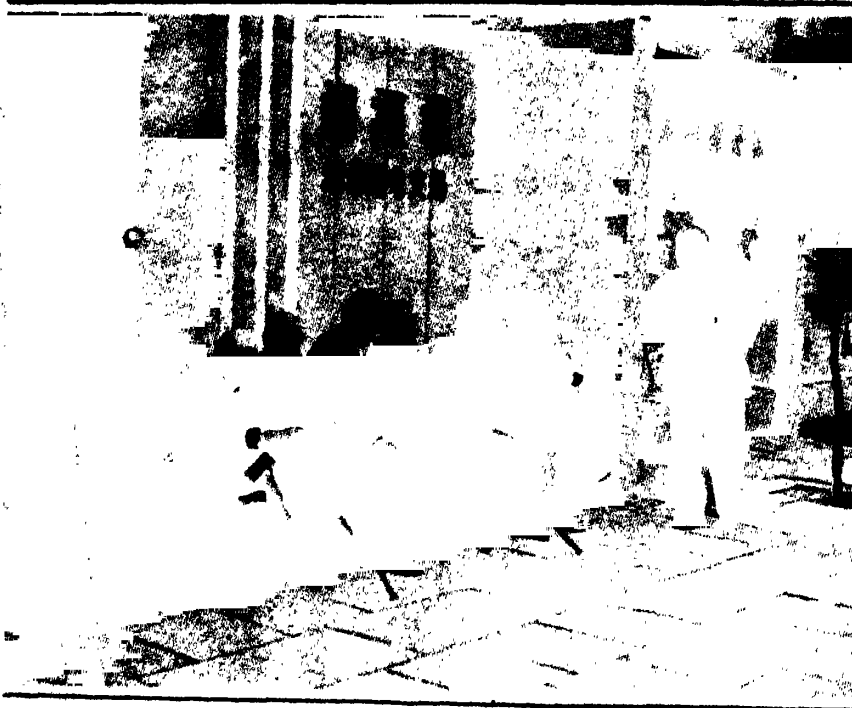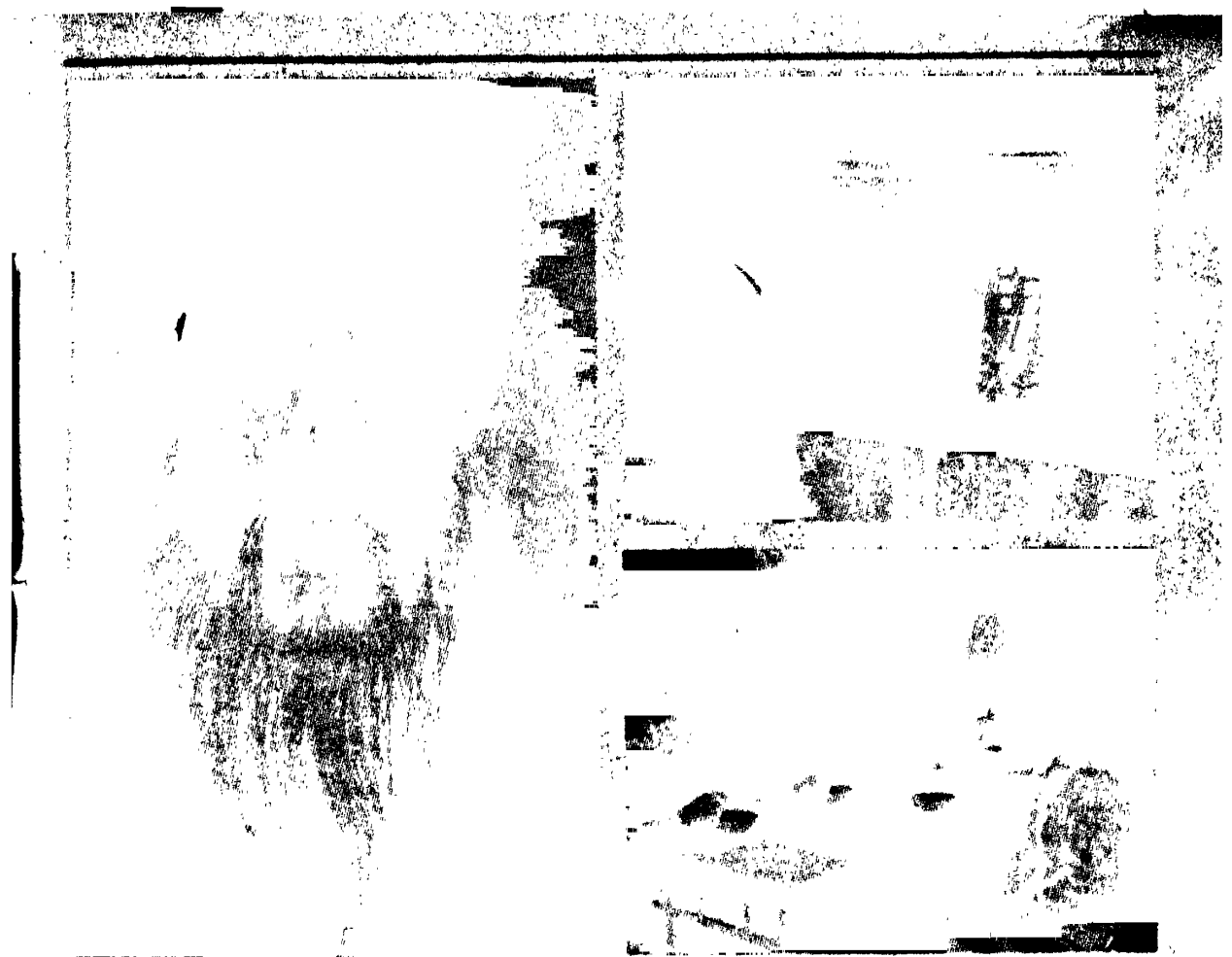
نہیں ہے۔ اب وہاں بین الاقوامی تجارت پر زور دیا جا رہا ہے۔ معمولی پیمانے پر پرائیویٹ تجارت کی اجازت بھی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ دیوارِ چین میں دروازے کھل گئے ہیں۔ آج کل وہاں کے سربراہ ڈینگ ژاؤ چنگ ہیں۔ ان کی عمر ۸۱ سال ہے۔ اس عمر میں بھی ان میں جوانی کی سی پھرتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انہیں رجعت پسند اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ چار کی ٹولی کے زمانے میں دو بار انہیں حکومت سے نکال دیا گیا تھا لیکن آخر میں جیت اُن ہی کی ہوئی۔

چین میں مرد اور عورت کو برابری

کا درجہ حاصل ہے۔ ماؤ کے زمانے میں مرد اور عورت دونوں ایک سا لباس پہنتے تھے۔ نیلی وردی وہاں کا مخصوص لباس تھا۔ پانچ بٹن والا بند کوٹ اور پتلون وہاں کا پہناوا تھا۔ اس لباس میں مرد اور عورت کا پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا۔ عورتیں اپنے بال کٹواتی تھیں۔ لپ اسٹک پاؤڈر اور میک اپ ممنوع تھا۔ یہ سب چیزیں سرمایہ دار ملکوں سے وابستہ تھیں۔ چین کو فیشن سے الرجی تھی یہاں تک کہ جوتوں کو پالش کر کے چمکانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ ہوٹل کیبرے، کازینو، ریسٹورنٹ عیاشی کے اڈے تھے۔ چین کے باشندوں کا صرف ایک فرض تھا: کام، کام اور زیادہ کام۔ یہ تجربہ برسوں تک چلتا رہا۔ یہ کہنا زیادتی ہے کہ

چین کو اس طریقے سے کامیابی نہیں ملی چینی بہت محنتی ہوتے ہیں۔ ان کی دن رات کی محنت نے چین کو دنیا کے بڑے ملکوں کی فہرست میں کھڑا کر دیا لیکن آج چین کے لیڈر پرانے طریقے کو ترک کر رہے ہیں۔ وہاں اب مرد سوٹ پہنتے ہیں۔ ٹائی لگاتے ہیں۔ عورتیں اسکرٹ، بلاؤز اور مغربی طرز کے سوٹ پہن سکتی ہیں۔ لوگ اپنا ذاتی مکان بنا سکتے ہیں۔ چین کے ماحول سے یکسانیت اور اُداسی ختم ہو گئی ہے۔ وہاں اب سڑکوں پر زندہ دل اور چنچال عورتیں گھومتی نظر آتی ہیں۔ گھر میں عیش و آرام کے سامان مہیا ہیں۔ لوگ بڑے چاؤ سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہیں۔ عورتیں گرمیوں میں بھڑکیلے کپڑے پہنتی ہیں، میک اپ کرتی ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا غلط ہوگا کہ چین مغرب کی بے تحاشا نقالی کر رہا ہے۔ چین میں پرانی قدریں بدل رہی ہیں، لیکن آہستہ خرامی کے ساتھ۔ چین کی اس تبدیلی کو مغربی ملکوں کے اخبارات سرخیوں میں شائع کر رہے ہیں لیکن

یہ خبریں مبالغہ آمیز ہیں۔ چینی عورتوں کے فیشن کا ڈھنگ سب سے الگ تھلگ ہے۔

اس تبدیلی میں ایک سنجیدگی ہے۔ چین میں ابھی تک موٹر کاروں کا زیادہ رواج نہیں ہے۔ چینی لوگ بائیسکل پر سفر کرتے ہیں۔ غالباً اسی لئے ان کی صحت قابلِ رشک ہوتی ہے۔ بیجنگ کی سڑکوں پر سائیکلوں کے ساتھ بسوں کی قطار بھی نظر آتی ہے۔ وہاں ہانگ کانگ کی طرز کے ڈپارٹمنٹ اسٹور کھل گئے ہیں جہاں کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں وافر مقدار میں ملتی ہیں۔ اگرچہ باہر کی چیزوں کی درآمد ممنوع ہے۔

چین کی آبادی دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ ہے۔ اس معاملے میں اس نے ہندوستان کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ دنیا کی آبادی میں ہر سیکنڈ میں ۴ بچوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان میں ایک بچہ چین میں اور دوسرا ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے۔ باقی دو بچے ساری دنیا کے باقی ملکوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی آبادی اب ۹۰ کروڑ تک پہنچنے والی ہے۔ چین ہم سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ وہاں کی آبادی ۱۱۰ کروڑ تک پہنچنے والی ہے۔ ماؤ آبادی سے نہیں گھبراتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کمیونزم میں زیادہ سے زیادہ آبادی کو کھلانے کی گنجائش ہے۔ لیکن بعد میں چینی لیڈروں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چین میں خشک سالی پڑی تو وہاں قحط کے آثار نمودار ہونے لگے۔ چینی لیڈروں نے امریکہ سے اناج خریدا۔ امریکہ نے بھی اسی بہانے چین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ امریکہ کو معلوم ہے کہ چین اور روس میں ٹھنی ہوئی ہے۔ اس نے روس کو نیچا دکھانے کے لیے چین سے دوستی پیدا کی۔ اسے غلہ فراہم کیا۔ اس کے بعد چینی لیڈروں نے اپنی پالیسی بدل دی۔ اب وہاں جگہ جگہ فیملی پلاننگ کلینک قائم ہو گئے ہیں۔ کسی بھی جوڑے کو ایک بچے سے زیادہ پیدا کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کے نتیجہ میں چین میں آبادی کی رفتار کم ہو گئی ہے۔

چین کے انقلاب سے سب سے زیادہ فائدہ عورتوں کو پہنچا۔ آج سے ۸۰ سال پہلے وہاں ماں باپ لڑکیوں کو تین چار سال کی عمر میں لوہے کے جوتے پہنا دیتے تھے۔ اس طرح ان کے پیروں کی نشو و نما رک جاتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ عورت کے پاؤں نارمل ہوئے تو وہ گھر سے بھاگ جائے گی۔ جوانی میں عورت کا پورا جسم بڑھتا تھا لیکن پاؤں بچوں جیسے رہتے تھے۔ یہ عورتیں تیز تیز نہیں چل سکتی تھیں۔ چین میں بادشاہت کا خاتمہ ہوا اور سن یات سن کی جمہوری حکومت قائم ہوئی تو پیر وں کا باندھنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا۔ لیکن عورتوں کی پوزیشن وہی رہی۔ وہ دن بھر کھیتوں میں کام کرتیں۔ درجنوں بچے پیدا کرتیں۔ اور خاوند کی جھڑکیاں سہتیں۔ کمیونزم کے داخلے کے بعد یہ سب ختم ہو گیا۔ اب وہاں عورت اور مرد کے حقوق برابر ہیں۔ ان کی تنخواہیں برابر ہیں۔ کارخانے، کھیت، سرکاری دفتر عورتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ عورتوں کو تعلیم کی سہولیات میسر ہیں۔ چین کے انقلاب میں عورتوں نے ایک اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ اگرچہ ایشیائی ملک ہونے کے ناطے بچی کی پیدائش پر اب بھی چینی مرد ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن اُمید ہے کہ یہ حالت زیادہ دن قائم نہیں رہے گی۔ ●

اڑن طشتری کی پرواز
فریب یا حقیقت؟
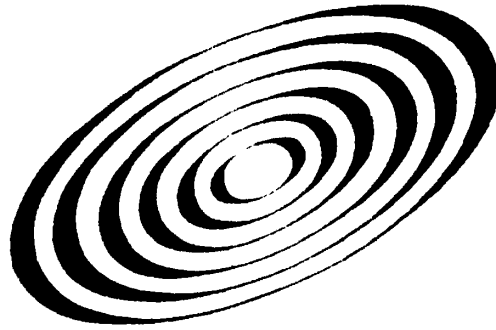
اسپین کی فضا میں ایک جمبو جہاز پرواز ر رہا تھا۔ یکایک پائلیٹ نے دیکھا کہ ایک شتری نما جہاز بھی اس جہاز کے ساتھ ساتھ بواز کر رہا ہے۔ پائلیٹ کو اپنی آنکھوں پر یقین یں آیا۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ پائلیٹ کو ردار کیا۔ اس نے بھی طشتری نما جہاز کو دیکھا جہاز ایک دو منٹ تک جمبو جہاز کے ساتھ تا رہا اور پھر تیزی سے پرواز کرتا ہوا آگے نکل یا۔ جمبو جہاز .. ۷ میل فی گھنٹہ سے زیادہ تیز یں اُڑ سکتے۔ اِس لئے اڑتی ہوئی یہ جہاز طشتری پیچھا نہیں کر سکا۔ جب پائلیٹ نے افریقہ کے مالی صحرا میں جہاز اتارا تو اس نے ایئر پورٹ کے حکام سے اِس سلسلے میں بات چیت کی۔ ہوائی اڈے پر راڈر کا انتظام ہوتا ہے، فضا میں میں اُڑنے والی ہر چیز راڈر پر ایک لکیر کی طرح نمودار ہو جاتی ہے۔ راڈر کے نگراں نے پائلیٹ کی بات سُنی تو اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا کیونکہ اس نے راڈر کے اسکرین پر کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی تھی۔ پائلیٹ کو یہ سن کر تعجب ہوا، لیکن اس کا تعجب اس وقت اور بھی بڑھ گیا جب کچھ دیر بعد جہاز کی پرواز شروع ہونے پر ایرپورٹ کے حکام نے اسے بتایا کہ جہاز کے اُڑتے ہی ایک طشتری نما جہاز نے اس کا تعاقب کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ طشتری نما جہاز جمبو کی پرواز کا انتظار کر رہا تھا۔ پائلیٹ نے جب یہ بات سُنی تو اس نے جہاز سے جھانک کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، واقعی ایک طشتری ان کا پیچھا کر رہی تھی، وہ کبھی تیزی سے اوپر جاتی کبھی تیزی سے نیچے کی طرف اڑان لگاتی۔ کوئی عام جہاز اِس طرح کے کرتب نہیں دکھا سکتا۔ یہ سلسلہ ایک گھنٹے تک چلتا رہا۔ اس دوران طشتری نما جہاز جو سفید روشنی کا ایک ہالہ معلوم ہوتا تھا اپنا رنگ بدل کر نارنجی ہو گیا اس کے بعد وہ فضا میں تیزی سے اڑتا ہوا

> سب سے زیادہ عجیب واقعہ ایک اور جہاز کے پائلیٹ کو پیش آیا۔ اُس نے ایک دیوزاد اڑن طشتری دیکھی۔ اُس کا قطر تقریباً دو میل تھا اور اونچائی ایک دو سو منزلہ عمارت کے برابر تھی۔ پہلے تو پائلیٹ نے سمجھا کہ یہ کوئی بادل ہے، لیکن جب اُس نے جہاز کے ساتھ چلنا شروع کردیا تو پائلیٹ بھی شش و پنج میں پڑ گیا۔ دنیا میں اتنی بڑی اڑن طشتری پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔

غائب ہوگیا۔

یہ واقعہ کوئی انوکھا حادثہ نہیں ہے، اڑن طشتری کے چشم دید گواہ دُنیا میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آسمان کے کسی سیارے میں زندگی موجود ہے۔ وہاں کے رہنے والے زمین کے رہنے والوں سے زیادہ عقل مند اور ترقی یافتہ ہیں، اور گاہے گاہے زمین کا معائنہ کرنے چلے آتے ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے مشہور مصنف ایچ۔ جی۔ ویلز نے ایک ناول لکھا تھا۔ اس کا نام تھا "ٹائم مشین" اس میں بتایا گیا تھا کہ مریخ میں زندگی موجود ہے اور وہاں کے رہنے والے زمین پر حملہ کرتے ہیں۔ اس وقت اس ناول کو مجذوب کی بڑ سمجھا گیا تھا۔ لیکن اب لوگ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ گذشتہ دنوں اسپین میں اس موضوع پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اسپین کے ایک مصنف نے اڑن طشتری پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ اس نے اس کانفرنس میں اڑن طشتری کے وجود سے متعلق ٹھوس ثبوت پیش کئے۔

اسپین میں اڑن طشتری کے متعلق ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک ڈاک لے جانے والا جہاز فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ ایک اڑن طشتری اس کا پیچھا کرنے لگی۔ اس نے ہوائی اڈے تک اس کا پیچھا کیا۔ جب ڈاک کا جہاز ہوائی اڈے پہنچ گیا تو اڑن طشتری بھی اس کا پیچھا کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ وہ ہوائی اڈے پر چیل کوے کی طرح ۳ منٹ تک معلق رہی، اس کے بعد وہ تیزی سے پرواز کرتی ہوئی غائب ہوگئی۔ راڈار اسکوپ پر اس کی لکیر نمودار ہوئی، لیکن بعد میں غائب ہوگئی۔

سب سے زیادہ عجیب واقعہ ایک اور جہاز کے پائلیٹ کو پیش آیا۔ اس نے ایک دیوزاد اڑن طشتری دیکھی۔ اس کا قطر تقریباً دو میل تھا اور اونچائی ایک ۲۰۰ منزلہ عمارت کے برابر تھی۔ پہلے تو پائلیٹ نے سمجھا کہ یہ کوئی بادل ہے لیکن جب اس بادل نے جہاز کے ساتھ چلنا شروع کردیا تو پائلیٹ بھی شش و پنج میں پڑ گیا۔ فضا میں اتنی بڑی اڑن طشتری پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ اس طشتری سے سفید روشنی پھوٹ رہی تھی، کچھ دیر جہاز کے ساتھ چلنے کے بعد یہ طشتری بھی فضا میں غائب ہوگئی

اسپین کی کانفرنس ختم ہوئی تو ساری دنیا سے لوگوں نے اپنے مشاہدات اس کانفرنس کے صدر کو لکھے۔ روس میں اڑن طشتری دیکھی گئی تھی۔ جنوبی امریکہ کے ملک برازیل سے سب زیادہ خط آئے۔ وہاں کے ایک گاؤں کے رہنے والوں نے اڑن طشتری کو کئی بار پرواز کرتے دیکھا ہے۔ اس گاؤں کے مکھیا نے بتایا کہ اس نے ایک سفید شعلے کو اپنے کھیت سے گزرتے دیکھا ہے۔ اسے کئی لوگوں نے اس کے متعلق بتایا تھا، لیکن اس نے اس بات کو ان کا وہم سمجھا تھا، لیکن جب اس نے خود اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ آگ کا شعلہ اس کے کھیت سے تین گز اوپر اُڑ رہا تھا، گاؤں کا مکھیا بھی اس شعلے سے دُور نہیں تھا، وہ صرف دس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور گالوں پر چٹکی لی کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔

جب گاؤں کا مکھیا گھر پہنچا تو اس نے حکومت کو اپنی آنکھوں دیکھی رپورٹ لکھی۔ اس نے لکھا کہ اس گاؤں کے لوگوں نے اڑن طشتری کو کئی بار دیکھا ہے۔ نہ معلوم کیوں اڑن طشتری نے اس گاؤں کا انتخاب کیا ہے۔ ایک بار گاؤں والے ایک کھیت میں کھڑے تھے، کہ اڑن طشتری ان کے سر پر سے گزری۔ یہ اتنی نیچے اڑ رہی تھی کہ گاؤں کے ایک باشندے نے اپنا چاقو اس کی طرف پھینکا، چاقو اڑن طشتری کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا لیکن چاقو پھینکنے والے پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اس کی زبان بند ہوگئی، جسم اکڑ گیا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ کئی گھنٹے کی دوا دارو کے بعد اس کو ہوش آیا۔

اس دن کے واقعے کے بعد گاؤں والے اتنے خوف زدہ ہوگئے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر دوسری جگہ جانا چاہتے ہیں۔ اگر اڑن طشتری کی پرواز کا یہی حال رہا تو وہ دن دُور نہیں جب یہ گاؤں ویرانہ بن کر رہ جائے گا۔ ■■

برسات کی بھیگی راتوں میں

جب لہراتی ہے مست پون برسات کی بھیگی راتوں میں
یاد آتے ہیں پردیسی سجن برسات کی بھیگی راتوں میں

جب اُجڑی اُجڑی تنہائی روتی ہے لپٹ کر سینے سے
بڑھ جاتی ہے اور دل کی جلن برسات کی بھیگی راتوں میں

ہم ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے، تم نے کہا تھا پنگھٹ پر
یاد آتا ہے وہ بھولا وچن برسات کی بھیگی راتوں میں

جب دل کے سلگتے آنگن میں اشکوں کی شبنم گرتی ہے
کھو جاتے ہیں سب رنج و محن برسات کی بھیگی راتوں میں

دُھندلی دُھندلی، بھولی بسری کچھ یادیں بھٹکتی رہتی ہیں!
یاد آتا ہے جب اپنا وطن برسات کی بھیگی راتوں میں

رہ رہ کر یاد آتے ہیں وہ افسانے جن کو بھلانے کے
ہر ممکن ہم کرتے ہیں جتن برسات کی بھیگی راتوں میں

جو غم کی اندھیری راہوں میں یوں مجھ کو اکیلا چھوڑ گئی!!!
میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں وہ کرن برسات کی بھیگی راتوں میں

جھوم اُٹھتے ہیں عرفانؔ سب ہی لفظوں کے برستے قطروں پر
سجتی ہے جب محفلِ سخن برسات کی بھیگی راتوں میں

سکندر عرفانؔ کھنڈوی
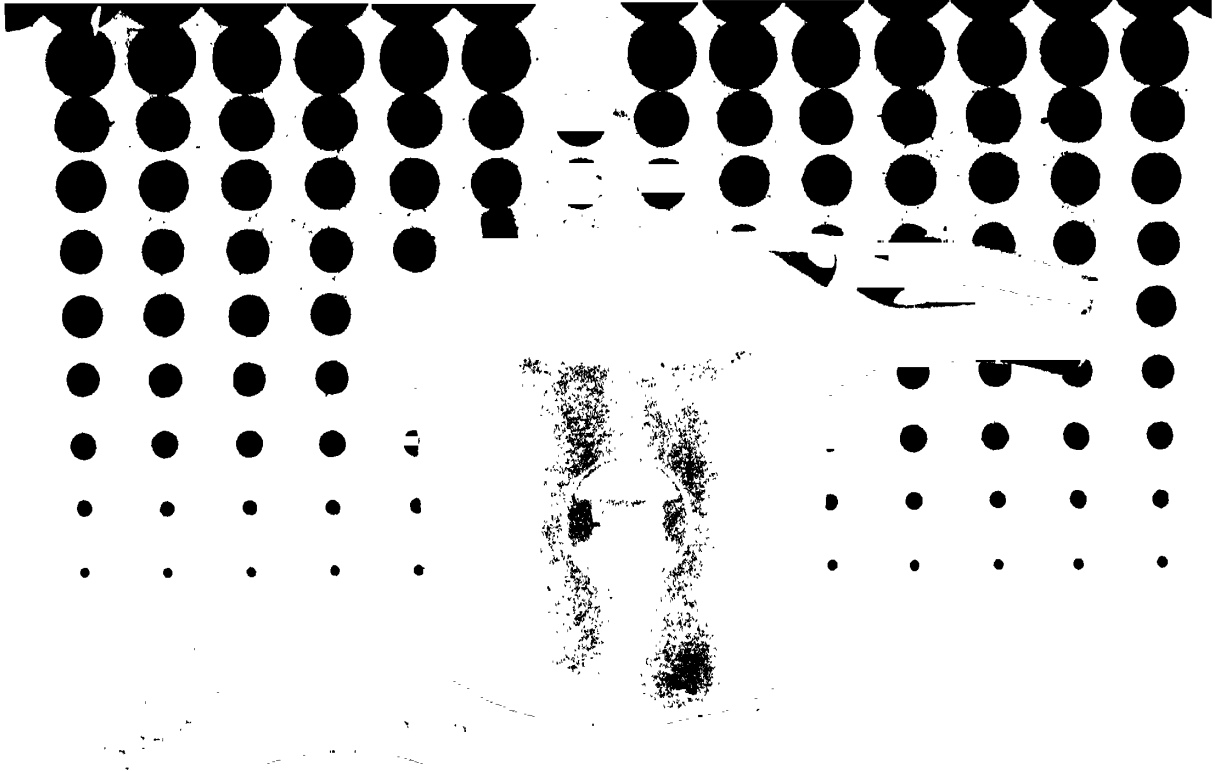
گیت

نینوں نے اب نیر بہانا چھوڑ دیا
ہونٹوں نے بپتا کا رونا چھوڑ دیا
سانسوں نے بھی آہیں بھرنا چھوڑ دیا
اب تو جیون میں کیول اُجیالے ہیں
ساجن آنے والے ہیں

اب پُروائی میرے من کو بھاتی ہے
مال بے چاری چین سے روٹی کھاتی ہے
میری چنتا نہ اُس کو تڑپاتی ہے
دل میں میرے اب نہ دُکھتے چھالے ہیں
ساجن آنے والے ہیں

کیسے کانٹے تھے برہا کے دن میں نے
دن اُنگلی پر جوڑے تھے گن گن میں نے
جوگ لیا تھا جیسی تیرے بن میں نے
اب ہاتھوں میں کنگن کان میں بالے ہیں
ساجن آنے والے ہیں

اب سکھیاں پوچھوں گی کیوں رے پانی
مجھ پر اپنی نظر یا کیوں ڈالی
دوں گی گن کے میں تجھ کو ستر گالی
دیکھوں کتنے تیرے یار جیالے ہیں
ساجن آنے والے ہیں

کل تڑکے جاؤں گی کھیت کے آنگن تک
بلٹ جو ہوں گی اُن کے گاؤں میں آنے تک
بھیگ چکے گی چُندری حال بتانے تک
روئیں گے یہ نین جو اب متوالے ہیں
ساجن آنے والے ہیں

سیف الرحمان عباؔ

ایثار

آر. شاہین

"عاصی! اے عاصی! دیکھو دلہن تیار ہوئی یا نہیں، اور تم کیا کر رہے ہو؟ انجو کہاں ہے؟ اسے بھیجو جلدی!" رابعہ بیگم نے ایک ہی سانس میں سب کو آوازیں لگائیں اور تیزی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ انہوں نے عاصم کو پھر آواز دی۔

"اوہ امی! ابھی بہت وقت ہے، مگر دیکھئے آپ کا بیٹا بالکل تیار ہے۔ اور یہ عورتیں؟ توبہ توبہ! کبھی جو وقت پر کوئی کام کریں۔"

"اچھا اچھا، کہہ چکا بک بک، اب جا دیکھ، دلہن اور انجو تیار ہو گئی ہوں تو جلدی بلا۔"

گھر میں سب خوش تھے۔ بھاگ دوڑ کل سے مچی ہوئی تھی اور آج تو کچھ عالم ہی اور تھا اور کیوں نہ ہو ایک ماں کا بیٹا، بہن بھائی کا لاڈلا چہیتا بھائی جو آیا تھا۔ نوکر مشین کی طرح بے آواز دوڑ دوڑ کر کام کر رہے تھے۔ ان کا شفیق و مہربان مالک جو آیا تھا۔ ثروی کے دل نے کہا "بیگم! وہ تیرا بھی تو کچھ ہے۔ کچھ کہاں، بہت کچھ، بلکہ سب کچھ۔"

"بھابی! بھابی!" انجو کی آواز نے ثروی کو سوچ سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل آئی اور پھر امی سے دعائیں لیتی وہ عاصم اور انجو کے ساتھ ایئرپورٹ کے لئے چل پڑی۔ راستے بھر وہ اسے چھیڑتے اور ہنساتے رہے اور وہ ان کا ساتھ دیتی رہی۔ کتنا چاہتے تھے وہ لوگ اسے۔ ساس، نند اور دلہا سب ہی تو اس کے چاہنے والے تھے۔ ایک دن کے لئے بھی وہ اپنے میکے میں نہیں رہ سکی تھی۔ میکے والے بلکہ ہر ملنے والی اس کی چاہت دیکھ دیکھ کر کہتے عزیز رشتہ دار سب کے سب اس پر بہت جلتے "خدا ثروی جیسی سسرال سب کی بیٹیوں کو دے" مگر آہ! امی کو اس سے پوچھنا کہ حقیقت کیا تھی۔

> یہ جملہ سیدھا اس کے دل کے پار ہو گیا۔ اور وہ جو بڑی دیر سے اپنے کو سنبھالے ہوئے تھی بکھر گئی۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ اور وہ روتے روتے نڈھال ہو گئی۔ ماں نے اس کے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا اور اسے تنہا چھوڑ دیا۔

ن نند اور دیور کی چاہت کو سب نے دیکھا
سراہا۔ مگر وہ ۔۔۔ جس سے وہ منسوب کی گئی تھی،
یا تھا؟ سب اس کے اپنے تھے، مگر وہ پھر بھی
تھی۔ کتنی ویران، کتنی شکستہ تھی اندر سے،
س کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ میکے والے
ور کی بات ہے، اس کے ساتھ ہر وقت رہنے
احساس، انجو اور عاصی جو حقیقتاً اس کا سایہ
رہتے تھے، وہ تک نہ جان سکے کہ ہر وقت قہقہے
رنے والی، دوسروں کو ہنسانے اور جینے کا سبق
نے والی یہ ہستی بذاتِ خود کیا ہے۔ اس کا ظاہر
کے باطن پر حاوی رہتا تھا۔ ایرپورٹ پہنچ کر
ظار کتنا جان لیوا ہوتا ہے، مگر اسے تو جیسے
ی سروکار ہی نہ تھا۔ وہ تو اس وقت چونکی جب
م اور انجو دوڑ کر نعمان سے لپٹ گئے۔ اس نے
نے خیالات کو جھٹکا اور دھیرے دھیرے ان کی
ف بڑھنے لگی۔ ادھر نعمان نے اسے دیکھا اور تیزی
اس کی طرف آئے۔

"کیسی ہو؟" نعمان نے اپنی مخصوص دھیمی
سکراہٹ سے اسے دیکھا۔ اُف! وہ آنکھیں جن
ڈوب جانے کی حد تک گہرائی تھی، اس کا بغور
ئزہ لے رہی تھیں۔ عاصی اور انجو گاڑی کی طرف
ر دئے نعمان نے دھیرے سے اس کا ہاتھ
تھام لیا اور چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ کر سکی۔ مگر
اتھ چلتے چلتے اس نے دھیرے سے ہاتھ کھینچ لیا۔
اڑی چونکہ مانی ہی ڈرائیو کر رہے تھے، اس لئے
جبوراً اسے آگے ان کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ اپنی بےبسی

اور مجبوری پر وہ تڑپ کر رہ گئی۔ مگر کچھ کر جانے
اسے ظاہر کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ تو سب
کچھ بھول جانے کی عادی تھی اور جھیل رہی تھی۔

گھر میں گویا بہار آ گئی۔ مانی کی شخصیت
ہی اس قدر دل چسپ تھی کہ ان کی صحبت میں
گھر والے، دوست، رشتے دار یہاں تک کہ
ملازم بھی لطف لیتے۔ مردانہ حسن کا مکمل شاہکار
سنجیدہ، ذہین نعمان اس کے ہوتے ہوئے بھی
اس کے نہ تھے۔ کس قدر بدنصیب تھی وہ۔
دن تو ہنستے مسکراتے، گھومتے پھرنے پتہ بھی نہ
چلتا۔ وہ اور مانی دونوں ہی نارمل رہتے، ہنستے
بات کرتے مگر رات ۔۔۔ اُف، رات کا تصور
ہی اس کے لئے کتنا روح فرسا تھا۔ رات اور
دن۔ کتنا فرق تھا دونوں میں! رات کو خاموش
خاموش مانی آتے۔ شرمندہ شرمندہ۔ بہت کم
بات کرتے۔ نہ جانے کب تک سگریٹ پھونکتے۔
وہ نہ جانے کب تک سوچتی اور پھر تھک کر دونوں
سو جاتے۔

ایک دن صبح سے ہی وہ پریشان تھی۔
طبیعت صبح ہی سے اداس تھی۔ ناشتے پر بھی اس
کی خاموشی کو سب نے محسوس کیا اور وہ سر درد
کا بہانہ کر کے کمرے میں آ گئی۔ وہ مستقل کھڑی
یہی سوچ رہی تھی کہ کب تک یہ زندگی یوں ہی
گزرے گی۔ کہیں وہ اس بناوٹ سے تھک
نہ جائے اور کہیں یہ بھرم ٹوٹ نہ جائے۔ یہی
خیالات نہ جانے کیوں اسے آج اس قدر اداس
کر رہے تھے۔ اتنے میں اس نے اپنے کندھے
پر بوجھ محسوس کیا اور تیزی سے مڑی "اوہ!"
وہ مانی سے ٹکرا گئی۔

ابھی وہ سنبھل ہی رہی تھی کہ انہوں نے
دوسرا ہاتھ بھی اس کے کندھے پر رکھ دیا۔
"کیا بات ہے؟ آج آپ صبح سے ہی کچھ پریشان
اور خاموش ہیں؟"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں"۔ اس
نے اپنے کاندھے چھڑاتے ہوئے کہا اور آگے
بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

مانی بھی اس کے سامنے بیٹھ گئے اور
اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اس نے
بیزاری سے انہیں دیکھا اور سختی سے اپنے
ہاتھ چھڑا لئے۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ آج مانی
اس قدر کیوں اس کے قریب آ رہے ہیں۔
کمرے میں آنے کے بعد تو وہ اس سے نظر بھی
کم ملاتے ہیں۔ آج اس طرح ......

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ نعمان کی آواز
نے اسے چونکا دیا۔ کتنا جدا انداز تھا ان کا
"ثوبی، ایک بات بتایئے۔ آخر یہ زندگی
کیسے گزرے گی؟"

"جیسے گزر رہی ہے۔"

"نہیں ثوبی، میری غلطی کی سزا خود کو
کیوں دے رہی ہو؟ میرا ضمیر مجھے جینے نہیں
دیتا۔ ثوبی، خدارا کچھ تو بتاؤ کہ میں کیا کروں۔
کس طرح اس غلطی کا ازالہ کروں۔ تمہیں گھٹتے
دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے سے نفرت ہونے لگتی
ہے۔ میری زندگی عذاب بن گئی ہے۔ آج تمہیں
فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ خدارا مان جاؤ۔ کیوں زندہ
درگور ہوتی جا رہی ہو؟"

> پھر صائمہ بھابی نے جو کچھ اسے بتایا۔ یا تو اسے اس کی پہلے سے توقع تھی۔ یا پھر اتنی صابر ہو چکی تھی کہ اس نے سب کچھ بڑے صبر و تحمل سے سنا۔ پھر اس نے اپنی گود میں صائمہ بھابی کے ڈالے ہوئے بچے کو دیکھا۔

کتنا دُکھ تھا ان کے لہجے میں مگر وہ
ی کیا کرے ؟ کیسے اپنے دل کو سمجھائے ؟
ں چاہتے تھے وہ ان کی بیوی بن کر ہی رہے،
ے سے اپنا حق مانگے، ان کے قریب رہے اور
ب سے بڑھ کر خوش رہے مگر وہ کیا کرتی ؟
ں کا دل کسی طرح اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔
وہ نعمان صاحب، مجھے آپ سے کوئی
شکایت نہیں پھر آپ کیوں یہ سب سوچتے ہیں
زرنے دیجئے جیسے گزر رہی ہے، مگر خدارا
ندہ اس قسم کا ذکر نہ کیجئے گا۔"

"ٹوبی، مجھے حیرت ہے کہ تم اس قدر
بر کر سکتی ہو مگر میں تو نہیں کر سکتیں"۔ انہوں
نے قدرے تلخی سے کہا۔

یہ جملہ سیدھا اس کے دل کے پار ہو گیا
ر وہ جو بڑی دیر سے اپنے کو سنبھالے ہوئے
ی بکھر گئی۔ ضبط کے سارے بندھن
ٹ گئے۔ اور وہ روتے روتے نڈھال ہو گئی
ں نے ان آنسوؤں کو بہہ جانے دیا اور اسے
ا چھوڑ دیا۔ اور وہ جو صابر تھی مضبوط تھی،
ں وقت اپنے آپ میں نہ تھی، ٹوٹ ٹوٹ کر
ر رہی تھی۔ اسے ارد گرد کا ہوش نہ تھا وہ تو
د تھا کہ گھر میں امی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور وہ
پر بہت کم آتی تھیں۔

مانی باہر بے چین و مضطرب تھے اور
ندر وہ بے قرار۔ اس نے سوچا کہ وہ کبھی رحم
ی بھیک قبول نہیں کرے گی۔ وہ ایسے ہی
ئے گی جیسے آج تک جی رہی تھی۔ وہ اسی فیصلہ
کار بند رہے گی جو اس نے پہلی رات کو
یا تھا۔

کہتے ہیں سہاگ رات زندگی کی حسین ترین
ت ہوا کرتی ہے۔ ٹوبی کی زندگی میں بھی یہ
رات آئی تھی، مگر کس قدر مختلف۔ جب مانی
نے گھونگھٹ اٹھایا تھا اور عام سے لہجے میں
جس میں ندامت کا رنگ صاف نظر آ رہا تھا،
کہا تھا "تم بلاشبہ حسین ہو ٹوبی، مگر ـــــ"
اور اس مگر کے بعد کی خاموشی کس قدر جان لیوا تھی
اس کا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا
اور مانی تھے کہ کچھ بول ہی نہیں رہے تھے اور پھر
جب بولے تو اسے تو گویا سکتہ ہو گیا۔ وہ الفاظ
تھے یا بم جو ایک دلہن پر گھونگھٹ اٹھتے ہی گرے
تھے۔ انہوں نے دھیرے دھیرے کہنا شروع
کیا تھا "ٹوبی، آپ میری بیوی ہیں میں آپ
کے حقوق کی ادائی میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ ہر
طرح آپ مجھے مخلص پائیں گی مگر آپ کو ایک
سمجھوتا کرنا ہوگا۔ میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

"ٹوبی نے سوچا یا اللہ یہ سب کیا ہے؟"
یہ ایسی کون سی بات منوانا چاہتے ہیں اور پھر
اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ وعدہ کر لیا۔
اس کے بعد نعمان نے جو کچھ کہا۔ کیا کیا کہا،
ٹوبی نے کچھ نہ سنا، سوا اس کے کہ وہ شادی شدہ
ہیں اور یہ شادی ان کے آتے ہی اتنی جلدی
میں ہوئی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی کسی سے کچھ نہ
کہہ سکے۔ بس اتنا ہی اس نے سنا تھا، پھر
اسے ہوش ہی کہاں تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو
کافی دیر پڑی وہ چھت کو تکتی رہی۔ ایک ایک
کر کے گھر والوں کے بشاش چہرے اسے
یاد آتے رہے۔ وہ روتی رہی اور پھر اس نے
ایک فیصلہ کیا کہ وہ نعمان سے جو بظاہر اس کے
شوہر ہوں گے کوئی واسطہ نہ رکھے گی۔ اور اس
فیصلے پر وہ مطمئن ہو گئی۔ پھر اس نے بکھرے وجود
کی کرچیاں سمیٹ کر یہ فیصلہ صبح ہوتے ہوئے
نعمان کو بھی سنا دیا۔ اور ان کے لاکھ سمجھانے پر
بھی وہ ایک انچ ادھر سے ادھر نہ ہوئی۔ مجبوراً
مانی بھی خاموش ہو گئے اور جب سے آج تک
دو سال کے طویل عرصے میں اس نے اپنے وعدے
کو نبھایا تو آج کیوں وہ بے بس ہو جائے؟ یہی
سب سوچتے سوچتے اس نے آج بھی نعمان کو
مطمئن کر دیا۔

ادھر نعمان سخت مایوس تھے ان کا دل
اس معصوم اور نازک سی لڑکی کے لئے بے طرح
دکھتا۔ کبھی سوچتے کہ انہوں نے کچھ نہ بتایا ہوتا
تو یہ کتنی خوش ہوتی۔ مگر اب کیا ہو؟ کیسے اس
لڑکی کو خوشیاں لوٹائیں؟ یہی سوچتے سوچتے
چھ ماہ گزر گئے۔ اور پھر اچانک ہی انہیں عذرا
(ان کی پہلی بیوی) کی طرف سے خط ملا۔ اور انہوں
نے دو ہی دن میں جانے کی تیاری کر لی۔ اور وہ
سب کو حیران چھوڑ کر پھر جا رہے تھے۔ وہ بھی حیران
تھی، اس پر نہیں کہ وہ جا رہے تھے، بلکہ اس پر کہ
وہ بہت خوش تھے اتنے خوش کہ ایک لمحے کو وہ
سوچ میں پڑ گئی۔

ڈیڈی کی طبیعت خراب تھی اور ٹوبیہ
میکے آئی ہوئی تھی۔ ایک دن عاصم نے آ کر اسے

بتایا ۔ بھائی جان آرہے ہیں؟

وہ پھر حیران رہ گئی۔ ابھی گئے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں۔ کُل بائیس اور وہ آ بھی رہے ہیں۔ مگر غاصم کے لاکھ کہنے پر بھی وہ انہیں لینے نہ گئی، کیونکہ ڈیڈی کی طبیعت خراب تھی اور یہ بہانہ اس کے لئے کافی تھا اتی نے بھی بہت اصرار کیا، مگر وہ نہ گئی۔ شام کو ہی نعمان آئے۔ آئے تھے تو ڈیڈی کو دیکھنے، مگر اسے لئے بغیر جانے کو تیار نہ تھے۔ بے حد خاموش، گُم سُم، وہ ان کے ساتھ چلی آئی۔ راستے بھر دونوں خاموش رہے۔ اس کا دل اندر ہی اندر ڈر رہا تھا یا اللہ! گئے تھے تو اس قدر خوش تھے اور آئے ہیں تو اس قدر اُداس۔ یا اللہ خیر۔ اور پھر وہ اسے گھر لے جانے کی بجائے صائمہ بھابی کے گھر لے گئے۔ یہ ان کے جگری دوست کی بیوی تھیں۔ ان لوگوں میں آپس میں بہت محبت تھی۔ وہ اسے بھابی کے پاس چھوڑ کر بغیر کچھ کہے واپس ہوگئے۔ اس نے بھابی سے دریافت کیا تو وہ اسے اندر لے گئیں۔

پھر صائمہ بھابی نے جو کچھ اسے بتایا، یا تو اسے اس کی پہلے سے توقع تھی یا پھر اتنی صابر ہو چکی تھی کہ اس نے سب کچھ بڑے صبر و تحمل سے سُنا۔ پھر اس نے اپنی گود میں صائمہ بھابی کے ڈالے ہوئے بچے کو دیکھا اور اپنے لاشعور میں چھپے ممتا کے جذبے سے مغلوب ہو کر اس معصوم اور بے تصور وجود کو سینے سے لگا لیا۔ بے اختیار ہو کر وہ اتنا روئی، اتنا روئی کہ بھابی کی آنکھیں بھی بے تحاشا برسنے لگیں۔ نانی کی اُداسی کا سبب اسے معلوم ہو گیا تھا۔ ان کی بیوی ایک معصوم نومولود بچہ ان کو سونپ کر خود چلی گئی تھی مگر اب اس وقت وہ کہاں تھے؟ یہ معلوم نہ ہو سکا۔ اس نے بھابی سے گھر فون کرایا کہ جیسے ہی مانی آئیں، انہیں ان تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد وہ مانی کا انتظار کرنے لگی۔

جب مانی کی گاڑی رات کے دس بجے گیٹ میں داخل ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ ثوبی ننھے کو سینے سے لگائے کاریڈور میں کھڑی بھابی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔

مانی اپنے کو اس وقت پاتال کی گہرائیوں میں محسوس کر رہے تھے اور وہ عظمت کی بلند و بالا میناروں کو چھوتی نظر آ رہی تھی۔ کس قدر عظیم تھی! اور خود وہ کیا تھے؟ وہ آگے بڑھے اور بے اختیار جُھک کر اس عظیم دیوی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔ اور یہ اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔

●●

نسخے

مہربانو

جلد کو سفید بنانے کے لئے دو کھیروں کا عرق۔ ایک چمچہ گلیسرین اور ایک چمچہ عرقِ گلاب۔ تمام چیزوں کو اچھی طرح ملا کر ایک شیشی میں رکھ لیں۔ اور دن میں مُونہہ دھونے سے پہلے لگائیں۔ اس سے ایک مہینے میں آپ کی جلد میں غیر معمولی تبدیلی آئے گی۔

●

جِلد کو صاف اور سفید کرنے کے لئے تازہ کریم ایک چمچہ۔ دُودھ ۲۵ ملی میٹر اور ایک لیمو کا عرق ذرا سا سِرکہ، ذرا سی پھٹکری ایک چمچہ چینی کالے کر ان سب چیزوں کو ملا کر تین منٹ تک پکائیں۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو چھان لیں۔ اور دن میں کئی مرتبہ مُونہہ پر لگا کر پانچ منٹ تک چھوڑ دیں پھر مُونہہ دھولیں۔

●

بالوں کو خوب صورت اور چمک دار رکھنے کے لئے ایک انڈا، ایک چمچہ زیتون کا تیل، ایک چمچہ گلیسرین، چند قطرے سرکے کو اچھی طرح ملا کر شیمپو کرنے کے بعد سر میں لگائیں پندرہ یا بیس منٹ بعد دھو ڈالیں۔

●

چہرے کی جُھریاں دُور کرنے کے لئے پھینٹی ہوئی انڈے کی سفیدی۔ عرق گلاب، پھٹکری کا پاؤڈر، سب کو اچھی طرح ملا کر تین چار مرتبہ روئی کے پھوئے سے مُونہہ پر لگائیں۔ پانچ منٹ بعد مُونہہ دھولیں۔

●

اگر آپ کی جِلد خشک ہے تو نہانے سے پہلے بادام کا تیل، عرق گلاب ملا کر نہانے سے پہلے بدن پر لگائیں۔

جے پور کے سابق مہاراجہ کے محل میں ۱۲۴ رانیاں تھیں!

ارشد حسین

دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ اہم رول مردوں نے ادا کئے ہیں، عورتیں سابق حکمرانوں کے محل کی زینت کے سوا کچھ نہیں تھیں تاہم خال خال ہی ایسی عورتوں کے قصے بھی ملتے ہیں جنہوں نے تاریخ میں کچھ عرصے کے لیے ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ روس کی کیتھرائن، فرانس کی جوزیفائن، انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ اوّل، ہندوستان کی رضیہ سلطان اور احمد نگر کی چاند بی بی نے اپنے دورِ حکومت میں یہ ثابت کر دیا کہ عورت کسی بھی صورت میں مرد سے کم دلیر اور بہادر نہیں ہے۔ مرہٹوں کے پیشوا باجی راؤ مستانی کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے۔ جے پور کے مہاراجہ جگت سنگھ رس کپور پر ایسے فدا ہوئے کہ انہوں نے اپنی آدھی حکومت اس کے نام کر دی۔ مہاراجہ کے درباری اس زیادتی پر چراغ پا ہو گئے اور بغاوت پر اتر آئے۔ اس شورش کا اثر یہ ہوا کہ رس کپور، جو جے پور کی ملکہ بننے کے خواب دیکھ رہی تھی، نہار گڑھ کے قلعہ میں قید کر دی گئی۔

جے پور کے دوسرے مہاراجہ سادھو سنگھ ثانی تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک نارمل قسم کے انسان تھے۔ لیکن بدقسمتی سے کسی وید یا حکیم نے انہیں مقوی دوا کھلا دی۔ اس جادو اثر دوا کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجہ معمولی آدمی سے پہلوان بن گئے۔ ان کی جسامت پہلے سے چوگنی ہو گئی۔ جے پور کے چندر محل میں ان کا لباس آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے انگرکھے میں چار آدمی سما سکتے ہیں۔

جسامت کے ساتھ مہاراج کی قوت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ان کے حرم میں ۱۲۴ رانیاں جمع ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ان گنت داشتائیں، جو پردایات اور پاسبان کہلاتی تھیں، ان کے حرم کی زینت بن گئیں۔ اس معاملے میں وہ ایک طرح کے سوشل ورکر بن گئے۔ اگر کسی محلے میں کوئی عورت بیوہ ہو جاتی یا کوئی عورت بدچلنی کی وجہ سے لوگوں کی ملامت کا نشانہ بن جاتی تو مہاراجہ ازراہِ کرم اُسے اپنے محل میں پناہ دے دیتے۔ اسی طرح جے پور کے محلے ان عورتوں کی ریشہ دوانیوں سے بچ گئے۔ ان عورتوں کی نگہداشت کا سارا بوجھ مہاراجہ نے اپنے بھاری کندھوں پر اٹھا لیا۔

محل کی زنانہ ڈیوڑھی کوئی معمولی پناہ گاہ نہیں تھی۔ ہر رانی یا داشتہ کے لئے بیسیوں ملازم تھے۔ ان کے دل بہلاوے کے لئے موسیقی کا انتظام تھا۔ غرض یہاں عیش و آرام کے سارے سامان مہیا تھے۔ کوئی پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا تھا۔ زنانہ ڈیوڑھی کی شہرت اتنی بڑھ گئی تھی کہ دوسری ریاستوں کے راجہ اپنے خاندان کی عورتوں کو وہاں بھیجنا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اس طرح وہ ایک تیر سے دو شکار کرتے تھے۔ کوئی رشتہ دار بیوہ ہو گئی یا کوئی چہیتی داشتہ نظر سے اتر گئی تو اس کی کشتی کیسے پار لگائی جائے؟ ایسے میں زنانی ڈیوڑھی ان کے کام آتی تھی۔ کسی کے یہاں لڑکیوں کی بھرمار ہوتی تو وہ بر تلاش کرنے اور جہیز مہیا کرنے کی بجائے ان میں سے کچھ لڑکیاں زنانہ ڈیوڑھی میں بھجوا دیتا۔ اس طرح اس بے چارے کا مسئلہ حل ہو جاتا۔

آزادی سے پہلے زنانہ ڈیوڑھی کی رونق دیکھنے کے لائق تھی، لیکن آزادی کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ راجاؤں مہاراجاؤں کا دور ختم ہوا اور اس کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔ حکومت بدلی تو نئی حکومت نے ازراہِ کرم زنانہ ڈیوڑھی کے مکینوں کو محل کی چار دیواری سے نجات دلائی۔ وہ محل کی قید سے رہا تو ہو گئیں مگر انہیں دنیا اور دنیا والوں کا کچھ تجربہ نہیں تھا۔ وہ باہر کی دنیا سے الگ تھلگ رہتی تھیں۔ دنیا والوں کی چھل کپٹ کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے انہیں سبز باغ دکھا کر ان کی جمع پونجی اور زیورات ہضم کر لئے

ان عورتوں کے لیے یہ ایک کاری چوٹ تھی۔ اب وہ کہاں جائیں اور کیا کریں۔ ناچار وہ پھر زنانہ ڈیوڑھی میں واپس آگئیں۔ انہوں نے مہاراجہ کا نمک کھایا تھا۔ برسوں ان کے محل میں زندگی گزاری تھی۔ انہوں نے مہاراجہ سے اپیل کی تو مہاراجہ ان کی دیکھ بھال کرنے پر راضی ہو گئے۔ صوبائی حکومت نے بھی مدد اور تعاون کا وعدہ کیا۔ اس طرح یہ عورتیں دنیا کی دھکم دھکا سے بچ گئیں۔ مہاراجہ اور حکومت نے ان کی زندگی تک ان کی دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری لے لی۔

اس واقعہ کو تیس پینتیس سال گزر چکے ہیں۔ زنانہ ڈیوڑھی اب اپنے مکینوں سے خالی ہے۔ لے دے کے صرف دو پردایات بچی ہیں، جن کو ۴۵۰ روپے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔ ان کی خادماؤں کو ۱۵۰ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ یہ تنخواہ بہت کم ہے۔ یہ عورتیں اچھے دنوں میں اس سے دگنا روپیہ روزانہ خرچ کرتی تھیں۔ پردایات کے لڑکوں کو آج بھی راجہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

زنانہ ڈیوڑھی میں دل بہلانے کے سارے سامان مہیا تھے۔ رام لیلا منائی جاتی تھی۔ تیوہاروں کے موقع پر خاص میلے منعقد ہوتے تھے۔ گھر میں شطرنج، چوسر، گنجفہ، دش گھاٹا اور تاش کی بازیاں جمتی تھیں۔ کوئی عورت موسیقی کی شوقین ہوتی تو اس کے لیے استاد کا انتظام ہوتا۔ غرض ہر دن عید ہوتا اور ہر رات شب برات۔ کوئی عورت یکسانیت سے بور نہ ہوتی۔ رات ہوتے ہی زنانہ ڈیوڑھی کے دروازے بند کر دیے جاتے۔ رات میں کسی کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔

چاندی کے دروازے والی زنانہ ڈیوڑھی آج بھی قائم ہے۔ مہاراجہ کے بیٹی پیلس کی مردانہ ڈیوڑھی سے ملحق ہے۔ زنانہ ڈیوڑھی کا رقبہ دو مربع کیلو میٹر ہے۔ اس کے نیچے سرنگیں ہیں۔ یہ سرنگیں ۴ کیلو میٹر لمبی ہیں۔ مہاراجہ جب زنانہ ڈیوڑھی میں تشریف لاتے تو ڈیوڑھی میں تہلکہ مچ جاتا۔ مہاراجہ کس پردایات پر مہربان ہوں گے، یہ بات راز میں رکھی جاتی تھی۔ محل کے سارے دروازے بند کر دیے جاتے۔ مہاراجہ سرنگ کے راستے زنانہ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے۔ محل کی ناکہ بندی سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ عورتوں میں حسد نہ پیدا ہونے پائے۔ مہاراجہ خاموشی سے اپنی منظور نظر کے محل میں داخل ہوتے اور صبح ہوتے ہی واپس سرنگ کے راستے اپنے محل میں پہنچ جاتے۔ زنانہ ڈیوڑھی میں بجلی اور نل کا انتظام نہیں تھا۔ پانی کا کنواں اور شمعیں کافی تھیں۔

آج زنانہ ڈیوڑھی میں ویرانی کا ڈیرا ہے۔ آخری پردایات کی موت کے بعد اس کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔

○○

ذہنی ورزش

انعام:
ایک سوان
پریشر کوکر

اپنی ذہانت کو آزمائیے، اپنی معلومات کا امتحان لیجیے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوان پریشر کوکر حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوتے تو انعام پانے والوں کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا۔ اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔

۱۵۔ ستمبر ۱۹۸۵ء تک ہمیں ملنے والے جوابات اِس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر ۹" ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۔ فارسی زبان کا سب سے پہلا شاعر کون تھا؟

۱۔ شہر بمبئی کا پُرانا نام کیا تھا؟

۲۔ آل انڈیا مسلم لیگ کس سنہ میں قائم ہوئی؟

۴۔ دنیا کا سب سے بڑا ہوائی اڈا کہاں ہے؟

۵۔ 'روشنی کے مینار' کا مصنف کون ہے؟

۶۔ چین میں کمیونسٹ حکومت کب قائم ہوئی؟

۷۔ اڑیسہ کی وزیر اعلیٰ ایک عورت تھی۔ اُس کا کیا نام تھا؟

۸۔ مغل بادشاہ بابر سے ماہم بیگم کی کیا رشتہ داری تھی؟

۹۔ یورپ کی سب سے اونچی چوٹی کا نام کیا ہے؟

۱۰۔ لکھنؤ سے دو بہنیں پاکستان چلی گئی تھیں۔ اُنہوں نے اُردو ادب میں خاص مقام حاصل کیا۔ اُن کے نام کیا ہیں؟

ذہنی ورزش نمبر ۹

(۱) ....
(۲) ....
(۳) ....
(۴) ....
(۵) ....
(۶) ....
(۷) ....
(۸) ....
(۹) ....
(۱۰) ....
نام: ....
پتہ: ....

نتیجہ: خیال اپنا اپنا

کیا عورتوں کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے؟

اس مقابلے کے لئے بھیجی ہوئی تحریروں میں روایت پرستی بھی جلوہ گر نظر آئی، روشن خیالی بھی۔ تاہم روشن خیالی کا پلڑا بھاری رہا۔ کشور سعید (نئی دہلی-۱۳) کی تحریر پہلے انعام (سو روپے) کی حق دار قرار دی گئی۔ نکہت فاطمہ (حیدر آباد-۲۳) کو دوسرا انعام (پچاس روپے) اور سروری عالم شاہ (کھمم، آندھرا) کو تیسرا انعام (تیس روپے) دیا جا رہا ہے۔ انعام پانے والی تحریریں یہاں شائع کی جا رہی ہیں۔

پہلا انعام:

سیاست کی باگ ڈور صدیوں سے مرد کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ خوں ریز جنگ۔ بغاوت۔ ملک گیری کی ہوس۔ ہوا اور سمندر میں لڑائی۔ زمین پر لڑائی۔ حتیٰ کہ سمندر کی تہہ میں بھی لڑائی جاری ہے۔ مرد نچلا نہیں بیٹھ سکتا اور نہ تھوڑے پر قناعت کر سکتا ہے۔ وہ زمین پر رہتے ہوئے آسمان کے خواب دیکھتا ہے، اپنے گھر میں رہتے ہوئے دوسروں کے گھروں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، جب کہ عورت کے پاؤں زمین پر ٹکے رہتے ہیں۔ مرد صنعت کار ہے تو عورت زراعت پسند۔ عورت حقیقت پسند ہے اور مرد خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ ہٹلر نے ساری دنیا میں قبضہ کرنے کا خواب دیکھا۔ نپولین نے بھی یہی خواب دیکھا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ان کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ اس دوران لاکھوں انسان تباہی کا شکار ہوئے وہ علیحدہ۔

عورت میں غصہ، تشدد اور ملک گیری کی ہوس نہیں ہوتی۔ اس کی نسوانیت اس امر کی دلیل ہوتی ہے۔ اگر وہ سیاست میں داخل ہو جائے تو عوام کو اپنے بچوں کا پیار دے سکتی ہے، ان سے اپنے بھائیوں کا سا سلوک کر سکتی ہے۔ عورت خون خرابے سے گھبراتی ہے، اس لئے سیاست میں حصہ لینے کے بعد وہ جنگ سے گریز کرتی ہے۔ عورت میں رحم کا مادہ مرد سے زیادہ ہے، اس لئے وہ انسان پر ظلم نہیں کر سکتی۔ اگر عورت سیاست میں حصہ لینا شروع کر دے تو دنیا کا نقشہ پلٹ سکتا ہے۔ وہ مرد کے تشدد کو لگام دے سکتی ہے۔ مرد کے غصے اور انتقام کے جذبے میں ٹھہراؤ آ سکتا ہے۔ ملک کا نظام بدل سکتا ہے۔ روپیہ بٹورنے کی ہوس اور بلیک مارکیٹ کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ عورت ایک ماں ہے اس لئے بچوں کی فلاح و بہبود کے قوانین پاس ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک بہن اور بیوی ہے، اس لئے عورت کی حفاظت کے قوانین پاس ہو سکتے ہیں۔ جہیز اور اس کی تباہ کاریوں سے نجات مل سکتی ہے۔ وہ ہتھیاروں کے کارخانوں کی بجائے زراعت پر توجہ دے گی۔ ملک کو غریبی سے نجات ملے گی۔ خوش حالی اور امن چین کا دور دورہ ہو گا۔ چور بازاری، رشوت، منافع خوری اور بلیک مارکیٹ کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ پھر لوگ بچوں کے دودھ کا پاؤڈر گودام میں بھر کر اس کی قیمت کو گراں کرنے کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے میری رائے میں دنیا میں امن، سکون اور شانتی لانے کے لئے عورت کو سیاست میں ضرور حصہ لینا چاہئے۔

کشور سعید، نئی دہلی ۱۳

دوسرا انعام:

عورت کو عام طور پر صنفِ نازک تصور کیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مرد کے مقابلے میں کم زور ہے۔ مرد کی صدیوں کی بالادستی نے اس خیال میں سچائی کا رنگ بھی بھر دیا ہے۔ مگر یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ تصویر کے دوسرے رُخ میں عورت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو کانچ کی چوڑیوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی، وہ وقت آنے پر تلوار اٹھا لیتی ہے۔ ماں، بہن اور بیوی کے روپ میں وہ دوسروں کا سہارا بنتی ہے۔ اسی طرح جب وہ سیاست کے افق پر ابھرتی ہے تو بلا امتیاز و تفریق انصاف کی شعاعیں ہر گھر میں داخل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

عورت کا سیاست میں حصہ لینا اس لئے بھی ضروری ہے کہ آج ہر طرف نفرت اور تشدد کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ انھیں پیار محبت کی ہوائیں ہی برسنے سے روک سکتی ہیں۔ چونکہ عورت فطری طور پر امن پسند ہوتی ہے اور اس کا دل دوسروں کو کسی تکلیف میں مبتلا دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ اس لئے عوام کے جذبات اور تکالیف کا بھرپور احساس کر کے وہ انہیں فوری دور کرنے کی جستجو کر سکتی ہے، جو ایک اچھے سیاست داں کی علامت ہے۔

آج عورتیں مہنگائی اور خود پر ہونے والے جا ظلم سے پریشان ہیں۔ اگر وہ سیاست کے میدان میں اُتر کر ان مسائل پر توجہ دیں تو ملک جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ جو عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ وہ سیاست سے قطعی نا واقف ہیں، پھر وہ کس طرح اس میں حصہ لے سکتی ہیں، انھیں یہ دیکھنا چاہئے کہ جس طرح دھنک میں ایک رنگ تدریجی طور پر دوسرے رنگ میں حل ہو جاتا ہے، اسی طرح عورتیں اپنی سوجھ بوجھ اور عقل و فہم سے سیاست میں حصہ لے کر سروجنی نائیڈو اور اندرا گاندھی کی طرح بلند حوصلوں کے ساتھ سیاست میں چٹان کی طرح جمی رہ سکتی ہیں۔ اپنے حقوق کی حفاظت اور پاک صاف حکومت قائم کرنے کے لئے عورت کا سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے۔

نکہت فاطمہ، حیدرآباد ۲۳

تیسرا انعام:

عورت پیدائشی سیاست داں ہوتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ سیاست مردوں نے عورتوں ہی سے سیکھی ہے۔ جہانگیر کی سلطنت کا سارا کاروبار نور جہاں کے دماغ کے بل بوتے پر چلتا تھا۔ رضیہ سلطانہ نے مردوں کے کارناموں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جھانسی کی رانی کی دلیری اور فراست نے ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کے دانت کھٹے کر دئے تھے۔ حالیہ مثال اندرا گاندھی کی ہے، جن کی سیاسی سوجھ بوجھ نے ساری دنیا میں اپنا لوہا منوا لیا تھا۔

ہندوستان سے ہٹ کر سری لنکا میں مسز بندرا نائیکے نے بھی اپنی کامیاب اور مقبول عوام سیاست کے جھنڈے گاڑ دئے تھے۔ برطانیہ کی وزیر اعظم مسز تھیچر بھی ساری دنیا میں اپنی سیاسی فراست کی دھوم مچائے ہوئے ہیں۔ اسرائیل میں بھی ایک خاتون وزیر اعظم مسز گولڈا مائر نے کامیاب حکومت کی تھی۔ عورت کا اپنا گھر ایک جیتی جاگتی چھوٹی سی سلطنت ہوتی ہے، جہاں فرماں بردار بھی ہوتے ہیں اور باغی بھی۔ مسئلے پیدا کرتے ہیں۔ گھریلو مسئلے کھڑے کرنے والوں کو سدھارنے کے لئے وہ حالات کے مطابق کبھی پیار، کبھی سختی سے کام لیتی ہے۔ شوہر، ساس، سسر، نند، دیور، بچوں، غرض ہر ایک سے وہ ایسی سوجھ بوجھ کے ساتھ پیش آتی ہے کہ اس کا گھر جنت بنا رہتا ہے۔ اگر یہی عورت سیاست کے میدان میں بھی اپنے قدم جما لے تو ایک جنت نشاں ملک کا حسین خواب حقیقت بن سکتا ہے۔

عورت میں ممتا ہوتی ہے اور ممتا کا تقاضا ہے کہ ہر ایک سے انصاف کیا جائے، اس لئے سیاست میں آنے کے بعد وہ یقیناً عوام کو بلا امتیاز انصاف دلائے گی۔ عورت سیاست میں اگر مرد کے دوش بدوش کام کرے تو مرد کے حوصلے بھی بلند ہو جاتے ہیں۔

سروری عالم شاہ، کھمم، آندھرا

ـنیہ صمد

وارڈ نمبر ۱۳۳

وہ سب آپریشن تھیٹر کے سامنے جمع تھے
ـیں ہوتا تھا کہ کس کا کس سے کیا رشتہ
ـسب کے چہروں پر ایک ہی جیسے جذبات
ـشی، خوف، انتظار، پریشانی۔ کبھی کوئی
ـسے سرگوشی میں کچھ کہہ دیتا۔
اتنے میں تھیٹر کا دروازہ کھلا اور لیڈی
ـاث دار آواز آئی۔ "مریضہ کے شوہر کون
ادھر آئیں۔" پھر ایک سفید سفاری سوٹ
ـل آدمی آگے بڑھا۔ کچھ دیر بات ہوئی۔ اس
ـہ واپس آکر اپنے لوگوں سے کچھ کہنے لگا۔
ـکے چہرے دھواں دھواں ہو گئے۔ ایک
ـی کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔

"جلدی فیصلہ کرو۔" ڈاکٹر کی آواز پھر گونجی۔
ان لوگوں میں بے چینی اور بڑھ گئی۔ رائے
مشورے اور تیزی سے ہونے لگے۔

وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے آخر
ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟
ڈاکٹر کہتی ہے کہ کافی عرصہ بعد بچہ ہو رہا
ہے اس لئے آپریشن ضروری ہے جیسا کہ وہ پہلے
بتا چکی تھی۔ وہ ہمارے داماد سے فارم پر دستخط
کرنے کے لئے کہہ رہی ہے۔" ایک خاتون یہ کہہ کر
بے تحاشہ رونے لگی۔

"ارے اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟
آج کل تو ایسے آپریشن بائیں ہاتھ کا کھیل
ہیں۔ ہمت کیجئے۔" کچھ عورتیں اپنے خاندان کی
مثالیں دے دے کر ان کی ہمت بڑھانے لگیں۔
داماد نے برق رفتاری سے دستخط کر دئے۔ پھر
بھی کسی کی بے چینی اور پریشانی میں فرق نہ آیا۔
مگر یہ پریشانی مریضہ کے لئے نہ تھی، بلکہ فکر تھی
تو یہ کہ مریضہ کی ساس کو کیا مونہہ دکھایا جائے
بقول اس خاتون کے، ساس اس نرسنگ ہوم
کی سخت مخالف تھیں اور اتفاق سے جس وقت
مریضہ کو یہاں لانے کی نوبت آئی تھی، وہ عید
کی شاپنگ کو گئی ہوئی تھیں۔
وقت پر لگا کر اڑتا۔ ایک سسٹر نے

تاریخ کا سب سے مغرور اور ظالم بادشاہ

مراقش کا سلطان مولے اسماعیل (۱۶۴۶ - ۱۷۲۷) اس یقین کے ساتھ کہ اس کے ہاتھوں مرنے والا کوئی بھی آدمی اعزاز حاصل کرے گا، ہمیشہ اپنے گھوڑے کی رکاب پکڑنے والے نوکر کا سر کاٹ کر شکریہ ادا کرتا۔ اس طرح اس بادشاہ نے ذاتی طور پر دس ہزار نوکروں کو قتل کر ڈالا۔

تھیٹر سے سر نکالا۔ "مبارک ہو، لڑکا ہوا ہے" اِس خوش خبری سے چہروں پر ذرا سکون نظر آیا مریضہ کو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

ایک دِن اچانک کچھ شور سا ہونے لگا۔ معلوم ہوا کہ آج وارڈ نمبر ۲۳ کی مریضہ ڈسچارج ہونے والی ہے۔ شور کچھ اور بڑھا سنے میں آیا کہ دادی آج پہلی بار پوتے کو دیکھنے اور بہو کو لے جانے آئی ہیں اور اس بات پر سخت ناراض ہیں کہ بہو کو کیوں اِس نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا۔ ابھی یہ نوسیکھے اپنا ہاتھ صاف کرنے کے لئے آپریشن کرتے ہیں یہاں اور تو اور پوتا ہوا بھی تو خالہ کی صورت کا۔"

"آٹھ سال بعد اللہ نے اولاد دی اور وہ بھی لڑکا اور آپ مسلسل ناراض ہو رہی ہیں" نانی نے کہا۔

"اور آٹھ سال بعد ہونے والے نواسے کی مونھ دکھائی میں نانی نے کیا کیا؟ اتنا بھی نہ ہو سکا کہ سونے کی باریک دو چوڑیاں ہی پہنا دیتیں۔"

"لڑکا اور چوڑیاں؟" نانی بلبلا اٹھیں۔ عجب رسم بتا رہی ہیں آپ۔ اگر معلوم ہوتا تو لالہ ڈ بازار سے دلہن کا جوڑا لا کر تہ پہنا دیتی۔ اتنے دِن بعد خبر لی۔ نہ اچھے میں نہ برے میں، اب آپ آئیں تو جی جلانے کی باتیں ہو رہی ہیں"

"تیرے سامنے میری یہ بے عزتی ہو رہی ہے اور تو چپ چاپ کھڑا ہے۔ کچھ بولتا کیوں نہیں؟" ساس رونے لگیں۔

"وہ کیا بولے گا۔ اسی کی مرضی سے تو اس کی بیوی کو اِس نرسنگ ہوم میں داخل کرایا ہے۔ ہم نے تو ... مرضی سے نہیں کیا"

"آپ لوگ نیچے آجائیے" داماد نے پہلی بار زبان کھولی۔ "ٹیکسی کھڑی ہے"

ماں کا اصرار تھا بیٹی میکے آئے گی، ساس کی ضد تھی بہو سسرال جائے گی اور یہ تو تو میں میں نہ جانے اور کتنی دیر ہوتی کہ ایک نرس نے (جو ریٹائرڈ ملٹری نرس تھی) پہلے تو دو چار بار وارننگ دی، پھر اس سے پہلے کہ سب لوگ کچھ سمجھتے اور سنبھلتے اس نے سب کے جوتے نیچے کمپاؤنڈ میں پھینک دئے۔ پھر تو وہ سب نیچے بھاگے، دیکھا تو ٹیکسی ندارد۔

قریب کھڑی ایک دایہ نے کہا "صاحب کہہ گئے ہیں کہ انہوں نے منت مانی تھی کہ گھر جانے سے پہلے وہ درگاہ پر حاضری دیں گے۔ یہ بھی کہا کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھر آجائیں۔"

دوسرے دِن جب ہم وارڈ نمبر ۲۳ کے پاس سے گزرے تو ایک خاتون دوسری خاتون سے کہہ رہی تھی۔ "قدرت کے معاملے میں آپ ہم، سب ہی تو بے بس ہیں۔"

"یہ سچ ہے، قدرت کے آگے ہم سب بے بس ہیں، مگر روایت بھی تو کوئی چیز ہے، میرے چاروں لڑکوں کے یہاں لڑکے ہوئے اور اب یہ چھوٹی بہو کے لڑکی ہوئی ہے تو آپ خود سوچئے میرے لڑکے کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا" دوسری خاتون نے جواب دیا۔

ہماری نظر بے اختیار کمرے میں گئی، جہاں بچی کا باپ، دنیا جہاں کی شفقت و محبت سے سرشار بچی کو ایک قیمتی خزانے کی طرح گود میں لئے مسکرائے جا رہا تھا۔

پھر ہم نہیں جانتے، یہ ازلی اور بین الاقوامی الجھن کس طرح سلجھی۔ ■■

عورت

میں ہر اک دَور کی زینت ہوں ہر اک شخص کا خواب

میں کہ بیوی بھی، بہن بھی ہوں تو ماں بھی ہوں میں
اور گذرے ہوتے لمحوں کا نشاں بھی ہوں میں
میری قربت نے سدا مرد کو لذت دی ہے
میری چاہت نے شہنشاہوں کو شہرت دی ہے
میں نے پیدا کئے اِس دھرتی پر اوتار بہت
مرد کے پیار نے بھی مجھ کو کیا خوار بہت
میں نے بخشا ہے ہر اک دَور کو جینے کا ہنر
رام کے ساتھ تھی بن باس میں بے خوف و خطر
میں نے فرہاد کو شہرت کی بلندی بخشی
میں نے مجنوں کو بھی تو صحرا نوردی بخشی
میں نے ہر دَور کی تاریخ کو دی رعنائی
شکنتلا بنی، زلیخا کبھی ممتاز بنی
میں نے ہی نورجہاں بن کے دیا درسِ وفا
ہیر بن کے بھی جو آئی تو ترا ساتھ دیا
میں نے ہی مرد کے ہر درد کو اپنا سمجھا
کہیں شوہر کہیں بھائی کہیں بیٹا سمجھا
جنگ میں فتح کی میں نے ہی دُعا بھی کی ہے
جس کا ثانی نہ ملے ایسی وفا بھی کی ہے
میں نے نفرت کے چراغوں کو بجھایا اکثر
مرد کو پیار کا احساس دِلایا اکثر
ہر کڑی دھوپ میں سایہ کی طرح ساتھ چلی
مرد کی ذات سے منسوب مِری ذات رہی
تین ہی جملوں میں بس ہو کے پرائی میں نے
سلطنت اپنی جوانی کی لُٹائی میں نے
میں پتی ورتا ستی بھی تو ہوئی ہوں اکثر
میں نے خود اپنی تباہی کے بھی دیکھے منظر
اپنی شِریانوں کا خوں جس کو پلایا میں نے
اُس نے ہی رونقِ بازار بنایا مجھ کو
میں نے ممتا کے گھنے سائے میں پالا جس کو
صرف دولت کے لئے اُس نے نچایا مجھ کو

ڈاکٹر انور حسین انور

سُہاگن

جِھلملاتی ہے مانگ میں افشاں
ہیں حِنائی ہتھیلیاں میری   مرمریں ہیں کلائیاں میری
خوبرو جسم حُسن کا ہے نشاں

ہونٹ ہر وقت مُسکراتے ہیں
چہرہ ہر دَم دمکتا رہتا ہے   حُسن جیسے چھلکتا رہتا ہے
میرے انداز سب کو بھاتے ہیں

کتنی دلکش مری کہانی ہے
کتنی دلچسپ داستاں ہے مری   زیست کس درجہ ضو فشاں ہے مری
مثلِ کُندن مری جوانی ہے

چاند جس میں اُگیں وہ آنگن ہوں
کل میں کچھ بھی نہ تھی اب سُہاگن ہوں

حضور سہسوانی

تبسم
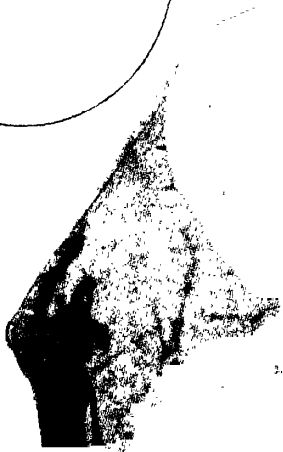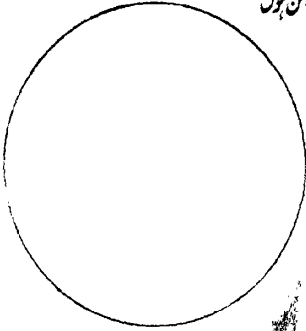
"تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ ظفر ریحانہ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"
"اس کے تحفے دیکھ کر۔"
"تحفے دیکھ کر؟"
"ہاں۔ وہ ریحانہ کو ایسے تحفے پیش کرتا ہے جنہیں عرصۂ دراز تک گھر میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

●

"تمہاری بیوی بولتی بہت ہے۔ میں تو گھبرا گیا ہوں تم اس کے ساتھ کیسے گزارہ کرتے ہو؟ میں ہوتا تو ایک دن بھی گزارہ نہیں کر سکتا تھا ایسی عورت کے ساتھ، مجھے تم پر حیرت ہوتی ہے۔"
"ہاں دوست، تم سچ کہتے ہو۔ ویسے تم مجھ پر نہیں، اس روٹی پر حیرت کرو جو اب تک مجھ کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔"

●

لڑکیاں زبردستی نانی اماں کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والا ہاکی میچ دکھلانے لے گئیں۔
کھیل شروع ہوا تو دیر تک نانی اماں کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔
"دیکھو نانی اماں! ایک لڑکی نے سمجھانے کی کوشش کی۔" کھیل کا مقصد یہ ہے کہ کسی ایک گول میں ۔۔۔ وہ جو دونوں طرف جال لگے ہیں، وہی گول کہلاتے ہیں۔ ہاں، تو کسی ایک گول میں گیند ڈال دی جائے۔"
"یہ کام تو بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔" نانی اماں نے کہا۔ "بشرطیکہ لوگ خواہ مخواہ بیچ میں آ کر راستہ روکنا بند کر دیں۔"

●

ایک نجومی نے ایک شخص سے کہا۔ "آپ کا قسمت کا ستارہ بلند ہے۔ عنقریب آپ کے گھر میں ایک بڑی رقم آنے والی ہے کیا آپ نے لاٹری یا سٹہ لگایا ہے ذرا سوچئے۔"
وہ شخص بولا۔ "لاٹری یا سٹہ تو نہیں، ہاں ابھی چند دن ہوئے میں نے پچاس ہزار روپے کا اپنی زندگی کا بیمہ ضرور کرایا ہے۔"

●

انسپکٹر نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے کسی شخص کی آواز آئی۔ "انسپکٹر صاحب! میری کار کی اسٹیئرنگ وہیل، بریک، پیڈل ایکسی لیریٹر اور ڈیش بورڈ غائب ہو گئے ہیں، جلد آئیے۔"
ابھی پولیس انسپکٹر روانہ ہونے والا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اس شخص کی آواز آئی۔ "معاف کیجئے، انسپکٹر صاحب میں غلطی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔"

●

دو شرابی آپس میں تکرار کر رہے تھے
پہلے نے کہا۔ "میں کچھ ہی دن میں بھارت کا پردھان منتری بن جاؤں گا۔"
دوسرا بولا۔ "اے مسٹر، تم ابھی پردھان منتری نہیں بن سکتے۔"
پہلے شرابی نے کہا۔ "تم دیکھتے ہی رہ جاؤ گے اور میں پردھان منتری بن بھی جاؤں گا۔"
دوسرے نے غصے میں آ کر کہا۔ "جب تک میں استعفیٰ نہ دوں گا، تم پردھان منتری نہیں بن سکتے۔"

●

ایک صاحب اپنے بیٹے کو فرصت کے وقت میں پڑھا رہے تھے۔ اچانک انہیں کلاک کا خیال آیا کہ وہ چل رہا ہے یا نہیں۔
انہوں نے اپنے بیٹے کو دوسرے کمرے میں بھیجا اور کہا۔ "ذرا دیکھ کر آؤ کہ کلاک چل رہا ہے یا نہیں؟"
تھوڑی دیر بعد لڑکے نے واپس آ کر کہا "ابا جان، چل تو نہیں رہا ہے، ہاں دُم ضرور ہلا رہا ہے۔"

●

خود بھی ہنسئے، دوسروں کو بھی ہنسائیے۔ نئے نئے، مزے دار چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجئے۔ پرانے گھسے پٹے، بار بار سنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجئے، کیوں کہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

بانو نسیمہ، دہلی

مشرقی افریقہ کے ساحل پر تنزانیہ ایک آزاد ملک ہے۔ یہ ملک ۱۹۶۰ میں انگریزوں کے قبضے سے آزاد ہوا تھا۔ آج سے ۱۰۰ برس قبل مسقط کے عرب وہاں آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے وہاں اپنا پایۂ تخت بنایا اور اس کا نام دارالسلام رکھا۔ ابھی انہیں وہاں قبضہ کئے ۴۰ سال بھی نہ گزرے تھے کہ جرمن بحریہ کے ایک افسر نے یہ علاقہ ان سے چھین لیا۔ جرمن قبضے کے دوران یہ علاقہ ٹانگا نیکا کہلاتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران انگریزوں نے یہ علاقہ جرمنی سے چھین لیا۔ ٹانگا نیکا سے کچھ دور سمندر میں ایک جزیرہ ہے جس کا نام زنجبار ہے۔ یہاں عربوں کی حکومت قائم رہی۔ زنجبار کے سلطان انگریزوں کے جھنڈے تلے حکومت کرتے رہے۔ ۱۹۶۰ میں وہاں بغاوت ہو گئی۔ سلطان نے وہاں سے فرار ہو کر لندن میں پناہ لی۔ زنجبار کا زان اور ٹانگا نیکا کا تان ملا کر ایک نیا ملک وجود میں آیا اور اس کا نام تنزانیہ پڑ گیا۔

نفیسہ خواجہ تنزانیہ میں چار سال رہیں۔ ان کے شوہر خواجہ عبدالخالق وہاں سیکنڈ سیکریٹری تھے۔ ان کا تعلق پریس انفارمیشن سے تھا۔ نفیسہ کو تنزانیہ بہت پسند آیا۔ اس کی راجدھانی دارالسلام ایک خوب صورت شہر ہے۔ اس کی آبادی بھی گنجان نہیں ہے۔ آٹھ لاکھ باشندوں کا یہ شہر کشادہ سڑکوں اور خوب صورت مکانوں کے لئے مشہور ہے۔ تنزانیہ ایک زراعتی ملک ہے۔ ۱۰۰ برس پہلے عربوں نے وہاں لونگ کی کاشت کی۔ لونگ کو یہ زمین بہت راس آئی آج دنیا کی ۸۰ فی صد لونگ تنزانیہ میں پیدا ہوتی ہے۔

نفیسہ کو تنزانیہ میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ وہاں تقریباً ۵۰ ہزار ہندوستانی آباد ہیں، جن میں زیادہ تر گجراتی اور کچھی ہیں۔ آغا خانی اور اثنا عشری بھی کافی تعداد میں ہیں۔ یہ لوگ وہاں کی تجارت پر قابض ہیں۔

چند سال پہلے تنزانیہ کے پڑوسی ملک یوگنڈا میں ہندوستانیوں کے خلاف مہم شروع ہوئی تھی۔ اس مہم کے سربراہ وہاں کے صدر عیدی امین تھے۔ انہوں نے ہندوستانیوں کو حکم دیا کہ وہ ۹۰ دن میں یوگنڈا کو خالی کر دیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی پریشان ہو گئے۔ آخر وہ ۹۰ دن میں اپنے کارخانے، دکان، مکان کس طرح فروخت کریں؟ لیکن حکمِ حاکم مرگِ مناجات۔ اس افراتفری میں انہیں جو کچھ مل سکا اسی کو لے کر انہوں نے یوگنڈا کو خیر باد کہہ دیا لیکن اس کے بعد یوگنڈا کی معاشی حالت خراب ہو گئی۔ پڑوس کے ملک کینیا میں بھی ہندوستانی آباد ہیں۔ ان کا بھی تجارت پر قبضہ ہے۔ لیکن کینیا اور تنزانیہ نے ہندوستانیوں کو نکالنے کی کوشش نہیں کی۔

نفیسہ نے تنزانیہ میں جو کچھ دیکھا اس میں سب سے تعجب انگیز بات وہاں کی جنسی آزادی ہے۔

اس میں مسلمان اور عیسائی کی قید نہیں۔ تنزانیہ میں مسلمانوں کی آبادی لگ بھگ ۴۰ فی صد ہے زنجبار میں تقریباً ۹۰ فی صد لیکن وہاں کا کلچر مشترک ہے۔

مسلمان شادی کے لیے مسجد کا انتخاب کرتے ہیں مسجد میسر نہ ہو تو گرجا میں بھی نکاح کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ مسلمان اور عیسائی میں شادی عام ہے۔ اگر مسلمان لڑکا یا لڑکی عیسائی سے شادی کر لے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض اوقات سرے سے شادی ہی نہیں ہوتی اور لڑکا لڑکی یوں ہی ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ ماں باپ اس بات کا برا نہیں مانتے۔ اس ضمن میں نفیسہ کو ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ ایک بار خواجہ عبدالخالق کو سفارت خانے کے لیے ایک ملازم کی ضرورت پڑی۔ ملازمت کی امیدواروں میں ایک مسلمان لڑکی بھی تھی۔ فارم میں ایک خانہ بچوں کے لیے تھا۔ اس میں لڑکی نے دو بچے لکھے تھے۔ شادی کے خانے میں اس نے لکھا تھا: غیر شادی شدہ۔ خواجہ عبدالخالق کو پہلے تو بہت تعجب ہوا کہ لڑکی نے کس دلیری اور صفائی سے فارم پُر کر دیا۔ لیکن بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ تنزانیہ میں لڑکی کی پیدائش پر ماں باپ اداس نہیں ہوتے۔ انہیں لڑکی کے لیے لڑکا ڈھونڈنے اور اس کی مانگیں پوری کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لڑکی خود لڑکا ڈھونڈ لیتی ہے۔ غرض وہاں لڑکی کی شادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

دوسری بات جس نے نفیسہ کو بہت متاثر کیا وہ وہاں کی مذہبی رواداری ہے۔ وہاں فرقہ وارانہ فساد کا نام و نشان نہیں ہے۔ مسلمان اور عیسائی بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے آتا ہے کہ ایک خاندان میں بھائی مسلمان ہے اور بہن نے عیسائیت قبول کر لی۔ عیسائیوں اور مسلمانوں میں شادی عام ہے۔ اس کے ساتھ وہ دوسرے کے مذہب کا احترام بھی تنزانیہ کے

تنزانیہ میں تعلیم مفت ہے۔ ابتدائی کلاس کی تعلیم جبری اور مفت ہے۔ اس کے بعد امتحان ہوتے ہیں اور ذہین بچے کو سیکنڈری اسکول میں داخلہ مل جاتا ہے۔ یہاں بھی تعلیم مفت ہے۔ اس کے چار سال بعد یونیورسٹی کا نمبر آتا ہے۔

لوگوں کے ضمیر میں شامل ہے۔ رمضان کے مہینے میں عیسائی شراب پینا چھوڑ دیتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں نفیسہ کی ملاقات ایک عیسائی سے ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ روزے سے ہے۔ نفیسہ کو تعجب ہوا کہ وہ عیسائی ہو کر روزہ رکھ رہا ہے۔ اس نے بتایا "میری بیوی مسلمان ہے۔ وہ روزہ رکھتی ہے تو میں بھی اس کا ساتھ دیتا ہوں"

تنزانیہ میں تعلیم مفت ہے۔ ابتدائی کلاس کی تعلیم جبری اور مفت ہے اس کے بعد امتحان ہوتے ہیں اور ذہین بچے کو سیکنڈری اسکول میں داخلہ مل جاتا ہے۔ یہاں بھی تعلیم مفت ہے۔ اس کے ۴ سال بعد یونیورسٹی کا نمبر آتا ہے۔ ذہین بچوں کا انتخاب ہوتا ہے اور انہیں یونیورسٹی میں داخلہ مل جاتا ہے، جہاں نہ صرف تعلیم مفت ہے، بلکہ ساتھ میں وظیفہ بھی ملتا ہے۔ تعلیم ہر اسٹیج پر مخلوط ہے۔ لڑکے لڑکیوں کے اسکول اور کالج الگ الگ نہیں ہوتے۔

نفیسہ تنزانیہ میں ۴ سال رہیں۔ ابتدا میں انہیں یہ ملک بہت سستا نظر آیا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہاں چیزوں کی قیمت آسمان کو چھونے لگی۔ وہاں زیادہ تر چیزیں درآمد کی جاتی ہیں۔ نفیسہ کو اس مہنگائی نے اس لیے متاثر نہیں کیا کہ سفارت خانہ بغیر ڈیوٹی ادا کیے بیرون ملک سے جو چاہے منگوا سکتا ہے۔ لیکن وہاں لوگوں کے بیان سے مہنگائی کی رفتار کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ شروع میں مکھن ۲۵ روپے کیلو تھا، پھر ۱۲۵ روپے کیلو ہو گیا۔ اب سننے میں آتا ہے کہ یہ ۵۰۰ روپے کیلو ہو گیا ہے۔ دراصل افریقی بہت سادہ ہوتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کی طرح تجارت کے گُر نہیں جانتے اور نہ ان کی طرح اپنی سات پشتوں کے لیے پیسہ جوڑتے ہیں۔ ان کی زندگی، طرۂ امتیاز توکل ہے۔ وہ آج کے لیے جیتے ہیں، کل کی فکر نہیں کرتے۔

افریقہ کے لوگوں کی سادہ دلی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار وہاں کسی افریقی کے پاس بادام کی بوریاں پہنچ گئیں۔ اس نے زندگی میں کبھی پستہ، بادام کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ وہ حیران تھا کہ انہیں کس دام پر فروخت کرے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ۱ روپے کیلو مناسب قیمت ہے۔ ہندوستانیوں نے جب بادام کو چنے کے بھاؤ فروخت ہوتے دیکھا تو وہاں لائن لگ گئی۔ ہندوستانی سارا مال خرید کر لے گئے۔ تب اس افریقی کو معلوم ہوا کہ اس نے سونے کو پیتل کے دام فروخت کر دیا ہے۔

نفیسہ خواجہ تنزانیہ میں ۴ سال گزارنے کے بعد ہندوستان آ گئیں اس کے بعد خواجہ عبدالخالق کا تبادلہ مسقط ہو گیا۔ وہ آج کل مسقط میں مقیم ہیں۔ خواجہ عبدالخالق ریٹائر ہونے والے ہیں اس لئے یہ تبادلہ غالباً آخری ہے۔

نفیسہ کی پیدائش لکھنؤ کی ہے۔ ان کے خاوند کا تعلق دریا باد (ضلع بارہ بنکی) سے ہے۔ ان کے والد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم لامارٹینیر لکھنؤ میں ہوئی۔ پھر کرامت حسین اسکول اور کرامت حسین گرلز کالج سے انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۶۰ میں ان کی شادی خواجہ عبدالخالق سے ہو گئی۔ خواجہ صاحب کا تعلق کانپور سے ہے۔ ان کے دو بچے ہیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ شادی کے بعد وہ چند سال کلکتہ رہیں، پھر دلی میں بس گئیں، جہاں خواجہ عبدالخالق پریس انفارمیشن میں کام کرتے تھے۔ ○○

رفعت پروین

دولہا کے بازار بھاؤ

آج کل جہیز کی رسم پر اخبارات میں خوب لے دے ہو رہی ہے۔ جہیز پر قانونی پابندی نافذ ہے۔ جہیز مانگنے والوں کو قید اور جرمانہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جہیز کی رسم ہندوستانیوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے حکومت لاکھ قانون بنالے جہیز کی رسم پر قابو نہیں پا سکتی۔ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے، جسے قانون کی مدد سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ ہم آئے دن نئی نویلی دلہنوں کے جلانے کی خبریں پڑھتے ہیں۔ بہو کو جہیز کی رقم نہ لانے پر مار ڈالنے کی حرکت کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ روایت برسوں سے چلی آ رہی ہے۔ آج کل عورتوں کے ادارے اور اخبارات نے اس موضوع کو اہم بنا دیا ہے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ واقعات صرف آج کے ہندوستان میں پیش آ رہے ہیں۔ یہ پبلسٹی اخبارات کی دین ہے۔

ہندو سماج میں عورت کی ترکے سے محرومی جہیز مانگنے کی رسم کی بنیاد ہے۔ لڑکی کو باپ کے ترکے سے ایک پائی بھی نہیں ملتی تھی۔ بیوی کو خاوند کے ورثہ سے کچھ نہیں ملتا تھا۔ بیٹے کے ترکے سے ماں کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ عورت زندگی کے ہر اسٹیج میں مرد کی محتاج تھی۔ جب عورت کو باپ کی موت کے بعد کچھ نہیں مل سکتا تو قدرتی طور پر لڑکی کی سسرال والے باپ کی زندگی میں ہی جہیز کے نام پر رقم وصول کر لیتے تھے۔ یہ کنیا دان کہلاتا تھا۔ اگر ورثہ میں لڑکی کا حصّہ ہوتا تو عین ممکن ہے کہ جہیز وصول کرنے کی نوبت پیش نہ آتی۔ حکومت نے اس بات کو مدِ نظر رکھ کر ایک قانون بنایا جس کی رو سے باپ کی موت کے بعد لڑکی کو لڑکے کے برابر حصّہ مل سکتا ہے۔ لیکن اس قانون میں ایک ڈھیل چھوڑ دی گئی۔ اگر باپ زندگی میں یہ وصیّت لکھ دے کہ میری موت کے بعد میری تمام دولت کا حق دار میرا لڑکا ہوگا۔ تو اس وصیّت کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا یعنی بات وہیں رہی۔ اس لئے جہیز کی رسم بھی جوں کی توں برقرار رہی۔

جہیز مانگنے کی رسم ہندوستان کی تقریباً ہر ریاست میں رائج ہے۔ لیکن جو بات بہار میں ہے وہ کہیں نہیں۔ یہاں لڑکی کے پیدا ہوتے ہی باپ کے سر پر جہیز جمع کرنے کی فکر سوار ہو جاتی ہے وہ اس کی پیدائش سے ہی روپیہ جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اتر پردیش، بہار، راجستھان اور ہریانہ میں باپ جہیز کی رقم ادا کرنے سے آنکھ چراتے ہیں جس کا نتیجہ ان لڑکیوں کو بھگتنا پڑتا ہے بعض لوگ آدھی رقم دے کر باقی بعد میں ادا کرنے کا

وعدہ کر لیتے ہیں۔ یہ رقم ادا نہ ہو تو پھر بیٹی کی مصیبت آجاتی ہے۔ بہار کے والدین اس معاملے میں وعدے اور حساب کے پکے ہیں۔ اسی لئے بہار میں دُلہنوں کے جلانے کے واقعات دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کم پیش آتے ہیں۔

بہار میں بھومی ہار زمیں داروں کی کثرت ہے۔ یہ ذات بہار کے سوا ہندوستان کی کسی ریاست میں نظر نہیں آتی۔ یہ لوگ بے شمار اراضی کے مالک ہیں۔ ان کے بعد راجپوتوں کا نمبر آتا ہے لیکن یہ لوگ دولت میں بھومی ہاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جہیز کی رقم ادا کرنے میں بھومی ہاروں کا ثانی نہیں مل سکتا۔ جب بھومی ہار لڑکوں کی بولی لگتی ہے تو ان کے دام سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک آئی اے ایس لڑکے کو ۱۰ لاکھ روپے کی مالیت کا مکان اور زیورات جہیز میں ملے۔ ایک دوسرے آئی اے ایس لڑکے کا باپ ۴۰ لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اسے پوری امید ہے کہ اسے مطلوبہ رقم مل جائے گی جس لڑکی سے ۴۰ لاکھ روپے طلب کیا جا رہا ہے، اس نے امریکہ میں تعلیم پائی ہے۔ پٹنہ میں ایک شادی طے ہوئی جس کے لئے شہر میں ایک سجا سجایا فلیٹ، ایک قطعۂ اراضی جس کی قیمت ۱۴ لاکھ روپیہ ہے [illegible] نقد جہیز میں دیا گیا۔ [illegible] لڑکوں کی قیمت بھی [illegible]

نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن اب افسر انجینیر اور ڈاکٹر کی قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

راجپوت مالی حیثیت میں بھومی ہاروں سے پیچھے ہیں، لیکن جہیز کے معاملے میں ان سے دو ہاتھ آگے ہیں۔ حال ہی میں ایک راجپوت آئی پی ایس لڑکے نے نقد اور زیور کی شکل میں ۳۰ لاکھ روپیہ حاصل کیا۔ دراصل ابتدا میں جہیز کی رقم ۱۰ لاکھ طے ہوئی تھی۔ جہیز میں کار، ٹیلی ویژن، وی سی آر اور فرنیچر شامل تھا۔ مسہری کا سائز ذرا بڑا تھا۔ دولہا کی بہنوں نے کہا کہ اگر یہ مسہری

> عورت زندگی کے ہر اسٹیج میں مرد کی محتاج تھی جب عورت کو باپ کی موت کے بعد کچھ نہیں مل سکتا تو قدرتی طور پر لڑکی کی سسرال والے باپ کی زندگی میں ہی جہیز کے نام پر رقم وصول کر لیتے تھے۔ یہ کنیا دان کہلاتا تھا۔

بیڈ روم میں رکھی گئی تو کمرہ میں گھٹن پیدا ہو جائے گی۔ لڑکی کے باپ نے کہا کہ وہ بیڈ روم میں ایر کنڈیشنر لگوا دے گا۔ لڑکیوں نے اعتراض کیا کہ آج کل بجلی کی کمی ہے۔ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ایر کنڈیشنر بے کار ہو جائے گا۔ لڑکی کا باپ ہار ماننے والا نہیں تھا اس نے کہا کہ وہ کمرے میں ایک جنریٹر لگوا دے گا۔ لڑکیوں نے کہا کہ کمرے میں جنریٹر رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ لڑکی کے [illegible] نے کہا [illegible] کو نیا مکان [illegible] ایر کنڈیشنر [illegible]

کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس معاملہ میں لڑکے کے باپ نے مداخلت کی۔ اس نے لڑکی کے باپ کی تجویز مان لی۔ اس کا مشورہ صرف اتنا تھا کہ یہ مکان اس کے اپنے مکان کی چھت پر تعمیر ہو۔

گزشتہ سال ایک آئی اے ایس لڑکا ۵ لاکھ روپے میں فروخت ہوا۔ یہ روپیہ نقد دیا گیا۔ زیور، ایر کنڈیشنر، ٹیلی ویژن، وی سی آر، کار اور فریج اس کے علاوہ ہیں۔ نقد روپیہ لڑکے کے باپ کو ملتا ہے۔ وہ اس روپے سے اپنی لڑکیوں کی شادی کے لئے لڑکے خریدتا ہے۔ اگر لڑکیاں نہیں ہیں یا ان کی شادی ہو چکی ہے تو وہ اس روپے سے ایک گھر بنوا لیتا ہے۔ بہو کو گھر چاہئے تو وہ بھی بہو کا باپ بنوا کر دیتا ہے۔ ایک مرکزی حکومت کے افسر کے دام تین سے چار لاکھ تک مقرر ہیں۔ ملازمت یافتہ ڈاکٹر ۲ لاکھ میں مل جاتا ہے۔ یہی دام انجینیر کے بھی ہیں۔

بھومی ہار اور راجپوت لوگوں کے بعد کایستھ بھی کافی جہیز دیتے ہیں لیکن کایستھ زمیں دار اور تاجر نہیں۔ یہ لوگ ملازمت پیشہ ہیں۔ کایستھوں میں خال خال ہی زمین دار ملتے ہیں۔ ۱۹۷۵ میں ایک کایستھ آئی اے ایس لڑکے کو ۱½ لاکھ روپے کی پیش کش ہوئی لیکن اس نے کسی دوسری لڑکی سے شادی رچالی۔ یہ محبت کی شادی تھی اس میں جہیز کی ایک کوڑی بھی نہیں ملی۔ کایستھوں میں اس کے اقدام سے کہرام مچ گیا۔ اس ارزانی کے زمانے میں ۱½ لاکھ روپے کا نقصان کچھ کم نہ تھا۔ کایستھوں میں بے روزگار لڑکوں کو جہیز کے نام پر کچھ نہیں ملتا۔ تجارت کرنے والے لڑکے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

زمین دار اور بے روزگار لڑکے بھی اسی فہرست میں شامل ہیں۔ کایستھوں میں اُونچی ملازمت کو عزت اور احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر یہ ہو تو شادی کا خرچ ۱۰ اور ۱۵ ہزار کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ روپیہ برات کے کھانے پینے پر خرچ ہوتا ہے۔

بہار کے میتھلی برہمن جہیز کے معاملے میں سب سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں جہیز کا سسٹم رائج نہیں ہے۔ برات کا خرچ بھی برائے نام ہے۔ میتھلی برہمنوں میں براتیوں کی تعداد مقرر ہوتی ہے۔ برات ۹ آدمیوں پر مشتمل ہوتی ہے یا اپر۔ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ لیکن یہاں بھی ایک آدھ انسان ان روایات کو توڑ دیتا ہے۔ حال ہی میں ایک میتھلی برہمن نے اپنی لڑکی کی شادی کے پنڈال پر ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا۔ حالانکہ برات میں وہی ۹ آدمی تھے، لیکن پنڈال کی سجاوٹ پر پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا۔

بہار کے اگروال فرقے میں بھی جہیز کا سسٹم بھومی ہاروں سے ملتا جلتا ہے۔ یہ لوگ تجارت پیشہ ہیں۔ لڑکا تاجر ہو اور مال دار بھی ہو تو وہ ۳ سے ۴ لاکھ روپیہ حاصل کر سکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ گریجویٹ ہو۔ اگر وہ آئی اے ایس ہے تو جہیز کی یہ رقم بڑھ کر ۸ اور ۱۰ لاکھ تک پہنچ سکتی ہے۔ اس کے باوجود اگروال آج بھی ملازمت پیشہ لڑکے پر تجارت پیشہ لڑکے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بنیوں میں جہیز کا سسٹم رائج نہیں ہے مال دار گھرانوں میں بھی شادی کا خرچ پچیس تیس ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں ہوتا اس رقم میں فرنیچر اور گھر کے برتن شامل ہوتے ہیں نقد روپیہ نہیں دیا جاتا۔ گھریلو سامان میں کار، فریج، ٹیلی ویژن اور ایسی ہی قیمتی چیزیں طلب نہیں کی جاتیں۔

نچلی ذاتوں میں دھوبی، کورمی، کہار اور پاسوان بھی جہیز مانگنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ایک کالج کا تعلیم یافتہ لڑکا، جو بے روزگار بھی ہے، ۱۸ سے ۲۰ ہزار روپیہ وصول کر لیتا ہے۔ زیور، ٹیپ ریکارڈر، برتن، بائیسکل اور گھڑی اس کے علاوہ ہیں۔ میٹرک پاس بے روزگار لڑکا ۵ ہزار روپیہ اور گھریلو سامان کے ساتھ مل جاتا ہے۔ ایک ناخواندہ چپڑاسی ۵ ہزار اور ایک ہلکے سونے کے سیٹ میں دستیاب ہوتا ہے۔ ایک کلرک' جو گریجویٹ ہے' ۵ ہزار سے ۱۰ طلب کرتا ہے۔

بہار میں بنگالی بھی آباد ہیں بنگالیوں میں

> گزشتہ سال ایک آئی۔ اے ایس لڑکا ۵ لاکھ روپے میں فروخت ہوا۔ یہ روپیہ نقد دیا گیا زیور، ایر کنڈیشنر، ٹیلی ویژن، وی۔ سی۔ آر۔ کار اور فریج اس کے علاوہ ہیں۔ نقد روپیہ لڑکے کے باپ کو ملتا ہے وہ اس روپے سے اپنی لڑکیوں کی شادی کرتا ہے

عام طور پر جہیز کی رسم رائج نہیں۔ لیکن خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اب بہاریوں کی دیکھا دیکھی بنگالی بھی جہیز طلب کر رہے ہیں۔ اور تو اور مسلمان بہاری بھی اس وبا کی لپیٹ میں آگئے ہیں۔ مسلمانوں میں شادی کا زیادہ خرچ لڑکے والوں پر پڑتا ہے، لیکن اب وہ بھی لڑکی والوں سے جہیز طلب کر رہے ہیں۔ وہاں اسے تلک کی رسم کہتے ہیں۔

عموماً تعلیم یافتہ اور برسر روزگار عورتوں کو جہیز نہیں دینا پڑتا لیکن بہار میں اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر لڑکی برسر روزگار ہو (بلکہ اس کی تنخواہ بھی لڑکے سے زیادہ ہو) تو بھی اسے جہیز دینا پڑتا ہے۔ جہیز کے بغیر شادی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

آج سے ۲۰ سال پہلے لڑکی کا خاندان اور شرافت دیکھی جاتی تھی۔ بھومی ہاروں میں خاندانی زمین داری اور عزت کو پرکھا جاتا تھا لیکن اب پرانی قدریں بدل گئی ہیں۔ اب پیسہ ہی شرافت کا معیار ہے۔ آج لڑکی کی تعلیم، خاندان، صورت، شکل پر کوئی دھیان نہیں دیا جاتا۔ جہیز کی رسم شادی میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

متوسط طبقے اور نچلے طبقوں میں جہیز نے ایک کاروبار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اگر کسی غریب خاندان میں نوجوان لڑکا موجود ہے تو اس کے ماں باپ اسے بازار میں اچھی قیمت میں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ جہیز سے خاندان کی مالی حالت سدھر سکتی ہے۔ لڑکیوں کی شادی ہو سکتی ہے۔ نیا مکان بن سکتا ہے۔ آئی ہوئی دولت کو کون چھوڑتا ہے۔ آج کل بلیک کے پیسے نے جہیز کی رقم میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ سونے کی قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ لڑکوں کی قیمت میں بھی۔ کیا ڈاکٹر اور کیا انجینیئر، سب اسی ناؤ میں سوار ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ جہیز کی رسم ختم کرنے کی بجائے دونوں ہاتھوں سے مال لوٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔

شادی کے بعد بھی لڑکی ساس سسر کے ساتھ رہتی ہے مشترکہ خاندان عزت کی نشانی ہے۔ بہو خود الگ گھر بسانے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اس سے خاندان کی عزت پر حرف آتا ہے۔ وہ سسرال میں رہتی ہے اور ساس سسر اس کے پیسے پر عیش کرتے ہیں۔

فاقہ

ایک بہترین علاج

مہلک کلب

راحت علی

فاقہ ایک قدیم اور کارگر علاج ہے۔ یہ سب سے پرانا سب سے سستا اور سب سے اچھا علاج ہے یہ قدرتی علاجوں کا بادشاہ ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسان کی بیماری کی وجہ اس کا پیٹ ہے۔ وہ نہ معلوم کیا کیا الابلا کھاتا رہتا ہے یا ضرورت سے زیادہ کھا لیتا ہے اس طرح جسم میں فالتو اور فاسد مادّہ جمع ہو جاتا ہے۔ یہ فاسد مادہ جسم سے کس طرح خارج ہو؟ قدرت نے اس کا علاج بیماری بھی رکھا ہے۔ بخار کی حرارت سے یہ فاسد مادہ جل جاتا ہے۔ دست اور قے کی شکل میں بھی یہ جسم سے نکل جاتا ہے۔ پیشاب اور پسینے کی کثرت سے بھی یہ مادّہ بدن سے دُور ہو جاتا ہے۔ اس طرح بیماری بھی ایک علاج ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس کی نوبت ہی کیوں آنے دی جائے کہ انسان کا علاج بیماری سے ہو؟ کیوں نہ بیماری کا سبب ہی ختم کر دیا جائے؟ قدرت کا منشا یہ ہے کہ بیماری کا سبب اُلٹ دیا جائے۔ یعنی اگر بیماری زیادہ کھانے یا غلط کھانے سے ہو تو کھانا ہی بند کر دیا جائے یا کم کر دیا جائے۔ یہی بات فاقہ کا بنیادی اصول ہے۔

فاقہ کے دوران جسم کے تمام اعضا بلا روک ٹوک کام کرتے ہیں۔ غذا ان کا راستہ نہیں روکتی۔ آنتیں غذا سے خالی ہوں تو فاسد مادّہ نکالنے میں زیادہ مستعدی دکھاتی ہیں۔ پھیپھڑے، گردے، جگر، سب اپنا کام بغیر کسی رکاوٹ کے کرتے ہیں۔

فاقہ کتنا لمبا ہو، یہ انسان کی عمر پر منحصر ہے۔ اس کے علاوہ اسے کیا بیماری ہے، اس نے اس بیماری کی روک تھام کے لئے اب تک کیا دوا استعمال کی ہے، یہ سب باتیں دھیان میں رکھنا ضروری ہیں۔ بہت طویل فاقہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ابتدا میں ایک دن کا فاقہ کریں۔ اس کے بعد دو یا تین دن کا فاقہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایک روز کا اضافہ کرتی رہیں تا آٹھ روز سے زیادہ کا فاقہ نہ کریں۔

فاقے کے بعد پرانی چال پر لوٹنا غلط ہے۔ اگر آپ نے وہی غذا کھانی شروع کر دی جو بیماری کا سبب بن گئی تھی تو فاقہ کرنا بے کار ثابت ہوگا۔ فاقہ کے بعد سادہ غذا کھانی ضروری ہے۔ الم غلم کھانے سے ساری محنت اکارت جائے گی۔ اگر آپ نے فاقے کے بعد غذا کا دھیان رکھا تو آپ کی صحت قابلِ رشک ہو جائے گی۔ قوت اور طاقت واپس آ جائے گی۔

ذیابیطس، ٹی بی اور اعصابی بیماری کے مریض فاقہ نہ کریں۔ فاقے سے پہلے آنتوں کا خالی ہونا ضروری ہے۔ سادے پانی کا انیما لیں۔ اس سے آنتیں صاف ہو جائیں گی۔ آنتیں خالی نہیں ہوں گی تو آنتوں کا فضلہ اور فاسد مادّہ علاج کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گا۔ اگر زیادہ دن کا فاقہ کر سکتی ہیں تو روز انیما لینا چاہیئے، تاکہ آنتوں سے فاسد مادّہ خارج ہوتا رہے۔

فاقہ کے دوران کثرت سے پانی پئیں ہر ایک گھنٹے کے بعد ایک گلاس پانی پیتی رہیں تاکہ آنتوں کی دھلائی ہوتی رہے۔ فاقہ کے دوران جسم کو کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ سارے جسم سے فاسد مادّے کو خارج کرنا آسان کام نہیں۔ اس لئے فاقے کے دوران زیادہ کام نہ کریں۔ دماغ اور جسم دونوں کو آرام پہنچانا ضروری ہے۔ بستر پر لیٹی رہیں یا کوئی ہلکا پھلکا کام کریں۔ ویسے بھی فاقے میں کمزوری محسوس ہوتی ہے کھانے کے اوقات میں بھوک لگتی ہے۔ جسم مقررہ وقت پر غذا مانگتا ہے۔ لیکن اسے یہ غذا نہ ملے تو وہ تن بتقدیر صبر کر لیتا ہے۔ اگر خالی پیٹ میں صفرا کی شکایت ہو جائے یا الٹی ہونے لگے تو لیموں کا عرق پانی میں ملا کر پئیں۔ اگر سر زیادہ چکرائے، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگے اور الٹی لگ جائے تو فاقہ توڑ دیں۔ فاقہ توڑتے وقت کسی پھل کا رس پئیں، سبزی کھائیں اور آہستہ آہستہ نارمل غذا کھانا شروع کر دیں۔

موٹی عورتوں کے لئے فاقہ کرنا آسان ہوتا ہے۔ غذا کی کمی کو بدن کی فالتو چربی پورا کر دیتی ہے۔ جسم اس ذخیرے سے چربی نکالتا رہتا ہے۔ ویسے بھی دبلا ہونے کی خوشی فاقے کو آسان بنا دیتی ہے۔ فاقے کا پہلا دن سب سے زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔ اس وقت بھوک کی پکار سے نبٹنے کے لئے پانی پیتی رہیں۔ دوسرے دن پیٹ کی پکار ہلکی ہو جاتی ہے اور تیسرے دن اس سے بھی کم۔

اسلام میں رمضان کا مہینہ مذہبی لحاظ سے بڑا برکت والا مہینہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ صحت کے لئے بھی مفید ہے۔ تمام دن کھانے پینے سے پرہیز کرنے سے جسم کا نظام بہتر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس مہینے میں لوگوں کو زیادہ کھانے سے گریز کرنا چاہیئے۔

فاقہ ایک نسوانی ہتھیار ہے۔ مرد جب ناراض ہوتا ہے تو گالیاں دیتا ہے، مار پیٹ کرتا ہے۔ عورت جب ناراض ہوتی ہے تو کھانا پینا چھوڑ دیتی ہے اور اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ جاتی ہے۔ اب مرد کے لئے بڑی مشکل ہے کہ وہ کیا کرے۔ بھوکی پیاسی عورت کو برا بھلا کہنا مردانگی کی توہین ہے۔ اگر عورت زبان دراز ہو یا ہاتھ میں بیلن اٹھائے تو مرد کا کام آسان ہو جاتا ہے عورت اب اس کی زبان میں بات کر رہی ہے۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے لیکن فاقہ سے وہ بالکل نروس ہو جاتا ہے۔ عورت کے اس ہتھیار کے آگے وہ بے بس ہو جاتا ہے اور اسے منا لیتا ہے۔ اگر وہ بھی کہیں فاقہ کا ہتھیار سنبھال لے تو عورت کے لئے بڑی مشکل ہو جائے۔ لیکن مرد عموماً ایسا نہیں کرتے۔ اسی طرح فاقہ دو دھاری تلوار بن سکتا ہے۔ موٹی عورتوں کے لئے یہ اور بھی مفید ہے۔ وزن بھی کم۔ صحت بھی بہتر اور میاں بھی راضی موٹی عورتیں اس ہتھیار کو آزمائیں تو فاقے سے انہیں بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ●●

اپنی خوشی

ایم صمد صدیقی

چھ مہینے کے طویل اور تھکا دینے والے کویت، دمام، بیروت اور مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے علاقوں کے دورے سے نوید کامیاب کاروبار کر کے لوٹا تھا۔ اس کا پلین پالم پر رُکا اور اس نے سیفٹی بیلٹ کھول کر ایک طویل انگڑائی لی۔ سامنے ایر ہوسٹس کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر اسے ناہید کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آنے لگا۔

چھ مہینے پہلے جب وہ کویت کے لئے پرواز کر رہا تھا تو اس کی شادی کو صرف چھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ یہ چھ مہینے ناہید کے ساتھ جس طرح گزرے تھے، اس کا ایک ایک پل نوید کے لئے حاصلِ زندگی تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے کی اکلوتی لڑکی ناہید نے رُخصت ہو کر جب اس گھر میں قدم رکھا تو یہ ایک سیلزمین کا گھر تھا۔ لیکن ناہید نے نوید کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لاڈلی بیٹی ہے۔ اپنی بے پناہ محبت اور خلوص سے اس نے نوید کا دل جیت لیا تھا۔

وہ نوید کے بغیر ناشتہ کرتی نہ کھانا کھاتی، بلکہ رات کو فرم سے واپسی میں اگر کچھ دیر بھی نوید کو ہو جاتی تو وہ صوفے پر بیٹھی اونگھتی رہتی اور نوید کی پہلی ہی دستک پر وہ پُوچھتی "کون ہے؟" نوید کا جواب ہوتا "تمہارا" اور وہ دروازہ کھول کر نوید سے اس طرح ملتی جیسے برسوں کی بچھڑی ہوئی ہو۔

تھکا ہوا نوید صوفے پر بیٹھ کر پاؤں سینٹر ٹیبل پر پھیلا دیتا تو ناہید اس کے جوتوں کے بند کھولنے لگتی۔

"ارے یہ کیا کرتی ہو ناہید!" نوید پاؤں نیچے اُتارنا چاہتا تو ناہید دونوں ہاتھوں سے اس کے پیروں کو پکڑ لیتی۔

"کیوں؟ کیا آپ میرے سرتاج نہیں ہیں؟" عجب دل فریب ادا سے وہ گردن ٹیڑھی کر کے اس کی طرف دیکھتی اور اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگتیں۔

"مگر ..." نوید اس پر جھک جاتا "تم — تم — میں خود جوتے اُتار لوں گا۔"

"نہیں ڈیر۔" ناہید مسکرا کر بند کھولتے ہوئے کہتی "تم دن بھر کے تھکے ہوئے ہو۔ ذرا سی دیر آنکھیں بند کئے بیٹھے رہو" اور پھر نوید صوفے کی پشت سے ٹک جاتا۔ اور ناہید گرم پانی سے اس کے پیروں کو ٹب میں دھوتی اور کپڑے سے خشک کر کے ہلکی سی ویسلین لگاتی۔ پھر کھانا نکالنے کے لئے کچن میں چلی جاتی۔ اور پھر ناہید کے ہاتھوں سے لقمے کھاتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ساری زندگی کی بھوک مٹتی جا رہی ہے اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

کیسی راحت تھی اس چاہت میں!

صبح کو اذان کی آواز کے ساتھ ہی ناہید بستر چھوڑ دیتی اور ابھی نوید سویا ہی ہوتا کہ وہ گرم پانی تولیہ اور دُھلے ہوئے کپڑے باتھ روم میں رکھ دیتی اور پھر نوید کے بالوں میں اس کی انگلیاں اُلجھنے لگتیں۔ نوید کی آنکھ کھلتی تو وہ ناہید کو خود پر جھکا ہوا پاتا۔ چپکے چپکے اس کے ہاتھ اٹھ کر ناہید کی کمر میں حائل ہو جاتے اور ایک لمحے کے لئے وہ دونوں کسی دوسری دنیا میں گم ہو جاتے۔

"اب اُٹھئے بھی۔" وہ کسمساتی "صبح ہو رہی ہے اور وقت نکلا جا رہا ہے۔"

"اچھا — کیا صبح ہو گئی؟" نوید جمائی لیتے ہوئے کہتا۔ "اوہو! ذرا دیکھنا تو کیا بجا ہے۔"

"چھ بجے ہیں اور سورج نکلنے میں صرف چالیس منٹ باقی ہیں۔" ناہید نوید کے گال تھپتھپاتی اور نوید ایک طویل انگڑائی کے ساتھ بستر سے چھلانگ لگا دیتا اور ناہید کو باہوں میں سمیٹ لیتا۔

"دیر ہو رہی ہے نوید۔" ناہید اس کے سینے پر سر رکھ دیتی اور نوید کو غسل خانے کی طرف دھکیل دیتی۔

"اچھا بابا، اچھا۔" کہتا ہوا نوید غسل خانہ میں گھس جاتا اور ناہید ناشتہ بنانے لگتی۔

کیسی حسین تھی اس کی زندگی کی ساتھی۔

کیسی دل رُبا، کس قدر دل نواز۔ ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھنے والی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کبھی اسے کسی قمیص کا بٹن ٹوٹا ہوا ملا ہو۔ کبھی کوٹ کی جیب میں رومال نہ ملا ہو۔ کبھی کھانا ٹھنڈا سامنے آیا ہو اور کبھی اس کی دل آزاری ہوئی ہو۔ ناہید اس کی نظروں کو پہچانتی۔ وہ جس چیز کو پسند کرتا ہے، وہی ناہید کی پسند بن جاتی۔ وہ جس بات کو پسند کرتا وہی بات ناہید کی زبان سے نکلتی۔ وہ جس لباس میں

"صبح کی اذان کے ساتھ ہی ناہید بستر چھوڑ دیتی۔ نوید ابھی سویا ہی ہوتا کہ وہ گرم پانی تولیہ اور دُھلے ہوئے کپڑے باتھ روم میں رکھ دیتی۔ اور پھر نوید کے بالوں میں اس کی انگلیاں اُلجھنے لگتیں۔"

ناہید کو دیکھنا چاہتا، وہی لباس ناہید کا پسندیدہ لباس ہوتا۔ غرض ناہید نے نوید کو اس طرح اپنا معیار بنا یا تھا کہ اس کی ہر خوشی ناہید کی خوشی بن چکی تھی۔ اس کا ہر غم ناہید کا غم ہو گیا تھا اور وہ حقیقت میں ایک جان دو قالب بن چکے تھے۔

"اے مسٹر!" اس کے کانوں میں ایر ہوسٹس کی آواز آئی "کہاں کھو گئے؟ کیا اترنا نہیں ہے؟" اور وہ چونک پڑا۔ جھینپے ہوئے انداز میں اس نے ایر ہوسٹس کا شکریہ ادا کیا اور بریف کیس اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

کسٹم سے فارغ ہو کر نوید نے ٹیکسی کے لئے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ دُور دُور تک بھی کسی ٹیکسی کا پتہ نہیں تھا۔ اچانک ایک ٹیکسی اندر داخل ہوئی اور نوید لپک کر اس کی طرف بڑھا اور ایک طرف کھڑے ہو کر سواریاں اُترنے کا انتظار کرنے لگا۔

"آیئے صاحب!" ٹیکسی والے نے کرایہ لے کر اس کی طرف رُخ کیا اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کا مُونہہ کھُل گیا۔

"ارے خان تم!" اس کی زبان سے نکلا۔

"کون؟" نوید اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا "اوہ! غفار خاں، یہ تم ہو!" نوید بے ساختہ آگے بڑھ کر ٹیکسی والے سے لپٹ گیا۔

"یہ ٹیکسی اور — اور تم؟" نوید نے غفار خاں سے پوچھا۔

"اماں چلو بھی یار۔" غفار خاں نے نوید کا بازو پکڑ کر اگلی سیٹ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہر بات ہر جگہ نہیں کرتے۔" اور پھر ٹیکسی اسٹارٹ ہو گئی۔ رنگ روڈ پر گاڑی پہنچی تو غفار بولنے لگا۔

"ہاں بھئی، اب کہو کیا کہہ رہے تھے؟"

"یار یہ کہہ رہا تھا۔" نوید اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا "میری تو عقل ہی خبط ہو کر رہ گئی ہے تمہیں اس حال میں دیکھ کر۔"

"کیوں؟" غفار خاں مہارت سے اسٹیرنگ کرتے ہوئے بولا "اس میں عقل خبط ہونے کی کیا بات ہے۔"

"ارے بھئی، فرسٹ کلاس ایم کام ہونے کے بعد یہ ٹیکسی؟" نوید نے اپنا بریف کیس پیروں سے اُٹھا کر گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں غفار خاں ڈیش بورڈ کھول کر اس میں ہاتھ ڈال

چکا تھا۔ اور جب اس کا ہاتھ باہر نکلا تو نوید نہ صرف یہ کہ بہت زور سے چونکا بلکہ خوف زدہ نظروں سے غفار کی طرف دیکھ کر اس نے اپنے بریف کیس کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"ڈرو مت، یار" غفار خاں ڈیش بورڈ سے نکالے ہوئے پستول کو نوید کی گود میں ڈالتے ہوئے بولا "یہ تمہارے لئے نہیں ہے یہ تو میرا دھندا ہے بھتیجے" اور نوید نے اطمینان بھری ایک لمبی سانس لی۔ اس کی تو جان ہی نکل گئی تھی پستول دیکھ کر۔ اس لئے کہ اس وقت اس کے بریف کیس میں تقریباً ایک لاکھ روپے کے بیرر چیک اور لگ بھگ اتنی ہی رقم کا سونا تھا جو وہ کسٹم ادا کر کے لایا تھا اور یہ سب اس کی فرم کے مالک سردار آغا کا تھا۔ اور اس وقت ٹیکسی ایک ویران راستے سے گزر رہی تھی، جس کے ایک طرف قدیم کھنڈر تھے اور دوسری طرف ایک بہت بڑی جھیل۔

"کیسا دھندا غفار خاں؟ کسـ کیا تم؟" نوید ہکلایا۔

"یار، کسی غلط فہمی میں نہ پڑو" غفار خاں نے قہقہہ لگایا "یہ کسی کو لوٹنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ فارسیل ہے، نمبر دو میں یعنی بلاٹکٹ"

"یعنی ــ یعنی ــ" نوید پھر ہکلایا۔

غفار ہنستا چلا گیا "یار تم ہکلے کب سے ہو گئے؟ تھوڑی دیر پہلے تو اچھے خاصے تھے"

"ہم ــ میرا مطلب ہے کہ کیا تم ناجائز اسلحہ فروخت کرتے ہو؟" نوید کے لہجے میں تنفر تھا۔

"یہ بھتیجے ناجائز کیا ہوتا ہے؟" غفار خاں نے طنز سے کہا "کیا اس لاقانونیت کے دور میں جب ہر شخص اپنی کھال میں زندہ ہے اور اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میرے سامنے کون ہے اور کس حال میں۔ اسے نہیں معلوم کہ مجھ پر اس کا کیا حق ہے جو مجھے ادا کرنا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ میرے کیا فرائض ہیں جنہیں مجھے ادا کرنے ہیں۔ اسے خبر ہی نہیں کہ انسان کے انسان پر کیا حقوق ہیں جن کے نہ ادا ہونے کی صورت میں پورا انسانی معاشرہ جرائم اور درندگی کے کوڑھ سے بجبجاتی ہوئی غلیظ اور زہریلی دل دل بن گیا ہے، جس میں پھنس جانے والا ابھی ہلاک ہوتا ہے اور اس کے قریب کھڑا ہونے والا ابھی اس کے زہریلے گیس

> کیا اس لاقانونیت کے دور میں جب ہر شخص اپنی کھال میں زندہ ہے اور اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میرے سامنے کون ہے اور کس حال میں۔ اسے نہیں معلوم کہ مجھ پر اس کا کیا حق ہے جو مجھے ادا کرنا ہے۔

سے ہلاک ہوئے بغیر نہیں رہتا جب تک وہ اپنے چہرے پر دوسرا القتل چہرہ نہ چڑھالے کیا کوئی کام ناجائز بھی ہے۔" غفار خاں کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور تھوڑی دیر پہلے والے غفار کا کھلنڈرا اور مسکراتا ہوا چہرہ اس کے نیچے جا چھپا تھا۔ اور نوید سوچ رہا تھا کہ غفار اس جھوٹ اور فریب کے دور میں کیا کھرا اور بے داغ سچ بول رہا ہے۔

ٹیکسی نوید کے مکان کے سامنے

رک گئی۔ نوید نے پستول غفار کے ہاتھوں میں دے دیا جو اب تک اس کے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا اور جیب سے پرس نکالنے لگا۔ لیکن اسی لمحے غفار خاں نے اسے پیچھے ڈھکیلا اور ٹیکسی کا دروازہ بند کر دیا۔ نوید "ارے ارے" کرتا ہی رہ گیا اور ٹیکسی زوں سے نکل گئی۔

"پھر آؤں گا نوید، میرے دوست"

یہ آخری آواز تھی جو اس کے کانوں میں غفار کی آئی اور وہ مسکراتا ہوا دروازے کی طرف مڑا اور اس کا ہاتھ کنڈی کی طرف اٹھ گیا۔ اس کے تصور میں ناہید کا چہرہ اور ننھے ظفر کا مکھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کا پہلا بچہ جس کی پیدائش کی خبر اسے دمام میں مل چکی تھی۔

ناہید اس وقت ظفر کو نہلا کر پلنگوڑے پر لٹا رہی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز آئی اور وہ اچھل پڑی ــ یہ آواز ــ یہ آواز تو نوید کی دستک کی تھی۔ وہی مخصوص انداز ــ ناہید نے جھپٹ کر دودھ کی شیشی میز سے اٹھا کر ظفر کے ہاتھ میں تھمائی اور دوڑی کنڈی کھولنے۔ کنڈی کھولی ہی تھی کہ ظفر کے رونے کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ شاید بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ تیزی سے پلٹی اور نوید کے بازو پھیلے ہی رہ گئے۔

نوید نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ بریف کیس قدموں میں سے اٹھایا اور مکان میں داخل ہو گیا صوفے پر تولیہ پڑا تھا اور سینٹر ٹیبل پر ننھے ظفر کے کھلونے بکھرے ہوئے تھے۔ نوید نے تولیہ اٹھا کر اسٹینڈ پر ڈالا اور صوفے پر گر کر حسب عادت پاؤں سینٹر ٹیبل پر پھیلا دیے۔ پلاسٹک کے کھلونے پھسلتے ہوئے پُرشور آواز کے ساتھ زمین پر گر پڑے۔ ناہید نے

ظفر کو تندہی سے پلاتے پلاتے نوید کی طرف تیز نظروں سے دیکھا۔

"اوں! کتنے بُرے ہیں آپ۔ میرے بچّے کے کھلونے پھینک دیئے۔"

"ہاں، میں واقعی بُرا ہوں ناہید جو میں نے پھینک دیئے۔" نوید اس طرح بولا جیسے خواب میں بولتے ہیں۔ اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں وہ ذہنی جھٹکے سے بے ہوش ہو چکا تھا۔

"ارے!" ناہید اس کی طرف متوجّہ ہوئی "نوید! نوید! کیا ہوا تمہیں، یہ کیا ہوا؟" وہ زور سے چلّانے لگی۔

آواز سن کر پڑوسن گیتا نے پکارا "کیا ہوا ناہید؟ کیا بات ہے؟"

"یہاں تو آؤ، گیتا۔ ذرا جلدی" ناہید گھبرائی ہوئی بولی اور گیتا دروازے سے اندر آ گئی۔ اس کا کوارٹر بالکل برابر ہی میں تھا۔ وہ ہسپتال میں نرس تھی اور ناہید کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ نوید کی غیر موجودگی میں اس نے سگی بہن کی طرح ناہید کی دیکھ بھال کی تھی۔ خصوصاً ظفر کی پیدائش کے وقت تو اس کا سارا وقت ناہید ہی کے گھر میں گزرتا تھا۔ ظفر کی پیدائش کے بعد وہ اکثر ناہید سے کہا کرتی "تم نوید کو خط کیوں نہیں لکھتیں ظفر کو میں دیکھ لیتی ہوں"، لیکن ناہید یہ کہہ کر ٹال جاتی کہ میں اپنے ننھے سے ایک پل بھی الگ نہیں رہ سکتی۔ اور گیتا یہ کہہ کر خاموش ہو جاتی "بھولی ناہید! ظفر بھی تو نوید ہی سے ہے۔"

گیتا اندر آئی تو اس کی نظر سب سے پہلے سامنے صوفے پر پڑے ہوئے نوید پر پڑی۔ اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ دونوں پیر جوتوں سمیت سینٹر ٹیبل پر پھیلے ہوئے تھے۔ سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ سانس دھیرے دھیرے چل رہا تھا گیتا جھپٹ کر اس کے پاس آئی اور ہاتھ اٹھا کر نبض دیکھنے لگی۔

"یہ تو بے ہوش ہیں ناہید" گیتا نے ناہید کی طرف دیکھا جو ہلکوڑے میں پڑے ہوئے ننھے ظفر پر رضائی ٹھیک کر رہی تھی۔

یہ سن کر ناہید نے چونک کر سر اٹھایا "ارے! مگر کیوں؟ یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک گھر میں آئے ہیں۔"

"ابھی کیا کہا جا سکتا ہے" گیتا نے نوید کی پلکیں اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا "میرے

> اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا۔ دونوں پیر جوتوں سمیت سینٹر ٹیبل پر پھیلے ہوئے تھے۔ سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا سانس دھیرے دھیرے چل رہا تھا گیتا جھپٹ کر اس کے پاس آئی اور نبض دیکھنے لگی۔

خیال میں تو یہ زیادہ تھکن کی وجہ سے ہو سکتا ہے ٹھیرو، میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں" گیتا باہر جاتے ہوئے بولی، "گھبرانا نہیں، میں ابھی آتی ہوں۔ بس تم ان کے بدن پر کسی ہوئی ہر چیز ڈھیلی کر دو" کہتے ہوئے گیتا باہر نکل گئی۔

ناہید دہشت زدہ سی جلدی جلدی نوید کے جوتوں کے بند کھولنے لگی۔ جوتے اتار کر موزے اتارے اور پھر ٹائی اتار کر بیلٹ کھولنے لگی۔ وہ گھبرا گھبرا کر بار بار کبھی نوید کی صورت دیکھتی کبھی پلٹ کر ہلکوڑے پر نظر ڈالتی کہ ظفر کہیں اٹھ تو نہیں گیا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر اس نے فولڈنگ صوفے کی بیک کا اسٹینڈ ہٹایا اور اسے سیدھا کر کے کوچ میں بدل دیا۔ نوید کا لٹکا ہوا ہاتھ اٹھا کر اس کے پہلو میں رکھا اور اسٹول لے کر اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔

اتنے میں گیتا اندر آئی۔

"کر آئیں ٹیلی فون گیتا؟" ناہید نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ڈاکٹر مشرا تھے ڈیوٹی پر۔ ابھی آتے ہیں"، گیتا دوسرے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولی۔"

اسی وقت ظفر نے آواز نکالی اور ناہید جھپٹ کر ظفر کے ہلکوڑے پر جھک گئی اور ظفر کو تھپکنے لگی۔ اب اس کی پوری توجّہ ظفر کی طرف تھی۔ ٹھیک اسی لمحہ نوید کی پلکوں میں حرکت ہوئی اور مونہہ سے بڑبڑاہٹ نکلی۔

"ٹھیک کہا تھا غفار خاں نے۔ سب اپنی کھال میں زندہ ہیں۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ کوئی کسی کا نہیں — کوئی کسی کا نہیں" اس کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

"ارے ارے، نوید، یہ کیا ہو گیا تمہیں؟" ناہید جھپٹ کر اس کے مونہہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "ہوش میں آؤ نوید۔ چلّاؤ مت۔ دیکھو میرا ننّھا میرا ظفر جاگ جائے گا۔"

"ہاں ہاں، کوئی کسی کا نہیں۔ سب اپنی خوشیوں کے لئے جیتے ہیں۔ اپنی کھال میں۔ اپنی کھال میں۔" نوید زور سے چیخا "بس اپنی کھال میں" اور ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔

○○

آخری داؤ

عبدالغنی شیخ

قصبے میں گاہے گاہے انتظامیہ کے خلاف احتجاجی جلسے اور مظاہرے ہو رہے تھے' جلوس نکل رہے تھے۔ یہ جلسے جلوس قیمتوں میں بڑھاوے، جرائم میں اضافہ' چوری اور نقب زنی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں اور انتظامیہ کے کسی افسر کی مبینہ بدسلوکی کے خلاف منظم کیے جاتے تھے۔ ان جلسوں میں اکثر سیاست آجاتی اور مختلف سیاسی پارٹیاں انہیں اپنے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتیں۔ کبھی کبھی کوئی ہارا ہوا سیاست داں اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کے لیے انہیں بروئے کار لاتا۔

ان جلسوں میں دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔ سامعین کو مقررین کے بلند بانگ دعووں اور انتظامیہ کے خلاف طنز سے بھرپور تیکھے اور تیز جملوں میں بڑا لطف آتا تھا۔

کبھی کبھی جلسے، جلوس تشدد کی صورت اختیار کر جاتے تھے اور پولیس طاقت کا استعمال کرتی تھی۔ کئی آدمی گرفتار کیے جاتے جو یا تو جلد رہا کیے جاتے یا ان کے خلاف مقدمے دائر کیے جاتے لیکن عموماً کسی کو سزا نہیں ملتی تھی۔ ہر بات میں سیاسی دباؤ ہوتا اور ہر معاملے میں اثر و رسوخ کام کرتا۔ چنانچہ کئی ملزم بچ جاتے اور عدلیہ تماشائی بن کر رہتا۔

انتظامیہ نہ صرف مصلحت پسند تھا بلکہ عافیت پسند بھی تھا۔ کھلے عام قاعدے قانون کی خلاف ورزیاں ہوتی رہتی تھیں لیکن انتظامیہ کے کانوں پر جوں نہ رینگتی یا مختلف مصلحتوں کی بنا پر چشم پوشی کی جاتی۔ اور جب تک اس کو جھنجوڑا اور للکارا نہ جاتا وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔

ان جلسوں اور جلوسوں کی قیادت عام طور پر مرد کرتے تھے جو عموماً کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہوتے تھے۔ تاہم ان میں عورتیں بھی خاصی تعداد میں حصہ لیتی تھیں۔

اچانک قصبے کی سماجی اور سیاسی زندگی کے اُفق پر ایک لڑکی نمودار ہوئی جو آن کی آن میں ماہِ کامل بن کر چمکنے لگی۔ چیماں پڑھی لکھی تھی، خوب صورت تھی اور دلیر تھی۔ قصبے میں ہر ایک کی زبان پر چیماں کا نام تھا اور ہر ایک کی نظریں اسی پر تھیں۔

چیماں کی آمد کے ساتھ جلسوں' جلوسوں میں حاضرین کی تعداد دوگنی ہو گئی۔ ان میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ہوتی تھی جو اس کے گرد اس طرح جمع ہوتے جیسے پروانے شمع کے گرد منڈلاتے ہیں۔ جب وہ اسٹیج پر سے تقریر کرتی تو رضاکار نوجوان اس کے گرد ایک حصار سا بنا لیتے اس کے ایک ایک فقرے پر خوب تالیاں بجتیں۔ چیماں میں خطابت کا اچھا مادہ تھا، لیکن بہت سے لوگ (خاص طور سے نوجوانوں) کو جلسے جلوس کے مقصد سے زیادہ چیماں کے شانوں پر بکھرے ہوئے لمبے سیاہ گیسو اور اس کی آنکھوں کی سحر کاری سے دلچسپی تھی۔

ایک رات شہر میں بیک وقت کئی دکانوں میں چوری ہوئی۔ پولیس حسب معمول چوری کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔ چیماں نے ایک احتجاجی جلوس کی قیادت کی اور بڑی دلیری سے ڈنکے کی چوٹ چوری کا الزام پولیس کے ان جوانوں پر لگایا جو اس رات گشت پر تھے۔

پھر ایک دن قصبے میں قتل کی ایک واردات ہوئی۔ پولیس قاتل کو گرفتار نہ کر سکی۔ چیماں نے ایک

جلوس کی رہنمائی کی۔ اس کے ہاتھ میں ایک جلتی ہوئی لالٹین تھی، جو زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ شہر میں اتنی اندھیر نگری ہے کہ دن کو بھی روشنی کی ضرورت ہے۔

اسی دوران میں قصبے کے پرانے کلکٹر کا تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ ایک جوان اور وجیہہ کلکٹر آیا۔ اس کے آتے ہی آگ کی ایک واردات میں قصبے کا راشن اسٹور جل گیا۔ لوگوں کو یہ شبہ تھا کہ آگ کی واردات ایک بددیانت ملازم کا ہتھکنڈہ ہے جس نے راشن میں خورد برد کی ہے اور اشیا کی کمی چھپانے کے لئے اسٹور کو نذرِ آتش کیا ہے۔

چیماں کی سرکردگی میں ایک بڑا جلوس کلکٹر کے دفتر کی طرف بڑھا۔ کلکٹر کے دفتر پر پولیس کا ایک دستہ پہرہ دے رہا تھا۔ جلوس نعرے بلند کرتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا، لیکن پولیس نے اسے روک دیا۔ چنانچہ کلکٹر کے دفتر کے احاطے کے سامنے کا میدان جلسہ گاہ بنا اور چیماں کی شعلہ بیانی شروع ہوئی۔

"شہر جل رہا ہے، لیکن حاکم سو رہا ہے۔ بیوروکریسی نہیں چلے گی۔ کلکٹر کا کام دفتر کی چار دیواری میں رہنا نہیں ہے۔ بازار میں گوشت نایاب ہے۔ سبزیوں کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ مٹی کے تیل میں پانی ملا ہے۔ عوام گلے سڑے چاول کھا کر بیمار ہو گئے ہیں۔ دکاندار تین تین گنا نفع کما رہے ہیں۔ لیکن افسر شاہی کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ ذرا کھڑکی سے باہر جھانک لو اور عوام کے تیور دیکھو۔ اس آگ کو مزید پھیلنے سے روکو، ورنہ اس کے ساتھ تم بھی بھسم ہو جاؤ گے ...."

چیماں کے الفاظ شبنم نہیں، لپکتے ہوئے شعلے تھے۔ ہر شخص اس کی باتیں اس طرح سن رہا تھا اور اس طرح اُسے تک رہا تھا جیسے ٹی وی پر ایک حسین اناؤنسر ایک اہم اعلان کر رہی ہو۔

تقریر کے اختتام پر چیماں نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر جذباتی انداز میں کہا "جب تک میرے دم میں دم ہے یہ سر کبھی خم نہ ہو گا۔ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں گی۔ یہ میرا آخری داؤ ہو گا۔"

لوگوں نے "چیماں زندہ باد!" کے نعرے بلند کئے۔ مشتعل ہجوم چیماں کی قیادت میں زور زور سے نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا اور پولیس کا مضبوط گھیرا توڑ ڈالا۔ ہوا میں لہراتی ہوئی لاٹھیاں جھک گئیں۔ لوگوں کا مضبوط ریلا پولیس کو دھکیلتا اور ریلتا پیلتا آفس کی راہداری میں پہنچا، جہاں زینے کے نیچے پولیس کے ایک اور دستے نے اسے روک لیا۔

کلکٹر نے چیماں کی قیادت میں ایک وفد کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ چیماں نے شکایات اور مطالبات سے بھرا ہوا ایک میمورنڈم پیش کیا۔ کلکٹر نے وفد کو یقین دلایا کہ وہ آتش زنی کی واردات کی تحقیقات کرے گا اور دوسرے مسائل سلجھانے کے لئے جلد مناسب اقدام کرے گا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ آگ کی واردات کے سلسلے میں کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی اور نہ کھوج میں کوئی پیش رفت ہوئی۔ صارفین کو راشن کے چاول اور آٹا ملنا بند ہو گئے تھے اور مارکیٹ میں اجناس کی کھلم کھلا چور بازاری ہو رہی تھی۔ ادھر کئی چیزوں کے دام بھی بڑھ گئے تھے۔

جب عوام کی بے چینی بڑھ گئی تو ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی، جس میں چیماں سمیت سب ہی لیڈروں نے شرکت کی۔ ایک پرانے سیاسی نیتا نے میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"میں نے پہلے ہی روز آپ لوگوں سے کہا تھا کہ ہمارا نیا افسر کلکٹری کے لئے موزوں نہیں۔ اسے فلم لائن میں جانا چاہئے تھا۔ وہاں یہ ایک اچھا اداکار ثابت ہو گا۔" (ویسے بھی قصبے میں کلکٹر ہیرو کے نام سے مشہور ہو گیا تھا)۔

میٹنگ کے بعد ایک وفد چیماں کی رہبری میں نئی شکایات کا دفتر لے کر کلکٹر سے ملنے گیا۔ نفیس تراش کے قیمتی سوٹ اور بالوں کے منفرد اسٹائل میں اس کی دلکش شخصیت اور بھی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ لوگوں کے جذبات دیکھ کر انتظامیہ نے ایک مشکوک ملازم کو فوراً حراست میں لے لیا، لیکن تیسرے روز وہ ضمانت پر رہا ہو گیا۔ اور آگ کی واردات کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

قصبے میں ایک 'عوامی تحریک کمیٹی' تھی جو ایک لمبی مدت سے اپنی افادیت کھو بیٹھی تھی۔ اب 'عوامی تحریک کمیٹی' کے ممبروں، سیاسی پارٹیوں اور نوجوانوں کے نمائندوں کی ایک میٹنگ ہوئی، جس میں اتفاقِ رائے سے ایک بڑا احتجاجی جلوس نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ اس کے لئے ۹ اپریل کی تاریخ مقرر کی گئی۔ گرد و نواح کے تمام دیہات میں سیاسی کارکنوں، نمبرداروں اور سرپنچوں کو فوراً خط بھیجے گئے کہ وہ ۹ اپریل کی صبح کو قصبے میں لوگوں کے ساتھ جلوس میں شامل ہونے کے لئے پہنچ جائیں۔ آنے جانے کے لئے بسوں اور ٹرکوں کے انتظام کی اطلاع بھی دی گئی۔

۹ اپریل کی صبح کو قصبے میں بڑا تناؤ تھا۔ سرکاری اور غیر سرکاری، دونوں حلقوں میں اس اندیشے کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ لوگ تشدد پر اتر آئیں گے اور پولیس طاقت کا استعمال کرے گی۔

انتظامیہ کی ہدایت پر ٹرانسپورٹ کے محکمے نے گرد و نواح کے تمام دیہات میں بسوں کی سروس معطل کر دی۔ تاہم سیاسی تنظیموں کی درخواست پر پرائیویٹ ٹرکوں کے مالکوں اور ٹھیکہ داروں نے اپنے ٹرک مظاہرے کے لئے وقف کر دئے۔

صبح سے ہی قصبے کے مضافات میں ایک جگہ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ دوپہر تک کئی ہزار لوگ جمع ہو گئے۔ تحریک کمیٹی کے ممبر، سیاسی کارکن، جوانوں اور عورتوں کے سرکردہ نمائندے آ چکے تھے، لیکن

ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ صبح سے چیماں کے گھر
...دمی بھیجے جا چکے تھے، لیکن ہر ایک یہی خبر لایا
...کے دروازے پر ایک بڑا تالا لٹکا ہے۔ سب ہی
...تھے کہ آخر چیماں گئی کہاں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ
...ایک اہم جلوس میں شامل ہونے کے لیے نہیں
...تی، ورنہ ایسے موقعوں پر وہ سب سے پہلے پہنچ
...تی۔ لیڈروں کو چیماں کی غیر موجودگی پر گہری تشویش
...۔ دو تین لیڈروں کو شک تھا کہ چیماں کی روپوشی میں
...امیہ کی کوئی چال مضمر ہے۔ اس نے حفظ ما تقدم کے
...پر اس کو حراست میں لیا ہے۔ یہ قیاس آرائی ایک
...جنگل کی آگ کی طرح جلوس کے ایک سرے سے دوسرے
...سرے تک پھیل گئی اور پھر میں غم و غصہ پھیل گیا۔ ایک
...جلے آدمی کو انتظامیہ کے ذریعے سے چیماں کی ٹوہ لینے
...کے لیے قصبہ بھیجا گیا۔

جلوس میں شامل لوگ پانچ پانچ آدمیوں کی
لائن میں ایک لمبی قطار بنائے کھڑے تھے، بیچ بیچ میں
نعرے بازی رکھے گئے تھے۔ مظاہرین کے ہاتھوں میں
جھنڈیاں اور پلے کارڈ تھے، جن پر موٹے موٹے حروف
میں گوناگوں مانگوں کے علاوہ انتظامیہ کی غفلت شعاری،
سرد مہری اور جانب داری کو لتاڑا گیا تھا۔ آن کی آن
میں ایک نئے پلے کارڈ کا اضافہ ہوا، جس میں چیماں کی
فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

چیماں کی وجہ سے جلوس کی روانگی میں ایک
گھنٹہ کی تاخیر ہو گئی۔ اب بھی اکثر لیڈروں اور جوانوں
کو امید تھی کہ وہ اچانک کہیں سے نکل آئے گی اور
جلوس کی قیادت کرے گی۔

چیماں کی غیر موجودگی سب کو کھل رہی تھی۔
خاص طور سے نوجوانوں کی مایوسی ان کے چہرے پر پڑھی
جا سکتی تھی۔ کئی جوانوں نے کہا کہ اگر چیماں نہیں آئی تو
وہ بھی جلوس میں شریک نہیں ہوں گے، لیکن چند عورتیں
کی مداخلت پر انہوں نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔

جلوس کی روانگی مؤخر کی جاتی تھی، کیوں کہ اس
آدمی کا انتظار تھا جو چیماں کی ٹوہ لینے گیا تھا۔

مزید آدھ گھنٹے کی تاخیر ہوئی اور پھر جلوس
روانگی کے لیے حرکت میں آیا۔ اور اسی لمحہ ہراول میں
موجود لیڈروں نے دیکھا کہ قصبے کی طرف سے تیز
رفتاری سے ایک ٹیکسی آ رہی ہے۔ جلوس چند لمحوں
کے لیے رک گیا۔

ٹیکسی میں سے وہ آدمی نمودار ہوا جس کا انتظار
تھا۔ کئی سیاسی لیڈر اور نوجوان اس کی طرف دوڑے
"وہ اب کبھی نہیں آئے گی۔" اس آدمی کا لہجہ
دو ٹوک تھا۔

سب لوگ مجسم سوال بن کر ہمہ تن گوش تھے
اس آدمی نے اعلان کیا۔ "کل شام اس نے ہیرا کے
ساتھ شادی کر لی ہے۔"

●●

خیال اپنا اپنا

نتیجہ ... دسمبر ۱۹۸۵ میں شائع ہوگا

یہ انعامی مقابلہ آپ کو موجودہ دور کے مختلف مسئلوں اور سوالوں کے بارے میں اظہارِ رائے کا موقع اور دعوت دیتا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات اور فکری نتائج دوسروں تک پہنچائیے اور انعام حاصل کیجیے

پہلا انعام : سو روپے

دوسرا انعام : پچاس روپے

تیسرا انعام : تیس روپے

اس ماہ کا سوال ہے : اگر بڑی طاقتوں کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ میں ہو تو عالمی جنگ کے بادل چھٹ سکتے ہیں :

اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ لفظوں میں اپنے خیالات ہمیں لکھ بھیجیے۔ آپ کی تحریر ۵ ستمبر ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جانی چاہیے :

خیال اپنا اپنا" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ب
اکٹر کوٹنس
کی بیوی
ہندوستان
آئی

ہندوستان ہمیشہ امن اور شانتی کا علم بردار رہا ہے۔ دنیا میں کہیں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں تو ہندوستان کے باشندے ان شعلوں کو بجھانے میں مدد کرتے ہیں جنگ میں وہ زخمیوں کی تیمارداری کرتے ہیں۔ آج سے ۶۰ سال پہلے ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک طبی وفد طرابلس گیا تھا۔ اس کے بعد دوسرا طبی وفد چین گیا تھا۔ جاپان نے ۱۹۳۷ میں چین پر حملہ کر دیا۔ چین اس زمانے میں ایک اونگھتا ہوا ملک تھا۔ غریبی، جہالت اور پس ماندگان کا شکار۔ ادھر جاپان یورپ کے نقشِ قدم پر چل کر ترقی کر رہا تھا طاقت کے بل بوتے پر جاپان نے چین پر چڑھائی کر دی۔ چین ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ اس کا رقبہ اور آبادی دونوں ہندوستان سے زیادہ ہیں۔ اس وقت چین میں ڈاکٹروں کی کمی تھی۔ جنگ میں زخمی ہونے والے سپاہی دھڑا دھڑ مر رہے تھے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے وہاں کی حکومت نے انڈین نیشنل کانگریس سے درخواست کی کہ وہ ہندوستانی ڈاکٹروں کا ایک وفد وہاں بھیجے۔ ۱۹۳۸ میں ۵ ڈاکٹروں پر مشتمل ایک ٹیم چین کے لئے روانہ ہو گئی۔ ڈاکٹر کوٹنس اس ٹیم کے ایک جوان ممبر تھے ڈاکٹروں کی ٹیم جب چین پہنچی تو فوراً محاذ پر بھیج دی گئی۔ اس ٹیم کے ممبران رات دن چینی زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے۔ ان کو طبی امداد بہم پہنچاتے۔ دوائیوں کی کمی تھی اس لئے کم سے کم دوائیں استعمال کی جاتیں۔ چین میں آج بھی

بانو محی دہلی

اس قوم کے کارنامے یادگار سمجھے جاتے ہیں۔ اس وفد کے ایک بنگالی ڈاکٹر باسو ابھی تک زندہ ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر دوارکا ناتھ کوٹنس چین میں بیمار ہوگئے اور وہاں ان کا انتقال ہوگیا۔

ڈاکٹر کوٹنس کو چین پہنچے ہوئے دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ ان کی ملاقات گوچینگ لانگ سے ہوئی۔ گوچینگ لانگ ایک نرس تھی۔ اس دن ڈاکٹر کوٹنس ایک تقریر کرنے والے تھے۔ چینگ لانگ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ ہندوستانی ڈاکٹر چینی زبان میں روانی سے بول رہا ہے۔ دو سال کے قلیل عرصے میں ڈاکٹر کوٹنس کا چینی زبان پر عبور پالینا یقیناً حیرت انگیز تھا۔ چینگ لانگ اس ڈاکٹر سے بہت متاثر ہوئی۔ اس نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ دونوں کا تعارف ہوا۔ دونوں جلد ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ ڈاکٹر کوٹنس چینگ لانگ کی مدد سے چینی زبان میں مزید مہارت حاصل کرتے اور وہ ان سے دواؤں کے متعلق معلومات حاصل کرتی۔ ڈاکٹر کوٹنس اپنی دوست کو تھوڑی بہت انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ چینگ لانگ کی مدد سے ڈاکٹر کوٹنس نے کئی چینی باشندوں کو ڈاکٹری کی تربیت دی۔ اس طرح ان کی دوستی پروان چڑھتی گئی اور ایک دن محبت میں بدل گئی۔

چین میں طبی وفد کا قیام تین سال کے لئے تھا، لیکن ۱۹۴۱ میں ڈاکٹر باسو نے چین کی عوامی پارٹی میں شامل ہونے کا ارادہ کرلیا۔ وہ جلد چین سے واپس نہیں آنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر کوٹنس کو بھی چین میں مزید قیام کے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آیا تو انہوں نے چینگ لانگ سے شادی کرنے کی ٹھان لی۔ یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر کوٹنس کا بھرا پرا خاندان ہندوستان میں تھا۔ کیا وہ ایک چینی عورت کو بہو بنانا پسند کرتے؟ کیا چینگ لانگ کو ہندوستان جانا پسند آتا؟ کیا چین سے ترکِ وطن کرنا اس کے لئے ممکن ہوتا؟ ڈاکٹر کوٹنس نے اس سلسلے میں اتنا سوچ بچار کیا کہ ان کے سر میں درد ہوگیا۔ لیکن ان کا فیصلہ شادی کے حق میں ہوا۔ انہوں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ آخرکار چین کے ایک فوجی کیمپ میں دونوں کی شادی ہوگئی۔

چین اور جاپان کی لڑائی کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ کبھی کبھی جاپانی فوج اچانک حملہ کردیتی تو کیمپ میں افراتفری پھیل جاتی جب ان حملوں میں اضافہ ہونے لگا تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ کیمپ کو میدان سے پہاڑوں میں بھیج دیا جائے۔ اب کیمپ غار ل میں تھا۔ چینگ لانگ کو تین مہینے کا حمل تھا۔ وہ پہاڑ کی چڑھائی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اس لئے دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ ڈاکٹر کوٹنس کو جب بھی وقت ملتا، وہ پرانے کیمپ میں اپنی بیوی سے ملنے پہنچ جاتے کچھ دن بعد جاپان کے حملے کم ہوئے تو چینگ لانگ ڈاکٹر کوٹنس کے پاس پہنچ گئی۔ ایک لمبے عرصے

بانو نئی دہلی

کے بعد دونوں کو ایک دوسرے کی رفاقت نصیب ہوئی۔ شادی کے ۹ مہینے بعد چنگ لانگ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام اینگ ہوا رکھا گیا۔ چینی زبان میں 'اینگ' کے معنی 'انڈیا' ہیں اور 'ہوا' چین کو کہتے ہیں۔ اس طرح بچے کا نام 'ہند چین' ہو گیا۔

ابھی اینگ ہوا چند مہینے کا تھا کہ ڈاکٹر کوٹنس بیمار ہو گئے۔ ان پر مرگی کے دورے پڑنے لگے۔ چین میں ان کا علاج نہیں ہو سکا۔ ان کا مرض بڑھتا گیا۔ مگر وہ بیماری کی حالت میں بھی کام کرتے رہے۔ ایک دن انہوں نے ۸۰ مریضوں کو مرہم پٹی کی تو دوسرے روز، [illegible] گھنٹے لگاتار کام کرتے رہے۔ اتنی شدید مشقت سے ایک صحت مند انسان بھی بیمار پڑ سکتا ہے اور ڈاکٹر کوٹنس تو خود بیمار تھے۔ آخر ان کی بیماری نے زور پکڑ لیا اور وہ چین کے بین الاقوامی اسپتال میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بیٹے اینگ ہوا کی عمر اس وقت ۳ مہینے تھی۔ چنگ لانگ سے ان کی شادی کو سوا سال گزر گیا تھا۔

ڈاکٹر کوٹنس نے وطن سے دور چین کی خدمت کرتے ہوئے جان دی۔ ان کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ چنگ لانگ نے ڈاکٹر کوٹنس کی موت کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ ڈاکٹر بن گئی۔ آج وہ چین کے شمالی مشرقی علاقے میں بچوں کی صحت کی نگراں ہے۔ ۱۹۵۲ میں چنگ لانگ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر ہندوستان آئی۔ اینگ ہوا اس وقت ۱۱ سال کا تھا۔ ڈاکٹر کوٹنس کے خاندان والوں نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ اینگ ہوا کی سالگرہ ہندوستان میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔

چین میں ڈاکٹر کوٹنس کی قربانی آج بھی احترام کے ساتھ یاد کی جاتی ہے۔ چین میں ان کا مجسمہ نصب ہے۔ ایک اسپتال ان کے نام پر بنایا گیا ہے۔ کئی ہال ان کی یاد میں تعمیر کئے گئے۔ ان کی زندگی کے متعلق کتابیں لکھی گئیں، ہم منٹ کی ایک فلم بھی بنائی گئی۔ ہندوستان میں بھی شانتارام نے 'ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی' کے نام سے ایک فلم بنائی تھی۔ ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران چنگ لانگ شولاپور گئی جہاں ایک اسپتال ڈاکٹر کوٹنس کے نام پر بنایا گیا ہے۔ وہ گوا اور بلگام بھی گئی۔

اینگ ہوا بھی باپ کے نقشِ قدم پر چل کر ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ اس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ لیکن بدقسمتی سے اسے کالج میں پیٹ کا روگ لگ گیا۔ اس کے فارغ التحصیل ہونے میں ایک سال باقی تھا کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کی عمر ۲۲ سال تھی۔

۱۹۸۵ میں چنگ لانگ دوبارہ ہندوستان آئی۔ اب اس کی عمر ۷۵ سال ہے۔ اسے اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کا غم ہے، لیکن اس نے اپنے غم کو لوگوں کی خدمت میں بھلا دیا ہے۔

چنگ لانگ کا بیان ہے کہ اب چین میں لڑکیوں کی پیدائش پر سوگ نہیں منایا جاتا۔ پہلے کبھی کبھار لڑکیوں کو مار ڈالنے کی خبریں ملتی تھیں، لیکن آج ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ ایسے مجرموں کو کڑی سے کڑی سزا دی جاتی ہے۔ چین میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ عورت آدھا آسمان سنبھالتی ہے۔ چین کی حکومت نے اس مقولے کو سچ کر دکھایا ہے۔ وہاں زندگی کے ہر شعبہ میں عورت کا دخل ہے۔ وزیر، سفیر، ڈاکٹر، میئر، حتیٰ کہ فوج میں بھی عورت کا عمل دخل ہے۔ چین میں گھریلو کام میں بھی مرد عورت کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اگر عورت کام سے فارغ ہو کر پہلے گھر پہنچ گئی تو وہ کھانا تیار کرتی ہے۔ اگر مرد پہلے پہنچ گیا تو وہ پکاتا ہے۔

چین میں ڈاکٹر مغربی طریقۂ علاج اور چینی طریقہ، دونوں سیکھتے ہیں۔ ایکیوپنکچر چین کی ایجاد ہے۔ اسے وہاں دوبارہ زندہ کیا جا رہا ہے۔ وہاں علاج سے زیادہ پرہیز سکھایا جاتا ہے۔ چنگ لانگ گاؤں گاؤں پھرتی ہے اور عورتوں کی صحت کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کوٹنس کی تربیت بے کار نہیں گئی۔

بانو، نئی دہلی

○○

یوں نگاہوں سے گرانا تو کوئی بات نہیں
گرنے والوں کو سنبھالو تو بڑا کام کرو
(شمیم) مس سیدہ رابعہ، نرمل

غم ہے تو اک یہی ہے اسی جستجو میں ہوں
خوشیاں اگر ملیں تو زمانے کو بانٹ دوں
(رئیس رامپوری) محمد اظہر سعید، حیدرآباد

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری
(اقبال) غزل، علی گڑھ

یہ الگ بات ہے تکمیل نہ ہونے پائے
ورنہ ہر ذہن میں اک تاج محل ہوتا ہے
(نامعلوم) عبدالاحد، چھپرہ

جسارت زندگی بھر سر اٹھانے کی نہ اب ہوگی
سبق، شیشے کچھ ایسا پتھروں کو آج دے آئے
(ضیاء) فرح مبین سہروردی، حیدرآباد

مجھے تو زندگی بھر اب تری یادوں میں جینا ہے
تجھے بھی کیا کبھی گزرے زمانے یاد آئیں گے
(ساحر) رخسانہ، علی گڑھ

تمام خلق کی دولت سمیٹ لے انساں
سکونِ قلب میسر نہیں تو کچھ بھی نہیں
(نامعلوم) عباسی اکبر علی، بڑودا

ہے نظر کاتب کی اپنے ہاتھ کی تحریر پر
خود مصور ہی لُٹا جاتا ہے اس تصویر پر
(نامعلوم) مہرالنساء قاضی، پرانی ممبئی

"میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

نتیجہ: ذہنی ورزش

اس مقابلے میں سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی بھی بانو بہن، بھائی نے نہیں بھیجے۔ نتیجہ نمبر ۷ میں مسز کے، ارشید (رام پور) کے ارسال کئے ہوئے جوابات میں ایک غلطی تھی۔ تیسرے سوال کے جواب میں انہوں نے "مصر"، کی جگہ 'عرب' لکھا تھا۔ اور نتیجہ نمبر ۸ میں حصہ لینے والوں کی تعداد بہت زیادہ رہی۔ صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تعداد کافی رہی۔ قرعہ اندازی کے ذریعے انعام کی حق دار مس سلطانہ (دہلی) قرار پائیں۔ ان دونوں کو ایک ایک سوان پرنسٹر کو کر دیا جا رہا ہے۔

نتیجہ نمبر ۷

صحیح جواب یہ ہیں:

۱۔ قلوپطرہ
۲۔ اسوان ڈیم
۳۔ مصر
۴۔ پانچ ریاستوں میں
۵۔ بدخشاں
۶۔ بہار
۷۔ عظیم بیگ چغتائی
۸۔ بائیبل
۹۔ ۱۹۴۶
۱۰۔ پارسی

مسز کے، ارشید (رام پور)

نتیجہ نمبر ۸

صحیح جواب یہ ہیں:

۱۔ بحرالکاہل
۲۔ امریکہ
۳۔ مسز بندرانائیکے
۴۔ اٹلی
۵۔ مہرالنساء
۶۔ ڈپٹی نذیر احمد
۷۔ فیض آباد
۸۔ میر
۹۔ اینی بیسنٹ
۱۰۔ ۱۰۰ فی صد

مس سلطانہ (دہلی)

کروٹ

قاضی انیس الحق

ریکھا طالب علمی کے زمانے میں بڑی تیز لڑکی تھی۔ پڑھائی میں بھی، لڑکوں کے ساتھ بھی، عورتوں کو حقوق دلانے میں بھی، ان پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے میں بھی اور ماں باپ کی فرماں برداری میں بھی مگر پتہ نہیں کیوں کالج کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد، جب وہ گھر پر رہنے لگی تو اس کے اندر کا سارا جوش، چنچل پن، شوخی اور انقلابی جذبات سب ختم ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پہاڑی جھرنا چھوٹ کر پہاڑیوں پر سے بہتا ہوا اچانک کسی تالاب میں آکر رک گیا ہو اور آگے بڑھنے کی کوئی سبیل نہ ہو۔

لڑکی جب سے جوان ہوتی ہے، اسی دن سے ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر شروع ہو جاتی ہے ریکھا کے ماں باپ کو بھی ریکھا کی شادی کی فکر تھی۔ شیش گری جیسے افسر کو داماد ملنا کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی، مگر زمانہ اتنا خراب ہوتا جا رہا تھا کہ ان کی ذات میں جتنے لڑکے تھے، وہ جہیز تو لیتے ہی تھے، ان کے اخلاق بھی بے حد گرتے جا رہے تھے۔ اس لئے ان کو اپنی لاڈلی بیٹی کے لئے اچھے داماد کی تلاش تھی۔

ریکھا کے سامنے جب اس کی شادی کی باتیں ہوتیں تو اس کو بہت برا محسوس ہوتا۔ وہ سوچتی کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں لڑکی کا مقام سماج میں کتنا نیچے

یوں نگاہوں سے گرانا تو کوئی بات نہیں
...رنے والوں کو سنبھالو تو بڑا کام کرو
(شمیم) مس سیّدہ رابعہ، نرمل

غم ہے تو اک یہی ہے اسی جستجو میں ہوں
خوشیاں اگر ملیں تو زمانے کو بانٹ دوں
(رئیس رامپوری) محمد اظہر سعید، حیدرآباد

...یک اے شمع آنسوؤں کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری
(اقبال) غزل، علی گڑھ

یہ الگ بات ہے تکمیل نہ ہونے پائے
ورنہ ہر ذہن میں اِک تاج محل ہوتا ہے
(نامعلوم) عبدالاحد، چھپرہ

جسارت زندگی بھر سر اُٹھانے کی نہ اب ہوگی
سبق، شیشے کچھ ایسا پتھروں کو آج دے آئے
(ضیاء) فرح مبین سہروردی، حیدرآباد

مجھے تو زندگی بھر اب تری یادوں میں جینا ہے
تجھے بھی کیا کبھی گزرے زمانے یاد آئیں گے
(ساحر) رخسانہ، علی گڑھ

تمام خلق کی دولت سمیٹ لے انساں
سکونِ قلب میسّر نہیں تو کچھ بھی نہیں
(نامعلوم) عباسی اکبر علی، بڑوانی

ہے نظر کاتب کی اپنے ہاتھ کی تحریر پر
خود مصوّر ہی لُٹا جاتا ہے اس تصویر پر
(نامعلوم) مہرالنساء قاضی، پرانی ہبلی

"میرا پسندیدہ شعر" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

نتیجہ: ذہنی ورزش

نتیجہ نمبر ۷

صحیح جواب یہ ہیں:

۱۔ قلوپطرہ
۲۔ اسوا براؤن
۳۔ مصر
۴۔ پانچ ریاستوں میں
۵۔ بدخشاں
۶۔ بہار
۷۔ عظیم بیگ چغتائی
۸۔ بائبل
۹۔ ۱۹۴۶
۱۰۔ پارسی

مسز کے، رشید (رام پور)

اس مقابلے میں سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی بھی بانو بہن، بھائی نے نہیں بھیجے۔ نتیجہ نمبر ۷ میں مسز کے، رشید (رام پور) کے ارسال کئے ہوئے جوابات میں ایک غلطی تھی۔ تیسرے سوال کے جواب میں انہوں نے "مصر" کی جگہ 'عرب' لکھا تھا۔ اور نتیجہ نمبر ۸ میں حصّہ لینے والوں کی تعداد بہت زیادہ رہی۔ صحیح جوابات بھیجنے والوں کی تعداد کافی رہی۔ قرعہ اندازی کے ذریعے انعام کی حق دار مس سلطانہ (دہلی) قرار پائیں۔ اِن دونوں کو ایک ایک سوان پریشر کوکر دیا جارہا ہے۔

نتیجہ نمبر ۸

صحیح جواب یہ ہیں:

۱۔ بحرالکاہل
۲۔ امریکہ
۳۔ مسز بندرانائیکے
۴۔ اٹلی
۵۔ مہرالنساء
۶۔ ڈپٹی نذیر احمد
۷۔ فیض آباد
۸۔ میر
۹۔ اینی بیسنٹ
۱۰۔ اُنی صد

مِس سلطانہ (دہلی)

قاضی انیس الحق

ریکھا طالب علمی کے زمانے میں بڑی تیز لڑکی تھی۔ پڑھائی میں بھی، لڑکوں کے ساتھ بھی، عورتوں کو حقوق دلانے میں بھی، ان پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے میں بھی، اور ماں باپ کی فرماں برداری میں بھی مگر پتہ نہیں کیوں کالج کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد، جب وہ گھر پر رہنے لگی تو اس کے اندر کا سارا جوش، چنچل پن، شوخی اور انقلابی جذبات سب ختم ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پہاڑی جھرنا پھوٹ کر پہاڑیوں پر سے بہتا ہوا اچانک کسی تالاب میں آ کر رک گیا ہو اور آگے بڑھنے کی کوئی سبیل نہ ہو۔

لڑکی جب سے جوان ہوتی ہے، اسی دن سے ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر شروع ہو جاتی ہے ریکھا کے ماں باپ کو بھی ریکھا کی شادی کی فکر تھی۔ شیش گری جیسے افسر کو داماد ملنا کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی، مگر زمانہ اتنا خراب ہوتا جا رہا تھا کہ ان کی ذات میں جتنے لڑکے تھے، وہ جہیز تو لیتے ہی تھے، ان کے اخلاق بھی بے حد گرتے جا رہے تھے۔ اس لیے ان کو اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے اچھے داماد کی تلاش تھی۔

ریکھا کے سامنے جب اس کی شادی کی باتیں ہوتیں تو اس کو بہت برا محسوس ہوتا۔ وہ سوچتی کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں لڑکی کا مقام سماج میں کتنا نیچے

گھر گیا ہے۔ اس سے چھٹکارا پانے کے لئے ماں باپ ہزاروں روپے میں لڑکے خریدتے ہیں اور پھر اپنی لونڈیا کو اسی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی بھروسا نہیں کہ شادی کے بعد لڑکے کا برتاؤ لڑکی کے ساتھ ٹھیک ہی رہے۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے بھی لوگ اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی رشتہ آتا تو اس کا دل چاہتا کہ شادی سے انکار کر دے مگر اس کی فرماں بردار طبیعت اس کی باغی جذبات کو کچل دیتی۔

ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس کو اپنے ماں باپ کی مرضی کے مطابق مہیش کو پسند کرنا ہی پڑا۔ مہیش، بسوائی ڈرو الیکٹرک پروجیکٹ میں منیجر تھا۔ خوب صورت، خاندانی، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک اعلیٰ افسر۔ ایک باپ اپنی لڑکی کے لئے ایسا ہی تو شوہر چاہتا ہے جب یہ چاروں باتیں لڑکے میں موجود ہوں تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ لڑکی شادی کے بعد سکھی رہے گی۔

شادی کے لئے مہیش کو صرف دس دن کی چھٹی ملی تھی۔ کام ذمہ داری کا تھا۔ برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا، اس لئے اس کو شادی کے تیسرے ہی دن اپنے کام پر واپس جانا پڑا۔ ریکھا کو بنگلور ہی میں رہنا پڑا۔ جس پہاڑی پر مہیش کام کر رہا تھا، وہ جگہ اتنی اچھی نہیں تھی کہ وہ نئی دلہن کو لے کر جاتا۔ اور تو اور وہاں اور کسی کی فیملی بھی نہیں تھی۔

تین راتیں مہیش کے ساتھ گزارنے کے بعد ریکھا کے دل میں یہ خیال ابھرا تھا کہ وہ بھی مہیش کے ساتھ ہی چلی جائے، مگر شوہر اور بزرگوں کے پہلے مشورے کو وہ کیسے رد کر سکتی تھی۔ تاہم ریکھا کو یہ بات عجیب سی لگی کہ کل تک وہ جس گھر میں رہ رہی تھی، وہ گھر ایک اجنبی کو پھولوں کا ہار پہنا دینے سے چھوٹ گیا تھا۔ آج وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں اجنبی بن گئی تھی۔ ماں باپ بھی کیسے ہوتے ہیں۔ کتنی دھوم دھام سے اپنی لڑکی کا گھر نکالا کرتے ہیں۔ اور کس شان سے شوہر بھی کام کی ذمہ داری کے بہانے اس کو اکیلا چھوڑ گیا تھا۔

ریکھا کی شادی ہوئے گیارہ مہینے ہوئے تھے۔ تین مہینے تک تو مہیش ہر مہینے دو تین دن کے لئے آجاتا اور میٹھی باتیں اور سنہرے سپنے دکھا کر چلا جاتا۔ محبت بھرے خط برابر آتے رہے۔ پہلے طول طویل اور دلچسپ باتیں، پھر تحریر مختصر ہو گئی۔ وقفہ طویل ہوتا گیا۔ بیچ میں وہ ایک بار پھر آیا۔ دفتری کام تھا۔ سات دن تک رہنا ہوا۔ خوب باتیں ہوئیں۔ قہقہے گونجے۔ مگر مہیش ریکھا کو پروجیکٹ سائٹ پر لے جانے کو تیار نہیں ہوا۔ البتہ اس نے وعدہ کیا کہ کالونی کچھ دن میں پوری ہو جائے گی اور لوگ بھی اپنی بیوی بچوں کو لائیں گے پھر وہ ریکھا کو ضرور بلائے گا۔

> اس نے فوراً کلینڈر پر تاریخ دیکھی۔ گھڑی میں تاریخ دیکھی۔ اور جب یقین ہو گیا کہ سولہ تاریخ میں ایک دن اور باقی ہے۔ تو اس کو کچھ اطمینان ہوا۔ پھر اس نے تحریر پر ایک نظر ڈالی تحریر ریکھا ہی کی تھی۔

ایک دن مہیش کو ریکھا کا خط ملا۔ وہ لفافہ ہاتھ میں لے کر اسے تولتا رہا۔ پھر پتہ دیکھا تو خوش ہوا۔ خط تو ریکھا ہی کا تھا، مگر وزن کم تھا۔ اس نے معمول کے مطابق خط کو ایک طرف رکھ دیا۔ آخر اس کا کام تھا، اس کی دنیا تھی۔ تیسرے دن اس کی نگاہ اس خط پر پڑی۔ اس نے مسکرا کر لفافہ اٹھایا اور اسے چاک کیا۔ اندر صرف ایک مختصر سا پرزہ تھا، ایک جملے کی تحریر پڑھ کر کاغذ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس نے فوراً کیلنڈر پر تاریخ دیکھی، گھڑی میں تاریخ دیکھی، اور جب یقین ہو گیا کہ سولہ تاریخ میں ایک دن اور باقی ہے تو اس کو کچھ اطمینان ہوا۔ پھر اس نے تحریر پر ایک نظر ڈالی۔ تحریر ریکھا ہی کی تھی۔

ڈیر

۱۶ مارچ کو شام کے چار بجے
تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں۔

ریکھا۔

ریکھا کی غیر متوقع آمد سے مہیش کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ مگر وہ اپنے دل کی کیفیت ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ اپنے دوستوں پر اور نہ ریکھا پر۔ مارچ کا مہینہ بابا بدھن کی پہاڑیوں پر بہار کی آمد کا مہینہ ہوتا ہے۔ آب و ہوا بدل جاتی ہے۔ اور پوری فضا میں مٹی کی خوشبو پھیلنے لگتی ہے۔ ہر دو ہاتھ پر پہاڑی چشمے اپنی ٹھنڈک سے کیف پیدا کرتے ہیں۔ اتنے حسین ماحول میں ریکھا کو پچھلے نو مہینے سے اپنے ساتھ نہ رکھ کر مہیش نے واقعی بھول کی تھی۔

ریکھا جب آئی تو اسے بھی یہ ماحول بہت پسند آیا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ مہیش نے اس سے جھوٹ کیوں کہا تھا کہ یہاں کوئی فیملی نہیں رہتی۔ تاہم وہ ان باتوں کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔ زندگی حسین گزر رہی تھی اور شادی کے بعد اس کو پہلی بار سکون نصیب ہوا تھا۔

یہاں آئے ہوئے ریکھا کو ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ مہیش بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ کام سے سیدھا گھر آجاتا، پھر ریکھا کو پہاڑیوں پر ادھر ادھر گھمانے لے جاتا۔ پیڑ، چھوٹے چھوٹے چشمے، پہاڑیاں، جنگل کے معصوم مزدور، دریا کی بے چینی۔ وہ قدرت کی ہر چیز سے لطف اندوز ہوتی۔ کبھی کبھی مہیش پروجیکٹ سائٹ پر چلا جاتا تو دیر سے گھر لوٹتا۔ شام رات میں بدلنے لگتی تو ریکھا کو ڈر سا لگتا۔ مگر جب وہ واپس آجاتا تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔

سہ پہر کا وقت تھا، کالونی کی عورتیں اپنا اپنا کام ختم کر کے سو چکی تھیں۔ سورج ذرا زیادہ ہی گرمی دکھا رہا تھا۔ مگر آم کے پیڑ کے نیچے بہت سکون تھا۔ ریکھا چارپائی پر بیٹھی ناول پڑھ رہی تھی کہ دور سے جیپ کی آواز آئی۔ یہ جیپ مہیش کی ہی ہو سکتی تھی۔ ریکھا مہیش کے دبے پاؤں کی آہٹ اور اس کی جیپ کی آواز کو خوب پہچانتی۔ مگر آج اتنی جلد؟ اتنی جلد تو مہیش کبھی کام سے نہیں لوٹا تھا۔ آج کوئی خاص بات.... یہ سوچ کر اس کو شرم سی آگئی۔ اتنے میں مہیش جیپ کو سڑک پر روک کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا مکان کی طرف آنے لگا۔

"اتنی بے قراری؟ چار بجے سے ہی راستہ دیکھنے لگتی ہو؟"

مہیش نے دور ہی سے ریکھا کو دیکھ کر کہا۔

"میں یہ دیکھ رہی تھی کہ کون بے قرار ہے — دفتر سے بھاگ کر آنے والا یا انتظار کرنے والی۔"

ریکھا نے جواب دے کر اپنا پلو درست کیا۔ اتنے میں مہیش اس کے قریب آگیا۔

"آج اتنی جلدی کیسے؟"

"چائے کے لئے نہیں پوچھو گی؟" مہیش نے ہلکی مسکراہٹ سے اس کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

چند منٹ کے بعد مہیش آرام کرسی پر دراز ہاتھ میں چائے کی پیالی لئے کسی خیال میں غرق چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سامنے ریکھا بیٹھی کسی رنگین بات سے ماحول کی خاموشی کو توڑنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اتنے میں باہر سے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور اچانک دونوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان ضرور ہاتھ میں نیزہ لئے گھر میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کو آتے دیکھ کر دونوں کھڑے ہو گئے۔ ریکھا کچھ گھبرا سی گئی۔

"کون ہو تم؟" مہیش نے کڑک کر کہا۔

"تم جاننا چاہتے ہو، میں کون ہوں؟" نووارد نے نیزے کو تولتے ہوئے کہا۔

"بدتمیز! زبان سنبھالو۔ مجھے تم کہہ رہے ہو!"

"ہاں ساب، تم ہی کہوں گا۔"

"بدتمیز!" مہیش اس کی طرف لپکا۔

"نیزے کی نوک بہت تیز ہے، ساب۔ زہر میں بھی ڈوبی ہے۔ اس سے دور رہو۔"

مہیش وہیں رک گیا۔ ریکھا گھبرائی ہوئی کبھی اپنے شوہر کو دیکھتی، کبھی اس نوجوان کو۔ جب اس نے نیزہ مہیش کی طرف بڑھایا تو ریکھا چیخ اٹھی۔

"رکو! یہ کیا کر رہے ہو! کون ہو تم؟"

> اتنے میں باہر سے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور اچانک دونوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان مزدور ہاتھ میں نیزہ لئے گھر میں داخل ہو رہا ہے۔

"میم ساب! مزدور نے زبان چباتے ہوئے کہا:

"میم ساب، میں ایک بدنصیب مزدور ہوں۔ یہاں کام کرتا ہوں۔ میری شادی ہوئے تین مہینے ہوئے ہیں۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی ہے۔ وہ میکے تھی۔ کل اس ساب نے اس سے اپنا مونہہ کالا کیا ہے میری سجو نے خودکشی کر لی.... میم ساب وہ اچھی لڑکی تھی۔" مزدور کی آواز بھاری ہونے لگی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔" مہیش نے چلا کر کہا۔

"سارا لوگ تمہارا کرتوت جانتا ہے، ساب۔ سارا لوگ جانتا ہے۔ تم نے کل اپنا مونہہ کالا کیا۔ مزدوروں سے بات چھپتی نہیں ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے؟" ریکھا نے گرج کر مہیش سے سوال کیا۔ ریکھا کی آنکھوں سے نکلتی ہوئی ریڈیائی کرنوں کی تاب مہیش جیسا کمظرف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

"جواب دو۔" ریکھا نے پھر بلند آواز میں کہا۔

"تم نے یہ کیا ہے؟ تم نے — میرے سہاگ نے چھیا!"

"تم اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ یہ لوگ کمینے ہوتے ہیں۔"

"یہ کمینے ہوتے ہیں یا تم کمینے ہو؟ مجھے سبق نہ پڑھاؤ۔" ریکھا نے اپنی پوری قوت سے کہا۔

اتنے میں بہت سارے مزدور در کارکن مکان کے اندر اور باہر جمع ہونے لگے تھے۔ نوجوان مزدور اس ڈر سے کہ کہیں موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ مہیش پہ وار کرنے کے لئے آگے بڑھا۔

"رک جاؤ!".... ریکھا نے اس مزدور سے کہا۔ "اپنے محنت کرنے والے ہاتھوں کو اس کے گندے خون سے ترمت کرو۔"

"ہم غریب اور مفلس نظلم پر یہی سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ہمیں سب اپدیش دیتے ہیں۔ راستہ کوئی نہیں دکھاتا۔"

"میں اپدیش نہیں دے رہی ہوں، راستہ دکھا رہی ہوں۔ تم اس کو پولیس کے حوالے کر دو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میں تمہاری سجو کی جگہ دوں گی۔ اس کمینے کے ساتھ میں ایک پل نہیں رہ سکتی۔"

سارے کارکن افسر اور مزدور دم بخود تھے۔ ریکھا اس مزدور کا ایک ہاتھ تھامے قہر آلود نگاہوں سے مہیش کو دیکھ رہی تھی۔

مہیش سر تھامے کرسی پر گر گیا۔ زندگی ایسی کروٹ لے گی، اُسے کبھی خواب میں بھی خیال نہیں آیا تھا۔

گلوں سے خار بہتر ہیں....

جان سویڈن میں رہتا ہے۔ اس کی عمر ۵۰ سال ہے۔ گزشتہ سال اس کی بیوی اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے مرد کے ساتھ چلی گئی۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ ساتھی کے نام پر گھر میں صرف ایک کتا رہ گیا ہے۔ جان نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ اس کتے کو اپنی بیوی کی قبر میں دفن کرنا چاہتا ہے۔ قبرستان میں جان کی فیملی کا اپنا احاطہ ہے وہاں جان اور اس کی بیوی کی قبروں کے لئے جگہ خالی ہے۔ یہ دونوں قبریں ساتھ ساتھ ہیں چونکہ جان کی بیوی زندگی میں اس کا ساتھ چھوڑ گئی، اس لئے جان موت کے بعد اپنے رفیق کتے کو برابر کی قبر میں جگہ دینا چاہتا ہے وہ اپنی ابدی آرام گاہ میں ایک شریف تر، ساتھی کے ساتھ آرام کرنا چاہتا ہے۔ یہ ساتھی اس کی بیوی سے زیادہ ہمدرد، وفادار اور غمگسار ثابت ہوا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ سویڈن کا قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ جان نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ اس معاملے میں اس سے خصوصی سلوک کیا جائے۔ آخر انسان اور کتے کے جسم میں کیا فرق ہے؟ انسان [illegible] بھی [illegible] فی صد پانی [illegible] فی صد [illegible] فی صد چکنائی اور [illegible] فی صد نمکیات ہیں۔

عورتیں تنہا زندگی گزارنا چاہتی ہیں

جاپان کی [illegible] ٹوکیو میں حال ہی میں ایک سروے ہوا۔ لوگوں سے پوچھا گیا کہ وہ شادی شدہ زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں یا تنہا زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اس سروے کے مطابق [illegible] فی صد [illegible] نے بیان کیا [illegible] تنہا [illegible] کریں گے۔ اگر گھر میں کھانا پکانے، صفائی ستھرائی کرنے کی سہولیتیں موجود ہوں تو وہ شادی کے جھمیلے میں پھنسنا پسند نہیں کریں گے۔ ۳۰ فی صد عورتوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا۔ ان عورتوں کی عمر ۳۰ سے ۴۰ سال تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ معاشی طور پر آزاد ہیں۔ دفتر اور گھر دونوں کا کام بخوبی سنبھال سکتی ہیں۔ انہیں کسی مرد کی مدد اور رفاقت کی ضرورت نہیں۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ ۴۰ فی صد عورتوں نے بیان کیا کہ جاپان میں عورتوں کی [illegible] معاشی آزادی [illegible] کی [illegible] ہے۔

سونے سے گھڑا ول ہنگی

ہمارے ملک میں [illegible] اور [illegible] کی قیمت کئی سال سے جاری ہے حکومت نے [illegible] سے [illegible] در آمد [illegible] ہے۔ لیکن باہر سے [illegible] ہے۔ اس کے لئے

قانون کا بدلنا ضروری ہے۔ مہنگائی کا اثر جہاں کھانے پینے اور استعمال کرنے کی اشیاء پر پڑا ہے وہاں نوٹوں اور سکوں کی پیداوار بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔ ایک روپے کے نوٹ کی عمر ایک مہینہ ہوتی ہے اور اسے چھاپنے میں تقریباً ۵ روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ ۲ روپے کا نوٹ ۵ روپے ۶۰ پیسے میں چھپتا ہے ۵ کا نوٹ ۵۵-۶ میں۔ ۱۰ روپے کے نوٹ پر ۸ روپے ۵۰ پیسے لاگت آتی ہے۔ یہ آفسیٹ پر چھپتا ہے۔ اس کا معمولی نوٹ ۴ٖ روپے میں چھپتا ہے۔ ۲۰ روپے کا نوٹ ۱۴ روپے ۷۰ پیسے میں چھپتا ہے۔ ۵۰ روپے کے نوٹ پر ۱۶ روپے اور ۱۰۰ روپے کے نوٹ پر ۱۷ روپے ۳۰ پیسے لاگت آتی ہے۔ ۵ پیسے کا سکہ ۱۰ پیسے میں، ۱۰ پیسے کا سکہ ۲۱ پیسے میں، ۲۵ کا سکہ ۳۳ پیسے میں اور ۵۰ کا سکہ ۴۴ پیسے میں ڈھلتا ہے۔

تعلیم یافتہ جوڑوں کی شادی کا خرچ حکومت کے ذمے

لی کوان یو سنگاپور کے وزیر اعظم ہیں انہوں نے اپنے ۲۵ سالہ دور وزارت میں سنگاپور کی کایا پلٹ دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹا سا جزیرہ خوشحالی میں یورپ اور امریکہ کے ملکوں سے بھی بازی لے گیا۔ صنعتی اور تجارتی ترقی کے بعد لی کوان یو نے انسان کی پرائیوٹ زندگی کو سدھارنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کا یقین ہے کہ عقلمند، تعلیم یافتہ اور خوشحال ماں باپ ہی اپنے بچوں کو کسی قابل بنا سکتے ہیں اس لئے صرف انہیں ہی بچے پیدا کرنے چاہئیں۔ [illegible] جاپان [illegible] رہنے چاہئیں۔ حال ہی میں سنگاپور کی حکومت نے اس سلسلے میں ایک [illegible]

مستقبل کی کار

جب سے پٹرول کے دام بڑھے ہیں، سائنس داں پٹرول کا بدل ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ اب ایسی بیٹریاں ایجاد ہو رہی ہیں جنہیں سورج کی شعاعوں سے چارج کیا جا سکتا ہے۔ یہ بیٹریاں کیمرے سے لے کر کیسٹ ریکارڈر تک کام کر رہی ہیں۔ ان کو دھوپ میں ۲ گھنٹے رکھنا پڑتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک سائنس داں نے ایسی تھرماس ایجاد کی ہے جس میں دھوپ کی روشنی سے پانی ابال کر چائے تیار کی جا سکتی ہے۔ اس کی قیمت ۵۰۰ روپے ہے۔ اب جرمنی کی مرسیڈیز کمپنی نے ایسی کار ایجاد کی ہے جو سورج کی کرنوں سے چلتی ہے۔ اس کا ڈھانچہ شیشے کا ہے۔ شہر کی سڑکوں پر اس کی رفتار ۴۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ ہے اور ڈھلان پر ۵۵ کیلومیٹر۔ اس کار کو ایک گھنٹہ چلانے کے لئے اسے تین گھنٹے دھوپ میں کھڑا رکھنا پڑتا ہے، یعنی اس کے لئے تین گھنٹے کا تیلو لا ضروری ہے۔ اس کی قیمت ۹ لاکھ روپے ہے۔ ممکن ہے مستقبل میں اس کی قیمت کم ہو جائے۔

اس نے نشاط کا رول ادا کیا اور چند ایسے جوڑے منتخب کئے جن کے پاس یونی ورسٹی کی ڈگری تھی۔ حکومت نے ان جوڑوں کو شادی پر رضا مند کیا اور ان کی شادی کا سارا بار اٹھانے کا وعدہ کیا۔ ان شادیوں پر ۲۱ لاکھ روپیہ خرچ آیا۔ آج کل یونی ورسٹی کے ڈگری لئے ہوئے طالب علموں کے لئے ایک دوسرے سے ملنے کے مواقع فراہم کئے جا رہے ہیں۔ رات کو کنوارے جوڑے قمقموں سے روشن جہاز پر سفر کرتے ہیں۔ موم بتی کی روشنی میں کھانا کھاتے ہیں۔ اس رومانٹک ماحول میں انہیں ایک دوسرے کے قریب آنے کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ لی کوان یو کا خیال ہے کہ اس طرح سنگاپور کے آئندہ شہری خوش حالی میں مدد کر سکتے ہیں۔

ایک انوکھی شادی

ہندوؤں میں شادی ایک لمبی تقریب ہے۔ اس کے دوران میں گھنٹوں منتر پڑھے جاتے ہیں۔ شادی کی تقریب میں بیوہ عورتیں حصہ نہیں لے سکتیں۔ حال ہی میں تامل ناڈو کے شہر سیلم میں شادی کی ایک تقریب منعقد ہوئی جہاں ایک باغی اور باہمت انسان نے ہر اس رسم کے خلاف عمل کیا جسے ہندو مقدس اور ضروری سمجھتے ہیں۔ سب سے پہلے برات کے شرکاء کا نمبر تھا۔ اس میں ۵۰۰ بیواؤں نے حصہ لیا، جب کہ ایسی تقریب میں ان کا حصہ لینا منحوس سمجھا جاتا ہے۔ عموماً بیواؤں کے بال کاٹ دئے جاتے ہیں۔ وہ رنگین ساڑی نہیں پہن سکتیں۔ اس برات میں انوکھی بات یہ تھی کہ ساری بیوائیں رنگ برنگی ساڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے زیورات بھی پہنے ہوئے تھے۔ یہ برات ایک سیاہ بالوں میں قید ہوئی اور راہو کال (شگون) کے ساتھ دلہن کے گھر پہنچی۔ شادی کے منڈپ نے کسی فلمی گانے کی یا خوشی کی دھن نہیں بجائی۔ سڑک کے دونوں طرف ہزاروں لوگوں کا ہجوم اس انوکھی برات کا تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو گیا۔

شادی کی رسم کے لئے مہورت کا شبھ وقت نکالا گیا تو اس میں یہ التزام تھا کہ یہ راہو کال ہو جو شادی کے لئے سب سے منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس شادی میں شرکت کرنے کے لئے دور دراز سے مذہب و رسوم و رواج کے باغی اور دہریے آئے تھے۔ دو بیواؤں نے منگل سوتر کو اپنی نیک خواہشات کے ساتھ دولہا کو پیش کیا۔ دولہا نے منگل سوتر دلہن کو پہنایا۔ پنڈت کے منتروں کی بجائے یہ نعرے لگائے گئے "توہم پرستی مردہ باد!" "بیواؤں کی بے عزتی مردہ باد!"

شادی کے موقع پر مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ اس میں مٹن بریانی بھی تھی۔ (بکرے کا گوشت بھی جنوبی ہند میں منحوس ہے) غرض اس شادی میں ہر رسم اور رواج کے خلاف کام کیا گیا۔

دولہا کے باپ مولقو سوامی مذہب کے باغی ہیں۔ وہ راما سوامی پیریار کے معتقد ہیں۔ راما سوامی دہریوں کے گورو تھے۔ ان کی عمر ۹۰ سال تھی تو ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ برہمنوں کی اجارہ داری کے سخت مخالف تھے۔ وہ عمر بھر دہریت کا پرچار کرتے رہے۔

دیس بدیس کی خبریں

گلوں سے خار بہتر ہیں....

جان سویڈن میں رہتا ہے۔ اس کی عمر ۵۰ سال ہے۔ گزشتہ سال اس کی بیوی اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے مرد کے ساتھ چلی گئی۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ ساتھی کے نام پر گھر میں صرف ایک کتا رہ گیا ہے۔ جان نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ اس کتے کو اپنی بیوی کی قبر میں دفن کرنا چاہتا ہے۔ قبرستان میں جان کی فیملی کا اپنا احاطہ ہے وہاں جان اور اس کی بیوی کی قبروں کے لئے جگہ خالی ہے۔ یہ دونوں قبریں ساتھ ساتھ ہیں چونکہ جان کی بیوی زندگی میں اس کا ساتھ چھوڑ گئی، اس لئے جان موت کے بعد اپنے رفیق کتے کو برابر کی قبر میں جگہ دینا چاہتا ہے۔ وہ اپنی ابدی آرام گاہ میں ایک "شریف تر" ساتھی کے ساتھ آرام کرنا چاہتا ہے۔ یہ ساتھی اس کی بیوی سے زیادہ ہمدرد، وفادار اور غم گسار ثابت ہوا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ سویڈن کا قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ جان نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ اس معاملے میں اس سے خصوصی سلوک کیا جائے۔ آخر انسان اور کتے کے جسم میں کیا فرق ہے؟ انسان کی طرح اس میں بھی ۷۰ فی صد پانی، ۱۵ فی صد پروٹین، ۱۰ فی صد چکنائی اور ۵ فی صد نمکیات ہیں۔

عورتیں تنہا زندگی گزارنا چاہتی ہیں

جاپان کی راجدھانی ٹوکیو میں حال ہی میں ایک سروے ہوا۔ لوگوں سے پوچھا گیا کہ وہ شادی شدہ زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں یا تنہا زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اس سروے کے مطابق ۶۲ فی صد مردوں نے بیان کیا کہ وہ تنہا رہنا پسند کریں گے۔ اگر گھر میں کھانا پکانے، صفائی ستھرائی کرنے کی سہولتیں موجود ہوں تو وہ شادی کے جھمیلے میں پھنسنا پسند نہیں کریں گے۔ ۶۰ فی صد عورتوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا۔ ان عورتوں کی عمر ۳۰ سے ۴۰ سال تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ معاشی طور پر آزاد ہیں۔ دفتر اور گھر دونوں کا کام بخوبی سنبھال سکتی ہیں۔ انہیں کسی مرد کی مدد اور رفاقت کی ضرورت نہیں۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ ۴۸ فی صد عورتوں نے بیان کیا کہ جاپان میں عورتوں کی بڑھتی ہوئی معاشی آزادی اس صورت حال کی ذمہ دار ہے۔
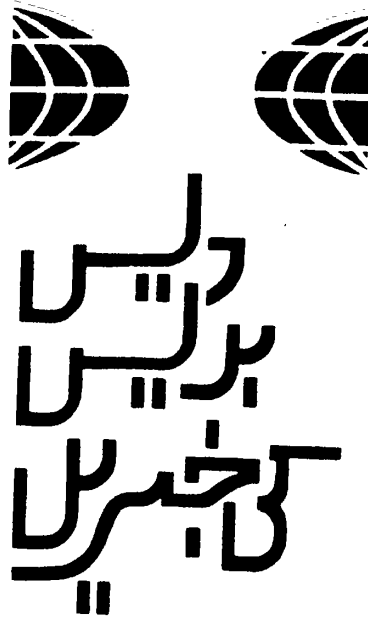
سونے سے گھڑاول مہنگی

ہمارے ملک میں چھوٹے نوٹوں اور ریزگاری کی قلت کئی سال سے جاری ہے۔ حکومت نے مغربی ممالک سے ریزگاری درآمد کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ لیکن باہر سے سکے درآمد کرنا غیر قانونی ہے۔ اس کے لئے قانون کا بدلنا ضروری ہے۔ مہنگائی کا اثر جہاں کھانے پینے اور استعمال کرنے کی اشیاء پر پڑا ہے وہاں نوٹوں اور سکوں کی پیداوار بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔ ایک روپے کے نوٹ کی عمر ایک مہینہ ہوتی ہے اور اسے چھاپنے میں تقریباً ۵ روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ ۲ روپے کا نوٹ ۵ روپے ۶۰ پیسے میں چھپتا ہے ۵ کا نوٹ ۵۵-۶ میں۔ ۱۰ روپے کے نوٹ پر ۸ روپے ۵۰ پیسے لاگت آتی ہے۔ یہ آفسیٹ پر چھپتا ہے۔ ۱۰ کا معمولی نوٹ ۴½ روپے میں چھپتا ہے۔ ۲۰ روپے کا نوٹ ۱۴ روپے ۷۰ پیسے میں چھپتا ہے۔ ۵۰ روپے کے نوٹ پر ۱۶ روپے اور ۱۰۰ روپے کے نوٹ پر ۱۷ روپے ۳۰ پیسے لاگت آتی ہے۔ ۵ پیسے کا سکہ ۱۰ پیسے میں، ۱۰ پیسے کا سکہ ۱۲ پیسے میں، ۲۵ کا سکہ ۲۳ پیسے میں اور ۵۰ کا سکہ ۴۴ پیسے میں ڈھلتا ہے۔

تعلیم یافتہ جوڑوں کی شادی کا خرچ حکومت کے ذمے

لی کوان یو سنگاپور کے وزیر اعظم ہیں۔ انہوں نے اپنے ۱۵ سالہ دور وزارت میں سنگاپور کی کایا پلٹ دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ چھوٹا سا جزیرہ خوشحالی میں یورپ اور امریکہ کے ملکوں سے بھی بازی لے گیا۔ صنعتی اور تجارتی ترقی کے بعد لی کوان یو نے انسان کی پرائیویٹ زندگی کو سدھارنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کا یقین ہے کہ عقلمند تعلیم یافتہ اور خوشحال ماں باپ ہی اپنے بچوں کو کسی قابل بنا سکتے ہیں اس لئے صرف انہیں ہی بچے پیدا کرنے چاہئیں۔ غریب اور جاہل لوگ بے اولاد رہنے چاہئیں۔ حال ہی میں سنگاپور کی حکومت نے اس سلسلے میں ایک ٹھوس قدم اٹھایا۔

مستقبل کی کار

جب سے پٹرول کے دام بڑھے ہیں، سائنس داں پٹرول کا بدل ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ اب ایسی بیٹریاں ایجاد ہو رہی ہیں جنہیں سورج کی شعاعوں سے چارج کیا جا سکتا ہے۔ یہ بیٹریاں کیمرے سے لے کر کیسٹ ریکارڈ تک کام کر رہی ہیں۔ ان کو دھوپ میں ۶ گھنٹے رکھنا پڑتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک سائنس داں نے ایسی تھرماس ایجاد کی ہے جس میں دھوپ کی روشنی سے پانی اُبال کر چائے تیار کی جا سکتی ہے۔ اس کی قیمت ۵۰۰ روپے ہے۔ اب جرمنی کی مرسیڈیز کمپنی نے ایسی کار ایجاد کی ہے جو سورج کی کرنوں سے چلتی ہے۔ اس کا ڈھانچہ شیشے کا ہے۔ شہر کی سڑکوں پر اس کی رفتار ۴۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ ہے اور ڈھلان پر ۵۵ کیلومیٹر۔ اس کار کو ایک گھنٹہ چلانے کے لئے اسے تین گھنٹے دھوپ میں کھڑا رکھنا پڑتا ہے، یعنی اس کے لئے تین گھنٹے کا قیلولہ ضروری ہے۔ اس کی قیمت ۹ لاکھ روپے ہے۔ ممکن ہے مستقبل میں اس کی قیمت کم ہو جائے۔

اس نے مشاطہ کا رول ادا کیا اور چھ ایسے جوڑے منتخب کئے جن کے پاس یونی ورسٹی کی ڈگری تھی۔ حکومت نے ان جوڑوں کو شادی پر رضامند کیا اور ان کی شادی کا سارا بار اٹھانے کا وعدہ کیا۔ ان شادیوں پر ۱۶ لاکھ روپیہ خرچ آیا۔ آج کل یونی ورسٹی کے ڈگری لئے ہوئے طالب علموں کے لئے ایک دوسرے سے ملنے کے مواقع فراہم کئے جا رہے ہیں۔ رات کو کنوارے جوڑے قمقموں سے روشن جہاز پر سفر کرتے ہیں۔ موم بتی کی روشنی میں کھانا کھاتے ہیں۔ اس رومانٹک ماحول میں انہیں ایک دوسرے کے قریب آنے کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ لی کوان یو کا خیال ہے کہ اس طرح سنگاپور کے آئندہ شہری خوش حالی میں مدد کر سکتے ہیں۔

ایک انوکھی شادی

ہندوؤں میں شادی ایک لمبی تقریب ہے۔ اس کے دوران میں گھنٹوں منتر پڑھے جاتے ہیں۔ شادی کی تقریب میں بیوہ عورتیں حصہ نہیں لے سکتیں۔ حال ہی میں تامل ناڈو کے شہر سیلم میں شادی کی ایک تقریب منعقد ہوئی جہاں ایک باغی اور باہمت انسان نے ہر اس رسم کے خلاف عمل کیا جسے ہندو مقدس اور ضروری سمجھتے ہیں۔ سب سے پہلے برات کے شرکا کا نمبر تھا۔ اس میں ۵۰۰ بیواؤں نے حصہ لیا، جب کہ ایسی تقریب میں ان کا حصہ لینا منحوس سمجھا جاتا ہے۔ عموماً بیواؤں کے بال کاٹ دئے جاتے ہیں۔ وہ رنگین ساڑی نہیں پہن سکتیں۔ اس برات میں انوکھی بات یہ تھی کہ ساری بیوائیں رنگ برنگی ساڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے زیورات بھی پہنے ہوئے تھے۔ یہ برات ایک سینما ہال میں جمع ہوئی اور ماتمی جلوس کے ساتھ دلہن کے گھر پہنچی۔ شادی کے بینڈ نے کسی فلمی گانے کی یا خوشی کی دھن نہیں بجائی۔ سڑک کے دونوں طرف ہزاروں لوگوں کا ہجوم اس انوکھی برات کا تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو گیا۔

شادی کی رسم کے لئے مہورت کا شبھ وقت نکالا گیا تو اس میں یہ التزام تھا کہ یہ راہو کال ہو جو شادی کے لئے سب سے منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس شادی میں شرکت کرنے کے لئے دور دراز سے مذہب اور رسوم و رواج کے باغی اور دہریے آئے تھے۔ دو بیواؤں نے منگل سوتر کو اپنی نیک خواہشات کے ساتھ دولہا کو پیش کیا۔ دولہا نے منگل سوتر دلہن کو پہنایا۔ پنڈت کے منتروں کی بجائے یہ نعرے لگائے گئے: "توہم پرستی مردہ باد!" "بیواؤں کی بے عزتی مردہ باد!"

شادی کے موقع پر مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ اس میں مٹن بریانی بھی تھی۔ (بکرے کا گوشت بھی جنوبی ہند میں ممنوع ہے) غرض اس شادی میں ہر رسم اور رواج کے خلاف کام کیا گیا۔

دولہا کے باپ مولقو سوامی مذہب کے باغی ہیں۔ وہ راما سوامی پیریار کے معتقد ہیں۔ راما سوامی دہریوں کے گورو تھے۔ ان کی عمر ۹۰ سال تھی تو ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ برہمنوں کی اجارہ داری کے سخت مخالف تھے۔ وہ عمر بھر دہریت کا پرچار کرتے رہے۔

شہناز رحمن

چہرے کو تر و تازہ رکھنے کے لئے

بیوٹی سیلون ماسک کا استعمال کرتے ہیں۔ ایک فیشیل کا خرچ ۲۰ سے ۳۰ روپے تک ہوتا ہے۔ بیوٹی سیلون آج کل ہر بڑے شہر میں کھل گئے ہیں، لیکن عام طور پر امیر عورتیں ہی وہاں جاتی ہیں۔ اوسط درجے کے لوگ بیوٹی سیلون جاتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ ذیل میں ہم کچھ ایسے ماسک تجویز کرتے ہیں جو آپ کو بیوٹی سیلون جانے کی زحمت اور وہاں طلب کی جانے والی اونچی قیمت سے بچالیں گے۔

جب ہم چہرے پر ماسک لگاتے ہیں تو وہ گیلا ہوتا ہے۔ سوکھ جانے پر اسے دھو دیا جاتا ہے۔ ماسک سوکھنے سے پہلے اپنی کرامت دکھاتا ہے۔ ماسک سے دورانِ خون کی رفتار بڑھ جاتی ہے خون چہرے کی جلد کے بالائی حصے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس عمل سے چہرے کی جلد میں دبا ہوا گرد و غبار اور فاسد مادہ بھی جلد پر ابھر آتا ہے۔ جب ہم ماسک کو دھو کر صاف کرتے ہیں تو چہرے پر خون کی سرخی نمودار ہو جاتی ہے جسب ذیل ماسک آپ گھر بیٹھے ہی استعمال کر سکتی ہیں۔

آلو ایک عام ترکاری ہے۔ اس سے ماسک بھی بنایا جاتا ہے۔ اسے دو طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک بڑا آلو لیں۔ اسے چھیل کر درمیان سے کاٹ لیں۔ اب اسے صابن کی ٹکیا کی طرح چہرے پر رگڑیں۔ اس طرح چہرے کے داغ دھبے اور جھائیاں ختم ہو جائیں گی۔ دو تین منٹ تک رگڑنے کے بعد صابن اور ٹھنڈے پانی سے چہرے کو دھو ڈالیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آلو کو کدو کس میں کس لیں۔ اب آلو کے پتلے لچھے چہرے پر پھیلا دیں یہ عمل لیٹ کر کیا جا سکتا ہے۔ بیس منٹ تک انتظار کرنے کے بعد چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں۔

اگر گاجر کا موسم ہو تو اس سبزی سے بھی ماسک تیار کیا جا سکتا ہے۔ گاجر میں وٹامن سی اور وٹامن اے ہوتا ہے۔ اس سے چہرے کی جلد بیدار ہو جاتی ہے اور اس میں نمی پہنچ جاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ گاجر کو کس کر اس کا عرق نکال لیں۔ اگر گھر میں مکسی ہو تو یہ کام ایک منٹ میں ہو سکتا ہے۔ ایک گاجر کا عرق کافی ہے۔ اس میں سے دو چائے کے چمچے بھر عرق ایک پیالی میں نکال لیں۔ اب اس میں ایک انڈا ملائیں۔ اب اس میں ایک چمچہ شہد ملائیں۔ سب چیزوں کو یکجان کر لیں۔ لیجئے ماسک تیار ہے۔ اسے چہرے پر لگانے کے بعد بیس منٹ انتظار کریں۔ سوکھ جانے پر صابن اور پانی سے چہرے کو دھو ڈالیں۔

سبزی کے بعد پھلوں کی باری آتی ہے ہم گذشتہ شماروں میں ٹماٹر اور کھیرے کا ماسک تجویز کر چکے ہیں۔ اب ہم اس سلسلے میں آپ کو ایک اور پھل سے روشناس کراتے ہیں۔ اور وہ ہے پپیتا۔ پپیتے کو کاٹ کر اس کے قتلے کر لیں۔ پھر انہیں کچل کر گودا بنا لیں اس گودے کے تین بڑے چمچے لیں۔ اس میں ایک بڑا چمچہ باسی کریم ملا لیں۔ تازی کریم ایک روز تک رکھنے سے کھٹی ہو جاتی ہے۔ اب اس میں ایک بڑا چمچہ شہد بھی ملا دیں۔ اس ماسک کو چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ تک انتظار کریں۔ سوکھ جانے پر ٹھنڈے پانی اور صابن سے دھو ڈالیں۔

کیلا تقریباً سارے سال ملتا ہے ماسک بنانے کے لئے ایک تہائی کیلا کافی ہے کیلے کے اس ٹکڑے کو کچل کر گودا بنا لیں۔ اس میں ایک بڑا چمچہ بھر شہد ملا لیں۔ اس ماسک کو چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ انتظار کریں۔ سوکھ جانے پر صابن اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں۔ یہ ماسک موائسچرائزر بھی ہے۔ نیز ہوا اور دھوپ میں چلنے سے جلد

ہر جگہ نر کا بول بالا ہے!

نر اور مادہ کے فرائض اور کاموں میں تخصیص اور امتیاز انسانوں تک ہی محدود نہیں ہے، جانور بھی اس میں شامل ہیں یہ اس رپورٹ کا خلاصہ ہے جو ڈاکٹر اقبال ملک نے پیش کی ہے۔ ڈاکٹر اقبال ہندوستان کی پہلی خاتون ہیں جنہوں نے تین سال بندروں کے درمیان گزارے ہیں۔ نئی دلی کے قریب تغلق آباد کا قلعہ بندروں کی آماجگاہ ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے تین سال میں ۵۸۰۰ گھنٹے بندروں کی حرکات کا مشاہدہ کرنے میں صرف کئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بندروں میں بھی نر کی فرماں روائی ہے۔ غالباً مادہ بندر کبھی اپنی آزادی کے لئے کوئی تحریک چلانی چاہتے۔ بندروں میں بھی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا چلن ہے۔ بندروں کا لیڈر اس حق کا سب سے زیادہ استعمال کرتا ہے۔ اس کی مادہ دوسری بندریوں پر فوقیت جتاتی ہے اور نر اسی بات پر لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتی ہے کیوں نہ ہو، آخر وہ لیڈر کی مادہ ہے۔

بندروں کا لیڈر عام طور پر اپنی رعایا کے گھریلو جھگڑوں میں دخل نہیں دیتا لیکن جب بات حد سے بڑھ جاتی ہے تو وہ اپنی دم اٹھاتا ہوا آتا ہے اور اپنا حکم سناتا ہے۔ اس کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔ لیڈر عموماً خاموش سنجیدہ اور اکیلا ہوتا ہے۔ بندروں میں عام طور پر جھگڑے مادہ کو ہتھیانے پر ہوتے ہیں اس کے علاوہ کھانے اور ایک دوسرے کی جگہ ہڑپ کرنے پر بھی اکثر مار پیٹ ہو جاتی ہے بچوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے تو لیڈر فوراً جھگڑے میں دخل دیتا ہے۔ بچوں کے لئے بندروں کے دل میں خاص ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

بندر گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کرتے ہیں۔ یہ آرام کئی گھنٹے تک چلتا رہتا ہے۔ ان میں گدی پر کبھی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ایک لیڈر کے مرنے پر دوسرا لیڈر بغیر کسی جھگڑے کے گدی سنبھال لیتا ہے۔ اس کی شخصیت اور حکومت دیکھ کر کوئی بندر اعتراض نہیں کرتا۔

تمتما جاتی ہے نیز ٹھنڈی ہوا سے بھی جلد پر برا اثر پڑتا ہے۔ چہرے کا رنگ سانولا ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے دودھ، شہد اور انڈے سے کا ماسک تیار کریں۔ ایک بڑا چمچہ دودھ لیں اس میں ایک بڑا چمچہ شہد ملالیں۔ اگر جلد چکنی ہے تو انڈے کی سفیدی ملائیں اگر جلد خشک ہے تو انڈے کی زردی ملائیں۔ اس ماسک کو چہرے پر لگا کر بیس منٹ انتظار کریں۔ سوکھ جانے پر صابن اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں۔

جو کا دلیہ ناشتہ میں کام آتا ہے۔ اس سے ماسک بھی تیار ہوتا ہے یہ ماسک موائسچرائزر کا کام بھی کرتا ہے۔ صبح کو جب آپ ناشتے کے لئے جو کا دلیہ تیار کریں تو ایک چمچہ بھر دلیہ پانی میں ابال کر نکال لیں۔ اس میں ایک بڑا چمچہ شہد، ایک انڈے کی زردی اور چند قطرے لیموں کا عرق ملالیں اب اس محلول کو چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ انتظار کریں پھر ٹھنڈے پانی اور صابن سے دھو ڈالیں۔

چہرے کو ملائم بنانے کے لئے ایک اور ماسک کی ترکیب یہ ہے۔ ایک بڑا چمچہ جلاٹین لیں۔ جلاٹین عام طور پر پیکٹ میں ملتی ہے۔ اس سے جیلی بنتی ہے۔ کھلی جلاٹین بھی بازار میں ملتی ہے۔ تھوڑے سے ابلتے ہوئے پانی میں جلاٹین ملالیں۔ یہ پانی میں حل ہو جاتی ہے اب اس میں چند قطرے لیموں کا عرق اور ایک چمچہ بھر شہد ملالیں۔ پہلے چہرے کو صابن سے دھوئیں۔ پھر اس محلول کو چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ انتظار کریں۔ پھر ٹھنڈے پانی سے چہرے کو دھو ڈالیں۔ یہ ماسک موائسچرائزر کا کام بھی کرتا ہے۔

فیشل کے بعد اگر مسامات کھلے رہ جائیں تو انہیں بند کرنے کے لئے لیموں کے چند قطرے ٹھنڈے پانی میں ملا کر چہرے پر لگائیں۔ یوڈی کلون کو ٹھنڈے پانی میں ملا کر چہرے پر لگانے سے بھی مسامات بند ہو جاتے ہیں گھر میں مرد اکثر آفٹر شیو لوشن استعمال کرتے ہیں چہرے کے کھلے مسامات کو بند کرنے کے لئے آپ اسے بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ سیب کے عرق کا سرکہ برابر کے پانی میں ملا کر چہرے پر لگانے سے بھی مسامات بند ہو جاتے ہیں۔

●●

بزمِ بانو

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دل چسپ جوابات دیتی ہیں۔

ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔ سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں، صرف نام لکھنا کافی ہے۔

مدیرہ

بزمِ بانو
ماہ نامہ "بانو" آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

شکیل خاں، سہسرام، بہار

س :- کیا واقعی عشق انسان کی ضرورت ہے۔ کیوں؟

ج عشق یعنی لگن اور شوق نہ ہو تو دنیا ختم ہو جائے۔ عشقِ حقیقی کے ساتھ عشقِ مجازی بھی دنیا کے وجود کے لئے اہم ہے

س :- کیا آدم کی روح اپنی اولاد سے خوش ہو گی؟ قیاس آرائی۔

ج حضرت آدم سے تو رابطہ قائم کرنا مشکل ہے۔ میرے خیال میں خوش بھی ہوں گے سر پکڑ کر روتے بھی ہوں گے۔ کبھی شجرِ ممنوعہ کھا کر پچھتاتے ہوں گے۔ کبھی فخر سے چھاتی پھول جاتی ہو گی۔

سیدہ فرح دیبا عابدی، امراوتی کیمپ

س :- آنٹی، آپ کو آپ کے تحریر کردہ ناولوں میں کون سا ناول سب سے زیادہ پسند ہے؟

ج "ایک قطرہ خون"، جس پر میں نے بہت محنت کی ورنہ بس قلم اٹھا کر لکھنے کی برسوں سے عادت ہے۔ اس ناول کے لئے بہت سال پڑھا۔ محرّم کی مجلسوں میں شرکت کی۔ واقعاتِ کربلا کے سوز و گداز کو ایمان بنا کر محسوس کیا تب قلم اٹھایا۔

س :- بعض لوگ اپنے آگے کسی کی بات نہیں سنتے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ کس قسم کا رویہ رکھنا چاہیے۔؟

ج غور سے ان کا مطالعہ کیجیے بڑا لطف آئے گا عقل کا دامن وسیع ہو گا۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کرنے کا سلیقہ پیدا ہو گا۔ ذرا سنجیدہ ادب کے مطالعہ کو بھی جھیلئے خود اعتمادی بڑھے گی۔ لیڈر بہت بوکھلاتے ہیں تاکہ آپ مرعوب ہو کر اپنے حقوق اور ذمہ داریاں انہیں سونپ دیں۔ وہ جی بھر کے من چاہی کریں۔ دیکھیے نا ہمارے لیڈر کیا کر رہے ہیں۔ غریبوں کے نام پر دُہائی دیتے ہیں ان کا مُنہ بھر دیا جاتا ہے۔ دوسرے چلّانے لگتے ہیں غریب ویسے ہی مرتے رہتے ہیں۔

راشد فاروقی، دلاور پور، مونگیر

س :- میری عمر ۲۱ سال ہے۔ میں اپنی زندگی آزادانہ گزارنا چاہتا ہوں۔ شادی کروں یا نہ کروں؟

ج ابھی شادی نہ کیجیے خوب آزادانہ زندگی گزار لیجیے جی بھر جائے اور بیوی بچوں کا ارمان دل میں جاگے تب شادی کیجیے گا۔ تب تک اپنا مکان، موٹر گاڑی بھی ہو جائے گی۔ پھر گھر ہست کی زندگی ایمان داری سے گزاریئے۔ اپنے سے بہت چھوٹی حسینہ کے چکّر میں پڑنے کے بجائے کوئی کماتی ہوئی بیوی سے شادی کیجیے۔ مسلمان نوجوان شادی کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ شکر ہے کہ آپ آزادی سے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ قوم کو آپ کے ہم خیال نوجوانوں کی ضرورت ہے جو ایک خدمت گار کی ضرورت بیوی سے پوری کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اچھی نوکری پر ہیں تو بہت سے لڑکی والے آپ کی جان کو لگیں گے۔ لڑکیاں بھی آپ کو پھانسنا چاہیں گی اس لئے کہ وہ بھی اپنے والدین پر بوجھ ہیں۔ جہیز کے چکّر میں نہ آیئے گا۔ جہیز سے پوری زندگی نہیں سنورتی۔ لڑکی والے نوکری کا لالچ بھی دیتے ہیں گھپلے میں مت آیئے گا ورنہ زندگی کے چکّر میں پھنستے گھسٹتے رہیں گے مسلمانوں میں بہت شادیاں اور بہت بچے ہونے ہیں۔ نوجوانوں کو اس کی روک تھام کرنا چاہیے۔ پہلے معیار بڑھانا

20,000 !!

بیس ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام:
بارہ ہزار روپے نقد
یا ایک ۵۱ سینٹی میٹر کا
رنگین ٹی وی اور
تین ہزار روپے نقد

دوسرا انعام:
آٹھ ہزار روپے

پہلا انعام بالکل درست حل پر : بارہ ہزار روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر : آٹھ ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر، یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی کوپن بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ کوپن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مینی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ : ہفتہ، ۲۱۔ ستمبر ۱۹۸۵، آٹھ بجے رات تک
پیر، ۲۳۔ ستمبر ۱۹۸۵ تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کر لئے جائیں گے۔

شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۸

ا	س	ا				
مں		ج	و	پ		
ط	ا	ک	ل	■		ک
س				م		
ا	ی		ی			ث
		ا		ب		ب
	ن	و		و	ی	ب

اشارے :

اوپر سے نیچے :

۱۔ یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے — ہے ردیفِ شعر میں، غالب زبس تکرارِ دوست

۲۔ سمجھ لو جو شخص گول — بچے دار باتیں کرتا ہے اس کی نیت صاف نہیں

۳۔ — لڑکے رنگ برنگے کپڑے پہننے اور سج دھج کر نکلنے میں لڑکیوں کو مات کرتے ہیں

۴۔ ہندوستان کے — مسائل کا حل نہ کمیونزم کے پاس ہے نہ سوشلزم کے پاس

۵۔ شاعر — کی اسی کیفیت کو اپنے کلام میں سمو دیتا ہے

دائیں سے بائیں :

۶۔ کافی ہے نشانی تری، چھلے — نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بہ وقتِ سفر انگشت

۷۔ ارے میاں — کے نام پر جو "ساز شیں" ہوتی ہیں ان میں لاکھوں کا ہیر پھیر ہوتا ہے

۸۔ میں نے غربت کے دن دیکھے ہیں۔ میں اس بیچارے کے لہجے کی — کا سبب سمجھتا ہوں

۹۔ کہنے کو اب رہ بھی کیا گیا تھا ؛ وہ تھوڑی دیر — تا رہا پھر خاموش

۱۰۔ بظاہر دنیا بھر کی — کے مسائل ایک سے ہی نظر آتے ہیں لیکن ہندوستان ●

★ کوئی کوپن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں — فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ۔

★ صرف دس اشارے

★ انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

★ صحیح حل : جوابی لفافہ بھیج کر منگوائیے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھیے۔

★ شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۸ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور نومبر ۱۹۸۵ کے ماہ نامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

شمع ادبی معمے (شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۸) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی د[ہلی]

شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۸ کا صحیح حل ... ستمبر ۱۹۸۵ کو ... ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام ... [illegible] ... تفصیلات شمع، نومبر ۱۹۸۵ میں بھی شائع ...

...gistered with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 741/57 Regd. No. D-(C) 120

گنگا کی کہانی

بنائی کے نئے ڈیزائن

جدید تکنیک کے مطابق بالوں کا حسن جڑی بوٹیوں کے استعمال میں ہے۔
ٹریٹ آملہ شکاکائی ہیئر آئل اور ٹریٹ ہربل ہیئر سوپ، آملہ، شکاکائی، مہندی اور
دیگر جڑی بوٹیوں سے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ جڑی بوٹیاں لمبے، گھنے، چمکیلے اور
کالے بالوں کو بڑھانے کے لئے صدیوں سے مشہور ہیں۔

افتتاحیہ

افلاطون کی نظر میں انصاف کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کا حق بے روک ٹوک ملے۔ لیکن کیا انصاف کے معنی صرف اِس بات تک محدود ہیں کہ جو شخص جیسا بوئے گا، ویسا ہی کاٹے گا؟ ہماری رائے میں انصاف کا مفہوم وسیع تر ہے انصاف کا اصل مقصد سماج میں مکمل ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ وہ دل کش ہم آہنگی جو ستاروں اور سیاروں کو ترتیب اور نظام کا پابند رکھتی ہے، وہ جاں فزا ہم آہنگی جو کسی مسحور کن راگ میں ملتی ہے، وہ اُمید پرور ہم آہنگی جو کسی معصوم بچے کی مسکراہٹ میں جھلکتی ہے۔

اگر ضمیر، ضمیر نہ رہے، صرف سزا کا خوف بن کر رہ جائے تو سماج کو دیمک لگنے لگتی ہے۔ سماج کا مضبوط پہاڑ ریزہ ریزہ ہوکر بکھرنے لگتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح انسان کو بھی ذاتی طور پر ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔ ہر انسان علم، خواہشات، جذبات، احساسات اور خیالات کا مجموعہ ہے، لیکن کام یاب وہی انسان ہوتا ہے جو اپنے علم، جذبات، احساسات اور خواہشات میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

انصاف کا ضمیر سے وہی رشتہ ہے جو صحت کا جسم سے۔ ہر بُرائی کا سرچشمہ غیر آہنگی ہے، چاہے وہ انسان اور قدرت کے درمیان ہو یا ایک انسان اور دوسرے انسانوں کے درمیان۔ یا پھر خود انسان کے وجود کے اندر، اس کے ضمیر اور نفس کے درمیان۔

سعدیہ دہلوی

بہ یادگار: یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اڑتیسواں سال، ۴۶۴ واں شمارہ
عام شمارے کی قیمت: چار روپے
سالانہ قیمت: اڑتالیس روپے

مقامِ اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس: SHMA IN
ٹیلی فون: 272066, 272067 272068
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان: شمع میگزین
طابع و ناشر: یونس دہلوی

ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس، دہلی
مطبوعہ: روبی پرنٹنگ پریس، دہلی

نئے پیرون

ایل آئی سی
پیش کرتی ہے
ڈبل انشورنس پلان

جیون ساتھی

یہ پلان، ملازمت پیشہ جوڑوں کے لئے بے حد
موزوں ہے جس طرح شادی کا بندھن
مضبوط ہوتا ہے جنم بھر کی آپسی محبت اور

عقیدت سے اسی طرح جیون ساتھی بیمہ کی سلامتی
بھی زندگی بھر کے لئے ملتی ہے۔
پالیسی کی مدت ختم ہونے پر ساری رقم بیمہ اور
جمع شدہ بونس مل جاتے ہیں۔
پالیسی کی مدت کے دوران اگر کوئی شریک حیات
گزر جائے تو جو شوہر / بیوی زندہ رہیں گے
ان کو بنیادی رقم بیمہ دے دی جائے گی
اور بقید حیات فرد کو مزید
پریمیم دینے کی ضرورت نہیں
رہے گی۔
پالیسی کی مدت کے ختم پر اور ایک بار
بنیادی رقم بیمہ بقید حیات
فرد کو یا پالیسی کی مدت ختم ہونے سے پہلے
اُس کی بھی موت واقع ہو جائے تو اُسکے نامزد رشتہ داروں
کو یہ رقم دے دی جائے گی۔

جیون مِتر

یہ پالیسی خاندان کے مکمل تحفظ کی خاطر
تیار کی گئی ہے۔
پالیسی کی مدت ختم ہونے پر ساری رقم بیمہ

معہ بونس کے بیمہ لینے والے کو ادا
کی جائے گی جیسا کہ دوسری میعادی
بیمہ پالیسیوں کے لئے ہوتا ہے۔
اگر پالیسی کی مدت کے دوران بیمہ لینے والا
گزر جائے تو اُس کے
نامزد شدہ شخص کو بیمہ کی دوگنی
رقم معہ بونس ملے گی۔
تھوڑا سا زائد پریمیم ادا کرنے پر
حادثہ کی صورت میں موت واقع ہونے پر
زائد بیمہ کا تحفظ بھی ملتا ہے۔

**ان دُھرے فائدے والے ہر دو پلان
کے بارے میں مزید تفصیلات اپنے بیمہ ایجنٹ
سے یا کسی بھی ایل آئی سی کے دفتر سے
حاصل کیجئے۔**

لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

۱۹۸۵ ہوائی حادثوں کا سال

اصغر علی

جب انسان کو فضا میں اُڑنے
شوق چرایا تو اس کے ساتھ فضائی حادثوں
امکان بھی پیدا ہو گیا۔ ابتدا میں لوگ ہوائی
ر سے کتراتے تھے۔ ریل کے حادثے میں انسان
ے بچنے کا امکان باقی رہتا ہے لیکن ہوائی حادثے
ں جان کا خطرہ کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ گزشتہ
کئی سال میں انجینیئروں نے ہوائی سفر کو بہت
حد تک محفوظ بنا دیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مسافر
کو ہوائی اڈے پر رخصت کر کے اپنے گھر
واپس جانے والوں کے لئے موٹر کار یا بس کے
حادثے کا خطرہ زیادہ ہے۔ ہوائی سفر ۹۹ فی صد
محفوظ ہے۔ لیکن ۱۹۸۵ میں لگاتار کئی حادثے
ہوئے جن سے ہوائی سفر پر مسافروں کا اعتماد کم
ہو گیا ہے۔

۱۹۸۴ میں فضائی حادثے نہ ہونے کے
برابر تھے، لیکن ۱۹۸۵ نے اس کمی کی تلافی کر دی
ہے۔ اس سال تابڑ توڑ اتنے حادثے ہوئے کہ
۱۹۸۵ فضائی حادثوں کا سال بن کر رہ گیا۔ ان

ہوگیا۔ اس حادثہ کے چار مہینے بعد ایرانڈیا کا
بوئنگ ۷۴۷، جس میں ۳۰۷ مسافر اور ۲۲ کارکن
سوار تھے۔ کینیڈا سے انگلستان آتے ہوئے
آئرلینڈ کے قریب سمندر میں گر پڑا۔ ایک عام خیال
یہ تھا کہ یہ حادثہ ایک بم پھٹنے سے ہوا جو تخریب
کاروں نے جہاز میں رکھ دیا تھا۔ ہر جہاز میں ایک
آلہ ہوتا ہے جسے "بلیک باکس" کہتے ہیں۔ اس
میں پائیلٹ کی بات چیت ریکارڈ ہوتی ہے۔
اس کے علاوہ ایک اور آلہ ہوتا ہے جو جہاز کی رفتار،
اونچائی وغیرہ ریکارڈ کرتا ہے۔ ہندوستان کی
حکومت نے تقریباً سات کروڑ روپیہ خرچ کر کے
سمندر کی گہرائی سے یہ آلے برآمد کئے۔ یہ پہلا
موقع ہے کہ اتنی گہرائی سے یہ آلے برآمد کئے گئے
تھے۔ لیکن یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ ان آلوں
کی بار بار جانچ کی گئی لیکن کسی بم کے دھماکے
کی آواز نہیں ملی۔ نہ پائیلٹ یا کسی مسافر کی
چیخ سنائی دی۔ اس حادثے سے تمام ملک میں
غم کی لہر چھا گئی۔ کینیڈا کے لئے اڑان بند کر دی
گئی۔ انشورنس کمپنی نے دوسرا جہاز خریدنے
کے لئے کئی سو کروڑ ڈالر دئے۔ ہر مسافر کے لواحقین
کو لاکھوں روپے ہرجانہ ادا کیا گیا۔

ایر انڈیا کے طیارے کے حادثے
کے ڈیڑھ مہینے بعد ۲ اگست کو امریکہ میں ڈیلٹا
ایرلائن کا طیارہ ہوائی اڈے پر اترتے وقت
تباہ ہو گیا۔ پائیلٹ جہاز کو رن وے پر اتارنے
کے لئے نیچے زمین کی طرف لا رہا تھا کہ طیارے پر
یا تو گرج یا تیز ہوا کی ایک لہر نے طیارے کو
زمین پر گرا دیا۔ یہ حادثہ رن وے سے چند سو گز
کے فاصلے پر ہوا۔ جہاز زمین پر گرا تو ہوائی اڈے
پر کھڑی ایک موٹر کار سے ٹکرایا۔ کار کا ڈرائیور
اندر بیٹھا تھا۔ اس کا سر دھڑ سے جدا ہو گیا۔
دوسری کار کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جہاز میں آگ
لگ گئی جس کے نتیجے میں ۱۳۴ مسافر ہلاک ہو گئے
چوں کہ جہاز سر کے بل گرا تھا، اس لئے پائیلٹ
بھی ہلاک ہو گیا۔ جہاز کے عقب میں بیٹھے ہوئے
چند مسافر بچ گئے۔ جہاز جب ناک کے بل گرے تو
آگے بیٹھے ہوئے مسافروں کی شامت آتی ہے۔
پیچھے بیٹھے ہوئے مسافر نسبتاً محفوظ رہتے ہیں۔

اس حادثے کو ابھی دس روز بھی نہیں
گزرے تھے کہ جاپان ایرلائن کا بوئنگ ۷۴۷
جمبو جیٹ طیارہ جس میں ۵۲۰ مسافر اور جہاز کا
عملہ سوار تھا، ٹوکیو سے اوساکا جاتے ہوئے تباہ
ہو گیا۔ ٹوکیو سے اوساکا کا سفر ایک گھنٹے کا
ہے۔ ابھی ہوائی جہاز کو ٹوکیو سے روانہ ہوئے
دس منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ جمبو جیٹ کی دُم
میں خرابی پیدا ہو گئی۔ پائیلٹ نے لاکھ کوشش
کی کہ جہاز کا توازن برقرار رہے، لیکن وہ ناکام
رہا۔ اس نے ٹوکیو ہوائی اڈے کو صورت حال
سے آگاہ کیا۔ انہوں نے پائیلٹ کو مشورہ دیا کہ
اس سے جہاز نہیں سنبھل رہا ہے تو وہ ایک قریبی
ہوائی اڈے پر اتر جائے۔ لیکن پائیلٹ نے ٹوکیو
واپس آنے کی اجازت مانگی۔ اسے یہ اجازت
مل گئی، لیکن جہاز ٹوکیو کی طرف جانے کی
بجائے دوسری طرف اڑ رہا تھا۔ جہاز اب پائیلٹ
کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ اس پتے کے مانند تھا
جو درخت سے ٹوٹ کر لہراتا ہوا زمین پر گرتا ہے
جہاز کو ٹوکیو سے روانہ ہوئے آدھا گھنٹہ ہو چکا
تھا۔ اب وہ جاپان کے پہاڑوں کے اوپر سے
گزر رہا تھا۔ یکایک جہاز ٹوکیو کے راڈار اسکرین
سے غائب ہو گیا۔ راڈار ٹیلی ویژن سیٹ کے
مانند ہوتا ہے اور اس کے اسکرین پر جہاز ایک

...کی ابتدا اسپین سے ہوئی ۱۹ فروری کو
...ا ایرلائن کا بوئنگ ۷۴۷، جمبو جیٹ، جس
۱۴۸ مسافر سوار تھے، ایک حادثے کا شکار

ِشنی کے نقطے کی مانند دکھائی دیتا ہے۔

ِب یہ جہاز اسکرین سے غائب ہوگیا تو لوکیو کا عملہ سمجھ گیا کہ جہاز تباہ ہو گیا ہے۔ جہاز پہاڑ کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ مسافروں کو بچانے کا کام دوسرے دن صبح کو شروع ہوا۔ جہاز کے ملبے سے چار انسان زخمی حالت میں ملے۔ ان میں دو بچے بھی شامل تھے۔ یہ لوگ جہاز کے عقبی حصے میں بیٹھے تھے۔

جاپان ایرلائن کا فضائی حادثہ

ہوائی سفر کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ جو فضا میں پیش آیا۔ اس سے پہلے مارچ ۱۹۷۷ میں دو جہاز رن وے پر ٹکرا گئے تھے جس کے نتیجے میں ۵۸۳ انسانوں کی جانیں تلف ہوئی تھیں۔ ان حادثوں میں تخریب کار کا ہاتھ نہیں تھا۔

اس حادثے کے ٹھیک دس روز بعد ایک اور ہوائی حادثہ پیش آیا۔ یہ حادثہ انگلستان کے شہر مانچسٹر میں ہوا۔ برٹش ایرٹورز کا طیارہ بوئنگ ۷۳۷ رن وے سے اڑنے والا تھا کہ اس میں آگ لگ گئی۔ جہاز میں ۱۳۷ مسافر سوار تھے۔ جہاز کے انجن میں آگ لگی تو اگلا حصہ آگ اور دھوئیں سے بھر گیا۔ جاپان ایرلائن کے طیارے میں جہاز کے پچھلے حصے میں بیٹھنے والے موت سے بچ گئے تھے لیکن انگریزی جہاز میں پچھلا حصہ پہلے تباہ ہوا۔ جو لوگ موت سے بچ گئے، وہ جہاز کے اگلے حصے میں بیٹھے تھے۔ پائیلٹ نے مسافروں کو مشورہ دیا کہ وہ دہشت کا شکار نہ ہوں بلکہ اطمینان سے سیڑھیاں پار کریں۔ مگر بد قسمتی سے جہاز کا بایاں دروازہ جام ہو گیا۔ وہاں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ ناچار دوسرا دروازہ کھولا گیا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے کی دھن میں تھا۔ مسافر ایک دوسرے پر پل پڑے۔ کرسیوں کا پلاسٹک اور فرش کا قالین جلنے لگا تو دھوئیں سے جہاز بھر گیا۔ پھر جہاز میں بہت زوروں کا دھماکہ ہوا جو آکسیجن سلنڈر پھٹ جانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ کچھ مسافر اچھل کر جہاز سے نیچے گر پڑے اس طرح انہیں چوٹیں تو آئیں لیکن وہ زندہ بچ گئے۔ ۱۳۷ مسافروں میں سے کل ۸۳ انسان بچ سکے باقی ۵۴ مسافر موت کا لقمہ بن گئے۔

۱۹۸۵ میں پانچ بڑے ہوائی حادثے ہوئے جن میں ۱۴۰۰ انسانوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ تقریباً سارے طیارے بوئنگ کمپنی کے بنائے ہوئے تھے۔ یہ ایک امریکن کمپنی ہے جس نے پہلے پہل ۷۰۷ بنایا پھر ۷۴۷ اور ۷۳۷ غرض اس کمپنی کے سب طیاروں کے نام ۷۰۰ سے شروع ہوتے ہیں۔ ●●

قلم کے جادوگر
الیاس سیتاپوری
کے دو تازہ ترین شاہ کار

اُن انسانوں کی کہانیاں جو بادشاہ تھے،
وزیر تھے، مصاحب تھے، امیر تھے، فن کار تھے،
پرستار تھے، عاشق تھے، محبوب تھے، رقیب تھے،
دوست تھے، دشمن تھے، جھوٹے تھے، سچے تھے۔
انسانوں کے وہ تمام رُوپ جو ہمیشہ سے ہیں اور
ہمیشہ رہیں گے۔ گرفت، نشہ، سحر،
سوز و گداز .... وہ سب جو آپ چاہتے ہیں۔

پارسائی کا خمار
قیمت: بیس روپے -/20 (ڈاک خرچ الگ)

آشنا پرست
قیمت: پندرہ روپے -/15 (ڈاک خرچ الگ)

الیاس سیتاپوری کی دوسری کتابیں

حرم سرا کا محبوب
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

دیوی کے پرستار
قیمت: بیس روپے
(ڈاک خرچ الگ)

کشمیر کی کلی
قیمت: سو کر روپے
(ڈاک خرچ الگ)

داستانِ حُور
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

الیاس سیتاپوری کے دیگر شاہ کار جو شمع بک ڈپو نے عمدہ کاغذ پر آفسیٹ سے شائع کیے ہیں:

شہزادی کا نیلام
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

بالاخانے کی دُلہن
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

حرم سرا
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

چاند کا خدا
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

عجائب خانۂ عشق
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)

اندر کا آدمی
قیمت: دس روپے
(ڈاک خرچ الگ)

راگ کا بدن
قیمت دس روپے
(ڈاک خرچ الگ)

آج ہی ایک پوسٹ کارڈ بھیج کر گھر بیٹھے وی پی ڈاک سے منگوا لیجیے یا اپنے اخبار فروش سے طلب کیجیے۔

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد بھیجیں

غیر ملکی پروانے اپنے ایجنسی کے نئے قیمت اور مسل ڈاک معلوم کرنے کے لئے تحریر فرمائیں یا ڈرافٹ بھیجیں۔

آپ کو ہندوستان کے کسی گوشے میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں اردو، انگریزی، ہندی، پنجابی کتابیں یا رسائل منگوانے ہوں تو شمع کے ادارے کو خدمت کا موقع دیجیے۔ غیر ممالک میں شہر شہر نئے ایجنٹ بنائے جا رہے ہیں!!

انتباہ:
الیاس سیتاپوری اور ضیا تسنیم بلگرامی کی تمام کہانیوں اور کتابوں کے ہندوستان میں اشاعت کے حقوق شمع بک ڈپو کے نام محفوظ ہیں۔ بلا اجازت شائع کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

گنگور کا میلہ

راحت عظیم

ہندوستان میں راجاؤں اور مہاراجاؤں کا دور ختم ہوا، نوابی ٹھاٹ باٹ ماضی کا قصہ بنے، لیکن اس دور کی یادگار راجاؤں کے محل ابھی تک باقی ہیں۔ یہ محل اگرچہ ایک خاندان کی رہائش کے لئے تعمیر ہوتے تھے، لیکن ان میں کئی کئی سو کمرے ہوتے تھے۔ عالی شان دربار ہال، برآمدے، باغات، غرض عیش و عشرت کا ہر سامان موجود ہوتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ایک راجہ ایک محل پر قناعت نہیں کرتا تھا۔ ایک محل گرمیوں کے لئے، دوسرا برسات کے لئے اور تیسرا جاڑے کے لئے۔ پھر ان راجاؤں کی کئی کئی رانیاں ہوتی تھیں۔ ان کے لئے بھی الگ الگ محل تعمیر ہوتے تھے۔ بعض ریاستیں ان محلوں کی وجہ سے آج تک مشہور ہیں۔ اودے پور بھی ان میں سے ایک ہے۔

اودے پور میں ایک خاصیت یہ ہے کہ یہاں کی پچولہ جھیل کے بالکل بیچ میں ایک محل تعمیر کیا گیا تھا۔ آج کل اس محل کو ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کا نام وہائٹ لیک پیلس ہوٹل ہے۔ اس ہوٹل میں جانے کے لئے کشتی کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس جھیل میں ایک اور جزیرہ ہے، جسے جگ مندر کہتے ہیں۔ مغل بادشاہوں کے دور میں باپ کے خلاف بیٹوں کی بغاوت عام تھی۔ جہاں گیر کے ولی عہد خرم نے بھی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا اور عتابِ شاہی سے بچنے کے لئے اس نے اسی جزیرے میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ اس وقت اودے پور میواڑ کی راج دھانی بن چکا تھا۔ اس سے پہلے چتوڑ میواڑ کی راج دھانی تھا۔

آپ نے تاریخ میں پنا بائی کا قصہ پڑھا ہوگا۔ کس طرح اس وفادار آیا نے ننھے اودے سنگھ کی جان بچانے کے لئے اپنے بیٹے کو قربان کر دیا تھا۔ اودے سنگھ کی جان بچ گئی اور ایک قریبی ریاست میں اس کی پرورش ہوتی۔ یہ ریاست کوبل گڑھ تھی۔ یہاں کے راجا نے اودے سنگھ کی پرورش کی۔ بعد میں اودے سنگھ کو میواڑ کا راجہ تسلیم کر لیا گیا۔ اودے سنگھ

نے ہی اودے پور کی بنیاد رکھی۔ اس واقعہ کو ۴۰۰ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ اکبر کے دور میں مغل فوج نے چتوڑ پر حملہ کیا تو اودے سنگھ بزدل ثابت ہوا۔ وہ چتوڑ کو اپنے دو سرداروں کے حوالے کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن بعد میں اودے سنگھ کا قصور معاف کر دیا گیا اور پھر راج گدی پر بیٹھ گیا۔ اودے سنگھ لڑائی کا سورما نہیں تھا تو کیا ہوا، اس نے ایک خوب صورت اور رومانٹک شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ ایک بنجر ریگستانی علاقے میں ایک وسیع شہر کی بنیاد رکھنا اس کا کارنامہ تھا۔ اس نے یہاں کئی محل تیار کئے ــــ آب پاشی کے لئے ایک مصنوعی جھیل تعمیر کی یہ شہر اس دور کے فنِ تعمیر کی یاد دلاتا ہے۔

اودے پور

اودے پور کا سب سے بڑا تہوار گنگور ہے۔ پچولہ جھیل کے کنارے روشنیوں کا یہ بنگلہ کسی پریوں کی داستان سے مشابہہ لگتا ہے۔ گنگور دراصل عورتوں کا تیوہار ہے۔ لوگوں کا قول ہے کہ راجستھان میں ۷ دن میں ۹ تیوہار منائے جاتے ہیں۔ لیکن گنگور ان سب تیوہاروں کا بادشاہ ہے۔ گنگور دراصل "گور" سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے: پاروتی۔ اس روز تمام عورتیں اپنے بہترین گھاگرے اور چولیاں پہن کر پاروتی یا گور کی پوجا کے لئے نکل آتی ہیں۔ یہ عورتیں آواز ملا کر گانے گاتی ہیں۔ ان

گانوں کے بول کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں:
اگر تم نے نیم دلی سے دیوی کی پوجا کی تو تمہارا ہونے والا شوہر بھی نیم دلی سے محبت کرے گا۔ اگر تم نے آج میلے کچیلے کپڑے پہنے تو تمہیں شوہر بھی میلا کچیلا ملے گا۔

عورتیں پاروتی کی شبیہ کو سجا کر سر پر اٹھا کر لاتی ہیں۔ گنگور گھاٹ کے پاس پہنچ کر یہ قافلہ رک جاتا ہے۔ یہاں عورتیں دیوی کی پیاس بجھانے کے لئے اسے پانی پیش کرتی ہیں۔ اسے خوشبو سنگھانے کے لئے اس کے سامنے پھولوں کا ڈھیر سجا دیتی ہیں۔

گنگور کا تیوہار راجستھان میں سیکڑوں سال سے منایا جاتا ہے۔ لیکن ادھر کچھ سال سے کشتیوں کا قافلہ بند کر دیا گیا تھا۔ اب راجستھان کی حکومت نے سیاحی کو فروغ دینے کے لئے اسے دوبارہ رائج کر دیا ہے۔ تیس سال بعد کشتیوں کا کارواں پھر جاری ہو گیا ہے۔ لیکن اودے پور کے باشندے مہاراجہ کی کشتی کو اب بھی یاد کرتے ہیں۔ مہاراجہ اب اس تیوہار میں حصہ نہیں لیتے۔

جس طرح شمالی ہندوستان میں عید کے بعد ٹر آتی ہے اسی طرح راجستھان میں دوسرے روز لوٹی ہوئی گنگور کا میلہ لگتا ہے۔ یہ اودے پور سے کچھ فاصلے پر گوگنڈا میں منعقد ہوتا ہے۔ لٹی ہوئی گنگور کے پیچھے یہ کہانی ہے کہ ایک بار گوگنڈا

کے راجہ نے تیوہار کے دن اودے پور پر چڑھائی کی اور وہاں سے گور کا مجسمہ چرا لیا۔ یہی لوٹا ہوا مجسمہ گوگنڈا میں براجمان رہتا ہے۔ کسی نے گوگنڈا کے ایک باشندے سے سوال کیا کہ اگر اودے پور کے لوگ پولیس کی مدد سے چوری کا مال واپس لینے آجائیں تو تم کیا کروگے۔ اس نے جواب دیا کہ گوگنڈا کے لوگ کچی گولیاں نہیں کھیلتے۔ انہوں نے اصل مجسمہ ایک تجوری میں مقفل کر دیا ہے اور یہ مجسمہ نقلی ہے۔ اودے پور والے شوق سے یہ مجسمہ لے جا سکتے ہیں۔ گوگنڈا میں لگی ہوئی گنگور کا میلہ دیکھنے کے لئے لائق ہوتا ہے۔ سارے گاؤں والے میلے میں شرکت کے لئے گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ عورتیں رنگ برنگے لباس پہنتی ہیں۔ ساری رات ناچ گانا ہوتا رہتا ہے۔

●●

تلخ حقیقت

عظیمہ خاتون شبنم

برات کو رخصت کر کے محمودہ بیگم اندر آئیں تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھیں۔ وہ بوجھ اُن کے سر سے اُتر چکا تھا جو عرصے سے ان کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ وہ آکر پلنگ پر لیٹیں تو کمر اکڑ کر رہ گئی۔ ایسا لگا کہ ایک طویل مسافت کے بعد وہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر سستا رہی ہیں۔ ابھی تک تو وہ جوش اور لگن میں سارا کام نپٹاتی رہی تھیں، تکان کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ تکان کا احساس کرنے کے لئے بھی فرصت درکار ہے اور ان کو دم مارنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اب برات سے فارغ ہو کر تکان کا احساس بھی جاگ اٹھا تھا۔

محمودہ بیگم نے کمر کو پکڑ کر کروٹ لی۔ کمر درد سے پھٹی جا رہی تھی، لیکن پھر بھی وہ آج بہت مسرور تھیں۔ خدا کے فضل سے وہ آج اپنی بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو گئی تھیں، اور یہ سب کچھ انہوں نے تنہا اپنی ہمت اور حوصلے کے بل پر کیا تھا۔ ورنہ اگر وہ ہمت ہار جاتیں تو نہ جانے کہاں ہوتیں اور ان کی بیٹی کا رشتہ پتہ نہیں کب اور کیسے طے پاتا۔

محمودہ بیگم کے شوہر ایک متوسط

گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ماشکیہ بھی زیادہ
خوش حال نہ تھا۔ ساس سسر دونوں ان
کی شادی سے قبل ہی فوت ہو چکے تھے۔ شوہر
ایک اسکول میں ماسٹر تھے۔ معمولی تنخواہ
پاتے تھے اور موٹا جھوٹا کھاتے تھے، شادی
کے بعد دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔
عرفان، ریحان اور نجمہ ان کی زندگی کا سہارا،
آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھے۔ ہر وقت
اُن پر نگاہیں لگی رہتیں۔ ذرا بچے گھر سے باہر
نکلے کہ ان پر پڑھ پڑھ کر دم کرتے، خود بغیر
بگھری دال اور سوکھی روٹی کھاتے، دونوں
لڑکوں کے لئے انڈے پراٹھے تلے جاتے۔
حسب حیثیت ان کو جیب خرچ بھی دیتے۔
اُجلے کپڑے پہناتے۔ کہیں ان میں احساسِ
کمتری پیدا نہ ہو جائے اس لئے اپنی بساط
سے بڑھ کر ان پر خرچ کرتے، اب جب سے
مہنگائی بڑھنے لگی تھی انہوں نے ٹیوشنیں
بھی شروع کر دی تھیں۔ یہ سارے جتن وہ
اس خیال سے کرتے تھے کہ بچوں کی تعلیم میں
کوئی کمی نہ رہ جائے اور وہ بڑے ہو کر یہ نہ
سوچیں کہ ہمارے ماں باپ نے ہم کو پڑھایا
تک نہیں۔

محمودہ بیگم کے دونوں لڑکے ذہین
تھے۔ صحت بھی اچھی تھی۔ کوئی اُن کے رہن سہن
کو دیکھ کر یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ ایک
معمولی ماسٹر کی اولاد ہیں۔

والدین کی حوصلہ افزائی اور اپنی ذہانت
سے عرفان اور ریحان دونوں امتیازی نمبروں
کامیاب ہوتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ نجمہ بھی
بھائیوں کی دیکھا دیکھی خوب پڑھتی۔ وہ بھی اپنے
درجے میں اوّل آتی۔ زندگی وہی اپنی پرانی ڈگر
پر معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ محمودہ بیگم
اور ان کے شوہر اپنے لڑکوں کی شاندار کامیابی
سے پھولے نہ سماتے۔ وہ فخریہ ہر دوست سے
ان کا تعارف کراتے۔

محمودہ بیگم کو یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ
بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بڑھتے ہوئے مصارف
میں وہ آئندہ کس طرح گزارہ کریں گی، ماسٹر صاحب
بیمار رہنے لگے تھے اور اُن کی پنشن کا وقت بھی
قریب تھا۔ وہ صرف اپنی قوت ارادی کے بل بوتے
پر اپنے گھر کی ذمہ داری اور نوکری دونوں کام
کو انجام دے رہے تھے، لیکن اب کچھ دن سے

> وہ بڑی ذی ہوش اور سمجھ دار
> لڑکی تھی۔ ذرا سی عمر میں اس نے ہائی
> اسکول پاس کر لیا تھا۔ وہ ماں کو تسلی
> اور دلاسہ دیتی رہی، کہتی ماں تم فکر نہ کرو
> میں سب سنبھال لوں گی، بس کچھ دن کی
> بات ہے۔

ان کو اپنی ہمت جواب دیتی نظر آ رہی تھی۔
حوصلہ پست ہوا چاہتا تھا اور کمر جھکی جا رہی تھی
اپنی حالت کو وہ اپنی بیوی سے چھپاتے رہے کہ
ان کی فکروں میں اضافہ ہوگا اور بچوں کی تعلیم
بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ لیکن ہونی کو
کون ٹال سکتا ہے۔ ایک رات اُن کی طبیعت
ناساز ہوئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ مرض کی تشخیص
ٹھیک طرح ہو بھی نہیں پائی تھی کہ آخری وقت
آ پہنچا اور موت نے انہیں اپنی آغوش میں
سمیٹ لیا۔ وہ مالک حقیقی سے جا ملے اور
محمودہ بیگم کو اس دنیا سے نبٹنے کے لئے تنہا
چھوڑ گئے۔

محمودہ بیگم بہت ہی خشک آنکھوں کی عورت
تھیں لیکن وہ زار و قطار روئیں۔ زندگی بھر
کا ساتھ ٹوٹ جانا کوئی معمولی ٹھیس تو نہیں۔
محمودہ بیگم کے لئے یہ ایک بڑا المیہ تھا، لیکن
نئی نئی پریشانیوں اور مصائب میں وہ اس غم
کو بھلا بیٹھیں۔ شوہر کی موت کے دن سے ہی
ان کی مصیبتوں کا دور شروع ہو گیا۔ ماسٹر صاحب
نے کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا تھا۔ جو تنخواہ ملتی تھی
ماہ بہ ماہ خرچ ہو جاتی۔ محمودہ بیگم نے سوچا
کہ گھر کی حالت سے عرفان اور ریحان دونوں
باخبر ہیں۔ ان میں سے اگر ایک نے بھی نوکری
کر لی تو کچھ نہ کچھ آمدنی گھر میں آئے گی اور گھر
کی حالت زیادہ خستہ نہیں ہو پائے گی۔ لیکن
اُن کے لاڈلے فرزندوں کا عمل ان کی اُمید
کے برعکس نکلا۔ دونوں لڑکوں میں سے ایک
نے بھی اس انداز سے نہ سوچا۔ ماسٹر صاحب کے
فنڈ کی وصول یابی کے لئے ان دونوں نے بھاگ دوڑ
کی۔ فنڈ کی رقم مل گئی تو اُس کے سہارے کچھ دن
گھر کی گاڑی چلی۔ اس کے بعد محمودہ بیگم کے زیورات
کی باری آئی۔ ایک ایک کر کے سارے ختم ہو گئے۔
شہر میں ماسٹر صاحب کے دو مکان تھے، ایک
میں ان کی رہائش تھی اور دوسرا کرائے پر اٹھا
ہوا تھا۔ کرائے دار سے وہ مکان خالی کرا کے
اُسے فروخت کیا گیا اور اس طرح گھر کے اخراجات
اور لڑکوں کی پڑھائی کے لئے روپیہ فراہم کیا گیا
محمودہ بیگم کو اس بات کا سخت ملال تھا کہ شوہر
کی وفات کے بعد اُن کو ان حالات سے دوچار
ہونا پڑا جن کے بارے میں انہوں نے کبھی خواب
میں بھی نہ سوچا تھا۔ وہ کتنی لٹی لٹی اور بے سہارا

...تھیں۔ ان کے دل کی ساری شمعیں ایک
...کر کے گُل ہو گئی تھیں۔ ہر طرف بے کراں
...اور خوف ناک ظلمتیں تھیں۔
محمودہ بیگم کے دل پر غم سے زیادہ چوٹ
...، وہ بڑی وضع دار اور خوددار خاتون تھیں
...ں سے مونہہ کھول کر کہنا انہوں نے پسند
...ں کیا۔ اُن کی زندگی میں کوئی راز بھی تو نہ تھا
...کی زندگی تو ایک کھلی کتاب کی طرح تھی —
...اس سے جی چاہا اٹھا کر پڑھ لی جائے اور پھر
...ب کام لڑکوں کے ہاتھوں ہی سے تو ہو رہا
...تھا۔ بلا کی ذہانت رکھتے ہیں، پھر بھی کیا یہ بات
...ن کو بتانی ہوگی، نہیں یہ بات بتانے کی نہیں،
...ن کے خود سوچنے سمجھنے کی ہے، جو ذہن اس
...بات کا رسا نہیں اور جو آنکھیں اس چیز کو نہ
...دیکھ سکیں، اُن سے وہ مطالبہ نہیں کریں گی۔
اس سے ان کے شوہر کی روح کو تکلیف ہو گی
اُن کے اپنے جذبات مجروح ہوں گے اور ان کی
انا کو ٹھیس پہنچے گی۔

محمودہ بیگم کے دل کی آواز کی بازگشت
اور ان کے ذہنی کرب کو سمجھنے والی نجمہ تھی۔ وہ
بڑی ذی ہوش اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ ذرا سی عمر
میں اُس نے ہائی اسکول پاس کر لیا تھا — وہ
ماں کو تسلی اور دلاسا دیتی رہی۔ کہتی "ماں، تم
فکر نہ کرنا۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ بس کچھ دن
کی بات ہے۔" نجمہ نے ماں سے چھپ کر ایک آدھ
ٹیوشن کر رکھی تھی۔ ہائی اسکول پاس لڑکی کو کوئی
اچھی ٹیوشن تو ملنے سے رہی، پھر بھی معمولی معاوضے
والی دو ٹیوشنیں اس کو مل گئی تھیں، اس معاوضے
کی رقم کو وہ اپنی کتابوں پر صرف کرتی، محمودہ بیگم
نے محسوس کیا کہ نجمہ ان سے فیس نہیں مانگ
رہی ہے، اس کی وجہ دریافت کرنے پر جو حقیقت
سامنے آئی اس سے وہ ہکا بکا رہ گئیں، ذرا سی
بچی میں اتنی سمجھ! کیا قدرت کے کھیل ہیں۔

دو سال اسی طرح گزر گئے۔ عرفان اور
ریحان دونوں کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ ان لوگوں
نے مقابلے کے امتحان میں شرکت کی اور اس میں بھی
وہ کامیاب ہوئے۔ ایک انجینئر بن گیا اور دوسرا
ایکسائز انسپکٹر۔

محمودہ بیگم کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے
تھے۔ اُن کے دونوں لڑکے برسرِ روزگار ہو گئے
تھے، چلو کہنے کی نوبت نہیں آئی اور اُس سے
پہلے ہی اللہ نے سُن لی۔ اب کمانے لگے تو ضرور ماں

**محمودہ بیگم کا خون کھول اٹھا۔
اُن کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں،
رخساروں کے کنول مرجھا گئے —
آنکھوں کی روشن قندیلیں بجھ گئیں۔
ہونٹوں پر مہرِ سکوت لگ گئی۔**

کا خیال کریں گے، لیکن محمودہ بیگم کو خبر نہیں تھی
کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑ جائیں گے۔ آج کل
لڑکوں کا ایسا کال پڑا ہے کہ ذرا کوئی اچھا لڑکا
سامنے آیا اور لوگ اُس کو پھانسنے کی فکر کرنے
لگے۔ یہی عرفان اور ریحان کے ساتھ بھی ہوا۔
محمودہ بیگم بیٹوں کی نوکری کی خوشیاں پوری طرح
منا بھی نہیں پائی تھیں اور ایک ماہ کی تنخواہ بھی
وہ ان کے ہاتھ پر نہیں رکھ پائے تھے کہ پتہ چلا
کہ عرفان اور ریحان دونوں اپنی اپنی کلاس میٹ
کی زلفوں کے اسیر ہو چکے تھے اور دونوں اپنی اپنی
شادی جلدی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، محمودہ بیگم
کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ وہ اتنی جلدی
اس بات کے لئے تیار نہیں تھیں وہ تو پہلے
نجمہ کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے
سوچ رکھا تھا کہ لڑکی سے فارغ ہونے کے بعد
وہ اپنے لڑکوں کے لئے چندے آفتاب، چندے
ماہتاب دلہنیں لے کر آئیں گی، مگر یہاں تو پانسہ
ہی پلٹا ہوا تھا۔ محمودہ بیگم اپنی رائے اور مرضی کو
اپنے لڑکوں پر تھوپنے کے خلاف تھیں۔ یہ بات
تو ان کے سوچنے کی بھی تھی۔ باپ کے بعد وہی
دونوں تو نجمہ کے سرپرست تھے۔ لیکن جہاں
خود غرضی اور مطلب پرستی پیدا ہو جائے وہاں
خونی رشتے بے وقعت اور حقیقتیں بے وزن
ہو کر رہ جاتی ہیں۔

محمودہ بیگم نے لڑکوں کی مرضی کے مطابق
ان کی شادی کر دی، یہ ان کی خوشی کا سودا نہیں
تھا، اس لئے وہ الگ تھلگ سی رہیں، کیونکہ
انہوں نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ ان کے
لڑکے اس مسئلے میں ان کی مداخلت پسند نہیں
کریں گے۔

عرفان اور ریحان دونوں کی پوسٹنگ
الگ الگ شہروں میں ہوئی اور دونوں اپنی بیوی
کو لے کر اپنی اپنی نوکری پر چلے گئے۔ ماں بہن کے
کے بارے میں ایک نے بھی نہ سوچا کہ اکیلی کیسے
رہیں گی اور کس طرح گزر اوقات کریں گی، محمودہ بیگم
نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ وہ اپنے بیٹوں کے
عمل سے دل برداشتہ اور چوٹ کھائی ہوئی ضرور
تھیں لیکن اپنے مرتبے اور مقام سے گر کر ان سے
ملنا یا کسی قسم کا مطالبہ کرنا وہ نہیں چاہتی تھیں
اگر کبھی کسی بات سے وہ زیادہ ملول اور رنجیدہ
ہوتیں تو یہ سوچ کر تسلی دے لیتیں کہ بہت سے

لوگ ایسے بھی ہیں جن کے بیٹے نہیں ہوتے اور بہت سے لوگوں کے تو اولاد ہی نہیں ہوتی، وہ لوگ بھی تو کسی نہ کسی طرح گزر بسر کرتے ہی ہیں، پھر آخر ہمت کیوں ہاری جائے، مایوس کیوں ہو جائے

دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ عرفان دسہرے کی اور ریحان بڑے دن کی چھٹیوں میں ماں سے ملنے آئے۔ بیوی بچے بھی ساتھ آئے۔ خیر سے دونوں صاحب اولاد ہو گئے تھے۔ عرفان کے ایک لڑکی اور ریحان کے ایک لڑکا تھا، بچے بہت ہی پیارے تھے۔

محمودہ بیگم بیمار رہنے لگی تھیں۔ نجمہ نے عرفان سے اشارتاً گھر کی حالت اور ماں کی بیماری کا تذکرہ کیا مگر عرفان سنی اَن سنی کر گیا۔ نجمہ زود رنج اور طبیعت کی حساس تھی۔ اُس کو بہت بُرا لگا۔ اس لئے جب ریحان بڑے دن کی چھٹیوں گھر آیا تو اس نے عمداً چُپ سادھ لی۔

محمودہ بیگم نے بھی بیٹوں کے طرزِ عمل سے ایک سبق سیکھا۔ اگر وہ بے رُخی کرتے تو یہ بھی اُن سے کنارہ کش ہو جائیں۔ نہ اُن کے آنے پر روک لگائیں نہ جانے پر، جب ان کا جی چاہتا آتے، دو چار دن قیام کرتے۔ جانا چاہتے تو کوئی روکتا نہ تھا۔

محمودہ بیگم کا سارا اثاثہ ختم ہو چلا تھا اور اب روزانہ کے مصارف کے لئے ان کے پاس پیسہ نہیں رہا تھا۔ خرچ مونہہ کھولے قطار در قطار کھڑے تھے اور برس سمٹ سکڑ رہا تھا۔ یہ مہیب سیاہ بادل دبے پاؤں اِس گھر کی فضا پر پھیل رہے تھے۔ محمودہ بیگم کی زندگی ایک بنئے کی کتاب بن گئی جمع تفریق، سود و زیاں۔ ان کے لئے اب گاڑی کھینچنا ناممکن ہو رہا تھا۔ آخر کریں تو کیا کریں؟ وہ رات بھر اسی اُدھیڑبن میں لگی رہیں، پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح کو ان کی آنکھ لگی اور اس کے بعد جو بیدار ہوئیں تو دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی، ان کا گلا بڑی طرح سوکھ رہا تھا چہرہ بے نور و بے آب تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ وہ کچھ دیر جوں کی توں بیٹھی رہیں۔ نہ اُٹھنے کو جی چاہ رہا تھا، نہ کچھ کرنے کو۔ ذرا دیر میں جب طبیعت کچھ پُرسکون ہوئی تو انہوں نے اُٹھ کر مونہہ ہاتھ دھویا، بکھرے بالوں پر کنگھی پھیری، ناشتہ کے بعد آرام کرسی پر دراز ہو گئیں، اور پھر خیالات کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئیں۔

اچانک ان کو ایک ترکیب سُوجھی، کیوں

> خدا کا شکر ہے میں تہی دامن نہیں میری بیٹی نجمہ لاکھوں میں ایک ہے، وہ اپنی ماں کی خدمت اور اطاعت پر ایمان رکھتی ہے۔ اس کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ میری ہر تکلیف میں اپنی جان کی بازی لگانے کو تیاّر رہتی ہے۔

نہ وہ اپنے مکان کو فروخت کر دیں۔ اُن کا مکان کافی کشادہ تھا۔ اُن کی اور نجمہ کی ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ اگر ان کو چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر مل جائے تو ان دونوں ماں بیٹی کا کام چل سکتا ہے۔ اس مکان کی جو قیمت ملے اس کو اگر کسی فائننس کمپنی میں ڈال دیں تو اُن کے مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ یہ کمپنیاں اچھا خاصہ منافع دیتی ہیں۔ اس سے اُن کے مصارف چل جائیں گے۔

محمودہ بیگم نے پہلے کرائے کے مکان کی تلاش کی، ایک چھوٹا سا مگر صاف ستھرا فلیٹ آسانی سے مل گیا، کیوں کہ محلّہ پڑوس میں ان کے ملا... کی کمی نہ تھی۔ اپنا مکان انہوں نے فروخت کر... اس رقم کو ایک فائننس میں ڈال دیا جس... ان کو چھ سو روپے ماہوار ملنے لگا۔ محمودہ بیگ... کے دل پر سے بوجھ اتر گیا۔

محمودہ بیگم کو اب کوئی فکر تھی تو وہ نجمہ کی تھی۔ کسی طرح ان کی زندگی میں اس کے ہاتھ پ... ہو جائیں۔ جو لڑکے ماں کو نہ پوچھ سکے وہ بہن... کیا پوچھیں گے۔ اتفاق سے ایک اچھا رشتہ مل گیا۔ لڑکا ان کا دیکھا بھالا تھا۔ اچھا خوش... اور تن دُرست۔ پوسٹ آفس میں کلرک تھا محمودہ بیگم نے اُسے اپنی لڑکی کے لئے موزوں سم... ظاہر ہے اُونچے عہدے والا ان کے یہاں کیو... پیام دیتا۔ اس مسئلے میں محمودہ بیگم نے اپنی مر... کو اوّلیت دی۔ وہ جانتی تھیں کہ اُن کے لڑکو... کے دماغ بڑے اُونچے ہیں۔ وہ یہ رشتہ کبھی نکا... دیں گے اور اپنے معیار کا رشتہ ان کو ملنے سے ا... لہٰذا محمودہ بیگم نے ہاں کر دی اور اپنے دونو... بیٹوں کو شادی کی تاریخ سے مطلع کر دیا، لیکن... محمودہ بیگم کو اس وقت بڑا طیش آیا جب ان... دونوں لڑکوں نے اپنی اپنی مجبوری ظاہر کی کہ و... شادی میں شرکت نہیں کر سکتے۔ عرفان کے... یہاں عن قریب خوشی ہونے والی تھی اور ری... کو سرکاری کام سے کہیں باہر جانا تھا۔ عرفا... نے اپنے خط کے ساتھ پانچ سو روپے کا چیک... بھیجا تھا اور ریحان نے لکھا تھا کہ وہ جلد ہی... کا انتظام کر کے ان کو بھیجے گا۔

محمودہ بیگم کا خون کھول اٹھا۔ اُن... پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں، رخساروں کے... کنول دفعتاً مُرجھا گئے۔ آنکھوں کی روشن... قندیلیں بجھ گئیں، ہونٹوں پر مہرِ سکوت لگ گ...

عورت طبعاً شبنم ہے لیکن مجبور کرنے پر
بن جاتی ہے۔ لڑکوں کی سرد مہری اور
منائی پر وہ کڑھتی رہیں۔ تلخ حقیقتیں کوڑے
اُن کے جذبات اور احساسات پر برس پڑیں۔
کی وہ مستحق تھیں؟ یہ رویّہ ان کے ان
کا تھا جن کو اعلیٰ تعلیم دلا کر کسی قابل بنانے
ان کا تعاون کس درجہ شامل تھا۔ انہوں
لیا کچھ نہیں کیا تھا؟ اپنا سارا زیور، کل اثاثہ
پر نچھاور کر دیا تھا۔ کیا اسی دن کے لئے؟
نے کیسا اپنا پیٹ کاٹا تھا اور قربانی
قربانی دی تھی، صرف اپنا فرض نبھانے کی
اور موت کی آغوش میں پناہ لی تھی جس طرح
والدین سوچتے ہیں اسی طرح انہوں نے
سوچا تھا کہ آج وہ اپنا فرض پورا کر رہے ہیں،
کل جب تنگ دستی، تنگ دامنی اور بڑھاپے
کا وقت آئے گا تو اُن کے لڑکے اس امر کا لحاظ
رکھتے ہوئے اُن کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے
اور اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کریں گے۔

ہر انسان، محبّت، ہمدردی اور چاہت
کا بھوکا ہے اور اگر یہ سب اعزّا و اقارب سے
ملے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ محمودہ بیگم یہی
سوچے جا رہی تھیں کہ دنیا کتنی خود غرض ہو گئی
ہے۔ اپنے ناخنوں کو رنگین کرنے کے لئے دوسرے
کے ارمانوں کا خون کر دیا جاتا ہے، انہوں نے
تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں ایک وقت
ایسا بھی آئے گا کہ وہ تنہا اپنی کشتیٔ حیات کو
کھیتی رہیں گی اور کوئی پُرسانِ حال نہ ہوگا۔
تقدیر کی بے رحمی اور سنگینی پر وہ تڑپ اٹھیں۔

دیر تک محمودہ بیگم سوچتی رہیں کہ ایسا
کیوں ہوتا ہے کہ زندگی میں چند روشن کرنیں امید
کی جھلک پیدا کرتی ہیں۔ آہستہ یہی کرنیں پھیل
کر صبح کا اجالا بنتی ہیں، لیکن پھر یہ سیاہ تاریکیوں
میں کیوں بدل جاتی ہیں؟ محمودہ بیگم ایک شش و پنج
اور کشمکش میں تھیں، چیک ان کو کاٹنے کھا رہا
تھا۔ بہتر یہی تھا کہ جلد از جلد یہ چیک ان کی
نظروں سے دُور ہو جائے تاکہ وہ سکون و چین
کا سانس لے سکیں۔ انہوں نے عرفان کو اس
کا چیک واپس کرتے ہوئے اپنے خط میں لکھا۔

"یہ جان کر دکھ ہوا کہ تم اپنی بہن کی شادی
میں شرکت نہیں کر سکتے، تم یہ پانچ سو روپے

> تمہارے اس چیک سے میرے
> جذبات ہی مجروح نہیں ہوئے ہیں۔
> میری خودداری، غیرت اور انا کو ٹھیس
> پہنچی ہے۔ نجمہ کے مزاج کو دیکھتے ہوئے میرا
> یقین ہے کہ تمہارے اس عمل کو وہ ذلت
> پر محمول کرے گی۔ اور ہرگز اس رقم کو
> قبول نہ کرے گی۔

نہ دیتے صرف خالی ہاتھ آکر کھڑے ہو جاتے
تو میں خود کو بڑی بھاگیہ وان سمجھتی، تم نے اونچی
تعلیم حاصل کی ہے، اونچی اونچی ڈگریاں تمہارے
پاس ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے دولت، ثروت
عزت، سب ہی تم کو میسر ہے، شاید اسی لئے
فرض اور رحم کے فرق کو بھلا بیٹھے ہو، رحم کن
لوگوں پر کیا جاتا ہے اور فرض کی ادائی کس طرح
ہوتی ہے اس کو اگر تم جانتے تو شاید ایسی حرکت
نہ کرتے، ماں باپ کی خدمت اور اطاعت اولاد
کا فرض ہے، نہ صرف یہ بلکہ اولاد کا یہ بھی فرض
ہے کہ ماں باپ کا مونہہ کھلنے سے پہلے ان کی
ضرورتوں کو سمجھ لے۔ نجمہ تمہاری ذمہ داری تھی
لیکن تم نے اس کو بوجھ سمجھ کر اپنے سے دُور رکھا
کبھی اس کے اچھے بُرے کی خبر نہ لی۔ جس طرح
اب تک نجمہ کی اور میری گزر اوقات ہوتی رہی
ہے اسی طرح اس کی شادی بھی ہو جائے گی۔ تم
بھائی ہو، لیکن خدا کی اس زمین پر بہت سے
بندے ایسے بھی ہیں جو اپنی مصروفیات کو بالائے طاق
رکھ کر بے باپ کی بچیوں کی شادی میں بڑھ چڑھ
کر حصّہ لیتے ہیں۔ تمہارے اس چیک سے میرے
جذبات ہی مجروح نہیں ہوئے ہیں، میری خودداری
غیرت، اور انا کو بھی ٹھیس پہنچی ہے۔ نجمہ کے مزاج
کو دیکھتے ہوئے میرا یقین ہے کہ تمہارے اس عمل
کو وہ ذلت پر محمول کرے گی اور ہرگز اس رقم کو
قبول نہ کرے گی۔

"خدا کا شکر ہے میں تہی دامن نہیں۔
میری بیٹی نجمہ لاکھوں میں ایک ہے، وہ اپنی ماں
کی خدمت اور اطاعت پر ایمان رکھتی ہے، اس
کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ میری ہر تکلیف میں اپنی
جان کی بازی لگانے کو تیار رہتی ہے، مجھ کو اپنی
بیٹی پر فخر ہے۔ شاید تم کو یاد ہو کہ اس نے بچپن
میں ٹیوشن کر کے میرے مصارف میں میرے ساتھ
تعاون کیا۔ لیکن تم اتنی پیاری بہن کی بھی قدر نہ کر سکے
تم صرف روپیوں کی جھنکار سے ہی محظوظ ہوتے
رہے۔

"خط خاصا طویل ہو گیا ہے، پڑھنا
تم پر بار نہ ہو، اس لئے ختم کرتی ہوں، تمہارا
چیک واپس کر رہی ہوں۔ برا نہ ماننا، ریحان
کو ضرور لکھ دینا کہ میں نے تمہارا چیک واپس کر دیا
ہے، بہتر ہے کہ وہ مجھ کو مزید آزمائش میں نہ ڈالے،
"میری طرف سے بہو اور بچوں کو دلی
دعائیں۔ نجمہ سلام عرض کرتی ہے۔" ■■

ہر ماں اور باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کا لاڈلا دنیا کی آنکھ کا تارا بنے ۔ صرف اُن کا ہی نہیں، قوم کا ملک کا بھی نام روشن کرے ، دُنیا کی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھائے ۔ یہ خواہش اپنی جگہ ٹھیک ہے ، مگر آپ نے اِس سِلسلے میں کیا کچھ کیا ہے ۔ اس کی ابتدا پنگوڑے میں ہی کرنی چاہئے ۔ اپنے لاڈلے کو "ممتا" دیجئے ، یہ ننھے بچوں کا خاص ٹانک ہے، جو ایک ماں کی طرح ان کی حفاظت کرتا ہے ۔ جسم میں کیلشیم کی کمی کو دُور کر کے ہڈیوں کے ٹیڑھے پن کو روکتا ہے ۔ ننھے بے زبان بچوں کو قبض سے نجات دلاتا ہے ۔ نزلہ اور زکام میں بھی مفید ہے ۔ بچوں کو ہنستا اور خوش و خرم رکھنا ہی "ممتا" کا کام ہے ۔ اپنے بچے سے پیار ہے تو اُسے "ممتا" ہی دیجئے اور دیکھئے وہ کتنی جلدی جلدی پروان چڑھتا ہے ۔

قیمت فی شیشی : ۸ روپے ۵۰ پیسے

شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) **لیباریٹریز**، لال کنواں، دہلی ۶

بیٹی کے اسکول کا پہلا دن

میری بیٹی کے وہ اسکول کا پہلا دن تھا
کیا بتاؤں کہ مرے دل کا عجب عالم تھا
رات بھر سو نہ سکی
خواب پر خواب بُنے
جاگتی آنکھوں سے کئی
میرے دل میں جو لرزتے ہوئے
سوچوں کے گھنے سائے تھے
انہیں سوچوں کے گھنے سائے میں
بچھڑی یادوں کو لئے
دُور تلک جا پہنچی
آگہی کرب کی جو ماں کا مقدر ہے بنی
اور بشارت کا وہ لمحہ جاگا
درد کی، کرب کی، تخلیق کی جاں لیوا گھڑی
جب مری گود میں چہکی تھی وہ ننھی سی کلی
درد کا ایک سمندر مرے آگے تھا رواں
ڈوبتی، چھوٹتی نظروں میں قیامت کا سماں
ہاں قیامت کہ قیامت یونہی ہوتی ہوگی
میں نے سوچا کہ یہی مرنا ہے
میری گڑیا کے وہ اسکول کا پہلا دن تھا
رات بھر سو نہ سکی انہیں سوچوں میں رہی
چاندنی بہتی ہوئی، چاندی کا ساگر بن کر
میرے آنگن پہ جھکی
رات کے ہاتھوں نے تاروں کے نگینے بانٹے
میرے پلّو پہ کئی درد کے تارے ٹانکے
کرب نے گیت کی صورت لے لی
ایک چڑیا کی کہیں نرم ہنسی
چاندنی رات کی اُجلی لوری
میرے کانوں میں پڑی
پھول نے جھک کے کہا سو جاؤ
ساری ماؤں کا مقدر ہے یہ راحت کی گھڑی
اک فرشتے نے مرے کان میں سرگوشی کی
رات، اِس رات۔ جنت مرے قدموں سے لپٹ کر سوئی
اور دو ہاتھ محبت بن کر۔ میرے ہاتھوں پہ جھکے
میں نے جانا کہ یہی جینا ہے
میری بیٹی کے وہ اسکول کا پہلا دن تھا
رات بھر سو نہ سکی، انہیں سوچوں میں رہی
فاصلہ بنتی ہوئی صبح کے لمحے جاگے
دُور ہوتی ہوئی قربت تھی وہ آگے آگے
پھول سا چہرہ ہواؤں میں کھلا جاتا تھا
ہاتھ اس کا مرے ہاتھوں سے چھٹا جاتا تھا
ننھے قدموں میں نہ لرزش تھی نہ ڈر تھا نہ تھکن
اک نئی دنیا کو پانے کی سجانے کی لگن
اُس نے دیکھا بھی نہیں مڑ کے مجھے
پھول سے ہاتھ کو ایک ہاتھ نے تھاما بڑھ کر
اور گم ہو گئی اسکول کے جنگل میں کہیں
اور پلٹ کر مجھے دیکھا بھی نہیں
ایک تارہ مری پلکوں پہ کہیں ٹوٹ گیا
میرا آنچل مرے ہاتھوں سے وہیں چھوٹ گیا
پھر وہی ہاتھ رفاقت بن کر
میرے شانوں پر جھکے
میں نے سمجھا کہ یہی جینا ہے
میں نے جانا کہ یہی جنت ہے
میری بیٹی کے وہ اسکول کا پہلا دن تھا
کیا بتاؤں کہ مرے دل کا عجب عالم تھا

محسنہ جیلانی

آپ کتنے برس جئیں گی

بائیبل میں انسان کی عمر ۷۰ سال بتائی گئی ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے انسان کی اوسط عمر ۳۰ سال سے زیادہ نہیں تھی، لیکن آج کل انسان اسّی نوّے سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق تمام دنیا میں عورتوں کی عمر مردوں سے زیادہ ہوتی ہے یعنی نانی، دادی زندہ رہتی ہیں اور نانا، دادا چل بستے ہیں ساری دنیا میں عمر کا اوسط مختلف ہے۔ ہالینڈ لمبی عمر کے معاملے میں سرِفہرست ہے۔ وہاں عورتوں کی اوسط عمر ۷۷ سال ہے اور مردوں کی ۷۱ سال۔ انڈونیشیا میں دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں یعنی ۵۴ سال۔ دنیا میں صرف تین ملک ایسے ہیں جہاں مرد عورت سے زیادہ جیتے ہیں۔ ہندوستان، جہاں عورت کی اوسط عمر ۴۱ سال ہے اور مرد کی ۴۲ سال۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ملک کمبوڈیا میں عورت کی اوسط عمر ۴۲ سال ہے اور مرد کی ۴۴ سال۔ پاکستان میں مَردوں نے بازی جیت لی۔ وہاں عورت کی اوسط عمر ۴۹ سال ہے اور مَرد کی ۵۴ سال۔

یورپ کا ایک سائنس داں اس مسئلہ پر تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ درازیٔ عمر کا ایک پہلو وراثت ہے۔ اگر ماں باپ، دادا دادی، نانا، نانی ۸۰ سال سے زیادہ زندہ رہے تو آپ کی عمر کا اوسط بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس سائنس داں نے ایک چارٹ بنایا ہے جس سے انسان اپنی عمر کی درازی کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کے خاندان میں عمریں لمبی ہیں تو آپ اپنی عمر کا اوسط مقرر کر سکتی ہیں۔ فرض کیجیے کہ یہ اوسط ۷۰ سال ہے تو اس میں زندگی، ماحول، صحت اور کام کے لحاظ سے برسوں کی جمع تفریق ہوتی ہے۔ یہ حساب درج ذیل ہے۔ اسے فرضی اوسط عمر میں گھٹانا یا بڑھانا ہے۔

اگر آپ کے دادا دادی، نانا نانی میں سے دو بزرگ ۸۰ سال سے زیادہ زندہ رہے تو اوسط عمر میں ۲ سال جمع کر لیں۔ اگر چاروں ۸۰ سال زندہ رہے تو ۵ سال جمع کر لیں۔

اگر آپ کے نزدیکی رشتہ داروں میں کوئی انسان ۵۰ سال کی عمر میں دل کے دورے سے فوت ہو گیا تو اوسط سے ۴ سال گھٹا دیں۔

اگر ماں باپ، بھائی بہن میں کسی کو کینسر ذیابیطس یا دل کی بیماری ہے تو ۳ سال گھٹائیں

اگر آپ کسی بڑے شہر میں رہتی ہیں جس کی آبادی ۱۰ لاکھ سے زیادہ ہے تو ایک نمبر گھٹائیں۔ اگر کسی قصبے یا چھوٹے شہر میں رہتی ہیں جس کی آبادی ۱۰ ہزار تک ہے تو ایک نمبر جمع کر دیں۔

اگر کوئی مرد دن بھر دفتر میں بیٹھا رہتا ہے تو ۲ سال گھٹائے جائیں۔ اگر اس کا کام چلنے پھرنے کا ہے تو ۲ سال جمع کیے جائیں۔ اگر وہ سال میں ۵۰ ہزار روپے سے زیادہ کماتا ہے تو ۲ سال گھٹائے جائیں۔ تعلیم یافتہ انسان ایک سال جمع کرے۔ ایم اے تک پڑھا ہو تو ۲ سال جمع ہوں گے۔ اگر آدمی ۶۰ سال کی عمر میں بھی کام کرتا ہے تو ۳ سال جمع ہوں گے۔ ۴۰ سگریٹ روز پینے والا مرد ۸ سال گھٹائے۔ ۲۰ سگریٹ روز پینے والا ۶ سال اور ۱۰ سگریٹ روز پینے والا ۳ سال۔

جہاں دادا دادی کی شادی پوتے کراتے ہیں

سرفراز احمد

ہندوستان میں عموماً لڑکی کی پیدائش پر جشن نہیں منایا جاتا۔ لڑکی کی پیدائش پر اکثر ماں باپ کا مُونہہ لٹک جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں ایسے علاقے بھی موجود ہیں جہاں بیٹی کی پیدائش پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ بیٹی پیدا ہو تو جہیز دینے کی بجائے لڑکی کی قیمت مل جاتی ہے یہ لوگ چھوٹا ناگ پور کے علاقے میں رہتے ہیں جو جنوبی بہار اور اُڑیسہ کی سرحد پر واقع ہے۔ یہ لوگ ڈانگ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ لوگ جنسی آزادی کے قائل ہیں۔ شادی سے پہلے لڑکی کے بچہ پیدا ہو جائے تو اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہر شخص خوش ہوتا ہے کہ گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہوگا۔ اگر لڑکا ہے تو کھیتوں میں کام کرے گا اگر لڑکی ہو تو اس کی شادی پر اس کی قیمت ملے گی۔ شادی کے بعد بھی لڑکی جس کے ساتھ چاہے محبت کی پینگیں بڑھا سکتی ہے۔

بے وفائی اور بدچلنی کے الفاظ ڈانگی ڈکشنری میں نہیں ملتے۔ یہ ایک تعجب انگیز بات ہے کہ روایتوں سے جکڑے ہوئے اس ملک میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنی آزاد خیالی میں یورپ کے ترقی پسند ملکوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اگر کوئی ڈانگی اپنی بیوی کو مارتا پیٹتا ہے تو وہ اسے چھوڑ دیتی ہے۔ طلاق کے بعد دوسری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ ہندوستانی سوسائٹی میں ستی ساوتری کا جو تصور برسوں سے رائج ہے، ڈانگی عورتیں اس سے کوسوں دُور ہیں۔

ڈانگی عورتوں سے شادی کی رسم بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اس لئے وہاں لوگوں نے شادی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلی رسم 'بول پن' کہلاتی ہے۔ یہ ہمارے یہاں کی سگائی سے مشابہ ہے۔ دوسری رسم باقاعدہ شادی ہے جو ہمارے یہاں کے نکاح اور رُخصتی سے ملتی جُلتی ہے۔

سب سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اس کے بعد لڑکے لڑکی کو دیکھنے اس کے گھر جاتے ہیں۔ یہ عموماً منگنی یا 'بول پن' کی رسم سے پندرہ بیس روز پہلے ہوتا ہے۔ لڑکے والے اس بات کا خاص دھیان رکھتے ہیں کہ لڑکی ان کی رشتہ دار نہ ہو۔ اگر لڑکے والوں کو لڑکی پسند آجائے تو لڑکی کا باپ انہیں چائے پلاتا ہے۔ چائے کے ساتھ گُڑ اور بسکٹ بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ اپنی لڑکی کی شادی پر یہ اس کا پہلا اور آخری خرچ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اصل بات شروع ہوتی ہے، یعنی لین دین کی بات۔ لڑکے والے لڑکی کی کتنی قیمت ادا کر سکتے ہیں؟ آج کل مہنگائی کا زمانہ ہے۔ آج سے دس سال پہلے ایک ڈانگی نے ۵۰ روپے ۵، پیسے میں اپنی بیوی خریدی تھی لیکن تین سال پہلے لڑکے والوں نے لڑکی کے لئے ۲۰۵ روپیہ ادا کیا۔ آج ممکن ہے کہ یہ رقم بڑھ کر ۳۰۰ تک پہنچ گئی ہو۔ ساڑی، چولی، چوڑیاں اور ناک کی کیل اس کے علاوہ ہے۔ یہ سب خرچ لڑکے والے اُٹھاتے ہیں۔

اگر لڑکی والے لڑکے کی مالی حالت سے مطمئن نہ ہوں تو کسی رشتہ دار کو لڑکے کے گھر بھیجتے ہیں تاکہ وہ اس کی مالی حالت کا جائزہ لے۔ کبھی کبھی لڑکی کا باپ خود لڑکے کے گھر جاتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ کھیتی میں لڑکے کا کتنا حصہ ہے؟ اس کی لڑکی وہاں آرام سے رہ سکے گی یا نہیں؟ وہ ان سب باتوں کی تحقیقات کرتا ہے مطمئن ہو جانے پر وہ منگنی کا دن طے کر دیتا ہے۔

منگنی کے دن لڑکے والے لڑکی کے گھر پہنچتے ہیں۔ وہاں وہ اپنے لئے دال بھات لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد شراب کا دَور چلتا ہے۔ پھر ڈھولک بجتی ہے۔ گانا ہوتا ہے۔ ڈھولک کی آواز پر سب مل کر ناچتے ہیں۔ لڑکی والے لڑکی کو کندھے پر بٹھا کر ناچتے ہیں۔ دُولہا بھی اکثر ناچ گانے میں

شامل ہو جاتا ہے۔ نشے میں دُھت عورتیں اپنے مردوں کے کندھوں پر بیٹھ جاتی ہیں۔ ڈھولک کی آواز تیز ہو جاتی ہے اور یہ تماشا رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ تھک ہار کر یہ لوگ جہاں جگہ ملے سو جاتے ہیں۔

صبح کو جب نشہ ختم ہو جاتا ہے تو لڑکے والے لڑکی میکے سے سسرال لے جاتے ہیں۔ یہ برات دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ لڑکی کے لئے نہ ڈولی ہوتی ہے اور نہ کوئی دوسری سواری۔ وہ دُولہا کے ساتھ آئے ہوئے براتیوں کے کندھے پر سوار ہو کر دُولہا کے گھر جاتی ہے۔ اگر دلہن بھاری جسم کی ہو اور براتی کم زور ہو تو وہ اپنا کندھا بدل لیتا ہے اور دوسرا براتی اس بوجھ کو کندھے پر اُٹھا لیتا ہے۔ اس طرح لڑکی دُولہا کے گھر پہنچ جاتی ہے لیکن ذرا ٹھہریئے۔ لڑکی دُولہا کے گھر پہنچ تو گئی لیکن ابھی تک اس کی باقاعدہ شادی نہیں ہوئی۔ شادی ایک الگ مسئلہ ہے۔ اس میں دُور دراز سے پنڈت کو بُلانا پڑتا ہے۔ اسے بھاری فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ منڈپ بنتا ہے۔ دعوت ہوتی ہے۔ ڈانگی لوگ باقاعدہ شادی کو ٹالتے رہتے ہیں۔

بول پن یا منگنی کے بعد لڑکی گھر آ گئی۔ وہ بیوی کی طرح رہتی ہے تو شادی کا خرچ کون اُٹھائے؟ بعض اوقات نوجوان بیٹے اپنے ماں باپ کی باقاعدہ شادی کا خرچ اُٹھاتے ہیں کبھی کبھی یہ بار پوتوں پر پڑتا ہے۔ دادا، دادی کی شادی کے لئے روپیہ جمع کر کے پوتے اس فرض کو انجام دیتے ہیں۔ شادی میں میاں بیوی کا لباس بھی قیمتی ہوتا ہے۔ میاں بڑھیا لُنگی اور صافہ پہنتا ہے۔ بیوی لال ساڑی زیبِ تن کرتی ہے۔

بول پن یا منگنی کے بعد جب لڑکا دلہن کو لے کر اپنے گھر پہنچتا ہے تو وہ باپ سے اپنا الگ گھر مانگتا ہے۔ کوئی بیٹا شادی کے بعد ماں باپ کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا۔ زمین پر باپ کا قبضہ ہوتا ہے وہی اس زمین سے کچھ حصہ نکال کر بیٹے کا جھونپڑا تعمیر کراتا ہے۔ اگر باپ لڑکے کو علیحدہ گھر بنا کر نہ دے تو گھر میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں بعض اوقات نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ بیٹا گھر نہ ملنے پر باپ کی پٹائی کرتا ہے۔ باپ مجبور ہو کر اسے علیحدہ گھر بنوا دیتا ہے۔ بیٹے کو گھر مل جائے تو وہ باپ کی خدمت کرتا ہے اور اسے دونوں وقت کھانا بھجواتا ہے۔ اگر باپ کے پاس زمین نہ ہو اور وہ بہت غریب ہو تو وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں بیٹا خود ہی اپنا گھر بنواتا ہے۔ اور باپ بیٹے کی مار پیٹ سے بچ جاتا ہے۔

خیال اپنا اپنا

نتیجہ بانو ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵ میں شائع ہوگا

یہ انعامی مقابلہ آپ کو موجودہ دور کے مختلف مسئلوں اور سوالوں کے بارے میں اظہارِ رائے کا موقع اور دعوت دیتا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات اور فکری نتائج دوسروں تک پہنچایئے اور انعام حاصل کیجئے۔

پہلا انعام: سو روپے

دوسرا انعام: پچاس روپے

تیسرا انعام: تیس روپے

اس ماہ کا سوال ہے: اگر میاں بیوی کی عمر میں کافی فرق ہو تو کیا زندگی زیادہ کامیاب گزر سکتی ہے؟

اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ لفظوں میں اپنے خیالات ہمیں لکھ بھیجئے۔ آپ کی تحریر نومبر ۱۹۸۵ تک اس پتے پر پہنچ جانی چاہئے:

"خیال اپنا اپنا" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تنہا تنہا

سیما ناصر
(ٹھٹھ، سندھ، پاکستان)

دریچے سے آتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بڑے پیارے لگ رہے ہیں، لان میں کھلے پھولوں کی خوشبوئیں ہولے ہولے قدم رکھتے ہوئے شریر بچوں کی طرح کمرے میں اٹھکھیلیاں کر رہی ہیں، سفید پردوں سے چھن چھن کر آتی چاندنی جیسے کچھ گنگنا رہی ہے اور میں حسب معمول اپنے اندھیرے کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی سرسراتے پردوں کے پیچھے جانے کیا تلاش کر رہی ہوں، دُور گھڑی کی ٹن ٹن نے بارہ بجنے کا اعلان کیا ہے میں اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں، سلیپر پیروں میں ڈال کر دریچے کے پاس آ کھڑی ہوتی ہوں۔ نیچے باغ میں کھلے ہوئے موتیا، چنبیلی اور رات کی رانی کی خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی ہے۔ حسین اور خوبصورت پردوں کے پار دودھیا چاندنی میں نہائی ہر شے کیسی بھلی لگ رہی ہے۔

سامنے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کی لہریں جھاگ اُڑاتی، پھنکارتی سی ساحل تک آتی ہیں اور واپس جانے کہاں چلی جاتی ہیں، ان شور مچاتی لہروں میں بھی کیسا سکون ہے۔ لیکن میرے اِس ویران اور سنسان مکان میں، میرے اپنے جیون میں ہر وقت کیسا شور ہے، یادوں کا کیسا ہجوم ہے، سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ کلفٹن پر سمندر کے کنارے یہ خوب صورت بنگلہ، قیمتی ساز و سامان جس کی ہر شے، پرفارن کا لیبل ہے، گیرج میں کھڑی امپورٹیڈ کار، چاندی، سونے کے ظروف، قیمتی پردے۔ مخملی قالین، لوگوں کو یہ سب کیسا بھلا سا لگتا ہے۔ کہتے ہیں: بیگم حسین اپنے نام ہی کی طرح خوش بخت ہیں، لیکن کیا میں بھی خوش بخت ہوں؟ یہ بنگلہ، یہ بڑے بڑے کمرے، یہ لان میں کھلے پھول، ہر کمرے میں سجا ہوا قیمتی سامان، جس کی ترتیب بدل بدل کر رکھنے پر بھی میں مطمئن نہیں ہو پاتی، یہ کیسا شور ہے جو میرے اندر اُٹھتا ہی رہتا ہے۔

دُور سمندر میں ایک کشتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ماہی گیر مچھلی پکڑنے جا رہے ہیں۔ کشتی میں جلتا بجھتا وہ روشن چراغ مجھے بھی دُور کہیں ماضی کے سناٹوں میں کھینچے لئے جا رہا ہے۔

بہن بھائیوں میں سب سے بڑی، متوسط طبقے کے گھرانے کی سیدھی سادی

دادی امّاں پھپھو جان کے بیٹے نوید کو میرے لئے منتخب کر چکی ہیں اور میں چھپ چھپ کر نوید کو دیکھتی ہوں، لال سرخ، لمبے تڑنگے۔ مگر اُمّی ہیں کہ خالہ امّاں کے بیٹے اقبال پر جان دیتی ہیں۔

ڑکی، گھریلو ماحول، وہی فرسودہ گھِسا پِٹا، وپٹہ سر سے کھِسکا نہیں کہ دادی امّاں کا دو ہتّڑ بلا۔ سارے دن چولھا ہانڈی۔ ذرا فرصت ہوئی نہیں کہ دادی امّاں نے کترنوں کی گٹھری کال لی۔ کترنیں جوڑ کر، دسترخوان یا چاندنیاں ور تکیے کے غلاف بن رہے ہیں اور میں سر جھکائے ننھے ننھے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر جیسے دل کے آسمان پر آرزوؤں کے ستارے ٹانک رہی ہوں یا پھر سوّیاں اور پاپڑ بن رہے ہیں، سویٹر اُدھیڑے بُنے جا رہے ہیں وپٹے رنگنے اور چُنّن دینے کا کام ہے۔ غرض گھر کے جھمیلے ہیں اور میں ہوں، کورس کی کتابوں کے سوا مجال ہے جو کسی ناول یا رسالے کو ہاتھ لگا سکتے ہوں، ہاں کبھی بھار سال چھ مہینے میں دادی امّاں اور اُمّی نہ ہوں تو پڑوس کے مکان سے شمّی آپا سے شمع کے پرچے لے کر چوری چوری پڑھ لیتے ہیں س ایک ساتھ سب کچھ پڑھنے کو جی کرتا ہے ور سارے افسانے جب گڈ مڈ ہو جاتے یں تو جانے ذہن میں کیسی کیسی آندھیاں سی چلتی ہیں، مگر کس سے کہیں، نہ کہیں جانے کی اجازت ہے اور کسی سے ملنے کا یارا۔

خالہ شگفتہ کی شادی ہو چکی ہے اور ب میری باری ہے۔ ہر جانے آنے والے کے سائے سے گھبرا رہی ہوں۔ رنگین کپڑوں کے ڈھیر آتے ہیں، سلتے ہیں اور ٹرنکوں میں سینت کر رکھ دئے جاتے ہیں۔ دل چاہتا ہے جگ مگ کرتے کپڑے پہن کر خوب سنگھار کروں۔ لیکن کیسے؟ امّاں کے ٹرنک پر لگا تالا میرا مونہہ چڑا تا رہتا ہے، کبھی چوری چھپے ٹرنک کی چابی ہاتھ لگتی ہے تو اس تلے کے کان مروڑتی ہوں سامنے دھنک کے سارے رنگ بکھر جاتے ہیں۔ ہائے کیسا پیارا سلک ہے۔ کیسی عمدہ بنارسی ساڑی ہے، کیسی خوش رنگ بوٹیاں ہیں۔ کیسے جھل مل ستاروں کے کام کے جوڑے ہیں، کوئی آہٹ ہوتی ہے تو میں تالا لگا، لپک کر بچوں کے کپڑوں میں بٹن ٹانکنے بیٹھ جاتی ہوں۔

کبھی اچانک امّاں بی کو لاڈ آجاتا ہے تو ان ہی جوڑوں میں سے کوئی جگ مگ کرتا جوڑا تھما کر کہتی ہیں۔ "جا بٹیا نہا دھو کر یہ جوڑا پہن لے" اور میں نظریں جھکائے اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتی ہوں۔ دادی امّاں کے پاندان سے پان چرا کر ہونٹوں کو رنگنے کا سامان کر لیتی ہوں۔ پکوان ٹرے میں سجائے آنے والے مہمانوں کے سامنے کچھ پل کے لئے ٹھہرتی ہوں اور جب وہ چلے جاتے ہیں تو وہ جوڑا اتار کر تہہ کر کے ٹرنک کی زینت بنا دیا جاتا ہے۔ کیا زندگی تھی خدایا وہ بھی! اور میں دُعا مانگنے لگتی ہوں "یا اللہ میری بھی شادی کر دے کہ میں بھی نئے نئے خوش رنگ جوڑے پہنوں" ان بد رنگ جوڑوں سے تو اب کراہیت ہونے لگی ہے ہائے! خالہ شگفتہ کیسے کیسے کپڑے پہننے لگی ہیں، کیسے چٹپٹے ناول اور رسالے پڑھنے لگی ہیں اور میں نے جو کسی کتاب کو ہاتھ لگایا یا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو نہارا کہ دادی امّاں نے جوتی پھینک کر ماری "بی بی، امّاں باوا کے گھر یہ چونچلے نہیں چلیں گے، پرائے گھر کی ہو جاؤ تو جو جی چاہے کرنا، میرا جی چاہتا ہے کہ کہوں۔ "امّاں بی! جانے کیسا گھر ملے۔ اپنے جی کی کر بھی سکوں گی کہ نہیں، مگر کیسے کہوں۔ کچھ کہنا سُننا سیکھا ہی کہاں ہے۔

دادی امّاں پھپھو جان کے بیٹے نوید کو میرے لئے منتخب کر چکی ہیں اور میں چھپ چھپ کر نوید کو دیکھتی ہوں۔ لال سرخ۔ لمبے تڑنگے مگر امّی ہیں کہ خالہ امّاں کے بیٹے اقبال پر جان دیتی ہیں۔ کیسے فلمی ہیرو جیسے ہیں۔ بات بے بات شعر سنانا، قہقہے لگانا، شرارتیں کرنا بس ایک بجلی ہیں، کبھی اِدھر چمکی کبھی اُدھر چمکی اور میں چُپ تماشا دیکھ رہی ہوں۔ بے زبان لڑکیوں کی قسمتیں تو ہمارے بزرگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ جس تھان پر چاہیں لے جا کر باندھ دیں، کہاں کے آئیڈیل کیسے آئیڈیل اچانک ماموں جان پاکستان سے آجاتے ہیں اور ابّا جان میرا ہاتھ ان کے بیٹے منصور کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔ اقبال اور نوید ڈولی کو کاندھا دینے میں آگے آگے ہیں۔ عجیب کارخانہ ہے یہ دنیا۔ یہ گورکھ دھندا کس کے سمجھ میں آیا ہے۔

برقعے میں لپٹی لپٹائی، ابو کی قدم بوسی کرتی، امی اور دادی اماں کی دعائیں لیتی دیارِ غیر میں چلی آتی ہوں۔ پہنچتے ہی منصور برقعہ تہہ کرکے رکھ دیتے ہیں، کہتے ہیں: "یہ جھاڑ جھنکاڑ سے بال سیٹ کرایئے۔"

میں آملے کا تیل سر میں ڈال کر لمبی سی چوٹی گوندلیتی ہوں۔

"کہاں سے لے آیا ہے یہ تیلن؟ تو تو کہہ رہا تھا کہ ایم۔ اے۔ ہے۔"

رخسانہ باجی کے الفاظ تیر بن کر کلیجہ چھلنی کردیتے ہیں۔

"ہاں پرائیویٹ طور سے ایم۔ اے کیا ہے۔ سنتے تو ہیں۔"

جی چاہتا ہے کہوں: آپا، میرے اماں ابا نے مجھے تعلیم دلائی ہے، میک اپ نہیں سکھایا ہے۔

پھر میک اپ بکس آجاتا ہے، آپا رخسانہ میرے چہرے کو تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں، اور جب میں تیار ہوکر آئینے کے سامنے کھڑی ہوں تو خود کو پہچان نہیں پاتی ہوں۔ پنسل پھری ہوئی بھنویں۔ رنگے ہوئے بال، ہونٹ جیسے سرخ شعلے۔

"ہاؤ چارمنگ!" آواز سن کر میں پلٹ پڑتی ہوں، آج منصور بڑے خوش نظر آرہے ہیں اور میں سوچ رہی ہوں: یہ تو اجڑی اجڑی سی صورتوں کے ہی دیوانے ہیں۔

غریب رگڑ رگڑ کر مسالے پیستی ہوں۔ کھانے پکاتی ہوں۔ پوچھتی ہوں کیا کباب پسند آئے آپ کو؟"

> میرے اندر جیسے کچھ ٹوٹ جاتا ہے یا میں ہی بکھر جاتی ہوں، گلابی ساڑی جھلمل ستاروں سے تن من کو جلا دیتی ہے، سفید ساڑی پہن کر جیسے اپنے آپ کو اپنی حسرتوں کے کفن پہن کر جائے نماز پر کھڑی ہوجاتی ہوں۔

وہ چونک جاتے ہیں۔ "ہاں اچھے ہیں۔ کسی دن کولمبس کے کباب کھائیں گے۔ بڑے مزے دار ہوتے ہیں۔"

میں موںہہ دیکھتی رہ جاتی ہوں۔ بھیا جی کی یاد آتی ہے۔ کیسے واہ واہ کرکے کھانا کھاتے تھے۔ پورے خاندان میں میرے ہاتھ کے پکائے کھانوں کی دھوم تھی۔

کولمبس میں بیٹھے ہیں۔ ڈھکے ہوئے سر کو دیکھ کر وہ بگڑ اٹھتے ہیں: "کیا نماز پڑھنے کو آئی ہو؟ ہر جگہ کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اس طرح سہمی سہمی بیٹھوگی تو لوگ کہیں گے کہ بھگا کر لایا ہے۔"

میں حیران سی انہیں دیکھتی رہ جاتی ہوں۔ وہ واش بیسن کی طرف جاتے ہیں تو میں دادی اماں کی سرخ سرخ آنکھیں تلاش کرتی ہوں۔

"ہیلو مسز منصور!" کوئی ہاتھ آگے بڑھاتا ہے۔ میں لرز جاتی ہوں۔

"میرے عزیز ترین دوست محسن۔ میری بیگم مینا منصور۔"

"ہاں اماں اب میں عابدہ نہیں رہی اب تو مینا منصور ہوں۔ یہاں کے آداب نرالے ہیں۔

میں جھک کر تسلیم کرتی ہوں — شیک ہینڈ کیسے کرلوں؟ کبھی کسی مرد سے ہاتھ ملایا ہی کہاں؟ مگر منصور کے چہرے کے رنگ ہولا دیتے ہیں۔

محسن میری نیچی نگاہوں اور خاموشی کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں اور منصور ہیں قہقہے پر قہقہہ لگا رہے ہیں، لیکن گھر پہنچ کر مجھ پر بگڑ اٹھتے ہیں۔

"تمہارے گھر والوں نے تمہیں گٹھری میں باندھ رکھا تھا کیا؟ کوئی مینرز اور ایٹی کیٹ نہیں سکھائے۔ گنوار عورت! کیا سوچتا ہوگا میرا دوست بھی۔"

میں چپ چاپ آنسوؤں کو پیتی۔ اماں کے تصور میں کھو جاتی ہوں۔ اماں، تمہاری لال پیلی آنکھیں بہت یاد آتی ہیں۔ "کیا ناک کٹوائے گی؟ چرچر زبان چلاتی ہے۔"

ایک شام منصور لدے پھندے آتے ہیں۔

"کچھ خاص قسم کے مہمان آرہے ہیں۔ گھر ٹھیک ٹھاک کرلو۔" وہی بے زاری سی ہے ان کے لہجے میں۔

میں گھر کی صفائی کرکے جارجٹ کی سفید ساڑی، بلاؤز پہن کر، کانوں میں موتیوں کے ٹاپس ڈال کر، ڈھیلی ڈھالی سی چوٹی کے ساتھ کھڑی اپنے آپ کو نہار رہی ہوں کہ منصور چیخ پڑتے ہیں: "یہ کام وا

> گھر سے ہر پرانی شے نکالی جارہی ہے۔ اور آخر وہ دن بھی آجا تا ہے کہ انجانے میں ہی منصور میرے ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا تھما کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور وہ کاغذ مجھے ہوش و حواس کی دنیا میں لے آتا ہے۔

ساڑھیاں کیا وارڈروب کی زینت بننے کے لئے ہیں؟۔ ویسے ہی سانولی ہو، سفید کپڑوں میں اور بھی کالی نظر آتی ہو۔"

چُپ چاپ گلابی کام دار، ستاروں کی جھلمل ساڑی پیبیٹ، کانوں میں جھالے ڈال کر سجاتی ہوں۔ لمبے بالوں کا جوڑا بنا کر بندیا سجا لیتی ہوں۔

"کبھی ڈھنگ سے بھی رہا کرو اس طرح" بڑا پھیکا سا لہجہ ہے۔

"یہ شبانہ ہیں"۔ منصور کی آنکھوں کی چمک کہہ رہی ہے "پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ کوئی خاص بات ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ بچھ جائیں۔ میں بھی شبانہ کے آگے بچھی جارہی ہوں۔

میک اپ میں لت پت چہرہ، کٹے ہوئے بالوں کو جھلاتی وہ ہوا کے جھونکے کی طرح آکر چلی جاتی ہیں۔

"یہ میری محبت تھی" منصور کا لہجہ بڑا عجیب ہے۔

میں حیران سی دیکھتی رہ جاتی ہوں۔

"میں نے صرف ابو کی خدمت کے لئے تم سے شادی کی ہے"۔

"شبانہ کو نہ کھانا پکانا آتا ہے، نہ خانہ داری، بڑے رئیس کی بیٹی ہے"

میرے اندر جیسے کچھ ٹوٹ جاتا ہے۔

یا میں ہی بکھر جاتی ہوں۔ گلابی ساڑی جھلمل ستاروں سے تن من کو جلا دیتی ہے، سفید ساڑی پہن کر جیسے اپنے آپ کو اپنی حسرتوں کو کفن پہنا کر جاتے نماز پر کھڑی ہو جاتی ہوں۔ اماں تم نے تو سجدے میں گر کر رو لینے کا درس دیا تھا مجھے۔

چاند سا بیٹا گود میں آگیا ہے۔ منصور نہال ہیں۔ یار دوست کہتے ہیں "یار منصور بڑے خوش نصیب ہو۔ بھابی، آپ جیسی لڑکی سے ہی شادی کرنی ہے، ڈھونڈ دیں نا"

اور میں سوچتی ہوں، خود تو مصلوب ہوں اور کسی کو کیسے کھینچ لاؤں ایسی ہی صلیب پر

ماموں میاں کا انتقال کیا ہوا، منصور سعودی عرب کے لئے پر تول رہے ہیں۔

"کیا کریں گے اتنی دور جاکر؟"

فریج، رنگین ٹی۔ وی، کار، ایرکنڈیشنز کچھ بھی نہیں ہمارے ہاں۔ آج لوگ ذات سے نہیں، زر سے پہچانے جاتے ہیں ۔۔ تم ہندوستانی دیہاتی لڑکی تم کیا جانو"

ایرپورٹ پر ٹیک آف کرتے ہوئے طیارے کو دیکھتی رہ جاتی ہوں اور گڈو کو گود میں لئے تنہا تنہا سی کھڑی رہ جاتی ہوں محسن آگے بڑھ کر سنبھال لیتے ہیں تو خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہ جاتی ہوں، عامر گڈو کو لیتے ہیں اور قدم مڈوے کی جانب بڑھ جاتے ہیں۔

رات کے دو بجے اجنبی مردوں کے ساتھ مڈوے میں کافی پی رہی ہوں، تب بھی اماں ری تمہارا ہی خیال ہے۔ تم نے تو کبھی تنہا نہ چھوڑا تھا۔ اب کہاں جاؤں؟ دیکھو، تم نے بند کر رکھا تھا۔ اب کٹی پتنگ کی طرح ڈول رہی ہوں۔

ایک طویل سال گزر جاتا ہے، محسن پھیرے لگا رہے ہیں۔ میں سمٹی جارہی ہوں، عامر گڈو کو دیکھنے کے بہانے جانے میرے لئے کیا کیا تحائف لئے چلے آرہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کیا کروں۔

منصور ایک مہینے کے لئے آتے ہیں، فریج، رنگین ٹی۔ وی آگیا ہے، سارا خاندان جمع ہے۔ صبح کے پانچ بجے سے رات کے بارہ بجے تک باورچی خانہ ہے اور میں ہوں کہ رشتے داروں کی محبتیں اُمڈ آئی ہیں۔

جب منصور جانے لگتے ہیں تو گالوں کو تھپتھپا کر چل دیتے ہیں۔

بس پانچ سال۔ اس کے بعد ہم ہوں گے بڑا سا بنگلہ ہوگا۔ چمکتی ہوئی کار ہوگی۔

میں ٹھگی سی کھڑی رہ جاتی ہوں۔

پانچ سال نہیں، دس سال گزر جاتے ہیں۔ بنگلہ بھی بن گیا ہے، کار بھی آگئی ہے جاپان سے۔ ایرکنڈیشنز۔ فریج۔ قالین، کیا نہیں ہے گھر میں مہمانوں کی ریل پیل ہے، پھر بھی جیسے تنہا تنہا ہوں۔

ببلو اور گڈو میری آنکھوں کا نور ہیں میری زندگی کا محور ہیں۔ بس۔

گھر سے ہر پرانی شے نکالی جارہی ہے

سرحد کے اس پار اور اس پار میں بڑا فرق ہے، بڑا تضاد ہے، وہاں جو مشرقیت ہے، یہاں کی مغربیت نے اُسے قبول نہیں کیا۔ امّاں، کاش تم نے مجھے کترنیں جوڑنا نہ سکھایا ہوتا۔ بالوں کی تراش خراش سکھائی ہوتی، چُپ رہنے کی تلقین نہ کی ہوتی۔ چرپڑ چرپڑ باتیں کرنا اور بات بے بات ٹھٹھے لگانا سکھائے ہوتے۔

خر وہ دِن بھی آجاتا ہے کہ انجانے میں سور میرے ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا ر آگے بڑھ جاتے ہیں اور وہ کاغذ مجھے ں و حواس کی دنیا میں لے آتا ہے۔

دونوں بچّوں کے ساتھ اس بنگلے ، نکلنا پڑتا ہے جس کی آرزو میں منصور یری زندگی کے دس سال نذر کر دیئے۔ ۔ آپا رخسانہ اور برجیس کے خیال میں،) اس بنگلے میں سوٹ نہیں کرتی۔

نیلو کا شانہ منصور کی زینت بن جاتی ، اور میں ایک اسکول میں ٹیچر ہو کر چھوٹے سے فلیٹ میں اُٹھ آتی ہوں۔

ننھے ننھے بچّے جب ڈیڈی کے بارے ں پوچھتے ہیں تو سوچتی ہوں کیا کہوں، ایک ہی خاموشی ہے لبوں پر۔

خون آنسو بن کر شریانوں میں بہنے لگے ذ انسان ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

بچّوں کے لئے کبھی دودھ نہیں ہے، کبھی ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں۔ "ہاں بیٹا، اگلے ماہ تنخواہ ملے گی تو خرید دوں گی۔ پانچ سو روپے کی بساط ہی کیا ہے؟"

کبھی کبھی سوچتی ہوں، غلطی کس کی ہے؟ میری؟ منصور کی؟ کاتبِ تقدیر کی؟ یا میرے تربیت کرنے والوں کی؟ اللہ ہی جانے۔

جب جی بھر آتا ہے اور رو پڑتی ہوں تو گڈّو کہتا ہے۔ "امّی رونا نہیں۔ بڑا تو ہو لینے دو۔ ایسا مزہ چکھاؤں گا ڈیڈی کو یاد کریں گے۔

میں اس کے مونہہ پر تھپّڑ مار دیتی ہوں "خبردار جو ڈیڈی کے لئے ایک لفظ بھی مونہہ سے نکالا۔

وہ حیران سا مجھے دیکھتا رہ جاتا ہے،

"امّی بڑا ہو جاؤں گا تو سارے دُکھ دور کر دوں گا۔" ننگاہ نیچی کئے میرا بیٹا گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔

جس روز جہاز رضوان کو لے کر دوبئی کے لئے پرواز کر جاتا ہے تو میں پھر کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہوں۔

بہت روکا، مگر ایک ہی رٹ تھی "ممّی زر ہے تو عزّت ہے۔ ڈیڈی کو بتا دوں گا کہ وہی پیسے نہیں کما سکتے، میرے بازوؤں میں بھی دم ہے۔"

اتنی ہمت زندگی میں کبھی نہ پا سکی کہ کسی کو روک سکوں۔ میری جنّت کا دربان چلا جاتا ہے۔

کامران بھی بڑے بھائی کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ اسے کینیڈا جانے کی لگن ہے اور ایک دِن وہ بھی سِدھار جاتا ہے اور میں اپنے اندر آج بھی ہمت نہیں پاتی کہ اسے بڑھ کر روک سکوں۔

یہ اس ملک کا المیہ ہے۔ ہر گھر کا ایک نہ ایک مرد ملک سے باہر ہے۔ ڈھیروں روپیہ کما رہا ہے۔ مائیں بیٹوں کے سر کے پھول کھلانے کے لئے بیٹھی انتظار کر رہی ہیں۔ سہاگنیں پیا کے انتظار میں راتوں کی ویرانیوں کو تک رہی ہیں۔ بچّے باپ کے انتظار میں باپ کی شفقت کو ترس گئے ہیں۔ مائیں بیٹوں کا انتظار کر لیتی ہیں لیکن سہاگنیں کب تک پیا کا انتظار کریں چھپکے چھپکے اور بھی صنم تراش لیتی ہیں۔ بیٹے باپ کی شفقت سے محروم رہ کر خود سر اور خود مختار ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ میں ناسور ہی پھیلتے جا رہے۔ مگر ان کا علاج کون کرے۔ فریج، رنگین ٹی۔ وی۔ کار، بنگلہ ان زخموں کا مرہم بن رہا ہے لیکن سکون ہے کہ ناپید ہے۔

دونوں بیٹوں نے خوب پیسہ کمایا ہے یہ بنگلہ، یہ کار، یہ قیمتی ساز و سامان، لوگ کہتے ہیں۔ مسز منصور بڑی خوش نصیب ہیں اپنے نام کی طرح خوش بخت۔

امّاں، یہ خوش بختی ہے؟

سرحد کے اس پار اور اس پار میں بڑا فرق ہے، بڑا تضاد ہے۔ وہاں جو مشرقیت ہے، یہاں کی مغربیت نے اُسے قبول نہیں کیا

امّاں، کاش تم نے مجھے کترنیں جوڑنا نہ سکھایا ہوتا، بالوں کی تراش خراش سکھائی ہوتی چُپ رہنے کی تلقین نہ کی ہوتی، چرپڑ چرپڑ باتیں کرنا اور بات بے بات قہقہے لگانے سکھائے ہوتے۔ یہ خاموشی مجھے کھا گئی، امّاں کیا ہوگا! کیا چاہا اور کیا ملا! تم بھی سوچتی ہوگی کہ میری بیٹی پیسے میں کھیل رہی ہے۔ سونے چاندی کے ڈھیر میں بیٹھی ہے۔ امّاں، پھر یہ کیسی آگ ہے جو تن من کو جلائے جا رہی ہے، میرا دم کیوں گھٹ رہا ہے؟ کیوں امّاں کیوں؟ ■■

تبسم

ایک بچہ اپنی ماں سے ضد کرنے لگا
"امی، میں تو گدھے کی سواری کروں گا۔"
ماں بولی "نہیں بیٹا، تمہارے ابا ماریں گے"
بچے نے پوچھا مگر امی، ابا کیوں ماریں گے؟"
ماں نے سمجھایا "کیونکہ اچھے بچے گدھے پر نہیں چڑھا کرتے۔"
بچے نے پوچھا "مگر کیوں، امی؟"
ماں جھلا کر خاموش بیٹھے ہوئے شوہر سے بولی "خدا کے لئے ذرا اسے اپنے کندھے پر چڑھا لیجئے۔ خاموش ہو جائے گا۔"

●

بیوی: "تم ہر وقت ڈائجسٹوں کے مطالعہ میں ڈوبے رہتے ہو میری طرف ایک لمحے کے لئے بھی توجہ نہیں دیتے۔ کاش میں بھی ڈائجسٹ ہوتی تاکہ مجھے تمہاری کچھ محبت اور توجہ حاصل ہوتی۔"
شوہر "ایسی آرزو نہ کرو کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔ میں ہر مہینے نئے ڈائجسٹ لاتا ہوں اور پرانے ڈائجسٹوں کو اسٹور میں رکھ دیتا ہوں۔"

●

ایک عورت سے کتابوں کے سیلز مین نے کہا "آپ ہماری کتاب" شوہر کے لئے گھر دیے سے آنے کے ہزار کارگر بہانے" ضرور خرید لیں۔ یہ آپ کے بہت کام آئے گی۔"
عورت کچھ حیران ہو کر بولی "بھلا یہ کتاب میرے یعنی ایک بیوی کے کس طرح کام آسکتی ہے؟"
سیلز مین نے جواب دیا "اس طرح کہ ابھی ابھی اس کتاب کی ایک جلد آپ کے شوہر خرید چکے ہیں۔"

●

ایک بچہ اسکول سے گھر آیا تو اس کی ماں یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ بچے کا ہونٹ سوجا ہوا تھا اور گال پر نیل کے نشان تھے۔
اس نے بگڑ کر بچے سے کہا "تم اسکول میں پھر لڑ پڑے۔ تم نے میری نصیحت پر عمل کیوں نہیں کیا اور اپنے غصے پر قابو پانے کے لئے بیس تک گنتی کیوں نہیں گنی؟"
بچے نے جواب دیا "گنی تو تھی، لیکن دوسرے لڑکے کی ماں نے اسے صرف دس تک گننے کی نصیحت کی تھی۔"

●

ایک نوجوان ملازم نے اپنے مالک سے کہا "اگلے اتوار کو میری شادی ہونے والی ہے مجھے تین دن کی چھٹی چاہیے۔"
مالک بھڑک کر بولا "شادی! کون احمق لڑکی ہو گی جو تم جیسے صرف تین سو روپے ماہانہ کمانے والے کلرک سے شادی کرے گی؟"
ملازم نے جواب دیا "آپ کی بیٹی، جناب!"

●

دو دوست کافی عرصے بعد ملے۔ حال چال پوچھنے کے بعد پہلے نے سوال کیا "ارے، یار، تمہارے تینوں لڑکے آج کل کیا کر رہے ہیں؟"
دوسرے نے جواب دیا۔ "ایک ڈاکٹر ہے اور دوسرا انجینیر"
"تم نے اپنے تیسرے لڑکے کے بارے میں نہیں بتایا؟" پہلے نے پوچھا۔
"بھئی کیا بتاؤں، تیسرا لڑکا نو حجام بن گیا ہے۔"
"افسوس!" دوسرے دوست نے ہمدردی جتلاتے ہوئے کہا "اس تیسرے لڑکے کی وجہ سے تمہاری تو بہت بدنامی ہو رہی ہو گی۔ تم اسے گھر سے نکال کیوں نہیں دیتے؟"
"کیا بتاؤں یار، میں ایسا کر بھی نہیں سکتا کیوں کہ دوسرے دو لڑکوں کا سارا خرچ وہی تو اٹھا رہا ہے۔"

خود بھی ہنسیے، دوسروں کو بھی ہنسائیے۔ نئے نئے، مزے دار چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجیے۔ پرانے گھسے پٹے، بار بار سُنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجیے، کیوں کہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

شادی بیاہ کی عجیب و غریب رسمیں

پاکیزہ حبیب

شادی کے موقع پر دنیا کے مختلف
ں، قبیلوں، مذہبوں اور انسانی گروہوں
رح طرح کی رسموں کا چلن عام ہے۔
بیلوں میں شادی بیاہ کے موقع پر جو رسمیں
ں پڑھی اور سُنی جاتی ہیں وہ اپنے اندر دلچسپی
یرت کا وافر خزانہ رکھتی ہیں۔ اور یہ باور کرنا
شکل ہوتا ہے کہ انسان ایسے مبارک موقع پر
ں طرح کی حرکات بھی کر سکتا ہے۔

شادی دو اجنبی زندگیوں کا ملن ہے۔
و انجان راہی ایک دوسرے سے متعارف
وکر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ ظاہر ہے
عارف کے وقت دونوں فریق محتاط، محجوب
ور اپنے اندر سمٹے سمٹائے رہتے ہیں۔ اپنی
طرف سے کسی قسم کی کوئی معیوب بات وہ
پسند نہیں کرتے۔ لیکن غیر مہذب کہے جانے
والے لوگ اس کے برعکس کرتے ہیں، کیونکہ
تہذیب و تمدن سے وہ کوسوں دُور رہتے
ہیں اور اپنی دنیا میں مگن رہ کر وہی حرکات کرتے
ہیں جن کو وہ اپنے سامنے دیکھتے سُنتے ہیں۔

قدیم وسطی افریقہ میں حاکم وقت ہی شادی بیاہ کے معاملات طے کرتا تھا۔ وہاں لڑکی کی بولی لگائی جاتی ہے۔ جو لڑکی جتنی صحت مند ہوتی تھی، اتنی ہی زیادہ اس کی قیمت ہوتی تھی۔

چین میں بہو کو سُسرال میں یہ آزمائش دینا پڑتی تھی کہ وہ بھاگوان ہے یا منحوس۔ ایک ہفتے وہ وہاں قیام کرتی تھی۔ اسی دوران میں لڑکے والے یہ دیکھتے تھے کہ ان کے گھر کی کوئی چیز ٹوٹی پھوٹی تو نہیں ہے کسی کو کوئی مرض تو نہیں ہوا۔ اگر کچھ غلط بات ہوتی تو رشتہ توڑ دیا جاتا تھا۔

تبت کے پہاڑی علاقہ میں رواج تھا کہ دُولہا دُلہن کے گھر نہیں جاتا۔ دُلہن کو گھر کے کسی کونے میں چھپا دیا جاتا تھا۔ دُولہا جب گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو گھر کے مرد اس کو بُری طرح مارتے پیٹتے اور اسے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیتے۔ لیکن بہادر دُولہا ساری مار پیٹ کو برداشت کرتا ہوا جب اندر دندناتا ہوا چلا ہی جاتا تو اسے وہاں عورتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا، جو اس کی گھونسوں، تھپڑوں، لاتوں سے خوب تواضع کر کے اس کے داخلے کو روکتیں۔ بہادر دُولہا دوسرا معرکہ بھی سر کر کے جب گھر میں آگے بڑھتا تو جس جگہ دُلہن چھپی ہوئی ہوتی، ادھر بڑھتا تیسرے معرکہ میں اسے اس گھر کے بچّوں سے زور آزمائی کرنی ہوتی۔ بچّے اس دُولہا کو نیچے کھسیٹتے۔ دُولہا آخر کار ان بچّوں کی   کو پار کرتا ہوا دُلہن کے قریب پہنچ ہی جاتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آنگن میں لے آتا۔ پھر دونوں ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتے۔ اس کے بعد لڑکی سُسرال چلی جاتی۔

فلپائن جزائر کے نگریٹو مقام پر آدی باسی لڑکا اور لڑکی ایک مچان پر بیٹھ کر اپنے سر آپس میں ٹکراتے ہیں، یہاں تک کہ سر سے خون نکلنے لگتا ہے۔ اس کے بعد لڑکی سُسرال جاتی ہے اور وہاں اپنے استقبال میں سجے ہوئے تحائف کو دیکھتی پرکھتی ہے۔ اگر وہ وہاں رُکتی ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ شادی ہو گی، ورنہ لڑکی واپس ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی طرح کا کوئی مول بھاؤ نہیں ہوتا۔

سائبیریا میں سُسر اپنے داماد کو جہیز میں ایک چابک دیتا ہے تاکہ وہ اپنی بیوی کی غلط روی پر چابک سے کام لے۔

مشرقی نائیجیریا کے آدی باسیوں میں دُلہن کی سہیلیاں دُولہا کی قوتِ برداشت کا امتحان لیتی ہیں اور اسے کوڑوں سے پیٹتی ہیں۔ کتنی پٹائی کون کتنی دیر تک سہ سکا، اسی بات پر قوتِ برداشت کا انحصار رہتا ہے۔

تبسم

ایک بچہ اپنی ماں سے ضد کرنے لگا "امی، میں تو گدھے کی سواری کروں گا۔"

ماں بولی "نہیں بیٹا، تمہارے ابا ماریں گے"

بچے نے پوچھا مگر امی، ابا کیوں ماریں گے؟"

ماں نے سمجھایا "کیونکہ اچھے بچے گدھے پر نہیں چڑھا کرتے۔"

بچے نے پوچھا "مگر کیوں، امی؟"

ماں جھلا کر خاموش بیٹھے ہوئے شوہر سے بولی "خدا کے لئے ذرا اسے اپنے کندھے پر چڑھا لیجئے۔ خاموش ہو جائے گا۔"

●

بیوی: "تم ہر وقت ڈائجسٹوں کے مطالعہ میں ڈوبے رہتے ہو میری طرف ایک لمحے کے لئے بھی توجہ نہیں دیتے۔ کاش میں بھی ڈائجسٹ ہوتی تاکہ مجھے تمہاری کچھ محبت اور توجہ حاصل ہوتی۔"

شوہر "ایسی آرزو نہ کرو کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔ میں ہر مہینے نئے ڈائجسٹ لاتا ہوں اور پرانے ڈائجسٹوں کو اسٹور میں رکھ دیتا ہوں۔"

●

ایک عورت سے کتابوں کے سیلز مین نے کہا "آپ ہماری کتاب 'شوہر کے لئے گھر دیر سے آنے کے ہزار کارگر بہانے' ضرور خرید لیں۔ یہ آپ کے بہت کام آئے گی۔"

عورت کچھ حیران ہو کر بولی "بھلا یہ کتاب میرے یعنی ایک بیوی کے کس طرح کام آسکتی ہے؟"

سیلز مین نے جواب دیا "اس طرح کہ ابھی ابھی اس کتاب کی ایک جلد آپ کے شوہر خرید چکے ہیں۔"

●

ایک بچہ اسکول سے گھر آیا تو اس کی ماں یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ بچے کا ہونٹ سوجا ہوا تھا اور گال پر نیل کے نشان تھے۔

اس نے بگڑ کر بچے سے کہا "تم اسکول میں پھر لڑ پڑے۔ تم نے میری نصیحت پر عمل کیوں نہیں کیا اور اپنے غصے پر قابو پانے کے لئے بیس تک گنتی کیوں نہیں گنی؟"

بچے نے جواب دیا "گنی تو تھی، لیکن دوسرے لڑکے کی ماں نے اسے صرف دس تک گننے کی نصیحت کی تھی۔"

●

ایک نوجوان ملازم نے اپنے مالک سے کہا "اگلے اتوار کو میری شادی ہونے والی ہے۔ مجھے تین دن کی چھٹی چاہئے۔"

مالک بھڑک کر بولا "شادی؟ کون احمق لڑکی ہوگی جو تم جیسے صرف تین سو روپے ماہانہ کمانے والے کلرک سے شادی کرے گی؟"

ملازم نے جواب دیا "آپ کی بیٹی جناب۔"

●

دو دوست کافی عرصے بعد ملے۔ حال چال پوچھنے کے بعد پہلے نے سوال کیا "ارے یار، تمہارے تینوں لڑکے آج کل کیا کر رہے ہیں؟"

دوسرے نے جواب دیا۔ "ایک ڈاکٹر ہے اور دوسرا انجینیر۔"

"تم نے اپنے تیسرے لڑکے کے بارے میں نہیں بتایا؟" پہلے نے پوچھا۔

"وہ بھی کیا بتاؤں، تیسرا لڑکا تو حجام بن گیا ہے۔"

"افسوس!" دوسرے دوست نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا "اس تیسرے لڑکے کی وجہ سے تمہاری تو بہت بدنامی ہو رہی ہوگی۔ تم اسے گھر سے نکال کیوں نہیں دیتے؟"

"کیا بتاؤں یار میں ایسا کر بھی نہیں سکتا، کیوں کہ دوسرے دو لڑکوں کا سارا خرچ وہی تو اٹھا رہا ہے۔"

خود بھی ہنسئے، دوسروں کو بھی ہنسائیے۔ نئے نئے، مزے دار چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجئے۔ پرانے گھسے پٹے، بار بار سنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجئے، کیوں کہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

شادی بیاہ کی عجیب و غریب رسمیں

پاکیزہ حبیب

شادی کے موقع پر دنیا کے مختلف خطّوں، قبیلوں، مذہبوں اور انسانی گروہوں میں طرح طرح کی رسموں کا چلن عام ہے۔

کچھ قبیلوں میں شادی بیاہ کے موقع پر جو رسمیں دیکھی، پڑھی اور سُنی جاتی ہیں وہ اپنے اندر دل چسپی اور تحیّر کا وافر خزانہ رکھتی ہیں۔ اور یہ باور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ انسان ایسے مبارک موقع پر اس طرح کی حرکات بھی کرسکتا ہے۔

شادی دو اجنبی زندگیوں کا ملن ہے۔ دو انجان راہی ایک دوسرے سے متعارف ہوکر ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ ظاہر ہے تعارف کے وقت دونوں فریق محتاط، محجوب اور اپنے اندر سمٹے سمٹائے رہتے ہیں۔ اپنی طرف سے کسی قسم کی کوئی معیوب بات وہ پسند نہیں کرتے۔ لیکن غیر مہذب کہے جانے والے لوگ اس کے برعکس کرتے ہیں، کیوں کہ تہذیب و تمدّن سے وہ کوسوں دُور رہتے ہیں اور اپنی دنیا میں مگن رہ کر وہی حرکات کرتے ہیں جن کو وہ اپنے سامنے دیکھتے سُنتے ہیں۔

قدیم وسطی افریقہ میں حاکم وقت ہی شادی بیاہ کے معاملات طے کرتا تھا۔ وہاں لڑکی کی بولی لگائی جاتی ہے۔ جو لڑکی جتنی صحت مند ہوتی تھی، اتنی ہی زیادہ اس کی قیمت ہوتی تھی۔

چین میں بہو کو سُسرال میں یہ آزمائش دینا پڑتی تھی کہ وہ بھاگوان ہے یا منحوس۔ ایک ہفتے وہ وہاں قیام کرتی تھی۔ اسی دوران میں لڑکے والے یہ دیکھتے تھے کہ ان کے گھر کی کوئی چیز ٹوٹی پھوٹی تو نہیں ہے۔ کسی کو کوئی مرض تو نہیں ہوا۔ اگر کچھ غلط بات ہوتی تو رشتہ توڑ دیا جاتا تھا۔

تبّت کے پہاڑی علاقہ میں رواج تھا کہ دُولہا دُلہن کے گھر میں جاتا۔ دُلہن کو گھر کے کسی کونے میں چھپا دیا جاتا تھا۔ دُولہا جب گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو گھر کے مرد اس کو بُری طرح مارتے پیٹتے اور اسے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیتے۔ لیکن بہادر دُولہا ساری مارپیٹ کو برداشت کرتا ہوا جب اندر دندناتا ہوا چلا ہی جاتا تو اسے وہاں عورتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا، جو اس کی گھونسوں، تھپیڑوں، لاتوں سے خوب تواضع کرکے اس کے داخلے کو روکتیں۔ بہادر دُولہا دوسرا معرکہ بھی سر کرکے جب گھر میں آگے بڑھتا تو جس جگہ دُلہن چھپی ہوئی ہوتی، ادھر بڑھتا۔ تیسرے معرکہ میں اسے اس گھر کے بچّوں سے زور آزمائی کرنی ہوتی۔ بچّے اس دُولہا کو نوچتے کھسوٹتے۔ دُولہا آخر کار ان بچّوں کی   کو پار کرتا ہوا دُلہن کے قریب پہنچ ہی جاتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آنگن میں لے آتا۔ پھر دونوں ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتے۔ اس کے بعد لڑکی سُسرال چلی جاتی۔

فلپائن جزائر کے نگریٹو مقام پر آدی باسی لڑکا اور لڑکی ایک مچان پر بیٹھ کر اپنے سر آپس میں ٹکراتے ہیں، یہاں تک کہ سر سے خون نکلنے لگتا ہے۔ اس کے بعد لڑکی سُسرال جاتی ہے اور وہاں اپنے استقبال میں سجے ہوئے تحائف کو دیکھتی پرکھتی ہے۔ اگر وہ وہاں رُکتی ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ شادی ہو گئی، ورنہ لڑکی واپس ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی طرح کا کوئی مول بھاؤ نہیں ہوتا۔

سائبیریا میں سُسر اپنے داماد کو جہیز میں ایک چابک دیتا ہے تاکہ وہ اپنی بیوی کی غلط روی پر چابک سے کام لے۔

مشرقی نائیجیریا کے آدی باسیوں میں دلہن کی سہیلیاں دُولہا کی قوتِ برداشت کا امتحان لیتی ہیں اور اسے کوڑوں سے پیٹتی ہیں۔ کتنی پٹائی کون کتنی دیر تک سہہ سکا، اسی بات پر قوتِ برداشت کا انحصار رہتا ہے۔

اس کے بعد بیاہ پکا ہو جاتا ہے۔

برازیل کے قبائلیوں میں بیاہ کے بعد آدمی کو کان چھدوانے ہوتے ہیں اور ان میں لکڑی کے کنڈل لٹکانے ہوتے ہیں۔ ان سے سب کو اس کے شادی شدہ ہونے کا علم ہو جاتا ہے۔ کنوارے لڑکوں کے کان نہیں چھیدے جاتے۔

نیوگنی کے قبائلیوں میں بیاہ لڑکے، لڑکی کی مرضی سے ہوتا ہے۔ بیاہ کے موقع پر دونوں اپنے اپنے خاندان سے الگ ہو جاتے ہیں اور کہیں دور جنگل میں اپنا ڈیرا ڈالتے ہیں۔ وہ اپنے خاندانوں میں اسی وقت واپس ہوتے ہیں جب دلہن حاملہ ہو جاتی ہے۔

سوڈان کے خانہ بدوشوں میں اجتماعی رقص اور شراب و کباب کی محفل ہی شادی بیاہ کی علامت ہے۔ لڑکا اور لڑکی، دونوں کے رشتہ دار، عزیز مل جل کر ناچتے کودتے اور شراب وغیرہ پیتے ہیں۔ لڑکے لڑکی کو بھی ناچنا کودنا ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ملبوسات بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ وہ منظر کیسا عجیب ہوتا ہے جب مرد عورت کے کپڑے پہنتا ہے اور عورت مرد کے۔

نائجیریا کے میڈی قبیلے میں لڑکا اپنی منگیتر پسند کرتا ہے اور اس کی کلائی میں ہری گھاس کی رسی باندھ دیتا ہے۔ پھر لڑکی کے خاندان کے لوگ لڑکے والوں سے قیمت طے کرتے ہیں۔ قیمت کی وصولی میں ادھار قرض بھی چلتا ہے۔ اور جو ممکن موقع پر ادا نہ کیا جا سکے، اس کو قسط وار ادا کرنا ہوتا ہے جس کی ادائی ایک مخصوص تیوہار پر ضروری ہوتی ہے۔

ملایا کے قبائلیوں میں دوڑ کی بازی جیتنا بیاہ کے لئے ضروری ہے۔ لڑکی آگے دوڑتی ہے، لڑکا اس کے پیچھے۔ لڑکی کے گھر والے لڑکے کا راستہ روکتے ہیں۔ لڑکا ادھر ادھر بچتا بچاتا لڑکی سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بازی جیتنے پر بیاہ پکا ہو جاتا ہے اور رقص و سرور کی محفل گرم ہو جاتی ہے۔

اسکاٹ لینڈ میں لڑکی کی ماں نمک کی پلیٹ لڑکے کے سر پر پٹک کر توڑتی تھی جس سے یہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ لڑکے میں کتنی قوت برداشت ہے۔

سماترا میں ایک زمانے میں دلہن مول بھاؤ کر کے خریدی جاتی تھی۔ بعد میں اگر کوئی سوچتا کہ اسے گھاٹا ہوا ہے تو وہ اپنی عورت کو کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ کر اپنے لئے نئی بیوی خرید لیتا۔

فجی میں جنوب شمال میں پھیلے ہوئے ملینیشا جزیرے میں بیاہ سے پہلے لڑکیاں ایک پنجرے میں بند کر دی جاتی تھیں، تاکہ کوئی آدمی یا جن بھوت اس کی عصمت دری نہ کر سکے۔ ماں باپ اپنی پسند کے لڑکے کو لڑکی دیتے تھے۔ پھر لڑکی کی سسرال والے لڑکی کی پاک دامنی کی جانچ اس طرح کرتے کہ پنجرا کتنا پرانا ہے اور کہیں سے ٹوٹا پھوٹا تو نہیں ہے۔

مغربی تارجری میں بیوی گھوڑے پر بیٹھ کر دوڑ لگاتی ہے۔ دولہا کا گھوڑا اس کا پیچھا کرتا ہے۔ اگر لڑکے کا گھوڑا آگے نکل جائے تو دونوں کا بیاہ ہو جاتا ہے، ورنہ بیاہ نہیں ہو پاتا۔

امووا قبیلے میں لڑکے سے جتنی زیادہ عمر والی عورت ملے اتنا ہی وہ بیاہ مبارک سمجھا جاتا ہے۔ نئی عمر کے لڑکے بھی ادھیڑ عمر کی عورتوں، بیواؤں اور کئی کئی بچوں کی ماؤں ساتھ بیاہ کرتے دیکھے گئے۔

چھوٹا ناگ پور کے سنتال آ

باسیوں میں لڑکے اپنی منگیتر کو اغوا کر لیتے
لڑکی کے چلے جانے پر پنچایت بیٹھتی ہے جو
کے گھر والوں سے لڑکی کے خیر خواہوں کو
کی رقم دلاتی ہے۔

اڑیسہ کے ایک قبیلے میں شادی
قابل لڑکی کی زبردست حفاظت کی جا
اگر لڑکا لڑکی تک پہنچ جائے تو وہ لڑکی
بالوں میں گلال بھر دیتا ہے۔ یہی بیاہ کی رسم
جاتی ہے۔

سکم کی لیپچا برادری میں رواج
منگنی پکی ہونے پر لڑکے کو سسرال میں رہنا
ہے۔ کافی لمبے عرصے تک اسے ان لوگوں
مزدور کی طرح کڑی محنت میں مصروف رہ
پڑتا ہے۔ اس طرح اس کی عادتوں اور
سے سسرال والے مطمئن ہو جاتے ہیں،
کے بعد اس کے ساتھ لڑکی کو رخصت کر
جاتا ہے۔

مغربی ہندوستان کے ٹوڈو قبیلے
یہ رسم ہے کہ دولہا اپنے ہونے والے سسـ
گھر جا کر اس کے پیروں پر اپنا ماتھا ٹیکتا

ہمالیہ کے دامن میں بسے ہوئے آ
باسیوں میں اب تک کچھ علاقوں میں سارے
بھائیوں کے لئے ایک عورت سے تعلق
جائز سمجھا جاتا ہے۔ کچھ علاقوں میں سارے
کے لئے ایک شوہر کی روایت بھی موجو

تمنا

خلا ہے امن کی بستی
وہاں ...ے نہیں ہوتے
...ں چین و سکوں کی بادشاہت ہے
وہاں راہیں درخشاں ہیں تجسس کی
خلا میں کتنی وسعت ہے
خلا میں بس مسرت ہے"

خلا بازوں نے آکر ہم کو یہ سب کچھ بتایا ہے

یہ ہند اور روس کی پروازِ مشترکہ
مبارک ہو، مبارک ہو
زمیں کو راس آئے، اور
زمیں پر بھی خوشی کا اِک نیا ماحول بن جائے

تمنا ہے مری یہ
میں خلا میں گر پہنچ جاؤں
وہاں سے امن لے آؤں
اُسے دنیا کی ہر اِک سمت لے جاؤں
ہر اِک انساں کو دے دوں میں

زمیں پر اپنی پھیلا دوں
کہ جس کو پا کے اُس کا حُسن بڑھ جائے
زمیں سے ختم ہو جائے
فضا تخریب کاری کی
کہ آنے والی نسلیں
"جنگ" جیسے لفظ کا مفہوم نہ جانیں

...وہ "بم" کو بھی نہ پہچانیں
نیا ماحول ایسا ہو
کہ رنگ و نسل کے جھگڑے
یہ آپس کی عداوت ختم ہو جائیں
سب ہی فرقے، سب ہی طبقے
سب انساں ایک ہو جائیں!

تمنا ہے یہی
اے کاش!
یہ پیاری زمیں اپنی
...شہ لہلہائے اور
...سا گہوارہ بن جائے!!

... ندیم

اے خدایانِ دیں

قیامت نہیں تو کیا ہے
خرگوش کے چولوں میں
بھیڑیئے نظر آتے ہیں
یہ خونی درندے
یہ ناپاک چہرے
ان خوں ریز آنکھوں
سے ڈر نہیں لگتا
قوتِ گفتار محبوس ہو نہیں سکتی
مذہبی آڑ کا سہارا لے کر
تفاوت کے کارخانوں میں
تشدد کو گڑھ رہے ہیں

تاریخ کے بے غرض
صفحات اُلٹ کے دیکھو
ہم نے ہی نسل دی ہے
اپنی ہی نسل ہے یہ
غیروں کی شہ پہ ظالم
اپنے چمن کے غنچوں
اپنے چمن کی کلیوں
کے گالوں کو نوچتے ہو
یہ بد دماغ فطرت
خون میں نہا نہا کر
چنگیز بن رہے ہو
جبر و ستم کے چیتھڑوں
کو اوڑھ کر بدن پر
کیوں ننگ بن رہے ہو
اپنے ہی خود مذہب کو
بدنام کر رہے ہو

محبوب یہ وطن ہے
محبوب ہر مذہب ہے
ہر دل میں اِک خدا ہے
ہو ذکر
چاہے جدا جدا ہے

اے خدایانِ دیں
خدا کے نام پر
دھبّہ نہیں تو کیا ہو؟

رنجیت سنگھ آفتاب

کالج کے نوجوانوں سے خطاب

یہ عرض کرنا ہے کالج کے نوجوانوں سے
وطن کی شوکت و عظمت کے پاسبانوں سے

جہانِ علم و ادب کے اجارہ دار ہو تم
ہر ایک گلشنِ اُمید کی بہار ہو...

خدا کرے کسی عالم میں تم ملول نہ ہو
تمہارے پھول سے چہروں پہ غم کی دھول نہ...

دل و نگاہ میں ماں باپ کی گھر رہنا
اساتذہ کی بھی عظمت سے باخبر ر...

اگر دِلوں میں نئی روشنی کی چاہ کرو
تو اپنے قول و عمل پر بھی اک نگاہ ک...

ہر ایک راز سے محرم تمہاری ذات رہے
حصولِ علم مگر مقصدِ حیات ر...

خوشی کے رنگ بھرو درد کے فسانے میں
جلاؤ مشعلِ انسانیت زمانے میں

جدھر بھی دیکھو تباہی کا دَور دورا ہے
تمہیں سے رشتۂ اُمید سب نے جوڑا...

تم عہد کر لو تو نفرت کی آندھیاں نہ اُٹھیں
شریف بیٹیوں، بہنوں کی عصمتیں نہ...

وہ دیکھو دخترِ انسانیت سسکتی ہے
تمہاری سمت بڑی بے بسی سے تکتی...

جو تم بھی کھوئے رہے عیش میں تو کیا ہوگا
زمیں پہ کون غریبوں کا آس...

مزہ ہے بن کے اگر نخلِ سایہ دار رہے
وہ کیا کرے گا جو خود دوسروں پہ با...

جو تم میں کر کے دکھانے کا کچھ ارادہ ہے
تو پھر اُمید نہیں یہ اثرؔ کا دعویٰ ہے
کل اِس جہاں میں تمہارا مقام بھی ہوگا
تمہارے نام سے کالج کا نام بھی ہوگا

ایوب اثرؔ شاہجہانپوری

ان سے ملئے

یاسمین سعید

آج کل ہندوستانی اور پاکستانی تارکینِ وطن کی کثیر تعداد انگلستان میں آباد ہے ۱۹۵۵ء میں ان لوگوں کی انگلستان پر چڑھائی زوروں پر تھی۔ آج کل وہاں بسنا مشکل ہے لیکن جو لوگ وہاں اب تک بس چکے ہیں ان کی تعداد ۱۵ لاکھ ہے۔ ان میں ۱۲ لاکھ ہندوستانی ہیں اور تین لاکھ پاکستانی۔ ۱۲ لاکھ ہندوستانیوں میں ۶۰ ہزار مسلمان ہیں بنگلہ دیش کے لوگ بھی کافی تعداد میں ہیں۔ آج کل وہاں ہندوستانی اور پاکستانی کو ایشیائی کہا جاتا ہے۔ یہ ایشیائی لوگ اپنے خاندان کے ساتھ آباد ہیں۔ کچھ مہم جو لوگ اکیلے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے۔ وہیں کسی انگریز لڑکی سے شادی کر لیتے اور لشتم پشتم زندگی گزار لیتے۔ ڈاکٹر سعید اور ان کی بیگم یاسمین (سابق نام جوائس) اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

ڈاکٹر سعید جب انگلستان ڈاکٹری پڑھنے آئے تو ان کی ملاقات جوائس سے ہوئی۔ جوائس نے ان کو بتایا کہ وہ مسلمان ہو چکی ہے۔ اس کا نام یاسمین ہے وہ شراب اور سگریٹ کو نہیں لگاتی۔ لمبا کوٹ اور پوری آستین کا بلاؤز پہنتی ہے، سمندر پر نہانے نہیں جاتی۔ حلال گوشت کھاتی ہے۔ نماز اور روزے کی پابند ہے۔

ڈاکٹر سعید خود اتنے پابندِ مذہب مسلمان نہیں تھے وہ جوائس کی باتیں سُن کر حیران رہ گئے۔ جوائس نے انہیں بتایا کہ وہ لاہور کے احمدی مبلغوں سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئی ہے۔ اس نے سعید کو اپنا سرٹیفیکیٹ دکھایا جو لاہور سے بھیجا گیا تھا اس میں اس کا شمارہ نمبر اور نیا اسلامی نام یاسمین لکھا تھا۔

جوائس جب مسلمان ہو گئی تو اس نے عیسائیوں سے اپنا ناتا توڑ لیا۔ وہ ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں میں گھُل مِل گئی۔ اس میل جول کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے ایک مسلمان وکیل سے محبت ہو گئی۔ یہ وکیل پاکستانی تھا۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی منگنی ہو گئی۔ یاسمین اس منگنی سے بہت خوش تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کو فخر سے منگنی کی انگوٹھی دکھاتی پھرتی تھی۔ مگر اچانک اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اس کا منگیتر موٹر سائیکل کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔

یاسمین اپنے منگیتر کی موت سے بہت رنجیدہ تھی۔ اس نے ماتمی سیاہ لباس پہننا شروع کر دیا۔ وہ نماز پڑھ کر اپنے خاوند کی مغفرت کے لئے دعا مانگتی۔ جمعرات کو روزہ رکھتی۔ اس نے شادی کا خیال ترک کر دیا تھا۔ ایک دن اس کی ملاقات ڈاکٹر سعید سے ہو گئی۔ سعید نے یاسمین کے دل کو ڈھارس دی۔ یاسمین کو روحوں سے ملنے اور ان سے بات کرنے کا بہت

سب سے بڑا سکھ

شمیم عالم مصحفی

ندیم اور نزہت کے درمیان تین دن سے سرد جنگ جاری تھی۔ صلح کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ ندیم نزہت کی اس بے رُخی سے بے حد پریشان تھا کئی مرتبہ اس نے بات کرنے کی کوشش بھی کی تھی، مگر نزہت نے شاید اپنی ضد منوائے بغیر صلح نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

ندیم اور نزہت کی شادی کو ابھی چھ مہینے ہی گزرے تھے۔ مگر دونوں کے مزاج میں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے آپس میں وہ ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہتے تھے۔ نزہت امیر باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ زندگی کی ہر آسائش اسے حاصل تھی۔ لاڈ پیار میں پلی نزہت بے پناہ ضدی، فیشن پرست اور روشن خیال تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے اپنے ابّو کے گلے میں پیار سے اپنی بانہیں ڈال کر ان کو بتایا کہ وہ اپنے کالج کے اُردو لیکچرر ندیم سے شادی کرنا چاہتی ہے تو انہیں اس کی اس جرأت پر حیرت ضرور ہوئی مگر وہ اپنی بیٹی سے اس شادی کے لئے انکار نہ کرسکے۔

نزہت اپنے کالج میں 'ساحرہ' کے نام سے مشہور تھی۔ وہ تھی بھی بے حد حسین اور اس کا احساس خود نزہت کو بھی تھا۔ وہ نوجوان دلوں پر بجلیاں گرانا خوب جانتی تھی۔ اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ کالج کے اکثر لڑکے اس کی نظرِ عنایت کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر اس کے تیور پر پڑے بَل کو دیکھ کر کسی میں اتنی جرأت نہ ہوتی کہ وہ اپنی اس بے خودی کا اظہار اس کے سامنے کرسکے۔ ہاں پچھلے چار مہینے سے نزہت میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی جارہی تھی جس نے کالج کے نوجوانوں کو بے چین کر رکھا تھا۔ جب سے لیکچرر ندیم نے کالج جوائن کیا تھا، نزہت اکثر اس کے قریب دیکھی گئی تھی۔ ندیم کی مردانہ وجاہت اور متانت نے نزہت کو بے اختیار کھینچ لیا تھا۔ ندیم بھی اس کے ساحرانہ حُسن سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ دونوں ایک دوسرے کی جانب کھنچے چلے گئے اور جلد ہی ازدواجی زندگی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ندیم نے جہیز کے نام پر کچھ بھی لینے سے قطعی انکار کردیا۔ وہ سماج سے جہیز جیسی لعنت کو ختم کرنے کا دل سے حامی تھا۔

نزہت سسرال آئی تو درمیانی طبقے کے رہن سہن اور وضع زندگی میں ہفتہ عشرہ میں ہی اپنے آپ میں گھٹن محسوس کرنے لگی۔ جہیز میں ملے ہوئے قیمتی سامان کو نہ لینے کی بات پر اکثر وہ ندیم پر دبے لفظوں میں اعتراض کرتی۔ وہ اس بات پر ندیم کو آمادہ کرنے کی کوشش بھی کرتی کہ وہ یہ سامان لے آئے۔ آپس میں ایک دوسرے سے اس موضوع پر بحثیں بھی ہوتیں۔ نزہت کا موڈ بگڑ جاتا اور وہ گھنٹوں ندیم سے روٹھی رہتی۔

صُبا کی چمچماتی ہوئی سُرخ رنگ کی کار نزہت کے چھوٹے سے بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئی تو مہینوں بعد دونوں سہیلیاں باتوں کا پٹارا کھول بیٹھیں۔ صُبا نے کمرہ کے در و دیوار پر ایک سرسری نگاہ ڈالی تو نزہت احساسِ کمتری کے مارے اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔ اسے ایسا لگا جیسے صُبا اس کمرے کے در و دیوار کو تضحیک بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے حالاں کہ کمرہ سادگی کا بہترین نمونہ تھا۔ بید کے بنے ہوئے صوفے پر صاف کپڑے کے خوب صورت غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے قریب تپائی پر تازہ پھولوں کا گلدستہ سجا ہوا تھا۔ سامنے دیوار پر چند جدید قسم کی تصویریں آویزاں تھیں۔ دروازے اور کھڑکیوں پر زعفرانی رنگ کے ریشمی پردے چھت سے لٹکے ہوئے پنکھے کی ہوا سے لہرا رہے تھے۔

صُبا ایک گھنٹے تک نزہت کے ہمراہ رہی اس درمیان وہ اپنے میاں سے زیادہ اپنے کمرے کی سجاوٹ اور قیمتی سامانوں کے متعلق ہی باتیں کرتی رہی۔ فریج اور رنگین ٹی وی کے خریدے جانے کی اطلاع دیتے ہوئے وہ نزہت سے اپنے گھر جلد آنے کا وعدہ لے کر واپس چلی گئی۔ اور نزہت بڑی حسرت سے صُبا کی جاتی ہوئی سُرخ کار کو دیکھتی رہی۔

شام کے وقت ندیم جب کالج سے واپس گھر آیا تو نزہت نے ایک بار پھر جہیز میں ملے ہوئے سامان کو اپنے گھر میں لانے کی بات چھیڑ دی۔ ندیم نے بے حد پیار سے اس کی کمر کے گرد اپنا ہاتھ حمائل کرتے ہوئے اسے سمجھانے

کی کوشش کی: "نازو، جہیز میں ملے ہوئے اس
قیمتی سامان کو میں اپنے گھر لا نہیں سکتا اور نہ میری
اتنی حیثیت ہے کہ تمہارے لئے اس قدر قیمتی صوفے
الماری، قالین، فریج اور ٹی۔ وی وغیرہ خرید سکوں۔
ایک لکچرر کی کیا تنخواہ ہوتی ہے، تم سے پوشیدہ
نہیں۔ اس کے باوجود بھی تمہیں مجھ سے شکایت
ہے؟ تم ان ظاہری نمائشی چیزوں کی چاہ میں
میرے اٹوٹ پیار کو نظر انداز کر بیٹھی ہو۔ کبھی
تم نے میرے دل میں بھی جھانکنے کی کوشش
کی، جہاں تمہارے لئے بے پناہ پیار ٹھاٹھیں
مار رہا ہے۔"

نزہت ندیم کا ہاتھ اپنی کمر کے گرد سے
ہٹاتی ہوئی خفگی سے بولی "زندگی کے شب و روز
صرف پیار محبت کے سہارے نہیں گزرتے۔
مہذب طرز زندگی کے بغیر زندگی کی کوئی حقیقت
نہیں ہے۔ آپ اپنی تنخواہ سے ان چیزوں کو
نہیں خرید سکتے نہ سہی، جہیز میں ملے ہوئے سامان
کو لینے میں کون سا عذر مانع ہے؟ آخر اس پر
میرا بھی تو حق ہے۔ میں تو اسے منگوا ہی سکتی ہوں۔"

"ایسی غلطی بھی نہ کرنا نازو۔ یہ میری
مرضی کے خلاف ہوگا۔ میں جہیز جیسی لعنت کو
اپنے گھر میں جگہ نہیں دے سکتا۔ تم اپنے خیالات
میں تبدیلی لانے کی کوشش کرو۔ مہذب طرز
زندگی قیمتی اشیاء کی بھیڑ کا نام نہیں، ہماری
محبت اور سادہ طرز زندگی کا نام ہے۔"

"میں اس قدر سادہ زندگی کی عادی نہیں
ہوں۔ آپ کی یہ سادگی میرے لئے گھٹن کا موجب
ہے۔ میری سہیلیاں آتی ہیں تو ان کے سامنے مجھے
شرمسار ہونا پڑتا ہے۔ میرے دن رات پشیمانی
اور احساس کمتری میں گزرتے ہیں۔ مگر اس کا
احساس آپ کو کیوں کر ہونے لگا؟ آپ تو اس
زندگی کے عادی ہیں۔"

نزہت غصے سے اپنے پاؤں فرش پر
پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوگئی اور بستر
پر اوندھے منہ گر کر سسک پڑی۔ ندیم کمرے
سے باہر نکل گیا۔

تین دن سے جو سرد جنگ چل رہی تھی
ابھی تک جاری تھی۔ صلح کی کوئی صورت نظر نہیں
آرہی تھی۔

شام کے وقت نزہت، ہما کے یہاں
وعدے کے مطابق پہنچی تو ہما میک اپ سے
بے نیاز، سادگی کی تصویر بنی اپنے کمرے میں
پلنگ پر لیٹی ایک خط پڑھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں
سے آنسو چھلک پڑنے کے لئے بے تاب تھے۔
نزہت کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ اس کے گلے سے
لگ کر بلک پڑی۔ آنسو آنکھوں سے نکل کر اس
کے رخسار کو بھگونے لگے۔ نزہت حیرت میں
ڈوبی ہما کو ڈھارس بندھائے جا رہی تھی۔ اس
کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک اسے ہو کیا
گیا ہے۔ ہر وقت قہقہے لگانے اور اپنے آپ میں
مگن رہنے والی ہما کی آنکھوں میں آنسو؟ یہ تو
اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ دل کے زخم
پر آنسوؤں کا مرہم لگ جانے کے بعد ہما نے
نزہت کے روبرو اپنے دل کی کتاب کا ایک
ایک ورق کھول کر رکھ دیا۔ وہ احساس شرمندگی
سے اپنے سر کو خم کئے ہوئے بولی "نازو! میں بہت
بدنصیب عورت ہوں۔ زندگی کا تمام عیش و عشرت
مجھے حاصل ہے۔ ہر وہ مادی سکھ مجھے شاہد نے
دیا جس کی تمنا عورت کو ہوتی ہے۔ مگر میں آج
تک جس عیش و عشرت کو زندگی کا سب سے بڑا
سکھ سمجھتی رہی تھی، میرے لئے وہی سب سے
بڑا دکھ ثابت ہوئی۔ حقیقی اور دائمی خوشی تو شوہر
کی رفاقت اور قربت میں ہے اور وہ مجھے کبھی نہیں
ملا۔ شاہد جرمنی میں ڈاکٹر ہیں۔ سال بیت چلا ہے۔
ہر ماہ ایک موٹی رقم پابندی سے بھیج دیتے ہیں۔
یہ دیکھو، ان کا خط آیا ہے۔ انہوں نے اپنی بے پناہ
مصروفیت کا رونا رویا ہے۔ پچھلے خطوں کی طرح
اس خط میں بھی وعدہ کیا ہے کہ پہلی فرصت میں وہ
ہندوستان آنے کی کوشش کریں گے۔ کاش انہیں
اس بات کا احساس ہوتا کہ میں ان کی بے پناہ دولت
اور شہرت کی نہیں ان کی رفاقت اور قربت کی بھوکی
ہوں، نازو تو بڑی قسمت والی ہے کہ تجھے ندیم جیسا
ٹوٹ کر چاہنے والے شوہر کا اٹوٹ پیار ملا۔"

ہما کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں
نے نزہت کو جھنجھوڑ ڈالا۔ ندیم کے ساتھ خود
اس کی اپنی بے نیازی کیا کم تھی؟ اپنی اس بے پروائی
کو محسوس کر کے اس کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔
ظاہری عیش و عشرت کی چاہ میں وہ ندیم کے اٹوٹ
پیار اور والہانہ رفاقت کو واقعی نظر انداز کر بیٹھی
تھی جن چیزوں کو وہ اپنے لئے سب سے بڑا سکھ
کا ذریعہ سمجھتی رہی تھی کسی کے لئے سب سے
بڑا دکھ کا سبب بن جائیں گی، اسے اس بات کا
گمان بھی نہیں تھا اس کے دل سے ساری کدورتیں
نکل چکی تھیں۔ وہ اپنے پیار، عیش و عشرت کی
زندگی کو تیاگ کر سادگی کا دامن تھام چکی تھی۔

نزہت واپس گھر پہنچی تو رات کے نو
بج چکے تھے۔ ندیم اپنی آنکھیں بند کئے بستر پر
لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے تھکن اور ذہنی
کرب جھلک رہا تھا۔ نزہت دبے پاؤں کمرے
میں داخل ہوئی۔ اسے ندیم پر بے حد پیار آرہا تھا
اس نے چپکے سے ندیم کے بالکل قریب جا کر اس کی
کشادہ پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دئے۔ ●

انور حسین

گنگا کی کہانی

گنگا دنیا کے چند بڑے دریاؤں میں سے ایک ہے۔ جنوبی امریکہ کا ایمیزن، شمالی امریکہ کا مسی سی پی، مصر کا نیل اور یورپ کا ڈینوب اس کے ہم پلہ ہیں۔ دریائے گنگا تقریباً تمام شمالی ہندوستان سے گزرتا ہے۔ یہ ہندوستان کے سب سے پوتر دریاؤں میں سے ایک ہے یہ ہر دوار سے ۲۰۰ میل دور گنگوتری سے نکلتا ہے۔ اس کا منبع گؤ مکھ کہلاتا ہے، یعنی یہ گائے کے مونہہ سے مشابہ ہے۔ گنگوتری برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ اس کی اونچائی سطح سمندر سے تین ہزار میٹر ہے۔ ابتدا میں یہ ایک نالے سے زیادہ نہیں دکھائی دیتا، لیکن دیو پریاگ پر اس میں دو اور چھوٹے دریا آملتے ہیں۔ یہ دریا الکھ نندا اور منداکنی ہیں۔ اس جگہ گنگا کو بھاگیرتی بھی کہتے ہیں۔ رشی کیش اور ہر دوار پہنچ کر یہ خاصا چوڑا ہو جاتا ہے۔ گنگوتری اور ہر دوار کے درمیان گنگا کے کنارے سیکڑوں مندر اور آشرم واقع ہیں۔

یہاں جٹا دھاری فقیر، ننگ دھڑنگ سادھو اور جوگی ریاضت میں مشغول رہتے ہیں۔ کوئی گنگا کے ٹھنڈے پانی میں ایک ٹانگ پر کھڑا رہتا ہے۔ کوئی ایک بازو اونچا کیے کھڑا نظر آتا ہے۔ کوئی گنگا کے کنارے دھیان لگائے بیٹھا ہے۔ ہر دوار میں ہر چھٹے سال کمبھ میلہ ہوتا ہے۔ یہ اردھ کمبھ کہلاتا ہے، یعنی آدھا کمبھ۔ اس میلے میں دور دور سے ہزاروں بلکہ لاکھوں زائرین گنگا میں ڈبکی لگانے پہنچ جاتے ہیں۔ سیکڑوں، ہزاروں سادھوؤں کا جمگھٹ لگ جاتا ہے۔

گنگا کے کنارے بیسیوں بڑے شہر آباد ہیں۔ کان پور میں گنگا کا کنارہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی یاد دلاتا ہے۔ یہاں ۱۸۵۷ میں نانا کی فوج نے انگریزوں کو شکست دی تھی۔ اس جنگ میں صرف ایک انگریز زندہ بچا تھا، جو کسی نہ کسی طرح الہ آباد پہنچ گیا تھا۔ الہ آباد میں گنگا کا پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا ہے۔ اس میں دریائے جمنا مل جاتا ہے۔ الہ آباد کا پرانا نام پریاگ ہے۔ گنگا اور جمنا کے سنگم کو تری وینی بھی کہتے ہیں، یعنی تین دریا۔ ایک روایت کے مطابق یہاں ایک تیسرا دریا سرسوتی بھی آملتا ہے۔ لیکن یہ دریا دکھائی نہیں دیتا۔ الہ آباد میں ہر ۱۲ سال کے بعد کمبھ میلہ ہوتا ہے۔ اس میلے میں زائرین کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ گنگا کا کنارہ خیموں کا شہر بن جاتا ہے۔ یہاں ہندوستان کے مشہور جوگی اپنا عارضی آشرم کھول لیتے ہیں۔ یہ اکھاڑے کہلاتے ہیں۔ دور دراز سے ہزاروں سادھو اس میلے میں شرکت کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ چند سال پہلے گنگا کے کمبھ میلے میں ایک بھیانک حادثہ پیش آیا تھا۔ ننگے سادھوؤں کا ایک جلوس ہاتھوں میں ترشول

طاہر ادیب - سہسرام

اقوالِ زرّیں

دنیا ایک عظیم کتاب ہے جو لوگ گھر چھوڑ کر باہر نہیں نکلتے وہ اِس کتاب کا ایک ہی صفحہ پڑھ کر رہ جاتے ہیں۔ (سوکتی)

کسی بات کا فیصلہ کرنے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں ـــ احساس، علم، اور عمل کرنے کی استعداد۔ (سقراط)

خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیار کا کام دیتی ہیں۔ (جارج برنارڈ شاہ)

کوئلہ اگر جلتا ہوا ہے تو چھونے پر جلا دیتا ہے۔ اگر ٹھنڈا ہے تو ہاتھ کالا کر دیتا ہے۔ (چانکیہ)

کم زور جسم دماغ کو بھی کم زور کر دیتا ہے۔ (روسو)

غریبی شرم نہیں ہے۔ لیکن غریبی کی وجہ سے شرم محسوس کرنا، شرم کی بات ہے۔ (سوکتی)

زندگی طوفانی تھپیڑوں کے بیچ ایک ٹمٹماتی لَو کی طرح ہے۔ جب تک یہ لَو ٹمٹماتی رہے گی تب تک اِن تھپیڑوں کی بھی ہستی رہے گی۔ (ہملٹن)

امن انسان کی آرام دہ اور فطری حالت ہے۔ جنگ اُس کا زوال ہے۔ کلنک ہے۔ (ٹائمس)

جب علم اتنا مغرور بن جائے کہ رو نہ سکے، اتنا سنجیدہ ہو جائے کہ ہنس نہ پائے اور اتنا خود غرض بن جائے کہ اپنے سوا کسی اور کی فکر نہ کرے تو وہ جہل سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ (خلیل جبران)

دفن کر دیتے۔ ٹھگی کا سلسلہ زمین سے دریا میں پہنچا تو ٹھگوں نے بھی گنگا کا انتخاب کیا۔ وہ بھولے بھالے مسافروں کے گلے میں پھندا ڈال کر مار ڈالتے اور انہیں گنگا میں پھینک دیتے۔ اس طرح لاش کا نشان بھی نہ ملتا۔ مونگیر اور پٹنہ سے کلکتہ کا سفر ان ٹھگوں کی وجہ سے خطرناک بن گیا تھا۔ ٹھگوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ یہ لوگ بھوانی کی پوجا کرتے تھے اور اپنے شکار کو بوہنی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ انگریزوں نے ٹھگی کے فتنے کو سختی سے کچل ڈالا اور گنگا کا سفر ایک بار پھر مسافروں کے لئے محفوظ ہو گیا۔

جہاں آج کل فراکا کا پل بنایا گیا ہے، وہاں سے گنگا دو ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک ٹکڑا کلکتہ چلا جاتا ہے، جہاں اسے ہگلی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور دوسرا ٹکڑا بنگلہ دیش پہنچ جاتا ہے، جہاں اسے پدما کے نام سے پکارتے ہیں۔

لیے میلے کے درمیان سے گزرا تو ہزاروں عورتیں بھی اشنان کرنے جمع ہو گئیں۔ ناگا سادھو عورت کی قربت گوارا نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے ترشول سے انہیں ہانکنا شروع کر دیا۔ عورتیں ڈر کر بھاگیں تو ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اس بھگدڑ میں تقریباً ۵۰۰ آدمی مارے گئے۔ عورتیں اور بچے بھاگتے ہوئے انسانوں کے پیروں تلے کچلے گئے۔

الہ آباد کے بعد بنارس گنگا کے کنارے آباد کرتا ہے۔ بنارس ہندوستان کا ایک قدیم شہر ہے۔ اس کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا ذکر ویدوں میں ملتا ہے۔ بنارس کا نام اب وارانسی ہے۔ اسے کاشی بھی کہتے ہیں۔ کاشی ایک متبرک مقام ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بنارس کے ٹھگ بھی مشہور ہیں۔ بنارس کے گنگا کا پانی گدلا ہو جاتا ہے لیکن بنارس میں مرنا اور اس کے گھاٹ پر چتا میں جلنا بہت مبارک سمجھا جاتا ہے۔ اس کے گھاٹ پر کوئی نہ کوئی چتا ہر وقت جلتی رہتی ہے۔ ایک زمانے میں بال ودھوا عورتوں کو سر منڈوا کر بنارس بھیج دیا جاتا تھا۔ وہ بدقسمت عورتیں جنہوں نے خاوند کا مونہہ بھی نہیں دیکھا، اپنی تمام عمر اسی شہر میں کاٹ دیتی تھیں۔ اسی شہر میں بنارس ہندو یونیورسٹی قائم ہے۔

بنارس سے آگے چلیں تو پٹنہ اور مونگیر اس دریا کے کنارے ملتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت کے ابتدائی دور میں دریا کا یہ حصہ ٹھگوں کے لیے مشہور تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ٹھگ ہندوستان کے لیے ایک مصیبت بن گئے تھے۔ وہ مسافروں کا روپ دھار لیتے اور اپنے ہم سفر کے گلے میں پھندا ڈال کر اسے مار ڈالتے، اس کا مال لوٹ لیتے اور اسے کسی کنوئیں میں پھینک دیتے یا زمین میں

جہاں بنارس گنگا کے کنارے قدیم ترین شہر ہے، وہاں کلکتہ ایک جدید ترین شہر ہے۔

اسے ۱۶۹۰ میں چارناک نامی ایک انگریز نے آباد کیا تھا۔ انیسویں صدی میں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ ۱۷۵۶ میں سراج الدولہ نے کلکتہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن اگلے سال اسے پھر گنگا کے کنارے پلاسی کے مقام پر شکست ہوئی۔ کلکتہ جو سترہویں صدی میں چند جھونپڑوں پر مشتمل تھا، اب ہندوستان کا سب سے بڑا شہر [illegible] کلکتہ سے گنگا سمندر میں گرنے کے لئے [illegible] ہو جاتی ہے۔ اس کا ڈیلٹا سندربن کہلاتا ہے۔ یہا[ں] شیر، چیتے، مگرمچھ کثرت سے ملتے ہیں۔ سندربن [میں] گنگا کے بیسیوں ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ا[س] طرح یہ دریا ڈھائی ہزار کیلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے خلیج بنگال میں مل جاتا ہے۔ ○

دمہ عموماً موروثی ہوتا ہے

ہیلتھ کلب

دمہ سانس کی بیماری ہے۔ دمہ کے مریض کو سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ لیکن یہ دشواری دمہ کے حملہ کے دوران میں ہی محسوس ہوتی ہے۔ عام حالات میں دمہ کا مریض نارمل نظر آتا ہے۔ دمہ کا مرض عمر کے کسی بھی حصے میں لاحق ہوسکتا ہے۔ دمہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو پھیپھڑوں سے سانس کی ٹیوب میں ہوا کے داخلے کو روکتا ہے دوسرا وہ جس کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ دوسری قسم میں سانس کی تکلیف دل کی بیماری سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر دمہ بچپن میں لاحق ہو جائے تو یہ عموماً موروثی ہوتا ہے۔ بچپن میں ایگزیما، تپ کاہی یا دوسری بیماریوں سے الرجی پیدا ہوسکتی ہے۔ بچوں کا دمہ اکثر جوانی کی سرحد میں پہنچنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات دمہ جوانی میں شروع ہوتا ہے اور بڑھاپے تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ دمہ کے ۳۰ فی صد کیس موروثی ہوتے ہیں۔

دمہ کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔ بہت زیادہ حساس مزاج والا انسان بھی اس کا شکار ہوجاتا ہے۔ انفکشن سے بھی یہ مرض لاحق ہوسکتا ہے اس کے علاوہ نفسیاتی عوامل بھی اس کے محرک بن سکتے ہیں۔ الرجی اور انفکشن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نمونیہ، کالی کھانسی، انفلوئنزا اور خسرہ اس بیماری کی ابتدا بن سکتے ہیں۔ بوڑھے لوگ انفکشن سے دمہ کے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔

نفسیاتی عوامل میں پریشانی، اندیشے، فکر اور خدشات دمہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ والدین سے جدائی، خصوصاً ماں سے جدائی بھی اس کی وجہ ہوسکتی ہے ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جائے تو انسان عدم تحفظ کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس کے دل میں اداسی اور مایوسی گھر کر لیتی ہے۔ کوئی ایسا کام سامنے آجائے جس کو انجام دینے کی قوت نہ ہو تو ذہنی تناؤ بھی اس کا سبب بن سکتا ہے۔

دمہ کے اسباب میں الرجی سرفہرست ہے۔ گھر میں گرد و غبار ہو، کتے، بلیاں پلے ہوں، پھولوں کے گملے یا پتوں کی بیل ہو مرغیاں یا کبوتر دوڑتے پھرتے ہوں تو یہ سب چیزیں یا ان میں سے کوئی ایک چیز دمہ کا سبب بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ خوشبو، مثلاً سینٹ یا عطر، کریم، لپ اسٹک اور شیمپو بھی الرجی کا باعث بن سکتے ہیں۔ پرندوں کے پر اور جھڑتے بال دوا بھی الرجی کی وجہ ہوسکتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی غذا میں سبزی ترکاری، لہسن پیاز غرض کھانے کی کوئی چیز بھی الرجی کا باعث بن سکتی ہے۔ درجنوں سبزیوں، ترکاریوں اور پھلوں میں الرجی ڈھونڈنا ایسا ہے جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا۔ لیکن یہ تلاش ضروری ہے۔ الرجی دریافت کئے بغیر اس کا علاج دشوار ہے۔

جب گھر میں جھاڑو دی جاتی ہے تو خاک دھول سے جراثیم سانس کی نالی کے ذریعے سے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ ہمارا جسم ایک قلعہ کی طرح ہے۔ اس میں صرف وہی لوگ داخل ہوسکتے ہیں جو قلعہ کے چوکیدار سے آشنا ہیں۔ اجنبی آدمی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر کتا بھی زور زور سے بھونکتا ہے۔ اسی طرح جب خاک دھول کے جراثیم جسم میں داخل ہوتے ہیں تو جسم کا حفاظتی نظام انہیں اندر داخل نہیں ہونے دیتا۔ اسے خاک دھول سے الرجی ہوتی ہے دمہ کے مریض پر جب یہ اجنبی جراثیم حملہ کرتے ہیں تو سانس کی نالی میں جنگ کا میدان گرم ہوتا ہے۔

آج کل شہروں میں آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور آبادی کے ساتھ گندگی بھی۔ ریلوں کی چمنی کا دھواں، بس اور کار کے پائپ سے نکلتی ہوئی مونو آکسائیڈ گیس، نل کا گندا پانی اور گندگی کے ڈھیر بھی دمہ کے حملے میں شدت پیدا کرسکتے ہیں۔

مرطوب آب و ہوا اور بادلوں سے گھرا آسمان بھی دمہ کے لئے سازگار نہیں ہوتا۔ اس لئے سمندر کے پاس رہنے والے مریضوں کو خشک آب و ہوا والے شہر میں منتقل ہو جانا چاہئے۔

جب دمہ کا حملہ ہوتا ہے تو سب سے زیادہ زور پھیپھڑے کی نالی پر پڑتا ہے۔ سانس کی نالی الرجی کو ختم کرنے کی کوشش میں سکڑ جاتی

ہے۔ بار بار سکڑنے اور پھیلنے سے اس کی لچک ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی ہے سانس لینے میں دشواری اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ دمہ کے مریض کے پھیپھڑوں میں بھی وہ لچک نہیں رہتی جو ایک نارمل انسان کے پھیپھڑے میں پائی جاتی ہے۔ دمہ کا حملہ ہونے سے پیشتر ہی مریض کو اس کا سگنل مل جاتا ہے۔ اسے اپنے سینے میں دباؤ محسوس ہوتا ہے۔ مریض بستر پر سر جھکا کر بیٹھ جاتا ہے اور سانس لینے کی کوشش کرتا ہے۔ دمہ کا حملہ کسی وقت بھی ہو سکتا ہے، لیکن یہ زیادہ تر رات میں ہی شروع ہوتا ہے۔ سینے میں سانس چلنے کی آواز آتی ہے۔ مریض محسوس کرتا ہے کہ سینے میں بلغم جم گیا ہے۔ وہ اسے نکالنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں سے پانی جاری ہو جاتا ہے۔ وہ بے چینی محسوس کرتا ہے۔ بار بار اپنی ناک کھجاتا ہے۔ جلدی جلدی سانس لیتا ہے۔

دمہ کے علاج کے لئے سب سے پہلے سینے کا ایکس رے ضروری ہے، تاکہ پھیپھڑوں کے نقصان کی نوعیت معلوم ہو سکے۔ اس کے بعد الرجی کی تلاش ہوتی ہے۔ یہ الرجی کسی ایک چیز سے بھی ہو سکتی ہے اور کئی چیزوں سے مل کر بھی۔ دوسری صورت میں اس کا ڈھونڈنا خاصا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خون ٹیسٹ کرانا بھی ضروری ہے۔ بعض اوقات تھوک اور بلغم کا ٹیسٹ کرانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ دمہ کے مریض کو پمپ سے سانس لینے میں مدد ملتی ہے۔ اکثر مریض یہ پمپ ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اینٹی بایوٹیک دواؤں سے دمہ کا علاج کرتے ہیں۔ سانس لینے میں زیادہ دشواری پیش آئے تو آکسیجن بھی دیتے ہیں۔ کھانسی کا شربت دمہ کے لئے زیادہ مفید نہیں۔ اس کے بجائے پانی کا کثرت سے استعمال بہتر ہے۔ سینے سے بلغم نکالنے کے لئے پانی سے زیادہ موثر دوا کوئی نہیں۔

پرہیز کے لئے مریض کو خاک دھول سے بچنا چاہیئے۔ ہاضمے کی گولیاں کھانا بھی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ زکام اور کھانسی کا حملہ ہو تو فوراً اس کا علاج کرانا چاہیئے۔ کام کی زیادتی ہو تو کام سے چھٹی لینا بہتر ہے۔ ثقیل اور مرغن غذا سے پرہیز لازمی ہے۔ کچھ لوگ مریض کو جھاڑ پھونک کرنے والوں کے پاس لے جاتے ہیں۔ ایک مشہور، مگر واہیات علاج زندہ مچھلی نگلنا ہے۔ اگر اس قسم کے مریض کو علاج کے لئے کسی دوسرے شہر لے جایا جائے اور اسے افاقہ محسوس ہو تو یہ جھاڑنے والے کی کرامت سے زیادہ تبدیلی آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے۔

●●

- پنیر کو تازہ رکھنے کے لئے پنیر کو ململ کے کپڑے میں لپیٹیں۔ پھر پانی میں سرکہ کی چند بوندیں ڈال کر پنیر والے کپڑے کو اس میں رکھیں۔ پنیر کئی دن تک تازہ رہے گا۔
- پنیر کو اگر کدوکش کرنا ہو تو پہلے اسے پندرہ منٹ فریج میں رکھیں۔ پنیر کے ٹکڑوں کو سخت ہونے سے ـ نے کے لئے ان کے چاروں طرف مکھن مل لیں۔
- چاول اُبالتے وقت پانی میں لیمو کے چند قطرے ڈال دینے سے چاول سفید اور الگ الگ ہو جاتے ہیں۔
- سخت گوشت کو گلانے کے لئے پکاتے وقت پپیتے کے سوکھے چھلکوں کا سفوف چٹکی بھر ڈال دیں۔
- سلاد کی پلیٹ میں ر ... تازہ ہرے پتے بچھا دیں۔ دو تازہ یا ڈبے میں بند اناناس کے قتلے سلاد کے پتوں پر رکھیں۔ دو پیالے گریپ فروٹ کے قتلے اناناس کے قتلوں پر لگائیں۔ ایک سرخ سیب کی پتلی پتلی پھانکیں کاٹ لیں اور گریپ فروٹ کے قتلوں پر سجائیں۔ ان پر ایک پیالہ بھر بغیر بیج کے انگور ڈالیں۔ دو موسمی کے قتلے کاٹ کر انگوروں پر رکھیں۔ اس کے اوپر چیری کے دانے یا انار کے دانے ڈال دیں۔ کھانے سے ۱۵ منٹ پہلے فریج میں رکھ دیں۔
- کولڈ کارن بیف ڈبے میں بند ملتا ہے۔ اس کے پتلے پتلے قتلے کاٹ کر پلیٹ میں سجائیں۔ اردگرد ابلے ہوئے مٹر کے دانے ڈالیں۔ آلو اُبال کر چھیل کر ٹکڑے کاٹ لیں اور ان کو ہلکا سا تل لیں۔ اب ان کو پلیٹ میں سجا کر سرخ مولی کے ساس کے ساتھ سلاد کی طرح کھائیں۔

چوبی پچک

ثریا صولت حسین

ھر والوں کا یہ اصرار عابد
ےرت بنا ہوا تھا کہ دولہا برات
ے پر بیٹھ کر آئے۔ بظاہر تو
رالے اچھے خاصے مہذب اور
سا معلوم ہوتے تھے، لیکن نہ جانے
انہوں نے مسلسل 'گھوڑے' کی رٹ
ی تھی۔ عابد کو یہ تو معلوم تھا کہ اس کو خود
گھوڑے کی لگام نہیں سنبھالنا پڑے گی،
لیکن وہ پھر بھی خوف زدہ تھا۔ گھوڑسواری تو کجا'
اس نے تو کبھی گھوڑے کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہ
تھا۔ اس کو جانوروں سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔
وہ سوچ رہا تھا کہ جانور کا کیا بھروسا؟ پل بھر
میں موڈ بدلے تو اٹھا کر دے پٹخے! خوف کی
وجہ سے اس کا خون سوکھا جا رہا تھا۔ پچھلے کئی
مہینے سے عابد نے خود گھوڑے کی طرح چنے
کھا کھا کر اور کسرت کر کے اپنے آپ کو اس قابل
بنایا تھا کہ وہ بانکا، سجیلا اور گبرو دولہا نظر
آسکے۔ لیکن اب اس کو اپنی تمام محنت رائیگاں
جاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی امی سے
صاف انکار کر چکا تھا کہ وہ گھوڑے پر ہرگز
نہ بیٹھے گا۔ لیکن اس کی امی مصر تھیں کہ عابد کو دلہن
والوں کی اس معمولی سی خواہش کا بسر و چشم احترام
کرنا چاہیئے، تاکہ اس مبارک موقع پر کسی قسم کی
رنجش پیدا نہ ہو۔

پھر سہاگ رات کو عابد پر یہ انکشاف ہوا
کہ دراصل گھوڑے والی ضد اس کی دلہن ڈولی
کی تھی۔ ڈولی نے عابد کو بتایا کہ کس طرح بچپن
سے فلمیں دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں بھی اس
خواہش نے جنم لیا تھا کہ اس کا دولہا بھی بالکل
فلمی دولہا کی طرح سج دھج کر گھوڑے پر سوار
ہو کر اس سے شادی کرنے آئے۔ گھوڑے
والا تجربہ عابد کے لئے کافی تکلیف دہ ثابت
ہوا تھا اور اس سلسلے میں وہ دل ہی دل میں کچھ
خفا بھی تھا۔ لیکن ڈولی کا حسین چہرہ اور
دل کش ادائیں دیکھ کر اس کی ساری خفگی
دھل گئی اور وہ پھول کی طرح کھل گیا۔

رنگ، نور اور نکہت کی فضاؤں میں
نہ جانے کتنی پروازوں کے بعد جب ڈولی نے
زمین پر قدم رکھا تو اس نے اپنے آس پاس کے
ماحول پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر اس
کا دل دھک سے رہ گیا کہ عابد کا گھر اس کے
خوابوں کے گھر سے یکسر مختلف تھا۔ خوش حال
گھرانا ہوتے ہوئے بھی اس گھر کے ماحول میں
سادگی اور مشرقیت رچی ہوئی تھی۔ ادھر ڈولی
کے ذہن میں فلموں میں دیکھے ہوئے ماڈرن بنگلے
کلبلا رہے تھے۔ مختلف فلموں سے چن کر ان گنت
آرٹ کے نمونے اس نے اپنے ذہن میں محفوظ
کر لئے تھے، تاکہ وقتِ ضرورت ان کو کام میں
لایا جا سکے اور اب اس کے برعکس ماحول میں
پہنچ کر اسے مایوسی نے آ گھیرا۔ لیکن پھر یہ
سوچ کر اس کے ذہن میں آس کی کرن پھر
جگمگانے لگی کہ اس گھر میں عابد کی سیدھی سادی
امی کے سوا کوئی اور تھا ہی نہیں جو اس کی راہ
میں رکاوٹ بنتا۔ چنانچہ ڈولی نے اپنے دل
میں پکا ارادہ کر لیا کہ وہ بہت جلد اس گھر کی ہر شے

کو اپنی پسند کے مطابق تبدیل کر کے اس گھر کا حلیہ بدل دے گی۔

بچپن سے ہی ڈولی کے ذہن پر فلمی بھوت سوار تھا۔ وہ پردۂ سیمیں پر دکھائے جانے والے رئیسانہ ٹھاٹ باٹ اور عیش و مسرت سے بھرپور زندگی سے اس حد تک متاثر تھی کہ وہ خود بھی ایسے ہی ماحول میں جینا چاہتی تھی۔ اس کے رہن سہن اور بول چال پر بھی فلمی چھاپ

> "ڈولی" عابد اپنی پوری قوت سے دہاڑ "اللہ کیا بکتی ہو جس بچے کا ابھی تمہاری کوکھ میں وجود بھی نہیں۔ اس کے لئے تم میری ضعیف ماں کو ان کے کمرے سے نکال دو گی؟"

تھی، جو شاید ایک بار دیکھنے پر ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ اسی لئے تو عابد کی امّی کو وہ پسند آگئی تھی۔ ڈولی کے والدین خود ڈولی کی اس احمقانہ روش سے بیزار تھے، لیکن ڈولی کی خود مختاری کے آگے ان کی ایک نہ چل سکی تھی اور اب اسی فلمی دلدل میں پھنسی ہوئی ڈولی عابد کی زندگی میں چلی آئی تھی۔

"اوہ ڈیر! اس کچن میں تو قدم رکھنے کو بھی من نہیں کرتا؟" ایک دن ڈولی نے بات چھیڑ ہی دی۔ اس پر اپنی گفتگو میں انگریزی اور ہندی الفاظ استعمال کرنے کا خبط سوار رہتا تھا۔

"کون کہتا ہے کہ آپ کچن میں قدم رکھیں؟ آپ تو بس اس دل میں قدم رنجہ فرمائے رہئے میڈم" عابد نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں ڈولی کی بات کا جواب دیا اور پھر خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"آپ نے فلموں میں کچن دیکھے ہیں؟ اوہ گاڈ! کیا لولی کچن ہوتے ہیں! چم چم کرتے ہوئے چینی کے فلور، چینی کے چبوترے اور اسنو وائٹ واش بیسنوں میں چھل چھل کرتے ہوئے چاندی جیسے نل! اگر اپنا کچن بھی ویسا ہوتا تو!" ڈولی نے سرد آہ بھری اور اس کی نیم وا آنکھیں عابد کے چہرے کو ٹٹولنے لگیں۔

بیوی کی اس پہلی فرمائش پر عابد کا دل پگھلا کر ڈولی کے قدموں میں بہنے لگا اور اس نے جھٹ اس فرمائش کو اپنی امّی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ امّی نے جب یہ سنا تو ان کے دل میں بھی ایک پھریری سی اٹھی اور خوشی سے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں کہ چلو بہو کو شاید پکانے کھلانے کا بڑا شوق ہے، اسی لئے تو اس نے سب سے پہلے باورچی خانے کی طرف توجہ دی ہے۔ چنانچہ چند دن بعد ہی قدیم باورچی خانے کی جگہ ڈولی کے خوابوں والا باورچی خانہ جگمگا اٹھا۔ لیکن عابد اور اس کی امّی دونوں منتظر ہی رہے کہ کب چھم سے ڈولی باورچی خانے میں قدم رکھے اور پھر طرح طرح کے پکوانوں کی خوشبو سارے گھر میں پھیل جائے! ادھر ڈولی بھی کہ اسے باورچی خانے کی طرف رجوع ہونے کی فرصت نہ ملنا تھی نہ ملی۔ ویسے اس کو ٹھیک طرح پکانا ہی کب آتا تھا؟ وہ تو اب ڈرائنگ روم سنوارنے میں لگی ہوئی تھی۔ فلاں فلم جیسا صوفہ

سیٹ ... بہتر ہے ... پردے اور ... ڈولی نے جمع کر لی ... ڈائننگ روم، پھر بیڈ روم ... تھا جو چلا ہی جا رہا تھا۔

گرہستی کا سارا بوجھ حسبِ سابق امّی اور ملازمین ہی سنبھالے ہوئے تھے۔ دو سال اسی طرح گزر گئے۔ عابد کی امّی گٹھیا کی روگی تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کے دل میں پوتے کا ارمان لہک رہا تھا۔ ایک ننھی منی چیخ، ایک مسکراتی کلکاری کے لئے ان کے کان ترس رہے تھے۔ پوتے کی انگلی تھام کر چلنے کی تمنا اور لال پیلی پریوں کی کہانیاں سنانے کی آرزو ان کو بے چین کئے دیتی تھی۔ لیکن گھر میں ہنوز سناٹا تھا۔ ڈولی کے ساتھ ان کا عابد بھی نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔

جوں توں کر کے ایک سال اور گزرا تو اچانک خود بخود عابد ڈولی کے سحر سے باہر نکل آیا اور جب اس نے مڑ کر گزرے ہوئے تین برسوں کی طرف سنجیدگی سے دیکھا تو وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔ ان تین برسوں میں اس نے کچھ بھی تو نہیں پایا تھا۔ ہاں کھو بہت کچھ دیا تھا۔ ڈولی ان دنوں باغبانی میں مصروف تھی۔ ہمہ اقسام کے گلاب اور کیکٹس کے پودے جمع کرنے کا شوق دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ کسی فلم میں دیکھی ہوئی رنگ برنگی چھتری اور اس چھتری تلے بچھی ہوئی گارڈن چیئرز کی اس نے فرمائش لگا رکھی تھی۔ عابد کو پہلی بار ڈولی کا اس طرح فرمائش پر فرمائش کرنا ناگوار سا لگا اور وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا

دو شہزادیوں کی کہانی

رنوار احمد

اب سے تیس برس پہلے انگلستان کا
خاندان دنیا کا سب سے روایت پسند
ان تھا۔ شہزادے اور شہزادیاں سونے
ے میں قید رہتے تھے۔ ان پر ۲۴ گھنٹے
نگرانی رکھی جاتی تھی، ماں باپ ان کے
توں کا انتخاب کرتے تھے۔ یہ دوست بھی
لک بچّے ہوتے تھے۔ عام آدمیوں سے
ں ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ طلاق کا نام
گفتگو میں نہیں آتا تھا۔ طلاق یافتہ عورت
کے دربار میں حاضر نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ
ن شہزادی مارگریٹ نے ایک طلاق یافتہ
ے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تو ایک
امہ کھڑا ہو گیا۔ آخر انہیں اِس محبّت سے
ت بردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد ان کی
ی ایک مشہور فوٹو گرافر ٹونی آرمسٹرانگ جونس
ہو گئی۔ یہ شادی بھی ۱۵ سال سے زیادہ
ل سکی۔ دونوں میں طلاق ہو گئی۔ یہ شاہی
خاندان میں پہلا واقعہ تھا۔ بدلتے ہوئے وقت
نے مارگریٹ کا ساتھ دیا اور وہ شادی کے
بندھن سے آزاد ہو گئیں۔ اِس سال یکم مئی
کے دن ان کی بیٹی سارہ بھی ۲۱ سال کی عمر
ہو جانے پر قانونی طور پر بالغ ہو گئی۔

سارہ کی عمر جب ۴ سال تھی تو اس
نے اپنے ماں باپ میں تنازعہ اور طلاق کا
منظر دیکھا۔ اِس حادثے کا اس کے ذہن پر
برا اثر پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ زخم مندمل
ہو گیا۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی
اس شادی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ سارہ
اسے اپنے محل میں رکھتی ہے۔ لیکن باپ سے
اس کے تعلّقات خوش گوار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ
وہ سوتیلی ماں اور سوتیلی بہن سے بھی پیار کرتی
ہے۔ سارہ اپنے باپ کی طرح آرٹ سے لگاؤ
رکھتی ہے۔ وہ صبح ۵ بجے بستر سے اٹھ جاتی
ہے اور تیار ہو کر آرٹ اسکول چلی جاتی ہے،
اس کے باپ نے اُسے سوئزرلینڈ میں برف
پر "اسکی" پہن کر دوڑنا سکھایا۔ ایک بار وہ اٹلی
کے شہر وینس گئے۔ یہ شہر دریا کے کنارے
واقع ہے۔ یہاں موٹروں، بسوں اور
سائیکلوں کی بجائے کشتیاں چلتی ہیں۔ یہ شہر
اپنی قدیم اور عظیم الشان عمارت کے لئے بھی
مشہور ہے۔ باپ نے سارہ سے کہا کہ اگر تم
ان عمارتوں کا اصلی حسن دیکھنا چاہتی ہو تو
صبح کاذب سے اچھا کوئی وقت نہیں، دونوں
باپ بیٹی صبح کو چار بجے بستر سے اُٹھے اور وینس
کی سیر کو نکل گئے۔

انگلستان کے لوگ شاہی خاندان
سے بے حد محبّت کرتے ہیں۔ تخت کی وراثت
کا مسئلہ کبھی نہیں الجھتا۔ شاہی خاندان میں ہر
بچّے کی پیدائش کے بعد وراثت میں اس کا
نمبر مقرر کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً سارہ کا نمبر ۱۱

ہے، لیکن اس کی ماں شہزادی مارگریٹ کا نمبر ۵ ہے۔ اس لئے جب وہ اپنی ماں کے ساتھ بیرونِ ملک کی سیاحت کے لئے جاتی ہے تو وہاں کی حکومت ان کی حفاظت کے لئے پولیس کے آدمی مقرّر کر دیتی ہے۔ گذشتہ دنوں دونوں ماں بیٹی اٹلی گئے تو وہاں کی حکومت نے اصرار کیا کہ آٹھ باڈی گارڈ ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں گے۔ اس طرح ساری سیر کا مزا کرکرا ہو گیا۔ مارگریٹ بھی بیٹی کی پریشانی سمجھتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میری بیٹی شاہی خاندان سے ضرور ہے لیکن اس میں شہزادیوں کی سی کوئی بات نہیں ۔۔ ہاں ملکہ الزبیتھ ضرور اس کی خالہ ہیں۔

سارہ نے گذشتہ برسوں میں کئی نوجوانوں سے محبّت کی پینگیں بڑھائیں، اس کے پاس محل کے پھاٹک کی کنجی رہتی ہے۔ یہ کنجی ۲۱ سال، کی عمر ہو جانے پر ہی ملتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رات کو جب جی چاہے محل واپس آ سکتی ہے۔ اسے دروازہ کھولنے کے گھنٹی بجانے کی ضرورت نہیں۔ سارہ نے اِس آزادی سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کی ماں پر کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وہ رات دِن اِن پابندیوں کو توڑنے کے لئے کوشاں رہتی تھی۔ لیکن آج زمانہ بدل گیا ہے، آج وہ پابندیاں موجود نہیں ہیں تو انہیں توڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سارہ نے چند سرسری معاشقوں کے بعد پڑھائی میں دِل لگالیا۔ وہ ٹکسٹائل ڈیزائن کا کورس کر رہی ہے۔ صبح سویرے ہی وہ اپنی چھوٹی سی کار میں بیٹھ کر اسکول پہنچ جاتی ہے اور شام کو تھکی ہاری گھر پہنچتی ہے۔ گھر پہنچ کر پارٹیوں میں جانے اور آوارہ گردی کرنے کی ہمّت نہیں رہتی۔

اس کے برعکس دوسری شہزادی ہیلن ابھی تک روایت شکنی میں معروف ہے۔ ہیلن ملکہ کے چچازاد بھائی ڈیوک آف کینٹ کی بیٹی ہے۔ وہ ۲۸، اپریل کے دن ۲۱ سال کی ہو گئی۔ دونوں شہزادیاں دوست ہیں۔ سارہ اور ہیلن کی عمر میں صرف ۳ دن کا فرق ہے۔ سارہ کے باپ ایک متین اور سنجیدہ آدمی ہیں۔ اس کی ماں ایک گھریلو عورت ہیں۔ انہیں پارٹیوں اور جلسوں سے وحشت ہوتی ہے۔ وہ مجبوراً شاہی ذمّہ داریاں ادا کرتی ہیں۔ ۴۵ سال کی عمر میں ان کے یہاں چوتھا بچّہ پیدا ہونے والا تھا۔ لیکن کئی پیچیدگیوں کی وجہ سے بچّہ پیدا نہ ہو سکا۔ ان کے ذہن پر اس حادثے کا اتنا بُرا اثر پڑا کہ شہزادی مایوسی اور تکان کا شکار ہو گئی۔ وہ چھ سال تک بستر پر لیٹی رہی۔ ہیلن نے اپنے لڑکپن میں ماں کی بیماری دیکھی۔ غالباً اس کی وجہ شاہی خاندان کی ذمّہ داریاں، بچّہ ضائع ہونے کا رنج یا زندگی کی یکسانیت تھی۔ ہیلن ماں کے برعکس ہے۔ ماں جتنی سنجیدہ اور گھریلو عورت ہے، بیٹی اتنی ہی شوخ بے باک اور شریر ہے۔ ایک بار وہ اپنے دوستوں کے ساتھ یونان کی سیر کے لئے گئی تو وہاں سمندر کے کنارے اس نے اپنا بالائی حصّہ برہنہ رکھا۔ یہ ٹاپ لیس فیشن آج کل یورپ میں بہت مقبول ہے۔ لیکن شاہی خاندان کی لڑکیاں اس فیشن کو اختیار کرنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اِنگلستان کی دوسری سیاح عورتوں نے جب ہیلن کو اس لباس یا بے لباسی میں دیکھا تو حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ہیلن جب سوئٹزرلینڈ گئی تو وہاں آزادانہ اپنے مرد دوستوں کے ساتھ گھومتی رہی۔ اس کے قریبی دوستوں میں نائی جل نامی ایک لڑکا اس کی محبّت کا دم بھرتا تھا۔ ہیلن بھی اس کی محبّت کے جال میں پھنس گئی تھی کہ نائی جل سے ایک بھول ہو گئی۔ اس نے اپنے معاشقے کی داستان لندن کے ایک اخبار کو فروخت کر دی۔ پھر کیا تھا، ایک بھونچال آگیا۔ محبّت کی داستان کو پیسے کے لئے فروخت کرنا ایک ناقابلِ معافی گناہ تھا۔ ہیلن نے نائی جل سے کنارہ کر لیا۔ یوں بھی نائی جل کی حرکتوں سے سب عاجز تھے۔ ایک بار ہیلن کے ماں باپ بیرونِ ملک گئے تو نائی جل رات کے وقت مکان میں چوری چھپے داخل ہو گیا تھا۔ محل کے چوکیداروں نے اُسے دیکھ لیا، لیکن ہیلن کی وجہ سے خاموش ہو گئے۔ دوسرے دِن اس واقعہ کی رپورٹ ماں باپ کو ملی تو انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ اب نائی جل دِن میں بھی محل میں نہیں آ سکتا۔

۱۹۸۳ میں ہیلن نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ماں باپ سے الگ ایک فلیٹ میں رہے گی۔ وہ فلیٹ میں اپنی سہیلی کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ ماں باپ کو ہیلن کی جدائی گوارا نہیں تھی۔ آخر اسے کس چیز کی کمی تھی، لیکن انہوں نے بیٹی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ دو سال اس فلیٹ میں رہی، پھر اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ گئی۔ اب وہ بچّوں کے اسکول میں کام کرتی ہے، عام انسانوں کی طرح۔ وہ زمین دوز ریل میں سفر کرتی ہے۔ موسم اچھا ہو تو پیدل ہی کام پر جاتی ہے۔

آج سے ۳۰ سال پہلے ان دونوں شہزادیوں کو یہ آزادی ہرگز میسّر نہ ہوتی، لیکن زمانہ بدل گیا ہے اور دونوں شہزادیاں اس کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ■■

بیوٹی کالج

شہناز حسین

آج کل مغربی ممالک میں عورتوں پر جسمانی ورزش کا جنون سوار ہے۔ امریکہ میں ہزار ہا سوئمنگ پول ہیں، ہیلتھ کلب ہیں جہاں عورتیں ایسی سائیکل چلاتی ہیں جو اسٹینڈ پر کھڑی ہوتی ہے۔ "جوگنگ" یعنی دوڑنا پاگل پن کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ جسے دیکھو وہ بنیان اور نیکر پہنے شہر کی شاہراہوں پر دوڑتا جا رہا ہے۔ اس مرض میں لیڈر، پروفیسر، وکیل اور سیاست داں سب ہی مبتلا ہیں لیکن اب "جوگنگ" میں رکاوٹ پڑ گئی ہے۔ اس مشغلے کا مشہور اُستاد گزشتہ دنوں دوڑتا ہوا جا رہا تھا کہ یک بیک سڑک پر گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ اس کی موت نے دوڑنے کی رفتار کچھ کم کر دی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستانی عورتیں کیا کریں۔ وہ سڑک پر بنیان اور نیکر پہن کر نہیں دوڑ سکتیں۔ ہیلتھ کلب بھی ان کی پہنچ سے باہر ہیں۔ سائیکل چلانا بھی آسان نہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ ان سخت ورزشوں سے پرہیز کریں۔ سخت ورزش ویسے بھی صحت کے لئے مفید نہیں ہے۔ اس کی بجائے ہلکی اور باقاعدہ ورزش سے نہ صرف جسم کی چربی کم ہو جاتی ہے، بلکہ عام صحت بھی درست رہتی ہے۔

عورتوں کے لئے گھر پر ورزش کرنا بہتر ہے

ورزش کو سر پر سوار نہ کریں۔ اس کو شوق اور تفریح کے طور پر انجام دیں۔ تفریح جب ڈیوٹی بن جائے تو انسان جلد ہی اس سے اوب ہو جاتا ہے۔ اگر آپ صبح کو دیر سے اٹھتی ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے چند ورزشیں کر لیں۔ تو آپ کے لئے مفید ہوگا۔ تاہم ورزش کے لئے صبح کا وقت ہی زیادہ مناسب ہے۔

ذیل میں ہم چند ہلکی پھلکی ورزشیں پیش کرتے ہیں۔

پہلی ورزش میں صرف پاؤں کے دونوں انگوٹھوں کو چھونے کا عمل کئی طریقوں سے انجام دیا جاتا ہے۔

اس ورزش سے آپ کی کمر سیدھی رہے گی۔ اور جسم میں پھرتی آئے گی۔ فرش پر بیٹھ جائیں۔ دونوں ٹانگیں سامنے کی طرف پھیلا لیں۔ دونوں پیروں کے انگوٹھوں کو ملا لیں۔ اب آگے کی طرف جھک کر دونوں انگوٹھوں کو چھونے کی کوشش کریں۔ سر کو جتنا جھکا سکتی ہیں جھکائیں۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں آپ کو کامیابی نہ ہو، لیکن ہمت نہ ہاریں۔ اگر آپ کے ہاتھ پاؤں کے انگوٹھے تک نہیں پہنچ سکتے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کچھ عرصہ کی مشق کے بعد آپ کو مہارت حاصل ہو جائے گی۔

دوسری ورزش میں فرش پر بیٹھے بیٹھے ٹانگوں کو اوپر اُٹھائیں اس طرح کہ فرش اور ٹانگوں کے درمیان ۴۵ ڈگری کا زاویہ بن جائے۔ اس حالت میں دونوں انگوٹھوں کو چھونے کی دوبارہ کوشش کریں۔

تیسری ورزش میں فرش پر چت لیٹ جائیں۔ ٹانگوں کو ۴۵ ڈگری کے زاویہ تک اُٹھائیں۔ اسی حالت میں کولہوں کو دائیں بائیں گھمائیں۔ اس کے بعد ٹانگوں کو قینچی کی طرح حرکت دیں۔ دو منٹ تک یہ عمل جاری رکھیں۔ یہ ورزش کولہے، ران اور پیٹ کو بھاری ہونے سے بچاتی ہے۔

چوتھی ورزش بھی کولہوں کے لئے ہے۔ خاص طور پر وضع حمل کے بعد کولہے بھاری ہو جانے پر اس ورزش سے فائدہ پہنچتا ہے۔ اس ورزش میں آپ کو کولہوں کے بل چلنا ہے۔ فرش پر آرام سے بیٹھ جائیں اور بغیر ہاتھوں کی مدد سے فرش پر چلنے کی کوشش کریں۔ ٹانگیں سامنے کی طرف پھیلائیں۔ چلنے کے لئے کولہے اور ٹانگوں کے اعصاب پر زور دیں۔ یہ ایک اپاہج کی چال کے مانند ہے، لیکن اس سے آپ کے کولہوں کا گوشت کم ہو جائے گا۔

پیٹ کو کم کرنے کے لئے یہ ورزش مفید ہے۔ فرش پر سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ دونوں ٹانگوں

ے فاصلہ ایک فٹ کا فاصلہ رکھیں۔ ہاتھوں کو کولہوں پر رکھ لیں۔ اب بالائی جسم کو جھکائیں جس طرح رکوع میں جھکتے ہیں۔ اس کے بعد بغیر پیروں کو جنبش دیے بالائی جسم کو دائیں بائیں حرکت دیں۔ دو منٹ اس ورزش کے لئے کافی ہیں۔

پیٹ، رانوں اور ٹانگوں کو مضبوط بنانے کے لئے یہ ورزش مفید ہے۔ فرش پر چت لیٹ جائیں۔ دونوں ٹانگوں کو اوپر لے جائیں۔

دو منٹ تک ٹانگوں کو اوپر کی طرف رکھیں اس کے بعد ٹانگوں کو اور اوپر لے جائیں۔ اس میں ہاتھوں کی مدد درکار ہوتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے کمر کو پکڑ لیں۔ دو منٹ تک اسی حالت میں رہیں۔ پھر ایک منٹ تک دونوں ٹانگوں کو اس طرح حرکت دیں جس طرح سائیکل کا پیڈل گھمایا جاتا ہے۔

ورزش کے لئے بائیسکل چلانا بہت مفید ہے، لیکن بازار میں سائیکل چلانا مشکل

ہے۔ ورزش کے لئے اب ایسی سائیکلیں بن رہی ہیں جو اسٹینڈ پر کھڑی رہتی ہیں۔ آپ ان پر بیٹھ کر آرام سے میلوں کا سفر طے کر سکتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ آپ اپنی جگہ سے نہیں ہلتیں۔ اگر آپ کے خاوند یا بھائی کے پاس سائیکل ہے تو اس کے لئے گھر میں ایسا اسٹینڈ بنوا لیں جس میں پہیئے زمین سے اوپر رہیں۔ اور آپ گھر میں ہی سائیکل چلانے کا لطف اٹھا سکیں۔ اس طرح سائیکل چلانے میں کم محنت خرچ ہوتی ہے۔ سڑک پر سائیکل چلانا زیادہ محنت طلب ہے۔

اگر آپ کی کمر جھکی رہتی ہے تو قد کو سیدھا کرنے کے لئے ایک اور آسان ورزش بھی عمل میں لائی جا سکتی ہے جب آپ باورچی خانے میں کھانا پکائیں تو سامنے کے بریکٹ یا میز پر ہاتھ رکھ لیں اور زمین پر بیٹھ جائیں لیکن کمر سیدھی رکھیں۔ فرش پر اکڑوں نہ بیٹھیں۔

صحت کے لئے کھانے میں احتیاط رکھنا بھی ضروری ہے۔ پھل اور کچھ سبزیاں زیادہ کھائیں۔ پکا ہوا کھانا مونہہ میں ڈالتے ہی گلدی بن جاتا ہے۔ اسے چبانے کی نوبت نہیں آتی۔ ادھ کچرا کھانا بغیر اچھی طرح چبائے حلق سے نہیں اترتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ چین کے لوگ ادھ کچرا گوشت کھاتے ہیں۔ ان کی صحت ہندوستانیوں سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ تپ دق کا وہاں نام ونشان نہیں ہے۔ کبھی کبھی ایک دو کچی بھنڈیاں چبا کر کھیں چبانے سے غذا میں لعاب دہن اچھی طرح مل جاتا ہے۔ یہ لعاب ہاضمہ میں مدد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دانتوں اور مسوڑھوں کی بھی ورزش ہو جاتی ہے۔

ذہنی ورزش

انعام:
ایک سوان
پریشر کوکر

اپنی ذہانت کو آزمائیے، اپنی معلومات کا امتحان لیجیے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوان پریشر کوکر حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوئے تو انعام پانے والوں کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔

۱۵- اکتوبر ۱۹۸۵ تک ہمیں ملنے والے جوابات اِس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر ۱" ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ا- دلی میں ہمایوں کا مقبرہ کس نے تعمیر کرایا تھا؟

ا- مشہور سیاسی لیڈر شیخ حسینہ واجد کا تعلق کس ملک سے ہے؟

ا- سابق ملکۂ ایران فرح دیبا کس ملک میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہے؟

ا- ہاتھی کتنے سال زندہ رہتا ہے؟

- سندھی زبان کا رسم الخط کیا ہے؟

- اصغری اکبری ایک مشہور ناول کے کردار ہیں۔ اس ناول کا نام کیا ہے؟

- اُردو کا مشہور ناول 'تصویر' کس کی تصنیف ہے؟

- کیا ہندوستان میں مردوں کی عمر کا اوسط عورتوں سے زیادہ ہے؟
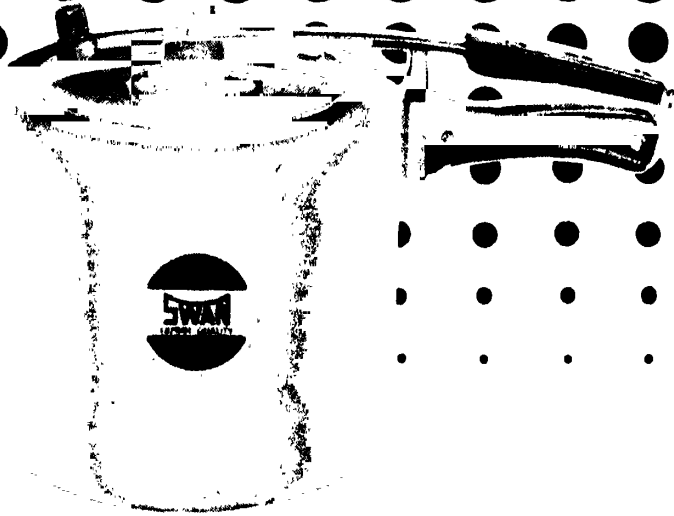
۹- جوشن جسم کے کس حصے پر پہنا جاتا ہے؟

۱۰- جاپان کی عورتیں کبھی کبھار اپنا قدیمی لباس زیبِ تن کرتی ہیں۔ اس کا نام کیا ہے؟

ذہنی ورزش نمبر ۱

بانو

۱ ....
۲ ....
۳ ....
۴ ....
۵ ....
۶ ....
۷ ....
۸ ....
۹ ....
۱۰ ....

نام: ....

پتہ: ....

....

کٹھ پتلی

زہرہ مسرور

بہاروں سے زیادہ پیاری حُسنہ
ے نام!
جو معصوم بھی ہے،
بھولی بھی ہے،
پیاری بھی ہے ——— ایک کٹھ پتلی کی
رح۔
اب کٹھ پتلی کو پیار کے سنگ ناچنا
ھی ہے۔

کیوں حُسنہ، ہے نا؟ بیٹی، اب جب کہ
تمہاری شادی ہونے والی ہے اور میرا خط پہنچنے
تک ہو بھی چکی ہو گی تو میں سوچ رہا ہوں۔
اور ٹھیک ہی سوچ رہا ہوں) کہ شادی ایک
کٹھ پتلی کا کھیل ہے، جس میں لڑکی کٹھ پتلی
ہوتی ہے اور کٹھ پتلی کی ڈور لڑکے کے ہاتھ
میں ہوتی ہے۔ اور آواز آتی رہتی ہے "بول ری
کٹھ پتلی، بول!"

ایسی کٹھ پتلی جو اپنے پیا کے سنگ ہم آہنگ
ہو کر ناچتی ہے، ایک کام یاب کٹھ پتلی کہلاتی
ہے۔ یعنی ایک کام یاب لڑکی، جس کے ہاتھ
میں سوتی یا ریشمی ڈور تو بندھی نہیں ہوتی، پھر
بھی اشاروں کی ان دیکھی ڈور ضرور موجود ہوتی
ہے جو اشاروں پہ چلے، وہ ایک کام یاب
لڑکی، ایک کام یاب کٹھ پتلی ہوتی ہے۔ جو
اشاروں پر نہیں ناچتی اور جس کے ہاتھ میں
ڈور بھی بندھی رہے تو وہ کاٹھ کی اُلّو ہوتی ہے۔

تم تو کٹھ پتلی ہو۔ پوری کٹھ پتلی۔ زریں
لباس میں سجی، زرتار دوپٹہ اوڑھے، بوٹے سے
قد میں بھلا تمہیں کون کٹھ پتلی نہ کہے گا؟ کون
نہ بولے گا: "بول ری کٹھ پتلی بول!"

یہ ان دنوں کی بات ہے جب تم
سب لوگ پاکستان جانے کی تیاریوں میں لگے
ہوئے تھے اور میں دتار آباد میں تنہا رہتا تھا
وہاں میں نے کٹھ پتلی کا ایک ناچ دیکھا تھا۔ وہ
تھرتھراتا ہوا ناچ مجھے بے حد پسند آیا تھا پھر
میں نے پردے کے پیچھے اس نوجوان کو بھی دیکھا
تھا جس کی ساری اُنگلیوں میں تاگے پھنسے ہوئے
تھے اور وہ اُنگلیوں کے اشاروں پر پتلیوں کو
نچا رہا تھا۔ ایک ایسا شخص جو اس کھیل کی تکنیک
سے واقف نہ ہو، یہ کھیل دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا
ہے۔ کٹھ پتلی کا کھیل ہوتا ہی حیران کُن ہے۔
اور کٹھ پتلی ناچتی رہتی ہے۔ سب کو حیران کرتی
رہتی ہے۔ بعض وقت نچانے والا خود حیران
رہ جاتا ہے کہ یہ اتنا اچھا ناچ کیسے رہی ہے
یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک کٹھ پتلی ایک
کام یاب کٹھ پتلی بن جاتی ہے۔ وہ ناچتی ہے
اس کے ساتھ نچانے والا گاتا ہے۔ اور وہ خود
بھی گاتی ہے "میں ناچوں اپنے پیا کے لئے۔"

اس روز کٹھ پتلی کے کھیل میں مجھے زندگی
کا پورا تماشا دکھائی دیا تھا۔ کٹھ پتلی چاول چھنتی
ہے، کھانا پکاتی ہے، کھاتی ہے، ہنستی ہے،
بچے کو سلاتی ہے، شوہر کو حقہ بھر کر دیتی ہے۔

ایک بار فلم دیکھتے ہوئے میں نے ایک ایسی ہی
کٹھ پتلی کو دیکھا تھا جو میرے سامنے کی قطار
میں بیٹھی لائٹر جلا کر اپنے جیون ساتھی کے مونہہ
میں دبے ہوئے سگریٹ کو جلا رہی تھی۔

جانے کیوں مجھے عورت کی ذات ایک
کٹھ پتلی ہی لگتی ہے۔ کسی کو اس پر اعتراض
ہو تو ہو، لیکن مجھے نہیں۔ جس کو نچانا نہ آئے
بھلا وہ کٹھ پتلی کی نطرت سے کیا واقف؟
کٹھ پتلی ناچنا چاہتی ہے۔ اسے نچانے والا
چاہئے۔ وہ خوب ناچتی ہے۔ وہ خود نہیں تھکتی
نچانے والا تھک جاتا ہے۔ وہ تو بس ناچتی رہتی
ہے، تھرکتی رہتی ہے، گاتی رہتی ہے "بول ری
کٹھ پتلی، بول!"

خط لکھتے لکھتے میں بھی تھک گیا ہوں۔

ڈر ہے پڑھتے پڑھتے تم نہ اُکتا جاؤ۔ بہت
دن سے خواہش تھی کہ تمہاری شادی پر ایک
نصیحت پیش کروں، جو مبارک باد کے ساتھ
ساتھ زندگی کی سچائی بھی پیش کر دے۔ اُمید
ہے تم اپنے آپ کو زندگی کے کھیل میں ایک
کام یاب کٹھ پتلی ہی ثابت کرو گی۔

اچھا بیٹی، خدا حافظ! میری طرف
سے سب کو سلام کہنا اور کہنا کہ تمہاری شادی
کا کم از کم ایک فوٹو ضرور مجھے بھجوائیں، جس
میں تم کھڑی ہو گی اپنے شریکِ زندگی کے ساتھ
زرتار دوپٹہ اوڑھے ہوئے بوٹے سے قد میں سمٹی ہوئی
آنکھیں بند کئے ——— جیسے ایک کٹھ پتلی کھڑی
ہے، مگر پھر بھی لگے گا کہ ڈور بندھی ہے۔

تمہارا بچھڑا ہوا،
بوڑھا چاچا

بُنائی کے نئے ڈیزائن

بُنائی کے
نئے ڈیزائن

[illegible]

[illegible] زخمی ہو جاتے
ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں آگ سے جھلس جاتے
ہیں۔ وہ دشمن کی گولیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔
زخمیوں کو میڈیکل کیمپ میں لایا جاتا ہے جب
ڈاکٹروں نے ان کے گھاؤ کا معائنہ کیا تو انہیں
درد کی شدت سے بچانے کے لئے مارفین کا انجکشن
دیا۔ وہ یہ بات دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان فوجیوں

[illegible]
جدائی اور اسپتال رہنا ہے — ماں بیمار ہو اور بیٹا
پردیس جا رہا ہو تو ماں کا درد بڑھ سکتا ہے۔ اس
کے برعکس ماں کی بیماری کے دوران اس کا لاڈلا
گھر آ جائے تو اس کا درد کم ہو جاتا ہے۔

درد سے متعلق ایک اور انکشاف

زیادہ دلچسپ ہے۔ اگر کسی عورت کے سر میں

بھی فائدہ ہوا۔ اتنی آپ کے [illegible]
جھاڑ پھونک کرنے والے بھی اسی
کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جھاڑ پھونک کر
کی چٹکی دینے سے مریضہ کا درد کم ہو جاتا
تعویز باندھنے سے بھی فائدہ حاصل ہو
دعا کے ساتھ اعتقاد اور امید وابستہ ہو
دوا تیر بہدف بن جاتی ہے۔

ہم آئے دن ایسے انسان دیکھتے ہیں
ی نہ کسی درد کی شکایت کرتے رہتے
ل عورت باورچی خانے سے نکل کر دردِ سر
ہوجاتی ہے۔ کوئی گٹھیا اور جوڑوں کے
شکایت کرتی رہتی ہے۔ کسی کی کمر میں
درد رہتا ہے۔ اس کے علاوہ درد کی
یں ہیں جو عارضی ہوتی ہیں۔ مثلاً آپ نے
سے اتاری تو آپ کی
سے درد شروع ہوگیا۔ ہاتھ

جگا دیتا ہے، اسی طرح درد کا الارم ہمیں بستر پہ
پہنچا دیتا ہے، تاکہ ہم اپنے علاج کے متعلق سوچ
سکیں۔ مگر ہم اپنے مکان کے فرش پر چل پھر رہے
ہیں۔ اچانک ہمارے پاؤں کا انگوٹھا پلنگ کے
پائے سے ٹکرا جاتا ہے۔ ہم فوراً ہائے کہہ کر بیٹھ جاتے
ہیں۔ اس ایک سیکنڈ میں چوٹ کا پیغام دماغ
تک پہنچ جاتا ہے۔ چوٹ کا احساس او
اس پیغام کے پہنچنے کے

تو درد میں اچانک کمی ہوئی۔ ڈاکٹروں نے اس
تجربے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سگنل پہنچانے والے
اعصاب ایک وقت میں ایک ہی پیغام بھیج سکتے
ہیں اگر ایک سے زیادہ پیغام بھیجے جائیں تو یہ سلسلہ
گڈمڈ ہوجاتا ہے۔ پاؤں کے انگوٹھے میں اگر
نے کا لیپ کیا جائے تو
ہے۔ آیوڈیکس یا
بھکا

سلیم اختر

ست کا لبادہ نوچ کر
ہے جو تیرے در پہ چلمن پھونک دوں
وحشتیں کہتی ہیں عرفی اِس جہاں کو پھونک دوں
چاند تاروں کو جلا دو آسماں کو پھونک دوں

شین عرفی

ڈکاٹو انتریپ کے عجیب غوطہ خور

قدیم یونان میں لیوکاس جزیرہ کے نوجوان پادریوں کو اپولو مندر میں پوجا پاٹ کے لئے اپنے کو اہل ثابت کرنے کے لئے عقاب کے پر باندھ کر ۲۳ فٹ کی اونچائی سے سمندر میں غوطہ لگانا پڑتا تھا۔ ایسا خیال کیا جاتا تھا کہ دیوتا ناقابل لوگوں کو بھسم کر دیں گے مگر کبھی کوئی غوطہ خور زخمی بھی نہیں ہوا۔ حالاں کہ صبر آزما امتحان کی روایت صدیوں تک جاری رہی۔

یہ ساری بیماریاں جو پہلے زمانے میں لاعلاج سمجھی جاتی تھیں، اب خطرناک نہیں سمجھی جاتیں۔ لیکن کینسر کا علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ اس لئے جب کسی مریض کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ کینسر کا شکار ہے تو وہ زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے۔ خوف اور مایوسی سے درد کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

درد کے بارے میں ڈاکٹروں پر ایک اور انکشاف ہوا۔ جنگ کے دوران فوجی زخمی ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں آگ سے جھلس جاتے ہیں۔ وہ دشمن کی گولیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ زخمیوں کو میڈیکل کیمپ میں لایا جاتا ہے جب ڈاکٹروں نے ان کے گھاؤ کا معائنہ کیا تو انہیں درد کی شدت سے بچانے کے لئے مارفین کا انجکشن دیا۔ وہ یہ بات دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان فوجیوں کو مارفین کی بہت کم مقدار بھی کافی تھی جب کہ عام شہری کے اگر ایسی چوٹ لگتی تو وہ درد سے بلبلا اٹھتا اور اسے مارفین کی وافر مقدار دینی پڑتی۔ اس کا راز یہ تھا کہ فوجی کے لئے زخمی ہونا جنگ سے چھٹی ملنے اور گھر واپس جانے کا نام ہے۔ گھر پہنچنے کی خوشی، چوٹ کے درد کو کم کر دیتی ہے۔ جب کہ ایک عام شہری کے لئے زخمی ہونے کا مطلب گھر سے جدائی اور اسپتال رہنا ہے — ماں بیمار ہوا اور بیٹا پردیس جا رہا ہو تو ماں کا درد بڑھ سکتا ہے۔ اس کے برعکس ماں کی بیماری کے دوران اس کا لاڈلا گھر آجائے تو اس کا درد کم ہو جاتا ہے۔

درد سے متعلق ایک اور انکشاف زیادہ دلچسپ ہے۔ اگر کسی عورت کے سر میں

شدید درد ہو تو آپ اسے یہ کہہ کر ایک گولی دیں کہ یہ درد کی تیر بہدف دوا ہے۔ گولی کے حلق سے اترتے ہی درد غائب ہو جائے گا۔ ۹۰ فی صد حالات میں درد کم ہو جاتا ہے۔ اس علاج کے لئے دوا کا اصلی ہونا ضروری نہیں۔ شکر کی معمولی گولی سے بھی کام چل جائے گا۔ آپ نے یہ مقولہ اکثر سنا ہو گا کہ اعتقاد آدھا علاج ہے۔ اکثر عورتیں ایک ہی ڈاکٹر سے علاج کراتی ہیں۔ ان کے خیال میں اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا ہوتی ہے۔ امیر عورتیں اکثر ڈاکٹروں کا دماغ چاٹتی ہیں: ہمیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ یہ فہرست اتنی طویل ہوتی ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ ڈاکٹر لاکھ سمجھائے کہ آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے لیکن انہیں یقین نہیں آتا۔ ڈاکٹر ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے انہیں کوئی معمولی ٹانک لکھ دیتا ہے۔ اس دوا سے انہیں فائدہ پہنچتا ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر بھی بھاری فیس وصول کر لیتا ہے۔ ایک ڈاکٹر نے ایسے ہی ایک مریضہ کو بچے کے دودھ کا پاؤڈر کا ایک چمچہ دن میں تین بار کھانے کے لئے مشورہ دیا۔ کچھ دن کے بعد مریضہ کلینک میں آئی اور بولی۔ "ڈاکٹر، مجھے آپ کی دوا سے بہت فائدہ ہوا۔ میری کئی سہیلیوں نے بھی اس دوا کو آزمایا ہے انہیں بھی فائدہ ہوا۔ واقعی آپ کے ہاتھ میں شفا ہے۔"

جھاڑ پھونک کرنے والے بھی اسی اندھے اعتقاد کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جھاڑ پھونک کرنے اور خاک کی چٹکی دینے سے مریضہ کا درد کم ہو جاتا ہے۔ تعویز باندھنے سے یہی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جھوٹی دوا کے ساتھ اعتقاد اور امید وابستہ ہو تو وہ دوا تیر بہدف بن جاتی ہے۔

○

تُو مجھے پہچان ہمدم میں تری ہمراز ہوں
اپنے ہی کمرے میں ایک گھٹتی ہوئی آواز ہوں
زندگی کا کیفِ آگیں میں کوئی نغمہ نہیں
وقت کے ہاتھوں جو ٹوٹا وہ شکستہ ساز ہوں
میں کہ اک زینت محل ہوں میں کہ اِک شہناز ہوں
تُو مجھے پہچان ہمدم میں تِری ہمراز ہوں

رات کی رانی ہوں یا اِک رات کی دلہن ہوں میں
یا نسیمِ صبح کی آغوش میں گلشن ہوں میں
موتیا، چمپا چمیلی اور جُوہی میرا نام
الجھنوں کے درمیاں اُلجھی ہوئی اُلجھن ہوں میں
بن پیا کے میں سہاگن مانگ میں سیندور ہے
تیری دھرتی کی یہ سیتا کس قدر مجبور ہے

کوئی مذہب کوئی مسلک ہے نہ کوئی ذات ہے
زیست کا افسانۂ رنگیں مری اک رات ہے
ملک و ملت دین اور ایمان کی باتیں یہاں
اِک ادھورا خواب ہے یہ اک ادھوری بات ہے
میرے بُت خانے کا کوئی بُت خدا بنتا نہیں
کوئی اس دیر و حرم میں پارسا بنتا نہیں

جی میں آتا ہے تیرا ہنستا نشیمن پھونک دوں
آشیاں خود پھونک لوں یا تیرا خرمن پھونک دوں
جسم سے تیرے شرافت کا لبادہ نوچ کر
جگمگاتا ہے جو تیرے در پہ چلمن پھونک دوں
وحشتیں کہتی ہیں عرفی اِس جہاں کو پھونک دوں
چاند تاروں کو جلا دو آسماں کو پھونک دوں

شین عرفی

گھر کی تقدیر

سُرخ چمکتے گھونگھٹ میں ہے
پیاری سی تصویر
شام کے آنچل میں چمکی ہے
مہتابی تنویر
جیسے کتابِ دِل کے ورق پر
اِک رنگیں تحریر
جیسے میرؔ کی غزلیں جیسے
غالبؔ کی تقریر
گورے گورے پاؤں میں پہنے
چاندی کی زنجیر
چھم چھم کرتی آئی جگانے
گھر کی مرے تقدیر

سیف سہسرامی

دلہن مجھے بنا دو

نیل گگن سے چاند ستارے لا کر آج سجا دو
تم سنگ اب تو رہ نہ سکوں گی دُلہن مجھے بنا دو
پریت کی اگنی من میں بھڑکے ایسا گیت سناؤ
آؤ سکھی ری آؤ

جنم سے جس کی میں تھی پیاسی لینے آئے پاس
دیکھو کھِل گئیں کومل کلیاں بھنورا ڈالے باس
جاؤں گی میں پی کے دُوارے دل کا ساز بجاؤ
آؤ سکھی ری آؤ

مانگ میں افشاں ہاتھ میں کنگن ڈالو آنکھ میں کاجل
دیکھ پیا کو آج سکھی ری سر کا بیری آنچل
آنسوں موتی کیوں ہو پردتی گیت ملن کے گاؤ
آؤ سکھی ری آؤ

ہونٹوں پہ مُسکان کا جادو جسم ہے مہکا مہکا
آج خوشی میں سنبھل نہ پائے قدم ہے بہکا بہکا
پائل کی جھنکار سناؤ کا ہے کو شرماؤ
آؤ سکھی ری آؤ

سلیم اختر

بزمِ بانو

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی آپ کے سوالات کے دلچسپ جوابات دیتی ہیں۔

ایک پوسٹ کارڈ پر صرف دو سوال لکھیں۔ ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑنی ضروری ہے ورنہ جواب نہ دیا جائے گا۔ سوال بھیجتے وقت اپنا پورا پتہ نہ لکھیں صرف نام لکھنا کافی ہے۔

مدیرہ

بزمِ بانو

ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ نئی دہلی ۲

سرور عالم انصاری، چھپرہ (بہار)

س: ابتدا میں شریف لڑکیاں اظہارِ محبت کا سگنل کس طرح سے دیتی ہیں؟

ج: میں عشق کے معاملے میں بالکل اناڑی ہوں۔ میری رائے پر بھروسے سے عمل کر بیٹھے کوئی ناداں تو بڑے ٹوٹے میں رہے گا۔ آپ سگنل وغیرہ کا انتظار کیوں کرتے ہیں ویسے ہی لڑکی کو انسان سمجھ کر شرافت سے ملئے۔ اگر عشق ہو جائے تو سگنل خود بخود سمجھ میں آنے لگے گا۔ نہ ہو تو دوستی تو رہے گی پردے کی وجہ سے بہت اُلجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ رشتہ داروں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان دیواریں کھڑی ہیں پھر ایک دن ایک لڑکے کو ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ چپکا دیا جاتا ہے۔ اور حکم ملتا ہے پوری زندگی گزار دو۔

محمد ابراہیم راہی، بانسواڑہ

س: محبوبہ اگر جنت کا خواب ہے تو بیوی؟

ج: خواب اور وہ بھی جنت کا خواب ہی ہے تو اچھا ہے۔ بیوی نہایت ٹھوس حقیقت ہوتی ہے۔ ایسا کیجئے کہ یا تو محبوبہ کو بیوی بنا لیجئے یا بیوی کو محبوبہ۔ پتہ چل جائے گا۔

س: دوستی دو قدم تو محبت ......؟

ج: جنم جنم۔

مسز رقیہ صمد، حیدر آباد

س: اُردو زبان کے رسم الخط کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: اُردو نہایت شیریں اور آسان زبان ہے وہ جس رسم الخط میں بھی لکھی جائے عام انسان کے کام آئے گی نہ جانے دنیا کی زبانیں ایک ہی رسم الخط

لگایا جا سکتا۔ ویسے فکر کرنے کا بوجھ مرد نے زبردستی اکیلے اٹھا رکھا ہے۔

شیخ عثمان آزاد، نصیر آباد

س: کیا غربت میں انسان کی عقل بھی کام نہیں کرتی؟

ج: بالکل درست! دنیا میں غریبوں کی اکثر[illegible] اس بات کا ثبوت ہے۔ بہت مختصر سی امیر انسانوں کی ٹولی ان کے خون سے ہولی منا رہی ہے۔ اور وہ اپنے سے بھی زیا[illegible] غریب اور کمزور کو لوٹ رہے ہیں قتل کر رہے ہیں۔ ان کی پہنچ اوپر والوں تک تو ہے نہیں۔ اپنے سے کم زور کو ہی مار لیتے ہیں۔

س: شادی کرنے کا طریقہ بتائیے؟

ج: گھر کی خواتین کو ایک عدد دُلہن کی تلا[illegible] میں بھیجئے۔ لڑکیاں بھی شادی کی اُم[illegible] لگائے سوکھ رہی ہیں۔ آسانی سے دُلہن مل جائے گی۔ بینڈ باجے اور جوڑے، گھوڑے کے چکر کو بھول کر بس خاموشی سے نکاح کر ڈالئے۔ اس میں ایسی مشکل کیا ہے؟ رہی وہ بینڈ باجے والی شادی تو وہ حماقت ہے۔

محی الدین خاں، سندر گڑھ، اڑیسہ

س: جس کلی کو سورج کی جھلک نصیب نہ ہو کیا اس کو پھونک مار کر شگفتہ کیا جا سکتا ہے؟

ج: سورج کا کرایہ تو نہیں دینا پڑتا اگر آپ پھونک مار کے بجلی کا بلب بجھا سکتے ہیں تو ضرور کلیاں بھی کھلا دیں گے۔ کوشش کر کے دیکھ لیجئے۔

س: کیا اچھی اور دلنشیں باتوں کے لئے

میں کیوں نہیں ہیں۔

س: عورت کو ماضی، حال اور مستقبل میں سے کس کی زیادہ فکر رہتی ہے؟

ج: ماضی حال اور مستقبل کی اہمیت ہر جاندار کے لئے اہمیت رکھتی ہے جنس کا ٹھپہ نہیں

آرائستگی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ج: یہ لفظ آرائستگی ڈکشنری میں تو نہیں ہے کیا سجاوٹ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ بات کام کی ہو تو کلی پھندنے لگانے کے بجائے سیدھے سادے طریقے سے کہہ دینا بہتر ہے۔

س: فقیری اور بادشاہی میں کتنا فرق ہے؟

ج: بس اتنا ہی فرق ہے جتنا سیاہی اور سفیدی میں۔ فقیر دل کا بادشاہ ہو سکتا ہے اور بادشاہ کم ظرف اور ظالم ہو سکتا ہے

نذیر اعظمی، مغل سرائے

س: کوئی لڑکی کسی داغ دار لڑکے سے شادی کرنے پر کب آمادہ ہوتی ہے؟

ج: لڈو تو گھی کا لڈو ہوتا ہے ذرا ٹیڑھا بھی ہو تو میٹھا اور مزے دار تو ہوتا ہے۔ اگر داغ دار سے مطلب کسی بھیانک مرض کا داغ ہے تب تو آن جانے ہی شادی پر راضی ہو جاتی ہوگی۔

س: دولت سے عزت یا عزت سے دولت؟

ج: آج تو دولت سے سب کچھ ملتا ہے۔ عزت نہ بھی ملے تو ٹھاٹ تو ہو ہی جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں اسمگلروں کو بہت نیچا سمجھا جاتا تھا۔ اب ان کی دولت سے بڑی اونچی کرسیاں حاصل کی جاتی ہیں میرے خیال میں دولت سے حاصل کی ہوئی عزت کچھ زیادہ پائیدار نہیں ہوتی اونچی گدی تو مل جاتی ہے مگر ہر دم یہی خوف طاری رہتا ہے اور زیادہ پیسے والا ٹانگ گھسیٹ کر گدی سے اتار بھی سکتا ہے۔ وہ محبت اور عزت زیادہ پائیدار اور سکون بخش ہوتی ہے جو فنکار کو ملتی ہے جس میں روپیہ کا لین دین نہیں ہوتا۔

حسینہ پروین فرزانہ رشیدی کامٹی ناگپور

س: انسان سے لحاظ کا دامن کب چھوٹ جاتا ہے؟

ج: جب اس کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے یا جب برا وقت پڑتا ہے۔ جینے کے لئے بے شرمی کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ تب قسمت کو الزام دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے ناقص العقل کہلاتی ہیں۔ دنیا بدل رہی ہے۔ رشتے ناطے ٹوٹ رہے ہیں لڑکیاں اونگھ رہی ہیں۔ باپ بھائی کہیں سے پالن ہار ڈھونڈ کر لائیں تو نصیبہ کھلے۔

س: کیا کامیابی بغیر جد و جہد کے بھی مل سکتی ہے؟

ج: تھوڑی سی چوری کی تو تکلیف گوارا کرنا ہی پڑے گی۔ کچھ بے ایمانی چار سو بیس بھی جھیلنی پڑے گی۔ آج کل یہی حربے کامیابی بخش رہے ہیں۔ دیکھنا ہے یہ کب تک چل سکے گا، یہ اکثریت کی سمجھ میں آتا جا رہا ہے کہ انسان اپنے اوپر بھروسا کرنا پڑے گا خاص طور پر لڑکیوں کو بس کمائو شوہر پر بھروسا کر کے زندگی گزارنے کی عادت بدلنا ہوگی۔ مرد کی کمائی پر شوق پورے کرنے کا وقت گیا والدین کو لڑکی کیا دیتی ہے جو وہ اس سے بیٹے جیسی محبت کریں۔ لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ لڑکیاں [illegible] مزاج، پڑھنے سے جی چراتی ہیں صورت شکل پر بھروسا کرتی ہیں۔ گھنے بالوں اور گوری رنگت کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ والدین پھر شوہر پر پھر بیٹوں کے رحم و کرم پر جیتے مرتے ہیں بغیر جد و جہد کے عیش کے نسخے تلاش کرتی ہیں۔

عشرت بیگم، چوڑ علی، (بہار)

س: خاتون مشرق کی تعریف کیا ہے؟

ج: خاتون مشرق مغرب پورب پچھم میں اتنا ہی فرق ہے سوائے اشتراکی ملکوں کے عورت اب بھی مرد کے برابر نہیں بس اتنی بات کام کی ہے باقی سب ڈھونگ ہے

س: بیوی کے لئے شوہر کے ساتھ دولت ہونا ضروری ہے؟

ج: دولت عمر سے آتی ہے۔ نوجوان لڑکے دولت چوری کالا بازاری یا عرب ممالک کی ریت پھانک کر ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ دولت چاہئے تو بڈھے عرب آج کل بہت آئے ہیں کچی کلیوں کی تاک میں حسینوں کی دولت کی مانگ نے ہمارے ملک کے نوجوانوں کو کس رخ موڑ دیا ہے۔ کتنا احساس کمتری پیدا کر دیا ہے خدا رحم کرے ان حسینوں کی ذہنیت پر۔ اگر آپ پاکستان کی خاص طور پر عورتوں کی لکھی کہانیاں پڑھیں تو ہوش ٹھکانے آجائیں۔

سرور عالم انصاری چھپرہ (بہار)

س: محبت ایک طوفان کی طرح دل میں کب آتی ہے؟

ج: جب سینے میں دل کی جگہ ایک سوکھا پتہ ہو

دیس پردیس کی خبریں

کالے یہودی
گورے یہودیوں سے تنگ

پچھلے دنوں دو ہزار حبشی یہودی اسرائیل کی راج دھانی تل ابیب میں احتجاج کے لئے نکل پڑے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے یہ لوگ نعرے لگاتے ہوئے ہوائی اڈے پر پہنچے اور کچھ دیر وہاں انتظار کرنے کے بعد منتشر ہو گئے۔ یہودی عورتیں اس جلوس میں پیش پیش تھیں۔

یہ حبشی یہودی ایتھوپیا کے رہنے والے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ دان قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ان بارہ قبیلوں میں سے ایک تھا جو دشتِ سینا میں راستہ بھول گئے تھے۔ یہ خود کو فلاشا کہتے ہیں۔ پچھلے سال یہ لوگ ایتھوپیا سے کوچ کر کے خاموشی سے سرحد کے پار سوڈان میں پہنچ گئے۔ سوڈان کی حکومت نے انہیں نظر بند کر دیا۔ اسرائیل کی یہ پالیسی ہے کہ ساری دنیا کے منتشر یہودی اسرائیل پہنچ جائیں۔ اس پالیسی کے تحت حبشی یہودیوں کو اسرائیل لے جایا گیا۔ اسرائیلی جہاز سوڈان کی حکومت سے چھپتے چھپاتے پناہ گزینوں کے کیمپ میں پہنچ گئے اور انہیں نکال لائے۔

حبشی یہودی اسرائیل تو پہنچ گئے، لیکن ان کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا۔ اسرائیل کے بڑے عالم نے فلاشا کا دعویٰ تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ۱۹۷۲ کا ہے۔ اس کے بعد عالموں کی پالیسی بدل گئی اور ان کو فلاشا میں نقص نظر آنے لگے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ فلاشا خالص یہودی نہیں ہیں۔ انہوں نے غیر مذہب میں شادیاں کی ہیں۔ اب انہیں دوبارہ مشرف بہ یہودیت ہونا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی انہیں خاص اور مکمل یہودی تسلیم کیا جائے گا۔ اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو یہودی عالم ان کی ختنہ، شادی اور موت کی رسمیں ادا نہیں کریں گے۔

یہودی عالموں کی یہ دھمکی بے
ثابت ہوئی۔ حبشی یہودیوں نے دوبارہ
مذہب قبول کرنے کی ضرورت سے انکار کر
انہوں نے کہا کہ ہم نے رات کی تاریکی میں اپ
گھر بار، دھن دولت چھوڑ کر اسرائیل کا رخ
ہے۔ ہم صرف اپنا دین ساتھ لائے ہیں۔ گور
رنگ اور نسل کی کوئی گنجائش نہیں ہم کالے
اس لئے ہمیں تنگ کیا جا رہا ہے۔ پھر ایک دا
نے جلوس نکالا اور ایرپورٹ پہنچ گئے اس
مطلب یہ تھا کہ وہ واپس جانے کے لئے تیار
انہوں نے کہا کہ گورے یہودیوں نے ہما
نام بدل ڈالے۔ ہمارے بچوں کو دقیانوسی اسک
میں بھرتی ہونے کا حکم دیا۔ ہمارے ساتھ غی
سا سلوک کیا۔ حبشی عورتوں کے ساتھ برا
کیا۔ ابھی تک اس مشکل کا حل نہیں نکلا
یہودی عالم اپنی ضد پر اڑے ہیں کہ حبشی یہو
کو دوبارہ یہودیت قبول کرنی پڑے گی۔

شادی کے وقت
بیٹا بھاگ گیا۔
دلہن نے سسر سے
شادی کر لی

حال ہی میں جدہ میں ایک دلچسپ
واقعہ پیش آیا۔ تفصیلات کے مطابق ایک نو
کے والدین اسے مجبور کر رہے تھے کہ وہ شا
کر لے لیکن وہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر انکا
کرتا رہا۔ تاہم والدین کے زیادہ اصرار پر ا
نے رضامندی ظاہر کر دی اور اس کے لئے د
کا انتخاب کر لیا گیا۔ اس کے باپ نے شادی

ہزار سعودی ریال خرچ کر دئے۔ عین شادی
روز دُولہا غائب ہو گیا۔ تحقیقات پر علم
وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے جس سے وہاں
صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ اس صورتِ حال
ابو پانے کے لئے دُولہا کے والد نے دلہن کے
سے جو اس کا بزنس پارٹنر بھی ہے کہا کہ اگر وہ اور
کی بیٹی رضامند ہوں تو وہ دُلہن سے شادی
لے گا۔ لڑکی نے رضامندی ظاہر کر دی اور
ہونے والے سُسر اور والد کے بزنس پارٹنر
شادی کر لی۔

ایک نئی کوآپریٹو سوسائٹی

مہاراشٹر کے شہر پُونا میں دیوداسیوں
کا بازار مشہور ہے۔ یہ جگہ بدھوار پیٹھ کہلاتی
ہے۔ دیوداسی ایک پرانی روایت ہے۔ پُرانے
زمانے میں لوگ اپنی بیٹیوں کو مندر میں بھیج دیا
کرتے تھے۔ وہ پروہت اور پُجاریوں کی
خدمت کرتی تھیں۔ آج دیوداسی کے دوسرے
معنی طوائف ہیں۔ دیوداسی بننے کے لئے ایک
لڑکی کو ۵۰۰ روپے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ نائیکہ اس
کی ضمانت دیتی ہے۔ مہاجن ۱۲ فی صد ماہانہ
سُود لیتا ہے۔ اب ۵۰۰ دیوداسیوں نے دس
ہزار روپے جمع کر کے اپنی کوآپریٹو سوسائٹی
بنائی ہے۔ یہ عورتیں اس روپیہ سے اپنا قرض
اُتاریں گی۔ کوآپریٹو کو بینک سے ۷ فی صد سُود
پر روپیہ قرض مل سکتا ہے۔ اس کے بعد
ان عورتوں کو سینا پرونا۔ پاپڑ اور چٹنی بنانا سکھایا
جائے گا تاکہ وہ یہ پیشہ چھوڑ کر شریفانہ زندگی
گزاریں۔

بچّے کو دُودھ پلاؤ ورنہ بائیکاٹ!

صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے اعلان
کیا ہے کہ جو عورتیں اس وجہ سے بچّے کو اپنا دودھ
نہیں پلاتیں کہ ان کا جسم بھدّا ہو جائے گا ان کا
سماجی بائیکاٹ کر دینا چاہئے۔

امریکن عورت ایک نئے میدان میں

گزشتہ دنوں کیتھی سلیوان خلا میں
پیدل چلنے والی پہلی امریکی خاتون بن گئی۔ امریکہ
کا ایک خلائی جہاز خلا میں [illegible] تھا کہ
اس میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی۔ [illegible] کرنے
کے لئے دو مستری خلا میں بھیجے گئے۔ ان میں
ایک کیتھی تھی۔ یہ دونوں ایک چھوٹے سے
خلائی جہاز میں بیٹھ کر فضا میں پہنچے۔ انہوں
نے مرمّت طلب جہاز کے قریب پہنچ کر اپنا
جہاز چھوڑ دیا۔ اور بڑے جہاز کی مرمّت میں
لگ گئے۔ اس جہاز کا نام چیلنجر ہے۔ دونوں
نے فضا میں موسم کی خرابیوں سے بچنے کے لئے
خاص فضائی سُوٹ پہنے تھے۔ ایک سُوٹ کی
قیمت ۲۵ لاکھ روپے ہے۔ یہ سُوٹ ان کو
ریڈیائی لہروں، شدّت کی سردی اور گرمی
اور چھوٹے موٹے شہابِ ثاقب سے بچاتے ہیں
فضا میں شہابِ ثاقب دوڑتے پھرتے ہیں
یہ سورج کی گرمی سے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ لیکن
جہاز سے باہر نکل کر چلنے والوں کو ان سے خطرہ
لگا رہتا ہے۔ چونکہ فضا میں کششِ ثقل نہیں
ہے۔ اس لئے وہاں انسان کے نیچے گرنے کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خلاباز خود کو جہاز کے
ساتھ ایک تار سے باندھ لیتا ہے۔ اس تار
کو کھینچنے سے انسان جس طرف چاہے خود کو
موڑ سکتا ہے۔ کیتھی دراصل دنیا کی دوسری
خلاباز عورت ہے جس نے فضا میں چہل قدمی
کی ہے۔ اس سے پہلے روس کی سوتیلانا یہ
[illegible] انجام دے چکی ہے۔ سوتیلانا نے
جولائی ۱۹۸۴ میں ۳ گھنٹے تک خلا میں ایک
جہاز کی مرمّت کی تھی۔ مرمّت میں ویلڈنگ
اور ٹانکہ لگانے کا کام شامل تھا۔

ہمیں محافظ کی ضرورت نہیں

امریکہ میں ایک سروے کے مطابق
۷۵ فی صد عورتوں کو اپنی حفاظت کے لئے مرد
کی ضرورت نہیں۔ اگر بازار میں کوئی ان کا پرس
چھین لے تو وہ اس کا پیچھا کر کے اپنا پرس واپس
لے سکتی ہیں۔ راہ چلتے کوئی مرد ان کو چھیڑے
تو اسے جواب دے سکتی ہیں۔ کوئی غنڈا ہاتھا
پائی پر اتر آئے تو کھیل بازی کے جوہر بھی
دکھا سکتی ہیں۔ دس سال پہلے جو سروے کیا
گیا تھا، اس میں ایسی عورتوں کی تعداد ۹ فی صد
تھی۔

اس کے علاوہ امریکہ کی عورتوں میں
تیز رفتار اسپورٹس کار چلانے کا شوق بھی
بڑھ گیا ہے۔ پہلے یہ شوق مردوں تک محدود
تھا۔ اب ان تیز رفتار کاروں کے خریداروں
میں ۱۰ فی صد عورتیں شامل ہیں۔

باورچی خانہ

کورین گوشت

گوشت (سینے کا) : ۵۰۰ گرام
گاجر : ۳ عدد
میدہ : ۲ ٹیبل اسپون
ٹماٹر کیچپ : ۳ ٹیبل اسپون
چلغوزے (چھلے ہوئے) : پاؤ پیالی
ٹماٹر (درمیانہ سائز) : ۳ عدد
انناس : ۲ ٹکڑے
تل : آدھا چائے کا چمچہ
اجوائن : ایک چٹکی
ہری مرچ : ۵ عدد
پیاز (درمیانہ سائز) : ۳ ڈلی
لہسن : ایک چائے کا چمچہ
گھی : آدھی پیالی
نمک : حسبِ ذائقہ

گوشت کو دھولیں۔ پھر اس پر آدھا ٹماٹر کیچپ، نمک اور لہسن مل کر آدھے گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ پیاز اور گاجروں کو چھیل لیں پھر پیاز کا کچومر کاٹ لیں گاجروں کو موٹے کدوکش میں کس لیں ٹماٹر اور ہری مرچوں کو دھولیں پھر ٹماٹروں کا کچومر کاٹ لیں ہری مرچوں کے چھلکے کاٹ لیں۔

ایک دیگچی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہو جائے تو اس میں گوشت ڈال کر خوب بھونیں۔ گوشت سرخی مائل ہو جائے تو اس میں پیاز، گاجر، ہری مرچ، اجوائن، تل اور نمک ڈال دیں اور مزید دو چار منٹ بھونیں، پھر میدہ اور باقی ٹماٹر کیچپ بھی اس میں شامل کر دیں۔ دو چار منٹ بھون کر گلنے کے اندازکا پانی ڈال دیں۔ گوشت گل جائے اور پانی بھی تقریباً خشک ہو جائے تو چلغوزے اور ٹماٹر ڈال دیں ٹماٹروں کا پانی بھن جائے تو دیگچی کو آنچ سے اتار لیں۔
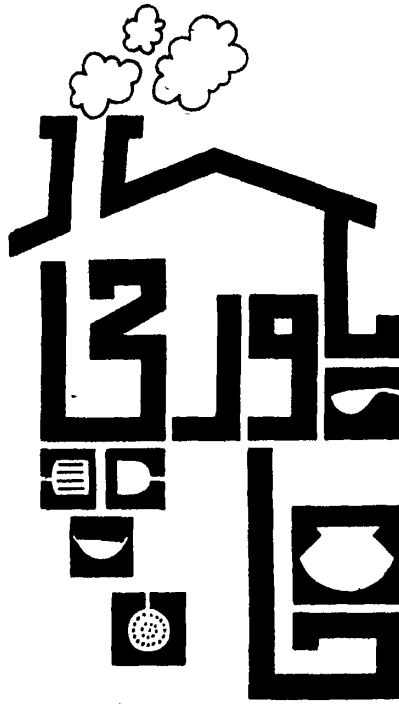
ڈش میں نکالنے کے بعد اس پر انناس کے ٹکڑے سجا دیں۔

بیگن کا بھرتہ

بیگن : ۵۰۰ گرام
دھنیا (ثابت) : ۱ چائے کے چمچے
خشخاش (ثابت) : ۲ چائے کے چمچے
ناریل کا برادہ : ۲ ٹیبل اسپون
لال مرچ (کٹی ہوئی) : ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ہلدی : پاؤ چائے کا چمچہ
ادرک : آدھا انچ کا ٹکڑا
لہسن : ۸ جوے
پیاز (درمیانہ سائز) : ۲ ڈلی
ہرے پودینے کی پتیاں : ۲ ٹیبل اسپون
لیموں کا عرق : ایک ٹیبل اسپون
سرسوں کا تیل : پونی پیالی
نمک : حسبِ ذائقہ

بیگن دھو کر ان کے چار چار ٹکڑے کر لیں پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ لہسن چھیل لیں۔ دھنیا، خشخاش، اور ناریل کے برادہ کو سل پر گیلا پیس لیں۔ ادرک چھیل کر باریک کچومر کاٹ لیں۔

کڑھائی میں پیاز کے لچھے، لہسن کے جوے اور تیل ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز بادامی ہو جائے تو پیاز اور لہسن تیل سے نکال کر کچومر کر لیں اور تیل میں پسے ہوئے گیلے مسالے لال مرچ ہلدی اور ادرک ڈال کر ایک دو منٹ بھون لیں، پھر بیگن ڈال دیں اور چمچہ چلاتی رہیں۔ پانچ سات منٹ بعد نمک، پیاز اور لہسن کا کچومر بھی ڈال دیں چمچہ برابر چلاتی رہیں بیگن اچھی طرح بھن جائیں اور بھرتہ بن جائے تو پودینے کی پتیاں اور لیموں کا عرق ڈال کر آنچ سے اتار لیں۔

ٹرائفل پڈنگ

دودھ : ایک لیٹر
کیلے : ۲ عدد
سیب : ایک عدد
کسٹرڈ پاؤڈر : ۴ ٹیبل اسپون
جیلی (لال رنگ) : ایک پیکٹ
سیب کا جام : ۲ ٹیبل اسپون

ترتیب و تزئین:

رشیدہ خاتون

کیک : (بڑا سائز) ایک عدد
: ۵۰ گرام
: ایک پیالی

دودھ کو جوش کر کے اس میں چینی ڈال کر لیں۔ ایک پیالی دودھ ٹھنڈا کر کے اس سٹرڈ گھول لیں۔

سیب کو چھیل کر گول گول قتلے کاٹ لیں۔ ں کو چھیل کر اس کے بھی گول گول قتلے کاٹ لیں

ایک شیشے کی بڑی ڈش میں کیک کا ایک رکھ دیں۔ اس پر تھوڑا سا گھلا ہوا جام پھیلا دیں س پر تھوڑے سے سیب کے قتلے تھوڑے ے قتلے پھیلا دیں پھر اس پر تھوڑا کسٹرڈ پھیلا کر دیں۔ کسٹرڈ پر دوسرا ایک کا ٹکڑا رکھ پھر اس پر گھلا ہوا جام پھیلا دیں۔ پھر سیب یلے کے قتلے پھر کسٹرڈ، کسٹرڈ پر اسی طرح ب کا تیسرا ٹکڑا رکھ کر اسی طرح باقی کی تمام یں پھیلا دیں۔ اور ڈش کو ٹھنڈا کرنے کے ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔

کریم کو ایک بیٹرے سے ہلکا سا پھینٹ ں تاکہ اس میں تھوڑا سا گاڑھا پن آجائے۔

پڈنگ ٹھنڈی ہو جائے تو جیلی کی پلیٹ بھاپ پر ہلکا سا گرم کر لیں تاکہ وہ پلیٹ سے ک ہو جائے گھلے نہیں پھر جیلی کو پڈنگ پر کھ دیں پھر جیلی پر چمچے سے تھوڑی تھوڑی وری پر ایک ایک چمچہ کریم ڈال دیں پھر پڈنگ دوبارہ ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔

نوٹ: پڈنگ کو کھانے سے پانچ ات منٹ پہلے ریفریجریٹر سے نکالیں۔

اروی چنے کی دال

اروی (چھوٹا سائز) : ۲۰۰ گرام
دال چنا : ۲۰۰ گرام
لال مرچ : ڈیڑھ چائے کا چمچہ
دھنیا : ایک چائے کا چمچہ
ہلدی : پاؤ چائے کا چمچہ
گرم مسالہ : پاؤ چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانہ سائز) : ایک ڈلی
ہرے دھنیے کی پتیاں : ایک ٹیبل اسپون
گھی : پونی پیالی
نمک : حسب ذائقہ

دال کو صاف کر کے دھو لیں پھر ایک گھنٹے کے لئے بھگو دیں۔ ارویوں کو چھیل کر دھو لیں پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔

ایک دیگچی میں پیاز کے لچھے اور گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں، پیاز بادامی ہو جائے تو اس میں لال مرچ، دھنیا، ہلدی، نمک اور پاؤ پیالی پانی ڈال کر مسالہ بھون لیں پھر مسالے سے آدھا گھی نکال کر رکھ لیں پھر اروی ڈال دیں اور دو چار منٹ بھون لیں پھر دال اور اروی گلنے کے اندازے کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں۔

دونوں چیزیں گل جائیں تو مسالے والا گھی اور گرم مسالہ ڈال کر آنچ سے اتار لیں۔

ڈش میں نکالنے کے بعد ہرے دھنیے کی پتیاں چھڑک دیں۔

گوشت اور سبزیوں کا سوپ

گوشت (قیمہ موٹا موٹا) : ۵۰۰ گرام
گاجر : ۲ عدد
مٹر : ۱۰۰ گرام
شلغم : ایک عدد
: ۲ ڈلی
ادرک : ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن : ۴ جوے
دار چینی : آدھے انچ کا ٹکڑا
کالی مرچ : آدھا چائے کا چمچہ
کارن فلور : ایک چائے کا چمچہ
مکھن : ۲ چائے کے چمچے
نمک : حسب ذائقہ

گوشت کو دھو لیں۔ گاجر، شلغم اور پیاز کو چھیل کر کچھ کر کاٹ لیں۔ ادرک چھیل کر چار ٹکڑے کر لیں۔ مٹر کے دانے نکال لیں۔

ایک دیگچی میں گوشت کٹی ہوئی سبزیاں مٹر، پیاز، ادرک، لہسن، دارچینی، نمک اور دس پیالی پانی ڈال کر تیز آنچ پر رکھ دیں پکنے لگے تو آنچ دھیمی کر دیں، سبزیاں اور گوشت گل جائیں تو آنچ سے اتار کر سوپ کو چھلنی میں چھان لیں، پھوک پھینک دیں۔

ایک دیگچی میں مکھن ڈال کر آنچ پر رکھ دیں مکھن گرم ہو جائے تو کارن فلور، سوپ اور کالی مرچ ڈال دیں۔ چمچہ چلاتی رہیں سوپ میں گاڑھا پن آجائے تو آنچ سے اتار لیں اور گرم گرم ہی پینے کے لئے پیش کر دیں۔

سعدیہ صاحبہ:

آپ کی "نانی اماں" سے بھی ہمیں ایک خاص لگاؤ اور عقیدت سی ہوتی جا رہی ہے لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ ان کا ذکر پابندی سے ہونا چاہیے۔

بانو: اگست میں آپ کا سفرنامہ بھی بہت اچھا لگا۔ اس میں مشرقیت کا حسن اور پاکیزگی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یہ مختصر سفرنامہ کئی ضخیم سفرناموں پر بھاری ہے جو پچھلے چند برسوں میں شائع ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان سفرناموں میں ایک قسم کا احساسِ کمتری جھلکتا ہے۔ جب کہ آپ کا سفرنامہ اس نقص سے پاک ہے۔

ش صغیر ادیب بلیک برن (یو۔کے)

پیاری بہن:

اگست کا شمارہ نظروں سے گزرا۔ سارے مضامین اچھے لگے "میرا پسندیدہ شعر" "خیال اپنا اپنا" "کہنی سُنی" "تبسم" کے کالم اور آپ کا مضمون "سفرنامہ" تو خوب سے خوب تر رہے۔

احسان بھٹی لپور

محترمہ:

بانو: اگست نظر نواز ہوا۔ "وہ یادگار دن" پڑھ کر زبان سے واہ! نکلی۔ افسانوں میں یوں تو سب ہی ٹھیک رہے، "بگڑ ادھار کی زندگی" میں چھوٹی بہو کے ساتھ جو سلوک گھر والے کرتے تھے، اسے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک نواب خاندان میں اتنا ظلم بہو پر ہو اور شوہر کچھ بھی نہ بولے، جب کہ وہ بزنس کرتا ہے اور سوتیلا یا گونگا بھی نہیں ہے۔ مضمون "جودھا بائی اور نور جہاں" کے بارے میں پڑھ کر آگاہی میں اضافہ ہوا کہ تواریخ میں جودھا بائی ایک نہیں، دو ہوتی ہیں۔ بیوٹی کالج میں اس بار سانس کی جو ورزش بتائی ہے وہ آسان بھی ہے اور مفید بھی۔

فیض ایم صدیقی، جے پور

عزیزہ سعدیہ:

بانو: اگست ملا تو حسبِ عادت پہلے افتتاحیہ پڑھا، جس نے بہت متاثر کیا۔ میں اور میری اہلیہ کی جانب سے مبارک باد قبول فرمائیے۔

ضیاء الحق، انیسر

پیاری بہن:

بانو: اگست کا ملا۔ افتتاحیہ اس بار ... آپ کا ...

... ترقی عطا کرے۔ ...

ہوا۔ میں جالندھر کے علاقے میں ہوں، جہاں سیلاب سے تباہی اتنی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ واقعی بقول آپ کے افتتاحیہ فقرے کے ...

... کا اتفاق ہوا ...

محترمہ:

بانو میں آپ نے ادبی مواد کے ساتھ ...

بھی خوب لگا اس میں پیار نمک ڈال پھر میدہ کر دو پانی

بارہ ہزار روپے کا پہلا انعام بارہ درست حلوں پر تقسیم کیا گیا

صحیح حل شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۷

■	■	ہ	ب	ا	ذ	د
■	■	و	گ	ک	ا	و
م	ہ	■	ش	ل	ل	س
ا	د	چ	■	ی	ن	ر
ت	ر	ط	ف	■	ے	و
ح	ر	ط	س	ا	■	ن
ت	ا	س	ا	ی	ق	■

...معمہ نمبر ... اعلان ... درست حلوں ... مبلغ بارہ ہزار روپے ... شمع مینی معموں کی ... بے مثال ہے — ... ظاہر کئے جانے کے ... میں تقسیم انعامات ... کا اعلان کر دیا گیا۔ ... نے صحیح حل بھیجنے ... نے بھیجے تھے، انہیں ... کی تفصیلات بھی لکھ دی گئیں۔ دوبارہ جانچ کے لئے کسی کلیم کا انتظار ... پہلے انعام کے چیک اور دوسرے انعام کے منی آرڈرز بھیج دیئے گئے۔

درست حل بارہ وصول ہوئے، جن پر پہلا انعام مبلغ بارہ ہزار روپے بحساب ایک ہزار روپے فی حل تقسیم کیا گیا:

...شاہ صاحب ولد محمد اسماعیل صاحب پٹیل نزد مہاراج فلور مل تعلقہ نلنگہ ضلع لاتور

...یہ مشتاق صاحبہ بنت مشتاق احمد صاحب بٹ، ترال ۱۹۲۱۲۳ کشمیر

...کے سیٹھی صاحب، سیکریٹری۔ اے منسٹری آف شپنگ اینڈ ٹرانسپورٹ، (روڈ ونگ) ٹرانسپورٹ بھون، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

...یہ خان صاحبہ معرفت سلیم الزماں خاں صاحب ایڈووکیٹ، روشن گنج، شاہجہانپور

...بورام صاحب ویدیق، محلہ مالویہ نگر نزد پہاڑیہ کی چکی، قصبہ کونچ ضلع جالون ۲۸۵۲۰۵

...عبدالصمد صاحب، مکان نمبر ۵-۳۰-۴-۱۱ - بازار گھاٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

...ایم۔ ڈار صاحب، سرائے صفا کدل، سری نگر ۱۹۰۰۰۲ کشمیر

...عبدالکریم صاحب مستری۔ محلہ سفینہ چاند، پیلی بھیت

...نار احمد خاں صاحب معرفت نیو میئر کٹنگ سیلون، بھیٹی روڈ، راؤنڈ کیلا ۱

...بین داس صاحب، ٹی للوانی ۲۶-۲۵ - پرپا پروڈکٹس نیو مل شوپنگ سینٹر، شواجی چوک، الہاس نگر ۴۲۱۰۰۳

...جی۔ محی الدین پیران صاحب ۱۲-۱-۱۰ (بالاخانہ) UPSTAIRS سوامی ریڈی اسٹریٹ، چتوڑ

...کے سیٹھی صاحب، سیکریٹری۔ اے منسٹری آف شپنگ اینڈ ٹرانسپورٹ، (روڈ ونگ) ٹرانسپورٹ بھون، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

...غلطی والے، ۱۹۷ حل وصول ہوئے، جن پر دوسرا انعام مبلغ آٹھ ہزار روپے بحساب ۴۰ روپے ۵ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا:

...نفیرہ بیگم بمبئی ۲ - رام بہاری لال، دہلی ۳ - وجے کمار، نئی دہلی ۴ - وجے کمار ... ۵ - قمرالدین، امروہہ ۶ - قمرالدین، امروہہ ۷ - پرمود کماری، دہلی ۸ - ...عین، امروہہ ۹ - محمد نور عین، امروہہ ۱۰ - امیر احمد، امروہہ ۱۱ - علی ... امروہہ ۱۲ - بھگوان داس نئی دہلی ۱۳ - حبیبہ بیگم، حیدرآباد ۱۴ — ...، حیدرآباد ۱۵ - سُدیش، نئی دہلی ۱۶ - سُدیش، نئی دہلی ۱۷ - حمیدالدین، دہلی ... امروہہ ۱۹ - کرشنا دیوی، نئی دہلی ۲۰ - تقی الدین، حیدرآباد ۲۱ - محمد حسین، ... ایم۔ ایل۔ بھاٹیہ، دہلی ۲۳ - ایچ۔ کے۔ اکبر، نئی دہلی ۲۴ - نرگس بیگم، دہلی ... امروہہ ۲۶ - خورشید احمد، جودھپور ۲۷ - شجاع الرحمٰن، دہلی ۲۸ - ... دہلی ۲۹ - شجاع الرحمٰن، دہلی ۳۰ - فرقان احمد، دہلی ۳۱ - امیر احمد، امروہہ ... پیلی بھیت ۳۳ - ایم۔ فاروق، پیلی بھیت ۳۴ تا ۳۶ - اے۔ اے صدیقی ... اجے کمار، نئی دہلی ۳۸ - حارث عثمانی، امروہہ ۳۹ - حبیب احمد، ۴۰ - محمد عارف، پھلاؤدہ ۴۱ - شائستہ تنویر، دہلی ۴۲ - آر۔ یو۔ خاں، ... آر۔ یو۔ خاں، شاہجہانپور ۴۴ - عبدالحمید، سری نگر ۴۵ - شاکر علی، ... امروہہ ۴۷ - شمیم احمد، امروہہ ۴۸ - شمیم احمد، امروہہ ۴۹ - شیخ مقبول

...جموں ۵۳ - تزین اہرول، جموں ۵۴ - غلام رسول، ... ۵۶ - شاہد جمال، فیض آباد ۵۷ - ایس۔ آر۔ سنگا ریڈی، چنڈی گڑھ ۵۸ - جمیلہ بنو، سری نگر ۵۹ - جسوندر سنگھ، چنڈی گڑھ ۶۰ - نسیم فاطمہ، امروہہ ۶۱ - نبی بیگم، حیدرآباد ۶۲ - صادقہ بیگم، حیدرآباد ۶۳ - شرف الزماں، دھنباد ۶۴ - محی الدین، حیدرآباد ۶۵ - نرنجن ناتھ، سری نگر ۶۶ - خلیل احمد، بھیونڈی ۶۷ - کشور رو دام، غازی پور ۶۸ - ترلوک سیٹھی، جودھپور ۶۹ - حسینہ شیخ، رونتی پورہ ۷۰ - اطہر بیگ، بمبئی ۷۱ - مقیم، دھنباد ۷۲ - لاڈلی بیگم، دھنباد ۷۳ - تمیم چند، رام پور ۷۴ - رویندر کتیال، مراد آباد ۷۵ - رویندر کتیال، مراد آباد ۷۶ - ایم۔ اے مجید، حیدرآباد ۷۷ تا ۷۹ - محمد پاشاہ، نیلنگہ ۸۰ - اوم تنکر، مراد آباد ۸۱ - ایم۔ وائی۔ صوفی، سری نگر ۸۲ - ایم۔ وائی صوفی، سری نگر ۸۳ - اختر حسین، جمشید پور ۸۴ - کرشن لال، جلال ۸۵ - اوم پرکاش، سری نگر ۸۶ - اوم پرکاش، سری نگر ۸۷ - سجاد حسین، نجیب آباد ۸۸ - عابد حسین، پٹنہ ۸۹ - عثمان بابو، بھیونڈی ۹۰ - عثمان بابو، بھیونڈی ۹۱ - نرنجن ناتھ، سری نگر ۹۲ - محمد یوسف، حیدرآباد ۹۳ - کمال احمد، دھام پور ۹۴ - محمد نظام الدین، جھریا۔ ۹۵ - جی۔ ایس۔ گاندھی، چنڈی گڑھ ۹۶ - جنید احمد، رام نگر ۹۷ - حمیداللہ، رائچور ۹۸ - نوشاد علی، جھری تلیا ۹۹ - فرحت بیگم، مونگیر ۱۰۰ - اشرف، کتراس گڑھ ۱۰۱ —— عنبرینہ مشتاق، ترال ۱۰۲ - ابوالخیر احمد، چترلپور ۱۰۳ - محمد وصی، غازی پور ۱۰۴ تا ۱۲۱ - کے۔ کے۔ سیٹھی، نئی دہلی ۱۲۲ - معروف حسن، شاہجہاں پور ۱۲۳ - رابعہ اسلام، سہارنپور ۱۲۴ - کے۔ ایم۔ ایم۔ حامد، حیدرآباد ۱۲۵ - عبدالغفور، بمبئی ۱۲۶ - آر۔ ملیشم —— سنگا ریڈی ۱۲۷ - بالو رام، کسنج ۱۲۸ - بالو رام، کوریج ۱۲۹ - بالو رام، کوریج ۱۳۰ —— رحیم النسا، کرنول ۱۳۱ تا ۱۳۸ - سعدیہ خاں، شاہجہاں پور ۱۳۹ - اعجاز احمد، سرا ۱۴۰ - محمد اسلم، الہ آباد ۱۴۱ - محمد فیاض، شولاپور ۱۴۲ - انوار الدین، بھاگلپور ۱۴۳ تا ۱۴۸ فریدہ محمد حسین، بھیونڈی ۱۴۹ تا ۱۵۰ - اسرار محمد حسین، بھیونڈی ۱۵۱ تا ۱۵۵ - مینو بھابڑوواج استھر ۱۵۶ - ایس۔ داوے صاحب، کڈپہ ۱۵۷ - محمد حسین، اودے پور ۱۵۸ - انور علی بستی ۱۵۹ - بیرلال شرما، گورداسپور ۱۶۰ - عبدالرب، ناگپور ۱۶۱ تا ۱۶۶ - جنید احمد، رام نگر ۱۶۷ - نثار احمد، راؤنڈ کیلا ۱۶۸ - انور حسین، لیا ۱۶۹ - عبدالقادر، کڈپہ ۱۷۰ - محمد احسن، بنگلور ۱۷۱ - امان اللہ، رانچی ۱۷۲ - محی الدین پیران، چتوڑ ۱۷۳ - ایم۔ قمر، الہ آباد ۱۷۴ - رام ناتھ، فیروز پور ۱۷۵ - عرفات احمد، چھپرہ ۱۷۶ - سراج الدین، وانمباڑی ۱۷۷ - رحیم النسا، چتوڑ ۱۷۸ تا ۱۸۲ - چمن داس، الہاس نگر ۱۸۳ تا ۱۹۲ - محی الدین پیران، چتوڑ ۱۹۳ - شمس الدین، بستی پور ۱۹۴ - احمد حسین، جمشید پور ۱۹۵ - ابوالحسن، حیدرآباد ۱۹۶ - حارث عثمانی، امروہہ ۱۹۷ - رخسانہ پروین، برونی

●●

● تمام حلوں کی جانچ نہایت احتیاط سے کی گئی ہے پھر بھی اگر آپ کو شبہ ہے کہ آپ کو کوئی انعام ملنا چاہیئے تھا۔ اور آپ کو ابھی تک منی آرڈر نہیں ملا تو دوبارہ جانچ کی فیس ایک روپیہ منی آرڈر سے "شمع مینی معمہ" ماہ نامہ شمع آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ کو بھیج کر اس کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید یا ایک روپے کے حساب سے جاری کئے گئے نقد نامے کے ساتھ کلیم سیکشن "شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۷" ماہ نامہ شمع آصف علی روڈ نئی دہلی کو اپنی شکایات لکھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر کریں کہ آپ نے شمع مینی معمہ نمبر ۱۱۷ کے کتنے حل بھیجے تھے۔ سادہ ڈاک سے ریکارڈڈ ڈیلیوری، رجسٹری سے بھیجے تھے یا دستی طور پر دفاتر شمع نئی دہلی میں ڈالے تھے اور متعلقہ حل کی فیس کس کس نمبر کے منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد نامہ سے کس تاریخ کو بھیجی تھی اور تقسیم انعامات سے متعلق آپ کی شکایت کیا ہے اگر آپ کی شکایت درست ہوئی تو آپ کو انعام دیا جائے گا اور دوبارہ جانچ کی فیس کا ایک روپیہ بھی واپس کر دیا جائے گا۔ اگر شکایت غلط ہوئی تو دوبارہ جانچ کی فیس ایک روپیہ واپس نہیں کی جائے گی۔ ہر حل کے بارے میں شکایت الگ آنی چاہیئے اور اس کی فیس بھی الگ ادا کرنی ضروری ہے۔ اپنی شکایت کے بارے میں یہ ضرور بتائیے کہ یہ ...س حل کے بارے میں ہے جس کی فیس ... نمبر کے منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد نامے کے ذریعے ادا کی گئی ہے۔ ایسی تمام شکایات ۱۲۔ اکتوبر ۸۵ء تک مل جانی چاہئیں۔

حوالے: شمع مینی معمہ ۱۱۷ کے اشارے جن کتب سے اخذ کئے گئے تھے، ان کے نام یا ان کے قلم کاروں کے مختصر نام یہ ہیں: اوپر سے نیچے: ۱- محمود ۲- عزیز ۳- حسین ۴- بشرا ۵- دیوانِ غالب دائیں سے بائیں: ۱- ۶- دیوانِ غالب ۷- یوسف ۸- انصاری ۹- جلیل ۱۰- شاکر۔

سعدیہ صاحبہ :

آپ کی "نانی اماں" سے مجھی ہمیں ایک خاص لگاؤ اور عقیدت سی ہوتی جا رہی ہے لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ ان کا ذکر پابندی سے ہونا چاہیے۔

بانو : اگست میں آپ کا سفرنامہ بھی بہت اچھا لگا۔ اس میں مشرقیت کا حُسن اور پاکیزگی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یہ مختصر سفرنامہ کئی ضخیم سفرناموں پر بھاری ہے جو پچھلے چند برسوں میں شائع ہوئے ہیں۔ کیوں کہ ان سفرناموں میں ایک قسم کا احساسِ کمتری جھلکتا ہے۔ جب کہ آپ کا سفرنامہ اس نقص سے پاک ہے۔

ش صغیر ادیب بلیک برن
(یو۔ کے)

پیاری بہن :

اگست کا شمارہ نظروں سے گزرا سارے مضامین اچھے لگے "میرا پسندیدہ شعر" "خیال اپنا اپنا" "کہنی سنی" "تبسم" کے کالم اور آپ کا مضمون "سفرنامہ" تو خوب سے خوب تر رہے۔

احسان بمبئی پور

محترمہ :

بانو میں آپ نے ادبی مواد کے ساتھ دیگر مواد بھی شامل کر کے بانو کو فقط خواتین کے لئے محدود نہیں رکھا۔ سعدیہ دہلوی کا وہ یادگار دن ... روحانیت کی اس طاقت سے روشناس کراتا ہے جسے ہم صرف محسوس کر سکتے ہیں اور انسر بانو کا پنجاب سے متعلق باتصویر فیچر بھی پسند آیا "المناک دورہ" اور "سیلاب" بہت خوب تھے ... میں جیسا کہ ذاتی طور پر ... کا شاہد ہوں۔ اس لئے اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ میں جالندھر کے علاقے میں ہوں، جہاں سیلاب سے تباہی اتنی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ واقعی بقول آپ کے افتتاحیہ فقرے کے "ان کا تو اللہ ہی مالک ہے"۔

رام پال، (پنجاب)

محترمہ سعدیہ صاحبہ :

کافی وقفے کے بعد بانو پڑھنے کا اتفاق ہوا مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ کیا یہ وہی جریدہ ہے جسے میں نے چند برس قبل دیکھا تھا۔ بلاشبہ اس نکھار اور حسنِ ترتیب کو برقرار رکھیں۔

اشفاق احمد شیدا، ہوڑہ۔

بانو : ...
پڑھ کر زبان سے ... سب ہی ٹھیک رہے ... میں چھوٹی بہو کے ساتھ جو سلوک گھر والے کرتے تھے، اسے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک نواب خاندان میں اتنا ظلم بہو پر ہوا اور شوہر کچھ بھی نہ بولے، جب کہ وہ بزنس کرتا ہے اور سوتیلا یا گونگا بھی نہیں ہے۔ مضمون "جودھا بائی اور نور جہاں" کے بارے میں پڑھ کر آگاہی میں اضافہ ہوا کہ تواریخ میں جودھا بائی ایک نہیں، دو ہوئی ہیں۔ بیوٹی کالج میں اس بار سانس کی جو ورزش بتائی ہے وہ آسان بھی ہے اور مفید بھی۔

فیض ایم صدیقی، جے پور

عزیزہ سعدیہ :

بانو : اگست ملا تو حسبِ عادت ... افتتاحیہ پڑھا، جس نے بہت متاثر کیا ... اور میری اہلیہ کی جانب سے مبارک باد قبول فرمائیے۔

ضیاء الحق، نیسر

پیاری بہن :

بانو : اگست کا ملا۔ افتتاحیہ اس بار سبق آموز اور کارآمد رہا۔ آپ کا سفرنامہ "یادگار دن" اتنا پسند آیا، اتنا پسند آیا کہ ... نہیں۔ خدا آپ کے قلم کو دن دونی رات ترقی عطا کرے۔ دوسرے افسانے اور مضامین بھی اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں۔

یاسمین سلیم، آمبور

20,000.00

بیس ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام بالکل درست حل پر: بارہ ہزار روپے، دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: آٹھ ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعے ادا کی جاسکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر، یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حقدار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ہفتہ، ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۸۵، آٹھ بجے رات تک پیر ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۸۵ تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کر لئے جائیں گے۔

پہلا انعام:

بارہ ہزار روپے نقد

یا ایک ۵۱ سینٹی میٹر کا

رنگین ٹی وی اور

تین ہزار روپے نقد

دوسرا انعام:

آٹھ ہزار روپے

شمع منی معمہ نمبر ۱۱۹

	ن	و	م	س	ح	۱م
		ا	ی	ا	کھ	۲د
ل	و		س	ص	س	۳س
ا				ے	جھ	۴س
	س					۵ک
ل	ہ	ا	بھ	۶تھ		
ا	ا	س	ی	ا		

اشارے:

دائیں سے بائیں:

۱۔ ــــ کو سوسائٹی سے الگ کرکے جیل خانوں میں بند کر دینے سے سماج کی ذمہ داری پوری نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد

۲۔ گاندھی جی نے اپنے قول و فعل سے یہ ــــ کہ اونچی اور نیچی جاتیوں کا فرق ماننا درست نہیں

۳۔ تمہاری طرح ــــ کے جینا ہمیں قبول نہیں۔ بہادروں کی طرح مار دیا مر جاؤ

۴۔ غریبی نے مجھے بہت ٹھوکریں کھلائی ہیں۔ میں چاہتا ہوں اب ــــ اور ٹھوکریں کھانی نہ پڑیں۔ اسی لئے

۵۔ عشق نے پکڑا نہ تھا غالب!
ابھی وحشت کا ــــ رنگ

اوپر سے نیچے:

۶۔ رہ گیا ــــ دل میں جو کچھ ذوقِ خواری
ہائے ہائے!

۷۔ امن کی پیشکش ــــ تک مناسب ہے۔ لیکن ایک دفعہ توپیں آگ اگلنے لگیں پھر

۸۔ کسی کو اس کے منہ پر ــــ کہہ دینا شریفوں کا شیوہ نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا

۹۔ میری نظر میں اس جاپانی سپاہی کی عزت بڑھ گئی۔ وہ اپنے ملک کے لئے ــــ تھا اور میرے لئے جنگ صرف ملازمت

۱۰۔ زندگی میں اچھا اور برا، صحیح اور غلط سفید اور سیاہ الگ الگ نہیں ہوتے سب کچھ اس طرح ــــ ہوتا ہے کہ پہچان مشکل ہو جاتی ہے

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔

★ آپ ہر حل پر انعام کے حقدار بن سکتے ہیں ــــ فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ۔

★ صرف دس اشارے

★ انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جاسکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

★ صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوائیے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھیے۔

★ شمع منی معمہ نمبر ۱۱۹ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور دسمبر ۱۹۸۵ کے ماہ نامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

۲...۱

شمع ادبی معمے (شمع منی معمہ نمبر ۱۱۹) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی

شمع منی معمہ نمبر ۱۱۹ کا صحیح حل: بدھ، ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۸۵ کو صبح دس بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام والوں کے نام ماہ نامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع: دسمبر ۱۹۸۵ میں بھی شائع کی جائیں

BANO New Delhi 38th Year of Publication ISSUE NO. [illegible] Price Rs. 4/-
Registered with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 741/57 Regd. No. D-(C) 120

نومبر

میری بیوی سے بچاؤ :
دوسرا رخ

بھیڑیا عورت کی داستان

بچوں کو نفسیاتی
...ں سے بچایئے

...ورجہاں کا

افسانہ : بین
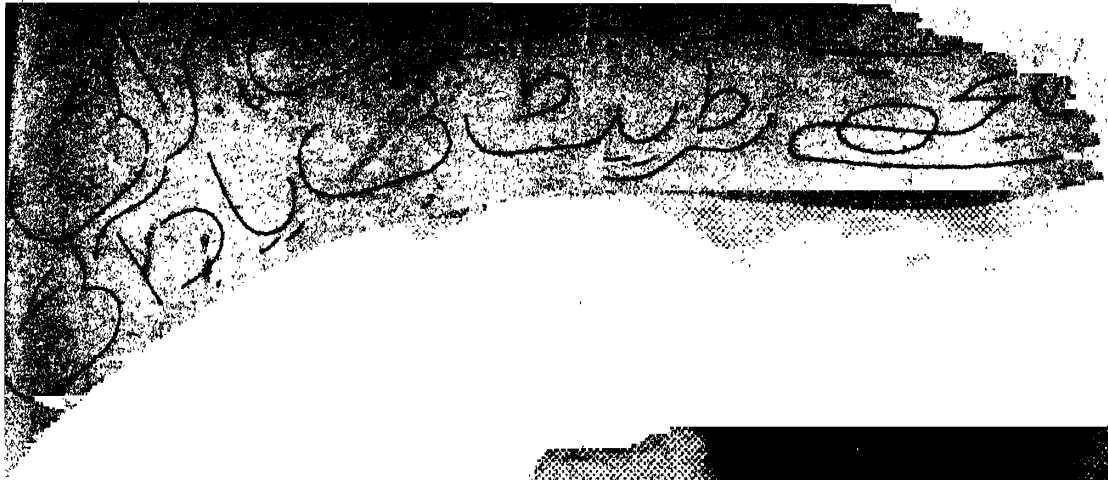
جدید تکنیک کے مطابق بالوں کا حسن جڑی بوٹیوں کے استعمال میں ہے۔
ٹریٹ آملہ شکاکائی ہیئر آئل اور ٹریٹ ہربل ہیئر سوپ، آملہ، شکاکائی، مہندی اور
دیگر جڑی بوٹیوں سے تیّار کیئے گئے ہیں۔ یہ جڑی بوٹیاں لمبے، گھنے، چمکیلے اور
کالے بالوں کو بڑھانے کے لئے صدیوں سے مشہور ہیں۔
جی وی انٹرنیشنل پوسٹ بکس

افتتاحیہ

اللہ تبارک و تعالیٰ کا اوّلین اور سب سے بڑا صفاتی نام رحمٰن ہے۔ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ اپنی راہ پر چلنے والے رحم دِل بندوں کو محسن کا مقام عطا فرماتا ہے۔ مومن کی ایک اعلیٰ، اچھّی صفت رحم دِلی ہے۔ دوسروں کا دُکھ دیکھ کر اس کی آنکھیں نم ہوجاتی ہیں اور دِل تڑپ اُٹھتا ہے۔ مومن اپنے دشمنوں کے لئے بھی دُعائے خیر کرتا ہے۔
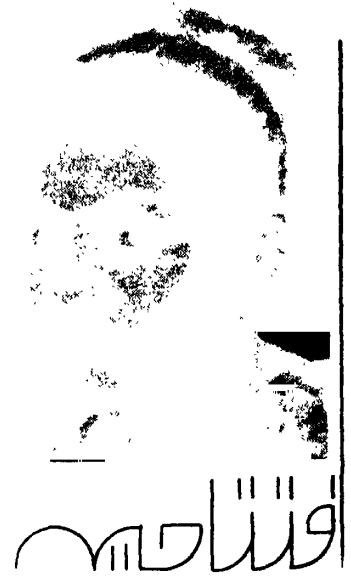
سنگ دِلی اور بُخل صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے۔ سنگ دِل انسان ایسا پتھر ہے جو اپنے اندر کسی دوسری چیز کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے وجود میں پانی جیسی خفیف شے کو بھی قبول نہیں کرسکتا۔ اس کے برعکس اگر زمین کی نرم مٹّی کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ مٹّی اپنی نرمی کی بنا پر رنگ برنگے پھُول کھلاتی ہے اور تناور درختوں تک کو سہارا دیتی ہے۔

اِسی طرح با فیض علم بھی رحم دِلی اور انکسار کی فضا میں زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ موثر ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے بے فیض علم والوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ ان پتھروں کے مانند ہیں جو رَواں چشمے کو روک کر پیاسی زمین کو سیراب ہونے سے محروم رکھتے ہیں۔

سعدیہ دہلوی

بہ یادگار: یوسف دہلوی مرحوم
مدیرہ اعزازی: زینت کوثر دہلوی
مدیرہ: سعدیہ دہلوی
ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی، آمنہ دہلوی

اشاعت کا اڑتیسواں سال، ۴۶۵ واں شمارہ
عام شمارے کی قیمت: چار روپے
سالانہ قیمت: اڑتالیس روپے

مقام اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
تار کا پتہ: شمع نئی دہلی SHAMA NEW DELHI
ٹیلکس: SHMA IN
ٹیلی فون: 272068 272067 ,272066
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس
مالکان: شمع میگزین
طابع و ناشر: یونس دہلوی

ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس، دہلی
مطبوعہ: روبی پرنٹنگ پریس، دہلی

وادیوں کے ...

مضمون اور تصاویر : سعدیہ دہلوی

ڈل لیک کا دوسرا رُخ

اللہ بخشے نانی اماں کو، جو ہمیں بچپن
ت سلیمانی کے قصے سُنایا کرتی تھیں لیکن
نانی اماں رہیں نہ حضرتِ سلیمان کا تخت۔
ان کے آباء اجداد کشمیری تھے۔ ان سے
ں ہماری ساری ننہیال کو سیبوں کا شوق و
بلا۔ نانی اماں نے جب بھی کسی کی خوب صورتی
کیا، اس میں "کشمیری سیب کی طرح گال"
شمار کئے۔ پچھلے دنوں کشمیر میں ہم کو سڑکوں پر
سیب لُڑھکتے دکھائی دیتے تو سینے پر سانپ
جانے اور بے اختیار نانی اماں یاد آجاتیں۔
کہتے ہیں سیر کے لئے نیک لوگ پہاڑوں
تے ہیں اور عقل مند لوگ سمندر کے کنارے
ن کو چھُوتے ہوئے پہاڑوں کے سامنے
ن اپنے آپ کو بہت چھوٹا، بہت حقیر محسوس
ہے، قدرت کی اس عظیم حقیقت کے
کھڑے ہو کر جھوٹ بولتے ہوئے شرماتا ہے۔
پچھلے دنوں ہم سری نگر ایک کانفرنس
سلسلے میں گئے تھے۔ وہاں ہندوستان
سے دانشور آئے ہوئے تھے۔ اسلام اور
ستانی مسلمانوں کے مسائل پر کشمیر یونی ورسٹی
ف سے اس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔
سے صحافی خوشونت سنگھ، جامعہ کے پروفیسر
لحق، دہلی یونی ورسٹی کے چند پروفیسر اور
ہم اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اقبال
ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر سرور ہمارے میزبان
تھے۔ کشمیر کے گورنر جگ موہن صاحب اور
وہاں کی بہت سی اہم شخصیتوں سے ملاقات رہی۔
کانفرنس انتہائی کام یاب رہی اور بہت سی باتیں
سامنے آئیں، جن کا ذکر ہم پھر کبھی کریں گے۔

کشمیر یونی ورسٹی حضرت بل کے علاقے
میں اور ہنگن جھیل کے پاس ہے۔ اگلی بار آپ
سری نگر جائیں تو چشمۂ شاہی اور شالیمار باغ
کے ساتھ یونی ورسٹی دیکھنے بھی ضرور جائیں۔
اس کی خوب صورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔
پہاڑوں سے گھری ہوئی خوب صورت عمارت
اور سبزہ زار۔ خوب صورت موسم۔ خوب صورت
پھول پھل۔ یہاں تک کہ لڑکے اور لڑکیاں بھی
خوب صورت۔ ہم تو دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے اور
یہی سوچتے جاتے کہ یہاں پڑھائی کیسے ہوتی ہوگی۔
لڑکوں کے لئے کتابوں سے سر نہ اُٹھانا کتنا
مشکل ہوتا ہوگا۔

شہد کا کارخانہ

کانفرنس سے دو ایک روز ہمیں فرصت ملی تو ہم نے اپنا کیمرہ اٹھایا اور چلے کشمیر کی سیر کرنے۔ سب سے پہلے ہم گئے شنکر آچاریہ مندر۔ سنتے ہیں صدیوں پہلے یہاں حضرت سلیمانؑ تشریف لائے تھے اور اپنا تخت اس مقام پر چھوڑ گئے تھے۔ برسہا برس تک مسلمان اس تخت کی زیارت کرنے اس پہاڑی کی چوٹی پہ

چڑھتے رہے۔ پھر شنکر نام کے گرو وہاں رہنے لگے اور یہ مندر بھی وہاں بن گیا۔ اس کے بعد ہندو، مسلمان دونوں وہاں جاتے رہے لیکن اب صرف ہندو وہاں عبادت کرنے جاتے ہیں یا پھر ہم جیسے سیاح جو تاریخی آثار میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس پہاڑی کے اوپر سے سارا سری نگر دکھائی دیتا ہے۔ پہاڑی کی ہر سمت سے شہر کا ایک نیا پہلو نظر آتا ہے۔

صاحب، ہم اس روز پری محل بھی گئے۔ گزشتہ رات ہم نے ایک پہاڑی پر ایک ننھی سی عمارت روشنی سے جگ مگ جگ مگ کرتی دیکھی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ عمارت پری محل ہے، جہاں پریاں آتی ہیں۔ یہ کئی منزلہ عمارت ہے سری نگر کا سب سے خوب صورت نظارہ یہاں سے دکھائی دیتا ہے۔ داراشکوہ (اورنگ زیب کے بھائی) نے یہیں بیٹھ کر سنسکرت اپنشد کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ پری محل اتنی سکون کی جگہ ہے کہ ہمارا بھی جی چاہنے لگا کہ وہاں بیٹھ کر کوئی ادبی شہ پارہ تخلیق کر ڈالیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کشمیر کی فضا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں پہنچ کر مزاج میں فن کارانہ اظہار کی امنگ پیدا ہو جاتی ہے۔

رات ڈھلی تو ہم شکارے میں واپس اپنی ہاؤس بوٹ کی طرف روانہ ہوئے اور اس کی چھت پر بیٹھ کر ڈل لیک کی رعنائیوں میں ڈوب گئے۔ اچانک دیکھا کہ شائیں شائیں کرکے آس پاس سے اونچی اونچی چنگاریاں لپکیں۔ ہم نے سوچا شاید کہیں شادی ہو رہی ہے اور آتش بازی چھوٹ رہی ہے۔ پھر ایک دم گھپ اندھیرا ہو گیا۔ معلوم ہوا وہ شعاعیں بجلی

وادئ کشمیر کا ایک دل کش منظر

پیپر ماشی کا کام ہو رہا ہے

مبے سے اُٹھی تھیں۔ پلک جھپکنے میں سارے
نے کی بجلی چلی گئی۔ مگر ہم نے اتنے خوبصورت
ین بجلی جاتے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہمارے
میری دوست نے بتایا کہ آج کل کشمیر کچھ
ہ ہی رومانٹک ہوگیا ہے، یعنی ہر کام موم
ی کی روشنی میں ہوتا ہے۔ بجلی کا جانا بہت
م ہے۔

ہاؤس بوٹ کی زندگی بھی خوب ہے۔
ی فائیو اسٹار ہوٹل سے یہاں کم عیش نہیں۔
ا پنگ کرنے کے لئے بھی باہر نہیں جانا پڑتا۔
ارے دن ہاؤس بوٹ میں دُکان دار خود ہی
نے رہتے ہیں۔ کوئی جوس بیچ رہا ہے تو کوئی
ثمینہ اور شہتوت کی شالیں، کوئی پھول
روخت کر رہا ہے تو کوئی زیورات۔ صبح صبح
ل لیک میں تیرتا ہوا بازار لگ جاتا ہے۔ کسی
وخط یا تار بھیجنا ہو تو لیک کے اندر ہی ڈاک
ور تار گھر بھی موجود ہے۔

ایک دن ہم شکارے سے ڈل لیک
کا دوسرا رُخ دیکھنے چلے، جہاں کشمیری رہتے
ہیں۔ یہ حصہ ہمیں اطالوی شہر وینس جیسا لگا۔
وہاں بھی آبی شاہ راہیں ہیں اور یہاں بھی ایک
مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے کے لئے
شکارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بچے کشتی میں
اسکول جاتے آتے ہیں۔ کشتی میں دہی، دُودھ
اور سبزی بکتا ہے۔ ایک طرف مسجد ہے تو
دوسری طرف مندر۔ کہیں شہد کا کارخانہ ہے
کہیں بھیڑ حلال ہو رہی ہے۔ ایک طرف کپڑے
دُھل رہے ہیں، دوسری طرف سِل رہے ہیں۔
ہم نے اپنے شکارے سے اُتر کر شہد بھی خریدا
اور ایک قالین کے کارخانے میں بھی گئے۔ دیکھا
کہ ایک چھوٹے سے کمرے میں، جہاں روشنی بے حد

کشمیر کی ایک سہانی شام کا منظر

کم تھی، قالین کے قریب لگے ہوئے ہیں۔ قالین لڑکیاں بُن رہی تھیں۔ ان میں سب سے چھوٹی لڑکی چار سال کی ہوگی۔ یہ دیکھ کر گہرا صدمہ ہوا۔ کشمیری قالین خریدنا تو دُور کی بات ہے ہم اس پر بیٹھنا بھی جرم سمجھنے لگے۔ یہ قالین معصوم بچیوں کے بچپن کی مُسکراہٹوں کے خون سے رنگا ہوا ہوتا ہے۔ ننھی ننھی اُنگلیوں سے گرہیں جلدی اور صفائی سے بنتی ہیں۔ سارے دن کی

ہاؤس بوٹ کے اندر کی ایک جھلک

محنت کی قیمت پانچ دس روپے ہوتی ہے ہم نے جب اس چار سال کی بچّی کو عربی میں لکھے ہوئے نقش کو پڑھتے ہوئے اپنی معصومیت کو بیچتے ہوئے دیکھا تو اس دنیا کے انصاف اور قانون پر ہنسی آئی۔ سوچا کہ یہ قالین کہاں اور کیسے بُن رہے ہیں اور کہاں جاکر یہی قالین امیروں کے گھر کی زینت بن جاتے ہیں۔ نانی امّاں تم سچ کہتی تھیں کہ یہ دنیا بڑی ظالم اور بے رحم ہے۔

ایک اُداسی سی دل میں لے کر ہم آگے بڑھے۔ تھوڑی دُور جاکر ایک اور کارخانہ نظر آیا تو شکارہ روک لیا۔ یہ پیپر ماشی کا کارخانہ تھا۔ ہمیں پیپر ماشی کی چیزیں بے حد پسند ہیں لیکن ہم کو معلوم نہ تھا کہ اس کو بنانے میں کتنی محنت اور لگن کی ضرورت ہے۔ پہلے تو کاغذ کی ردّی اور کپڑے کی دھجیاں پانی میں کئی دن تک گلائی جاتی ہیں۔ پھر اس میں گوند ملا کر اس کو مختلف چیزوں میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس کے بعد کاغذ چپکا چپکا کر سلوٹیں دُور کی جاتی ہیں۔ پھر وارنش ہوتی ہے۔ پتھر کوٹ کر رنگ بنائے جاتے ہیں۔ ڈیزائن ٹریس کیا جاتا ہے اور اللہ جانے کیا کیا کیا جاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا ڈبّا بھی نہ جانے کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے۔ کہیں پانی میں تو کہیں آگ کی بھٹّی میں۔ ہم تو یہ دیکھ کر پہلے کے مقابلے میں اس فن کی دس گنا قدر کرنے لگے۔ دو چار چیزیں جو ہم نے وہاں سے خریدیں تو اللہ گواہ ہے ذرا بھی سودے بازی نہ کر سکے۔

دن بھر شکارے میں گھومنے کے بعد ہم اپنی ہاؤس بوٹ میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ ہاؤس بوٹ والے بہت ایمان دار اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے کشمیری

کھیتوں میں کام کرتی ہوئیں ماں اور بیٹی

ـنے کھلاتے رہتے ہیں۔ ان کی ایمان داری
ـ عالم کہ آپ سونا بھی کھلا چھوڑ کر چلے جائیں
ـکی ہاتھ نہیں لگتا تا۔ عجیب لوگ ہیں۔ یوں
ـمیری اپنی جھوٹی قسموں کے لئے مشہور ہیں
ـ بات میں اللہ میاں کو لے آتے ہیں۔ جب
ـ تا ہم کشمیر گئے تو گھر والوں نے یہی نصیحت کی کہ
ـہوشیار رہنا) مگر تجربے کی بنیاد پر ہمارا یہ خیال
ـہ کہ اس ہوشیاری کی ضرورت دکان داروں تک
ـ محدود رہتی ہے۔ مجموعی طور پر کشمیری بے حد
ـلیف شمار ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان میں شاید
ـشمیر میں سب سے کم جرائم ہوتے ہیں۔ لڑکیاں
ـام کو آرام سے گھومتی پھرتی ہیں۔ چوری چکاری
ـہزنی وغیرہ کی وارداتیں بہت کم ہوتی ہیں۔

جمعہ کے روز ہم حضرت بل نماز پڑھنے گئے تو ہمیں ایسا لگا کہ جیسے کشمیر کے سب راستے حضرت بل کو جاتے ہیں۔ ہم حضرت بل پیدل جا رہے تھے، مگر کسی سے راستہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ پڑی جس طرف لوگ ہجوم در ہجوم چلے جا رہے تھے، ہم اسی طرف چلتے

کچھ کشمیری اپنے آپ کو ہندوستان سے الگ سمجھتے ہیں۔ یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے جگہ جگہ وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہندوستان میں کیا موسم ہے؟ وہاں کی صورت حال کیا ہے؟ اور ہاں، ہمارے گلے میں نانی اماں کا دیا ہوا اللہ کے نام کا تعویز دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ کپڑے کے دام جھٹ پٹ کم کر دیتے۔ جب ہم نے اپنے ہاؤس بوٹ والے سے مصلّیٰ مانگا تو وہ خوشی سے کھل گیا اور فوراً جا نماز لے آیا۔ ہمارے تو ٹھاٹ ہو گئے ایک پر ہم عشاء کی نماز پڑھتے تو دوسری پر فجر کی نماز۔ میزبان نے ہماری ایک وقت کی نماز بھی قضا نہ ہونے دی اذان ہوتے ہی ہمیں اطلاع ہو جاتی اور ہمیں سجدے میں دیکھ کر میزبان کا ڈھیروں خون بڑھ جاتا۔

چار سال کی لڑکی قالین بنتے ہوئے

گئے اور آسانی سے اپنی منزل پر پہنچ گئے۔
وہاں بسوں اور اسکوٹروں کے جھرمٹ ہر طرف دکھائی دئے۔ نماز کے لئے اتنا مجمع دیکھ کر دل کھل اٹھا اور اقبال کا یہ شعر یاد آیا:

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ جہاں ہمارا

حضرت بل کی مسجد کے سامنے جھیل میں وضو کرنے والوں کی بھیڑ تھی۔ ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ دیکھا کہ جھیل میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں لاکھوں کی تعداد میں تیر رہی تھیں۔ ہم نے وضو کرنا شروع کیا پھر ہاتھ رک گئے۔ پاس بیٹھے صاحب سے پوچھا "بھائی صاحب، اس میں ہم کلی کیسے کریں؟" انہوں نے ہاتھ سے پانی ہلا کر مچھلیوں کو بھگا کر دکھایا اور کلی کرتے ہوئے بولے "لیجئے" اللہ معاف کرے، ہم سے یہ ستم نہ ہوا اور ہم نل کی تلاش میں نکل گئے۔ جوتیاں ہم پہلے ہی اتار چکے تھے۔ اللہ جھوٹ سے بچائے آدھے گھنٹے سے زیادہ ننگے پاؤں دھوپ میں چلتے رہے تب کہیں جاکر دور سڑک پر ایک سبیل نظر آئی ہم نے ٹھنڈا پانی پیا، اس سے وضو کیا اور جماعت پکڑنے کے لئے واپس بھاگے۔

کشمیر میں ہمیں سب سے اچھا وقت لگا جو یہاں بے حد آہستہ آہستہ گزرتا ہے۔ دلی میں تو گھڑی کی سوئی دوڑ لگاتی رہتی ہے، لیکن کشمیر میں ایسی بات نہیں۔ زندگی کی رفتار گھڑی کی بندش سے آزاد ہے۔ ہم جب سوچیں گے کہ گھنٹہ گزر گیا تو معلوم ہوگا کہ صرف پندرہ منٹ گزرے ہیں۔

آج کل لیک کی صفائی ہو رہی ہے۔ لیکن لیک تو پھر بھی کافی صاف ستھری ہے، لیکن ڈل کا تو بہت برا حال ہو رہا ہے۔ پانی میں گھاس ہی گھاس بھری ہوئی ہے۔ کشمیر کے کسی عالم نے ہمیں بتایا کہ ڈل لیک خشک بھی ہوتی جا رہی ہے۔ دراصل اس جھیل کے نیچے کئی چشمے ہیں، جو اب بڑھتی ہوئی گندگی کی وجہ سے بند ہوتے جا رہے ہیں۔ سارے شہر کی بھی ڈل میں ہی جاتی ہے۔ اگر اس جھیل کی صفائی نہ ہوئی تو کشمیر کی خوب صورتی خطرے میں پڑ جائے گی اور یہ جھیل بھی آچار یہ جھیل کی طرح سوکھ کر میدان بن جائے گی۔ سنا ہے سرکار نے انگلستان کے کچھ ماہروں کو ڈل کی صفائی کا کام سونپ دیا ہے۔ بیس پچیس کروڑ روپے کا بجٹ ہے۔ خدا کرے کشمیر کی خوب صورتی قائم رہے اور آپ اور ہم اس جنت کے مزے لوٹتے رہیں۔ ●●

عدیہ دہلوی

فاروق عبداللہ سے ایک ملاقات

کشمیر سے واپسی کے چند روز بعد ہی دہلی میں ہماری فاروق عبداللہ سے ملاقات ہوئی۔ کشمیر کے سفر کے دوران ہمارے دماغ میں طرح طرح کے سوالات اٹھے۔ جس طرح کشمیر کی خوب صورتی کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی، ٹھیک اسی طرح وہاں کے لوگوں کی فطرت بھی مختلف ہے۔ کشمیر کے لوگوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ کشمیری، باقی ہندوستانیوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ہندوستان کے آئین میں کشمیر کو ایک خاص درجہ دیا گیا ہے اور کشمیریوں کو بہت سی ایسی رعایتیں اور سہولتیں دی گئی ہیں، جو باقی ہندوستانیوں کو نہیں ملتیں۔ کشمیر سے رخصت ہوتے ہوئے ایک عام ہندوستانی کو کچھ رشک کچھ افسوس اور کچھ غصہ آتا ہے۔ کشمیر کے کچھ ڈھکے چھپے رازوں کے بارے میں ہم نے فاروق عبداللہ

● فاروق عبداللہ : مرکزی حکومت کشمیریوں کو ندیدہ اور نکما بنانے پر تلی ہوئی تھی۔

سے خاص طور پر پوچھا :

س : ہندوستانی عوام کی اکثریت یہ سوچتی ہے کہ مرکزی سرکار نے کشمیر کو حد سے زیادہ رعایتیں دے کر سر پر چڑھا لیا ہے اور کشمیر کے لوگ ناشکر گزار ہیں۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے ؟

ج کیا دیا ہے مرکزی سرکار نے کشمیر کو ؟ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ساتھ جو رعایتیں کی گئیں۔ کشمیریوں کو وہ رعایتیں فراہم کرنا دراصل کشمیر کی ریاستی حکومت کی ذمہ داری تھی اور یہ رعایتیں زیادہ تر کھانے کی چیزوں سے متعلق تھیں۔ مرکزی حکومت کشمیریوں کو کھلا کھلا کر ندیدہ اور نکما بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ ۱۹۷۵ میں میرے والد شیخ عبداللہ نے اس امداد کو سستی غذا مہیا کرنے کی بجائے ہسپتال، کالج، سڑکیں اور پل بنانے کے لئے استعمال کیا۔ جموں کا پل بھی میرے والد نے ہی بنایا تھا۔ ذرا سوچئے تو اس سے پہلے یہ پل تھا ہی نہیں۔

س : ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے مطابق کشمیر کو ایک خاص درجہ دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے کوئی غیر کشمیری آج تک کشمیر میں جائداد نہیں خرید سکا۔ آزادی کے اتنے سال کے بعد بھی کیا اس خاص حیثیت کی ضرورت ہے ؟

ج بالکل ہے ــــ کشمیر کی وادیوں میں جہالت، غربت اور بیماری کا دور دورہ آج بھی ہے۔ کشمیر میں اگر غیر کشمیری کو زمین خریدنے کی اجازت مل گئی تو ہمارے عوام کے پاس کچھ نہ بچے گا۔

س : اسی دفعہ کے تحت کوئی کشمیری اگر غیر کشمیری عورت سے شادی کرتا ہے تو یہ غیر کشمیری عورت اس کی جائیداد کی حق دار بن جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی کشمیری عورت کشمیر سے باہر شادی کرتی ہے تو اپنی جائداد کا حق بالکل کھو بیٹھتی ہے۔ کیا یہ عورتوں کے ساتھ زیادتی نہیں ؟

ج جی نہیں ــ آج کل تو شادیاں دنیاوی فائدے کے لئے دکھاوے کے طور پر رچائی جاتی ہیں۔ اس قانون میں تبدیلی کا مطلب یہ ہوگا کہ غیر کشمیریوں کا کشمیر پر قبضہ شروع ہو جائے گا۔

س : ہم کئی بار کشمیر گئے اور ہر بار یہی محسوس کیا کہ وہاں کشمیری قومیت کے سوا کوئی اور قومیت کا جذبہ نہیں۔ آخر کشمیری چاہتے کیا ہیں ؟

ج کشمیری آزادی چاہتے ہیں، انقلاب چاہتے ہیں۔ آپ کا خیال درست ہے کہ ہندوستانی قومیت کا کشمیر میں کوئی جذبہ نہیں ہے۔ حالانکہ میں خود ہندوستانی قومیت میں یقین رکھتا ہوں۔ کشمیری سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ جو کچھ پنجاب بھیونڈی یا گجرات میں ہوتا ہے کشمیر میں اس کا اثر گہرا ہوتا ہے۔ ایک کشمیری کو حد سے زیادہ نہیں دبایا جا سکتا ــ

کیوں کہ پھر اس کا ڈنک ایک زہریلے سانپ سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔

س: کشمیری اپنے آپ کو نہ صرف ہندوستان سے بلکہ ساری دنیا سے الگ چھپ چھپا کر رہنا پسند کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ اپنی بنائی ہوئی خود فریبی کی دنیا میں نہیں جی رہے ہیں؟

ج: ہاں، یہ صحیح ہے کہ کشمیری اپنے ہی سجائے ہوئے خوابوں میں جیتے ہیں کبھی کبھار میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان پہاڑوں کو توڑ کر کشمیریوں کو ان کی نیند سے بیدار کر کے حقیقت کی طرف لے جاؤں۔

س: کشمیر کے دورے میں ہم نے دیکھا کہ ننھی منی لڑکیوں کی تمام دن کی محنت و مشقت کا معاوضہ صرف چار یا پانچ روپے ہے۔ یہ لڑکیاں صبح سے شام تک اپنی نازک انگلیوں سے قالین بنتی ہیں۔ ہماری نظر میں ان معصوم بچیوں پر سراسر ظلم ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ اس پر قانونی پابندی لگائی جائے۔

س: ہم اس چلن کو کیسے روک سکتے ہیں۔ کشمیر میں انتہائی غربت ہے، جس کی وجہ سے خاندان کے ہر فرد کو روزی کمانی پڑتی ہے۔ ہم ایک فلاحی ریاست

فاروق عبداللہ اپنے والد شیر کشمیر شیخ عبداللہ کے ساتھ ◄

نہیں ہیں، اس لیے ہر خاندان کے سارے افراد کو اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ جن میں بچے بھی شامل ہیں۔

س: کشمیر میں ہندو پنڈت اور مسلمان ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ پنڈت عموماً تعلیم یافتہ ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت ان پڑھ ہے۔

ج: کشمیر کی پوری تاریخ میں مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے اور وہ مغل بادشاہ ہوں یا ڈوگرہ یا سکھ راجہ، کسی نے بھی کشمیری مسلمانوں کی تعلیم پر دھیان نہیں دیا۔ کشمیری مسلمان ہنرمند ضرور رہا۔ اس لئے کشمیری مسلمان ہاتھ کا کام ہی کرتے آرہے ہیں اور اس میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ دینی اور غیر مذہبی تعلیم کی اختلافی بحث بھی موجود ہے۔ علما صرف مذہبی تعلیم پر زور دیتے ہیں۔ اس لئے کشمیری مسلمان عام تعلیم کے معاملے میں بدقسمت رہے۔
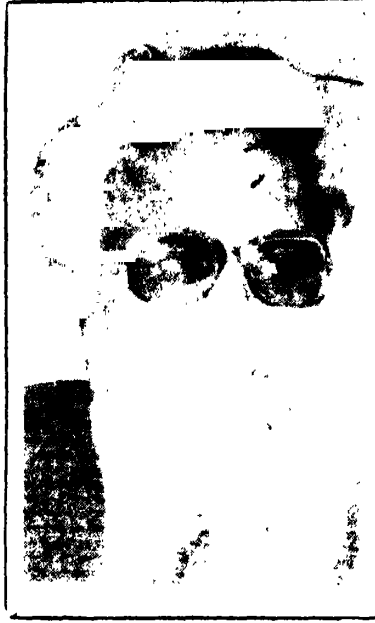
• کشمیر کے گورنر شری جگ موہن، جنہوں نے فاروق عبداللہ کو چیف منسٹر کے عہدے سے برطرف کیا

س: یہ ایک عام خیال ہے کہ کشمیریوں کی وفاداری کشمیر تک ہی محدود ہے۔ اس کے علاوہ وہ اکثر سیاحوں کو لوٹنے میں بھی مشہور رہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: آج کل دنیا میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون وفادار ہے اور کون نہیں۔ دنیا میں وفا نام کی چیز ہی عنقا ہوگئی جب مسز گاندھی پر مصیبت کا دور آیا تو اس وقت ان کے وفاداروں کی ٹولی کہاں غائب ہوگئی۔ جہاں تک کشمیریوں کی دھوکے بازی کا تعلق ہے، اس میں حد درجہ مبالغہ آرائی ہے۔ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

س: دوسری طرف کشمیر میں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کا باعث لوگوں کی فطرت ہے یا حکومت کی خوش انتظامی؟

ج: کشمیر کی حکومت کا انتظام کشمیر میں باقی ہندوستان سے مختلف نہیں ہے — کشمیری فطرتاً خدا ترس اور امن پسند ہوتے ہیں۔

س: کشمیر کی سرکاری زبان اردو ہے۔ کیا کشمیری لوگ اس بات کا احساس نہیں کرتے کہ اس سے ان کی کشمیری زبان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

ج: کشمیری بہت روادار ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اردو سے محبت ہے۔

س: کشمیر میں کشمیری ادب نہ ہونے کے برابر ہے۔ کشمیری ایک خوبصورت زبان ہے پھر ایسا کیوں ہے؟

ج: کشمیریوں نے خود اپنی زبان کی ترویج اور اشاعت پر توجہ نہیں دی۔ لیکن اب یہ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے اور اس کے ادب میں بھی اضا ہو رہا ہے۔ میرے والد نے اس زبا کو اسکول اور کالج کے نصاب میں داخ کیا تھا۔

س: کیا آپ اپنا ڈاکٹری کا پرانا پیشہ اختیا کرنا چاہتے ہیں؟

• فاروق عبداللہ چیف منسٹر کے عہدے کا حلف لیتے ہوئے

ج نہیں، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے اپنے پیشے میں سیکھا ہے، وہ روزمرہ کی زندگی میں میرے کام آتا ہے۔ ڈاکٹر ہونے کے ناتے اگر مریض کا مرض لاعلاج ہے تو بھی اُسے کم از کم زبانی دلاسہ تو دیا ہی جا سکتا ہے۔ یہ ہمیشہ میری زندگی کا اصول رہا ہے۔ اُس وقت بھی جب میں چیف منسٹر تھا، میرے گھر کے دروازے سب کے لئے کھُلے ہوئے تھے۔

س : آپ کے اپنے بہن بہنوئی سے اختلافات ہیں۔ کیا اس میں سُدھار ہونے کے امکانات ہیں؟

ج بالکل نہیں ـــــ اب اختلافات ذاتی نہیں بلکہ سیاسی رُوپ لے چکے ہیں۔ یہ اختلاف ہمیشہ باقی رہے گا۔

س : آپ کو چیف منسٹر کے عہدے سے برطرف کیا گیا تھا۔ یہ کام گورنر سے لیا گیا تھا۔ گورنر آئینی طور پر اس کا مجاز ہے، لیکن ہندوستان کے آئین کی رُو سے جب کہ مُلک کا صدر اور وزیرِ اعظم بھی اپنی کابینہ کے مشورے کے بغیر یہ کام نہیں کر سکتا۔ کیا گورنر کا اتنا زیادہ اختیار ریاستوں کے لئے نقصان کا باعث نہیں ہے؟

ج یہ گورنر کے حد سے بڑھے ہوئے اختیارات یقیناً خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے آئین میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ گورنر کی نامزدگی غلط طریقہ ہے۔ گورنر کا انتخاب اسٹیٹ اسمبلی اور کونسل کو کرنا چاہیئے۔ گورنر کو اپنے کام کا اہل ہونا چاہیئے۔ اُسے مرکزی حکومت کی کٹھ پُتلی نہیں بننا چاہیئے ـــ

فاروق عبداللہ کے ساتھ کیا ہوا، اسے بھول جائیے، لیکن اس کا اثر لوگوں پر گہرا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ فریب ہوا ہے۔ ایسا ردِ عمل قدرتی ہے۔

س : آپ نے حال ہی میں کہا تھا کہ میرا دوست راجیو گاندھی مجھے واپس مل گیا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوبارہ وزیرِ اعلیٰ بننے کی اُمید رکھتے ہیں؟

ج یہ بات وقت ہی بتائے گا۔

●●

▼ فاروق عبداللہ کے بہنوئی اور کشمیر کے موجودہ چیف منسٹر جی۔ایم شاہ "یہ اختلاف ہمیشہ باقی رہے گا"

بین

مسرور جہاں

یہ کون لوگ ہیں ؟
یہ سب مجھ سے لپٹ کر کیوں رو رہے ہیں ؟

باری باری وہ میرے پاس آتے ہیں۔ مجھے گلے سے لگاتے ہیں — اور اس طرح تڑپ کر روتے ہیں کہ میرا دل بے چین ہو جاتا ہے — میں رونا چاہتی ہوں، لیکن رو نہیں پاتی آنسوؤں کی نمی کہیں میرے اندر ہی اندر اُترتی جا رہی ہے۔ اور میں ہوں کہ دیوارِ گریہ بنی بیٹھی ہوں۔ کہ لوگ آتے جائیں اور مجھ سے لپٹ کر روتے جائیں۔ اور میں خاموش، پتھرائی آنکھوں سے بس اُن کو دیکھتی رہوں۔

ان بین کرنے والوں سے میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ آخر مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ ان کو مجھ سے یہ توقع تو نہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ روؤں ؟ کاش کوئی اس وقت مجھے چند قطرے آنسوؤں کے اُدھار دے دے، تاکہ میں ان رونے والوں کی آرزو پوری کر سکوں۔ اس وقت میری یہ خشک آنکھیں مجھے کیا پشیمان کر رہی ہیں۔ رونا تو اس وقت آتا ہے جب اپنا کوئی نقصان ہوتا ہے — لیکن میرا تو ذرا سا بھی نقصان نہیں ہوا، کیوں کہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی سودا نفع اور نقصان دیکھ کر نہیں کیا۔ بلکہ از خود کوئی سودا ہی نہیں کیا۔ کسی سے کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ بس کوئی اَن دیکھا، انجانا ہاتھ مجھے مختلف معاہدوں میں کستا اور پھانستا چلا گیا۔ میں نے اپنے ہر موقع پر احتجاج کرنا چاہا، مخالفت کرنا چاہی، لیکن میری کبھی ایک نہ چلی — ہوا وہی جو دوسروں نے چاہا اور کیا۔ میں تو ہر جُرم میں ناکردہ گناہ ہی پکڑی گئی۔ اور پھر اس کی پاداش میں سزا بھی مجھ کو ہی

بھگتنا پڑی۔ حالاں کہ میں نے اس وقت بھی
سخت احتجاج کیا کہ جب میں نے اپنی مرضی سے
کوئی جرم ہی نہیں کیا ہے تو یہ سزا کیسی ؟
لیکن اس وقت بھی کسی نے میری فریاد پر کان
نہیں دھرا۔ ایک کے بعد دوسری صلیب اور
دوسری کے بعد تیسری صلیب میرے کاندھوں
پر رکھی گئی حتیٰ کہ میں ان کے بوجھ تلے دب گئی،
پس گئی، ختم ہوگئی اور جب ختم ہوگئی تو ایک بار
پھر سب رونے اور گریہ کرنے چلے آئے۔
اب تو مجھ میں احتجاج کرنے کی طاقت بھی نہیں
رہی ہے۔ اس لئے تو میں خشک آنکھیں لئے
حیران اور پشیمان سی بیٹھی ہوں۔

ہاں رونا تو مجھے اس وقت آیا تھا —
جب تیرہ برس کی عمر میں مجھے سرخ کپڑے اور
بھاری زیور پہنا کر ایک تنگ و تاریک کمرے
میں دھانس کر بٹھا دیا گیا تھا۔ اس وقت
میرا کیسا جی چاہا تھا کہ بھاگ کر اپنی سہیلیوں
کے پاس جاؤں اور انہیں اپنے سرخ چمکیلے
کپڑے اور جگ مگ کرتے زیور دکھاؤں۔
لیکن اماں نے جھڑک کر باہر نکلنے سے منع کر دیا
تھا۔ ذرا دیر کے بعد بھانت بھانت کی بولیاں
بولتی چند عورتیں آئیں تو بجو نے میرا دوپٹہ کھینچ کر
لمبا سا گھونگھٹ نکال دیا۔ اور میں ان عورتوں
کی صورت دیکھنے کو بس تڑپ کر رہ گئی۔ پھر
خالہ بی مجھے اپنی سخت باہوں میں دبوچ کر
بیٹھ گئیں۔ سامنے ایک چادر تان کر پردہ
کیا گیا — ماموں جان کی آواز آئی " بنّو
(میری خالہ بی کا نام)، مولوی صاحب تشریف
لے آئے ہیں۔"

اور پھر مولوی صاحب شاید خالہ بی سے
کچھ پوچھنے لگے، کیوں کہ ماموں جان نے ان
ہی سے کہا تھا۔ لیکن خالہ بی میرے بازو اور
پسلی میں اپنی سخت، کھردری انگلیاں چبھونے
لگیں۔ "ہوں، کرو — ہوں، کرو!"
ابھی میں غصے کے مارے چیخنے والی
تھی کہ خالہ بی نے ایک زور کی چٹکی بھرلی۔
تکلیف سے میں سسک اٹھی۔ اور بلک
بلک کر رونے لگی۔ میرے رونے اور بلبلانے
سے سب اتنے خاموش ہوئے کہ زور زور
سے ہنسنے لگے — مگر پھر رونے لگے۔ ان
کے ہنسنے یا رونے کا سبب میری سمجھ میں نہ آیا۔
میں اپنا رونا بھول کر حیرت سے ان کی صورتیں
تکنے لگی۔ اماں، خالہ بی اور بجو۔ سب
ہنس رہے تھے۔ اور سب رو بھی رہے
تھے۔ اور اس طرح ہنستے روتے مجھے کسی نے
گود میں اٹھا کر دروازے پر کھڑی موٹر میں
لاکر بٹھا دیا۔ ہوش آیا تو نہ اپنا گھر تھا نہ اپنے
گھر والے۔ اور اس سارے تماشے کو شادی
کا نام دیا گیا۔ اس اجنبی گھر کو میرا گھر کہا گیا
اور ایک اجنبی مرد، کو میرا شوہر۔

میرے کچھ ماننے یا نہ ماننے کا تو سوال
ہی نہیں تھا، اس لئے کہ یہ سارا تماشا میری مرضی
سے تو ہوا نہیں تھا بات تو دوسروں کی مرضی کی
تھی اور جس طرح میرے گھر والوں نے سارے
تام جھام کے ساتھ مجھے اس اجنبی مرد کے ساتھ
ایک اجنبی گھر میں لے جا کر چھوڑ دیا تھا، میں بھی
اس سامان کے ساتھ اس گھر میں ایک گوشے
میں پڑی رہی۔ اور شاید ساری زندگی پڑی
رہتی، لیکن میں اجنبیت کی اس دیوار کو ڈھا کر
جو پہلے روز سے ہی میرے گھر والوں نے میرے
اور اس مرد کے درمیان کھڑی کر دی تھی کم از کم
انہیں اتنا انتظار تو کرنا چاہئے تھا کہ میں شادی
اور شوہر کا مفہوم سمجھنے کے قابل ہو جاتی۔ مجھے
اسکول اور سہیلیوں سے چھڑا کر انہوں نے
جو نئی زندگی مجھے دی، میں اس کی مسرتیں
سنبھالنے کے لائق ہی کب تھی ؟ لیکن جب
میں گھر کی دہلیز پر واپس آئی تو میرے کلیجے میں
طعنوں کے بھالے چبھوئے گئے اور میں
اپنے چاہنے والے ماں باپ سے یہ بھی نہ پوچھ
سکی کہ آخر آپ لوگوں کو مجھے گھر سے وداع
کرنے کی اتنی عجلت کیوں تھی، جب کہ بجو
ابھی مزے سے اسکول جاتی ہیں۔ شادی تو
ان کی ہونا چاہئے تھی۔ یہ تو کوئی عذر نہیں کہ میں
پڑھنے میں کمزور تھی اور بجو ہر کلاس میں فرسٹ
آتی تھیں۔ کیا صرف فرسٹ آنے والوں ہی
کو پڑھنے کا حق ہے ؟ اور یہ جو ہر سال سیکڑوں
ہزاروں لوگ سیکنڈ اور تھرڈ ڈویژن آتے
ہیں، اور وہ بے چارے جو فیل ہو جاتے ہیں۔
انہیں بھی تو اپنی تعلیم جاری رکھنے کا حق نہیں

"ان بین کرنے والوں سے میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ آخر مجھ سے کیا چاہتے ہیں ؟ ان
کو مجھ سے یہ توقع تو نہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ روؤں ؟ کاش کوئی اس وقت مجھے چند
قطرے آنسوؤں کے ادھار دے دے تاکہ میں ان رونے والوں کی آرزو پوری
کر سکوں۔"

...ہتے — تب پہلی بار مجھے بجو سے سخت
...د ا میں ان سے باقاعدہ جلنے لگی۔
... میں سمجھتی تھی کہ اس میں بے چاری بجو
... بھی قصور نہیں ہے۔ وہ تو ہمارے
...ں رہتی بھی نہیں تھیں۔ وہ ماموں جان
...مانی جان کے پاس رہتی تھیں۔
ماموں جان خود بھی بڑے لائق فائق
... یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اس لئے
... کی ذہانت سے بہت خوش رہتے تھے
...کی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے بجو کو تعلیم
...پنی محرومیوں کا ازالہ کرتے تھے۔ بجو کے
...ے اخراجات ان ہی کے ذمہ تھے۔ میرا
... ہوتا تو ہمیشہ میرے نمبر پوچھتے۔ پھر
...ے میرا موازنہ کرتے۔ نتیجے میں مجھے ان
...اڑ سننا پڑتی۔ بجو کے مقابلے میں ہمیشہ
... ناقدری ہوتی تھی۔ ہر جگہ ان کے ناز
...ے اٹھائے جاتے۔ دو دن کو گھر کیا
...، ایسا لگتا کہیں کی مہارانی آگئی ہیں۔ یہ
...ھائیں گے۔ وہ نہیں پیئیں گے۔ یہ بستر
... گندا ہے۔ یہاں مچھر کتنے ہیں۔ میں ان
...رے دیکھ کر کھول کھول کر رہتی تھی۔ وہ
...اتیں تو میں سکھ کا سانس لیتی۔ مجھے تو ماموں
... اور ممانی جان سے بھی سخت چڑ ہوتی
...۔ اور ان ہی تینوں کی ضد میں میں نے
...ہ اپنی پڑھائی شروع کردی۔ تعجب اس
...ہوا جب ماموں جان نے میری حوصلہ
...ں کی — اس دن پہلی بار مجھے ماموں جان
...ٹوٹ کر پیار آیا — اور میں جو اپنے دل میں
...ے خلاف ڈھیر ساری شکایتیں پالے بیٹھی
... ایک دم سب بھول گئی۔

پھر ایک دن کاغذ کا ایک معمولی سا پرزہ میری سسرال سے آیا جسے دیکھ کر اماں ایسا روئیں کہ میں سمجھی کسی کی موت کی خبر آگئی ہے۔ پتہ چلا کہ وہ میرا طلاق نامہ تھا۔ میں نے کاغذ کا وہ حقیر ٹکڑا اماں سے لے کر پرزے پرزے کر دیا — اماں کو پانی پلایا — پنکھا جھلا۔ پاؤں دبائے۔ تب کہیں جا کر ان کے حواس درست ہوئے۔ شادی کے تماشے کی طرح مجھے تو یہ بھی ایک کھیل ہی لگا۔ بھلا کون اس پرزے کے لئے جان ہلکان کرے۔ مجھے کون سا اس گھر میں واپس جانا تھا۔ یہ بات اماں کی بھی سمجھ میں آگئی اور میں یکسوئی سے پڑھتی رہی — اب تو ماموں جان بھی میرا کافی خیال رکھتے تھے اور بجو بھی دل جوئی کرتی تھی، میں نے تو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا — بجو کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتیں، بلکہ ماموں جان کی امیدوں کے مطابق لکچرر بننا چاہتی ہیں۔ مجھے اپنی بجو پر فخر ہوتا۔ کیسی بولڈ، ہیں میری بجو! کتنی پر اعتماد ہیں اور اپنا اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ میری طرح مٹی کی مادھو نہیں کہ جس طرح چاہے گھر والے پکڑ کر شادی کر دیں۔

میں نے انٹر کے بعد سی ٹی کیا اور ایک اسکول میں ملازمت کرلی۔ بجو ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ کر کے ایک کالج میں لکچرر ہو گئیں — ماموں جان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا! اس کے بعد اچانک ماموں جان پر فالج کا حملہ ہوا اور ایک ہفتہ بیمار رہ کر وہ ختم ہو گئے۔ اور اس روز پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ میں ماموں جان کو بہت چاہتی تھی۔ بجو کا تو برا حال تھا۔ ماموں جان ان کے بزرگ بھی تھے، ناصح بھی اور دوست بھی۔ وہ تو ان کا آئیڈیل تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان جیسا ہمارے خاندان میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ان کے بعد ممانی جان نے بجو کو ہاتھوں ہاتھ رکھا۔ ان کی دل جوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن بجو کچھ اس طرح ٹوٹ کر بکھری تھیں کہ لگتا تھا کہ اب عرصہ تک وہ خود کو سمیٹنے میں ناکام رہیں گی۔

خدا جانے یہ فیصلہ بجو کا تھا یا وقت اور حالات کا، لیکن تھا تعجب خیز۔ بجو کے لئے ایک پیغام آیا اور وہ چپ چاپ راضی ہو گئیں۔ شاید وہ ماموں جان کے بعد خود کو تنہا اور کم زور سمجھنے لگی تھیں۔ بجو کے اقرار سے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔
خوش تو میں بھی تھی۔ لیکن اس خوشی میں کچھ دکھ بھی شامل تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ بجو نے اپنی مرضی کے خلاف بس حالات سے

"بجو کے مقابلے میں ہمیشہ میری ناقدری ہوتی تھی۔ ہر جگہ ان کے ناز نخرے اٹھائے جاتے۔ دو دن کو گھر کیا آتیں، ایسا لگتا کہیں کی مہارانی آگئی ہیں۔ یہ نہیں کھائیں گے، وہ نہیں پیئیں گے۔ یہ بستر کیسا گندا ہے۔ یہاں مچھر کتنے ہیں۔ میں ان کے نخرے دیکھ کر کھول کھول جاتی تھی۔"

سمجھتا کیا ہے۔ حالانکہ اب مجھے اتنی سمجھ آگئی تھی کہ ایک خاص عمر میں لڑکی کی شادی ہوجانا چاہئے — میرا اپنا معاملہ تو اس کے برعکس تھا اس لئے اپنے تلخ تجربے کے بعد میں نے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا — لیکن بجّو کا فیصلہ تو خود اعتمادی کا ثبوت تھا۔ اور اب شاید وہ اپنی خود اعتمادی کھو چکی تھیں۔ بات کچھ بھی ہو اب وہ شادی کے لئے رضامند تھیں اور اس کے لئے ان کی شرط بھی نہیں تھی۔ یہ تو ان کی خوش نصیبی ہی تھی کہ علی بھائی ماشاءاللہ صورت و سیرت سب میں یکتا تھے۔

ہونے دیتے تھے کہ اتنی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود شادی کر کے انہوں نے کوئی حماقت کی۔ بلکہ بجّو نے اکثر فراخ دلی سے اقرار کیا تھا کہ شادی ایک لڑکی کی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے اور شریک زندگی اگر 'علی' جیسا ہو تو زندگی زمین پر بہشت بن جاتی ہے۔ کئی بار انہوں نے مجھ سے بھی شادی کرنے کے لئے اصرار کیا تھا اور علی بھائی کو ایک اچھا لڑکا دیکھنے کے لئے تاکید بھی کرتی تھیں۔ علی بھائی بھی اکثر مجھ سے مذاق کرتے تھے مگر میں اپنے فیصلے پر اٹل تھی۔ پھر ابّا کے انتقال کے بعد امّاں اور باجی وداع ہو کر سسرال چلی گئیں تو مجھے ایسا لگا کہ ہر لڑکی مٹی کی بے جان گڑیا ہی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی ڈگریاں بھی اس میں روح پھونکنے میں ناکام رہتی ہیں۔ ہر لڑکی کا ایک ہی انجام ہوتا ہے: شادی اور صرف شادی۔ ایک اجنبی مرد کا سہارا اس کا مقدّر ہوتا ہے اور ایک اجنبی گھر اس کی منزل ہوتا ہے۔ بجّو کو بھی آخر کار ایک سہارا مل گیا تھا، ایک منزل مل گئی تھی۔ خدا کرے ان کا یہ سہارا پائیدار ثابت ہو اور منزل ایک خوش گوار جنّت

بجّو اپنی نئی زندگی میں خوش و خرّم تھیں۔ علی بھائی ان سے بے حد محبت کرتے تھے اور ایک پل کے لئے بھی بجّو کو یہ احساس نہیں

بھائیوں کی تمام تر ذمّہ داری مجھ پر ہی تھی۔ کس کو آگے پڑھانا ہے، کس کو کام سکھانا ہے، یہ سارے فیصلے اب مجھ ہی کو کرنا تھے اور یہ بات بجّو بھی محسوس کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان کے اصرار میں کمی آگئی اور یہ ٹاپک بند ہو گیا

پہلی بچّی کی ولادت کے بعد بجّو کافی کمزور ہو گئیں اور انہیں سانس کی شکایت ہو گئی۔ بمبئی کی مرطوب آب و ہوا اس مرض کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ کچھ روز وہ ہمارے پاس آکر رہیں۔ مرض کنٹرول میں آگیا تو وہ پھر بمبئی چلی گئیں۔ ان کے بغیر علی بھائی کو تکلیف بھی ہوتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں ایک دوسرے کی رفاقت کے عادی ہو چکے تھے۔ میں بھی اپنے اسکول سے چھٹی لے کر ان کے ساتھ گئی — اور چند ہفتے رہ کر واپس آگئی۔ اتنے دن بچّی کی دیکھ بھال میں ہی کرتی رہی تھی۔ مکمل آرام اور بہترین علاج نے بجّو کی صحت پر اچھا اثر کیا تھا۔ لیکن چند مہینے کے بعد ان کی تکلیف پھر ابھر آئی۔ علاج ہوتا رہا — کتنے ہی چیک اپ ہوئے۔ کتنے ہی ایکس رے لئے گئے۔ پتہ چلا کہ ان کے پھیپھڑے سخت متاثر ہو چکے ہیں۔ علی بھائی کا خط ملا تو میں فوراً بمبئی گئی۔ اور بجّو کو اپنے ساتھ لے آئی دوسری بچّی کی ولادت ہوئی تو بجّو گویا موت کے منہ سے واپس آئیں۔ بڑی بچّی روبی میرے سینے سے لگی رہتی تھی۔ بجّو تو ان ننھی منّی گڑیا جیسی بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر نے انہیں دودھ پلانے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ ڈبّے کے دودھ پر بچّی کو پالنا آسان نہیں تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ بجّو کی طبیعت سنبھل گئی تو انہوں نے علی بھائی کو خط پر خط لکھ کر پریشان کر دیا۔ آخر علی بھائی ان کو لینے کے لئے آگئے۔ حالانکہ ان کی منشا بجّو کو لے جانے کی نہیں تھی۔ بجّو دو بچیوں کی دیکھ بھال تنہا نہیں کر سکتی تھیں۔ میں نے انہیں سمجھا بجھا کر روبی کو اپنے پاس روک لیا اور بجّو ننھی روزی کو لے کر علی بھائی کے ساتھ بمبئی چلی گئیں۔

بجّو کے خط آتے تو سارے خط میں بس روبی کا ہی ذکر ہوتا۔ یا پھر روزی کے متعلق باتیں ہوتیں۔ میں نے ہر خط میں انہیں تسلّی دی کہ بڑے دن کی چھٹیوں میں روبی کو لے کر آؤں گی لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک دن

"میں نے ہر خط میں بجّو کو تسلّی دی کہ بڑے دن کی چھٹیوں میں روبی کو لے کر آؤں گی۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک دن اچانک علی بھائی کا ٹیلی گرام ملا کہ بجّو کی حالت خراب ہے۔ فوراً روبی کو لے کر آؤ"

اچانک علی بھائی کا ٹیلیگرام ملا کہ بجّو کی حالت خراب ہے۔ فوراً روبی کو لے کر آؤ۔

میں فوراً پلین سے بمبئی گئی۔ بجّو کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دروازے پر لگی تھیں۔ شاید انہیں روبی کا شدت سے انتظار تھا — اور اپنی بچّی کو دیکھنے کے بعد وہ سیاہ چمکیلی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔

اس اُفتاد پر میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے۔ میری آنکھوں کے آنسو خشک ہوگئے میری چیخیں سینے میں گھٹ کر رہ گئیں — دونوں بچیوں کو سینے سے چمٹائے میں حیرت اور دُکھ سے بجّو کو آخری سفر پر روانہ ہوتے دیکھتی رہی — میری پتھرائی ہوئی آنکھوں نے علی بھائی کو روتے بلکتے دیکھا لیکن میں بے حس پتھر بنی سب کچھ دیکھتی رہی — اور جب میں بچیوں کو لے کر گھر واپس آئی تو میرے آنسوؤں کا باندھ ٹوٹ گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو علی بھائی کو اپنے پاس دیکھا وہ کہہ رہے تھے: "زرّو! اس طرح بے حال رہو گی تو ان بچیوں کو کون سنبھالے گا؟ مہرو انہیں تمہیں سونپ کر گئی ہیں۔"

اُف! یہ بجّو نے میرے اوپر کیسی ذمہ داری ڈال دی! میں اس کی اہل کب ہوں! میں تو ہمیشہ کی نااہل اور نکمّی ہوں۔ خود اپنی زندگی نہ سنبھال سکی، ورنہ شادی کے بعد میکے کی دہلیز پر کیوں پڑتی؟ اپنے بچے ہوتے تو شاید فطرت خود ہی مجھے ان کی پرورش کرنا سکھا دیتی لیکن اب — اب مجھے کون یہ سب سکھائے گا؟

قسمت نے مجھے دو بچیوں کی ماں تو بنا دیا لیکن ممتا کے جذبے سے لاعلم رکھ کر یہ کیسا ظلم میرے اوپر کیا؟ اور اب علی بھائی کہہ رہے ہیں کہ مہرو ان بچیوں کو تمہیں سونپ گئی ہے — میں نے روبی اور روزی کو اپنے سینے سے لگالیا۔

علی بھائی واپس چلے گئے — انہیں جانا ہی تھا۔ اگلے پھیرے میں وہ بجّو کا کُل زیور اور کپڑے وغیرہ لے آئے۔ "یہ مہرو کی امانت ہے اس کا جو دل چاہے کرو۔" پھر ہر ماہ ایک معقول رقم — ہر خط میں بچیوں کے لئے ڈھیر سارے تحائف۔ اور محبت۔ علی بھائی کی زندگی ایک لگے بندھے ڈھرّے پر چل رہی تھی۔ میں اپنی ملازمت بھی سنبھالتی تھی اور دونوں بچیوں کی پرورش بھی کر رہی تھی۔

کچھ دن بعد کسی نے شوشہ چھوڑا کہ زرّو کا عقد علی میاں سے کر دیا جائے۔ بات مجھ تک آئی تو میں نے قیامت بپا کر دی۔ یہ تو شکر تھا کہ علی بھائی نہیں تھے، ورنہ میں تو ان کے سامنے شرم سے مر ہی جاتی۔ وہ خود کیسا شرمندہ ہوتے۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھا تھا۔ اور میں نے ان کے روپ میں بڑے بھائی کو پایا تھا — لیکن یہ دنیا والے کسی رشتے کی عزت نہیں کرتے۔

دونوں بچیاں اسکول جانے لگیں تو تُتلی زبان سے امّاں کے بجائے 'انّا' نکلا — تو میں ان کی 'انّا' ہی ہوگئی۔ میں ان کی انّا ہی تو تھی۔ انہیں پالنے کے سوا میں نے کیا ہی کیا تھا! اب تو بس ایک ہی تمنا تھی کہ علی بھائی اپنے ہاتھوں سے انہیں دلہن بنا کر رخصت کریں میں سمجھوں گی مجھے دونوں جہان مل گئے — میری بے مقصد زندگی کسی کام آگئی۔ 'ماں' بن کر نہ سہی، 'انّا' بن کر سہی، لیکن — 'بہار میں تابچے'۔ ابھی چند گھنٹے پہلے بمبئی سے ٹرنک کال آیا ہے۔ علی بھائی کا ہارٹ فیل ہوگیا اور میں خشک آنکھیں لئے پتھر دل بنی بیٹھی ہوں۔

آنے والی عورتیں مجھ سے لپٹ لپٹ کر رو رہی ہیں۔ ان میں علی بھائی کی بہنیں بھی ہیں۔ اور بھاوجیں بھی — کچھ میری رشتہ دار خواتین ہیں۔ کچھ پڑوس کی عورتیں ہیں۔ یہ سب مجھے کس کا پُرسہ دے رہی ہیں؟ میں علی بھائی کا پُرسہ کیوں قبول کروں؟ میں نہ ان کی ماں، نہ بہن، نہ میرا ان سے کوئی رشتہ ناطہ۔

روزی اور روبی ابھی اسکول سے آئی ہیں۔ میں عورتوں کی بھیڑ سے نکل کر دونوں کو اپنے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیتی ہوں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہوں۔ آنسوؤں کا ایک سمندر موجزن ہے۔ میرے ساتھ روزی اور روبی بھی اس میں ڈوبتی جا رہی ہیں۔

"لوگو! مجھے میری بچیوں کے باپ کا پُرسہ دو۔"

یہ کیا! میں تو بین کر رہی ہوں!

●●

"اگلے پھیرے میں علی بھائی بجّو کا کُل زیور اور کپڑے لے آئے۔ 'یہ مہرو کی امانت ہے۔ اس کا جو دل چاہے کرو' پھر ہر ماہ ایک معقول رقم، ہر خط میں بچیوں کے لئے ڈھیر سارے تحائف اور محبت۔ میں اپنی ملازمت بھی سنبھالتی تھی اور دونوں بچیوں کی پرورش بھی کر رہی تھی۔"

مسافر: کیا میں یہاں سگریٹ پی سکتا ہوں؟

اسٹیشن ماسٹر: جی نہیں۔ یہاں سگریٹ پینا منع ہے۔

مسافر: تو پھر یہ سگریٹ کے ٹکڑے کن لوگوں کے ہیں؟

اسٹیشن ماسٹر: ان لوگوں کے ہیں جو اجازت نہیں مانگتے۔

●

ایک پولیس مین نے ایک چور کو پکڑ لیا تو چور کہنے لگے "حضور آپ ذرا یہیں رکئے میں اپنے لئے ہتھکڑی لے کر آتا ہوں۔"

پولیس مین بولا۔ "کیوں تو مجھے بیوقوف بناتا ہے۔ تو یہیں ٹھہر میں ہتھکڑی لے کر آتا ہوں۔"

●

ایک ساہوکار کے بڑے لڑکے نے اپنی کلاس میں حساب کے امتحان میں سو میں سے اٹھانوے نمبر حاصل کئے تو خوش خوش باپ کے پاس پہنچا مگر باپ نے یہ سنا تو غصے میں چیخ کر بولا "تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ ارے کم بخت، ہم نے تو ہمیشہ سو کے دو سو کئے ہیں۔ اور تو ہے کہ الٹا جمع میں سے دو اور گھٹا بیٹھا۔"

●

ایک شخص نے کہا کہ اس کے باپ بہت بہادر سپاہی تھے۔ ایک بار جنگ کے میدان سے وہ دشمن کی فوج کے ایک جوان کا پاؤں کاٹ کر لائے تھے۔

سننے والے نے تعجب سے کہا "بھئی کاٹنا ہی تھا تو سر کاٹا ہوتا۔"

اس شخص نے جواب دیا "سر کیسے کاٹتے؟ وہ تو پہلے سے ہی کٹا ہوا تھا۔"

●

ایک صاحب خدا سے دعا کر رہے تھے: 'اے خدا، میں اپنی بیوی سے تنگ آگیا ہوں۔ میں اب بالکل زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے موت دے دے۔"

یہ سن کر بیوی نے کہا "اے خدا ان سے پہلے تو مجھے موت دے دے۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔"

شوہر جلدی سے کہنے لگا "اے خدا تو ان کی دعا قبول کر لے۔ میں اپنی عرضی واپس لیتا ہوں۔"

●

سائنس داں: ہم نے راکٹ کے ذریعہ چوہوں کو آسمان پر روانہ کر دیا۔

خاتون: یہ فضول خرچی نہیں تو پھر کیا ہے۔ میں نے تو بغیر راکٹ کے اپنے شوہر کو آسمان پر پہنچا دیا۔

●

تین دوست آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

پہلا دوست بولا "کتنی عجیب بات ہے، میری بیوی نے ایک ناول پڑھا تھا، جس کا نام تھا 'دو پھول'، اور کل ہی اس نے دو بچوں کو جنم دیا۔"

دوسرے نے کہا: "یہی حال میرے گھر میں ہوا۔ میری بیوی نے ایک ناول 'تین دوست' پڑھا تھا۔ اس کو ایک ساتھ تین بچے پیدا ہوئے۔"

تیسرا دوست یہ سنتے ہی غش کھا کر گر پڑا۔ اسے بہ مشکل ہوش میں لا کر وجہ معلوم کی گئی تو اس نے کہا۔ پرسوں سے میری بیوی جو کتاب پڑھ رہی ہے اس کا نام 'علی بابا چالیس چور' ہے"

●

عورت: آج میری نوکرانی کی سلور جوبلی ہے۔

سہیلی: خوب! کیا تمہاری نوکرانی کو کام کرتے ہوئے پچیس سال ہو گئے؟

سہیلی: نہیں، اس سال میں یہ ہماری پچیسویں نوکرانی ہے۔

●

پارسی فرقہ اپنی رحمدلی اور کار خیر کے لئے مشہور ہے۔ ایک پارسی عورت کا معمول تھا کہ جب وہ شام کو ہوا خوری کے لئے جاتی تو فٹ پاتھ پر ایک ساتھ بھیک مانگنے والے ایک اندھے اور ایک لنگڑے فقیر کو خیرات ضرور دیتی۔ ایک دن اسے صرف لنگڑا فقیر وہاں نظر آیا تو اس نے پیسے دیتے ہوئے یوں ہی پوچھ لیا "کیوں بابا، آج تمہارا ساتھی کدھر گیا؟"

لنگڑے فقیر نے جواب دیا "میم صاحب وہ آج پکچر دیکھنے گیا ہے۔"

●

خود بھی ہنسئے، دوسروں کو بھی ہنسایئے۔ نئے نئے، مزے دار، چٹپٹے لطیفے اشاعت کے لئے بھیجئے۔ پرانے، گھسے پٹے، بار بار سنے اور پڑھے ہوئے چٹکلے ارسال کرنے سے گریز کیجئے، کیوں کہ انہیں پڑھ کر چٹکلوں پر نہیں، چٹکلے بھیجنے والوں پر ہنسی آئے گی!

بیچارہ

محمد عارف

آج کل ہم روزانہ اخبارات میں عورتوں
ظلم و ستم کی داستان پڑھتے ہیں۔ کہیں کسی نئی
بیاہتا عورت کو زندہ جلانے کی خبر ملتی ہے تو
ہیں بیوی کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دینے
خبر آتی ہے۔ لیکن اس نقار خانے میں طوطی
صدا سُنائی نہیں دیتی۔ کوئی انسان تصویر
دوسرا رُخ نہیں دیکھتا۔ حال ہی میں کان پور
شوہروں کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس میں
سارے مرد شامل ہیں جو بیوی کی گالیوں،
طعنوں اور مار پیٹ سے تنگ آ گئے ہیں۔ رونے
چیخنے چلانے کا حق صرف عورت کو حاصل
ہے۔ مرد اس حق کو استعمال نہیں کر سکتا۔
سماج اس مرد کو حقارت اور تمسخر کی نگاہ سے دیکھتا
ہے جو عورت کے ظلم و ستم کی شکایت کرتا ہے۔
مرد کو زیب نہیں دیتا کہ وہ عورت کی مار پیٹ
سے تنگ آ کر زار و قطار روئے۔ اس راستے
میں مرد کی انا بھی آڑے آ جاتی ہے۔ کوئی کیا
کہے گا۔ ارے مرد کا بچہ ہو کر روتا ہے! رونا تو
عورت کا ہتھیار ہے، مرد اسے استعمال نہیں
کر سکتا۔ کان پور کی اس انجمن کی میٹنگ ہر
مہینے ہوتی ہے، جہاں خاوند اپنی بیوی کے ظلم و ستم
کا دُکھڑا سُناتے ہیں۔ انہوں نے اخبارات
اور حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ انہیں اپنی بیوی
کے ظلم و ستم سے بچائیں۔ انہیں اُمید ہے کہ ملک
بھر میں مزید ایسے کلب قائم ہو جائیں گے اور
تصویر کا دوسرا رُخ بھی لوگوں کے سامنے آ جائے
گا۔

یہ تو ہندوستان کی بات ہے جہاں ابھی
جہالت اور غریبی نے اپنا ڈیرا ڈال رکھا ہے لیکن
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے تہذیب یافتہ ملک
بھی اس اُلٹی گنگا سے محروم نہیں۔ امریکہ کو ہی
لیجئے۔ یہ دنیا کا امیر ترین اور ترقی یافتہ ملک کہلاتا
ہے۔ وہاں کی عورتیں بھی مردوں کے ظلم و ستم کی شکایت
کرتی ہیں۔ حکومت کے شعبے مردوں کے قبضے
میں ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر کا نام و نشان نہیں ملتا۔
امریکہ میں بچوں کی پیدائش مرد ڈاکٹر ہی کی نگرانی
میں ہوتی ہے۔ کاروباری اداروں پر مردوں کا قبضہ
ہے۔ اس صورتِ حال سے تنگ آ کر وہاں کی
عورتیں بغاوت پر اتر آئیں۔ انہوں نے اپنے
پیٹی کوٹ اور زنانہ لباس نذرِ آتش کر دئے۔
اور مردوں کے خلاف محاذ بنا لیا لیکن صورتِ حال
جوں کی توں رہی جس ملک میں مردوں کے تسلط
کے خلاف عورتوں کی آزادی کی تحریک شروع
ہوئی، وہاں بھی بعض اوقات مرد عورت کا غلام
نظر آتا ہے۔ وہ اس کی جھڑکیاں سُنتا ہے اس
کی مار کھاتا ہے، لیکن اُف نہیں کرتا۔

خاوند کو مارنا پیٹنا امریکہ کا اہم مسئلہ
ہے۔ لیکن عام لوگ اس مسئلہ سے بے خبر رہتے
ہیں۔ یہ دنیا کا واحد جرم ہے جس کی رپورٹ عموماً
پولیس میں درج نہیں کرائی جاتی۔ خاوند بے چارہ
چپ چاپ مار سہہ جاتا ہے۔ وہ اس بات کو بتاتے
ہوئے جھجکتا ہے کہ اسے اس کی بیوی نے پیٹا
ہے۔ حال ہی میں ایک صحافی عورت نے اس مسئلہ
کی چھان بین کی تو ایسے واقعات سامنے آئے
جن کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک
خاوند نے اس صحافی کو بتایا کہ اس کی بیوی نے
ایک بار اس پر اُبلتا ہوا پانی ڈال دیا۔ دوسرے
نے بتایا کہ میری بیوی نے مجھے چارپائی سے
باندھ دیا۔ اس کے بعد چھڑی سے میری پٹائی
کی"۔ ایک خاوند نے بتایا کہ اس کی بیوی ہمیشہ

...سے پیٹ کے نیچے لات مارتی ہے۔ اگر وہ
...بڈل نہ پہنے ہو تو بھاری ایش ٹرے ہی کھینچ کر
...ی ہے۔ اس صحافی نے جب سارے اعداد و
شمار جمع کئے تو اسے معلوم ہوا کہ ہر سال ۲۷ ہزار
خاوند بیوی کے ہاتھ سے بُری طرح مار کھاتے
ہیں۔ بعض اوقات یہ مار پیٹ اتنی سخت ہو جاتی
ہے کہ خاوند اپنی جان بچانے کے لئے بیوی کو
ہی مار ڈالتا ہے۔

چارلس اور میری کی شادی ۱۹۷۶ء میں
ہوئی تھی۔ چارلس کی عمر ۴۴ سال تھی میری اس
سے ۱۱ سال چھوٹی تھی۔ میری ایک غصیلی اور
جذباتی عورت تھی۔ اسے جب غصہ آجاتا تو وہ
آپے سے باہر ہو جاتی۔ چار سال کی مدت میں اس
نے جوتے، چاقو، چھری، حتیٰ کہ بندوق کا بھی
استعمال کیا۔ ایک بار اس نے غصے میں خاوند
کے مونہہ پر چھری ماردی۔ چھری آنکھ کے بالکل
قریب لگی۔ لیکن خوش قسمتی سے آنکھ بچ گئی۔
ایک بار اس نے خاوند کو بستر پر اس وقت
سوتا پایا جب وہ خود سینما جانے کی تیاری کر رہی
تھی۔ اس نے لوہے سے زنگ چھڑانے کا
کیمیائی مادہ اس پر پھینک دیا۔ چارلس کی کھال
بُری طرح جھلس گئی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کے لئے
داغ دار ہو گیا۔ چارلس بیوی کے ہاتھوں سخت
مجروح ہو کر چار بار اسپتال گیا۔ دوبارہ وہ اتنا
شدید مجروح ہو گیا تھا کہ پولیس نے میری کو
ضربِ شدید کے الزام میں گرفتار کر لیا۔
لیکن واہ رے شرافت! چارلس نے تھانے
میں جا کر کہہ دیا کہ وہ خود زینے سے گر پڑا تھا۔
عدم ثبوت کی بنا پر پولیس نے میری کو چھوڑ دیا۔
چارلس نرم خو آدمی تھا، خاکساری اس میں
کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ اپنی
ظالم بیوی سے شدید محبت کرتا تھا۔ اسے اس
کی جوتیاں کھانا گوارا تھا، لیکن اس کا ساتھ
چھوڑنا برداشت نہیں تھا۔

دوسرے کیس میں معاملہ حد سے بڑھ
گیا اور بیوی کی موت پر ختم ہوا۔ جان اور ایلزا کی
شادی کو چھ برس گزر گئے تھے۔ ان چھ برسوں میں
ایک دن بھی ایسا نہ گزرا تھا جب ایلزا نے
جان کو صلواتیں نہ سنائی ہوں۔ مار پیٹ کا
سلسلہ بھی چلتا رہا جان ہر بار ٹال جاتا۔ لیکن
ایک بار وہ ضرورت سے زیادہ ڈر گیا۔ ایلزا
نے اس سے گالی گلوچ کی۔ جان چپ رہا تو
ایلزا آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے اپنا پرس
کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو جان کو اپنی آنکھوں
کے سامنے موت ناچتی دکھائی دی۔ ایلزا ہمیشہ
پرس میں ریوالور رکھتی تھی۔ جان کو یقین ہو گیا کہ
اب اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اگلے ہی لمحے
ریوالور کی لبلبی دبے گی اور گولی اس کے سینے
کے پار ہو گی۔ اس نے جھٹ دیوار پر ٹنگی بندوق
اٹھائی اور ایلزا پر گولی چلا دی۔ ایلزا زخمی ہو کر
گر پڑی۔ جان نے ایمبولینس کو فون کیا اور اسے
اسپتال لے گیا۔ ایلزا دو ہفتے اسپتال میں
رہی۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی، لیکن
اسے بچا نہ سکے۔ پولیس نے جان کو قتل کے
الزام میں گرفتار کر لیا۔ لیکن یہ دفتری کارروائی
تھی۔ پولیس کو سارا کیس معلوم تھا انہوں نے
جان پر مقدمہ قائم نہیں کیا اور اسے معمولی پوچھ گچھ
کے بعد رہا کر دیا۔

ادھر جان پر شدید احساسِ گناہ سوار
تھا۔ وہ ایلزا کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا
وہ روز اسپتال جاتا اور گھنٹوں بے ہوش
بیوی سے باتیں کرتا اس سے معافی مانگتا
[illegible] وہ
اور بیوی کے تابوت سے محبت بھری باتیں کرتا
رہا۔ وہ اس کی لاش کے سامنے دو زانو ہو جاتا
اور زار و قطار روتا۔ اس سے اپنی محبت کا اقرار
کرتا۔ بیوی کی تدفین کے بعد وہ روز اس کی
قبر پر جاتا اور اس کی یاد میں آنسو بہاتا۔

جب اس صحافی نے یہ واقعات اور
اعداد و شمار اخبار میں شائع کئے تو لوگ
حیران رہ گئے۔ آخر بیویاں خاوند کو کیوں مارتی
ہیں۔ یا خاوند ان سے کیوں مار کھاتے ہیں۔
بعض اوقات عورت تن و توش کی بھاری ہوتی
ہے۔ مرد نازک اور کم زور ہوتا ہے۔ وہ ضخیم
بیوی سے ڈرتا ہے۔ بعض اوقات ادھیڑ عمر
کا مرد ایک جوان عورت سے شادی کر لیتا ہے
وہ عمر کے اس فرق کو محسوس کرتا ہے۔ اسے ڈر لگا
رہتا ہے کہ کہیں اس کی بیوی اسے چھوڑ کر نہ چلی
جائے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اسے کھونا نہیں
چاہتا۔ بیوی یہ قیمت وصول کرتی ہے تو وہ
چوں و چرا نہیں کرتا۔ بعض اوقات محبت بھی مار
پیٹ کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر خاوند بیوی کے
عشق میں گرفتار ہے تو اسے اس کی مار پیٹ
بھی گوارا ہوتی ہے۔ بعض اوقات گھریلو بچوں
کی موجودگی بھی مرد کے آڑے آجاتی ہے۔
وہ گھر میں جھگڑا بڑھا کر بچوں پر برا اثر نہیں ڈالنا چاہتا۔
یا اس کی تربیت بھلے لوگوں نے کی ہے۔
اسے یہ بتایا گیا ہے کہ عورت پر ہاتھ اٹھانا
تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ تربیت اس کے
شعور میں بس گئی ہے۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو اس
میں شک نہیں کہ بعض امریکن بیویوں نے
اپنے خاوند کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے ●

ظہیر کیفی امروہوی

... دادا نے اس سے جب یہ ... وہ کب تک اپنے الگ رہنے کا بندوبست ... کے گا تو شہیر کو ایک دھکا سا لگا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن اسے اپنا وہ گھر چھوڑنا پڑے گا جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ جس کی مٹی میں وہ کھیلا تھا، جس کے کچے آنگن میں وہ دوڑا پھرا تھا۔ اب وہی گھر اس کے لیے اجنبی بنایا جا رہا تھا اور اس کی وجہ اس کی بیوی شمیم تھی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے اختلافات اس کے والد اور دادا کو اس سے اس حد تک بددل اور بدظن کر دیں گے کہ وہ اس کو گھر سے نکال دینے پر تُل جائیں گے۔

شہیر لمحہ بھر کو بھونچکا سا بنا اپنے والد دادا کو تکتا رہا۔ ان کے چہروں پر کوئی ایسا تاثر نہ تھا جس کو دیکھ کر شہیر سمجھ لیتا کہ معاملہ سمجھنے اور سمجھانے سے سلجھ جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اختلاف اور اشتعال کی وجہ اس کی بیوی شمیم ہے جس کی کچھ عادتیں ان لوگوں کو ناگوار اور ناپسند ہیں۔ بس اسی سبب سے وہ لوگ اسے ہمیشہ کے لیے اس گھر سے نکالنے اور دور کرنے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ نہایت مایوسی اور بے بسی کے عالم میں شہیر نے پوچھا "مگر میں کہاں جاؤں گا؟"

"ہم یہ نہیں جانتے۔ جہنم میں جاؤ تم اپنی چہیتی بیوی کے ساتھ" والد صاحب غرائے "اب باتیں برداشت سے باہر ہیں گھر کی باتیں، گھر کی چار دیواری سے باہر، پہلے گلی تک کے لوگوں تک محدود تھیں، لیکن اب تو گلو کے نیم تلے، تک پہنچ چکی ہیں اور اگر تم دونوں اس گھر میں رہے تو سارے شہر میں گشت کرنے لگیں گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم...."

شہیر نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے لہجے کو نرم کرتے ہوئے کہا۔ "ابا جی، میں اس گھر سے الگ رہنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر بیہودگی اور غلطی ہوگئی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔"

"معافی؟ باپ کی جگہ دادا نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔" معافی مسئلہ کا حل نہیں ہے پانی سر سے بہت اونچا ہو چکا ہے، برخوردار۔ ہمارے تمہارے خیالات اور نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

"اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ کو میرے نظریات اور خیالات سے دُکھ پہنچ رہا ہے، ان سے اختلاف ہے۔" شہیر نے ہمت کر کے کہا۔

دادا جی ہتھے سے ہی اُکھڑ گئے۔ "لاحول ولاقوۃ عجیب غمیر کے لڑکے ہو۔ بزرگوں کی باتوں کو تو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ برخوردار ہمارے دادا کے سامنے تو گھر کا کوئی فرد بول ہی نہیں پاتا تھا چہ جائیکہ گھر کی بہوئیں مونہہ کو آئیں، ہماری باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیں، بولتے وقت یہ بھی نہ سمجھیں اور جانیں کہ وہ کہہ کیا رہی ہیں اور کس سے کہہ رہی ہیں۔"

"جی، وہ تو درست ہے۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں جیسا ماحول اور زمانہ ہوتا ہے، خیالات اور نظریات بھی بدلتے جاتے ہیں دادا جی۔"

"بکومت۔ نابکار!" والد صاحب غرائے اُن کے بُشرے سے ایسا لگتا تھا کہ وہ شہیر کو کچا ہی کھا جائیں گے۔ پھر وہ بولے۔

جتنی جلد ممکن ہو آپ اپنی بیگم صاحبہ کو لے کر یہاں سے دفعان ہو جائیے۔ ہم لوگوں سے یہ رات دن کی چخ چخ نہیں سُنی اور سہی جاتی۔"

شہیر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح معاملہ کو سلجھائے اور ان لوگوں کو منائے۔ اس کے سامنے ان گھریلو مسائل سے کہیں زیادہ اہم اس کی اپنی بیرونی زندگی کے مسائل تھے اس کو اپنی الگ دنیا بسانے اور بنانے کے لئے، ابھی کچھ وقت درکار تھا۔ لیکن حالات کا شکنجہ اُسے کسے ہوئے تھا۔ اس نے آخری بار ان لوگوں کی منت سماجت کی۔ اپنا نقطہ نظر اور پروگرام ان کو بتایا۔

"دادا جی، آپ لوگ جیسا کہتے ہیں، جو فیصلہ بھی کرتے ہیں مجھے منظور ہوگا۔ لیکن مجھے کچھ وقت درکار ہے۔ مجھے نوکری کی تلاش ہے۔ مل جائے گی تو میں چلا جاؤں گا یہاں سے۔" یہ کہتے کہتے شہیر کا لہجہ روہانسا ہو گیا اور شاید یہ اسی کا تاثر تھا کہ اس کے والد اور دادا کا رویہ اچانک ڈھیلا پڑ گیا۔

تین دن بھی آرام اور سکون سے نہ گزرے تھے کہ شہیر کی بیوی کی کسی بات پر بزرگ پھر چراغ پا ہو گئے۔ شہیر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح حالات کا مقابلہ کرے۔ کس طرح بیوی کو سمجھائے اور بتائے کہ وہ کس قدر الجھن اور پریشانی میں مبتلا ہے کس طرح اپنے والدین اور دادا جی کے یہ ذہن نشین کرائے کہ وہ بے قصور ہے، حالات سے مجبور ہے اور ذہنی طور پر الجھا ہوا ہے۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا، اس کا اظہار وہ نہ اپنی بیوی سے کر پاتا۔ نہ بزرگوں کو بتا پاتا۔

وہ عجیب مخمصے میں گرفتار تھا کہ کس طرح آنے والے طوفان اور ہنگامے سے خود کو محفوظ رکھے۔
اسی ادھیڑبُن میں وہ لمحے آپہنچا، جب شہیر کو اپنا مختصر سامان سمیٹ کر باندھنا پڑا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر جانے ہی والا تھا کہ اچانک شہیر کے ماموں آنکلے۔ انہوں نے جب شہیر اور اس کی بیوی کو سامان سمیٹ کہیں جاتے ہوئے پایا تو پوچھا۔ "کیوں بھئی، یہ تم دونوں سامان سمیٹ کہاں جانے کی تیاری میں ہو؟"
شہیر کی بیوی بولی۔ "گھر چھوڑ کر جارہے ہیں یہ گھر ہمارا تھا ہی کب؟"
"کیوں؟ کیا ہوا؟"
"ابھی میں بتاتا ہوں، بلّو میاں" دادا جی نے ماموں کو بتانا شروع کیا۔ ہماری ان لوگوں سے نہیں نبھ سکتی، اس لیے، ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ دونوں کہیں الگ جا کر رہیں۔"
"لیکن یہ کہیں شریفوں کا شیوہ ہے کہ گھر کی بہو اور بیٹے پوتے بزرگوں کے سائے سے دُور جا کر بے امان رہیں؟"
"یہ سب میں نہیں جانتا میاں بلّو — حالات نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ان دونوں کو ہماری نظروں سے دور ہی رہنا چاہیے۔"
شہیر اور اس کی بیوی شمیم نے گھر پر آخری نظر ڈالی، سب کی طرف حسرت آمیز نظروں سے دیکھا اور گھر سے باہر جانے کے لیے، قدم نکالا ہی تھا کہ ماموں صاحب نے ان دونوں کو تنبیہہ کی "خبردار! ٹھیرو — بات سُنو۔"
"نہیں نہیں، جانے دو ان کو میاں بلّو۔" والد صاحب نے ماموں کو ٹوکا۔
ماموں تیز ہو کر بولے "دادا جی، آپ نے یہ نئی بات سنی ہے یا نہیں — وہ جو گلو کا نیم ہے نا کچھ خود غرض اور لالچی لوگوں نے اسے بیچ دیا۔ چنانچہ اس کو کاٹنے والے آدھمکے۔ کلہاڑیاں تانے یہ لوگ اس کے بھاری تنے پر وار کرنے ہی والے تھے کہ کسی من چلے نے ان پر وار کر دیا۔ پھر کیا تھا بہت بڑا ہنگامہ اور بہت بڑا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ساری خلقت وہاں اُمڈی پڑی ہے یہ تماشا دیکھنے کو کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟"
"ارے!" دادا جی اور والد صاحب بولے۔ "تو پھر کیا ہوا؟"
"اجی یہ بھی کوئی عقل مندی ہے کہ برسوں پرانے اس گلو کے نیم کو محض چند ٹکوں میں بیچ کر لوگوں کو اس کی چھایا سے محروم کر دیا جائے؟ اب دیکھئے نا کیسی چہل پہل کی جگہ ہے۔ شہری ہو کہ دیہاتی، عورت ہو یا مرد، بچّہ ہو یا بوڑھا سب کے لیے یہ گلو کا نیم پناہ کی جگہ بنا رہا ہے۔ اور وہ چار آدمیوں کے مل بیٹھنے کی جگہ کو برباد کرنے والے یہ لوگ کون ہیں؟ پیٹ بھرے لوگ۔"
"کون — کون ہیں وہ؟" دادا جی نے دلچسپی اور توجّہ سے پوچھا۔
"اجی ایک تو وہ حاجی حکمت اللہ ہیں، دوسرے وہ ٹھیکے دار ہیں رستم علی، اور تیسرے وہ۔"
"لاحول ولاقوۃ!۔ دادا جی نے برا سا مونہہ بنایا" عجیب خمیر کے ہیں یہ لوگ، جو دوسروں کے دُکھ اور تکلیف کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔!"
ماموں نے دیکھا دادا جی کے غصّہ کا پارہ گلو کے نیم سے متعلق باتوں کی طرف ہے تو انہوں نے نہایت آہستگی سے کہا۔ دادا جی، دراصل سارا معاملہ یہی ہے کہ آج کا آدمی، دوسروں کے دُکھ اور پریشانی کو قطعی محسوس نہیں کرتا اور محض اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی جستجو میں لگا ہوا ہے۔ مانا کہ زمانہ بدل گیا ہے، نئی اور پرانی نسلوں کے درمیان سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کے طریقے اور خیالات بدل گئے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سرے سے ہر پرانی بات کو ختم کیا جائے چاہے وہ مفید ہی کیوں نہ ہو۔"
"جی ہاں — جی ہاں۔" والد صاحب بولے
دادا جی نے بھی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ "میاں بلّو، اگر نئی نسل اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلے تو کاہے کو یہ آفتیں آئیں"
یہ کہتے ہوئے دادا جی نے ایک اچٹتی ہوئی نظر شہیر کی بیوی کی طرف اٹھائی۔ ایک پل کے لیے انہوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا تو وہ دنگ رہ گئے۔ پوتے کی بہو شمیم کے چہرے کا رنگ آنے والے حالات سے زرد اور پھیکا ہو رہا تھا۔ جہاں دیدہ، تجربہ کار دادا جی نے آپ ہی آپ کہا اور سب نے ان کے چہرے کو دیکھا۔
"لاحول ولاقوۃ! آدمی نادانی اور ناسمجھی میں کیسی کیسی حماقتیں اور زیادتیاں کر بیٹھتا ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے لگائے ہوئے پودے کو برسوں کی محنت اور ریاضت کے بعد تن آور درخت بنا کر اُسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اب دیکھو نا، سو ڈیڑھ سو سال پہلے کسی اللہ کے بندے نے یہ نیم کا پودا بویا ہوگا، پھر اس کی نگہداشت کر کے اسے سینچا اور پالا ہوگا، پروان چڑھایا ہوگا اور ہزاروں موسموں کی سختیوں کو جھیل کر بھی یہ درخت دوسروں کو راحت پہنچانے کا ایک بڑا ذریعہ بنا رہا ہے۔ اور کچھ لوگ اُسے کاٹنے پر آمادہ ہیں۔ لال ولاقوۃ! میاں بلو، ذرا ان دونوں سے تم ہی کہو کے یہ گھر سے نہ جائیں۔ بعض باتیں غصّے میں کہہ دی جاتی ہیں جن کا مطلب یہ نہیں کہ ان کو ہی صحیح مان لیا جائے۔" پھر آہستگی سے دادا جی بولے۔ بہو کا پاؤں بھاری ہے۔ اسے اب گھر تو گھر پلنگ سے بھی نیچے اپنا پاؤں نہ اتارنا چاہیئے۔"
دادا جی کے اس انکشاف اور فیصلے کو سن کر گھر کی فضا میں ٹھنڈک سی گھل مل گئی اور دونوں بزرگ شہیر اور ماموں صاحب کے ہمراہ گلو کے نیم کی گتھی سلجھانے کو چل کھڑے ہوئے۔
○○

ازواجِ مطہرات

بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا

حضرت خدیجہ طاہرہؓ رسول صلعم کی پہلی
ں۔ ان کے والد کا نام خویلد بن اسد تھا اور
ا نام فاطمہ بنت زائیدہ۔ وہ قریش کے قبیلے
ں رکھتی تھیں۔ خویلد بن اسد قریش کے ایک
ب تاجر تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد
خدیجہؓ نے ان کا کاروبار سنبھال لیا۔ ان
شادی ابو ہالہ سے ہوئی تھی۔ ان کے خاوند
بنو تمیم کے قبیلے سے تھا۔ ابو ہالہ سے ان
بیٹے ہوئے۔ پہلے بچے کا نام ہالہ تھا اور
ے کا ہند۔ یہ نسوانی نام ہیں۔ عرب میں دستور
بچے کو بری نظر سے بچانے کے لیے اس کا نام
ے نام پر رکھا جاتا تھا (حضرت خدیجہؓ کے
ے بیٹے ہند جنگِ جمل میں حضرت علیؓ کی
سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے) حضرت
کا دوسرا نام اُمِّ ہند بھی تھا۔ پہلے خاوند
ل کے بعد ان کی شادی عتیق بن عائض
ی۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام
ھا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے دوسرے
ا بھی انتقال ہوگیا۔

حضرت خدیجہؓ ایک نیک اور پارسا خاتون تھیں۔ وہ اپنے خالی وقت میں خانۂ کعبہ جا کر عبادت میں مشغول ہو جاتیں۔ مکہ کے شرفا ان سے نکاح کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے کسی کی پیش کش کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ ان کی قسمت میں تو محسنِ انسانیت اور پیغمبرِ اسلامؐ کی زوجہ ہونے کا شرف لکھا تھا۔ انہیں ام المومنین کا لقب ملنا تھا۔

جب حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد جنگِ فجار میں مارے گئے تو حضرت خدیجہؓ کو کاروبار کے متعلق تشویش لاحق ہوئی۔ انہیں ایک ایسے انسان کی تلاش ہوئی جو نیک اور ایمان دار ہو اور کاروباری سوجھ بوجھ رکھتا ہو۔ رسول صلعم کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی۔ وہ اپنی نیکی اور ایمانداری کی وجہ سے مکہ میں 'امین' کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کے عزیزوں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا کاروبار ان کو سونپ دیں۔ حضرت خدیجہؓ نے اس مشورے کو قبول کر لیا۔ ابتدا میں رسول صلعم نے تامل کیا، لیکن بعد میں اپنے چچا ابو طالب کے سمجھانے سے راضی ہو گئے۔ کاروبار کی شرائط مکہ کے قانون کے مطابق طے ہو گئیں۔ منافع میں سرمایہ کار کا آدھا حصہ اور آدھا حصہ کارکن کے لیے طے ہوگیا۔

رسول اللہؐ کو کاروبار کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا، لیکن پہلے ہی مرحلے میں ان کی خداداد صلاحیت ظاہر ہو گئی۔ وہ قافلے کے ساتھ شام گئے، اپنا مال فروخت کیا اور مکہ کے لیے مال خریدا۔ اس کاروبار میں جتنے نفع کی امید تھی، انہیں اس سے دگنا نفع حاصل ہوا۔ اس سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ شام کے سفر کے دوران رسول اللہ کی ملاقات ایک عیسائی راہب نسطور سے ہوئی۔ نسطور نے حضرت محمدؐ کے چہرے پر نظر ڈالی تو اُسے یقین ہوگیا کہ عہدِ عتیق کی کتابوں میں جس نبی آخر الزماں کا ذکر ہے وہ یہی ہیں۔ اس نے میسرہ کو بتایا کہ تمہارے ساتھی کو خدا کے آخری پیغمبر بننے کی فضیلت ملے گی۔

محمد صلعمؐ کی محنت اور ایمان داری سے حضرت خدیجہؓ کے کاروبار میں ترقی ہوئی۔ شام کے دوسرے سفر میں بھی منافع حاصل ہوا۔ رفتہ رفتہ حضرت خدیجہؓ کے دل میں آں حضرتؐ کے لیے عقیدت پیدا ہوگئی۔ ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ سورج ان کے آنگن میں اُتر آیا ہے جس کی روشنی سے سارا مکہ منور ہوگیا۔ حضرت خدیجہؓ نے آں حضرتؐ کو نکاح کا پیغام دیا۔ یہ مثال اس بات کی دلیل ہے کہ اس زمانے کی عرب عورت نہ صرف کاروباری معاملات میں آزاد تھی بلکہ اپنے رفیقِ سفر کے انتخاب میں بھی خود مختار تھی۔ اس پیغام کو سن کر آں حضرتؐ کو تامل ہوا۔ حضرت خدیجہؓ مکہ کی ایک مال دار خاتون تھیں اور آں حضرتؐ کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی۔ نکاح کے نام و پیام میں حضرت خدیجہؓ

کی خادمہ نفیسہ نے اہم رول ادا کیا۔ آں حضرتؐ بہت شرمیلے انسان تھے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں سے مشورہ کیا۔ سب کی یہی رائے ہوئی کہ آپ خدیجہؓ کے پیام کو قبول کرلیں۔ دونوں کی شادی طے ہوگئی۔ خدیجہؓ کے ولی ان کے چچا عمر بن اسد تھے۔ آں حضرتؐ کے چچا ابوطالب نے نکاح کی تقریب ادا کی اور خدیجہؓ آں حضرتؐ کے نکاح میں آگئیں۔ مہر کی رقم ۵۰۰ درہم مقرر ہوئی۔ آں حضرتؐ نے یہ رقم اپنے ۲۰ اونٹ فروخت کر کے ادا کر دی۔ شادی کی تقریب میں حلیمہ بھی شریک ہوئیں۔ انہوں نے آں حضرتؐ کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ وہ رسول اللہؐ کی رضاعی ماں تھیں۔ حضرت خدیجہؓ نے ان کو ۵۰۰ دینار انعام دیا۔ شادی کے موقع پر آں حضرتؐ کی عمر ۲۵ سال اور خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ لیکن عمر کا یہ فرق ان کی کامیاب اور پُرمسرت زندگی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا۔ آں حضرتؐ کو مالی پریشانیوں سے نجات مل گئی۔ یہ فرصت کے لمحات ان کی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ بن گئے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ہمیشہ ان لمحات کو یاد کرتے تھے۔

آں حضرتؐ نے فرصت کا وقت لہو و لعب میں نہیں گزارا وہ تھوڑے سے ستو اور پانی لے کر غارِ حرا چلے جاتے اور اپنا وقت مراقبہ میں گزارتے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔ جب ان کی عمر ۴۰ سال ہوگئی تو غارِ حرا میں ان پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ اس وحی سے آں حضرتؐ خوف زدہ ہوگئے۔ اسی خوف اور دہشت کے عالم میں وہ گھر پہنچے تو حضرت خدیجہؓ ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ان کے سوال پر آں حضرتؐ نے ان کو سارا ماجرا سنایا۔ حضرت خدیجہؓ نے ان کو دلاسا دیا۔ ان کی کپکپی دور کرنے کے لیے ان کو چادر اوڑھائی۔ قرآن میں یاایھاالمدثر والی آیت اسی واقعے سے متعلق ہے۔

دوسرے دن حضرت خدیجہؓ اپنے ایک عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ ورقہ انجیل اور تورات کے عالم تھے۔ انہوں نے جب سارا ماجرا سنا تو کہا "یہ تو وہی پیغمبر آخرالزماں ہیں جن کی آمد کی بشارت عہدِ عتیق کی کتابوں میں موجود ہے۔ ان کو خدا کا پیغام پہنچانے میں تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی اگر میں زندہ رہا تو ضرور ان کی مدد کروں گا"۔

حضرت خدیجہؓ نے جب ورقہ کی بات سنی تو ان کو یقین ہوگیا کہ ان کے خاوند ہی خدا کے نبی ہیں۔ انہوں نے گھر پہنچ کر آں حضرتؐ کو سارا واقعہ سنایا اور اسلام قبول کرلیا۔ اس طرح اُمتِ محمدؐ میں ان کو اوّلیت کا شرف حاصل ہوا۔ جب آں حضرتؐ نے مکّے کے لوگوں کو جمع کرکے اسلام کی دعوت دی تو اکثر لوگوں نے ان کی دعوت کو مذاق سمجھا۔ یہی نہیں بلکہ انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ اس دَور میں آں حضرتؐ کو خدیجہؓ کا پورا تعاون حاصل رہا۔ وہ ان کے دُکھ درد میں شریک رہیں۔ پیغمبرِ اسلام نے ان کے تعاون اور مدد کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ان کے انتقال کے بعد جب بھی آں حضرتؐ قربانی کرتے وہ اس کا گوشت خدیجہؓ کے رشتہ داروں کے یہاں ضرور بھجواتے۔

حضرت خدیجہؓ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ ایک ہمدرد انسان اور غمگسار بیوی تھیں۔ انہوں نے اسلام کے دَورِ ابتدا میں رسول اللہؐ کا پورا ساتھ دیا اور ان کے مشن کی کامیابی کے لیے تن من دھن کی بازی لگادی۔ اس خدمت کے لئے دنیائے اسلام ان کی احسان مند ہے۔ وہ ساری رات خدا کی عبادت کرتی تھیں۔ (اس وقت تک پانچ نمازیں فرض نہیں ہوئی تھیں۔)

آں حضرتؐ اپنی بیوی کی ہمدردی اور تو اس قدر معترف تھے کہ وہ ان کے انتقا بعد بھی ان کو فراموش نہ کر سکے۔ ایک بار حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہ آں حضرتؐ سے آئیں۔ ان کی آواز سن کر آں حضرتؐ نے "یہ ضرور ہالہ کی آواز ہے۔ اس کی آواز خ آواز سے مشابہہ ہے"۔

آں حضرتؐ سے خدیجہؓ کے جو اولاد پہلے لڑکے کا انتقال ۴ برس کی عمر میں ہوگ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ۴ بیٹیاں ہوئیں۔ ان کے نام زینب، رقیہ، اُمِّ کلثو فاطمہ تھے۔ سب سے بڑی بیٹی زینب شادی ابوالعاص سے ہوئی، جو حضرت خد کے بھانجے تھے۔ حضرت زینب بعثت سے پیش تر پیدا ہوئی تھیں۔ جنگِ بدر میں ابو مکّہ کے کفار کی حمایت میں لڑے اور قیدی مدینہ لائے گئے۔ ان کی رہائی کے لئے مکّ زینب نے ایک ہار بھیجا۔ یہ ہار حضرت خ نے زینب کو دیا تھا۔ جب آں حضرتؐ یہ ہار دیکھا تو ان کی آنکھیں نم ہوگئیں انہوں کہا کہ میں یہ ہار اور قیدی دونوں واپس کردو اگر میری بیٹی زینب کو مدینہ بھیج دیا جائے شرط قبول کرلی گئی اور زینب مدینہ پہنچ گئیں ان کا انتقال تلوار کے ایک زخم سے ہوا۔ یہ ہجرت آٹھواں سال تھا۔ ان کا قاتل حماد بن اسد جو ابوسفیان کا ایک قریبی عزیز تھا۔ دوسری بیٹی رقیہ اور اُمِّ کلثوم ابولہب کے دو بیٹوں سے گئی تھیں۔ ابولہب کی اسلام دشمنی مشہور تھی۔ ا کے بیٹوں نے دونوں بیویوں کو طلاق دے دی رقیہ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے ہوگیا۔ دونوں میا بیوی مکّہ سے مدینہ پہنچے۔ مدینہ میں رقیہ کا انتق

ہوگیا تو آں حضرتؐ نے اپنی تیسری بیٹی ام کلثومؓ سے حضرت عثمانؓ کا نکاح کرادیا۔ اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ کا لقب "ذوالنورین" پڑ گیا۔ چوتھی بیٹی حضرت فاطمہؓ کا نکاح آں حضرتؐ کے چچازاد بھائی شیرِ خدا حضرت علیؓ سے ہوا۔

حضرت خدیجہؓ نے اپنے غلام زید کو آں حضرتؐ کے سپرد کردیا۔ آں حضرتؐ نے زید کو آزاد کر کے اس کو اپنا لے پالک بنا لیا۔ رسول اللہؐ کو زید سے اتنی محبت تھی کہ انہوں نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کا نکاح زید سے کردیا۔ رسول خداؐ خدیجہؓ کے پہلے خاوند کے بچوں سے بھی اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی اپنی اولاد سے۔

حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہجرت سے ۳ سال قبل مکہ میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ ان کا مزار مکہ میں جنت المعلیٰ میں ہے۔ ان کے مزار کے قریب آں حضرتؐ کے آبا و اجداد کی قبریں ہیں۔ آں حضرتؐ فرماتے تھے کہ خدیجہؓ سے بہتر کوئی بیوی نہیں ہے۔ عورتوں میں مریم بنت عمران اور میری بیوی خدیجہؓ سے بڑھ کر کسی کا درجہ نہیں ہے۔ خدیجہؓ کے انتقال کے بعد آں حضرتؐ بہت آزردہ ہوئے۔ خدیجہؓ کے انتقال کے بعد ان کا مکہ میں رہنا اور بھی مشکل ہوگیا۔ رہی سہی کسر ان کے چچا اور مربی ابو طالب کے انتقال نے پوری کردی اور آں حضرتؐ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنی پڑی۔ اور یوں مدینہ اسلام کا مرکز بن گیا۔

آں حضرتؐ اور خدیجہؓ کی ازدواجی زندگی بامثالی زندگی تھی۔ آں حضرتؐ نے

ایک بھیڑیا عورت کی کہانی

افتخار حسین

آج سے ۱۵ سال پہلے امریکن سفارت خانے کا ایک افسر اپنی بیوی کے ساتھ شکار کی نیت سے نکلا۔ دونوں کئی روز تک گھنے جنگلوں میں گھومتے رہے، انہوں نے ہرن، خرگوش اور مرغابیوں کا شکار کیا۔ ایک دن وہ گھنے جنگلوں میں جیپ چلا رہے تھے کہ سامنے بھیڑیوں کا غول دکھائی دیا انہوں نے جیپ کا رخ موڑنے کی بجائے اس کی رفتار تیز کردی۔ بھیڑیوں نے جب موٹر کی آواز سنی تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ دونوں میاں بیوی یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ انہیں ایک حیرت انگیز جانور نظر آیا۔ ...نہوں نے جیپ کا رخ اس کی طرف موڑ دیا تو یہ دیکھ ...ت کی انتہا نہ رہی کہ وہ جس جانور کے ... وہ ایک عورت ہے۔ یہ عورت ...کی طرح چاروں ہاتھ ... میاں بیوی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ جیپ کو اس جانور نما انسان کے پیچھے دوڑاتے رہے۔ جب ان کو یقین ہوگیا کہ جانور ایک عورت ہے تو انہوں نے جیپ روک دی اور اسے پکڑ لیا۔ جانور نما عورت نے ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے اپنے پنجے چلائے، لیکن امریکن طاقت ور تھا اس نے عورت کو قابو میں کرلیا۔ دونوں میاں بیوی نے مزید شکار ملتوی کردیا اور اس عورت کو لے کر دہلی آگئے۔

دہلی پہنچ کر انہوں نے بھیڑیا نما عورت کو مدر ٹریسا کے ہوم میں داخل کردیا۔ مدر ٹریسا کی مددگار سسٹر کونراڈ نے اس عورت کو اپنی نگہداشت میں رکھا۔ اس عورت کا نام پتہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ بھیڑیوں کے غول میں کب اور کیسے پہنچی، لیکن ایسا معلوم

کی خادمہ نفیسہ نے اہم رول ادا کیا۔ آں حضرتؐ بہت شرمیلے انسان تھے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں سے مشورہ کیا۔ سب کی یہی رائے ہوئی کہ آپ خدیجہؓ کے پیام کو قبول کرلیں۔ دونوں کی شادی طے ہوگئی۔ خدیجہؓ کے ولی ان کے چچا عمرو بن اسد تھے۔ آں حضرتؐ کے چچا ابوطالب نے نکاح کی تقریب ادا کی اور خدیجہؓ آں حضرت کے نکاح میں آگئیں۔ مہر کی رقم ۵۰۰ درہم مقرر ہوئی۔ آں حضرتؐ نے یہ رقم اپنے ۲۰ اونٹ فروخت کر کے ادا کردی۔ شادی کی تقریب میں حلیمہ بھی شریک ہوئیں۔ انہوں نے آں حضرتؐ کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ وہ رسول اللہؐ کی رضاعی ماں تھیں۔ حضرت خدیجہؓ نے ان کو ۵۰۰ دینار انعام دیا۔ شادی کے موقع پر آں حضرتؐ کی عمر ۲۵ سال اور خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ لیکن عمر کا یہ فرق ان کی کامیاب اور پُرمسرت زندگی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا۔ آں حضرتؐ کو مالی پریشانیوں سے نجات مل گئی۔ یہ فرصت کے لمحات ان کی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ بن گئے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ہمیشہ ان لمحات کو یاد کرتے تھے۔

آں حضرتؐ نے فرصت کا وقت لہو و لعب میں نہیں گزارا وہ تھوڑے سے ستو اور پانی لے کر غارِ حرا چلے جاتے اور اپنا وقت مراقبہ میں گزارتے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔ جب ان کی عمر ۴۰ سال ہوگئی تو غارِ حرا میں ان پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ اس وحی سے آں حضرتؐ خوف زدہ ہوگئے۔ اسی خوف اور دہشت کے عالم میں وہ گھر پہنچے تو حضرت خدیجہؓ ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ان کے سوال پر آں حضرتؐ نے ان کو سارا ماجرا سنایا۔ حضرت خدیجہؓ نے ان کو دلاسا دیا۔ ان کی کپکپی دور کرنے کے لیے ان کو چادر اوڑھائی۔ قرآن میں یاایھاالمدثر والی آیت اسی واقعے سے متعلق ہے۔

دوسرے دن حضرت خدیجہؓ اپنے ایک عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ ورقہ انجیل اور تورات کے عالم تھے۔ انہوں نے جب سارا ماجرا سُنا تو کہا "یہ تو وہی پیغمبر آخرالزماں ہیں جن کی آمد کی بشارت عہدِ عتیق کی کتابوں میں موجود ہے۔ ان کو خدا کا پیغام پہنچانے میں تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی اگر میں زندہ رہا تو ضرور ان کی مدد کروں گا۔"

حضرت خدیجہؓ نے جب ورقہ کی بات سنی تو ان کو یقین ہوگیا کہ ان کے خاوند ہی خدا کے نبی ہیں۔ انہوں نے گھر پہنچ کر آں حضرتؐ کو سارا واقعہ سنایا اور اسلام قبول کرلیا۔ اس طرح اُمتِ محمدؐ میں ان کو اوّلیت کا شرف حاصل ہوا۔ جب آں حضرتؐ نے مکّہ کے لوگوں کو جمع کر کے اسلام کی دعوت دی تو اکثر لوگوں نے ان کی دعوت کو مذاق سمجھا۔ یہی نہیں بلکہ انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ اس دَور میں آں حضرتؐ کو خدیجہؓ کا پورا تعاون حاصل رہا۔ وہ ان کے دُکھ درد میں شریک رہیں۔ پیغمبرِ اسلام نے ان کے تعاون اور مدد کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ان کے انتقال کے بعد جب بھی آں حضرت قربانی کرتے وہ اس کا گوشت خدیجہؓ کے رشتہ داروں کے یہاں ضرور بھجواتے۔

حضرت خدیجہؓ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ ایک ہمدرد انسان اور غم گسار بیوی تھیں۔ انہوں نے اسلام کے دَورِ ابتدا میں رسول اللہؐ کا پورا ساتھ دیا اور ان کے مشن کی کامیابی کے لیے تن من دھن کی بازی لگادی۔ اس خدمت کے لیے دنیائے اسلام ان کی احسان مند ہے۔ وہ ساری رات خدا کی عبادت کرتی تھیں۔ (اس وقت تک پانچ نمازیں فرض نہیں ہوئی تھیں۔)

آں حضرتؐ اپنی بیوی کی ہمدردی اور تعاون کے اس قدر معترف تھے کہ وہ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کو فراموش نہ کرسکے۔ ایک بار مدینہ میں حضرت خدیجہؓ کی بہن ہالہ آں حضرت سے ملنے آئیں۔ ان کی آواز سن کر آں حضرتؐ نے فرمایا۔ "یہ ضرور ہالہ کی آواز ہے۔ اس کی آواز خدیجہؓ کی آواز سے مشابہ ہے۔"

آں حضرتؐ سے خدیجہؓ کے جو اولاد ہوئیں۔ پہلے لڑکے کا انتقال ۴ برس کی عمر میں ہوگیا۔ دوسرے کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ۴ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے نام زینب، رقیہ، اُمِ کلثوم اور فاطمہ تھے۔ سب سے بڑی بیٹی زینب کی شادی ابوالعاص سے ہوئی، جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے۔ حضرت زینب بعثت سے ۱۰ سال پیش تر پیدا ہوئی تھیں۔ جنگِ بدر میں ابوالعاص مکّہ کے کفار کی حمایت میں لڑے اور قیدی بنا کر مدینہ لائے گئے۔ ان کی رہائی کے لئے مکّہ سے زینب نے ایک ہار بھیجا۔ یہ ہار حضرت خدیجہؓ نے زینب کو دیا تھا۔ جب آں حضرتؐ نے یہ ہار دیکھا تو ان کی آنکھیں نم ہوگئیں انہوں نے کہا کہ میں یہ ہار اور قیدی دونوں واپس کردوں گا اگر میری بیٹی زینب کو مدینہ بھیج دیا جائے۔ یہ شرط قبول کرلی گئی اور زینب مدینہ پہنچ گئیں۔ ان کا انتقال تلوار کے ایک زخم سے ہوا۔ یہ ہجرت کا آٹھواں سال تھا۔ ان کا قاتل حماد بن اسد تھا، جو ابوسفیان کا ایک قریبی عزیز تھا۔ دوسری بیٹیاں رقیہ اور اُمِ کلثوم ابولہب کے دو بیٹوں سے بیاہی گئی تھیں۔ ابولہب کی اسلام دشمنی مشہور تھی۔ اس کے بیٹوں نے دونوں بیویوں کو طلاق دے دی۔ رقیہ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے ہوگیا۔ دولہا میاں بیوی مکّہ سے مدینہ پہنچے۔ مدینہ میں رقیہ کا انتقال

ہوگیا تو آں حضرتؐ نے اپنی تیسری بیٹی اُمِ کلثوم سے حضرت عثمانؓ کا نکاح کرادیا۔ اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ کا لقب "ذوالنورین" پڑ گیا۔ چوتھی بیٹی حضرت فاطمہ کا نکاح آں حضرتؐ کے چچازاد بھائی شیرِ خدا حضرت علیؓ سے ہوا۔

حضرت خدیجہؓ نے اپنے غلام زید کو آں حضرتؐ کے سپرد کردیا۔ آں حضرتؐ نے زید کو آزاد کر کے اس کو اپنا لے پالک بنالیا۔ رسول اللہؐ کو زید سے اتنی محبت تھی کہ انہوں نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کا نکاح زید سے کردیا۔ رسول خداؐ خدیجہؓ کے پہلے خاوند کے بچوں سے بھی اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی اپنی اولاد سے۔

حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہجرت سے ۳ سال قبل مکہ میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ ان کا مزار مکہ میں جنت المعلٰی میں ہے۔ ان کے مزار کے قریب آں حضرتؐ کے آباواجداد کی قبریں ہیں۔ آں حضرتؐ فرماتے تھے کہ خدیجہؓ سے بہتر کوئی بیوی نہیں ہے۔ عورتوں میں مریم بنت عمران اور میری بیوی خدیجہؓ سے بڑھ کر کسی کا درجہ نہیں ہے۔ خدیجہؓ کے انتقال کے بعد آں حضرتؐ بہت آزردہ ہوئے۔ خدیجہؓ کے انتقال کے بعد ان کا مکہ میں رہنا اور بھی مشکل ہوگیا۔ رہی سہی کسر ان کے چچا اور مربی ابوطالب کے انتقال نے پوری کردی اور آں حضرتؐ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنی پڑی۔ اور یوں مدینہ اسلام کا مرکز بن گیا۔

آں حضرتؐ اور خدیجہؓ کی ازدواجی زندگی ... مثالی زندگی تھی۔ آں حضرتؐ نے ...

ایک بھیڑیا عورت کی کہانی

افتخار حسین

آج سے ۱۵ سال پہلے امریکن سفارت خانے کا ایک افسر اپنی بیوی کے ساتھ شکار کی نیت سے نکلا۔ دونوں کئی روز تک گھنے جنگلوں میں گھومتے رہے، انہوں نے ہرن، خرگوش اور مرغابیوں کا شکار کیا۔ ایک دن وہ گھنے جنگلوں میں جیپ چلا رہے تھے کہ سامنے بھیڑیوں کا غول دکھائی دیا انہوں نے جیپ کا رُخ موڑنے کی بجائے اس کی رفتار تیز کردی۔ بھیڑیوں نے جب موٹر کی آواز سنی تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ دونوں میاں بیوی یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ انہیں ایک حیرت انگیز جانور نظر آیا۔ ...نہوں نے جیپ کا رُخ اس کی طرف موڑ دیا تو ...یدیکھ...ت کی انتہا نہ رہی کہ وہ جس جانور کے ... وہ ایک عورت ہے۔ یہ عورت ... کی طرح چاروں ہاتھ ... میاں بیوی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ جیپ کو اس جانور نما انسان کے پیچھے دوڑاتے رہے۔ جب ان کو یقین ہوگیا کہ جانور ایک عورت ہے تو انہوں نے جیپ رد کی اور اسے پکڑ لیا۔ جانور نما عورت نے ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے اپنے پنجے چلائے، لیکن امریکن طاقتور تھا اس نے عورت کو قابو میں کرلیا۔ دونوں میاں بیوی نے مزید شکار ملتوی کردیا اور اس عورت کو لے کر دہلی آگئے۔

دہلی پہنچ کر انہوں نے بھیڑیا نما عورت کو مدر ٹریسا کے ہوم میں داخل کردیا۔ مدر ٹریسا کی مددگار سسٹر کونراڈ نے اس عورت کو اپنی نگہداشت میں رکھا۔ اس عورت کا نام پتہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ بھیڑیوں کے غول میں کب اور کیسے پہنچی، لیکن ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ وہ برسوں سے ان کے ساتھ رہتی ہے
اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر تھی۔ اس کے بال
تیزی سے اُگے ہوئے تھے۔ وہ کچا گوشت مزے
سے چبا چبا کر کھاتی تھی۔ پانی کے برتن میں مونہہ
ڈال کر پانی پیتی تھی۔ کوئی قریب آتا تو فوراً اپنے
تیز ناخنوں سے اس پر جھپٹا مارتی، مدر ٹریسا
کے ہوم میں وہ بھیڑئیے کے نام سے پکاری جانے
لگی۔

انسان کی اپنی کوئی زبان نہیں ہوتی

وہ زبان کا استعمال اپنے ماحول سے سیکھتا ہے
عورت بھیڑئیے کو صرف غرّانا آتا تھا۔ وہ کوئی لفظ
ادا نہیں کر سکتی تھی، ہوم میں رہ کر بھی وہ کوئی زبان
نہیں سیکھ سکی۔ ابتدا میں وہاں کے کارکنوں کو
بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اس کے ناخن
تراشے، لباس پہنایا، اس کے بال دھو کر صاف کئے، لیکن
بھیڑئیے نے کپڑے پھاڑ دئے۔ دال اور سبزی کی
پلیٹ پھینک دی۔ اس کے دانت بہت تیز
تھے۔ سسٹر کو ڈر تھا کہ اگر وہ کسی کو کاٹ ڈالے
تو اس کی خیر نہیں۔ سب سے زیادہ مشکل بھیڑئیے
کو دونوں پیروں پر کھڑا ہونے کی مشق کرانا تھا۔
اس کا قد ۴ فٹ ہے اور وزن ۴۵ کیلوگرام،
اتنے چھوٹے قد اور کم وزن کے باوجود لوگ
اس کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ لیکن ہوم
کی کارکن عورتوں نے ہمت نہیں ہاری دھیرے
دھیرے وہ اس کا دل جیتنے میں کامیاب ہوگئیں۔
انسان پھر انسان ہے خواہ وہ برسوں جانوروں میں
رہا ہو۔ جانوروں کی صحبت نے اسے جانور بنایا تو
انسان کی محبت اسے پھر سے انسان بنا دے گی
ہوم کے کارکنوں کو یہی امید ہے۔ اس کے سلسلے میں
لکھا گیا۔

بھیڑیا، آج بھی مدر ٹریسا کے ہوم میں
رہتی ہے۔ وہ بول نہیں سکتی، لیکن سمجھ ضرور لیتی
ہے۔ اگر اس سے کوئی سوال کیا جائے تو اس کا
جواب اشاروں میں دیتی ہے۔ اب وہ دونوں
پیروں پر کھڑی ہوجاتی ہے۔ لیکن اس منزل
تک پہنچنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ کئی
بار ایسا ہوا کہ ہوم کے کارکنوں کو یقین ہوگیا کہ بھیڑیا
انسان بن گئی ہے۔ لیکن انہیں مایوسی کا سامنا
کرنا پڑا۔ بھیڑیا نے پھر جانوروں کی حرکتیں شروع
کردیں۔ لیکن سسٹرز نے ہمت نہیں ہاری۔ آخر
انہوں نے "محبت" محنت اور صبر سے اس کا
دل جیت لیا۔ اب بھیڑیا، ہر آنے والے کو سلام
کرتی ہے، اس سے ہاتھ ملاتی ہے۔ جب اس
سے ملاقات کرنے والا رخصت ہوتا ہے تو اسے
ہاتھ ہلاکر "گڈ بائی" کہتی ہے۔ اس میں بچوں کی
سی معصومیت ہے، وہ کبھی فکر مند نہیں ہوتی
فکر اور پریشانی صرف انسانوں کے حصے میں آئی
ہے۔ اب اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ
عورت کبھی چاروں ہاتھ پیروں سے چلتی تھی،
اور ہر آنے جانے والے پر جھپٹا مارتی تھی۔ اس
سلسلے میں سسٹر کونراڈ کو ایک واقعہ یاد ہے
ایک بار ایک عورت 'بھیڑیا' سے ملنے آئی۔ اس
وقت 'بھیڑیا' لوگوں کو سلام کرنا اور ان سے
ہاتھ ملانا سیکھ چکی تھی۔ آنے والی عورت نے
اسے سلام کیا اور اس سے مصافحہ کرنے کے لئے
ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت 'بھیڑیا' کے پاس کھانے
کی پلیٹ رکھی تھی، ابھی اس میں جانوروں کی حس
باقی تھی' وہ سمجھی کہ آنے والی عورت اس کا کھانا
خود کھانا چاہتی ہے۔ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ
بڑھانے کی بجائے اس پر جھپٹا مارا۔ آنے والی
ایک تن درست اور لمبی تڑنگی عورت تھی اور

بھیڑیا، صرف ۴ فٹ کی دھان پان بڑھیا تھی،
لیکن وہ اس اچانک حملے سے خوف زدہ ہوگئی
'بھیڑیا' نے غرّا کر اتنی شدت سے حملہ کیا کہ بیچاری
عورت گر پڑی۔ اس نے بھیڑیا کے پنجے سے خود
کو بچانے کے لئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا
لیا۔ کہیں بھیڑیا اپنے تیز ناخن سے اس کا مونہہ
نہ نوچ لے۔ جب عورت اٹھ کر پیچھے ہٹ گئی تو
بھیڑیا کو یقین آگیا کہ وہ اس کا کھانا ہڑپ کرنا نہیں
چاہتی۔ اس نے اس عورت کا پیچھا چھوڑ دیا اور
اطمینان سے کھانا کھانے لگی۔

مدر ٹریسا کے ہوم میں لوگ آج بھی اس
سے ملنے آتے ہیں۔ وہ اس سے جنگل کی زندگی
کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ وہ بے چاری جواب
نہیں دے سکتی۔ لیکن انہیں سمجھانے کے لئے وہ
چاروں ہاتھ پیروں پر چلنے لگتی ہے، وہ اپنے
مونہہ کو جانوروں کی طرح کھول دیتی ہے۔ کبھی کبھی
مذاق میں وہ لوگوں پر جھپٹا مارتی ہے، لوگ
خوف زدہ ہوکر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ جب وہ
فوراً دونوں پیروں پر کھڑے ہوکر انہیں گلے لگا
لیتی ہے تو لوگ اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔

آج سے ۰۰ سال پہلے اتر پردیش کے
جنگلوں سے ایک ۱۲ سالہ بچہ اسی طرح بھیڑیوں
کے غول میں دوڑتا پکڑا گیا تھا۔ وہ بھی جانور
کی طرح حرکتیں کرتا تھا وہ رامو دی وولف بوائے
کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ وہ لکھنؤ میں کئی
مہینے زیر علاج رہا۔ ڈاکٹروں نے لاکھ کوشش
کی وہ انسانوں کی طرح کھانا پینا شروع کر
لیکن وہ [illegible]
[illegible] کی [illegible] مشہور تھی۔ اس
[illegible] دونوں بیویوں کو طلاق دے دی۔
[illegible] حضرت عثمانؓ سے ہوگیا [illegible] میاں
[illegible] سے مدینہ پہنچے [illegible] مدینہ میں رقیہ کا انتقال

بچّوں کی تربیت کے سلسلے میں تین باتوں کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔ سب سے پہلی چیز محبت ہے۔ بچے کو اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ ماں باپ اسے چاہتے ہیں۔ دوسری چیز بچے کی بات کو دھیان سے سننا ہے۔ ماں باپ خود کو عیس مانخال سمجھتے ہیں اور بچے کو نادان۔ اگر وہ گفتگو کے دوران میں مونہہ کھولے تو یہ کہہ کر اس کا مونہہ بند کر دیا جاتا ہے کہ بچے بڑوں کی بات میں نہیں بولتے۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ اس سے بچّے میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے بہتر یہ ہے کہ بچّے کی بات کو دھیان سے سنا جائے اور اس کا معقول جواب دیا جائے۔ اس لئے بچے کو اپنی اہمیت کا احساس ہوگا اور اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ تیسری چیز بچے کے نظامِ اوقات کو سنوارنا ہے۔ اسے صبح سویرے اٹھنا ہے۔ اسکول کی تیاری کرنی ہے۔ گھر پہنچ کر اسکول کا کام کرنا ہے۔ مقررہ وقت پر کھیل میں حصّہ لینا ہے۔ رات کو جلد سو جانا ہے اگر ماں باپ رات گئے تک جاگتے رہتے ہیں تو بچہ بھی ان کی دیکھا دیکھی سونے کا نام نہیں لیتا۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ بچّہ کو سمجھانا چاہئے کہ اس کے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس معاملے میں سختی برتنا نقصان دہ نہیں ہے۔

اگر بچے کو محبت حاصل نہ ہو تو اس کی آئندہ زندگی میں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ محبّت اس کا پیدائشی حق ہے۔ اس کے لیئے وہ ماں کا دامن پکڑتا ہے اگر ماں دامن کو جھٹک دے تو وہ مایوس ہو کر اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوتا، بلکہ اور بھی زیادہ طاقت سے دامن کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماں اس کی ضد سے جھنجھلا جاتی ہے۔ اس کا موڈ ٹھیک نہیں وہ بیمار ہے۔ اس کے سر میں درد ہے۔ ماں کی بے رخی کی کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ وجہ بچے کو نہیں بتاتی۔ وہ اسے جھڑک دیتی ہے۔ اس طرح بچے کی زندگی کا ایک نقشہ بن جاتا ہے۔ وہ محبت کو جھڑکی سے وابستہ سمجھتا ہے۔ آئندہ زندگی میں ایسے انسان خاوند کے روپ میں بیوی سے محبت طلب کرتے ہیں۔ لیکن ان کی طلب کا انداز نرالا ہوتا ہے۔ وہ بیوی کو کسی بات پر اشتعال دلاتے ہیں۔ بیوی ان کے جھانسے میں آجاتی ہے۔ وہ انہیں دو چار جلی کٹی سنا دیتی ہے اور خاوند کی لاشعوری اذیت پسندی

کو تسکین مل جاتی ہے ۔ وہ محبت کا یہی روپ
پہچانتے ہیں ۔ اگر بیوی ان سے واقعی پیار محبت
کی باتیں کرے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں ۔ اس
بات کا انہیں تجربہ نہیں ہوتا ۔ وہ محبت کا صرف
ایک ہی پہلو پہچانتے ہیں اور وہ ہے بے رُخی
اور جلی کٹی باتیں ۔

کچھ ماں باپ اپنی ناکامیوں کی تلافی اپنے
بچوں سے کرانا چاہتے ہیں ۔ باپ ڈاکٹر یا وکیل بننا
چاہتا تھا لیکن کسی وجہ سے اس کی خواہش پوری
نہ ہو سکی ۔ اب وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا
اس کا بیٹا کرے ۔ وہ اپنی زندگی بیٹے کے روپ
میں جینا چاہتا ہے ۔ اگر بیٹا اس بات پر راضی ہو جائے
تو ٹھیک ، ورنہ وہ اس پر سختی برتتا ہے ۔ بیٹا تجارت
کرنا چاہتا ہے ۔ اسے ڈاکٹری یا وکالت سے کوئی
لگاؤ نہیں ۔ لیکن باپ اس کی ایک نہیں سنتا ۔ نتیجے
میں بیٹا نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے ۔ وہ باپ
کی بات مان لے تو اس کی اپنی خواہش کا خون ہوتا
ہے ۔ اگر نہ مانے تو احساسِ گناہ اسے مارے ڈالتا
ہے ۔ اس کے آگے کنواں ہے اور پیچھے کھائی ۔ وہ
کیا کرے اور کیا نہ کرے ۔ عموماً بچے ماں باپ کی
خواہش پوری کر دیتے ہیں ۔ وہ گناہ کے احساس سے
بچنا چاہتے ہیں ۔ ماں باپ نے انہیں پال پوس کر
جوان کیا ہے کیا ان کا اتنا بھی حق نہیں کہ ان کی ذرا سی
بات مان لی جائے ؟ ماں باپ بھی اس بات کو جتاتے
نہیں تھکتے ۔ نتیجے میں بچہ ہار جاتا ہے ہمیں ماں باپ
کی ضد پر اعتراض نہیں ۔ اعتراض ان کی سختی پر ہے ۔
اگر وہ بچے کو اپنا پیشہ چننے میں آزادی دے دیں تو
بہت ممکن ہے کہ وہ اسی پیشہ کو اختیار کرے جو
وہ چاہتے ہیں ۔ لیکن اس طرح یہ فیصلہ اس کا اپنا
فیصلہ ہوگا ۔ اس میں گناہ کا احساس شامل نہیں ہوگا
اور نہ وہ ماں باپ پر کوئی احسان کرے گا ۔ اس
طرح وہ آئندہ زندگی میں نفسیاتی الجھنوں سے محفوظ
رہے گا اور ماں باپ سے لاشعوری بیزاری سے بھی ۔

کچھ ماں باپ زیادہ سخت گیر ہوتے ہیں ۔
وہ اس گھسی پٹی کہاوت پر عمل کرتے ہیں کہ کھلاؤ
سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ ۔ ممکن ہے کہ یہ
مقولہ پرانے زمانے میں کارآمد ثابت ہوتا ہو ،
لیکن آج کے زمانے میں اس کی افادیت مشتبہ ہے ۔
سخت گیری سے ماں باپ اور بچے کے درمیان
حاکم اور محکوم کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے ۔ بچہ غلام
کی طرح مالک کو خوش رکھنے کا جتن کرتا ہے ۔ وہ ان
کی ناراضگی سے خوف زدہ رہتا ہے ۔ یہ طریقہ اس کی
آئندہ زندگی میں بھی برقرار رہتا ہے ۔ اگر اسے زندگی
میں ایسے دوست یا کارکن مل گئے ، جو اس کے کام سے
خوش ہوتے ہوں تو وہ خوب دل لگا کر کام کرتا ہے
اگر وہ اس کے کام کو پسند نہ کریں تو خوف اور مایوسی
اسے گھیر لیتی ہے ۔ ان رشتوں میں صرف کامیابی اور
ناکامی زندگی کا فیصلہ کرتی ہے ۔ محبت اور اعتماد
کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ۔

سخت گیری سے ماں باپ اور بچے کے درمیان
حاکم اور محکوم کا جو رشتہ قائم ہو جاتا ہے ؟ اس سے
بھی بُرا بے رُخی کا رشتہ ہے ۔ اس بے رُخی کی ایک
وجہ ماں باپ کی اپنی لڑائیاں ہوتی ہیں ۔ وہ ایک
دوسرے سے جھگڑنے میں اتنے مصروف رہتے ہیں
کہ اس بچے کی طرف دھیان دینے کا وقت نہیں ملتا ۔
بچے کو اس بات کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ ماں باپ اس
کے متعلق کیا سوچتے ہیں ۔ وہ کہاں جاتا ہے ۔ کیا
کھاتا ہے ۔ اس کی کیا ضروریات ہیں ۔ اس طرح
بچہ اپنی خیالی دنیا بسا لیتا ہے اور عملی دنیا سے
کنارہ کش ہو جاتا ہے آئندہ زندگی میں یہ چیز اس
کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے ۔ بچے کے پاؤں
ٹھوس زمین پر نہیں ٹکتے ۔ وہ ہوا میں معلق رہتا ہے
اس کی ذہنی الجھن شدت اختیار کر لیتی ہے ۔ زندگی کے
ٹھوس حقائق اسے خوف زدہ کر دیتے ہیں ۔ ایسے
بچے ایذا طلبی کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ وہ بے رُخی کو
ہی محبت مان لیتے ہیں ۔ اگر اتفاق سے زندگی میں
انہیں محبت مل جائے تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ
وہ اسے بے رُخی میں بدل دیں ۔ ان کی بیویاں ان کی
ایذا طلبی کا شکار رہتی ہیں ۔ مردوں میں یہ بیماری
عورتوں سے زیادہ پائی جاتی ہے ۔

بچے کو ماں باپ کی محبت اور اعتماد حاصل
نہ ہو تو وہ اس محبت کو کتابوں اور فلموں میں محسوس
کرتا ہے ۔ عورتیں خاص طور پر رومانی ناولوں کی
شوقین ہوتی ہیں مطالعہ کے دوران میں چند گھنٹے کے
لئے وہ ناول کی ہیروئن بن جاتی ہیں ۔ ہیرو انہیں پانے
کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے ۔ وہ ان کے
قدموں پر سر رکھ دیتا ہے ۔ ان کے لئے آسمان سے
تارے توڑ لانے کا وعدہ کرتا ہے ۔ ان کی یاد میں
کروٹیں بدلتا ہے فلم میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے ۔ فلم کا
شوق اور فلموں کی ہر دل عزیزی اسی جذبے کی
مرہونِ منت ہے لیکن ان میں ایک قیامت ہے یہ
خیالی محبت خیال میں ہی رہتی ہے ۔ حقیقت سے اس
کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا ۔ بلکہ اگر حقیقت میں محبت
مل بھی جائے تو یہ لوگ حیران ہو جاتے ہیں ۔ وہ
ٹھوس محبت کو نہیں پہچانتے ۔ وہ صرف خیالی محبت کو
تسلیم کرتے ہیں ۔ فلم دیکھنے کے دوران میں وہ جتنی
گرمجوشی کا اظہار کرتے ہیں گھر پہنچ کر اتنی ہی سرد مہری
برتتے ہیں ۔ وہ فلم کے سین دیکھ کر خوب روتے ہیں
لیکن حقیقت میں کوئی ٹریجیڈی ان کی آنکھوں میں
آنسو نہیں لا سکتی ۔

کاش تم مجھ کو چاہتے ہوتے

کاش!!!
تم مجھ کو چاہتے ہوتے!
حالت ایسی نہ مضمحل ہوتی
میں سمجھتی سکونِ ذات مِلا!
کہ مجھے مقصدِ حیات مِلا!
روز خدمت تمہاری میں کرتی
خیر — ایسا نہ ہو سکا، پھر بھی!
سوچتی ہوں کہ تم سے یہ کہہ دوں
"تم نے چاہا ہے جس حسینہ کو.
جس کو ہر روز تم نے پوجا ہے
تم سے وہ سیر ہو گئی شاید
اُس کا دل تم سے پھر گیا ہو گا!
ورنہ اِس طرح وہ نہیں جاتی
(تم کو چھوڑ کر)
رنج و غم کی راہوں میں
چھین کر زندگی کی رنگینی!
نوچ کر سب تمہاری زندہ دِلی!
کتنی بدبخت ہے وہ ماہ جبیں
جو فسردہ بنا گئی ہے تمہیں
باوجود اِس کے سلے مِرے شاعر
اپنے دل میں ملال مت کرنا
آج بھی ہر گھڑی تمہارے لئے
مِرا تن من نثار ہے غازی
کیا کروں تم میں ہی نہیں جرأت
ورنہ یہ روز و شب مِرے ہوتے
کاش تم مجھ کو چاہتے ہوتے!

شریف غازی

اب بھی

اب وہ پہلے سے شب روز کہاں ہیں جاناں
جب کہ گھر بار اِک جنت کا بنا رہتا تھا
اب وہ پہلی سی
کہاں شوخ ادائیں تجھ میں
اب کہاں ہے
تِرے گُل جیسے بدن کی خوشبو
لب بھی گُل رنگ نہیں شگفتگیِ جاں بھی نہیں
پھول کھِلتے جسے دیکھ کے وہ مسکان نہیں
اب کہاں ہیں
تِری آنکھوں کے وہ جام لب ریز
جن کا نشہ مجھے سرشار کیا کرتا تھا
اب کہاں پھول سے عارض وہ گھٹا سی زلفیں
سرنگوں ہو گئے کیسے وہ شوالوں کے کلس
اب نہ پازیب کی جھنکار
نہ لہجے میں کھنک
ہاں نہیں وہ شب و روز مگر اچھا ہے
ایک ہی وقت میں چھائی ہے خزاں
دونوں پر
للہ الحمد کہ دونوں دلوں میں خوش آنے
رقص کرتی ہیں محبت کی بہاریں
اب بھی!!

جمال اللہ غزنی

جوابِ شکوہ

زلفیں شانوں پہ بکھری ہوئیں
آنکھوں میں ممتا کا نور
رُخسار پر سِلوٹیں
سینے سے ایک شیر خوار چمٹا ہوا
آواز میں کرختگی
صرف ایک سال بعد!
پھر تمہاری وہی بازگشت
خدارا مجھے بتلائیں کہ
میں کیا کروں؟

حیدر راحت

دُور پار سجنی کے نام

(محترمہ ہمایوں پروین سے معذرت کے ساتھ)

میری جاں
خط مِلا
پڑھ کے کچھ دیر تک
میں خلاؤں میں تکتا رہا
تیری تصویر نظروں میں پھرتی رہی
گفتگو گونگے شبدوں میں ہوتی رہی

میری جاں!
سچ ہے مِرے بِنا
دل گرفتہ ہے تو
دل شکستہ ہے تو
لیکن اے جانِ جاں!
آج کی سختیاں
کل مسرت کے لمحوں کو اپنا بنانے کی خاطر تو ہیں
آج محرومیاں
موسمِ گُل میں کل گنگنانے کی خاطر تو ہیں
آج کی دُوریاں
قربتوں کو مَچلانے کی خاطر تو ہیں

میری جان!
تو نے میرے چمن میں
کِھلایا ہے جو ایک ننھا گلاب
وقت کی دھوپ اُس کو نہ مُرجھا سکے
موسموں کے تھپیڑوں سے اُس کو بچانا بھی ہے
اُس کا خوش رنگ چہرہ نہ کُمھلا سکے
زندگی میں کئی رنگ اُس کی سجانا بھی ہے
اِس لئے
میری جاں!
اور کچھ روز سہہ لے یہ مجبوریاں
پھر نہ حائل کبھی ہوں گی یہ دُوریاں
اپنے آنگن میں پھر مسکرائیں گے ہم
پیار کے ساز پر گیت گائیں گے ہم

فرزاد شبلی

قلم کے جادوگر
الیاس سیتاپوری
کے دو تازہ ترین شاہ کار
اُن انسانوں کی کہانیاں جو بادشاہ تھے،
وزیر تھے، مصاحب تھے، امیر تھے، فن کار تھے،
پرستار تھے، عاشق تھے، محبوب تھے، رقیب تھے،
دوست تھے، دشمن تھے، جھوٹے تھے، سچے تھے۔
انسانوں کے وہ تمام روپ جو ہمیشہ سے ہیں اور
ہمیشہ رہیں گے۔ گرفت، نشہ، سحر،
سوز و گداز .... وہ سب جو آپ چاہتے ہیں۔
آشنا پرست
قیمت: پندرہ روپے -/15 روپے (ڈاک خرچ الگ)
پارسائی کا خمار
قیمت: بیس روپے -/20 روپے (ڈاک خرچ الگ)
الیاس سیتاپوری کی دوسری کتابیں
حرم سرا کا محبوب
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)
دیوی کے پرستار
قیمت: بیس روپے
(ڈاک خرچ الگ)
کشمیر کی کلی
قیمت: سولہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)
داستانِ حور
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)
الیاس سیتاپوری کے دیگر شاہ کار جو شمع بک ڈپو نے عمدہ کاغذ پر آفسیٹ سے شائع کیے ہیں:
شہزادی کا نیلم
بالا خانے کی دلہن
حرم سرا
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)
چاند کا خدا
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)
عجائب خانۂ عشق
قیمت: پندرہ روپے
(ڈاک خرچ الگ)
اندر کا آدمی
قیمت: دس روپے
(ڈاک خرچ الگ)
راگ کا بدن
قیمت: دس روپے
(ڈاک خرچ الگ)
شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
انتباہ:
الیاس سیتاپوری اور ضیا تسنیم بلگرامی کی تمام کہانیوں اور کتابوں
کے ہندوستان میں اشاعت کے حقوق شمع بک ڈپو کے نام
محفوظ ہیں۔ بلا اجازت شائع کرنے والوں کے خلاف قانونی
کارروائی کی جائے گی۔

قاضی مشتاق احمد

ہاجرہ بیگم نے فرحت کے سرہانے ایک نوجوان لڑکے کی تصویر اور ایک چھٹی دیکھی تو وہ گھبرا گئیں۔ تصویر کے پیچھے گلابی سیاہی میں "مائی سویٹ ہارٹ فرحت" لکھا ہوا تھا اور نیچے ایک گڈمڈ قسم کی تحریر تھی جو شاید اس نوجوان کے دستخط تھے۔ چھٹی انگریزی میں لکھی ہوئی تھی۔ جسے مکمل طور پر پڑھنا ہاجرہ بیگم کے بس کے باہر تھا۔ وہ معمولی انگریزی جانتی تھیں۔

پانچ سال پہلے ہاجرہ بیگم کے شوہر کا ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا تھا۔ شوہر کے ذاتی مکان اور فیملی پینشن کی وجہ سے انہیں کوئی تکلیف نہ تھی۔ اپنی سترہ سالہ بیٹی فرحت کے ساتھ وہ نہایت آرام کے ساتھ زندگی گزار رہی تھیں۔ مگر آج فرحت کے سرہانے رکھی ہوئی تصویر اور چھٹی نے ان کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچادی تھی۔ وہ اکیلی عورت ان حالات کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہے؟ فرحت پر ان کو پورا بھروسا تھا۔ بچپن سے ہی وہ کھلنڈری بچی تھی۔ باپ کی اچانک موت نے اسے بھی حواس باختہ کردیا تھا۔ پیار کرنے والے باپ کے اچانک چلے جانے کی وجہ سے اس کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا تھا۔ بچپن سے وہ اپنے باپ کو "فرحو! فرحو!" کرتے ہوئے اور اپنی ہر ضد پوری کرتے ہوئے دیکھتی آئی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ باپ کی گود میں سوار ہوجاتی اور صرف اس وقت ان سے الگ ہوتی جب نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہوتیں۔ ہاجرہ بیگم بھی فرحت پر جان نچھاور کرتی تھیں لیکن فرحت کو ماں سے زیادہ باپ سے پیار تھا۔ باپ کی موت کے بعد اس نے اپنی ماں کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ماں کے پُروقار مگر خوب صورت چہرے پر ہمیشہ اُداسی چھائی رہتی۔ فرحت کو اپنی ماں کی اس بات پر فخر تھا کہ انہوں نے کبھی مدد کے لئے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ فیملی پنشن کے کاغذات پر بھی انہوں نے اپنے گھر ہی میں دستخط کئے۔ فرحت کے باپ کے افسر اعلیٰ خود گھر چل کر آئے تھے اور ان کی موجودگی میں ان کاغذات پر دستخط ہوئے تھے۔ بینک کے کام کاج میں ان کے ایک پڑوسی مدد کرتے تھے۔ چونکہ وہ خود بینک میں کام کرتے تھے، اس لئے ہاجرہ بیگم نے ان کی مدد قبول کرلی تھی۔ اس مدد کے بدلے ہاجرہ بیگم کبھی ان کے بچوں کے لئے سوئیٹر بنا دیتیں، کبھی ان کی بچی کے کپڑے سی دیتیں۔ وہ لاکھ انکار کرتے، لیکن ہاجرہ بیگم نے یہ کبھی گوارا نہیں
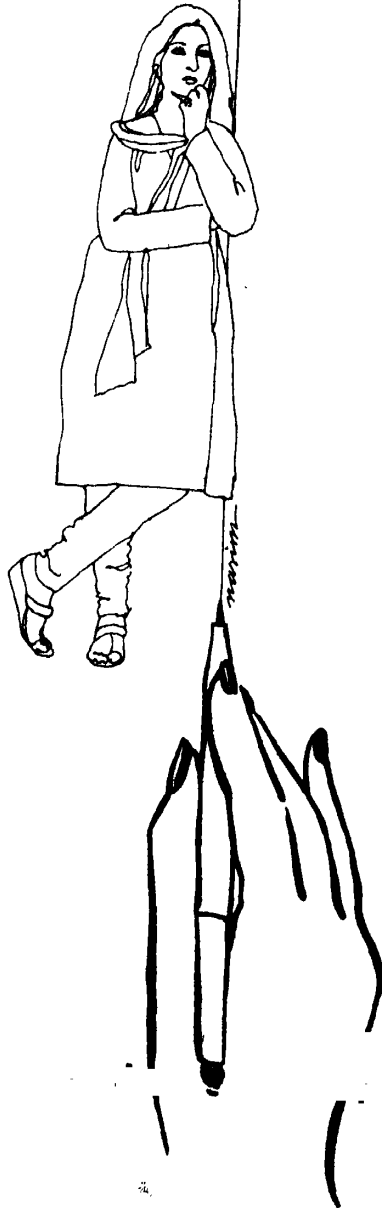
کیا کہ منفت میں کسی کی مدد قبول کی جائے۔ عموماً بیوہ عورتیں اپنے آپ کو سماج پر ایک بوجھ سمجھنے لگتی ہیں، لیکن ہاجرہ بیگم نے بیوگی کو ایک چیلنج کی طرح قبول کیا تھا۔ وہ اداس ضرور تھیں، لیکن مجبور یا بے بس نہیں۔ فرحت کی انہوں نے بڑے پیار کے ساتھ پرورش کی تھی۔ اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا لیکن آج اس تصویر اور لو لیٹر نے ان کے اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچائی تھی۔ شوہر کی موت کے بعد انہیں دوسری بار ایک زبردست صدمہ پہنچا تھا۔ انہیں اس بات کا افسوس ہونے لگا کہ انہوں نے فرحت کو صرف ماں کا پیار دیا۔ کاش وہ اسے بہن اور سہیلی کا بھی پیار دے سکتیں تو شاید وہ اپنا دل ان کے سامنے کھول کر رکھنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتی۔

ہاجرہ بیگم ان عورتوں میں سے نہیں تھیں جو معمولی باتوں سے گھبرا جاتی ہیں یا مدد کے لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہیں۔ انہوں نے اس معاملے کو بھی خود ہی طے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں اپنی بیٹی پر اعتماد تھا اور اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گی۔ فرحت جیسی خوب صورت اور ذہین لڑکی کے پیار میں کوئی ایرا غیرا تو گرفتار نہیں ہو سکتا اور نہ وہ کسی ایسے لڑکے کو لفٹ دے سکتی ہے۔ یہ سوچ کر ان کی گھبراہٹ کچھ ختم ہو گئی اور وہ پہلے کی طرح پُرسکون ہو گئیں۔

شام کے وقت فرحت جب واپس آئی تو ہاجرہ بیگم نے ہمیشہ کی طرح بڑے پیار کے ساتھ اس کی پیشانی چومی۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے ڈرائننگ ٹیبل پر آئی تو اس کی پسند کا گاجر کا حلوا بھی تیار تھا۔ بڑی دیر تک وہ ماں کو دن بھر کے واقعات سناتی رہی۔ ہاجرہ بیگم نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کی باتیں سنتی رہیں۔

"ممی، آج میرا کمرہ کس نے صاف کیا؟" فرحت نے پوچھا۔

"روشن خالہ نے۔" ہاجرہ بیگم نے اپنی ملازمہ کا نام بتایا۔

"کیا کچھ کاغذات ......"

"ہاں ـــ وہ؟" ہاجرہ بیگم نے بڑے

"انہیں اپنی بیٹی پر اعتماد تھا اور اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گی فرحت جیسی خوب صورت اور ذہین لڑکی کے پیار میں کوئی ایرا غیرا تو گرفتار نہیں ہو سکتا اور نہ وہ کسی ایسے ویسے لڑکے کو لفٹ دے سکتی ہے۔ یہ سوچ کر ان کی گھبراہٹ کچھ ختم ہو گئی"

پُرسکون لہجے میں کہا۔ "وہ رقعہ اور تصویر جو تم اپنے سرہانے بھول گئی تھیں، میں نے تمہاری الماری میں رکھ دی ہیں۔"

"ممی، وہ ـــ وہ رقعہ پڑھا آپ نے؟"

"میں اتنی انگریزی کہاں جانتی ہوں؟ اور پھر دوسرے کے خطوط پڑھنے کی مجھے عادت نہیں۔"

"اور وہ تصویر؟"

"دیکھی ہے ـــ لڑکا اسمارٹ ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟" ان کے پُرسکون لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"آصف ـــ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔"

"اس کے والد؟"

"غلام علی صاحب ـ بینک میں افسر ہیں۔"

"تم اس لڑکے کو ـــ میرا مطلب ہے آصف کو پسند کرتی ہو۔"

"جی ـــ ممی۔"

"اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"ممی!" اس اچانک سوال پر وہ گھبرا گئی۔

"گھبراؤ مت صاف صاف کہو۔"

"ہم دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔"

"میری ایک بات سنو گی بیٹی؟"

"ضرور ـــ ممی۔"

"مجھے تمہاری پسند پر کوئی اعتراض نہیں۔ بس ایک خواب دیکھا ہے میں نے تمہیں گریجویٹ بنانے کا۔ تمہارے باپ کا بھی یہی ارمان تھا۔ تمہارے گریجویٹ ہوتے ہی آصف کے ساتھ میں تمہاری شادی کر دوں گی۔"

"ممی! آپ کتنی اچھی ہیں!" فرحت خوشی سے اُچھل پڑی۔

"لیکن میری شرط یاد رکھنا ـ پہلے ڈگری پھر شادی۔ اور ہاں آصف سے بھی کہہ دینا اب لو لیٹر بند۔ شادی سے پہلے ہی اگر وہ پیار بھری باتیں ختم کر دے گا تو پھر بات چیت کے لئے کیا بچے گا اس کے پاس شادی کے بعد؟"

"ممی!" فرحت شرما گئی۔

"آصف کو ایک بار گھر لاؤ۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔"

"جی ممی!"

ہاجرہ بیگم نے یہ جنگ بھی جیت لی تھی۔

○

اندر پاشا

قوتِ ارادی کیسے بھتر ہو؟

روزمرّہ کی زندگی میں انسان پریشانیوں، غموں اور مصائب سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے اور امن وسکون اور ذہنی توازن حاصل کرنے کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات نے ذہنی توازن کے حصول کا انحصار قوتِ ارادی پر بتایا ہے، جس سے دلی اور جسمانی حالت کو حسبِ خواہش ڈھالنے کی مہارت پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں سوویت ماہرین نے بہت تجربوں اور مشاہدوں کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قوتِ ارادی بڑھانے کا مناسب ترین وقت وہ ہے جب انسان بیدار ہوتا ہے، کیوں کہ اس وقت اس کی سرگرمی میں ٹھہراؤ ہوتا ہے اور اس کے بعد سارے دن اس میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔

قوتِ ارادی کو بڑھانے کے لئے دیوار پر اپنے سامنے ایک گھڑی لٹکائیے اور اس کی طرف دیکھئے۔ سیکنڈ کی سوئی کی طرف دھیان لگائیے اور گھڑی کے نمبروں کی طرف دیکھتے ہوئے ایک، دو، تین، چار ۔۔ بیس تک گنتی کیجئے۔ اس کے بعد گننے کے وقفے کو ذہن میں رکھ کر گھڑی کی طرف نگاہ ڈالے بغیر گنتی کیجئے۔ اس عمل کے دوران گھڑی کی ٹِک ٹِک کی طرف بھی مطلق دھیان نہ دیجئے اور دل ہی دل میں بیس تک گنتے جائیے۔ پھر گھڑی کی طرف نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ اس عمل میں کتنا وقت گزرا۔

اگر آپ نے بیس تک گنتی ۱۹ سے ۲۱ سیکنڈ میں پوری کی تو اس کا مطلب ہے کہ وقت کا اندازہ کرنے والا آپ کا عصبی اور نفسیاتی عمل "بہت مناسب" ہے۔ ۲۲ سے ۲۵ سیکنڈ تک "کچھ کم" اور ۳۱ سے بھی زیادہ سیکنڈ لگیں تو کافی کم ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر صبح سویرے آپ کے عصبی اور نفسیاتی عمل کی رفتار کم ہے تو ورزش کی شدّت اور رفتار میں اضافہ کرنا ہوگا۔ کمرے میں دوڑتے وقت ہاتھ اوپر اُٹھائیے، پھر انہیں آگے لائیے اور مٹھیوں کو بھینچنا اور کھولنا شروع کیجئے۔ تیزی سے، اور بھی تیزی سے اور پھر بہت تیزی کے ساتھ۔ ہلکی دوڑ کی ورزش کرتے ہوئے ہتھیلی کو ترتیب وار آگے پیچھے اپنے محور کے گرد گھمانے سے ورزش میں ادل بدل کی جا سکتی ہے۔

اب نئے سرے سے گنتی اور وقت کی پیمائش کی آزمائش دل ہی دل میں کیجئے۔ اگر وقفہ کامیاب رہا تو آپ کے عصبی اور نفسیاتی عمل میں تیزی پیدا ہو جائے گی۔

اگر شروع سے ہی آپ ۲۰ تک گنتی ۱۶ سے ۱۸ سیکنڈ میں پوری گننے لگے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ میں کافی جوش ہے۔ اگر ۱۶ سے کم سیکنڈ لگیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ میں ضرورت سے زیادہ جوش ہے کام کے دوران میں عصبی اور نفسیاتی تناؤ میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بڑھنے کے وقت سکون بخشنے والی ورزشیں بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ حرکت کی بار بار تبدیلی بھی اچھا اثر ڈالے گی۔ مثلاً اس طرح کہ پہلے انگڑائی لی جائے، عضلات اکڑائے جائیں اور پھر انہیں ڈھیلا چھوڑ دیا جائے۔

مزاج کو بہتر بنانے اور کام کی رفتار بڑھانے کا یہ بے حد کارگر طریقہ ہے ●

جہنم

بیگم اسلام احمد

آج دس سال بعد میں اس بستی میں آئی ہوں، جو آب ایک چھوٹا سا شہر کا رُوپ اختیار کر چکی ہے۔ تم ایک بڑے سرجن بن چکے ہو۔ تمہاری شہرت سُن کر ہی ظفر نے مجھے بھیجا ہے، ورنہ میں نے تو اس بستی کو آنے والا ہر راستہ اپنے آپ پر بند کر لیا تھا، ہر پگڈنڈی کو ماضی کی بھیڑ میں گم کر دیا تھا۔ اس جگہ کو جہاں میرے بچپن کی کتنی یادیں وابستہ ہیں، الوداع کہتے وقت میں نے اپنے ارمانوں کو نہ جانے کس طرح بہلایا تھا۔ اپنی ناکام آرزوؤں کو جھوٹی تسلیاں دے کر یہاں سے لے گئی تھی اور سسکتے ہوئے ارمان وقت کی مانگ پر قربان کر دئے تھے لیکن اتنے لمبے عرصہ کے بعد بھی یہ راستے مجھے اس چوکھٹ پر گھسیٹ لائے۔ میں نے نقاب برابر کی اور گاڑی سے نکل کر سامنے بیٹھے دربان سے تمہارے بارے میں معلوم کیا۔

"وہ تو آ چکے ہیں محترمہ۔ آپ اُدھر جا کر اپنا نام لکھوا دیجئے۔" اس نے ادب سے جواب دیا۔

میں نے سلپ پر بچّے کا نام لکھ کر سلپ اندر بھجوا دی اور خود ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد محسن کا نام پکارا گیا تو میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن میرے قدم جیسے زمین نے جکڑ لئے تھے۔ دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ برقع میں ہونے کے باوجود میری ہمّت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس شخص کے سامنے جاؤں جس کو دھوکا دیا ہے جس کی وفاؤں کو روند کر چاندی کے محل میں جا چھپی ہوں۔

دروازے میں آتے ہی تم نے اپکارنا شروع کر دیا تھا "شمع، شیل کہاں گئی؟"

میں جان بوجھ کر خاموش بیٹھی رہی تھی۔

"کیا شیل شیل کی رٹ لگا رکھی ہے بھیّا۔ زیادہ میٹھا کھانے سے دانت گر جاتے ہیں۔"

شمع نے تمہیں چھیڑتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے تمہاری اس کوٹھی کے تمام ملازم میرے جوتے پالش کر کے کہیں چھپا دیتے ہیں۔ اب میں پاگلوں کی طرح تلاش کرتا پھروں گا۔"

واقعی غلطی میری تھی، اس لئے فوراً بول پڑی، "ٹھہریئے! میں آتی ہوں۔"

پھر بھاگی بھاگی میں کمرے میں پہنچی تو سامنے ہی جوتے رکھے دیکھ کر دماغ بھنّا گیا۔ جیسے ہی پلٹی، تم دروازے سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔

"آپ اپنی آنکھوں کا ٹیسٹ کرا لیجئے، پھر بھاگا نا اندر۔" میں نے تمہیں گھورتے ہوئے تمہارے پاس سے نکل جانا چاہا تو بڑی جرأت سے تم نے میرا راستہ روک لیا۔

"شیل! میں کل پانچ سال کے لئے لندن جا رہا ہوں۔ آج مہمان آنے شروع ہو جائیں گے مجھے پھر وقت نہیں ملے گا، صرف دو منٹ ٹھہر کر میری بات سن لو۔"

میرا پورا وجود لرز گیا۔ وہ گھڑی کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ میں جانتی تھی تم کیا کہو گے۔ گھبراہٹ اور شرم سے میں پسینے پسینے ہو گئی۔ لیکن تم میری حالت سے بے پروا کہتے رہے "آج تک میں نے کسی بھی لڑکی کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا لیکن آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ تم میرے دل کی گہرائیوں میں چھپی بیٹھی ہو۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تم میری شریکِ حیات بننا پسند کرو گی؟"

میں نے گھبرائی گھبرائی نظروں سے تمہیں دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ تم نے اپنا دایاں ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ ایک برقی سی دوڑ گئی میرے اندر۔ تمہاری انگلیوں کا وہ لمس میں آج بھی اپنے شانے پر محسوس کرتی ہوں۔ تم نے ٹھہر ٹھہر کر کہا، "میری زندگی میرا مستقبل تمہاری ہاں، یا نہ، پر موقوف ہے۔"

"آپ نے خالہ جان اور شمع کی مرضی بھی جان لی ہے؟" میں نے ہمت کر کے پہلی بار لب کھولے۔ اور آہستہ سے تمہارا ہاتھ اپنے شانے پر سے ہٹا دیا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ میرے انتخاب کی داد دیں گے۔"

"اور اگر اس کے خلاف کچھ ہوا تو؟"

نہ جانے یہ کہنے کی ہمت مجھ میں کہاں سے آ گئی تھی۔

"شیل! میں پانچ سال کے لئے لندن جا رہا ہوں۔ آج مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔ مجھے پھر وقت نہیں ملے گا صرف دو منٹ ٹھہر کر میری بات سن لو۔"

"میرا پورا وجود لرز گیا وہ گھڑی کسی قیامت سے کم نہ تھی، میں جانتی تھی تم کیا کہو گے۔"

"تو ڈاکٹر شہباز زندگی بھر چیر پھاڑ کرتا رہے گا، لیکن دل کے زخموں کا مداوا نہیں کرے گا۔ یہ تم سے وعدہ کرتا ہوں۔"

"تو جائیے، شہلا بھی اپنی زندگی آپ کے نام ارپن کرتی ہے۔ وہ آپ کی واپسی تک انتظار کی شمع جلائے رکھے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

میری مرضی جان لینے پر تم خوش خوش لندن چلے گئے۔ اپنا حال میں خود ہی جانتی تھی۔ کاش میں وعدہ نبھانے کے قابل ہوتی۔ اس وقت تو میرے سامنے تمہارا عظیم مقصد تھا۔ تمہارے ابا مرحوم کی خواہش کو پورا کرنے میں مجھے خالہ جان کی مدد کرنا تھی۔ بعد میں انجام کچھ بھی ہوتا۔

"آ بیٹھے محترمہ" میں چونک پڑی۔ چپراسی تمہارے چیمبر کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ میرے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔

ڈاکٹر کا سفید گاؤن پہنے تم میرے سامنے کھڑے تھے۔ سنجیدہ اور پروقار شخصیت کے مالک۔ میں نے ڈاکٹر بھٹناگر کی رپورٹ تمہارے سامنے رکھ دی اور محسن کا ہاتھ پکڑے خاموش کھڑی رہی۔ تم نے رپورٹ نکال کر دیکھی اور پھر بڑی نرمی سے بولے "آپ اس طرف بیٹھ جائیے۔ میں ذرا بچے کا چیک اپ کر لوں۔"

میں خاموشی سے آگے بڑھ کر تمہاری میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور تم محسن کا چیک اپ کرنے لگے۔ اس کی دائیں ران کی ہڈی میں سوراخ ہو گیا تھا۔ اس کے لئے آپریشن ضروری تھا یا دوائیں ہی کافی تھیں، اس کا فیصلہ تمہیں کرنا تھا۔ آدھے گھنٹے تک تم اس کا معائنہ کرتے رہے۔ اس وقت مجھے کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ میری نظریں جنون کی حد تک تمہارا طواف کر رہی تھیں۔ دس سال کا صبر شاید تمہیں دیکھ کر بکھر پڑنے کو بے قرار تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر تم میرے سامنے کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔

ایئر کنڈیشن کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تم رپورٹ تیار کر رہے تھے۔ تمہارا قلم اپنی مہارت اور تجربے کے پھول کھلا رہا تھا۔ اچانک تمہاری نظریں میز پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ پر پڑیں تو وہیں تھم گئیں۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچا اور گھبرا کر برقعے میں چھپا لیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں خاموشی سے یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی، تاکہ تمہیں کوئی

اس ہی نہ ہو سکے۔ لیکن میری احتیاط کے
جود تم نے مجھے پہچان لیا۔ اپنی بے بسی پر مجھے
رونا آ گیا۔ دھندلی آنکھوں کے سامنے کہر میں
لپٹی وہ صبح ابھر آئی جب پالم ہوائی اڈے پر
لندن جاتے وقت تم نے مجھے یہ انگوٹھی پہنائی
تھی۔ اور کہا تھا "شیل! یہ میرے پیار
اور وفاؤں کی نشانی ہے۔ اسے ہمیشہ اپنے
ساتھ رکھنا"

میں نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر
تمہیں دیکھا۔ تمہارے چہرے کے خطوط کھنچ چکے
تھے، جیسے اپنے اندر کسی بھیانک طوفان سے
لڑ رہے ہوں۔ کھنڈروں میں اٹھتے ہوئے شعلوں
کی چمک تمہارے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔
تمہاری نظریں اب بھی برقعے میں چھپے ہوئے
میرے ہاتھ پر جمی تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے دس سال کے
بعد پہلی مرتبہ ایک اجنبی کی طرح تمہیں پکارا تو
تم چونک پڑے۔ میں چاہ رہی تھی کہ تم مجھے کچھ کہو،
کچھ بولو، یہ طوفان اپنی ساری بندشیں توڑ دے۔
تمہیں دیکھ کر میرا دل بھر آیا تھا۔

اپنے آپ پر قابو پا کر تم نے آہستہ سے کہا
"گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ دوائیں میں نے
لکھ دی ہیں۔ تین مہینے تک ان دواؤں سے علاج
جاری رکھئے۔ تین مہینے کے بعد میں پھر دوبارہ
چیک اپ کروں گا۔" یہ کہہ کر تم نے لفافہ میری
طرف بڑھا دیا۔

میں بھری تو بیٹھی ہی تھی۔ تمہاری سرد مہری
برداشت نہ کر سکی اور میز کے کنارے پر سر رکھ کر
پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی
"مجھے جی بھر کے ڈانٹو، پھٹکارو، اور دھکے دے کر
باہر نکال دو لیکن سامنے ہو کر اجنبی مت بنو۔"

جب کچھ دیر بعد دل کا بوجھ آنسوؤں نے اٹھا لیا
تو میں نے سر اٹھا کر کہا "خالہ جان کیسی ہیں؟
شمع کیسی ہے؟"

"سب ٹھیک ہیں۔" تم نے بڑی بے رخی
سے کہا۔

"اور آپ کی بیوی کہاں ہیں؟" تم نے
کوئی جواب نہیں دیا بس خاموشی سے سیلنگ فین
کو گھورتے رہے۔ مجھے پہچان کر جو تمہیں ذہنی
جھٹکا لگا تھا، اس کو تم سنبھال نہیں پا رہے تھے۔

"میں نے پوچھا تھا آپ کی بیوی ...."

"میں بھری تو بیٹھی ہی تھی تمہاری سرد مہری
برداشت نہ کر سکی اور میز کے کنارے
پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
لرزتی ہوئی آواز میں بولی "مجھے جی بھر کے
ڈانٹو، پھٹکارو اور دھکے دے کر باہر
نکال دو لیکن سامنے ہو کر اجنبی نہ بنو"

اور کمرے میں جیسے بھونچال آ گیا۔ تمہاری چیخ پر
میں اچھل پڑی۔

"جہنم بنا کر رکھ دی ہے میری زندگی تم نے
اب اور کیا چاہتی ہو تم؟ مجھ سے کیوں ملنے آئی
ہو؟ میری بیوی سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟ —
آؤ۔ آؤ تمہیں اپنی بیوی سے ملاؤں، تاکہ اپنی
کامیابی پر مطمئن ہو کر جاؤ۔"

تم جلدی سے اٹھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر
گھسیٹتے ہوئے برابر کے کمرے میں لے گئے۔

"جاؤ، دیکھو سامنے۔"

میں نے سامنے میز پر رکھے ہوئے ایک
فریم پر نظر ڈالی اور مجھے ایسا لگا کہ کمرے کی چھت
گرنے ہی والی ہے۔ میری تصویر پر تازہ پھولوں
کا ایک گجرا پڑا تھا۔ اور تم کہہ رہے تھے۔

"انہیں مرے ہوئے دس سال ہو چکے ہیں۔ ہر صبح کو
کام شروع کرنے سے پہلے یہاں آ کر فاتحہ
ضرور پڑھتا ہوں۔"

مجھے محسوس ہوا کہ مزید ایک منٹ بھی یہاں
ٹھیری تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ مونہہ میں دوپٹہ
کا پلو ٹھونسا، بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے
میں آئی اور حیران و پریشان پانچ سالہ محسن کی انگلی
پکڑ کر باہر نکل آئی۔

اس وقت میرے دماغ میں آندھیاں
چل رہی تھیں اور یہی سوچ رہی تھی کہ کس نے
کس کے لئے اپنی زندگی جہنم بنا ڈالی ہے۔

اچھا ہے تم مجھے وفانا آشنا ہی سمجھتے
رہو۔ ایک بے وفا لڑکی سے تو زندگی جہنم ہی بنے گی۔
اور میں تمہیں یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ اگر حشمت علی کے
گھر میں میری شادی نہ ہوتی تو تم لندن نہ جا سکتے۔
ایک ماہر سرجن نہ بن سکتے۔ بیس ہزار روپے دیتے
ہی حشمت علی نے ظفر کا پیام میرے لئے دے
دیا تھا۔ ان کے احسانوں میں دبی خالہ جان کا دور
دور تک کوئی نہ تھا۔ میں نے رو رو کر خالہ جان کو
تمہیں بلانے سے روکا تھا اور ان سے وعدہ لیا
تھا کہ جب تک تم اپنی تعلیم پوری نہ کر لو تمہیں کچھ
نہ بتائیں۔ اور اس طرح شہباز! جہنم کو سمیٹ کر
میں ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے گئی تھی تاکہ تمہاری
زندگی ہمیشہ فردوس کی ہواؤں کے سائے میں
گزرے اور مجھے بھول کر تم کسی جنت میں پناہ
لے سکو۔ صرف جسمانی طور پر قریب ہونا ہی وعدہ
نبھانا نہیں ہوتا۔ کسی کے لئے اپنے آپ کو مٹا کر
بھی وعدہ نبھایا جاتا ہے۔

○○
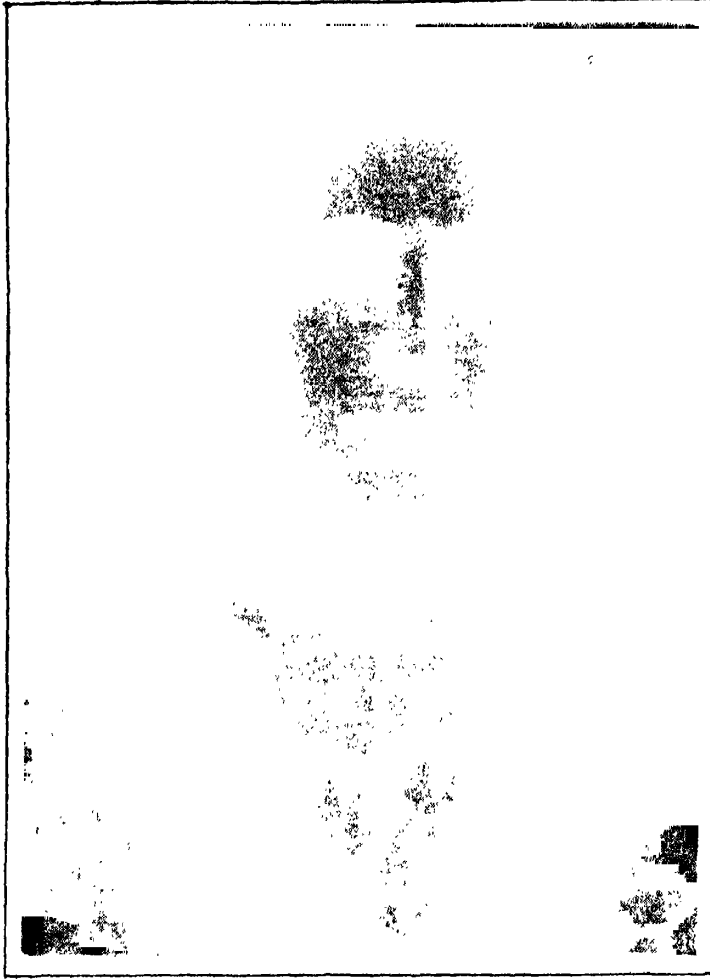
جب ہندوستان ۱۹۴۷ میں آزاد ہوا تو یہاں کا تعلیمی معیار بہت پست تھا. ایک سروے کے مطابق خواندگی کا تناسب صرف ۷ فی صد تھا. نئی حکومت کے سامنے ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کو پڑھانے کا مسئلہ تھا. اس مسئلہ پر خاص توجہ دی گئی. مسلمان خاص طور پر تعلیم کے میدان میں پیچھے تھے. عورتوں کا ذکر کیا، مرد بھی تعلیم سے بے گانہ تھے. لیکن آج یہ سب بدل گیا ہے. مسلمان عورتیں نہ صرف تعلیم حاصل کر رہی ہیں بلکہ نئی نسل کو تعلیم بھی دے رہی ہیں. عروسہ تنویر کا شمار ان اولو العزم عورتوں میں ہوتا ہے. وہ رام پور کے ایک کانونٹ میں بچیوں کو تعلیم

عروسہ تنویر

دیتی ہیں. انہوں نے علی گڑھ سے جغرافیہ میں بی. اے. آنرز کیا. نئی دلی کی جواہر لال نہرو یونی ورسٹی سے ایم کیا. اور دلی سے اپنے وطن پہنچ کر ایک کانونٹ میں ملازمت کر لی.

عروسہ کا وطن رام پور ہے. یہ وہی رام پور ہے جو آزادی سے پہلے اپنے لمبے اور گراری دار چاقوؤں کے لئے مشہور تھا، لیکن اب وہاں چاقو بنانے کی صنعت ماند پڑ گئی ہے.

عروسہ کے والد پولیس کے محکمہ میں سب انسپکٹر تھے. ان کا تبادلہ مختلف شہروں میں ہوتا رہتا تھا. عروسہ نے شاہ جہاں پور سے ہائی اسکول پاس کیا. ان کے والد قدامت پسند تھے انہوں نے عروسہ کو تعلیم دلائی لیکن پردے کی پابندی برقرار رہی. اس پابندی میں رام پور کے ماحول کا دخل تھا. وہاں آج تک ۹۰ فی صد مسلم عورتیں برقعے پہنتی ہیں. لڑکیاں اسکول اور کالج بھی برقعے پہن کر جاتی ہیں. لوگ اپنی لڑکیوں کو مخلوط تعلیم والے اداروں میں بھیجنے سے ہچکچاتے ہیں

اس بارے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ عروسہ کی والدہ انگریزی تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود آزاد خیال ہیں. انہوں نے عروسہ کو اپنی تعلیم مکمل کرنے میں بہت مدد کی. عام طور پر عورتوں کو جاہل اور قدامت پسند سمجھا جاتا ہے، لیکن عروسہ کی

والد اپنے طرزِ فکر میں خاصی ماڈرن ہیں۔ اس کے علاوہ عروسہ کے بڑے بھائی نے بھی عروسہ کی بہت مدد کی۔

جغرافیہ ایک خشک مضمون ہے۔ آزادی سے کئی سال بعد تک یہ مضمون یونی ورسٹی میں نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ اس میں فیلڈ ورک بھی شامل ہوتا ہے۔ عروسہ اس کام کے لئے کشمیر گئیں۔ لداخ اور سری نگر کی سرحد پر کارگیل کا درّہ واقع ہے۔ یہ وہی کارگیل ہے جو ہند و پاک کی جنگ میں خبروں کا موضوع بنا ہوا تھا۔ کارگیل میں سخت سردی پڑتی ہے۔ یہ علاقہ سال میں آٹھ مہینے برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ کارگیل اور باقی لداخ میں بدھ اور مسلمان باشندوں کی آبادی ہے۔ مسلمانوں کا تناسب ۵۰ فی صد ہے۔ لدّاخ میں ہندوؤں کی آبادی نہیں ہے۔ بدھ عورتوں میں ایک سے زیادہ خاوند رکھنے کا رواج ہے۔ لداخ کے علاوہ عروسہ نے کچھ عرصہ پنجاب میں بھی گزارا۔

عروسہ کے خیال میں مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب والدین اور خصوصاً ماں کی جہالت ہے۔ بچے کا پہلا اسکول ماں کی گود ہوتا ہے۔ ماں باپ رجحان گر ہوتے ہیں۔ اگر گھر میں تعلیم کا چرچا نہ ہو اس کی اہمیت نہ ہو تو بچہ تعلیم سے روشناس نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں بچے عموماً اسکول کے دوران ہی تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ عروسہ کا مشاہدہ رام پور تک محدود ہے۔ وہاں لڑکے عموماً ہائی اسکول تک بھی نہیں پہنچتے اگر ہائی اسکول پاس کر لیا تو کالج کی تعلیم پوری نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس لڑکیاں اعلیٰ تعلیم مکمل کر لیتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بی اے پاس لڑکی میٹرک پاس لڑکے سے بیاہ دی جاتی ہے۔ لڑکوں کی تعلیم ادھوری رہنے کی وجہ ان کی بے راہ روی ہے۔ رام پور آزادی سے پہلے ایک ریاست تھی۔ ہندوستان کے دوسرے نواب راجاؤں کی طرح وہاں بھی رؤسا عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے جیسا راجہ ویسی پرجا۔ نوابوں کی دیکھا دیکھی متوسط طبقہ بھی اس بے راہ روی کا عادی بن گیا۔

آج بھی وہاں کا متوسط طبقہ زیادہ شوقین طبع ہے بچے کی بسم اللہ اس طرح منائی جاتی ہے جیسے گھر میں کوئی شادی ہو۔ لڑکیوں کو سورۃ پڑھائی جاتی ہے تو اس تقریب پر بھی ایک شادی کا خرچ آ جاتا ہے۔

رام پور کے ماحول میں شوقین مزاج اور فضول خرچی کے علاوہ قدامت پسندی بھی رچی ہوئی ہے۔ عروسہ کو اس کا خوب تجربہ ہے وہ ہمیشہ والد کی نگرانی میں رہیں۔ ہائی اسکول تک باپ ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ کالج میں یہ ذمّہ داری بڑے بھائی نے سنبھال لی۔ دشواری اس وقت پیش آئی جب انہیں ایم اے کرنے کے لئے دلّی آنا پڑا۔ رام پور کے لوگ اس بات کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے کہ لڑکی اکیلی ہاسٹل میں رہے۔ اس موقع پر خوب لے دے ہوئی۔ والد عروسہ کے ہاسٹل میں رہنے کے خلاف تھے، لیکن ان کی ہمّت اور اعتبار ان کے آڑے آ گیا اور وہ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی پہنچ گئیں۔ ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے کئی جگہ ملازمت کی کوشش کی، لیکن یہاں بھی رام پور کی قدامت پسندی آڑے آ گئی۔ پتہ نہیں ملازمت ملنے کے بعد ان کا تقرر کہاں ہو! پھر تبادلہ کہاں ہو جائے؟ وہ گھر سے باہر اکیلی کس طرح رہیں گی؟ یہ سب باتیں سوچ کر ان کے والد نے ان کی سرکاری ملازمت کی مخالفت کی۔ عورتوں کے لئے صرف ایک ہی محفوظ پیشہ ہے اور وہ ہے پڑھانا۔ باقی کام 'غیر محفوظ' ہیں۔ اس اندازِ فکر کے نتیجے میں عروسہ کسی کمپٹیشن میں بھی نہیں بیٹھ سکیں۔ اس محرومی کا انہیں افسوس ہے انہوں نے مختلف مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن ان کی ایک نہیں چلی۔ ناچار انہیں ایک کانونٹ میں ٹیچر کا کام کرنا پڑا۔

جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں تعلیم پانے کے دوران عروسہ کی ملاقات وارث احمد خاں سے ہوئی وارث اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ وہ بہار کے ضلع اورنگ آباد کے رہنے والے ہیں۔ چند مہینے گزرے کہ دونوں کی شادی ہو گئی۔ اب مشکل یہ پڑی کہ وارث دلّی میں ہیں اور عروسہ رام پور میں۔ دلّی سے رام پور کا فاصلہ تقریباً ۲۰۰ کلومیٹر ہے۔ عروسہ کی کوشش ہے کہ ان کا تبادلہ رام پور سے دلّی ہو جائے تاکہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ رہ سکیں۔ اور انہیں رام پور کے تعصباتی ماحول سے نجات مل جائے۔ ●●

"مسلمانوں کی پس ماندگی کا سبب والدین اور خصوصاً ماں کی جہالت ہے، بچے کا پہلا اسکول ماں کی گود ہوتا ہے۔ ماں باپ رجحان گر ہوتے ہیں۔ اگر گھر میں تعلیم کا چرچا نہ ہو، اس کی اہمیت نہ ہو تو بچہ تعلیم سے روشناس نہیں ہوتا۔"

رادھارات کو ملی تھی تو بخار میں تپ رہی تھی۔

وہ بخار میں تپتی رہی ہے، اس کا پتہ اس وقت چلا جب وہ واپس جانے لگی۔ بس اچانک واپس جاتی ہوئی رادھا کے جسم سے اس کا ہاتھ ٹکرا گیا تھا اور اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کا ہاتھ کسی دہکتے انگارے سے ٹکرا گیا ہے۔

"رادھا تمہیں تو بہت تیز بخار ہے" بس اتنا ہی اس کے مونھ سے نکلا تھا اور رادھا کے چہرے پر خوف کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ اس نے بھی ہونی نظروں سے اسے دیکھا تھا اور کوئی جواب دئے بغیر آگے بڑھ گئی تھی، اور وہ اُسے پکارتا رہ گیا تھا۔

رات کو دیر تک اسے نیند نہیں آسکی تھی۔ یہ خیال بار بار اسے تنگ کرتا رہا تھا کہ رادھا بخار میں پھنک رہی ہوگی، بستر پر کروٹیں بدل رہی ہوگی۔ اس کا خیال رکھنے والا تو دور اس سے ہمدردی کے دو بول بولنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔

اسے اپنی بے وقوفی پر غصہ آرہا تھا کہ رادھا کے برتاؤ سے اس نے رادھا کی حالت کا اندازہ کیوں نہیں لگالیا؟

رادھا ہر لفظ رُک رُک کر ادا کر رہی تھی جیسے ہر لفظ کو ادا کرتے ہوئے اُسے ایک درد برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے چہرے سے کمزوری ٹپک رہی تھی اور اس کے لئے کھڑا ہونا مشکل تھا مگر اس نے اِس طرف دھیان نہیں دیا تھا اور نہ ہی رادھا نے یہ ظاہر ہونے دیا تھا کہ وہ بیمار ہے۔

وہ رات بھر ندامت کی آگ میں جُھلستا رہا اور پھر اس کے اندر کوئی اس کی جذباتیت کا مذاق اُڑانے لگا۔ 'اگر تمہیں پتہ بھی چل جاتا کہ رادھا کو زور کا بخار ہے تو تم کیا کر لیتے؟ کیا تم اسے دواخانے لے جاسکتے تھے؟ کیا رادھا تمہارے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کو تیار ہو جاتی؟ تم کس رشتے سے رادھا کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے؟ کیا اس کے سسرال والے یہ برداشت کر سکتے تھے؟

وہ رات بڑی بے چینی سے کٹی۔ ایک لمحہ بھی یہ احساس اس سے جدا نہیں ہوسکا کہ رادھا بخار میں تپ رہی ہے اور کوئی بھی اس کی خبر لینے والا کوئی نہیں ہے، وہ دل کو بہلانے کے لئے ہزار بہانے ڈھونڈ رہا ہے، لیکن اپنے دل کو نہ بہلا سکا۔ اگلے دن چھٹی تھی لیکن پھر بھی وہ جلد جاگ اٹھا۔

صبح ہی صبح اُسے نل پر رادھا پانی بھرتی نظر آئی تو اسے چکر آنے لگے۔

اُف کتنا بڑا ظلم ہے! رادھا اتنی بیمار ہے اور اس حالت میں کام کر رہی ہے۔

اسے پتہ تھا کہ رادھا بہر حال گھر کے سارے کام کرے گی۔ اگر کسی سے بھول کے اس نے اپنا دُکھ کہا تو اس پر سسرال والوں کی طرف سے گالیوں اور لاتوں کی برسات شروع ہو جائے گی۔

اور سنورانی جی کے نکھرے! کہہ رہی بیمار ہے۔ دس آدمیوں کا کھانا اکیلی کھالیتی ہے اور کہہ رہی ہے بیماری کی وجہ سے کام نہیں ہو رہا ہے۔

شاید ان ہی باتوں سے بچنے کے لئے ہی رادھا اپنی تکلیفوں کو نظر انداز کر کے گھر کے سارے کام کرنے میں لگی ہے۔

وہ ٹکٹکی باندھے رادھا کو دیکھتا رہا۔ رادھا بڑا سا کلسہ کبھی سر پر رکھ کر کبھی کمر پر اٹھائے پانی بھر رہی تھی۔ اس کے پاؤں بار بار لڑکھڑا جاتے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی گر جائے گی۔ مگر وہ کسی طرح خود کو سنبھال لیتی تھی۔

آخر وہ ہو ہی گیا جس کا اسے ڈر تھا۔

گھر کی سیڑھیوں کے پاس رادھا کے پاؤں
لڑکھڑا گئے اور وہ دھڑام سے گر پڑی۔ اس کا سر
قریب پڑے ہوئے پتھر سے ٹکرایا اور اس نے
رادھا کا چہرہ لہو لہان دیکھا۔

اندر سے ساس دوڑتی ہوئی آئی اور
کلسے کے پھک جانے پر رادھا کو کوسنے لگی۔
چھوٹی نند سہارا دے کر اندر لے جانے لگی
وہ بے بسی سے چپ چاپ سب کچھ
دیکھتا رہا۔

کئی بار اس کے دل میں آیا تھا کہ وہ اس
مکان اور اس محلّے کو چھوڑ دے اور کہیں اور مکان
لے کر رہنے لگے۔ لیکن اتنے دنوں تک رادھا پر
ہونے والے جو مظالم اس نے اپنی آنکھوں سے
دیکھے ہیں کیا اس کے محلّہ چھوڑ کر چلے جانے سے
وہ مظالم بند ہو جائیں گے؟ کیا رادھا پر ہونے
والے ان مظالم کو وہ بھول سکے گا؟

دُور رہنے پر بھی طرح طرح کے خیالات
اسے اس بات کا احساس دلاتے رہیں گے، رادھا
کس حالت میں ہے؟ اس کے سسرال والے
اس پر کس قسم کے ظلم ڈھا رہے ہیں؟

اس میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ رادھا
کو ان مظالم سے نجات دلا سکے۔ گذشتہ دنوں اماں
اور دیدی بھی آکر گئے تھے اور انہوں نے بھی اپنی
آنکھوں سے رادھا پر ہونے والے مظالم دیکھے تھے
ان مظالم کو دیکھ کر ان کے دِل میں بھی رادھا کے
لئے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ بھگوان! کسی بھی
لڑکی کو اس عمر میں بیوہ کر کے اس کی زندگی رادھا
کی طرح جہنم نہ بنا دئے۔

لیکن اسے علم تھا کہ ان کی رادھا سے
یہ ہمدردی صرف اس لئے ہے کہ رادھا ان
کے محلّے میں رہتی تھی اور وہ رادھا کو اچھی طرح
جانتے ہیں۔ وہ رادھا کے دُکھوں کو دُور کرنے
لئے کوئی قربانی نہیں دے سکتے اور اسے اپنی
بہو بنانے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتے
بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بیوہ ان کے گھر
کی بہو بنے۔ مانا کہ اس میں لاکھ خوبیاں ہیں۔

پتہ نہیں گھر والوں کو علم بھی ہے یا نہیں
کہ وہ رادھا سے پیار کرتا ہے، شاید علم بھی
ہو گا کیوں کہ رادھا اکثر ان کے گھر آتی تھی۔
رادھا کا جوش اور خود اس کی تڑپ گھر والوں
کی نظروں سے نہیں چھپی ہو گی اور انہوں نے
اس کے پیچھے کے نرم جذبے کو محسوس کر لیا ہو گا

آخر وہی ہو گیا جس کا اُسے ڈر تھا۔
گھر کی سیڑھیوں کے پاس رادھا کے
پاؤں لڑکھڑا گئے اور وہ دھڑام سے گر پڑی۔
اس کا سر قریب پڑے ہوئے پتھر سے ٹکرایا،
اس نے رادھا کا چہرہ لہو لہان دیکھا۔

لیکن انہوں نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ رادھا
ان کے گھر کی بہو بن سکتی ہے یا بہو بننے کے
قابل ہے۔

جب رادھا کی شادی طے ہوئی تھی تو
انہوں نے کہا تھا۔ "رادھا بہت اچھی لڑکی
ہے۔ جس گھر میں جائے گی اس گھر کو جنّت
بنا دے گی۔"

اس وقت اس کے دِل میں آیا تھا کہ
کہہ دے۔ "تو ماں، کیوں نہ رادھا ہمارے
گھر آئے اور ہمارے گھر کو جنّت بنا دے، میں
رادھا سے پیار کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھے چاہتی
ہے۔ میں رادھا سے شادی کرنا چاہتا ہوں،
بس تمہارے ہاں کہنے کی دیر ہے۔ سب ٹھیک
ہو جائے گا۔ رادھا کا یہ رشتہ بھی ٹوٹ جائے گا"
لیکن اس میں یہ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

اسے پتہ تھا اس بات پر اسے ماں کی جھڑکیاں
سننی پڑے گی۔

ابھی تیری پڑھائی بھی پوری نہیں ہوئی
ہے۔ تو اپنے پیروں پر بھی کھڑا نہیں ہوا ہے، اپنے
گھر والوں پر ایک بوجھ ہے۔ اب بیوی کو بھی
بوجھ بنانا چاہتا ہے۔ پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو
پھر شادی کے خواب دیکھنا۔

اور وہ کچھ نہیں کہہ سکا۔

رادھا کی شادی ہو گئی اور وہ چپ چاپ
اپنے شوہر کے ساتھ اپنے نئے گھر چلی گئی اور
اسے پہلی بار پتہ چلا کہ لڑکیاں کیسے کیسے درد
اپنے سینے میں چھپا کر سمجھوتے کر لیتی ہیں۔

پھر اس کی پڑھائی ختم ہو گئی اور اسے
ایک نوکری مل گئی۔

اِس درمیان رادھا کا آخری سہارا اس
کے والد بھی دنیا میں نہ رہے اور اس حادثے کے
کچھ دن بعد وہ بیوہ ہو گئی۔

اس کا تبادلہ اس شہر میں ہو گیا جہاں
رادھا کی سسرال تھی۔ اسے مکان بھی رادھا
کے مکان کے سامنے ملا۔ تب اس نے اپنی
آنکھوں سے دیکھا کہ بیوہ ہو جانے کے بعد رادھا
اپنے سسرال والوں کے کیسے کیسے مظالم سہہ
رہی ہے اور کتنی اذیت ناک زندگی گزار رہی
سسرال والے اس کے شوہر کی موت
کی ساری ذمّہ داری اسی پر ڈالتے تھے۔ کہتے تھے
کہ منحوس ہے۔ اپنے شوہر کو کھا گئی۔ وہ رادھا سے
دِن بھر جانوروں کی طرح کام لیتے تھے اور اسے

...نے کے منہ کو کھا شوکھا اور باسی کھانا دیتے

بات بات پر اس پر گالیوں کی برسات

...ر ہتے تھے اور کبھی کبھی تو ہاتھ بھی اٹھا

...تھے۔ رادھا چپ چاپ سب کچھ برداشت کرلیتی

...کر وہ اس کا آخری سہارا تھا۔ دنیا میں

اور ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ سر چھپا سکے

وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا رہا

...ور کڑھتا رہتا۔ وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

...ن اس کی ہمدردی کا اس کی سسرال

...طلب نکال بیٹھیں اور رادھا پر نئے نئے

...لم کریں۔

رادھا خود اس سے نظریں ملانے سے

...تھی، لیکن جب کبھی موقع مل جاتا اس سے

...کے لئے ضرور آجاتی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا

...دھا کے دل میں اب بھی اس کے لئے پیار کا

شعلہ بھڑک رہا ہے۔

لیکن وہ بزدل تھا۔ اس میں بغاوت کرکے رادھا کو اپنانے کی ہمت نہیں تھی۔ اسے ڈر تھا، اس نے ایسا کیا تو لوگ، سماج، اس کے گھر والے اسے کیا کہیں گے۔

دوپہر تک رادھا کے مکان میں سناٹا رہا۔ اس کی کیا حالت ہے، اس پر کیا بیت رہی ہے، کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

شام کو اچانک یہ خبر پھیل گئی کہ رادھا کی حالت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں بتائی ہے۔

وہ تڑپ اٹھا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ ایک تو پہلے ہی بیمار اور کمزور تھی، اوپر سے اب بہت زیادہ خون بہہ گیا ہے۔ اس لئے جسم میں اتنی کمزوری آگئی ہے کہ اسے دور کرنا مشکل ہے۔

سارا محلہ رادھا کو دیکھنے کے لئے امڈ پڑا تو وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔

رادھا بے ہوش تھی، وہ رادھا کو دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد رادھا کو ہوش آیا اور اس نے اپنی کھولیں۔ ملامت بھری نظروں سے وہ اس کی طرف دیکھنے لگی، جیسے اس سے کہہ رہی ہو۔ 'تم بزدل ہو، تم میں بغاوت کرکے سماج، گھر والوں سے ٹکرانے کی ہمت نہیں ہے۔ اس لئے میں آج موت کی بھینٹ چڑھ رہی ہوں۔ میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا بزدل تمہاری گردن پر۔

اور پھر رادھا کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔

■■

اپنی ذہانت کو آزمائیے، اپنی معلومات کا امتحان لیجیے۔ دس سوالوں کے صحیح جوابات بھیج کر آپ انعام میں ایک سوان پرنٹیشر کو کر حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح جوابات بھیجنے والے ایک سے زیادہ ہوئے تو انعام پانے والوں کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا جائے گا اگر سب سوالوں کے صحیح جوابات کسی نے بھی نہ بھیجے تو انعام سب سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے کو دیا جائے گا۔
۱۵۔ نومبر ۱۹۸۵ تک ہمیں ملنے والے جوابات اس مقابلے میں شریک ہو سکیں گے۔

"ذہنی ورزش نمبر ۱۱" ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۔ روس کی ریاست تاجکستان کا صدر مقام کون سا ہے؟

۲۔ کولمبس نے امریکہ کس سنہ میں دریافت کیا تھا؟

۳۔ ابوالہول کا مجسمہ کس ملک میں ہے؟

۴۔ مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری کس شہر کے رہنے والے تھے؟

۵۔ آگرہ کا دوسرا نام کیا ہے؟ اکبر آباد

۶۔ دنیا میں سب سے زیادہ کس مذہب کے ماننے والے ہیں؟ اسلام

۷۔ ٹیپو سلطان کا مقبرہ کہاں ہے؟

۸۔ پانی کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ H_2O

۹۔ جیومیٹری کا موجد کون تھا؟

۱۰۔ اقبال اور فیض دونوں کا آبائی وطن ایک ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟

ذہنی ورزش نمبر ۱۱

(۱) ....
(۲) ....
(۳) ....
(۴) ....
(۵) ....
(۶) ....
(۷) ....
(۸) ....
(۹) ....
(۱۰) ....
نام : ....
پتہ : ....

جنم جنم کا ساتھ

کیرالہ کے ایک اسپتال میں دو جڑواں بھائی زیر علاج ہیں۔ دونوں کا نام ایک ہی ہے۔ دونوں ہمیشہ ایک ہی کھاٹ پر سوتے۔ ایک ہی وقت میں کھانا کھایا۔ نیند بھی ساتھ ساتھ آتی۔ بھوک بھی ایک ساتھ لگتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے ایک ہی لڑکی سے شادی کی۔ ان کی بیوی کی عمر اب ۷۰ برس ہے۔ اسے یاد ہے کہ ۵۶ سال پہلے دونوں بھائیوں نے اسے منگل سوتر پہنایا تھا۔ ان دونوں بھائیوں سے ۹ بچے پیدا ہوئے۔ اب دونوں بھائی ۸۵ سال سے اوپر ہیں۔ ڈاکٹروں کا گمان ہے کہ دونوں ایک ساتھ ہی دنیا سے بھی جائیں گے۔

جب دودھ ضامن ہو جاتا ہے

عام خیال ہے کہ ماں بچے کو دودھ پلا رہی ہو تو اس دوران میں وہ دوبارہ حاملہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ بات ۔۔ اقی صد صحیح نہیں ہے۔ کئی بار عورتوں نے اس مقولہ پر عمل کیا اور وہ دوبارہ حاملہ ہوگئیں۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک ڈاکٹر نے اس سلسلے میں تحقیقات کی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ مقولہ کافی حد تک صحیح ہے، شرط یہ ہے کہ ماں بچے کو کم از کم ۶۰ منٹ روزانہ دودھ پلائے اگر وہ دن میں کم از کم چھ بار یہ عمل دہراتی رہے تو دودھ ضامن ہو سکتا ہے۔ اگر عورت رضاعت کے دوران میں حاملہ ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے اس نے روزانہ اپنا دودھ پلانے کے ۶۰ منٹ پورے نہیں کیے۔ اس ڈاکٹر نے سیکڑوں عورتوں پر تجربہ کر کے اس بات کو بھی ثابت کر دیا کہ بچوں کو بوتل سے دودھ پلانے والی مائیں بچے کی پیدائش کے ۸ ہفتے بعد دوبارہ حاملہ بننے کے قابل ہو جاتی ہیں، جب کہ اپنا دودھ پلانے والی مائیں ۳۳ سے ۳۶ ہفتے تک حمل سے محفوظ رہتی ہیں۔

ایک پیدائشی متوالا

جان امریکہ میں رہتا ہے۔ اس کی عمر ۶ سال ہے۔ اس کو ایک عجیب و غریب بیماری لاحق ہے۔ اگر وہ ایک کیک کا ٹکڑا کھالے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شراب کا ادھا چڑھالیا ہے۔ اس کا جسم کیک کے نشاستے اور مٹھاس کو فوراً الکحل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسے الکحل کے اثرات سے بچنے کے لئے ہمیشہ دوا کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اگر وہ دوا کا استعمال نہ کرے تو اسے ہر وقت نشے میں دُھت رہنا پڑتا ہے۔

جان کو یہ بیماری ۷ مہینے کی عمر میں لاحق ہوگئی تھی۔ اس عمر میں اسے کان میں تکلیف محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا تو اسے جان کے کان میں سوجن دکھائی دی۔ اس کا کان پک گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس سوجن کو کم کرنے کے لئے ایک طاقت ور اینٹی بائیوٹیک دوا دی۔ کان کی بیماری تو رفع ہوگئی، لیکن طاقت ور اینٹی بائیوٹیک نے اس کے نظامِ ہضم پر بُرا اثر ڈالا۔ اور اس کا جسم ایک شراب کی بھٹی بن گیا۔ وہ جب کوئی میٹھی چیز کھاتا تو پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا۔ دیوار کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا۔ نہ بولتا، نہ عام بچوں کی طرح چلتا پھرتا۔ جب وہ تین سال کی عمر تک پہنچا تو اس نے کھانا پینا بند کر دیا۔ اگر وہ کبھی کچھ کھالیتا تو مست ہو جاتا۔ جان کے والدین نے کئی ڈاکٹروں سے علاج کرایا لیکن اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ جان کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اگر وہ پاگل نہیں ہوا تو جلد ہی پاگل ہو جائے گا۔ جان کے والدین نے ڈاکٹروں کی بات کا اعتبار نہیں کیا۔ وہ ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال اور دوسرے سے تیسرے اسپتال گئے، لیکن جان کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ جان نے کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا۔ اسے مصنوعی طور پر غذا پہنچانی پڑتی تھی۔

جان کے والدین ناامید ہوگئے تھے کہ انہیں اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دی۔ انہوں نے اتفاقاً ایک اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ جاپان میں ایک شخص کو یہ بیماری لاحق ہوگئی تھی۔ جاپان کے ڈاکٹروں نے اس کا علاج کیا اور وہ ٹھیک ہوگیا۔ یہ دوا امریکہ میں نہیں ملتی تھی۔ ناچار جان کے والدین نے اسے

مریض سے رابطہ قائم کیا۔ جاپان سے یہ دوا امریکہ پہنچ گئی اور جان تن درست ہوگیا۔ لیکن اس کے لئے ابھی تک مٹھائی کا استعمال ممنوع ہے۔ وہ پھلوں اور سبزیوں پر گزر کرتا ہے۔ جان کے والدین سوچتے ہیں کہ جاپانی دوا نے جان کے نظام ہضم کو دوبارہ اپنی اصلی حالت پر پہنچا دیا تھا، ممکن ہے کہ ایک دن جان ڈبل روٹی اور مٹھاس بھی کھا سکے اور نشے میں متوالا نہ ہو۔

وہ نوکرانی سے جج بن گئی

اجیت ہربنس سنگھ ایک سکھ عورت ہے۔ وہ ۱۹۵۳ء میں انگلستان گئی تو ہندوستانی سفارت خانے کے ایک افسر کے گھر میں خادمہ بن گئی۔ انگلستان میں اجیت کی زندگی خادمہ کے رول میں شروع ہوئی، لیکن آج وہ ایک آنریری مجسٹریٹ ہے۔ وہ پہلی ہندوستانی سکھ عورت ہے جسے اتنا بڑا اعزاز عطا ہوا۔ وہ عدالت میں چھوٹے موٹے دیوانی اور فوجداری کے مقدموں کا فیصلہ کرتی ہے۔

اجیت نے اپنے دوسرے وطن میں پہنچتے ہی وہاں کی زندگی کا مطالعہ کرنا شروع کردیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو انگلستان کے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ وہاں کلچرل پروگرام منعقد کئے۔ انگریزوں کو ہندوستانی کھانوں سے روشناس کرایا۔ ایک بار وہ اپنے علاقے سے بیوٹی کوئین بھی منتخب ہوگئی تھی۔ لیکن انگریز ججوں نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتے ہوئے اسے دوسرا انعام دیا۔ ججوں کا خیال تھا کہ انگریز عوام ایک ایسی عورت کو حسن کی ملکہ ماننے میں تامل کریں گے جس کا رنگ سفید، آنکھیں نیلی اور بال سنہری نہ ہوں۔ اجیت نے ۱۹۶۰ء کے بعد انگلستان کے ٹی۔ وی پروگراموں میں بھی حصہ لیا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہاں کے ہندوستانی مہاجرین کے فلاح و بہبود میں مصروف ہوگئی۔ اس کے لئے یہ بات آسان تھی کیونکہ وہ ہندوستان کی پانچ زبانیں روانی سے بول سکتی ہے۔ اس کی محنت اور لگن کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے اسے جسٹس آف پیس یعنی آنریری مجسٹریٹ بنا دیا۔

ویت نام۔ دس سال پہلے ایک لاکھ طوائفوں کا ملک تھا۔

ویت نام کی جنگ دوسری عالمی جنگ کے بعد سب سے زیادہ ہلاکت انگیز حادثہ تھی۔ لاکھوں امریکن سپاہی جنوبی ویت نام کی سرکار کے ساتھ مل کر شمالی ویت نام کی فوجوں سے لڑ رہے تھے۔ جنوبی ویت نام کی راج دھانی سائیگون تھا۔ یہ شراب، جوئے، اسمگلنگ اور طوائفوں کا شہر کہلاتا تھا۔ کئی سال تک لڑنے کے بعد آخر امریکہ کو ہار ماننی پڑی اور انہوں نے ویت نام خالی کردیا۔ اس کے بعد شمالی ویت نام نے سائیگون پر حملہ کردیا اور وہاں کی سرکار کو بھاگتے ہوئے ہی بن پڑی۔

آج اس واقعہ کو دس سال گزر گئے ہیں۔ ان دس برسوں میں ویت نام کی سرکار نے لوگوں کی فلاح و بہبود کا ایک ریکارڈ قائم کردیا ہے۔ جوا اور اسمگلنگ بند کردئے گئے۔ سائیگون میں طوائفوں کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر تھی۔ اب وہاں صرف چند طوائفیں ہی رہ گئی ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سائیگون کی آبادی۔ ۴۰ لاکھ سے ۳۵ لاکھ رہ گئی۔ گاؤں سے شہر آنے والوں کا ریلا کم ہوگیا۔ لوگوں کو دوبارہ دیہات میں بھیج دیا گیا اور وہاں ان کے لئے کام کا بندوبست کردیا گیا۔ سائیگون کا نیا نام ہوچی منہ شہر ہے۔ جنگ کے خاتمہ کے دس سال بعد ویت نام کی سرکار نے بیرونی اخبارات کے نامہ نگاروں کو پہلی بار سائیگون آنے کی دعوت دی ہے، تاکہ وہ وہاں پہنچ کر اپنی آنکھوں سے نئے شہر کی صاف ستھری زندگی کا مشاہدہ کریں۔

دانتوں کی بیماری سے ہمیشہ کیلئے نجات

میڈیکل سائنس نے بیسویں صدی میں انسان کی صحت کے لئے شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ ایک سائنس داں نے پولیو کا ٹیکہ ایجاد کیا اور ہزاروں بچوں کو اپاہج ہونے سے بچایا۔ چیچک جیسے موذی مرض کا دنیا سے خاتمہ ہوگیا۔ آنے والی نسلیں اس بیماری کا حال صرف کتابوں میں پڑھ سکیں گی۔ مردہ کی آنکھ سے کورینا نکال کر دوسرے نابینا انسان کو بینائی مل جاتی ہے۔ گردے بے کار ہوجائیں تو ڈائی لیس انسان کو زندہ رکھتا ہے۔ اب سائنس داں کینسر جیسے مہلک مرض کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ اتنی مہلک اور جان لیوا بیماریوں کے علاج کی کھوج میں دانت بیچارہ گم ہوگیا تھا۔ کسی سائنس داں نے دانت کی طرف توجہ نہ دی تھی۔ دانتوں کی خرابی کوئی مہلک مرض نہیں ہے، اس لئے یہ فہرست میں سب سے نیچے رہ گیا۔

اب خدا خدا کر کے دانتوں کی باری آئی ہے حال ہی میں سائنس دانوں نے ایسا ٹیکہ ایجاد کیا ہے جس کے لگنے کے بعد ساری عمر دانت میں کیڑا نہیں لگے گا۔ یہ ٹیکہ انگلستان میں ایجاد ہوا ہے اور امید ہے کہ جلد ہی ہندوستان پہنچ جائے گا۔ بچے کے یہ ٹیکہ لگا دیا جائے تو وہ ساری عمر کے لئے دانتوں کی بیماری سے محفوظ رہے گا۔ جوانوں اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کے بھی یہ ٹیکہ لگایا جاسکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ٹیکہ لگاتے وقت ان کے سارے یا بچے کھچے دانت صحت مند ہونے چاہئیں۔ دانتوں میں پہلے سے ہی کیڑا لگا ہو تو ٹیکہ ضائع جائے گا۔ ○○

سویٹر کے دِل کش ڈیزائن

بیوٹی کالج

شہناز حسین

تو فریج میں جاکر گرمی کھائیں۔ سبزیوں کو بے تحاشا پکانے سے بھی ان کے وٹامن ضائع ہوجاتے ہیں۔ دُودھ اگر بوتل کا ہے تو اسے دوبارہ نہ پکائیں۔ اگر کچا ہے تو ہلکا سا جوش دینا کافی ہے۔ آپ کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ مغربی ممالک میں لوگ دُودھ کو کبھی آگ پر نہیں رکھتے۔ وہ چائے اور کافی میں بھی ٹھنڈا دُودھ ڈالتے ہیں۔ کچھ عورتیں دُودھ کو تین بار جوش دے کر چولہے سے اُتارتی ہیں۔ اس طرح اس کے وٹامن ضائع ہوجاتے ہیں۔

وٹامن کی دریافت کو بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا، لیکن اس مختصر عرصے میں وٹامن نے صحت اور حسن درستی کی کتاب میں اپنی جگہ مخصوص کرلی ہے۔ وٹامن کی کئی قسمیں ہیں۔ اے، بی، سی، ڈی، اور ای۔ یہ وٹامن الگ خاصیت کا حامل ہے۔ مثلاً کچھ وٹامن اعصاب کو طاقت پہنچاتے ہیں۔ تو کچھ جلد کے لئے فائدہ مند ہیں۔ کچھ وٹامن دانتوں اور مسوڑھوں کے لئے فیض رساں ہیں تو کچھ خون کی کمی کے دُور کرنے کے لئے مشہور ہیں۔

وٹامن بازار میں گولیوں کی شکل میں مل سکتے ہیں، لیکن انہیں حاصل کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انہیں غذا میں تلاش کیا جائے۔ سب سے پہلے وٹامن اے کو لیجئے۔ یہ وٹامن انسانی جلد کے لئے مفید ہے۔ اس کا استعمال جلد میں جھرّیاں پیدا ہونے نہیں دیتا۔ یہ بالوں کے لئے بھی مفید ہے۔ اس سے بالوں میں چمک اور مضبوطی برقرار رہتی ہے۔ وٹامن اے کا سب سے زیادہ فائدہ بینائی کو پہنچتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ اندھے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں جب ان کے اندھے پن سے متعلق تحقیقات کی گئیں تو معلوم ہوا کہ یہ سب وٹامن اے کی کمی کا شکار ہیں۔ اگر چہرے پر سیاہ کیلیں نمودار ہوجائیں یا ایکنے کا حملہ ہو تو وٹامن اے کا استعمال چہرے کو اس شکایت سے نجات دلا سکتا ہے۔ چہرے پر سفید جھائیاں ہوں تو یہ بھی وٹامن اے کی کمی کی وجہ سے نمودار ہوتی ہیں۔

وٹامن اے کو غذا کے ذریعہ حاصل کرنے کے لئے پھل اور ترکاریوں کا سہارا لینا چاہئے۔ یہ دُودھ، مکھن، پنیر اور انڈے میں پایا جاتا ہے۔ سبزیوں میں گاجر، پالک کا ساگ، سلاد کے پتے اور ٹماٹر وٹامن اے سے بھرپور ہوتے ہیں۔ گوشت میں کلیجی وٹامن اے کا خزانہ ہے۔ کلیجی کی یخنی پینا بے کار ہے۔ یخنی میں کلیجی کا مزہ اور بُو آجاتی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ حکیموں کی یہ بات غلط ہے کہ گوشت کی یخنی پکانے سے اس کا سارا ست نکل آتا ہے۔ ماڈرن سائنس اس نظریہ کے خلاف ہے۔ کلیجی کو بھون کر یا پکا کر کھائیں۔ اگر ہوسکے تو فریج میں ...

وٹامن بی اکیلا وٹامن نہیں ہے، بلکہ آٹھ وٹامن کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی گولیوں کو 'بی کامپلکس' کہتے ہیں۔ یہ وٹامن اعصاب کے لئے ضروری ہے۔ یہ جسم کا اعصابی نظام درست طریقہ سے چلاتا ہے۔ اگر آپ خود کو تھکی ہوئی یا نروس محسوس کرتی ہیں تو آپ کو وٹامن بی سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اگر آپ کے سر پر کام کا بوجھ ہو یا گھر میں بن بلائے مہمان آگئے تو وٹامن بی کی گولیاں آپ کے اعصاب کو سکون پہنچائیں گی۔ حمل کے دوران بھی اس کا استعمال مفید ہے۔ یہ بے چھنے آٹے میں پایا جاتا ہے۔ اگر چھنے ہوئے آٹے میں تھوڑی سی بھوسی ملالیں تو اس کی کمی پوری ہوجاتی ہے یہ کچّے انڈے کی زردی میں بھی ملتا ہے اور گُردے میں بھی۔ اس کے علاوہ خمیر بھی وٹامن بی سے بھرپور ہوتا ہے۔ یہ وٹامن بھی آپ کی جلد کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر خون کی کمی میں وٹامن بی ۶، ۱ اور ۱۲ کا انجکشن تجویز کرتے ہیں۔ پہلے یہ انجکشن جانور کی کلیجی سے بنائے جاتے تھے اور بہت

بنتے ہوتے تھے۔ لیکن اب یہ مصنوعی طور پر تیار ہوتے ہیں۔ اور بہت سستے ہوتے ہیں۔ انجکشن کی بجائے گولیوں کا استعمال کریں۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسے غذا کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔

وٹامن سی انسانی جسم کے خلئے اور ریشے مضبوط بنانے کے کام آتا ہے۔ زکام اور فلو میں وٹامن سی تیر بہدف دوا ہے۔ ہندوستان میں لوگ زکام میں کھٹی چیزیں کھانے سے منع کرتے ہیں۔ لیکن مغربی ممالک میں زکام کا ایک ہی علاج ہے: تیز گرم چائے میں دودھ کے بجائے ایک لیموں کا عرق نچوڑ کر پی لیں اور کپڑا اوڑھ کر بستر پر دراز ہو جائیں۔ وٹامن سی نزلہ زکام کے علاوہ دانتوں اور مسوڑھوں کے لئے بھی ضروری ہے۔ اگر آپ کے مسوڑھوں سے خون نکلتا ہے تو آپ ایسی غذا استعمال کریں جس میں وٹامن سی کثرت سے ہو۔ تمام عرق والے پھل مثلاً نارنگی، سنترہ، لیموں، مالٹا، انناس وغیرہ وٹامن سی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کلیجی، بند گوبھی، پھول گوبھی، پالک کا ساگ اور امرود میں بھی وٹامن سی پایا جاتا ہے۔

وٹامن ڈی، دانتوں اور ہڈیوں کے لئے مفید ہے۔ اس وٹامن میں ایک خرابی یہ ہے کہ اس کی کثیر مقدار نقصان دہ ہے۔ دوسرے وٹامن اگر ضرورت سے زیادہ جسم میں پہنچ جائیں تو فاضل وٹامن جسم سے خود بخود خارج ہو جاتے ہیں۔ لیکن وٹامن ڈی اس طرح خارج نہیں ہوتا۔ بچوں کے لئے یہ وٹامن بہت ضروری ہے، کیوں کہ اس میں کیلشیم ہوتا ہے۔ اس وٹامن کی گولیاں کھانے سے بہتر ہے کہ اسے غذا کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ سورج کی روشنی سے یہ وٹامن مفت ملتا ہے۔ صبح کا سورج وٹامن ڈی کو اپنی کرنوں کے ذریعہ انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ دھوپ سے جہاں کچھ نقصان ہیں، وہاں یہ فائدہ بھی ہے کہ جسم وٹامن ڈی سے محروم نہیں ہوتا۔

وٹامن ڈی، مچھلی، انڈے، دودھ، پنیر اور کاڈ لیور آئل میں ملتا ہے۔ کاڈ لیور آئل نہ ملے تو کسی بھی مچھلی کا تیل استعمال کیا جا سکتا ہے۔

وٹامن ای دورانِ خون کو درست کرنے میں مدد کرتا ہے۔ چہرے کی جلد کے لئے بھی وٹامن ای کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے استعمال سے چہرے پر بڑھاپا نمودار نہیں ہوتا۔ کچھ عورتیں وٹامن ڈی کا تیل چہرے پر لگاتی ہیں۔ یہ غلط ہے۔ روغنی جلد کے لئے یہ تیل نقصان دہ ہے۔ ہاں اگر وٹامن ای کا تیل سر کے بالوں کے تیل میں ملا کر لگایا جائے تو بال گھنے اور چمک دار ہو جاتے ہیں۔ وٹامن ای کے تیل کو کریم میں ملا کر چہرے پر لگایا جا سکتا ہے۔ یہ وٹامن گاجر، بند گوبھی، زیتون کے تیل، روٹی، اخروٹ، بادام، مونگ پھلی، کاجو اور سبز پتوں والی ترکاری میں پایا جاتا ہے۔ ●

نسخے

مہر بانو

چاول ابالتے وقت پانی میں تھوڑا سا لیموں کا رس نچوڑ لیا جائے تو چاولوں کا رنگ خوب نکھر جاتا ہے اور چاول جڑنے بھی نہیں پاتے۔

کریلے پکانے سے پہلے انہیں نمک کے پانی سے دھو لیجئے اور چھیل چھیل کر نمک کے پانی میں ڈالتی جائیے۔ ایسا کرنے سے کریلوں کی کڑواہٹ جاتی رہے گی۔

●

دودھ سے زیادہ بالائی حاصل کرنی ہو تو دودھ کو اچھی طرح جوش دے کر اس میں تھوڑا سا سنگھاڑے کا آٹا چھڑک دیجئے اور تھوڑی دیر کے بعد بالائی اتار لیجئے۔ بالائی کی خوب موٹی تہہ آجائے گی۔

●

گوبھی کی بو ناگوار ہو تو تھوڑا سا سرکہ یا لیموں کا عرق پانی میں ملا کر پکی ہوئی گوبھی میں ڈال دیجئے۔ گوبھی کا ذائقہ نہایت لذیذ ہو جائے گا۔

خون کی کمی کا قدرتی علاج

ہیلتھ کلب

اگر آپ کا چہرہ زرد رہتا ہے، اس پر جھریاں پڑنے اور بڑھنے لگی ہیں۔ آنکھیں تھکی تھکی دکھائی دیتی ہیں، یادداشت خراب ہوگئی ہے، بدن میں کمزوری محسوس ہوتی ہے، سر چکراتا ہے، تھوڑا سا کام کرنے سے سانس پھولنے لگتا ہے اور بغیر کام کے تھکان محسوس ہوتی ہے تو اس بات کا اندیشہ یقین میں بدل جاتا ہے کہ آپ خون کی کمی میں مبتلا ہیں۔

خون کی کمی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جسم میں خون کم ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خون میں سرخ ذرات کم ہیں۔ انسان کا خون سرخ اور سفید ذرات سے مل کر بنتا ہے۔ سرخ ذرات کو ہیموگلوبین کہتے ہیں۔ خون میں سرخ ذرات کی عمر ۱۲۰ روز ہوتی ہے۔ اس مدت کے بعد ختم ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ تازہ ذرات لے لیتے ہیں۔ ۱۰۰ سی سی خون میں ۱۵ گرام سرخ ذرات ہونے ضروری ہیں۔ اگر یہ ۵ فی صد کا تناسب کم ہوجائے تو انسان انیمیا یا خون کی کمی کا شکار سمجھا جاتا ہے۔ سرخ ذرات ہڈیوں کے گودے میں تیار ہوتے ہیں۔ یہ لوہے، پروٹین اور وٹامن کی مدد سے پیدا ہوتے ہیں۔

خون کی کمی کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔ اگر ہڈیوں کے گودے میں کوئی خرابی پیدا ہوجائے تو سرخ ذرات کی پیداوار میں بھی کمی ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ماہواری کی زیادتی، بواسیر میں خون کا زیادہ بہنا یا کسی ایکسیڈینٹ میں جسم سے کافی مقدار میں خون کا اخراج بھی اس کا سبب بن سکتے ہیں۔ نظام ہضم میں خرابی پیدا ہوجائے تو اس سے بھی یہ شکایت پیدا ہوسکتی ہے۔ مثلاً جسم میں نمک کا تیزاب بنتا ہے جو سخت اور ثقیل کھانے کو جلا دیتا ہے۔ اگر انسان فکر اور اندیشے میں مبتلا ہو تو اس تیزاب کی پیداوار کم ہوجاتی ہے۔ کھانے میں لوہا اور پروٹین صحیح طور پر ہضم نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ تیز دواؤں سے بھی وٹامن ضائع ہوجاتے ہیں۔ تپ دق میں بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔ پیٹ میں کیڑے یا کیچوے ہوں تو یہ بھی انسانی خون پی جاتے ہیں۔ ۲۵ کیچوے ۲۴ گھنٹے میں ڈیڑھ اونس خون ہضم کرجاتے ہیں۔

خون کی کمی کا علاج یہ ہے کہ اس کمی کو پیدا نہ ہونے دیا جائے۔ اگر بچوں کو بڑھوتری کے زمانے میں ایسی غذا دی جائے جس میں لوہا موجود ہو تو وہ شاذونادر ہی خون کی کمی کا شکار ہوتے ہیں۔ لوہا بے چھنے آٹے میں پایا جاتا ہے۔ دھان اور مشین کے بغیر صاف کیا ہوا چاول بھی لوہے کا خزانہ ہوتا ہے۔ سبز پتوں والی ترکاریاں مثلاً سرسوں اور پالک کا ساگ، مٹر، بند گوبھی، گاجر، چقندر اور ٹماٹر بھی لوہے سے بھرپور ہوتے ہیں۔ پھلوں میں سیب، انجیر، انگور، کھجور اور آڑو میں بھی لوہا پایا جاتا ہے۔ صرف وہ خوراک کھانا کافی نہیں جس میں لوہا وافر مقدار میں ہو۔ اس کے لئے پروٹین کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ہوں تب ہی خون کی کمی دور ہوتی ہے۔ پروٹین کے لئے دودھ، پنیر اور انڈے کا استعمال بھی ضروری ہے۔

وٹامن بی ۱۲ انیمیا کی تیر بہدف دوا ہے۔ اس کے ۵ انجکشن کی شیشی تقریباً ۱۰ روپے میں مل جاتی ہے۔ ایک شیشی میں ۱۰ سی سی دوا ہوتی ہے۔ ہر دوسرے روز ۲ سی سی کا انجکشن لینے سے وٹامن بی ۱۲ کی کمی دور ہوجاتی ہے لیکن انجکشن کے بجائے اس وٹامن کو غذا سے حاصل کرنا بہتر ہے۔ یہ کلیجی اور گردے میں ہوتا ہے۔ گوشت خوروں کو ہیموگلوبین کی کمی محسوس نہیں ہوتی لیکن زیادہ گوشت کھانا بھی مفید نہیں۔ ایک انسان کو روزانہ ایک چھٹانک یعنی ۵۰ گرام گوشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ گوشت کھانے سے خرابی پیدا ہوسکتی ہے۔ جانوروں کی بیماریاں گوشت کے ذریعہ انسانی جسم میں منتقل ہوجاتی ہیں۔ گوشت کے علاوہ وٹامن بی ۱۲ انڈے، دودھ اور پنیر میں بھی پایا جاتا ہے۔ لوہے کو انسانی جسم میں جذب کرنے کے لئے ایسکوربک ایسڈ بھی ضروری ہے۔ یہ سنگترے، لیموں، انناس، موسمی وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا انیمیا کے لئے بہت مفید ہے۔ دن میں دو بار ٹھنڈے پانی سے نہائیں۔ اگر عادت نہ ہو تو گنگنے پانی سے شروع کریں۔ پھر اس میں آہستہ آہستہ ٹھنڈے پانی کی آمیزش کرتی جائیں۔ آخر میں نل کے پانی سے نہائیں۔ ہفتے میں ایک بار جسم کی مالش کرنا بھی ضروری ہے۔ صبح کو تازہ ہوا میں گہرے سانس لینا اور ہلکی ورزش بھی خون کی کمی کے لئے ضروری ہے۔ اگر ورزش نہیں کرسکیں تو چہل قدمی ہی کریں۔ ورزش سے خون کی روانی تیز ہوجاتی ہے۔

سبزیوں میں چقندر خون کی کمی کا خاتمہ کردیتا ہے۔ چقندر کا عرق لوہا، تانبا، کیلشیم، نشاستہ، پروٹین، چکنائی اور وٹامن بی کا خزانہ ہوتا ہے۔ اس عرق سے خون کے سرخ ذرات کی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ ●●

اس نے کسی پر ظلم کیا ہے ؟

ج: اگر اتفاق سے اس کے ظلم کا شکار وہ خود یا اس کا کوئی عزیز ترین دوست یا رشتہ دار نکلتا ہے۔ ایک آدمی ایک کمرے میں چوری کی غرض سے گھسا۔ جب وہ تالا توڑ رہا تھا تو پلنگ پر سویا ہوا آدمی جاگ کر اس پر جھپٹ پڑا۔ اپنے بچاؤ کے لئے چور نے اسے قتل کر دیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ واپس لوٹ کر ابھی خون آلودہ کپڑے بدل کر ہاتھ دھو رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے بیٹے کا دوست اس کی لاش لے کر آیا تھا رات زیادہ گزر جانے کی وجہ سے اس کا بیٹا دوست کے ہاں سو گیا تھا بدمعاشوں کے خوف کی وجہ سے۔

محمد مصطفےٰ احمد عابد — ورنگل

س: میری کمزوری لڑکیاں ہیں بتائیے کیا کروں؟

ج: اسے کمزوری کیوں کہتے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے میں دلچسپی لے کر قانون قدرت کی پابندی کرتے ہیں یہ کوئی مرض نہیں کمزور تو خواہ مخواہ مار کھاتا ہے اسے عیب نہ سمجھئے کوئی تہذیب سے گری ہوئی حرکت نہیں کرتے تو آپ صحت مند ہیں۔

ب سیدہ نقوی، علی گڑھ

س: جس کی ہر سحر میں شب کا سا اندھیرا ہو تو اس انسان کی زندگی ؟

ج: دل اور دماغ میں خود اعتمادی کا سورج اتار لے وہ انسان تو زندگی کی شاہراہیں روشن ہو جائیں گی۔ زندگی جینے کی آرزو سے جگمگا اُٹھے گی۔

س: زندگی کی راہیں ناہموار ہوں اور راہی کمزور تو ؟

ج: بہت سے کمزور مل بیٹھیں راہوں کو ہموار بنانے کے طریقے سوچیں۔ ایک تار کمزور ہوتا ہے۔ بہت سے کچے سوت کے تاروں سے مضبوط رسّی بن سکتی ہے۔

سید ارشد اقبال چھپرہ، (بہار)

س: اس دور میں انسان اگر ضمیر کی سُنتا رہے تو ؟

ج: زندگی کی راہیں ہموار ہو جائیں گی مگر ضمیر سے جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ ورنہ بہک جائے گا غریب۔

س: "دنیا میں کون سا امتحان اہمیت رکھتا ہے ؟"

ج: سب ہی امتحان پوری توجہ کے حقدار ہیں۔ بنیادی امتحان حق اور باطل میں تمیز کرنے کا ہے۔ اگر اس میں اچھے نمبر لے سے پاس ہو گئے تو پھر بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

پیاری سلطانہ، پروین سلطانہ، گنٹور

س: آنٹی ذرا یہ بتائیے۔ کسی کو دھوکا دے کر کسی سے جدا ہو کر کوئی خوش رہ سکتا ہے یا نہیں ؟

ج: اگر زبردستی جدا نہیں کیا گیا خوشی سے الگ ہوا ہے تو ضرور خوش رہے گا۔ رہی بات دھوکے کی تو آج کل زیادہ تر دھوکا بازی عشق کر رہے ہیں۔ خوش بھی ہوں گے شاید۔

س: اگر شوہر روز روز یہ دھمکی دے کہ میں دوسری شادی کر دوں گا تو بیوی بے چاری کو کیا کرنا چاہئے بتائیے ؟

ج: جلد از جلد ایک نئے شوہر کی تلاش شروع کر دینا چاہئے۔ اگر "بے چاری" ہے تو مونہہ پر آنچل رکھ کر زور زور سے رو دیجئے شوہر کا دل پگھل جائے گا۔ انشاء اللہ۔

س: انسان کی زندگی کا صحیح مقصد کیا ہے اور کیا دولت انسان کے دُکھ درد اور غم کو بانٹ سکتی ہے ؟

ج: کسی کو دُکھ دو نہ کسی کو اپنے اوپر ظلم ڈھانے دو کہ دونوں ہی گناہ اور عذاب ہیں۔ دولت زندہ رہنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ درد کے علاج کے لئے ڈاکٹر کو فیس دینی پڑتی ہے اور غم سے چھٹکارا پانے کے لئے بھی پیسے چاہئیں۔

س: جب ہر طرف مصیبتوں اور غموں کی یلغار ہو تو ہم کو نجات کس طرح ملے گی اور ہم کس کو پکاریں کس طرف دیکھیں ؟

ج: پتہ نہیں کیا مصیبتیں اور غم ہیں تو کیا رائے دی جائے غموں کی پوٹلی کھولئے۔ بڑے بڑے چُن کر ایک کاغذ پر فہرست بنا لیجئے۔

س: مصیبت میں اور تکلیف میں انسان خدا کو پکارتا ہے جب اس کا مطلب پورا ہو جاتا ہے تو سب کچھ چھوڑ دیتا ہے آخر کیوں ؟

ج: یہ آپ اپنے تجربہ کی بات کہہ رہی ہیں یا کسی نے آپ کو نسخہ بتایا ہے۔ خدا کو سچے دل سے یاد کرنے والے اسے کبھی نہیں بھولتے۔

●●

بیمار پڑنے کا حق

فرحت قمر

کئی دن سے مسز نکہت ملک کے
پیروں میں اتنا درد ہے کہ وہ کھڑی نہیں ہو سکتیں
کل صبح جب ان کے شوہر بچوں کی مدد سے
ناشتہ تیار کرتے ہوئے جھنجلا سے گئے تھے
تو وہ بدقت باورچی خانہ میں چلی گئی تھیں، لیکن
ان کو ایسا لگا کہ جیسے ان کی پنڈلیوں میں کئی
بچھوؤں نے ایک ساتھ کاٹ لیا ہو۔ اس کے
بعد سارے دن ان کے بخار میں تیزی رہی تھی۔

ان کے بچے سہ پہر کو اسکول سے لوٹے
تھے تو ان کی آوازیں اور باورچی خانے میں
برتن کھڑکنے کی آوازیں ان کے کانوں میں آتی
رہی تھیں اور وہ اندازہ لگاتی رہی تھیں کہ بچے
کیا کر رہے تھے ۔ "کھانا دانا تو کیا، بس
پیٹ کی آگ بجھا رہے ہیں" انہوں نے
دکھ کے ساتھ سوچا تھا۔ ان کے دل میں ممتا کا
درد جاگا تھا، لیکن کیا کیا جائے کہ ان کی
ٹانگوں میں ہونے والا درد ان کے دل کے
درد سے زیادہ تھا۔

کل شام کو ان کے شوہر دفتر سے لوٹے
تھے تو بڑے بچے نے ان کو چائے بنا کر پلا دی
تھی مگر وہ بچہ اتنا بڑا تو تھا نہیں کہ کھانا بھی بنا سکتا
خود ان کو ہی کھانا تیار کرنے کا کام کرنا پڑا تھا۔
انہوں نے دفتر سے گھر آ کر کپڑے بھی تبدیل نہیں
کئے تھے۔ نکہت جانتی تھی کہ ملک صاحب گھر
میں داخل ہونے کے بعد پتلون وغیرہ کو ایک منٹ
بھی برداشت نہیں کر پاتے۔ لیکن ان کو ڈاکٹر
کے پاس جانا تھا نا! نکہت کو اپنے شوہر کی
بے آرامی کی بات سوچ کر بہت برا لگا تھا، مگر
وہ مجبور تھیں۔

پلنگ پر پڑے ہوئے نکہت کو آج
چوتھا دن تھا۔ ملک صاحب زندگی کی
ذمہ داریوں اور حقائق سے گھبرائے نہیں تھے
نکہت گھر میں نہ ہوں یا بیمار پڑ جائیں تو خندہ پیشانی
سے گھر اور بچوں کو سنبھال لیتے تھے۔ لیکن ان
کی بھی اپنی حدود تھیں۔ دن بھر کے دفتر کے
بکھیڑے اور باہر کی زندگی کی الجھنیں۔ کل
شام کو نکہت نے اپنے شوہر کی بیزاری کو صاف
طور پر محسوس کیا تھا۔ یہ فطری ہی تھا مگر نکہت
کا درد بھی تو ایک فطری مجبوری تھا۔

20,000.00

پہلا انعام بالکل درست حل پر: بارہ ہزار روپے، دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: آٹھ ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعے ادا کی جاسکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر، یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں۔ اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مِنی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ہفتہ، ۲۳۔ نومبر ۱۹۸۵ء آٹھ بجے رات تک۔ پیر ۲۵۔ نومبر ۱۹۸۵ تک ڈاک سے ملنے والے حل بھی قبول کر لئے جائیں گے۔

بیس ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام:

بارہ ہزار روپے نقد

یا ایک ۵۱ سینٹی میٹر کا

رنگین ٹی وی اور

تین ہزار روپے نقد

دوسرا انعام:

آٹھ ہزار روپے

شمع مِنی معمہ نمبر ۱۲۰

د	ا	م	ت	ع	ا	■
ے	ت	ن	ا	م	■	ن
ے	ن	ا	ھ	■	ہ	ا
ط	ب	ض	■	ث	م	د
ے	ا	■	س	ا	و	ا
		ج	و	ز	ا	ط
		س	ج	ی	ر	ی

اشارے:

دائیں سے بائیں:

۱۔ جو کام بھی کرو یقینِ محکم کے ساتھ اور مکمل —— کے ساتھ۔ ورنہ

۲۔ یوں تو سب —— ہیں کہ شراب سے نقصان ہی نقصان ہے۔ پھر بھی شراب کی کھپت بڑھتی ہی جاتی ہے

۳۔ میاں باغ لگانے والے اور ہوتے ہیں اور پھل —— والے اور۔ قدرت کا یہی نظام

۴۔ فوجی تربیت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ گھمسان کے رن میں بھی ہر دستہ میں نظم و —— برقرار رہے

۵۔ دیکھو، —— ساکنانِ خطۂ خاک!

اوپر سے نیچے:

۶۔ —— کو کہتے ہیں عالم آرائی

۷۔ اپنی —— پر انحصار کرنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس

۸۔ مالکن رحمدل ہے۔ سب نوکروں کو روٹی کیساتھ —— ترکاری دیدیتی ہے۔ کبھی کبھار

۹۔ زندگی کی راہوں کو اتنا —— سمجھنا بھی غلط ہے۔ آخر لاکھوں کروڑوں انسان

۱۰۔ مسلمانوں میں تعلیم فروغ پائے گی تو ان کی یہ —— خود بخود دور ہو جائے گی

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں۔

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں —— فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ۔

★ صرف دس اشارے

★ انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جاسکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

★ صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجیے یا پھر اگلے ماہ نامہ بانو یا ماہ نامہ شمع میں دیکھیے

★ شمع مِنی معمہ نمبر ۱۲۰ کا نتیجہ ماہ نامہ بانو (نئی دہلی) اور جنوری ۱۹۸۶ کے ماہ نامہ شمع (نئی دہلی) میں شائع کیا جائے گا۔

شمع ادبی معمے (شمع مِنی معمہ نمبر ۱۲۰) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

عید میلاد النبیؐ اور گرو [illegible] کی تعطیلات کے سبب شمع مِنی معمہ نمبر ۱۲۰ کا صحیح حل: جمعرات، ۲۸۔ نومبر ۱۹۸۵ کو صبح دس بجے [illegible] گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ماہ نامہ بانو میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع: جنوری ۱۹۸۶ میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں۔